
حالِ ہند
اردو کا ... میگزین
ں وکشمیر ـ سیاسی مصا
روس تعلقات کا نیاد
ثقافتی نشاۃِ ثانیہ
2 JAN 1987
8

# حرفِ دانش

جب آفتاب نکلتا ہے تو اس کی روشنی اور حرارت میں کوئی تمیز نزدیک و دور، اعلیٰ و ادنیٰ، سیاہ و سفید یا باغ و دشت کی نہیں ہوتی، اس کی روشنی بلا تمیز مکان و مقام ہر شے پر چمکتی اور حرارت پذیر وجود کو گرم کرتی ہے۔

آج وطن عزیز کو ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو آفتاب کی طرح بدستور جلتے ہوئے بھی اندھی اندھیری زندگیوں کو روشنی کا فیضان بخشے اور بیماروں اور زخمیوں کو راحت پہنچا سکے۔

●

دنیا کی مختلف قومیں، زمین کے دور دراز گوشوں پر بسنے والی آبادیاں سب ایک ہی گھر کے عزیز ہیں۔

●

مذہب انسانی سرگرمی سے الگ نہیں — مذہب ایک ایسی سرگرمی ہے جو دوسری تمام سرگرمیوں کے لیے اخلاقی اساس فراہم کرتی ہے۔ اس کے بغیر ساری سرگرمیاں اس سے محروم رہتیں اور زندگی شور و غوغا کی دھند بن کر رہ جاتی۔ جس کی کوئی بھی اہمیت نہ رہتی۔ جو چیز زندگی کے ایک شعبے میں اچھی اور اخلاق رویے کے مترادف ہے وہ باقی زندگی میں بھی لازمی طور سے ایسی ہی ہوگی۔ انسانوں کی مجموعی زندگی کے خاص کر سیاسی شعبے میں جو افراتفری اور بحران موجود ہیں وہ اس لیے ہیں کہ انسانوں نے اخلاقیات کے دو رخے معیار اپنا لیے ہیں۔ ایک معیار انفرادی اور سماجی میل جول کے لیے ہے اور دوسرا سیاسی شعبے کے لیے ہے جو خاص کر بین الاقوامی سیاسیات میں نمایاں ہے۔

●

دنیا کی تمام جنگیں ہمیشہ ہی سے انسان کے ذہن سے ابھرتی رہی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ امن و امان کی حفاظت کے منصوبے اس کے ذہن میں بر وقت بوئے جائیں اور ان کی باقاعدہ آبیاری بھی ہوتی رہے۔

●

اخلاقی قوت کو وحشیانہ دست درازی میں منتقل کرنا ناقابلِ معافی جرم ہے۔

●

کھونا اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ جینا۔

●

کامیاب خطبہ وہ ہے جس میں خطیب و مقرر مطالعے اور نظر کی وسعت، مفہوم کو موزوں ترین الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت، مفکرانہ طریقۂ استدلال اور موقف کی صداقت اور صحت پر کامل اعتماد رکھتا ہو — یعنی جو سامعین کو اپنا ہم خیال بنانے اور انھیں اپنی کسی رائے یا تجویز سے متفق کرانے کی اہلیت رکھتا ہو۔

●

پوت سپوت کے پاؤں پالنے ہی سے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

●

جو ذہن گنگ ہے اسے سوچنا ہے، جو زبان بول نہیں سکتی اس کو بولنا ہے، جو قدم اٹھ نہیں سکتا اسے چلنا ہے۔ کیونکہ وقت آگیا ہے کہ گونگے بولنے لگیں اندھے دیکھنے لگیں لنگڑے چلنے لگیں اور بہرے سننے لگیں۔

ایڈیٹوریل بورڈ
●
ایڈیٹر ان چیف
●
مینیجنگ ایڈیٹر
●
ایڈیٹر
●
ایسوسی ایٹ ایڈیٹر
●
ایڈیٹر قانون
●
ایڈیٹر اقتصادیات
●
ترتیب

# احباب کہتے ہیں

ماہنامہ حال ہند ماہ اکتوبر ۱۹۹۰ء موصول ہوا۔ حوادث الواقع انتہائی اہم کاوش کا آئینہ دار ہے۔ اردو میں آج تک ایسا کوئی جریدہ نہیں نکلا۔ معیار کے لحاظ سے اس کو انگریزی سے اور ... لائن سے کسی طرح کم نہیں سمجھا جاسکتا

ڈاکٹر سید اے جے ایس بیتوکی
گوہاٹی۔ آسام

حال ہند دیکھا طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ ایک معیاری جریدہ اردو صحافت میں ایک نیا سنگ میل ہے۔ امید ہے کہ یہ خوب سے خوب تر ہوتا جائے گا

آزاد قاسمی
چکسو

حال ہند کا معیار انگریزی میں شائع ہونے والے کسی نیوز میگزین سے کم نہیں۔ اس میں آپ نے ہر طرح کے مواد کو یکجا کیا ہے اور اہم مسائل پر سیر حاصل تبصرے بھی۔ مجموعی اعتبار سے یہ جریدہ بہت ہی دلکش، خوب صورت، معیاری اور بے باک ہے۔

ایس۔ اے نصر وارثی
پٹنہ ہائی کورٹ

اردو داں طبقے کی ذہنی غذا اور اردو کی ترقی و ترویج کے لیے آپ کی کوششیں اور کاوشیں لائق تحسین ہیں، نیز ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں جو اپنے اہل و عیال سمیت پلتے تو اردو کے دسترخوان پر ہیں، لیکن انھوں نے اپنی نجی اور اجتماعی زندگی میں اردو سے بے رخی برتی ہے۔

جوہر قدوسی
چندری گام۔ جموں و کشمیر

پہلی ہی نظر میں آپ کا "حال ہند" قاری کو گرفت میں لے لیتا ہے اور وہ جنھیں اردو صحافت کے امکانات سے ... وہ بھی ... ایسے ... کے ساتھ تھام لیتے ہیں۔ اس کا صوری حسن دل آویز ہے

آپ نے اسے اردو کا پہلا نیوز میگزین کہا ہے۔ یہ دعوی ذرا محل نظر ہے۔ اس سے قبل واقعات نو، شیشہ و تیشہ، خیر و خبر اور چند اور جریدے بھی جاری ہوئے جو نیوز میگزین کی صف سے تعلق رکھتے تھے۔ ہاں اگر وہ ثابت قدمی، اس کی کلید بنی جس کا اظہار آپ نے اپنے افتتاحی اداریے میں کیا ہے تو یہ یقیناً اردو کا پہلا پائیدار نیوز میگزین ثابت ہوگا۔ اس کی آمد اس ہونہار بروے کی سی ہے جس کے پات چکنے چکنے ہوتے ہیں۔

اس میں نیوز میگزین کے لوازمات سے ہم آہنگ مختلف گوشوں کے لیے بجا طور پر کچھ مستقل عنوانات قائم کیے گئے ہیں مثلاً ملک کی مختلف ریاستوں کے حالات حاضرہ کے لیے "احوال وطن"، ابھرتے ہوئے مسائل کے لیے "وقت کی آہٹیں"، اندرونی بدعنوانیوں اور کج خیالیوں کے لیے "حق لگتی"، فلموں اور قلم والوں کے لیے "دنیائے سیمیں"، اور ادب، کھیل جگت اور صحت کے مضامین کے اپنے کالم ہیں

پہلے شمارے سے ظاہر ہوتا تھا کہ عالمی حالات کو "پاس پڑوس" کے ممالک تک محدود کردیا گیا ہے، لیکن دوسرے شمارے میں تو آزاد اور آزادی کے طالب ممالک کے مسائل کے لیے "تیسری دنیا" کا کالم بھی کھول دیا گیا ہے۔ بہرحال ابھی عالمی حالات کے موضوع کو اس طرح وسعت دینے کی ضرورت ہے کہ بڑی طاقتوں کی سیاسیات کا احاطہ ہوجائے۔

گورنگن چندن
نئی دہلی۔۱۴

# منظر نامہ









اداریہ

# بات ایک برس کی

۱۹۸۶ء کا سال ختم ہوتے ہی ہم لوگ اکیسویں صدی سے قریب ہو گئے ہیں۔ یہ اکیسویں صدی نئی ٹیکنالوجی سے وابستہ اقتصادی اور سماجی اعتبار سے ایک ایسی عجیب و غریب دنیا ہے جسے شری راجیو گاندھی نے ایک چیلنج اور امید کے روپ میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ شری راجیو گاندھی کا یہ رویہ ہندوستان کے [illegible] سربراہ کی حیثیت سے ان کی اپنی ذہنی ساخت کا ایک لازمی جزو ہے۔ کیا اس چیلنج اور امید پر ہمارے ملک کا اجتماعی رویہ مناسب رہا ہے۔ یہ ابھی قابل استفسار ہے۔ ہم میں سے بیشتر لوگوں کے لیے ایک دوسری صدی میں منتقل ہو جانا تقویمی تبدیلی کے علاوہ شاید کچھ بھی نہیں۔

وہ لوگ جو زیادہ جانتے ہیں ان کے لیے بھی اچھے یا برے آئندہ سو برسوں کی جملہ امکانی صلاحیتوں کا آسانی سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ وقت کا ایک ایسا طویل عرصہ ہے جو مستقبل کی جانب قدم قدم کی حرکت کی قابل اعتماد پیش گوئی کی اجازت نہیں دیتا۔ البتہ ہم چند ظاہری رجحانات کی بنا پر کسی نہ کسی نوعیت کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور نسبتاً بہترین صورت حال کی امید کر سکتے ہیں یا موجودہ رجحانات کی بنا پر بدترین صورت حال کا آسیب بھی ہم پر چھا سکتا ہے۔

آج کے آثار کو دیکھیں تو دونوں طرح کی صورت حال پیدا ہونے کی گنجائش موجود ہے۔ صدی کے گذشتہ ۸۶ برسوں کے دوران سائنس نے بڑی بھاری ترقی کی ہے۔ یہ ترقی خصوصی طور سے اس عرصہ کے دوران ہوئی جب دوسری عالمی جنگ کے دنوں تباہ کن ہتھیاروں کی جستجو میں ایٹمی توانائی دریافت کی گئی۔ اس لحاظ سے یہ ترقی حوصلہ افزا بھی ہے اور ہراس انگیز بھی۔ آج ان دو متوازی راستوں کی کوئی بھی صاف صاف تصویر پیش نہیں کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ان کے بارے میں کوئی ایسا یقینی فیصلہ قائم کرنا مشکل ہے جسے دنیا کی اعلا طاقتیں اور ان کے اپنے براعظموں یا دوسرے براعظموں میں موجود ان کے پیروکار اختیار کریں گے۔ ایک زبردست تباہی کا خوف ہی انہیں کنارے سے لپک کر گرداب میں کودنے سے روکے ہوئے ہے۔

خوش قسمتی کی بات ہے کہ دونوں فریق اس فیصلے پر تو پہنچے ہی ہیں کہ باہمی بے اعتمادی کے موجودہ حالات میں وہ تباہی جس کا ڈر دونوں کو ہے کسی ایک ہی سمت تک محدود نہیں رہے گی۔ اس کے باوجود وہ سد راہ جو خود انہیں اور باقی دنیا کو تباہی سے بچانے کے لیے انہیں باہمی سمجھوتہ کرنے سے روک رہی ہے بدستور موجود ہے۔

ایسے میں یہ بے اعتمادی جس خوف سے رونما ہوئی ہے ویسی ہی کسی دوسری بے اعتمادی کی نشاندہی ہو گی۔ چنانچہ ہندوستان بھی اس بین الاقوامی خودکشی کی دوڑ دھوپ کے نتائج سے بچ نکلنے کی امید نہیں کر سکتا۔ ملک میں ۳۰ فیصد خواندگی کے مایوس کن موجودہ ریکارڈ کی وجہ سے انسان کو درپیش خطرات کا ادراک لازمی طور سے محدود ہے۔ اس اعتبار سے یہ خوش قسمتی کی بات ہے کیونکہ لاکھوں لوگ جو اخبارات کا مطالعہ نہیں کرتے یا خبر یا چترمالا کے سوا ٹیلی ویژن بھی نہیں دیکھتے یا ریڈیو سے نشر ہونے والی ناخوشگوار خبریں بھی نہیں سنتے وہ تیرے آج کے خطرات کے آثار سے باخبر نہیں ہیں۔ ان کے دل و دماغ پر ایسی بہت سی دیگر چیزیں چھائی ہوئی ہیں کہ وہ سوویت یونین اور امریکہ کے ایٹمی ہتھیاروں کے بھرپور ذخیروں کے بارے میں سوچنے سے قاصر ہیں۔

آئندہ صدی کے لیے اس ملے جلے ذہنی میلان کو فی الوقت نظر انداز کرتے ہوئے ہمیں آنے والے سال سے کیا توقع کرنی چاہیے؟ اس سوال کا جواب دو بڑے سوالات پر مبنی ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آیا ہم ملک کی قومی یکجہتی کے درپیش اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو چلے ہیں جو ملک کے کچھ حصوں پر چھایا ہوا ہے۔ پنجاب ہی ایسا خطہ پیش کر رہا ہے جو اس معاملے میں شک و شبہ پیدا کرتا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا شری راجیو گاندھی اور ان کی سربراہی میں کام کرنے والے ارباب اختیار ایک ایسی سیاسی نیز انتظامی ٹیم کی نمائندگی کرتے ہیں جو ملک کو متحد رکھنے کے سلسلے میں امداد دینے کے لیے ملک کے عوام میں معقول اعتماد اجاگر کرنے کے قابل ہو؟ اس سلسلے میں بھی شبہات در آتے ہیں۔

ایک تیسرا شبہ جو پہلے دو سے جڑا ہوا ہے، ایک ایسی معیشت سے تعلق رکھتا ہے جو فی الحال آئندہ کے وعدوں اور گذشتہ سال کے دوران جزوی عمل درآمد کا ایک گڈمڈ کا سلسلہ ہے۔

آؤ اب پہلے دو سوالوں کی طرف لوٹ آئیں جہاں ہماری قومی یکجہتی واقعی خطرے میں ہے اور ہمارے سربراہ کی طرف سے دانشوری اور جرأت کی متقاضی ہے۔ وہاں علاحدگی پسندوں اور امن و استحکام کے دشمنوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کے لیے ایک قومی جذبے کے آثار بھی واضح طور سے نمایاں ہیں۔ جدید ایک واہمہ کی پیداوار سرزمین خالصتان کے لیے گمراہ کن اجتہاد سے پیدا ہونے والا خطرہ زیادہ حقیقی صورت اختیار کر گیا ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ حالیہ مہینوں میں اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے ارادے بھی زیادہ قوی ہو گئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دہلی کی حکومت اکثر اوقات کمزور سی دکھائی دیتی ہے لیکن اس سے عوام کے ارادوں میں کوئی ایسی کمزوری نہیں آئی ہے جو ہندوستان کو پھر سے تقسیم ہونے سے نہ روک سکے۔ ہمارا ملک اپنے حکمرانوں کو یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ ملک کی یکجہتی کو اندرونی یا بیرونی دشمن سے عارضی صلح کی کوشش میں سودے پر لگا دیں۔

بدقسمتی سے شری راجیو گاندھی کی سربراہی میں فی الحال کام کرنے والی وزارتی ٹیم اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس قدر اعتماد کی مالک نہیں ہے کہ وہ آج کے تقاضوں کا مقابلہ کر سکے۔ بلاشک کچھ حضرات مستثنیٰ بھی ہیں جیسے مثال کے طور پر وزیر خزانہ شری وی پی سنگھ لیکن پہل قدمی اور فکری دسترس جس کی توقع جوان حضرات سے کی جا سکتی ہے وہ قریب قریب وزیر اعلیٰ کے کم عمر رفقائے کار میں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ حضرات بھی اپنے قائد کی طرح اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہتے ہیں اور منتخب نشانوں پر توجہ مرکوز نہیں کرتے جو دہلی کی عمل درآمد کی گرفت میں لائے جا سکتے ہیں۔ وزیر اعظم کی متواتر اور مسلسل نگرانی کے باوجود ان کی کارکردگی میں کوئی واضح بہتری آتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی بجائے ہمیں ایسا لگتا ہے کہ زیادہ تبدیلیوں اور تجربہ کوششوں کی وجہ سے صحیح کام صحیح انداز میں نہیں ہو رہا ہے۔

لیکن ایک سربراہ کی حیثیت سے خود شری راجیو گاندھی سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں جو اپنے تجربات کی بدولت روز بروز زیادہ سمجھ دار ہوتے جا رہے ہیں۔ اپنے عہدے پر ان دو برسوں کے دوران انہیں بھی تعلیم حاصل ہوئی ہے اور ان کی غیر معمولی دیانت داری نیز اپنے لیے اور ہندوستان کے لیے دوست بنانے کے سلسلے میں ان کی صلاحیت کے بارے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ آنے والا سال ان کے لیے اور عمومی طور پر قوم کے لیے ایک ایسا دوسرا عرصہ ثابت ہونے والا ہے جس میں قوم کو بڑی شدید کشمکش سے دوچار ہونا پڑے گا۔ شری راجیو گاندھی کو وہ سب کچھ استعمال میں لانا پڑے گا جو انہوں نے گذشتہ دو سال کے دوران اپنی آزمائشوں اور غلطیوں سے سیکھا ہے۔ اپنے ملک میں اور بیرونی ممالک میں بھی ان پر کڑی نگاہ رہے گی۔ خدا کرے یہ نیا سال ہم سب کے لیے مبارک ثابت ہو۔

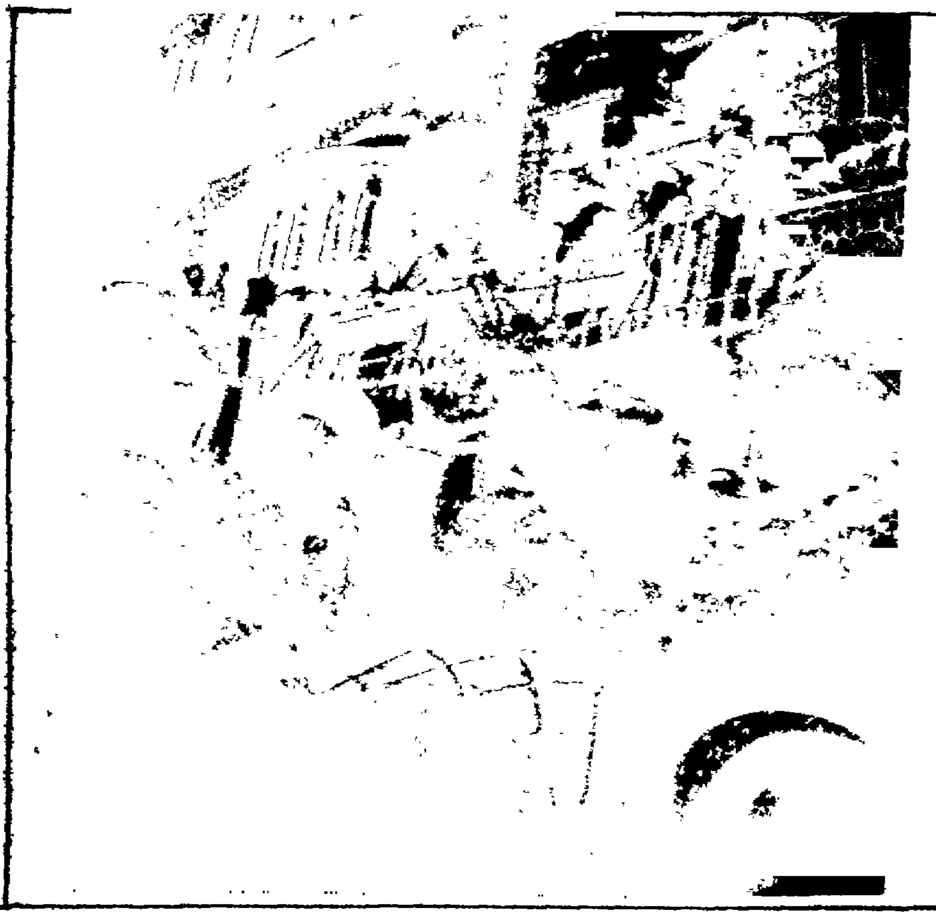
From Bharat [illegible]

([illegible])

بجے چند کرتی

# پنجاب :

## خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد



پنجاب میں آخر کب تک بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا سلسلہ جاری رہے گا؟

اس چبھتے ہوئے سوال کا جواب نہ برنالہ سرکار کے پاس ہے، نہ ہی پولیس کے ڈائریکٹر جنرل جے ایف روبیرو کے پاس۔ ۴ نومبر کو لدھیانہ میں نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے پنجاب کے پولیس چیف مسٹر روبیرو نے بتایا کہ اب پولیس نے انتہاپسندوں کو پکڑنے کے ساتھ ساتھ انھیں حوصلہ دینے اور پناہ دینے والے لوگوں کو بھی پکڑنا شروع کر دیا ہے۔ آپ نے بتایا کہ متحدہ اکالی دل، بادل اکالی دل اور سکھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے ان لیڈروں کو پکڑا جا رہا ہے جو بے گناہ لوگوں کو مارنے والے انتہاپسندوں کی موت کے بعد ان کی روحوں کو شانتی پہونچانے کی غرض سے رکھے گئے پاٹھ کے خاتمہ پر اکٹھے ہوئے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے نہ صرف ان کی بے جا تعریف کرتے ہیں بلکہ ان کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔

اب تک نیشنل سیکورٹی ایکٹ کے تحت اور ملک سے غداری کے الزام میں جن لوگوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے ان میں سابق وزیر سکھ جندر سنگھ شیر سنگھ زنجیری، خالصتان کونسل کے سوداگر سنگھ وریندر سنگھ چیمہ، رنجیت سنگھ برہم پورہ، پچکور سنگھ رڈھے اور درشن سنگھ شامل ہیں۔ آپ نے بتایا کہ متحدہ اکالی دل کے کنوینر بابا جوگندر سنگھ اور یکم نومبر کو امرتسر میں سربت خالصہ کا اہتمام کرنے والے سکھ لیڈروں کے خلاف ملک سے غداری کرنے کے مقدمے درج کئے گئے ہیں۔

آپ نے بتایا کہ اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ۳۰ اکتوبر کو جالندھر کے پی اے پی کمپلکس کے اندر مجھ پر (روبیرو پر) حملہ کرنے کی سازش کمپلکس کوارٹروں کے اندر سپاہی سردول سنگھ کے کمرہ میں ہی تیار کی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں سات آدمی پکڑے جا چکے ہیں اور چار پولیس ملازم ابھی مفرور ہیں۔ آپ نے بتایا کہ انتہاپسندوں پر قابو پانے کے لیے مرکز سے ریزرو پولیس کی ساٹھ کمپنیاں اور مانگی گئی ہیں۔ آپ نے بتایا کہ پہلے درجے کے ۲۸ انتہا پسندوں میں سے ۱۵ کو گرفتار کرنا باقی ہے۔ دیگر یا تو پکڑے جا چکے ہیں یا پولیس مقابلوں میں مارے جا چکے ہیں۔

اسی سلسلہ میں ۵ نومبر کو نئی دہلی میں اپوزیشن لیڈروں کو اعداد و شمار بتاتے ہوئے وزیر اعلی سردار سرجیت سنگھ برنالہ نے حالات کے سدھرنے کا وعدہ کرتے ہوئے بتایا کہ امسال ۶ مارچ سے ۳۰ اکتوبر تک ۱۷ بڑے گولی کانڈوں میں سے ۱۴ کے ملزموں کا پتہ لگا کر بہت سی گرفتاریاں کی جا چکی ہیں۔

آپ نے مزید بتایا کہ ایک سو چودہ ممبروں پر مشتمل انتہاپسندوں کے چھ گروہوں میں سے منوبیر سنگھ گروہ کے ۳۸، اور کوہاڑ گروہ کے ۲۸ ممبر پکڑے جا چکے ہیں۔ آپ نے بتایا کہ گزشتہ ایک سال میں انتہا پسندوں کے حملوں میں ۹۰۴ آدمی مارے گئے ہیں۔ جن میں ۲۶۱ ہندو اور ۱۴۴ سکھ ہیں۔ جب کہ پچھلے چھ ماہ میں ۴۸ انتہاپسند مارے گئے اور ۱۰۲۴ گرفتار کئے گئے، نیز پچھلے تین ماہ میں انتہاپسندوں سے جتنا اسلحہ پکڑا گیا ہے اتنا گزشتہ پانچ برسوں میں بھی نہیں پکڑا گیا۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے بتایا کہ دو مشین گنیں، ۲۶۰ اسٹین گن اور برین گن، ۱۲۱۱ پستول، ۴۰۰ بندوقیں اور ۵۱۴ رائفلیں شامل ہیں۔

بے شک وزیر اعلیٰ کی نظر میں یہ بہت بڑی معرکہ آرائی ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسٹر برنالہ کے گدی نشین ہونے کے بعد مار دھاڑ، قتل و غارت گری نے گزشتہ پانچ سال کے ایسے تمام واقعات کا ریکارڈ مات کر دیا ہے۔ وزیر اعلیٰ کے اپنے اعداد و شمار کے مطابق یکم اکتوبر ۸۵ء سے ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء تک ۹۰۴ آدمی مارے گئے لیکن اگر ان واقعات کا تاریخ وار جائزہ لیا جائے تو ایک ایسی تصویر سامنے آتی ہے جسے دیکھ کر انسانیت سے پیار کرنے والی ہر آنکھ آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کیوں کہ برنالہ سرکار کے ایک سال کے عرصہ کے دوران ۲۹ ستمبر ۱۹۸۵ء سے لے کر ۲۸ ستمبر ۱۹۸۶ء تک چھ سو سات بے گناہ موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ جب کہ اکتوبر ۱۹۸۶ء میں کشت و خون کے واقعات نے پچھلے پورے ایک سال کے سبھی بارہ مہینوں کے ریکارڈ مات کر دکھائے۔

برنالہ سرکار کے دوسرے سال کے شروع کے دس دنوں میں چودہ بے گناہ مارے گئے، جبکہ ۹ اکتوبر سے ۲۹ اکتوبر تک ۴۲ بے گناہ لوگ مارے گئے۔ اس طرح دوسرے سال کے پہلے ماہ کے پورا ہونے تک مرنے والوں کی تعداد ۵۶ ہو گئی۔

۳۰ اکتوبر کو ضلع ہوشیارپور کے قصبہ ٹکواڑہ میں اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی برانچ سے انتہاپسندوں نے صوبہ کی سب سے بڑی بینک ڈکیتی میں ۲۲ لاکھ روپے لوٹ لیے اور بینک منیجر و دیگر دو بینک ملازموں کی جان لے لی۔

۳۱ اکتوبر کو امرتسر کے گوردوارہ منجی صاحب میں اندرا گاندھی کے قاتل بے انت سنگھ کی دوسری برسی منانے کی غرض سے سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے ایک تقریب منعقد کر کے تیس کے قریب قاتلوں کے وارثین کی عزت افزائی کی۔ جن میں جرنیل سنگھ بھنڈراں والا کے دونوں لڑکے، ان کی ماں پریتم کور شریمتی اندرا گاندھی کے قاتل بے انت سنگھ کی بیوہ بمل خالصہ، اندرا گاندھی کے دوسرے قاتل ستونت سنگھ کو بھائی تکھا سنگھ کا ایوارڈ دیا گیا، جو ستونت سنگھ کی ماں نے "بولے سو نہال" کے جوشیلے نعروں میں حاصل کیا۔ ایسے تمام لوگوں کو عظیم شہید قرار دیتے ہوئے دمدمی ٹکسال کے بابا ٹھاکر سنگھ نے ایک ایک شال (سروپا) کے ساتھ گیارہ گیارہ سو روپے نقد دیے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جنھوں نے خاص شخصیتوں کو قتل کیا یا ایسا کرنے کی کوشش کی۔ کچھ ایسے ہیں جو پولیس مقابلوں میں مارے گئے۔

دربار صاحب کے منجی صاحب دیوان ہال میں منعقدہ شہیدی کنونشن کے اسٹیج پر سکھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا کنوینر گورجیت سنگھ بیٹھا تھا جسے پکڑنے کے لیے پنجاب سرکار نے ایک لاکھ روپے انعام دینے کا اعلان کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اسٹیج پر ایسے کئی انتہاپسند دیکھے گئے جو پولیس کی 'اے' اور 'بی' کلاس میں شامل ہیں۔ ان میں کچھ فیڈریشن کی ایڈہاک کمیٹی کے ممبر، کچھ ضلع صدر اور خالصتان کمانڈو فورس کے کارکن بھی شامل تھے۔ کنونشن میں سات ریزولیوشن پاس کئے گئے جن میں مقاصد کے حصول اور ہندوستان کی غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے جہاد جاری رکھنے کا حلف لیا گیا۔ قاتلوں اور ڈاکوؤں کو سکھ شہید گردانتے ہوئے ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، اندرا گاندھی، للت ماکن، جنرل ویدیہ کو قتل کرنے والوں کو وزیر اعظم راجیو گاندھی نیز پنجاب کے ڈائریکٹر جنرل پولیس جے۔ ایف۔ روبیرو پر حملہ کرنے والوں کی بھرپور تعریف کی گئی۔ ایک ریزولیوشن میں پنجاب آرمڈ پولیس کے ان جوانوں کی بھی ستائش کی گئی جنھوں نے روبیرو کے قتل کی سازش کی اور اس میں حصہ لیتے ہوئے سرکاری نوکری ٹھکرا کر خالصتان کمانڈوز میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔ اس ریزولیوشن میں فوج اور سیکورٹی فورسز میں کام کر رہے سکھوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر توجہ دیں اور مستقبل قریب میں کسی



بھی خدمت کے لیے تیار رہیں۔

سکھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے کنوینر گورجیت سنگھ کے دستخطوں والا دس نکاتی حلف نامہ جاری کیا گیا جس میں سکھ پنتھ کو طاقت کی بھوکی سرکار جاتی اور ذہنی طور پر غلام لیڈرشپ سے آزاد کروانے، پانچ ممبری پنتھک کمیٹی کی طرف سے خالصہ راج کی جدوجہد میں پروگرام کی حمایت کرنے جیسے معاملات شامل تھے۔ اس میں ۱۹۸۵ء ۸۶ء کے دوران سکھ نوجوانوں کے مارے جانے کا بدلہ لینے کی بھی بات کہی گئی ہے۔

ایک ریزولیوشن میں یہ وارننگ بھی دی گئی کہ اگر فرار یا زیر حراست نوجوانوں کی جان کو خطرہ ہوا تو اس کے خطرناک نتائج ہوں گے۔ ان نوجوانوں میں ترسیم سنگھ کوہاڑ، گرجیت سنگھ، ہرجیندر سنگھ چندا، ستونت سنگھ شامل ہیں جنھیں پنتھ کے ہیرے قرار دیا گیا۔

کنونشن میں نظربند سکھوں کو رہا کرنے، بھگوڑے فوجیوں کو بحال کرنے کی مانگ کرتے ہوئے سبھی سکھوں کو کیسری نشان کے نیچے متحد ہونے کی اپیل کی گئی، جب کہ وزیر اعلیٰ سرجیت سنگھ برنالہ اور وزیر خزانہ بلونت سنگھ کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ جتھیدار جگدیو سنگھ تلونڈی، بمل خالصہ اور کار سیوا کمیٹی کے سکریٹری مہتاب سنگھ نے بھی جی بھر کے دل کی بھڑاس نکالی۔

اسی دن انتہاپسندوں نے رات قریب ساڑھے سات بجے لدھیانہ کے منڈی گنج ایریا میں اندھا دھند فائرنگ کر کے آٹھ لوگوں کی جان لے لی۔ یہ سبھی اقلیتی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۲۸ مارچ کے بعد لدھیانہ میں یہ دوسرا بڑا المیہ

تھا۔اسی عرصہ کے دوران پنجاب میں اجتماعی قتل کی ایسی ہی ۱۷ بڑی وارداتیں ہو چکی ہیں جن میں کتھو گولی کانڈ سب سے بھیانک اور بڑا واقعہ تھا جس میں پندرہ بے قصور لوگوں کی جان لے لی گئی تھی۔

یکم نومبر کو دیوالی کے دن پانچ ممبری پنتھک کمیٹی نے دربار صاحب میں ایک اور سربت خالصہ بلاکر امسال ۲۹ راپریل کو خالصتان کے اعلان کی تائید کی۔ یہ سربت خالصہ پنتھک کمیٹی کے ممبر گوربچن سنگھ مانوچاہل نے بلایا تھا۔ لیکن وہ خود اسٹیج پر نہیں آیا۔ اس سربت خالصہ میں چاہے سرکاری طور پر دو ہزار سکھوں کی شمولیت تسلیم کی گئی لیکن عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ یہ تعداد پانچ ہزار سے کم نہیں تھی۔ اس میں ایک ریزولیوشن کے ذریعے وزیراعلیٰ سرجیت سنگھ برنالہ، وزیر خزانہ بلونت سنگھ اور پانچ سنگھ صاحبان کو سکھ پنتھ سے خارج کر دیا گیا اور سکھ سنگتوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ ان سے قطع تعلق کریں۔

برنالہ اور بلونت سنگھ پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے ۳۰ راپریل کو دربار صاحب میں پولیس بھیج کر بہت بڑا پاپ کیا ہے۔ (ان کی نظر میں ۲۹ اپریل کو دربار صاحب میں خالصتان کا اعلان نہ دربار صاحب کی بے حرمتی تھی نہ وطن دشمنی)۔

پانچ سنگھ صاحبان کو سکھ پنتھ سے خارج کئے جانے کے متعلق ریزولیوشن میں کہا گیا کہ ۲۶ رجنوری والے سربت خالصہ میں حکم دیا گیا تھا کہ وہ ۱۳ راپریل کے سربت خالصہ میں حاضر ہو کر اپنی پوزیشن واضح کریں لیکن وہ نہیں آئے۔ حکم عدولی کے جرم میں انھیں پنتھ سے خارج کیا گیا ہے۔ جب یہ ریزولیشن پاس کیا گیا تو چاروں طرف سے خالصتان زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے جبکہ کئی جگہ خالصتان کے جھنڈے بھی لہرائے گئے۔

سربت خالصہ کے خاتمہ کے بعد ۲ رنومبر کو اکال تخت کے جتھیدار کرپال سنگھ نے ایک پریس بیان جاری کر کے اسے سربت خالصہ میں منظور کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ سوائے دربار صاحب کے جتھیدار کے اور کسی کو سربت خالصہ بلانے کا حق نہیں جب کہ پنتھک کمیٹی کا کہنا ہے کہ ۲۶ رجنوری کے سربت خالصہ نے کمیٹی کے ممبر گوربچن سنگھ مانوچاہل کو کرپال سنگھ کی جگہ دربار صاحب کا جتھیدار بنا دیا گیا تھا۔

دوسری طرف ۲ رنومبر کو ہی سرجیت سنگھ برنالہ نے کیبنٹ میٹنگ بلا کر یکم نومبر کے سربت خالصہ کے بارے میں متفقہ طور پر پاس کیے گئے ریزلیوشن میں کہا کہ وزارت ایسے خالصتان کے حمایتیوں اور انتہا پسندوں کی طرف سے دربار صاحب جیسی معظم جگہ میں میٹنگ کرنے والوں کی پُرزور مذمت کرتی ہے جو غیر ملکی طاقتوں کی طرف سے ملکی سالمیت اور قومی یک جہتی کے لیے خطرہ پیدا کر رہے ہیں۔ کوئی بھی وطن پرست ہندوستانی صوبہ و ملک کے خلاف کارروائی برداشت نہیں کر سکتا۔ وزارت اپنے اس



عزم کے تئیں وفادار ہے کہ توڑ پھوڑ، انتہا پسندانہ و قومی یک جہتی کو ختم کرنے والی طاقتوں کے خلاف بنیادی، نظریاتی، سیاسی و انتظامی محاذوں پر جنگ جاری رکھی جائے گی۔ وزارت نے سبھی مذاہب اور سیاسی پارٹیوں کے لوگوں سے امن پسند و وطن پرست طاقتوں کا ساتھ دینے کی اپیل کی۔

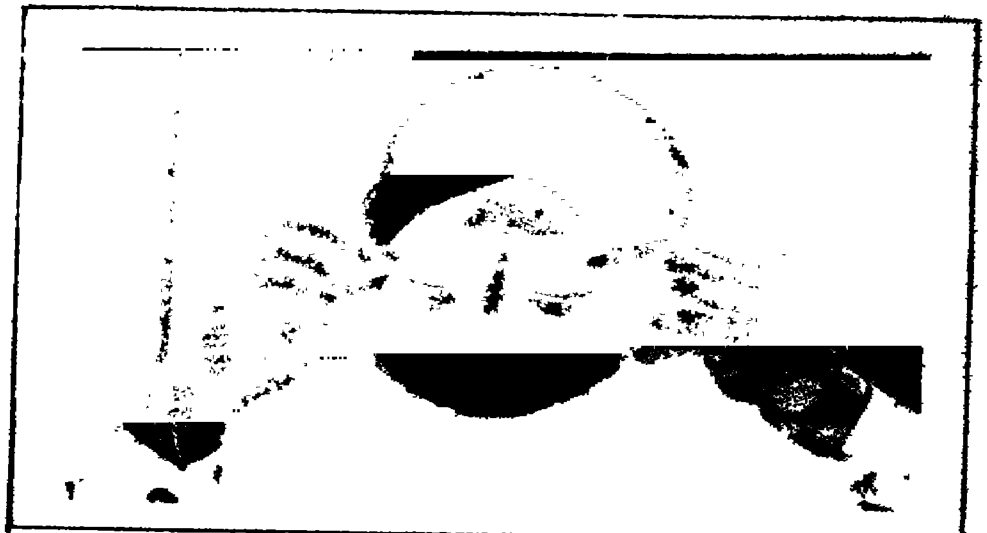
۴ رنومبر کو سکھ محافظ دل کے نام سے قائم کی گئی۔ اس نئی تنظیم کے جنرل سکریٹری ترلوچن سنگھ نے اکال تخت کے جتھیدار گیانی کرپال سنگھ کو چیلنج کیا کہ اگر انھیں دیوان کے دن یکم نومبر کو دربار صاحب میں ہوا سربت خالصہ منظور نہیں تو وہ خود اکال تخت پر سربت خالصہ بلا کر دکھائیں۔ ترلوچن سنگھ نے وزیراعلیٰ برنالہ کو بھی چیلنج کیا ہے کہ وہ دربار صاحب کے منجی صاحب دیوان ہال میں کوئی میٹنگ کر کے دکھائیں۔

ترلوچن سنگھ نے سربت خالصہ کے بارے میں گیانی کرپال سنگھ کے بیان اور پنجاب وزارت کے ریزولیوشن پر سخت اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ گیانی کرپال سنگھ اکال تخت کے جتھیدار نہیں ہیں کیوں کہ جب سے سرکاری طور پر بتایا گیا ہے کہ اکال تخت گرا دیا گیا ہے، وہ اکال تخت سے متعلق کسی تقریب میں شامل نہیں ہوئے۔ دربار صاحب کے مین گیٹ پر لگے کئی بورڈوں پر اب بھی بھائی گوردیو سنگھ جتھیدار اکال تخت لکھا ہوا ہے۔ گیانی کرپال سنگھ ایسے بورڈوں کو اتروانے کی ہمت بھی نہیں کر پاتے نیز وزیراعلیٰ اور اکالی دل کے صدر سرجیت سنگھ برنالہ دربار صاحب میں اپنی پارٹی کی میٹنگ نہیں کر سکتے اس لیے وہ اپنی پارٹی کا دفتر چنڈی گڑھ لے گئے ہیں ایسی حالت میں سربت خالصہ سے متعلق ان کے بیانات بے معنی ہیں۔

۴ نومبر کو ہی دربار صاحب میں پنجابی میں شائع شدہ ایک پوسٹر کئی جگہ چسپاں دیکھا گیا، جس میں سکھ نوجوانوں کو خالصتان پولیس فورس میں بھرتی ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ ہر سکھ خاندان سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ کم از کم خاندان کے ایک آدمی کو اس فورس میں بھرتی کرائے تاکہ جھوٹے پولیس مقابلوں میں مارے جا رہے سکھ نوجوانوں کا بدلہ لیا جا سکے۔ یہ اشتہار سجیت سنگھ اور بابچیہ سنگھ کے نام پر لاہور سے شائع ہو کر آیا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ۱۷ رنومبر کو شری ہرگوبند پور صاحب میں ایک پاٹھ رکھا جائے گا

دل چسپ بات یہ ہے کہ خالصتان پولیس فورس کے ڈائرکٹر جنرل کی، دو ڈپٹی جنرل انسپکٹر اور چار ڈی ایس پی کی آسامیاں پُر کی جا چکی ہیں بھرتی چاہے امرتسر اور گورداسپور ضلعوں کے لیے اعلان کی گئی ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ کہاں ہوگی۔ پوسٹر میں سی۔آر۔پی۔ایف اور بی۔ایس۔ایف کو وارننگ دی





[illegible] جیسا مسکو نوجوانوں کو عورتے مظلوموں [illegible] جاتا ہے اسی طرح ان کے بچوں سے بھی سلوک کیا جائے گا۔ جو لوگ اس پولیس فورس میں بھرتی [illegible] ہاتھوں سے بدلہ لینے کا حلف لے لیا ہے۔

سوال گھوم پھر کر یہیں آجاتا ہے کہ آخر بدلہ لینے کا یہ احمقانہ رجحان کب تک [illegible] پرانے تہذیب وتمدن کی جڑوں کو کھوکھلا کرتا رہے گا؟ کتنی عجیب بات ہے کہ قصور کوئی کرے، سزا کوئی بھگتے۔ اور سزا بھی بھیانک موت کی شکل میں آج تک دنیا کی کسی عدالت نے ایسا فیصلہ نہیں دیا کہ قتل بیٹے نے کیا ہو اور اس کے فرار ہونے کی صورت میں پھانسی مجرم کے باپ، بھائی، بیٹے، بیوی یا ماں کو دی جائے۔ آخر ہم تباہی کے دہانے تک کیوں کر پہنچے۔ اس پر گہرائی اور ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا۔

سو سال کی طویل جدوجہد کے بعد جب انگریزوں نے سمجھ لیا کہ اب انہیں ہندوستان چھوڑ کر جانا ہی ہوگا تو انھوں نے مذہب اور علاقائیت کی بنیاد پر ہندوستانی قوم میں فرقہ پرستی کو ابھارنا شروع کر دیا۔ کچھ راجاؤں، مہاراجاؤں کو اپنی ریاستیں آزادانہ طور پر قایم رکھنے کے لیے اکسایا تاکہ یہاں انارکی پیدا ہونے کا بہانہ بنا کر ہندوستان کو غلام بنا کر رکھا جا سکے۔ جب ان کی یہ چال کامیاب نہیں ہوئی تو انھوں نے محمد علی جناح کو ہاتھ میں لے کر پاکستان کا شوشہ کھڑا کر دیا۔ ہمارے قومی رہنماؤں نے بہت کوشش کی کہ ملک کا بٹوارہ نہ ہو لیکن ہندو اور مسلمان میں نفرت کی ایسی دیوار کھڑی کی گئی کہ نہ صرف ملک کا بٹوارہ ہوا بلکہ مذہبی جنون نے لاکھوں بے گناہوں کی جان لے لی۔ لوگ گھروں سے بے گھر ہو گئے۔ کروڑوں کی جائیداد جلا دی گئی۔ جب یہ بھیانک طوفان رکا تو دونوں طرف کے محنت کش عوام نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ دونوں ملکوں نے اپنے طور پر حکومتی ڈھانچے وضع کرکے اپنا اپنا کام شروع کر دیا۔ برٹش سامراج نے دونوں نئے آزاد ملکوں کو کامن ویلتھ کا ممبر بنا لیا تاکہ کسی بھی انداز میں ان پر اپنی بالادستی قایم رکھی جاسکے۔

ہندوستان نے جہاں آزادی کے بعد جمہوریت اور سیکولرازم کا راستہ اختیار کیا، وہاں پاکستان نے اسلامی جمہوریت کے نام پر مذہب کو اوّلیت دی۔ ادھر بابا صاحب امبیدکر کی رہنمائی میں جہاں جمہوری آئین تیار کرکے ۱۹۵۲ء میں پہلے عام انتخابات کرائے گئے۔ وہاں پاکستان میں اندرونی طور پر اقتدار کی جنگ تیز ہو گئی جس کا نتیجہ ایک ایسی فوجی ڈکٹیٹرشپ میں سامنے آیا جو ابھی تک ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ وہاں پہلے مسٹر بھٹو کو پھانسی دی گئی اور اب بے نظیر کی جان کے درپے ہیں۔ گو کہ آزادی کے فوراً بعد سامراجی طاقتوں نے ہندوستان میں بھی فرقہ پرستی کو ابھار کر مہاتما گاندھی کو قتل کروا کر ہندوستان میں عدم استحکام پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پنڈت جواہرلال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، کرشنا مینن جیسی دوراندیش لیڈرشپ نے یہاں استحکام بنائے رکھا۔ ہم نے ملکی ترقی کے لیے منصوبہ بند معیشت کا راستہ اپنایا۔ یہاں بھاکڑہ جیسے عظیم باندھ اور بڑے بڑے کارخانے لگانے کے لیے جب سامراجی طاقتوں سے مدد مانگی تو انھوں نے ہماری مدد تو کی لیکن مشروط۔ تبھی وقت نے ایک کروٹ لی پنڈت جواہرلال نہرو، مارشل ٹیٹو (یوگوسلاویہ)، جمال عبدالناصر (مصر) ان تین ہستیوں نے مل کر دنیا کو ایک نئی راہ دکھائی غیر وابستگی کی۔ یعنی دونوں بڑی طاقتوں روس اور امریکہ کے فوجی گٹھ جوڑوں سے الگ رہنے کی۔ سبھی نئے آزاد ممالک اس نئی تحریک سے بہت متاثر ہوئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سبھی ملک اس تحریک میں شامل ہو گئے۔

تینوں سربراہوں نے غیروابستہ تحریک کے لیے جو اصول وضع کیے۔ ان میں قوموں کے لیے حق خودارادیت، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت اور ہر قیمت پر امن عالم کو فروغ دینے اور اس کے لیے لگاتار کوشش کرنے، اقتصادی اور معاشی معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرنے جیسے سنہرے اصول شامل تھے۔ سوویت روس نے جہاں ان اصولوں کی مکمل حمایت کی وہاں امریکہ اور دیگر سامراجی ممالک نے زبانی طور پر اس کی حمایت کی اور عملی طور پر اس کی کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ ہند سے خطرہ کا بہانہ بنا کر ہمارے ہمسایہ ملک پاکستان کو ہتھیار سپلائی کرنے شروع کر دیے۔ کشمیر کے معاملے میں اقوام متحدہ سے پاکستان کی حمایت کی [illegible]



پنالی۔ ہندو فرقہ پرستی کو شہ دے کر ہمارے ملک
میں ہندو مسلم فسادات کی لاتعداد کوششیں کیں۔
اسی دوران جہاں پاکستان ریڈیو کے ذریعہ ہندوستان
کی اقلیتوں پر ظلم و جبر کا واویلا کیا جاتا رہا وہاں ۱۹۶۲ء
کے اسمبلی انتخابات کے بعد پنجاب میں متحدہ محاذ کی
گورنام سنگھ وزارت کے ٹوٹنے کے بعد بنی لچھمن گل
وزارت کے وزیر خزانہ جگجیت سنگھ چوہان کو امریکی
سامراجیوں نے پاکستان کے ذریعہ اپنا پٹھو بنانے
میں کامیابی حاصل کر لی۔ گل وزارت کے ٹوٹتے ہی
چوہان امریکا بھاگ گیا۔ امریکہ برطانیہ اور کینیڈا
کی شہ پر اس نے وہاں خالصتان کا شوشہ چھوڑا،
جسے ہندوستان میں کوئی حمایت حاصل نہیں ہوئی
حالاں کہ دربار صاحب میں ریڈیو ٹرانسمیٹر نصب کرنے
خالصتانی فوج بنانے نیز اسی طرح کی بہت سی حرکتیں
کر چکا تھا۔ اسی دوران دو اہم واقعات رونما ہوئے جن
پر روشنی ڈالنا بہت ضروری ہے۔
ایک ۱۹۷۱ء میں ہند۔ پاک جنگ، جس
میں بنگلہ دیش ایک الگ ملک بن گیا۔
دوسرا واقعہ تھا چنڈی گڑھ میں چیف خالصہ
دیوان کی طرف سے پنجابی کے نام پر ایک کانفرنس
کا ہونا جس میں امریکی کرو ڑ پتی گنگا سنگھ ڈھلوں
نے سکھوں کے لیے الگ آزاد اسٹیٹ کا نعرہ دیا
تھا۔ درحقیقت اس کانفرنس کا اہتمام بھی امریکہ کی
بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی سی۔ آئی۔ اے نے کرایا تھا۔
بعد میں چیف خالصہ دیوان نے اس کانفرنس سے
اپنی لاتعلقی کا اظہار کر دیا تھا۔
قابل غور بات یہ ہے کہ ہند۔ پاک دونوں

معاہدہ پر ۹ اگست ۱۹۷۱ء کو دستخط ہوئے تھے۔ تبھی
سے ایک جانب امریکہ نے ہندوستان سے پنجاب
کو الگ کرنے کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے
لیے در پردہ کوششیں شروع کر دیں اور ان کے لیے
پنجاب میں ایسے لوگ ڈھونڈ نکالے جو مذہب کے
نام پر یہاں منافرت پھیلانے اور اپنا دائرہ بڑھانے
کے کام میں مصروف ہیں۔ وہاں دوسری جانب
بنگلا دیش کا بدلہ لینے کے لیے پاکستان نے اسمگلروں
کے ذریعہ یہاں ہتھیار بھیجنے شروع کر دیے ہیں۔
بلیو اسٹار آپریشن اور اس کے بعد ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ہونے
شریمتی اندرا گاندھی کے قتل اور اس کے بعد دہلی،
کانپور و دیگر بڑے شہروں میں ہوئے سکھ مخالف
دنگوں کا اس پس منظر میں جائزہ لیں تو واقعات
کی تہہ تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوگی۔
اب آئیے ذرا سنجیدگی سے اس بات پر غور
کریں کہ ہندوستان میں اگر خالصتان بن بھی
جائے تو اس کی سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی پوزیشن
کیا ہوگی؟۔ اس سلسلے میں اپنی رائے زنی کی چنداں
ضرورت نہیں۔
حال ہی میں سکھ معاملات کو گہرائی سے
پرکھنے والے پنجاب کے ایک صحافی ہربیر سنگھ بھنور
نے پنجابی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا
نام ہے "کیا خالصتان بنے گا؟"۔ موصوف پی۔ ٹی
آئی، یو۔ این۔ آئی، انڈین ایکسپریس کے اسٹاف
رپورٹر رہنے کے بعد آج کل چنڈی گڑھ کے روزنامہ
ٹریبون اور انٹرنیشنل نیوز ایجنسی بی۔ بی۔ سی لندن
سے منسلک ہیں اور ۱۹۷۸ء سے امرتسر میں مقیم ہیں
جنھوں نے سبھی واقعات کا بغور جائزہ لیا ہے۔ ہم
یہاں انھیں کی کتاب کے چند اقتباسات پیش
کر رہے ہیں۔
فرض کر لیجیے اگر موجودہ پنجاب ہی خالصتان
بن جاتا ہے تو یہ مجوزہ ملک ڈیفنس کے لحاظ سے سبھی
اطراف سے ننگا ہوگا جیسا کہ ہند، پاکستان، بنگلہ دیش
کے شمال کی طرف ہمالیہ پہاڑ ہے اور جنوب کی طرف
سمندر ہے جو ڈیفنس کے اعتبار سے بہت اہم ہیں
وہ اس مجوزہ ملک کے پاس نہیں ہوں گے اس لیے
اس چھوٹے سے ملک کو چاروں طرف ڈیفنس کے
انتظامات کرنے ہوں گے۔
موجودہ پنجاب کے پاس لوہا، کوئلہ نیز

ہیں۔ ایسی تمام دھاتوں کے لیے اسے دوسرے ممالک پر
انحصار کرنا ہوگا۔ یہاں تک کہ پنجاب کے پاس تو عمارتی
یا دیگر ضرورتوں کے لیے لکڑی کے جنگل بھی نہیں ہیں۔
یہ بھی وہ ہماچل یا جموں و کشمیر سے حاصل کریں گے
نمک، ہلدی اور دیگر مصالحے بھی پنجاب میں دوسرے
صوبوں سے آتے ہیں۔ انھیں اکیلے زرعی پیداوار پر
غرور نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اس معاملے میں اب
دوسرے صوبے بھی خود کفالت کی طرف بڑھتے جا
رہے ہیں
کسی بھی ملک کے لیے سمندری تجارتی
بندرگاہ کا ہونا ضروری ہے جو یہاں ایک بھی نہیں
بلکہ ہوائی اڑانوں کے لیے بھی انھیں ہندو پاک کا ہی
سہارا لینا پڑے گا۔
سیاسی طور پر خالصتان کی باگ ڈور چاہے
سکھوں کے ہاتھ میں ہو، لیکن کیا وہ حکومت کرنے
کے قابل ہوں گے؟۔ کیوں کہ صوبہ پنجاب بننے کے
بعد پانچ مرتبہ اقتدار ملنے کے باوجود وہ ایک بار بھی
پانچ سال کی مدت پوری نہ کر پائے اور ہمیشہ باہمی
رسہ کشی کے شکار رہے، جیسا کہ موجودہ حالات
شاہد ہیں۔
اگر خالصتان بن گیا تو پاکستان کی طرح
ہزاروں گوردوارے پنجاب سے باہر رہ جائیں
گے جن کی زیارت کے لیے ترسنا ہی ہوگا۔
پاکستان، جس کا وجود خود ہی پُرخطر ہے
وہ خالصتان کی کیا مدد کر سکے گا؟
ان حالات میں خالصتان خود سکھوں کے
لیے وبال جان بن جائے گا۔ کیا دوسرے صوبوں کے
سبھی سکھ جو کافی امیر اور دولت مند و جائیداد کے
مالک ہیں جن کے وہاں بڑے بڑے کاروبار ہیں، پنجاب
آنا پسند کریں گے؟ ظاہر ہے یہ ناممکن ہے
سکھ دھرم میں ذات پات کا سوال نہیں لیکن اس
بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اکالی دل
پر جاٹوں کا غلبہ ہے جو معمولی سی بات پر
کا اپنے کھیتوں میں جانا بند کر دیتے ہیں
بغاوت نہیں کریں گے؟۔
ان حالات میں سکھوں کو چاہیے
خالصتان کا نعرہ ختم کر کے آنند پور ریزولیوشن
عمل کرا کے صوبہ کے لیے زیادہ سے زیادہ
راہ ہموار کریں۔

مسٹر ہرچرن سنگھ بھنوری کی کتاب کے اقتباسات
سے ظاہر ہے کہ اگر خالصتان بن بھی جائے تو
[illegible] وسائل نہ ہونے کی وجہ سے یہ
[illegible] تک قائم نہیں رہ سکتا۔ تو پھر ایسے
[illegible] دشمن طاقتوں کے فریب میں آکر
کیوں اس سرسبز و شاداب خطے کو تباہ و برباد کرنے
کے درپے ہیں؟۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے
کہ وطن دوست طاقتیں انھیں تلخ حقائق کا احساس
دلانے میں ناکام رہی ہیں۔ لہٰذا قصوروار نوجوانوں
ہی کا نہیں بلکہ ان سیاست دانوں کا بھی ہے جو اپنے
اقتدار اور ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے انھیں
بھڑکاتے رہے ہیں۔

حیران کن بات تو یہ ہے کہ گزشتہ چار پانچ
برسوں سے پنجاب میں جو نام نہاد لٹریچر و رسائل کی
اتنی بھرمار ہے نیز وہ قومیت کی بنیاد پر سادہ لوح
سکھوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ آئے دن ایسے
مضامین شائع ہوتے ہیں جو پنجاب کے نوجوان
سکھوں کے ذہن کو تو پراگندہ کرتے ہی ہیں پنجاب
سے باہر رہنے والے سکھوں کے لیے بھی مصائب
و آلام کی راہ کھول رہے ہیں۔

سنت بھنڈراں والے کے متعلق بہت سی
افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں۔ ایک رسالے نے تو پہلے
صفحہ پر اس کی تصویر شائع کی ہے اور دعویٰ کیا
ہے کہ سنت جی پاکستان میں زندہ و صحیح سلامت
موجود ہیں، مگر ارباب حکومت خاموش تماشائی
بنے ہوئے ہیں اور سنجیدگی سے اس کا کوئی نوٹس
[illegible] رہے ہیں۔

اسی طرح ہندو شیو سینا، ہندو سرکشا سمیتی
[illegible] نئی ایجاد شدہ سمیتیاں زہر کے بیج
کیوں [illegible] رہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارا سیکولرازم
[illegible] کر رہ گیا ہے۔ چاہے ہندو ہو یا
[illegible] حمام میں ننگے ہیں۔

[illegible] وزیر اعلیٰ سرجیت سنگھ برنالہ
[illegible] بے گناہ لوگوں کو آزاد کرانے اور فوجی
[illegible] بحال کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔
[illegible] نوجوانوں کو اقتدار میں حصہ دار
[illegible] ستان سے آنے والوں کے لیے خاص
[illegible] منتخب کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنی
[illegible] پر سنجیدگی سے غور کر سکیں اور یکسو
[illegible] و قوم کے لیے اپنے اندر ہمدردی اور نیک
[illegible] جذبہ پیدا کر سکیں۔ تحریر پرکاش سنگھ بادل

اپنے گروہ کے ساتھ وزیر اعلیٰ کو دونوں عہدوں
سے ہٹانے میں اپنی ذہنی صلاحیت صرف کرنے
میں مصروف ہیں۔

دوسری طرف پنجاب کانگریس [illegible]
کا بائیکاٹ کر کے سیاسی دکانداری چمکانا چاہتی ہے
ان حالات میں پنجاب کی الجھی ہوئی ڈور کو کون
سلجھائے گا؟۔ یہ سوچنے کا مقام ہے۔

۸ر نومبر کو چنڈی گڑھ میں نامہ نگاروں سے
بات چیت کرتے ہوئے پنجاب کے ڈائریکٹر جنرل
پولیس مسٹر جے ایف۔ روبیرو نے کہا کہ ابھی تک
پنجاب میں انتہاپسندوں سے نپٹنے میں صرف ایک
تہائی کام پورا ہوا ہے اور دو تہائی باقی ہے۔ آپ نے
کہا کہ جو لوگ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں کہ ۳ر اکتوبر کو
اپنے اوپر ہوئے حملہ کے بعد میں نے انتقاماً بے گناہ
سکھ نوجوانوں کو جھوٹے پولیس مقابلے بنا کر مارنا شروع
کر دیا ہے۔ کوئی بھی اس قسم کی مثال نہیں پیش کر سکتا
اور نہ ہی ایسے کسی ایک نوجوان کا نام ہی بتا سکتا ہے

آپ نے کہا کہ میں بین الاقوامی سرحد کا
انچارج نہیں ہوں۔ سرحدی معاملات سے نپٹنا
بارڈر سیکورٹی کا کام ہے۔ جب کہ گزشتہ سات
ماہ میں بارڈر سیکورٹی فورس نے ۲۴۹ لوگوں کو سرحد
پار کرتے ہوئے مقابلہ میں مارا ہے۔ ان میں زیادہ تر
بنگلہ دیش کے باشندے ہیں۔ آپ نے بتایا کہ سات
ماہ کے دوران ۳۰۳۵ لوگوں کو سرحد پار کرتے ہوئے
پکڑا گیا ہے، جن میں ۱۷۶ انڈین، ۵۷۰ پاکستانی،
۲۱۴۵ بنگلہ دیشی، ۱۵۶ برمی، اور ۹ دیگر ممالک کے
لوگ شامل ہیں۔ جب کہ سرحد پار کرتے ہوئے مقابلہ
آرائی میں مارے گئے لوگوں میں ۲۳ انڈین، ۵۳
پاکستانی، ۳۸ بنگلہ دیشی اور ۱۳۵ دیگر لوگ شامل
ہیں۔ ۲۳ ہندوستانیوں میں ۱۹ سکھ ہیں جن میں
۱۰ وہ بھی شامل ہیں جو ڈیرہ بابا نانک سیکٹر میں
مارے گئے تھے اور ان کے متعلق بادل اور اکالی
حکومت نے جھوٹا پولیس مقابلہ بنا کر مارنے کا
شور مچایا تھا۔

آپ نے مزید کہا کہ میرے آفیسر اور جوان
جنگ جیسے حالات سے گزر رہے ہیں، ایسی حالت
میں اگر ان پر کوئی حملہ کرتا ہے تو اس کا جواب اسی
طرح دینا ہوگا۔ آپ نے بتایا کہ انتہاپسندانہ کارروائیوں
میں ۳۰ کے قریب عورتیں بھی سرگرم ہیں۔ لیکن
ان تمام حالات کے باوجود پنجاب کی اکثریت
انتہاپسندانہ کارروائیوں کے خلاف ہے۔ اسی کے
ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا
کہ ایسے لوگوں کی تعداد اگرچہ کم ہے لیکن ان کے
حامی بھی موجود ہیں، بقیہ لوگ ان سے ڈرتے
ہیں۔ آپ نے کہا کہ سب سے پہلے انتہاپسندی
کا خاتمہ ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی سیاسی
حل ممکن ہے۔

جہاں تک سیاسی حل کا سوال ہے اس
کے لیے سبھی سیاسی پارٹیوں نے متفقہ طور پر مرکز
سے اپیل کی ہے کہ پنجاب سمجھوتہ کو جس جذبات
کے ساتھ کیا گیا تھا، فوراً لاگو کیا جائے۔ ان سبھی
پارٹیوں نے وزیر اعلیٰ سرجیت سنگھ برنالہ سے
دہلی میں اور پارلیمنٹ میں بھی اس اپیل پر
زور دیا۔ اس کے اچھے نتائج سامنے آئے ہیں۔
جیسا کہ ۱۱ر نومبر کو چنڈی گڑھ میں جنرل سندر جی
نے وزیر اعلیٰ برنالہ سے ملاقات کر کے بتایا کہ
۳۰۷۲ فوجی بھگوڑوں میں سے ۲۲۹۲ معمولی سزاؤں
کے بعد بحال کیے جا چکے ہیں جب کہ ۲۶۶ کی نظر
ثانی کی درخواستیں آرمی ہیڈ کوارٹرز کو موصول ہوئی
ہیں، جن میں ۵۷ کی سزائیں کم کر دی گئی ہیں، جن
۲۰۰ فوجیوں کو سروس سے نکال دیا گیا تھا، انھیں
ڈیفنس سیکورٹی کارپس میں لگایا گیا ہے۔ سب سے
بڑا فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ فوجی بیرکیں چھوڑنے کے
بعد جو فوجی مارے گئے تھے ان کے لواحقین کو
آرمی گروپ انشورنس کا پورا فائدہ حاصل ہوگا،
جو ساٹھ ہزار روپے فی فوجی ہوگا۔ یہ فیصلہ پنجاب
سمجھوتے کے مدنظر کیا گیا ہے۔

آپ نے مزید بتایا کہ جن فوجیوں نے مختلف
جرائم کیے ہیں ان کی رحم کی درخواستوں پر غور کرتے وقت
ان تمام جذباتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو مدنظر رکھا جائے
گا جن کی وجہ سے افسوس ناک واقعات ہوئے۔ یہ
سب کچھ اس بہادری، ایمانداری، وفاداری اور
ڈیوٹی کے تئیں ذمہ داری کو پوری طرح تسلیم کرتے
ہوئے کیا جا رہا ہے جو سکھ فوجیوں نے ہمیشہ دکھائی
ہے۔ جب کہ پنجاب مسئلہ کے متعلق وزیر اعظم
راجیو گاندھی کی مخلصانہ جدوجہد کو بھی پیش نظر
رکھا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے اس سے فوجی بھگوڑوں
کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے۔ اسی طرح جودھپور
کے نظربندوں کا بھی حل نکل جائے گا۔ لیکن کیا
ان تمام نرم رویوں کے باوجود یہ امید کی جا سکتی
ہے کہ مستقبل قریب میں پنجاب میں امن ہو جائے
گا؟



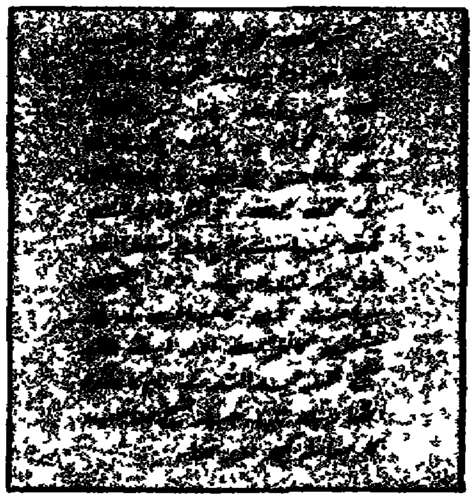
صوفی غلام محمد

# جموں و کشمیر : سیاسی دھوپ چھاؤں

جموں و کشمیر میں بدلتے موسموں کی طرح اس کی سیاست بھی قابل اعتبار نہیں۔ یہاں سیاست اتنی تیزی سے بدل رہی ہے کہ وثوق سے یہ کہنا کہ کب کیا ہوگا، بڑا مشکل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جو لوگ جس قسم کے ماحول میں رہتے ہیں اسی طرح کے اثرات ان کے خیالات اور جذبات پر بھی مرتب ہوتے رہیں۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ اپنی تمام ترکمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ریاست کے مقبول اور ہر دلعزیز لیڈر ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر فاروق کی شخصیت میں وہ مقناطیسی کشش نہیں جو ان کے والد شیخ محمد عبداللہ کا طرۂ امتیاز تھی۔ شیخ صاحب جس معاملے پر چاہے عوام کو اپنے ساتھ رکھنے کی صلاحیت اور قوت رکھتے تھے۔ کشمیری عوام کو شیخ صاحب کی ہر ادا پسند تھی۔ وہ ان کی ہر بات پر سر دھنتے تھے، خواہ یہ بات پاکستان کے خلاف ہوتی یا ہندوستان کے حق میں۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سیاست "پدرم سلطان بود" پر زندہ ہے۔ وہ اپنی سیاست کی کامیابی کے لیے نیشنل کانفرنس اور اپنے والد شیخ محمد عبداللہ کے نام کا فائدہ اٹھا رہے ہیں جبکہ شیخ صاحب کا معاملہ کچھ اور تھا۔ ان ایام میں نیشنل کانفرنس اپنی کامیابی کے لیے شیخ محمد عبداللہ کی ذات اور نام کا فائدہ اٹھا رہی تھی۔

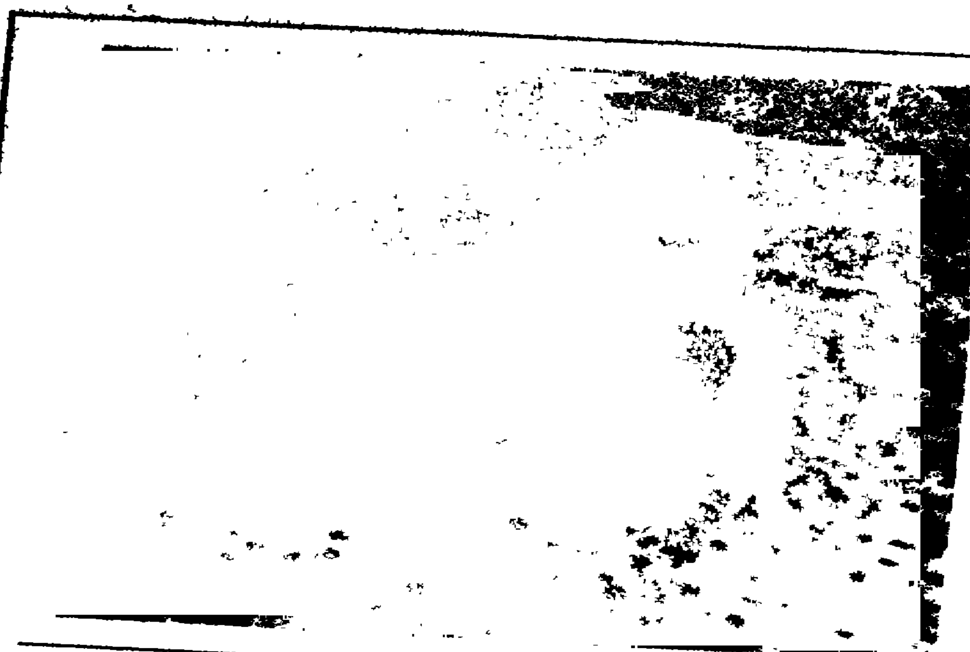
جموں و کشمیر کی سیاست اس وقت عجیب و غریب صورت حال سے دوچار ہے۔ گورنر راج چھ ماہ کی مدت ختم ہونے کے بعد اس پر صدر راج نافذ کیا گیا۔ گورنر راج اور صدر راج دونوں جمہوریت کا نعم البدل نہیں ہو سکتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گورنر راج کی طرح صدر راج بھی جمہوریت کی ضد ہے لیکن ریاستی عوام کی افتاد طبع ہی کچھ ایسی ہے کہ ہر نئی تبدیلی کا وہ خیر مقدم کرتے ہیں اور پھر یکایک اس کے خلاف احتجاج کرنے لگ جاتے ہیں۔ زیادہ دور جانے کی بات نہیں۔ ۵ جون ۱۹۸۳ء کو جب ریاست میں اسمبلی کے عام چناؤ ہوئے تو نیشنل کانفرنس کی کامیابی کو لوگوں نے اپنی کامیابی قرار دیا اور سارے کشمیر میں جشن منائے گئے، لیکن جلد ہی عوام کو محسوس ہوا کہ جس شخص اور جس پارٹی کو ووٹ دے کر انھوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا اس کے کام کرنے



کا طریقہ بچکانہ، اس کے ارادوں میں ناپختگی اور اس کے دعووں میں خلوص نہیں تھا چنانچہ خود ڈاکٹر فاروق کی پارٹی میں ان کے خلاف بے چینی اور مایوسی پیدا ہوئی جس کا فائدہ خواجہ غلام محمد شاہ نے اٹھایا جو شیخ محمد عبداللہ کی وفات کے بعد ڈاکٹر فاروق کے سیاسی حریف کے طور پر ابھر آئے تھے اور شیخ صاحب کے حقیقی جانشین ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ غلام محمد شاہ نے مرکز اور کانگریس (آئی) کی مدد سے نیشنل کانفرنس کے ۱۳ ممبران اسمبلی کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اس طرح ڈاکٹر فاروق عبداللہ اسمبلی میں اکثریت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ گورنر شری جگموہن نے مسٹر جی ایم شاہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ عوام نے جی ایم شاہ کے خلاف نفرت اور بیزاری کے جذبات کے باوجود اس نئی سیاسی تبدیلی کا خیر مقدم کیا۔ جی ایم شاہ کی وزارت بیس ماہ تک قائم رہی، لیکن اس کے وجود میں آنے سے صرف دو ماہ بعد اس کے خلاف ساری ریاست میں نفرت اور غم و غصہ پیدا ہو گیا۔ ۷ مارچ ۱۹۸۶ء کو کانگریس (آئی) نے جی ایم شاہ سے اپنا دیا ہوا اعتماد واپس لے لیا اس طرح ایک آئینی بحران پیدا ہوا اور گورنر نے ریاستی آئین کی دفعہ ۹۲ کے تحت ریاست پر گورنر راج لاگو کر دیا۔ اس اقدام کا ساری ریاست میں خوشگوار اثر پڑا۔ خود ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے بھی گورنر راج کے نفاذ کا خیر مقدم کیا۔ گورنر راج میں سب سے عمدہ کام یہ ہوا کہ تعمیر و ترقی کے کاموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ سیاحوں کی آمد میں اضافہ ہوا۔ صرف مارچ ۱۹۸۶ء سے لے کر اگست کے اختتام تک ساڑھے تین لاکھ سیاح کشمیر کی سیر کو آئے جس سے اس نقصان کی کافی حد تک تلافی ہوئی جو ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۵ء میں پنجاب کی گڑبڑ اور خود جموں و کشمیر میں بدامنی کے حالات کی وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن گورنر جگموہن نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے جو مرکزی قوانین ریاست پر لاگو کرائے اس سے عام لوگوں اور بالخصوص دانشور حلقے میں گورنر کے عزائم کے بارے میں شکوک پیدا ہو گئے۔ گورنر نے سڑکوں کو خوبصورت بنانے، پارکوں کو وسعت دینے اور اس قسم کے بہت سے کاموں کے ساتھ ساتھ قانون سازی کے اختیارات بھی اپنے ہاتھ میں لے لیے اور کچھ ایسے فیصلے کیے جو صرف عوام کی ایک منتخب حکومت ہی کرنے کی مجاز تھی۔ گورنر نے قبل از وقت کچھ سرکاری افسروں کو ریٹائر کر دیا۔ سرکاری ڈاکٹروں کی پرائیویٹ پریکٹس پر پابندی لگا دی۔ کچھ ایسے احکام جاری کیے جس سے ایک فرقے کے لوگوں کو محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں پالیٹیکنیک اور انجینیرنگ کالج میں داخلے کے لیے منتخب امیدواروں کی مثال پیش کی گئی جن میں اکثریتی اور اقلیتی فرقے کے امیدواروں کا تناسب معقول نہیں تھا۔ جنم اشٹمی کے موقع پر اعلان کروایا گیا کہ اس دن تمام ذبح خانے اور قصابوں کی دوکانیں بند رہیں گی۔ اس سے وادی میں ہیجان پیدا ہوا اور اچانک رجعت پرست عناصر کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ کوئی ایک درجن لیڈر گرفتار کیے گئے۔

افواہوں کی گرم بازاری نے صورت کو سنگین بنا دیا

ت کی گتھیں



پرست پریشانی پیدا کی جماعت اسلامی کے لیڈر گیلانی کی موت کی جھوٹی افواہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا شہر کے کئی حصوں میں تشدد آمیز مظاہرے ہوئے پولیس کی گولی سے ایک نوجوان ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے

ادھر یہ تماشا ہو رہا تھا ادھر اقتدار کی بازیابی کے لیے مرکز کے ساتھ ڈاکٹر فاروق کی بات چیت کا سلسلہ جاری تھا ڈاکٹر فاروق کے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے اسمبلی کے چودہ ممبران کے گروپ کے ساتھ کانگریس (آئی) کی طرف سے درپردہ سازشیں جاری رہیں۔ مرکزی وزیر سیاحت نے دو بار سری نگر میں واقع اپنی سرکاری کوٹھی میں ان ۱۴ ممبران اسمبلی کو ریاست کی دعوت پر بلایا اور ان کے ساتھ رازدارانہ گفتگو جاری رکھی۔ اس سارے کھیل میں معاملات کو طول دینے میں مرکز کا رویہ کانگریس (آئی)، نیشنل کانفرنس اور آزاد ممبران اسمبلی کے گروپ کے لیے پریشان کن رہا یہ گروپ جس کی قیادت سابق وزیر تعلیم علی محمد نائیک کر رہے تھے محسوس کر رہا تھا کہ ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے بلکہ ان کی بے عزتی بھی کی جا رہی ہے۔ ایک طرف انہیں کانگریس (آئی) کے ساتھ وزارت بنانے کے لیے تیار رہنے کا مشورہ دیا جا رہا تھا دوسری طرف سے ان کی آنکھوں کے سامنے ڈاکٹر فاروق کو جج کی کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے سعودی عرب بھیجا جا رہا تھا۔

کشمیر کی سیاست کا ناگفتہ بہ حال خود پرست سیاست دانوں اور طالع آزما لیڈروں کے لیے مفید ہو تو ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے سارے ملک کی بدنامی ہو رہی ہے۔ مرکز کی بے اصولی کا پردہ فاش ہو رہا ہے۔ اپوزیشن کی فتنہ سامانیاں آشکار ہو رہی ہیں اور عوام کی سیاسی ناپختگی کا اظہار ہو رہا ہے۔ کشمیر جس کو کبھی جمہوریت اور سیکولرزم کی لیبارٹری کہا جاتا تھا اب اس میں ایسی قوتیں پنپ رہی ہیں جو اس کی صدیوں پرانی بھائی چارے کی روایتوں کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہیں مرکزی لیڈر یہ کہتے کو ترک رہا ہے کہ کشمیر کی ترقی اور امن و سلامتی کے لیے قوم پرست قوتوں کا یکجا اور متحد ہونا ضروری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ قوم پرست قوتیں کیا ہیں؟ مرکز نے ابھی تک ان قوتوں کی نشاندہی نہیں کی اور نہ یہ بتایا ہے کہ قوم پرستی کی تشریح کیا ہے۔ ڈاکٹر فاروق کی حکومت کو برطرف کرنے کی ایک وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ وہ درپردہ فرقہ پرست، انتہا پسند اور علیحدگی پسند قوتوں سے ملے ہوئے ہیں لیکن اب ڈاکٹر فاروق نے کانگریس (آئی) کے ساتھ معاہدہ کر کے مل جل کے ریاست کے مسائل حل کرنے کا اپنا لائحہ عمل بنا لیا ہے۔ گورنر راج کے بعد صدر راج کے نفاذ سے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا کے فیصلے نے لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کیے ہیں۔ گورنر راج یا صدر راج ہنگامی حالات میں معاملات کو سلجھانے کا ایک عبوری انتظام ہوتا ہے۔ گورنر راج اور صدر راج جمہوریت کی بحالی اور امن و امان کی قائمی کے لیے عارضی بندوبست بھی ہوتا ہے۔ لیکن گورنر کی سفارش پر مرکزی آئین کی دفعہ ۳۵۶ کا اطلاق ظاہر کرتا ہے کہ مرکز کا ایجنٹ وہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لیتا ہے جو اس کی حدود سے باہر تھا۔ جموں و کشمیر ہائی کورٹ میں ڈاکٹروں کی پریکٹس پر پابندی کے معاملے نے کچھ ایسے آئینی مسائل کھڑے کیے ہیں جو کسی بھی وقت ریاست اور مرکز کے تعلقات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

سابق ڈپٹی چیف منسٹر شری دیوی داس ٹھاکور نے ڈاکٹروں کی طرف سے ہائی کورٹ میں دلائل پیش کرتے ہوئے ریاستی آئین کی دفعہ ۹۲ اور مرکزی آئین کی دفعہ ۳۵۶ کی تفصیل سے وضاحت اور صراحت کی۔ شری دیوی داس ٹھاکور نے کہا کہ اول تو ایک ہی ملک میں دو الگ الگ آئینوں کی موجودگی بعید از فہم بات ہے۔ دوئم اگر کسی وجہ سے دو آئینوں کا ہونا ضروری ہے تو مرکزی آئین کو ریاستی آئین پر برتری اور فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ شری ٹھاکور نے کہا کہ اس لحاظ سے گورنر کی طرف سے جاری کیے گئے تمام قانونی اور انتظامی احکامات غیر آئینی ہیں۔ کیوں کہ مرکزی آئین کی موجودگی میں ریاستی آئین کی دفعہ ۹۲ کے تحت گورنر راج لاگو نہیں ہو سکتا تھا۔

ظاہر ہے کہ جب گورنر راج کا نفاذ ہی غلط ہے تو اس کی طرف سے جاری کیے گئے تمام احکامات بھی غلط ہیں خواہ وہ انتظامی نوعیت کے ہوں یا آئینی نوعیت کے۔ بہرحال یہ سارا معاملہ جموں و کشمیر ہائی کورٹ کے سامنے ہے اور دیکھنا باقی ہے کہ شری دیوی داس ٹھاکور کی اس دلیل سے عدالت عالیہ اتفاق کرتی ہے یا نہیں۔

اب جو ڈاکٹر فاروق عبداللہ کانگریس (آئی) کے ساتھ مل کر ایک مخلوط وزارت تشکیل دے چکے ہیں فوری ہے کہ اس نئی صورت حال سے کشمیری عوام بڑی بڑی توقعات وابستہ کریں گے۔ سب سے زیادہ امید افزا فضا تو اس بات سے ہی پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک آئینی اور سراسر جمہوری نظام ریاست میں برسر اقتدار آگیا ہے مخلوط وزارت کے پیش نظر جو اہم مقاصد ہیں ان میں قابل ذکر یہ ہیں کہ جمہوری اور سیکولر اقدار کے استحکام کی بدولت قوم دشمن اور رجعت پسند عناصر کا مقابلہ کیا جائے اور ریاست میں قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کی فضا پیدا کی جائے کیونکہ یہی فضا وہ بنیادی ضرورت ہے جس پر ریاست کی سماجی اور معاشی ترقی کا دارومدار ہے۔ مخلوط وزارت کو ایک تجربہ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ لیکن اگر ارادے نیک اور مقاصد صالح ہیں تو تجربہ کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔ دنیا امید پر قائم ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

آرمل جے شرما

# سیاسی مصلحت

حزب مخالف کی صف کے دو نمایاں پرجوش اور سرگرم سربراہوں یعنی فاروق عبداللہ اور شرد پوار کے کانگریس (آئی) کی صف میں آملنے کے بعد اپوزیشن کے رنگ ڈھنگ اب بدلنے لگے ہیں۔ آج کے ابلاغ عامہ کے ذرائع کی وسیع سرگرمیوں کی بنا پر ہندوستان کے اندرونی دور دراز علاقوں میں بھی سیاسی بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ راجیو اور فاروق کے درمیان حالیہ اتحاد نے کافی بحثوں اور چہ میگوئیوں کو جنم دیا ہے۔ جیسا کہ قیاس آرائی کرنے والوں کی عادت ہوا کرتی ہے، وہ ہمیشہ ہی اصل سے زیادہ بین السطور میں پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فاروق عبداللہ پر ریاست کے مفادات کا سودا کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے جبکہ کانگریس (آئی)، پر بھی یہ الزام ہے کہ ریاست میں مختلف حکومتوں کو لٹنے میں اصلاً یہی پارٹی ڈور ہلاتی رہی ہے

پہلے جن عناصر نے ایک "قوم دشمن" کی طرف سے "سودے بازی" پر حلق پھاڑ پھاڑ کر شور مچایا تھا، وہی اب راجیو گاندھی کے حق میں، جب وہ اپنے ساتھیوں کی مدد اور حوصلہ افزائی کے لیے دورہ پر آئے تھے، نعرے لگا کر آسمان سر پہ اٹھائے ہوئے تھے۔ عوام کی یادداشت کمزور واقع ہوئی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کانگریس (آئی) کے بے اعتبار تلوّن پسندی کو فراموش کر دیا گیا ہے۔

کیا یہ راجیو گاندھی کا کوئی کرشمہ ہے جو سب کو سحر زدہ کیے ہوئے ہے یا اعلیٰ قیادت اور حکومت کی سطح پر کوئی انقلابی تبدیلی عمل میں آگئی ہے؟ یا پھر یہ محض سمجھوتہ اور لین دین کی سیاست ہے؟

بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اندرونی اختلافات اور شخصی مفادات کو بلند تر قومی مفادات کے مقابلے میں پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ کیا حقیقت میں سیاسی تبدیلی ہے؟ یہ سوال قابل غور ہے۔ باوجودیکہ اعلیٰ سطح پر لیڈروں نے اتحاد کر لیا ہے۔ اس کے لیے ایک عرصہ درکار ہوگا۔

ماضی قریب کی بات ہے کہ شرد پوار اور ڈاکٹر فاروق دونوں ہی اپوزیشن کے ہر جلسے میں شریک ہو کر شانہ بشانہ [illegible] کے ساتھ اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ کانگریس (آئی) کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مضبوط اپوزیشن تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

اب وہ اپنے اس موقف سے لغزیدہ ہو گئے ہیں اور یہ رویہ انھوں نے وسیع تر قومی مفاد کے پیش نظر اختیار کیا ہے یا تنگدلانہ سیاسی مفادات کے لیے؟ اس کا فیصلہ وقت ہی کرے گا یا اس کا سبب کہیں یہ تو نہیں کہ ہوا کے رخ پر ہوا کے زور سے اونچائی پر چڑھنا اس کے مخالف رخ کے مقابلے میں زیادہ آسان ہوتا ہے؟

لیکن اگر ہندوستانی سیاسیات کی گذشتہ تاریخ کو دیکھا جائے تو ظاہر ہے کہ ہندوستانی سیاسیات میں ذہنی تلون اور مصلحت اندیشی بلاشک بہبود عامہ کی بجائے ذاتی مفادات کے تحت ہی صورت پذیر ہوتے رہے ہیں۔ قومی مفاد اور بہبود عامہ اس سیاسیات سے بے تعلق ہو گئے ہیں۔ یہ سیاسیات لاکھوں عوام کی خدمت کے آلہ کار کی بجائے منافع کا کاروبار بن گئی ہے۔ بھلا ہو ہمارے عوام کی بے پناہ صلاحیت کا جس کے تحت وہ سربراہوں کی طرف خوب کان دھرتے ہیں اور ان کی پیش کردہ وضاحتوں کو درست مان لیتے ہیں اور یہ وضاحتیں ان کے لیے بڑی امید افزا ہو جاتی ہیں ایسی صورت حال کی ایک مثال ہے جموں و کشمیر میں کانگریس (آئی)، اور نیشنل کانفرنس (الیف) کا حالیہ معاہدہ۔

اس سلسلے میں ہماری نامہ نگار آرمل جے شرما نے حال ہی میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور دوسرے سربراہوں کے ساتھ کشمیر میں جو انٹرویو کیے وہ درج ذیل ہیں:

جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپنی شدید مصروفیات کے باوجود ہماری نامہ نگار آرمل جے شرما سے اپنے جموں آفس میں گفتگو کے لیے وقت نکالا۔ باضابطہ انٹرویو شروع ہونے سے پہلے ڈاکٹر فاروق نے بے تکلف گفتگو کے دوران کہا:

"عوام ابھی میرے حق میں نہیں ہیں لیکن انھیں آزادانہ اور منصفانہ الیکشن کا موقع فراہم کروں گا۔ میں اس منصب پر برقرار نہیں رہوں گا، اگر وہ مجھے نہیں چاہتے .......... مگر وہ افرا تفری چاہتے ہیں تو وہ اسے اپنا سکتے ہیں۔ لیکن میرا ذہن اس معاملے میں بالکل صاف ہے کہ اصل طاقت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا فوری ارادہ یہ ہے کہ دیہی علاقوں کی طرف زیادہ توجہ دی جائے جنھیں ماضی میں نظر انداز کیا گیا ہے۔ شہری اور دیہی علاقوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے ہم نے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ مثال کے طور پر مرکز وادی کے اندرونی دور دراز علاقوں میں کام کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر سروس فراہم کرے گا، جہاں کے لوگ سردیوں میں علاحدہ کٹ کر رہ جاتے ہیں۔"

اور اب اس طویل انٹرویو کے اہم حصے ملاحظہ [illegible]

## ڈاکٹر فاروق عبداللہ

### وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر

**آرمل:** مسز اندرا گاندھی نے اس معاملے میں [illegible] دلچسپی لی تھی کہ آپ اپنے والد کے [illegible] لیکن اس کے بعد اس تعلق میں کیا نا[illegible] پیدا ہوئی کہ ۱۹۸۳ء کے انتخابات میں آپ [illegible] ان کے ساتھ اشتراک نہیں رکھا؟

**فاروق عبداللہ:** مجھے اس کا علم نہیں، میں [illegible] تعلق کبھی نہیں توڑا۔ بس کچھ ایسا [illegible] کہیں ٹوٹ گئی۔ یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ [illegible] گیا ہوئی تھی۔ میں متعین طور پر کسی [illegible] نشاندہی نہیں کر سکتا، ممکن ہے [illegible] صورت حال کا سبب بنے ہوں۔ [illegible]

جو ہم دونوں کے درمیان دوری پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے پھوٹ ڈالنے کے لیے شرارت کی یا ممکن ہے کہ مجھ سے ہی کہیں کوئی غلطی ہوئی ہو۔ بہ ہر کیف ہمارے ذاتی تعلقات ہمیشہ بے حد خوشگوار رہے۔ پارٹی کی سطح پر اختلافات تھے جنھوں نے مخصوص صورت حال پیدا کی۔

ارمل: آپ کو تو اس کا تجربہ ہے کہ کانگریس (آئی) کا فی رنگ بدلنے والی واقع ہوئی ہے۔ اس نے آپ کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے دل بدلوؤں کی حمایت کی اور اب پھر آپ کی حمایت کر رہی ہے۔ آپ کے خیال میں اس پارٹی کے ارادوں یا اس کے عمل پر کہاں تک بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟

فاروق عبداللہ: میں نے اتحاد اس طرح کے اعتماد کے ساتھ نہیں کیا ہے۔ کانگریس (آئی) مرکز میں حکمراں ہے۔ جبکہ میری ریاست کا مکمل طور پر مرکز کی مدد پر انحصار ہے۔ دونوں پارٹیوں کے درمیان گرم جوشی ہمیشہ ہی بلکہ ہندوستان کی آزادی سے پہلے سے موجود رہی ہے۔ ہمارے نظریات مشترک تھے اور ہم نے ملک کی سالمیت کے لیے ایک ہی پلیٹ فارم سے جد و جہد کی بد قسمتی سے بعد میں اختلافات کو کچھ غلط شکل دے دی گئی جس کا نتیجہ شیخ صاحب کی ۱۹۵۳ء میں گرفتاری کی صورت میں نکلا۔ رفتہ رفتہ تقریباً دو دہائیوں کے بعد ان آپسی ناخوشگواریوں کو دور کرنے کا عمل شروع ہوا۔ اب جو ہم نے اتحاد کیا ہے تو وہ اس بنا پر کہ وزیر اعظم اپنی پارٹی کے ناراض اور مایوس افراد کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے یہ بات سمجھ لی ہے کہ ہم دونوں کی متحدہ جد و جہد ملک کے لیے کہیں زیادہ مفید ہوگی۔ بمقابلہ اس کے کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا رہے تو تخریب پسند قوتیں کہیں زیادہ مضبوط ہوں گی۔ اصل میں انہیں قوتوں کو قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ ریاست ترقی کرے اور تیز رفتار سے آئندہ صدی کی طرف بڑھے۔

ارمل: آپ کو کانگریس (آئی) کے وزرا کے انتخاب کے معاملے میں آزادی دی گئی تھی، لیکن کیا آپ ریاستی کانگریس (آئی) کے برہم عناصر کو اپنے ساتھ رکھ سکیں گے یا اس کے لیے ہر مرحلے پر [illegible]

کی طرف سے قربانیہ داری کے حکم کی ضرورت ہوئی؟

فاروق عبداللہ: میرے خیال میں ایسا نہیں ہے تاہم جہاں تک کانگریس (آئی) کے معاملات کا تعلق ہے، اپنی پارٹی کے بارے میں وزیر اعظم کو ہی اصل دخل ہوگا۔ ہم دونوں کو مل کر کام کرنا ہے اور ملک کے مفاد میں بھی یہی ہے کہ ہم مل کر کام کریں۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ برسوں میں اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔

ارمل: آپ اپنے نئے ساتھیوں کو کس طرح مطمئن کریں گے؟

فاروق عبداللہ: آپ کی رائے میں میں کس طرح کر سکتا ہوں؟ آپ کس طرح چاہیں گی کہ میں انہیں مطمئن کروں؟



ارمل: ان میں سے سبھی چاہیں گے کہ وزارت میں انھیں جگہ ملے؟

فاروق عبداللہ: صرف وہی کیوں؟ میری پارٹی کے لوگ بھی وزارت میں جگہ حاصل کرنا چاہیں گے، تو کیا ان سب کو وزارت میں شامل کیا جا سکتا ہے؟ نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ لوگوں کو دوسری سطحوں پر کام کرنا ہوگا۔

ارمل: حلف برداری کے ۲۴ گھنٹوں کے اندر ہی ستمبر کو آپ نے اسمبلی کو کیا اس بنا پر تحلیل کر دیا تھا کہ آپ کے خیال میں ان لوگوں کی جانب سے جو وزرا کی کونسل میں شامل نہیں کیے جا سکے تھے گڑبڑ کا اندیشہ تھا؟

فاروق عبداللہ: میں نے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسمبلی کو تحلیل کر دوں گا تاکہ وہ خود فیصلہ کریں کہ آئندہ حکومت کس کی بنے گی۔ اگر میں نے اسمبلی تحلیل نہ کی ہوتی تو میں وعدہ خلافی کرتا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں اس کرسی پر بیٹھنا نہیں چاہتا۔ میرا بنیادی نظریہ ۲ جولائی ۱۹۸۴ کے بعد سے ہی یہ رہا ہے کہ اسمبلی توڑ دی جائے اور نئے انتخابات کرائے جائیں تاکہ عوام فیصلہ کریں۔ آخر ہماری جمہوریت تو عوام کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ خود اپنا فیصلہ کریں۔ اسمبلی توڑ کر میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔

ارمل: اعلیٰ سطح پر موجود خیر سگالی کو نچلی سطحوں تک پیدا کرنے کے سلسلے میں آپ کے سامنے کیا منصوبہ ہے تاکہ اسمبلی خوش اسلوبی کے ساتھ کام کر سکے؟

فاروق عبداللہ: بھئی اس میں تو کچھ وقت لگے گا۔ کوئی چاہے کہ ایک دن میں ایسا ہو جائے تو نہیں ہو سکتا۔ اس میں برسوں لگ سکتے ہیں۔ اس دوران رابطہ کمیٹیوں کے ذریعہ اختلافات کو سلجھانے کی کوشش کی جائے گی جو اس بات کی کوشش کریں گے کہ کم از کم رخنہ پڑے۔

ارمل: کیا یہ کولیشن حکومت سیاسی کولیشن سے آگے بڑھ کر بھی کچھ ہے؟ اگر نہیں تو اس کوشش کا حاصل؟

فاروق عبداللہ: یہ کولیشن مکمل طور پر ریاست کے عوام کے مفاد کے مطابق ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ مرکز کا مفاد ریاست کے عوام کے مفاد سے کچھ بھی الگ ہے۔ ہم دونوں ہی قومی مفاد اور اس کے ساتھ اس ریاست کے عوام کے مفاد کے پہلو سے سوچ رہے ہیں۔

ارمل: کانگریس (آئی) نے اس سے پہلے آپ کو اینٹی نیشنلسٹ کہا تھا، پھر یہ اچانک تبدیلی کیسی؟

فاروق عبداللہ: میں تو علاحدگی پسند بھی ہوں، پاکستانی بھی ہوں، خالصتانی بھی ہوں۔ سبھی کچھ ہوں؟

ارمل: اور اس کے باوجود کانگریس (آئی) نے آپ کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا؟

فاروق عبداللہ: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے یہ بات آپ لوگ کہتے ہیں، آپ کا کہنا ہے کہ میں

ارمل: لیکن یہ بات کسی صحیفے کہہ رہی۔ یہ ایک الزام ہے جو کانگریس (آئی) نے لگایا تھا۔

فاروق عبداللہ: [illegible] کی فکر نہیں کرتا یہ فیصلہ [illegible] کرے گی کہ میں کیا

ہوں، کون ہوں۔ شاید جب میں مرجاؤں اور دفن کردیا جاؤں، تب وہ مجھے نیشنلسٹ قرار دیں، اس کی میں پروا نہیں کرتا۔ میں ملک وقوم کے لیے اپنا کام جاری رکھوں گا، اپنی پوری قوت کے ساتھ، خواہ کیسی ہی دشواریاں حائل ہوں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ان سے کہیں زیادہ بدتر الزامات عاید کیے گئے تھے جو مجھ پر لگائے جارہے ہیں حالانکہ آپؐ کی ذات مبارک کے مقابلہ میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ جب آپؐ کی ذات کو ایسی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، تو اس فاروق عبداللہ کا کیا شمار ہے۔ میرے والد بھی ان ہی حالات سے گزرے۔ انھیں امریکی ایجنٹ کہا گیا، پاکستانی ایجنٹ قرار دیا گیا، لیکن آخر کار قوم پر واضح ہوگیا کہ شیخ محمد عبداللہ سرتا پا، ایک نیشنلسٹ، سیکولر اور ہندوستانی تھے۔

ارمسل :۔ آپ کے تمام اپوزیشن کے اتحادیوں نے اس سمجھوتے کی مذمت کی ہے اور اسے "غیر جمہوری اور اصولوں کے خلاف" قرار دیا ہے۔ آپ کا کوئی تبصرہ ؟۔

فاروق عبداللہ :۔ ٹھیک ہے، اس معاملہ میں ان سب کی اپنی اپنی رائیں ہیں، میں ان کے نقطۂ نظر پر انھیں برا نہیں کہتا۔ میرے خیال میں انھیں اس بات کا افسوس ہے کہ فاروق عبداللہ نے ساتھ چھوڑ دیا، لیکن میں ان سے یہ ضرور کہوں گا کہ یہ کولیشن قومی مفاد میں ہے۔

ارمسل :۔ قومی مفادات کے معاملہ میں ذاتی تنازعات کو پس پشت ڈال دینا چاہیے ؟۔

فاروق عبداللہ :۔ ہاں، قطعی طور پر !

ارمسل :۔ آپ کی وزارت میں، تمام بھاری بھرکم افراد میں سے کسی کو بھی شامل نہیں کیا گیا، کیا دانستہ ایسا کیا گیا ؟۔

فاروق عبداللہ :۔ کس طرح کے بھاری بھرکم لوگ ؟

ارمسل :۔ وہ لوگ جو آخری لمحے تک یہ سمجھ رہے تھے کہ انھیں وزارت میں شامل کیا جائے گا۔

فاروق عبداللہ :۔ واقعی ؟۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی کو ایسی امید تھی۔ کسی کو یہ علم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی توقع رکھنے کا سوال کہاں ہوتا ہے ؟ اس سے قطع نظر، اس حکومت کو چار مہینوں تک کام کرنا ہے، اس لیے میں نے ان ساتھیوں کا انتخاب کیا ہے جن کے پاس کام کا وقت ہے۔

ارمسل :۔ حقیقت میں اس سمجھوتے نے دونوں ہی پارٹیوں کی ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے کیا اس بات سے آپ کو اتفاق ہے ؟۔

فاروق عبداللہ :۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ اس کے بجائے میں کہوں گا کہ اس سے ہماری ساکھ اور بہتر ہوئی ہے۔ اب شاید ہم پہلے سے بہتر کر دکھانے کے لائق ہوں گے۔

ارمسل :۔ آپ نے کھلے عام یہ اعتراف کیا ہے کہ مرکز سے آپ کا ٹکراؤ آپ کی ایک "غلطی تھی اور یہ کہ آپ کو ٹکراؤ پر مجبور کیا گیا تھا —— کوئی تبصرہ کرنا پسند کریں گے ؟۔

فاروق عبداللہ :۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کبھی ٹکراؤ کا طریقہ اپنایا ہے۔ کبھی نہیں۔ اس بارے میں بہت ساری باتیں سامنے آئی ہیں، لیکن ان میں کوئی سچائی نہیں ہے۔

ارمسل :۔ خود اپنے موقف پر نظر ثانی آپ کے لیے اپنی استعداد اور اپنی کوتاہیوں کا اندازہ کرنے میں کس طرح مددگار بنی ؟

فاروق عبداللہ : مادام، سب سے اہم نکتہ جو آپ کو ذہن نشین رکھنا چاہیے، وہ یہ کہ ہماری یہ ریاست، ۴۷ ۱۹ء کے بعد سے کئی صدمے اٹھا چکی ہے۔ پاکستان سے ہماری تین جنگیں ہوئیں اب بھی اس علاقہ میں کافی فرقہ وارانہ سازگاری اور میل جول ہے مرکز سے ہمارے مبینہ ٹکراؤ کے رجحان کی بنا پر ہمارے عوام کو پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ یہ ریاست آگے کی طرف بڑھنے کے بجائے اور پیچھے جا پڑی ہے۔ میں رہوں یا کوئی اور، جو بھی اس منصب پہ ہوگا، دہلی میں کوئی بھی حکومت ہو، وہ اس کے لیے اہم ہوگی۔ حالات جو صورت اختیار کر رہے تھے اور فرقہ وارانہ منافرت جس انداز سے پھیل رہی تھی، وہ صورت حال سیکولر ہندوستان کے لیے تباہ کن تھی۔ ان حالات میں دو میں سے ایک کام کرسکتا تھا، یا تو اپنی لڑائی جاری رکھتا یا ملک کو بچانے کی اور اس کے لیے کچھ کرنے کی کوشش کرتا۔ اس مرحلے میں مجھ پر واضح ہوا کہ اپنی لڑائی جاری رکھ کر ملک کو محض نقصان ہی پہنچاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی سامنے آئی کہ اگر ملک تباہ ہوا تو پھر کشمیر کہاں رہے گا ؟ باقیہ ہندوستان کے بغیر جموں وکشمیر کے باقی رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے اور اس بنا پر یہ کولیشن نہایت ضروری تھا۔

ارمسل :۔ کیا یہ ایک کٹھ پتلی حکومت ہے، جو مرکز کے اشارے پر کام کرے گی ؟۔

فاروق عبداللہ :۔ ہم کسی دوسرے کے حکم پر کام نہیں کر رہے ہیں۔ ہم خود اپنے ارادہ اور مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں۔

ارمسل :۔ پھر یہ ایلچیوں کی آمد و رفت کیسی تھی ؟۔

فاروق عبداللہ :۔ کس ایلچی کو دیکھا آپ نے...... ؟۔

ارمسل :۔ راجیش پائلٹ ۔

فاروق عبداللہ :۔ وہ دوبارہ کب آئے ؟۔

ارمسل :۔ وہ پہلے دہلی گئے اور پھر اس وقت واپس آئے جب آپ حلف برداری کی رسم ادا کر چکے تھے۔

فاروق عبداللہ :۔ انھیں دہلی جانا پڑا تھا کیوں کہ پارلیمنٹ کا اجلاس جاری تھا اور وہاں انھیں سوالات کا جواب دینا تھا۔ وہ یہاں واپس آئے کیوں کہ وہ دوسرے وزرا کی حلف برداری کے وقت موجود رہنا چاہتے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سلسلے میں کسی کو اس سے زیادہ کچھ سمجھنا چاہیے۔

ارمسل :۔ کیا یہ کولیشن سے متعلق سمجھوتہ آئندہ انتخابات کے پیش نظر کیا گیا ہے ؟

فاروق عبداللہ :۔ مادام، میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ آئندہ انتخابات آزادانہ اور صاف ستھرے ہوں گے۔ اس کا فیصلہ عوام کریں گے۔ ہم نے کانگریس (آئی) سے ایک مفاہمت کی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے مقابلہ میں لڑنا اور عوام کی پریشانیوں میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔ باقی فیصلہ ہم عوام پر چھوڑتے ہیں۔ اگر وہ ہمیں ووٹ دیتے ہیں تو ہم اقتدار میں آئیں گے، اگر ووٹ نہیں دیتے تو ہم حکومت سے باہر ہوں گے بات ختم !

ارمسل :۔ اب تک تو کانگریس (آئی) سے آپ کا اتحاد قطعی ناکام ثابت ہوا ہے ؟ کیا اس مرتبہ کی یہ کوشش آخری ہوگی ؟۔

فاروق عبداللہ :۔ میرے خیال میں دہلی میں جو [illegible] قیادت پہلے سے مختلف ہے۔ صورت حال کی [illegible] کے اعتبار سے [illegible]

تبدیلی آئی ہے۔ آپ دیکھئے، شرد پوار کانگریس (آئی) میں شامل ہو رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ بہت سے ہم خیال لوگ، جن کے نزدیک ہندوستان کی اہمیت ہے، اس موقع پر سامنے آکر ان (راجیو گاندھی) کے ہاتھ مضبوط کریں گے اور اس طرح آگے بڑھیں گے۔

ارمل:- کیا ایسا ہے کہ آپ تمام فیصلے بیگم صاحبہ سے مشورہ کے بعد کرتے ہیں؟-

فاروق عبداللہ:- میں تمام اہم امور پر ان سے بات کرتا ہوں، اس کے علاوہ وہ پارٹی کی سرپرست بھی ہیں۔

ارمل:- کانگریس (آئی) کے وہی وزرا جنھوں نے آپ کی نکتہ چینی کی تھی، کس طرح وہ بحیثیت وزیر اعلیٰ آپ کی قیادت میں کام کر سکیں گے؟

فاروق عبداللہ:- یہ صورت دونوں ہی طرف ہے۔ ہماری ایک دوسرے سے لڑائی رہ چکی ہے۔ کچھ عرصہ تک ان کے لیے بھی مجھ سے ہم آہنگی پیدا کرنا مشکل ہوگی اور میرے لیے بھی ان سے مطابقت پیدا کرنا دشوار ہوگا۔

ارمل:- بنیادی طور پر لوگ بدلتے نہیں ہیں؟-

فاروق عبداللہ:- میں نہیں جانتا کہ لوگ بدلتے ہیں یا نہیں۔ البتہ ہم بدلیں گے اور کوئی شخص انسان نہیں ہو سکتا اگر وہ بدل نہ سکے۔

ارمل:- اس وقت جھکاؤ کس طرف ہے؟-

فاروق عبداللہ:- میرے خیال میں جھکاؤ بہتر رخ پر ہے۔ باقی فیصلہ وقت ہی کریگا۔

ارمل:- کیا آپ نے کانگریس (آئی) سے مفاہمت کرتے ہوئے اپنے سیاسی حلیفوں سے مشورہ کیا تھا؟-

فاروق عبداللہ:- میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی پارٹی سے کافی تفصیل کے ساتھ صلاح و مشورہ کیا تھا۔ یہ محض ان کا وزیر اعظم کا اور میرا فیصلہ نہیں تھا۔

ارمل:- اور یہ بیان کہ ان سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا؟

فاروق عبداللہ:- میرے خیال میں یہ پریس کا گھڑا ہوا بیان ہے۔

ارمل:- کوئی بنیاد تو ہوگی؟-

فاروق عبداللہ:- افواہیں ہیں اور میں ہر وقت ان

کہتے ہیں؟-

فاروق عبداللہ:- مجھے ان سے کوئی بیر نہیں ہے، پریس کو پوری آزادی ہے۔

ارمل:- کانگریس (آئی) کے ساتھ کیا کوئی انضمام ہو رہا ہے؟-

فاروق عبداللہ: کیا ایسا ہے؟-

ارمل:- ایسا لگتا تو ہے؟

فاروق عبداللہ:- لگتا تو بہت کچھ ہے، لیکن مجھے علم نہیں۔

ارمل: ابھی تک ایسا ہے نہیں یا فی الوقت اس سلسلہ میں آپ کچھ کہنا نہیں چاہتے؟-

فاروق عبداللہ:- میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس وقت کسی معاملہ پر کوئی قطعی بات کہہ سکتا ہے۔ وقت ہی فیصلہ کرے گا۔

# غلام محمد شاہ

## سابق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر

ارمل:- اس کولیشن حکومت کے تعلق سے آپ کا ردعمل کیا ہے؟

جی ایم شاہ:- واحد مقصد اقتدار....

ارمل:- دونوں چاہتے ہیں اقتدار؟-

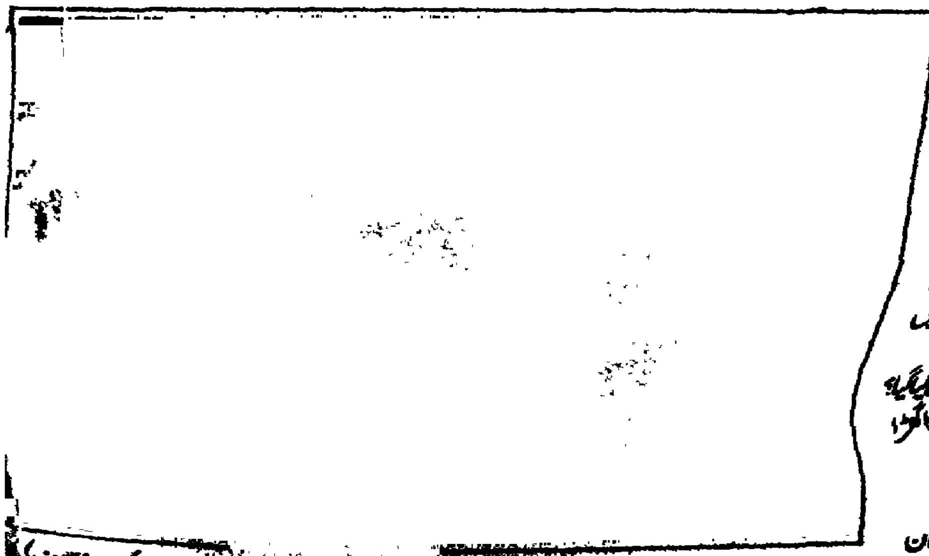
جی ایم شاہ:- اس لیے کہ راجیو نے ۹ مارچ کو ہم سے کہا تھا کہ آپ دو افراد کو، ایک جموں سے، ایک کشمیر سے، ساتھ لیں اور کولیشن بنالیں۔ میں نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا۔ پہلے تو انھوں نے میری پارٹی یعنی نیشنل کانفرنس (خ) کو کانگریس (آئی) میں ضم کرنے کی تجویز رکھی۔ میں نے کہا کہ یہ کم از کم میرے جیتے جی تو نہیں ہو سکتا۔

ارمل:- آپ اولاً کانگریس (آئی) کی مدد سے کام کرنے پر رضامند ہی کیوں ہوئے؟-

جی ایم شاہ:- کون؟ میں؟ اس لیے کہ ہر شخص کو حکومت کو بدلنے کا جمہوری حق حاصل ہے۔ میرے پاس نیشنل کانفرنس (خ) کے ۱۲، ۱۰ افراد تھے اور کانگریس نے بھی میری حمایت کی اور میں نے قبول کرلی۔ یہ تو سیدھا سا حساب ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ارمل:- یہ اگر ایسا ہی سیدھا حساب تھا تو یہ غلط کیوں نکلا؟

جی ایم شاہ:- اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ۱۹۸۹ء کے الیکشن تک کسی انضمام یا کولیشن کے لیے نہیں کہا جائے گا اور کہا تھا کہ "بس اپنا کام کیجیے اور عوام کی خدمت کیجیے۔" میرے اور



بات چیت کریں گے۔ یہ تقاضہ بھی تھا جس کی بنیاد پر انھوں نے کانگریس (آئی) کی حمایت قبول کرلی۔ پھر اس طرح کی خبریں بھی آئیں کہ فاروق کشمیر کو تباہ کر رہے ہیں، اور "[illegible]" اور خالصتانیوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مجھ تک یہ اطلاع بھی پہونچی کہ کشمیر میں آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے کیمپ قائم ہیں اور ان کا ارادہ ریاست میں پُر تشدد قسم کی تحریک چلانے کا ہے اور فاروق ان کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس طرح کی باتیں بھی سامنے آئیں کہ انھوں نے بھنڈراں والے اور لونگووال سے ملاقات کی تھی۔ ان تمام باتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے میں آگے بڑھا۔ ورنہ وزیر اعلیٰ کے عہدے کے لیے تو شیخ صاحب کی زندگی میں بھی تین مرتبہ مجھے پیش کش ہو چکی تھی۔ لیکن میں نے کہا کہ نہیں، مجھے اس سے دل چسپی نہیں ہے شیخ صاحب کے بعد میں ریاست سے علاحدہ ہو جاؤں گا۔

ارل :- کیا آپ کو فاروق کے خلاف استعمال کیا گیا تھا؟ یا ان سے اتحاد کرنے کا آپ کا ذاتی فیصلہ تھا؟

جی ایم شاہ۔ یہ میرا ذاتی فیصلہ تھا۔

ارل :- اگر لوگ آپ کی حکومت سے خوش تھے تو کیا ریاست کی بہبود کے لیے آگے بڑھنے کا کوئی درمیانی راستہ نہیں تھا؟

جی ایم شاہ :- ان کا اصرار تھا کہ یا تو میری پارٹی ختم ہو جائے یا پھر کولیشن حکومت ہو۔ ایسی صورت میں میں کیا کر سکتا تھا۔ بصورت دیگر یہ کہا گیا کہ کانگریس (آئی) اسمبلی میں اپنی حمایت واپس لے لے گی اور انتظامیہ میں روڑے ڈالے گی۔

ارل :- کیا آپ کا آئندہ الیکشن لڑنے کا ارادہ ہے؟

جی ایم شاہ۔ دیکھئے، میری پارٹی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ الیکشن لڑے گی۔

ارل :- کیا آپ فاروق سے براہ راست ٹکر لیں گے؟

جی ایم شاہ :- صاف طور پر ایسا ہوگا، کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔

ارل :- کیا سیاسی اختلافات ذاتی تعلقات میں بھی [illegible]

جی ایم شاہ :- [illegible] ہندوستان [illegible] سیاسی اختلافات [illegible]

ہوتا ہے تو آپ ذاتی تعلقات بھی توڑ لیتے ہیں

میں ایک جمہوریت پسند ہوں، جمہوریت پر میں یقین رکھتا ہوں۔ سیاسی لحاظ سے میرا اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن ذاتی تعلقات کو خراب نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ میرا بھتیجہ فاروق کے ساتھ ہے اور وہ بھی مجھ سے بات تک نہیں کرتا۔

ارل :- کیا ایسا نہیں ہے کہ فاروق کی بھی آپ سے بات چیت نہیں ہے؟

جی ایم شاہ - فاروق کا رشتہ دور کا ہے نسبتی بھائی کا رشتہ خون کا رشتہ نہیں ہے۔

ارل :- کیا ایسا نہیں ہے کہ کانگریس (آئی) نے پہلے آپ کی حمایت کا ناٹک رچا اور اب یہی حرکت فاروق کے ساتھ کر رہی ہے؟ کیا اس رویہ پر اپوزیشن کو حرکت میں نہیں آنا چاہیئے؟

جی ایم شاہ - یہ درست ہے اب دیکھئے، ۱۹۶۴ء میں ہم اپنی خود مختاری سے محروم ہوئے، جب صادق صاحب نے کشمیر میں مرکزی قوانین نافذ کیے۔ ۱۹۷۵ء میں اندرا جی اور شیخ عبداللہ کے درمیان یہ معاہدہ ہوا تھا کہ سابقہ حالت دوبارہ بحال کر دی جائے گی۔ لہٰذا ہمارا موقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اس حالت کو بحال کریں گے، جو ہمارا آئینی حق ہے۔ ہم نے آئین ہند کی مختلف دفعات اور ان مرکزی قوانین پر نظر ثانی کرنا شروع کر دیا تھا جو ریاست پر لاگو کیے گئے تھے، لیکن اسی دوران شیخ صاحب کے انتقال کی وجہ سے ہم یہ کام انجام نہ دے سکے۔ میرا احساس ہے کہ جب تک ہم سابقہ پوزیشن میں واپس نہیں آتے، یہ حالات یہاں پیش آتے رہیں گے۔ کوئی پائیداری نہیں ہوگی۔ کشمیر میں کوئی پائیدار حکومت نہیں ہوگی، اور کانگریس (آئی) کا غلبہ جاری رہے گا۔ یہ لوگ یہاں جمہوریت کو تباہ کر دیں گے۔

ارل :- کیا آپ کے دور حکومت میں کانگریس (آئی) کی کٹھ پتلی حکومت کام کر رہی تھی؟

جی ایم شاہ :- قطعی نہیں، یہی وجہ ہے کہ کانگریس (آئی) حمایت سے دست بردار ہو گئی اور مجھے برطرف کر دیا گیا۔

ارل :- آپ نیشنل کانفرنس (ف) سے علاحدہ کیوں ہوئے؟

جی ایم شاہ - فاروق نے ہمیں اپنے اختلافات کے اظہار سے روکنے کے لیے ہم پر حملہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ ۲۳ مئی کو اقبال پارک میں ایک کنونشن ہوا، جس میں ۶۲ فی صد مندوبین نے ہماری تائید کی۔ فاروق کو پارٹی کی صدارت سے برطرف کر دیا گیا۔ خالدہ، میری بیوی، صدر نشیں۔ پندرہ ممبر ہمارے ساتھ آگئے یہ دل بدل کس طرح تھا؟ یہ تو پارٹی میں تقسیم تھی۔ دل بدل مخالف بل میں بھی یہ صراحت کی گئی ہے کہ اگر پارٹی کے ممبروں کی ایک تہائی تعداد علاحدہ ہو جائے تو یہ دل بدل نہیں ہے۔

ارل اس سے اتحاد کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کا عملی منصوبہ کیا ہے؟

جی ایم شاہ - اپوزیشن کو متحد کرنا اور الیکشن لڑنا ہیں اور کچھ نہیں۔

ارل آپ انھیں کس طرح جوڑیں گے؟

جی ایم شاہ میں کوشش کر رہا ہوں۔

ارل - لیکن کون سی اپوزیشن پارٹیاں ہیں؟

جی ایم شاہ بہت سی ہیں۔ میں نے یہ کہا ہے کہ میں شیطان کا ساتھ بھی دوں گا اگر وہ اس پوزیشن کے دوبارہ حصول میں میری حمایت کرے، جو ہمیں ۱۹۴۷ء میں اور ۱۹۵۳ء تک حاصل تھی

ارل :- کیا عوام میں موجودہ سیاسی صورت حال کے تعلق سے زیادہ بیداری پیدا ہو رہی ہے؟

جی ایم شاہ - ہاں۔ وہ سیاسی پارٹیوں کو جانتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ دفعہ ۳۷۰ کا کیا مطلب ہے اور جب ہم الیکشن کے لیے میدان میں آئیں گے تو یہی ہمارا منشور ہوگا۔

ارل - مہم کن خطوط پر چلائیں گے؟

جی ایم شاہ - دفعہ ۳۷۰ کی بحالی اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس وقت عوامی موڈ ہند مخالف ہے۔

ارل :- عوام ہند مخالف کیوں کر ہو سکتے ہیں؟

جی ایم شاہ :- وہ ان پڑھ لوگ ہیں [illegible] بھی کیا جاتا ہے، ان کے لیے اس کا مطلب ہندوستان ہی ہوتا ہے۔ ہندوستان کی اکثریت [illegible] کانگریس کی [illegible]

سے افسوسناک پہلو ہے، اور اسے ہند کے تمام عوامی لیڈروں کو سمجھنا چاہیئے۔ اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ عوام اصل دھارے میں شامل ہوں، تو انھیں دفعہ ۳۷۰ اپنی مکمل صورت میں بحال کر دینی چاہیے پھر وہ دیکھیں کہ اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں کوئی بھی پاکستان کی بات نہیں کرے گا

ارمل: ۔ کیا وادی میں لوگ پاکستان نواز ہیں؟۔

جی ایم شاہ: ۔ ہاں، پاکستان نواز ہیں۔

ارمل: کیوں؟

جی ایم شاہ: ۔ میں اس کے اسباب بیان کر چکا ہوں

ارمل: ۔ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی طرف اس جھکاؤ سے انھیں کوئی فائدہ ہو رہا ہے؟ عوامی ذہن کو کون اکسا رہا ہے؟۔

جی ایم شاہ: یہ فرقہ پرست تنظیمیں

ارمل: ۔ کون ہیں وہ تنظیمیں؟۔

جی ایم شاہ: کئی تنظیمیں ہیں، اور اس طرح کی نئی تنظیمیں پیدا ہو رہی ہیں

ارمل: ان میں سے کچھ کے نام آپ بتا سکتے ہیں؟

جی ایم شاہ: عوامی ایکشن کمیٹی ہے جماعت اسلامی ہے، آر ایس ایس شیو سینا اور تمام جنگجو تنظیمیں ہیں۔

ارمل: اپوزیشن کو متحد کرنے کا کوئی ٹھوس اقدام؟

جی ایم شاہ: ۔ نہیں ابھی تو گفتگو چل رہی ہے

ارمل: ۔ کیا کسی بڑی نیشنل اپوزیشن کے ساتھ؟

جی ایم شاہ: میں نے ابھی رابطہ قائم نہیں کیا ہے مجھے جموں جانا تھا، اندازہ کرنے کے لیے کہ لوگ دل والے کیا کہتے ہیں۔ بی جے پی کا کیا خیال ہے؟

ارمل: کیا ان میں کسی طرح کا کوئی ملاپ ہو رہا ہے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے؟ اس سلسلے میں آپ کی طرف سے پہل ہوئی ہے یا اس اتحاد کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کی طرف سے کوئی تجویز آئی ہے؟

جی ایم شاہ: وہ ابھی تک میرے پاس نہیں آئے ہیں؟

ارمل: اس طرح کی باتیں بھی جا رہی ہیں کہ فاروق نے کشمیر کے مفاد سے دغا کی ہے۔ کیا یہ درست ہیں؟

جی ایم شاہ: ۔ یہ درست ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خود میری پارٹی کے لوگوں نے مجھ پر کانگریس (آئی) کے ساتھ ضم ہونے کے لیے دباؤ ڈالا۔ لیکن میں نے اس دباؤ کی یہ کہہ کر مزاحمت کی کہ اگر سبھی لوگ ایسا ہی چاہتے ہیں تو میں ان کا لیڈر نہیں ہوں۔

ارمل: کانگریس سے اس کے علاوہ آپ کا کیا اختلاف تھا کہ وہ لوگ آپ کی پارٹی کا انضمام چاہتے تھے؟ ان لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا اور وزارت بنانے میں آپ کی حمایت کی تھی؟

جی ایم شاہ: یہ حمایت اسی مقصد سے تھی، میں اسے اب سمجھ رہا ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ میں آسانی سے ان کے جھانسے میں آجاؤں گا۔ لیکن میں علاقائی پارٹی سسٹم پر یقین رکھتا ہوں۔ میرے خیال میں طاقت کو غیر مرکوز ہونا چاہیئے۔ اور ہم نے ایسا کیا ہے اس سے دستبردار ہونے پر مجبور کیوں کیا جائے؟

ارمل: کیا آپ کو اس کا افسوس ہے کہ آپ نے موقع گنوا دیا؟

جی ایم شاہ: ۔ نہیں مجھے افسوس کیوں ہو؟ اگر میں اقتدار کا بھوکا ہوتا تو میں بھی مان لیتا۔

ارمل: اس کولیشن حکومت کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟۔

جی ایم شاہ: کانگریس (آئی) پورے ہندوستان میں اپنا اقتدار چاہتی ہے اس کے لیے وہ اپنے قریب ترین دوستوں کو بھی بھینٹ چڑھا سکتے ہیں۔ فاروق کے پاس اقتدار نہیں ہے، صرف کرسی ہے۔ اقتدار کانگریس (آئی) کے پاس ہے، مرکز کے ہاتھ میں ہے۔

ارمل: ۔ کیا کسی پارٹی کو حقیقت میں ریاست کی بہبود سے دلچسپی ہے؟۔

جی ایم شاہ: میں ایک جوابی سوال کروں گا۔ کیا کانگریس (آئی) کو حقیقت میں بحیثیت مجموعی عوام کی بہبود سے دلچسپی ہے؟۔

ارمل: کیا نگراں حکومت کے عملی منصوبے یا اس کا طریقۂ کار عوام پر یا سیاسی پارٹیوں پر واضح ہے؟

جی ایم شاہ: ۔ کیا آپ نے ایسی کوئی بات سنی، مجھے تو کچھ نہیں معلوم میں نے ایسا کوئی منصوبہ نہیں دیکھا۔ ان کا انتخابی منشور آنے دیجئے، پھر ہم اس کا جواب دیں گے

ارمل: ۔ کیا آپ عوام کی ناراضگی کا فائدہ اٹھا رہے ہیں؟۔

جی ایم شاہ: ۔ ہر کوئی اس کا فائدہ اٹھائے گا، میں کوئی سنت تو نہیں ہوں، میں ایک سیاستداں ہوں۔

# میر واعظ مولوی فاروق

## چیئرمین عوامی ایکشن کمیٹی

ارمل: کیا آپ اس اتحاد کو شکست دینے کے لیے اپوزیشن سے ہاتھ ملا رہے ہیں؟

میر واعظ: ہمیں اصل فکر معقولیت یا غیر معقولیت کی نہیں بلکہ ریاست میں جمہوریت کے مستقبل کی فکر ہے کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس (الف) کے مل جانے کے بعد اسمبلی میں کوئی اپوزیشن اب موجود نہیں ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست میں بھی کوئی اپوزیشن نہیں ہے؟ کہا جاتا ہے کہ اب صرف دو طاقتیں ہیں، کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس (الف)، کوئی تیسری قوت نہیں ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ کشمیر میں تیسری قوت کس طرح پیدا کی جائے جو ریاست اور عوام کے فائدہ اور بہبود کے لیے کام کرے؟ یہ ہمارا اصل کام ہے۔ اگر ہم آئندہ انتخابات میں اپنی توانائیاں صرف کریں اور اگر چار تا پانچ سیٹیں جیت سکیں یا کوئی سیٹ نہ جیت سکیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ریاست میں اپوزیشن کا خاتمہ ہو گیا؟ جموں و کشمیر کی محب وطن اور جمہوریت پسند قوتیں سمجھ گئی ہیں کہ جس انداز سے یہ سب کچھ کیا گیا ہے، اس کا کوئی آئینی یا اخلاقی جواز نہیں تھا۔ جن لوگوں نے بھی اس میں حصہ لیا ہے وہ سب یکساں طور پر اس کے ذمہ دار ہیں۔ مرکز کی حکومت جس نے مستقل طور پر کشمیر کو اس کے جمہوری حقوق سے محروم رکھنے کی پالیسی اپنا رکھی ہے، یہ سب قومی مفاد میں نہیں کر رہی ہے۔

ارمل: آپ کے خیال میں کیا مرکز (یہاں) کٹھ پتلی حکومت چاہتا ہے؟

میر واعظ: ڈاکٹر فاروق بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ انھوں نے حضرت بل میں کہا کہ اگر مرکز کا یہ رویہ موافقانہ نہیں رہا تو وہ خود بھی کوئی مسئلہ حل نہیں کر سکیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں معاہدہ کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فاروق اس اتحاد کے لیے مجبور تھے۔

اُرمِل: دباؤ کس جانب سے تھا؟

میرواعظ: دباؤ مرکز کی جانب سے تھا اور یقین ابتدا ہی سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں برطرف کر دیا گیا تھا۔ اب انھوں نے یہ سبق حاصل کر لیا ہے کہ مرکز سے الجھنا نہیں چاہیے۔

اُرمِل: اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ایک شخص کا مرکز سے ہمیشہ ہی اتفاق ہو اور اس طرح ریاست کے مفاد کو بھینٹ چڑھا دے؟

میرواعظ: یہی نکتہ ہے جس پر میرا آپ سے اتفاق اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ سے اختلاف ہے۔ میں ذاتی طور سے یہ سمجھتا ہوں کہ انھیں کچھ انتظار کرنا چاہیے تھا۔ انتخابات کو کسی صورت میں زیادہ لمبے عرصہ تک ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں۔ اگر ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ذرا انتظار سے کام لیا ہوتا تو انتخابات بہرحال ایک سال یا اس سے کم و بیش عرصہ کے اندر ہو جاتے۔ مرکز الیکشن کو مسلسل ٹال نہیں سکتا تھا۔

اُرمِل: ڈاکٹر عبداللہ کے وزیر اعلیٰ رہتے ہوئے کانگریس (آئی) کے وزرا کیا کچھ کر سکتے ہیں؟

میرواعظ: یہ تو وقت ہی بتائے گا میں نجومی نہیں ہوں کہ یہ بتا سکوں کہ یہ لوگ کیا کریں گے۔ میرے علاوہ کسی شخص کے اندر اپنے اختلافات کے اظہار کی جرأت نہیں ہے۔ سوال کردار کا ہے۔ اگر جموں کشمیر کے نمائندوں کے یہاں کردار نہیں ہے تو مولوی کیا کرے گا۔ بحیثیت میرواعظ میری ذمہ داری یہ کوشش کرنا ہے کہ کردار کی دیانتداری برقرار رہے اگر کردار سازی نہ ہو تو انتخاب بیکار ہے۔

اُرمِل: نیشنل کانفرنس (الف) میں دل بدل کیوں ہوا؟

میرواعظ: ماضی میں لیکئے دیکھا ہے کہ اسمبلی کے ممبروں کا ایک دو لاکھ روپے پر سودا ہوتا تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ چودہ دل بدلوؤں نے فاروق کے لیے مشکل پیدا کی۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ ان چودہ افراد نے ہی وہ کردار ادا کیا جو ڈاکٹر فاروق کو اس مقام پر لانے کا باعث بنا۔

اُرمِل: ڈاکٹر عبداللہ اب اس سلسلے میں ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ کیسے حکومت کے لیے منتخب ہونا چاہیے تاکہ تاریخ پھر اپنے آپ کو نہ دہرائے۔

میرواعظ: یہ صرف ڈاکٹر عبداللہ کا ہی نہیں بلکہ ریاست کے ہر شخص کا مسئلہ ہے۔ اپوزیشن کا بھی مسئلہ ہے۔ ماضی میں تجربہ ہوا ہے اس کے پیش نظر کوئی یہ ضمانت کیسے دے سکتا ہے کہ آگے منتخب ہونے والے افراد تاریخ کو نہیں دہرائیں گے! وہ جانتے ہیں کہ ڈرامے کس طرح رچائے جاتے ہیں۔ میں جمہوریت پر یقین رکھتا ہوں۔ ناراضگی کا اظہار جمہوری طریقہ پر کیا جانا چاہیے۔ انتخابات آرہے ہیں اور اگر عوام اس کے مخالف ہیں تو انھیں اس کے خلاف ووٹ دینا چاہیے۔ میں کہتا ہوں میں اس کا مخالف ہوں لیکن اس وقت شور شرابہ کرنے کی بجائے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ انتخابات کے وقت ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ اس کے حق میں ووٹ دیتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ وہ اس کے مخالف ہیں تو آپ کیا کر سکتے ہیں؟

اُرمِل: عوام کا ردعمل کیا ہے؟

میرواعظ: کشمیر کے عوام کی ترجمانی کرتے ہوئے میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جمہوریت پر ان کا یقین متزلزل ہو گیا ہے کشمیر کے عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک تماشا کیا جا رہا ہے مولوی افتخار ہی تھے جنھوں نے جی ایم شاہ کی حکومت بنانے میں حمایت کی تھی اور وہی ان کی برطرفی کے بھی ذریعہ بنے۔ ایک دن وہ انھیں برطرف کرتے ہیں۔ اگلے دن گورنر راج ہو جاتا ہے پھر صدر راج لاگو ہو جاتا ہے اور پھر چکر پورا ہو کر ڈاکٹر فاروق دوبارہ برسراقتدار آجاتے ہیں۔ اب الیکشن کا پروپیگنڈہ ہو رہا ہے۔ یہ سب "اسٹیج شو" ہے۔ مذاق تماشا ہے۔

اُرمِل: کیا کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس (الف) کے درمیان کوئی انتخابی مفاہمت ہو گئی ہے؟

میرواعظ: عوام نے ان ہتھکنڈوں کو سمجھ لیا ہے جو کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس (الف) استعمال کر رہی ہیں۔ ان لوگوں نے عوام کو اعتماد میں لیے بغیر خود ہی آپس میں سیٹیں تقسیم کر لی ہیں۔

اُرمِل: کشمیری مفاد کا "سودا" ہوا ہے؟

میرواعظ: اس اتحاد پر میرے ردعمل کو ذاتی چشمک کے طور پر نہیں سمجھنا چاہیے۔ جی ایم شاہ اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ اپنے آپسی معاملات کو شخصی روپ دے سکتے ہیں لیکن اگر کشمیر میں سیاسی صورتحال بگڑی ہوئی ہے تو اس کے لیے مرکزی حکومت قصوروار ہے۔ دہلی کی حکومت اور اس کی پالیسیاں ہیں جو بڑی حد تک ریاست کشمیر میں اس وقت موجود صورتحال کا سبب ہیں کشمیر کے عوام اپنے جمہوری حقوق کی مکمل بحالی اور بازیابی چاہتے ہیں۔

اُرمِل: کیا وادی میں پاکستان نواز رجحان ہے؟

میرواعظ: مجھے اس کی پروا نہیں ہے اگر باقی ملک یہ سمجھتا ہے کہ کشمیری پاکستانی ہیں۔ بار بار اس بات کو دہرانا وقت ضائع کرنا ہے کہ کشمیر میں کوئی پاکستان نہیں ہے شاید ایسا ہے کہ اگر ہم کانگریس (آئی) کے نظریات کی حمایت کرنے لگیں تبھی ہمیں محب وطن سمجھا جائے ورنہ نہ سمجھا جائے۔ آج ڈاکٹر فاروق ان کے ساتھ ہیں، اس لیے انھیں ملک کا ایک عظیم لیڈر سمجھا جا رہا ہے کل تک ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی وہ "غدار وطن" تھے، ایک "پاکستانی" تھے۔ یہ ان کا طریقہ کار ہے۔ اگر مسلم لیگ ان کے ساتھ ہے تو وہ ایک بڑی نیشنلسٹ پارٹی ہے اور اگر وہ ان کی حمایت نہ کرے تو مسلم لیگ، مسلم لیگ ہے۔

## میر لسجن

### نائب صدر پردیش کانگریس کمیٹی

میر لسجن: کشمیر میں ہماری تحریک جاگیر داری نظام کے مخالف تھی۔ ۱۹۴۴ء میں ہم نے 'نیا کشمیر' کے عنوان سے ایک پروگرام بنایا۔ اس پروگرام میں ہم نے یہ دکھایا تھا کہ آزادی کے حصول کے بعد ہمارا معاشی نظام کیسا ہونا چاہیے۔ غریبی بیماری اور ایسی دوسری خرابیوں کو ختم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم خیال جمہوری قوتیں متحد ہوں تاکہ یہ ریاست بھی ملک کے ساتھ ساتھ تیزی سے ترقی کر سکے۔ ملک دشمن قوتیں فاروق کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہی تھیں۔ اب چونکہ ان کی حمایت انھیں حاصل نہیں رہی اس لیے یہ قوتیں بے اثر ہو جائیں گی۔ کچھ بین الاقوامی قوتیں بھی سرگرم تھیں اور ان کے ایجنٹ اہمیت رکھنے والی شخصیتوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتی رہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ عوام متحد ہوں اور اپنے معاشی مسائل کو حل کریں۔

اُرمِل: وہ معاشی منصوبہ کیا ہے جو ریاست کی حالت

بہتر بنانے کے لیے تیار کیا گیا ہے ؟

میریجن : تینوں علاقوں کے مسائل الگ الگ ہیں جن کا تعین کیا جا رہا ہے ۔

اَرل : ریاست کی سابقہ حکومتیں کیا کر رہی تھیں ؟

میریجن : ایسا لگتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر رہی تھیں اب عام آدمی ہماری کارکردگی کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ ہم اس مقصد کو جلد از جلد پورا کرنے کے لیے یکسوئی سے کام کر رہے ہیں ۔ شاہ حکومت کے دوران کانگریس (آئی) آزادی سے کام نہیں کر سکی ، ہمیں ہر ان اسمبلی کو خوش رکھنا پڑتا تھا ورنہ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ۔ اب ہم آزادی سے کام کر رہے ہیں ۔ اگر ہم عوام کو مطمئن کر سکے کہ پہلے کی اور اب کی حکومت میں فرق ہے تو عوام کا اعتماد دوبارہ بحال ہو جائے گا

اَرل : یہ صرف اعلیٰ سطح پر موجود افراد کا فیصلہ تھا یا عام ممبروں کو بھی اس میں شامل کیا گیا تھا ؟

میریجن : کافی بات چیت اور تبادلۂ خیال کیا گیا اور نچلی سطح کے ورکرز کو بھی اس غور و فکر میں شامل کیا گیا ــــــ میرٹھی جو اس وقت موجود تھے انھوں نے کہا کہ اگر ریاست کے عام آدمی کو دونوں وقت پھر پیٹ کھانا مل جائے تو وہ پاکستان کو اور تمام ہندوستان مخالف سرگرمیوں کو بھول جائیں گے اگر تمام ہند نواز قوتیں متحد ہو جائیں تو ہم ریاست کی حالت بہتر بنانے کے لیے کام کرنے کے قابل ہو سکیں گے ۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنی حکومت نہیں بنا سکتے تھے ۔ ہماری پارٹی کے ۲۶ ممبر اور دوسری پارٹی کے ۱۴ ممبر تھے لیکن ہم نے قربانی دی کیونکہ ہم نے یہ محسوس کیا کہ فاروق اور ان کے ہندوستان حامی موقف کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے اگر دونوں پارٹیوں یعنی کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس (الف) کے وزرا مل جل کر تال میل سے کام کرتے ہیں تو یقینی طور پر نہ صرف ریاست اور اس کے عوام کی بہتری کا بلکہ بحیثیت مجموعی پورے ملک کی بہتری کا باعث ہوگا

اَرل : نیشنل کانفرنس (الف) اور کانگریس (آئی) کے درمیان رابطہ بندی کے بارے میں کیا خیال ہے ؟

میریجن : رابطہ کمیٹی ابھی زیرِ تشکیل ہے ۔ جو جلد ہی قائم ہو جائے گی اور جیسا کہ فاروق صاحب نے بھی کہا ہے ۔ یہ بلاک کی سطح تک رابطے کے کام کو تیز کر دے گی ہم گذشتہ ۳۸ برسوں سے اپنے اختلافات دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

اَرل : ان (فاروق) کی چیف منسٹر شپ میں ؟

میریجن : اس میں کوئی دشواری نہیں ہوگی ۔ کیونکہ کابینہ کی سطح پر ہم مشترکہ فیصلہ کرتے ہیں ۔ فاروق عوام کے سامنے عید میلاد النبی کے موقع پر حضرت بل میں کہہ چکے ہیں کہ ہمیں 'ہندوستان' کے ساتھ قدم ملا کر ترقی کرنی ہے ۔ ہم پاکستان کی طرف کسی طرح کا جھکاؤ نہیں چاہتے ۔ ایک بنیادی سطح کے ورکر کو آج مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ہمارے مقابلہ میں نیشنل کانفرنس (الف) کے لیے کسی قدر زیادہ ہے ۔ کیوں کہ ان لوگوں نے عوامی جذبات کا فائدہ اٹھایا تھا ۔ لیکن اب ہمارا اصول یہ ہے کہ انہیں تنہا نہ چھوڑا جائے ۔ ہم ان کی مشکلات پر قابو پانے میں ان کا ساتھ دیں گے ۔ طعنوں کے یہ دن گذر چکے ۔ اب ہمیں نہ صرف اپنے اندر بلکہ عوام کے اندر بھی اعتماد پیدا کرنے کے لیے قدم ملا کر چلنا ہوگا ۔ ہم اس بات کے لیے اپنی بھرپور کوشش کریں گے کہ یہ کوشش کامیاب رہے ۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے ۔

ڈیگانت کے سکھریا

# آسام

## امید و بیم کے دوراہے پر



۲۴ دسمبر ۱۹۸۵ء کو مسٹر پرفل کمار مہنتا نے آسام کے دسویں وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالا اس وقت آسام کی بحران زدہ ریاست کے عوام میں قابل ذکر حد تک یہ امید افزا احساس پیدا ہوا کہ اس تبدیلی کی بدولت وہاں کے غیر ملکی باشندوں کے متنازعہ فیہ مسئلے کا حل عمل میں آجائے گا۔

تینتیس سالہ وزیر اعلیٰ کی آنکھوں میں آنسو تھے جب وہ قسم اٹھانے کی رسم کے سلسلے میں وہاں کے نہرو اسٹیڈیم میں تعمیر کردہ پنڈال کی چھوٹی چھوٹی پانچ سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے وہاں مسٹر مہنتا اور ان کی کابینہ کے رفیق کار حضرات کو آسام کے گورنر شری بھیشم نارائن سنگھ نے عہدہ سنبھالنے اور رازداری کی قسم دلوائی تھی۔

پورا ایک سال گذر گیا ہے لیکن مسٹر مہنتا ابھی تک کشمکش و پیچ کی حالت میں ہیں۔ یہ صورت حال ان کے سرکاری حیثیت سے متعدد بیانات سے ظاہر ہے جن میں انھوں نے بڑے تشہیر یافتہ آسام معاہدہ پر عملدرآمد کے سلسلے میں مرکز کی طرف سے ٹال مٹول اور ستم ظریفانہ رویے پر بڑے زور و شور سے اظہار تشویش کیا ہے۔

وزیر اعلیٰ کے ایک حالیہ بیان نے کہ ریاستی حکومت اپنے آپ اس معاہدے پر عمل درآمد نہیں کر سکتی۔ ریاست میں اور بھی ناچاقی کے آثار پیدا کیے ہیں۔ مہنتا کو یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ مرکز اس معاہدے کے بارے میں اپنی ذمہ داری کے تئیں بے اعتنائی سے کام لے رہا ہے۔ اسی وجہ سے "طلبا کی کل آسام جماعت" نے جو ریاست میں طلبا کی سب سے زیادہ طاقتور تنظیم ہے اور جس نے آسام کی چھ سالہ تحریک میں سربراہانہ کردار ادا کیا تھا نئی دہلی میں پارلیمنٹ کے آگے بوٹ کلب کے مقام پر دھرنا لگایا۔

گوہاٹی میں سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ طلبا کی مذکورہ جماعت نے جو کچھ نئی دہلی میں کیا اس سے مرکز کی آنکھیں اس امر کی جانب کھل جانی چاہئیں کہ مرکز کی طرف سے سست روی کے رویے کے باعث ان میں کس قدر ناچاقی پیدا ہوئی ہے۔ مذکورہ تنظیم نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ مرکز کے اس رویے کے خلاف ایک نئی تحریک شروع کر دے گی [illegible]

(آئی ایم ڈی ٹی) کی ترمیم کب کی جائے گی اور نہ اس نے ہند و بنگلا دیش سرحد کو بند کرنے کے لیے کوئی موثر قدم اٹھایا ہے۔ ایکٹ کی ترمیم کے سلسلے میں سست روی کی پالیسی اپنانے سے مرکز نے یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ وہ شاید معاہدے کی دفعات کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ آسام کے وزیر داخلہ مسٹر بھرگو کمار پھکن آسام تحریک میں اس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے بڑے پیش رو رہے ہیں۔ انھوں نے راقم الحروف سے اپنی ایک حالیہ ملاقات کے دوران ریاستی حکومت کے نظریے کی خاصی وضاحت کی۔ وزیر داخلہ نے دلیل پیش کی کہ آسام کے لوگ جنھوں نے غیر ملکی باشندوں کے معاملے کے سلسلے میں چھ سال کی تحریک کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا تھا، مرکز کے اس تاخیر آمیز رویے کو گوارا کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔ مرکز اس ضمن میں بھی ناکام رہا ہے کہ وعدہ کرنے کے باوجود ایک سرحدی سڑک کی تعمیر اور کانٹے دار تار کی باڑ لگانے کی جانب اس نے کوئی اقدام نہیں کیا جس سے کہ آسام میں غیر ملکی افراد کی مزید دراندازی رک جاتی۔ ہمیں تو مرکزی سربراہوں کے اس رویے پر کسی قدر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی عذر کے تحت مقام عمل سے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔

نئی دہلی میں مقیم سربراہوں نے سرحدی سڑک کی تعمیر کے بارے میں ذکر کرنا شروع کر دیا ہے لیکن انھوں نے ۲۰۱ کروڑ روپے کی لاگت سے لگائی جانے والی کانٹے دار تار کی باڑ لگانے کے بارے میں پوزیشن کا کوئی واضح اظہار نہیں کیا اسی اثنا میں سرحدی اضلاع سے موصول ہونے والی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ سرحد کے اس پار سے لوگ متواتر دراندار ہو رہے ہیں۔ آسام معاہدے کی ایک اور اہم دفعہ ۶ آسامی عوام کی لسانی اور ثقافتی شناخت کے فروغ و تحفظ کے لیے آئینی، قانونی اور انتظامی اہتمامات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں مرکز نے ابھی تک کوئی اقدام نہیں کیا۔ ایک اور بنیادی مانگ جو آسام تحریک میں حصہ لینے والے سرکاری ملازموں کی غیر حاضری کو جائز قرار دینے سے تعلق رکھتی ہے ابھی تک پوری نہیں کی گئی۔ البتہ مرکز کا یہ تازہ ترین فیصلہ کہ ایسی غیر حاضری کو ملازمتی تعطل تصور کرنے کی بجائے چھٹی کا عرصہ شمار کیا جائے، بہت سے لوگوں میں شک و شبہ پیدا کر رہا ہے۔ ریاست [illegible]

ریفائنری کے قیام کے سلسلے میں تا حال کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا۔ ان حالات میں نئی نئی پالیسیوں نے عوام کے غم و غصہ کو راہ دی ہے۔

اگرچہ مرکز کے رویے پر آنسو بہانے کی ضرورت نہیں تاہم نئی دہلی کو برتنے کے لیے ایک طریق کار کی ضرورت ہے کیونکہ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کے ساتھ کوئی تنازعہ مول لینا غیر ملکی باشندوں کے معاملے کے حل کے مبہم امکانات پر اثر انداز ہوگا۔ آسام گن سنگرام پریشد کے ایک اعلیٰ سربراہ نے گوہاٹی کے مرکزی ہیڈ کوارٹر میں منعقدہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں یہ ایک بڑی معقول صلاح دی ہے۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ گذشتہ سال کانگریس (آئی) کو محض اس لیے بھاری شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ اسے عوام دشمن گردانا گیا تھا اس لیے موجودہ حالت میں وہ اپنی پارٹی کے ٹوٹے ہوئے حوصلے کو غیر ملکی باشندوں کا مسئلہ حل کیے بغیر کسی طرح بحال نہیں کر سکتے البتہ جو چیز اس وقت تشویش پیدا کر رہی ہے، وہ یہ ہے کہ آسام گن سنگرام پریشد نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے کہ وہ مرکز کی طرف سے آسام معاہدے کے تئیں بے اعتنائی کے خلاف پھر سے تحریک شروع کر دے گا۔ اسی وجہ سے اس سرحدی ریاست میں بدامنی کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا جس کے لیے محض حکومت ہند ہی ذمہ دار ٹھہرے گی۔

دوسری طرف عوام میں پھیلتی بے اطمینانی، مہنتا حکومت کی سیاسی اساس کو دھچکا لگائے گی اس خیال کے تحت کہ وہ معاہدے پر عملدرآمد کے سلسلے میں مرکز کو متاثر کرنے میں ناکام رہی ہے۔ معاہدے پر عمل درآمد میں مزید تاخیر لازمی طور سے ریاست کے سیاسی استحکام کو خطرے میں ڈال دے گی۔ مسٹر مہنتا اس صورت حال سے پوری طرح آشنا ہیں ۲۹ نومبر ۱۹۸۶ء کو انھوں نے وزیر اعظم سے ملاقات کی جس میں انھوں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ مرکزی حکومت معاہدے کی کچھ اہم دفعات کو ترمیم دینے کے سلسلے میں آئینی اقدام سے قاصر رہی ہے حالانکہ اس کے لیے باہمی سمجھوتہ ہوا تھا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ معاہدے کی دفعہ ۶ پر عمل درآمد کے لیے خصوصی عملی اقدامات بھی کیے جائیں جن کے تحت ریاست کی بھرپور ترقی تیزی کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔

رنجن کمار پادھی

# ہند-روس تعلقات کا نیا دور

وہ دن ہوا ہوئے جب ہندوستان کو محض ایک ٹی دی برطانوی سامراج کا عصا سے پیری سمجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا تھا۔ اور اس تجزیہ کی بنیاد خرادنوف کا "دو دشمنوں" کا مشہور نظریہ تھا۔ جس کا واضح اصول تھا کہ "اگر آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں، تو آپ ہمارے مخالف ہیں"۔ نیز مختلف ریاستوں کے بارے میں، مارکسی لیننی نظریہ کے تحت ہندوستان کو مختلف قوموں (وریاستوں) کا ایک مجموعہ دکھائی ہی سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خیال بھی اپنی جگہ تھا کہ جلد از جلد اس ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جو دیگر مارکسی دانشوروں مثلاً آر۔ پی۔ دت کے نظریے سے یکسر متضاد ہے۔ دت کا نظریہ شروع سے یہی رہا ہے کہ ہندوستان ایک زبان کے ساتھ ایک قوم کے روپ میں ایک متحد ملک



ہے، اس کے بعد ملوی نووسکی کا نظریہ بھی سامنے آیا جس کے تحت ہندوستان کو سرمایہ داری کا خطاب دیا گیا تھا، لیکن یہ بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ یہاں کانگریس پارٹی اپنے چہرے پر ترقی پسندی کا ہلکا سا نقاب بھی ڈالے ہوئے ہے اور غالباً اسی لیے ہندوستانی کمیونسٹوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ داخلی و عالمی امور میں کانگریس حکومت کی حمایت کریں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس وقت سے مارکسی و لیننی اپنی خارجی پالیسی کے سلسلے میں کہیں زیادہ واقعیت پسند ہو گئے ہیں اور خصوصاً تیسری دنیا کے سلسلے میں کافی غور و فکر، تحمل اور مستقل مزاجی کے ساتھ پالیسی سازی کا عمل انجام دیا جا رہا ہے۔

اس واقعیت پسندانہ روسی خارجہ پالیسی کے تحت ہندوستان اور اس جیسے دوسرے ممالک کے سلسلے میں سوویت رویہ کا ذکر کرتے وقت عموماً غیر سرمایہ دارانہ راہ ترقی، اور کثیر جہتی سماج، جیسے نظریاتی اصولوں کا حوالہ دیا جاتا ہے اور ان اصولوں کو ایک قسم کی نظریاتی رواداری کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے، اور یہ بات اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ہندوستان کو مشرقی استبداد کا نمونہ اور افسر شاہی کے تحت جبری حکومت کے شکار ایک سماج، کا نام دینے کے مارکسی نظریے کو آج کے سنجیدہ دانشوروں نے محض پیش پا افتادہ صحافتی رائے قرار دے کر مسترد کر دیا ہے، اور اس کے بعد سے دریائے ماسکو وایس میں بھی کافی برف پگھلی ہے نہ تباہی، نہ بربادی، اب تو محض پرامن بقائے باہم اور ناجنگی کا اصول ہی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے گورباچوف کا مارکسزم ولیننزم نیا ہے اور تیسر گورباچوف کی نئی فکر نے بھی اسے کافی سہارا دیا ہے۔

لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ روس نے پرولتاری بین اقوامیت، عالمی اشتراکیت، محنت کشوں کی عالمی حکومت جیسے اپنے مقاصد کو پس پشت ڈال دیا ہے؟ نیز کیا کارل مارکس کا یہ پیام۔ "دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ"۔ کیا یہ بیان جسے آج تک نئے دور کا نقیب سمجھا جاتا رہا ہے، کیا اس نے اپنا انقلابی جوش و خروش کھو دیا ہے؟ نیز کیا اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ اشتراکیت انسانی تاریخ کا ایک اندوہناک باب بن کر رہ گئی ہے، اور اسے بھی جلد ہی محض ایک ایسویگین پیش گوئی ہی سمجھا جائے گا؟ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ روسی کمیونسٹ پارٹی کی ۲۷ ویں کانگریس میں طے شدہ پروگرام انقلابی روح سے محروم محض ایک خالی خالی دستاویز تھا، جس کے ذریعہ اچانک روسی نظام کی خامیوں کو اجاگر کیا گیا، اور شاید اسی لیے گورباچوف کے عہد میں نیا نظام تشکیل کیا جا رہا ہے یا یہ کہ ایک اور انقلاب آ رہا ہے؟ یہ سوالات اور اس طرح کے اور بہت سے سوالات کا موزوں جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ روس کے ملکی ڈھانچے کے تناظر اور اس کے جملہ ضوابط کے دائرے کے اندر روس کی پالیسیوں کا تفصیلی جائزہ نہ لیا جائے۔

آج اگر چہ امن بقائے باہم (یہ لفظ لینن کی ایجاد ہے) کو بہت زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے، اور آج اگر روس کی خارجہ پالیسی بڑی حد تک ناجنگی، عالمی امن اور تحفظ کے اصولوں پر مبنی ہے اور اب روس طبقاتی جدوجہد اور انقلاب کی وکالت نہیں کر رہا ہے تو دراصل یہ سب کچھ تاریخ کی منطق کے مطابق ہے۔ اس کی پشت پر کوئی منطقی ضمیر فریبی نہیں ہے۔ آج "ستاروں کی جنگ" اور "نئی ارضیت" کے دور میں روس کا مقصد عین غالباً یہ ہو گیا ہے کہ پہلے قوتوں کو باہم مربوط کیا جائے۔

آج اگر روسیوں کے پیش نظر یہ مقصد ہے کہ مغربی ممالک کے ساتھ ایک مستقلاً قابل عمل رشتہ استوار کیا جائے تاکہ جنگ کو ٹالا جاسکے، بحران پر قابو پایا جاسکے اور اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیز تر کیا جاسکے۔ تو اس کے ساتھ ان کا منشا یہ بھی ہے کہ ہر ملک کے ساتھ الگ الگ مساوی سطح پر تعلقات بنائے جائیں، اور اس دائرے کو ممکنہ حد تک وسیع کیا جائے نیز اس معاملے میں سیاسی یا سماجی نظریات کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔

فریڈ ہیلی ڈے نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ "ایک ایسی دنیا میں جہاں انقلاب عمل مسلسل نہیں ہے وہاں روایتی حکمت عملیاں ایسی عالمی سرگرمیوں کا اہم حصہ بنی رہتی ہیں جن کا مقصد روس کے مفادات کو فروغ دینا ہوتا ہے۔"

ہند روس تعلقات اور راجیو، گورباچوف باہمی خوش مزاجی، ہند کے بارے میں روس کے احساسات اور اس کی پالیسیوں کا جائزہ اسی روشنی میں لیا جانا چاہیے۔

ہندوستان اور روس کے باہمی اشتراک وعمل سے متعلق امور کو تین حصوں میں تقسیم کرکے واضح کیا جاسکتا ہے۔

(۱) باہمی امور

(۲) علاقائی امور

(۳) عالمی امور

باہمی امور میں اقتصادی تعاون، سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں تعاون تعلیم ثقافت وغیرہ شامل ہیں۔ علاقائی امور میں ایشیائی خطے میں متوازن دموزوں فضا پاکستان کی مستقل اسلحہ بندی، اس کی نیوکلیائی پیش رفت، امریکی اثرات امریکہ کی اتحادی حکمت عملی، بحر ہند، ایشیائی بحرالکاہل کا تحفظ وغیرہ شامل ہیں۔ عالمی امور میں اسلحہ کی دوڑ، اسلحہ سازی کا خاتمہ، عالمی امن وتحفظ، نسل پرستی کے خلاف جدوجہد وغیرہ شامل ہیں۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر ظفر امام نے بالکل درست کہا ہے کہ حالانکہ ہند، روس روابط کے تحت باہمی وعلاقائی پہلوؤں پر خاصی توجہ دی گئی ہے مگر عالمی پہلوؤں پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی اور اس کی اہمیت کو کبھی پوری طرح محسوس نہیں کیا گیا۔

عالمی امور کے ذیل میں ہند، روس اشتراک وامتزاج کی بنیاد دراصل فلسفیانہ ہے اور اس کی جڑیں ہر دو ممالک کے اپنے اپنے نظریات میں پیوست ہیں۔ ان نظریات کا تعلق عالمی امن کے تصور، پرولتاری بین الاقوامیت اور بقائے باہم وغیرہ سے ہے، اس کے علاوہ داخلی الترامات اور خارجی حقیقتیں بھی دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں ممد ومعاون ثابت ہوئی ہیں، دونوں ممالک کے درمیان نہ صرف باہمی اور علاقائی بلکہ عالمی اہمیت کے متعدد معاملات کے سلسلے میں بھی اتفاق رائے موجود ہے۔

ہند، روس تعلقات کا آغاز ۱۹۵۰ء کے بعد کی دہائی میں ہوا، تب سے برسہا برس کے عرصے میں ان تعلقات کو مسلسل فروغ ہوا ہے، اور اس دوران ہر دو ممالک کی یہ دوستی کئی آزمائشوں سے بھی گزری ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستانی قائدین بار بار اس بیان کا اعادہ کرتے رہے ہیں کہ امریکہ ہو یا کوئی اور ملک، کسی کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات روس کی دوستی کی قیمت پر نہیں ہیں۔ ہندوستان اور روس کی دوستی محض دو حکومتوں کے مابین کے روابط کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اصلاً دو قوموں، دو ملکوں کے عوام کے درمیان کی دوستی ہے اور اس کی جڑیں تاریخی، سماجی واقتصادی عوامل میں پیوست ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بین الاقوامی تقاضے ہماری دوستی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد کے منظر نامے میں زیادہ تر جنگ کے بھیانک شور کی گونج ہی سنائی دیتی رہی، جرمنی کا مسئلہ، ناٹو کا قیام واستحکام اشتراکیت کے پھیلاؤ کے خلاف مہمات اور عالمی سطح پر دو خیموں میں تقسیم اس دور کے اہم امور ہیں۔

ان حالات میں روس بھی زیادہ سے زیادہ طاقت کے حصول کی سیاست میں الجھ گیا، اور مغربی ممالک کے ساتھ اس کی اچھی خاصی مقابلہ آرائی شروع ہوگئی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اثرات بڑھانے اور حلیف وحامی پیدا کرنے کی خواہش بھی تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

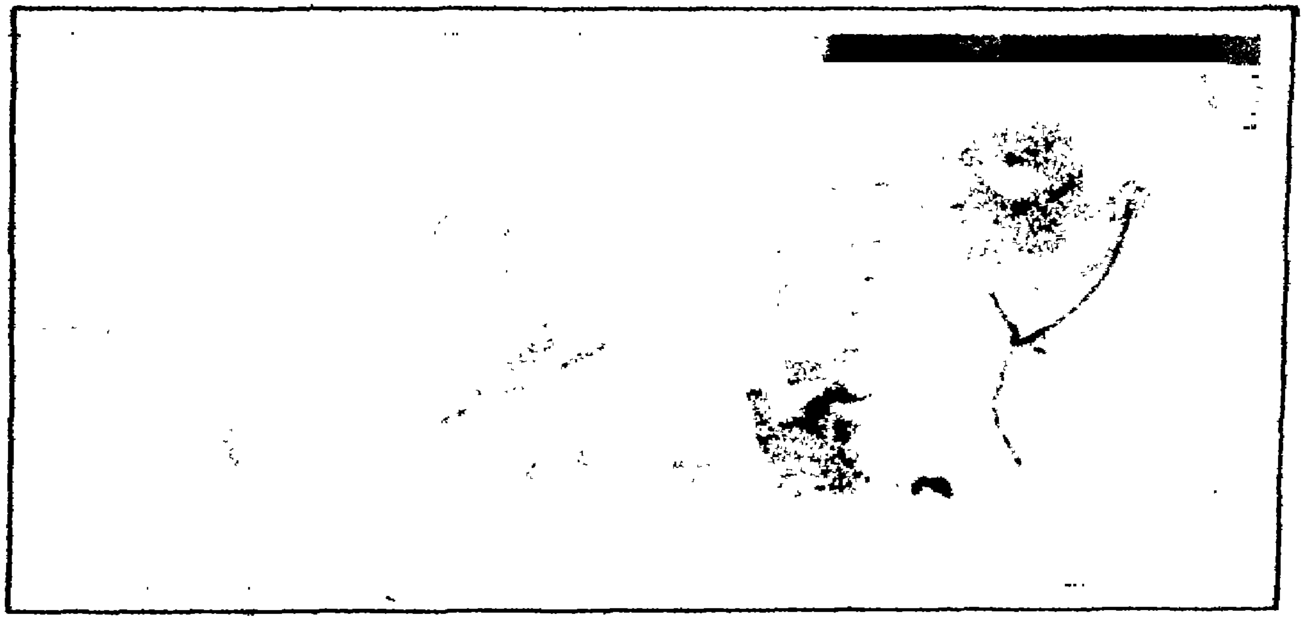
آزادی کے بعد ہندوستان نے جو نوآبادیت، سامراج، نسل پرستی کے خلاف اور ناوابستہ پالیسیاں اختیار کیں، ان کے سیاق وسباق میں روس اسے ایک قریبی دوست کے روپ میں ہی نظر آیا —— اور یہ بھی حقیقت ہے کہ غیرملکی استبداد سے نجات حاصل کرنے کے فوراً بعد ہندوستان کو اپنی ترقیات کے صنعتی وزرعی پروگراموں کے لیے مدد کی ضرورت تھی۔ روس کسی قسم کے اکراہ وتعصب کے بغیر ہندوستان کی مدد کے لیے آگے آیا، اور اس نے ہندوستان کو صنعتی منصوبوں کی تکمیل کے لیے مشینری، ساز وسامان، تکنالوجی، تکنیکی عملہ اور مالی امداد سبھی کچھ فراہم کیا، اور روس نے امداد کے ساتھ کوئی شرط یا پابندی بھی عائد نہیں کی۔ ہندوستان کو اپنی صنعتی حکمت عملی کے تعین اور اس پر عمل درآمد کی پوری پوری آزادی رہی۔ سرکاری سرمایہ داری کی پالیسی اختیار کرنے کے لیے بھی کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا، اور نہ ہی سرکاری سماج واد، منصوبوں کی آزاد معیشت کے سلسلے میں مجبور کیا گیا۔ یعنی یہ کہ امداد کو کسی قسم کے نظریاتی دائروں میں مقید نہیں کیا گیا۔ ہندوستان کی صنعتی ترقی میں روسی تعاون کا بڑا حصہ رہا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی معاملات میں روس نے ہندوستان کی پوری پوری سیاسی حمایت کی ہے۔ خواہ وہ مسئلہ کشمیر ہو، ہند، پاک جنگ ہو، ہند چین سرحدی تنازعہ ہو، بنگلہ دیش کی جنگ ہو، ہر معاملہ میں روس ہندوستان کا حامی رہا ہے۔ چین اور پاکستان کے گٹھ جوڑ کی موجودگی میں اس حمایت کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ روس ہندوستان کو جنوبی ایشیائی خطے کی بڑی طاقت خیال کرتا ہے اور اسے ایشیا کی بااثر قوت سمجھتا ہے۔ اور اسی بنا پر دونوں ممالک کے مابین گہرے سیاسی واقتصادی روابط قائم ومستحکم ہوئے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ روس نے شروع ہی سے ہندوستان کی موثر قوت واہمیت کو تسلیم کیا ہے، چین کے اعصابی رویے اور امریکہ کی اتحادی پالیسی کے پیش نظر اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے —— امریکہ نے جس طرح اپنے آپ کو سب کا رکھوالا فرض کر لیا ہے اور جس طرح وہ اپنے مفادات کی تکمیل کر رہا ہے اس کی بنا پر پوری دنیا میں تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے اور اس کے ردعمل کے طور پر روس بھی میدان میں آیا ہے۔ خواہ ہند چین ہو، مشرق وسطیٰ ہو یا برصغیر ہند، ہر جگہ یہی صورت نظر آتی ہے۔

امریکہ کی طرف سے پاکستان کو مسلسل سیاسی، اقتصادی وفوجی مدد، اس کی جارحانہ پالیسیوں کی اندھا دھند حمایت اور چین کی جانب سے پاکستان کی حمایت، ہندوستان کی سرحدوں پر جنگ، ہندوستان کی ہزاروں مربع میل زمین پر قبضہ اور اس کے علاوہ بحر ہند میں امریکہ کی فوجی موجودگی۔

ان سب اسباب نے ہندوستان اور روس کو قریب لانے میں اہم رول ادا کیا۔ دونوں ممالک کے درمیان سیاسی، اقتصادی و حفاظتی امور کے سلسلے میں تعاون اور بڑھا۔ ہندوستان کے حفاظتی و دفاعی اہمیت کے معاملات میں روس نے ہندوستان کی مدد جی کھول کر کی ہے۔ روس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ امریکی ساتویں بیڑے کی حرکت رک گئی ہے، بلکہ اس کی فوجی اہمیت کی امداد سے ہندوستان کا دفاع مضبوط تر ہوا ہے۔

ان تمام واقعات و حقائق کے پیش نظر ہی ۱۹۷۱ء میں ہند، روس دوستی معاہدہ ہوا تھا، جس سے ہر دو ممالک کے باہمی تعلقات کو اور بھی استحکام

کے لیے کافی تھا، اور اس امر کا غماز تھا کہ ہندوستان اور روس مختلف میدانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کتنی دور تک جا سکتے ہیں، اور یہی جذبہ حالیہ چوٹی کانفرنس کے دوران بھی نظر آیا۔ درحقیقت مغربی ممالک کے ساتھ تفوق سے میل جول کے بعد ہی شری راجیو گاندھی کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر ان کے نانا نے مارشل بلگانن اور مسٹر خروشچیف کا شاندار استقبال کیا تھا۔ جنتا حکومت کے مختصر دور کے علاوہ ہند، روس دوستی کے سلسلے میں سرکاری پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اس زمانے میں امریکہ اور روس سے یکساں دوری کے اعتبار سے ہندوستان کی حقیقی ناوابستگی کی سب



حاصل ہوا۔ روس کی جانب سے ہندوستان کی ناوابستہ پالیسی کی حمایت اور عام طور سے ناوابستہ تحریک کو روس کی جو ہمدردیاں حاصل رہی ہیں، اس سے بھی ہند، روس دوستی کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ نسل پرستی، اسلحہ کی دوڑ، نوآبادیت، سامراجیت اور خصوصاً نیوکلیائی اسلحہ سازی کے خلاف دونوں ممالک شانہ بشانہ صف آرا رہے ہیں۔

اب شری راجیو گاندھی اور شری گورباچوف کی قیادت کے زمانے میں دونوں ممالک کے تعلقات کو اسی سیاق و سباق میں دیکھنا چاہیئے۔ دہلی میں ہوئی دونوں رہنماؤں کی حالیہ چوٹی کانفرنس کے بعد دونوں ملک اور ان کے عوام ایک دوسرے کے اور قریب آئے ہیں۔

پاکستان کی اسلحہ بندی، بحر ہند، ایشیائی بحرالکاہل کا تحفظ، اسلحہ کی دوڑ اور ترک اسلحہ جیسے امور پر دونوں ممالک کے درمیان مکمل اتفاق رائے اور مشترکہ خیالات کی بنا پر دونوں ممالک کے تعلقات اور مستحکم ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی سیاسیات میں شری راجیو گاندھی کا ایک منفرد انداز ہے۔ امریکہ سے واپس ہوتے وقت وہ پہلے سے کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر ماسکو گئے۔ ان کا یہ اقدام زبان حال سے بہت کچھ کہتے

باتیں بے معنی ثابت ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ تاریخی عوامل کی اہمیت اپنی جگہ مسلم رہی ہے۔ یہ ایک تاریخی ضرورت ہے کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے دوست رہیں، صرف اپنے فائدے کے لیے ہی نہیں بلکہ امن عالم کے لیے بھی۔

دونوں قائدین کے مابین ہوئے معاہدوں اور حالیہ گفت و شنید کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیئے۔

روس نے بجلی، کوئلہ، فولاد اور پٹرولیم کے چار بڑے ہندوستانی پروجیکٹوں کی مکمل تکمیل کے لیے ڈیڑھ ارب روبل (۲۸ ارب ۸۳ کروڑ روپے) کے قرضے کی پیش کش کی ہے۔

روس کی جانب سے ہندوستان کو دیا جانے والا یہ سب سے بڑا قرضہ ہے اور یہ ایک ارب روبل کے اس قرضے کے علاوہ ہے جس کی پیش کش شری راجیو گاندھی کے دورۂ ماسکو کے دوران کی گئی تھی۔

اس سلسلے میں جو معاہدہ ہو گا اس کے تحت روس ہندوستان کو سائنسی و تکنیکی تعاون دے گا، اور نہ صرف ماہرین بھیجے گا بلکہ ہندوستانی ماہرین کے لیے تربیت کا بندوبست بھی کرے گا۔ اس کے علاوہ [illegible]

سائنسی و ٹکنیکی تعاون کے لیے ایک وسیع ڈھانچہ تیار کرنے کے سلسلے میں بھی معاہدہ کیا گیا ہے۔

مشترکہ پیداوار، پیداواری تعاون، کسی تیسرے ملک میں مشترکہ پروجیکٹ، روس میں چل رہے تعمیری اور صنعتی پروجیکٹوں میں ہندوستان کی شرکت وغیرہ باہمی تعاون کے اہم پہلو ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں روس میں ایک ہندوستانی میلے کا انعقاد بھی اس معاہدے میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ آئندہ موسم سرما میں ہندوستان میں روسی میلہ بھی منعقد ہوگا۔

روس اور ہندوستان کے درمیان اقتصادی تعاون کی تین دہائیوں کے خاص پہلو درج ذیل ہیں۔

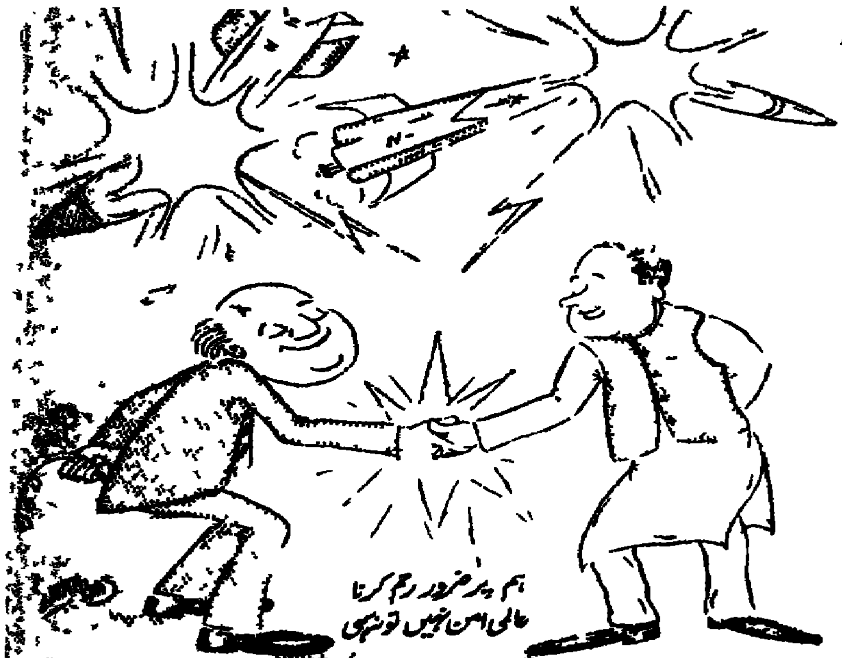
(۱) ہندوستانی روپیہ کی شکل میں ادائیگی کے معاہدے۔
(۲) مشینری اور ساز و سامان کی فراہمی کے لیے رعایتیں و قرضہ جات۔
(۳) برآمدات کے ذریعہ قرضوں کی واپس ادائیگی۔
(۴) روس کی طرف سے پٹرولیم کے مصنوعات کی فراہمی کا خصوصی معاہدہ۔

ہندوستان کی صنعتی پیداوار میں روس کا حصہ ستمبر ۸۲ء کے دوران فولاد میں ۳۵ فی صد، تیل میں ساٹھ فی صد، تیل کی صفائی میں ۳۵ فی صد، پٹرول کی مصنوعات میں ۳۰ فی صد، بجلی میں ۲۰ فی صد، اور کوئلے میں ۴ فی صد رہا۔ ۱۹۹۰ء کے دوران، صنعتی پیداوار کے سلسلے میں، ۱۹۷۹ء کے طویل المدتی پروگرام کے تحت، یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ دو کروڑ دس لاکھ ٹن فولاد میں سے ایک کروڑ چالیس لاکھ ٹن ڈھائی کروڑ ٹن تیل میں سے ایک کروڑ چالیس لاکھ ٹن تیل موجودہ ہند روس مشترکہ پروجیکٹوں کے ذریعے سے تیار ہوگا۔ ۱۹۵۳ء میں ہندوستان کی تجارتی کارکردگی ایک کروڑ تیس لاکھ کی تھی اور ۱۹۸۳ء میں یہ بڑھ کر ۳۱ء۲ ارب ہوگئی۔ اسی طرح برآمدات دو فی صد سے بڑھ کر ۳ء۱۳ فی صد ہوگئیں اور درآمدات ۱۰ فی صد سے بڑھ کر ۱۵-۸ فی صد ہوگئیں روس، ہندوستان کی روایتی برآمدات کا اکیلا سب سے بڑا گاہک رہا ہے۔ روسی معیشت کا استحکام، افراط زر سے اس کی محفوظیت اور استواری روس سے ہند کی تجارت میں کافی معاون رہے ہیں۔

آج کل اس سلسلے میں کافی دلائل دیے جاسکتے ہیں کہ روپیوں میں ادائیگی کے معاہدوں کو منسوخ کردیا جائے، کیوں کہ اعلیٰ ٹکنالوجی کے میدان میں روس کی طرف سے ہندوستان کے مطالبات پورے نہ کئے جانے کے سبب ہند امریکی اور [illegible] پالیسی میں فرق آ رہا ہے۔

پاکستان کو جس طرح تیزی کے ساتھ اسلحہ سے لادا جا رہا ہے اس کے پیش نظر ہندوستان کے حفاظتی مسائل پر بھی دونوں ممالک کے قائدین نے خصوصی توجہ دی۔ اگر چہ مسٹر راجیو گاندھی نے روس۔ ایشیائی اجتماعی سلامتی کے خیال کو پسند کیا، لیکن اس ضمن میں بات چیت آگے نہ بڑھ سکی۔ بہرکیف ایک جانب مسٹر راجیو گاندھی نے امن عالم کے سلسلے میں مسٹر گورباچوف کی مساعی اور [illegible] کی پیش کردہ تجاویز کی توصیف کی تو دوسری طرف مسٹر گورباچوف نے [illegible] مسٹر راجیو گاندھی کی مساعی امن کی خوب داد و تحسین کی اور ۱۹۸۵ء [illegible] کے سلسلے میں پسندیدگی کا اظہار کیا۔

[illegible]




ممالک کو یکساں طور پر تشویش ہے اور اس بنا پر دونوں کے مابین اتحاد و اتفاق و اشتراک لازم ہے۔ یہ بات اہم نہیں کہ ہندوستان امریکہ یا روس کی پالیسیوں کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ حقیقت بہر حال اہمیت کی حامل ہے کہ روس، ہندوستان کو ایشیائی خطہ کی ایک مستحکم طاقت خیال کرتا ہے اور اسی بنا پر کچھ ایسے باہمی امور میں اشتراک کے لیے تیار ہے، جو دونوں ممالک کے لیے مفید ہیں، اور یہی سبب ہے کہ ہندوستان اور روس کے تعلقات خالصتاً باہمی بنیادوں پر ہیں اور اسی جذبہ کے تحت امن عالم اور علاقائی مسائل میں اقوامی امور کو بھی مرکز توجہ بنایا جاتا ہے۔

افغانستان میں روسی مداخلت، خواہ کن ہی دفاعی اسباب کی بنا پر ہو، مگر اس سے ہندوستان کو کافی بے چینی لاحق ہوئی ہے، کیوں کہ ہندوستان کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ اسے اس روسی مداخلت اور روس کے ساتھ اپنی دوستی کے مابین ایک متوازن موقف اختیار کرنا ہے، اور اسی مقصد سے ہندوستان نے ایک خاص سفارتی زبان اختیار کی ہے اور اسی لہجہ میں ہندوستان نے اکثر اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ روس کو افغانستان سے ہٹ جانا چاہیئے۔ ہندوستان نے اکثر روس اور پاکستان کے درمیان ایک قسم کی ثالثی کا فرض انجام دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ بہر حال اس امر پر زور دیتا ہے کہ اس قسم کے رویہ کا اظہار امریکہ کی جانب سے بھی ہونا چاہیئے۔ یعنی افغانستان کو بین الاقوامی ضمانت ملنی چاہیئے۔ مسٹر راجیو گاندھی اپنے تبادلہ خیالات کے دوران یہ بات امریکہ اور پاکستان دونوں پر پوری طرح واضح کر چکے ہیں۔

بین الاقوامی روابط کی موجودہ صورت حال میں، جب کہ [illegible] جنگ کا خوف سارے کرۂ ارض پر طاری ہے، جب کہ [illegible] تشویش بنیادی اصولوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، تو [illegible] ہندوستان اور روس کے تعلقات [illegible] کی [illegible] مکمل کر [illegible] ہے۔

بلراج ورما

# سارک ثقافتی نشاۃِ ثانیہ

جنوبی ایشیا کے ممالک اپنے عوام کی بہبود اور ان کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے آج کل قومی تعمیر کی سعی میں مصروف ہیں۔ اپنی قومی ثقافتوں کو فروغ دینے اور انہیں برقرار رکھنے کی جانب ان ممالک میں کی جارہی قومی کاوشوں کی روز افزوں شہادت ملتی ہے۔ البتہ قومی ثقافتوں کا فروغ جہاں قومی تعمیر نیز قومی شناختوں کے ادعا کے لیے ضروری ہے وہاں یہ ان ممالک کی طرف سے سرکاری چارہ جوئی اور خاص کر اس کی ثقافت کے بنیادی ڈھانچے پر شدید دباؤ اور تناؤ ڈالتا ہے۔ سارک جذبہ اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کے ممبر ممالک جو کہ جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے ملحق ہیں، اپنی تعمیر و ترقی کے مقصد سے کی جانے والی تمام بڑی کوششوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ بنگلور چوٹی کانفرنس نے اس امر کو تسلیم کیا کہ اس خطے کا ثقافتی فروغ اس کی عام تعمیر و ترقی کا ایک اہم جزو ہے اور اس میدان میں تعاون حاصل کرنے کے لیے اس خطے کے عوام کے مابین ایک بہتر مفاہمت بے حد ضروری ہے جبکہ گوناگوں حقائق کے پیش نظر ایک دوسرے کی ثقافتوں کی انفرادیت اور رنگارنگی کی قدر کی بنا پر اس خطے کو باہمی ثقافتی تعاون کے لیے سرتوڑ کوشش کرنی ہوگی اور کثرت میں وحدت کے اصول کی بنیاد پر اپنے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کرنا ہوں گے۔

چنانچہ ثقافتی فروغ کو مجموعی قومی تعمیر اور بشر کی مادی اور روحانی پیش رفت کا ایک اہم حصہ مان لیے جانے پر اس خطے کے عوام کو صادق سارک جذبے کے تحت نہ صرف سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بلکہ علم آثارِ قدیمہ، عجائب خانوں، ریکارڈ خانوں، کتب خانوں، ادب، بصری فنون، سینما، ٹیلی ویژن اور کھیلوں جیسے دیگر مختلف میدانوں میں بھی باہمی اور کثیر الفریقی معاہدوں اور تبادلہ کے پروگراموں میں اب شرکت کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے ممالک میں مخصوص شعبوں میں کام کرنے والے اہم قومی اداروں کی نشاندہی کر سکتے ہیں اور ان کی ایک فہرست تیار کر سکتے ہیں جو کہ خطے میں رہنے والے سبھی لوگوں کے لیے خصوصی مہارت کے اہتمام اور دستیابی کی خاطر جانکاری دینے والے بینکوں نیز تربیت و علاقائی اشتراکِ عمل کے مراکز کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان پروگراموں میں یہ امور شامل کیے جا سکتے ہیں جیسے جانکاری کا تبادلہ، فلمیں، مائیکروفلمیں، مائیکروفیش، سائنسی، ادبی اور ثقافتی نوعیت کی کتب کے براہ راست تراجم، تفہیمی نظاموں (انسانی، معاشرتی اور فلسفیات) کے مطالعہ کے لیے بین شعباتی پروجیکٹ نیز مخصوص شعبوں میں مروج اور متعلق صنعت کارانہ روایات۔ مزید برآں مشترکہ ثقافتی پروجیکٹ بالخصوص وہ جن کا تعلق معاشرتی ثقافتی نظاموں، ماحولیات کے تحفظ اور فروغ سے ہو مرتب کیے جائیں اور روایتی ہنرمندیوں کے علاوہ صنعتی مظاہرات کو ترقی دینے کے لیے ان پر عمل کیا جائے تاکہ ان کی رسائی دہلی کے حالیہ "اپنا اُتسو" جیسے ترمیتی تہواروں کے ذریعہ نوجوان طبقے تک ہو سکے۔

ان سرگرمیوں میں نوجوانوں کی شرکت، ان کے ورثے کی نشاندہی اور قدردانی نیز ثقافت کے مفاد کو فروغ دینے میں بڑا کام کرے گی۔ سارک کے ممبر ممالک کو مل کر مطالعہ کے طریقوں کو مرتب کرنا چاہیے اور ان میں سدھار لانا چاہیے۔ قومی اور علاقائی ترقی کے لیے ثقافتی اور دیگر سرگرمیوں میں پُرجوش اور تخلیقی انداز میں حصہ لینے کے لیے خواتین اور مردوں کو باہمی بنا پر تحقیقی فیلوشپ کی پیشکش کی جانی چاہیے، نیز ان کے قیام، ترقی اور مزید نشوونما کے لیے مستقل مشترکہ تنظیموں کی بنا ڈالنی چاہیے۔ مختلف ثقافتی روایات سے متعلق جانکاری کی اشاعت کے لیے ذرائع ابلاغ عامہ کا تخلیقی اور تعمیری استعمال اس مقصد کے حصول کے لیے ایک اور وسیلہ پیش کرتا ہے۔ ان سرگرمیوں کی منصوبہ بندی کرنے، پروگرام بنانے اور ان پر عمل درآمد کے سلسلے میں خطے کے موجودہ کچھ تعلیمی اور سائنسی اداروں کو بھی جو یہ ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہوں، سرگرم طور پر شامل کیا جا سکتا ہے۔

کھٹمنڈو میں حال ہی میں قائم کیا گیا سارک سکریٹریٹ اپنی طرف سے خود کو مذکورہ تجویزوں کے اصل منشا اور مقاصد کے ساتھ وابستہ کر سکتا ہے اور ثقافت کے مفاد کو آگے بڑھانے کے لیے مخصوص پروجیکٹ نیز سرگرمیاں مرتب کر سکتا ہے اور ان شعبوں میں خطے کے ممبر ممالک کے ساتھ تخلیقی انداز میں تعاون کر سکتا ہے۔ وظائف، فیلوشپ اور سفری گرانٹوں کے قیام کے ذریعے وہ ان پروگراموں میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ سہولیات محققین، ماہرین اور ثقافتی منتظمین کو اس قابل کریں گی کہ وہ ان پروجیکٹوں میں تربیت حاصل کریں اور اپنے تجربے میں ایک دوسرے کو شریک کریں۔ سائنسی، ادبی اور ثقافتی دلچسپی کی اہم تحریروں کے براہ راست ترجمے کے پروگراموں میں بھی مذکورہ سکریٹریٹ ممبر ممالک کی مدد کر سکتا ہے۔

## نوجوان اور ثقافتی زندگی

نوعِ انسان کے ثقافتی ورثے کو برقرار رکھنے کے کام میں ہمیں نوجوانوں کو ضرور شامل کرنا چاہیے۔ معاشرے کی سماجی اور سیاسی زندگی نیز امن اور بین علاقائی مفاہمت میں ممد ہونے کے ضمن میں جنوبی ایشیا کی کل آبادی کے نصف حصے پر مشتمل نوجوانوں کی فطری امنگوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خطے کے ممبر ممالک کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ان کو ـــ خصوصاً ان میں سے کم نصیبوں کو ـــ تعلیم، سائنس اور ثقافت تک مفت رسائی بہم پہنچا کر ان کے فنکارانہ، ثقافتی اور ذہنی معیارات کو اونچا اٹھائیں۔ عالمی ثقافتی ورثے کے سیاق میں قومی روایات کو سمجھنے اور ان کا احترام کرنے کے لیے لازمی طور سے ان کی حوصلہ افزائی بھی کرنی چاہیے۔ عصری تہذیب اور انسان کے مستقبل کے تعلق سے ان میں سماجی ذمہ داری کا شعور پیدا کرنا چاہیے۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع کی بدولت کیے جانے والے گمراہ کن پروپیگنڈے، مثلاً دہشت گردی کے خیالات، جنگ اور تشدد، قوموں کے مابین مخاصمت اور نسلی امتیاز اور فحش نگاری اور بدعنوانیوں کی متعدد دیگر صورتوں کے ذریعے سے حد تجارتی نوعیت کی عصری ثقافت کی برائیوں کی اشاعت سے ان کی اخلاقی اور روحانی صحت کو درپیش خطرات

کو تسلیم کرنے اور ان سے بچنے کے لیے ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کرنی چاہیے۔ الغرض قوموں کے مابین امن دوستی اور تعاون کے اصل منشا کو سمجھنے میں نوجوانوں کی مدد کے لیے خطے کو اپنی طرف سے پروگرام وضع کرنے چاہئیں۔

نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لیے ثقافتی سرگرمیوں کی اہمیت کے پیش نظر نیز اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ موجودہ ثقافتی پروگرام اور حکمت عملیاں ان کی فوری امنگوں کو شاید پورا نہ کر پائیں، سارک کے لیے اچھا ہوگا کہ وہ ایسی ثقافتی سرگرمیوں کے ایک وسیع سلسلے کی نشاندہی کرنے اور اسے فروغ دینے میں سرتوڑ کوشش کرے جو کہ نہ صرف نوجوانوں کی ضروریات اور امنگوں کو پورا کریں بلکہ ان میں سماجی ذمہ داری کے احساس پر بھی زور دیں جہاں ضروری ہو ممبر ممالک کو قانونی اقدامات سے بھی ایسے مناسب حالات پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ان کی قومی ثقافت سے متعلق پالیسیوں کی تشکیل میں ان کے جائز حق کے علاوہ ثقافت میں ان کی بلا رکاوٹ رسائی اور سرگرم شرکت کو یقینی بنائیں۔

خطے میں تعاون اور مفاہمت کو تقویت دینے کی غرض سے جنوبی ایشیا کے نوجوانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، یہ ضروری ہے کہ سبھی جنوب ایشیائی ممالک اکٹھے ہوں اور بشمول دیگر امور کے عالمی امن اور آفاقی ثقافت کے فروغ کے لیے کام کرنے کے اعتبار سے سارک کے ادارے کے طور پر جنوب ایشیائی یوتھ انسٹی ٹیوٹ مستقل بنیاد پر قائم کریں جس کا مرکز [illegible] ملک میں واقع ہو۔

مختصر یہ کہ چونکہ نوجوان جنوبی ایشیا کے ممالک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ہیں اور اس اعتبار سے اپنی ثقافتوں کا انتہائی طاقتور جزو ہیں، یہ ضروری ہے کہ انہیں ثقافت کے فروغ و ترقی کے عمل میں نہ صرف قومی بلکہ خطے کی سطح پر بھی مربوط طور پر شامل کر لیا جائے۔

خطے میں امن و مفاہمت کو مستحکم کرنے کے لیے، اس میں واقع مختلف ممالک کے مابین مساوی حقوق پر مبنی باہمی طور پر فائدہ مند ثقافتی تعاون ایک اہم عنصر ہے ان ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے اور ان کی قومی ثقافتوں میں باہمی اضافے کی صورت میں بین علاقائی ثقافتی تبادلوں کی طرف بنگلور چوٹی کانفرنس نے پہلے ہی توجہ دلائی ہے اور ان کے فروغ کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس کانفرنس میں خطے کے تمام ممالک کے مابین جمہوریت، خودمختاری، دوسروں کے داخلی امور میں عدم مداخلت اور ایک دوسرے کے قوانین اور روایات کے احترام کے اصولوں پر ثقافت کے میدان میں وسیع اور ہمہ گیر تعاون کے فروغ کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ لہٰذا اب یہ اچھا ہوگا، کہ ممبر ممالک ان مقاصد کی حمایت کے لیے بین علاقائی تعاون کے پروگراموں کو مفصل طور سے تیار کریں اور انہیں انجام دیں، مختصر یہ کہ فلموں اور فن کے میلوں، مشترک فلموں کی مشترکہ تخلیق، تعلیمی و ثقافتی فلمیں، کتب اور رسائل تحفہ

سرود کی محفلیں، آرٹ نمائش اور آرٹ البموں کی تیاری جیسی سرگرمیاں شروع کرنے کے لیے ان ممالک کو اب سرتوڑ کوششیں کرنی چاہئیں بین علاقائی ثقافتی تبادلوں کو ترقی دینے کے لیے انہیں قومی ٹریڈ یونینوں، خواتین اور نوجوانوں کی تنظیموں، امداد باہمی کی انجمنوں اور دیگر عوامی جماعتوں کو ان میں حصہ لینے کی بھی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ ہر ممبر ملک کو یہ بھی کہا جائے کہ جنوب ایشیائی مصنفوں اور شاعروں کی تصانیف کے انتخابات کی تالیف اور اشاعت کے لیے نمائندہ ادبی تصانیف کی فہرستیں تیار کریں اور انہیں کٹھمنڈو میں واقع مرکزی سارک سکریٹریٹ کو ارسال کرے

اس کے علاوہ سکریٹریٹ کو درخواست کی جائے کہ وہ ممبر ممالک کے مابین ثقافتی تبادلوں کو فروغ دے، باہمی دلچسپی کے معاملات میں تحقیق کے نتائج اور اطلاعات کی ادلا بدلی کرنے کا انتظام کرے اور اس کام میں مدد کرے، علاقائی مفاہمت، ثقافت اور امن کے مسائل سے متعلق پروگراموں کی توسیع کرے، نیز جنوب ایشیائی مصنفوں اور فنکاروں کے تئیں ادب اور فن کے لیے انعامات قائم کرے اور عطا کرنے کے امکان پر غور کرے۔

اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ تہذیبوں کا باہمی تعارف، انسانی ورثے سے وسیع تر واقفیت میں مدد دیتا ہے، نیز یہ دیکھتے ہوئے کہ جنوب ایشیائی خطہ جو دنیا میں ثقافت کے انتہائی مالا مال خزینوں پر مشتمل ہے نوع انسانی کی ثقافتی دولت میں اس سے کہیں زیادہ اضافہ کر سکتا ہے جتنا کہ اس نے اب تک کیا ہے اور روایات

سارک



'SMILING MASKS'

[illegible] اپنی طویل تاریخ کے دوران جنوب ایشیائی ممالک نے دنیا کو متعدد ایسے عظیم مفکر اور عالم دیے [illegible] جنہیں لوگ نہ صرف پوری طرح جانتے ہیں اور [illegible] قدر کرتے ہیں، جنگلور چوتھی کانفرنس نے جنوب ایشیائی ثقافت کی صحیح اور متعلقہ صفات کی وضاحت کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا تاکہ اہل دنیا اس کی اصلی قدر و قیمت سے استفادہ کر سکیں۔

آج کے حالات کو دیکھتے ہوئے خطے کے ہر ملک کو دوسرے ایشیائی ممالک کی ثقافتوں کا مطالعہ کرنے کے لیے اور اپنے اسکولوں کی درسی کتب میں دیگر ایشیائی قوموں کے عظیم مفکروں اور عالموں کی زندگیوں اور تصانیف کے بارے میں معلومات مہیا کرنے کے مقصد سے اپنی یونیورسٹیوں میں تاریخ اور تہذیب کے شعبے قائم کرنے چاہئیں۔

ثقافتی ورثے کے تحفظ کے لیے قومی کوششیں اکثر ناکافی ہوتی ہیں کیونکہ اس ملک کے اقتصادی، سائنسی اور تکنیکی وسائل جس میں تحفظ دی جانے والی چیز واقع ہوتی ہیں قلیل ہوتے ہیں۔ لہٰذا سارک سکریٹریٹ کو چاہیے کہ اس خطے کے ثقافتی ورثے کے لیے خاطر خواہ تحفظ حاصل کرنے نیز اس کے فنون کو فروغ دینے کی غرض سے ترقیاتی تحقیق اور دستاویزی لوازم سے متعلق پروگراموں پر عمل درآمد کے لیے خطے کے ممبر ممالک کے تعاون کے ساتھ "مرکز برائے علم آثار قدیمہ و فنون لطیفہ" کے قیام اور فنون کے فروغ کی حمایت کرے۔

ہم جانتے ہیں کہ جنوبی ایشیا کی تاریخ کے مختلف ادوار میں ٹیکسلا کی قدیم بودھ یونیورسٹی جیسے علم اور ثقافت کے متعدد معروف مراکز بین علاقائی اور بین اقوامی ثقافتی تعاون نیز خیالات اور تجربات کی باہمی آبیاری کے لیے وسائل کی حیثیت رکھتے تھے اور دنیا کے ہر حصے سے اہل قلم، فنکار، علما اور زائرین ان میں کشاں کشاں آتے تھے۔ بعد میں یہ مراکز اور ادارے یا تو تاریخی انقلابات نے منہدم کر دیے یا غیر ملکی فاتحین کے عروج کے بعد یہ زوال پذیر ہو گئے۔ ان فاتحین نے اپنی طرف سے ویسے ہی مراکز قائم کیے، جو رنگ جگ۔ آفاقی طور پر عصری علمیت کے منفرد مخزن شمار ہونے لگے اور اس طرح علم کے متلاشیوں کا رخ مغرب سے مشرق کے بجائے مشرق سے مغرب کو مڑ گیا۔ اس صورت حال کے نتیجے میں ایشیائی طلبا اور علما نہ صرف مغربی ثقافت اور علوم کے مطالعے اور تحقیق کے لیے بلکہ خود اپنی لسانیات، ادبیات اور ثقافت کے سلسلے میں بھی ان مغربی مراکز میں جوق در جوق جانے لگے۔ ان میں سے کچھ قدیم اور مقدس مراکز کا جنوب ایشیائی سرزمین پر بحال ہونا، اس خطے کے عوام کے مابین بیش بہا ثقافتی اشتراک اور ربط فراہم کرے گا نیز نو آبادیاتی عہد کے باعث ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو بھی پھر سے جوڑ دے گا۔

جنوب ایشیائی ممالک فن تعمیر کے بھرپور ورثے کے مالک ہیں۔ ان کی قدیم یادگاروں اور شہری مراکز نے فنکاروں اور کاریگروں کی تعلیم و تربیت کی بستیوں کے روایتی انداز کو اکثر برقرار رکھا ہے۔ سارک کے ممبر ممالک کے لیے موزوں ہوگا کہ وہ اپنے قدیم شہروں کے بچاؤ کے لیے مناسب قانونی اقدامات اختیار کریں، نیز اس امر کو یقینی بنائیں کہ ایسے شہروں کی مزید ترقی ان کی روایتی شناخت سے مطابقت رکھے۔ "شہری اور دیہی منصوبہ بندی میں قدیم شہری مراکز سے متعلق ثقافتی اخلاق کا ضابطہ" تیار کرنے کے لیے جنوب ایشیائی ممالک کے شہری منصوبہ کاروں کا ایک اجلاس بلایا جائے جو کم از کم تجربوں کی بدولت بیش از بیش نتائج حاصل کرنے میں بھی ان ممالک کی مدد کرے۔ سارک سکریٹریٹ قائم ہو جانے پر اس سے درخواست کی جانی چاہیے کہ وہ یونیسکو کی مدد سے افریقہ میں ڈاکر کے مقام پر قائم شدہ اسکول کی طرز پر اپنے کسی ممبر ملک میں فن تعمیر کا ایک پائلٹ اسکول قائم کرے جس میں فن تعمیر کے ماہرین کو ماحول کی بدصورتی کو سنوارنے اور اسے معیاری بنانے کے مناسب ذرائع معلوم کرنے کی تربیت دی جائے۔ وہاں انہیں شہروں کی منصوبہ بندی کی اسکیموں کی تفصیلات تیار کرنا بھی سکھایا جائے، جو ثقافت کی ہم آہنگ زندگی کی تعمیر میں انتہائی مددگار ہوگا۔

ہم اس کردار کو تسلیم کرتے ہیں جو امن اور سلامتی کے قیام اور استحکام کے لیے سارک ادا کر سکتی ہے اور ہمیں پورا بھروسہ ہے کہ پنچ شیل کے اصول کا اصل منشا یعنی قومی آزادی، ملکی خود مختاری، مساوی حقوق، خود ارادیت اور دوسروں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت جیسے نصب العین اس کی جملہ حکمت عملیوں اور پروگراموں پر چھائے رہیں گے۔

## خلاصہ اور تجزیہ

جنوبی ایشیا کے ممالک کا ایک دوسرے کے ساتھ اتنا ربط نہیں رہا جتنا کہ وہ اکثر مغربی خطے کے ممالک کے ساتھ رکھتے ہیں۔ جنوب ایشیا سیاق میں ثقافتی تعاون ایک دوسرے کے رہن سہن کے بارے میں عظیم تر مفاہمت اور رواداری پیدا کرے گا۔ علاقائی تعاون کا مطلب دوسروں سے الگ تھلگ کرنے والی پالیسی نہیں ہے۔ دراصل آگے چل کر یہ بین اقوامی مفاہمت اور بھائی چارے کی طاقت کو بڑھائے گا جو کہ خطے اور بحیثیت مجموعی پوری دنیا میں ثقافتی ترقی کے فروغ اور عروج کے لیے ضروری ہیں۔ اس تعاون کی بنیاد سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تعاون کے عمل دخل کو تنہا فنون کی قدر افزائی ہی تک محدود رکھا جائے، بلکہ اس میں دیگر سرگرمیوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے جیسے خطے کے ثقافتی اثاثہ اور روایات پر تحقیق، ایشیائی زبانوں کی تعلیم، موجودہ ثقافتی اداروں کا زیادہ مؤثر استعمال، خصوصی ماہرین کی تربیت (اشخاص، بالخصوص نوجوانوں)، ثقافتی معلومات اور اصناف کی ادلا بدلی، مشترکہ مسائل پر مباحثات کے لیے علاقائی کانفرنسوں اور سیمیناروں کا انعقاد، فنی پیشے اور سماعی روایات کی دستاویز سازی کے ذریعے انہیں محفوظ کرنا۔ اہم ترین لحاظ اس بات کا ہے کہ تعاون کی بنیاد لازمی طور سے قومی آزادی، ملکی خود مختاری، مساوی حقوق، دوسرے کے امور داخلہ میں عدم مداخلت اور باہمی مفاد پر ہو۔ یہ عمل یکطرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہونا چاہیے جس میں تبادلے کی ہر شے مساوی قدر و قیمت کی ہو۔ یہ رابطہ "سخی" اور "سوالی" کا سا نہیں ہو سکتا۔ روحانی اقدار اور روایات کے تعلق سے جنوبی ایشیا باقیماندہ دنیا کی ثقافت میں نئی روح پھونکنے کے لیے بہت کچھ دے سکتا ہے۔ یہ علاقائی رابطہ زندگی کی کوالٹی سے وابستہ تصورات کی اہمیت کی چھان بین جیسے شعبوں میں مشترکہ پروجیکٹوں کی شکل میں علاقائی تعاون، ثقافتی کثرت کے حقائق کے پیش قومی شناخت اور یکجہتی کی جستجو اور ٹیکنالوجی کی جدید ترین نیز ترقی یافتہ صورتوں سے قدیم ترین اور راسخ روایات کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی نئی اقدار کے ظہور کو ملحوظ رکھ کر عمل میں لایا جائے۔ دیہی عوام اور قبائلی فرقوں یا آبادی کے محروم ترین طبقوں کے تعلق سے درپیش سماجی اور اقتصادی مسائل اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ سماجی نابرابریاں امن اور سلامتی کے ساتھ براہ راست جڑی ہوئی ہیں۔

وہ سرگرمیاں جن کا نصب العین عوام میں باہمی ثقافتی مفاہمت اور روحانی مصالحت ٹھہرایا گیا ہے امن و سلامتی کو مضبوط کرتی ہیں۔ لہٰذا خطے میں پائیدار امن کے قیام کے خیال سے ان کی بھرپور حمایت کی جانی چاہیے۔ سارک کے ممبر ممالک کو اکیسویں صدی کی [illegible] نئی دنیا میں ایک [illegible] اور ترقی [illegible] قوت کی طرح وارد ہونا چاہیے۔

چارو کیسری

# پنکھڑیاں کنول کی

میلے میں پہونچتے ہی مجھے ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہوا۔ زبردست بھیڑ تھی۔ مگر مجھے انسانوں کی اس زندگی سے بھرپور جھیل میں کھو جانا اچھا لگا جہاں ہماری گنگا جمنی تہذیب کا رنگارنگ کنول، جھیل کی ٹھاٹھوں کی آغوش میں نیک کی طرح مہک رہا تھا۔ چاٹ چوڑیاں، قلفی، پلاسٹک کی بالٹیاں، بندریاں، گھٹیا نیل پالش، مکا کے بھننے دانے، مٹی کے کھلونے، غبارے، سیٹیاں، اور دیوی دیوتاؤں کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں کیا کچھ نہیں تھا۔

ایک مسلم میلے میں بھگوان، رام، عیسیٰ مسیح اور درگا ماتا کی مورتیاں دیکھ کر میں چونک پڑی۔ سوچنے لگی کہ ابھی کوئی اعتراض نہ کر بیٹھے۔ میں محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ مگر اس بھیڑ بھاڑ میں ہندو مسلمان کی تمیز ہی کہاں ہو پا رہی تھی۔ صرف چند برقع پوش عورتیں اور کچھ گول ٹوپیوں والے مرد ضرور پہچانے جا رہے تھے۔ بچے تو سب ایک جیسے ہوتے ہی ہیں، معصوم فرشتوں کی طرح۔

میلہ تو پھر میلہ ہے، یہاں ہر ایک کے لیے صلائے عام ہوتی ہے۔ ہندوستان بھی تو اسی طرح، بنیادی طور پر ایک بہت بڑا سیکولر میلہ ہے۔ رنگارنگ تہذیب و ثقافت یہاں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے رہے ہیں، اور اسی خوب صورت امتزاج نے ہندوستان کو انوکھا پن عطا کیا ہے۔

تبھی ایک بچے نے ایک نقلی سانپ میرے اوپر پھینکا۔ میں چونک کر لرز گئی۔ سانپ لمبا ہوتا چلا گیا تھا۔ میں نے غصے سے اس بچے کے چانٹا رسید کیا اور آگے بڑھ گئی۔ میرا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہاں پولیس بھی موجود ہے۔ خاکی [illegible] اٹھائے ہوئے پولیس والے اس میلے کے [illegible] ماحول میں ایک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھا، [illegible] [illegible] [illegible] گئی۔ گشتا [illegible] [illegible] کی کوشش کر رہا تھا

مگر یہاں پہنچتے ہی میں جیسے خود کلامی کے ایک آسیب میں بھٹکنے لگی۔ میں اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ "ہندوستان کو خدا کی روحانی خلقت کہا جاتا ہے، مگر یہاں ہر ہفتوں کا قتل عام، سیاسی قتل و غارت، فسادات، محدود وفاداریاں، ذات پات، صوبائیت اور زبانوں کے بڑھتے ہوئے اختلافات اور سرحد پار کی وابستگیوں کے پیش نظر ہندوستان کے بارے میں یہ جملہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ اب عوام کو بری سے بری خبر سن کر بھی صدمہ نہیں ہوتا، ان کے باہمی اختلافات دن بدن بڑھتے جاتے ہیں وہ اب احتجاج بھی نہیں کرتے، جب تک معاملہ ان کی ذات سے متعلق نہ ہو، وہ کسی قسم کی تشویش کا روگ نہیں پالتے۔ لیکن جن پر ان حالات کا براہ راست اثر پڑتا ہے، ان کے بارے میں کیا کہا جائے۔ ان کا غصہ، ان کی برہمی تو فطری ہے اور اس غصے میں وہ کوئی منطق، کوئی دلیل نہیں دیکھتے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے بڑے شور و غوغا کے ساتھ کرتے ہیں لیکن یہ لوگ کون ہیں؟ انتہا پسند، محروم یا متعصب، آخر کون ہیں یہ لوگ؟۔ ان کی نشان دہی ضروری ہے اور پھر ان کی غلط فہمی اور ان کی تکالیف کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ یہ لوگ مسائل کے پتلے نہیں ہیں بلکہ یہ خود ہی مسائل گزیدہ ہیں۔

ہندوستان میں مذہب ایک ایسی طاقت ہے جس کی گرفت عوام کی زندگی پر سب سے زیادہ مضبوط ہے، مذہب کے سلسلے میں ہو جانے والی کوئی بھی غلط فہمی یہاں زیادہ تر تصادم اور خون خرابے کا باعث ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا مناسب مذہبی تعلیم سے کچھ بات بن سکتی ہے۔ مثال کے طور پر مذاہب کی تقابلی تعلیم کو لازمی کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں یہ کوئی ایسی بے تکی بات بھی نہیں ہوگی۔

چھوٹے درجوں میں کسی بھی سادھو، پیر، فقیر کی داستان حیات نہایت ہی دل چسپ اور سبق آموز

ثابت ہو سکتی ہے۔ مذہبی پیشواؤں کی سادگی اور ایثار و قربانی سے بھری زندگیاں ہمارے بچوں کے لیے مشعل راہ ہو سکتی ہیں۔ کم از کم ہماری آنے والی نسلیں تو تعصبات سے اور مذہبی منافرت سے پاک ہو سکتی ہیں۔ ہر مذہب معاف کر دینے اور دل سے کدورت نکال دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ تمام مذہبی کتابیں یہی درس دیتی ہیں۔

اس کے بعد اعلیٰ سطح پر چند بنیادی تصورات کا تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر خدا کی وحدانیت کے تصور پر غور و خوض کرنے سے ہی بڑے مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ چونکہ ہندو بہت سے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں، اس لیے غیر ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو خدائے واحد کو نہیں مانتے، اور انھیں کافر کا خطاب دیا جاتا ہے۔ جب کہ یہ خیال ہی سرے سے غلط فہمی پر مبنی ہے یہ غلط فہمی صرف بھگوت گیتا کے مطالعہ سے ہی دور ہو سکتی ہے، اور یہ راز آشکارا ہو سکتا ہے کہ دراصل ہندومت کے قادر مطلق اور اللہ یا گاڈ کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔

تمام مذاہب کے فلسفے میں بنیادی چیز عمل ہے۔ یعنی "جیسا بوؤ گے ویسا ہی کاٹو گے"۔ عیسائیت اور اسلام دونوں ہی میں یوم حشر کا تصور ہے اور یہ ایک کائناتی حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ [illegible] اور گورو گرنتھ صاحب کا پیغام ایک ہے۔ بھگوت گیتا میں بھی قیامت کا بڑا پر جلال بیان ہے۔ ان تمام امور سے یہی واضح ہوتا ہے کہ کوئی مذہب نظریاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے متصادم نہیں [illegible] کیا یہ ایک خوشگوار بات نہیں ہے؟

ہر مذہب میں یہ عقیدہ موجود ہے کہ کائنات کا خالق خدا ہے جو ہر شے پر قادر ہے، اسی نے پیدا کیا ہے اور وہی اسے فنا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

اس اصول کو تسلیم کرتا ہے۔ مرہا وشنو مہیش۔
قرآن کریم میں بھی بعض بنیادی سچائیاں موجود ہیں
کہ اللہ رب العالمین ہے "حشر کے دن فیصلہ اسی
کے اختیار میں ہوگا، اور وہی تمام اشیا پر قادر ہے۔"
بکچہ بنیادی امور کے سلسلے میں متوازی مطالعہ
سے پتہ چلے گا کہ کیاں دور ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ہندو مورتی
پوجا کیوں کرتے ہیں؟ وہ ذات پات کے نظام میں
کیوں یقین رکھتے ہیں۔ بلکہ اسلام حضرت محمدؐ کی
بابت تبدیلی مذہب کے بارے میں کیا کہتی ہے؟
ہر ہندو دیوی یا دیوتا علامتی طور پر کسی
ایک حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے۔ مثلاً علم و فن کی
دیوی الگ ہے اور شوا بدی یوگی ہیں اب جو شخص
اپنی زندگی میں جو چیز حاصل کرنا چاہتا ہے اسی کی
رعایت سے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کر سکتا
ہے۔ گیان دھیان میں لگنے والے ہندی ذہن کے
بھٹکنے کا ڈر ہوتا ہے اس لیے ذہن کو یکسو کرنے کے
لیے مورتی کو ضروری سمجھا گیا۔ شبیہ سامنے ہو تو ذہنی
ارتکاز میں مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ سنتوں اور
مہاتماؤں کی تصاویر اور مورتیاں دل و دماغ کو مہاپرشوں
کا دھیان دلا کر نیک اور پاک خیالات کی جانب مائل
کرتی ہیں۔

اس بات کو ہم ایک برعکس مثال کے ذریعہ
بھی سمجھ سکتے ہیں۔ عریاں تصاویر ذہن و جذبات کو
برانگیختہ کرتی ہیں۔

جہاں تک ذات پات کا سوال ہے، ہمارے
یہاں یہ نظام محنت کی تقسیم کے ایک صحت مند
اصول کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا، بعد میں طاقت
ور لوگوں نے کمزوروں کا استحصال کر کے اس
نظام کو مسخ کر دیا۔ ذات کا تعلق پیشے سے نہیں بلکہ
پیدائش اور خاندان سے جوڑ دیا گیا۔ لیکن اس نظام
کے کرتا دھرتا ہندو رشیوں منیوں کا یہ مقصد ہرگز
نہیں تھا۔

سکھ گوروؤں نے بھی انسانی اخوت اور محبت
کی تعلیم دی، انھوں نے ذات پات کی بنیاد پر عائد کردہ
ہر قسم کی پابندیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ خود
دربار صاحب اس کی روشن مثال ہے۔ اس کا سنگ
بنیاد ہی ایک مسلمان صوفی کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔
اور اس کے دروازے ہر وقت ہر شخص کے لیے کھلے
رہتے ہیں۔

جس طرح مسلمان ہندوؤں میں دیوی
دیوتاؤں کی پرستش پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں،
اسی طرح ہندوؤں کا ذہن "جبری تبدیلی مذہب" کے
سلسلے میں الجھ جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام
کی تعلیمات میں جبری تبدیلی مذہب کی کہیں کوئی گنجائش
ہی نہیں۔



کبھی کبھی صرف ایک لفظ ہی غلط فہمی اور
الجھن کا باعث بن جاتا ہے۔ "کافر" ایک ایسا ہی لفظ
ہے۔ اس لفظ سے مراد غیر مسلم ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ
اس کے معنی تو خدا کے وجود سے انکار کرنے والے
کے ہیں۔ اس کے اور گہرے مطالب بھی ہو سکتے ہیں
مثلاً انسان کے اندر چھپی برائی اور اس کی شخصیت کا
تاریک پہلو۔ اسی پہلو کو قرآن کریم میں کافروں کے خلاف محاذ
آرا ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔

اسلام تو ایک انسانیت نواز مذہب ہے، اس
کا پیغام بھی بدھ مذہب کی طرح آسودگی بخش ہے۔
اسلام اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔

مذاہب کا تقابلی مطالعہ یقینی طور پر کشیدگی کم
کرنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں مددگار ہو سکتا
ہے۔ اس طرح کے مطالعہ سے ہماری آنے والی نسلیں
ہندوستان میں فسادات سے محفوظ ہو کر رہ سکتی ہیں۔
سبھی صوفی سنتوں نے تمام انسانوں کے ایک
ہونے پر زور دیا اور مختلف عقائد کے ماننے والوں کے
مابین اختلافات کی خلیج کو پاٹنے کی پوری پوری کوشش
کی ہے۔

بزرگوں اور صوفیوں کے علاوہ ہندوستان کے
عظیم حکمرانوں نے بھی ملک کے اندر موجود اتحاد کی
قوت کو محسوس کر لیا تھا اور کثرت میں وحدت پر زور
دیا تھا۔ اشوک اور اکبر اس سلسلے میں شاندار مثال کی
حیثیت رکھتے ہیں۔

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے عظیم
روحانی پیشواؤں نے اس سلسلے میں جتنی مساعی کیں
اب ہمارے تنگ ذہن اور مفاد پرست عناصر ان سب
کو ملیامیٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، یہ لوگ جان
بوجھ کر مذہب اور سیاست کو گڈمڈ کرتے ہیں اور سیاسی
فائدے حاصل کرنے کے لیے مذہبی منافرت پھیلاتے
ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ غیر صحت مند فرقہ وارانہ
بنیادوں پر قائم سیاسی تنظیموں اور تعلیمی اداروں کا
جائزہ لے۔ اگر ہندوستان کو ایک اکائی کی حیثیت
سے آئندہ صدی میں قدم رکھنا ہے تو وہ اس خون
خرابے اور شورش کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اتحاد
کو نقصان پہونچانے والے ہر گروہ کو ننگا کرنا ضروری
ہے۔ ایسے شر پسندوں کو تو حضرت عیسیٰ نے بھی
نہیں بخشا تھا۔

کوئی بھی ایسا رواج یا روایت، خواہ کتنی ہی
قدیم کیوں نہ ہو، اگر اس کے ذریعہ دو فرقوں میں نفرت
پھیلتی ہے تو فوراً صحت مند طریقے سے اس کی تجدید
کرنی چاہیے یا سرے سے اس پر پابندی ہی عاید
کر دینی چاہیے۔ مثلاً اگر رات رات بھر بھجن گانے کی
آوازوں سے ہمسایوں کو تکلیف پہونچتی ہے تو وہاں
لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی عاید کر دینی
چاہیے۔

مذہبی جلوس اکثر فسادات کا سبب بن جاتے ہیں، معصوم جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ نازک حالات میں ایسے جلوس منسوخ کیے جا سکتے ہیں، مذہب میں سارا زور روحانیت پر ہونا چاہیے۔ نہ کہ کھوکھلے وقار اور دکھاوے پر۔ سبھی مذاہب کے با اثر حلقوں کو اس سلسلے میں بعض ترمیمات پر غور کرنا چاہیے۔ اور بعد میں عوام کو پیار محبت کے ساتھ ترمیم شدہ طور طریق پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا مسئلہ جو لوگوں کے ذہنوں میں خلفشار پیدا کرتا ہے، وہ ہے اکثریت، اقلیت، پس ماندہ قبائل، پس ماندہ ذات، اور اسی طرح کے دوسرے طبقات کی بنیاد پر درجہ بندی اور تقسیم مفادات کا سلسلہ۔ آخر ایک ہندوستانی صرف ہندوستانی کیوں نہیں ہو سکتا؟ ایک امریکی شروع سے آخر تک محض امریکی ہی ہوتا ہے۔ حکومت کو اس کے مذہب یا ذات سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ہندوستان میں ہر فارم میں مذہب کا اندراج کرنا لازمی ہے۔ آخر تعلیم، ملازمت یا جزا کا مذہب سے کیا تعلق ہے؟ ہندوستانی اپنے اپنے مذہب پر گھر کے اندر بیٹھ کر بھی عمل کر سکتے ہیں۔ مذہب کے ذریعے عوامی زندگی کو تو کسی طرح متاثر نہیں ہونے دینا چاہیے۔

اسی طرح انتخابات کا معاملہ ہے۔ لوگ ہندو، مسلم اور ہریجن ووٹوں کی بات کرتے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا ووٹ صرف ووٹ نہیں ہوتا؟ ایک ہندوستانی کا ووٹ؟ زندگی کے ہر شعبے میں مذہب اور ذات پات کے عمل دخل کے اس رجحان سے سادہ اور سچے سیکولر لوگ تقسیم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

لیکن ہر طرح کی مشکلات، رکاوٹوں اور نشیب و فراز کے باوجود ہندوستانیت کی روح میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ لوگ ایک دوسرے کی تہذیب اور دستر خوان سے فیض یاب ہو کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ غزل، بھارت ناٹیم، دوسہ، ڈھوکلا، کرکٹ، اتوار کی فلم، بڑھتی ہوئی مہنگائی، بھری ہوئی بسیں، پاپ میوزک، ٹی۔ وی، شیمپو کے اشتہار، اونچے کرائے، جہیز کی وجہ سے ہونے والی اموات، کپڑا دھونے کے پاؤڈر کے ساتھ مفت ملنے والے چمچے، لڈو، فلمی ہیرو اور ہیروئن۔ ان سب کا اثر ہندوستانیوں کے ذہن پر ایک جیسا ہی ہوتا ہے، کشمیر سے کنیا کماری تک۔

سچ یہ ہے کہ ہندوستانی عوام وقت کی آزمائشوں میں ہمیشہ پورے اترے ہیں۔ ہر مشکل وقت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں۔ انھوں نے ہند کو ایک سیکولر ملک بنایا ہے۔ ہندوستان کے عوام ہی نے ہندوستان کو "خدا کی روحانی خلقت" کا خطاب دلایا ہے۔ اسی ہندوستان کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ کون حفاظت کرے گا؟ حکومت، مذہبی رہنما، اور خود عوام۔

اچانک میری خود کلامی کا سلسلہ ٹوٹ سا گیا۔ لیکن اس میلے کا نقشہ گویا پھر میرے سامنے آ گیا۔ وہ جیسے، وہ گنگا جمنی تہذیب کا تر و تازہ کئی پتیوں والا کنول، میرے دل و دماغ کے آئینے میں اسی طرح جھلملا رہا تھا جیسا کہ میں نے اسے میلے کی ٹھاٹھیں مارتی بھیڑ میں محسوس کیا تھا۔ مجھے بھی اپنی سوچ کے دھارے کو ایک ایسا موڑ دینے کی ضرورت محسوس ہوئی جس سے یہ سارا افسانہ اپنی خوب صورتی کے ساتھ ختم ہو جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمارے ہندوستان کی عوام ہی تو اس کی تہذیب کے اس کنول کی پنکھڑیوں کی طرح ہے جس کی مجموعی آب و تاب، تازگی اور رعنائی کا دار و مدار ان تمام پنکھڑیوں کے باہمی ربط پر ہے۔ گویا اس کی ایک پنکھڑی گر جائے تو کنول بدنما ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں آس پاس کسی گلچیں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے چاہے وہ ہوا ہی کیوں نہ ہو۔

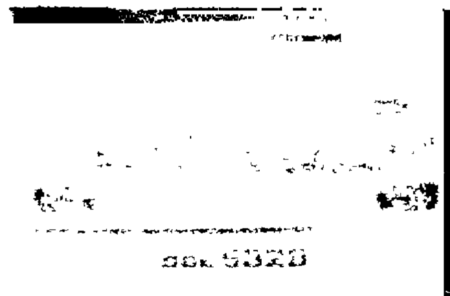
# میٹروپولیٹن کلچر — چند جھلکیاں

## ہماری موٹر گاڑیاں

امریکہ میں لاکھوں موٹر گاڑیاں سڑکوں پر دکھائی دیں گی لیکن ان میں سے ایک بھی گاڑی ایسی نہ ہوگی جس کی تمام عقبی بتیاں، جیسے سرے کی بتیاں، بریکوں کی بتیاں، اشارتی بتیاں، اُلٹے گیئر کی بتیاں پورے طور سے کام نہ کرتی ہوں جن کے ساخت لگانے کے مقامات، روشنی کی تیزی وغیرہ کو خصوصی طور سے متعین کیا گیا ہے اور وہ بھی سلامتی کے لوازمات کے تحت گاڑی سازوں اور ڈھانچہ سازوں کی جانب سے بڑے سوچ وچار، تحقیق اور اخراجات کے نتیجے میں امریکہ کے ایک تازہ ترین ضابطے کے تحت عقبی کھڑکی میں بھی ایک مزید بتی ہونی چاہیے۔ یہ بتیاں شاذ ہی خراب ہوتی ہیں کچھ بھی ہو یہ فوری طور سے توجہ دلاتی ہے۔

اب اپنے ملک کی راجدھانی دہلی کی طرف آیئے۔ اس کے شہری معزز طور سے ترقی یافتہ ہیں۔ تعلیم میں اوسط سے اوپر اور شہری تیز و احساس میں بھی کچھ ایسے ہی ہیں اور یہاں آمد و رفت سے وابستہ سرکاری عملہ اور کنٹرول کے نظام جیسے سب لوازم موجود ہیں۔ یہاں کی آٹو رکشاؤں، بسوں اور مقامی ٹرکوں میں سے تقریباً تین چوتھائی کے پاس کام کرنے والی عقبی بتیاں، بریکوں کی بتیاں اور اشارتی بتیاں نہیں ہوتیں۔ سی ماروتی گاڑیوں اور درآمد شدہ کاروں کو چھوڑ دیجیے۔ بیشتر پرائیویٹ اسکوٹروں اور کاروں کے عقبی پرزوں میں کوئی نہ کوئی عملی نقص ضرور ہوتا ہے۔ کیا چند مرکزی لیمپوں سے روشن سڑکیں اس کے لیے کافی بہانہ نہیں؟

جانوروں کے ذریعے چلنے والی، آدمی کے ذریعے کھینچی جانے والی گاڑیاں خوش قسمتی سے ایسی ہو گئی ہیں سے بالکل بے نیاز ہیں۔ آزادی سے پہلے، تانگے والے اپنے راستے میں کھڑے شام ہوتے ہی ایک رسم کی صورت میں تانگے کے ایک طرف میں رکھے لالٹین کو جلا دیا کرتے تھے۔ اب ان کے بیٹے اور پوتے بڑے مزے سے ادھر ادھر ڈنگی مارتے پھرتے ہیں بغیر بتی کے اور وہ بھی




پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک آمد و رفت کی حالت میں۔ اور یہ لوگ بتیوں کے لیے کسی مشورے پر ایسے غضب کے ساتھ ردِ عمل دکھائیں گے جیسے کسی نے انہیں گھوڑے کو لباس پہنانے کے لیے کہہ دیا ہو۔

آٹو رکشائیں ہماری سڑکوں کے بگڑے ہوئے بالک ہیں۔ ان کے ڈرائیور آپ کو بتائیں گے (اگر آپ خوش مزاجی کے ساتھ پوچھیں) کہ وہ اس ذرا سی مہذب بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کے پیچھے آنے والوں کو ان کی موجودگی اور آگے کے ارادوں کا پتہ چلے جبکہ پیچھے سے آنے والا خطرناک حد تک بہت بڑا نہ ہو۔ اکثر وہ اپنے ارادوں کو بھی وقت سے ذرا پیشتر نہیں جانتے۔ ایک خاص مسئلہ بھی اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے جو کہ بنا قسم کا تین پہیوں والا اسکوٹر کافی روشنی پیدا نہیں کرتا۔ جونہی عقبی بتیاں جلتی ہیں سامنے کی بتی مدھم ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں زیادہ تر بتیاں ان جلی رہتی ہیں اور آگے میں اشارتی بتیاں دن کے بجھی رہتی ہیں جو کچھ لوگ اسکوٹر ساز کمپنیوں کے بارے میں کہتے ہیں اگر اس میں کوئی سچائی ہے تو یہ کمپنیاں اپنے یہاں کوئی ٹیک تالی نہیں حاصل کرتیں۔ اگرچہ چمکنے والے چند ایک ہوں تو پولیس والے بھی متوجہ ہوں لیکن جب سارے کے سارے درگزر کر رہے ہیں تو پولیس بھی ایسے بکھیڑے سے قطع نظر کر سکتی ہے اور ڈرائیور لوگ بھی اس مشترکہ خطرے کے مقابلے میں متحد ہو جاتے ہیں۔ بالکل ایسی ہی حالت آٹو رکشا کی کالی پیلی چچا زاد بہن ماڑی جرمن کار ٹیکسی کی ہے۔

بسیں چاہے وہ دہلی ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی ہوں یا پچھلی گلی پرائیویٹ بسیں، دہلی کی سڑکوں کے بھوت کی طرح ہیں۔ جیسا خیال آتا ہے کہ شروع میں کچھ ان کی عقبی بتیاں لگائی گئی تھیں، بنا سوچے سے کہ گرد، کیچڑ، تار و [illegible] کوالٹی کے پرزے وغیرہ اور [illegible] علاوہ انسانوں کے لیے نقل و حرکت [illegible] دوران ایسے رگڑوں سے یہ بتیاں جلد ہی نکل گئیں ہوں گی۔ روزانہ کی دیکھ بھال میں بہت ہی زیادہ دوسرے جھگڑے ہوتے ہیں جن کی فکر رہتی ہے۔ مقامی سامان و سامان اٹھانے والے ٹھیلوں کے پاس جن کے ڈھانچے بھونڈے اور ٹوٹی ہوئی پشتیں ہوتی ہیں یہ عقبی بتیوں ایسی بھاری پٹیوں کے ذریعے سے دکھا و عمل میں لانے کی بات نہیں ہوتی۔

ایک خلل انداز پہلو ہے اسکوٹروں اور کار والوں کی اضافی بے اعتنائی۔ مالک لوگ جو بیچے تو گھر کی ٹرانسپورٹ کی دیکھ بھال کے بجے خواہاں ہوتے ہیں، اپنی عقبی بتیوں کی خرابی دیکھ نہیں پاتے یا بعد میں ٹالتے ہیں [illegible] درست نہیں کرواتے [illegible]

بنا پر برسوں تک کوئی مشکل پیدا نہیں کرنی چاہیے یہ نعمت ابھی تک دستیاب نہیں۔ گھٹیا بلب اور غیر معیاری پرزے مصیبتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ہمارے صنعت کار ایک لازمی ساز و سامان کی طرح ہر دو پہیے والے اسکوٹروں میں اشارتی بتیاں نصب کریں۔ جہاں آمد و رفت، بڑے شہروں کی طرح سڑک پر بنائی گئی گلیوں میں چلتی ہے وہاں ایسی ایک چیز ناقابلِ درگذر ضرورت بن جاتی ہے۔

کیا ہندوستان میں سڑک استعمال کرنے والوں کا عقبی بتیوں کی طرف کوتاہی کا یہ رویہ، جسے بطور مثال پیش کیا گیا ہے، کسی ثقافتی میلان یا کسی دوسرے بنیادی برتاؤ سے منسوب کیا جا سکتا ہے؟ سنگاپور، مارشیس، کینیا، کینیڈا، برطانیہ یا امریکہ میں رہنے والے ہندوستانی لوگ وہاں کے ٹریفک کے ضوابط پر تعمیل کرتے ہیں۔ کیا اس کا جواب یہ ہے کہ ان ضوابط کو یہاں سختی سے لاگو کیا جائے۔ یہ نفاذ گاڑیاں تیار کرنے والوں پر ہونا چاہیے جو بہتر ڈیزائن والے اور زیادہ پائیدار پرزے فراہم کریں۔ سائیکلوں، سائیکل رکشاؤں، ہاتھ گاڑیوں اور جانوروں سے چلنے والی گاڑیوں کے لیے کم از کم مضبوط، کارآمد ریفلیکٹر ہونا ضروری ہے۔ چاروں طرف ٹریفک کے ضوابط کا نفاذ ضروری ہے۔ شاید دہلی جیسے شہر کو ایک ہزار سے زیادہ ایسے نوجوان ٹریفک افسروں کی ضرورت ہے جو خصوصی طور سے تربیت یافتہ، تحریک یافتہ، گاڑی سوار اور با اعتماد ہوں اور کسی بھی غلط کار چھوٹے یا بڑے کو قانون کے ضبط میں لانے کے لیے تیار رہیں۔ آپ بہت سے ایسے ٹریفک کانسٹیبلوں کے بغیر گذارا کر سکتے ہیں جو مختلف مقامات پر بیکار سے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ ایک اشد ضرورت ہے کیونکہ ان حالات میں انسانی زندگیاں تلف ہو رہی ہیں۔

کچھ بھی ہو، گاڑی چلانا بڑی تیزی سے ایک ہولناک چیز بنتی جا رہی ہے۔

دہلی انتظامیہ آج کل موٹر گاڑیوں سے نکلنے والی آلودگی کے لیے انسدادی عمل درآمد کا اعلان کر رہی ہے (دھویں کا تجزیہ کرنے والے آلات حاصل کر لیے گئے ہیں، کچھ بری طرح سے دھواں دینے والی گاڑیاں کہیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں)۔ خارج ہونے والی گندگی کا کنٹرول صنعت کاروں کی طرف سے مہنگی ترامیم کا متقاضی ہے۔ اس کے لیے انجنوں کی دیکھ بھال کے برزور طریق کار اپنانے کی ضرورت ہے۔



دراصل یہ معاملہ بڑی تعداد میں پرانے بوسیدہ گاڑیوں کو جلد از جلد نکال دینے پر منحصر ہے یہ کام بھی اپنی جگہ تحریک دینے والے مفاد پر منحصر ہے جو گاڑیوں کو بدل دینے کی ترغیب دیتا ہے سب سے پہلے یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ نفاذ کرنے والا عملہ بہت ہی حساس، مستعد اور موثر ہو لیکن یہ بات اس صورتِ حال میں نہیں ہو سکتی جہاں ادھر ادھر چلنے والی زیادہ تر گاڑیاں مشینی اعتبار سے ٹھیک نہ ہوں، جن میں خراب بتیاں ہوں، خراب بریکیں نہ سہی۔ — تا ہے کہ دھوئیں کا تجزیہ کرنے والے آلات کھلونوں کی طرح رہ جائیں۔

# سائیکل سوار کباڑی

دہلی کے ہزاروں تھیلہ بردار کباڑی صبح سویرے پرندوں کے ساتھ ہی بیدار ہو جاتے ہیں اور کارخانوں میں وقت پر پہنچ جانے کے لیے بے قرار کارکنوں کی مانند ہر روز اپنی سائیکلوں پر سوار گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ پرندوں کی مانند ان کی کوئی منزلِ مقصود نہیں ہوتی، وہ کسی دفتر یا دکان پر جا کر حاضری نہیں دیتے، بلکہ اپنی اپنی چنی ہوئی گلیوں کے، جن کا راز وہ اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتے ہیں، سرگرمی سے چکر لگاتے ہیں۔ وہ نہ کچھ کھا کر گھر سے نکلتے ہیں، اور نہ ہی ان کی کوئی ہفتہ واری چھٹی ہوتی ہے۔

سائیکل سوار اپنی آزمودہ اور قابلِ اعتماد سائیکلوں پر کم از کم تین خالی تھیلے لے کر نکلتے ہیں جن میں سے ایک کیریئر پر بندھا ہوتا ہے اور دو اطراف میں لٹک رہے ہوتے ہیں۔ نوٹوں سے بھری جیب کے ساتھ، جس میں کم از کم سو روپے تو ضرور ہوتے ہیں وہ اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ نوٹ عموماً نئے اور کرارے ہوتے ہیں۔ جو ان کے گاہکوں کو بہت پسند ہیں کیوں کہ نئی کرنسی آج کل بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ جس طرح کوا کائیں کائیں کرتا ہے اسی طرح کباڑی آوازیں لگاتے ہوئے آتے ہیں اور اکثر ان کی آواز ہی گھروں کے سکوت پر دستک دیتی ہے۔

وہ عموماً مناسب لباس میں اور چاق و چوبند دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن قریب سے دیکھا جائے تو پہننے کی چیزوں میں عجیب و غریب میل جول متوجہ کرتا ہے۔ پھٹی ہوئی قمیص کو ٹانکے لگے ہوئے، جوتے ضرور پہنے ہوتے ہیں مگر ایک جوتے کی ایڑی ضرور غائب ہوتی ہے۔ چہرہ ایسا کہ جیسے اس دن ڈاڑھی نہ صاف کی گئی ہو۔ یہ کام بہت محنت کا اور تھکا دینے والا ہے۔ لہٰذا عمر رسیدہ اور کمزور لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ اتنی سخت سائیکل سواری اس پر بھاری بوجھ اٹھا کر گلیوں کے اتار چڑھاؤ، پھیلتا، پھلا چلا کر آوازیں دیتا

خریدے ہوئے مال کو باندھنا اور پھر کھولنا ، اور چست مزاج گھریلو خواتین کے ساتھ بھاؤ تاؤ کا اعصابی معاملہ اور اس کے بعد اور بھی زیادہ چالاک دکان داروں کو مال کی فروخت سب اس کے کام کا حصہ ہیں۔

اور دھات کی اشیا اب اس کاروبار میں زیادہ آنے لگی ہیں حالاں کہ پرانے کپڑے جو برتنوں کے عوض لیے جاتے ہیں اب بھی ان کی روایتی تجارت کا کافی بڑا حصہ ہیں۔ اس پر بھی یہ ادنی (یوں لگتا ہے کہ خواتین کے لیے یہ پیشہ بہت زیادہ جوکھم کا کام ہے)



اس کاروبار میں اتنا منافع نہیں ہوتا کہ سائیکلوں کی جگہ موٹر سے چلنے والی موپیڈ سائیکلیں کام میں لائی جاسکیں۔ لیکن ایک سست رو کباڑی کے لیے یہ دور کی بات ہے جو ایک مویشی کی مانند آپ کے دروازے پر بیٹھا کچھ التجا کرتا ہوتا ہے۔ اور کچھ سونے باری۔ یہ تیز رفتار سائیکل سوار اب زیادہ تر چھوٹے کاروباری آدمیوں کی طرح کام کرنے لگے ہیں وہ تھوڑا بہت پڑھے لکھے بھی ہوتے ہیں اور موقع پر ایک اہم فیصلہ بھی کر سکتے ہیں کہ کیا خریدنا ہے اور کس ام پر خریدنا ہے۔ وہ جلد بازی میں کچھ خطرات بھی مول لے لیتے ہیں۔

لیکن اب بھی صفائی سے بندھے ہوئے اخبارات جن کا کوئی استعمال نہیں کیا گیا ہوتا یا محنت سے جمع کی گئیں بوتلیں جو نقلی مال بھرنے کے کام آ سکتی ہیں اس کاروبار کی خاص اشیا ہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسکاچ کی وہی بوتل جس کی وہسکی آپ ختم کر چکے ہیں کسی دیسی وہسکی سے بھری ہوئی پھر آپ کے پاس واپس آجائے ٹین کے ڈبے

کوئی بھی دوسری چیز جو انھیں پیش کی جائے خریدنے کے لیے تیار رہتے ہیں بشرطیکہ ان کی نگاہ میں بچ جائے۔

ردی کے بھاؤ پر جھگڑا کرنا بیکار ہے کیونکہ آپ کو قیمت میں جو منافع ہوگا اتنا ہی نقصان آپ کو وزن میں ہو جائے گا۔ اس کی دلیل یہی رہتی ہے کہ اس کو تو مال میں بندھا ٹکا منافع ہی ملے گا۔ دوسرے کسی بھی دوسرے ذیلی کاروبار کرنے والے کی مانند اسے مقامی پولیس والوں کو بھی خوش رکھنا پڑتا ہے اور آج کل وہ سستے میں خوش بھی نہیں ہوتے کباڑی کا ترازو انجینیرنگ اور دماغی اختراع کا مجموعہ ہوتا ہے اور وہ سی تجارتی عجائب گھر میں رکھنے کی چیز ہے ناپ تول کے کسی ادارے کی بے ادبی نہ سمجھی جائے کہ اس کے ایک کلو کے باٹ پر ایک کلو کی ہی مہر ہوتی ہے اور جب خالی ترازو اٹھایا جاتا ہے تو وہ صحیح صحیح توازن دکھاتا ہے۔ لیکن حقیقی وزن نصف یا ایک تہائی کم ہو سکتا ہے کہ ترازو کو پکڑنے والی رسّی

جس میں آپ کا مال بے ترتیبی سے ٹھونسا ہوا ہوتا ہے خاص طور پر بنائی گئی لکڑی کی ڈنڈی میں سے ایک انچ کے لگ بھگ ہی باہر آتی ہے۔ اگر آپ کافی چست ہیں اور اس کی چالاکی کو پکڑ لیتے ہیں تو وہ اسے ہنس کر ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر آپ ردی کو اپنے ترازو میں تولنا چاہیں تو وہ بازار کے بھاؤ پر مال لینے کی ضد کرے گا۔

کباڑی کی زندگی کی بھی اپنی افادیت ہوتی ہے۔ آپ صرف قبل دوپہر تک ہی کام کرتے ہیں (جب تک کہ آپ جمع کی گئی لوٹ کو لانے کے لیے ایک اور "پھیرا" نہ لگائیں) ایک گھنٹہ اور لگ جاتا ہے مال کو خریدار کے پاس لے جانے میں۔ مختلف قسم کے مال کے خریدار مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ راستے میں ہی ہوں جہاں وہ آسانی سے پہونچ سکیں بس آپ کا درمیانہ دار کردار یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ اب آپ مزے سے دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے فارغ ہیں جو لوگ دوپہر کے بعد کسی کام کے ذریعہ ملازمت کے علاوہ اضافی آمدنی حاصل کرتے ہیں وہ زیادہ جفاکش ہیں۔ تاہم وہ نہیں چاہتے کہ ان کی اولاد بھی یہ پیشہ اختیار کرے۔ جو نئے لوگ اس پیشے میں آتے ہیں وہ عام طور پر ایسے اشخاص ہوتے ہیں جو دوسرے پیشوں سے مسترد ہو چکے ہوں اور انھیں اس مال کے بچے کھچے خریدار اس پیشے میں داخل کرتے ہیں۔

فطری طور پر ہمارا معاشرہ آج بھی ذخیرہ اندوزی کا معاشرہ ہے اور ہمیں کوئی چیز پھینکتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ کرم فرمائی کے طور پر کوئی چیز دے دینا ایک اور بات ہے جیسے کہ کوئی ایسی چیز جس کا آپ کے لیے کوئی مصرف نہ ہو کسی بھی اور شخص کو دے دی جائے جس کے لیے وہ آپ کا شکر گزار ہو۔ ہمارا رویہ چیزیں اٹھا کر پھینکنے والے معاشرے کے عین متضاد ہے جہاں فرنیچر، فٹنگز اور بجلی کے سامان تبدیل کر دیے جانے کے بعد (امریکہ اور مغربی یورپ کے ملکوں میں) اکثر گلیوں کے کنارے پر پڑے دکھائی دیتے ہیں تاکہ شہر کے خاک روب آئیں اور ان چیزوں کو اٹھا کر لے جائیں۔

وہاں پرانے اخبارات، خالی بوتلوں، ڈبوں، لکڑی اور دھات کی بنی اشیا اور دوسری بہت سی چیزوں کا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس

کے برعکس آپ کو درختوں کی تراشی ہوئی شاخوں اور دوسرے بے کار سامان کو اٹھوانے کے لیے پتے سے کچھ دینا پڑے گا۔

اب ذخیرہ کرنے کے لیے جگہ کی قلت اور چیزوں کو جلدی جلدی تبدیل کرنے کے بڑھتے ہوئے رجحان سے ہمارے شہروں میں بہت سا متروکہ سامان نکالا جا رہا ہے۔ ہر چیز ماسوائے چند اشیا کے یا تو پھر سے تیار کی جا رہی ہے یا نچلی سطح پر کام میں لانے کے لیے پہونچا دی جاتی ہے۔ متروکہ اشیا کے پھر سے استعمال کی ایک وسیع اور منظم سمت وجود میں آگئی ہے اور کباڑی اس صنعت کا ہیرو ہے۔ وہ دروازے دروازے پر جاتا ہے اور نقد ادائیگی کرتا ہے اور یہ چند روپے دوسری نقدی سے کہیں زیادہ دل کش دکھائی دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی خدمات میں توسیع ہوگی جو مختلف شکلوں میں دکھائی دینے کے ساتھ ساتھ زیادہ فروغ پائیں گی۔

اور اس حقیقت سے ہم ایک مرکزی خیال پر پہونچتے ہیں کہ کوئی چیز اکٹھی نہیں کی جاتی، جب اسے جمع کرنے کے اخراجات اس سے ہونے والی آمدنی سے زیادہ ہوں۔ اور یہی وقت اور دولت کی طرح کی مساوات ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہندوستان میں جہاں ایک طرف ختم نہ ہونے والی غربت اور دیرینہ بے روزگاری موجود ہے اور دوسری جانب اشیائے صرفہ کی بھاری مانگ ہے، وہاں مستقبل قریب میں ایسی متروکہ اشیا جمع کرنے والوں کی کمی نہیں ہو سکتی۔ یہاں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہیں گے، جن کے پیٹ خالی اور جن کے پاس وقت بھی ہوگا، اور جو ہر قابل فروخت یا ناقابل فروخت چیز کو جمع کریں گے۔

اس پیشے کی سب سے نچلی سطح پر نمبر آتا ہے۔ چیتھڑے جمع کرنے والوں کا۔ (یہ لوگ اکثر ناتواں بے ہنر، ان پڑھ، بوڑھے ہوتے ہیں)، پتے، گھاس پات اکٹھا کرنے والوں کا (اکثر غریب ان پڑھ دیہاتی عورتیں ہوتی ہیں)، گوبر سمیٹنے والوں کا (یہ کام عموماً بے حال غریب لڑکیاں کرتی ہیں جو گوبر اٹھانے کے لیے ایک دوسرے پر جھپٹتی ہیں)، اور انتہائی نچلے درجے کے گندگی کے ڈھیروں میں سے چیزوں کی تلاش کرنے والوں کا، جو سوروں، آوارہ کتوں اور گتوں کے مقابل ہوتے ہیں۔

حال ہی میں اس پیشے میں ایک نیا زمرہ کاغذ اکٹھے کرنے والوں کا شامل ہو گیا ہے۔ اکثر یہ لوگ چیتھڑوں میں ملبوس دبلے پتلے ہوتے ہیں جو قبل از وقت بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک کھو چکی ہوتی ہے اور انسانی وقار کی کوئی علامت باقی نہیں بچی ہوتی۔ یہ شخص آپ کو مکانوں اور کاروبار کے دوسرے مقامات پر بکھرے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں پر جھپٹتا نظر آئے گا جو ان کاغذوں کو لپک کر، اٹھا کر کندھے سے لٹک رہے تھیلے میں ٹھونس رہا ہوگا۔ دس گھنٹے کی گرد دیدہ آوارہ گردی سے اسے چھ یا سات روپے حاصل ہو جاتے ہیں کیوں کہ کاغذ کے یہ ٹکڑے پچاس پیسے کلو میں بھی فروخت نہیں ہوتے۔ تاہم کوڑے کرکٹ سے بھرے اس ماحول میں وہ ایک ایسا شخص ہے جو کمیٹی کے حکام کی بلا معاوضہ عمر بھر خدمت کرتا ہے۔

# انسانی فضلے کا کیا کہنا

اب جو گنگا کو پاک، صاف اور شفاف رکھنے کے تمام اہتمام مکمل ہو چکے ہیں، حکام کو انسانی فضلے کو ٹھکانے لگانے کا پریشان کن اور مستقل مسئلہ سلجھانا پڑے گا۔ اس فضلے کی مقدار کے بارے میں یہی کہنا کافی ہے کہ ستر کروڑ افراد ہمارے ملک میں ہیں، ان بہت سے افراد کو ملحوظ رکھتے ہوئے جنہیں پوری غذا نہیں ملتی۔

ماحولیات کے محکمے کی سوچ وچار کی مشنری کو جو چیز پریشان کر رہی ہے وہ کوئی مسئلے کے تکنیکی، انتظامی اور مالی پہلو نہیں بلکہ وہ تو بنیادی طور کا فلسفیانہ پہلو ہے۔ دنیا کے تمام لوگوں میں صرف ہندوستانی لوگ ہی سب سے زیادہ انسانی فضلے سے نفرت کرتے ہیں جب یہ اپنا ہی ہو! گھر میں عورتیں بڑے پیار سے رسوئی کے فرش کو گائے کے گوبر سے پوتتی ہیں۔ کسان لوگ مویشیوں بھیڑ بکریوں، مرغیوں وغیرہ کے فضلے کو ہاتھ لگاتے رہتے ہیں پھر بھی انسانی فضلے کے بارے میں الگ رویہ ہے جیسے انسان زہر ہی اگلتے رہتے ہوں۔ ماتا کستوربا نے جب اپنے ایک مہمان کے گندے ڈبے کو اٹھانے سے انکار کا اظہار کیا تو اسے یہ بھی خطرہ پڑ گیا کہ مہاتما جی انہیں گھر سے نکال دیں گے۔ یہ رویہ بیماری کی چھوت چھات کی وجہ سے نہیں کیوں کہ ان چیزوں کا علم ہونے سے پہلے بھی یہ روایت چلتی تھی۔ آیورویدک نظام طب تلی کے ٹیسٹ کرنے سے درگزر کرتا ہے۔ شاید اسی بنیادی نفرت سے ہی خاکروبوں کا طبقہ وجود میں آیا جس کا مدمقابل کسی بھی دوسرے ملک میں نہیں ہے یا کیا یہ بات ہے کہ چونکہ ہمارے یہاں خاکروب تھے لہٰذا ہم نے نفرت کرنا شروع کر دیا؟ محکمہ اس صورت حال کی ابتدا اور تاریخ کے بارے میں گہرے مطالعات شروع کر رہا ہے۔ امید ہے اس سے مفید سراغ دستیاب ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کے بورڈ کی سابقہ میٹنگ کے دوران بحث میں گرمی سی آگئی تھی۔ سماجی سائنسدان ڈاکٹر رام آپے سے باہر ہو گیا۔ کہنے لگا "میں مطالعات کا انتظار نہیں کر سکتا ہمیں چاہیے کہ ہم ایک ہی بار خاکروبوں کا سلسلہ ختم کر دیں اور انہیں دوسرا کام سپرد کر دیں۔ اقدار کے معیار اپنے آپ ہوش میں آجائیں گے۔ شہروں میں صبح کے منظر کا تصور کیجیے۔ ہر آدمی اپنے کوڑے کرکٹ کا ڈبہ اٹھا کر لے جائے اور گلی کے کونے میں اسے ڈال دے۔ کیوں کہ کوڑے کے تھیلوں کے ساتھ بھی تو وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ سر پر گندگی اٹھانا! اب نہیں چلے گا۔ کوڑے کی گاڑی چاہیے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ گاڑی سیڑھیوں یا اونچی نیچی جگہوں پر نہیں چلتی۔ خاکروبوں کے نہ رہنے سے چھوت چھات کی تمام عمارت گر جائے گی۔ اس طرح آپ ایک سماجی انقلاب لا سکتے ہیں۔"

چیرمین بولے: "یہ سب کچھ اکیسویں صدی کے لیے ہے بیسویں صدی کے لیے نہیں۔" پروفیسر کرشنا مورتی جو ماہر اقتصادیات ہوتے ہوئے انتظامیہ میں آگئے ہیں کہنے لگے "اس کا متبادل یہ ہے کہ بہت بڑے پیمانے پر فلش کا نظام ہونا چاہیے گنجان آبادیوں اور متعدد منازل والی عمارات میں یہ چھوٹے چھوٹے سوراخوں والی نالیاں پورا کام نہیں کر سکتیں۔"

چیرمین بولے: "کیا ہمارے پاس اتنا روپیہ ہے؟ مجھے پتہ چلا ہے کہ جے پور جیسے شہر میں نئے انداز کا بدرو نظام قائم کرنے کے لیے سو کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی۔"

ڈاکٹر رام بولے: "اگر آپ کے پاس روپیہ ہو بھی سہی، تمہارے پاس پانی تو نہیں ہے جو اوسطاً ۲۰ گیلن فی کس فی روز ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ روزانہ کی پمپنگ، اس کا ذخیرہ کرنا اور پھر اسے

نندتا ریڈی

# سماجی بے راہ روی کی ایک جھلک

میں اب بھی انھیں دیکھ سکتی ہوں۔ وہی کالے چہرے، سفید ساڑھیوں، سفید دیواروں اور سفید سیمنٹ کے فرشوں کے گھیرے میں۔ وہ ایسے بھوتوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں جو وقت کے چکر میں پھنسے ہوئے ہوں۔ وہ چپ چاپ ادھر اُدھر گھومتی رہتی ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کی خلوت کے غیر متعین علاقے میں قدم نہ رکھیں۔ انھیں یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر وہ ایسا کریں گی تو ان کی گھٹی گھٹی حسرتوں کا لاوا پھوٹ پڑے گا اور ایک جھگڑا کھڑا ہو جائے گا۔

یہ عورتیں بنگلور سنٹرل جیل کے زنانہ وارڈ میں عمر قید کی سزا بھگت رہی ہیں۔ یہ جیل شہر کے مرکز میں واقع ہے اور اس کی اونچی اونچی دیواریں قریباً بیس ایکڑ زمین کا احاطہ کرتی ہیں۔ لیکن ہم یہ کبھی سوچنے سے باز نہیں آسکتے کہ ان دیواروں کے اندر کس طرح کی زندگی ہوتی ہے۔ زنانہ وارڈ ۳۲۰ مربع فٹ سیمنٹ کا بنا ہوا حصہ ہے، جس میں کوٹھریوں کی دو قطار، جس اور پاخانوں اور غسل خانوں کا ایک گروپ ہے۔ جو کہ جیل کی تاریخ میں ایک وقت پہلے موت کا گوشہ کہلاتا تھا۔ یہ عورتیں مردوں سے بالکل الگ رکھی گئی ہیں اور انھیں وارڈ سے باہر کبھی نہیں جانے دیا جاتا، سوائے اس کے کہ کبھی کبھار کوئی اِکّا دُکّا شخص ان سے ملنے آجائے۔

اس علاحدگی کی وجہ سے زنانہ وارڈ کے قیدی ان سہولتوں سے محروم ہو جاتے ہیں جو مردوں کو میسر آتی ہیں جیسے فلمیں دیکھنا، لائبریری تک رسائی، باغبانی اور دیگر فرائض جن کی بدولت مردوں کو چند گھنٹوں کے لیے جیل کے تمام حصوں تک پہونچنے کی کھلی چھوٹ مل جاتی ہے چند عمر قیدی مرد سپرنٹنڈنٹ کے دفتر اور جیل کے باہر گھروں میں چپراسی اور کلرکوں کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

زنانہ وارڈ میں سوائے تلسی کے ایک پودے کے ہریائی کا نام و نشان نہیں۔ ان عمر قید عورتوں کا باہر کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وارڈ کے عملہ کے افراد کوئی نہ کوئی خبر لے کر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی، وارڈ کے دروازے پر لگے لوہے کے بھاری کواڑوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر مرکوز رہتی ہے جو اپنے قبضوں پر گھومتے ہوئے چیختے ہیں۔ اس سے کھانا آنے کا پتہ چلتا ہے اور اگر دروازہ کسی غیر مقررہ وقت پر کھلے تو بڑی ہاہا کاری مچ جاتی ہے جس کا مطلب ہے کسی نئے قیدی کا وارد ہونا یہاں کے قیدی اپنے آپ کو عادتاً ذرا ذرا سے جرم کرنے والوں سے کچھ بہتر ہی محسوس کرتے ہیں اور پیشہ ور عورتوں اور جیب کتروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ان تمام عمر قید عورتوں کو عمر قید کی سزا قتل کرنے کے جرم میں ہوئی ہے۔ لیکن ان میں سے ۹۰ فی صد عورتوں نے کسی مادی مفاد کے لیے قتل نہیں کیا تھا بلکہ سماجی حالات کی وجہ سے۔ ان کا معاملہ مردوں جیسا نہیں جہاں ۹۰ فی صد قتل مادی مفاد کے لیے چوری کے روپ میں یا قتل کرنے کے معاوضے کی شکل میں ہوتے ہیں۔

میرا کی عمر بیس سال ہے۔ وہ اپنے سامنے کی دیوار میں سے جھانکتے ہوئے پیاری پیاری آواز میں کیرتن گاتی ہے جب کہ اس کی دو سال کی بچی ننھی چپ چاپ ماں کا گانا سنتی ہے۔ میرا کے خاوند نے گاؤں میں "اراک" بیچنے والی ایک عورت سے معاشقہ شروع کر دیا تھا جب میرا کا پہلا بچہ ہونے والا تھا۔ میرا نے اپنے منگل سوتر اور پیدا ہونے والے بچے کی حفاظت کی کوشش میں دوسری عورت سے لڑائی مول لے لی۔ اس سے ہاتھا پائی شروع ہو گئی جس کی گرما گرمی میں میرا نے اس عورت کے گلے پر درانتی دے ماری جس سے وہ مر گئی۔ میرا کے خاوند نے رپورٹ درج کرا دی اور بعد میں عدالت میں گواہی دے دی کہ اس کی بیوی نے اس کی محبوبہ کو قتل کیا تھا۔

میرا کو عمر قید کی سزا ہوئی اور اس کی بچی جیل میں ہی پیدا ہوئی۔ اس کے خاوند نے دوبارہ شادی کر لی تھی۔ مگر اسے جو چٹھی ملی تھی اس میں یہی لکھا تھا کہ اس نے کنبے کے نام پر کلنک لگا دیا ہے جس کی وجہ سے اس کی بہن سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا۔

میرا دن بھر دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر راگی "صاف" کرتی رہتی ہے، اگرچہ اسے بامشقت سزا نہیں ملی۔ ہر روز کے کام کے لیے اس کی اجرت ایک روپیہ پچاس پیسے ہے۔ جو کہ جیل سے باہر ایسے کام کے لیے مقرر شدہ کم سے کم اجرت کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑی ہے۔ اس کی یہ اجرت اس کی رہائی تک جیل سپرنٹنڈنٹ کے پاس جمع رہے گی۔

میرا کی بچی اور تین دوسرے بچوں کی پرورش کے لیے، جن کی عمر تین سال سے کم ہے۔ جیل کے ضوابط میں کوئی سہولت مقرر نہیں کی گئی۔ یہی بچے ہی ان کی ماؤں کے زندہ رہنے کا سبب ہیں اور اس کے علاوہ وہ اتنے چھوٹے ہیں کہ انھیں الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ ان بچوں کے لیے کوئی علاحدہ راشن مقرر نہیں ہے سوائے اس کے کہ ان کی ماؤں کے کوٹے میں کچھ اضافہ کر دیا گیا ہے۔ وہ بھی وہی راگی کھاتے اور وہی گانجی پیتے ہیں۔ انھیں پروٹین اور تازہ سبزیوں سے محروم رکھا جاتا ہے۔ بچوں کے لیے نہ کپڑے ہیں نہ کھلونے۔ ان کی مائیں اپنی ساڑھیوں سے پٹیاں کاٹ کر اور انھیں راگی کی بوریوں کے دھاگوں سے سی کر ان کے لیے لباس بناتی ہیں اور کاغذ کے گولوں سے دھاگے باندھ کر ان کے لیے کھلونے تیار کرتی ہیں۔

سیمنٹ سے بنے زنانہ وارڈ کی چار دیواری کے اندر کاغذ، کپڑے، دھاگے وغیرہ کا ہر ٹکڑا ایک قیمتی چیز ہوتا ہے۔ جسے مائیں اپنے خس کے تکیوں کے نیچے یا اپنے جسم پر حفاظت سے رکھتی ہیں۔ ان بچوں نے ان دیواروں کے احاطے سے باہر کی کسی شے کو نہیں دیکھا۔ اونچی دیوار کے اوپر سے ناریل کے درخت کی جھلکتی ہوئی چوٹی ہی ان کے لیے درخت ہے اور وہ کالی بلی جو کبھی کبھار ادھر آنکلتی ہے ان کے لیے ایک جانور ہے۔ انھوں نے گھر، گائے، بیل گاڑی یا موٹر کبھی نہیں دیکھے۔ جب وہ سیدھا اوپر کی جانب دیکھتے ہیں تو آسمان کا جو ٹکڑا انھیں دکھائی دیتا ہے ان کے لیے قدرت سے ایک رابطہ ہے۔

لکشمی امّا ایک بھری گداز ماں جیسی عورت ہے جس کی شادی بارہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک اس کے شرابی خاوند سے اس کے چار بچے ہوئے۔ وہ کہتی ہے کہ اس کا خاوند اسے اس طرح اذیتیں دیتا تھا کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ سرِعام اسے بے لباس کرتا، گرم لوہے سے اسے داغتا،



بچوں کو ٹرنک میں بند کرتا اور اسے پیٹتا تھا۔ وہ خودکشی کے لیے مجبور کر دی گئی۔ لیکن چونکہ وہ بچوں کو پیچھے نہیں چھوڑ سکتی تھی، اس لیے اس نے انھیں اپنے ہمراہ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بچوں کو اور اپنے آپ کو کنویں میں پھینک ڈالا۔ بدقسمتی سے اسے اور دو بڑے بچوں کو بچا لیا گیا اور دو بچے ڈوب کر مر گئے۔ اسے خودکشی کرنے کی کوشش اور دو بچوں کے قتل کے جرم کی وجہ سے عمر قید کی سزا دی گئی ہے۔

لکشمی اماں کی رہائی کو صرف ایک سال رہ گیا ہے اس نے اپنی سزا بھگت لی ہے اور دو بچوں کی موت بھی اس کے ضمیر پر سوار ہے۔ وہ اب دنیا کو منہ دکھانے سے خائف ہے۔ اٹھارہ سال کی سزا کے دوران جیل کی چار دیواری سے باہر کی زندگی سے نپٹنا اسے نہیں سکھایا گیا۔ اسے کوئی تربیت یا ہنر نہیں مہیا کیا گیا اور واپس جانے کے لیے کوئی کنبہ بھی نہیں ہے۔ لکشمی اماں جیسی عورتوں کو رہائی کے بعد غلط کار لوگ پکڑ کر پیشہ کرانے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کے لیے نہ تو جیل کے حکام کوئی رہنمائی کرتے ہیں اور نہ کوئی رضا کار تنظیم یا سماجی بہبود کا بورڈ امداد فراہم کرتا ہے۔

اس لیے لکشمی اماں کا خیال ہے کہ جیل کی چار دیواری کے اندر رہ کر وہ زیادہ محفوظ رہے گی۔ یہاں اسے کم از کم سال میں دو ساڑھیاں تو ملتی ہیں جن سے ٹکڑے کاٹ کر وہ چولی کوٹ بنا لیتی ہے۔ اسے دو وقت کھانا تو ملتا ہے۔ جو بھلے ہی خوش ذائقہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اچھی طرح تیار کیا ہوتا ہے۔ اگرچہ اتوار کو بھجن گانے کے سوا اس کا کوئی تفریح طبع کا وسیلہ نہیں، تاہم اسے کم از کم سونے کی جگہ تو ملتی ہے۔ یہ جگہ اس کے لیے باہر جانے سے بہتر ہے۔ جہاں اسے اپنے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اس زندگی سے اٹھارہ سال تک منقطع رہنے کی وجہ سے اسے پھر سے اپنی راہ تلاش کرنی ہوگی اور سماجی بدنامی کا بوجھ بھی برداشت کرنا ہوگا۔

اس سے ہم ایک شدید سوال کی طرف آ جاتے ہیں۔ ہمارا عدالتی نظام سزاؤں پر مبنی ہے۔ کیا اسے ہمدردانہ اور انسانی بہبود کی بدولت بحالی اور اصلاح کے رویے سے وابستہ نہیں ہونا چاہیے؟ کیا ہم ان لوگوں کو اپنی مسرتوں پر قابو پانے کے لیے اور سماج سے نپٹنے میں مدد کر رہے ہیں یا ہم ایسے بے روح سایے پیدا کر رہے ہیں جو سماج سے وابستہ نہیں ہیں اور ہمیشہ کے لیے سماجی اچھوتوں کی طرح سماج سے باہر ہی رہیں گے اور ایسے میں یا تو وہ جیلوں میں مقید ہوں گے یا رات کی تاریکی میں گلیوں میں جسم فروشی کا دھندہ کریں گے؟

قابل غور بات یہ ہے کہ یہ تمام عورتیں اقتصادی اعتبار سے کمزور ترین طبقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ایسے جرائم صرف انھیں طبقوں کے لوگ کرتے ہیں یا زیادہ حقائق کی روشنی میں یہ کہیں کہ اونچے طبقات کے لوگ "عدل" کی قیمت چکا سکتے ہیں۔

میرے خیال میں اب ایسا وقت ہے کہ اس سوال پر پھر سے غور کیا جائے اور کوئی نئی صورت پیدا کی جائے۔ ان مجرموں کی جانب ہمارا رویہ نفرت کا نہیں بلکہ ہمدردی اور مفاہمت کا ہونا چاہیے۔ جرم کی بنیادی وجوہات کو سمجھے بغیر سزا کا اعلان کرنا کافی نہیں ہے ممکن ہے اگر سماج خود عورتوں کو بطور افراد، وقار اور فخر کے ساتھ اپنا وجود جتانے کی اجازت دیتا، تو ایسے جرائم کبھی نہ کیے جاتے اور وہ تمام بچے کسی آزاد شہریوں کی طرح جنم لیتے اور پروان چڑھتے۔

ستیش بترہ

# جدید ٹیکنالوجی

## تربیت یافتہ کارکنوں کی کمی

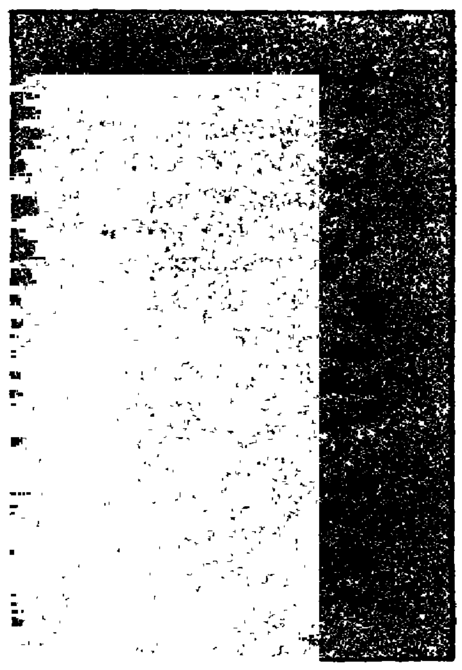
کیا کبھی آپ کو ایک ایسی عمارت یا مکان میں جانے کا اتفاق ہوا ہے جہاں پانی کے نلکے ٹھیک نہ رہے ہوں، جہاں غسل خانے کے فلش ٹھیک سے کام کر رہے ہوں، دیواروں پر نمی نہ ہو، بجلی کے تمام بٹن کارگر ہوں، بجلی کے تاروں کی حالت درست ہو، لکڑی کے دروازے وغیرہ مرمت کے متقاضی نہ ہوں۔ ان سب کا مطلب یہ ہے کہ اس عمارت یا مکان میں تعمیر کے وقت جو کاریگری وغیرہ کسی کارکن سے کروائی گئی تھی وہ بالکل ہی پھیکی اور معیاری پرفارمنس کی تھی۔ پائپ کے ڈھیلے ڈھالے کنکشن ٹپکتی چھتیں اور نمدار دیواریں، ٹپکتے ہوئے پانی ضائع کرتے ہوئے نلکے اس عمارت کے لیے اور اس میں رہنے والے افراد کی زندگی کے لیے خطرات کی صورت حال پیدا کرتے ہیں۔ مکانوں کے گر جانے، بجلی کے تاروں میں نقص کی وجہ سے آگ لگ جانے، بجلی سے ہلاک ہو جانے کے حادثات ہماری روزانہ زندگی میں معمول کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

اگرچہ ایسے معاملات میں گھٹیا کوالٹی کے ساز و سامان کا استعمال ہی درحقیقت ان کا کارن ہو سکتا ہے لیکن اکثر معاملات میں ہمارے ان نام نہاد تربیت یافتہ کارکنوں کی کاری گری پر ہی الزام آتا ہے جیسے معمار، کھاتی، پلمبر اور بجلی کے کاریگر۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے ہم تربیت یافتہ کاریگر کا نام دیتے ہیں وہ تربیت یافتہ نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے قابل اور تربیت یافتہ کارکنوں کو مشرق وسطیٰ کے ممالک میں نئی کارگاہیں دستیاب ہو گئی ہیں جن کی جگہ ان لوگوں نے لے لی ہے جو کافی قابل نہیں ہیں۔ یہ دلیل محض جزوی طور پر درست ہو سکتی ہے۔ ناخوشگوار حقیقت یہ ہے کہ قابل کارکنوں کی دستیابی ہمیشہ سے ایک مسئلہ رہا ہے جو ہماری متعدد تعمیراتی اور ترقیاتی سرگرمیوں کی وجہ سے اب بہت بڑھ گیا ہے۔

اگرچہ ہمارے منصوبہ کاروں نے تربیت یافتہ انجینئروں، ماہرین تعمیر، شہروں کے منصوبہ کاروں کی ضرورت محسوس کی ہے اور ہم نے بہت سے انجینئرنگ کالج، ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ، صنعتی تربیت کے مراکز، فن تعمیر کے اسکول قائم کیے ہیں تاہم کاریگروں اور تربیت یافتہ کارکنوں کو تربیت دینے کی طرف توجہ نہیں دی حالانکہ یہی تربیت یافتہ کارکن اس کروڑوں پر مبنی تعمیراتی صنعت کے اصلی پرزے اور بنیادی کامگار ہوتے ہیں جن کے فیض سے ہمارے کنبوں کے لیے گھر، کارخانے اور دیگر سہولیات مہیا ہوتی ہیں۔

ہمارے تربیت یافتہ کارکن وہی لوگ ہوتے ہیں جو ابھی خاندانی روایت یا کاروباری استادوں کی دین ہیں جو شخص بھی ایسے ماحول میں چند دن گزار لیتا ہے وہ اعتماد کے



ساتھ تربیت یافتہ کارکن ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ معمولی مزدور اور امدادی کارکن راتوں رات ماہر بن جاتے ہیں انہیں بنیادی چیزوں کے بارے میں ذرا بھی جانکاری نہیں ہوتی۔ ان میں سے بہت سے ماہر ہونے کا دعویٰ کر کے کاروبار چلانے لگ جاتے ہیں۔ انھوں نے واقعی "سیکھو اور کیا ہو" کا اصول اپنا لیا ہے جس کی قیمت ان کے گاہکوں کو ہی چکانی پڑتی ہے۔

کیا یہ غیر واجب ہے کہ ان سے اپنا کام خوب جاننے کی توقع کی جائے؟ اور اس روپے کا خدا حافظ ہے جو آپ کو ان کی طرف سے خدمت یا یہ کہو کہ ناخدمت کے لیے صرف کرنا پڑتا ہے اور تعجب نہیں اگر ایسے میں ہمارے ٹیلی فون کام نہ کریں، ہمیں بجلی فیل ہو جائے، لاکھوں روپے کی مشینری کباڑ بن کے رہ جائے، ہماری عمارتیں اور مکان موت کے پھندے بن جائیں! ہماری زندگی، صحت اور سلامتی انہیں کے رحم و کرم پر ہے۔

تیزی سے بدلتی ہوئی ٹیکنالوجی کے اس دور میں ہمارے تربیت یافتہ کارکن بہت ہی پیچھے رہ گئے ہیں۔ نئے ساز و سامان، اوزاروں اور طریقے پرانے ساز و سامان وغیرہ کی جگہ لے رہے ہیں۔ تعمیراتی صنعت کی مثال ہی لیجئے، جس میں پلاسٹک ساز و سامان نے کئی چیزوں کی جگہ لے لی ہے۔ پی۔ وی۔ سی کے پائپ، ٹینک، استر، ٹونٹیاں، بجلی کے بٹن اور تار، کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑ، فرشی چٹائیاں، سرکٹ توڑنے والے چھوٹے آلات اور نہ جانے کیا کیا اشیا میدان میں آ کر انقلابی انداز میں روایتی اشیا کی جگہ لے چکی ہیں۔ مناسب نگرانی میں اور منتخب تربیت یافتہ کارکنوں کے ساتھ ابتدائی تنصیب کا کام شاید کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں لیکن اس طرح کی مہارت اوسط درجے کے کارکن کے حصے میں نہیں آتی جسے اکثر مرمت اور دیکھ بھال کے کام کے لیے وہاں لایا جاتا ہے۔ اس کا تو اوزار چلانے اور آزمائش کرنے کا طریق کار ہے جس کی وجہ سے ایک سیکھے ہوئے گاہک کا بھی اس سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

معیشت کے مفاد کے لیے بہت سے متبادل ساز و سامان استعمال میں لائے گئے ہیں اور ان سے یہی مقصود ہے کہ بنیادی ساز و سامان کو دوسری زیادہ قیمت والی اشیا کی تیاری میں استعمال کیا جائے۔ یہ تو خود کسی ملک پر منحصر ہے کہ وہ کیلشیم فولاد کو فولادی پائپوں جیسی نچلی ٹیکنالوجی والی اشیا بنانے میں لگائے یا کچھ بہتر یعنی اعلیٰ ٹیکنالوجی میں استعمال کرے اور اچھے یعنی کئی گنا زیادہ منافع کمائے

ہندوستان میں پی۔ وی۔ سی پائپوں کا استعمال گیلوانائزڈ فولادی پائپوں کی جگہ لے سکتا ہے جس سے جست کی درآمد میں بچت کے علاوہ فولاد کو دوسرے زیادہ قیمت پیدا کرنے والے مصنوعات کی جانب صرف کیا جا سکتا ہے۔ پی۔ وی۔ سی کے پائپ گھستے نہیں، بلا روک ٹوک مائعات کا بہاؤ اور زیادہ لمبی پائیداری فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ زیادہ ہلکے اور آسانی سے قابل تنصیب ہوتے ہیں۔ پی۔ وی۔ سی کی ساری صنعت جو بڑی بڑی امیدیں لے کر شروع ہوئی تھی، صارفین کی طرف سے سخت مزاحمت سے دوچار ہے جس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ صارفین کو سمجھانے میں ناکام رہی ہے اور اہم وجہ یہ ہے کہ یہ اوسط درجے کے پلمبر کو پی۔ وی۔ سی کے پائپ آپس میں جوڑنے کے طریقوں اور استعمال ہونے والی فٹنگز کے بارے میں تربیت دینے سے قاصر رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ صارفین ایسی مفید چیز کو استعمال کرنے سے کتراتے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں کاریگروں کی انجمنوں نے کارکنوں کلاں کے اپنے اپنے شعبوں میں تربیت دینے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ معمار کھاتی، بجلی کے کاریگروں وغیرہ کی اپنی اپنی انجمنیں ہیں جو اپنے پیشے کے مفادات کی دیکھ بھال کے علاوہ اپنے پیشے میں نو آموز گاروں کو بھی لے آتے اور انہیں تعلیم و تربیت دیتے ہیں۔ قانون کسی آدمی کو کوئی پیشہ اپنانے سے مانع ہوتا ہے جب تک وہ اپنی انجمن کا امتحان پاس نہ کر لے اور ایک مقررہ وقت تک آموزگار کی حیثیت سے کام نہ کر لے۔ یہ انجمنیں پیشہ ورانہ میگزین شائع کر کے اپنے پیشے کی برادری کی رہنمائی کرتے ہیں اور انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرتے ہیں باقاعدہ ریفریشر کورس چلائے جاتے ہیں تاکہ حصہ لینے والوں کو نئے طریقوں کا عملی تجربہ فراہم کیا جائے۔

اپنے ایک امریکی دورے کے دوران ایک انجمن کی گریجویشن تقریب میں بطور مہمان شریک ہوا انجمن کے اراکین اور تربیتی استادوں کی طرف سے اپنے کام میں انہماک کو دیکھ کر مجھے بڑی حقیقی مسرت کا احساس ہوا۔ ہر چہرے سے فخر کا احساس جھلک رہا تھا اور نئے گریجویٹس کو انھوں نے اپنے پیشے میں دلی خیر مقدم پیش کیا تھا۔

ہندوستان کاریگروں کی کامیابی سے متعلق بڑی بھرپور روایتوں سے وابستہ رہا ہے جس کے لیے اسے عالمی داد و تحسین حاصل ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے ہماری روایتوں نے افراد پر ہی زور دیا ہے اور فنی مہارت پشتینی انداز میں باپ سے بیٹے اور زیادہ سے زیادہ کنبے تک ہی محدود رہی ہے۔ ماضی قریب تک ہی کاریگری کے سلسلے میں کوئی اجتماعی تصور وجود میں نہیں آیا اور مہارت کی خوبی چند ایک افراد کا اجارہ بن گئی۔ وقت کی ضرورت یہ ہے کہ کاریگری کا عام معیار اوپر اٹھایا جائے اس لیے یہ اشد ضروری ہے کہ ہر شہر میں سائنسی انداز کے تربیتی اسکول چلائیں جن کے لیے نصاب اور امتحانی معیار مشترکہ نوعیت کے ہوں تاکہ کارکردگی میں یکسانیت رہے۔



ایسا اقدام پیشے کے لیے احترام حاصل کرے گا، مزید تعلیم یافتہ صلاحیت کے لیے کشش پیدا کرے گا اور آج کی طرح ان پڑھ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں تک ہی محدود نہیں رہے گا۔ جانکاری کی بدولت کارکن کے اندر اپنی کاریگری کے تئیں اعتماد اور فخر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس سے قوم کے کردار کی تعمیر میں مدد ملتی ہے۔

ایسا قانون نافذ ہونا چاہیئے جس کے تحت مناسب تربیتی اسناد کے بغیر کسی پیشے میں کام کرنے کی ممانعت ہو۔ اس کے لیے رجسٹریشن یا لائسنس حاصل کرنا لازمی ہونا چاہیئے۔ ویدوں اور حکیموں کے بارے میں شروعات کی جا چکی ہے، تو کیا ان تربیت یافتہ کاریگروں اور کارکنوں کیلئے ایسا کیوں نہ کیا جائے جن کی کارکردگی سماج کے لیے کسی طرح بھی کم یا غیر اہم نہیں ہے۔

بنیادی لوازم کو نظر انداز کرنا خطرناک ہے۔

## بقیہ: میٹروپولیٹن

ٹھکانے لگانا بھی تو ہے۔

پروفیسر مورتی بولے: اچھا مجھے یاد آیا۔ ماحولیاتی آلودگی کا بدترین پہلو ہے لوگوں کا سر عام رفع حاجت کے لیے بیٹھ جانا جو کہ ہمارے ملک کا مخصوص پہلو ہے۔ ریل اور سڑک کے کنارے بڑے مرغوب ہوتے ہیں کیوں کہ وہاں اونچی اور خشک جگہ دستیاب ہوتی ہے اس لیے بیٹھنے والے اپنا کام چلاتے ہیں اس اعتماد کے ساتھ کہ دیکھنے والے تو اجنبی ہوتے ہیں جنہیں چلا جانا ہے۔ لوگ اپنے ہی فضلے سے الگ ہو کر چلتے ہیں جیسے اس کا ان سے کوئی تعلق ہی نہ ہو کسی فارغ ہو کر جاتے ہوئے شخص سے روبرو ہو کر یہ کہنے کا خیال پیدا ہوتا ہے "معاف کیجیے گا آپ کا کچھ گر گیا ہے"

## بقیہ: خودکشی

اس میں قانون تو کیا، زندگی اور دنیا کی ہی کوئی اہمیت اس کے لیے نہیں رہ جاتی۔

اسی طرح یہ سوچنا بھی فضول ہی ہوگا کہ عدالت کے اس فیصلے کے بعد انفرادی خودکشی کے واقعات میں اضافہ ہوگا، کیوں کہ جس طرح کوئی ناشاد و نامراد شخص قانون کے ڈر سے خودکشی سے باز نہیں رہ سکتا، اسی طرح کوئی احمق سے احمق اور مہم پسند سے مہم پسند شخص بھی محض اس بنا پر خودکشی کا ارادہ نہیں کر سکتا کہ اب (ناکام رہنے کی صورت میں) اسے قانون سے کوئی خطرہ نہیں۔ قانون کا خوف نہ سہی مگر بھیانک موت کا خوف تو بدستور ہے، جس کے اندر زندہ رہنے کی ذرا بھی خواہش باقی ہوگی وہ اس نہج پر سوچ بھی نہیں سکتا۔ عمل تو دور کی بات رہی۔

عدالت نے خودکشی کے ضمن میں یہ فیصلہ کر کے اپنی رائے دے دی ہے۔ اب اس کی روشنی میں اس سلسلے میں واضح قانون بنانا، اور اس قانونی پیچیدگی کو ہمیشہ کے لیے حل کر دینا قانون ساز اداروں کا کام ہے۔ لہٰذا اس سمت میں ہماری پارلیمان کو فوراً توجہ دینا ہوگی۔

دیویندر اسر

# دُور درشنی سیاسیات

عوام کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی اور رائے عامہ کی تشکیل کے سلسلے میں ذرائع ابلاغ کا کردار دنیا بھر میں تسلیم لیا گیا ہے۔ دور درشنی سیاسیات کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ لگ بھگ پچاس برس پہلے بھی ٹیلی ویژن کے آغاز کے ساتھ ساتھ اسے ترویج حاصل ہوگئی تھی۔ ہٹلر نے اور اتحادیوں نے بھی اس کا فائدہ اٹھایا۔ جہاں جرمن ٹیلی ویژن نے ہٹلر کو اس کے قد و قامت سے بھی کہیں عظیم تر دکھایا وہاں اتحادیوں نے بھی اسی طرح روزویلٹ، چرچل، اسٹالن اور ڈی گال جیسے مشاہیر جنگ کا مظاہرہ کیا۔ جنگ کے دوران اور اسی طرح اس کے حالات میں دور درشنی سیاسیات بدستور رہی ہے اور رہے گی۔ دوردرشن محض تفریح طبع کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ اس کی بدولت ناظرین کو تازہ ترین خبریں بھی بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ لیکن خبریں کس چیز سے بنتی ہیں اور کون لوگ ان کا موضوع ہوتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ خبریں غیر معمولی نوعیت کے قومی اور بین الاقوامی واقعات اور عوام کے ممتاز سربراہوں پر مبنی ہوتی ہیں اور ہندوستان جیسے عظیم ملک کے وزیر اعظم یقیناً ایک ایسی ہی شخصیت کے مالک ہیں۔ وزیر اعظم کے ٹیلی ویژن پر بہت زیادہ پیش کیے جانے پر مضمون نگار نے جس ردِ عمل کا اظہار کیا ہے اس کی تہہ میں شاید ان کا یہ خدشہ کارفرما ہے کہ مبادا وزیر اعظم جیسے نیک سربراہ اپنے حدود سے تجاوز کر کے آمریت پر اتر آئیں۔ ایسے میں ہم دیویندر اسر کو یقین دلا سکتے ہیں کہ آمریت کے لیے ہمارے ملک میں کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ ہمارا جمہوری نظام اسے روکنے کے لیے کافی مضبوط ہے۔ (ایڈیٹر)

ہندوستان میں دور درشن کا سلسلہ ستمبر ۱۹۵۹ء میں شروع ہوا تھا جب تجرباتی طور سے اسے ایک گھنٹے کے لیے ہفتے میں دو بار دکھایا جاتا تھا تاکہ یہ سماجی تبدیلی کے لیے ذریعۂ ابلاغ کی صورت میں کام کر سکے۔ اب دوردرشن کافی فروغ پا چکا ہے لیکن مقصد بدل گیا ہے۔ اب اسے بیشتر حکومت کے کاروبار کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس طرح وہ سیاسی عمل ناپید ہو جاتا ہے جس میں تبدیلی کے تحرک میں عوام کا کردار مرکزی نوعیت رکھتا ہے آج جو کچھ ہم دوردرشن پر دیکھتے ہیں وہ "دور درشنی سیاسیات" ہے جس سے مراد ہے شخصیات کی بدولت حکمرانی کرنا۔ اس میں سیاسیات ملکی امور کی بجائے شخصیتوں کا معاملہ بن جاتی ہے۔ اس میں بہترین آدمی کی جگہ بہترین تاثرات کا مالک ہی سرخرو ہوتا ہے اور یہ تاثرات دوردرشن کے ذریعے سے محنت کے ساتھ پیدا کیے جاتے ہیں۔

اس صورت حال سے وزیر اعظم کے دوردرشن پر ضرورت سے زیادہ نمودار ہونے کے وہ اسباب واضح ہو جاتے ہیں جن کے تحت اسے "وزیر اعظم درشن" کا نام دیا گیا اور وہ بھی اس تشہیر یافتہ خط کے باوجود جس میں وزیر اعظم نے سابقہ وزیر اطلاعات و نشریات شری وی۔ این۔ گاڈگل کو مشورہ دیا تھا کہ اس تاثر کی حوصلہ افزائی سے گریز کیا جائے کہ دوردرشن کا ایک اہم کام یہ ہے کہ وزیر اعظم یا اس کے کنبے کو زیادہ سے زیادہ پیش کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوردرشن پر وزیر اعظم کو اس سے بھی زیادہ پیش کیا گیا۔ ذرائع ابلاغ کے کارگزاروں نے وزیر اعظم کو عذرِ شک و شبہ کی پناہ دے کر دوردرشن کے چھپے کارکنوں کو دوش دے دیا اور یہ بھول گئے کہ دوردرشن کے چھپے کارکن وزیر اعظم کی خواہشات کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔

لہٰذا یہی تاثر بدستور چلتا ہے کہ وزیر اعظم کا متذکرہ خط اس قدر عمل کا متقاضی نہیں تھا جس قدر کہ وہ عوام کا منہ بند کرنے کے لیے تھا۔ اس خط کے بعد کیا ہوا؟ وزیر اعظم کے دورۂ راجستھان پر ایک طویل فیچر پیش کیا گیا جو ہر لحاظ سے بالکل ایک شاہی دورے کے مصداق تھا۔ اسی طرح وزیر اعظم کا کیرل میں دورہ بھی اس وقت کی یاد دلاتا تھا جب رعایا کے لوگ اپنے بادشاہ اور ملکہ کے آگے سرِ تسلیم خم کیا کرتے تھے۔ دور درشنی سیاسیات حکومت کے سربراہ اعلیٰ کو ایک شاہی معزز کی طرح پیش کرتی ہے اور اقتدار کی نئی علامت جسے سیاستدان حضرات بڑی بے شرمی کے ساتھ پوجتے ہیں اس میں فخر محسوس کرتی ہے۔ جمہوریت کا نام نہاد حزبِ مخالف بھی اسی کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ سربراہوں کے بیٹے اور بیٹیاں بھی منظرِ عام پر آتے ہیں اور لوگ ان کے واری جاتے ہیں اس لیے نہیں کہ وہ کوئی بہتر سربراہ یا کسی یقینی نظریے کے حامل افراد ہوتے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ایک خاندان کی علامت ہوتے ہیں، اس کا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ بُری طرح سے اس خاندان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔

دوردرشن نہ صرف اس تاثر کو پیش کرتا ہے بلکہ مزید تقویت دیتا رہتا ہے۔ شہنشاہیت کا اختتام لازمی طور سے خاندانی رویے کو ختم نہیں کر پاتا۔ نظریات اور حقیقی امور بے محل سے ہو جاتے ہیں۔ جین فرینکوکس ریویل کے الفاظ میں یہ صورت حال ایسی ہے جس میں حقیقت نہ عیسوی ہے نہ مارکسی بلکہ یہ دوردرشنی حقیقت ہے اور انقلاب ندارد ہے۔ چنانچہ "ٹیلی پالیٹکس" کے مصنف کہتے ہیں:

"خاندانی صورت حال میں (جسے ہم اس کے سیاسی معنی میں لیتے ہیں) حکمراں شخص چاہے اچھی طرح راج کرے، بری طرح راج کرے یا بے رخی سے راج کرے، تاہم وہ راج کرتا ہی چلا جاتا ہے جس کے لیے ہمیں اس کے نام اور اس کے خاندان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو چاہے شاہی خاندان ہو یا رتیسانہ۔ ایسے سیاسی نظام میں موصوف کی حکمرانی چلتی ہے کیونکہ عصائے اقتدار اس کے حوالے کر دی گئی ہے، شاہی لبادہ اس کے اوپر ڈال دیا گیا ہے۔ گویا خاندان کے نئے حکمراں عوام کے چہیتے بن جاتے ہیں۔ دوردرشنی سیاسیات خاندان کو سیاسی میدان میں واپس لے آئی ہے گویا دوردرشنی سیاسیات نے جمہوری انفرادیت کو ختم کر دیا ہے۔ ہندوستان آج بھی خاندانی رسم و راہ کی بنا پر زندگی کرتا ہے اور حزب مخالف کے ان حلقوں میں بھی بڑی دیانت داری کے ساتھ یہ رویہ بدستور ہے جن کے سربراہ جمہوری وا ہمہ کا پرچار کرتے ہیں۔

دوردرشنی سیاسیات سربراہوں پر ٹکی ہے کیونکہ اس میں بھی ایسے لوگ ہیں جو سربراہوں کو لبیک کہتے ہیں، واہ وا کرتے اور ان کی گل پوشی کرتے ہیں۔ لوگوں کا اشتراک اسی خوشنما چاپلوسی سے آغاز کرتا ہے اور اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ حقیقی زندگی میں، اور سیاسی فیصلہ دینے کے کاروبار میں وہ کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ روزمرہ کے سیاسی کاروبار میں عوام کا اجنبی رہنا ملک کے جمہوری اداروں، سماجی فروغ اور قومی یکجہتی کے لیے اچھا شگون نہیں۔ اس سے تشدد اور علیحدگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ولبر سکرام نے کہا ہے کہ ذرائع ابلاغ کے کارکن کسی شخص کا تصوراتی مجسمہ پیش کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں، وہ منزل مقصود اور ترقیاتی مسائل پر توجہ مرکوز کر سکتے ہیں۔ وہ کثیر تعداد میں خود اور براہ راست ذاتی اور قومی آرزوؤں کو ابھار سکتے ہیں۔ کیا ہمارا دوردرشن یہ فرض ادا کر رہا ہے۔ اس کا جواب یقیناً نہیں ہے۔

دوردرشن کے ۱۷۶ ٹرانسمیٹر ہیں جو ملک کی آبادی کے ۷۰ فیصد حصے کو (جس میں ۲۷ فیصد شہری اور ۴۳ فیصد دیہی آبادی شامل ہے جن کے لیے دوردرشن سے درگذر ممکن نہیں) مستفید کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ دوردرشن محض "دور کا درشن" ہے۔ حقیقی واقعات کی جگہ سے یہ بہت دور ہے۔ اس لیے "جن وانی" کا پروگرام چلتا ہے جو کہ عوام کی باوثوق آواز کا بیہودہ سا متبادل ہے۔ اس سے وزیروں اور ان کی جوابدہی سے لوگوں کی وابستگی کا کھوکھلا سا احساس پیدا ہوتا ہے کسی وزیر کی کارکردگی محض اسکرین پر اس کی اچھی اداکاری سے پرکھی جاتی ہے۔ میدان میں اس کے کام سے نہیں۔ مذکورہ کتاب کے مصنفین کہتے ہیں:

"انتظامیہ کے مشیروں نے چھٹی دہائی کے دوران اس اصول پر بڑا زور دیا تھا کہ کارکن لوگ بڑے خوش ہو جاتے ہیں اگر ان کی شکایت کو سن لیا جائے۔ بہتری لانا ضروری نہیں۔ ان کے لیے واقعی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی بات سنیئے اور یہ تاثر پیدا کیجیے کہ تم نے ان کی طرف دھیان دیا ہے۔"

دوردرشن کی اسکرین پر باہمی عوامل ایک ظاہری معاملے کے مصداق ہیں۔ ملک کے مختلف مقامات پر وزیراعظم کے دورے اور لوگوں سے ان کی بات چیت بس ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں جسے لحاق جمہوریت کا نام دینا بجا ہوگا جیسا کہ "جن وانی" ہے۔ سلامتی اور تحفظ کی وجوہات بہرحال ویسے ہی وزیراعظم کا عوام سے جدا رہنا ان کے لیے دوردرشنی سیاسیات کا سہارا لینا لازمی کر دیتا ہے جس کے ذریعے وہ ہم سے مخاطب ہوتے ہیں لیکن ہمیں دیکھ نہیں پاتے اور ہم انہیں دیکھ لیتے ہیں لیکن ان سے بات نہیں کر پاتے۔

چنانچہ وزیراعظم دوردرشنی سیاسیات کے ذریعے سے عوام سے رابطہ رکھتے ہیں گویا الیکٹرانی چیک دمک ہی ان کے لیے اظہار اقتدار کا ذریعہ رہ گئی ہے اس سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ حکومت بیشتر ماہرین اور ہم مرتبہ گروہوں کے ذریعے سے چلائی جائے جو منتخب شدہ ہوں یا نہیں لیکن ان پر منتخب حضرات انحصار رکھتے ہوں۔ یہ حلقہ غیر ادارہ جاتی ہوتا ہے اور صرف اس سربراہ کا تاثر اجاگر کرنے کے لیے کام کرتا ہے یہ محض سربراہ کے تئیں ذمہ دار ہوتا ہے ان کے لیے نہیں جنہوں نے سربراہوں کو ووٹ دیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تعلقات عامہ کا یہ قبیلہ ہی دراصل ان پروگراموں کا ہدایتکار ہوتا ہے جن میں وزیراعظم کو پیش کیا جاتا ہے وہ بذات خود وہاں موجود ہوتے ہیں جب ایسے پروگرام زیر عمل ہوتے ہیں۔ انھوں نے ذرائع ابلاغ کا ایک عجیب و غریب دائرہ تخلیق کیا ہے۔ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وزیراعظم کا ایک نسوانی پرستار ان کا عینک سمیت فوٹو دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ اصل شے ان کا تاثر ہے۔ حکومت کرنے کی صلاحیت ثانوی ماہیت رکھتی ہے۔

تاثراتی سیاسیات اکثر صحیح چیز سے خالی ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص جو اپنے تاثر کے ذریعے سے اپنا اقتدار کو قائم رکھتا ہے اسے لازمی طور سے اس طرح کے صلاح کاروں، نام نہاد مفکروں اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کے گروہوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ تاثر بیشتر خواب و خیال سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ حقائق سے لہٰذا مصنوعی الفاظ حقیقی عمل کی جگہ لے لیتے ہیں اور سماج بدانتظامی کی جانب چل دیتا ہے۔ سربراہ اعلیٰ جو کچھ کرتا ہے وہ کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ وہی چیز معنی رکھتی ہے جو وہ کہتا ہے کہ اس نے کی ہے اور جو آئندہ وہ کرنے والا ہے۔

اقبال مسعود نے بجا کہا ہے کہ ٹیلی ویژن نے بنیادی طور سے سوچ وچار، منطق اور تدوین و تالیف کے ان طریق کار کے خلاف جو الفاظ پر مبنی ثقافت کے لیے مرکزی ماہیت رکھتے ہیں۔ ذریعہ ابلاغ کی فطرت میں یہ شامل ہے کہ وہ خیالات کو دبا کر رکھے تاکہ نمائش مفاد کی ضروریات کو گنجائش دی جا سکے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب ہے کہ دکھاوے کے کاروبار کے اہمیت کو گنجائش ملے۔

ٹیلی ویژن نے سیاسیات کو ایک جھانکی ایک سرکس اور ایک دکھاوا بنا دیا ہے اور یہ دکھاوا چلتا رہنا چاہیے۔ نتائج کی پرواہ نہیں۔ جیمز ویسلن نے جو مغربی نظام کے بارے میں کہا ہے وہ ہندوستان کے لیے بھی درست ہے:

"ہم واقعات کی اور خاص کر ان واقعات کی رپورٹیں فراہم کرنے میں خاصے بروئے کار ہوتے ہیں جو ڈرامائی نوعیت کے ہوں۔ ہم واقعات سے مسحور ہوتے ہیں اور اس چیز سے مسحور نہیں ہوتے جو واقعات کا باعث ہوتی ہے۔ ہم سوچ وچار کی خبروں کا احاطہ نہیں کرتے جو ہمیں کرنا چاہیے۔ یہی وہ صورت حال ہے جہاں سے بغاوت، انقلاب اور جنگ جنم لیتے ہیں۔ لیکن ہم سرعام تنازعات پر زور دیتے ہیں اور ثانوی پہلو کو پہلوئے اول سے وابستہ نہیں کرتے۔"

مظفر حسین سید

# خودکشی : حقِ خود اختیاری ؟

گزشتہ دنوں دو خبروں نے پورے ملک کو چونکا دیا تھا۔

پہلی خبر یہ تھی کہ جبل پور کے قریب ایک گاؤں میں ایک ۲۵ سالہ خاتون اپنے شوہر کی موت کے بعد اس کی نعش کے ساتھ جل کر ستی ہو گئی قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اس کے اس اقدام کو پوری برادری کا آشیرواد حاصل تھا۔

دوسری خبر یہ تھی کہ بمبئی کی عدالت عالیہ نے خودکشی کی سعیِ ناکام کے سلسلے میں ایک شخص کو مجرم نہیں گردانا، اور اپنی زندگی پر اس کے انفرادی حقِ خود اختیاری کو تسلیم کرتے ہوئے اسے باعزت بری کر دیا۔

بظاہر مختصر، مگر زوردار ان دو خبروں نے ملک بھر کے عوامی حلقوں میں عموماً اور دانشورانہ حلقوں میں خصوصاً ایک ہلچل سی مچا دی۔

ستی کی خبر، کوئی نئی خبر نہ تھی، اس غیر انسانی اور مکروہ رسم کے خاتمے کے برسوں بعد بھی، آزاد ہند میں یہ سلسلہ جاری رہا ہے، اور گاہے گاہے معصوم صنفِ نازک کے بالرضا یا بالجبر ایک وحشیانہ روایت کے بھینٹ چڑھنے کی خبریں آتی رہی ہیں ـــــ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس غیر انسانی وغیر قانونی تماشے کو یا تو عام، برادری اور گرد و پیش کے لوگوں کی شرمناک حمایت حاصل رہی ہے یا کم از کم سماج نے اس معاملے میں چشم پوشی ضروری سمجھی ہے، اور قانون کے رکھوالوں کا رویہ بھی خاصا غیر ذمہ دارانہ نظر آیا ہے۔

مہذب ملکوں اور قوموں میں گزشتہ کچھ عرصہ سے یہ مسئلہ بحث کا موضوع رہا ہے کہ کیوں نہ خودکشی کو انسان کا بنیادی حق تسلیم کر لیا جائے جسے وہ حسبِ منشا استعمال کر سکتا ہو۔ اس سلسلے میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ جس طرح ایک شخص کو اپنی زندگی پر اختیار ہے کہ وہ اسے جس طرح چاہے بسر کرے، اسی طرح اسے یہ حق بھی ملنا چاہیے کہ جب اس کا دل چاہے تب وہ اپنی زندگی کو اپنے من چاہے طریقے سے ختم بھی کر لے۔

ہندوستان کے تعزیری قانون کے تحت خودکشی کرنے اور خودکشی پر آمادہ یا مجبور کرنے کے اعمال کو "جرم" قرار دیا گیا ہے اور اس قسم کے الزامات کے سلسلے میں لوگوں پر مقدمے چلتے رہے ہیں اور انھیں سزائیں بھی ہوتی رہی ہیں۔

کسی کو خودکشی پر آمادہ کرنا، مجبور کرنا یا ایسے حالات پیدا کرنا کہ کوئی شخص تنگ آ کر خودکشی کا راستہ اختیار کرے، یہ سب بڑے سنگین جرم ہیں اور ان کے لیے سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ کسی فرد کے ذریعہ خودکشی کی سعیِ ناکام کے بعد اس شخص پر مقدمہ چلا کر اسے سزا ہونے کی بھی مثالیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ خودکشی کی کوشش کامیاب ہونے کے بعد تو وہ شخص قانون کی گرفت سے خود بخود آزاد ہو جاتا ہے، اور دنیا کی کسی عدالت میں اس پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔

لیکن بمبئی ہائی کورٹ کے ایک فیصلے نے اس صورت حال کو یکسر بدل کر بحث کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ اپنے اس تاریخی فیصلے میں جسٹس ساونت اور جسٹس کولسے پاٹل نے تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۳۰۹ کو آئینِ ہند کے آرٹیکل ۱۴ اور ۲۱ کے خلاف قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے کہ کسی شخص کا خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کرنا جرم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ فاضل ججوں نے اپنے فیصلے میں مذکورہ دفعہ کو کالعدم قرار دیتے ہوئے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اپنی رضا سے اپنی جان لینے کے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے فاضل قانون دانوں نے "ستی" اور "جوہر" کا بھی ذکر کیا ہے۔

تقریباً ایک سال قبل دہلی کی عدالت عالیہ کے جج جسٹس راجندر سچر نے بھی اسی قسم کا ایک تاریخی فیصلہ دیا تھا۔ ان کا فیصلہ اس حد تک تو نہیں تاہم بمبئی ہائی کورٹ کے فیصلے کے آس پاس ضرور پہونچ گیا تھا۔ جسٹس سچر نے حکم دیا تھا کہ تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۳۰۹ کے تحت (الزام خودکشی میں) دہلی کی تمام عدالتوں میں زیرِ سماعت تمام مقدمات کو فوراً خارج کر دیا جائے۔ انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ اس دفعہ کے شاملِ قانون رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

بمبئی ہائی کورٹ کے شہرت یافتہ مقدمے کی تفصیل یہ ہے کہ ایک پولیس کانسٹبل جس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی، وہ اپنا پیٹ پالنے کے لیے ایک دکان کھولنا چاہتا تھا، مگر اسے اجازت نہ مل سکی۔ حالات سے تنگ آ کر بالآخر اس کانسٹبل نے ایک اعلیٰ افسر کے کمرے میں اپنے آپ کو نذرِ آتش کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی گئی، بعد میں اس پر اقدامِ خودکشی کے الزام میں مقدمہ چلا، اور اس مقدمے میں عدالت عالیہ نے اسے باعزت بری کر دیا۔

عدالت نے اپنے فیصلے میں کہا کہ اس طرح خودکشی کی یہ کوشش، دراصل مدد کے لیے پکارنے کے مترادف تھی اور کسی ایسے شخص کو جو مدد کا خواستگار ہو، سزا دینا وحشیانہ، غیر آئینی اور غیر انسانی فعل ہے۔ عدالت نے اپنی زندگی اور موت کے سلسلے میں "فرد" کے حقِ خود اختیاری کو تسلیم کیا ہے۔

فاضل ججوں نے مبینہ طور پر اپنے اس تاریخی فیصلے میں کہا ہے کہ خودکشی یا اس کی کوشش کبھی بھی نفرت یا مذمت کا نشانہ نہیں رہی ہے، لیکن ایسا ہوتا اگر زندگی خود محترم ہوتی۔ (دراصل) زندگی کو ختم کرنے کا سبب یا وہ حالات جن میں زندگی کو ختم کیا جاتا ہے، ان ہی کی بنا پر سماج نے اس کے (خودکشی کے) تئیں اپنا رویہ اختیار کیا ہے۔ فاضل ججوں کی اس نکتہ رسی کی اگر ہم اپنے الفاظ میں وضاحت کرنا چاہیں تو شاید یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں خود زندگی کی ہی قدر و قیمت کب ہے، جو اس کے خاتمہ کو قابلِ نفرین سمجھا جائے۔ ہاں جن حالات میں یا جن وجوہات کی بنا پر زندگی سے تنگ آنے والے جسم و جان کے رشتے کو ...

سے منقطع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، ان پر فرد تبصرہ آرائی ہوتی ہے اور اسی بنا پر سماج والے یہ طے کرتے ہیں کہ اس شخص کا یہ عمل قابل نفرت تھا، یا قابل احترام۔ "ستی" کی رسم کا (آج کے ہندوستان میں بھی) باقی ہونا، عورتوں کا بھری برادری کے سامنے اپنی جان دینا (یا جان دینے پر مجبور ہونا) اور اس عمل کے لیے سماج کا اجازت دینا، اس بات کا ثبوت ہے — سماج نہ صرف اجازت دیتا ہے، بلکہ اس بھیانک عمل کو بہ نظر احترام دیکھتا ہے۔

راجستھان کا گاؤں دیورالہ اس امر کا منھ بولتا ثبوت ہے، جہاں وہ مقام آج بھی لوگوں کی عقیدت بھری توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے، جہاں گزشتہ سال ایک عورت نے ستی ہو کر اپنی جان دی تھی۔ اس قربان گاہ کو نہ صرف محفوظ کر لیا گیا ہے بلکہ عقیدت مند لوگ وہاں نارئیل کی نذر بھی چڑھاتے ہیں۔ یہی حال جوہر کا ہے، یہ رسم آج باقی نہ سہی، لیکن "ہم عام ہندوستانی" اجتماعی خودکشی کے اس تکلیف دہ عمل کو شاید اب بھی "احترام" کی نگاہ سے ہی دیکھتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی مرن برت رکھتا ہے تو (اس سے قطع نظر کہ اس کا مقصد کتنا جلیل اور کتنا فضول ہے) ہم اس کے اس جرأت مندانہ قدم سے متاثر ہوتے ہیں۔ بھوک ہڑتال کے حق کو تو ہمارا قانون بھی تسلیم کرتا ہے۔

اصل نکتہ وہ ہے جس کی جانب بمبئی کی عدالت عالیہ نے اپنے فیصلے میں توجہ دلائی ہے یعنی وہ حالات جن کے تحت کوئی شخص خودکشی جیسے تکلیف دہ، ناپسندیدہ اور مشکل انجام کو اپنا مقدر بنانے پر مجبور ہوتا ہے۔ خودکشی کرنے والا تو (ناکام رہنے کی صورت میں) قانون کی گرفت میں آ جاتا ہے، لیکن وہ سماجی محرکات جو اسے اس تکلیف دہ فیصلے پر مجبور کرتے ہیں، وہ صرف موٹے موٹے آنسو بہا کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ قانون کے لیے ہاتھ بھی ان تک نہیں پہونچ پاتے، کیوں کہ ان کا رول تو عام طور پر نفسیاتی اور ذہنی ہوتا ہے، کوئی مادی ثبوت ہوتا ہی نہیں، اور قانون ثبوت مانگتا ہے۔

خودکشی کا رواج یوں تو پوری دنیا میں ہے ترقی اور جدیدیت کے دعویدار مغرب میں ہمارے یہاں سے بھی زیادہ۔ بعض معاشروں میں تو اسے "رومانس" کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ جاپان کی "ہارا کاری" اس کی ایک مثال ہے۔ یوروپ اور امریکہ میں ایسے واقعات بھی سامنے آتے ہیں جہاں لوگوں نے صرف اس لیے خودکشی کی کہ وہ موت کا مزہ چکھنا چاہتے تھے، یہ تجربہ کرنا چاہتے تھے کہ موت کس طرح آتی ہے۔ تاہم مغربی ممالک میں خودکشی کی وجہ عموماً عشق میں ناکامی یا کوئی نفسیاتی الجھن ہوتی ہے، جب کہ ہمارے یہاں یہ ایک محض معاشرتی اور سماجی مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں ہونے والے خودکشی کے اکثر واقعات کے اسباب بے روزگاری، مفلسی، مایوسی، استحصال اور بھوک ہوتے ہیں، جب آدمی تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق خود اپنے ہی خلاف صف آرا ہو جاتا ہے۔ امتحان میں ناکامی، کسی اور طرح کی ذلت یا عشق میں نامرادی بھی خودکشی کا سبب ہوتی ہے، لیکن معاشی اسباب کا پلڑا خاصا بھاری ہوتا ہے۔

انفرادی وجوہات کے علاوہ کسی سیاسی یا سماجی مطالبے کی حمایت میں بھی لوگ اپنے آپ کو نذر آتش کر کے خودکشی کرتے ہیں۔ لیکن ایسی کوششیں چونکہ علانیہ اور تماشگی طور پر کی جاتی ہیں اس لیے عموماً قانون انھیں روک دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

دراصل خودکشی کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان اسباب کے سدباب کی کوشش کی جائے، جن کی بنا پر انسان یہ ناگوار عمل کرنے کی حد تک پہونچتا ہے، یہی اصل مسئلہ ہے۔

بمبئی کی عدالت عالیہ کے مذکورہ فیصلے کے بعد ملک کے دانشور حلقوں میں ایک نئی بحث شروع ہوئی ہے۔ اس امر کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ عدالت کے اس فیصلے کو بنیاد بنا کر ہمارے سماج کے رجعت پرست عناصر "ستی" کی فرسودہ رسم کو قانونی شکل دینے کی کوشش پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ اور عدالت کا یہ فیصلہ صنف نازک کے استحصال کے لیے بہانہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں اگرچہ "ستی" کی رسم برطانوی عہد (۱۸۲۹ء) میں ہی خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی، لیکن اس کے باوجود یہ رسم پوری طرح ختم کبھی نہیں ہوئی۔ آزادیٔ وطن کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ ماضی قریب میں ۱۹۷۹ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک عورتوں کے اپنے پتی کی ارتھی کے ساتھ جل کر مر جانے کے کم از کم نصف درجن واقعات ہوتے ہیں، اور ان مقامات پر قانون کے محافظوں نے اس کو کوشش کو ناکام بنا دیا اور ایک جگہ تو پولیس کو گولی بھی چلانی پڑی۔ "ستی" کے سلسلے میں متعدد مقدمات بھی چل رہے ہیں، اگرچہ اس ضمن میں کوئی مستند اطلاع دستیاب نہیں کہ حالیہ برسوں میں اس طرح کے کسی مقدمہ میں کوئی سزایاب بھی ہوا ہے یا نہیں۔

یہ مثالیں وہ ہیں، جن کی باضابطہ اطلاع (حادثہ ہونے سے پہلے یا بعد میں) پولیس کو ملی، اور اس پر کارروائی ہوئی — یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنے ایسے واقعات اور ہوں گے، جو سرے سے ریکارڈ میں آ ہی نہیں سکے۔ "ستی" کے واقعات چوں کہ دیہی علاقوں میں ہی ہوتے ہیں، اور سماج کی پوری منظوری کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس لیے متعدد معاملات کا پولیس کے علم میں نہ آنا، اور ان کی اطلاع کا اس خاص علاقے سے باہر نہ نکلنا عین قرین قیاس ہے۔

بمبئی ہائی کورٹ کے فیصلے سے صرف تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۰۹ متاثر ہوتی ہے (جو اقدام خودکشی کے خلاف ہے) لیکن دفعہ ۳۰۶ بدستور کارگر ہے اس دفعہ کے تحت کسی کو خودکشی کے لیے مجبور کرنے والوں کے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔ (اس جرم کی سزا دس سال قید تک ہے)۔

لہذا یہ خدشہ درست نہیں کہ بمبئی ہائی کورٹ کے اس فیصلے سے جہیز کی بھینٹ چڑھنے والی خواتین کی اموات (یا قتل)، اور ستی کے واقعات میں اضافہ ہوگا۔

البتہ اپنی زندگی پر (اسے جینے یا ختم کرنے کا) مکمل اختیار کو تسلیم کیے جانے کے بعد بھوک ہڑتال اور خودسوزی جیسے سماجی و سیاسی واقعات پر اس کا اثر پڑ سکتا ہے۔ ان معاملات کے سلسلے میں اب پولیس دفعہ ۳۰۹ کے تحت کارروائی نہیں کر سکے گی۔ رہ گئی انفرادی خودکشی، تو اس پر اس فیصلے، یا کسی اور فیصلے یا قانون کا اثر پڑنا خارج از امکان اس لیے ہے کہ خودکشی جیسے اقدام کا انتہائی فیصلہ کوئی بھی شخص ہر طرف سے مایوس و نامراد ہو کر ہی کرتا ہے، اور یقینی امر ہے کہ خودکشی کی سعی کرنے والے کسی شخص کو یہ امید ہرگز نہیں ہوتی کہ وہ بچ جائے گا، اس صورت میں قانون کا خوف اس پر نہ پہلے غالب تھا اور نہ اب قانون کی چھوٹ سے اسے کوئی مزید ترغیب مل سکتی ہے۔ خودکشی کے فیصلے کی سطح تک پہونچ جانے والا شخص جس ذہنی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے،

# Making life a tasty affair·!

## BHUTAN'S

## DRUK

**Squashes, Juices, Jams, Tomato Ketchup**

Prepared from the finest fresh fruits DRUK fruit products provide extra nourishment your family needs. Everybody will relish the taste and ask for more. Give them a healthy break at breakfast. Serve them DRUK fruit products.




BFP-NP-121

**BHUTAN FRUIT PRODUCTS LTD., SAMCHI-BHUTAN**

*Trade enquiries to :*

**TRADE LINKS LIMITED**, 'Prabhat Kiran', 17, Rajindra Place, New Delhi.

راجندر سنگھ بیدی۔

# تاریخی فلمیں

سوانحی اور تاریخی فلمیں کیا ہیں؟ اگر ایک سادہ لفظ یا جملے کے لیے لغت تک ہاتھ بڑھانا ضروری ہو تو سوانحی فلمیں وہ ہیں جو کسی بڑے آدمی یا کسی عظیم شخصیت کی زندگی کو فلم کی صورت میں ہمارے سامنے لے آئیں اور تاریخی وہ جو کسی ملک یا قوم کی گذشتہ زندگی کو مصور شکل میں پیش کریں لیکن یہاں پہنچ کر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کیا کسی بڑے آدمی یا بڑی شخصیت کی زندگی میں پیدائش سے لے کر موت تک کے واقعات کی فہرست گنوا دینا ایک سوانحی فلم کہلائے گا، یا کسی ملک اور قوم پر گذرے حالات کو سلولائیڈ پر لے آنے سے تاریخی فلم ہو جائے گی

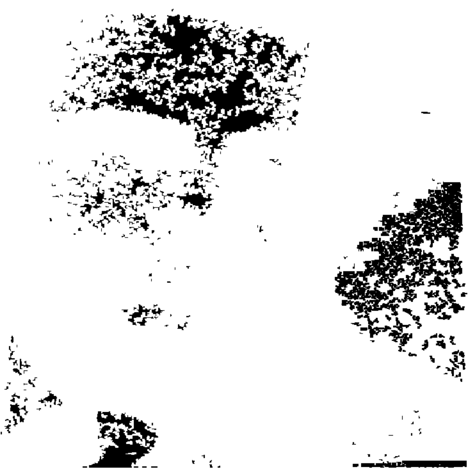
انسان کے بہت سے معمولوں کی طرح سوانح اور تاریخ بھی بند صندوں میں اینٹ اور پتھر ہیں جب تک یہ اینٹ اور پتھر کسی کاریگر معمار کے ہاتھوں میں نہیں آتے کوئی خوبصورت عمارت نہیں بن سکتی۔ آخر ایک انسان اور بہت سے انسانوں کی زندگی کی سوانح اور تاریخ کا ایک تصور وہ ہے جو بچپن میں اسکول ماسٹر نے ہمارے ذہن میں پیدا کیا۔ ایک معمولی اسکول ماسٹر کا تصور سوانح اور تاریخ کے بارے میں ساکت ہے کیوں کہ اس میں ہم ہر انسان اور ہر واقعہ کو ایک جگہ ٹھہرا ہوا دیکھتے ہیں۔ گویا انسان اور واقعات کا نہ گذرے ہوئے زمانہ کے انسان اور واقعات سے کوئی تعلق تھا اور نہ بعد میں آنے والے لوگوں سے۔ انسان یا واقعہ جس سلسلے کی کڑی ہے، اسے ہم نہیں دیکھ سکتے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بادشاہ یا اس کی رعایا پر خارجی حالات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اچھا آدمی اچھا حاکم تھا تو اس لیے کہ اس کا باپ چغتائی خاندان سے تعلق رکھتا تھا یا بہادر تھا۔ تو اس لیے کہ اسکی ماں راجپوت کی بیٹی تھی یا اس سے بھی ایک قدم پیچھے جا کر وہ پیدائشی طور پر اچھا یا برا تھا۔ اگر اکبر کو عقل سلیم حاصل تھی تو وہ خدا کی دین تھی۔ ایک بات جو اس قسم کا اسکول ماسٹر، تاریخ دان یا سوانح نگار نہیں دیکھتا وہ یہ ہے کہ اس سے پہلے کیا ہوا۔ اکبر کے باپ ہمایوں کو کیا کیا تکلیفیں اٹھانا پڑیں اور کیونکر؟ اکبر نے اور کہیں نہیں تو مصیبت اور تجربہ کے مدرسے میں تعلیم پائی اور اس لیے وہ ایسا حکمراں بنا اکبر اعظم کہلایا۔ برخلاف اس کے "دریافت ہند" کے فاضل مصنف خارجی حالات اور داخلی کیفیات دونوں کا برابر تجزیہ کر کے ہمارے سامنے رکھتے ہیں اور یہی بتاتے ہیں کہ اس زمانے کے سماج نے فرد پر کیا اثر ڈالا اور فرد نے سماج کو جوابی طور پر کیا دیا؟ آدمی اور ذرائع پیداوار نے آپس میں رشتے کیا تھے؟ ہم غیر کے زمانے سے لے کر چندر گپت موریہ کے سنہرے عہد تک پہنچے ہیں، تو کیسے؟ وہاں سے اکبر اعظم اور اکبر اعظم سے لے کر لارڈ کلائیو تک چلے آتے ہیں، تو کیوں کر؟ اور پھر کلائیو سے کرپس مشن تک۔

سوانحی اور تاریخی حالات اور واقعات یوں اپنی جگہ ساکن ہیں اور موم کی ناک ہیں جسے آپ جس طرف بھی چاہے موڑ کے رکھ دیں لیکن اگر آپ نے کسی شخص کی زندگی یا کسی ملک کی زندگی کے بارے میں ایک نقطۂ نظر وضع کر لیا ہے تو پھر اسی زندگی کے واقعات میں ایسے رنگ بھر سکتے ہیں کہ کتاب کی صورت میں پڑھنے اور فلم کی صورت میں دیکھنے والوں کو وہ نئے اور دلچسپ معلوم ہوں اور وہ سوچیں کہ واقعی لکھنے والے یا فلم پیش کرنے والے نے ہمیں پتے کی بات بتائی ہے، کسی خاص شخص کی زندگی یا کسی خاص عہد کی تاریخ کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے جس سے ہم واقف نہیں تھے یا اگر واقف تھے تو یہ سب باتیں ہمارے عقل اور جذباتی جسم کا حصہ نہیں بن پائی تھیں۔

یہ نقطۂ نظر کچھ بھی ہو ہمیں اس سے مطلب ہے تو صرف اتنا کہ اس کا مدار کسی دلیل پر ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے علم میں اضافہ ہو اور بہتری کے لیے انسان کی جد و جہد آگے بڑھے۔ یہ بھی نہ ہو تو کم سے کم ایک ایسی تفریح کا سامان ہو جو ہمارے بچوں، ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق کو نقصان نہ پہنچائے۔ انسان نے جو کچھ حاصل کیا ہے، کسی ایک آدمی کی دین نہیں۔ انسانی زندگی کا کل اس وقت بنا جب بہت سے جزو مل گئے بقول مرزا یگانہ:

اپنے اپنے رنگ میں اپنے اپنے حال میں
کوئی حیرانِ خزاں کوئی پریشانِ بہار

دنیا کی کم ہی چیزیں ہیں جو اپج کی حیثیت رکھتی ہیں کچھ ہم نے عربوں سے سیکھا، کچھ انھوں نے ہم سے۔ ہندوستان نے تصورات کا فلسفہ دنیا کے سامنے رکھا جس سے برکلے، کانٹ، ہیگل سے فلسفی متاثر ہوئے۔ مارکس نے انہیں فلسفیوں



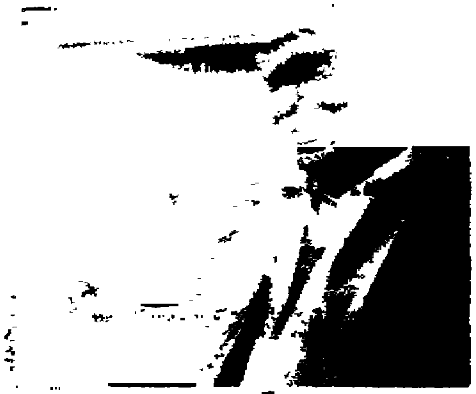
سہراب مودی

سے سیکھ کر ایک نیا انداز فکر پیدا کیا جسے ہم کائنات کا مادی تصور کہتے ہیں، لیکن ایسا کرنے میں انھوں نے خود سے پیچھے آنے والوں کی عملی شرکت کو نہیں جھٹلایا۔ گویا آپ چاہے روحانی نقطۂ نظر کے قائل ہوں، چاہے مادی کے اور چاہے آپ کا کوئی اپنا ہی نقطۂ نظر ہو مگر اس کے بغیر کسی بھی اچھی سوانح یا تاریخ کا لکھا جانا یا فلمانا ممکن نہیں۔ جب آپ اس نقطۂ نظر کو وضع کرنے بیٹھیں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ماضی کی چیزوں کو مصور کرنے کے لیے آپ کو آج کے زمانے کا علم بروئے کار لانا پڑے گا۔ گویا شراب پرانی ہو گی بوتل نئی۔ اس کو میں ایک مثال کے ذریعے سے واضح کروں

کو خاندانِ غلاماں کی سلطانہ رضیہ کے بارے میں تاریخ اتنی بتاتی ہے کہ اس کی محبت میر آخور یاقوت سے ہوئی جو ایک حبشی غلام [illegible] جب اس محبت کا ذکر کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اسی بات داستانوں میں دی ہے۔ آج سیکڑوں ہزاروں لوگ ہیں جو ایک بادشاہ یا شہزادی کی ایک آدمی سے محبت کو بغیر آہ یا واہ کے نہیں دیکھ سکتے اور ایک خاص تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے گورے اور کالے کی محبت کو دیکھ کر جن کا تن بدن جل اٹھتا ہے اور وہ کالے آدمی کو جیتے جی کچل دینا چاہتے ہیں۔

ایسے لوگ اس زمانے میں بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں۔ اس لیے اس قسم کے ظلم کو ہوتے دیکھ کر بغاوت یا قتل و خون کر دینا ایک ایسی بات ہوتی ہے جسے آپ سیکڑوں بار سن چکے ہیں، پڑھ چکے ہیں اور سنیما کے پردے پر دیکھ چکے ہیں۔ اس لیے اگر اس زمانے میں آپ رضیہ سلطانہ اور یاقوت کا قصہ بیان کریں گے، تو آپ کو یہ نقطہ اختیار کرنا پڑے گا کہ سلطانہ حبشی غلام سے اس لیے محبت نہیں کی کہ وہ بہت صحت مند تھا بلکہ اس لیے کہ وہ گورے اور کالے میں فرق نہیں سمجھتی تھی۔ ایبک سے لے کر خود اس کے باپ التمش تک کی تاریخ نے اس پر یہ چیز ظاہر کر دی تھی کہ ہر انسان میں صلاحیتیں موجود ہیں بشرطیکہ انہیں مناسب طریقے پر پنپنے کا موقع دیا جائے۔ یا اگر آپ کو سلطانہ رضیہ اور یاقوت کی محبت کے واقعے کی صحت پر ہی شک ہو تو آپ یہ دکھائیں گے کہ نسلی امتیاز کے خلاف جد و جہد آج سے صدیوں پہلے ہمارے ملک میں شروع ہو چکی تھی جب یہ کہانی اس نقطۂ نظر کی دلیل ہو گی تو نہ صرف لوگوں کے لیے دلچسپ ہو گی بلکہ تاریخ کی جدید REORIENTATION کی صورت میں دیکھنے والوں کے علم میں اضافہ کرے گی آپ رضیہ کے قصے کو کسی نظریے دیکھیں ترقی پسند اور رجعت پسند قوتوں کی ٹکر آپ کو سامنے نظر آئے گی رضیہ کی ماں ملکہ شاہ ترکن اور اسی کا بوڑھا وزیر جنیدی اور دوسرے ترک امرا نہیں چاہتے تھے کہ ایک نچلے طبقے کا اور پھر کالا آدمی کسی قسم کی طاقت حاصل کرے اس لیے انھوں نے رضیہ کی جگہ اس کے بھائی رکن الدین کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کی، حالانکہ وہ ایک عیاش آدمی تھا اور زیادہ شراب پینے کے عمل نے اسے بزدل اور حکومت کے اعمال بنا دیا تھا، چنانچہ رضیہ ان سب باتوں کے خلاف عملی طور پر جنگ کرتی ہے مگر آخر کار دیکھتی ہے کہ یہ جاہل ترک امیر اور وزیر اس کی اور یاقوت کی محبت کو اچھی طرح دیکھیں وہ ایک عورت کے مردوں پر حکومت کرنے ہی کو اپنے لیے باعث شرم سمجھتے ہیں۔ مگر وہ ڈٹی رہتی ہے خود اس کی ماں ملکہ شاہ ترکن اسے قتل کرنے کے لیے یونت

لانے میں زہر ملا کر بھیجتی ہے اور اس کام کے لیے یاقوت کو ہی لگایا جاتا ہے مگر جب یاقوت ملکہ کے حسن و جمال کو دیکھتا ہے تو اس ارادے کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔ جمالیات کا احساس ایک کالے آدمی کو بھی ہو سکتا ہے اور یاقوت نہیں چاہتا کہ اتنی خوبصورت چیز کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا جائے۔ رضیہ کی زندگی کا آخری دور ہمارے اس افسانے میں ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکتا



پرتھوی راج

کیوں کہ آخر میں وہ التونیہ سے شادی کر لیتی ہے اس لیے اس کہانی کو ہم یا نو میں ختم کر دیں گے جہاں التونیہ دوبارہ اسٹیج پر آتا ہے اور یا تھوڑا سا تصرف سے کام لیتے ہوئے ہمیں یہ دکھانا پڑے گا کہ جب التونیہ کے ساتھ شادی کی قربان گاہ پر اسا سر قربان رکھی رکھی تھی، تب بھی وہ پہلے کی طرح باغی اور بیدار عورت تھی البتہ کسی مصلحت کے تحت تو اس نے السا کیا یہاں پہنچ کر ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سوانح اور تاریخی باتوں میں آئے واقعات صرف افسانوی صلاحیتیں لیے ہوتے ہیں بنے بنائے افسانے نہیں ہوتے جس طرح عام ادب میں ہمیں زندگی میں ہونے والے واقعات میں رنگ بھرنا یا تصرف کرنا پڑتا ہے، اسی طرح سوانحی اور تاریخی کہانیوں میں بھی لیکن واقعات کو جھٹلائے بغیر مثلاً اوپر کے قصے میں وہ واقعہ بھی لا سکتے ہیں جو صرف ایک ملکہ اور حبشی کے درمیان ہوا۔ ملکہ ہمیشہ حبشی غلام کے کالے رنگ کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ ایک دن غلام نے کہا۔ ملکہ! میرے اس کالے رنگ کا ایک چھینٹا تمہارے چہرے پر پڑ جائے تو تمہارے حسن کو چار چاند لگ جائیں لیکن اگر تمہارے رنگ کا ایک چھینٹا بھی مجھ پر آ پڑے تو لوگ مجھے کہیں گے، کوڑھی ہے!..... اور اسی چھوٹے سے واقعے سے ملکہ اور غلام کے رومان کے

ابتدا ہو سکتی ہے کیونکہ وہ زمانہ تھا جب حاضر جوابی اور برجستگی کی بہت قدر ہوا کرتی تھی۔

یہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر ہمارے لیے وہ نقطۂ نگاہ، وہ پراپیگنڈہ مقدم ہے، جسے ہم عوام کے سامنے رکھنے جا رہے ہیں۔ ایک انسان یا بہت سے انسانوں کی سوانح جسے تاریخ کہیے، نتیجہ ہے ٹکر کھاتے ہوئے نظریات کا اور جتنی زیادہ سے زیادہ بار آپ اس ٹکر کو لائیں گے اتنا ہی آپ کے لیے اچھا ہے۔ کیونکہ بغیر نزاع (CONFLICT) کے آپ کا کوئی ڈرامہ نہیں بنتا۔ سوانح اور تاریخی واقعے میں مرکزی اعتبار سے فلم کی صورت میں جو آپ دکھانا چاہتے ہیں وہ تو طے ہے ہی مگر اس کے بعد جزئیات میں کرداروں کے مختلف نظریوں کا حامل دکھانا پڑے گا گویا یہ بات طے ہے کہ جہاں ملک اور قوم کی ترقی میں اور بہت سی باتیں ضروری ہیں۔ وہاں سوانح اور تاریخ کا گہرا مطالعہ لازمی ہے مجھے یاد ہے بچپن میں میں نے جب ہرتری ہری اور گوتم بدھ کی زندگیاں پڑھیں تو مجھ پر کیا کیفیت طاری ہوئی تھی۔ میرے چھوٹے سے دماغ نے کسی مبہم طریقے سے زندگی کی چند قدروں کی طرف میری توجہ دلائی تھی اور طبیعت میں ایک طرح کا ہیجان پیدا ہو گیا تھا پھر اپنے ملک اور بیرون ملک کی بڑی شخصیتوں کے حالات پڑھے تو میں نے راتوں رات اپنے آپ کو ان کے کردار میں ڈھالنے کی کوشش کی میں نے بڑی حیرانی سے دیکھا کہ سب بڑے لوگوں کی زندگی میں پیار زیادہ تھا اور نفرت کم۔ نفرت تھی بھی تو اسے کسی مقصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا کیونکہ محبت کی طرح نفرت بھی ایک اساسی جذبہ ہے جس کے وجود سے ہم انکار نہیں کر سکتے آخر کیا بات تھی جس نے ٹالسٹائی کو YASNAJA POLYANA کی اسٹیٹ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا اور آن واحد میں کاؤنٹ ٹالسٹائی بچوں کے استاد اور ہل چلانے والے کسان بن گئے؟ کون سی بات تھی جس نے مغربی رنگ میں رنگے ہوئے بیرسٹر گاندھی کو لنگوٹی پہنا دی؟ حقیقت وہی نہیں جسے

ہم اپنے تجربے سے حاصل کرتے ہیں۔ حقیقت وہ بھی ہے جو ہم دوسروں کے تجربے میں دیکھتے ہیں۔ آج ہم گیہوں کھانے کے لیے خود گیہوں نہیں اگاتے۔ اگر گیہوں اگلنے اور کپڑا بننے لگیں گے تو نہ کتاب لکھ سکیں گے نہ فلم بنا پائیں گے۔ آج کل کے بچے اور وہ لوگ جو صرف عمر کے لحاظ سے اکتا چکے ہیں مگر جذباتی طور پر بچے ہیں ان کے دماغ پر جس طریقے سے فلم کا میڈیم اثر انداز ہوتا ہے ہم فلم بنانے والوں پر ایک بڑی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ چونکہ سوانح اور تاریخ معروف شخصیتوں کی حامل ہوتی ہیں [illegible] ڈالنے والی [illegible] خود

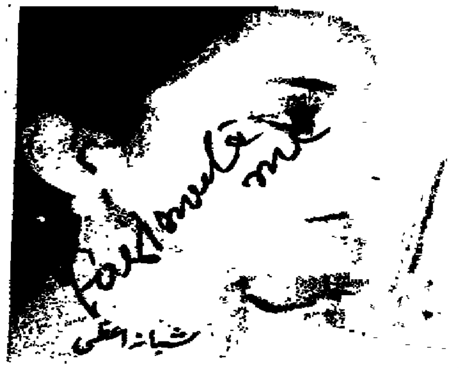
پلیٹوں کو لے سکتے ہیں اور ان پر تعلیم و تربیت کے نقش چھوڑ سکتے ہیں۔

سوانحی اور تاریخی فلموں کے سلسلے میں ہماری فلم انڈسٹری نے بحیثیت مجموعی لوگوں کو اچھی چیزیں دی ہیں اور دیکھنے والوں کے دلوں پر ان تصویروں نے گہرا اور واضح اثر چھوڑا ہے۔ پربھات فلم کمپنی کی تصویریں "رام شاستری" "سنت گیانیشور" "تکارام" آج بھی شاہکار گنی جاتی ہیں۔ منروا موویٹون کی "سکندر اعظم" "پکار" "پرتھوی ولبھ" "جھانسی کی رانی" اور "مرزا غالب" ایسی تصویریں ہیں جو مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ نیو تھیٹرز نے "راج رانی میرا" یونٹی پکچرز نے "چیتنیہ مہاپربھو" پرکاش نے "رام راجیہ" اور "بیجو باورا" رنجیت نے "تان سین" ایسی فلمیں پیش کرکے ہمارا سر فخر سے اونچا کیا ہے۔ یہ تصویریں نہ صرف ہر دلعزیز اور مقبول عام ثابت ہوئی ہیں بلکہ انھوں نے لوگوں کے ذہن میں تہلکہ مچا دیا ہے جہاں ان فلموں میں پیشکش کا انداز بے حد خوبصورت اور پیارا تھا وہاں کچھ ایسی بھی تھیں جن میں محبت کا عنصر اتنا ابھر گیا کہ اس نے سوانحی یا تاریخی شخصیت کی جامعیت کم کر دی یا تاریخ کے کسی دور کو ناپختہ رنگ کا دور ثابت کر دیا۔ میں خود کسی حیثیت میں فلموں میں کام کرنے کی وجہ سے پروڈیوسروں کی مشکلات، سنسر کا نقطۂ نظر، عوام کی مقبولیت کا قائل ہوں لیکن اس پر بھی عرض کروں گا کہ جہاں تصویر کی عوام کے نزدیک مقبولیت فلم بنانے والوں کی زندگی کے لیے ضروری ہے وہاں ملک اور قوم کے تئیں بھی ان کا قرض نکلتا ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ

سوانحی اور تاریخی فلمیں بنانے والا جہاں مضمون کے ساتھ انصاف کرے، اپنے ساتھ انصاف کرے، وہاں ملک اور قوم کا بھی خیال اپنے دل میں رکھے۔

آج ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے۔ ہماری قوم بن رہی ہے۔ پنج سالہ منصوبہ ہمارے سامنے ہے یہ سب

ہمارے رہنماؤں کی بدولت ہے کہ انھوں نے ہمارے ملک کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک



شبانہ اعظمی



نوشاد علی

ایک اکائی کی حیثیت سے ہم بھی قوم اور ملک کی ترقی اور بہبودی کی جد و جہد میں شعوری طور پر شرکت کر رہے ہیں! میں نہیں چاہتا کہ آج سے سو سال بعد جب آج کے ہندستان کی تاریخ لکھی جائے تو کوئی کہے "ملک کے دانشوروں نے اپنے رہنماؤں سے غداری کی"!

فلم انڈسٹری کے دانشوروں کے ہاتھ میں اتنا بڑا آلہ ہے جس سے وہ ملک کی تعلیم و تربیت میں حصہ لے سکتے ہیں۔ سوانحی اور تاریخی فلمیں چونکہ بنیادی طور پر زیادہ پرشکوہ زیادہ مؤثر ہوتی ہیں، اس لیے ان کی طرف ہمیں زیادہ توجہ کرنی چاہیے۔ ہمارے ملک میں بے شمار عظیم المرتبت آدمی پیدا ہوئے ہیں جن کے سامنے دنیا سر تسلیم خم کرتی ہے ان کی زندگیاں فلم کے پردے پر لاکر ہمیں اپنے لوگوں کے وقار کا سر اونچا کرنا ہے۔ ہماری تاریخ اتنی قدیم اتنی حسین اور اتنی رنگین ہے کہ کہیں سے بھی اس کے دو ورق اٹھا لیجیے آپ کو انہیں سے فلمی کہانی کا مواد مل سکتا ہے۔ ایک نقطۂ نظر اختیار کرکے اسے ہم لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ وہ فلم چاہے تصوریت کی چھاپ لیے ہوئے اور چاہے مادیت کی ہمیں روحانی مسرت دے سکتی ہے اور پھر اس دنیا کے ٹکراتے ہوئے نظریات کے مابین بھی ایک جگہ ہے جسے ہم "جیو اور جینے دو" کے ہلکے اور فاختی رنگ سے بھر رہے ہیں۔ اس تاریخی فلم کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے میں اپنے فلمی دوستوں سے یہی کہوں گا

کعبہ و دیر کے مابین جگہ خالی ہے

کہنا ہے دیوانہ ہے کہاں نہیں جانا ہے



شانتارام

سیٹھ کرشن داس ایس سری نواسن

# اپنا اُتسو




وہ پانچ نومبر ۱۹۸۶ء کی شام تھی جب دہلی میں شاہجہاں کے تعمیر کردہ وسیع و عریض لال قلعے کے مختلف مقامات پر ممتاز نوعیت کے نشان و شکوہ کی جگہ اس تاریخی اہتمامات نے لے لی جن میں قوس و قزح کے مختلف رنگوں کی طرح خوش مزاجی، شادمانی اور بے ساختگی کے ساتھ ملک بھر کے تقریباً ...۶ فنکاروں اور کاریگروں نے رقص و سرود، ڈرامہ اور تخلیقی جوہر کی بدولت اپنی موجودگی کا اظہار کیا۔ ۸ر نومبر ۱۹۸۶ء کو ایک ایسے فن کے اور ان دیکھے اٹھارہ روزہ میلے کا آغاز ہوا جس کا افتتاح شری راجیو گاندھی نے کیا اور اسے قومی نوعیت کے پہلے ثقافتی میلے کا روپ دیا۔ اس جشن کا نام "اپنا اُتسو" رکھا گیا اور یہ ایک ایسی کوشش کے مترادف تھا جس کے تحت ہندوستان کی اس ثقافت کے ذاتی مزاج اور مشترکہ تجربات کا امتزاج مقصود تھا، جو ہزاروں سال سے اب تک جاری و ساری چلی آرہی ہے۔

یہ خیال خوب رہا۔ اس سے شری راجیو گاندھی اور ثقافتی امور کے سلسلے میں ان کے صلاح کاروں کو خراج تحسین ملتا ہے کہ حکومت نے ثقافت کے لیے مناسب احترام اور وسائل روا رکھے۔ یہ خیال ان ہندوستانی میلوں کے فیضان سے وجود میں آیا تھا کہ جو بیرونی ممالک میں منعقد کیے گئے تھے کہ ہندوستانیت کے اس جدید نظریے کا اظہار ہوا جو تنگ نظری اور ذات پات، مذہب، جتھے، زبان اور نسل کی دو کاوٹوں کو پھاند گیا جن سے ہمارے دلوں میں انتشار اور روح میں ترشی پیدا ہو گئی تھی۔

لیکن ثقافت کی اس نئی پالیسی کی کامیابی اس خیال کو ایک تحریک میں بدل دینے پر موقوف ہے۔ مستقبل کے اس طویل المدتی سلسلے کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا ادو سلیہ شانتی نکیتن، الہ آباد، پٹیالہ، تھنجاور، دیپاپور اور ناگپور میں

سات ثقافتی مرکز قائم کیے گئے تھے۔ ان مراکز کی بدولت ایک میلہ کی شکل وجود میں لانے کی ترغیب دی جاتی تھی جو دعوت ان مراکز کے اپنے ہی فنکاروں کے مابین ہوگا بلکہ مختلف خطوں کے مابین بھی ہوگا تاکہ ثقافت کو اس کے وسیع تر پس منظر میں گہرائی سے سمجھا جائے جس سے ہماری معاشرتی زندگی میں یک رنگی کی دریافت ہو سکے گی۔ دہلی میں "اپنا اتسو" سات علاقائی مراکز کے عملی اشتراک کی بدولت ترتیب دیا گیا تھا۔ ہر ایک مرکز نے "جیون چکر" جیسی اوشیتک کھیتی باڑی کے موسم" وغیرہ جیسے سات موضوعات کی تفریح پیش کی جن کے گرد ہی میلے کے پروگرام تشکیل دیے گئے تھے اور ان سے ہمارے بسا رنگ سماج میں موجود یک جہتی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔

تقریبات کو زیادہ سے زیادہ عوام کی دسترس میں لانے کے لیے دہلی کے گنجان آبادی والے تمام علاقوں میں سات بڑے "میدان" ترتیب دیے گئے تھے۔ علاقائی مراکز میں سے ہر ایک مرکز نے ان میدانوں میں مظاہرات کیے جو دہلی والوں کو دستیاب ہوئے۔ ان کے دلوں کو چھو گئے، ان کے ساتھ عمل میں لائے گئے اور ان کے ردعمل کا استقبال پیش کرتے تھے۔ ان میں دیہی اور شہری، قدیم و جدید، کلاسیکی اور عوامی فنون کا امتزاج پیدا کیا گیا اور ان سے آج کے ہندوستان کا رنگا رنگ جیتا جاگتا منظر ابھر کر آ گیا۔

میلے کے ذیلی مقامات میں شامل تھے "خاص باغ" جیسے کاوِیہ (شاعری کا)، باغ ترتیبہ (ڈرامے کا)، باغ اور سنگیت (موسیقی کا) باغ جن میں نامور اساتذۂ فن ورکشاپ تبادلۂ خیال اور مظاہرات عمل میں لاتے تھے اور ان کی بدولت عوام کے ساتھ تخلیقی مکالمے اور ایک دوسرے کے شخصیاتی تاثر تشکیل دیتے تھے۔

"گرہن" جیسا پروگرام بڑے سوچ و بچار کے ساتھ ترتیب دیا گیا تھا جس کے انعقاد کے لیے عمارت آثار قدیمہ کا اشتراک و تعاون کار فرما تھا۔ تاریخی عمارت کے پس منظر میں چند روایتی نوعیت کے مظاہرات اور تخلیقی فنون میں تسلسل کا احساس دلایا جاتا تھا۔ دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس پروگرام میں شامل تھے: خواجہ بختیار کاکی کی درگاہ پر قوالیاں، [illegible] جہاں عیسائی تعلیمات کی [illegible] [illegible] [illegible] سنگیت، حوض خاص میں ایم ایف حسین کا [illegible] ساتھ مصوری کا کام، جنتر منتر میں [illegible] کا [illegible] تاج اور عبدالرحیم خانخاناں کے مقبرے پر [illegible] کا [illegible] حسین کے ہمراہ رحیم کی شاعری کو علامت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

جاری رہی اور جس میں ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی کے مشہور سربراہ جیسے پنڈت بھیم سین جوشی، بسم اللہ خاں، اشتیاق حسین اور دیگر حضرات نے سامعین کو محظوظ کیا۔

"اپنا اتسو" کے مظاہرات میں خصوصی پروگراموں جیسے "چھو منتر" نے خاصا اضافہ کیا جس میں روایتی جادوگروں نے اپنی بہت سی شعبدہ بازیوں کا مظاہرہ



کیا۔ "بھارت کی سیڑھیاں" پروگرام میں علاقائی دستکاری اور مستعمل متفرقات کا ڈرامائی اظہار تھا جب کہ "تلوار بازی" اور کشتی کے اکھاڑوں نے بہت سے لوگوں کو محظوظ کیا۔

"اپنا اتسو" کے اہتمام کا ایک خوش آئند پہلو یہ بھی تھا کہ بال بھون سوسائٹی اور "اسپک میکے" جیسے اداروں نے اس میں شرکت کی۔ اول الذکر نے ۱۸ نومبر کو "سرت واہنی" کا آغاز کیا جو ماحولیات کے لیے ایک حفاظتی سعی تھی۔

پھر ہزار فنکاروں کی رہائش کا اہتمام "کلا نگری" میں کیا گیا جو کہ سات رنگوں کے خیموں کا ایک گاؤں تھا جس میں طبی، خرید و فروخت، کھانے پینے اور تفریح طبع کی سہولیات فراہم تھیں اور ان میں باہمی میل جول، تبادلے اور اتحاد پر زور تھا۔

لیکن "اپنا اتسو" کے یہ سب کچھ اطمینان بخش نہیں تھا اس کے تصور کو ہی ان حضرات نے نکتہ چینی کا نشانہ بنایا جو ثقافت پر سرکاری قبضے، اس کی تشہیر کاری اور حکمرانی نوعیت کے خلاف تھے۔ "ثقافت کوئی حیثیت نہیں کہ جس کی منصوبہ بندی کی جائے"، انھوں نے کہا اور یہ بھی کہا کہ "کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں جسے حکومت مہیا کر سکے"۔ ان کا [illegible] واضح ہے کہ ثقافت ایک ایسی چیز ہے جسے [illegible] سمجھا

جاتا ہے اور یہ خود ہی اپنا "جلوہ" اظہار ہے۔ ثقافت عوام کی بے ساختگی کا ایک روپ ہے۔

ان نکتہ چینیوں اور خدشات میں سے بہت سے درست ثابت ہوتے ہوئے دکھائی دیے جب تقریب افتتاح پر ہی بحران سا پیدا ہو گیا اور وزیر اعظم شری راجیو گاندھی بھی فنکاروں کی محض پیٹھ ہی دیکھ پا رہے تھے۔ بعد کے دنوں کے دوران مظاہرات کے مقام، اوقات اور پروگرام تک بھی بار بار بدلے کیے جا رہے تھے۔ تعداد کے اعتبار سے بھی لوگوں کا جوش و خروش گھٹا ہوا سا تھا جو کہ شہری مراکز میں کم اور دیہی نیز نیم دیہی مراکز میں کافی تھا۔ کچھ پروگراموں میں جیسے "حوض دروازے پر احتجاجی شاعری" کے دوران فنکار حضرات سامعین سے بھی تعداد میں زیادہ تھے۔

ثقافت کی یہ لمبی چوڑی جو کہ ۱۶۷۵ افسران کی گنتیوں پر مشتمل تھی محض دہلی کا اپنا ہی ثقافتی میلہ بن کر رہ گئی۔ دہلی دوردرشن نے "اپنا اتسو" میں بہت کم وقت اور دلچسپی صرف کی جس کے لیے اسے زیادہ سوچ سمجھ سے کام لینا چاہیے تھا۔

راج گھاٹ کے قریب اندرا اسٹیڈیم میں منعقدہ افتتاحی تقریب کے موقع پر "اتسو" میں شریک ہونے والے ۶۰۰۰ فنکار اسٹیڈیم کے مختلف دروازوں سے داخل ہو رہے تھے۔ یہ لوگ اپنے رنگین لباسوں میں گاتے، ناچتے ہوئے ایک دائرے میں آگے بڑھ رہے تھے جس سے اسا [illegible] منظر کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ محسوس کرنا [illegible] [illegible] "اتسو" کا اہتمام بہتر ہونا چاہیے تھا۔

(قومی ثقافتی میلے "اپنا اتسو" کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر راجیو سیٹھی کا یہ انٹرویو ایس۔ سری نواسن نے میلے کے دوران لیا تھا)

سری نواسن: یہ قومی ثقافتی میلہ کس کے ذہن کی پیداوار ہے؟

راجیو سیٹھی: اس ملک میں یہ سوال تو کرنا ہی نہیں چاہئے۔ یہ طے ہے کہ وزیر اعظم ہمارے ثقافتی رویے کے سلسلے میں خاصی تبدیلی کے خواہاں رہے ہیں۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ اس ضمن میں ہماری پالیسی میں کچھ کوتاہیاں رہی ہیں۔ لیکن اب ہمارے سارے پروگراموں میں ثقافت کو اہمیت دی جا رہی ہے۔

س: اس میلے پر خرچ کی جانے والی رقم کے سلسلے میں خاصی نکتہ چینی ہوئی ہے۔ اس بارے میں کیا رائے ہے آپ کی۔

ر: اخراجات کے سلسلے میں اعتراض کرنا فضول ہے۔ ثقافت [illegible] و نغمہ کا نام تو نہیں یہ تو ہمارے سانسوں میں بسی ہوئی ہے۔ اگر فضا آلودہ ہو تو کیا آپ سانس لینا بند کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ تو ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ ہمیں فضا کو پاک و صاف بنانا ہے۔ ذرا اس رقم پر غور کیجیے جو ہم اس میلے پر خرچ کر رہے ہیں اور آج کے حالات پر دھیان دیجئے کہ آج ملک کے سماجی ڈھانچے کو تار تار کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اچھا ذرا یہ غور کیجیے کہ پولس اور حفاظتی امور پر کتنی رقم خرچ کی جا رہی ہے۔ اور پھر ثقافت تو ہماری بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے۔ بمبئی اور مدراس میں بننے والی کئی کئی بڑے ستاروں والی فلموں پر لوگ اعتراض کیوں نہیں کرتے۔ پھر جب پوری قوم کو اپنے فن، اپنی ذہانت اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور دوسری جانب ہم اپنی محنت کی کمائی کو ڈسکو جیسی چیزوں پر خرچ کر ڈالتے ہیں، آخر زیادہ اہم کیا ہے ہماری نظر میں؟

س: میلے کے افتتاح میں تاخیر کے اسباب کیا تھے، اس سلسلے میں خاصی پیچیدگی تھی کوئی؟

ر: نہیں کوئی تاخیر نہیں ہوئی۔ وزیر اعظم ٹھیک چھ بجے شام کو آگئے تھے۔ شو بھا یاترا چھ بجکر بیس منٹ پر شروع ہو گئی تھی۔ ثقافت کا اپنا جوش و خروش ہوتا ہے۔

س: ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ آپ لوگوں کے ساتھ رابطہ کس طرح رکھتے ہیں۔ کون کون کیا کیا کر رہا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ باہم ربط کے سلسلے میں کچھ مسائل درپیش ہیں اور منصوبہ بندی کی کمی ہے۔

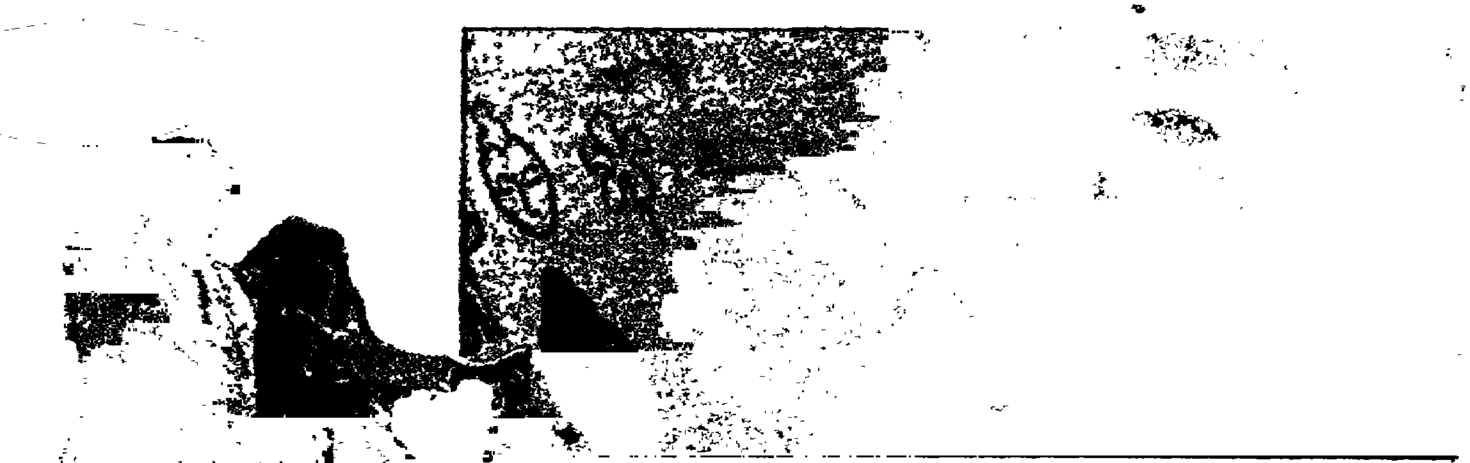
ر: دراصل ثقافتی منصوبہ بندی اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ آپ کو علم ہے کہ ہندوستانی میلے کا منصوبہ کئی سال میں تیار ہوا تھا۔ اور اس اپنا اتسو کی تیاریاں آناً فاناً کی گئی ہیں۔ مجموعی طور پر چھ ہزار فنکار آئے۔ کیا کسی ایسی ثقافتی تقریب کی کوئی دوسری مثال ہے اس شہر میں یا ملک بھر میں، اور جس میں کوئی ایسا ویسا واقعہ پیش نہ آیا ہو۔

س: یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے! کیا یہ درست ہے کہ افسر شاہی نے آپ کے ساتھ تعاون نہیں کیا؟

ر: نہیں، ایسا کچھ نہیں۔



..... اور ان سب مسائل کا ایک ہی حل ہے اپنا اتسو.....





س : اچھا۔ میلے کے علاقائی ڈائریکٹروں کی حیثیت سے افسران کا ہی تقرر کیوں کیا گیا ہے؟

ر :۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ میں صرف فنکار ہوں، یا میں صرف افسر ہوں۔ میں ایک فرد کی حیثیت سے اپنی شخصیت کی نشوونما کر سکتا ہوں اس کو جلا دے سکتا ہوں۔ میرے خیال میں لوگوں کو ان کی فوری ذمہ داریوں کی بنیاد پر محدود کر دینا صحیح نہیں۔

ایسے بھی بہت سے لوگ ہونگے جو میلے کی خوبیوں کے معترف ہوں گے، لوگ صرف چیئرمین کی بات کرتے ہیں، ممکن ہے کہ چیئرمین کو پندرہ قسم کے رقص اور سیکڑوں دوسرے فنون کے بارے میں مکمل جانکاری نہ ہو۔ لیکن اس کے پاس تہذیب کی دولت تو ہے، اور تہذیب ہی ثقافت ہے ثقافت صرف علم کا نام تو نہیں، ورنہ ہر عالم سب سے بڑا مہذب و متمدن ہوتا۔ جب کہ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔

س :۔ اس اُتسو پر کل کتنی رقم خرچ ہوئی ہے؟

ر :۔ پانچ کروڑ روپے۔

س :۔ اس کا مطلب یہ کہ اس سلسلے میں حزبِ مخالف اور اخبارات کے الزامات درست نہیں

ر :۔ نہیں قطعی نہیں۔

س :۔ تشہیر و اشتہار کا کام مناسب طور پر ہوا؟

ر :۔ نہیں، صحیح معنوں میں تو نہیں۔ میڈیا پبلسٹی صرف وہی نہیں جو اخبارات میں نظر آتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ عوام کے تاثرات کیا ہیں؟ آج آپ کو دلی میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو اپنا اتسو کے بارے میں نہ جانتا ہو۔

س :۔ دوسرے دن افتتاح کے بعد میں کچھ مقامات پر گیا، اور فنکاروں سے ملا۔ ان میں سے کچھ کو صبح نو بجے طلب کیا گیا تھا۔ اور شام تک انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا، آگے کے لیے انہیں ہدایات بھی نہیں دی گئی تھیں۔



ر ۔ یہ فنکار کون تھے ؟

س ۔ کیا یہ فنکار بہار کے تھے ، راجستھان کے تھے اور مدھیہ پردیش کے تھے ؟

ر ۔ مجھے اس بارے میں علم نہیں ۔ یہ بات میرے علم میں لائی بھی نہیں گئی ۔ بہر حال میں پتہ لگاؤں گا ۔

س ۔ کچھ فنکار پورے شو کا ہی بائیکاٹ کرنا چاہتے تھے ، تبھی ان کے گروپ میں سے کسی بھلے آدمی نے کہا کہ نہیں یہ قومی معاملہ ہے ، اور اس طرح کی کوئی حرکت نہیں ہونی چاہئے ۔ کچھ بھی ہو ہمیں اسٹیج پر تو جانا ہی ہے ۔



ر ۔ بہت خوب ، دیکھئے نا ایک ہزار میں سے ممکن ہے کہ دس یا بیس آدمی غلطی سے بلائے گئے ہوں ، پتہ نہیں ، پانچ ہزار افراد میں سے ، کچھ ضرور ہوں گے جن کو تلخ تجربہ ہوا ہوگا ۔ اگلے سال سے سب کچھ بہتر طور پر ہوگا ۔ میں ان تمام چیزوں کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہوں اور مجھے ان باتوں کا افسوس ہے ۔

س ۔ اس میلے کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ ہے کہ فنکار ایک دوسرے کے ساتھ گھلیں ملیں ، ایک دوسرے سے اثرات قبول کریں ، پھر لوگوں کو علاقائی بنیادوں پر گروپوں میں کیوں تقسیم کیا گیا تھا ؟

ر ۔ کیا آپ سب لوگوں کے کھانے کے سلسلے میں کوئی منطقی جواز تلاش کر سکتے ہیں اگر سب علاقوں کا کھانا ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے تو پھر آپ تین ہفتے تک انہیں ایک ساتھ رکھ کر کسی ایک قسم کا کھانا کھانے پر مجبور نہیں کر سکتے ۔ اس میں تو فرق رکھنا ہی پڑے گا ۔

س ۔ اچھا آپ ہندوستانی میلے اور دہلی کے اس اتسو کا موازنہ کس طرح کریں گے ؟

ر ۔ یہ موازنہ کبھی نہیں ہو سکتا اور نہ میں کروں گا ۔ ہاں ، آپ یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ کامیاب ہوا یا نہیں ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں کامیابی یا ناکامی کے بارے میں فکر مند نہیں ہوں ، یا میں توقعات وابستہ نہیں کرتا ہوں ——— مگر میں موازنہ نہیں کروں گا ۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے ۔ ان کے مقاصد قطعاً علاحدہ تھے ، مطمح نظر الگ تھا ، ان کی تنظیم الگ الگ ڈھنگ سے ہوئی تھی ، حصہ لینے والے لوگ الگ الگ تھے ۔ اس لئے موازنہ کرنے کی کوئی تک ہی نہیں ہے ۔



ر ۔ آپ کے خیال میں کتنے لوگوں نے یہ اتسو دیکھا ہے ؟

ر ۔ پولس والوں کے پاس کچھ تخمینہ ہے ۔ تقریباً پچاس ہزار روزانہ ۔

س ۔ یہ اتسو کتنا کامیاب ہے اور اس سے حاصل کیا ہوا ؟

ر ۔ اس پر تو گفتگو ہو سکتی ہے ۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میلہ کامیاب رہا ہے ، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ آج ہر شخص اس کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتا ، اس کا ذکر کرتا نظر آتا ہے یہ بہت اہم ہے اور یقیناً ثقافت یا تہذیب کوئی نظر انداز کردہ لاموضوع نہیں ۔

گوروبچن چندن

# بین الاقوامی تجارتی میلہ ۱۹۸۶ء

نومبر ۱۹۸۶ء کے شروع میں دنیا کے چھ ممتاز ملکوں نے نئی دہلی کے پرگتی میدان کی ایک خصوصی تقریب میں ہندوستان کے باوقار ایوارڈ حاصل کیے۔ یہ ایوارڈ انھیں اپنی مصنوعات اور ایجادات کی بہترین انداز سے نمائش کرنے کے صلے میں ملے تھے۔ یہ نمائش ۱۹۸۶ء کے عالمی تجارتی میلے میں کی گئی، جس کا اہتمام ٹریڈ فیئر اتھارٹی کا ادارہ کرتا ہے۔ یہ ادارہ حکومت ہند کی وزارت تجارت کا ایک خود مختار ادارہ ہے، جس کا قیام مارچ ۱۹۷۷ء میں ہوا تھا۔

اس ادارے نے ایسی نمائشوں کا اہتمام ۱۹۷۷ء میں شروع کیا۔ اس زمانے میں یہ میلہ دو سال میں ایک بار ہوتا تھا لیکن اس کی مقبولیت اور اہمیت کے پیش نظر ۱۹۸۰ء سے سالانہ کر دیا گیا۔

اس سلسلے کو ابھی تین سال ہی ہوئے کہ بین الاقوامی میلوں کی واحد عالمی یونین "یو۔ ایف۔ آئی" نے جس کا صدر دفتر فرانس کی راجدھانی پیرس میں ہے، نومبر ۱۹۸۵ء میں اسے اپنا رکن بنا لیا۔ یہ رکنیت اپنی نوعیت کا ایک اعلیٰ ترین امتیاز ہے۔ چنانچہ اس میلے کو پوری دنیا میں ایک خصوصی مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔

اس سال جن ملکوں نے اپنے ساز و سامان کی بہترین نمائش کے ایوارڈ حاصل کیے ان میں "غیر ملکی سرکاری سطح کی شرکت" کے زمرے میں سوویت روس سرفہرست تھا۔ اسے گولڈ میڈل دیا گیا۔ دوسرے نمبر پر اٹلی تھا جسے سلور میڈل دیا گیا۔ ان کے علاوہ بلغاریہ، عوامی جمہوریہ چین، سنگاپور کو ان کی باوصف شرکت کی نمائش میں توصیفی اسناد پیش کی گئیں۔

اسی طرح بین الاقوامی نجی سیکٹر میں مغربی جرمنی کے ایک صنعت کار ڈاکٹر کے۔ جی۔ فرتیب اور انگلستان کے ایک صنعت کار مسٹر جی۔ این۔ سی۔ مہر کو سلور میڈل دیا گیا۔

یہ ایوارڈ صرف غیر ملکی سطح ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ قومی سیکٹر میں مرکزی وزارتوں، ریاستی حکومتوں، پبلک سیکٹر کے اداروں اور نجی کمپنیوں نیز صنعت کاروں کو ان کی بہترین پیش کش کے صلے میں دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ مختلف زمروں کے منتخب اداروں یا افراد کو کل سات گولڈ، پانچ سلور میڈل اور دس توصیفی سرٹیفکیٹ دیے گئے۔

ان انعامات کی تقسیم شکنتلم تھیٹر کے شاندار آڈیٹوریم میں اتھارٹی کے چیئرمین جناب محمد یونس نے کی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کا ۱۹۸۶ء کا عالمی تجارتی میلہ ختم ہو گیا۔

یہ میلہ جو ہر سال ۱۴ نومبر کو شروع ہوتا ہے اور دو ہفتے تک جاری رہتا ہے، صرف تماشائی منظر یا رنگا رنگ آمد و رفت کا ہنگامہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اقتصادی، صنعتی، سائنسی، تکنیکی اور معلوماتی مقاصد سے بھرا ہوا خیال انگیز اور امکان افروز پروگرام ہوتا ہے۔

اس بار میلے کا افتتاح وزیر اعظم راجیو گاندھی نے کیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ اس میلے کی بدولت ہندوستان پوری دنیا کے رو برو آ جاتا ہے۔ اسے اب ہندوستان کے معاشی اور دہلی کے تہذیبی کیلنڈر میں ایک کلیدی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

اس میلے میں ہندوستان کی صنعتی اور تکنیکی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی مصنوعات، خدمات اور ٹکنالوجی کی برآمدی صلاحیت کی جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ میلہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے اقتصادی اور سائنسی شعبوں میں ہونے والی گوناگوں ترقیات کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔

اس بار اس میں ۳۲ ممالک اور ان کی تقریباً ۵۰ کمپنیوں نے شرکت کی۔ ان ممالک میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں شامل تھے۔ ان کے علاوہ کئی اور ممالک کی، جن کی حکومتیں شرکت نہ کر سکیں، نجی کمپنیوں نے شرکت کی۔ دنیا کے تقریباً دو درجن ملکوں سے تجارتی وفد آئے اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے مختلف شعبوں میں ہندوستان کی ترقی دیکھی۔

خود ہندوستان کی شرکت تو نہایت جامع تھی۔ مرکزی وزارتیں، ریاستی حکومتیں، پبلک سیکٹر کے ادارے نجی سیکٹر کے ادارے سب بڑی شان و شوکت اور جمال و کمال سے اس میں شریک ہوئے۔ دراصل میلے کا یہ قومی سیکٹر ہندوستان کی بڑھتی ہوئی صنعتی صلاحیتوں کا ایک ایسا منظر پیش کرتا ہے جس سے آپ ملک کے معیارِ ترقی کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں۔

اس میلے کا بنیادی مقصد ہی ان شعبوں میں ہندوستان کی صلاحیت کو نمایاں کرنا ہوتا ہے جو اس کی فلاح و ترقی سے وابستہ ہیں۔ ان شعبوں میں چھوٹی اور بڑی صنعتیں، زراعت، دیہی ٹکنالوجی، سائنس، توانائی، مواصلات، سیاحت، پارچہ جات، آبی وسائل، ریلوے وغیرہ شامل ہیں۔ چنانچہ ان سب کی میلے میں جامع عکاسی کی گئی۔

لیکن اس سال پہلی بار دو تجارتی ایسی اشیا پر خصوصی توجہ دی گئی جن کی برآمدات کے بارے میں ساتویں پنج سالہ منصوبے میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں الیکٹرانک سامان اور جواہرات و زیورات شامل ہیں۔

یہی اس میلے کے دو خاص موضوع تھے۔

الیکٹرانکس کے باب میں اس صنعت کے تعلق سے ہندوستان کی صلاحیتوں کی عکاسی کی گئی۔ اس میں الیکٹرانک مصنوعات اور برآمدات دونوں کے مختلف پہلو دکھائے گئے۔ ہندوستان کی کئی ریاستوں اور دنیا کے کئی ممالک نے اپنے اسٹالوں میں الیکٹرانک ساز و سامان کو نمایاں کیا۔ اس موضوع پر چھ سیمینار کیے گئے جن میں ملکی اور غیر ملکی ماہرین اور صنعت کاروں نے شرکت کی۔

ان سیمیناروں میں الیکٹرانکس میں حصولِ معیار، ان کے پرزوں اور سامان کی تجارت، ان کی برآمدات کے لیے صلاحیت، دفاتر میں ان کے رواج کے امکانات اور صنعتی خود کاری کے لیے ہندسوں کے نظام کی تنظیم کے موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔

جواہرات و زیورات اور جواہرات سے متعلق دوسرا

خصوصی موضوع [illegible] حاصل تھا۔ زیور سازی ہندوستان [illegible] نہایت قدیم صنعت ہے اور اس باب میں ہندوستان کی صناعی کی دور دور تک شہرت بھی ہے لیکن آج تک قومی سطح پر اس کی ترقی اور جدید کاری اور اس کی برآمداتی صلاحیت کے لیے کوئی خاص اقدام نہیں کیے گئے تھے۔

آزادی کے بعد اب پہلی بار اس صنعت کو یہ اہمیت دی گئی۔ میلے میں ہندوستان کے جڑاؤ زیورات کے شاہکار اور جواہرات دکھائے گئے ہندوستان کے مختلف حصوں سے سرکردہ صنعت کاروں نے شرکت کی اور استاد کاریگروں نے اپنے روایتی فن کی تکنیک کا مظاہرہ کیا۔ ان کاریگروں میں بہت سارے ایسے لوگ بھی تھے، جنہوں نے اپنے کمالات کے لیے قومی ایوارڈ حاصل کیے ہیں۔ چنانچہ اس شعبے میں گجرات کا کندن کا کام، راجستھان کی مینا کاری، اڑیسہ کی زر دوزی اور تامل ناڈو کے دیوی دیوتاؤں کو سجانے والے زیورات کے شاہکار دکھائے گئے

غیر ممالک کے زیور سازی کے مشہور صناعوں کو میلے میں مدعو کیا گیا تھا تاکہ ہندوستان کے کاریگروں سے تبادلۂ خیال اور تبادلۂ علم کر سکیں ان میں جواہرات اور جڑاؤ زیورات کی مشینری تیار کرنے والوں کی اٹلی کی سرکردہ انجمن ایفی مو اور دیگر کئی غیر ملکی کمپنیوں کے تکنیکی ماہر بھی شامل تھے۔

زیور سازی کے موضوع پر دو سیمینار بھی ہوئے جن میں ہندوستانی اور غیر ملکی ماہرین نے شرکت کی ان سیمیناروں میں جڑاؤ زیورات اور جواہرات کے لیے بدلتے ہوئے رواجوں اور اس صنعت کے لیے نئے اوزار اور طریقۂ کار کے موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا۔

یہ میلہ کئی لحاظ سے بے نظیر تھا اس کا زور اس بات پر تھا کہ ملکی اور اس سے بھی زیادہ غیر ملکی تجارت کے لیے ایک سازگار ماحول پیدا کیا جائے۔ چنانچہ میلے کے پہلے چار دن صرف پیشہ ورانہ اور تجارتی کاروبار کے لیے مخصوص کیے گئے۔ گزشتہ چھ میلوں میں ایسا کبھی نہیں کیا گیا تھا۔ بس صبح دس بجے سے دوپہر ایک بجے تک کا وقت پیشہ ورانہ کاروبار کے لیے مقرر کر دیا جاتا تھا بہر حال وہ انتظام اب بھی کیا گیا۔

تجارتی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے اور بھی کئی اقدامات کیے گئے۔ مثلاً تجارتی معاہدوں کی تکمیل کے لیے میلہ شروع ہونے سے کئی ماہ پہلے غیر ممالک کے ڈاک کا براہ راست اور وسیع نظام قائم کیا گیا۔

نمائش کے لیے جن خاص خاص اشیا۔ اور مصنوعات کا انتخاب کیا گیا اس میں اس امر کا خیال رکھا گیا کہ ہماری اقتصادیات، برآمداتی صلاحیت اور درآمداتی ضرورتوں کی اچھی نمائندگی ہو۔

ان تدبیروں کے نتائج بڑے سود مند ہے اور کثیر تعداد میں ملکی اور غیر ملکی تاجر میلے میں آئے۔

ٹیکنالوجی کے تبادلے کے لیے حال ہی میں



ہمارا ایشیائی اور بحرالکاہل کے ممالک کے سینٹر سے معاہدہ ہوا تھا۔ اس کے تعلق سے ان ممالک کے ساتھ تاجروں اور صنعت کاروں کا ایک وفد میلے میں آیا اور اس کے ارکان نے اپنے اپنے علاقوں کے لیے ہندوستان سے ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے لیے ٹھوس بات چیت بھی کی۔

اس میلے کے ذریعے ملکی اور غیر ملکی تجارت کے وسیع مواقع میسر آئے صدر جناب محمد یونس نے بتایا کہ اس سال کے میلے میں بائیس ارب روپے سے زیادہ کی مالیت کے فوری کاروبار کے امکانات پیدا ہوئے اس رقم میں ہندوستان کی برآمداتی درآمداتی اور اندرون ملک تجارتوں کے تخمینے شامل ہیں۔

چنانچہ ۱۹۸۶ء کے میلے نے اپنے کاروبار کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔ ۱۹۸۰ء میں پانچ ارب روپے کا کاروبار ہوا۔ اور پھر ۱۹۸۴ء میں یہ رقم بارہ ارب تک پہنچ گئی تھی لیکن ۱۹۸۶ء میں اس سے بھی دس ارب روپے زیادہ کا کاروبار ہوا۔

بیرونی ممالک جو اپنا مال بیچنے میں نسبتاً زیادہ کامیاب رہے ان میں اٹلی، روس، امریکہ، عوامی جمہوریہ جرمنی، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، جمہوریہ کوریا اور وفاقی جمہوریہ جرمنی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ہندوستانی شرکا میں سے نسبتاً زیادہ تجارتی پیش رفت کرنے والوں میں اتر پردیش، پنجاب، ہریانہ، مہاراشٹر، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی کارپوریشن، ہیرے جواہرات اور الیکٹرانکس کے شعبے شامل تھے۔

امریکہ اس میلے میں پہلی بار شریک ہوا لیکن یہاں ایک سودیشی ماحول تھا۔ اس کے اکثر اسٹال ہندوستان کے نجی اداروں نے لگائے تھے۔ یہ وہ ادارے تھے جو امریکہ کی تجارتی فرموں کے اشتراک سے کاروبار کر رہے ہیں۔ بہر حال اس پویلین نے جو کاروبار کیا وہ اس میں تقریباً ۱۰ ارب روپے کی مالیت کی ہائی ٹیک مصنوعات شامل ہیں جو امریکہ ہندوستان کے کاروباری اداروں کو مہیا کرے گا۔

اٹلی کے پویلین نے، جو سائز میں سب سے بڑا تھا، گیس ٹربائن، خراد سازی کی معلومات، گہرے سمندروں میں ماہی گیری کے ٹرالر، زیور سازی کی مشینیں اور کوئلے کی کانوں میں کام آنے والا سامان وغیرہ بیچنے کے معاہدے کیے۔

روسی پویلین مشینوں کے بیئرنگ، چھاپے کی مشینیں اور کپڑا بنانے کی مشینیں، بیچنے کے معاہدے کے علاوہ ہندوستان سے ایس بیس تاس، پارچہ جات، عینکوں کے شیشے اور الیکٹرانکس کا سامان منگوانے کے معاہدے کیے۔

آپ پوچھیں گے کہ پاکستان پویلین کی کیفیت کیا تھی؟ کچھ اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ وہاں گاہکوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ چنانچہ راقم وہاں گیا

اور دیکھا گیا واقعی یہی بات تھی لیکن خریداری کے سامان میں بادام، منقہ اور گھریلو ضروریات کی کچھ اشیا تھیں کسی انجن یا مشین یا خوراک کا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ میلے کے خاص موضوع الیکٹرانکس اور جواہرات و زیورات تھے۔ اس کے برعکس پاکستان کے پویلین میں جن چودہ کمپنیوں نے اپنا مال پیش کیا، ان میں سے پانچ کی سلیمانی پتھر کی اشیا، تین خشک میوے، دو دستکاریوں، دو مردانہ ملبوسات، دو زنانہ ملبوسات اور ایک جرمن سلور کا اسٹال تھا۔

ہندوستانی ریاستوں میں سے اتر پردیش نے کئی ترقی پذیر ممالک سے صنعتی اور روزمرہ مصنوعات کے لیے مکمل پراجیکٹ تیار کرنے کے معاہدے کیے ان ممالک میں برونڈی، تنزانیہ، یوگنڈا، زمبیا وغیرہ شامل ہیں۔

ایک نجی ادارے نے علم و آگہی کے لیے کمپیوٹر کے استعمال کے امکانات کو نمایاں کیا۔ اس ادارے نے "اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ برائے کمپیوٹر نواز علم" کے نام سے ایک درس گاہ قایم کی ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کو کویت کے ایک کنسارٹیم ال شیا ٹریڈنگ گروپ کا تعاون حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے اسٹال میں کمپیوٹر کے نظام کے وہ نمونے پیش کیے، جو تعلیمی، کاروباری اور شخصی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ممد ہوں گے اس انسٹی ٹیوٹ میں اس وقت تین سو طلبا کمپیوٹر کے استعمال کی تربیت پا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس ایک کورس میں چار سو طلبا کو تربیت دینے کی صلاحیت ہے اس انسٹی ٹیوٹ کا مستقل دفتر پرگتی میدان میں ہی قایم کر دیا گیا ہے۔

مرکزی وزارتوں کے گوشے میں صحت اور خاندانی بہبود کی وزارت کا طبی مرکز بہت مقبول ہوا یہاں آنے والوں کو فوری طبی معائنے کی سہولت پیش کی جاتی تھی۔ کوئی فیس لیے بغیر ہر خواہش مند کے خون کا دباؤ دیکھا جاتا تھا اور اس کے خون کے گروپ کا نام بتا دیا جاتا تھا اور یہ سارا کام سند یافتہ ڈاکٹر کرتے تھے۔ مزید اس پویلین میں خاندانی منصوبہ بندی اور تندرستی کے لیے سہل اور سود مند مشورے دیے جاتے تھے۔ اس میں بچوں کا الگ گوشہ تھا جس میں ان کی فلاح و ترقی کی تدبیریں بتائی جاتی تھیں۔ اس پویلین کی تعمیر و ترتیب میں انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت نے بھی شمولیت کی تھی۔

میلے میں ۴۳ پرائیویٹ فرموں نے اپنے اسٹال لگائے، جن میں متعدد فرموں نے اپنی الیکٹرانک اشیا کا مظاہرہ کیا تھا۔

لیکن پرائیویٹ سیکٹر کے کچھ متوقع ادارے غیر حاضر تھے۔ ملک کے نہایت بڑے صنعتی اداروں کا کوئی پویلین نہیں تھا۔ یہ غیر حاضری چند سال سے بار بار واقع ہو رہی ہے۔ غالباً ان اداروں کے پاس میلے



میں شرکت کے لیے وقت ہی نہیں یا شاید رغبت ہی نہیں۔

اس امر پر اتھارٹی کے صدر جناب محمد یونس اور ملک کے وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی حیرت اور تشویش کا اظہار کر چکے ہیں لیکن ان اداروں پر بظاہر کوئی اثر نہیں۔

تجارتی معلومات کے لیے میلے میں ایک الگ سینٹر قایم کیا گیا تھا۔ اس میں ہندوستان کی درآمدی اور برآمدی پالیسیوں، کسٹم کے محصولات، زر مبادلہ کے قواعد اور آنے والے تاجروں کے لیے دیگر متعلقہ معلومات فوراً بہم پہونچائی جاتی تھیں۔ اس میں اپنے اپنے شعبوں سے پوری طرح واقف ایجنسیوں کے ماہرین متعین کیے گئے تھے یہاں غیر ملکی خریداروں کے رجسٹریشن کے لیے مناسب سہولتیں مہیا کرنے کا بھی انتظام تھا

یہ میلہ صرف تاجروں کا ہی اکھاڑہ نہیں تھا بلکہ اہل ذوق اور فن کاروں کا سنگم بھی تھا۔ اس کی بدولت نومبر کے پچھلے پندرہ واڑے میں دہلی کی شہری اور ثقافتی زندگی میں ایک پر لطف سرگرمی اور گہما گہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں تو اس مہینے میں دہلی ثقافتی اور فنون لطیفہ کے پروگراموں سے بہت مالا مال ہوتا ہے لیکن اس میلے کی بات ہی اور ہے۔

اس میں ثقافتی اور تفریحی پروگراموں کی بھرمار ہوتی ہے۔ بچوں کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ میلے کا آغاز ہی جگت چاچا سورگیہ جواہر لال نہرو کے جنم دن سے ہوا تھا ——————



کی مصوری کا مقابلہ ہوا، اور ٹاپی موقع پر بہترین تصویریں بنانے والوں کو انعامات دیے گئے۔ ہوم گارڈ کے تمام حصے [illegible] ایکڑ میں پھیلا ہوا تھا ایک ایسا پارک بھی موجود تھا جہاں الیکٹرانک جھولوں اور سواریوں کا انتظام تھا۔ بچوں کے لیے یہ ملک میں اپنی قسم کا واحد انتظام تھا۔ اس میں الیکٹرانک نظام سے چلنے والے بیس اقسام کے گھوڑے، ہاتھی، پرندے، موٹریں اور جنتر والے تھے جن کی سواری صبر آزما اور پُرلطف ہوتی ہے لیکن یہ لطف اٹھانے کے لیے والدین کی جیب وزنی ہونی چاہیے۔

پرگتی میدان میں خود [illegible] کے اپنے دس تھیٹر قائم ہیں۔ وہاں ہر روز رقص، موسیقی یا فلموں کے کئی کئی پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔

شکنتلم تھیٹر میں فلم فیسٹول رکھا گیا جہاں ہرشی کیش مکرجی کی فلمیں دکھائی گئیں۔ فلک نما تھیٹر میں پتلی کے کھیل تھے، جن میں کئی ریاستوں کے پتلی والوں نے اپنے کمالات دکھائے۔ شری لنکا تھیٹر میں ڈانس ڈرامہ اور بیلے ہوتے رہتے ہیں ان میں بھی کئی ریاستوں کے فنکار آئے۔ وہیں کمپلیکس میں تین الگ مرکز تھے آنگن منچ، سارنگا تھیٹر اور کادمبری تھیٹر۔ یہاں مختلف اوقات میں مختلف ریاستوں کے فنکاروں کے دیہی پروگرام ہوتے رہتے ہیں ان میں اتر پردیش کی نوٹنکی اور جموں و کشمیر کا بھانڈ تھیٹر بہت دل چسپ تھا۔

نوجوانوں کے لیے ایک الگ گوشہ تھا۔ اس میں منجملہ دیگر پروگراموں کے قوالیوں کے کئی پروگرام ہوئے جن میں غلام فرید نظامی، رحیم کامل، صابر حسین وارثی، حسین خاں نیازی اور غلام حسین خاں کی ٹولیوں نے شرکت کی۔

غزلوں اور گیتوں کے بھی کئی پروگرام پیش کیے گئے، لیکن شعرا کی محفل یا مشاعرے کا کوئی پروگرام نہیں ہوا۔

ان کے علاوہ ہر ریاست نے ایک مقررہ دن میں اپنا مخصوص ثقافتی پروگرام پیش کیا۔ ہر پروگرام کا ٹائم ٹیبل میلے کے آغاز ہی میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ کئی کئی دن پہلے یہ انتخاب کرسکتے تھے کہ آپ کس دن کیا دیکھ سکتے ہیں۔

کھانا کھانے پینے والوں کے لیے لذیذ اور خوش ذائقہ لوازمات کی بہار تھی۔ میلے کے شمال، جنوب، مشرق، مغرب اور مرکز کے گوشوں میں ۱۲۵ ریستوراں اور کیا کیا بکھرے ہوئے تھے [illegible] تھے ان کے ناموں میں ایک ہوٹل گلستاں تھا [illegible] رات کی رونق، موہنی [illegible] رنگین [illegible]، گلاب دستہ بہار، زعفران [illegible] شروع آگیا، جو ہی اور [illegible] جائیں۔

خود پرگتی میدان ایک جلوہ گاہ ہے۔ ایک سو پچاس ایکڑ میں پھیلے ہوئے اس [illegible] کا انتظام بڑے قرینے سے کیا گیا تھا۔ ہر پویلین تعمیر بندی اور فن کاری کا عمدہ نمونہ تھا۔ صاف ستھری سڑکوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا جن کی مجموعی لمبائی تقریباً سات میل ہے۔ ان کے نام ہندوستان کے دریاؤں پر رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ اس ایک مقام پر آپ کو گنگا، جمنا، نرمدا، گوداوری، کاویری، موسیٰ، سون، راوی، ستلج، بیاس، چناب، برہم پتر اور ۳۲ مزید دریاؤں کے متبرک ناموں سے [illegible] ہو سکتی ہے۔

میدان کے عین وسط میں وسیع و عریض [illegible] جھیل ہے جسے دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو راحت ہوتی ہے۔ مختلف پویلین اور دیگر ہال اس کے چاروں طرف اس خوب صورتی سے ایستادہ ہیں کہ سارا ماحول حسن و جمال کے مناظر کا ایک فردوس معلوم ہوتا ہے۔ رات کو بجلی کی رنگا رنگ روشنیوں میں یہ سارا عالم بقعۂ نور ہوتا ہے۔

میلے کے کاروباری اور تفریحی دونوں شعبے نہایت بھرپور رہے۔ یہاں ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق سامان مل جاتا تھا چنانچہ دیکھنے والوں کا تانتا لگا رہا۔

سرکاری اندازہ کے مطابق اس دو ہفتے کی مدت میں تقریباً چالیس لاکھ انسان اسے دیکھنے آئے۔ بہرحال اس کی معنویت اور کشش میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ آخری دن لوگوں کا بے پناہ اژدہام تھا۔ ہر آرزومند جو کسی وجہ سے پہلے نہیں آسکا تھا آج اسے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ ان خواہش مندوں میں صرف عوام ہی نہیں بلکہ حکومت ہند کے وزرا اور دیگر ممتاز شخصیتیں بھی شامل تھیں۔ چنانچہ [illegible] کو مرکزی وزیر قانون شری اشوک سین، وزیر [illegible] اور [illegible] شری رام نواس مردھا اور دیہی ترقیات کے وزیر شری راما [illegible] بھی میلہ دیکھنے آئے۔

میلے کے بعض انتظامات پر نکتہ چینی بھی ہوئی۔ لیکن یہ دستور تو ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور شاید اس کے بغیر کوئی بھی میلہ پوری طرح خوب تر کی طرف گامزن نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا ہر ایک [illegible] اور [illegible] امید کی روشنی میں جو ترقی [illegible] لگی ہے۔

## بقیہ: ماں

یہ عہد کیا کہ میں اسے کبھی بھی دکھی نہیں کروں گی۔"

دنیا میں صرف ماں ہی کی ایک ذات ہے جو پورے طور پر بے غرض ہوتی ہے۔ بڑی عقیدت کے ساتھ اسے دیوی یعنی پرستش اور احترام کی شے گردانا گیا ہے باوجود اس کی زندگی میں خدمت گاری کا جز لازمی طور سے تاحیات بنا رہتا ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہے جو ہمیشہ دوسروں کی تمام تر ضروریات اور مطالبات پوری کرتی رہتی ہے اور اپنے وجود تک کو ان کی خوشی اور خوشحالی پر قربان کر دیتی ہے۔

کیا کبھی اپنے لیے بھی جیتی ہے، شاید نہیں۔ یہی وہ فرق اور کمی ہے جو میں آج کی نئے زمانے کی ماں میں محسوس کرتی ہوں۔ بچے کی نشوونما اور تربیت کے بارے میں اس کا طرزِ عمل مختلف ہے۔ وہ بچے کی دیکھ بھال اپنی سہولت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کرتی ہے۔ اس کو اس کے حصے کا پیار تو دیتی ہے مگر اس طرح کہ وہ اس کا دم چھلا بن جائے۔ اس کے لیے وہ یقیناً بہت کچھ کرتی ہے، قربانیاں بھی دیتی ہے لیکن ایک حد تک ہی وہ سوچتی ہے کہ اس سے زیادہ دینا اس کے اپنے وجود کو ختم کردے گا۔ لیکن اس کے وابستگی اپنی ہی زندگی اور آزادی سے زیادہ اہم نہیں ہوتی۔ جب بھی وہ اپنے حقوق جتاتی ہے، آزادی اور انفرادی حیثیت کی بات کرتی ہے فرائض اور حقوق کے درمیان توازن رکھنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ وہ اس ماں کے مقابلے میں ناکام اور چھوٹی ہے جو اس کی طرح آزاد اور انفرادیت پسند مزاج کی نہیں ہے لیکن جو گھریلو ہم آہنگی یکجہتی اور امن و امان کی پائیدار علامت ہے۔ اس کے اس طرزِ عمل سے گھر کی چار دیواری گرونے لگی ہے۔ کبھی کبھی تو گر بھی جاتی ہے۔

بغیر کسی تعصب کے یہ اعتراف کرنے دیجیے کہ ان دو قسم کی ماؤں کے درمیان جو فرق ہے وہ درجات کا ہے، مواد و مقدار کا نہیں۔

ماں اور بچے کے بنیادی رشتے اور گہرے اور اٹوٹ تعلق ناقابلِ تغیر ہے۔ یہ ہمیشہ ایسا ہے۔ ماں کی اہمیت اور اس کا کردار کبھی بھی قابلِ بحث نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے یہ سوال ہرگز پوچھنے لائق نہیں کہ ماں کیوں ایک نیک اور وفا شعار اور اللہ کی سب سے عزیز ترین پیاری اور پسندیدہ شخصیت ہے۔ [illegible] ایک [illegible] ہے جو مناسب [illegible] پایا جاتا ہے۔

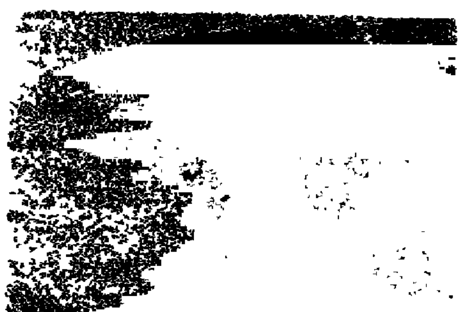
کرونا جوائے دیپ سنگھ

# ماں : ایثار و محبت کی دیوی

ہم لوگ اپنے آخری سال کے طلبا ساتھیوں کے لیے دی گئی الوداعی پارٹی میں شریک تھے۔ چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کے طور پر ان لوگوں کو ناچنے گانے اور مسخرے پن وغیرہ کا مظاہرہ کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس کے علاوہ ایک سوال جو سب سے پوچھا گیا وہ یہ تھا کہ وہ کون سی ہستی ہے جس کو آپ سب سے زیادہ چاہتے ہیں اور کیوں؟ دلچسپ بات یہ کہ جوابات زیادہ تر فلم اسٹاروں، کھلاڑیوں اور رقاصوں کے بارے میں تھے۔ کسی نے کہا مجھے زینت اپنے متناسب جسم کی وجہ سے پسند ہے، کسی کو گواسکر زیادہ پسند تھا کیونکہ وہ ایک بڑا کھلاڑی ہے۔ اسی طرح کے مختلف جوابات کسی نے بھی دھیان نہیں دیا کہ ان کے جوابات میں سنجیدگی اور سوجھ بوجھ کی کمی نمایاں تھی۔ اگر سوال کی اہمیت پر غور کیا جاتا تو صاف ظاہر تھا کہ سوال ہرگز یہ نہیں تھا کہ کون فلم اسٹار یا کون کھلاڑی ان کا پسندیدہ ہے، بلکہ اس سے وہ شخصیت مراد تھی جس کو وہ لوگ ذاتی طور پر جانتے تھے اور جس سے کسی نہ کسی طرح وابستہ بھی رہے تھے یا جس کی کسی خاص خوبی سے وہ اس قدر متاثر ہوئے ہوں کہ وہ شخصیت ان کی پسندیدہ شخصیت بن گئی ہو۔

یہی سوال ایک افریقی ساتھی سے بھی کیا گیا۔ وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد قدرے جھجکتے ہوئے بولا "میری پسندیدہ شخصیت میری ماں ہے اور کیوں ہے اس کی وضاحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" تھوڑی دیر کے لیے ہنسی مذاق کا ماحول جو دوسروں کے جوابات کی بنا پر بن گیا تھا۔ یکایک بدلنے لگا کیونکہ اس جواب کی سنجیدگی کو ہر ایک نے محسوس کیا۔ سب کی متفقہ رائے سے اس لڑکے کو وداع ہونے والے ساتھیوں میں "قابل ترین ساتھی" اعلان کیا گیا۔

لفظ ماں، واقعتاً ایک ایسی شخصیت کی تصویر ابھارتا ہے جس سے لامحدود محبت، نگہداشت اور مسلسل ایثار کی خوبیاں وابستہ ہیں۔ لیکن میری نظر میں ان ساری خوبیوں کے علاوہ ایک اور صفت بھی ہے جو خاص امتیازی خصوصیت کا حامل ہے۔ ایک گلیوں



اور پارٹیوں میں گھومنے پھرنے والی تیز و طرار ماں کو اس احاطہ کی حدود میں شامل کرنا میرے لیے مشکل ہے۔

میں ایک ایسی سادہ مزاج ماں کی بات کر رہی ہوں جو دکھاوے سے مبرا لیکن دنیاداری میں معقول اور ایسی دیانت دار شخصیت کی حامل ہے جو من موہ لیتی ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہے جو زمانے کے ساتھ تبدیلی تو قبول کرتی ہے لیکن اپنی روایات اور قدروں کو کسی صورت بھی نظرانداز نہیں کرتی، جو کمزور تو ہے ہی اپنے پرانے دوستوں، زمانوں اور جگہوں کے سلسلہ میں جذباتی بھی ہے مگر اس کی اپنی دنیا پوری متعین ہے گھر کی چار دیواری میں اس کی زندگی کا محور اور انتہا تما کی سیما ہے۔ اس کی دنیا چھوٹی سی نسبتاً سکڑی ہوئی سی ہے۔ لیکن وہ اس قدر آزاد اور بے چیدہ بھی کہ کسی دوسرے کی کیا مجال جو اس میں دخل اندازی کی جرأت کر سکے۔

اس کی زندگی کا سب سے اہم اور قیمتی سرمایہ اس کے بچے اور وہ خاندانی شجر ہے جسے وہ تاعمر پھولوں اور پھلوں سے بھرا لدا دیکھنا چاہتی ہے اور جس کے وقار اور تحفظ کے لیے وہ جی جان اور پوری لگن سے زندگی بھر ان تھک محنت میں جٹی رہتی ہے وہ بوڑھی ہو جاتی ہے عمر رسیدگی کی وجہ سے اس کا بدن کمزور اور ناتواں ہو جاتا ہے مگر اس کی ممتا کا چشمہ آخری سانس تک جوں کا توں بنا رہتا ہے۔

اگرچہ یہ مایوس کن ہے کہ اسے اپنی زندگی میں وہ سب نہیں ملتا جس کی وہ حقدار ہوتی ہے تاہم اس کی تقریباً ہر بات مانی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ جس شدت اور انداز سے ماں اپنے بچے سے پیار کرتی ہے وہ انداز کسی دوسرے رشتے سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔

میری ایک سہیلی نے اپنی یادوں کو ٹٹولتے ہوئے بتایا کہ اس کے پیے اپنی ماں کو ہمیشہ کے لیے کھو دینا کسی خیال و خواب میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن ایک رات اس نے خواب میں اپنی ماں کو مرتے ہوئے دیکھا۔ بیٹی اس کی سلامتی کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعائیں اور

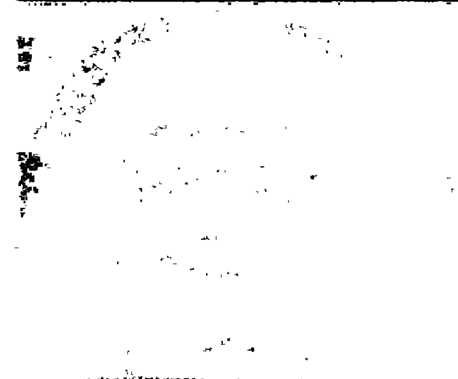
گرونا جوائے دیپ سنگھ

# کشمیری خانہ بدوش : ایک تہذیب

اس صورت حال کو ہم انسان کے اس دنیا میں بڑے ہی عجیب و غریب انداز میں بقید حیات رہنے کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ داستان ہے ان لوگوں کی جو پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں، سرسبز کھیتوں اور پھیلی ہوئی چراگاہوں کے بیچ گھری الگ تھلگ اور سونی سونی سی دنیا میں بے نیاز ہو کر خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور اب بھی اسی طرح رہتے ہیں جیسے کہ ماضی میں تھے فطرت کے ساتھ ان کا یہ قرب اور فطرت کی حدود تک ان کی بلا روک رسائی ہی ایسے پہلو ہیں جو درحقیقت اس قبیلے کو فطرت کے ان مناظر سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں جو جنگل میں اگتے پھولوں اور آسمان میں منڈلاتے بادلوں پر مشتمل ہیں۔ زندگی چاہے کتنی ہی دشوار ہو ان کی ایک بات یقیناً بدستور رہتی ہے۔ اگر یہ قبیلے انجان منزلوں کی تلاش میں اپنی آوارگی کی بدولت تن تنہا چوٹیوں کو عروج کرا تھیں زندگی سے بھرپور نہ کرتے تو ہمارے پہاڑوں کا طلسم اور ان کی شان و شوکت شاید کئی رنگوں کے باعث مختلف ہوتی یا معدوم ہوتی۔

جموں و کشمیری شاہراہ پر رات کو سفر کرنے والے اکثر آگ کے ایسے الاؤوں سے دوچار ہوتے ہیں جو کسی دور کے جنگل کے ایک حصے کو روشن کرتے ہیں۔ انھیں بھیڑوں کے ریوڑ، کتے اور گھوڑے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو وقفہ بہ وقفہ بجتی سیٹیوں کی چیخ کے نیچوں بیچ دھیرے دھیرے ایسی بل کھاتی اور اکثر اونچی اونچی سڑکوں پر ہانکے جاتے ہیں جو پہاڑوں کے ساتھ اور کبھی کبھی پہاڑوں کے درمیان ہوتی ہوئی تعمیر کی گئی ہیں۔ یہ بکروال قبیلے کے لوگ ہیں جو کہ ایک خانہ بدوش قبیلہ ہے اور ریاست میں آباد ہے۔ گرمی کا موسم آتے ہی وہ علاقے کی اونچی سطحوں پر سرسبز چراگاہوں اور زیادہ ٹھنڈے مقامات کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ سردی پڑتے ہی وہ میدانوں میں لوٹ آتے ہیں۔ تیز حنا راتوں کے دوران سفر کرتے ہوئے، جب سڑک مقابلتاً آمد و رفت سے خالی ہوتی ہے،

تیز چلتے ٹرکوں یا شور مچاتی ندیوں کا ساتھ دستیاب رہتا ہے۔ رات ہوتے ہی کبھی کبھی وہ تیز حنا ایسے ندی یا نالوں کے قریب رک جاتے ہیں جو جنگل میں سے بہتے چلے جاتے ہیں۔ رات کے ڈراونے اور خوفناک سناٹے میں اس مقام میں جان پڑ جاتی ہے جب یہ قافلہ، آگ جلا کر

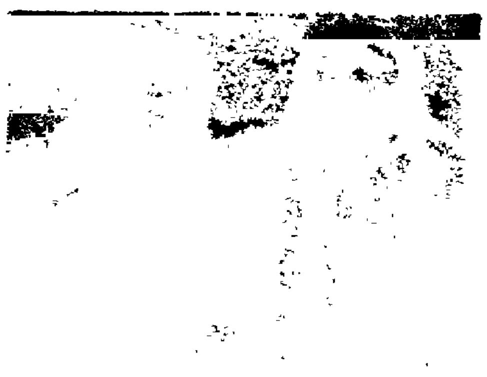


اور کھانا پکانے کی تیاری کے ساتھ وہاں رات کے وشرام کے لیے ٹھہر جاتا ہے۔

صدیوں سے ان کا اس طرح ادھر سے ادھر نقل و حرکت کرنا بدستور چلا آیا ہے جموں میں واقع شوالک سلسلے کی نچلی پہاڑیاں ان کے لیے موسم سرما کا گھر ہوتی ہیں۔ اور گرمیوں میں وادی کے ہمالیائی سلسلے ان کی جائے قیام ہوتے ہیں۔ بچے، بڑے ہو کر وہیں سے زندگی کا آغاز کرتے ہیں جہاں باپ دادا نے زندگی سے قطع تعلق کیا تھا زندگی کا یہی طور طریق بدستور چلتا ہے اور ان کی نسلیں اس روایتی انداز زیست کو بدلنے کا خیال تک نہیں کرتیں۔ وہ اپنے آبا و اجداد کی طرح رواں دواں ہیں اور بڑے قانع ہوتے ہیں چاہے بالکل خوش و خرم نہ بھی ہوں۔ گھوڑے ان کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور کتے ان کی اور ان کی بھیڑوں کی دخل اندازوں سے رکھوالی کرتے ہیں۔ وہ دخل انداز آدمی ہوں یا درندے چندن واڑی، پہلگام، سلواس مرگ، سونامرگ، گولاب اور

گورز کے دور دراز علاقے ان کے خیموں کے لیے قابل ذکر ہیں لیکن کبھی کبھی ایک مناسب جائے قیام کی تلاش کے مارے وہ جغرافیائی اعتبار سے بہت ہی الگ جگہوں پر جا نکلتے ہیں جو اتنی دور بھی ہو سکتی ہیں جتنی کہ امرناتھ کی گپھا۔ یہاں ہواؤں کی زد میں رہنے والی سرسبز چراگاہوں میں اپنے سال کے چند مہینے گزارتے ہیں۔ ان کے کھانے پینے کے لیے ان کی بکریوں کا دودھ، جنگلی سبزیاں اور مختلف النوع اناج ہوتے ہیں۔

موسم سرما کی پہلی برف باری ہوتے ہی قبیلہ واپسی سفر کی تیاری شروع کر دیتا ہے ان مقامات پر جانا یا واپس آنا ہمیشہ سہل نہیں ہوتا۔ اونچے نیچے پہاڑی سلسلوں سے گزرتے ہوئے بکروال قبیلے کے لوگوں کو اکثر ناخوشگوار موسم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن شجاعت جوان کی شخصیت کا طرۂ امتیاز ہے انھیں دلیر، سخت جان اور زندگی کی دشواریوں کے آگے ڈٹے رہنے کے انداز سکھاتی ہے۔ ایسے میں کسی حد تک وہ اپنی بہت سی قوت ارد گرد کے ان پہاڑوں سے حاصل کرتے ہیں جو زندگی کی درشتی کے بالمقابل اپنی شان و شوکت



کی بانسری کے ساتھ لطف اندوز ہوتے ہیں



بکروال قبیلے کی عورت عجیب اور سادہ ہوتی ہے

وہ سر پر پھلک بانمرشتی ہے۔ اس کے بال باریکی کے ساتھ گندھے ہوتے ہیں اور بڑے ہی قابل ذکر حوصلے اور برداشت کی داوی ہوتی ہے۔ یہ نظریہ، کہ قدرت انسان کی سب سے بڑی محافظ ہوتی ہے، ناقابل یقین حد تک درست لگتا ہے جب ہم ایک عورت کو سڑک پر ہی بچہ جنتے دیکھتے ہیں۔ یا کبھی کبھی ایسے دور دراز علاقوں میں جہاں مواصلات یا دیگر سہولیات نہیں ہوتیں۔ اس طرح قدرت کے ساتھ ان کا اٹوٹ رشتہ رہتا ہے۔

## ابتدا و آغاز

بکروال قبیلے کے لوگ ان عجیب و غریب اور گوناگوں ثقافتوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو عہد ماضی میں ہمارے ملک میں رہیں۔ اس قبیلے کی ابتدا بہت ہی قدیم وقتوں سے وابستہ کی گئی ہے، جو کہ مہا بھارت کے زمانے کے ناگ بھنگ ہیں۔ ایک سو سال قبل از مسیح میں، پھاچھی، رکشان، ناگر، بھار اور گورسی ذاتیں موجود تھیں جو آج تک بامروالا میں چلتی ہیں۔ بکروال لوگ اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جسے گوجر کہتے ہیں اور جو مرکزی ایشیا سے ہندوستان آئے کہتے ہیں کہ گپت خاندان کے عہد حکومت یعنی چوتھی صدی عیسوی میں عربوں کے حملے کے ساتھ انھوں نے میدان ہارنا شروع کیا۔ جوں ہی انھوں نے سندھ اور بلوچستان کھویا ان کا زوال شروع ہو گیا۔ اسلام آنے



پہلے پہل یہ سب عرب سے ہجرت ... اس مذہب کو اختیار کر لیا۔ پھر ایک بہت سے گروپ الگ ہو گئے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے خانہ بدوشی کے سوا اُن کے لیے

کوئی چارہ نہ رہا اور وہ ہمالیہ کے نچلے علاقوں کی پہاڑیوں میں پھیل گئے۔

## ثقافت کا تحفظ

اپنی ثقافت کو محفوظ رکھنے کی اٹوٹ آرزو کے باعث اس قبیلے نے کسی بیرونی ثقافت کی دخل اندازی کو گوارا نہیں کیا۔ اسی وجہ سے، اپنے طبقے سے باہر شادی کا رواج ان کے یہاں شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔ اس طرح یہ طبقہ ایک محصور و محدود گروہ بن کے رہ گیا ہے۔ اس شدید قدامت پسندی اور خانہ بدوشی کی زندگی کے باعث طبقے کی مادی بہبود کے امکانات کم ہو گئے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ گجروں کے خاندان سے ہی تعلق رکھتے ہیں پھر بھی بکروال قبیلہ کے لوگ اپنے ان بھائیوں کی نسبت کم خوش قسمت ہیں جنھوں نے مستقل طور پر آباد ہو جانے کو ترجیح دی ہے۔ بکروال لوگوں کے ذرائع آمدنی زیادہ تر مویشی پالنے پر موقوف ہیں، جس میں خسارے کے اتفاقات، بیماریوں، قدرتی آفات اور دیگر حوادث کے سبب سے ہوتے رہتے ہیں۔

حکومت نے بکروال قبیلے کو درج فہرست قبیلہ قرار دیا ہے اور ان کے لیے منتقل ہونے والے اسکول قائم کیے ہیں۔ وظائف کی ادائیگی، طبی مراکز، مویشیوں کی نگہداشت کے یونٹ وغیرہ قائم ہونے کے ساتھ ایک نئی بنیاد رکھی گئی ہے۔ انھیں زمین مہیا کرنے کی بھی کوششیں ہو رہی ہیں تاکہ وہ ایک جگہ آباد ہو جائیں۔ اس طبقے کو بعض ایسی چیزوں کے لیے مالی امداد کا بھی یقین دلایا گیا ہے جو ان کے وجود کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے انداز زیست کو بدلنا ابھی تک ایک خواب بے تعبیر ہی ہے۔

## مستقبل

سونامرگ کی چوٹیوں کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی جھونپڑی، جلتی آگ کے پاس ستر سال کا بوڑھا بشیر الدین بیٹھا تھا جس نے اپنی ساری زندگی خانہ بدوشی میں گزاری تھی۔ خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا جس کی وجہ سے نیچے میدانوں کی طرف ہجرت کرنے کا وقت تھا۔ لیکن اسے فکر تھی تو یہ تھی کہ لگاتار ہوتی ہوئی موسلا دھار بارش کہیں اس کی بھیڑوں کے پار ریوڑ میں چند ایک کو ہلاک نہ کر دے۔ علاقے کے ایک کونے سے دوسرے کونے کو ہجرت کرنے کے خطرات اور دشواریوں کا خیال کرتے ہوئے کیا کبھی اس نے اس زندگی کا خواب نہیں دیکھا جو کم دشوار اور زیادہ مستقل ہو؟

"ہاں! ہم یہ خواب دیکھتے ہیں اور انشاء اللہ کسی دن ہم ان تمام مشکلات سے نجات پائیں گے جو اب ہمیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔"

اس کا اللہ سے دعا کرنا، اس قادر مطلق کے آگے مکمل سپردگی کا اظہار کرتا تھا۔ اور یہ ٹھیک ہے کیوں کہ یہ لوگ اپنی بھلائی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔ مناسب تعلیم اور منظر عام پر آنے کی کمی کی وجہ سے ان کے یہاں کوئی ایسا قابل آدمی پیدا نہیں ہوا جو ان کی رہنمائی کرے اور ان کے لیے جہد مسلسل کرے۔ لیکن بوڑھے بشیر الدین کی یہ نیم محسوس آرزو یقیناً پھل لائے گی جب آج کے اسکول جانے والے بچے بڑے ہو کر ان کے طبقے کے معمار بن جائیں گے۔ صرف وہی اس طبقے کی رہنمائی کر سکیں گے اور اسے تمام قسم کی دشواریوں اور استحصال سے محفوظ کر سکیں گے۔

ان کی دنیا بڑی ہی مختلف قسم کی ہے جس میں وقت گویا ٹھہرا ہوا ہے اور زندگی، وجود کو برقرار رکھنے کی کوشش میں، معطل سی ہے۔ ان کے ماحول سے باہر کی دنیا بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ لگاتار آگے بڑھتی ہوئی تہذیب کی شان و شوکت اور ثقافتی ماحول سے بے گانہ یہ قبیلہ بڑے انہماک کے ساتھ اپنی زندگی کے پرانے رسم و رواج سے وابستہ چلا آ رہا ہے۔

# گاندھی جی کی تحریک "عدم تعاون" اور ٹیگور

یورپ میں کئی برسوں کے سفر کے بعد جب اگست ۱۹۲۱ء میں گورو دیو رابندر ناتھ ٹیگور ہندوستان واپس آئے تو لوگوں کی ذہنیت میں تبدیلی کو دیکھ کر انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ واپسی سے پہلے ہی یوروپ سے ہندوستان میں اپنے احباب کو لکھے متعدد خطوط میں انھوں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ ان خطوط میں سے بہت سے خطوط "ماڈرن ریویو" میں شائع ہوئے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ٹیگور اور گاندھی جی کے درمیان نظریاتی اختلاف اہم ہے کیونکہ یہ اختلاف ان دو عظیم ذہنوں کے درمیان تھا جنہیں باہمی وقار و تمکنت نے تحریک دی تھی لیکن وہ اپنے خیالات میں اس قدر الگ تھے جیسے کہ ایک فلسفی ایک مبلغ کے مقابلے میں یا جیسے ایک افلاطون سینٹ پال کے مقابلے میں ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اعتقاد اور سخاوت ہیں جو ایک نئے انسانی سماج کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ذہانت ہے جو آزاد پیدا ہوئی ہے، پر سکون و وسیع ہے اور ہمدردی نیز مفاہمت کے طفیل تمام [illegible] انسانوں کی آرزوؤں کو متحد کرنے کی سعی کر رہی ہے۔

ٹیگور ہمیشہ گاندھی جی کو سنت کہتے تھے اور میں نے انہیں اکثر گاندھی کا بڑے احترام کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے سنا ہے۔ جب گاندھی جی کے حوالے سے میں نے ٹالسٹائی کا ذکر کیا تو ٹیگور نے مجھے بتایا (اب مجھے اعتراف ہے کہ میں گاندھی جی کو پہلے سے بہتر جانتا ہوں) کہ گاندھی جی کی شخصیت ٹالسٹائی کی نسبت کس قدر پُر نور ہے۔ گاندھی جی کے نزدیک ہر چیز فطرت کے مترادف ہے جو منکسر، سادہ اور معصوم ہے اور ان کی تمام جدوجہد مذہب کے پُر سکون ہالے میں جگمگاتی ہے جب کہ ٹالسٹائی کے نزدیک ہر چیز فخر کے بالمقابل فخریہ سرکشی ہے۔ نفرت کے بالمقابل نفرت اور جذبے کے بالمقابل جذبہ۔ ٹالسٹائی میں ہر چیز پیکار ہے۔ ان کا اصول عدم تشدد جو آتش سوزی کی ماہیت کا حامل ہے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۲۱ء کو ٹیگور نے لندن سے لکھا تھا:

"ہم گاندھی جی کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کو ایک ایسا موقع دیا ہے جس کی بدولت [illegible]



گاندھی جی کی حمایت کرنے کا منصوبہ بنایا اور اکتوبر ۱۹۲۱ء کے منشور یعنی "سچائی کے لیے اپیل" میں بھی جس سے ان دو حضرات کے باہمی اختلاف کی نشاندہی ہوتی تھی شروعات گاندھی جی کے تئیں ایسے خوبصورت خراج تحسین سے ہوتی ہے جو شاید شاذونادر ہی لکھا گیا ہو۔

ٹیگور کے ساتھ گاندھی جی کا سلوک سراسر بھرے خلوص کا حامل ہے اور ان کے باہمی اختلاف کی حالت میں بھی نہیں بدلتا۔ آپ کو محسوس ہونے لگے گا کہ گاندھی جی ٹیگور کے ساتھ دلیل بازی کے حق میں نہیں ہیں اور جب کچھ احباب ذاتی جملوں کو دہرا کر اس مباحثے کو تلخ بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو گاندھی جی انہیں چپ رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور انہیں وضاحت کرکے بتاتے ہیں کہ وہ ٹیگور کے کس قدر ممنون ہیں۔

پھر بھی یہ ناگزیر تھا کہ دونوں کے مابین خلیج زیادہ وسیع ہو جاتی۔ ۱۹۲۰ء میں ٹیگور نے اس بات کی مزاحمت کی تھی کہ گاندھی جی کے بے پناہ پیار کو سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا جائے، جیسا کہ اسے تلک جی کی وفات کے بعد کیا گیا ہے۔ بلاشک گاندھی جی کوئی بے دلی کے ساتھ سیاسی میدان میں نہیں آئے تھے۔ لیکن جب تلک جی وفات پا گئے، تو ہندوستان میں کوئی سیاسی سربراہ نہیں تھا اور کسی نہ کسی کو ان کی جگہ لینی تھی۔

گاندھی جی کہتے ہیں۔

"اگر میں سیاسیات میں حصہ لیتا ہوا دکھائی
دیتا ہوں تو اس کا یہی سبب ہے کہ سیاسیات
ہمیں آج کل ایک سانپ جیسے پیچ دار
نرغے میں لیے ہوئے ہے جس میں سے نکلنا
بڑی کوشش کے باوجود بھی ناممکن ہے۔
میں اس سانپ سے لڑنا چاہتا ہوں
میں مذہب کو سیاسیات میں لے آنے
کی سعی کر رہا ہوں"

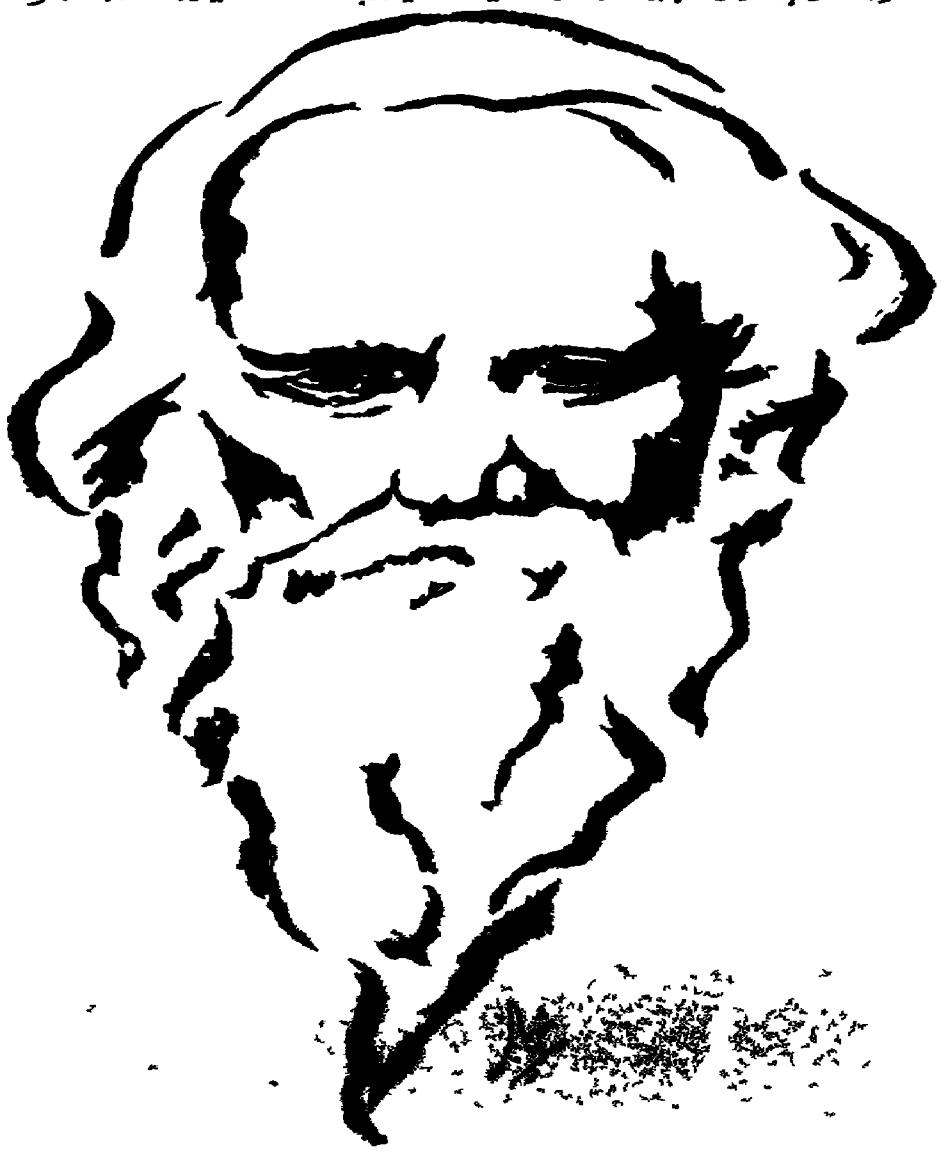
لیکن ٹیگور اسے اچھا نہیں سمجھتے ۷ ستمبر ۱۹۲۰ء کو لکھتے ہوئے انھوں نے کہا ہے۔

"ہمیں اس تمام اخلاقی قوت کی ضرورت
ہے جس کی نمائندگی مہاتما گاندھی جی
کرتے ہیں اور دنیا بھر میں وہ اکیلے ہی
نمائندگی کرنے کے قابل ہیں"

ایسے کیمیتی خزانے کو سیاسیات جیسے فضول اور برے ماحول میں پھینک دینا اور اسے مصادم اور غصیلے جماعت کے تموج کی زد پر چھوڑ دینا ہندوستان کی بڑی سدید بدبختی ہے جس کے متعلق کے بارے میں ٹیگور کہتے ہیں کہ اسے تو روحانی شعلوں کی تاب سے مُردوں کو جگانا ہے روحانی وسائل کو ایسے مسائل میں ضائع کرنا جو تجریدی سے نوعیت کی اخلاق سچائی کی روشنی میں بے سود لگتے ہیں بڑے افسوس کی بات ہے۔ اخلاقی قوت کو محض قوت میں ڈھالنا جرم ہے۔

یہی وہ امر ہے جس کا گورودیو کو عدم تعاون کی عجیب و غریب مہم کی شروعات' مسئلہ خلافت کے نام پر سر اٹھاتی ہوئی افراتفری اور پنجاب میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے پیش نظر احساس ہوا۔ یہ تحاشہ غیض و غضب کی رو میں بہا جانے والے عوام پر اس مہم کے اثرات کے بارے میں انہیں خدشات ہونے لگے۔ ان کی خواہش تھی کہ لوگوں کے دل و دماغ کو [illegible]

[illegible]



اور ان کے جذبۂ جاں نثاری [illegible] ۔ مداح تھے۔ پھر بھی وہ عدم تعاون میں نفی کے عنصر سے نفرت کرتے تھے ٹیگور فطرتاً ہر اس چیز سے انحراف کرتے تھے جو "نہیں" پر زور دیتی ہو۔

اسی عقیدے کے تحت وہ براہمن مت کے مثبت آدرشوں کا بدھ مت کے منفی نظریات سے مقابلہ کرتے تھے جن میں اول الذکر کا تقاضا ہے کہ زندگی کی مسرتوں کا خیر مقدم کیا جائے لیکن انہیں مقدس کر دیا جائے اور آخر الذکر ان مسرتوں کو دبا دینے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے جواب میں گاندھی جی کہتے ہیں کہ کسی چیز کو خارج کر دینا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اسے قبول کر لینا۔ انسانی ترقی دونوں کے امتزاج پر مشتمل ہے۔ اپنشدوں میں حرف آخر نفی ہے۔ اپنشدوں کے مصنفین نے برہمن کو نیتی یعنی "یہ نہیں" کی اصطلاح دی ہے۔ ہندوستان "نہیں" کہنے کی طاقت بیٹھا تھا۔ گاندھی جی اسے واپس لائے ہیں۔ خود رو پودوں کو نکال دینا بھی اتنا ہی لازمی ہے جتنا نئے پودے اگانا۔

لیکن ایسا لگتا ہے کہ ٹیگور خود رو پودوں کو نکالنے میں اعتقاد نہیں رکھتے۔ زندگی کو شاعرانہ انداز میں دیکھنے کے اعتبار سے وہ اشیا کو ان کے فطری روپ میں دیکھ کر مطمئن ہیں اور ان کی ہم آہنگی کے گن گانے میں انہیں مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو عظیم حسن کے نقوش میں واضح کرتے ہیں لیکن وہ زندگی سے الگ تھلگ ہوتے ہیں۔ ان کے الفاظ "شراج کنج" کی طرح ہوتے ہیں جو وہم و گمان کا ایک کھیل ہے۔ ٹیگور کہتے ہیں کہ وہ اپنے جذبات کو اس عظیم انگیخت کی سطح تک لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جو ملک پر طاری ہو رہی ہے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے دل میں اپنے پن کے باوجود اختلافات کا ایک جذبہ موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "اپنی مایوسی کے اندھیرے میں مجھے ایک مسکراہٹ دکھائی دیتی ہے اور میں ایک آواز سنتا ہوں جو یہ کہتی ہے کہ تمہاری جگہ ان بچوں کے پاس ہے جو دنیا کے سمندری کناروں پر کھیل رہے ہیں اور وہ آواز بھی وہیں میرے پاس موجود ہوتی ہے۔" ٹیگور ہم آہنگیوں کے ساتھ کھیلتے ہیں وہ نئے آہنگ ایجاد کرتے ہیں جو گھنٹوں کی مشقت کے ذریعے رونما ہوتے ہیں ان بچوں کی طرح جو دھوپ میں ناچتے ہیں اور غائب ہوتے ہوئے قہقہہ لگاتے چلے جاتے ہیں۔ "ٹیگور کی ہم آہنگی میں تمام کائنات مسرور ہے جس میں پھول اور پتے محض آہنگ ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتے بھگوان خود ہی ایک عظیم بازی گر ہے جو وقت کے ساتھ کھیلتا ہے ستاروں، سیاروں کو خلائی لہروں میں اچھالتا رہتا ہے اور خوابوں سے بھری کاغذی کشتیاں زمانوں کے دریا میں چھوڑتا رہتا ہے۔" جب میں اسے گزارش کرتا ہوں کہ مجھے اپنا شاگرد بنا لے اور مجھے بھی اپنی ایک خوش و خرم کشتی میں میرے ایجاد کردہ کھلونے رکھنے دے تو وہ مسکراتا ہے اور میں اس کی قبا کا سرا پکڑ کر اس کے پیچھے چلنے لگتا ہوں۔" ایسے ٹیگور محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنے صحیح مقام پر ہیں "لیکن میں کہاں ہوں اس بڑی بھیڑ میں جہاں ہر طرف سے مجھے کھینچا جا رہا ہے؟ اور جو شور میں سن رہا ہوں اسے کون سمجھ سکتا ہے؟ اگر میں کوئی گانا سنوں تو میرا ستار اس کی نغمگی اختیار کر لیتا ہے اور میں اس کورس میں شامل ہو سکتا ہوں کیونکہ میں ایک مغنی ہوں۔ لیکن بھیڑ کی ہاہاکار میں میری آواز گم ہو جاتی ہے اور میرا سر چکرانے لگتا ہے۔" عدم تعاون کی ہاہاکار میں ٹیگور نے نغمگی تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود، اور وہ اپنے آپ سے کہتے ہیں "اگر تم اپنے ہم وطنوں کی تاریخ کے سب سے زیادہ سنگین موقع پر ان کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتے تو خبردار کہ تمہارے منہ سے یہ نہ نکلے کہ وہ غلطی پر ہیں اور تم حق بہ جانب۔ لیکن ان میں اپنے مقام کو چھوڑ دو، اپنے شاعرانہ وجود کے گوشے میں چلے جاؤ اور لوگوں کی لعن طعن برداشت کرنے کے لیے تیار رہو"

ایسی باتیں ایک گوئٹے، بھارتی گوئٹے یا [illegible] ہی کر سکتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اب ٹیگو [illegible] کے لیے اپنا ارادہ طے کر لیا ہے۔ اس شاعر نے اس گل کو الوداع کہہ دیا ہے جس میں نفی کے معنی موجود ہیں اور وہ اپنے تخلیقی طلسمات کی دنیا میں لوٹ آتا ہے جسے اس نے اپنے گرد بن لیا ہے لیکن ٹیگور محض کنارہ کش ہی نہیں ہوتے۔ انھوں نے کہا ہے "مقدر کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ اپنی کشتی کو ندی کی لہروں کی مخالف سمت میں لے جائیں۔ اس وقت وہ محض ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ یورپ میں ایشیا کے روحانی سفیر بھی تھے۔ وہ ابھی ابھی یورپ سے واپس آئے تھے جہاں انھوں نے لوگوں سے التجا کی تھی کہ وہ شانتی نکیتن میں ایک عالمی یونیورسٹی قائم کرنے میں تعاون دیں۔ تقدیر کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ایک طرف تو وہ مغرب و مشرق کے درمیان تعاون کا پرچار کر رہے ہیں اور اسی وقت دوسری طرف عدم تعاون کی تبلیغ ہو رہی ہے۔

لہٰذا عدم تعاون نے انہیں دوسرا زخم دیا جو ان کے کلام اور ان کے نظریۂ زندگی پر اثر انداز ہوا۔ انھوں نے کہا ہے۔ "میں مشرق اور مغرب کے حقیقی اتحاد میں اعتقاد رکھتا ہوں۔"

عدم تعاون کا نظریہ ان کے طرز فکر سے ٹکرا گیا کیونکہ ان کی ذہنیت "ان کی بھرپور ذہانت تمام دنیا کی ثقافتوں کی بنا پر پروان چڑھی تھی۔ انھوں نے کہا ہے "بنی نوع انسان کی تمام عظیم ترین اشیا میری ہیں۔ اپنشدوں کے مطابق انسان کی لامتناہی شخصیت تمام انسانی نسلوں کی شاندار ہم آہنگی سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ میری دعا ہے کہ ہندوستان دنیا کی تمام اقوام کے باہمی تعاون کی نمائندگی کرے۔ ہندوستان کے لیے اتحاد ایک سچائی اور تفرقہ ایک برائی ہے۔ اتحاد وہی ہے جو ہر چیز کو گلے لگاتا اور سمجھتا ہے۔ لہٰذا اسے منفی رویے کے تحت حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی روح کو مغربی روح سے الگ کرنے کی حالیہ کوشش ایک طرح کی روحانی خودکشی کے مترادف ہے۔ موجودہ دور پر مغرب ہی غالب رہا ہے۔ کیونکہ مغرب کو ایک مشن پورا کرنا تھا ہم مشرق والوں کو مغرب سے سیکھنا چاہیے۔ بلاشک افسوس کی بات ہے کہ ہمارے پاس اپنی ثقافت کی قدر و قیمت لگانے کی طاقت نہیں رہی اور اسی لیے ہمیں جانکاری نہ ہو سکی کہ مغربی ثقافت کو کون سا صحیح مقام دیا جائے۔ لیکن یہ کہنا کہ مغرب کے ساتھ تعاون کرنا غلط ہے تو یہ سب خراب قسم کا صوبجاتی تعصب ہوگا اور اس سے ذہنی افلاس کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ مسئلہ عالمی نوعیت کا [illegible] سے قطع تعلق کر کے اپنی نجات [illegible] نہیں کر سکتی۔ ہم سب کو مجموعی حفاظت کی ضرورت ہے یا ہم اکٹھے ہی فنا ہو جائیں گے۔

دوسرے الفاظ میں جیسے ۱۸۱۳ء میں گوئٹے نے فرانسیسی تہذیب و تمدن سے انکار قبول نہیں کیا تھا ٹیگور بھی مغربی تہذیب کو ہندوستان سے جلاوطن کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اگرچہ گاندھی جی کا نظریہ مشرق اور مغرب کے مابین کوئی دیوار کھڑی نہیں کرتا پھر بھی ٹیگور جانتے ہیں کہ اگر ہندو قومیت [illegible] میں لائی گئی تو اس کا مطلب یہی لیا جائے گا۔ ٹیگور کو خدشہ ہے کہ علیحدگی کا جذبہ پروان چڑھے گا اور انھوں نے اپنے احساس شک و شبہ کی وضاحت اس وقت کر دی جب تحریک عدم تعاون کے آغاز پر ان کے طلبا ان کا مشورہ لینے کے لیے آئے۔ انھوں نے پوچھا "اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ طلبا کس مقصد کے لیے قربانی دیں گے؟ کیا زیادہ مکمل تعلیم کے لیے نہیں بلکہ تعلیم کی نفی کے لیے؟ سودیشی تحریک کی پہلی مہم کے دوران نوجوان طلبا کا ایک ٹولہ ان کے پاس آ کر بولا کہ اگر وہ حکم کریں تو سب طلبا فوراً اپنے اسکول اور کالج چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ جب انھوں نے حکم دینے سے انکار کر دیا تو سب غصے میں آ گئے کہ جذبۂ

حب الوطنی پر شک کرتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔

۱۹۲۱ء کی بہار کے دنوں جب ہندوستان نے انگریزی اسکولوں کا بائیکاٹ شروع کیا تو ٹیگور لندن میں دانشورانہ قومیت پسندی کی ایک شدید مثال سے روشناس ہو چکے تھے۔ ٹیگور کے ایک دوست پروفیسر پیٹرسن کے ایک لیکچر کے دوران کچھ بھارتی طلبا نے احساس قومیت کا ایک بے محل اظہار کیا تھا۔ ٹیگور کو ندامت کا احساس ہوا۔ شانتی نکیتن کے ڈائریکٹر کو اپنے ایک خط میں انھوں نے طلبا کے بے برداشت رویے کی مذمت کی اور تحریک عدم تعاون کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

اس الزام تراشی کا گاندھی جی نے یہ جواب دیا ہے :

میں نہیں چاہتا کہ میرا گھر تمام جانب
سے دیواروں میں گھرا ہوا اور اس کی
کھڑکیاں بند کر دی جائیں۔ میں چاہتا
ہوں کہ سب ملکوں کی ثقافتی ہوائیں میرے
گھر کے گرد پوری آزادی کے ساتھ چلتی
رہیں لیکن میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ
ان ہواؤں میں سے کوئی ہوا مجھے قدموں
سے اکھیڑ کر پھینک دے۔ میرا مذہب قید خانے
کا مذہب نہیں ہے اس میں بھگوان کی
چھوٹی سے چھوٹی تخلیق کے لیے بھی گنجائش
ہے لیکن نسل، مذہب یا رنگ کے اعتبار
سے کسی گستاخانہ گھمنڈ سے متاثر نہیں ہوگا۔

انگریزی کی اس ادبیاتی تعلیم کی خوبیوں کے بارے میں جس کا اخلاق تعمیر سے کوئی تعلق نہیں یا جس نے ہندوستان کے نوجوانوں کو کمزور کر دیا ہے، اپنے شبہات کا اظہار کرتے ہوئے گاندھی جی نے متذکرہ مبالغات کے لیے اظہار افسوس کیا اور کہا کہ ان کا یہ رویہ تنگ نظری کا نہیں جیسا کہ ٹیگور جی نے سمجھ لیا تھا۔

گاندھی جی کے یہ الفاظ بے تکلف تھے لیکن ان سے ٹیگور کے شبہات بے مصرف نہیں ہوتے تھے۔ انہیں گاندھی جی پر شک نہیں تھا۔ انہیں تو گاندھی جی کے پیروکاروں سے خدشہ تھا۔ یوروپ سے واپس آتے ہی جب وہ پہلی بار عوام سے ملے تو انہیں عوام کے اس اندھ وشواس سے خوف لگنے لگا جو انہیں گاندھی جی کے الفاظ میں پیدا ہو گیا تھا۔ ٹیگور نے محسوس کیا کہ ایک ذہنی اجارہ داری کا خطرہ قریب تر ہے اور ماڈرن ریویو کے شمارہ برائے اکتوبر ۱۹۲۱ء میں انھوں نے اپنا حقیقی منشور شائع کیا جو کہ اس اندھی تقلید کے خلاف احتجاج کی صدائے بلند تھی۔ یہ تحریری احتجاج خصوصاً بڑا زوردار ہو گیا تھا کیونکہ اس کے ابتدائی حصے میں گاندھی کے لیے بڑا خوبصورت خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں چلائی گئی پہلی تحریک آزادی کو بیان کرنے کے بعد ٹیگور نے وضاحت کی تھی کہ ان دنوں سیاسی سربراہوں کو کتابی نظریات سے تحریک ملی تھی جو کہ برک، گلیڈسٹن، مزینی اور گیری بالڈی کی روایات پر مبنی تھے اور ان کا پیغام صرف چیدہ چیدہ لوگوں کی سمجھ میں آ سکتا تھا گویا انھوں نے ایسا نظریہ پیش کیا تھا جو انگریزی بولنے والوں کے لیے تھا لیکن تب گاندھی جی منظر عام پر آئے وہ ان ہزاروں لوگوں کی دہلیز پر رک گئے جن کا لباس ان کے اپنوں کی طرح تھا۔ انھوں نے انھیں کی زبان میں بات چیت کی یہاں سچائی نمودار ہوئی اور وہ محض کتابوں کے اقتباسات نہیں تھے۔ لوگوں نے مہاتما کا نام جو گاندھی جی کو دیا ہے ان کا اسم بامسمیٰ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی دیگر شخص نے عوام سے ہم آہنگ ہو کر اس طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ انہی نے محسوس کیا تھا کہ لوگ ان کے سراپا اپنے ہیں۔ مہاتما کی للکار کی بدولت ہی روح کی مخفی قوتیں شگفتہ ہو کر سامنے آئی ہیں کیونکہ مہاتما نے سچائی کو ٹھوس اور قابل دید صورت دی ہے اسی طرح ہزاروں سال پہلے مہاتما بدھ کی کوششوں کی بدولت ہندوستان نے نئی عظمت کے گل کھلائے تھے جب انھوں نے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ تمام ذی روح اشیا کے درمیان ہمدردی اور برادرانہ احساس ہونا چاہیے۔ ہندوستان میں نئی زندگی بیدار ہوئی تھی اور اس نے سمندروں اور صحراؤں کے پار دولت اور سائنس کو وسعت دینے میں اپنی طاقت کا اظہار کیا تھا۔ کوئی بھی تجارتی یا فوجی نوعیت کی فتح اس قدر شان سے توسیع نہیں کر پائی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت ہی ایک واحد سچائی ہے۔

پھر ٹیگور کے لب و لہجہ میں تبدیلی آگئی۔ آدرشوں کی پرستش بند ہو گئی۔ فریب کاری در آئی، سمندر پار، یوروپ میں ٹیگور نے ہندوستان کی عظیم نشاۃ ثانیہ کا جھٹکا محسوس کیا۔ نئی آزادی کی نسیم فراواں میں سانس لینے کے خیال سے مسرت آشنا ہو کر وہ اپنے وطن واپس آ گئے۔ لیکن یہاں آتے ہی ان کا جوش و خروش دھیما پڑ گیا۔ لوگوں پر ایک زبردستی کا ماحول طاری تھا۔ ایک بیرونی اثر ان پر حاوی دکھائی دے رہا تھا جس کے تحت تمام لوگ ایک ہی لہجے میں بول رہے تھے اور ایک ہی لکیر کے فقیر تھے۔ ہر جگہ مجھے بتایا گیا کہ ثقافت اور دانشورانہ دلائل کو میدان چھوڑ دینا چاہیے اور اندھا دھند تقلید کا بول بالا ہو۔ کچھ ظاہری آزادی کے نام پر روحانی آزادی کو کچلنا کس قدر آسان ہو گیا ہے۔

ہم ٹیگور کی بے اعتمادی اور ان کی اپیل کو سمجھتے ہیں جو تمام وقتوں اور زمانوں میں ہوا کرتی ہیں۔ نئی عیسائیت کے طلوع کے موقع پر زوال پذیر قدیم دنیا کی آخری آزاد شخصیتوں نے ان کے بارے میں آواز اٹھائی تھی۔ اور جب کبھی کسی سماجی یا قومی نظریے میں اندھ وشواس کے ابھرتے جوار بھاٹا کا ہمیں خود تجربہ ہوتا ہے تو ہمارے اندر بھی ویسی ہی بے اعتمادی کے حرکت پذیر ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ٹیگور کی بغاوت، آزاد روح کی بغاوت ہے۔ اعتقاد کے ان زمانوں کے خلاف جو اس سے پیدا ہوئے ہیں کیونکہ اعتقاد جو چند منتخب حضرات کے لیے اعلیٰ قسم کی آزادی کے مترادف ہے وہ عوام کے لیے غلامی کی دوسری شکل ہے جنہیں اس اعتقاد سے راستہ دکھایا جاتا ہے۔

ٹیگور کی نکتہ چینی کا نصب العین عوام کے تعصبات سے اوپر اور پرے ہے۔ اندھ وشواس والے عوام سے اوپر جا کر یہ مہاتما جی پر چوٹ کرتا ہے۔ گاندھی کہتے ہیں عظیم کیوں۔ ہوں مگر بھی وہ اپنے اوپر یہ ذمہ داری لے رہے ہیں جو ایک اکیلا انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ ہندوستان جیسے ملک کا مفاد محض ایک اکیلے ماہر پر منحصر نہیں ہونا چاہیے۔ مہاتما گاندھی جی سچائی اور محبت کے ماہر ہیں لیکن سوراج یا ہوم رول کا حاصل کرنا بہت ہی پیچیدہ ہے۔ راستے گنجلک اور دشوار گذار ہیں۔ جذبہ اور تحریک کی ضرورت ہے اور ان کے علاوہ سائنس اور روحانی غور و خوض بھی لازمی ہیں۔ قوم کی تمام اخلاقی قوتوں کی تائید کی جانی چاہیے۔ ماہرین اقتصادیات کو عملی حل تلاش کرنے چاہئیں، ماہرین تعلیم کو تدریس کا کام کرنا چاہیے۔ سیاستدانوں کو غور و خوض کرنا چاہیے اور کارکنوں کو کام کرنا چاہیے۔ ہر جگہ سیکھنے کی خواہش کو آزاد اور بلا روک ہونا چاہیے۔ دیانت پر ظاہری یا مخفی کسی طرح کا دباؤ نہیں پڑنا چاہیے۔ ٹیگور کہتے ہیں :

" پرانے وقتوں میں ہمارے جنگلات میں
ہمارے رشی منی، گورو اپنی بھرپور بصیرت
کی بدولت سچائی کے تمام متلاشیوں کو
تلقین کیا کرتے تھے۔ ہمارا گورو جو عمل
کی جانب ہماری رہنمائی کرنا چاہتا ہے،
ایسی تلقین کیوں نہیں کرتا؟ "

لیکن گاندھی گورو نے اب تک جو حکم صادر کیا ہے وہ یہی ہے کہ " چرخہ کاتو اور کپڑا بنو " اور ٹیگور پوچھتے ہیں

" کیا نئے تخلیقی عہد کی یہی مستند سچائی ہے؟
اگر بھاری بھاری مشینری مغرب کے لیے
خطرناک ہے تو کیا چھوٹی چھوٹی مشینیں
ہمارے لیے زیادہ خطرناک نہ ہوں گی؟
کسی قوم کی قوتوں کو کس طرح سے کام کرنا
چاہیے۔ نہ صرف آپس میں بلکہ دوسری

قوموں کے ساتھ بھی ہندوستان کی بیداری دنیا کی بیداری سے وابستہ ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے آپ کو مقید کر لیتی ہے تو وہ نئے دور کی روح کی خلاف ورزی کرتی ہے۔

یورپ میں کئی برس گزارنے کے بعد ٹیگور خود سے ملنے والے ایسے افراد کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے اپنے دل و دماغ کو اپنی قومیت کی زنجیروں سے آزاد کر لیا ہے تاکہ وہ بنی نوع انسان کی خدمت کر سکیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عالمی شہروں میں ستم زدہ اقلیت کہلاتے ہیں اور ٹیگور نے انہیں سنیاسیوں کا ہم پلہ کہا ہے جنہوں نے اپنی آتما میں انسانی یکجہتی کو محسوس کیا ہے۔

اور گورو دیو پوچھتے ہیں کہ کیا ہندوستان اکیلا ہی نفی کا باب الاپتا رہے، دوسروں کی کوتاہی پر انحصار کرتا رہے اور نفرت کی بنا پر سوراج کی سعی کرے؟ جب پرندہ صبح کو جاگتا ہے تو اسے محض خورد و نوش ہی کی نہیں سوجھتی۔ اس کے پنکھ آسمان کی للکار سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ چڑھتے ہوئے دن کو خیر مقدم کہنے کے لیے اس کا گلا خوشی کے نغمات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی ایک نئی دنیا نے ہمیں پکارا ہے۔ ہندوستان کو اپنے ہی انداز میں اس کا جواب دینا چاہیے! صبح سویرے یہ ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم اسے یاد کریں، جو واحد ہے جو طبقاتی یا رنگ کے امتیاز سے ماورا ہے اور جو اپنی مختلف قدرتوں کی بدولت ہر طبقے اور سب کو ضرورت کے حساب سے ان کی ضروریات فراہم کرتا ہے۔ آؤ اس کی عبادت کریں جو ہم سب کو ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے عقل و دانش دیتا ہے۔

گورو دیو ٹیگور کے یہ پُروقار الفاظ جو قوم سے کیے گئے خطبات میں سے کسی حد تک خوبصورت ترین ہیں، ہم پسند کرتے ہیں گویا نورِ آفتاب پر نظم کے مترادف ہیں اور بنی نوع انسان کے تمام سنگھرشوں سے بالاتر صاف اور واضح ہیں۔ ان الفاظ کی تنقید ہم بھی کر سکتے ہیں کہ یہ ضرورت سے زیادہ واضح ہیں۔ گورو دیو ابدی نکتہ نگاہ کے اعتبار سے بجا فرماتے ہیں۔ ہائن (HEINE) نے ہمارے ایک ماہر موسیقی کو "شاعر پرندہ" عقاب قامت کوئل کہا تھا اسی طرح ٹیگور بھی ایک پرندہ ہے۔ وقت کے کھنڈرات پر بیٹھتا اور راگ الاپتا ہے۔ وہ ابدیت میں رہتا ہے لیکن آج کے مطالبات بہت ہی اشد ہیں۔ وہ وقفہ جو گزرتا ہے فوری عافیت کا خواہاں اور متقاضی ہے چاہے وہ ادھوری ہی ہو اور اس ضمن میں گاندھی جی جن میں ٹیگور کی شاعرانہ پرواز نہیں ہے، جواب دہی کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔

گاندھی جی نے شاید رحم و کرم کا جذبہ ہونے کے ناطے شاید اس شاعرانہ پرواز کو تیاگ دیا ہے تاکہ وہ ان عوام کے بیچ رہ سکیں جنہیں ورثہ میں یہ چیز نہیں ملی۔

گورو دیو ٹیگور کو جواب دیتے ہوئے گاندھی جی نے اب کے کہیں زیادہ جذبات کا اظہار کیا ہے جو اس سے پہلے اس تنازعہ کے دوران انھوں نے نہیں کیا تھا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۱ کو "ینگ انڈیا" رسالے میں ان کا تہلکہ انگیز جوابیہ شائع ہوا۔ اس میں گاندھی نے اس عظیم پاسبان کا شکریہ ادا کیا ہے کیونکہ اس نے ہندوستان کو آئندہ دشواریوں کا انتباہ کیا ہے۔ وہ گورو دیو جی سے اتفاق کرتے ہیں کہ سب سے ضروری ہے آزاد روح کا برقرار رکھنا۔

ٹیگور ایسے نگران محافظ ہیں جو ان دشمنوں کے بارے میں انتباہ کرتے ہیں جنہیں تعصب، تساہل، برداشت کی کمی، جہالت اور جمود کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن گاندھی جی یہ محسوس نہیں کرتے کہ ٹیگور کی بے اعتمادی جائز ہے۔ مہاتما جی ہمیشہ سوجھ بوجھ کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے کہ ہندوستان محض اندھی تقلید سے متحرک ہوتا ہے۔ اگر ملک نے چرخے کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے تو وہ صورتِ حال بڑے غور و فکر کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ ٹیگور صبر کی بات کرتے ہیں اور خوبصورت نغموں سے ان کا اطمینان ہو جاتا ہے لیکن اس وقت جنگ کا دور ہے۔ شاعر کو اپنا ساز دھر دینا چاہیے۔ وہ اس وقت نغمہ سرا ہو جب جنگ ختم ہو جائے۔ جب گھر جل رہا ہو تو سب کو مل کر آگ بجھانے کے لیے پانی کی بالٹیاں اٹھا لینی چاہئیں۔

جب میرے چاروں طرف لوگ بھوک سے مر رہے ہیں تو میرے لیے یہی جائز ہے کہ میں بھوکوں کو کچھ کھلاؤں۔ ہندوستان ایک جلتا ہوا مکان ہے۔ یہ بھوک سے مر رہا ہے کیونکہ اس کے پاس وہ روزگار نہیں ہے جس کی بدولت غذا خریدی جا سکے۔ کھلنا میں بھکمری ہے۔ پچھڑے اضلاع بتدریج چوتھے قحط سے گزر رہے ہیں۔ اڑیسہ میں تو ہمیشہ قحط رہتا ہے۔ ہندوستان روز بروز غریب ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے پیروں اور ہاتھوں میں خون کا دورہ بند ہو چکا ہے اور اگر ہم اس کی دیکھ بھال نہ کریں تو یہ بالکل ہی مسمار ہو جائے گا۔

بھوکوں مرتے اور بے کار لوگوں کے لیے بھگوان کے ظاہر ہونے کی یہی صورت ہے کہ انہیں کام دیا جائے اور کھانے کی شکل میں اجرت کا وعدہ کیا جائے۔ بھگوان نے انسان کو تخلیق کیا تھا کہ وہ اپنی خوراک کی خاطر کام کرے اور کہا تھا کہ جو لوگ بے کار ہیں وہ چور ہیں۔ ہمیں ان لاکھوں لوگوں کا خیال رکھنا چاہیے جو آج جانوروں سے بھی بدتر ہیں اور مرنے کی حالت میں ہیں۔ بھوک ایک ایسی دلیل ہے جو ہندوستان کو چرخے کی جانب لئے جا رہی ہے۔

فاقہ زدگی کی امید پر جیتا ہے اور وہ ہمیں بھی ایسا کرنے کی تلقین کرے گا۔ وہ ہماری تحسین آشنا آنکھوں کے لیے ان پرندوں کی خوبصورت تصاویر پیش کرے گا۔ جو صبح سویرے فطرت کی حمد کے نغمات گاتے ہوئے آسمان میں اٹھتے اور ابھرتے چلے جاتے ہیں۔ ان پرندوں کو دن بھر کا کھانا میسر آیا تھا اور عافیت آشنا پروں کی بدولت اونچا اڑ سکے تھے کیونکہ پچھلی رات کو ان کی رگوں میں نیا خون دوڑا تھا۔ لیکن میں نے ان پرندوں کو دیکھنے کا درد سہا ہے جو کمزوری کی وجہ سے اپنے پروں کی ایک پھڑپھڑاہٹ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہندوستان کے آسمان کے لیے انسان ایک ایسا پرندہ ہے جو صبح بیدار ہوتے ہوئے اپنی اس حالت سے بھی کمزور تر ہوتا ہے جس میں وہ سوتے وقت اپنے آپ کو عمداً سمجھ لیتا ہے۔ لاکھوں کے لیے زندگی ایک ابدی بے خوابی یا ایک ابدی طلسم ہے۔ میں کسی مصیبت زدہ مریض کو کبیر کے گیت سے سکون و راحت نہیں دے سکا۔

انہیں کام دیجئے تاکہ وہ کھا سکیں۔ یہ سوال پوچھا جائے کہ میں کیونکر چرخہ کاتوں جبکہ کھانے کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں؟ کیونکہ میں وہ چیز کھا رہا ہوں جو میری نہیں ہے۔ میں اپنے ہم وطنوں کی لوٹ پر زندہ ہوں۔ جو سکہ آپ کی جیب میں آتا ہے اس کے بنیادی وسیلے کا سراغ لگائیے۔ تب آپ میری اس تحریک کی صداقت کو پائیں گے۔ ہر آدمی کو چرخہ کاتنا چاہیے۔ ٹیگور کو بھی دوسروں کی طرح چرخہ کاتنا چاہیے۔ آج کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے بدیسی کپڑے جلا دے۔ کل کی بات بھگوان کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ گیتا میں کہا گیا ہے، ویسا ہی کرو۔

یہ الفاظ جس قدر گھناؤنے اور دہشت ناک ہیں، یہ ایک فن کے خواب و خیال کے آگے دنیا کی عقوبت جو چلا کر کہہ رہی ہے "تم کون ہو جو مجھے میرے وجود سے محروم کرو گے؟" اب کون ہے جو گاندھی جی کے اس شدید جذبے سے ہمدردی نہیں کرے گا اور اس میں شریک نہیں ہوگا!



بلراج ورما

# ہماری آفاقی میراث

"نئے دور (؟) دنیا کے لیے ہندوستان کا ایک عظیم تحفہ ہے ــــ اپنشدوں میں اسے 'اُپکھ' کہا گیا ہے۔

گوتم بدھ اس قادر مطلق میں یقین نہیں رکھتے تھے جسے ہم خدا کہتے ہیں ــــ اور نہ ہی انھوں نے اس کی تبلیغ کی ــــ اسی طرح ویدوں میں بھی کسی یک ذات خدا کے وجود کو لازم نہیں قرار دیا گیا ہے۔ ویدانتی فلسفہ کے مطابق خدا ایک کائناتی حقیقت ہے، جو پوری کائنات کا رب ہے۔ سچدانند سروپ نراکار، سروشکتی مان، نیائے کاری، دیالو، اجنما، اجرا، امر، ابھے، نت، پوتر اور شرشٹی کرتا۔

ہندوستانی علم ودانش کی دوسری دین ہے وجود کا تسلسل دوسرے مذاہب کے برعکس ہمارا یقین یہ ہے کہ کائنات کسی حادثاتی سبب سے وجود میں نہیں آگئی تھی اور نہ ہی یہ کسی آسمانی یا انسانی طاقت کا کرشمہ ہے بلکہ ایک اصول، ایک قانون، ایک ضابطہ کے تحت بتدریج تشکیل پذیر ہوئی اور یہ قانون وقت کے تصور سے بھی پہلے موجود تھا۔ غالباً اسی کو ویدوں میں 'رتا' کا نام دیا گیا ہے یعنی دھرم اور موزونیت، یہ دراصل ہم آہنگی کا علم ہے۔

ہندوستانی فکریات کے مطابق زندگی کا انجام موت نہیں ہے اور نہ ہی زندگی جنم کے ساتھ وجود حاصل کرتی ہے۔ زندگی تو نام ہے ایک مسلسل ہم آہنگی کا جو درجہ بدرجہ فروغ پاتی ہے اور کبھی ایک مخصوص نقطہ پر مجتمع ہوتی ہے تو کبھی لامحدود بلندیوں کو جا لیتی ہے اور کبھی یہ عمیق گہرائیوں میں بھی ڈوب جاتی ہے لیکن اس کے باوصف یہ بلاتخفیف وتنسیخ، ازل تا ابد جاری وساری رہتی ہے۔

اسی تصور نے ارتقاء کے عظیم اصول کو جنم دیا تھا۔ یہ تصور قرنوں سے ہندوستانی فلسفہ کی اساس رہا ہے اور زیرِ زمین ندی کی طرح محض ہندوستان ہی نہیں بلکہ متعدد دیگر ممالک اور تمدنوں کی علمی آبیاری کرتا رہا ہے۔ اگرچہ واضح طور پر اس حقیقت کو اکثر تسلیم نہیں کیا گیا ــــ اسی زیریں فکر نے پردۂ اخفا میں ...

ہماری مذہبی فکر تمام تر ویدوں کے اندر موجود ہے تاہم اس کے اعادہ کے لیے وقتاً فوقتاً قادرِ مطلق کے اوتار دنیا میں آئے۔ ان اوتاروں کا ذکر ہماری کتابوں میں موجود ہے لیکن اس بات کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا ہے کہ اوتاروں کا وجود دقیقہ سنج ہندوستانی ذہن کی ایجاد ہو اور اس کا مقصد ایک لاینحل قسم کے سوال کا سہل الفہم اور اطمینان بخش جواب تلاش کر لینا ہو ــــ ارتقاء کا یہ عمل سست رفتار مگر مستقل تھا اور اس کا سفر کیت سے کثرت کی جانب اور نزائیدگی سے تکمیلِ کُل کی طرف تھا۔ اس سفر کا رخ خارج سے داخل کی جانب اور محض نام نہاد واقفیت سے دانشورانہ پختہ کاری کی طرف تھا۔

بھگوان کرشن ہمارے اوتاروں میں مکمل ترین اوتار مانے گئے ہیں، اور ان کا کلام ورسندیش گیتا (جو شریمد بھاگوت ہی کا حصہ ہے) کی شکل میں موجود ہے بھاگوت ہمارے اٹھارہ پرانوں میں سب سے اہم مانی جاتی ہے اس میں کل اٹھارہ ہزار اشلوک ہیں اور عام عقیدہ ہے کہ ہندو دھرم کی موجودہ فکر وعقائد کا نوے فیصد حصہ اسی مقدس کتاب سے اخذ کردہ ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ہمارے اساطیر، تاریخ، اخلاق ومذہبی ضابطے حتی کہ زمان ومکان کے تصورات کے علاوہ ہمارے سارے فلسفے اسی خزانے سے ہی مستعار ہیں اور یہ خزانہ بھگوان کرشن اور ارجن کے مابین ہوئے مکالمات کے طفیل ہم تک پہنچا ہے۔

بھاگوت گیتا کا تاریخی حصہ وقت کے کسی تسلسل کا پابند نہیں ہے بلکہ گفتگو کی شکل میں کبھی پس منظر اور کبھی پیش منظری تکنیک کی مدد سے سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس میں ۱۲ کھنڈ (باب) ہیں اور ہر باب میں متعدد ادھیائے (ذیلی باب) ہیں۔ دسواں باب سب سے طویل ہے اس میں ۹۹ ادھیائے ہیں۔ اس باب میں براہِ راست بھگوان کرشن کی داستانِ حیات بیان کی گئی ...

ویدوں اور دیگر پرانوں کے مقابلے میں گیتا، رامائن اور اپنشد زیادہ مقبول ہیں اور ان کا مطالعہ بھی عام ہے۔ تاہم اول الذکر کا مرتبہ بہت بلند ہے اور انہیں ہماری روایات واقدار اور ہمارے تمدن وفلسفہ کے منبع وماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے باوجود ان صحائف کے سلسلے میں عام دلچسپی کے فقدان کی وجہ ان کی طوالت، ضخامت اور ان میں مندرجہ واقعات کی کثرت ہے جس میں اوسط درجہ کا ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک عام ہندو کے لیے مذہبی علم اور [illegible] کرنے کے لیے گیتا، رامائن اور مہابھارت جیسے خزینے ہیں جو ہندوؤں کی دو عظیم المرتبت ہستیوں رام اور کرشن کے کارناموں کے بیان سے بھرے پڑے ہیں۔

بھگوان رام کو مریادا پرشوتم کہا جاتا ہے [illegible] وہ ہستی جو (غیبی طاقتوں کے باوجود) اپنے عہد کے نظام کی حدود کے اندر رہتی ہے۔ دوسری جانب بھگوان کرشن سولہ کلاؤں کے اوتار ہیں، ان کے کارنامے اور ان کی تعلیمات انسانی سطح سے کہیں بلند اور آگے ہیں [illegible] بھگوان' ہیں۔ ان کے عہدِ حیات میں ہی ان کی پرستش ہوا کرتی تھی۔

اگر کل نہیں تو کم سے کم ہمارے فلسفۂ حیات ومکتبِ فکر کا خاصا بڑا اور بنیادی حصہ تو بھگوان کرشن ہی کا رہینِ منت ہے۔ وہ ایک کمسن گوالے کے روپ میں ہوں، راجکمار ہوں یا راجہ، بہ حیثیت ومنصب اپنے ہم عصروں سے کہیں قدآور نظر آتے ہیں۔ بھگوان کرشن انسانوں کی طرح رہتے تھے، انسانوں کی طرح ہی زندگی گذارتے تھے لیکن ان کا طریقِ عمل کہیں بہتر اور [illegible] وہ اپنے عہد کے 'بھگوان' تو تھے ہی، مگر آنے والے زمانے کے سارے بھگوانوں سے کہیں زیادہ ہردلعزیز تھے [illegible] کی قدآور اور عظیم ہستی (ویراٹ سروپ) کو صرف ان کی ماں یشودھا اور ارجن نے ہی دیکھا تھا (اور [illegible] کر انہماک سے بت بن گئے تھے) اسی روپ نے انہیں [illegible]



گیتا میں بھگوان کرشن نے ارجن کے سامنے زندگی اور کائنات کے حقائق آشکار کیے ہیں یہ سارا کلام موجود ہے مگر ہم ذہنی اعتبار سے بونے لوگ اس کی اہمیت آج تک سمجھ نہیں سکے ہیں

بھگوان نے ارجن سے کہا:

" ایسا کوئی زمانہ نہیں جس میں میں نہیں تھا اور ایسا کوئی عہد بھی نہیں ہو گا جس میں تم اور یہ راجے مہاراجے نہ ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا کہ ہم سب نہ رہیں

अशोच्यानन्वशोचस्त्वं प्रज्ञावादांश्च भाषसे ।
गतासूनगतासूंश्च नानुशोचन्ति पण्डिताः ॥११॥

न त्वेवाहं जातु नासं न त्वं नेमे जनाधिपाः ।
न चैव न भविष्यामः सर्वे वयमतः परम् ॥१२॥

نام روپ کے اصول کے تحت دنیا کو کچھ بنیادی اشیا سے تشکیل شدہ قرار دیا گیا ہے یہ اصول مزید وضاحت کرتا ہے کہ انسان اور بھگوان کے بیچ صرف نام اور شکل کا فرق ہے یعنی 'نام روپ' ہے۔ زندگی وسیع، باقی اور ترقی کرتی رہتی ہے اور ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے

ہندوستانی فلسفہ کے یہ بنیادی خیالات دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں بھی نظر آتے ہیں، مثلاً قدیم مصر، پیرو، میکسیکو، جاوا، کمبوڈیا، برما اور فلپائن کی تہذیبیں قابل ذکر ہیں۔ اسی قسم کے تصورات ہمیں زرتشتی عقائد میں ملتے ہیں۔ سورج کے قدیم مندر میں ایک ایسی عبارت ملی ہے جس میں درج ہے انسان اور خدا در اصل ایک ہیں اور فرق صرف نام اور شکل کا ہے - بنیادی طور پر مصری خیال ہے یا ہندوستانی کسی مقدس کتاب سے اخذ شدہ ہے۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، مماثلت یقینی ہے اور بھی مثالیں ہیں - موہن جو دڑو اور ہڑپہ کی کھدائی کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ دور قدیم میں بھی تہذیب و تمدن کی ترسیل کا چلن تھا میکسیکو میں پائے جانے والے قدیم مندروں کا طرز تعمیر جنوبی ہند میں بنے مندروں سے ملتا جلتا ہے اسی طرح پیرو کی تاریخ گواہ ہے کہ وہاں کے شاہی خاندانوں میں سے ایک خاندان آیر کہلاتا تھا اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جنوبی ہند میں بھی آیر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح جاوا اور مشرق بعید کے چند دیگر مقامات پر وہاں کے لوگوں کے نام ہندو ناموں سے ملتے جلتے ہیں اور یہ نام ان کے اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی برقرار رہے ہیں — ارجن نام تو برما سے فلپائن تک آج بھی عام ہے۔

اگرچہ اسلام وحدت کی تعلیم دیتا ہے اور ہندو مذہب میں کئی کئی بھگوانوں کی گنجائش ہے، لیکن صوفی فکریات تقریباً بھاگوت فلسفہ کے متوازی ہی چلتی نظر آتی ہے۔ صوفیا وصال کے قائل ہیں جس کا مطلب ہے خدا کی ذات میں مدغم ہو جانا۔

اگرچہ دنیا کے ماہرین مذاہب اور عالم اس بات کو کھل کر تسلیم نہیں کرتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بھاگوت کا اثر بہت گہرا اور آفاقی نوعیت کا ہے۔ جب لوگ اپنے اپنے ملکوں کی حدود سے باہر نکلے سفر کیا اور دوسری قوموں کے ساتھ گھلے ملے تو ہندوستان اور دوسرے ممالک کے مابین فکر و فلسفہ کا تبادلہ ہوا۔

آج کے دور میں بھی یونیسکو اور دیگر بین اقوامی اداروں کی نگرانی میں ہوئے مطالعات سے بھی یہی ثابت ہوا ہے کہ روایتی فلسفیانہ تصورات یعنی تمام تہذیبوں اور فنون و ادب کی اساس تقریباً ایک جیسی ہی ہے — اور ہندو، یونانی، زرتشتی، ایرانی، چینی، مصری و اسلامی تہذیبوں میں متعدد ایسے تصورات ہیں جو اس امر کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں اور چونکہ ہماری تہذیب قدیم ترین ہے اس لیے ہمارا یہ دعویٰ حق بجانب ہے کہ عالمی تہذیب و تمدن پر سب سے ٹھوس اور گہرا اثر ہمارا ہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اب کائنات کے مزید ارتقا پر اثر انداز نہ ہوں اور اپنے روایتی کردار کو مؤثر طور پر ادا نہ کریں۔

ارتقا ایک عمل مسلسل ہے بھاگوت کے مطابق پہلے اوتار متسیہ تھے، جن کے عہد میں مچھلیاں ہی زندگی کا اولین اور واحد ثبوت تھیں۔ اس کے بعد رینگنے والے اور پھر تیرنے والے اور پھر نیم انسانی وجود والے بونے انسان اور آخرکار حضرت انسان خود وجود میں آئے، اور پھر انسان اس قابل ہوا کہ اپنے آپ کو قدرتی عناصر کی گرفت سے آزاد کرا کے اپنے منشا کے مطابق زندگی گذار سکے۔ پھر انسان نے اپنے گرد و پیش کے بارے میں فکر و تردد شروع کیا اور اس طرح نتائج برآمد کر کے وہ تمام اشیا کی گہرائی تک پہنچ سکا اس پورے نظام کو سمجھ سکا اور بالآخر سچائی تک اس کی رسائی ممکن ہوئی۔ ایک بار جب اس پر اپنی آفرینش کا راز منکشف ہو گیا وہ خود خالق بن گیا اور اس نے کہا — "اہم برہم" — (میں خود خدا ہوں)

بھاگوت کو بہت سے لوگوں نے پڑھا ہے، اس کے بارے میں وعظ بھی دیے ہیں۔ لیکن ہمارے عہد میں اگر کسی شخص نے اس کو صحیح طور پر سمجھا اور اس کی دانش کو گرد و پیش کی دنیا میں عملی طور پر استعمال کرنے کا خواب دیکھا — تو وہ مہاتما گاندھی ہی تھے۔ گاندھی جی باعمل انسان تھے۔ ہم ان کا احترام تو بہت کرتے ہیں، ان کے خیالات کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ان کی تقلید ہم نہیں

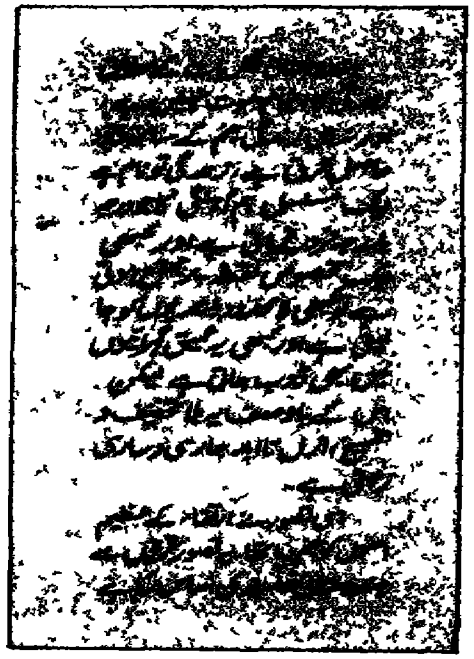
کرلیتے۔ ہم نے غیروں کی غلامی کا لبادہ اتارنے کے لیے ان کی خدمات حاصل کرلیں، مگر جب آزادی مل گئی تو ہم نے ان کے مشوروں کو مسترد کر دیا۔

آج گاندھی کے قائم کردہ اعلیٰ وارفع اخلاقی تصورات ہمارے مقدس آئین میں درج ہیں، لیکن ہم حسب ضرورت و خواہش اس آئین میں تبدیلیاں کرتے رہے ہیں، اس کا نتیجہ کیا ملا ہے؟ ہمارے ہر عمل کا ردعمل سامنے آیا ہے اور ہمارے مسائل و مصائب میں اضافہ ہوا ہے، نظر کا فریب بڑھا ہی ہے۔ ہم نے تیزتر نتائج کے لیے کوشش کی، مگر ہمیں سرے سے کوئی نتیجہ حاصل ہی نہیں ہوا۔ ہم آج آزادیٔ وطن سے پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ خراب حال میں ہیں اور جب ہم اپنے گرد و پیش کی ہی اصلاح نہیں کر سکتے تو ہم بھاگوت کے درس کو نئے عالمی نظام پر اثرانداز کرنے کا فریضہ کس طرح انجام دے سکتے ہیں؟ کیا ہم نے غیر ملکی جبر و استبداد کے خلاف جنگ اسی لیے لڑی تھی کہ ہمارے چنے ہوئے نمائندے ہم پر اس برے انداز سے حکومت کریں۔ کیا اس لڑائی کا مقصد محض کچھ مادی فائدے حاصل کرنا تھا اور وہ بھی صرف چند لوگوں کے لیے۔ کیا اسی لیے ہم آزادی کی جنگ میں کود پڑے تھے۔ کیا آزادی کا مطلب صرف زیادہ کارخانے، سیمنٹ کی فلک بوس عمارتوں کے جھنڈ اور جنتا جناردن کی دولت کا نئے خداؤں کے چہیتوں کی جیب میں ٹھونسنا ہی تھا۔ آج ہمارے فلسفی کہاں گئے —— ہمارے فنکار، ہمارے دانشور اور سائنس دان کہاں گئے؟ ہمارے سب سے اعلیٰ شاعر نے (جی ہاں وہ شاعر ہی تھا) وزیراعظم بننا پسند کیا ہمارے ممتاز ترین فلسفی نے خود کو راشٹرپتی بھون میں قید کرنا گوارا کیا۔ ہمارے بھٹناگر، بھابھا اور میگھ ناد ساہا اپنی اپنی تجربہ گاہیں چھوڑ کر عہدوں اور منصبوں کا لطف اٹھانے کے لیے دہلی آ گئے۔

مجھے تو شک ہوتا ہے کہ بڑے تجارتی گھرانوں نے ہماری جدوجہد آزادی کی حمایت محض حب الوطنی کے جذبے سے نہیں بلکہ مادی مفادات کے لیے اپنی دوراندیشی کے تحت ہی کی تھی۔ ہمارے عہد کے سب سے فعال فلسفی مہاتما گاندھی بھی ان کاروباری دیوزادوں کے ہاتھوں فریب کھا گئے —— آزادی کے بعد یہ طبقہ ہماری قومی زندگی میں سب سے طاقتور گروہ بن کر ابھرا ہے اور انھوں نے انگریزوں سے بڑھ کر غریبوں کا استحصال کیا ہے۔

مذہب ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ امید کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں —— ہاں ہمیں امید کرتے رہنا چاہیے، خواہ امید برائے امید ہی کیوں نہ ہو —— ہمیں امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے لیکن ہمیں اپنے اچھے کاموں کے پھل کی توقع ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔

اب ہماری نئی امید کی علامت ہمارے نوجوان وزیراعظم ہیں، آج کے ہندوستان کی سب سے پاک صاف ہستی —— وہ اپنے ملک اور اپنے عوام کو اچھی طرح سمجھتے



ہیں اور ان کی نظر ان تمام عوامل پر بھی ہے جو دنیا کے موجودہ مشکلات کا سبب ہیں

ہمارے وزیراعظم کو اس امر کا احساس ہے کہ پوری دنیا ایک خاندان کی طرح ہے اور اسے متحد رکھنا ضروری ہے، انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ اپنے سفر کے دوران ہم نے کہیں غلطی کی ہے اور اپنے مقصد سے ہٹ گئے ہیں۔ ہم من حیث القوم پھوٹ کا شکار رہے ہیں، ہم نے خود اپنے ہی لوگوں کے خلاف تعصب برتا ہے ہمارے وزیراعظم اس صورت حال کی اصلاح کے لیے حتی الامکان سعی کر رہے ہیں۔

اقوام متحدہ نے ۲۴ راکتوبر ۱۹۴۸ء کو انسانی حقوق کا اعلانیہ جاری کیا تھا۔ یہ ایک بہترین عمدہ ترین اعلان ہے جو انسان کے ذہن میں آسکتا تھا۔ پوری دنیا نے اس اعلانیہ پر اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار کیا تھا لیکن کیا ایک بھی ملک اس اعلانیہ پر پوری طرح عمل درآمد کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے؟ نہیں —— آج لنکن اور کینیڈی کے بعد بھی سفید فام اور سیاہ فام کا مسئلہ باقی ہے۔ یہ صرف مسئلہ ہی نہیں بلکہ یہ خون کا سرطان ہے اور جنوبی افریقہ خصوصاً اس کا شکار ہے

غیر منصفانہ عالمی نظام کے خلاف ہمارے وزیراعظم راجیو گاندھی کی مہم نے آج سفید فام دنیا کے احساس کو بیدار کر دیا ہے لیکن آج بھی سلامتی کونسل کے رکن ممالک مثلاً انگلستان و امریکہ کے فیصلوں پر مادی مفادات اثرانداز ہوتے ہیں —— اور اس سرطان کے خلاف کسی بھی فیصلے کو وہ جب چاہیں ویٹو کر سکتے ہیں۔ تاہم ناوابستہ ممالک کی امیدوں کے اس سربراہ کی طرف سے جدوجہد جاری ہے اور اس بہادر انسان کو پوری امید ہے کہ اس موذی مرض کا علاج بہت جلد ہو جائے گا۔

ہمارے سابقہ وزیراعظموں کی میراث ہی ہمارے موجودہ وزیراعظم کے حصے میں آئی ہے ہندوستان کی یہ بیش بہا میراث ہے، بے خوفی کا تصور اور ارتقار، تسلسل اور دنیائے واحد کا مقصد عظیم۔ یہی میراث ہمارے قابل وزیراعظم کو طاقت بخشتی ہے اور وہ پورے وقار و پورے یقین کے ساتھ دنیا کو سچائی کا سبق اور خوشی آئند مستقبل کی نوید دے سکتے ہیں۔

ہمارے علماء، ہمارے فنکار فلسفی اور ہمارے صحافی جو اپنے وطن عزیز ہندوستان جنت نشان کو بخوبی جانتے ہیں، اس کی ماہیت، اس کے اتحاد عمل سے واقف ہیں اور ساتھ ہی نظام قدرت سے بخوبی آشنا ہیں، اس کی ہم آہنگی کے اسباب کا علم بھی رکھتے ہیں —— ان سب کو بیدار ہونا چاہیے اور پوری دنیا کو اپنے نوجوان قائد کے کارناموں، خدمات، مقاصد اور خیالات و نظریات سے آگاہ کرنا چاہیے اور اس کی پوری حمایت کرنی چاہیے۔

آفاقی تمدن کا تصور عالمی نظام کے لیے بڑا بامعنی اور مفید ہے اگر اس کا نفاذ ہو سکے تو آج کی دنیا کے بے شمار مسائل حل ہو سکتے ہیں آج اگر ہمیں اس مسابقت و مقابلہ آرائی کے دور میں جینا ہے تو ہم سائنس اور ٹکنالوجی کو نظرانداز نہیں کر سکتے لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی خیال رکھنا ہوگا کہ ہم اپنی تہذیب و تمدن کی بنیادی خصوصیات کو فراموش نہ کر دیں۔ آج کی بیمار دنیا میں ان کی بڑی اہمیت و افادیت ہے۔

بھگوان نے کہا تھا:

"تمہارا فرض صرف عمل کرنا ہے، پھل کی پرواہ نہ کرو —— نہ ہی پھل کو اپنا مقصد بناؤ اور نہ ہی اپنے آپ کو ناکارگی کا شکار ہونے دو۔"

कर्मण्येवाधिकारस्ते मा फलेषु कदाचन ।
मा कर्मफलहेतुर्भूर्मा ते सङ्गोऽस्त्वकर्मणि २४७

بلراج ورما

# پنرملن : موسیقی اور انسانی جذبات

ہم اکثر ان امکانات کو موسیقی سے وابستہ کرتے ہیں جن کی بدولت انسانوں کے درمیان امن و اماں اور قریب آنے کی صورت حال پیدا ہوتی ہے یا جو محض افراد تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ بڑے بڑے گروہوں اور قوموں کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ کچھ اداروں نے موسیقی کی اس خوبی کا فن تعلیم میں بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ موسیقی میں نہ صرف مثبت خوبیاں ہوتی ہیں بلکہ کئی منفی اور انتہائی خطرناک اور تباہ کن خاصیتیں بھی اس سے وابستہ ہیں۔ ان خاصیتوں میں قابل ذکر ہیں۔ جنگ کے دوران جنگی صلاحیت کو جوش و خروش دلانا یا افراد اور حالات کا ایسی خصوصی تخلیقات کے ذریعے سے مذاق اڑانا جنھیں "پھبتی کے گیت" کہا جاتا ہے اور یہ گیت ایسے ہیں جنھیں افراد اور گروہوں کی پھبتی اڑانے کے لیے تو کیا، ان کی ہتک کرنے کے لیے بھی گایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس میں شک نہیں کہ موسیقی عوام کو سماجی سطح پر ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے جس کا سب سے نمایاں ثبوت، ہندوؤں کے مندروں، عیسائیوں کے گرجاگھروں اور سکھوں کے گوردواروں جیسے معبدوں میں اجتماعی نوعیت کے گانے بجانے میں ملتا ہے۔

ہندوستان کے مندروں سے وابستہ موسیقی کے فن، سائنس، جمالیات اور سماجیات کا آغاز اکثر Saman chants میں تلاش کیا جاتا ہے جو ویدک کال میں مذہبی تقریبات اور رسومات کا حصہ تھے۔ ڈاکٹر جی۔ ایم۔ تارلیکر نے Saman chants پر اپنی تصنیف میں ان نغموں سے چند بہت ہی مثبت عوامل کو منسوب کیا ہے، جیسے انسان اور عناصر کے باہمی اتحاد کی ضرورت کیوں کہ یہی عناصر ویدک کال میں دیوی، دیوتاؤں کی طرح پوجے جاتے تھے۔ کوئی ڈیڑھ سو سال کے دوران اس موضوع پر لکھے گئے مامحققین کے [illegible] کر تھے سے تو صرف مختلف موسیقیائی اور سوماجی زاویوں پر مبنی ہیں بلکہ تقریباً تمام۔ بڑے ادبی اور سماجی پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ عبرانی، افریقی، مصری، نارویجی، جاپانی اور بالی جیسے دوسرے تمدنوں کے نغمے بھی اسی طرح معبودوں کو خوش کرنے کے لیے تیار کیے اور گائے جاتے تھے۔ انھیں کی بدولت ان تہذیبوں کے مذہبی تفکر، فلسفہ اور ثقافت سے وابستہ اقدار کی ماہیت کا ہم پر انکشاف ہوتا ہے۔

کسی ملک میں وہاں کے فنون کا جو وقار ہوتا ہے اسی سے درحقیقت اس کی ثقافت اور تہذیب کی نشاندہی ہوتی ہے۔ انگلینڈ کے ممتاز سنگیت کار سر آرتھر سلیون نے ایک بار فن کو ایک ایسی دولت مشترکہ کہا تھا جس میں فنون کی تمام مملکتوں کا یکساں مرتبہ ہوتا ہے۔ سر آرتھر کے الفاظ میں :۔

"میرے خیال میں انسانی جذبات پر موسیقی کا اثر فوری، زیادہ قوی اور آفاقی ہوتا ہے۔"

موسیقی کی طاقت اور اثر کی وضاحت کے لیے بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ اگرچہ بہت سے لوگ اسے ایک گھریلو شغل یا زیادہ سے زیادہ اسے کانوں کے لیے مسرت افزا تفریح سمجھتے ہیں، تاہم درحقیقت یہ اس سے کہیں زیادہ گہری چیز ہے۔ اس کی وسیع، فوری داد و تحسین اور مقبولیت، اکثر اس کی زیادہ سنجیدہ اور اہم خوبیوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ امن ہو کہ جنگ ہو موسیقی ایک متحرک قوت رہتی ہے۔ کون بھول سکتا ہے بنکم چندر کے "بندے ماترم" اور بسمل کے "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" کو جن سے قبل از آزادی دور میں ہمارے محبان وطن کے دل و دماغ کھول اٹھتے تھے، یا کون بھول سکتا ہے اقبال کے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" یا ٹیگور کے "جن گن من" کو جن سے آج ہمارے دلوں میں حب الوطنی کا جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ گیت ہمارا ورثہ ہیں۔ جہاں پہلے دو نغمے ہماری تحریک آزادی میں ہمت و حوصلہ افزائی کے آلات کار رہتے وہاں آخری دو نغمے ہمارے لیے ایک آزاد جمہوریہ کے شہریوں کی حیثیت سے مایۂ ناز اور تحریک کے سرچشمے ہیں۔ موسیقی میں وہ مملکت ہے جو الفاظ کے طلسماتی دنیا میں بھی نہیں پائی جاتی۔

ہم نے ملہار اور دیپک وغیرہ جیسے راگوں کے بارے میں سن رکھا ہے جن سے بارش ہو جاتی تھی یا دیپک جل اٹھتے تھے۔ ہم نے ان تجربات کے بارے میں بھی سن رکھا ہے جو جنوبی ہندوستان کے جن میں کرناٹک کی سازوں اور گلے کی موسیقی پودوں اور فصلوں کے تیزی سے نشو و نما پانے میں معاون ثابت ہوئی۔ موسیقی پر رسالوں اور تحریروں اکثر ان خوبیوں کو اس کے ساتھ منسوب کیا ہے روحانی یکسوئی سے مقابلہ کرتی ہیں۔ ہم اپنی پوجا موسیقی کے ذریعہ کرتے ہیں اور آج بھی ہم دیوتاؤں کی تعریف اور تسلی موسیقی ہی سے کرتے ہیں۔ ہم خوشی کے دوران بھی گاتے ہیں اور اداسی کے عالم میں بھی۔ ایسے بھی گیت ہیں جو ہم شادی جیسے خوشی کے مواقع پر گاتے ہیں یا ایسے گیت ہیں جو ہم اپنے پیاروں کے مرجانے پر گاتے ہیں۔ ہم جنگ کرتے وقت بھی گاتے ہیں اور جنگ جیت لیتے ہیں تو بھی گاتے ہیں۔ فوجوں کی ہر تقریب کے لیے بھی ہمارے پاس موسیقی کی دھنیں بجا رہی ہیں۔

میں نے ایک پیاری مختصر سی کہانی۔ قدر طویل تمہید کیوں پیش کی ہے؟ یہ کہانی ۱۹۵۶ء میں، نئی دہلی میں منعقد ہوئی یونیسکو کانفرنس کے دوران یوگوسلاویہ کے ایک باشندے نے سنائی تھی۔ مجھے اس کہانی کی سچائی کا پتہ نہیں کیوں کہ میں نے اسے کسی تاریخی کتاب میں نہیں دیکھا۔ [illegible]

ور مجھے موسیقی کی ابھوتی قوت کا ذاتی طور سے تجربہ تھا۔ لیجئے یہ کہانی :-

پرانے زمانے میں جب موسیقی ایک شاہ کی منزلت پر تھی اور جب شوپن اور اس موسیقار سا تھی۔ یورپی سماج کے ممتاز طبقے ملران تھے تو اس وقت ڈنمارک میں ایک کیتھولک جوڑا رہتا تھا۔ ان کے نام اہم نہیں لیکن ان کی کہانی اہم ہے۔ انھوں نے محبت کی بنا پر ہی شادی کی تھی، اور وہ قریباً دس سال تک بڑی محبت کے ساتھ مل کر رہے۔ چوں کہ وہ دونوں جاگیردارانہ خاندانوں سے تھے، جہاں کام کرنے کی ممانعت تھی، اس لیے ہمیشہ ایک دوسرے کی محبت میں مگن رہتے تھے۔

تب اچانک کہیں کوئی واقعہ ہو گیا اور آپس میں محبت کرنے والے ایک دوسرے سے الگ ہو کر گویا دشمن بن گئے۔ ان کا دس سال کا "ہنی مون" ایک تلخ سی یاد بن کے رہ گیا۔ لوگ نہیں جانتے کہ وہ پیار کیوں کرتے ہیں اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ نفرت کیوں کرتے ہیں۔ محبت اور نفرت کا کوئی معقول تجزیہ نہ کبھی کیا گیا ہے اور نہ کبھی ہو گا۔ یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دس سال پیشتر ان میں محبت ہو گئی تھی، اور محبت کا یہ برعکس یعنی نفرت بھی ان میں اسی طرح ہو گئی۔ جو حد سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ حد سے زیادہ نفرت بھی کرنے لگتے ہیں۔ نہ اِس کی کوئی معقول وضاحت ہے نہ اُس کی، کیوں کہ محبت اور نفرت دونوں میں عقلیت کا دخل ممکن نہیں۔ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ چوں کہ دونوں کے پاس دنیا کی ہر شے کثرت سے موجود تھی لہٰذا وہ ایک دوسرے کے سہارے پر نہیں تھے۔

چونکہ دونوں ابھی جوان تھے اور راہبانہ زندگی ان کے لیے ممکن نہیں تھی اس لیے دوستوں اور بزرگوں نے انھیں طلاق کا مشورہ دیا۔ اس عہد کے رومن کیتھولک خاص کر اس دائرے کے ممتاز لوگ، جو اکثر خود روم کے پوپ کے ہاتھوں ہی رشتۂ ازدواج میں بندھے جاتے تھے، اپنے رشتۂ ازدواج کو اس عظیم شخصیت کی اجازت کے بغیر توڑ نہیں سکتے تھے۔

دونوں اپنی خاندانی گاڑیوں میں، قانونی علاحدگی حاصل کرنے کے لیے روم کی جانب چل نکلے۔ وہ "ویٹیکان سٹی" میں پہونچے اور مقامی دوستوں کے یہاں قیام کیا۔ انھیں بڑے پروہت نے سماعت دی۔ چونکہ وہ دوستانہ ترغیب اور مذہبی پند و نصائح کے ذریعے انھیں پھر سے ملانے میں ناکام رہے اس لیے انھوں نے انھیں ایک اور تاریخ پر آنے کو کہا اور بتایا کہ اگر وہ اس تاریخ تک ایک دوسرے کے قریب نہ آسکے تو وہ انھیں طلاق کی منظوری دے دیں گے۔

دن بڑی تیزی سے گزر گئے۔ مقررہ دن سے ایک دن پیشتر، ان کے اپنے اپنے خاندانی دوست انھیں فریڈرک شوپن کا موسیقی پروگرام سننے کے لیے لے گئے۔ نہ اس آدمی اور نہ اس عورت کو یہ ذرا بھی خیال آیا کہ دوسرا بھی وہاں آیا ہو گا۔ جب سامعین بیٹھ گئے اور اس عظیم موسیقار کی اسٹیج پر آمد کا اظہار کرنے کے لیے روشنیاں کردی گئیں تو انھوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھا۔



فریڈرک شوپن

وہ عورت اپنے احباب سے کہنے لگی۔

"مجھے شوپن سے کہا لینا دینا ہے میں ابھی یہاں سے جانا چاہتی ہوں میں اپنی سانسیں اس بد اخلاق کی سانسوں میں ملا گوارا نہیں کر سکتی۔"

وہ آدمی بول اٹھا

"یہ کمرہ میرے لیے دوزخ کی آگ بن گیا ہے کیونکہ وہ کم بخت بھی اسی میں بیٹھا ہے۔"

وہ اس ہال سے نکل جانے کو تیار ہو گیا۔ لیکن وہ دونوں ہی وہاں سے باہر نہ جا سکے کیوں کہ "تو یہ ہال سب کی ایک شرط یہ بھی ہوا کرتی تھی کہ جب وہ اسٹیج پر آ جائے تو ہال کے تمام دروازے مقفل کر دیے جائیں لہذا ایسا ہی ہوا اب نہ کوئی باہر جا سکتا تھا نہ اندر آ سکتا تھا۔

باس اسٹول پر بیٹھ گیا۔ تمام روشنیاں گل کر دی گئیں صرف پیانو کے اوپر رکھی ہوئی بتی جل رہی تھی تاکہ وہ عظیم موسیقار پیانو بجاتا ہوا دکھائی دیتا رہے۔

موسیقی شروع ہو گئی ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ لوگوں نے گویا اپنی سانسیں روک لیں وہ کسی لے سے بھی بے بہرہ نہیں رہنا چاہتے تھے۔ وہ ماہر موسیقار پیانو بجانے میں محو ہو گیا۔ ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی جوان اور ادھیڑ جوڑے، بالکل نہ جانتے ہوئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، اپنے ماضی میں کھوئے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ دبا رہے تھے وہ مسکرائے بھی نہیں مسکراہٹ کوئی قہقہہ نہیں ہوتی، لیکن انھیں ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے بھی شاید کوئی ہلکی سی آواز نکل جائے اور کوئی آواز بھی

تک آ چکا تھا۔ انھوں نے نہ ایک دوسرے کو پہلے دیکھا نہ ہی کسی اور نے۔ اب وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے تپاک کے ساتھ بغل گیر تھے۔ آدمی ابھار رہا تھا، عورت ابھار رہی تھی۔ آدمی اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے مہر بند کر رہا تھا گویا اسے بھی اور خود کو بھی ڈھارس دے رہا ہو۔

پیٹریارک آف روم کا معزز سربراہ، معتمد خداوندی کی طرح جانے کہاں سے نمودار ہو گیا ان محبت کے پتلوں کو آشیرواد دینے کے لیے "میں ایک بار پھر آپ کو ایک دوسرے سے ملا رہا ہوں اور دعا ہے (کہ آج کے بعد تم دونوں) ایسے ہی بنے رہو جب تک ........" اس نے جملہ مکمل نہیں کیا زندگی اپنے محور پر لوٹ آئی تھی۔ شوپن





موسیقی کی کارروائی کا آغاز سامعین کے کھڑے ہو کر تعظیم بجا لانے سے ہوا کئی منٹوں تک تالیاں بجتی رہیں آخر میں وہ عظیم موسیقار بولا "آج میں ایک خاص الخاص نغمہ پیش کر رہا ہوں یہ ایک سمفنی ہے، محبت کا سمفنی جو محبت کرتے ہیں ان کے لیے یہ مسرت کا باعث ہوگا۔ جنھوں نے محبت کی ہے مگر اب اسے کھو چکے ہیں انھیں اپنے اچھے دنوں کا پھر سے احساس ہوگا جس کی بدولت وہ انھیں دنوں کی فضا میں چلے جائیں کہ جب وہ مل کر رہتے تھے۔ چونکہ ہم سب زندگی سے محبت کرتے ہیں، لہذا میں آج کی پیش کش کو "دنیا کے عاشقوں اور محبوباؤں کے نام منسوب کرتا ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ وہ ماہر موسیقار پیانو کے

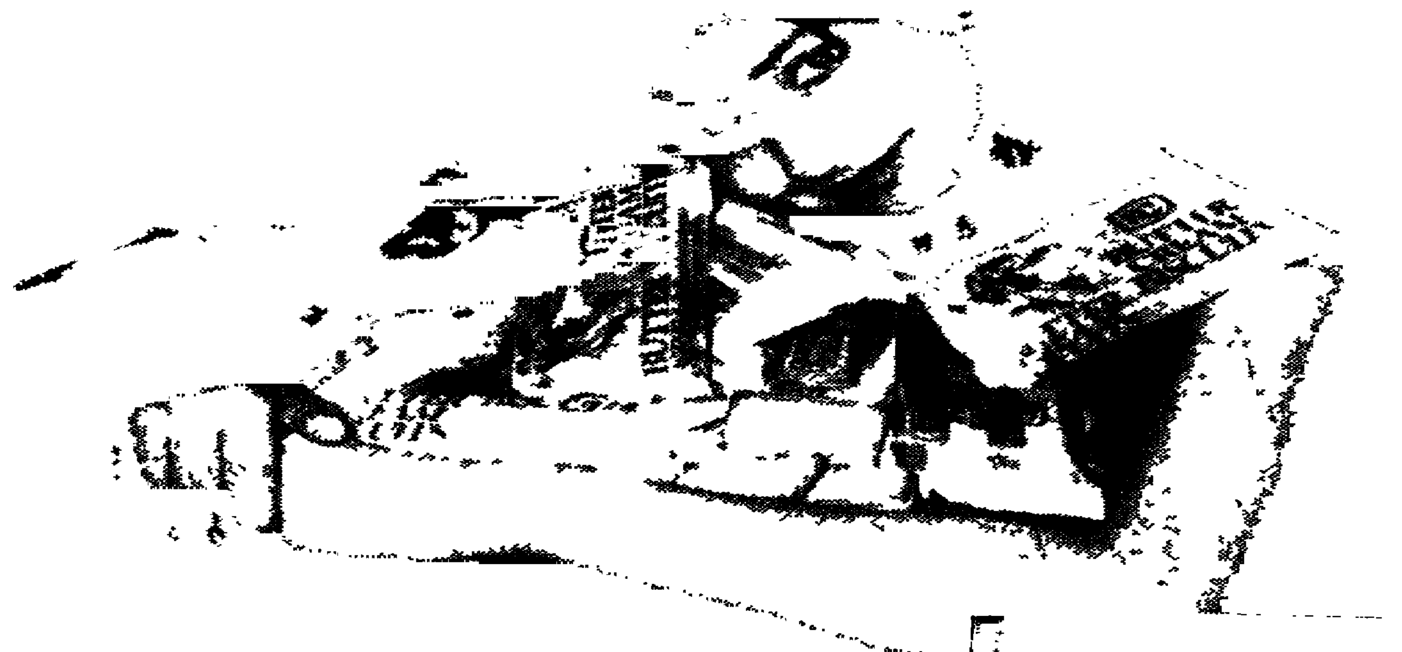
اس وقت ان آوازوں سے زیادہ قابل قدر اور متبرک نہیں تھی۔ جو پیانو سے نکل رہی تھیں۔ موسیقار کی لمبی، پتلی انگلیاں پیانو کی کنجیوں پر رقص کناں تھیں جیسے اپسرائیں ناچ رہی ہوں کسی نے فرشتوں کو ساز بجاتے نہیں دیکھا ہوگا لیکن اب وہ کسی قدر جان گئے تھے کہ فرشتے بھی اس سے بہتر کیا کر سکتے ہیں!

وہ اپنے سمفنی کے آخری الاپ کے قریب ہو چلا تھا کہ ایک ذرا سی چیخ نے فضا کا سارا طلسم توڑ دیا۔ اس نے پیانو بجانا بند کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ روشنیاں جگا دی گئیں اب کسی کو بھی دیکھنے میں دقت نہ تھی۔

ڈنمارک کا رہنے والا وہ جوڑا، فرش کے وسط

اسٹیج کے وسط آ کھڑا ہوا تھا۔ اس پر بار بار داد تحسین کی بوچھاڑ کی گئی تالیوں کی ایک گونج تھی جو ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ کھڑے کھڑے تعظیم کا سلسلہ کئی منٹوں تک جاری رہا۔ شوپن کی چمکتی آنکھوں سے پگھلے موتی جھڑ رہے تھے۔ اسے اس مقدس سربراہ نے اس جوڑے کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا تھا۔ اسے لگا گویا اسے اپنا انعام مل گیا ہو۔

پیارے قاری! کیا یہ کہانی آپ کو یقین نہیں دلاتی سر آرتھر کے اس قول کا کہ در حقیقت انسانی جذبات پر موسیقی کا ہی سب سے قوی، آفاقی اور فوری اثر ہوتا ہے۔







# خالی کرسی

[illegible]

چھ بجتے ہی روز گارڈن کالونی کے ایک فلیٹ میں ایک سایہ نمودار ہوتا ہے۔ چلنے کا انداز ہمیشہ کی طرح لنگڑانے کا سا ہے۔ پہلے دھیرے دھیرے بالکونی پھلانگتے ہوئے پتلے ریشمی پردے کی ڈوری کھینچی جاتی ہے۔ اس کے بعد جیسے زندگی کا وہ ناٹک پھر سے شروع ہو جاتا ہے جو اس کالونی کے آباد ہونے کے وقت سے کھیلا جا رہا ہے

تین بچوں کی ماں میرا سری نواس راؤ ادھر پردے کی ڈوری کو لوہے کی زنگ آلود ہک کے ساتھ باندھتی ہے ادھر اس کا آدمی صرف بنیان و پائجامہ پہنے باتھ روم سے برآمد ہوتا ہے۔ وہ بڑی نفاست سے دونوں بستر تہہ کرتا ہے۔ پھر انھیں ایک بکس نما پلنگ کے تہہ خانے میں بند کر دیتا ہے۔ اس کے بعد سفید روغنی اسٹیل کے پایوں والے پلنگ کو بھی فولڈ کر کے ایک دروازے کے پیچھے سرکا دیتا ہے۔ اور دیواروں کے ساتھ ساتھ سجائے ہوئے پرانے صوفوں کو گھسیٹ کر فرش پر اس طرح سجا دیتا ہے کہ بالکونی اچانک ایک ڈرائنگ روم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

چونکہ میرا سری نواس راؤ کے بیٹھنے کے لیے مخصوص ہوتی ہے وہاں ایک کرسی بھی لا کر رکھ دی جاتی ہے اور اس کے سامنے ایک تپائی بھی۔ مسز سری نواس راؤ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہی پہلے نیچے جھانکتی ہے۔ ہلال کی شکل میں بنے ہوئے کئی تین منزلہ بلاکوں میں سے صرف ایک میں اس کی گہری دل چسپی ہے۔ سی بلاک کے پندرہ نمبر کے فلیٹ میں جو اسے بیٹھے بیٹھے بھی صاف صاف نظر آ سکتا ہے۔ وہاں بھی ایک بالکونی ہے لیکن اسے ایک کمرے کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس میں میاں بیوی دو ہی پرانی رہتے ہیں۔ دونوں کسی آفس یا فیکٹری میں ملازم ہیں۔ نو بجتے بجتے ایک ہی اسکوٹر پر چل دیتے ہیں اور شام کو چھ بجے تک اسی طرح ساتھ ساتھ لوٹ آتے ہیں۔ اسکوٹر چلانے کی ذمہ داری بیوی نے لے رکھی ہے۔

ان کے دروازے اور کھڑکیاں کھل چکی ہیں اور بالکونی میں وہ کرسی بھی لا کر رکھ دی گئی ہے، جس پر بیٹھ کر وہ ہر صبح ایک آدھ گھنٹہ معمولاً اخبار پڑھنے کا عادی ہے۔ جب سے وہ لوگ اس فلیٹ میں آئے ہیں، اس کا یہی معمول ہے۔ لیکن اچانک اس نے اخبار پڑھنا کم اور اس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنا زیادہ کر دیا ہے۔ تلے اوپر کی کئی بالکونیوں میں سے جھانکنے والے اور بھی لوگ ہیں۔ جو ایک دوسرے کی طرف اس لیے تاکتے رہتے ہیں، کہ آپسی جان پہچان کا ایک طریقہ یہ بھی ہے وہ بھلے ہی ایک دوسرے کے نام نہ جانتے ہوں، ایک دوسرے سے کبھی نہ ملے ہوں لیکن وہ نظروں کے ایسے ہی تصادم کی وجہ سے ایک دوسرے کو جان گئے ہیں اور مطمئن ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے باعزت پڑوسی ہیں۔ لیکن 'سی پندرہ' میں رہنے والے پڑوسی کا رویہ ایک دوسری قسم کی جارحیت کا حامل بن گیا ہے جس سے میرا سری نواس کو سخت صدمہ



پہنچا۔ وہ اپنے فلیٹ کے آس پاس رہنے والے لوگوں اور ان کی بالکونیوں میں رکھے پھولوں، پودوں کے گملے دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے۔ اس لیے کہ زندگی واقعی خوب صورت ہے، دلکش ہے۔ زندہ رہنے کے لیے دل میں ہر دم ایک نئی امنگ پیدا کرتی رہتی ہے وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ اسے بھی اس ماحول کا ایک حصہ سمجھا جائے اور اس کا احترام کیا جائے۔ لیکن اسے یہ بات [illegible] لگتی ہے کہ کوئی اسے اس طرح ٹکٹکی لگا کر گھورا کرے۔ بالکل کھا جانے والے انداز سے۔ اگر قدرت نے انسان کو آنکھوں ہی کے ذریعے سے کھا جانے کی طاقت دے دی ہوتی تو آج دنیا میں ایک بھی خوب صورت شے باقی نہ رہ گئی ہوتی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس کا وجود صحیح و سلامت موجود ہے۔ اگرچہ اس کا دل بے زاری، صدمے اور نفرت سے بھرا ہوا ہے۔

اس نے طے کر لیا ہے کہ اب وہ 'سی پندرہ' کی جانب کبھی بھول کر بھی نہیں دیکھے گی۔ اسی لیے وہ اسے نظرانداز کر کے باقی ہر طرف دیکھتی رہتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد اسے اپنا یہ رویہ بھی بے حد بناوٹی محسوس ہونے لگا ہے۔ جیسے اس نے جان بوجھ کر اپنے مینو میں سے کسی خاص چیز کو خارج کر دیا ہو جس کے بغیر اسے اب سارا کھانا ہی بے مزہ و بے ذائقہ محسوس ہونے لگا ہے۔ زندگی کی غلیظ یا ناپسندیدہ چیزوں کے پاس سے آنکھیں پھیر کر تو نکلا جا سکتا ہے مگر انھیں یکسر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ وہ چیزیں بہر حال اپنی جگہ پر موجود ہیں اور رہیں گی۔ لیکن یہ سب سوچ سوچ کر بھی وہ خود کو مطمئن نہ کر پاتی آخر ایک دن اس کی نفرت کا پیمانہ لبریز ہو گیا، جب اس نے 'سی پندرہ' کو اپنے فلیٹ سے نکل کر اس کی اپنی بالکونی کے بالکل نیچے دیکھ لیا۔ وہ ایک ترکاری بیچنے والے کے ٹھیلے کے پاس کھڑا سودا لے رہا ہے اور سر اٹھا اٹھا کر اسے بھی گھورتا جاتا ہے میرا سری نواس چیخ کر اسے گالی دے بیٹھی، اور پوچھنے لگی ——— "تمھیں میری طرف اس طرح دیکھنے کا کیا ادھیکار ہے؟ بھلے مانش بن کر رہو، نہیں تو میں جوتے چپل سے بات کروں گی۔"

یہ سن کر وہ ہکّا بکّا سا رہ گیا ——— اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا کہ کیا جواب دے۔ ٹھیلے والا اور آس پاس کے کچھ اور لوگ بھی دونوں کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ وہ جلدی جلدی سودا لے کر سر جھکائے ہوئے لوٹ گیا اور میرا مطمئن سی ہو گئی۔ اس نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک ہی تھا یہی کرنا چاہیے تھا اسے۔ اور پھر وہ اگلی صبح کا انتظار کرنے لگی تھی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ اب بھی پہلے کی طرح بالکونی میں کرسی ڈال کر بیٹھتا

ہے کہ نہیں! ہوسکتا ہے اس معاملے میں وہ بڑا ڈھیٹ ہی نکلے۔ یہ سمجھ کر کہ وہ اس کا کیا بگاڑ لے گی۔ یا پھر وہ اپنا دروازہ ہی نہ کھولا کرے۔

لیکن دوسرے دن جب وہ جاگتی ہے اور اپنی بالکونی میں آکر بیٹھ جاتی ہے تو یہ دیکھ کر اسے بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ اس کا دروازہ حسب معمول کھلا ہوا ہے۔ وہاں اس کی کرسی بھی رکھی ہوئی ہے لیکن وہ خود موجود نہیں ہے۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگتی ہے۔ کتنی دیر ہو جاتی ہے وہ برآمد نہیں ہوتا۔ جب نو بجنے کو ہو آتے ہیں تو میرا اس کی بیوی کو تنہا اسکوٹر پر آفس جاتے ہوئے دیکھتی ہے اس روز وہ گھر سے باہر نہیں نکلتا ہے

میرا سری تو اس روز دل ہی دل میں خوش ہو اٹھتی ہے کہ اس نے اپنے ایک نظر باز پڑوسی کو اچھا سبق سکھا دیا ہے۔ اب وہ اپنے معمول کے مطابق پھر سے پورے اطمینان کے ساتھ ہر جانب کا نظارہ کر سکے گی، ہر چیز کا حسب عادت بھرپور جائزہ لے سکے گی ـــــ لوگوں کا، ان کی عادات کا، ان کے لباسوں کا، ان کے مکانوں کے دروازوں، کھڑکیوں، پر لٹکے ہوئے پردوں کا، بالکونیوں میں آر پار بندھے ہوئے تاروں پر سوکھتے ہوئے کپڑوں کا اور پھولوں اور پودوں کا اور چھتوں پر خودرو جھاڑیوں کی مانند ابھرے ہوئے ٹی وی کے بے شمار انٹیناؤں کا۔ پچھلے تین برسوں میں اسی طرح دیکھتے دیکھتے اس نے بہت کچھ سیکھا اور جانا ہے اور یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس ماحول کے بارے میں دوسروں کی نسبت وہ کچھ زیادہ ہی واقفیت رکھتی ہے۔

فلیٹوں کے نیم گول سلسلے کے سامنے جو کافی بڑا تکونیا پارک ہے اس میں اس نے ایک صوبائی منسٹر کو پیڑ لگاؤ مہم میں ایک درخت کا پہلا پودا لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے وہاں کے رہائشیوں کے سامنے مائک پر جو بھاشن دیا تھا وہ بھی اس نے سنا تھا۔ تب سے لوگوں نے خود بھی بے شمار پیڑ پودے لگائے ہیں اور اسی زمین پر نرم نرم مخملی گھاس بھی اگائی ہے جس پر بچے بالے کرکٹ اور فٹ بال کھیلا کرتے ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شام کو بلب جلا کر بیڈمنٹن کھیلتے ہیں اور بوڑھی و ادھیڑ عمر کی عورتیں سردیوں کی گنگنی دھوپ میں اون اور سلائیاں لے کر جا بیٹھتی ہیں اور دنیا جہان کی باتیں کرتی ہیں۔ چاہے سخت ٹھنڈی لہر چل رہی ہو یا بارش ہو رہی ہو۔ اس نے صبح ہوتے ہی دو چار لوگوں کو چھڑیاں یا چھاتے لیے ہوئے پارک کے اندر ہی اندر اتنے چکر لگاتے ہوئے دیکھا ہے جو اس کے اپنے اندازے کے مطابق دو ڈھائی کیلومیٹر کے فاصلے کے برابر ضرور ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب سے اس نے 'بی پندرہ' کو ڈانٹ پلائی ہے اس کے اندر یہ سب دیکھنے کی دلچسپی جیسے ختم ہو گئی ہے۔ اب اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ہے اس نے میرا سے اس کی محبوب ہابی چھین لی ہے وہ ابھی ٹانگوں کی پوری طاقت سے محروم ضرور ہے لیکن اتنی زیادہ بیمار بھی نہیں ہے کہ باہر کی دنیا سے سارا ناطہ ہی توڑ لے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نظروں کا مرکز وہی کرسی بن گئی ہے جو صبح ہوتے ہی بالکونی میں رکھ دی جاتی ہے اور پھر سارا دن ویسی ہی پڑی رہتی ہے۔ اس پر آکر کوئی نہیں بیٹھتا ہے تو بھی اسے ایسا لگتا ہے اس بے جان کاٹھ کے بدن پر دو آنکھیں ابھر آئی ہوں اور اب وہی اسے ٹکٹکی لگا کر دیکھا کرتی ہوں! وہ خود کہاں رہتا ہے یہ اسے معلوم نہیں ہے شاید کہیں باہر چلا گیا ہو! لیکن کھڑکیاں اور دروازے کیوں دن بھر کھلے رہتے ہیں جن پر پڑے ہوئے پردے ہوا میں جھولا کرتے ہیں۔ اس نے کبھی بھولے سے بھی پردہ اٹھا کر نہیں جھانکا۔ اس روز کے واقعے کے بعد وہ اس کا ردعمل تک معلوم نہیں کر پائی۔ لیکن وہ اس کے جاگنے سے بہت پہلے اپنی کرسی بالکونی میں رکھ کر غائب کیوں ہو جاتا ہے اسے چڑانے کے لیے اس نے یہ کیسا انوکھا طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے کہ سامنے نہیں آتا لیکن اپنی موجودگی کا احساس کرائے رکھتا ہے۔ اس سے میرا کے اندر ایک عجیب سا کرب پیدا ہو گیا ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ بے چین رہنے لگی ہے۔ اس سے اس کی ٹانگوں کا درد بھی بڑھ گیا ہے۔ اور اب وہ ذرا ذرا سی بات پر بھی خفگی کا اظہار کرنے لگتی ہے۔ اگر بچے وقت پر تیار ہو کر اسکول جانے کے لیے نہ نکل جائیں، ٹھیک ڈھنگ سے اسکول کی ڈریس نہ پہن سکیں، ناشتے کی میز پر بلاوجہ شور کریں یا اس کا آدمی وقت پر جا کر ڈیری سے دودھ نہ لے آئے یا اس کے لیے بنائی ہوئی چائے میں ذرا سی بھی زیادہ پتی ڈال دے!

آج صبح صبح ایک ایسی نوکرانی کسی کا سفارشی خط لے کر آ گئی جس نے آتے ہی یہ جاننا چاہا ـــــ "آپ لوگن کے واں گیس کا چولہا ہے کہ ناں! آپ کے واں سارے برتن اسٹین لس اسٹیل کے ہی ہیں کہ ناں۔ پیتل کے برتن کی ہم سے رگڑائی ناں ہوت، پہلے سے بتائے دیت ہاں!"۔

"مجھے تیرے جیسی کام چور نواب جادی نہیں چاہیے۔ تو بھی سن لے" اس نے اسے کھڑے کھڑے ہی واپس کر دیا۔ حالاں کہ اس کے گھر میں گیس ہی پر کھانا پکتا ہے اور برتن مانجھنے کے لیے راکھ کے بجائے پاؤڈر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

کچھ ہی لمحوں بعد اس کا آدمی جب تازہ اخبار لیے ہوئے اس کے پاس آتا ہے تو میرا کے غصے کا پارہ آسمان پر پہنچ جاتا ہے وہ اخبار اس کے منھ پر پھینک دیتی ہے ـــــ "پہلے چائے! تم جانتے ہو، صبح اٹھتے ہی میرا سوکھا ہوا حلق کیا مانگتا ہے! چائے۔ سمجھے! اخبار بعد میں۔

وہ چپکے سے کھسک جاتا ہے۔ پھر کچھ ہی منٹوں میں چائے لے کر آ جاتا ہے۔ آج وہ چائے بہت اچھی بنا کر لے آیا ہے۔ دو ہی تین گھونٹ حلق سے اتار کر میرا اپنے اندر ایک تبدیلی سی محسوس کرنے لگی ہے۔ اسے افسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اس قدر تلخی سے کیوں پیش آئی۔ وہ تو اس کی اتنی خدمت کرتا ہے کہ اس کی بڑی سے بڑی کوتاہی بھی معاف کی جا سکتی ہے۔ وہ اس سے معافی مانگ لے گی۔ اسے معافی ضرور مانگنی چاہیے۔ یہ فیصلہ کرکے وہ بالکونی کے باہر ایک عجیب سے اطمینان سے دیکھنے لگی ہے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی نظر 'بی پندرہ' کی بالکونی پر جا ٹکتی ہے جو گزشتہ کئی دنوں کی طرح اس وقت بھی خالی پڑی ہے۔ اور کرسی بھی اپنی جگہ پر موجود ہے۔ خالی کرسی آج اس کے اندر ایک نئی قسم کی بے بسی اور ہمدردی کا احساس پیدا کر دیتی ہے وہ کئی لمحوں تک اسے گھورتی رہتی ہے اور سوچتی رہتی ہے۔ یہ اس طرح کب تک خالی رکھی رہے گی، اس پر اسے پھر سے آکر بیٹھنا چاہیے۔ وہ جیسے ہی سامنے آئے گا وہ اس سے بھی معافی مانگ لے گی۔



# طنز و مزاح : عصری منظر نامہ

جوگندر پال

لگاتار بڑھتی ہوئی زندگی روز افزوں ناقابل یقین، کوئی دوڑ کر سکتے ہیں تو ان کے پاس ہنسنے ہنسانے کی بھی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ ناگفتہ بہ حالات کے تئیں اردو والوں کا ردعمل ہمیشہ زندہ دلانہ رہا ہے اور اس طرح وہ صرف کڑے اوقات کو جھیل گئے ہیں بلکہ زیادہ پختگی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ اردو کی ہمہ جہت حسیت اردو والوں کی اس فطری حس کی بدولت پروان چڑھی ہے جو انھیں مزاح اور ان باقی تمام چیزوں کے ساتھ رکھی ہے جو شادمانی یا سنجیدگی کے مختلف مخصوص پیرایوں میں مزاح کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہدایت آمیز تنقیدی جائزوں کی کمی کے باوجود، مزاح اور اس کی ہم رکاب طنز کے عناصر ہی اردو فکشن کو اس قدر مستحکم کرنے کے ذمہ دار رہے ہیں۔ میں "آنندی" جیسے چھوٹے سے شہکار کو کسی اور طرح نہیں دیکھ سکتا، سوائے اس کے کہ "غلام عباس" نے ایک ایسی شریرانہ چھیڑ سے کام لیا ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ شہری زندگی کے معصوم کلچر کے پختہ مینار بدی کے اداروں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح ہم فی الفور اشفاق احمد کے "گڈریا" کے متبرک پانی کی تہہ میں اتر جاتے ہیں کیوں کہ اس کی چمکیلی سطح پر "داؤجی" کے تجاوز آمیز برتاؤ کا طلسم موجود ہے۔ کرشن چندر بھی بطور ایک مثال قابل ذکر ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الفاظ کا ضرورت سے زیادہ استعمال، جو فن میں ناقابل معافی نقص تصور کیا گیا ہے، کس قدر قابل معافی لگتا ہے اگر کہانی کو طنزیہ ہنسی مذاق سے بھر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ طنز و مزاح نے اردو ادب کے وجود کو ہر پہلو سے برابر سہارا دیا ہے۔ یہ صورت حال محض نثر تک ہی محدود نہیں رہی۔ ماضی قریب میں اکبر الہ آبادی کے سماجی طنز کی قینچی نے ہماری شہزادی نما پرانی شاعری کی زلف دراز کو تراش کر اسے شدت آمیز نئے کردار کے لیے تیار کیا۔ اکبر الہ آبادی کی شروعات خوب رہی۔ لیکن بدقسمتی سے ان کے وہ 'سراغ' سید ضمیر جعفری اور رضا نقوی واہی جیسے چند شعرا کے علاوہ آنے والی نسلوں میں گم ہو کے رہ گئے۔

ادب کی دیگر اصناف میں اس کے واضح کردار کے علاوہ، اردو کے مزاح کو اس کے آبائی ادب میں بھی سراہا جاتا ہے جس کے اتنے ہی رخ ہیں جتنے کہ لکھنے والوں کے۔ گویا، جس طرح انسانی چہرے جانوروں اور پرندوں کے ساتھ اپنی جزوی مشابہت



کے باوجود، بالکل انسانی لگتے ہیں، اسی طرح مزاح بھی، شناخت کے اصولوں کی خلاف ورزی کے تئیں اپنے ذہنی تحفظات کے باوجود، ایک الگ صنف کی صورت میں فوراً ہی پہچانا جا سکتا ہے۔ ایک ناقابل گرفت اور غیر رسمی روپ تلاش کرنا مزاح کی فطرت کے عین مطابق ہے۔

وجوہات سے قطع نظر، مزاح نگار بے شرمی کے ساتھ پرائیویٹ معاملات میں بھی دخل انداز ہو جاتا ہے، اور ہم اسے پسند کیے بغیر نہیں رہ سکتے جب وہ اپنی زنبیل کھولتا ہے اور اس میں سے ایک ذاتی چٹکلا، مصنوعی بات چیت، بے پہلو انشائیہ بے ربط قصوں کا خوشگوار سلسلہ یا جو کچھ بھی ہو برآمد کرتا ہے۔ وہ بڑی فراخدلی کے ساتھ ہمیں بھی اپنے مال غنیمت میں شریک کرتا ہے۔ سارے کھیل کی شرارت آمیز چبھن اس وقت محسوس ہوتی ہے، جب مزاح نگار کی بصیرت میں شریک ہوتے ہوئے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ ہم نے سے اپنا رازداں بنا لیا ہے اور ہماری بیوقوفیوں پر اس کا مذاق اڑانا ہمیں ہرگز برا نہیں لگتا۔ اردو میں مزاح کو ایک جھگڑالو قسم کی تنقیدی رائے پر اکتفا کرنا پڑ گیا ہے کیوں کہ شاید اردو کے نقادوں کے یہاں تسلیم و اعتراف کی پذیرائی یا ان امکانی صلاحیتوں کا فقدان ہے جو عام انسانوں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

اردو کے جدید مزاح کے میدان میں "پطرس کے مضامین" کا منظر عام پر آنا ایک اہم واقعہ ہے۔ پطرس بذلہ سنجی میں اعتقاد رکھتے ہیں اور مزاح پیش کرنے میں اپنے متقدمین کی نسبت کم خود بین (Self Conscious) ہیں۔ ان کی تحریر ایک ہی وقت میں ضبط میں اور آزاد رہتی ہے۔ وہ اپنے موضوع کو اس حد سے باہر نہیں جانے دیتے جس میں اسے وہ حقیقتاً دیکھتے ہیں، اگرچہ موضوع بظاہر اپنے آپ ادھر ادھر ہوتا رہتا ہے۔ ان کا مضمون "کتے" اور اس سے بہتر "لاہور کا جغرافیہ" اعلیٰ درجے کی بذلہ سنجی کی مثالیں ہیں۔ جن میں ہلکی طنز کا امتزاج ہے۔ وہ لاہور کے بے محابا پھیلاؤ کو بیان کرتے ہیں اور اپنے مضمون میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ لاہور کے گرد و نواح میں لاہور کے سوا کچھ نہیں اور ایک یا دو دہائی کے اندر لاہور صوبہ بن جائے گا، اور پنجاب اس کی راجدھانی ہوگا۔ اسی طرح ان کی شہری بذلہ سنجی، لاہور پر اشتہار بازوں کے حملے پر ان کی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی دوہری بیرونی دیواریں ہیں جس کا مطلب ہے ایک تو اینٹوں سے بنی پلستر کی حامل اور دوسری اشتہاروں کی۔ چونکہ یہ اشتہار بدلتے رہتے ہیں لہٰذا عمارتیں اس قدر مختلف سی نظر آنے لگتی ہیں کہ لاہور کے لوگ ان کے بیچ کھوئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم یہ مسئلہ اب حل کیا جا چکا ہے۔ اشتہاری حوالہ جات اب بیرونی دیواروں پر مستقل طور سے پینٹ کر دیے گئے ہیں جس سے یہ سہولت ہمیشہ کے لیے میسر آگئی ہے کہ کوئی شخص جان سکتا ہے کہ "روزنامہ انقلاب" کا

دفتر ٹھیک وہاں واقع ہے۔ جہاں محمد علی دندان ساز جلی حروف میں پینٹ کیا ہوا ہے۔ یا مسٹر اقبال وہاں رہتا ہے جہاں بجلی اور بھاپ سے مریضوں کا علاج کرنے کا اسپتال ہے۔ اور امتیاز علی تاج اس دکان میں رہائش رکھتے ہیں جہاں خالص گھی سے مٹھائیاں تیار کی جاتی ہیں۔ ایک دندان ساز جو انسانوں کے دانت نکالتا ہے اس کی یاددہانی کرانے والا بامعنی معاون اشتہار، بجلی اور بھاپ کے اسپتال کے بارے میں روزانہ اخباروں میں چھپنے والے تنازعات کے حوالے سے، اس عظیم مصلح اور شاعر کے تعلق سے اور تاج صاحب کے بارے میں مٹھائیوں کی پوری دکان کا ذکر وغیرہ ایسی باتیں ہیں جن سے درحقیقت قطع نظر ممکن نہیں۔

آج ہم نے پطرس کے چند بڑے ہی مقبولِ عام بڑے معاصرین کو قریب قریب بھلا دیا ہے جن میں فرحت اللہ بیگ، چراغ حسن حسرت، عظیم بیگ چغتائی، عبدالمجید سالک، حاجی لق لق، اور امتیاز علی تاج اور ان کے پیچھے پیچھے ابراہیم جلیس اور سوادیشی ریل کے مشہور مضمون کے خالق شوکت تھانوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ہمیں تاج سے ایک بڑے المیے کی تصنیف "انارکلی" اور ایک چھوٹی انسانی تصنیف چاچا چھکن ورثے میں ملے ہیں۔ حاجی لق لق، جن کا عوامی اپیل کی بنا پر ایک وقت گھر گھر کا شہرہ تھا، کچھ زیادہ شور مچانے والے اور عارضی ہیں۔ البتہ وہ طنزیہ کالم جو چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک اور بعد کی نسل کے ابراہیم جلیس نے سماجی بدعنوانیوں کی کھوج میں تحریر کیے تھے، شاذو نادر ہی ادبی ماہیت کے حامل ہیں۔

کچھ شریف لوگ قابلِ فہم حد تک اس قدر شریف ہوتے ہیں کہ وہ بے طرح نہیں ہنس پاتے۔ اگرچہ ہم میں سے بیشتر یہ سمجھتے ہیں کہ ہنسنا خود ہی ہنسنے کا ایک معقول بہانہ ہے تاہم صاحب تمیز مصنفوں کو یہ برا لگے گا کہ وہ اپنی خوش طبعی کی خاطر دوسروں کو زک پہنچائیں۔ اگر ایسے مصنفین کسی شخص کو بہت ہی بھونڈا پائیں تو وہ اس پر اداسی بھری مسکراہٹ سے کام لیں گے اور اگر وہ اس پر ضرور ہنسنا چاہتے ہیں تو وہ پہلے ایک ایسی حالت پیدا کریں گے جس میں وہ شخص بھی لازمی طور سے ان کے ساتھ ہنسنے لگ جائے۔ ایڈیسن کا یہ رویہ، رشید احمد صدیقی کے یہاں براہ راست دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو کے ایک دوسرے ایڈیسن: پطرس کا بھی خیال آتا ہے

تاہم جہاں صدیقی کی شریف مزاجی رکی رکی سی روشنی بکھیرتی ہے وہاں پطرس کو اپنی حرکت اور قوت میں پہچانا جا سکتا ہے۔

کنہیا لال کپور پہلی بار دھماکے کے ساتھ منظرِ عام پر آئے۔ کرشن چندر کے مداح ہوتے ہوئے وہ بھی کرشن چندر کی طرح ناگوار سی تیز رفتاری کے قائل ہیں۔ ان کے فقرے تیز رفتاری کے مارے اچھلتے کودتے ہیں اور مفاہیم آرام کے آرزومند رہتے



ہیں۔ پطرس کے طالب علم کو موصوف کی تحریروں میں اس اندرونی تناسب پر مہارت دکھائی نہیں دیتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مفہوم خود بخود حرکت اختیار کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ مختلف واقعات میں یکسانی کے ایک ہی مفہوم کو اہتماماً دہرانے میں یکسانی خود وضاحت کرتی ہے کہ یہ چیز فن اور فن کار دونوں کے لیے کتنی نقصان دہ ہوتی ہے، اگر فن کار اپنے فن کے ساتھ پہلو بدلتا رہے۔ تاہم کپور کہیں کہیں واقعی خوب ہیں اور وہ اکثر کچھ ایسے انفرادی کلمات، جیسے "کلکتہ کا سفر" میں، پیش کرتے ہیں جو ذہن میں رہ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں موضوعات کے بے ڈھب انتخاب کی بدولت بعد کے مصنفین کو یہ تحریک ملی ہے کہ وہ اپنی تحریروں کی فضا کو نئے دور کی زندگی کی پیچیدگیوں کے قریب تر لائیں۔

کیا ہم فن کے لیے لامحدود گنجائش کا تصور کر سکتے ہیں اگر ہم دانستہ یا غیر دانستہ طور سے اپنے موضوعات کے انتخاب کو چند عام سے من پسند موضوعات تک محدود کر دیں۔ مثال کے طور پر

کرکٹ یا گھر پر اپنے رشتہ داروں کو ہی لیجئے۔ کرکٹ پر شفیق الرحمن کی تند و تیز تحریریں پڑھ کر ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم خود اس کھیل کے تمام ہنگامے سے گزر رہے ہیں۔ اسی طرح جب رحمان خوش حال مسلم کنبوں کے افراد کی تصویرکشی کرتا ہے تو وہ تصویریں براہ راست ہمارے ذہن میں اتر جاتی ہیں۔ وہ ان افراد سے اتنا قریب ہے کہ وہ اس کے لیے انجانے نہیں رہتے۔ "زنانہ اردو خط و کتابت" عجیب و غریب چٹھیوں کا ایک پلندہ ہے جن میں اونچے درجے کے مسلم کنبوں کی مختلف نوجوان عورتوں نے اپنی ماں، منگیتر اور ہم جولیوں کو مخاطب کیا ہے اور ان میں ژرف بینی کے ساتھ ان کے باہمی روابط میں اطمینان بخش تصنع کی وضاحت کی گئی ہے۔ رحمان پر یہ نکتہ چینی کی جاتی ہے کہ وہ انتہائی درجے کا مقامی اور گھریلو ہے لیکن اگر یہ سچ ہے کہ تمام اچھی تصانیف کسی مصنف کے اپنے مقامی لوازمات کو منعکس کرتی ہیں تو رحمان واقعی ان تصنیفات میں بہترین ہے۔

سید ضمیر جعفری بھی طنز و مزاح کے سعبے میں پرانے مہارت رکھتی ہیں ان کے "جاچا دینا" میں تیکھے تیکھے جملوں اور اچھوتے ماحول کے تارگی بخش حوالے ہیں، جنھیں حسب معمول واقعات سے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے ان کے تخلیقی مزاج میں جملہ معترضہ کی صورت میں ترشے اشارے جو آج کی سماجی خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہیں انھیں غیر رسمی لوجبت کا یقین انگیز سہارا دیتے ہیں۔

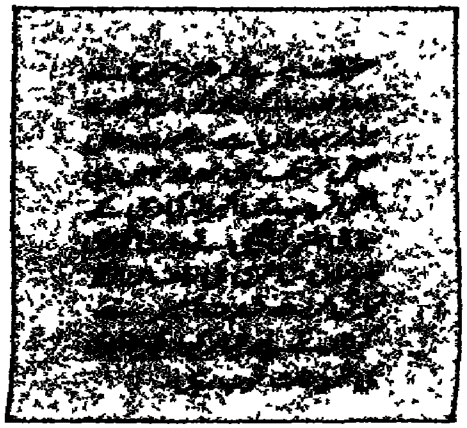
جونہی کہ آزادی کے سلسلے میں جشن و تقریبات کا شور اور غبار تھما، بعد کی نسل کا مصنف دھیرے دھیرے محسوس کرنے لگا کہ عام انسان کو کیوں کر بے وقوف بنایا گیا۔ ہمارے سیاسی رہنماؤں نے جس طرح اقتدار پر ہاتھ مارا اور فریب کارانہ انداز میں اپنی حکمرانی کو برقرار رکھنے کے لیے اسے استعمال کیا اس سے مایوسیت کی ہمہ گیر سطرانہ میں مسلسل اضافہ ہوا۔ عام آدمی نے اپنی عمومیت میں بلا روک وقار حاصل کرنے کا موقع پانے کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس کے رہنماؤں نے اسی کے ہی ووٹ کی بدولت جمہوریت کے آلۂ کار کو اسے پشیمانی اور توہین کے کونے میں دھکیل دینے کے لیے استعمال کیا۔ یقیناً اس نے یہ دیکھنے کے لیے کام نہیں کیا تھا کہ کہانی اس صورت حال تک آ جائے گی۔ فکر تونسوی نے بے چارے عوام کی مصیبتوں کے اس خوفناک ڈرامے کا مشاہدہ کیا اور اگرچہ وہ [illegible] تاہم اس

کی ہنسی کی رگوں میں بے ضمیر سیاسی سینہ زوروں کے تئیں گرم خون جیسا غصہ دوڑ رہا تھا۔ فکر صاحب بڑے پیمانے کے طنز نگار ہیں جو ملک کے تمام نہاد رہنماؤں کو مات دینے کے لیے برابر اپنے کالم اور ادبی طنز تحریر کرتے رہے ہیں۔ ان کی شخصیت میں عام لوگوں کی بے زبان اکثریت نے اپنا غیر معمولی ترجمان دریافت کیا ہے۔ ان کے تیس سال پرانے روزانہ کالم "پیاز کے چھلکے" کی بے پناہ کامیابی کا راز، ان کے عام لوگوں سے میل جول اور اس کے نتیجے میں ان کے فکر و فاقہ سے آگاہی طنز کے لیے ان کی فطری صلاحیت اور محض ہنسی مذاق کی بدولت زندہ رہنے کی توانائی میں مضمر ہے۔ فکر صاحب نے عوام اور ان کی بدحالی کی حالت کسی ادبی مزاح کے ان گنت مضامین میں کی ہے۔ فکر بات میں جیسی مختصر تحریروں اور مفاہمت، دونوں میں ان کے تخلیقی لائحہ عمل کا ایک وسیع سلسلہ محسوس کرنے کا موقع ملتا ہے۔

اب ابن انشا کی بابت سنیے۔ فکر نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "جب کبھی کراچی کے روزنامہ اخبار جنگ میں ان کا کالم نشر ہوتا تھا، اس کو پڑھنے کے بعد لوگ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوا کرتے تھے۔ اللہ نے انھیں وہ چیز عطا نہیں کی تھی جسے بجا طور پر کہتے ہیں یا اگر انھیں عطا ہوئی تھی تو وہ اس کا اظہار سنجیدگی سے نہیں کرتے تھے۔" فکر صاحب تپاک کے ساتھ اتنا سا مزید کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ "ابن انشا کا اسلوب ہی ان کا فلسفہ ہے۔ کوئی اس کی نقل نہیں کر سکتا۔" ابن انشا نے بڑے سفر کیے اور ایک جہاں گرد کی حیثیت سے اپنے کارناموں کے بارے میں وہ بڑی بذلہ سنجی کے ساتھ لکھا کرتے تھے۔ ان کا سفر نامہ "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" ناقابل تقلید حد تک ہنگامہ آرائی کے باوجود اختصار بیان موجود ہے۔

نریندر لوتھر کا مطالعہ ایک مسرت ہے۔ منصبی حاکم ہوتے ہوئے بھی ان میں ایک فنکار کی روح موجود ہے۔ بند کواڑ کے اس مصنف نے مزاح کے لیے ایک بڑا ہی حساس مزاج اختیار کر لیا ہے۔ ان کی نفاست ہمیں رشید احمد صدیقی کی یاد دلاتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ لوتھر مؤخر الذکر محترم بزرگ کی نسبت زیادہ بے تکلف ہے۔ صدیقی اور لوتھر دونوں کے یہاں مزاح امتیازی نوعیت کے انشائیہ کے نواح میں رہتا ہے۔ لیکن باہر کی طرف دیکھنے کے لیے آنکھوں کے استعمال پر ان کا جھکاؤ انھیں وزیر آغا، مجتبیٰ حسین، آذر، غلام جیلانی اصغر، انور سدید اور رام لال

تا بھوی جیسے انشائیہ نگاروں سے الگ کر دیتا ہے، جن کی کھوج لازمی طور سے اندرونی اور پرائیویٹ ہے۔ یہاں یہ دھیان میں رکھنا شاید دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ مزاح نگاروں کے بالکل ساتھ ساتھ ہی قابل نوجوان انشائیہ نگاروں کا ایک پورا گروہ نمودار ہوا ہے۔ دونوں اطراف کی روشنی ان کی باہمی سرحدوں پر گڈمڈ ہوتی ہے، ہر طرف کی امتیازی شناخت برقرار رہتی ہے۔



لوتھر نے اپنی تحریر "میاں بیوی" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "مزاح نگار ہمیں بتائے بغیر ہی ہماری اصلاح کرتا ہے ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی شخص سوتے میں ہمارا سر مونڈ دے۔" اس بیان کی سچائی جاننے کے لیے ہمیں لوتھر کی تحریروں کو پڑھنا ہوگا۔

لوتھر کی طرح بھارت چند کھنہ بھی حیدرآباد میں بس گئے ہیں۔ انھوں نے لوتھر گری اور تکلف بر طرف "میں نریندر لوتھر اور مجتبیٰ حسین کے بڑے ہی دلچسپ خاکے کھینچے ہیں۔ اول الذکر میں لوتھر کی تفصیلی زنقاشی کی گئی ہے۔ "کھنہ کا مدکیا نام نہ ہوگا" ایک بے ساختہ مزاح نگاری کا مجموعہ ہے جس میں وہ ایک ایسے قلم کار کی صورت میں سامنے آتے ہیں جو اپنے گرد و نواح کی دنیا سے پوری طرح آگاہ ہو۔

بمبئی میں آباد یوسف ناظم بھی پرانی حیدرآباد ریاست کے ہیں۔ اس خاموش مزاح جو اعتماد قلمکاری بذلہ سنجی دانشوری سے بھرپور ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ان کی مختصر تحریروں میں الفاظ کے مختصر نقوش ان کی مزید تحریری سہولت کے مترادف ہیں۔ ناظم کے پاس قاری کو آغاز سے ہی مسحور کر لینے کا ملکہ ہے۔ ان کے الفاظ پڑھے نہیں

جاتے، وہ خود بخود آواز دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں محو ہو جانے کے بعد قاری انھیں آخر تک سنتا ہی چلا جاتا ہے۔

ہم "حیدرآبادیوں" کو بےوجہ "زندہ دلوں" کے نام سے نہیں پکارتے۔ خواجہ عبدالغفور نے کئی مزاحیہ جملے تراشے اور ایجاد کیے تاکہ وہ لوگوں کو سایوں سے نکال کر روشنی میں لا سکیں۔ البتہ، اے کاش کہ ان کی طویل تحریروں میں متن کے حوالوں کی بدولت مفاہیم برقرار رہتے اور بے جوڑ شذرات نہ ہوتے۔

مزاح نگاروں کی اس درمیانی نسل کے دو مشہور نام ہیں احمد جمال پاشا اور وجاہت علی سندیلوی۔ جہاں پاشا نے ہماری یونیورسٹیوں میں ذہنی تساہل اور سازشوں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور صورت حال کو حقیقی طور سے بے نقاب کرتے ہیں وہاں سندیلوی اپنی لکھنوی انداز کی سادگی، لوچدار محاورے اور روایت آمیز واقعات کے لیے قابل ذکر ہیں۔

میں طنز و مزاح نگاروں کی اس نسل کی فہرست کو محمد خالد اختر پر ختم کرتا ہوں جو کہ ایک ہموار ذہانت کے ادبی نقاد اور جاندار طنز نگار ہیں۔ اختر عام طور سے ایک طرح کا فہرست وار مزاح پیش کرتے ہیں۔ ان کے خندراق کلمات ہمیں گلاب کے کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں تاکہ ہم خوشبودار خوابوں سے بیدار رہیں۔ ان کے ہموار ڈرامائی بیانات کے دوران چھوٹے چھوٹے خود کلامیے ناسٹلجیا کی حد تک الزبتھ اول کے عہد کی یاد دلاتے ہیں، اور ان کے مفاہیم کو عصری حقائق سے وابستہ کرتے ہیں۔ یہ دیکھنا بڑا دلچسپ ہوگا کہ وہ کس طرح آج کے انسان کے انحطاط پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ اپنی تصنیف "پاکستانی درندے" میں وہ ہمیں بتلاتے ہیں کہ جنگل کا بادشاہ اب صرف سرکس یا چڑیا گھر میں ہی ملے گا، اور وہ اب شکار نہیں کرتا بلکہ اپنا سارا وقت کھانے، سونے اور خوشی سے ہنستے کر بدہضمی میں گزار دیتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ جو نوجوان نسل، در اصل انسانی [illegible] سے اپنے متقدمین سے زیادہ [illegible] جانے ہو۔ مزاح نگار [illegible] آئی ہے وہ یقیناً زیادہ پختہ اور [illegible] وہ ایسی اصلی گمزوری نہیں ظاہر کرتے۔ جو ان کی تخلیقیت کو محدود کر دے۔

"میں آیا، میں نے نظر دوڑائی اور میں فتح یاب ہوا۔" یہ بات مزاح کے ماہر مشتاق

کے بارے میں، مزاح کی عصری دنیا پر ان فتحیابی کا ذکر کرنے کے لیے بھی جا سکتی ہے۔ ان کے ایک بزرگ مصنف ہونے کے باوجود میں نے انھیں اس آخری نسل میں سرفہرست جگہ دی ہے تاکہ موجودہ رجحانات سے ان کی سربراہانہ وابستگی کو نمایاں کیا جائے۔

ان کی پہلی تصنیف "چراغ تلے" کی بدولت ایک نیا در یچہ وا ہوا جس میں سے تازہ ہوا اندر آئی اور اردو کا مزاح عمر گزیدہ ہونے سے بچ گیا۔ یوسفی آزادہ رو ہیں، اور مشروطیت سے ماورا، سوائے اس کے کہ وہ ضمیر فن کے دلدادہ ہیں اور بے ساختگی سے لبریز۔ اپنے قارئین کی توقعات کو جھٹلاتا تو کیا، ان کی بعد کی تصنیفات "خاکم بدہن" اور "زرگزشت" اس آدمی کو ایک نیا چہرہ فراہم کرتی ہیں جو تمام ازموں کو نظر انداز کرتا ہے اور آدم کو دیر پا انسانیت کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ ان کے قہقہے خصوصی پس منظروں سے پیدا ہوتے ہیں اور اپنی آبائی ڈھلانوں سے نیچے نہتے چلے جاتے ہیں۔

اگرچہ یوسفی کا پورا لطف اس وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب ان کا مضمون مکمل طور سے دیکھا جاتا ہے۔ تاہم یہاں "سینئر ماتا ہری اور مرزا" سی دو چھوٹی تحریریں شاید قابل ذکر ہیں۔ ہری ایک کتیا ہے جو بطور ایک چوکیدار ہرگز بری نہیں۔ وہ سوائے اپنی عصمت کے ہر چیز کی اچھی طرح رکھوالی کرتی ہے۔ اور دوسرا معاملہ یہ ہے کہ ہر بگڑا ہوا مسلم رئیس یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے کہ نہ صرف اس کے کتے بلکہ اس کے آباؤ اجداد بھی خالص درآمد شدہ نژاد کے تھے۔

یوسفی اکیلے رسمی مذاق نہیں سناتے بلکہ وہ ایک خوش مزاج ماحول پیدا کرتے ہیں اور اپنے جملوں اور کہانیوں کو اس کے ساتھ گڈمڈ کر دیتے ہیں اور ایک ایسی آواز نکالتے ہیں جو کہ مجموعی طور سے ایک بڑا مذاق لگتا ہے۔

[illegible] کا کاری [illegible] پہنے ہوئے مزاح کے [illegible] تصور نہیں کر سکتا [illegible] دکھا ہوتا ہے۔ ہم اس [illegible] ساتھ [illegible] محسوس کرتے ہیں جن کا ایک حصہ بڑا پیارا اور بے تصنع ہے۔ اور ہم انھیں شکریے کے ساتھ پڑھتے اور اسی کی بدولت قوم کی مخصوص دنیا سے مستند طور سے متعارف ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر

"تیر جنگ آمد" میں ہمیں اپنے تجربے میں کھلے بندوں شریک ہونے کی اجازت دیتے ہیں اور ادا۔ فی الحال قیمت پر مذاق اڑانے سے کبھی نہیں شرماتے، اور جس انداز سے وہ اس پر قہقہہ لگانے کا مزہ لیتے ہیں اس سے تاثر پیدا ہوتا ہے گویا انھوں نے یہ ہمیں سے سنا ہے۔

[illegible]

مجتبیٰ حسین کے قریبی دوست مسیح انجم، حیدر آبادی ہونے کے ناطے مزاح نگاری پر گویا حق بجانب دعویٰ کر سکتے ہیں۔ وہ مجتبیٰ حسین کی کہانی میں، مجتبیٰ حسین کے بارے میں کسی قدر شکایت آمیز لہجے میں لکھتے ہیں کہ دہلی میں بس جانے کے بعد مجتبیٰ حسین نے "ہنوز" کو کیا اور آئینے کو شیشہ پکارنا شروع کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چیزوں کو انھیں ناموں سے جانتا، جن ناموں سے کسی علاقے کے لوگ انھیں پکارتے ہیں، مجتبیٰ حسین کی ایک ایسی خاصیت ہے جو موصوف کو برابر "پھیلاؤ" دیتی رہی ہے۔ میں نے "پھیلاؤ" کا لفظ اس لیے سوچ کر نکالا ہے

کیوں کہ اس دفعہ اس نے اپنی سکونت دہلی کو منتقل کرنے کو پھیلاؤ کی خواہش سے منسوب کیا تھا۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے آپ کو عجیب و غریب مقامات کے مطابق اس قدر ڈھال لینے کی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے کہ جاپان میں کچھ روز کے قیام کے بعد اس نے جاپان کا بڑا ہی دل آویز اور مستند نقشہ اپنے حالیہ سفرنامہ "جاپان چلو" میں فراہم کیا۔ موصوف کے یہاں اپنی شخصیت کو معطل کر دینے اور دوسرے لوگوں اور مقامات کے طور طریق اپنا لینے کی صلاحیت 'آدمی نامہ' میں شامل بہت ہی چست اور [illegible] تصویر کشی کی بدولت سامنے آئی ہے۔

مجتبیٰ حسین کا ہمارے اہم مزاح نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے چند ایک مجموعے منظر عام پر آئے ہیں جن میں سے "قصہ مختصر" بہت ہی حالیہ تصنیف ہے۔ ہمارے کچھ قلمکار اس تاثر میں کھوئے ہوئے لگتے ہیں جیسے وہ اپنے بارے میں لیے پھرنے کے خواہاں ہیں۔ وہ اس کے برعکس مزاح کو اس کی اپنی ہی روش کے تحت لیتے ہیں اور اسی طرح براہ راست اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتے ہیں۔

انتظار حسین نے لکھا ہے کہ جو کچھ عطاء الحق قاسمی کہتے ہیں شاید میرے دل پر اثر انداز نہ ہوں، لیکن ان کے کلمات ضرور اپیل کرتے ہیں۔ سچائی یہ ہے کہ کوئی جاندار کلمہ اپنے مفہوم کے بغیر وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔ قاسمی کے کلمات میں جس تیز دھار کی انتظار حسین سراہنا کرتے ہیں اسے محض ہنرمندی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ قلمکار کے جوش و خروش سے بھی گڈمڈ ہوتی ہے ان کی مزاحیہ تحریروں کا مجموعہ "عطا ئیے" ان کے یہاں صداقت، مقصد اور مقصد کو تشدید کے ساتھ اظہار دینے کی شہادت فراہم کرتا ہے۔ کرنل محمد خان نے یہ کہہ کر کہ موصوف پاکستان کے قدرتی وسائل میں سے ایک ہیں۔ انھیں حق بجانب خراج تحسین پیش کیا ہے۔

زندگی کی طرح مزاح ہمیشہ [illegible] اور چوں کہ زندگی اپنے کسی بھی [illegible] سے [illegible] بدستور [illegible] کو مختلف طریقوں سے اظہار دیتا ہے [illegible] ہے کہ ان مختلف طریقوں میں بھی ایک [illegible] اور اسلامیلان لازمی طور سے موجود ہے۔

ستیش بترہ

# مغربی تہذیب اور طرزِ فکر



کشتی کو کس طرح سے لہروں کے سپرد کرنا چاہیے

میرا پہلا امریکی سفر "بین الاقوامی تجرباتی زندگی" کے پروگرام کے تحت تھا۔ اس ادارہ کا مقصد کسی ملک کے منتخب لوگوں کو دوسرے ملک کے باشندوں کے گھروں میں رہ کر ان کی زندگی میں شریک ہو کر انھیں اور ان کے ملک کو سمجھنے کا موقع فراہم کرنا ہے تاکہ وہ اپنی قومی، ذاتی اور گھریلو سطح پر ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔ کسی بھی ملک کے کسی ہوٹل میں رہ کر اس ملک سے واقفیت بالکل سطحی ہو کر رہ جاتی ہے۔ انسان ایک دوسرے کے گھر میں رہ کر اس کے مکینوں کی خوشیاں، غموں اور ولولوں کے بارے میں جس طرح سے براہِ راست سیکھ سکتا ہے، وہ کسی بھی اور طریقے سے ممکن نہیں۔

اس پروگرام کے تحت ہم سویڈن سے آئی ہوئی ایک خاتون کے میزبان رہ چکے تھے اور امسال میزبانوں کو ایک دوسرے ملک میں بطور مہمان جانے کا موقع دیا جا رہا تھا۔ ہمارے دس ممبری گروپ کے قیام کا بندوبست امریکہ کے منی سوٹا صوبے کی راجدھانی مینا پولس، میں مختلف گھروں میں کیا گیا تھا۔ امریکہ میں ہر صوبے کو اپنی خصوصیت کے مطابق کوئی نہ کوئی لقب دیا جاتا ہے۔ منی سوٹا کو "دس ہزار جھیلوں والا صوبہ" کہا جاتا ہے۔

میں امریکہ کے کئی صوبوں میں گھوما ہوں۔ لیکن اس صوبہ سے زیادہ خوب صورت اور صاف علاقہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو گا۔ اس کی وجہ اس علاقے کے دوسرے بسنے کی ہے۔ اسی لیے دوسرے صوبوں کے بسنے میں جو خامیاں رہ گئی تھیں، یہ صوبہ ان سے نہ صرف مبرا ہی ہے بلکہ یہاں جدید ترین خیالات اور تکنیکی اضافوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ جھیلوں کی کثرت کا دعویٰ قطعی مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ کچھ یوں لگتا ہے جیسے اللہ میاں نے کوئی اسٹین گن اٹھا کر دھرتی کو جھیلوں سے چھلنی کر دیا ہو۔ اس کا ثبوت خود مینا پولس میں ہی دس بارہ جھیلوں کی صورت میں موجود تھا۔ ان میں دو تین جھیلیں تو اپنے یہاں کی نینی تال جھیل سے بھی بڑی ہوں گی۔

میرے میزبان پریسٹن ہیگلن ایک سول انجینئر تھے۔ ان کی ذاتی فرم کا کام ٹھیکے لینا تھا۔ میں ان کے خاندان کو "بی پریوار" کہا کرتا تھا کیوں کہ ان کے گھر کے ہر فرد کا نام 'پی' کے حرف سے شروع ہوتا تھا۔ پیٹی ان کی بیوی کا نام تھا، اور ان کے چار لڑکوں کے نام تھے :- پریسٹن جونیئر (۱۶ سال)، پیٹر (۱۳ سال)، پیٹرک (دس سال)، اور فن عمر پانچ سال۔ ایک بار جوابی مذاق میں پیٹی نے میرے خاندان کو 'بی' پریوار کا لقب دے دیا کیوں کہ میرا خاندانی نام 'بی' کے حرف سے شروع ہوتا ہے۔ اس دن سے گفتگو کے دوران میں 'بی' بمعنی شہد کی مکھیاں اور 'پی' بمعنی مٹر کے دانوں کا استعمال اکثر ہونے لگا۔ اب اکثر سنائی دینے لگا "شہد کی مکھی" مخاطب ہے "مٹر کے دانوں سے!"۔

گھر میں عورت ذات کے نہ ہونے سے (بھلا ماں بھی کہیں عورت ذات میں شامل ہے) اور مردانہ اکثریت ہونے کی وجہ سے والدین کے ڈسپلن پر زور دینے کے باوجود اکثر ہڑبونگ اور اودھم مچتا۔ مجھے فن کا گول، معصوم چہرہ اور اس کی پیاری پیاری باتیں بہت بھلی لگتیں۔ وہ بھی مجھے نہایت پیار سے 'میرا دوست' کہہ کر پکارتا۔ ان لفظوں کا استعمال وہ صرف اپنے کتے اور میرے لیے ہی کرتا!

بڑے بچے اسکول چلے جاتے۔ فن کی دیکھ بھال مختلف لوگوں کے ذمہ تھی۔ کیوں کہ پیٹی کو پریسٹن کے دفتر میں بھی سکریٹری کے فرائض سرانجام دینے ہوتے۔ سنیچر اتوار کو ہی وہ فن کو اطمینان سے توجہ دے سکتی۔ اکثر فن کی دادی سینئر مسز ہیگلن جو ذرا فاصلے پر رہتی تھیں، آجاتیں۔ فن کو اپنی دادی بہت پسند تھی اور جب کبھی وہ آتیں، فن بہت ہی خوش ہوتا۔ ان کے علاوہ ضرورت پڑنے پر ایک ادھیڑ عمر کی خوش مزاج خاتون مسز جینکنز آجاتیں۔ لیکن انھیں پیٹی کو دو ڈالر فی گھنٹہ کا معاوضہ دینا پڑتا۔ مگر مسز جینکنز اپنی ذمہ داری دل و جان سے نبھاتیں وہ بھی فن کو بہت پیار کرتیں۔

سارے پریوار کو کشتی کھینے اور بادبانی کشتیوں میں گھومنے کا بے حد شوق تھا۔ مینا پولس میں تو کسی پریوار کا کشتیوں کی تعداد سے ہی اس کا سماجی رتبہ جانا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے 'پی' پریوار کو جائز مقام حاصل تھا۔ ان کی تین کشتیاں تھیں۔ ایک بچوں کے لیے۔ ایک میاں بیوی کے استعمال کے لیے جب کہ تیسری کشتی ایک موٹر بوٹ تھی جس میں سب مل کر لمبی مسافت کے لیے نکل جاتے۔ گھر کے قریب ہی ایک میل کی دوری پر ہیریٹ جھیل میں لڑکوں کی کشتی تھی جب کہ دس پندرہ میل دور منی ٹانکا جھیل میں والدین کی کشتی تھی۔ منی ٹانکا جھیل دوسری کئی جھیلوں سے جڑی تھی اور یہاں سے پچاس ساٹھ میل کا چکر آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔

بچوں نے اپنی کشتی پہلے سے ہی جھیل میں ڈلوا رکھی تھی۔ انھیں دیکھ کر باپ کو بھی رشک ہوتا اور وہ بھی چاہتا تھا کہ ان کی کشتی بھی جلد از جلد منی ٹانکا جھیل میں پہونچ جائے۔ ہر اتوار کو بچے اپنی کشتی میں سیر کے لیے نکل جاتے۔ ان دنوں وہ ہر ہفتہ منعقد ہونے والی دوڑوں میں شریک ہونے کی تیاری کر رہے تھے منی ٹانکا جھیل میں کشتی پہونچانے کا پروگرام اس لیے دوپہر کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ لیکن ہر اتوار کی دوپہر کو کسی نہ کسی ناگہانی مصروفیت کے نکل آنے کی وجہ سے یہ پروگرام ٹلتا آیا تھا۔ بالآخر کشتی کو ٹریلر میں ڈال کر ایک اتوار کو جھیل پر پہونچایا گیا، جہاں موٹر کو بیک کر کے یہ ٹریلر پانی میں اتارا گیا۔ ٹریلر کے سرے کا تختہ لگایا گیا اور سب نے مل کر اللہ کا نام لیتے ہوئے اس بڑی کشتی کو پانی میں دھکیل دیا۔ ہر کوئی باپ کے چہرے پر ایک خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑتی دیکھ سکتا تھا۔

والی رَو کا پُرسکون یا تیز ہوا کی صورت میں مکمل فائدہ کیسے اٹھانا چاہیئے، بادبان ان حالات میں کس زاویے پر ہونے چاہئیں، یہ سب پہلو زور و شور سے بحث کا موضوع بنتے۔ والدین کا اپنے تجربے کی روشنی میں بچوں کو تربیت دینا بہت ہی بھلا لگتا تھا۔ کشتیوں کی دوڑ میں ابھی تک بچوں کو کبھی کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ آخر کار جب بچوں نے ناگوار موسم میں کئی تجربہ کار ٹیموں کے مقابلے میں پہلی بار ریس جیتی تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس یادگار موقع کی خوشی کو ہمیشہ دل میں بسانے کے لیے، میں نے تمام بچوں کو آئس کریم کھلائی۔ امریکا میں رنگا رنگ قسموں کی تیس سے بھی اوپر آئس کریم ملتی ہیں۔ اب تو خیر اپنے یہاں بھی اکثر قسمیں ملنے لگی ہیں۔ لیکن امریکن دودھ کریم کی آئس کریم کا کیا کہنا۔ ہم نے زیادہ سے زیادہ تعداد میں جی بھر کر آئس کریم کھائی۔ بچوں کے لیے تو یہ یادگار موقع تھا ہی، مجھے بھی یہ موقع اکثر یاد آتا ہے۔

ایک ہندوستانی تجارتی انجینئرنگ فرم سے متعلق ہونے کی وجہ سے، مجھے یہاں کے انجینئرنگ اداروں میں بھی دل چسپی تھی۔ یہاں رہ کر بہت سی نامی فیکٹریوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ صاحب خانہ جہاں بھی ہو سکا، خود ان فیکٹریوں میں لے کر گئے اور جہاں ممکن نہ ہو سکا انھوں نے یہ فرض اپنے جان کاروں اور متعلقہ دوستوں کے سپرد کر کے اپنی ذمہ داری ——— اگر میں اسے ذمہ داری کا نام دے سکوں تو ——— بہت ہی خلوص سے نبھائی۔ نتیجے کے طور پر دن میں ایک نہ ایک فیکٹری دیکھنے کا پروگرام تو معمول میں شامل تھا۔ ان سے فراغت پانے کے بعد میں اکثر پریسٹن کے ساتھ آسکے گا ہکوں سے ملنے چلا جاتا۔ ایک بات جس نے مجھے کافی متاثر کیا وہ کاروباری تعلقات میں نیک نیتی اور خلوص بھرا رویّہ تھا۔ صحیح بات کو صحیح کہنے میں کسی کو بھی تامل نہ تھا۔

پریسٹن سول انجینئرنگ کے مقامی اداروں کا پریذیڈنٹ تھا۔ بڑھئیوں کے ٹریننگ کورس پر ڈپلومہ دینے کی ایک تقریب میں جہاں پریسٹن کو ان طالب علموں کو مخاطب کرنا تھا۔ میں اور بیٹی بھی شامل تھے۔ ادارہ کے تمام ممبروں کے چہرے پر اپنی ذمہ داری کو لگن اور خلوص سے پورا کرنے پر اطمینان اور فخر تھا۔ انہوں نے نئی پیڑھی کے لوگوں کو تکنیک تربیت دے کر اپنے لیے بھی زمین ہموار کی تھی اس کا احساس سبھی کو تھا۔

پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت امریکن زندگی کا ایک امتیازی پہلو ہے۔ میرے قیام کے دوران پیٹر کو اپنے پڑوسی کے سوئمنگ پول کو صاف کرنے کا کام ملا۔ امریکن معاشرے میں بڑے سے بڑے خاندان کا بچہ بھی اخبار بیچ کر، لان کی صفائی یا کوئی اور کام کر کے زندگی کے گر سیکھتا ہے۔ کام کرنے میں کسی کو کوئی عار نہیں اور آس پڑوس کے سب لوگ ان بچوں کی ہمت افزائی کرتے۔ سال میں ایک دن ایسے بچوں کی ہمت افزائی کے لیے وقف ہے جب کہ آس پڑوس کے لوگ ان بچوں کو شاندار پارٹی دے کر ان کے کام کو سراہتے ہیں۔ تو خیر ذکر ہو رہا تھا پیٹر کا۔ اس کی معاشی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب اسے اس کام کا معاوضہ دس ڈالر ملنے والا تھا۔ پریسٹن نے بڑے جتن اور تفصیل کے ساتھ اسے اس صفائی کے تمام پہلو سمجھائے۔ چوں کہ پول کو صاف کرنے کے لیے ایسڈ کا استعمال ضروری تھا اس لیے انھوں نے ربڑ کے دستانے پہننے کے لیے تاکید کی اور اسے دیگر حفاظتی ترکیبوں سے آگاہ کیا۔ اور جب کام ختم ہونے پر پیٹر پہلی بار اپنی کمائی گھر لایا تو والدین اور سبھی بھائیوں کے چہرے فخریہ جذبات سے لہرا رہے تھے

امریکہ آنے سے پہلے میں نے امریکی تہذیب اور اس کے گھناؤنے پہلوؤں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ امریکن سماج میں بھی اخلاق کے بدترین نمونے ملتے ہیں لیکن ایسا کس سماج میں نہیں ہوتا، اور پھر امریکہ تو ہمیشہ سے ان لوگوں کی جائے پناہ رہا ہے جو اپنے ملکوں کے سماج میں کبھی قبول نہیں کیے گئے۔ چاہے اس کی وجہ ان کا دھرم ایمان رہا ہو، چاہے وہ قانون کی گرفت سے بھاگنے میں کامیاب رہے ہوں۔ لیکن ایک بات ان میں مشترکہ ضرور رہی ہے۔ وہ سب اپنی محنت مزدوری سے اپنے لیے ایک نیا مستقبل ضرور تلاش کر رہے تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنے لیے ایک ایسے نظام کی داغ بیل ڈالی جس میں ہر کوئی اپنی محنت، طاقت اور لگن سے اپنا مستقبل سنوار سکے۔

منی سوٹا میں آئرلینڈ سے آئے ہوئے لوگوں کی اکثریت ہے۔ نیویارک کے گرد اطالوی لوگوں کی، فلاڈلفیا کے پاس جرمن لوگوں کی، کیلی فورنیا میں ہسپانوی، میکسیکن اور چینیوں کی بھرمار ہے۔ نیگرو لوگ شروع شروع میں امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں کپاس کے کھیت میں کام کرنے کی غرض سے



لائے گئے تھے۔ آجکل وہ تقریباً سبھی ملک میں پھیل گئے ہیں۔ لیکن ان کی اکثریت نیویارک، شکاگو اور واشنگٹن کے آس پاس دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح سے ریڈ انڈین بھی ملک کے تقریباً ہر کونے میں پھیل گئے ہیں لیکن ان کی اکثریت بھی منی سوٹا اور اس کے گرد و نواح کی ریاستوں کو آباد کیے ہوئے ہے۔ اگرچہ امریکن تہذیب جو کہ کئی تہذیبوں کا ملا جلا مرکب ہے، سب جگہ ہی چھائی ہے لیکن اب بھی کچھ مخصوص جگہوں پر ایک ہی طرح کے باشندوں کے تعلق سے مقامی طور پر ان کے مخصوص رنگ کی گہرائی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ان ہی جگہوں سے آئے ہوئے لوگوں کا رہن سہن، کھانا پینا، مکانوں گرجا گھروں کی بناوٹ وغیرہ امتیاز رکھتی ہے۔

منی سوٹا اور مینا پولس میں آئرش قدریں وہاں کی زندگی میں جھلکتی ہیں۔ ان میں سے اکثریت کیتھولک لوگوں کی ہے۔ یہاں والدین آج بھی اصرار کرتے ہیں کہ ان کے بچے چاہے لڑکے ہوں یا لڑکیاں، اندھیرا ہونے کے بعد گھر سے باہر نہ رہیں اور اگر کسی وجہ سے یہ ناگزیر ہو جائے تو فوراً گھر میں فون کر کے اطلاع دیں، اور والدین سے اس کی باقاعدہ اجازت لیں۔ اس بارے میں پریسٹن اور بیٹی کو میں نے اکثر ڈانٹتے سنا تھا۔ وہ گھر میں ڈسپلن اور ضابطے کے بے حد قائل تھے بچوں کو صرف مخصوص ٹی وی پروگرام ہی دیکھنے کی اجازت تھی۔ وہ اس بارے میں خاصے فکرمند تھے کہ ان کے بچے اپنا فالتو وقت بیکار باتوں میں نہ خرچ کر کے وقت کا صحیح مصرف سیکھیں۔

میں بچوں کی خوش اخلاقی اور سلیقے سے بے حد متاثر تھا۔ ایک بار جب میں نے پیٹرک کو اس سلسلہ میں مبارک باد دی تو وہ فخر سے تن کر بھولے پن میں کہنے لگا "پاپا اور ماما نے ہمیں آپ کے قیام

کے دوران خوش اطواری کی سخت تاکید کی ہے!"
اس سے صاف ظاہر تھا کہ دنیا میں ہر جگہ باشعور والدین بچوں کو ایک ہی طرح کی تربیت دیتے ہیں۔ ہندوستان میں ہمارے گھروں میں بھی ایسی ہی تاکید کی جاتی ہے۔

ہیگلن پر-ووار کے سبھی لوگوں کو سماجی بھلائی کے کاموں میں خاصی دل چسپی تھی۔ بریسٹن پیشہ ورانہ اداروں سے الگ ایک ممتاز مقامی اسکول کے بورڈ پر ایک اعزازی ڈائرکٹر تھے۔ پیٹی اور سینئر مسز ہیگلن بوڑھوں اور عمر رسیدہ لوگوں کے ادارے کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ میں اس ادارے کے آشرم میں بھی گیا۔ یہاں کا انتظام اور صفائی اچھے خاصے ہوٹل کے معیار کی تھی۔ ان عمر رسیدہ لوگوں کو وقت سے ویسا ہی کھانا ملتا جیسے معمول گھروں میں ملتا ہے۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے پیٹی اور مسز ہیگلن جیسے کئی لوگ مقررہ وقتوں میں آکر ان کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ طبی علاج کے لیے ڈاکٹر اور نرسیں بھی موجود تھیں یہ سب لوگ ان سے طرح طرح کے کھیل کھیلتے اور کھلاتے اور چھٹی کے دن انھیں باہر پکنک پر یا گھمانے بھی لے جاتے۔
میرے ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے سبھی لوگ ہندوستان میں دل چسپی لینے لگے تھے پیٹی اور بریسٹن نے تو ہندوستان کے بارے میں کچھ کتابیں بھی پڑھ رکھی تھیں۔ میرے قیام نے انھیں ہمارے دیش کو جاننے سمجھنے کے لیے مزید ابھارا۔ وہ ہمارے مسائل کو، گھریلو اور سماجی زندگی کو گہرائی سے سمجھنا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں نہرو کی دو کتابیں Discovery of India، Letters to India تحفتاً دیں۔ جو انھوں نے فوراً پڑھنا شروع کر دیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مجھ سے مزید کتابوں کی فہرست بھی بنانے کے لیے کہا تاکہ وہ ہندوستان کے بارے میں اپنی جانکاری میں اور بھی اضافہ کر سکیں۔ ان کے اشتیاق کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ کتابیں دستیاب نہ تھیں جنھیں میں نے ہندوستان لوٹ کر بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔

اس سلسلہ میں انھوں نے مجھے اپنے اکثر دوستوں سے ملوایا اور پھر اکثر بہ مواقع ہندوستان سے مزید واقفیت کے سبب بنے بالکل اسی طرح کے مواقع میرے گروپ کے دوسرے ممبروں کو بھی مل رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس تین ہفتہ کے قیام میں مینا پولس میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو گا جو کہ ہندوستان کے چرچے سے خالی رہا ہو گا۔

مجھے ان مٹر کے دانوں کے خاندان سے ایک عقیدت سی ہو گئی تھی اور وہ بھی مجھے اور میرے پروار کے دوسرے لوگوں کو اپنے گھر کا فرد ہی سمجھنے لگ گئے تھے۔

ایک بار میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے پیٹرک کے کمرے میں سے جن کے رونے کی آواز آئی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ بریسٹن اور گھر کے دوسرے افراد گھر کے اندر تھے۔ شاید جن کی کسی غلطی پر والد نے اس کی ٹھکائی کی تھی۔ میرا اس طرح سے غیر ارادی طور پر جھانکنا، ایک نازک موقع تھا۔ اب جب میں نے جھانک ہی لیا تھا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ پانچ سالہ جن نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے دلیری سے کہا "کچھ بھی تو نہیں ہوا ہی! اب سب ٹھیک ہو گیا ہے!" "اگر ایسا ہے تو بھاگ کر مجھے کس KISS دو!"
جن کی آنکھوں میں نمی تھی اور آنسو اس کے گول مٹول گالوں سے بہہ رہے تھے۔ "ٹھہریے! میں ابھی منھ دھو کر آتا ہوں!" اور وہ باتھ کی طرف بھاگ گیا۔

اب آپ ہی بتائیے کوئی کیسے اس مخلص پر-ووار سے محبت کیے بنا رہ سکتا تھا۔

[illegible]

جلد [illegible] • شمارہ ۲ • [illegible]

صدر ایڈیٹوریل بورڈ
[illegible]

ایڈیٹر اِن چیف
[illegible]

مینیجنگ ایڈیٹر
[illegible]

ایڈیٹر
[illegible]

ایسوسی ایٹ ایڈیٹر
[illegible]

ایڈیٹر قانونی
[illegible]

ایڈیٹر اقتصادیات
[illegible]

آرٹسٹ
[illegible]

سول ڈسٹری بیوٹرز
[illegible]

[illegible]

# حرفِ دانش

کون کہتا ہے کہ نیک انسان موت آنے پر مرجاتا ہے۔ وہ تو ندی کی طرح سمندر میں اتر جاتا ہے۔

●

جس خدا نے محبت جیسی چیز تخلیق کی ہے، اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

●

ازدواجی زندگی سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے دوستانہ محبت سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے، اور آوارہ محبت اسے خراب کردیتی ہے۔

●

وقت کے ساتھ سوکھی جھاڑیاں پھر سے ہری بھری ہو جاتی ہیں، موسم سرما کی برف پگھل جاتی ہے تو ہوائیں نرم پڑجاتی ہیں آسمان پرسکون چھاجاتا ہے، اور پرندے بھی اپنا اپنا راگ الاپنے لگتے ہیں۔ لیکن حسرت زدہ اور ٹھکرائی ہوئی محبت پھر سے پھل پھلانے کے قابل نہیں رہتی۔

●

محبت کی آگ کو تازہ رکھنا ضروری ہے جس کے لیے حسن شاداب کارگر ہوتا ہے۔ محبت کے پنکھ قید و بند میں جھڑ جاتے ہیں۔ آزاد ہونے پر ہی ان میں بلندیوں میں پرواز کرنے کا جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔

●

آدمی کی محبت اسکی زندگی کا ایک پہلو ہے۔ عورت کی محبت اس کے تمام وجود کے مترادف ہے۔

●

اگر آپ صرف انھیں چیزوں سے محبت کرتے ہیں جو آپ کی محبت کے قابل ہیں تو آپ کی محبت بہت ہی سودمند ہے۔

●

محبت میں ان سب چیزوں کا تجربہ ہوتا ہے جیسے خوشی، غم، لرزتے شکوک، یقینِ محکم، امید و بیم، گھٹی گھٹی آرزوئیں۔ درد و غم میں محبت انسانیت سے لبریز ہوجاتی ہے۔ شدت پہ آتی ہے تو بہت ہی مختصر لیکن بہت ہی سرمدی اور یزدانی ہوجاتی ہے۔

●

سوکھی روٹی اور ٹھنڈا پانی پیش کرنے والی جھونپڑی میں پنپا پیار واقعی پیار ہوتا ہے۔ جہاں راکھ، کوئلے اور دھول جیسی چیزوں کو بالائے طاق رکھا جاسکتا ہے۔ محلوں کا پیار ایک ایسی عقوبت کے مترادف ہے جو کسی پارسا کے روزے سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔

# احباب لکھتے ہیں

'حال ہند' کے بیکر میں آپ نے کیا خوبصورت میگزین نکالا ہے۔ ٹھاکر صاحب کو میں کشمیر سے جانتا ہوں لیکن سیاسی مراحل اور قانون دان نے سلوص ایک صحافی بھی چھپا ہوا تھا اس کا مطابرہ کھل کر ہوا انھوں نے میری ایک دیرینہ خواہش پوری کر دی۔ کئی مدتوں سے کھٹک رہی تھی اور میں نے اس کا اظہار بہت سے صحافی دوستوں سے کیا لیکن اس کی تکمیل میری تحریک نے یہ ہوئی اس سے میری خوشی میں اضافہ ہوا۔ ایک معیاری جریدہ ہے

علی جواد زیدی

۳ ۶ دلی باغ کالونی۔ لکھنؤ

'حال ہند' کا دوسرا شمارہ اچھی طرح پڑھ لیا مشکل سے یقین آتا ہے کہ حال ہند حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ یہ کافی عرصہ پہلے سے شائع ہوتا رہا ہے اس کی کتابت طباعت تحریر، سنجیدگی نے زندگی کے ہر شعبہ پر گہری چھاپ ڈالدی ہے۔ اس کی شہرت سے خود ساختہ نقارخانوں میں نقلی اور گونگے طوطوں کی آواز دب گئی واقعی رسالہ 'حال ہند' ادیبوں، دانشوروں پرخلوص سیاسی لیڈروں نے وسیلوں اور باہمت غازیوں کے دروازے پر دستک دے رہا ہے کہ جاگو اور دوسروں کو بھی جگا دو کہ حال ہند کا آفتاب طلوع ہو گیا جو اب مشعل راہ کا کام دے گا

سید شوکت احمد

نگرمل باغ، سری نگر، کشمیر

کیا رسالہ نکالا ہے آپ نے۔ اردو میں اب تک ایسا کوئی رسالہ نہیں نکلا تھا اور یقینی طور پر اس کی سخت ضرورت تھی

عبدالصمد تانندہ۔ بہار

پرچہ اتنی نفاست کے ساتھ شائع ہوا ہے میرے خیال میں اس وقت اردو کا کوئی سیاسی جریدہ اس قدر معیاری اور دیدہ زیب نہیں ہے پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ اردو کا کوئی سیاسی پرچہ ہے۔ اردو میں بھی ایسا نفیس اور سنجیدہ خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ رسالہ شائع ہو سکتا ہے پتہ چلا کہ اگر ذہن تازہ کار اور دل سیاست اور صحافت، ادب اور ثقافتی دلچسپیوں میں کسی کی جڑیں بہت گہرائی تک چلی گئی ہوں تو وہ 'حال ہند' جیسے جریدے کا اجرا کر سکتا ہے۔

فاروق سعق۔ کلکتہ

ماہنامہ 'حال ہند' جن سیاسی، سماجی اخلاقی تہذیبی معیاروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو دنیا میں داخل ہوا یہ ایک جرأت مندانہ اقدام نہیں بلکہ دیگر جریدوں کے لیے کھلا چیلنج بھی ہے ٹھاکر صاحب نے ایک ایسی کمی کو پورا کیا ہے جس کی ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ اس کی کتابت، طباعت، اشاعت عین ٹھاکر صاحب کے اندازِ فکر کی طرح ہیں۔ اس کے تمام مضامین سچائی و حقیقت پرستی ہی نہیں بلکہ ایک ضروری معلومات کا قیمتی خزانہ بھی ہیں جس کا آغاز اچھا اس کا انجام بھی اچھا ہی ہوگا۔

فیضی امروہوی ملاڈ۔ بمبئی

میرے نزدیک 'حالِ ہند' کا تیسرا شمارہ ہے۔ حق تلفی، انسانیت سوز، اقدار، وقت کی آشیں' بہ تمام گوشے قابل ستائش ہیں۔ روس اور مطالعۂ غالب اور قرۃ العین حیدر کا فن جناب محمد علی صدیقی سے گفتگو پڑھ کر کچھ نئے نئے گوشے سامنے آئے۔

اسعد رضوی۔ مظفر پور بہار

# یہ مذاکرے یہ مباحثے

ممتاز کارٹونسٹ لکشمن کی ایک بے مثل تخلیق گزشتہ دنوں 'ٹائمز آف انڈیا' میں شائع ہوئی تھی۔ اس خاکے میں ایک مقرر کو کسی جگہ سے خطاب کرتے دکھایا گیا تھا۔ کارٹون کے نیچے درج عبارت اس طرح تھی:-

"حضرات! آسان سی بات ہے، یہاں
کی جغرافیائی سیاست کی مقناطیسی
قوت نسلی امتیاز کے جراثیم کو طاقت
بخشتی ہے اور پھر یہ مرض آفاقی شناخت
کی مرکزی قوتوں کو بھی نذر کر لیتا ہے۔"

اس مقرر کی پشت پر ایک بینر لگا تھا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرت دراصل "عالمی دانشوروں" کی ایک کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں۔ جو لوگ گزشتہ چند روز سے اخبارات میں اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ کے ذریعہ منعقدہ ایک پانچ روزہ میٹنگ کے بارے میں تفصیلات پڑھتے رہے تھے، ان کے لیے اس عبارت کے معنی کی تہہ تک پہونچنا مشکل نہ تھا، اس مجوزہ میٹنگ کا موضوع تھا "نئے آغاز کی طرف" یہ کانفرنس درحقیقت مشرق و مغرب کے دانشوروں کے ایک اجتماع کے مترادف تھی، جس میں روسی دانشور بھی شامل تھے، اور لکشمن کے خاکے کے نیچے درج عبارت قارئین کو کم از کم ایک ہلکا سا اشارہ دے رہی تھی کہ اس کانفرنس میں کس قسم کے ہوائی مباحثے ہوں گے۔ اب اس کانفرنس اور اس کی تحقیقات سے، ایک نئے عالمی نظام کے قیام کے سلسلے میں خود ہندوستان اور باقی دنیا کو کیا فیض حاصل ہوگا، اس بات کا فیصلہ تو ابھی ہونا ہے

دہلی تو پورے سال ہی سیمناروں، سمپوزیموں، ورکشاپوں کی آماجگاہ بنی رہتی ہے، اور یہ "نئے آغاز" والا سیمنار بس ان میں سے ایک تھا۔ اس "نئے آغاز کی طرف" والی کانفرنس کے ساتھ ہی ساتھ ممتاز دانشوروں کا ایک اور اجتماع بھی ہوا تھا، اور یہ سب حضرات ہندوستانی ہی تھے۔ یہ دانشور پنجاب کے حال اور مستقبل کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے، اور اس شورش زدہ ریاست کے حالات معمول پر لانے کے لیے علاج تجویز کر رہے تھے۔ اس بحث و مباحثہ کا نتیجہ لازمی طور پر تشدد کے خاتمے کے لیے اپیل کے روپ میں نکلا — یہ اپنے آپ میں ایک خوب صورت تصور ہے، اور یہ خیال اس سے قبل بھی زیادہ آسان لفظوں میں بارہا پیش کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ کوئی عملی علاج تو نہیں۔ سوال یہ ہے کہ تشدد کو ختم کرنے کے لیے پیش قدمی کون کرے گا؛ پنجاب کے دہشت پسند، ایک بے اثر، کمزور انتظامیہ یا پھر مرکزی حکومت؟ چوں کہ عرصۂ دراز سے پنجاب میں سب سے نازک اور اہم مسئلہ قتل و غارت ہی رہا ہے، جو اب طوائف الملوکی کی حد تک پہونچ گیا ہے، اس صورت میں دانشوروں کے ایک اجتماع کا یہ متحدہ مطالبہ، جادوئی طور پر ریاست کے امن و امان کو کس طرح واپس لا سکتا ہے۔ لفظ دانشور آج کل کافی مقبول ہے اور اس کی آڑ میں ایسے تعلیم یافتہ لوگ آجاتے ہیں جو کسی ایک موقف کے حامی ہوں، بہر کیف کانفرنس کے منتظمین نے اس سلسلے میں کوئی وضاحت نہیں کی۔

ہمارے ملک میں یکے بعد دیگرے اقتدار میں آنے والی مختلف حکومتوں کا پرانا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ فیصلے کی مشکل گھڑی سے بچنے کے لیے ایک کمیشن قایم کر دیا جائے۔ ہمارے یہ سیمنار اور سمپوزیم بھی اکثر و بیشتر ایک سعی لاحاصل سے زیادہ ثابت نہیں ہوتے۔ سچ بات یہ ہے کہ سیمنار کے محرکین اور منتظمین کا مقصد تو نیک ہو سکتا ہے، مگر غالباً وہ بھی بڑی سادہ لوحی سے یہی سمجھتے ہیں کہ کسی پیچیدہ مسئلے پر عوامی مباحثہ کر کے اس کے حل تک پہونچا جا سکتا ہے۔ تاہم حقیقت یہی ہے کہ بحث و مباحثے و اعلانات سے پُر بڑا اجلاس کسی مسئلے کو منظر عام پر لانے سے زیادہ کوئی خدمت انجام نہیں دیتے، بلکہ شرکاء کو یہ تسکین ضرور ہو جاتی ہے کہ انھیں اپنی بات کہنے کا موقع مل گیا۔ ہماری جیسی آزاد جمہوریت میں یہ بات بذات خود بھی کوئی بری چیز نہیں ہے، اور بعض اوقات اس طرح فضا بنانے میں مدد ضرور ملتی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہر مشکل قومی مسئلہ کا حل عوامی بحث و مباحثہ کے ذریعہ تلاش کیا جا سکتا ہے، اور پنجاب کا مسئلہ اسی طرح کا ایک مسئلہ ہے۔ وہاں صورت حال پہلے ہی عوامی بحث و مباحثے کی حد سے گزر چکی ہے اور دہلی میں ہونے والی دانشوروں کی اس کانفرنس سے پہلے ہی یہ امر واضح ہو چکا تھا کہ قتل و آتش زدگی کو محض تبادلۂ خیال کر کے نہیں روکا جا سکتا، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مباحثوں کے ذریعہ کسی مسئلے کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش کیا جا سکتا ہے، تو بھی اس میں سب سے بڑا خطرہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ مباحثہ فیصلہ کا متبادل بن کر رہ جاتے۔

علمی مباحثے ایک علاحدہ چیز ہیں اور تحریکاتی کانفرنس ایک الگ چیز ہے۔ گزشتہ دنوں نسل پرستی کے خلاف دہلی میں یوتھ کانگریس (آئی) کی جانب سے منعقد ہونے والا بین اقوامی اجلاس اسی قسم کا تھا۔ یوتھ کانگریس (ا) کا نصب العین پہلے ہی موجود ہو گر ان کا مطمح نظر واضح تھا، یعنی جنوبی افریقہ کی نسل پرستی کے خلاف عالمی رائے عامہ کو مستحکم کرنا — اور ظاہر ہے کہ اس معاملے میں مہذب دنیا کی دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ اس طرح کی کانفرنسوں میں پہل اور ان کی میزبانی کرنا ہندوستان کے حق میں اچھا ہے، کیوں کہ ہمارا ملک ہمیشہ سے نسل و رنگ کے امتیاز کے خلاف چلنے والی عالمی تحریکات کی قیادت کرتا رہا ہے۔

۳۰ جنوری کو مہاتما گاندھی کا ۳۹ واں یوم وفات تھا۔ اس سمت میں ہماری رہنمائی مہاتما جی نے ہی کی تھی، اور افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کو انصاف دلانے کے لیے جدوجہد کی تھی، اور اب دہلی میں نسل پرستی کے خلاف ہونے والی اس کانفرنس نے بھی اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ ہندوستان نسلی بربریت کے خلاف جنگ میں اپنا خاص کردار رکھتا ہے۔ یہ کانفرنس اسی بات کی ایک اور یقین دہانی ہے۔

Prem Bhatia

(پریم بھاٹیہ)

# فہرست







ڈاکٹر آشش نرائن رائے

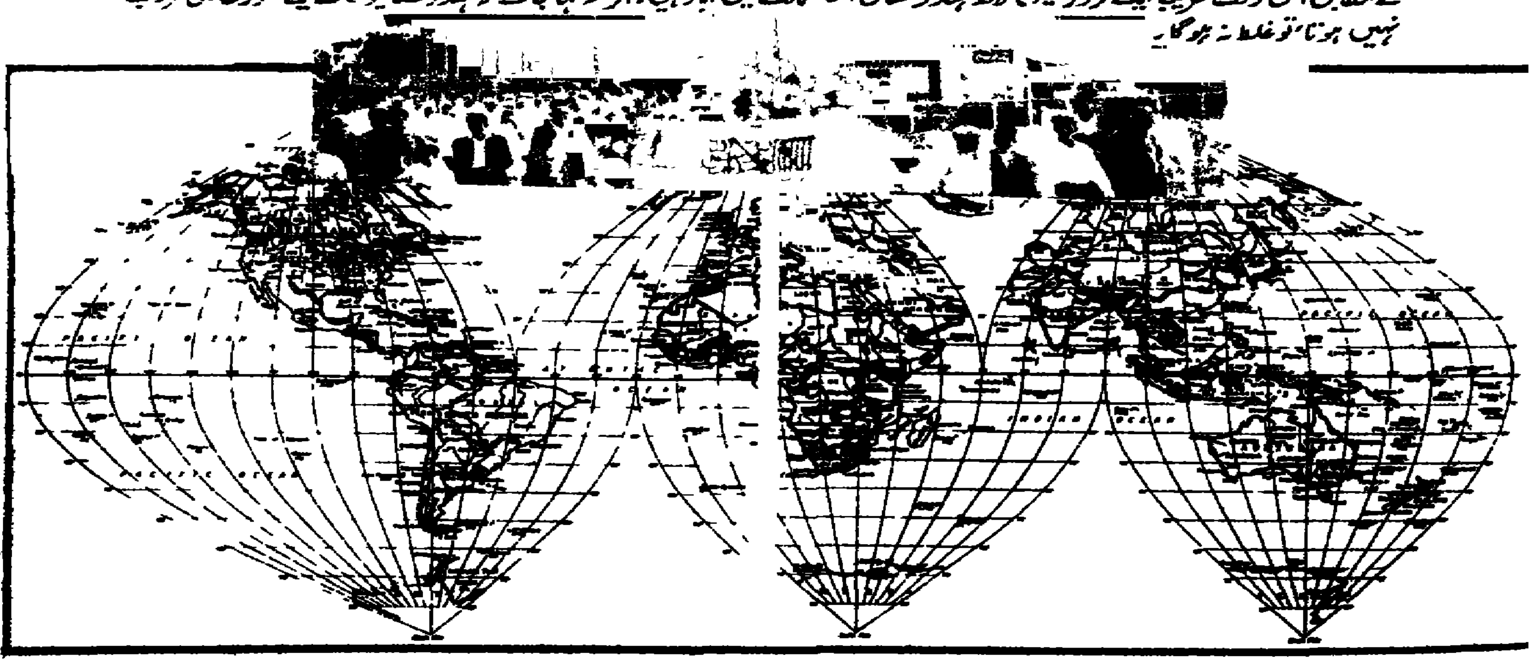
# دیس دیس بکھرے ہندوستانی

انسانی تاریخ قوموں کی ہجرتوں سے عبارت ہے۔ بنی نوع انسان کے وجود میں آتے ہی سفر کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ حضرت انسان نے یہ سفر کبھی خشکی میں کیا تو کبھی پانی میں، کبھی کرۂ ارض کی پیمائش کی تو کبھی سمندروں کو کھنگالا۔ یہ ہجرت اور یہ سفر پناہ گاہوں کی تلاش میں تھا اور ایک گھر، ایک ٹھکانہ بنانے کی خواہش انسانوں کے قافلوں کو ہر دم آمادۂ سفر رکھتی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ نقل و حرکت حیاتِ انسانی کا جزو لاینفک رہی ہے اور ہر دور میں دونوں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ انسانوں کے قافلے سرد علاقوں سے معتدل علاقوں کی جانب، اور گرم خطوں سے سرسبز و شاداب خطوں کی جانب سرگرم سفر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے اسی اُمت بنی اسرائیل کے ساتھ دریائے نیل پار کر کے مصر سے سرزمین خاص کی جانب مراجعت کی تھی۔ آریہ وسط ایشیا سے ہندوستان آئے تھے

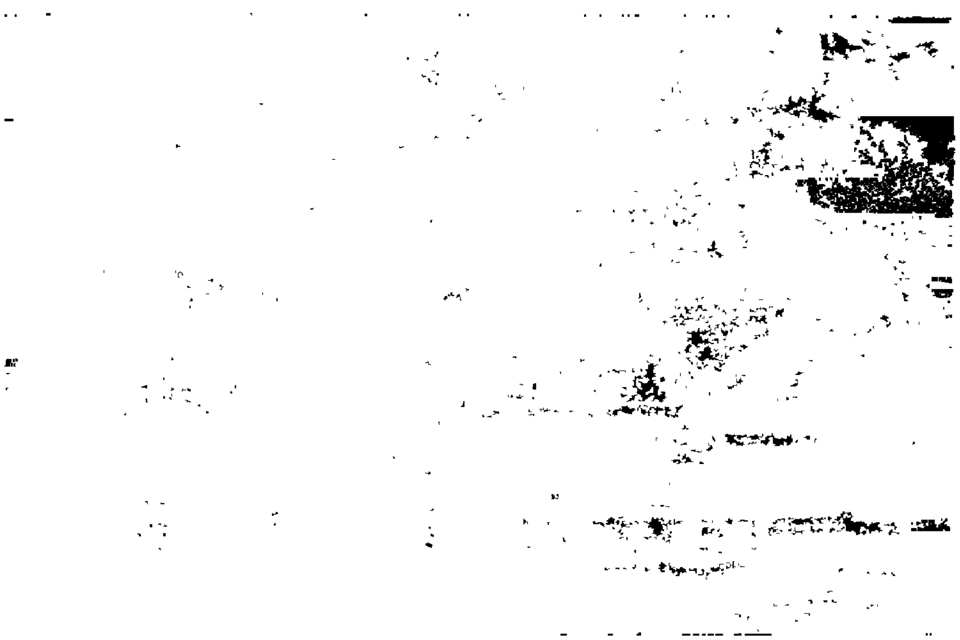
انہی تارکین وطن نے پرانی دنیا چھوڑ کر نئی دنیا بسائی۔ آج کا امریکہ یورپ سے نقل وطن کر کے آئے لوگوں سے ہی آباد ہے اس طرح اگر دنیا بھر سے مہاجرین و تارکین وطن کو جمع کر لیا جائے اور ایک جگہ آباد کیا جائے تو شاید اس طرح جو قوم وجود میں آئے گی وہ دنیا کی سب سے بڑی قوم ہوگی اور جو ملک نقشۂ عالم پر ابھرے گا وہ دنیا کا سب سے کثیر آبادی والا ملک ہوگا۔ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے یہ تو آباد ایک بڑے مجمع الجزائر کے جزیروں کی طرح ہیں جو دُور دُور بکھرے ہوئے ہیں۔

زمان و مکان کی رعایت سے تشریح کی جائے تو یہ مراجعتیں دو طرفہ حیثیت رکھتی ہیں۔ لوگ ایک جگہ سے اکھڑے ہیں تو دوسری جگہ آباد ہوئے ہیں۔ ایک سرزمین کو خیرباد کہہ کر انھوں نے نئے ملکوں کو اپنا وطن بنایا ہے۔ تجربہ اور تحقیق سے کافی معلومات حاصل ہو جانے کے باوصف اس معاملے میں ہمارا علم ابھی ادھورا ہے اور صحیح طور پر یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ تاریخ کے کس دور میں کہاں کہاں ہجرت ہوئی، کس پیمانے پر ہوئی؟ نہ جانے کتنی ہجرتوں، مراجعتوں اور نقلِ وطن و نقل مکانی کے واقعات ہوں گے جن کا ابھی ہمیں علم ہی نہیں ہے

ہندوستان کے باشندے اپنے مزاج اور فطرت کے اعتبار سے نقلِ وطن کے حق میں نہیں رہے ہیں۔ کبھی صبر آزما حالات میں اگر انھوں نے ترکِ وطن کیا بھی ہے تو اپنے اصل وطن واپس جانے کی خواہش ان کے دل میں مستقل طور پر رہی ہے۔ ہندوستان سے مختلف معاشرتی و اقتصادی پس منظر والے لوگ تبدیلیٔ وطن کر کے نئی اور پرانی دنیاؤں، دونوں جگہ آباد ہوتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ ہندوستانی ۵۶ ممالک میں آباد ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستانیوں کے لیے سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تو غلط نہ ہوگا۔



# ویسٹ انڈیز میں ہندوستانی رسم ورواج



ہندوستانیوں کو اپنی ہزاروں سال پرانی ثقافت اور شاندار ماضی کا بڑا احترام رہا ہے۔ بیرونی ممالک میں رہنے والے ہندوستانی لوگ اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں جہاں بھی گئے انھیں اپنی الگ پہچان کو برقرار رکھنے کے لیے بڑی کاوش کرنی پڑی۔ کچھ انھوں نے دنیا بھر میں ہندوستان کی ثقافتی میراث کو زیادہ تر برقرار رکھا ہے اور ہندوستانی ثقافت کے کچھ پہلو جدید کاری اور مغرب زدگی کی رو میں بہہ جانے سے بچے ہوئے ہیں۔ یہ صورت حال جس قدر بہت سی چھوٹی چھوٹی کریبیائی مملکتوں یعنی ویسٹ انڈیز کے تعلق سے صحیح ہے دوسرے ممالک میں اس قدر نہیں ہے۔

ہندوستانی تہذیب کی سر بلندیت اور اس کی تقویت کا بھلا ہو کہ جس کی بدولت ہندوستان کی ثقافت غیر ملکی ثقافتوں کی بے شمار چیرہ دستیوں سے محفوظ رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانیوں نے ہمیشہ سے دوسری ثقافتوں سے متاثر ہونا گوارا نہیں کیا جیسا کہ ترینی داد کے نوجوان نے خبردار کیا ہے

"ہم کسی ایسی کوشش کو برداشت نہیں کریں گے جو ہمیں کسی ایسے سانچے میں ڈھالنے کے خیال سے کی جائے گی جو ہمارے وطنی مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو۔"

اس رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ افریقی و کریبیائی مملکتوں نے عملی طور سے اپنے آبائی برّ اعظم سے ثقافتی رشتہ توڑ لیا تاہم ہندوستانیوں نے اپنی ثقافتی میراث کو زیادہ تر برقرار رکھا ہے۔ اگرچہ اول الذکر مملکتوں نے غلامی کے دوران اپنے مختلف یورپی حکمرانوں کی ثقافت سے گہرا اثر لیا تاہم موخر الذکر یعنی ہندوستانیوں نے احترامی اقدار اور سماجی طور طریق کو کم اہمیت دی، اور ملی جلی افریقی ثقافت کو اپنی نئی شناخت کے

## اپنے ہی گھر میں پرایا



[illegible]
چھوٹی [illegible]
اگر [illegible]
نے وطنی تعلیم کے لیے [illegible]
وہ [illegible]
تحقیق کرنے کے لیے امریکہ آگیا ہے [illegible]
جب تارکین وطن کے لیے یہ [illegible]
امریکہ میں آمد کے وقت [illegible]
[illegible] قرار دیا گیا [illegible]
[illegible]



علم بردار کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا۔ اسی طرح ان کے خاندان کا ڈھانچہ بیرونی دباؤ سے ٹوٹا نہیں جیسا کہ افریقی لوگوں کے ساتھ ہوا۔ اس کے نتیجے میں کریبائی ملکوں میں ہندوستانی ثقافت زیادہ آسانی کے ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہی اور اسے زندہ نیز متحرک رکھا گیا۔

ہندوستان سے آنے والے لوگ نہ صرف اپنے مذہبی و ثقافتی عقائد و عوامل اپنے ساتھ لائے بلکہ وہ ہندوستان کے رنگا رنگ تہوار، خوراک و پوشاک کی عادتیں اور ہندوستان کے سماجی نظام کے اقداری معیار بھی ساتھ لے آئے۔ ویسٹ انڈیز جیسے دور دراز ممالک میں رہنے والے ہندوستانیوں کے لیے اس طرح کی بھرپور ثقافتی میراث بڑی ہی استقامت انگیز اور راحت بخش ثابت ہوئی۔ شروع میں ہندوستانی اپنے ان مذہبی طور و طریق پر دھیمے انداز میں عمل کرتے رہے جن کا دوسری نسلوں کے لوگ کبھی کبھی مضحکہ اڑایا کرتے تھے البتہ دھیرے دھیرے ہندوستان کے تہوار وہاں قومی اہمیت اختیار کر گئے آج دیوالی اور پھاگوا (ہولی) کی تقریبات گیانا، ترنی داد اور ٹوبیگو میں قومی تعطیلات بن چکے ہیں

گیانا۔ ترنی داد، ٹوبیگو اور سورینام میں، جہاں ہندوستانی لوگ سب سے بڑا واحد طبقہ ہیں، دیوالی کا تہوار بڑے جوش و خروش اور شوق سے منایا جاتا ہے۔ مشرقی اتر پردیش اور مغربی بہار کی طرح، جہاں کے بیشتر ہندوستانی وہاں آباد ہیں، وہاں ہندو لوگ اپنے گھروں کی صفائی کرتے ہیں اور انھیں موم بتیوں اور چراغوں سے روشن کرتے ہیں۔ وہ ایسی محرابیں تعمیر کرتے ہیں جن میں بتیاں لگائی جاتی ہیں پارسا ہندو لوگ برت رکھتے ہیں، لکشمی کی پوجا کرتے ہیں۔

اور "جے لکشمی ماتا" جیسے بھجن بھی گاتے ہیں۔ جن علاقوں میں ہندوستانی لوگ زیادہ تعداد میں آباد ہیں وہاں دیہاتی میلے لگتے ہیں اور وہاں کے محمد رفیع اور کشور کمار ہندی فلموں کے گانے گاتے ہیں۔

ایک دوسرا اہم تہوار ہولی ہے جو ویسٹ انڈیز میں ہر دل عزیز ہے اور دلچسپ بات یہ ہے

کرتری داد میں بھی یہ عوامی اہمیت کا حامل ہے جہاں بہار کا موسم نہیں ہوتا۔ ہولی کے مخصوص گیت جیسے "ہولی کھیلت نند لال برج میں"۔ ڈھولک، منجیرا اور کھڑتالوں جیسے ہندوستانی سازوں کی دھن پر اب بھی وہاں کے بزرگ لوگ خاص طور سے گاتے ہیں۔ کچھ مقامات پر اس تقریب کے سلسلے میں چوگان کھلانے کے مقابلوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ کچھ علاقوں میں رام نومی، کرشن اشٹمی، شوراتری، دسہرہ، محرم اور عید الفطر بھی منائے جاتے ہیں۔



بڑی دل چسپ بات ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے تہواروں اور مذہبی تقریبات میں کھلے بندوں شامل ہوتے ہیں اور ان میں مذہبی تبدیلی عمل میں نہ لانے کا سمجھوتہ سا کار فرما ہے۔ ترنی داد اور گیانا میں ہندوستانی لوگ ایسے روایتی نوعیت کی ملی جلی سرگرمیوں میں شرکت کرتے ہیں، جیسے اسٹیل بینڈز اور کارنیوال۔

اسی طرح دیوالی اور ہولی زیادہ ملے جلے ہوتے جا رہے ہیں اور کارنیوالوں جیسی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ بہت سے ہندوستانی عیسائیوں کا بپتسمہ اپنا لیتے ہیں، اور ہندوستانی رسومات اور مذہبی رواجوں کو چھوڑے بغیر باقاعدہ گرجا گھروں میں جاتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے گھروں میں، ان کی دیواروں پر رام، کرشن، شیوجی اور ہنومان جی کی تصاویر کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰ اور عفت مآب مریم کی تصویریں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ مسلمان بھی عیسائیت کو گوارا کرتے ہیں۔

ایک بہت ہی خفیف حالت کے علاوہ ذات پات کا نظام وہاں ناپید ہے۔ تبدیلی ملک کے ابتدائی دنوں سے ان ممالک میں ذات پات پر عمل کرنا ناممکن سا تھا۔ جہاں ہر شخص مزدور بن جاتا تھا اور جہاں ایک مقامی کہاوت کے مطابق جب بھی کوئی ہندوستانی جہاز سے اترتا تھا وہ برہمن بن جاتا تھا۔

بلیئر موں اور لوریٹ موراں کے ایک مطالعہ کے مطابق، ہندو گھرانوں کے ½ سربراہوں کو اپنی ذات کا علم نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ ذات پات سے سماجی [illegible]

یعنی ایسی جگہ جو ارضی جنت کی حیثیت رکھتی ہے، تو میں ہند کا نام لوں گا۔"

---

اب دو سال بیت چکے ہیں [illegible] کی تعلیم مکمل ہو سکتی ہے [illegible] کا احساس [illegible] ہے [illegible] سے بہت متاثر کیا ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] کے اخلاق اور سائنسی و تکنیکی ترقی نے اسے بہت متاثر کیا ہے۔ [illegible] سرکاری [illegible] کی حیثیت اب [illegible]

جانے لگی ہے [illegible] یہ احساس [illegible] اب اس کا وقت [illegible] ہندوستانی [illegible] میں، امریکی دوستوں کے ساتھ [illegible] امریکیوں کا گرم جوشانہ، دوستانہ [illegible] خوشی سے سرشار کر دیتا ہے ——— [illegible]

[illegible]



وقار میں نہ اضافہ ہوتا ہے نہ کمی آتی ہے۔ مسرا، مسیر، شکل، پانڈے اور سنگھ جیسے چند ذات کے ناموں کے علاوہ کوئی ایسا لاحقہ استعمال نہیں کیا جاتا۔

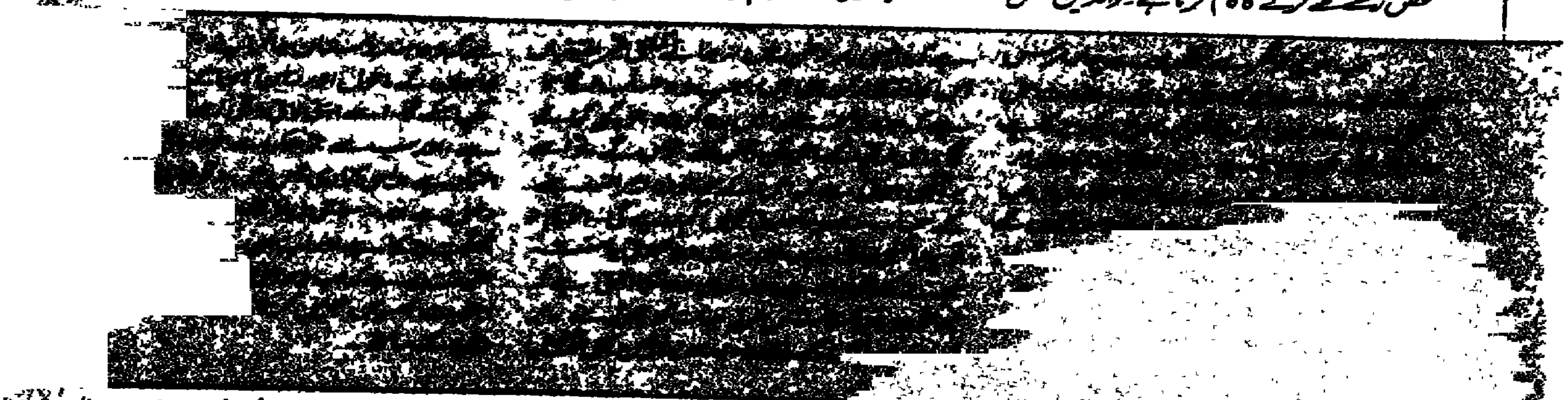
وشنو اور انکے دو اوتاروں رام اور کرشن سے وابستہ نام عام ہیں۔ عجیب سی بات ہے کہ درحقیقت میں گیانا اور ترنی داد کے آباد کاروں سے وابستہ انیسویں صدی کے دوسرے نصف سے متعلق ووٹ دہندگان کی فہرست کا معائنہ کر رہا تھا تو میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ اکثر لوگوں کے نام ایک جیسے یعنی رام، کرشن، مہادیو، شنکر وغیرہ تھے متعلقہ حکام نے مجھے یہ وضاحت پیش کی۔ باغات کے مالکوں نے ٹھیکے کے ان مزدوروں کو یہ کہہ کر معروف کیا تھا کہ وہ جلد ہی بہت سا زر و مال کما کر اپنے دیس لوٹ جائیں گے، اگرچہ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ انھیں کہاں لے جایا جا رہا ہے اس وقت سمندر کے سفر میں چار سے پانچ ماہ لگ جاتے تھے۔ کچھ لوگ راستے ہی میں مر جاتے تھے اور بہت سے لوگ ناموافق حالات کے سبب سے بیمار ہو جاتے تھے۔ جو بچ جاتے تھے وہ بری حالت میں ہوتے تھے۔ جہاز سے اترتے وقت برطانیہ کے حکام ان سے ان کے نام دریافت کیا کرتے تھے۔ انھیں انگریزی نہیں آتی تھی اور وہ اپنے اپنے بھگوان کا نام بولتے تھے۔ اسی طرح وہ ووٹ دہندگان کی فہرست میں اپنا نام درج کرواتے تھے آج بھی ان کے عام نام ہیں رام پرساد، رام کسون، سری کسون، رام چرتر، رام نارائن، کنج بہاری وغیرہ۔

جیون ساتھی چننے کے سلسلے میں ذات پات کا خیال بہت ہی کم اہمیت رکھتا ہے۔ شادی اب جوان ہوتے ہی مدنظر نہیں رکھی جاتی اور نہ ہی کوئی شخص رشتے طے کرنے کا کام کرتا ہے۔ والدین کی رضامندی کے ساتھ باہمی محبت کی شادی بہت عام ہوگئی ہے۔ ہندوستانی اپنے ہی لوگوں میں مختلف ذاتوں اور مختلف مذاہب کے افراد کے درمیان شادی کے سلسلے میں خاصی فراخدلی سے کام لیتے ہیں لیکن کالے رنگ کے لوگوں کے ساتھ شادی کرنے کے وہ بڑے ہی مخالف ہیں، اگرچہ ہندوؤں میں شادی بڑے تبرک کے ساتھ کی جاتی ہے اور تمام رسومات بدستور ہوتی ہیں پھر بھی آریہ سماج کی رسومات کے ساتھ شادی عمل میں لانا بہت مقبول ہوتا جا رہا ہے سورینام میں شادی کا قانون ۱۹۴۱ء سے نافذ کیا گیا تھا جس کے تحت ہندو اور مسلمان اپنے اپنے پروہتوں کے ہاتھوں شادی کی رسومات عمل میں لا سکتے تھے۔ ترنی داد کے قانون نے بھی ہندو طریق شادی کو ۱۹۴۶ء میں تسلیم کر لیا اور اس کے بعد سے ایسی شادی کو اتنا ہی درست تصور کیا جاتا ہے جتنا کہ گرجا گھر میں عیسائی طریق کی شادی۔

ہندی اور اردو وہاں مخصوص سی زبانیں ہیں، جنھیں صرف مذہبی رسومات اور تقریبات میں استعمال کیا جاتا ہے، اگرچہ بزرگ لوگ اب بھی یہ زبانیں بولتے ہیں۔ کچھ لوگ گھروں میں بھوج پوری اور [illegible] زبانیں بھی بولتے ہیں ورنہ انگریزی زبان جس کی علاقائی قسم کو ٹکی ٹکی کہتے ہیں، تمام آبادی کی مشترکہ زبان ہے۔

کھانے کے سلسلے میں ہندوستانی نوعیت کی پابندیاں اب اس قدر نادر نہیں ہیں جس قدر کہ وہ ابتدائی دور میں تھیں مثال کے طور پر ویسٹ انڈیز میں گائے کو متبرک نہیں سمجھا جاتا اور اس کا گوشت ہندوستانی اکثر کھاتے ہیں۔ اسی طرح رہن سہن معتدل طریقہ اور پرانی نسل کی سادہ مزاجی جو آبائی وطنوں کی میراث تھی، اب دھیرے دھیرے خاص کر نوجوان نسل میں، زیادہ مادی اور مغربی انداز کے [illegible] مزاجانہ طریق زیست سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں۔

ان تمام تبدیلیوں اور اثرات کے باوجود وہاں کے ہندوستانی اپنی ثقافتی میراث کا بڑے فخر کے ساتھ



[illegible] مت، ایران، عراق، جاپان، یوریو اور ملایا جیسے ممالک شامل تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ نالندہ اور ٹیکسلا کی ہماری قدیم دانش گاہوں میں غیر ملکی طلبا اکثر آتے جاتے تھے۔ تاہم اسباب جن کی اس وقت کوئی بھی "برین ڈرین" نہیں کہتا تھا۔

تب وہ کون سے اسباب ہیں، جن سے "برین ڈرین" تشکیل پاتی ہے؟ ہمارے سائنس دانوں، ڈاکٹروں، انجینیروں کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کی غرض سے ملک سے باہر جانے اور پھر وہیں پر بس جانے کی حقیقت کو شاید "برین ڈرین" نہیں کہنا چاہیے۔ جب تک کہ یہ ہماری معیشت کو کھوکھلا نہیں کرتی اور وہی ہمارے ملک میں کوئی ایسا خلا پیدا کرتی ہے جو پُر نہ ہو سکے۔ بایں ہمہ، کیا ہندوستان ان سے کہیں زیادہ سائنسداں اور ٹکنالوجسٹ تیار نہیں کر رہا، جنھیں وہ منفعت بخش طور پر کھپا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ جیسا کہ جے. بی. ایس. ہالڈین نے جامع انداز میں تحریر کیا ہے:

"مہاجرین وطن، اپنی لاعلمی کے جاننے
کے لیے کافی کچھ جانتے ہیں۔"

اور ان کا اعلیٰ معلومات حاصل کرنا اس حیثیت سے انسانی معلومات کی ترقی میں بہرحال معاون ہوتا ہے۔

البتہ عمدہ قسم کی افرادی قوت کا خارج ہونا، ایسے مفلس اور تنگ دست ممالک کے لیے ایک خسارے کا موجب بنتا ہے، جنھیں اعلیٰ استعداد کی اور ہنرمند افرادی تخلیق کرنے کے لیے مجبوراً اپنے قلیل وسائل صرف کرنے پڑتے ہیں۔ درحقیقت ترقی یافتہ دنیا نے ہمارے مادی اور افرادی قوت کے ہر دو وسائل خرد برد کرنے کی ایک "نوسامراجی" حکمت عملی مرتب کی ہے۔ پہلے نوآبادیاتی اور جدید نوآبادیاتی قوتیں ہمارے قدرتی وسائل کا استحصال کرتی تھیں اب وہ ہماری فہم و فراست کا استحصال کرتے ہیں اور ہماری قیمت پر پھلتے پھولتے ہیں۔ ہر دو حالتوں میں کم و بیش وہی مقصد اور مدعا کارفرما ہوتا ہے۔ اکثر یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اقتصادی اور فنی امداد دے کر ترقی یافتہ دنیا غریب تر ممالک کی دستگیری کرتی ہیں۔ ایسا البتہ دوسروں کی بہبودی کے جذبہ کے تحت نہیں کیا جاتا، بلکہ یہ تو ایک طرح کا ٹیکنالوجی سے وابستہ سامراج ہے، جو غریب ممالک کو غریب تر اور امیر ممالک کو امیر تر بناتا ہے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ ترقی پذیر ممالک ترقی یافتہ ممالک کو اپنے لائق و فائق اشخاص تحفتاً دے رہے ہیں، جن کی تعلیم و تربیت پر ملک نے لاکھوں ڈالر سالانہ خرچ کیے ہیں۔

ٹیکنالوجی کا یہ الٹا بہاؤ ہولناک ہے۔

۱۹۷۹ء میں تجارت اور ترقی کے عالمی ادارے کی جانب سے کی گئی ایک تحقیق سے ایک چونکا دینے والی شکل سامنے آئی، جس کے بموجب ہندوستان سے مغربی ممالک کو "برین ڈرین" کی قدر مالیت ۳۰۲ ملین امریکی ڈالر بنتی ہے۔ ہر بار جب ایک ہندوستانی ڈاکٹر امریکہ میں سکونت اختیار کرتا ہے، امریکہ کو ۶٫۵ لاکھ روپے کے فائدے کے مقابلے میں ہندوستان کو تقریباً ۳٫۲ لاکھ روپے کا خسارہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک سائنسداں کے ضمن میں امریکہ کو ۱۸٫۷۵ لاکھ روپے کے فائدے کے مقابلے میں ہندوستان کو ۱٫۳۲ لاکھ روپے کا نقصان رہتا ہے۔ ایک اور حساب کے مطابق ۱۹۴۹-۶۷ء کے دوران، لگ بھگ ایک لاکھ پیشہ ور ماہرین کے ترک وطن کی بدولت امریکہ کو لگ بھگ ۴۰ ارب ڈالر کی بچت ہوئی۔

"برین ڈرین" کے ظہور میں "عمل کشش" اور "عمل دفع" دونوں ہی کام کرتے ہیں۔ "عمل کشش" قبول کر لینے والے معاشرے کی دلفریبیوں پر مشتمل ہوتا ہے جیسے کہ بہتر زندگی گزارنے کے حالات، زیادہ تنخواہ، بہتر تعلیمی و تحقیقی سہولیات اور سب سے زیادہ یہ کہ [illegible] روایت سے آزادانہ [illegible] کا ایک قابل رشک سماجی وقار کی دستیابی کا خاصا امکان۔

"عمل دفع" میں عام طور پر اپنے دیس میں مکروہ اذیت کے حالات کا دخل ہوتا ہے، جن کا سبب یا تو وہاں کی آبادی سے متعلق مسائل ہوتے ہیں یا جابرانہ سیاسی صورت حال۔ البتہ ہندوستان میں "برین ڈرین" کی بڑی وجہ "عمل کشش" ہے نہ کہ "عمل دفع"۔

مثال کے طور پر، ہزارہا ہندوستانی سائنسدانوں اور دیگر اعلیٰ ہنرمند اشخاص کی غیر ممالک کو ہجرت کے باوجود ہندوستان میں، فقط امریکہ اور روس کے بعد، اب بھی دنیا میں تیسرے نمبر پر سائنسدانوں اور ٹیکنالوجسٹوں کی سب سے بڑی تعداد (لگ بھگ ۲۵ لاکھ) موجود ہے۔



ہندوستان میں کہیں بڑا مسئلہ "داخلی برین ڈرین" کا ہے، جس کا سبب ہماری تربیت یافتہ افرادی قوت کو کھپانے کے لیے کافی مواقع کا فقدان ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جب سے حکومت ہند نے ۱۹۵۸ء میں سائنسی حکمت عملی کا ریزولیوشن پاس کیا ہے، یونیورسٹیوں، ٹیکنالوجیکل اداروں نیز عوامی رقوم سے چلائے جانے والے سائنسی و صنعتی تحقیق کے اداروں میں سائنس کی تعلیم کے لیے سہولیات کی جامع توسیع ہوئی ہے۔ اہم ادارے، مثلاً کونسل برائے

سائنسی وصنعتی تحقیق، ہندوستان کی کونسل برائے زرعی تحقیق، ڈیمی توانائی کمیشن، تنظیم برائے دفاعی تحقیق و ترقی، طبی تحقیق کی ہندوستانی کونسل اور تنظیم برائے خلائی تحقیق وغیرہ۔ تحقیق و ترقی کی سرگرمیوں اور صنعتی پیداوار کی سریع توسیع کے لیے ضروری بنیادی ساز و سامان فراہم کرتے ہیں، البتہ ان اداروں سے فارغ التحصیل اشخاص موزوں طور پر کھپائے نہیں جا رہے ہیں کیوں کہ ہماری روزگار مارکیٹ بہت محدود ہے۔ ہم ایک ایسی فضا قایم کرنے میں بھی یکساں طور پر ناکام رہے ہیں جو سازگار ہو اور جس میں یہ لوگ مناسب صلے اور قدر شناسی کی ترغیب کے تحت کام کر سکیں۔

مختصراً ہم اپنے ہنرمند اشخاص کو مہارت طلب مواقع پیش کرنے میں نااہل رہے ہیں، جس کے نتیجے میں سائنسدانوں اور تیکنیکی کاریگروں میں مایوسی پیدا ہوتی ہے، جو آگے چل کر بالآخر ان کی دیگر ممالک کو ہجرت کا سبب بنتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ہماری تعلیمی منصوبہ بندی میں کوئی بنیادی خامی ہے، جس کے باعث یہ ہنرمند اور تربیت یافتہ اشخاص کی طلب و رسد میں ایک توازن قایم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ یہ امر افسوس ناک ہے کہ افرادی قوت کی طویل المدت اور قلیل المدت دونوں طرح کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہمارے تعلیمی نظام کو کام میں نہیں لایا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہماری منصوبہ بندی کے منطق اور ہمارے سماجی و اقتصادی نظام کے منطق میں فرق ہے۔ جیسا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں اشخاص کی بین الاقوامی نقل و حرکت پر یونیسکو کی ایک تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے:-

> "تارکین وطن کے ممالک میں موجود تعلیمی نظام ان کی ضروریات سے زیادہ گریجویٹوں کی تعداد پیدا کر رہے ہیں۔"

ایک حالیہ تحقیق کے مطابق اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کی غرض سے غیر ممالک کو جانے والے آئی آئی ٹی گریجویٹ میں سے لگ بھگ ۳۵ فی صد عام طور پر ہندوستان نہیں لوٹتے۔ انجینیری کے چند شعبوں میں ترکِ وطن کرنے والے انجینیروں کی تعداد کل تعداد کے ۴۰ تا ۵۰ فی صد ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ غیر ممالک سے ڈگریاں لے کر جب یہ گریجویٹ ہندوستان کے ماحول روزگار میں وارد ہوتے ہیں تو یہ جان کر انھیں انتہائی مایوسی ہوتی ہے کہ یا تو وہ کئی اسامیوں کے لیے ضرورت سے زیادہ استعداد رکھتے ہیں اور یا پھر ہندوستانی سیاق و سباق میں ان کی خصوصی مہارت کی نوعیت کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری ٹیکنالوجی اس ٹیکنالوجی سے کم از کم دس سال پیچھے جو مغرب میں عام ہے۔ جو لوگ مختلف کاموں میں لگا بھی دیے جاتے ہیں تو ان سے کبھی اپنی خصوصی مہارت کے مظاہرے کی شاذ ہی تاکید کی جاتی ہے ان کے کام کی نوعیت ایسی ہوتی ہے جو ان کی قابلیت اور پرواز فکر کا کوئی خصوصی مطالبہ نہیں کرتی۔

گوکھلے انسٹی چیوٹ آف اکنامکس اینڈ پولیٹیکل سائنس، پونہ کے پروفیسر وی۔ ایم ڈانڈیکر کا یہ قول برحق ہے کہ۔

> "برین ڈرین" اس دردناک علامت مرض کی مانند ہے، جو تہہ میں ایک شدید بیماری ہونے کا پتہ دیتی ہے اور اس تہہ میں چھپی بیماری کا انجام اس کی علامت سے جڑے ہوئے درد سے کہیں زیادہ شدید ہے۔"

لہٰذا اس کا علاج قابل اشخاص کو مصنوعی اعتبار سے بیرون ملک جانے سے روکنا نہیں ہے، بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ بہترین دماغوں کو اپنے ہی ملک میں قایم رکھنے کے لیے سازگار حالات پیدا کیے جائیں نیز وطن کی کشش میں اضافہ کیا جائے بایں ہمہ کسی کو ہنرمندی اور علم کی تحصیل سے کیوں روکا جائے؟ جو بات ان حالات میں بے حد ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری تعلیمی، سائنسی اور افرادی قوت سے متعلق منصوبہ بندی کرتے وقت زیادہ سوچ بچار اور دوراندیشی سے کام لیا جائے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے مؤثر اطلاق کے لیے نہ صرف سائنسی مزاج رکھنا ہی ہمارے لیے ضروری ہے بلکہ ایک ایسے سازگار سماجی، اقتصادی اور سیاسی ماحول کی بھی ضرورت ہے، جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی بروئے کار لائے جائیں۔

مکتوب اُتر پردیش

# ویر بہادر سنگھ

## نیا عزم نئے حوصلے

مظفر حسین سید

ریاستی سیاست نے ایک اور نیا رخ بدلا ہے۔ گزشتہ دنوں وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کے گدی چھوڑنے کی جو افواہیں گرم تھیں، وہ اب ٹھنڈی ہو گئی ہیں۔ ایک طویل سیاسی بحران اور طوفانی اُتھل پتھل کے بعد وہ کٹھ پتلی کا ہاتھ ہو تے پھر سے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ اگرچہ عام طور پر مسٹر ویر بہادر سنگھ کی انتظامی صلاحیتوں کے بارے میں ابھی رائے نہیں بن پائی ہے، لیکن حالیہ بحرانی صورت حال میں انھوں نے جس مشاقی سے ........ اپنا کام نکالا ہے، اس کو دیکھ کر تو ان کے دشمن بھی ان کا لوہا مان گئے ہیں، اور اب سبھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ویر بہادر سنگھ خواہ اچھے منتظم ہوں یا نہ ہوں مگر پکے سیاست داں ضرور ہیں۔ ان کے جو مخالفین گزشتہ دنوں ان کی ٹانگ کھینچنے کی کوششوں میں سرگرم رہے ہیں، اب ان کی سب امیدوں پر اوس پڑ گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ریاستی حکومت کے ملازمین کی طویل ہڑتال کے دوران حالات کافی دگرگوں ہو گئے تھے اور وزیر اعلیٰ کے مخالفین نے دن گننا شروع کر دیے تھے کہ وہ اب گئے اور تب گئے۔ مگر وزیر اعلیٰ نے اس پے چیدہ گتھی کو اس خوبی سے کھولا کہ ہاتھیاں بھی شاد رہا اور صیاد بھی ناخوش نہ ہوا۔ پندرہ فی صد عبوری راحت دے کر انھوں نے سرکاری ملازمین کا منھ بھی بند کر دیا، اور سرکاری ملازموں کے کام پر آتے ہی جب حکومتی مشینری ایک مرتبہ پھر سے حرکت میں آ گئی تو مخالفین کی زبانوں پر خود بخود تالے پڑ گئے۔ تاہم ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ان "اچھے دنوں" کی تعداد کتنی ہے۔ کیوں کہ وزیر اعلیٰ نے وقتی طور پر درپیش بحران کو حل کرنے کے لیے زید کو لوٹ کر بکر کو مالا مال کرنے والی پالیسی پر عمل کیا ہے۔ ہڑتالی ملازمین کو عبوری راحت دینے سے سرکاری خزانے پر جو نیا بوجھ پڑے گا، اسے کسی حد تک کم کرنے کے لیے روزانہ معاوضے پر کام کرنے والے پچاس ہزار عارضی ملازمین کو نکال باہر کرنے کا غیر منصفانہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب یہ "نوکر یدگان" بھی تحریک چلانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں، اور اس پر ستم یہ ہے کہ جن پندرہ لاکھ سرکاری ملازمین کی خوشی کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا، وہ بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہیں اور مرکزی حکومت کے ملازمین



کے مساوی مشاہرہ و دیگر سہولیات حاصل کرنے و دیگر بقیہ مطالبات منوانے کے لیے یہ لوگ پھر سے آندولن شروع کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں، لیکن یہ لوگ ابھی تک انتظار کریں گے، اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائیں گے۔

بہر حال اس صورت حال میں اس بات سے تو وزیر اعلیٰ کے دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے کہ، عارضی طور پر ہی سہی، مگر انھوں نے سب کو دھول میں جھونک کر، نئی زندگی اور نئی طاقت حاصل کر لی ہے۔

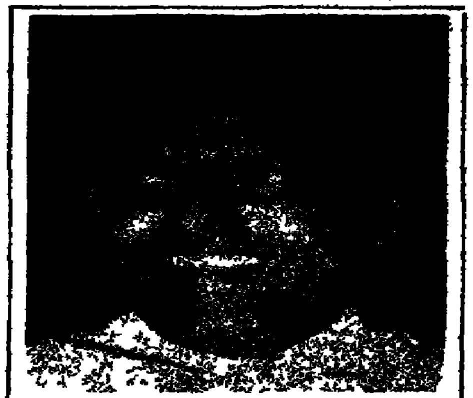
یہ امر قابل ذکر ہے کہ وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ نہ تو عوامی قائد ہیں، نہ ہی پارٹی میں ان کی جڑیں بہت گہری ہیں، وہ تو صرف مسٹر ارون نہرو کے طفیل میں اس تخت پر براجمان ہوتے تھے، اس وقت اتر پردیش میں ارون نہرو کا طوطی بول رہا تھا، اور مسٹر ویر بہادر سنگھ خود کوئی بہت لائق فائق یا طاقت ور امید وار نہ ہوتے ہوئے بھی اور شری کملا پتی ترپاٹھی جیسے گھاگ سیاست داں کی مخالفت کے باوجود صرف ارون نہرو کے طفیل میں مسند اقتدار پر جلوہ فگن ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پارٹی کے اندرونی حلقوں میں شدید مخالفت اور ناراضگی کے باوجود صرف مسٹر ارون نہرو کا زوال ہوا تو یہ بات یقینی سمجھی جانے لگی تھی کہ اب ویر بہادر سنگھ کے دن بھی پورے ہو گئے، مگر اس موقع پر انھوں نے بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے فوراً ارون نہرو سے ناطہ توڑ لیا۔ اعلیٰ کمان میں نئے بااثر لوگوں کا دامن تھاما اور ببانگ دہل یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ ارون نہرو کے آدمی نہ کبھی تھے، نہ ہیں، انھیں تو براہ راست وزیر اعظم کا اعتماد حاصل ہے۔ لیکن وزیر اعلیٰ کے مخالف گروہ نے ان باتوں کا نہ تو اثر لیا، نہ ان پر یقین کیا، اور سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ سرکاری ملازمین کی ہڑتال کے دوران ایک سنہری موقع ملا تو اس مخالف گروپ نے وزیر اعلیٰ کو مات دینے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ مگر جیت اس مرتبہ بھی وزیر اعلیٰ کی ہی ہوئی۔

وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ریاست کے امور پر عرصے سے اثر انداز برہمن لابی کو کافی کمزور کر دیا ہے۔ ارون نہرو اور پنڈت کملا پتی ترپاٹھی کے زوال کے بعد یہ آسان بھی تھا۔ باخبر ذرائع کے مطابق اب وہ چن چن کر چیدہ برہمن افسروں کو کلیدی عہدوں سے باہر کر رہے ہیں۔ اس طرح ریاست میں ایک بار پھر ٹھاکروں کا اثر بڑھ رہا ہے۔

وزیر اعلیٰ کی ایک خوش قسمتی یہ بھی ہے کہ اس وقت ریاست میں حزب اختلاف کا وجود برائے نام ہے۔ ریاست کی سب سے بڑی سیاسی جماعت لوک دل (جس کے ۸۶ ممبران اسمبلی ہیں) اپنے داخلی مسائل میں الجھی ہوئی ہے، اور سابق اپوزیشن لیڈر

راجہ دنیش سنگھ کے پارٹی سے نکلنے کے بعد سے اچھا خاصا بحران پیدا ہو گیا ہے۔ دوسری جزوی جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی کی عملی کارروائیاں محض چند اخباری بیانات تک محدود ہیں، جو اس کے لیڈر وقتاً فوقتاً جاری کرتے رہتے ہیں۔

مگر یہ سب راحتیں اور مسرتیں عارضی ہیں، کوئی مستحکم عوامی پس منظر نہ ہونے کی وجہ سے وزیر اعلیٰ کا اقتدار صرف اور صرف اعلیٰ کمان کی رضا مندی پر منحصر ہے، دوسرے ریاست کے عوام کے گوناگوں



مسائل جوں کے توں ہیں، کوئی طبقہ مطمئن نہیں ہر طرف سے تنقیدی بوچھاڑیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس صورت حال میں وزیر اعلیٰ کو اب ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جن سے براہ راست عوام کی اکثریت کو فائدہ پہونچے، ورنہ ان کے خیمے میں خوشی کے یہ شادیانے زیادہ دن نہ بج سکیں گے۔ یوں بھی جوڑ توڑ کی سیاست کی عمر بہت نہیں ہوتی۔

## کائستھ ـــ تیسری طاقت

ذات پات کی سیاست کے شکار اتر پردیش میں ابھی تک برہمن اور ٹھاکر، یہی دو متخالف قوتیں رہی ہیں، مگر اب اس ریاست میں پہلی بار کائستھ تیسری طاقت بن کر ابھر رہے ہیں۔ غیر برہمنوں، خصوصاً ٹھاکروں کو اگر وزیر اعلیٰ کی پشت پناہی حاصل ہے تو کائستھوں کے سرپرست ہیں سپر اسٹار، ممبر پارلیمنٹ امیتابھ بچن مسٹر اندرا نہرو کے زوال کے بعد اتر پردیش کی سیاست میں اعلیٰ سطح پر جو خلا پیدا ہوا تھا اسے اب مسٹر امیتابھ بچن نے پُر کیا ہے، اخباری حلقوں کے مطابق ان دنوں مسٹر امیتابھ بچن کو وزیر اعظم کا اعتماد بھی حاصل ہے۔

بقیہ تفصیلی اطلاعات مظہر ہیں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر امیتابھ بچن اپنی کائستھ برادری کے افراد کو چن چن کر کلیدی عہدوں پر بٹھا رہے ہیں، اس معاملے میں ان کے معتمد اور رفیق ہیں ریاستی وزیر مسٹر سنیل شاستری، جو خود بھی کائستھ ہیں۔ اس صورت حال کی وضاحت کے لیے صرف چند مثالیں ہی کافی ہیں۔

۱۔ انتخابات کے بعد مسٹر امیتابھ بچن کے بھائی مسٹر اجیتابھ بچن کو کملا نہرو ٹرسٹ (الہ آباد) کا چیرمین نامزد کیا گیا۔

۲۔ مسٹر جگدیش نرائن امیتابھ جی کے قریبی بزرگ عزیز ہیں، انتخابی سرگرمیوں کے دوران انھوں نے الہ آباد میں پارک روڈ پر واقع اپنا بنگلہ امیتابھ بچن کے انتخابی کیمپ کے لیے دے دیا تھا، ان ہی مسٹر جگدیش نرائن کو یوپی پبلک سروس کمیشن کا ممبر نامزد کیا گیا، اب وہ الہ آباد یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بھی ہیں۔

۳۔ مسٹر نرائن کی بیگم جو کسی اسکول میں ٹیچر تھیں، انھیں یوپی سوشل ویلفیر بورڈ کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے۔

۴۔ مسٹر رام سروپ بھٹناگر کو اتر پردیش کا ایڈوکیٹ جنرل مقرر کیا گیا ہے۔ یہ سبھی کائستھ ہیں۔

۵۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے تین حالیہ تقرر شدہ اسٹینڈنگ کونسلز میں سے دو (سری واستو) کائستھ ہیں۔

۶۔ امیتابھ جی کے انتخابی حلقے کے نئے ایس ایس پی مسٹر ڈی۔ پی۔ سنہا امیتابھ جی کے قریبی دوست بتائے جاتے ہیں۔

۷۔ ایک نوجوان اے سری واستو کو انتخابات کے فوراً بعد اتر پردیش یوتھ کانگریس کا نائب صدر نامزد کیا گیا تھا، اب وہ یوپی اسٹیٹ ٹرانسپورٹ اتھارٹی اور یوپی الیکٹری سٹی کی مشاورتی کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔

۸۔ الہ آباد ضلع یوتھ کانگریس کے نئے صدر مسٹر شتیل پرشاد سری واستو ہیں۔

۹۔ ایک ریٹائرڈ چیف میڈیکل افسر مسٹر ورما کملا نہرو اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کے منصب پر فائز ہیں ـــــــ یہ سبھی حضرات کائستھ ہیں۔

صرف یہی نہیں، نوئیڈا میں زیر تعمیر فلم سٹی، جس کے نگراں مسٹر امیتابھ بچن ہیں، اس کے تعمیری پروگرام کے تحت جتنے ٹھیکے دیے گئے ہیں، تقریباً وہ سبھی کائستھ ٹھیکیداروں کو ملے ہیں۔

یہ تو تھا امیتابھ جی کا چمتکار۔ مسٹر سنیل شاستری نے اپنے معتمد ساتھی مسٹر جیون پرکاش کو یوپی الیکٹری سٹی بورڈ کی مشاورتی کمیٹی کا رکن بنوایا ہے۔ گورکھپور مسٹر شاستری کا حلقہ انتخاب ہے، وہاں کے ضلع مجسٹریٹ مسٹر دنیش رائے، ایس پی (دیہات) مسٹر ایم کے سنہا، اور ریجنل فوڈ کنٹرولر مسٹر رام سروپ، یہ سب کائستھ ہیں۔

اسی پر بس نہیں، امیتابھ جی اور شاستری جی کی براہ راست رسائی وزیر اعلیٰ کے دفتر تک ہے، وزیر اعلیٰ کے پرسنل سیکریٹری ایک مسٹر سکسینہ ہیں، جو کچھ ہی دن قبل دونوں کائستھ قائدین کے آشیرواد سے اس منصب پر فائز ہوئے ہیں۔

لکھنؤ میں بعض جانکار حلقوں کا اصرار ہے کہ ان تقررات اور نامزدگیوں میں سے اکثر وزیر اعلیٰ کے منشا و مرضی کے خلاف عمل میں آئی ہیں لیکن وزیر اعلیٰ مجبور ہیں ـــــ اور ریاستی راجدھانی کے اعلیٰ حلقوں میں اب یہ خبر (یا افواہ) گردش کر رہی ہے کہ اتر پردیش کے ڈائریکٹر جنرل پولیس اور چیف سکریٹری حکومت اتر پردیش کے عہدوں پر جب بھی نئے تقرر عمل میں آئیں گے تو غالب امکان ہے کہ ان منصبوں پر کائستھ افسران ہی رونق افروز ہوں گے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک ہوشیار، جوڑ توڑ کے ماہر ٹھاکر، اور ایک ذہین، دور اندیش کائستھ کے درمیان اس سرد جنگ کا انجام کیا ہوتا ہے۔ واضح طور پر وزیر اعلیٰ کے سامنے دو ہی راستے ہیں کہ یا تو وہ "نئے بادشاہ گر" کا دل جیت لیں، یا پھر اسے مات دیں۔

# پنجاب

## ویدبھگوان کی جنم بھومی جہاں گورو نانک دیوجی نے انسانی بھائی چارے کا درس دیا تھا



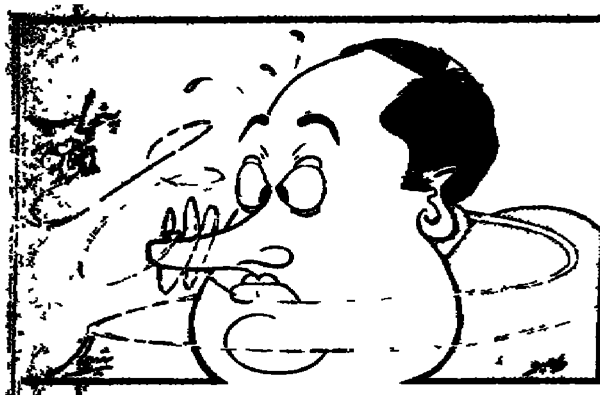
گذشتہ سال ۳۰ نومبر کو پنجاب میں دو ایسے واقعات ہوئے جنھوں نے دشمن و دوست پنجابیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور یہ لوگ اب اپنے مستقبل کو تاریک سمجھنے لگے ہیں. سیاسی مدبر ان واقعات کا تجزیہ چاہے کسی بھی ڈھنگ سے کریں اور انہیں چاہے کسی بھی عینک سے دیکھیں لیکن عام لوگ ان دو وقوعہ واقعات کو مستقبل کے لیے خطرے کی لال جھنڈی ہی تصور کرتے ہیں.

۳۰ نومبر کو دوپہر ایک بجے شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کا جنرل اجلاس دربار صاحب امرتسر کے تیجا سنگھ سمندری ہال میں بلایا گیا تھا. اجلاس سے پہلے بہت سے لوگوں نے جو اکالی سیاست سے وابستہ ہیں بہت زور سے یہ آواز بلند کی تھی کہ برنالہ اور بادل دھڑے اکالیوں کی اس پارلیمنٹ کے صدارتی عہدہ کا چناؤ متفقہ طور پر کریں لیکن دونوں دھڑوں کے سیاسی مفادات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے. اس لیے بادل دھڑا جہاں گوروچرن سنگھ ٹوہڑہ کو ایک دفعہ پھر ایس جی پی سی کا صدر بنا کر برنالہ کو نیچا دکھانا چاہتا تھا وہاں برنالہ کو اپنے اقتدار پر غرور تھا کہ وہ ایس جی پی سی کے اکثریتی ممبران کو اپنے ساتھ ملا کر اس گوروچرن سنگھ ٹوہڑہ کو شکست دے دیں گے جو اس عہدہ کی آڑ میں نہ صرف اکالی سیاست کو پتلی کے ناچ نچاتے رہے بلکہ اسی کے طفیل دو دفعہ راجیہ سبھا اور ایک دفعہ پارلیمنٹ کے بھی ممبر بننے میں کامیاب رہے تھے. تیرہ سال تک لگاتار شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے صدر رہتے ہوئے اس شخص نے جتنے رنگ بدلے اور اکالی سیاست میں جس طرح کے جوڑ توڑ کیے' ان کی ایک طویل داستان ہے جس کا ذکر ہم بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتے. لیکن سیاست میں کل کے دشمن آج کے دوست کی مثال کو جس تیز رفتاری سے گوروچرن سنگھ ٹوہڑہ نے عملی شکل دی ہے وہ بے مثال ہے. کون نہیں جانتا کہ ابھی پچھلی دفعہ ہی گوروچرن سنگھ ٹوہڑہ کو ہرانے کے لیے پرکاش سنگھ بادل نے ان کے مقابلہ میں سردار آتما سنگھ کو اپنا امیدوار بنا کر کھڑا کیا تھا. بادل اور ٹوہڑہ کے سنت

جوگندر سنگھ بھنڈراں والا کے معاملہ پر بھی شدید اختلافات تھے لیکن پنجاب سمجھوتہ کے وقت مرحوم سنت ہرچند سنگھ لونگووال کی حکمت عملی نے باہم ان دونوں دشمنوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیا تھا۔ کیوں کہ ان دونوں کو اس سمجھوتہ کے بعد اپنا سیاسی مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا تھا۔ جن حالات میں سولہ فروری کے آنندپور صاحب کے سربت خالصہ سے ایک دن پہلے ٹوہڑہ نے ڈرامائی طور پر اپنے عہدہ سے استعفیٰ دیا تھا اور پھر ۲۹ر اپریل کو دربار صاحب میں خالصتان کا اعلان ہونے کے بعد ۳۰ر اپریل کی پولیس کارروائی کو بہانہ بنا کر جس طرح یہ لوگ اکالی دل سے جدا ہوئے تھے انہیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۰ر نومبر کو شرومنی گورودوارہ پربندھک کمیٹی کا چناؤ جیتنے کے لیے دونوں دھڑوں نے دو ٹروں کو اپنے اپنے قبضہ میں کر رکھا تھا اس طرح سب سے پہلے جب پرکاش سنگھ بادل کے حمائتیوں کو تیجا سنگھ سمندری ہال میں لایا گیا تو جو بولے سو نہال کے نعروں سے فضا گونج اٹھی اس کے ساتھ ہی بھنڈراں والے سنت زندہ باد، پرکاش سنگھ بادل زندہ باد، گوروچرن سنگھ ٹوہڑہ زندہ باد، خالصتان زندہ باد اور پاکستان کے حق میں بھی چاروں طرف سے نعرے لگتے سنائی دیے۔ اس ماحول کو دیکھتے ہوئے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ چاروں طرف بادل دھڑے کا ہی طوطی بولتا ہے۔ کیوں کہ سکھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن، دمدمی ٹکسال، متحدہ اکالی دل اور جگدیو سنگھ تلونڈی دھڑوں کے سبھی لوگ بادل کی حمایت کے لیے متحد ہو گئے تھے۔ دوسری طرف برنالہ وزارت کے وزیر تعلیم سردار سنت سنگھ خالصہ ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کا نعرہ دے کر ایک دوسرے خیمے میں شامل ہونے کا واضح اعلان کر چکے تھے۔ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا۔

برنالہ دھڑے نے گوروچرن سنگھ ٹوہڑہ کے مقابلہ میں ایس۔ جی۔ پی۔ سی کے قائم مقام صدر قابل سنگھ کو کھڑا کیا تھا۔ چناؤ سے ایک دن پہلے برنالہ اور بلونت سنگھ نے دعویٰ کیا تھا کہ ۱۴۴ ووٹوں میں سے ان کے امیدوار کو ۸۰ ووٹ ملیں گے اس طرح جیت یقینی طور پر انہیں کے گروپ کی ہوگی بلکہ بلونت سنگھ نے تو چناؤ سے تین دن پہلے ٹوہڑہ کو یہ بھی پیش کش کی تھی کہ اگر وہ بادل دھڑے کو چھوڑ کر برنالہ دھڑے میں شامل ہو جائیں تو برنالہ انہیں اپنا امیدوار بنا لیں گے کیوں کہ دونوں دھڑوں نے آخری دن ہی اپنے اپنے امیدوار کا باقاعدہ اعلان کیا تھا لیکن برنالہ دھڑے کو بادل دھڑے نے آخری وقت تک یہ پتہ ہی نہ چلنے دیا تھا کہ انھوں نے عملی طور پر برنالہ دھڑے پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ اس طرح جیسے ہی برنالہ کے حامی ووٹروں کو تیجا سنگھ سمندری ہال میں لایا گیا تو غدار واپس جاؤ کے نعرے لگنے شروع ہو گئے۔ دربار صاحب کے باہر اور اندر بھاری تعداد میں پولیس اور سی۔ آر۔ پی۔ ایف کی فورسز تعینات تھیں جنھوں نے گھیرے میں لے کر ان ممبران کو تیجا سنگھ سمندری



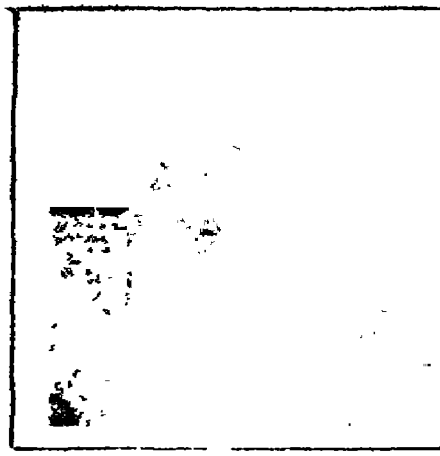
ہال تک پہنچایا بعد دوپہر قریب ڈیڑھ بجے جب قائم مقام صدر قابل سنگھ کی صدارت میں ایس۔ جی۔ پی۔ سی کا باقاعدہ اجلاس شروع ہوا تو ایسے تمام لوگوں کو ہال سے باہر نکال دیا گیا جو ایس۔ جی۔ پی۔ سی کے ممبر نہیں تھے۔ صدارت کے لیے برنالہ گروپ کے امیدوار قابل سنگھ کا نام امر سنگھ تلی نے پیش کیا جس کی تائید شیو سنگھ بیلا نے کی جبکہ دوسرے دھڑے کی طرف سے گوروچرن سنگھ ٹوہڑہ کا نام کلدیپ سنگھ وڈالا نے پیش کیا جس کی تائید ہری سنگھ اراوالا نے کی

تب ووٹ ... سلسلہ شروع ہوا گنتی کے بعد ... دھڑے کے پولنگ ایجنٹوں کی حاضری میں جب یہ اعلان کیا گیا کہ گیانی تاہن سنگھ کو ۱۳۴ ووٹوں کے ہاؤس میں ۵۹ اور گوردو چرن سنگھ ٹوہڑہ ۵۵ ووٹ لے کر کامیاب ہو گئے ہیں تو فضا ایک دفعہ پھر گوردچرن سنگھ پرکاش سنگھ بادل، بھنڈراں والا اور خالصتان کے نعروں سے گونج اٹھی۔ اس کے بعد نئے صدر ٹوہڑہ نے ہرچند سنگھ ترنتارن کو سینئر نائب صدر، اجاگر سنگھ زنگر میٹا کو جونیئر نائب صدر اور مل سنگھ تھمن کو متفقہ طور پر جنرل سکریٹری نامزد کرنے کا اعلان کیا' ان کے علاوہ گیارہ ممبری ایگزیکیوٹو کمیٹی کے ممبروں کی نامزدگی کا بھی اعلان کیا گیا جس میں پانچ ممبر قابل سنگھ کیمپ والے اور چھ ممبر ٹوہڑہ نے اپنے حمایتی نامزد کیے۔ ٹوہڑہ کی واضح اکثریت کو دیکھتے ہوئے برنالہ دھڑے کے کسی ممبر کو چوں چراں کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے بعد جب کھلا اجلاس شروع ہوا تو دونوں دھڑوں کے لیڈروں اور ورکروں کو اندر جانے کی اجازت دیدی گئی اور اس موقع پر جب برنالہ وزارت کے وزیر سردار تارا سنگھ لائلپوری جگدیو سنگھ تاجپوری سمندری ہال میں داخل ہونے لگے تو بادل دھڑے کے لوگوں نے انہیں دھکے مارتے ہوئے ہال سے باہر دھکیل دیا اسی طرح برنالہ دھڑے کے کئی اور لوگوں کو دھکے مارے گئے اس دھکم پیل میں کئی وزیروں اور دیگران کی پگڑیاں بھی اتر گئیں۔

کھلے اجلاس میں ایک ریزولیشن میں گوردواروں میں پولیس داخلہ کی سخت مذمت کی گئی اور آئندہ ایسی کارروائی نہ کرنے کی مانگ کی گئی۔ دوسرے ریزولیشن میں مانگ کی گئی کہ مجوزہ گوردوارہ ایکٹ کی تجاویز پر غور کرنے کے لیے جنرل اجلاس بلایا جائے اس کے بعد اسے مرکزی حکومت کے پاس بھیجا جائے۔ تیسرے ریزولیشن میں جودھپور اور دیگر جیلوں میں بند لوگوں کو رہا کروانے اور فوجیوں کی سزائیں معاف کروا کر انہیں بحال کروایا جائے۔ یہ تینوں ریزولیشن نعرے لگا کر پاس کئے گئے۔

اجلاس کے بعد نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے پرکاش سنگھ بادل نے کہا کہ یہ چناؤ ایک طرح سے برنالہ سرکار کے خلاف عدم اعتماد ہے اور یہ ان کی پہلی کمر توڑ شکست ہے' اس لیے برنالہ کا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ وہ وزیر اعلیٰ کے عہدے سے مستعفی ہو جائیں۔ بادل دھڑے کی اسمبلی پارٹی کے لیڈر امریندر سنگھ نے اعلان کیا کہ اٹھارہ دسمبر کو ہونے والے اسمبلی اجلاس میں برنالہ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جائے گی۔

ادھر امرتسر میں برنالہ اکالی دل کی کراری ہار کے بعد برنالہ مخالف متحدہ محاذ اپنی کامیابی کے شادیانے



بجا رہا تھا ادھر اسی کامیابی سے حوصلے کر اسی دن شام قریب ساڑھے پانچ بجے ضلع ہوشیار پور کے قصبہ ٹانڈہ کے موضع کھڈہ کے پاس بیسو روڈ ویز فرید کوٹ ڈپو کی ایک بس جس کا روٹ گنگا نگر سے پٹھانکوٹ کا ہے' کو چار انتہاپسندوں نے روک کر سبھی سواریوں کو حکم دیا کہ ان میں سے جتنے بھی سکھ یا مسلمان مرد عورتیں اور بچے ہیں وہ نیچے اتر جائیں۔ جب یہ لوگ نیچے اتر گئے تو انتہاپسندوں نے بس میں سواریوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اسی دوران جب ایک سکھ سواری نے التجا کرتے ہوئے اپنے ہونے بیٹے کو چھوڑ دینے کو کہا تو اس کی گڑگڑاہٹ کو حقارت سے ٹھکراتے ہوئے انتہاپسندوں نے اس لڑکے کو بھی موت کی نیند سلا دیا۔ بس کے اندر گولیوں کی اس اندھا دھند گڑگڑاہٹ نے چوبیس لوگوں کی جان لے لی اور گیارہ افراد سخت مجروح ہو گئے جن کو بے ہوشی کے عالم میں انتہاپسند مرچکے سمجھ کر بس کے پیچھے آئے اپنے ساتھیوں کے دو اسکوٹروں پر سوار ہو کر بڑے آرام سے چلے گئے۔ لوگ بس کے باہر کھڑے یہ خونچکاں واقعہ دیکھنے والے سبھی مرد اور عورتیں اندر ہی اندر خون کے آنسو بہا رہے تھے لیکن دہشت پسندوں کے ہوتے ہوئے کسی کو آہ و بکا کی بھی ہمت نہیں تھی۔

واقعات کے مطابق پیپسو روڈ ویز فرید کوٹ کی یہ بس جس کا نمبر پی۔ جے۔ جی ۷۲۸۴ ہے فرید کوٹ سے پٹھان کوٹ جا رہی تھی۔ راستہ میں اسے روک کر چار انتہاپسند سوار ہو گئے جنھوں نے اپنی اسٹین گن اور پستول وغیرہ اپنے اوپر اوڑھے ہوئے کمبلوں میں چھپا رکھے تھے بس میں سوار ہو کر ان چاروں میں سے دو پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور دو ڈرائیور کے پاس جاکر انجن کے ڈھکن پر بیٹھ گئے جیسے ہی یہ بس موضع کھڈہ کے نزدیک پہنچی تو آگے بیٹھے دو انتہاپسندوں میں سے ایک نے ڈرائیور کی گردن پر پستول رکھ کر بس کو لنک روڈ پر ڈالنے کا حکم دیا، اسی بس کے پیچھے دو اسکوٹروں پر دو اور انتہاپسند آ رہے تھے جنھوں نے ایک ڈیڑھ کلومیٹر آگے جاکر بس کو روکنے کا اشارہ دیا۔ بس رکنے کے بعد ڈرائیور اور کنڈکٹر چھلانگ لگا کر نیچے اتر گئے جس کے بعد ان چاروں نے پہلے سبھی سواریوں سے نقدی اور زیورات اتروا لیے اور اس کے بعد سکھ اور مسلمان مرد عورت سواریوں کو نیچے اتار کر باقی اندر بیٹھے سبھی لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا جن کی تعداد اوپر دی جا چکی ہے بعد ازاں یہ چاروں انتہاپسند نیچے کھڑے اپنے دو اسکوٹر سواروں کے پیچھے بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ پنجاب میں اپنی طرح کے اس سب سے بڑے اندوہناک واقعہ کی خبر دینے جب کچھ لوگ نزدیکی پولیس تھانہ دسوہہ میں گئے تو تھانے کا مین گیٹ اندر سے بند تھا جس میں اس وقت ڈیڑھ سو کے قریب جوان تھے لیکن یہ لوگ اتنے دہشت زدہ تھے کہ انھوں نے تھانہ میں ہتھیار نہ ہونے کا بہانہ بنا کر موقع پر جانے سے انکار کر دیا اس کے بعد جالندھر پولیس کو آگاہ کیا گیا تب جاکر پولیس اور سی۔ آر۔ پی۔ ایف کے جوانوں نے لاشوں کو بس سے نکال کر زخمی لوگوں کو ہسپتال میں بھیجنے کا بندوبست کیا۔

اس خونی سانحہ کی خبر جیسے ہی جالندھر پہنچی وہاں لوگ بھڑک اٹھے انھوں نے کئی بسوں کو نقصان پہنچایا لیکن اس بھیڑ کو جلد ہی منتشر کر دیا گیا زخمی لوگوں نے جو لدھیانہ کے سی۔ ایم سی ہسپتال میں داخل ہیں دوسرے دن نامہ نگاروں کو بتایا کہ بس کھڑی کرنے کے بعد انتہاپسندوں نے جب مسافروں سے نقدی اور زیورات چھین لیے تو سبھی مسافروں سے بھنڈراں والا زندہ باد کے اور کچھ ایسے بڑے انتہاپسندوں کے نعرے لگوائے جو یا تو پولیس مقابلوں میں مارے گئے ہیں یا پھر باہمی کشمکش کا شکار ہو گئے ہیں۔

یکم دسمبر کو ہندو سرکشا سمتی کی طرف سے پنجاب بند کی کال دی گئی لیکن اس کال کا ماسوائے جالندھر ہوشیار پور دسوہہ اور کچھ دیگر قصبوں پر کوئی خاص اثر نہ ہوا، اس لیے جب سبھی پارٹیوں کی طرف سے ۲ دسمبر کو پنجاب بند کی کال دی گئی تو سارا پنجاب بند رہا۔ پنجاب کے گورنر شری سدھارتھ شنکر رے اور وزیر اعلیٰ سرجیت سنگھ برنالہ و دیگر سبھی پارٹیوں کے لیڈروں نے اس دل دہلا دینے والے واقعہ کی پُرزور مذمت کرتے ہوئے لوگوں سے پُرامن رہنے کی اپیل کی۔ ادھر پارلیمنٹ اور راجیہ سبھا میں اس معاملہ کو لے کر جو ہنگامہ ہوا، اس سے کئی لوگ واقف ہیں جب کہ



یکم دسمبر کو ہی پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور گورنر کو نئی دہلی طلب کیا گیا اسی روز وہاں سے واپسی پر رات کو چنڈی گڑھ میں سرجیت سنگھ برنالہ نے انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں اور کچھ خاص لوگوں کی میٹنگ بلاکر فیصلہ کیا کہ انتہا پسند مخالف خاص دستے بنائے جائیں گے

شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی پر برنالہ مخالف متحدہ محاذ کا کامیاب ہونا اور اسی دن انتہا پسندوں کی طرف سے ایک ہی جگہ پر ۲۴ بے گناہوں کا خون اور پھر اس کے دوسرے دن یعنی یکم دسمبر کو مختلف چار واقعات میں ۱۳ بے گناہوں کا خون سارے پنجاب کے لیے خطرے کی ایک لال جھنڈی ہے۔ سنجیدہ سیاسی حلقوں کا کہنا ہے کہ حالات خطرناک موڑ لے سکتے ہیں! اکالیوں کے دونوں بڑے دھڑوں (بادل اور برنالہ) میں ایک دفعہ پھر جوڑ توڑ کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے

اکالیوں کے مختلف دھڑوں کے متحدہ محاذ کی شاندار کامیابی کے بعد برنالہ دھڑے کے کچھ اور وزیر اور ممبر اسمبلی برنالہ کا ساتھ چھوڑ جائیں۔ اس دوسری حالت میں برنالہ کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ یا تو وہ کانگریس سے باقاعدہ سمجھوتہ کرلیں یا پھر بادل گروپ کے آگے گھٹنے ٹیکتے ہوئے اکالی اسمبلی پارٹی سے کہیں کہ وہ اپنا نیا لیڈر چن لے اور خود شری برنالہ نئے لیڈر کے وفاداری کا یقین دلائیں یا پھر برنالہ اپنی وزارت کا استعفیٰ گورنر کو دیں اور اسمبلی کو توڑ کر نئے انتخابات کروانے کی سفارش کریں۔ اگر مندرجہ بالا تینوں باتوں میں سے برنالہ نے کچھ بھی نہ کیا تو ۱۸ دسمبر کو اسمبلی اجلاس شروع ہوتے ہی بادل گروپ کے اسمبلی پارٹی کے ممبر سرجیت سنگھ برنالہ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لائیں گے ہی، جس کا مقابلہ کرنا برنالہ کے لیے انتہائی مشکل ہے۔ کیوں کہ پنجاب کانگریس (آئی) پہلے ہی برنالہ سرکار کی حمایت واپس لینے کی دہائی دے رہی ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی میں بھی اس معاملہ پر شدید اختلافات ہیں۔ دونوں کمیونسٹ پارٹیوں کی طاقت اسمبلی میں نہ ہونے کے برابر ہے ان حالات میں اگر سیدھے یا ٹیڑھے ڈھنگ سے برنالہ نے کانگریس (آئی) سے سمجھوتہ کر کے ڈاکٹر فاروق عبداللہ والی لائن اختیار نہ کی تو ان کی وزارت کا چل چلاؤ یقینی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان تمام حالات کے باوجود کیا پنجاب انتہا پسندی سے چھٹکارہ پا لے گا؟ جبکہ اس کی تار ہلانے والی غیر ملکی طاقتیں بدستور سرگرم عمل ہیں۔ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ مرکزی حکمراں جب تک پوری ایمانداری سے پنجاب سمجھوتہ کو لاگو کرتے ہوئے اور سامراجی اور ان کی پٹھو طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا منہ توڑ جواب نہیں دیتے تب تک انتہا پسندی پر قابو پانا دشوار ہے۔ اس کے لیے قول و فعل کے تضاد کو ختم کرنا ہوگا۔ ورنہ آج اس جمہوری ملک کو تہس نہس کرنے کی جو سازشیں ہو رہی ہیں ان کے نتائج خوفناک ہوں گے اس کے ساتھ ہی برنالہ کو بھی دھرم اور سیاست کے ایک ہونے کی پالیسی کو چھوڑنا ہوگا تبھی آنے والے خطرناک حالات کا وہ مقابلہ کر سکیں گے۔



Snow view Manali

# Himachal—The land of many enchantments.

Himachal is one infinite kaleidoscope of Nature's heartstealing spectacles, set amidst enrapturing valleys, meadows, pine forests, haunting hill resorts, and oh-so-inviting snowscape in winter

Nature has been very generous here, bestowing the best of charms for those who wish to have a quiet, captivating affair with Her

Himachal is not only an enchanting abode of Nature, it offers endless excitements in adventure & trekking, pilgrimage fairs & festivals, sports, folk art & culture

**Avail of HPTDC conducted tours in Himachal Tourism Luxury Coaches/AC Cars**

Air-conditioned & Super Deluxe Coaches, imported & Indian Cars available for various destinations in Himachal from New Delhi, Chandigarh Simla, Manali & Dalhousie

# Nature in all her glory

**Make yourself comfortable at any of the HPTDC chain of Hotels**

SIMLA—Hotel Holiday Home, Hotel Wildflower Hall, NARKANDA—Hotel Himview SARAHAN—Tourist Lodge CHAIL—Palace Hotel, Rajgarh Cottage JOGINDER NAGAR—Tourist Bungalow KULU—Hotel Sarvari KATRAIN—Hotel Apple Blossom RAISON—Tourist Huts NAGGAR—Castle Hotel MANALI—Log Huts, Cottages, Manalsu Hotel, Tourist Lodge, Hotel Beas Tourist Inn, Hamta, Brich View Huts DHARAMSALA—Hotel Dhauladhar PALAMPUR—Hotel T-Bud DALHOUSIE—Hotel Geetanjali, Youth Hostel, KHAJJIAR—Hotel Devdar, Youth Hostel CHAMBA—Hotel Champak, Hotel Iravati



Log huts Manali

# HIMACHAL

**FOR ALL SEASONS, ALL REASONS**







...w view Palampur

Beas River in Kulu Valley

For detailed information and reservations please contact Himachal Tourism Office at

NEW DELHI—Chandralok Bldg. 36 Janpath Tel 345320 352104
CALCUTTA—25 Camac Street Tel 446847
BOMBAY—World Trade Centre Cuffe Parade Tel 219191 284
MADRAS—28 Commander in Chief Road Tel 472966
CHANDIGARH—S C O 1048-49 Sector 22 B Tel 26494
SIMLA—The Mall Tel 3311 3956
PATHANKOT—Opposite Railway Station Tel 20316

**Himachal Pradesh Tourism Development Corporation Limited**
Ritz Annexe, Simla 171 001
Phones 4472, 3977, 5071

Compacts

انندم ھوس دستیدار

# مشرقی علاقوں کا خبرنامہ

مغربی بنگال کانگریس (آئی) کے صدر مسٹر پریا رنجن داش منشی کے مرکزی وزراء کی کونسل میں چلے جانے کے بعد مغربی بنگال کانگریس (آئی) کے بحران میں ایک نیا موڑ آگیا ہے۔ انتظامیہ کی سربراہانہ سطح پر ایک خلا پیدا ہوگیا ہے کیونکہ صدر موصوف اب کلکتہ کی نسبت دہلی میں زیادہ مصروف کار ہیں۔ پارٹی کے بہت سے افراد مسٹر سبرا تو مکرجی کی بحالی کو گوارا نہیں کر پائے۔ مسٹر مکرجی اب ریاستی کانگریس کمیٹی (آئی) کے سب سے سینئر جنرل سکریٹری ہیں جو مسٹر داش منشی کی جانب سے نائب کی حیثیت سے اختیارات سنبھالے ہوئے ہیں۔ مبینہ طور پر تنظیم کا کام ٹھپ ہو چلا ہے۔

یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ جب سے داش منشی نے بھارت کے مرکزی وزیر مملکت کا عہدہ سنبھالا ہے بنیادی سطح پر پارٹی کے کارکنوں سے ان کا رابطہ کم ہوتا جا رہا ہے غالباً وہ پارٹی کے خاص و عام کے لیے ناقابل رسائی ہو چکے ہیں۔ سربراہان اعلیٰ نے اعتراض کیا ہے کہ وزارتی کام میں ان کی مصروفیت نے انہیں پارٹی سے دور کر دیا ہے۔

مسٹر سبرا تا مکرجی کے برسر اقتدار آنے اور ان پر خصوصی ذمہ داریوں کے عاید ہونے سے وہاں کی اقتداری کشمکش میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہوا ہے۔ داش منشی کی عدم موجودگی میں انہیں پارٹی کے پروگراموں میں تال میل کے اختیارات دیے گئے ہیں۔ بڑی دیر سے وہ بے اعتمادی کا شکار رہے ہیں۔ اس کی وجوہات یہ تھیں کہ وہ سالقہ کانگریس (ایس) کے دھڑے کے خلاف تھے، وہ مسٹر پرنب مکرجی کے ہمرکاب تھے، انھوں نے ستمبر کے دوران صنعتی ہڑتال اور گورکھا لینڈ کے معاملے میں لیفٹ فرنٹ کی حمایت کی تھی۔ درحقیقت آئندہ ریاستی اسمبلی کے لیے ان کی نامزدگی لایقینی ہو چکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی بحالی ایک سودہ بازی کے نتیجے میں ہوئی ہے۔ مبینہ طور پر انھوں نے وزیر اعظم کو لکھا تھا کہ وہ گورکھا لینڈ کے بارے میں پارٹی کے رویے سے اختلاف نہیں کریں گے اور آئندہ کے لیے گورکھا لینڈ اور دوسرے اہم امور پر صرف مسٹر داش منشی ہی بیانات جاری کیا کریں گے کچھ بھی ہو، مسٹر مکرجی کو دھڑے بندیوں کے پیش نظر محدود صورت حال میں ہی رہنا پڑے گا۔ موجودہ ریاستی کانگریس کمیٹی (آئی) میں ان کے حریف زیادہ ہیں اور پیرو کار کم ہیں۔

اقتدار کے نئے مقابلے میں اطلاعات و نشریات کے مرکزی وزیر مملکت مسٹر اجیت پنجہ اقتدار کا نیا مرکز ہیں کمیٹی کے اندرونی تنازعوں کے پیش نظر بے لاگ ہونے کی بدولت اپنے صاف ستھرے تاثر کی اہم بنا پر انہیں وزیر اعظم کی حمایت حاصل ہے۔ کہا گیا ہے کہ داش منشی کی مخالفت کرنے والا دھڑا ان کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔

دوسری جانب پرنب مکرجی کی سربراہی میں نوزائیدہ انڈین نیشنل کانگریس (سبھاش)۔ اندرا میں ذاتی اور نظریاتی تنازعات رونما ہو رہے ہیں، جہاں ان کے (پرنب مکرجی کے) ساتھی یہ آواز اٹھا رہے ہیں کہ پالیسی اور نظریاتی امور کے سلسلے میں انھیں نظر انداز کیا جا رہا ہے وہاں اندرا کے وفادار پارٹی کے نام میں نیتاجی کے شامل پر اعتراض کر رہے ہیں۔ پارٹی کے خاص و عام کا حوصلہ کم ہوگیا ہے اور پارٹی مشکل سے ہی اصلی کانگریس کی حیثیت سے ابھرنے کی حالت میں ہے۔ یہ ایک شاید ایسی تکمیل تھی جس کی بڑی تمنا رہی ہوگی۔

## بانکا کی صورتِ حال (بہار میں)

اب جو مسز منورما سنگھ لوک سبھا میں پہنچ گئی ہیں تو مسٹر بندیشوری دوبے کو پٹنہ میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرنا چاہیے لیکن ابھی بانکا خبروں کا مرکز بنا ہوا ہے اب تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ضمنی چناؤ کے دوران بے قاعدگیاں کی گئی ہیں۔ شہری آزادیوں کی عوامی انجمن کے مطابق جس کی ایک ٹیم نے ووٹ ڈالنے کے دن اس حلقے کا دورہ کیا تھا، کم از کم ۶۰ انتخابی بوتھوں پر انتخابی بدعنوانیاں ہوئی تھیں۔ کانگریس (آئی) کو موٹریں چلانے کی اجازت دی گئی تھی جن میں پارٹی کے کارکن اور غیر قانونی ووٹ دہندگان تھے اس سے انتخابی ضوابط کی بڑی خلاف ورزی ہوئی تھی۔

وزیر اعلیٰ کے ایک پرائیویٹ سکریٹری نے ایک بوتھ کو دو گھنٹے تک زبردستی طور سے اپنے قبضے میں رکھا۔ پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے کھلے بندوں ووٹ کی پرچیوں کو ایک خصوصی امیدوار کے حق میں نشان لگائے۔ ووٹ ڈالتے ہوئے نابالغ افراد کی تصویر لیتے ہوئے اخباری فوٹوگرافروں پر حملے کیے گئے۔ مسٹر وی۔ ایم۔ تارکنڈے نے جس نے اس ٹیم کی سربراہی کی تھی اپنی ابتدائی رپورٹ چیف الیکشن کمشنر کو بھیج دی ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو زبردستی کے ساتھ پولیس، مجسٹریٹوں اور کانگریس (آئی) والوں نے ووٹ ڈالنے سے روکا تھا رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ووٹ کی پرچیوں کی ایک بھاری تعداد پر مہریں لگائی گئیں، حزب مخالفت کے انتخابی ایجنٹوں کو مار بھگایا گیا، کارکنوں کو ووٹ ڈالنے سے پہلے گرفتار کر لیا گیا اور سرکاری عملے کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا۔ برسر اقتدار پارٹی کی مدد کے لیے پولیس کے افسران اعلیٰ نے مبینہ طور سے ایک پولنگ اسٹیشن سے دوسرے تک لوگوں کے ٹولوں کی سربراہی کی۔

## توجہ کا مرکز ـــ مرنال سین

جرمن لوگ مرنال سین میں دلچسپی لے رہے ہیں یہ کام پہلے تورین بارڈ ہوف نے کیا تھا۔ اب جوسر تھیل سین پر فلم بنا رہا ہے جو کہ سکنڈ جرمن ٹیلی وژن نیٹ ورک کے لیے ہے۔ اس دستاویزی فلم کو The smiling Tiger from Bengal کا عنوان دیا گیا ہے کیونکہ مرنال سین کے پاس مسکرانے کے لیے مزاح کا کافی سرمایہ ہے اور وہ سماجی استحصال کے خلاف خندہ پیشانی کے ساتھ لڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

یہ فلم "فلم فورم" کا حصہ ہوگی جو کہ جرمنی کا ایک ٹی وی سیریل ہے اور "امریکہ، یورپ اور ایشیا میں سنیما" کے موضوع پر ہے۔ ۴۵ منٹ کی یہ رنگین "۱۶" فلم اس سال کے اختتام تک تیار ہو جائے گی جس کی عکاسی اور ایڈیٹنگ وینا اور میتر میں ہوگی۔ ایک ویڈیو کیسٹ میکس مولر بھون کو مہیا کیے جانے کی توقع ہے۔

مسٹر تھیل نے اس فلم کی شوٹنگ کلکتہ اور دیہی علاقوں میں ۵ سے ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء تک کی تھی۔ سین کی پانچ فلموں بھون شوم، کلکتہ ۷۱، چل چتر، اکالیر سندھانے اور جینیسس کے اقتباسات سے اس فلم کی تزئین کی جائے گی پس منظر میں تھیل کی بیانیہ آواز اور مسٹر سین، اس کے اہم اداکاروں، تکنیکی ماہرین، فنکاروں اور اسٹیج کے ہدایت کاروں کے ساتھ سوال و جواب کے سیشن سنیما کے تئیں فلم ساز کے طریق کار کا جائزہ لیں گے۔ The smiling Tiger from Bengal کی فلم میں مسٹر سین کو بطور ایک "بین المذہبی" شخص کے پیش کیا جائے گا۔ مسٹر تھیل کے مطابق "جینیسس" ایک ہندو نے بنائی ہے جو کہ کمیونسٹ ہے۔ پھر بھی کسی غلط فہمی میں پڑے بغیر یہ فلم ساری عیسائی دنیا کو دکھائی جا سکتی ہے۔ مرنال تو ایک عیسائی پیغام رساں ہے۔

# آزادئ خیال کا مسئلہ

عبدالمتین عارف

آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل ارسطو کے ذہن رسا نے اس ناقابلِ تردید حقیقت کے ادراک و اظہار پر قابل کیا تھا کہ "انسان فطرتاً ایک سماجی اور سیاسی حیوان ہے۔" اس اٹل صداقت سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ہبوطِ آدم ہی سے انسانی زندگی کسی نہ کسی معاشرتی نظام کے رشتے میں منسلک رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام ابتدا میں انتہائی کمزور و ناتواں رہا ہوگا اور ماں باپ اور ان کے بچوں پر مشتمل ایک ایسے خاندان کی صورت میں منصۂ ظہور پر آیا ہوگا۔ جس کی سربراہی کے فرائض کہیں باپ Patriarch اور کہیں ماں Matriarch نے سرانجام دیے ہوں گے۔ تاریخ Patriarchal اور Matriarchal دونوں طرح کے خاندانوں کی موجودگی پر مہرِ تصدیق ثبت کرتی ہے!

مذکورہ بالا کوائف ہمیں اس نتیجے سے ہمکنار ہونے پر بھی مائل کرتے ہیں کہ ریاست جو کہ آزاد اور سیاسی اعتبار سے منظم معاشرے کا دوسرا نام ہے اپنی اولیں شکل میں ایک خاندان ہی کی حیثیت رکھتی تھی ——— تو گویا فرد اور ریاست کے باہمی تعلقات کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان قدیم ہے۔ اول اول یہ تعلقات بڑے سادہ اور غیر پیچیدہ تھے، مگر بعد میں جیسے جیسے ریاست خاندانوں اور قبیلوں کی حدود پھلانگتی ہوئی موجودہ وسیع قومی بنیادوں پر اپنے آپ کو استوار کرتی گئی تو یہ تعلقات بھی پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے گئے۔ وہ ریاست جو کبھی چار افراد پر مشتمل ہو سکتی تھی، افلاطون اور ارسطو کے زمانے تک معیاری قرار پانے کے لیے اپنے اندر تقریباً چار ہزار نفوس کی گنجائش پیدا کر سکتی تھی مگر آج ہم ایک ریاست میں چالیس کروڑ شہریوں کی موجودگی کے باوجود اسے غیر معیاری قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ریاست کے ارتقا کے ساتھ ساتھ افراد سے اس کے تعلقات میں پیچیدگی پیدا ہوتی چلی گئی، تاہم اس پیچیدگی کی اساس میں کبھی کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا، اس اساس کو ہم فرد اور ریاست کی آویزش کا نام دے سکتے ہیں — یہ آویزش اس ٹکراؤ سے مماثلت رکھتی ہے، جو باپ اور بیٹے کے درمیان ہمیشہ موجود رہتا ہے، اور جس کی ابتدا اولیں انسان اور اس کے فرزندانِ ارجمند کے باہمی تصادم سے ہوئی ہوگی ———

اس تصادم میں مدتوں تک باپ فاتح اور بیٹا مفتوح رہا۔ باپ کے وقار اور دبدبے کے آگے بیٹے کی خودداری اور عزتِ نفس بہت حد تک سرنگوں رہی۔ قدیم یونانی ریاستوں میں عام شہریوں کو اپنے طور پر کسی قسم کا معزز مرتبہ حاصل نہیں تھا، اور ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ ریاست کی عظمت و توقیر کے لیے اپنا سب کچھ تیاگ دیں کیوں کہ ان کی زندگی کا عظیم ترین مقصد یہی ہو سکتا ہے اقبال کا مندرجہ ذیل شعر یونانیوں کے تصورِ فرد و ریاست کو ہمارے سامنے کما حقہٗ پیش کرتا ہے ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

"اس تنہا کچھ نہیں" کی تردید کا خیال فرد کے ذہن میں ایک زبردست تحریک کی صورت میں مدتوں بعد پیدا ہوا۔ جب اس نے اپنی ہستی تسلیم کروانے کی غرض سے ریاست کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنا شروع کیے۔ لاک، روسو، بینتھم، جون اسٹورٹ مل، ہربرٹ اسپنسر، برائٹ، کابڈن، برٹرنڈ رسل، وغیرہ کی تحریروں سے متعدد بنیادی اختلافات رکھنے کے باوجود ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ انھوں نے شخصی آزادی کے اس تصور کی رنگ آمیزی کے سلسلے میں کار ہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں جو آج مہذب دنیا کے ہر باشعور انسان کو بے حد عزیز تر ہے۔

آزادی کے لغوی معنی پابندی کا فقدان ہیں لیکن اس لفظ کے اصطلاحی معنی مختلف ہیں کیوں کہ ہم اسے مطلق حیثیت سے استعمال نہیں کر سکتے۔ ہم جب تک معاشرے میں ہیں، ہمیں اس نوعیت کا شتر بے مہار پن میسر نہیں آ سکتا کہ ہم جو جی میں آئے سوچیں، جو جی میں آئے کہیں اور جو جی میں آئے کریں اور ہم سے باز پرس کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اس انداز کا فقدانِ ضابطہ ہمیں فقط جنگل میں نصیب



ہو سکتا ہے۔ لہٰذا لفظ آزادی کے معنی کا صحیح تعین فقط سماج کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے، اور یہی حوالہ ہم پر اس کا یہ مفہوم واضح کرتا ہے کہ ہم صرف وہ سوچنے کہنے اور کرنے کے مجاز ہیں، جس کی مکمل اجازت ہم دیگر ارکانِ معاشرہ کو بھی دیتے ہیں اور جس سے معاشرے کی فلاح کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کو قائم رکھنے کے لیے کسی ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو اس میں مخل ہونے والی قوتوں سے بطریقِ احسن نبرد آزما ہو سکے۔ اس ادارے کو "ریاست" State کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کی مرئی شکل حکومت Government ہے۔

شخصی آزادی کے سلسلہ میں آزادئ خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہر شہری کو اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں خلوص کے ساتھ غور و فکر کرنے کے نتائج کو بے باکانہ انداز میں دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی اجازت ہو۔

جب تک انسان نے لکھنے کے فن سے آگاہی حاصل نہیں کی تھی، یہ آزادی صرف تقریر تک محدود تھی۔ لیکن جب سے انسان اپنے خیالات کو پتھروں، جانوروں کی کھال، درختوں کے پتوں یا صفحۂ قرطاس کی زینت بنانے پر قادر ہو گیا ہے۔ اس آزادی میں تحریر کا عنصر بھی در آیا ہے۔ تو گویا ہم آزادئ خیال کو "آزادئ تقریر و تحریر" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس آزادی کے بغیر نہ تو کسی فرد کی شخصیت تکمیل کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے اور نہ اس کی ذاتِ زندگی کی خود مختارانہ کائی کا روپ دھار سکتی ہے لہٰذا ہر ریاست کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں تمام باشندوں کو اس نعمتِ غیر مترقبہ سے مستفید ہونے کے یکساں مواقع میسر آ سکیں!۔

اس میں شک نہیں کہ آزادیٔ تقریر و تحریر کو اتنی وسعت نہیں دی جاسکتی کہ ایک شخص کو دوسرے اشخاص پر توہین آمیز ذاتی حملوں کے ارتکاب کی اجازت دے دی جائے، البتہ اگر اس کی تنقید کا مقصد مفادِ عامہ کا تحفظ ہے، تو اسے ایسا کرنے سے باز رکھنا اس کے ایک جائز حق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے!

جس طرح مفادِ عامہ کے تحفظ کے پیشِ نظر ایک فرد دیگر افراد کے اعمال کا جائزہ لے سکتا ہے، بالکل اسی طرح ایک فرد حکومت کے اقدامات کا احتساب بھی کرسکتا ہے ——— یہ ضروری نہیں کہ حکومت جس لائحہ عمل کو عوام کے لیے مفید سمجھتی ہے ایک بالغ نظر شہری بھی اسے مفید گردانے اور ہر لحظہ حکومت کے حق میں رطب اللسان رہے۔ اختلاف رائے اس کا پیدائشی حق ہے، جس کے استعمال پر کسی قسم کی قدغن لگانا ایک انتہائی غیر منصفانہ فعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ افراد کی آزادیٔ خیال پر بالعموم تین اہم اختلافات کے حوالے سے شدید ترین حملے ہوتے آئے ہیں، ہو رہے ہیں، اور نہ جانے کب تک ہوتے رہیں گے اول مذہبی نقطۂ نظر کے اختلاف، دوم سیاسی اندازِ فکر کا اختلاف اور سوم اخلاقی زاویۂ نگاہ کا اختلاف۔ حضرت عیسیٰ کے ساتھ جو سفاکانہ سلوک روا رکھا گیا وہ مذہبی نقطۂ نظر کے سلسلہ میں بدترین متعصبانہ ذہنیت کی غمازی کرتا ہے اور ابراہم لنکن اور مہاتما گاندھی کی عظیم زندگیوں کے درخشاں شعلے سیاسی اندازِ نظر کی خونیں آندھیوں کے ہاتھوں فنا پذیر ہوتے۔

اخلاقی زاویۂ نگاہ کے اختلاف کے باعث آزادیٔ خیال پر جو حملے روا رکھے جاتے ہیں، اس کی بہت سی مثالیں ہمارے ادب کے دائرے میں ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ حکومت ذہنی رہنماؤں پر حملہ آور ہونے سے پہلے اپنے مشیروں سے مشورہ طلب کرتی ہے جو فکری اعتبار سے بالعموم بہت پسماندہ ہوتے ہیں۔ ڈی، ایچ لارنس "لیڈی چیٹرلیز لور" ہو خواہ سعادت حسن منٹو کی نگارش "ٹھنڈا گوشت" ان پر مقدمہ چلنے کا دار و مدار پریس برانچ کے متعلقہ افسروں کی منفی رائے پر ہوتا ہے اور مقدموں کی سماعت اور ان کا یہ فیصلہ ایسے قاضیوں کے توسط سے ہوتا ہے، جو بعض جملہ قانونی اہلیتوں کے باوجود محاکمۂ آداب کے سلسلہ میں یا کسی فن پارے کو عریب اخلاق اور فحش قرار دینے کے ضمن میں عام طور پر مستند نقادانِ فن یا ماہرینِ نفسیات کا ہم پلہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔

میرے ادبی نظریات ڈھکے چھپے نہیں ہیں، آپ جانتے ہیں کہ میں ادب میں فحاشی کا حامی نہیں ہوں، تقسیم ہند سے پہلے جب سعادت حسن منٹو کی کہانی "بو" اور عصمت چغتائی کے افسانہ "لحاف" پر مقدمہ چلا تو میں نے ایک مضمون میں ان پر بہت کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

"اگر آپ غیر جانبدارانہ انداز میں 'بو' اور 'لحاف' کا مطالعہ فرمائیں تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ 'بو' آپ کے جسم سے نہیں بلکہ منٹو کے جسم سے آرہی ہے، اور یہ 'لحاف' آپ نے نہیں بلکہ عصمت چغتائی نے اوڑھ رکھا ہے اور وہ آپ کو ان سے دور رہنے کی تلقین کے بجائے، ان کی جانب مدعو کرتے ہوئے نظر آئیں گے، تاکہ آپ بھی اپنے جسم میں ایسی 'بو' پیدا کرکے اور اپنے اوپر ایسا لحاف اوڑھ کر ان لذتوں سے ہم کنار ہو جائیں جن سے وہ خود ہو رہے ہیں ——"

مگر تقسیم ہند کے بعد جب منٹو کے "ٹھنڈا گوشت" پر مقدمہ چلا تو میں اس جریدے کے مدیر کی حیثیت سے ماخوذ تھا، جس میں وہ کہانی شائع ہوئی تھی۔ میں اس مقدمہ کی مصیبت سے بڑی آسانی کے ساتھ چھٹکارا حاصل کرسکتا تھا، کیوں کہ میں معتوب شمارے کی اشاعت سے بہت پہلے اس جریدے کی ادارت سے الگ ہو چکا تھا۔ مذکورہ افسانہ میری خواہش کے خلاف اور میری مرضی کے بغیر شریک اشاعت کیا گیا تھا اور ان حقائق کا زندہ ثبوت ناشر کے تحریری خط کی صورت میں میرے پاس موجود تھا۔ لیکن میں نے اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے کی بجائے مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ میں اس سلسلہ میں حکومت کی مداخلت کو ادیب کی آزادیٔ خیال پر حملہ تصور کرتا تھا اور اسے چیلنج کرنا اپنا ایمان سمجھتا تھا اور میرا یہ ایمان آج بھی غیر متزلزل ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ آزادیٔ خیال کو پامال کرنے سے کبھی اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے، جس معاشرے میں افراد مختلف موقعوں پر، مختلف مسائل کے سلسلہ میں اپنے ذہنی ردِ عمل کا آزادانہ اظہار نہ کرسکیں اس کے ارکان کی شخصیتیں یا تو آہستہ آہستہ پژمردہ ہو جاتی ہیں اور یا ان میں بغاوت کے ایسے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں جو پورے نظام کو اپنی ہلاکت آفریں لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ کیا اس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ اسٹیٹ ڈوما میں مخالفانہ تقریریں کرنے والا لینن جب روپوش ہونے پر مجبور کردیا گیا تو وہ اس قدر خطرناک ثابت ہوا کہ اس نے پورے ملک میں انقلاب برپا کرکے زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

آزادیٔ خیال کو میں نے ابھی تک ایسے فردِ واحد کے طور پر پیش کیا ہے جو ریاست کی اجتماعی قوت سے برد آزما ہے۔ اب میں اس مسئلے کے اس پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا جس میں فرد اپنی جدوجہد کے دوران تنہا نہیں رہتا بلکہ جاں نثار ساتھیوں کی رفاقت ڈھونڈ لیتا ہے یعنی ایسے افراد کے ساتھ مل کر ایک جماعت کی تشکیل کرلیتا ہے، جو اس کے ہم خیال ہیں، جن کا نظریۂ حیات اس کے اپنے نظریۂ حیات سے متصادم نہیں ہوتا، اور جن کا طرزِ عمل اس کے اپنے طرزِ عمل سے ایک نہایت خوشگوار قسم کی ہم آہنگی رکھتا ہے۔ میری ذاتی رائے میں فرد کی آزادیٔ خیال کا خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسے جماعت سازی کا جائز حق عطا نہیں کیا جاتا اور اس حق کی راہ میں حائل ہونے والے تمام سنگ ہائے گراں ریزہ ریزہ نہیں کردیے جاتے!

کسی جماعت کا رکن بن کر فرد اپنی شخصیت کو تنہائی کے خول سے رہائی دلاتا ہے اور یہ رہائی اس کی شخصیت کو پھیلنے کا موقع دیتی ہے، اس میں خود اعتمادی کا جوہر پیدا کرتی ہے۔ اس میں دردِ ذات سے گزر کر دردِ کائنات کو اپنانے اور پھر اسے اجتماعی تدبر سے مٹانے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے!

تاریخ بتاتی ہے کہ جہاں ریاست نے افراد کے اس حق کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں رواداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہاں معاشرہ، محبت، اخوت، اتحاد اور تنظیم سے ہم آغوش ہوا ہے اور اس کے برعکس جہاں اس نے اس حق کو بے دردی سے کچلنے کی کوشش کی ہے، وہاں سماج انتشار، بدنظمی اور تاراج کا شکار ہوا ہے۔

سیاسی جماعتوں، ادبی انجمنوں، مذہبی تنظیموں، ٹریڈ یونینوں اور دیگر رضاکارانہ طور پر سرگرم کار اداروں کو کسی معقول وجہ کے بغیر خلافِ قانون قرار دینا، ان کی پُرامن کارروائیوں میں خلل اندازی کرنا اور ان کے

جو اشتعال انگیز جلسوں میں شرکت کرنے والوں کو عدالت کے احکام جاری کرنا بالعموم آزادی خیال پر ایسے ناواجب حملے کے مترادف ہوتا ہے، جس کی حمایت کے فرائض کوئی باشعور اور روشن ضمیر انسان مشکل ہی سے سرانجام دے سکتا ہے۔

ہنگامی حالات کے حوالے سے آزادی خیال کا مسئلہ بڑی نازک صورت اختیار کر جاتا ہے۔ فرد کے اس بیش قیمت حق پر شدید ترین حملے ایسے ہی حالات میں روا رکھے جاتے ہیں اور ان حملوں کے جواز کے طور پر "ریاست کی سالمیت" اور "معاشرے کی بقا" کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں!

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہنگامی حالات میں افراد کو آزادی تحریر وتقریر کی وہ سطح بہم نہیں پہونچائی جاسکتی جو انھیں عام حالات میں حاصل ہوتی ہے کیوں کہ اس سے کئی قباحتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ مثلاً زمانۂ جنگ میں شہریوں کے خیالات وجذبات کا بے باکانہ اظہار حکومت کو ایسے مصائب سے دوچار کرسکتا ہے، جن سے محبان وطن کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہو، اور دشمنان ملک کو فائدہ پہونچنے کا امکان — لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم زمانۂ جنگ میں عوام کو تعمیری تنقید کے حق سے محروم کردیں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسے زمانہ میں انھیں اس حق کے استعمال کے جتنے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں گے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ کیوں کہ یہی وہ خطرناک دور ہوتا ہے، جب حکومت کی معمولی سی غلطی پوری قوم کو تباہی وبربادی کے غار میں دھکیل سکتی ہے۔

جنگ سویز کے موقع پر مسٹر ایٹلی اور ان کے رفقا، مسٹر ایڈن کی حکومت پر جو تنقید کرتے رہے ہیں، اس کی اہمیت سے انکار کرنا کچھ ایسا آسان کام نہیں ہے!

آزادی خیال کو کچلنے کے جملہ اقدامات کا حقیقی سبب دریافت کرنے کے لیے ہمیں معاشرے کا طبقاتی رنگ میں مطالعہ کرنا ہوگا۔ یہ مطالعہ ہم پر واضح کردے گا کہ ناہموار معاشرے میں حکومت کی مشینری پر صرف بالائی طبقہ غالب ہوتا ہے، جس کے مفادات نچلے طبقے کے مفادات سے ہمیشہ متصادم ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس مشینری کو مستقل طور پر اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کرتا ہے اور نتیجتاً نچلے طبقے کے افراد کی آزادی فکروعمل کے تحفظ کی کوئی ضمانت باقی نہیں رہتی۔ آزادی خیال پر حملے کرتے وقت خواہ بادشاہوں کے حقوقِ خداوندی کا نظریہ وضع کیا جائے اور خواہ آئین وقانون ساز اسمبلیوں کے تقدس کا کلیہ پیش کیا جائے۔ اس صداقت کی پردہ پوشی ممکن نہیں ہے کہ جابرانہ طرزِ عمل کی تہہ میں طبقاتی عناد کا جذبہ شعوری یا غیر شعوری انداز میں عموماً کارفرما ہوتا ہے۔

بالائی طبقہ مجلس قانون ساز میں ایک بل پیش کرتا ہے جسے اپنی اکثریت کے بل بوتے پر منظور کرکے قانون کی شکل عطا کردیتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس قانون کو خدائی احکامات کی سی عظمت وپاکیزگی بخش دی جاتی ہے، جس کے خلاف آواز اٹھانا، ایسے "کفر" کے مترادف ہے جس کی بیخ کنی قانون کے محافظوں کا اولین فرض ہے!

عوام سے قانون کی پرستش کروانے والوں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ قانون ساز اسمبلیاں انسانی ادارے ہیں اور اگر انھیں کسی قسم کا تقدس حاصل ہے تو وہ ان ہی انسانوں کا عطا کردہ ہے، جن کی نمائندگی کا انھیں دعویٰ ہے!

مذکورہ بالا معروضات سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بہ جانب ہیں کہ فرد کی آزادی خیال کو محفوظ ترین مقام صرف اسی معاشرے میں حاصل ہوسکتا ہے، جس میں متضاد مفادات رکھنے والے طبقات کا وجود قطعاً ناپید ہو! —

## کراچی فسادات

# سوال پانچویں قوم کا

مظفر حسین سید

پاکستان میں تشدد اور خون خرابے کا سلسلہ جاری ہے۔ تباہی، بربادی اور خوں ریزی کے جو بھیانک نظارے گزشتہ ایک ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں دیکھنے میں آئے ہیں انھوں نے تقسیم ملک کے وقت کے فسادات کو بھی شرما دیا ہے، کراچی میں جو ہولناک واقعات پیش آئے ہیں یا آ رہے ہیں، وہ محض فسادات تو ہرگز نہیں ہیں۔ پٹھانوں اور مہاجروں کے مابین جس طرح دو بدو جنگ ہوئی ہے، گلی گلی خون کی ندیاں بہی ہیں اور جس منظم طریقے سے محلوں اور بستیوں پر حملے کیے گئے ہیں ان کی مثال صرف خانہ جنگی سے دی جا سکتی ہے۔

دسمبر کے وسط میں اسّی لاکھ کی آبادی کا کراچی کئی دن تک جلتا رہا، بم کے دھماکے گونجتے رہے، گولیاں چلتی رہیں، اور عورتوں و بچوں کی آہ و بکا کی گونج میں پولیس کے ناکام رہنے کے بعد فوج دونوں باہم برسرپیکار قوموں کو خاموش کرنے کے لیے کوشش کرتی رہی، جب معاملہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو بارونق، رنگا رنگ اور پُرشور کراچی کی جگہ جو کچھ باقی بچا اسے "بھوت نگر" ہی کہا جا سکتا تھا۔ تہس نہس بازار، جلی ہوئی عمارتیں، فضا میں بندوق کی گولیوں اور آتشیں گولوں کا دھواں اور گھروں سے اٹھتی ماتمی آوازیں اور نالوں کی آواز گونج ——— بس یہی کچھ رہ گیا تھا۔

کراچی کا فساد بظاہر مہاجروں و پٹھانوں کا تصادم نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی پشت پر دو قوموں کی باہمی منافرت سے بڑھ کر بھی بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔ جس میں کاروباری منافست کے ساتھ ساتھ شہر پر اپنی اجارہ داری مسلط کرنے کی خفیہ خواہش کے علاوہ دیگر مفادات کا ٹکراؤ بھی شامل ہے۔

یہ سارا قصہ ایک سرکاری کارروائی سے شروع ہوا۔ جسے "آپریشن کلین اپ" کا نام دیا گیا تھا۔ اس منصوبہ بند کارروائی کے تحت فوج نے پٹھانوں کے علاقے سہراب گوٹھ پر چھاپہ مارا تھا۔ سہراب



گوٹھ کو پاکستان میں منشیات و دیگر غیر قانونی، غیر ملکی اشیاء کی اسمگلنگ کا مرکز خاص سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ چھاپہ ان ہی جرائم پیشہ گروہوں کو پکڑنے کے لیے مارا گیا تھا۔ اس مقصد میں فوج کو کس حد تک کامیابی و ناکامی ہوئی، اس پر تو بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن اس ضمن میں دو رائے نہیں ہو سکتیں، کراچی میں ہونے والے قتل عام، آتش زنی، تشدد کی گرم بازاری کا پیش خیمہ یہی واقعہ بنا۔ فوج تو اپنا کام کر کے چلی گئی، لیکن پٹھانوں کے دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ ان کے خلاف یہ سرکاری کارروائی مہاجرین کی سازش سے ہوئی ہے اور قریبی بستی اورنگی میں آباد بہاریوں نے ان کے خلاف مخبری کی ہے۔ بس اگلی صبح بندوقوں، رائفلوں اور روسی اسلحہ سے لیس پٹھانوں کی ایک چھوٹی موٹی فوج نے ٹیلوں پر چڑھ کر اورنگی پر یلغار کر دی ٹیلوں سے گھری اس بستی میں داخل ہونے کے سبھی راستے، جلتے ہوئے ٹائروں اور دیگر رکاوٹوں کے ذریعہ بڑی ہوشیاری سے پہلے ہی بند کر دیے گئے تھے۔ اس کے بعد قتل و غارت کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس نے دہلی کے نادرشاہی قتل عام کی یاد تازہ کر دی۔ چشم زدن میں سو سے زاید نہتے لوگوں کو قتل کر دیا گیا، اس معاملے میں بچے، بوڑھے یا عورتوں کی بھی تمیز نہیں کی گئی ۔ حملہ آوروں نے بے دریغ گولیاں برسائیں اور زندہ لوگوں کو اٹھا اٹھا کر ان ہی کے جلتے گھروں میں پھینکا ——— چالاک دشمن نے گھروں کو پہلے ہی ... آگ لگا دی تھی، لاشوں کو دفن کرنے کی ضرورت نہ تھی، چتائیں تیار تھیں ———

وحشت و بربریت کا جو ننگا ناچ کئی گھنٹے تک بے روک ٹوک ہوتا رہا، اس کے بارے میں چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ تقسیم ملک کے وقت ہوئے فسادات کے بعد اس پیمانے پر تشدد کی مثال نہیں ملتی۔ یہ تشدد بڑھتے بڑھتے پہلے پورے کراچی میں پھیلا، پھر اس آگ کی لپٹیں حیدرآباد تک پہونچیں اور سندھ کے کئی دوسرے شہر بھی اس کی زد میں آ گئے پولیس کے ناکام رہنے کے بعد فوج نے ہیلی کاپٹروں کی مدد سے بمشکل تمام اس خونریزی پر قابو پایا، ورنہ شاید اس دن اورنگی کی پوری بستی ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ——— لیکن کراچی میں چار دن تک تشدد کا بازار گرم رہا، ردّعمل میں مہاجر بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے، اور اِکّا دُکّا پٹھان محلوں پر حملے ہو رہے تھے۔ غیر معینہ مدت کا کرفیو اور فسادیوں کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کے احکامات بھی بے اثر ہو کر رہ گئے تھے۔ غیر سرکاری ذرائع کے مطابق اس فساد میں تین سو سے زاید جانیں تلف ہوئیں۔ اور ہزاروں لوگ زخمی ہوئے ——— تاہم حکومت اس پر مُصر ہے کہ ہلاک شدگان کی تعداد ۱۸۰ اور زخمیوں کی تعداد ۷۰۰ ہے۔

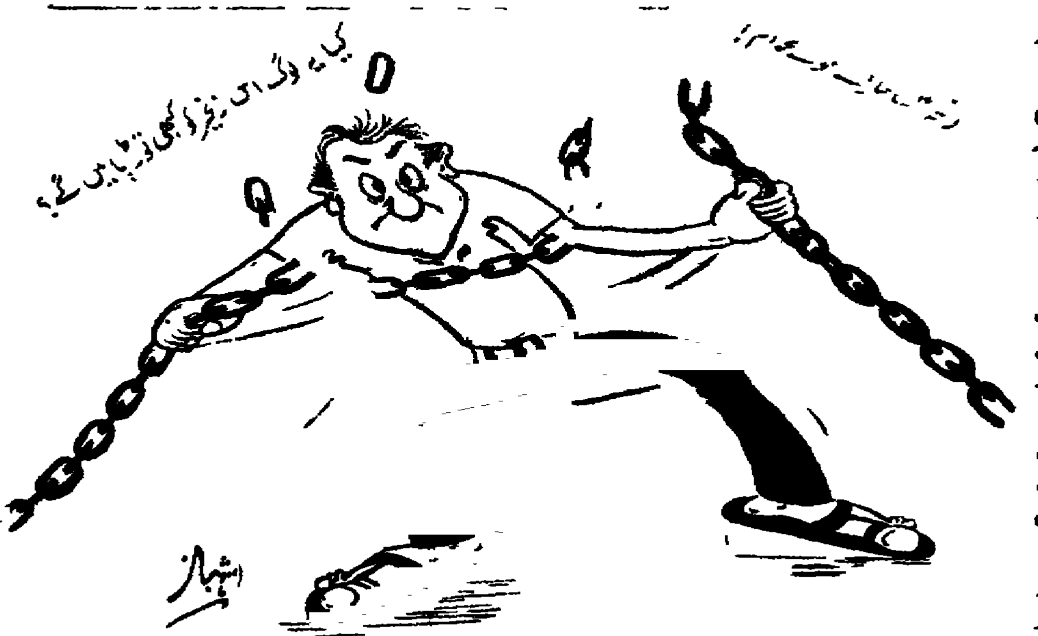
یہ تو تھی فسادات اور خوں ریزی کی دوسری قسط۔ اس سے ایک ماہ قبل ایک معمولی سے حادثے کے بعد

جب فساد ہوا تو پچاس افراد موت کا نوالہ بنے تھے اور سینکڑوں زخمی ہوئے تھے ـــ ویسے یہ سلسلہ تین برس سے جاری ہے، اور ایک محتاط اندازے کے مطابق اورنگی کے قتل عام سے پہلے ہی ۲۰۰ زندگیاں نفرت و انتقام کی اس دیوی کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔

ابھی اورنگی کے مقتولین کی چیخوں کی گونج فضا سے پوری طرح ختم نہیں ہوئی ہے کہ فسادات کا سلسلہ پھر سے پھوٹ پڑا ہے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق کراچی اور حیدرآباد میں پانچ روز سے قتل، لوٹ مار اور آتش زنی کا سلسلہ جاری ہے۔ صرف کراچی کے مشہور بازار لیاقت آباد میں ۳۲ دکانیں نذر آتش کر دی گئی ہیں۔ کراچی کے متعدد اضلاع اور حیدرآباد کے کچھ حصوں میں کرفیو نافذ ہے۔ ان سطور کے سپرد قلم کرتے وقت ملنے والی اطلاعات کے مطابق، پانچ روز کے اس خونریز فساد میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد درجنوں اور زخمیوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد ہو چکی ہے۔

ایک بات تو بلا تامل وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے یہ فسادات محض فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہیں دراصل یہ مہاجروں اور پٹھانوں کے درمیان بالادستی کی جنگ ہے۔ مہاجر کراچی کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ (پچاس لاکھ) ہیں اور پٹھان صرف سولہ لاکھ لیکن ان کی پشت پر ایک صوبہ کھڑا ہے۔ مہاجر تعلیم و ترقی یافتہ ہیں، معاشرے میں اچھا مقام ہے ان کا۔ دوسری جانب پٹھان کاروبار میں آگے ہیں۔ دولت کی قوت ان کے پاس کہیں زیادہ ہے۔ مہاجر اگر ہوٹلوں اور اونچے عہدوں پر فائز ہیں اور اخبارات پر ان کا غلبہ ہے تو پٹھان شہری ٹرانسپورٹ پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ اور ان دونوں دیوزادوں کے درمیان پنجابی اکثریت والی پولیس ہے، جو ان تمام حالات سے بے نیاز نظر آتی ہے اور جو انتہائی ضرورت کے وقت بے دلی کے ساتھ بمشکل تمام اپنا فرض ادا کرتی ہے۔

آج کے پاکستان میں لفظ 'مہاجر' کا مطلب ہے، ہندوستان سے نقل وطن کر کے پاکستان میں بس جانے والا غیر پنجابی۔ ویسے پنجابی مسلمان بھی بڑی تعداد میں مشرقی پنجاب سے جا کر پاکستانی پنجاب میں بسے تھے لیکن یہ زبان اور تہذیب کی یکسانیت کی بنا پر، وہاں کے ماحول میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ انھیں کوئی اجنبی نہیں سمجھتا اور نہ ہی انھیں مہاجر کہا جاتا ہے۔ پاکستان کی آٹھ کروڑ کی آبادی میں پنجابیوں کی اکثریت ہے۔ وہ ملک کی کل آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ ہیں، اور ان میں سے بیشتر صرف پنجاب میں ہی رہتے ہیں۔ بلوچ بلوچستان میں، اور پٹھان صوبہ سرحد میں آباد ہیں۔ مہاجر غیر منقسم ہندوستان میں اپنے گھروں سے اکھڑ کر پاکستان جا کر انھیں اپنا کوئی الگ صوبہ تو ملا نہیں، ان کی زبردست اکثریت سندھ میں جا بسی، اور خاص طور پر کراچی میں جو پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی و صنعتی مرکز ہے اور اس وقت دارالحکومت بھی تھا۔ مہاجروں کی خوش قسمتی سے سندھ کے اصل باشندے سندھیوں نے ان کی




طوفانی آمد اور بڑے پیمانے پر کراچی میں ان کی آباد کاری پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ آہستہ آہستہ کراچی اور حیدرآباد میں مہاجرین کا غلبہ ہو گیا ـــ پریشانی کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۹۶۰ء کے بعد سرحدی علاقوں سے پٹھانوں نے یہاں آ کر بڑی تعداد میں بسنا اور روزی تلاش کرنا شروع کیا۔ اس وقت کے صدر پاکستان جنرل ایوب خاں نے (جو خود پٹھان تھے) ان پٹھانوں کی خوب ہمت افزائی کی۔ بتایا جاتا ہے کہ صدر ایوب "ہندوستانیوں" (مہاجروں) سے ناخوش تھے۔ اور اس ناخوشی کا واضح سبب یہ تھا کہ صدارتی انتخابات میں مہاجروں نے ان کا نہیں بلکہ ان کی حریف محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی۔ لہٰذا جنرل ایوب کی انتخابی کامیابی کے بعد ان کے فرزند گوہر ایوب نے ایک شاندار جلوس فتح نکالا، جس میں پٹھانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی وقت پاکستان کی تاریخ کا پہلا پٹھان مہاجر فساد ہوا اور یہی فساد بس کی جڑ ثابت ہوا۔

پھر سقوط مشرقی پاکستان اور قیام بنگلہ دیش کے بعد جب آٹھ لاکھ بہاری اجڑے اجڑائے ڈھاکہ سے آئے تو انھیں بھی کراچی میں ہی پناہ ملی۔ اس طرح اردو داں مہاجرین کی تعداد اور بڑھ گئی۔ اور وہ باقی سب فرقوں پر چھا گئے۔ اُدھر پٹھانوں نے دھیرے دھیرے، کڑی محنت کر کے کاروباری میدان میں اپنے قدم جما لیے۔ انھوں نے شہری ذرائع نقل و حمل پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ اور کچھ دوسرے منافع بخش بڑے کاروبار بھی اپنی مٹھی میں کر لیے، جن میں سے تازہ ترین منشیات کی ناجائز تجارت اور ہر قسم کے غیر ملکی سامان کی غیر قانونی خرید و فروخت کا روبہ ترقی کاروبار ہے۔ اس معاملے میں پٹھانوں کے شریک کار وہ افغان باشندے ہیں، جن کی خاصی تعداد کراچی میں پناہ گزین ہے۔ قدرتی طور پر مہاجر اس صورت حال کو ہضم نہیں کر سکے، مفادات کا ٹکراؤ بڑھتا رہا، اور دونوں

قوموں کے مابین خلیج وسیع تر ہوتی چلی گئی ـــــ افغان پناہ گزینوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا، وہ نہ صرف اسمگلنگ اور منشیات بازی میں پٹھانوں کے مددگار ہیں بلکہ وہ انھیں روسی اسلحہ بھی بڑی فراخدلی سے دے رہے ہیں جو وہ افغانستان سے ساتھ لائے تھے۔ اور ان ہی ہتھیاروں کو پٹھانوں نے کھلے عام مہاجروں کے قتل و غارت اور ان کے رہائشی و کاروباری ٹھکانوں کو تہس نہس کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ مہاجر آج تک صحیح معنوں میں مقامی نہیں بن سکے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے چالیس سال بعد بھی اس دیار میں نو وارد اور اجنبی کی طرح ہیں، اور مقامیوں نے شاید دل سے انھیں پاکستانی نہیں سمجھا ہے، حالاں کہ ان کی ایک پوری نسل پیدا ہو کر جوان بلکہ ادھیڑ ہو چلی ہے، جن میں سے اکثر نے اپنے آبا و اجداد کا وطن (ہندوستان) دیکھا بھی نہیں ہے۔ اس معاملے میں مہاجر خود بھی برابر کے قصوروار ہیں۔ وہ ابھی کل تک مقامی باشندوں (خصوصاً سندھیوں) کو جاہل، گنوار اور بد تہذیب سمجھتے اور کہتے رہے ہیں۔ اپنے نئے وطن کے ساتھ وابستگی کے تمام تر دعووں کے باوجود مہاجروں کے بچے آج بھی نہ تو سندھی زبان پڑھتے ہیں اور نہ بولتے ہیں۔ ـ ـ گزشتہ چند برسوں سے مہاجرین کے اندر اپنے ممتاز، منفرد وجود اور اپنی علاحدہ شناخت کا احساس بہت شدید ہو گیا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے منوانے پر اصرار کرتے رہے ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ انھیں پاکستان کی پانچویں قوم تسلیم کیا جائے۔ باقی چار، پنجابی، سندھی بلوچی اور پٹھان قوموں کی طرح۔ (پاکستان میں یہ سب لسانی و تہذیبی فرقے اپنے آپ کو "قوم" ہی کہتے ہیں)۔

اس سلسلے میں مہاجرین کی سنجیدگی کا ثبوت ہے، ان کی تنظیم "مہاجر قومی تحریک" کا قیام۔ اس تنظیم کا مسلسل فروغ اور اس کی عوامی مقبولیت اس امر کی واضح نشان دہی کرتی ہے کہ مہاجروں میں "قومیت" کا احساس دن بہ دن شدید ہوتا جا رہا ہے۔

اسے تاریخ کی ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ آج چالیس برس کے بعد بھی پاکستان میں مہاجروں کو ابھی جان و مال کی سلامتی کا یقین نہیں، اور مستقبل کے سلسلے میں وہ بہت زیادہ پُر امید بھی نہیں۔ یہی بے یقینی اور نا امیدی انھیں "ایک قوم" کے طور پر اپنی شناخت تلاش کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ عدم اعتماد اور مایوسی کے احساسات آج مہاجر قاید کی تقریروں سے عیاں ہیں۔

"مہاجر قومی تحریک" کے ایک قاید جناب خالد سلطان نے حال ہی میں ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ

> "جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو ہم سب کو ایک قوم کے روپ میں ڈھلنا تھا، مگر جب ہمارے والدین نے سرزمین پاکستان پر قدم رکھا تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان ہیں پاکستانی کوئی نہیں اور اگر پاکستانی کوئی ہے تو صرف مہاجرین۔ ہم نے خود کو کبھی مہاجر نہیں کہلوایا تھا، دوسری 'قوموں' نے خود ہمیں مہاجر کہا، انھوں نے کبھی ہمیں تلّر کہا تو کبھی مٹوا، اور بھی طرح طرح کے خطابات سے نوازا گیا، اور اب ہم خود اپنے آپ کو مہاجر کہنے لگے ہیں۔ ہماری اپنی ثقافتی، تاریخی و لسانی شناخت ہے، جو دوسری "قومیتوں" سے جدا ہے اور ہم اسی بات کو تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔"

ہندوستان میں دہلی، اتر پردیش اور بہار کے علاوہ جو لوگ حیدر آباد (دکن) سے گئے ہیں وہ گجراتی تاجر، یہ سب مہاجر قومی تحریک کی حمایت کر رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جب گجراتی تاجر و صنعت کار وہاں کے کاروباری حلقوں پر حاوی تھے مگر بینکوں کے قومیائے جانے اور قرضہ جات کی سہولتوں کے بعد سے دوسرے نئے لوگ بھی اس نئے میدان میں داخل ہوتے ہیں، جس سے ان گجراتیوں کی اجارہ داری کم ہوتی ہے، اور اب انھیں اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا ہے۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ آج کل مہاجروں اور سندھیوں میں بڑا اتحاد و اتفاق ہے، لیکن اس میل ملاپ کو مصلحت پسندانہ گٹھ جوڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی کیوں کہ سندھیوں کو پنجابی و پٹھان



یہ کیا تماشا ہے! ایک قوم آدھی خوشحال، آدھی بدحال

خطرے کے مقابلہ نیز مرکز کی مخالفت کے لیے مدد کی ضرورت ہے اور مہاجروں کو بھی بخوبی اندازہ ہے کہ پٹھانوں کے مقابلے کے لیے مقامی سندھیوں کی ہمدردی حاصل رہنا ضروری ہے۔ کچھ دن قبل تک ان دونوں کی ایک دوسرے کے بارے میں کیا سوچ تھی، یہ کوئی راز نہیں۔

حالیہ فسادات کے سلسلے سے قبل مہاجر قومی تحریک نے حیدرآباد میں ایک عظیم الشان مظاہرے کا اہتمام کیا تھا۔ اس مظاہرے کے جلوس میں آٹھ دس لاکھ لوگوں کی حاضری نے سب کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اتنا بڑا مجمع تو بے نظیر بھٹو کے حامی بھی جمع نہیں کر پائے تھے۔ اس مظاہرے کے بعد ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے تحریک کے صدر جناب الطاف حسین نے للکارا تھا۔

"آج قوم کو باعزت زندگی گزارنے کے لیے قربانی کی ضرورت ہے، بالکل ویسی ہی قربانی کی۔ ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں اس لیے نہیں آئے تھے کہ یہاں آکر محکوم بن جائیں۔ نہ ہم یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ ہماری ثقافت اور ہماری زبان کو مٹا دیا جائے۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں، ہم اپنی جان دے کر بھی اسے مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ اگر پاکستان میں سندھی، پنجابی، بلوچی اور پٹھان قومیں ہیں تو ہم پانچویں قوم ہیں۔ پاکستان ہماری ہی قربانیوں کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔"

بعد ازاں الطاف حسین کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور وہ ابھی تک جیل میں ہیں۔

حزب اختلاف نے حسب روایت سارا الزام حکومت پر عاید کیا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے "آپریشن کلین اپ" کو ایک بھیانک ڈرامہ قرار دیا ہے اور صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کے استعفیٰ کا مطالبہ کیا ہے۔

حزب مخالف کے دوسرے قائدین نے بھی فسادات کی تمام تر ذمہ داری ضیاء حکومت کے سر ہی ڈالی ہے۔ در ایں اثنا وزیر اعظم محمد خاں جونیجو کی کابینہ مستعفی ہو گئی ہے۔

اس سارے خونیں ڈرامے کے دوران پاکستان کے سرکاری ذرائع ابلاغ کا رویہ کافی حیرت ناک رہا۔



پاکستانی ٹیلی ویژن اور ریڈیو پاکستان نے کراچی کے فسادات کی خبروں کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ اگر کچھ نشر ہوا تو صرف سرکاری اعلانات اور بیانات۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ فسادات کی خبروں کے لیے بی بی سی اور آل انڈیا ریڈیو پر ہی اعتماد کرتے دیکھے گئے۔ تاہم اس صورت حال کے برعکس اخبارات کا رویہ بہت دیانت دارانہ اور صاف ستھرا رہا۔ انگریزی کے 'ڈان' اور اردو کے 'جنگ' سے لے کر ہفتہ وار 'چٹان' تک تمام اخبارات و جرائد نے فسادات کی من و عن خبریں بڑی تفصیل سے شائع کیں اور ان پر بے باکانہ اداریے لکھے۔ ڈان کے ادارے سے شائع ہونے والے انگریزی جریدے 'ہیرلڈ' نے اپنی ایک حالیہ سرورق کہانی میں مہاجر قومی تحریک کے عروج پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس جریدے نے لکھا ہے کہ:-

"دوسری 'قومیتی' تحریکات کی طرح مہاجر قومی تحریک نے بھی حکومت، انتظامیہ اور مسلح افواج میں پنجابیوں کے غلبے کے خلاف ردِ عمل کے طور پر زور پکڑا ہے۔"

لاہور کے ایک ممتاز و موقر صحافی جناب آئی۔ اے۔ رحمٰن نے اس صورت حال کا جائزہ ایک زاویے سے لیتے ہوئے تبصرہ کیا ہے کہ:-

"حالیہ فسادات پاکستان کے لیے ایک بدشگون تنبیہہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اس امر کے غماز ہیں کہ اس بحران کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہیں اور اس کا سبب ہماری یہ ناکامی ہے کہ ہم آج تک ایک متحد قوم نہیں بن سکے ہیں۔ اس مسئلہ کا حل امن و قانون کے مروجہ طریقہ ہائے کار کے ذریعہ ممکن نہیں۔

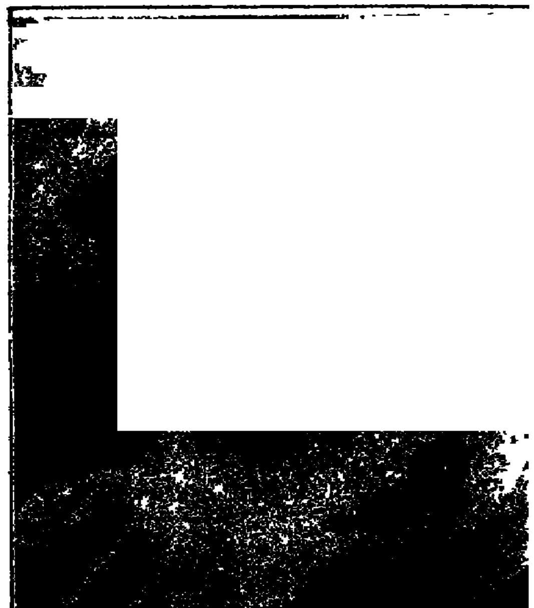
فسادات اور ان کے اثرات سے آج کراچی کی زندگی کا کوئی شعبہ اور طبقہ محفوظ نہیں، پٹھانوں کے بہت سے خاندان بھی حالات سے خوف زدہ ہو کر واپس سرحدی صوبے چلے گئے ہیں، اور مہاجروں کے لیے چوں کہ کوئی جائے فرار نہیں، لہٰذا وہ کسی نہ کسی طرح حالات کا مقابلہ کرنے اور قدم جمائے رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ لیکن مایوسی کے سائے ان کے پورے معاشرے پر منڈلا رہے ہیں۔ بقول ایک مہاجر:-

"پاکستان میں مہاجروں کا کوئی مستقبل نہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ درجہ دوم کے شہری ہو سکتے ہیں، اور ہمیں اس صورت حال کا عادی ہونا چاہیے۔"

جوئے ایس پرساد

# ایران گیٹ

مئی-جون ۱۹۸۵ء میں جب رونالڈ ریگن نے ایران کے ساتھ یرغمالوں کے بدلے میں اسلحہ کی خفیہ سودے بازی کو چپ چاپ مان لیا تو اسے کیا معلوم کہ یہ عاقبت اندیشی اس کے دورِ صدارت کا ایسا بدترین بحران بن کر ظاہر ہوگی جو شاید وہائٹ ہاؤس



میں خود اس کی حیثیت کو معرضِ خطر میں ڈال دے گا.

دیگر وجوہ کے ساتھ ساتھ دیکھنے کی مزید بات یہ ہے کہ امریکہ کے حلیف اسرائیل کی ارضی۔ فوجی مجبوریوں نے مشرقِ بعید کے اسلحہ فروشوں کے کاروباری مفادات کے ساتھ مل کر امریکی سرکار کو کس طرح ایک ایسی راہ اختیار کرنے کے لیے لبھایا، جو خود اس کے لیے باعثِ ہزیمت بن گئی۔

## اسرائیل کا تعلق

یہ بات اب ہر کوئی جانتا ہے کہ سعودی عرب کے ایک متمول اسلحہ فروش، عدنان خشوگی نے ۱۹۸۵ کے اوائل میں اپنے دو اسرائیلی ہمسروں کو اس منصوبے کو بروئے کار لانے کی غرض سے اپنے ساتھ لگا لیا تھا. ایک سابق فوجی کرنیل اور شاہ کے دورِ حکومت میں تہران میں طویل مدت تک اسرائیلی فوجی اتاشی کی حیثیت سے مقیم رہنے والے یعقوب نمرودی نیز اسرائیل ایئر کرافٹ انڈسٹریز کے صدر اور سابق اسرائیلی وزیر اعظم شمعون پیرس کے قریبی دوست الشومر کی، ایرانی وزیر اعظم کے مقرب، ایک ایرانی اسلحہ فروش منوچہر غوربنیفر سے ساتھ لگا کر ملاقات کرائی گئی۔

لندن میں کی گئی ایک میٹنگ میں ان چاروں نے امریکی یرغمالوں کی رہائی کے عوض اسلحہ کی فراہمی کے منصوبے پر تبادلۂ خیال کیا۔ غوربنیفر نے یہ بھی تجویز رکھی کہ خوش اتفاقی کی اشارت کے طور پر اسرائیل ایران کو ٹی او ڈبلیو ٹینک شکن میزائل اور ہاک طیارہ شکن میزائل جہاز سے روانہ کرے۔ اسرائیلی وزارتِ خارجہ کے ان دنوں ڈائرکٹر جنرل ڈیوڈ کمچے نے جولائی ۱۹۸۵ء سابق قومی سلامتی مشیر رابرٹ میکفرلین کو مطلع کیا کہ ایران امریکہ سے اپنے روابط کو بہتر بنانے اور لبنان میں امریکی یرغمالوں کی رہائی میں معاونت کرنے پر رضامند ہے۔ بشرطیکہ ریگن سرکار ایران کو ہتھیاروں کی 'صدقِ نیت' کھیپ فراہم کرے۔ گزشتہ بہار قومی سلامتی کونسل کے نئے سربراہ جان پوئنڈکسٹر نے میکفرلین اور اس کے نائب آلیور نارتھ کو پہلے اسرائیل کو پرواز کرنے کی ہدایت کی، جہاں وہ ایران کے لیے امریکی اسلحے جا رہے طیارے پر سوار ہوگئے۔

## خلیجی جنگ میں توازن قائم کرنا

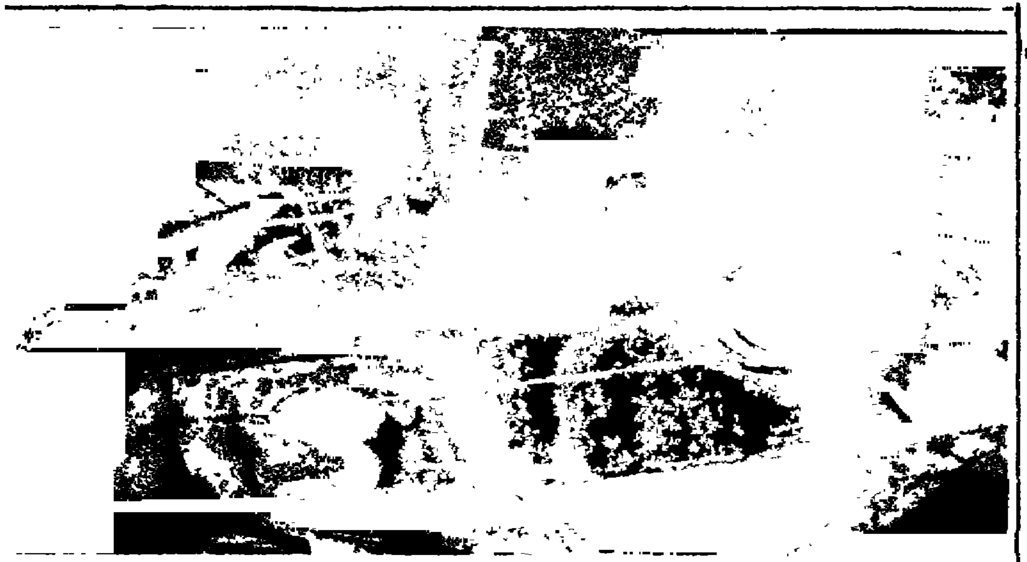
چھ برس سے چل رہی ایران-عراق جنگ کا اِس یا اُس فریق کے حق میں ایک فیصلہ کن جھکاؤ اسرائیل اور اس کے آتالیق امریکہ کے لیے ایک ناسازگار ماحصل ہوگا۔ ماضی میں عراق نے تین عرب اسرائیل جنگوں میں فوجی دستوں سے مدد کی تھی، نیز دہشت گردوں کو پناہ اور تعاون دیا تھا۔ دہشت گردی کی کفالت اور پشت پناہی میں خمینی کے رجعت پرست ایران کا ریکارڈ تو اس سے بھی زیادہ تابناک ہے۔ ان حالات میں خلیجی جنگ کے تعلق سے ایک مسلسل تعطل بہترین انتخاب ہوگا کیونکہ اس سے اسرائیل پر سے عربوں کی توجہ ہٹتی ہے، سعودی عرب ممالک آپسی مدد سے محروم ہو جاتے ہیں، نیز ایران سے تحریک پائے ہوئے اسلامی کٹرپنتھ کی توسیع کی مزاحمت ہوتی ہے۔

لہٰذا جلتی پر فرور ی تیل ڈالنے کے لیے سابق اسرائیلی وزیر اعظم میناچم بیگن نے ۱۹۸۰ء کے اوائل میں اسلحہ اور گولہ بارود جہاز سے تہران کو روانہ کیے۔ ۱۹۸۰ء میں تہران میں امریکی سفارت خانے میں امریکیوں کو یرغمال بنا لیے جانے کے بعد یہ راستہ بند کر دیا گیا۔ لیکن جونہی سبھی یرغمال آزاد ہوئے، اسلحہ کی فراہمی پھر سے شروع کر دی گئی۔ خلیجی جنگ میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کرتے ہوئے امریکہ نے ایران کو "دفاعی ہتھیار اور فاضل پرزے" بیچنا چوری چھپے مان لیا۔

## فراہم کیے گئے اسلحہ کی نوعیت

ٹیکساس کے ڈیموکریٹ، پارلیمانی رکن جم رائٹ نے، جو جنوری میں نئی منتخبہ کونسل کے اجلاس میں اسپیکر ہو جائیں گے، یہ انکشاف کیا ایران نے امریکہ سے ۲۰۰۸ ٹو ٹینک شکن میزائل اور ہاک طیارہ شکن میزائلوں کے لیے ۲۳۵ "توپخانہ سے متعلق پرزے وغیرہ" خریدے تھے۔ ٹوز کی تعداد مذکورہ اعداد سے دوگنا بھی ہو سکتی ہے، ایک سابق ایرانی جاسوسی کارندے" کے بموجب، ۳ ملین ڈالر کی مالیت کی ایف-۵ اور ایف-۶ لڑاکو جیٹ ہوائی جہازوں کے انجنوں کی ایک کھیپ الجریا کے راستے بھیجی گئی تھی۔ یہ اسلحہ مرکزی جاسوسی ادارے کو اس قانون کے تحت فراہم کیا گیا جس کی رُو سے سی۔آئی۔اے کے لیے اسلحہ کی قیمت کی محکمۂ دفاع کو تلافی کرنا ضروری تھا۔ پینٹاگن کے بجٹ کی ایک دستاویز کے بموجب ۱۲۷۰۰ ٹو میزائل خرید کرنے کے لیے امریکی فوج سے ۱۹۸۶ء میں ۱۸۲٫۹ ملین ڈالر ادا کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ ایک اکائی ٹو میزائل کی لاگت موٹے طور پر ۱۴۴۰۰ ڈالر آتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایران کو بھیجے گئے تنہا ٹو میزائلوں کی قیمت موٹے طور پر ۲۸٫۹ ملین ڈالر تھی۔ اسی طرح ۱۹۸۶ء کے مالی سال میں پینٹاگن کی رو سے ۵۵۰ مکمل ہاک میزائلوں کے لیے ۱۲۲٫۷ ملین ڈالر واجب الادا ہیں یعنی موٹے طور پر ۲۲۳۰۰۰ ڈالر فی میزائل۔

ایران کو اسلحہ کی فراہمی کے انکشاف نے



خطرے کے مقابلے، نیز مرکزی مخالفت کے لیے مدد کی ضرورت ہے اور مہاجروں کو بھی بخوبی اندازہ ہے کہ پٹھانوں کے مقابلے کے لیے مقامی سندھیوں کی ہمدردی حاصل ہونا ضروری ہے ... کچھ دن قبل تک ان دونوں کی ... ایک دوسرے کے بارے میں ... یہ کوئی ... نہیں۔

حالیہ فسادات کے سلسلے سے قبل مہاجر قومی تحریک نے حیدرآباد میں ایک عظیم الشان مظاہرے کا اہتمام کیا تھا۔ اس مظاہرے کے جلوس میں آٹھ دس لاکھ لوگوں کی حاضری نے سب کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اتنا بڑا مجمع تو بے نظیر بھٹو کے حامی بھی جمع نہیں کر پائے ہیں۔ اس مظاہرے کے بعد ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے تحریک کے صدر جناب الطاف حسین نے للکار کر کہا تھا

"آج قوم کو باعزت زندگی گزارنے
کے لیے قربانی کی ضرورت ہے جان
خون کی قربانی کی۔ ہم ہندوستان
سے ہجرت کر کے یہاں اس لیے نہیں
آئے تھے کہ یہاں آ کر محکوم بن جائیں،
ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے ہیں کہ ہماری
زبان اور ہماری ثقافت کو مٹا دیا
جائے۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں،
ہم اپنی جان دے کر بھی اسے مستقل
کی تعمیر کر سکتے ہیں اگر پاکستان میں
بھی پنجابی، سندھی اور پٹھان قومیں ہیں
تو ہم مہاجر بھی قوم ہیں۔ پاکستان
ہماری ہی قربانیوں کے نتیجے میں وجود
میں آیا تھا۔"

بعد ازاں الطاف حسین کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور وہ ابھی تک جیل میں ہیں۔

حزب اختلاف نے حسب روایت سارا الزام حکومت پر عاید کیا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے "آپریشن کلین اپ" کو ایک بھیانک ڈرامہ قرار دیا ہے اور صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کے استعفیٰ کا مطالبہ کیا ہے۔

حزب مخالف کے دوسرے قائدین نے بھی فسادات کی تمام تر ذمہ داری ضیاء حکومت کے سر ہی ڈالی ہے۔ در ایں اثنا وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی کابینہ مستعفی ہو گئی ہے۔

اس سارے خونیں ڈرامے کے دوران پاکستان کے سرکاری ذرائع ابلاغ کا رویہ کافی حیرت ناک رہا۔ پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو پاکستان نے کراچی کے فسادات کی خبروں کا مکمل بائیکاٹ کیا، اگر کچھ نشر ہوا تو صرف سرکاری اعلانات اور بیانات۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ فسادات کی خبروں کے لیے بی بی سی اور آل انڈیا ریڈیو پر ہی اعتماد کرتے دیکھے گئے۔ تاہم اس صورت حال کے برعکس اخبارات کا رویہ بہت دیانت دارانہ اور صاف شفاف رہا۔ انگریزی کے 'ڈان' اور اردو کے 'جنگ' سے لے کر ہفتہ وار 'چٹان' تک تمام اخبارات و جرائد نے فسادات کی من و عن خبریں بڑی تفصیل سے شائع کیں اور ان پر ایماندارانہ اداریے لکھے۔ ڈان کے ادارے سے شائع ہونے والے انگریزی جریدے 'ہیرالڈ' نے اپنی ایک حالیہ سرورق کہانی میں مہاجر قومی تحریک کے عروج پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس جریدے نے لکھا ہے کہ:-

"دوسری 'قومیتی' تحریکات کی طرح
مہاجر قومی تحریک نے بھی حکومت،
انتظامیہ اور مسلح افواج میں پنجابیوں
کے غلبے کے خلاف ردعمل کے طور پر
زور پکڑا ہے۔"

لاہور کے ایک ممتاز و موقر صحافی جناب آئی۔ اے۔ رحمٰن نے اس صورت حال کا جائزہ ایک زاویے سے لیتے ہوئے تبصرہ کیا ہے کہ:-

"حالیہ فسادات پاکستان کے لیے ایک
بدشگون تنبیہہ کی حیثیت رکھتے
ہیں، اور اس امر کے غماز ہیں کہ اس
بحران کی جڑیں تاریخ میں پیوست
ہیں اور اس کا سبب ہماری یہ ناکامی
ہے کہ ہم آج تک ایک متحد قوم نہیں
بن سکے ہیں۔ اس مسئلہ کا حل امن
و قانون کے مروجہ طریقہ ہائے کار کے
ذریعہ ممکن نہیں۔

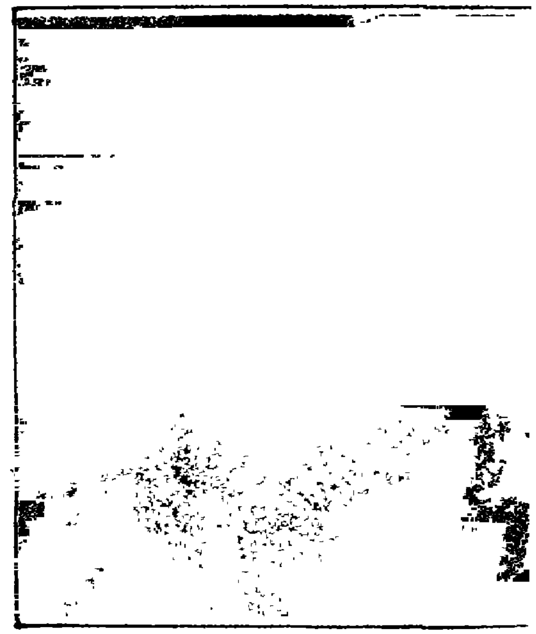
فسادات اور ان کے اثرات سے آج کراچی کی زندگی کا کوئی شعبہ اور طبقہ محفوظ نہیں، پٹھانوں کے بہت سے خاندان بھی حالات سے خوف زدہ ہو کر واپس سرحدی صوبے چلے گئے ہیں، اور مہاجروں کے لیے چوں کہ کوئی جائے فرار نہیں، لہٰذا وہ کسی نہ کسی طرح حالات کا مقابلہ کرنے اور قدم جمائے رکھنے کی جہد و جہد میں مصروف ہیں۔ لیکن مایوسی کے سائے ان کے پورے معاشرے پر منڈلا رہے ہیں۔ بقول ایک مہاجر:-

"پاکستان میں مہاجروں کا کوئی مستقبل
نہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ درجہ دوم
کے شہری ہو سکتے ہیں، اور ہمیں اس
صورت حال کا عادی ہونا چاہیے۔"

جے ایس پرساد

# ایران گیٹ

مئی-جون ۱۹۸۵ء میں جب رونالڈ ریگن نے ایران کے ساتھ یرغمالوں کے بدلے میں اسلحہ کی خفیہ سودے بازی کو چپ چاپ مان لیا تو اسے کیا معلوم کہ یہ عاقبت اندیشی اس کے دور صدارت کا ایسا بدترین بحران بن کر ظاہر ہوگی جو شاید وہائٹ ہاؤس



میں خود اس کی حیثیت کو معرض خطر میں ڈال دے گا دیگر وجوہ کے ساتھ ساتھ دیکھنے کی مزید ار بات یہ ہے کہ امریکہ کے حلیف اسرائیل کی ارض۔ فوجی مجبوریوں نے مشی بوہجی اسلحہ فروشوں کے کاروباری مفادات کے ساتھ مل کر امریکی سرکار کو کس طرح ایک ایسی راہ اختیار کرنے کے لیے لبھایا، جو خود اس کے لیے باعثِ ہزیمت بن گئی۔

## اسرائیل کا تعلق

یہ بات اب ہر کوئی جانتا ہے کہ سعودی عرب کے ایک متمول اسلحہ فروش، عدنان خشوگی نے ۱۹۸۵ء کے اوائل میں اپنے دو اسرائیلی ہمسروں کو اس منصوبے کو بروئے کار لانے کی غرض سے اپنے ساتھ گانٹھا ایک سابق فوجی کرنیل اور شاہ کے دورِ حکومت میں تہران میں طویل مدت تک اسرائیلی فوجی اتاشی کی حیثیت سے مقیم رہنے والے یعقوب نزودی نیز اسرائیل ایئرکرافٹ انڈسٹریز کے صدر اور سابق اسرائیلی وزیراعظم شمون پیرس کے قریبی دوست الشوِمرکی، ایرانی وزیراعظم کے مقرب، ایک ایرانی اسلحہ فروش منوچہر غوربنیفر سے سانٹھ گانٹھ کرائی گئی۔

لندن میں کی گئی ایک میٹنگ میں ان چاروں نے امریکی یرغمالوں کی رہائی کے عوض اسلحہ کی فراہمی کے منصوبے پر تبادلۂ خیال کیا غوربنیفر نے یہ بھی تجویز رکھی کہ خوش اتفاقی کی اشارت کے طور پر اسرائیل ایران کو ٹی او ڈبلیو ٹینک شکن میزائل اور ہاک طیارہ شکن میزائل جہاز سے روانہ کرے۔ اسرائیلی وزارت خارجہ کے ان دنوں ڈائرکٹر جنرل ڈیوڈ کمچے نے جولائی ۱۹۸۵ء سابق قومی سلامتی مشیر رابرٹ میکفرلین کو مطلع کیا کہ ایران امریکہ سے اپنے روابط کو بہتر بنانے اور لبنان میں امریکی یرغمالوں کی رہائی میں معاونت کرنے پر رضامند ہے۔ بشرطیکہ ریگن سرکار ایران کو ہتھیاروں کی 'صدق نیت' کھیپ فراہم کرے۔ گزشتہ بہار قومی سلامتی کونسل کے نئے سربراہ جان پوئنڈکسٹر نے میکفرلین اور اس کے نائب آلیور نارتھ کو پہلے اسرائیل کو پرواز کرنے کی ہدایت کی، جہاں وہ ایران کے لیے امریکی اسلحہ لے جا رہے طیارے پر سوار ہو گئے۔

## خلیجی جنگ میں توازن قائم کرنا

چھ برس سے چل رہی ایران-عراق جنگ کا اِس یا اُس فریق کے حق میں ایک فیصلہ کن جھکاؤ اسرائیل اور اس کے اتالیق امریکہ کے لیے ایک ناسازگار ماحصل ہوگا۔ ماضی میں عراق نے تین عرب اسرائیل جنگوں میں فوجی دستوں سے مدد کی تھی، نیز دہشت گردوں کو پناہ اور تعاون دیا تھا، دہشت گردی کی کفالت اور پشت پناہی میں خمینی کے رجعت پرست ایران کا ریکارڈ تو اس سے بھی زیادہ تابناک ہے۔ ان حالات میں خلیجی جنگ کے تعلق سے ایک مسلسل تعطل بہترین انتخاب ہوگا کیونکہ اس سے اسرائیل پر سے عربوں کی توجہ ہٹتی ہے، ہر دو عرب ممالک آپسی مدد سے محروم ہو جاتے ہیں، نیز ایران سے تحریک پائے ہوئے اسلامی کٹرپنتھ کی توسیع کی مزاحمت ہوتی ہے۔

لہٰذا جلتی پر مزید تیل ڈالنے کے لیے سابق اسرائیلی وزیراعظم مناچم بیگن نے ۱۹۸۰ء کے اوائل میں اسلحہ اور گولہ بارود جہاز سے تہران کو روانہ کیے۔ ۱۹۸۰ء میں تہران میں امریکی سفارت خانے میں امریکیوں کو یرغمال بنا لیے جانے کے بعد یہ راستہ بند کر دیا گیا لیکن جونہی سبھی یرغمال آزاد ہو گئے، اسلحہ کی فراہمی پھر سے شروع کر دی گئی۔ خلیجی جنگ میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کرتے ہوئے امریکہ نے ایران کو ۱۰ فاضل ہتھیار اور فاضل پرزے" بیچنا چوری چھپے مان لیا۔

## فراہم کیے گئے اسلحہ کی نوعیت

ٹیکساس کے ڈیموکریٹ، پارلیمانی رکن جم رائٹ نے، جو جنوری میں نئی منتخبہ کونسل کے اجلاس میں اسپیکر ہو جائیں گے۔ یہ انکشاف کیا ایران نے امریکہ سے ۲۰۰۸ ٹو ٹینک شکن میزائل اور ہاک طیارہ شکن میزائلوں کے لیے ۲۳۵ "توپخانہ سے متعلق پرزے وغیرہ" خریدے تھے "ٹو کی تعداد مذکورہ اعداد سے دوگنا بھی ہو سکتی ہے" ایک سابق ایرانی جاسوسی کارندے" کے بموجب ۳۰ ملین ڈالر کی مالیت کی ایف-۵ اور ایف-۶ لڑاکو جیٹ ہوائی جہازوں کے انجنوں کی ایک کھیپ الجیریا کے راستے بھیجی گئی تھی یہ اسلحہ مرکزی جاسوسی ادارے کو اس قانون کے تحت فراہم کیا گیا جس کی رُو سے سی آئی اے کے لیے اسلحہ کی قیمت کی محکمۂ دفاع کو تلافی کرنا ضروری تھا پینٹاگن کے بجٹ کی ایک دستاویز کے بموجب ۱۲۷۰۰ ٹو میزائل خرید کرنے کے لیے امریکی فوج سے ۱۹۸۶ء میں ۱۸۲/۹ ملین ڈالر ادا کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ ایک اکائی میزائل کی لاگت موٹے طور پر ۱۴۴۰۰ ڈالر آتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایران کو بھیجے گئے تنہا ٹو میزائلوں کی قیمت موٹے طور پر ۲۸/۹ ملین ڈالر تھی۔ اسی طرح ۱۹۸۶ء کے مالی سال میں پینٹاگن کی جانب سے ۵۵۰ مکمل ہاک میزائلوں کے لیے ۱۲۲/۷ ملین ڈالر واجب الادا ہیں یعنی موٹے طور پر ۲۲۳۰۰۰ ڈالر فی میزائل۔

ایران کو اسلحہ کی فراہمی کے انکشاف نے

…نے ان دعووں کو جھٹلا دیا کہ امریکہ کی طرف سے بھیجے گئے ہتھیار خالصتاً دفاعی اور "فاضل پرزہ جات" کی شکل میں تھے. جبکہ ٹینک شکن میزائل ایک جارحانہ مہم میں استعمال کیے جا سکتے ہیں فاضل پرزے اور حقیقتاً بیسیوں ناکارہ ٹینکوں اور حملہ کرنے والی گاڑیوں کو پھر سے فوجی نقل و حرکت کے قابل بنا سکتے ہیں. زیادہ طاقتور فریق کو زائد اسلحہ فراہم کرنا جنگ کو ختم کرنے میں مدد دینا نہیں ہے. یہ بات ہر کوئی سمجھ سکتا ہے.

## دیگر محرکات

ریگن سرکار کے دیگر محرکات جن کی وجہ سے ایران کو اسلحہ کی فراہمی ضروری سمجھی گئی. یہ تھے. اقتدار کے لیے اندرونی جدوجہد میں حصول رسوخ کی غرض سے ایران میں اعتدال پسندوں کے ساتھ رابطے کے لیے راہیں کھولنے کی سعی کرنا. فوجی نقطہ نظر سے اہم، اس خلیجی ملک کو مغربی گھیرے میں واپس لانا ایران کو دہشت گردی ترک کرنے پر مائل کرنا اور ضمنا لبنان میں ایران کے حامی گروہ "اسلامک جہاد" کی طرف سے بنائے گئے امریکی یرغمالوں کی رہائی کے لیے اس ملک کی مدد حاصل کرنا

امریکی ماہرین میں یہ بحث چل رہی ہے کہ آیا ایران میں فی الواقعی اعتدال پسند موجود ہیں یا نہیں. کئی ماہرین تجزیہ کا دعوا ہے کہ "قدامت پسند، انتہا پسند اور اعتدال پسند گروہوں پر مشتمل جدوجہد کے طور پر ایرانی سیاست کی صورتگری نے ایران کی خانگی ابتر سیاست کی کسی مفاہمت کو محض مزید گڈمڈ کر دینے کا کام کیا ہے. کارٹر سرکار کے ایرانی معاملات کے خصوصی ماہر گیری سِک کی رائے میں "ایران میں، حصول اقتدار کی کشمکش جاری ہے. یہ بہت ہی حقیقی ہے لیکن اس کے لیے "انتہاپسند" اور "اعتدال پسند" کے الفاظ استعمال کرنا غلط ہے."

## ایران میں حصولِ اقتدار کا کھیل

البتہ ایران میں اقتدار کی کشمکش میں بظاہر دو بڑی جماعتیں ملوث ہیں. ایک جماعت اس بات کی آرزومند ہے کہ ایران اپنی سیاسی علاحدگی کو ترک کر کے خاص شرائط کے تحت، امریکہ کے ساتھ تجدید روابط کرے. دوسری جماعت ایران مارکہ "اسلامی انقلاب" کو دساور چڑھانے، نیز امریکہ کے ساتھ کسی بھی رابطے کی مخالفت کے انتہاپسند نظریات سے چپکی ہوئی ہے.

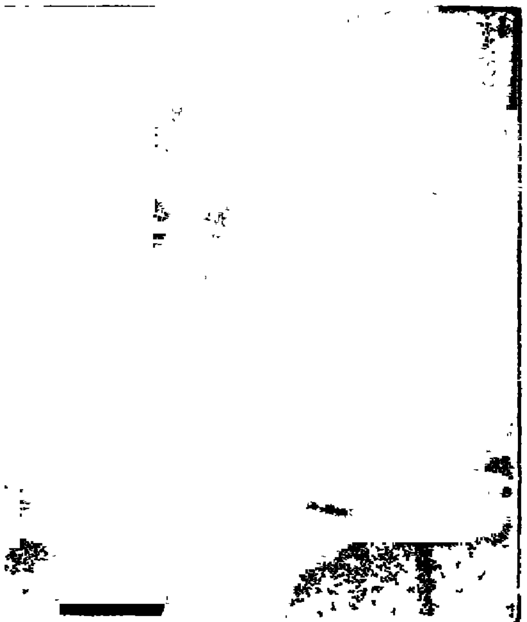
ایران کے صدر علی خامنہ ای اور وزیر خارجہ علی اکبر ولایتی اول الذکر گروہ کے سربراہ ہیں، جبکہ وزیراعظم میر حسین موسوی اور خمینی کے نامزد جانشین آیت اللہ حسین علی منتظری موخر الذکر گروہ کے. پارلیمنٹ کے اسپیکر حجت الاسلام ہاشمی رفسنجانی جو دونوں گروہوں کے بیچ ثالث کا کام کرتے ہیں، نے یہ بات بارہا زوروں سے کہی ہے کہ اگر امریکہ اس اسلامی حکومت کے تئیں اپنے موقف کو بدل لے تو ایران اس کے ساتھ اپنے روابط بحال کرے گا. بیروت سے چھپنے والے ایک ایران موافق اخبار الشراع جس نے پہلے پہل یہ خبر پہنچائی، کو دیے گئے ایک انٹرویو میں رفسنجانی نے اس بات کی صراحت کی کہ اگر امریکہ اور فرانس کچھ شرائط پوری کر دیں، جن میں جامد کردہ ایرانی املاک کی واپسی اور اسرائیل و دنیا کے دیگر حصوں میں پکڑے ہوئے قیدیوں کی رہائی شامل ہیں، تو ہم انسان دوستی کے عمل کے طور پر امریکی اور فرانسیسی یرغمالوں کی رہائی کے بارے میں لبنان میں اپنے دوستوں کو اپنے خیالات سے آگاہ کر دیں گے. عراق کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے سوال پر زیادہ تر "جنگ بازوں" کے ساتھی رفسنجانی نے "سفارتی حملے" کے نتیجے میں روس کے ساتھ ایرانی روابط میں یکساں اور مسلسل بہتری ہوئی ہے. روس وہ ملک ہے جس کو آیت اللہ خمینی نے ایک دفعہ امریکہ کے ساتھ کا ایک "بڑا شیطان" کہا تھا.

لہٰذا ایران کا وہ گروہ، جو اعتدال پسند لگتا ہے، "ادلا بدلی" میں دلچسپی رکھتا ہے. یہ حکومت کے ایک حصے کے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ "اغلب ہے کہ سرکار کو اسلحہ فراہم کرنے کی فریب دہی کی کوشش میں ایران کے کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو امریکہ کا دوست ظاہر کیا ہو." ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے واشنگٹن کے ساتھ مل کر ایرانی سرکار میں "اعتدال پسندوں" کو سہارا دینے کی امید میں اسلحہ کی فراہمی کی اسی چال کو آزمایا تھا، جس کے نتیجے میں فقط یہی کھلا کہ وہاں کوئی اعتدال پسند نہیں ہے.

حصول اقتدار کے بین الاقوامی کھیل میں ایران کی موجودہ صورت کے پیش نظر اسے مغرب کی موافقت پر آمادہ کر لینے کا کوئی امکان نہیں ہے. اسے دونوں بلاکوں سے ہتھیار خریدنے کا بے مثال حق حاصل ہے. ۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو ایک ایرانی بوئنگ ۷۴۷، لزبن (پرتگال) میں اسلحہ اٹھاتے ہوئے دیکھا گیا. گزشتہ جولائی ایک دوسرا بوئنگ ۷۰۷، یوگوسلاویہ سے ۳۳ ٹن اسلحہ ایران پہنچانے کے لیے استعمال کیا گیا. سوویت یونین کا حلیف، شمالی کوریا حصول اسلحہ کے لیے ایران کے سب سے بڑے ذرائع میں شامل رہا ہے.

## آپریشن سٹاپ

ایک ایسے ملک کو جو کہ دہشت گردی کو سرگرم طور پر فروغ دیتا ہو، اسلحہ و گولہ بارود فراہم کرنا،



خواہ وہ دفاعی نوعیت ہی کے ہوں، ان قوانین کی خلاف ورزی تھی جو صدر جمی کارٹر کے دور صدارت میں مدون کیے گئے تھے اور جن کی ریگن نے بھی تصدیق کی تھی. "دہشت گردوں کے ساتھ عدم کاروبار" کی سرکاری حکمت عملی کو شلز نے بڑے زوروں سے فروغ دیا ہے. وہ "آپریشن سٹاپ" کا انچارج رہا ہے، جس کا مقصد دوست دشمن ہر دو کو ایران کو اسلحہ نہ بیچنے کی ترغیب دینے کی سعی کرنا ہے. اس نے تو روس کے وزیر خارجہ ایڈورڈ شیورڈ نڈزے کو بھی یہ کوشش کرنے کی تلقین کی کہ روس کے اتحادی ممالک بھی ایران کو اسلحہ کی فروخت کم کر دیں لیکن خود امریکی انتظامیہ مملکت کے سکریٹری شلز اور سکریٹری دفاع کیسپر وینبرگر کی مخالفت کے

باوجود، ایران کو اسلحہ فروخت کرنے کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہو گئی۔ اسلحہ بالآخر طور پر دہشت گردوں کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اسلحہ کے بدلے میں یرغمالوں کی رہائی کی سودے بازی میں وہائٹ ہاؤس کو ایک ایک یرغمال کے لیے زرِ رستگاری کی بتدریج ادائیگی کے لیے پھانس لیا گیا۔ نیویارک ٹائمز نے اپنے اداریے میں لکھا: "اس سودے سے یہ پیام ملتا ہے کہ جتنے امریکیوں کو یرغمال بنایا جائے، اس کے لیے اتنا ہی انعام ملے گا۔ اگر لبنان میں بنائے گئے یرغمالوں کے لیے نہیں تو ان کے لیے جو کسی طیارے یا بحری جہاز پر بنا لیے جائیں۔" یہ سچ ہے کہ امریکی اسلحہ کی تین کھیپوں کی فراہمی کے بعد تین امریکی یرغمال رہا کر دیے گئے۔ لیکن لبنانی دہشت گردوں نے اس کے فوراً بعد سودا چکانے کی اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کی خاطر تین اور امریکیوں کو یرغمال بنا لیا۔

## شلز کا بیان

'ایران شروعات' میں نامرادی کے بعد، آخر کار ریگن سرکار کو اس کے بدلے میں ملا کیا؟ اس قصے کے بعد یہ سرکار یوں لگنے لگی گویا اس کے قومی سلامتی عملے اور مملکت و دفاع کے محکموں کے مابین تال میل کا فقدان ہو۔ امریکی خارجہ حکمت عملی کے خاص معمار کی حیثیت سے سکریٹری آف اسٹیٹ کی نمایاں شخصیت کو اس سے کافی زک پہنچی ہے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء کو ایوان نمائندگان کی کمیٹی برائے امورِ خارجہ کے روبرو اپنی شہادت میں جارج شلز نے یہ تسلیم کیا کہ ایران کو اسلحہ کی فراہمی کے سودے کے ضمن میں اس کی معلومات "جزوی، خال خال اور مواد کے اعتبار سے غیر مکمل تھیں"۔ اسرائیل کے توسط سے خفیہ طور پر ایران کو اسلحہ کی فراہمی، سوئٹزر لینڈ کے ایک بینک میں ایک ایسا کھاتہ کھولنا جس سے سی۔آئی۔اے کے بجائے قومی سلامتی ادارے کا ایک عہدے دار رقم نکلوا سکے، نیز ان باغیوں کی خفیہ مالی اعانت جو نکاراگوا، افغانستان اور انگولا میں روسی حمایت سے بنی حکومتوں کے خلاف رزم آزما ہیں۔ قومی سلامتی مشیر جان پوئنڈکسٹر اور اسی کے نائب آلیور نارتھ کے فیصلوں کا وہ مجموعہ تھا جو انھوں نے محکمہ دفاع اور مملکت کے سکریٹریوں کو نظر انداز کر کے لیے تھے۔

البتہ جارج شلز نے کانگریسنل کمیٹی کے سامنے اس امر کی تصدیق کی کہ اس کے علم کے مطابق بیرونی

کے سلطان نے "امریکہ والینٹری کمیٹی" تنظیم کو نکاراگوا کے خلاف جنگ کے لیے مالی ذرائع کے طور پر ۱۰ ملین ڈالر کا عطیہ دیا اور یہ رقم سوئٹزرلینڈ کے ایک بینک میں کھولے گئے خفیہ کھاتے میں جمع کر دی گئی۔ شلز نے سلطان کی حب الوطنیؔ کے لیے اس کی ستائش بھی کی

## امریکی قوانین

ایک سوال جس کی کانگریسنل انکوائری کمیٹی جانچ کرے گی، یہ ہے کہ کیا سرکار ان متعدد قوانین کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوئی ہے جو امریکی اسلحہ کی غیر ممالک کو منتقلی کی مناہی کرتے ہیں؟ ۱۹۷۶ء کے آرمز کنٹرول ایکٹ کی رُو سے سرکار کے لیے ضروری ہے کہ وہ بنیادی اسلحہ کی بھی برآمدات کے بارے میں کانگریس کو آگاہ کرے۔ ۱۹۷۹ء کے ایکسپورٹ ایڈمنسٹریشن ایکٹ کی رُو سے ہر ایسے ملک کو فوجی ساز و سامان

کی برآمد کی کلّی مناہی کر دی گئی، جس کے بارے میں یہ گمان ہو کہ وہ دہشت گردی کو ہوا دے رہا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں ریگن سرکار نے دہشت گرد ممالک کی فہرست میں ایران کا نام جوڑ دیا۔ ایران کو اسلحہ کی فراہمی سے بظاہر ۱۹۸۶ء میں پاس کیے گئے "اومنی بس ڈپلومیٹک سیکورٹی اینڈ اینٹی ٹیرارزم ایکٹ" کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ مزید اس ایکٹ کی رُو سے دہشت گرد ممالک کو اسلحہ کی منتقلی پر بھی پابندی عائد ہوتی ہے

## اعتماد کو ٹھیس

شاید دنیا بھر میں ریاست ہائے متحدہ کو جو نقصان پہنچا ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے نہ صرف اس کے یورپی اتحادیوں میں بلکہ تیسری دنیا اور اس کی حریف کمیونسٹ دوسری دنیا میں امریکی ساکھ کو



پیش رکھا ہے۔ امریکی مکاری سے خوب آشنا فرانس نے شام کو ایک دہشت گرد ملک قرار دے کر اس کے سفارتی مقاطعے کے لیے امریکی اور برطانوی کوشش میں ساتھ نہیں دیا نیز فرانسیسی یرغمالیوں کی رہائی کے لیے اس نے شام سے جداگانہ گفت و شنید کی۔

حال ہی میں منکشف ہوئی حکمت عملی سے مصر، اُردن، سعودی عرب، کویت اور باقیماندہ خلیجی ممالک جیسے اس کے عرب اتحادیوں کو شدید تشویش لاحق ہوگئی ہے۔ دراصل مصر کے صدر حسنی مبارک اور اُردن کے شاہ حسین نے امریکہ کی طرف سے ایران کو اسلحہ کی فراہمی پر اظہار ناپسندیدگی کیا ہے۔ امریکہ میں مقیم عراق کے سفیر نزار حمدون نے لکھا "ایران۔عراق جنگ میں امریکہ کی غیر جانبداری قیام امن کی سعی کا ایک اہم جزو تھی اور اب بھی ہو سکتی ہے"۔

اس پورے قصہ کی جزوئیات کو فاش کرنے سے اس بحران کے ختم ہونے کا امکان نہیں ہے، جس سے امریکہ دوچار ہے۔ امریکہ کی عالمگیر ساکھ کے علاوہ جو بات اب داؤ پر لگی ہے وہ ہے اپنے باقیماندہ منتخبہ مدت کے دو برسوں میں ریگن کے چل پانے کی صلاحیت۔ ریگن ایک سے زیادہ بار اپنے ملک سے دروغ گوئی کا مرتکب ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے گذشتہ برس ایران کو امریکی اسلحہ کی خفیہ فروخت کے بارے میں لاعلمی کا دعویٰ کیا، جبکہ اس کے سابق قومی سلامتی مشیر رابرٹ میکفرلین نے کانگریس کے روبرو یہ انکشاف کیا کہ اسے اس کام کے لیے صدر کی "زبانی منظوری" حاصل تھی۔

۱۹۸۸ء میں ہونے والے انتخابات میں ریگن کی ری پبلکن پارٹی کے لیے اسی کی جگہ لینے کے لیے ایک کامیاب امیدوار کھڑا کرنا نیز پارٹی کو اقتدار میں بنائے رکھنا ایک "بڑا دشوار معاملہ ہو گا"۔ سوویت یونین کے ساتھ نیوکلیائی اسلحہ پر روک سے متعلق معاہدہ کرنے کے ضمن میں ریگن سرکار کی صلاحیت بھی جوکھوں میں پڑگئی ہے۔ سوویت یونین کے ساتھ کیے گئے ایک بامعنی اسلحہ پر کنٹرول سے متعلق معاہدے سالٹ۔II کو صدر ریگن پہلے ہی منسوخ کر چکا ہے۔

امید ہے کہ اس سودے کے تعلق سے امریکی ایوان نمائندگان کی کمیٹی برائے امور خارجہ کی جانب سے ٹکٹی اور ٹیلی ویژن پر دکھائی جانے والی تفتیشی سماعت سے کئی اور حقائق بھی سامنے آئیں گے۔

جن کی روشنی میں چوکس امریکی اخبارات اور رائے عامہ اپنی سرکار کا ازسرنو جائزہ لیں گے۔

## این۔ایس۔سی کا پیوند

قومی سلامتی کونسل (این۔ایس۔سی) جو کہ صدر کے عہدے کے تحت ایک ادارہ ہے، وہائٹ ہاؤس کے تہہ خانے میں مرکزی جاسوسی ایجنسی (سی آئی اے) کے ساتھ ساتھ کام کرتا ہے۔ صدر، نائب صدر، سکریٹری مملکت، اور سکریٹری دفاع این۔ایس۔سی کے ارکین ہوتے ہیں۔ دفعات قانون کے مطابق سی آئی اے کا ڈائرکٹر اور جوائنٹ چیف آف اسٹاف کا چیرمین اس کے صلاح کار ہوتے ہیں۔ قومی سلامتی مشیر کی سربراہی میں



لگ بھگ ۵۰ اہل کاروں پر مشتمل این۔ایس۔سی کا عملہ کام کرتا ہے۔

این۔ایس۔سی ۱۹۴۷ء میں پریذیڈنٹ ہیری ایس ٹرومین کے تحت قائم کی گئی تھی۔ اس کا مقصد خارجہ حکمت عملی کے نظام میں تال میل پیدا کرنا تھا۔ اسے ایک ایسا منچ خیال کیا جاتا تھا، جہاں خارجہ حکمت عملی کی تشکیل میں مصروف مختلف کارندوں کے متضاد خیالات کو ہم آہنگ بنایا جا سکتا تھا۔ ان میں وہائٹ ہاؤس، اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور محکمۂ دفاع میں شامل تھے۔ البتہ کم از کم نکسن دور کے قیام سے اپنی مالیت کے خفیہ جوڑ توڑ کی عادی رہی ہے، جو بعض اوقات سکریٹری آف اسٹیٹ کو پوری طرح آگاہ کیے بغیر ہی عمل میں لایا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ این۔ایس۔سی کا رول حکمت عملیوں کے "مرتب" کا بھی ہے اور "عامل" کا بھی۔

حقیقتاً این۔ایس۔سی کا اثر و رسوخ ہر ایک صدر کے انداز کے مطابق گھٹتا بڑھتا رہا ہے۔ کینیڈی، نکسن اور مقابلتاً کچھ کم حد تک کارٹر جیسے خارجہ حکمت عملی کے انصرام میں ٹھوس دلچسپی رکھنے والے صدور نے اس پر مضبوط قابو رکھنے کے لیے سخت قومی سلامتی صلاح کاروں کو مامور کیا۔

لیکن باقیماندہ صدور کا میلان یہ اختیار سیکریٹریز آف اسٹیٹ کو سونپ دینے کی سمت رہا ہے۔ مثلاً آئزن ہاور نے جان فاسٹر ڈلس اور جیرالڈ فورڈ نے ہنری کسنجر کے معاملے میں ایسا کیا۔ اس سے این۔ایس۔سی کا اقتدار کمزور پڑ گیا۔

صدر ریگن کے تحت یہ انداز ملا جلا رہا ہے۔ اس کے پہلے سکریٹری آف اسٹیٹ الیگزینڈر ہیگ کے زمانے میں قومی سلامتی صلاح کار کو کم مرتبہ کر کے وہائٹ ہاؤس کے چیف آف اسٹاف کے ماتحت کام کرنے پر مامور کیا گیا۔ البتہ بعد میں جب سکریٹری آف اسٹیٹ جارج شلز کو خارجہ حکمت عملی کا معمار خاص مانا جاتا تھا، اس کی تشکیل کا مرکز اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو بنا دیا گیا۔

لیکن حالیہ روابط کے تعلق سے این۔ایس۔سی کا مقام ایران کے ساتھ کی گئی یرغمالوں کے عوض اسلحہ سودے بازی، لیبیا کے بارے میں گمراہ کن پروپگنڈہ نیز نکاراگوا، انگولا اور افغانستان میں وہاں کی حکومتوں کے خلاف رزم آزما باغیوں کو خفیہ امداد جیسے تینوں معاملات میں مرکزی رہا ہے۔ اس سے امر پر نگاہ رکھنے والوں کے خیال میں این۔ایس۔سی کے کردار کو زیادہ اہمیت کا حامل بنا دیا گیا ہے۔

مزید، ریگن سرکار کے بارے میں نئی بات وہ حد ہے جس تک این۔ایس۔سی کو شاید امریکی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سی آئی اے سے بے نیاز ہو کر جاسوسی کرنے کے لیے برتا گیا۔ زیادہ حیرت زا امر یہ ہے کہ پہلی بار سکریٹری آف اسٹیٹ کو بیرونی دنیا میں ایک حکمت عملی کو پیش کرنے پر مجبور کیا گیا، جبکہ وہائٹ ہاؤس اور این۔ایس۔سی بظاہر دوسری متناقض حکمت عملی پر عمل پیرا تھے۔

ڈاکٹر آر۔ ایل۔ چاولہ

# تیسری دنیا اور قرض کا مسئلہ

**نویں** دہائی کے آغاز سے ہی قرض کے سلسلے میں تیسری دنیا کے مسئلے نے عام دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ بین اقوامی مالی ادارے کے حالیہ ترین تخمینے کے مطابق ترقی پذیر ممالک کو دیے گئے غیر ملکی قرضہ جات ۱۹۸۶ء کے وسط تک ۱۰۰۰ بلین ڈالر کی حیرت انگیز رقم تک پہنچ گئے۔ ایک خطے کے طور پر تنہا لاطینی امریکہ ہی اس مجموعی قرض کے لگ بھگ ۵ر۲ حصے کے لیے ذمہ دار ہے۔

## قرضے کی مقدار اور ساخت

۱۹۷۰ء کے دہے سے نمایاں تفاوت کی صورت میں ۱۹۸۰ء کے دہے کے وسط تک ترقی پذیر ممالک کے غیر ملکی قرضہ جات کی ضخامت اور ساخت میں بڑی معنی خیز تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ بلحاظ مقدار تیل نہ پیدا کرنے والے ممالک (پٹرول مہیا کرنے والے) کا مجموعی قابل ادا قرضہ ۱۹۷۰ء میں ۱۰۰ بلین ڈالر سے بڑھ کر ۱۹۷۹ء میں لگ بھگ ۳۹۵ بلین ہو گیا جو مزید بڑھ کر ۱۹۸۶ء میں ۱۰۰۰ بلین ڈالر کی بھاری رقم تک جا پہنچا۔ حالانکہ ۱۹۷۰ء کے دہے میں قابل ادا قرض کا غیر مناسب طور پر بڑا حصہ طویل المدت نوعیت کا تھا تاہم ۱۹۸۰ء کے دہے کے وسط تک اس کی تشکیل ترتیب میں ایک ڈرامائی تغیر واقع ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۸۰ء کے دہے کے اوائل نصف میں لاطینی امریکہ کے مجموعی قرضے میں اس کا اوسط حصہ ۴۴ فیصد تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے دہے کے اوائل میں ترقی پذیر ممالک کے غیر ملکی قرضے کا لگ بھگ ۲۵ فیصد تجارتی بینکوں کو واجب الادا تھا جو ۱۹۸۰ء کے دہے کے وسط تک بڑھ کر ۵۰ فیصد ہو گیا۔

قرض کی مقدار میں سریع اضافے کے ساتھ ساتھ ۱۹۸۰ء کے دہے کے اوائل میں قرض کی ادائیگی سے متعلق قانونی پابندیوں (سود و قرض بے باق کرنے کے لیے ادائیگیوں) نے بھی نئی بلندیوں کو چھو لیا۔ مثلاً تیل نہ پیدا کرنے والے ترقی پذیر ممالک کے ضمن میں اوسط قرضہ سروس کا تناسب یعنی برآمدات کے فیصد کے طور پر ادائیگیاں ۱۹۷۳ء میں ۱۶ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۷۹ء میں ۱۹ فیصد اور ۱۹۸۳ء میں ۲۵ فیصد ہو گیا۔ صریحاً اوسط قرضہ سروس کا تناسب قرضے میں جکڑے ہوئے ممالک کے ضمن میں انفرادی طور پر انکشاف کرنے کی نسبت پوشیدہ کرنے میں آگے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۸۲ء میں قرضہ سروس کا تناسب برازیل میں ۸۷ فیصد، ارجنٹینا میں ۱۰۳ فیصد اور میکسیکو میں ۱۱۸ فیصد کے ارد گرد منڈلا رہا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں لاطینی امریکہ کے خطے کا فیصد کل ملا کر ۶۰ تھا۔

ناقابل برداشت قرضہ سروس تناسبوں کے علاوہ "وسائل کے الٹے بہاؤ" کا منظر حالیہ قرضہ کے مسئلے کا ایک پریشان کن پہلو رہا ہے۔ ایک مثال کے طور پر تیسری دنیا کے ممالک نے اپنے قرض خواہوں کو سود اور قرض کو بے باق کرنے کی ادائیگیوں کے لیے ۹۶ بلین ڈالر کی رقم کے لیے درمیانی اور طویل المدتی قرضوں کی شکل میں ۵۰ بلین ڈالر ادھار لیے تاہم اس وقت سے تجارتی بینکوں کا ادھار دینا بھی قابل لحاظ حد تک گھٹ گیا ہے۔ ان ممالک نے یہ سہولت ۱۹۸۲ء میں ۴۲ بلین ڈالر سے دھڑام سے گر کر ۱۹۸۵ء میں فقط ۳ بلین ڈالر رہ گئی۔ ۱۹۸۲ء میں عدم ادائیگی کے بحران کے پیش نظر اور نئے وسائل کی مشکل رسائی کی صورت میں تجارتی بینکوں نے ان ممالک کے لیے نئے کھاتے کھولنے نیز ان کے لیے بیرونی وسائل کے بہاؤ پر سوچ و چار کرنے سے قبل ان کی اقتصادی پالیسیوں کو ایک نئی توجیہ اور واضح سمت دینے سے پہلے بین اقوامی مالیہ ادارے کی "منظوری" پر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً اعلیٰ تنظیم از سر نو ترتیب کا دور شروع ہو گیا یہاں تک کہ تقریباً ۱۹۸۴ء میں ۲۰ ترقی پذیر ممالک کو دیے گئے ۱۱۳ بلین ڈالر کے قرضے کو بھی از سر نو ترتیب دی گئی۔

لہٰذا ۱۹۸۰ء کے دہے کے وسط تک تیل پیدا کرنے والے چند خلیجی ممالک کو چھوڑ کر، اور تیل نہ پیدا کرنے والے نیز درمیانی اور کم آمدنی والے دونوں طرح کے ممالک بین اقوامی اقتصادی واقعات سے شدید طور پر متاثر ہونے اور ایک تشویشناک بحران قرض میں مبتلا ہو گئے۔ تاہم خاص طور پر اعتبار سے افریقی۔ایشیائی گروپ کے کم آمدنی والے ممالک کے قرضوں کے مسئلے نے اس لحاظ سے قطعی اہمیت اختیار کر لی کہ کچھ ممالک کے قطع نظر ان کی معیشت پر "ایک ثقافتی روش" نیز ان کے بس سے باہر بیرونی طور سے فروغ پذیر عناصر کی کھینچا تانی کے باعث قرض ادا کرنے کی ان کی صلاحیت بہت زیادہ محدود اور مسدود رہی ہے حالاں کہ کم آمدنی والے ممالک کو دیے گئے قرضوں کا ۸۵ تا ۹۰ فیصد سرکاری اور کثیر فریقی کھاتے میں ہے۔ تاہم "پیرس کلب" یا "لندن کلب" کی زیر سرپرستی کسی عدم ادائیگی اور اس کے نتیجے میں کی جانے والی از سر نو ترتیب یا دوبارہ بات چیت ان ہی شرائط کو عائد کرتی ہے جو بڑے بڑے قرضداروں کو تجارتی بینکوں کی نو ترتیبوں کے تحت برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

خصوصاً ہندوستان کی مثال لیتے ہوئے اس کے قرضے نیز اس کی ادائیگی کے بارے میں قانونی پابندیوں کی کیفیت جسامت کو کئی مطالعوں سے واضح کیا گیا ہے عالمی بینک کے اعداد و شمار کی رو سے ہندوستان کا واجب الادا بیرونی قرضہ جو ۱۹۷۵ء میں ۹ر۱۵ بلین ڈالر تھا بڑھ کر ۱۹۸۰ء میں ۸ر۲۵ بلین ڈالر اور ۱۹۸۲ء میں ۷ر۳۰ بلین ڈالر ہو گیا۔ اس میں وہ رقوم بھی شامل ہیں جو تجارتی اور غیر تجارتی بینکوں سے نکالی گئیں ظاہر ہے کہ پچھلے چند برسوں میں ہندوستان کی طرف سے تجارتی ادھار کے طور پر لی گئیں بھاری رقوم کے پیش نظر مذکورہ بند سے قابل لحاظ حد تک چڑھ گئے ہوتے تاہم ہندوستان کا قرض ادا کرنے کا تناسب ۱۹۷۰ء کے دہے میں لگاتار گرتا رہا ہے یعنی ۱۹۷۳ء میں ۰ر۱۸ سے گھٹ کر ۱۹۷۹ء میں ۸ر۷ ہو گیا۔ ۱۹۸۰ء کے دہے کے آغاز سے بلاشک یہ چڑھتا ہی گیا اور ۱۹۸۵ء تک ۳ر۱۷ کی سطح پر آ گیا خیال ہے کہ یہ تناسب ۱۹۸۶۔۸۷ء کے دوران ۲۰ فیصد کے اوسط تک چڑھ جائے گا۔ حالانکہ یہ زیادہ اونچا نہیں ہے اور قابل انتظام ہے پھر بھی کئی جگہوں پر برآمدات میں جمود اور اسکے نتیجے میں پیش بینی کی حد تک مستقبل میں قرض کی ادائیگی کے تناسب میں اضافے کے بارے میں خدشات کا اظہار کیا گیا ہے۔

## بحران کی ابتدا

تاریخی تناظر میں حالیہ قرض کے بحران کی ابتدا کا سراغ ان واقعات سے ملتا ہے جیسے دو تیل بحرانوں کا وقوع، ایک طویل عالمی پس روی، برآمداتی منڈیوں میں مندہ اور حقیقی سود کی اونچی شرحیں جن کے باعث تیل نہ پیدا کرنے والے

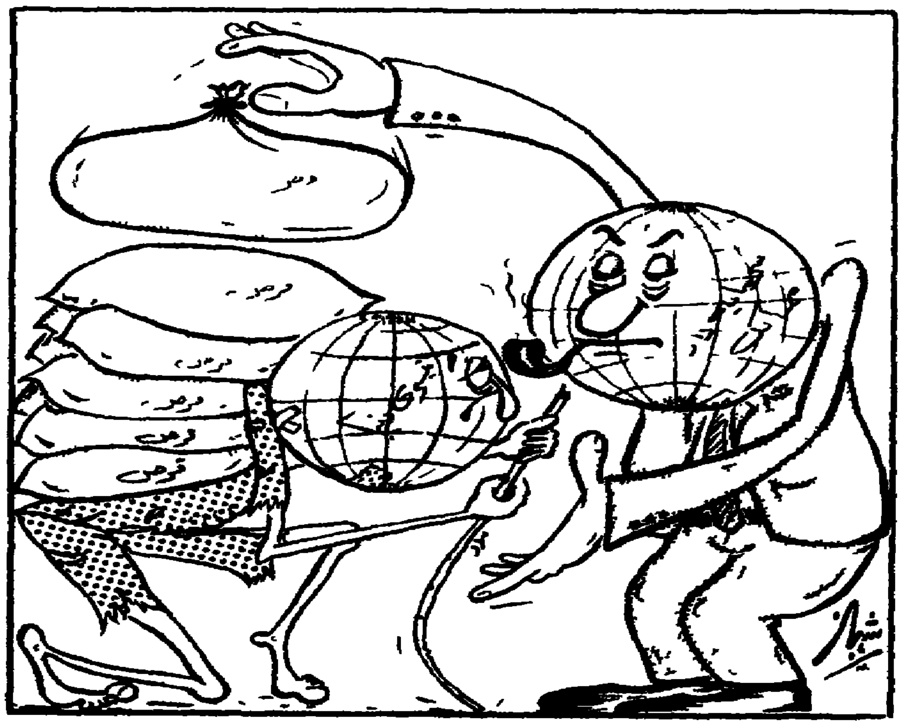
ترقی پذیر ممالک (بشمول میکسیکو) نے ادائیگیوں کے توازن کے کھاتے پر سخت دباؤ پڑا۔ اس عمل میں قرض کا بھاری بوجھ اکٹھا ہو گیا۔ ۷۴-۱۹۷۳ء کے پہلے تیل بحران کے بعد ان ممالک پر رواں کھاتے کے بھاری خسارے اور بڑھتی ہوئی افراط زر اور بیروزگاری کا وار ہوا مثلاً تیل نہ پیدا کرنے والے ترقی پذیر ممالک کے رواں کھاتے کا خسارہ ۱۹۷۳ء میں ۶ء۱۰ بلین ڈالر سے بڑھ کر ۱۹۷۵ء میں ۶ء۳۵ ہو گیا۔

جب ہندوستان جیسے ملک نے سخت اقتصادی اقدامات اختیار کیے اور بیل و نیل کی مصنوعات کے استعمال میں فی الفور بڑھا دیے، غیر ممالک کی طرف دیکھنے والے لاطینی امریکہ، جنوب مشرقی ایشیا اور مشرقی ایشیا کے کچھ درمیانی آمدنی والے ملکوں نے ان خساروں کو تجارتی قرضوں سے پورا کیا۔ ان ممالک کی ٹولی نے سخت اقتصادی اقدامات کو اس مفروضہ کی بنا پر غیر ضروری خیال کیا کہ ان کا اقتصادی نظام پچھلے سلسلے تک غیر لچکدار تھا اور ان میں سے بہتوں کو ۱۹۶۰ء کے دہے کے دوران صحت مند ترقی کے رجحان کا تجربہ ہوا تھا۔ لہٰذا انھوں نے تجارتی بینکوں سے قرض پر تکیہ کیا۔ چنانچہ خساروں کو مالی طور پر ایسے پورا کرنا نسبتاً آسان خیال کیا گیا کیوں کہ ان دنوں عالمی معیشت سرمایہ کاری کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی اور تجارتی بینک انہیں یہ رقوم ادھار دینے کے لیے بے قرار تھے۔ اس کے علاوہ ایسے ادھار کی لاگت زیادہ نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کے وسط تک لائی بور (لندن انٹر بینک کی پیش کردہ شرح) پر منافع اپنی سب سے نچلی حد تک پہنچ گیا تھا یعنی ۲ فیصد۔ اس سے بینک اپنے بالائی اخراجات ہی بمشکل پورے کر پاتے تھے۔ ان ظہورات کے نتیجے میں ۷۹-۱۹۷۴ء کے دوران تیل نہ پیدا کرنے والے ترقی پذیر ممالک اوسط روزانہ ترقی کی ۵ء۵ فیصد کی شرح کو برقرار رکھ پائے۔ جب ان معیشتوں کی ترقی ہو رہی تھی تو قرضوں کی ادائیگی سے متعلق قانونی پابندیوں نے کوئی سنگین مسئلہ کھڑا نہیں کیا اور یوں لگنے لگا جیسے کہ تیل کا بحران ختم ہو گیا اور عالمی معیشت نئی ترقی کے دور کی جانب گامزن ہو گئی۔ تاہم ترقی کا یہ اچھا دور چند روزہ تھا اور ۱۹۷۰ء کے دہے کے اختتام تک نسبتاً سنجیدہ وسعت کا عالمی اقتصادی بحران ظہور پذیر ہو گیا۔

تیل کے دوسرے بحران نے عالمی معیشت کو دھکا پہنچایا۔ نتیجتاً ادائیگیوں کا عدم توازن پیدا ہو گیا، پیٹرو ڈالروں کے پھیرے دور دورے کو حیات نو ملی، افراط زر کی وہیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں اور تحفظاتی رجحانات عالمی معیشت میں زیادہ زور پکڑ گئے۔ تاہم پہلے تیل بحران کی نسبت اس بار اس صورت حال کے تئیں حوالی ردعمل یکسر مختلف تھا۔ ترقی پذیر ممالک نے افراط زر کی چارہ سازی کی مدد سے

تیل کی قیمتوں کے صدمے سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کیا۔ بلکہ ان کی معیشتوں میں افراط زر کو قابو میں رکھنے پر زیادہ دھیان دیا گیا۔ افراط زر اور بے روزگاری کے جناتی میں مؤخر الذکر کو ترجیح دی گئی اور افراط زر پر قابو پانے کے لیے سکے سے متعلق اور مالی ذرائع کا سب اختیار کیا گیا۔ امریکہ میں سخت مالی انتظام کا دور شروع ہو گیا جس نے امریکی معیشت میں کساد بازاری داخل کر دی لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرضدار ممالک کی ادائیگی قرض کی صلاحیت کو بھی اس سے نقصان پہنچا۔

چونکہ عالمی معیشت ۱۹۷۰ء کے دہے کے اوائل میں ۱۹۶۰ء کے دہے کے وسط کے افراط زر سے متعلق مجبوری حالات سے اس سال بس ہی اور جلد ہی عام پھیلا گئے




کے رجحانات میں تبدیل کی نشاندہی کی تھی اس لیے اشیاء مع تیل کے قیمتوں میں گراوٹ کے رجحان نے تیسری دنیا کے ممالک کو زبردست دھچکا لگایا۔ میکسیکو، وینزویلا، نائجیریا اور ایران جیسے تیل برآمد کرنے والے ممالک نے پہلے اپنے پرشکوہ پراجیکٹوں کے لیے بھاری قرضے لینے شروع کیے تھے جس سے وہ قرضوں کا انبار اکٹھا کر بیٹھے۔ اس کے علاوہ سود کی اونچی شرحوں نے تیل نہ پیدا کرنے والے اور تیل پیدا کرنے والے ممالک کے ماضی میں لیے گئے قرضوں کے سود کے بوجھ کو یکساں طور پر بڑھا دیا۔ باوجود اس کے بڑے بڑے قرضداروں نے سود کی ادائیگی کی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قلیل المدتی مالی انتظام پر تکیہ کیا جب تک کہ اگست ۱۹۸۲ء میں میکسیکو میں عدم ادائیگیوں کا بحران پھوٹ پڑا جس کے اثرات میں ارجنٹینا اور برازیل میں بھی اسی سال السا ہی ہوا۔

## ہندوستان کی صورت حال

اس مرحلے پر ہندوستان کے تجربے کے بارے میں دو چار جملے کہنا مناسب ہوگا۔ ۱۹۴۳ء اور ۱۹۶۰ء کے دہوں کے اواخر میں ادائیگی قرض کے مسائل سے بچ

حکومت ہند سالانہ بنا پر ۱۹۶۸ء اور پھر ۷۳-۱۹۷۲ء کے دوران قرض کے متعلق بسا جتی بات چیت میں شریک ہوئی۔ تاہم ۱۹۸۰ء کے دہے کے اوائل کی بیرونی کشاکش سے نمایاں فرق کے طور پر ان برسوں میں قرض چکانے کی ہماری صلاحیت کو اولین طور پر دیسی قلتوں، قابل برآمد سامان کی فاضل مقدار اور روپے کی قیمت میں گراوٹ کے برے اثرات نے دبایا۔

۱۹۷۳ء کے تیل بحران اور بعد کے مذکورہ ادائیگیوں کے توازن کے خسارے کے نتیجے میں حکومت ہند نے ۱۹۷۰ء کے دہے کے وسط میں عالمی مالی ادارے کی تیل سے متعلق سہولت کی مدد کے ساتھ ساتھ سخت گنجائشی اقدامات بھی اختیار کیے۔ بھارت کی برآمداتی کارگزاری میں قابل لحاظ ترقی ہوئی اور خلیجی ممالک سے زر ترسیل کی آمد میں بھی نمایاں اضافہ ہوگیا۔ ان سے نہ صرف ہماری ادائیگیوں کے توازن کی مجبوریاں رفع ہوئیں بلکہ ۱۹۷۰ء کے دہے کے خاتمے تک زر مبادلہ کا ایک گرانقدر سرمایہ جمع کرنے میں بھی آسانی ہوئی۔

۱۹۸۰ء کے دہے کے آغاز میں خاص کر ۱۹۷۰-۸۰ء کے دوسرے تیل بحران سے پیدا ہونے والی اس کی تجارتی شرائط میں زیادہ تر بھاری خرابی کے باعث ہندوستان کے ادائیگیوں کے توازن کی حالت قدرے تشویشناک ہوگئی۔ ہم نے کثیر فریقی امداد اور اس کی کل جسامت میں مدنظر رکھی ہوئی چھوٹ کی ناسازگار فضا کا بھی سامنا کیا۔ ان بن بلائے ظہورات سے شدید متاثر ہوکر چھٹے منصوبہ کی شروعات کے آس پاس حکومت ہند نے قدرتی طور پر ادائیگیوں کے توازن کے خسارے سے متعلق مالی انتظام کے لیے متبادل ذرائع کے بارے میں سوچا۔ اسی سیاق وسباق میں سرکار نے ایکسٹنڈڈ فنڈ فیسلیٹی کے تحت عالمی مالی ادارے سے تین برس کے لیے ۵ بلین ایس ڈی آر کا بھاری قرضہ لینے کا ارادہ کیا۔ عالمی مالی ادارے سے اس انتظام کے ساتھ ساتھ سرکار نے سرکاری اور نجی زمروں کے یونٹوں کو بھی مخصوص انداز میں تجارتی قرضے لینے کی اجازت دے دی۔

ادائیگی قرض کے مسائل کے نقطہ نظر سے ان قرضوں کے پیچ پیٹ کا تجزیہ کرنا ایک اہم پہلو ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۸۰ء کے دہے کی ابتدا ہی سے ہندوستان کے ادائیگی قرض کے تناسب نے بڑھنے کے رجحان کو برقرار رکھا ہے۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ ۱۹۸۷ء میں یہ اپنے عروج پر پہنچ جائے گا۔ خلاف امید ۸۶-۱۹۸۵ء میں ہندوستان کا تجارتی خسارہ کل ۸۶۲۰ کروڑ تھا۔ جو چھٹے منصوبے کے اوسط سالانہ خسارے سے لگ بھگ ۶۰ فیصد زیادہ ہے اس تفاوت میں کسی طرح ترقی کو دھیما کر دینے والے رجحان کا واضح سراغ نہیں ملتا، خاص کر جب حکومت کا درآمدات میں فراخدلانہ فلسفے کے تحت سرکنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور تاسیسی تجاویز کے تحت ہماری برآمدات کے لیے غیر ملکی فضا غیر محرک لگتی ہے۔ اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے زر مبادلہ کو صرف کرنا محض ایک عارضی انتظام ہے قطعی تجزیے میں تجارتی قرض یا لمبی قرضوں یا سرمایہ کاری سے رجوع کرنا ملک کو برازیل کی طرح قرض کے بڑے چکر میں ڈال سکتا ہے۔

## قرض کے بحران کا حل

۱۹۸۲ء میں میکسیکو کے قرض بحران کے بعد سے قرضدار ممالک کے لیے مجموعی بچاؤ کی چارہ سازی عام طور پر الگ الگ معاملے کی بنا پر ہوتی آئی ہے۔ چونکہ قرضہ دینے والے بینک نئی ترتیب کے وقت عالمی مالی ادارے کی "مقبولیت" پر اصرار کرتے تھے۔ لہٰذا اس ادارے کی موجودگی ایک مسلمہ امر بن گئی۔ مقروض ممالک عالمی مالی ادارے کے استحکامی پروگراموں کو مجموعی بچاؤ کی چارہ سازی کا ایک جز تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ اپنے طور سے عالمی مالی ادارہ مقروض ممالک کی نہ صرف بڑی مالی اعانت کرتا تھا بلکہ غیر مستقل مزاج تجارتی بینکوں سے بیرونی فنڈ اکٹھا کرنے میں بھی ان کی مدد کرتا تھا۔ ان نو معاملات کے نتیجے میں ۱۹۸۳ء سے ۳۰ سے زیادہ ملکوں نے اپنے قرضوں کی ترتیب نو کی ہے جس میں ۱۹۸۳ء میں ۴۱ بلین ڈالروں کے مقابلے میں تنہا ۱۹۸۴ء میں ۱۱۲ بلین ڈالر کی بہت بڑی رقم شامل ہے۔ اس ترتیب نو نے ۱۹۸۴ء میں قرض کی ادائیگی کو ۱۹ بلین ڈالر کی حد تک کم کرنے کا اثر دکھایا۔ ارجنٹینا، برازیل، میکسیکو اور یوگوسلاویہ جیسے بڑے بڑے مقروض ملکوں کو عالمی مالی ادارہ نے نہ صرف ازخود مالی وسائل بہم پہنچائے، بلکہ قرض دینے والے بینک کے منتظموں کو اس بات پر بھی راغب کیا کہ وہ انہیں تصفیہ حساب کے لیے اشد ضروری رقوم مہیا کریں۔

تاہم تیزی سے بدلتے ہوئے بین اقوامی اقتصادی ماحول کے نتیجے میں ان معیشتوں میں ساختی رکاوٹوں جیسے طویل المدت مرض کو نو معاملات کے قلیل المدت منافعوں پر غالب نہیں آنا چاہیے۔ عالمی مالی ادارے کی مہربانی ہے کہ تیسری دنیا کے بہت سے ملکوں میں سادہ روی کے اقدامات، درآمدات اور سرکاری خرچ میں وحشیانہ کٹوتیوں کے باعث ان کے معیشتی نظام کو بے حساب نقصان پہنچا ہے! ۸۴-۱۹۸۲ء کے دوران درمیانہ آمدنی والے اکثر ملکوں میں صنعتی پیداوار اور روزگار میں نمایاں گراوٹ آگئی۔ اکثر لاطینی امریکہ کے ملکوں میں صنعتی روزگار، ۱۹۸۰ء سے ۵۰-۲۰ فیصد کی حد میں کم ہوا ہے اور بحرانی دور میں اس خطے کی لگ بھگ ایک چوتھائی صنعتی صلاحیت بے کار رہی۔ عالمی مالی ادارے کے بظاہر خوشگوار انداز میں چلنے والے گنجائشی پروگرام کے باوصف ہندوستان جیسے کم آمدنی لیکن متنوع معیشت والے ملک ہیں، ہمیں ابھی بحرانی مرحلے کو پار کرنا ہے اور بنیادی ڈھانچے میں لوچ کی کمی کے مرض پر قابو پانا ہے۔

ابھی بحرانی صورت حال سے نجات کے لیے الگ الگ فورموں پر قومی، علاقائی اور بین الاقوامی کوششوں کے ایک سلسلے پر تبادلہ خیال اور بحث ومباحثہ کیا جا چکا ہے۔ علاقائی سطح پر لاطینی امریکہ کے ۱۱ اہم ترین ممالک کے مابین کارٹیجینا معاہدہ، قرض کے بحران کو مجموعی طور پر حل کرنے کے لیے ایک جرأت مندانہ اقدام تھا۔ اس معاہدے کی رو سے ایک ملک کی برآمدات کے ایک خاص فیصد حصے تک سود کی ادائیگی کے لیے ایک حد مقرر کی گئی۔ مثال کے طور پر پیرو نے اپنی ادائیگی قرض کی قانونی پابندیوں سے نمٹنے کے لیے اپنی برآمدات کے مالیات کا ۱۰ فیصد مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ اسی طرح برازیلی سرکار نے مستقبل قریب میں ادائیگی سود کی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے جی۔ ڈی پی کا ۲ تا ۵ فیصد حصہ مقرر کرنے پر غور کیا ہے۔ ایک اہم امر کے طور پر بین اقوامی سطح پر ۱۹۸۵ء کے اواخر میں بیکر منصوبے نے قرض کے بحران کو رفع کرنے کی موجودہ حکمت عملی کو بدلنے کا اعلان کیا۔ استحکام اور شدید سادگی پسندی کے پروگراموں کی تاکید کی بجائے مذکورہ منصوبے میں فروغ وترقی کے پروگراموں پر خاص زور دیا گیا ہے۔ اس منصوبے میں اس نقطے پر غور کیا گیا ہے کہ تجارتی بینک تین برسوں کی مدت میں مزید ۲۰ بلین ڈالر قرض کے طور پر دیں گے۔ بشرطیکہ مقروض ممالک سرمایہ کاری اور پیداواریت میں اضافہ کرنے میں کامیاب ہوں۔ اس میں دیسی بچتوں کو وسعت دینے نیز پونجی کے فرار کو روکنے اور دستیاب وسائل کا با صلاحیت تعین کرنا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ منصوبہ ترقی پذیر ممالک میں مالی منڈیوں کی ساختی اصلاح کو بھی فرض کرتا ہے۔

حالانکہ بیکر منصوبے کی تاثیر کے بارے میں مقروض ممالک کی محدود تعداد (۱۵) کے پیش نظر کوئی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہوگا، تاہم یہ استدلال لفظی اور معنوی طور سے معقول لگتا ہے کہ یہ منصوبہ ایک استحکامی پروگرام کے مترادف ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہے لگتا ہے کہ تیسری دنیا کی معیشتوں پر عالمی مالی فنڈ کے رسوائے جہاں حاکمانہ کردار کے بجائے اس منصوبے نے یہ رول عالمی بینک کو سونپ دیا ہے۔ ایک قرضدار ملک کی سماجی ومعیشتی ترقی کے بجائے زور عمل ایسی معیشت کے پیداواری امکانات کو انتہا تک پہنچا دینے پر دیا گیا دکھائی دیتا ہے۔ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ قرض دار ممالک کی نجات کی ایک اونچی شرح فروغ کے ذریعے ہی ممکن ہے، تو بھی اعلیٰ ترقی کے امکانات ترقی یافتہ ممالک میں اقتصادی بازیابی اور تجارت کے پھیلاؤ کی رفتار پر مبنی ہوتے ہیں، حالانکہ ترقی یافتہ ممالک اپنے مالی اداروں کے استحکام کے بارے میں مشوش ہیں۔ ایک واحد بڑے قرضدار کی طرف سے قرضے کو تسلیم نہ کرنے کی صورت میں نیم دلانہ اور اکثر عارضی اقدام زیادہ سے زیادہ مسئلے کی شدت کو کم کر دینے والی ایک تدبیر لگتے ہیں، نہ کہ قرض کے بحران کا ایک ٹھوس حل۔



خورشید عالم

# مجذوب

کینڈیا ابھی سوکر اٹھا ہی تھا کہ مالانی کمرے میں داخل ہوا ——— "کچھ سنا تم نے؟"

خیریت تو ہے نا؟ کیڈیا نے وضاحت چاہی

خیریت ہی خیریت ہے پیارے! سدھیر ختم ہوگیا!

کیا بکتے ہو؟ لگتا ہے رات کا نشہ ابھی تک باقی ہے! کیڈیا کی سمجھ میں یہ تو آگیا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے

سدھیر کا باپ مرگیا! مالانی کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

کب؟

شاید آج صبح ہی' لیکن میرا خیال ہے کہ بڈھا رات میں ہی ٹھنڈا ہوگیا ہوگا اور سدھیر سالے کو پتہ بھی نہ چلا ہوگا۔ اب تو اس اس کی عیش ہی عیش ہے۔ باپ کا خوف ختم۔ اب جب چاہے کھیلے پیئے۔ اب کون روکے گا اسے؟

دیکھو بیٹا گھر پہنچ کر اب پتے ہی کھیلے گا: ہاں تو ابھی اس وقت کیا کرتا ہوگا؟

اس غریب کا یہاں اور کون ہے۔ تو اس بڈھے کو مرگھٹ لے جائے گا؟ اٹھو، کمر کسو اور چلو! مالانی نے مشورہ دیا

میں تو کمر کس کے بیٹھا ہوں۔ بول کس کس کے ماں باپ کو کندھا دینا ہے؟۔

جلدی چل یار، ورنہ دیر ہو جائے گی۔

اسکور کیا ہوا؟۔

کس سالے کو پتہ ہے؟۔

اگر آج چھ وکٹ لے سکیں تو شاید جیت جائیں۔

دونوں تیار ہوکر باہر آگئے۔ کیڈیا نے بازار سے سگریٹ کے چار پیکٹ لیے۔ اور کرتے کی جیب میں ٹھونس کر مالانی سے کہا، اب مجھے سارا شہر بھی شمشان گھاٹ لے چلنے کے لیے کہو تو میں تیار ہوں!

میرا ارادہ آج سارا دن کمینٹری سننے کا تھا۔ کسے پتہ تھا کہ یہ مصیبت آج ہی گلے پڑ جائے گی۔

یہ بتاؤ ہمیں فراغت کب تک ملے گی؟

دو تین بجے تک!

اگر دو بجے تک فرصت مل گئی تو اس کے بعد کچھ دیر تک کمینٹری سن لیں گے۔

سدھیر نے جب دیکھا کہ باپ کے پیرات اسی باپ کی قسم کھاؤ'

باپ کی قسم میرے پاس پیسے ہیں!

مذہبی رسوم کی ادائیگی کے بعد لاش کو ارتھی پر رکھا گیا مالانی اور کیڈیا نے سامنے سے ارتھی اٹھائی۔ سیٹھ نے تیسرا پایا اپنے کاندھے پر رکھا، چوتھا سلیم پکڑنے ہی والا تھا کہ سیٹھ نے منع کردیا

ارے ملّے تو ہمارے مردے کو ہاتھ نہ لگا ورنہ مردہ ناپاک ہو جائے گا!

اگر کہیں بڈھے کو پتہ چل گیا کہ ایک مسلمان اس کی ارتھی کو کندھا لگا رہا ہے تو وہ ارتھی سے نیچے کود پڑے گا! مالانی نے صفائی دی۔

ایک پڑوسی نے چوتھی طرف سے ارتھی اٹھائی اور شمشان کا سفر شروع ہوا۔

ارتھی اٹھانے سدھیر ناک کی سیدھ میں چلا جارہا تھا۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد وہ آزاد ہوگیا ہے، لیکن اب اسے محسوس ہورہا تھا کہ وہ آزاد نہیں بلکہ غلام ہوگیا ہے۔ جو رسی اسے کنارے سے باندھے ہوئے تھی وہ ٹوٹ گئی ہے اور اب وہ زندگی کے سیلاب میں ایک کٹے پیڑ کی طرح بہتا رہے گا۔ اب اس کا کوئی مرے گا اور نہ وہ ہی کسی کے لیے مرے گا زندگی کے باقی سفر میں وہ بالکل تنہا ہے اور سفر بہت مشکل اور طویل ہے۔

اچانک اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ اس وقت بیچ تنہا چوراہے پر چل رہا تھا۔ اسے ساتھ چلتا پنڈت نظر آیا نہ باپ کی ارتھی اور نہ ارتھی اٹھانے والے۔ بات کیا ہے؟ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے؟ آخر اسے کچھ دوری پر ایک دکان کے پاس کھڑا سگریٹ سلگاتا پنڈت دکھائی دیا تو

پھیر دار چکے ہیں تو وہ روپانسا پچنا۔ چپکے سے سلیم کے گھر گیا۔ سلیم نے سیٹھ کو خبر دی اور پھر پنڈت کو بلانے چلا گیا۔

گھنٹے بھر بعد سلیم پنڈت کو ساتھ لے کر آگیا۔ پنڈت نے آتے ہی آخری رسوم کی تیاریاں شروع کردیں۔ سدھیر نے رسوم کی ادائیگی ابھی شروع ہی کی تھی کہ کنڈیا اور مالانی بھی پہنچ گئے۔ کیڈیا سیدھا سدھیر کے پاس چلا گیا اور منہ کو اس کے گال کے قریب لے جاکر پوچھا "پیسہ ویسہ ہے نا!'

ہاں ہے'

اس کی جان میں جان آئی، لیکن باقی لوگ کہاں ہیں انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟

پنڈت سگریٹ پیتے ہوئے اس کے قریب آیا تو اس نے سدھیر کو بیچ سڑک میں پریشان سا تنہا کھڑا پایا۔

پنڈت بولا "سنو، تمہارے بھاگیہ میں جلنے ابھی کیا کیا دیکھنا لکھا ہے؟ ان راکششوں کے پاؤں پھسل گئے ہوں گے اور لاش نیچے گر گئی ہوگی۔ یہ تو بہت برا ہوا؟"

سدھیر کا دل پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ اسے اور بھی برے دن دیکھنے ہوں گے۔ پنڈت نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوگیا کہ آخر وہ لوگ گئے تو کہاں گئے؟ مانا کہ گر ہی پڑے ہوں گے، مگر زمین کے اندر تو نہیں چلے گئے ہوں گے سدھیر حیران و پریشان تو تھا ہی اب خاصا خوفزدہ بھی ہوگیا۔

کچھ منٹ بعد اسے بہت دور سڑک کے آخری کنارے پر ارتھی کی دھندلی سی جھلک دکھائی دی۔ اس کی جان میں جان آئی کچھ دیر بعد ارتھی اس کے قریب پہنچی۔

تین گرے..... پاس پہنچ کر مالانی چیخا۔

پنڈت کی چھاتی دھک سے رہ گئی ———

"کیوں بے راکششو! کیا تین بار شو نیچے گرا؟"

نہیں مہاراج! میرے شیر نے تین وکٹ لیے...... سچ مہاراج!

"چپ رہ سالے!" سیٹھ نے غصے سے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

حد ہوگئی! سلیم نے سدھیر سے کہا، "سنو، شاہی پان والے کی دکان کے پاس پہنچتے ہی مالانی کے پاؤں میں اچانک بریک لگ گئے۔ سالا کمینٹری سننے لگا۔ ہم نے بہت کہا، پان والے سے

[illegible] کردی۔ [illegible]
[illegible] کر گالیاں [illegible]
[illegible] نے ریشم کو جمع کر لیا۔
بڈھا چیخا! جب اس بڈھے نے اپنے بستر پر [illegible] مرگھٹ پہنچنے کی جلدی تھی، کھانی تو [illegible] چلی دس منٹ میں کون سی دیر ہو جاتی! مالانی نے صفائی دی۔
"اس سے کہو، زبان کو لگام دے!" غصے کی وجہ سے بیٹھو کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔
شمشان پہنچ کر مالانی، کنڈیا، سیٹھو اور بڈھی نے اپنے کندھوں سے بوجھ اتارا۔ مرگھٹ والا جتا جلانے لگا۔ سدھیر پنڈت کے حکم کا انتظار کر رہا تھا کہ مالانی بول اٹھا۔
"سنا تم لوگوں نے۔ اس کیڈیا کا لونڈا جل رہا ہے؟"
سبھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ پھر سلیم نے کیڈیا سے پوچھا "جلا ہے، کس کے ساتھ؟"
"مجھ سے سنو!" مالانی نے کہا "اس کا لونڈا اپنے صاحب کی میم لے ساتھ چل رہا ہے۔"
"میں تھوڑا سا مار کر چٹنی بنا کر دوں گا، سالے وہ تو میرا بنا ہے" کیڈیا ناراض ہو کر۔
"اسے طعنے کیوں دیتا ہے؟" سلیم نے مالانی سے پوچھا "کیا تم اپنے مکان مالک کے گھر آنے جانے نہیں ہو؟"
"جانے میری جوتی" سنا تم لوگوں نے سلیم نے لیڈری چھوڑ دی ہے۔
"کب سے؟" کیڈیا نے حیران ہو کر پوچھا۔
"جب سے اسے جیب کاٹنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا"
سبھی ہنس پڑے۔
"اٹھو، شو کو چتا پر رکھو" پنڈت کی آواز سن کر چاروں اٹھ کھڑے ہوئے . . .
"ہم تیار ہیں،" مالانی نے کہا، "کہو تو تمہیں بھی . . . ."
پنڈت نے اس کا آخری اور ادھورا جملہ نہیں سنا۔
چتا سے اب آگ کی لپٹیں نہیں اٹھ رہی تھیں بس انگارے چٹک چٹک کر راکھ ہو رہے تھے سیٹھو نے سدھیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "چلو، اب راکھ دیکھنے سے کیا ملے گا؟"
"چلو!" سدھیر اس کا سہارا لے کر چلنے لگا۔
"مالانی کہاں ہے؟" سدھیر نے دریافت کیا۔
"پنڈت اور اس بڈھی کی طرح وہ بھی بھاگ گیا۔" "کہاں گیا ہوگا؟" کیڈیا نے پوچھا۔
"مجھے معلوم ہے!" سلیم نے کہا، سالا جا کر کمنٹری سن رہا ہوگا۔ کرکٹ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا پھر بھی کرکٹ کا سالا بنتا ہے برادری کو چھوڑ کر اسے نہیں جانا چاہئے تھا۔
سدھیر، کنڈیا اور سیٹھو نے پیچھے مڑ کر بجھتی چتا کو آخری پرنام کیا تبھی سلیم چیخ پڑا ——— "وہ دیکھو اس درخت کی آڑ میں کون کھڑا ہے؟"
"یہ تو اپنا مالانی ہے!" کیڈیا نے کہا تینوں اس کے پاس چلے گئے۔ مالانی درخت کا سہارا لیے آسمان تکتے کھڑا ہے [illegible] طرف [illegible] کو [illegible] دیکھ رہا تھا سدھیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، "چلو یار، اب یہاں کیا رکھا ہے؟"
مالانی نے یکبارگی اسے اپنے سینے سے لگا لیا، "تم نے آج اپنے ہاتھوں اپنے پتا کو راکھ کر ڈالا میں تب بہت چھوٹا تھا۔ بس چھ سات مہینے کا میں تو یہ بھی نہیں کر پایا تھا"
سدھیر اور مالانی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ کیڈیا اس نئی صورت حال سے حیران و پریشان تھا، وہ ان دونوں کو شاید ڈانٹ دیتا، لیکن سلیم نے اسے اشارے سے سمجھا دیا ——— "رو لینے دو ان کے لیے رونا بہت ضروری ہے!"

---

کرشن موہن

# غزل

جو البس میں ہنگامہ اکثر، وہ گھر میری قسمت میں تھا
بڑے شہر کی بھیڑ کا شور و شر میری قسمت میں تھا
معاشی کشاکش کا گرداب پرشور میری قسمت میں تھا
کہ رہنا اسی میں سدا، ڈوب کر میری قسمت میں تھا
کچا کھچ بھری بس میں کرنا سفر میری قسمت میں تھا
مجھے کب گوارا ہوا یہ مگر میری قسمت میں تھا
بھری بستیوں میں بھی سونا رہا میرا دامن کیا کروں
محبت میں لاحاصلی کا ثمر میری قسمت میں تھا
سبکدوش ہو کر سبکسر بھی ہونا پڑا ہے مجھے
مشقت کا اندوہِ نامعتبر میری قسمت میں تھا
میری زندگی نزہت و روشنی کی تمنائی تھی
مگر تیرگی کا علامت نگر میری قسمت میں تھا
محبت مرا دل لبھاتی رہی، آزماتی رہی
طلسمِ تمنا، فریبِ نظر میری قسمت میں تھا
ادھر تیرا دلکش تبسم تری دلبری کا فسوں
ادھر روز و شب گریہ تا سحر میری قسمت میں تھا
نہ سایا نہ پھل کیا تپش کے سوا اس سے حاصل ہوا
شجر دھوپ کا بے ثمر میری قسمت میں تھا
بڑھاپے میں یا رب کا یہ دل شکن اور سنگین سلوک
مجھے کرشن موہن کہاں تھی خبر میری قسمت میں تھا


THE QUALITY THAT DESERVES YOUR TASTE
Offers you a parade of taste with an unbeaten range of 49 delecacies from Ketchup to Squashes Pickles to Jams Canned Fruits to Juices and Fruit Pulps to Canned Vegetables
Walk into any outlet of the Super Bazar or the Kendriya Bhandar or a shop with the NAFED Board
Area Sales Manager
NAFED Processed Foods
3 Siri Institutional Area
Haus Khas New Delhi
Tel No 656734
nafed

حیات ملک

# سیکولر دنیا اور مذہب

آج کی دنیا کو سیکولر گردانا جارہا ہے۔ مگر یہ بھی بجا اور درست ہے کہ اس پر ایک شدید خوف طاری ہے، کیونکہ احیائے مذہب کے حامی اس کے ہر حصے میں طاقت پکڑتے جارہے ہیں۔ ترقی پسندوں کی رائے میں ہمیں ان رجحانات سے تشویش ہونی چاہیئے، نیز مذہبی کٹرپن کا مقابلہ اور سیکولرازم کی تبلیغ کرنا چاہیئے۔ لہٰذا ہمارے ابتدائی بیان کو کچھ بدلنے کی ضرورت ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہم ایک سیکولر دنیا میں رہ رہے ہیں۔ تاہم یہ ڈھنڈورا پیٹنا ہے کہ ہم ایک سیکولر دنیا میں رہنے کے خواہاں ہیں۔ واقعی

لیکن خوف کو جنم دینے والے اور بھی طریقے ہیں جو کہ زیادہ عمدہ اور موثر ہیں۔ ان میں سے ایک مذہبی جنونی کہلائے جانے کا خوف ہے کہ ایسا شخص ایک معقول ترقی پسند ذہن نہیں رکھتا۔ ایک ایسی دنیا میں جو کہ سیکولر ہو یا ایسا ہونے کی خواہاں ہو، غیر سیکولر تجربات کو شاذ ہی زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ عام طور پر انہیں سیدراہ خیال کیا جاتا ہے نیز ان پر سائنسی اور ترقی پسند نظریات سے غالب آنا چاہیئے۔ بات یہ ہے کہ ایک سیکولر دنیا بھی نظام وراثت کی سعی ہوتی ہے۔ سائنس کے تئیں اس کا پابند ہونا

مقاصد متعدد ہیں یعنی ہماری ریاستی سربراہی کی جدید نوآبادیاتی توسیع سے لے کر اشیائے صرف کی مسلسل پیداوار تک۔

سیکولر ذہن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کا مطلب اپنی کامیابی اور کامرانی سے اخذ کرے یعنی کام کی اس نوعیت سے جو ایک ٹیکنالوجسٹ کے طور پر اس نے اپنے کارخانے میں یا منیجر کے طور پر اپنے دفتر میں سرانجام دیا ہو۔ سیکولر نوعیت کی سمت طے کرنا ہمیشہ دوسروں کی سربراہی کا متقاضی ہوتا ہے۔ مارٹن بوبر کے الفاظ میں یہ تعلق کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ "میں ۔ یہ" کی نسبت سے۔ دنیا اور انا کے بیچ پوشیدہ یکجہتی کو دریافت کرنے کے لیے داخلی انکشافات درکار ہوتے ہیں۔ اس کے لیے باہر سے اندر زیست سے موت اور تحرک سے نروان کی جانب متضاد سمتوں میں فاصلے طے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیکولرازم اسی بات کی تو نفی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سیکولر نوعیت کی صحیح اور واضح



ان بچوں میں کون ہندو ہے، کون مسلم ہے، کون سکھ اور کون عیسائی ؟

ہماری تہذیب کا نصب العین سیکولر ہے۔

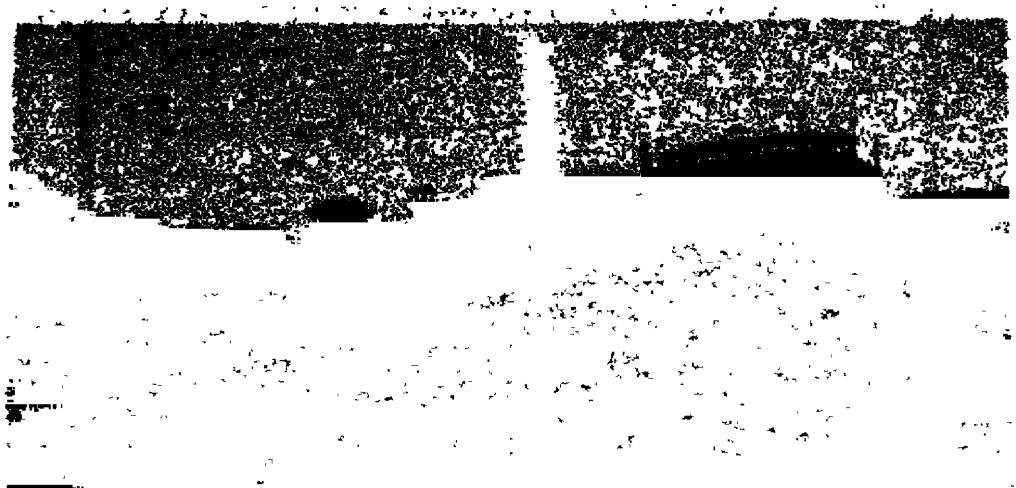
لازم ہے کہ ہر نومولود کو ایک شدید تربیتی عمل سے گزارا جائے۔ اس کی نشوونما میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے لے کر پارٹی کے دانشوروں تک جس کسی سے بھی اس کا سابقہ پڑے وہ ایک عظیم ذمہ داری سے لیس ہو۔ ان لوگوں کو چاہیئے کہ وہ ایک مثالی شہری کو تسلیم کرنے پر مائل کریں کہ سیکولر نہ ہونا ایک خطرناک غیر رجعت پسندی ہوگی مشکل ہو کہ معاشرہ کافی طور پر روادار ہو سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک غیر سیکولر شخص کو پاگل خانے یا جیل خانے بھیجا جائے۔

ایک مثالی سیکولر شہری اور ایک جاہل متعصبی کے درمیان حدِ فاصل پیدا کرتا ہے۔

تاہم یہ دہرا پن ضروری ہے۔ وہ نصب العین جو ہمیں عزیز ہیں ہر کوئی پورے نہیں کر سکتا۔ مذہبی شخصیتیں تو یقیناً ایسا نہیں کر سکتیں۔ اس کے لیے منضبط شخصیت، ایک "موضوعی آگہی" اور دنیا کو ایک سائنسی انداز سے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید ان جیسوں پر "موضوعی آگہی" کا مارکہ لگایا جا سکتا ہے۔ اپنے مقاصد کو پانے کی غرض سے ہمیں اس کو محفوظ کرنے کی ضرورت ہے

سمت کا تعین نہ تو وجدانی ہے اور نہ ہی باطنی یہ تو فقط دکھائی دینے والی تجرباتی چیز کو دیکھتا ہے۔

میں کون ہوں ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے درپیش ہے ایک سیکولر دنیا کی طرف سے دیا جانے والا اس کا جواب اپنی ہی قسم کا ہے۔ یہ وہ نہیں ہے جو اس تجرباتی دنیا کے لیے خطرناک ثابت ہو گئی سے میں دوچار ہوں۔ میں تو دراصل موجودہ اداروں کی ازسرِ نو تخلیق کرنے والا ایک کارگزار، ایک ٹیکنالوجسٹ ایک فوجی افسر یا ایک منتظم ہوں۔ یہ ہے میرا اولین فریضہ



[illegible]ریز اور تیری شناخت کا غالب پہلو، تیرے وجود کو [illegible] اسی انداز سے دیکھنا چاہیے، کیوں کہ وہ بھی تو ایسے ہی کارگزار ہیں۔ ان سے میرا تعلق یا تو نظریے کا ہے یا منصبی۔

سیکولرازم کے استدلال کو دیکھیے۔ ہر ایک فرد ایک شہری ہے اور اسی کے مذہب کی بنا پر اس سے کوئی امتیاز نہیں برتا جانا چاہیے۔ یہ واقعی مساوات کا ایک سبق بھلا اس کے باوجود یہ قصہ ادھورا ہے۔ ہر ایک شہری پہلے ہی بکھر چکا ہے۔ ایک سیکولر انسانیت کے نعرے کے پیچھے چھپا ہے وحشیانہ تشدد۔ ایک ایسی ذہنی حوالہ کی "تکمیت" اور اس کی وسیع تر اور مکمل شناخت کے خلاف ہے۔

فرض کیجیے، ایک فرد دل کی گہرائی سے ایک آواز سن کر یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ تنہا ایک تاجر نہیں ہے! اس کی حاصل آگہی اسے ایک ایسی دنیا میں لے جا سکتی ہے جو منڈیوں اور اسٹاک ایکسچینجوں سے پرے ہو۔ ایسی حالت میں وہ بحرانی دنیا، جسے ہمارا سیکولر شعور اس درجہ چاہتا ہے، تہس نہس ہونے لگتی ہے۔ بس مذہب یا کوئی موضوعی فلسفہ، جو ہمیں اپنی فرض کر لی گئی دنیا کے تئیں منکر بناتا ہو، شک بھری نظروں سے دیکھا جانا چاہیے۔

ایک سیکولر ریاست کسی کے مذہب میں دل چسپی نہیں رکھتی۔ اس کا سبب جاننا مشکل نہیں ہے۔ ریاست ایک فرد کو اپنے تعلق کے گرد و پیش میں سمائے ہوئے محض ایک کارکن کی طرح دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر مذہب اس کی زندگی کا ایک غالب عنصر ہو جائے تو وہ باغی بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ریاست اس نوع کی "دیوانگی" کو برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ اظہارِ خیال کی آزادی میں دل چسپی نہیں رکھتی۔ سیکولرازم سالمی وجود رکھتا ہے۔ یہ صوفیوں اور نام نہاد خدا رسیدہ اشخاص کے تجربات کا ادراک نہیں کر سکتا۔

ایک سیکولر شخص اپنے مقدر سے آگاہ ہوتا ہے باطنی نور شاذ ہی اس کے تجربے میں آتا ہے اور اگر کبھی الہامی لمحے بھی جائیں تو بھی اسے دنیوی عالم کو فوراً مراجعت کرنی پڑتی ہے۔ ایک سیکولر دنیا کا جابرانہ ہونا سچائی ہے۔ لیکن تب بھی کارل مارکس سے لے کر سگمنڈ فرائڈ تک، سیکولر دنیا کے انقلابی ہماری مشکلات کو حل کر سکتے ہیں یا ایک کمیونسٹ معاشرہ یا ایک ایسا سماج، جہاں ہر کوئی اپنے لاشعور کو سمجھتا ہے اور اسے اپنے استدلالی ذہن سے ہم آہنگ کرتا ہے، ہماری سیکولر جنت کی شبیہ پیش کرتا ہے اور اسے ممکن بنانے کے لیے ہمیں نہ تو نام نہاد خدا رسیدہ لوگوں کی اور نہ ہی صوفی سنتوں کی ضرورت ہے۔ منطق، مباحثے نے فن میں تربیت یافتہ کوئی انقلابی یا کوئی تحلیل نفسی کا ماہر اس کام کے لیے آگے آئے گا۔ ہم عنقریب ایک ایسی دنیا میں قدم رکھنے والے ہیں جہاں سیکولرازم اپنی حقیقی امکانی قوتوں کو وا کرے گا، جو اقتصادی استحصال اور انسانی ذہن کے نامعقول پہلو سے چھٹکارا دلائے گا۔

اس کے باوجود چند سوال ہمارے ذہن میں بار بار اٹھتے ہیں، ایسا کیوں ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ ایک قسم کی وجودیاتی بے چینی میں اکثر مبتلا رہتے ہیں؟ یہ روزگار کے متلاشی ایک بے کار نوجوان کی یا بہتر اجرتوں کے لیے لڑنے والے "ٹریڈ یونین لیڈر" کی بے چینی نہیں ہے۔ نہ یہ فرائڈ سے منسوب احساسِ گناہ ہے اور نہ اوڈی پس سے منسوب جنسیاتی تشویش ہے۔ یہ بے چینی اس شدید احساس سے پیدا ہوتی ہے کہ بشر محدود ہوتے ہوئے بھی لامحدود ہونے کا متلاشی ہے۔ یہ ایک متناقض سی صورتِ حال ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی دنیا اس کے دفتر، ٹیڈ یونین اور لیونگ سٹی تک ہی محدود ہے۔ پھر بھی وہ خود کو غیر مطمئن محسوس کرتا ہے۔ اس کا ذہن پھٹنا چاہتا ہے۔ اس دنیا سے وہ پرے جانا چاہتا ہے جسے اس کی سیکولر آنکھوں نے اب تک فرض کر لیا تھا۔ لیکن اسے بڑی حد تک یقین نہیں آتا کہ آیا کوئی جہان بھی ہے ــــ وہ جہاں جو اس کے ذریعۂ معاش، کنبے اور دھندے کے پیچھے ہے۔ واقعی جب وجودیاتی بے چینی گہرے طور پر شدید ہو جاتی ہے تو ایک شخص طور او نے سوالات پوچھنے لگ جاتا ہے، جیسے کیا زندگی واقعی جینے لائق ہے؟ ان کے سیکولر جوابات ناکافی رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ انقلابی نظریے بھی مطمئن کرنے میں ناکام رہتے ہیں، کیوں کہ کوئی انقلابی دنیا پر برتری حاصل نہیں کرتا، یہ محض اس کی سیاسی معیشت کو بدلتا ہے۔ شاید یہ معانی کا بحران ہے!

وجودیاتی خلا کو برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے

ایک سیکولر دنیا اپنی حکمت عملیاں خود مرتب کرتی ہے۔ اس کا آسان ترین طریقہ "اخلاق کار" کے اصول کا خوگر ہونا ہے۔ کمپنی کی "استعداد" کے لیے منتظمین اور عاملین کڑی محنت کرتے ہیں۔ وہ منافع اور شرحِ فروغ کو بڑھانے کے لیے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی میٹنگوں اور غیر ممالک کے دوروں میں مصروف رہتے ہیں اور ناممکن سوالات پر غور و فکر کرنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ دوسرا طریقہ صارفیت پر مبنی ہے۔ لطف اندوزی اور کامرانی کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ زندگی فقط مصنوعات، خواہ وہ ایک موٹر کار ہو یا ایک مشروب، کو صرف کرنے سے بھی بسر کی جا سکتی ہے لیکن آخر کار یہ حل تباہ کن نتائج پیدا کرتے ہیں۔ ایک اخلاق کار کا ایک بے معنی ضابطہ زندگی کے عمدہ پہلوؤں کو تباہ کر دیتا ہے۔ انسان کا اپنی اندرونی دنیا کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر نہ جی پانا اس کے احساسات کو ضرر پہنچاتا ہے اور تعلقات ناممکن ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ معاصرین کے تمدن میں موجود ایک احساسِ نرگسیت صورتِ حال کو خطرناک طور پر متشدد بنا دیتا ہے۔ پاکیزہ معنی سے عاری کسی دنیا میں زندگی بسر کرنے میں کوئی تُک نہیں ہوتی، کوئی بڑا مقصد نہیں ہوتا۔ یہاں ہر کوئی ایک حریف، ایک اجنبی اور کوئی باہر کا ہوتا ہے۔ البرٹ کیمس سے لے کر گراہم گرین تک، وجودیت میں یقین رکھنے والا ہر مصنف ہمارے دور کے گہرے درد کی علامت رہا ہے۔

اس کے باوجود ایسے لوگ بھی ہیں جو سرکش ہیں۔ وہ اپنی وجودیاتی بے چینی پر سوچ وچار کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس سے بچ نہیں سکتے۔ عملی لوگوں کے تجویز کردہ

حل انہیں معمول کے مطابق نہیں بنا سکتے۔ انہیں یہ بتلانا بے سود ہوگا کہ زیادہ دولت کماؤ، اپنی مزید ترقی کے لیے کوشش کرو اور زیادہ جنسی تجربات حاصل کرو۔ انھیں کچھ اور چیز چاہیئے۔ وہ کسی ربانی تجربے کے منتظر ہیں۔ تحلیل نفسی کے مغربی ماہرین میں سے جنگ نے اس بحران کو بہت ہی صحیح طور سے سمجھا ہے۔ اس کو کتنے ہی ایسے "مریض" ملے جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ ان کا اعصابی خلل ایڈلر یا فرائڈ کے نسخوں سے ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس کے بجائے جنگ کی رائے ہے ہمیں اپنے مجموعی آرکی ٹائپ کے شعور کی ضرورت ہے۔ یہ لگ بھگ ایک مذہبی تجربہ ہے، کائنات سے مکمل ہم آہنگی کی بصیرت۔ یہ ایسے ہے جیسے ہماری محدود آگہی لامحدود میں مدغم ہوگئی ہو۔

تاہم یہ مذہبی تجربہ کچھ چیدہ چیدہ افراد کی اجارہ داری نہیں ہے۔ کچھ الہامی لمحے بھی ہوتے ہیں۔ صحیح طور پر لوگ بھی سیکولر بصیرت کی بے اثری کو محسوس کرتے ہیں اور ایک یکسر مختلف دنیا میں وارد ہوجاتے ہیں۔ یہی وہ فعل ہے جسے ابراہم مسلو نے چوٹی کا تجربہ کہا ہے۔ یہ شدید محبت اور ربانی جنسی تجربے کے عمل میں واقع ہوتا ہے۔ یہ تب ہوتا ہے جب معقول دنیا کا نظام ریزہ ہوجاتا ہے اور حقیرانہ اپنے ذرہ یکسر رد کر کے لامحدود میں مدغم ہوجاتی ہے۔ یہ سائنس، استدلال اور ٹیکنالوجی سے بڑھ کر ہے۔ یہ وہ تجربہ ہے جسے ہماری سیکولر زبان کبھی الفاظ میں ادا نہیں کر پائے گی۔

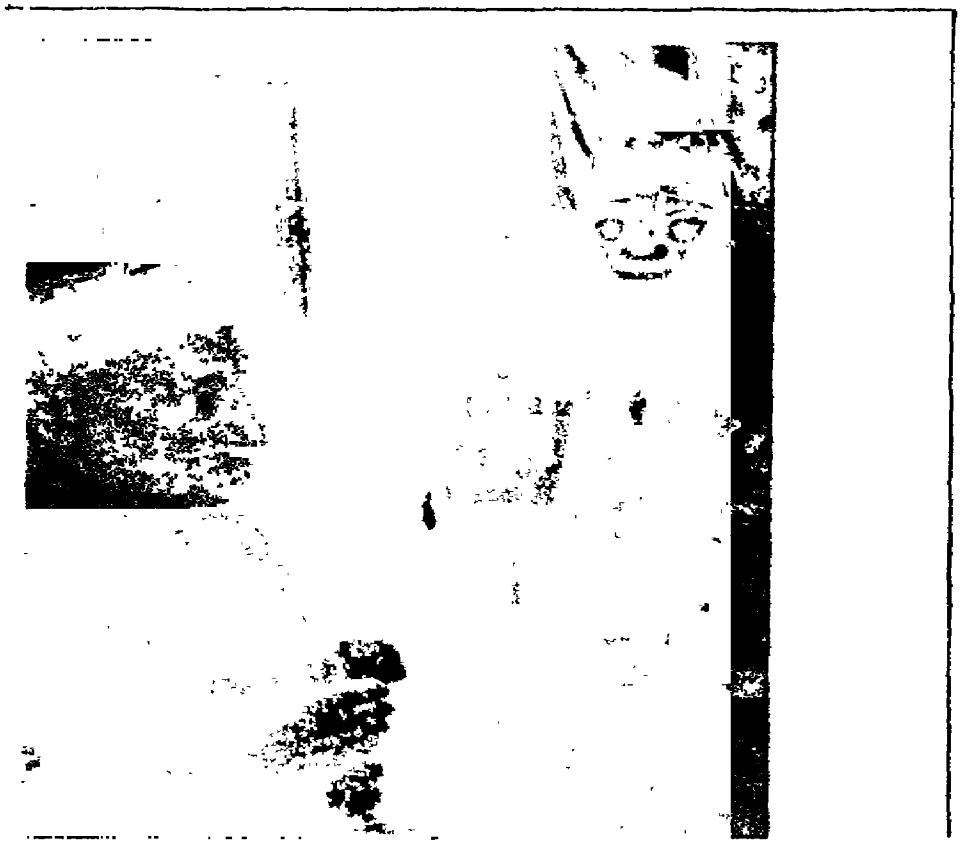
اس موقع پر سیکولرازم اور مذہب کے درمیان آویزش واضح ہوجاتی ہے۔ مذہب سیکولرازم کی جھوٹ موٹ کی دنیا کے غلط اعتقاد کو کمزور کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ دنیا ایک مایا جال ہے، اس کی شادمانیوں سے کسی طرح کا لگاؤ بالآخر آگے چل کر غم اور مایوسی دیتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی دکھوں اور مصیبتوں سے بھری ہوئی ہے! مذہب یاس پرستی پیدا کرسکتا ہے جو کہ سیکولر امید کی نفی ہے۔ اسے لازماً دبانا چاہیئے، اس کے جوہر کو نیست و نابود کر دینا چاہیئے اور اسے بے معنی سی حسب معمول رسمیات میں بدل دینا چاہیئے۔

البتہ مذہب کا ایک حقیقی ادراک ہمیں ایک الگ کہانی کہے گا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ نرگسیت اور اس غلط اعتقاد کی نفی کرتا ہے کہ اس دنیا میں عیش و عشرت، کامیابی اور کارناموں کا کوئی انت نہیں ہے۔ یہ ذہن میں موت کی تصویر یا شکل قائم کرتا ہے۔ یہ جانتا ہے کہ ہر کارنامہ ایک سراب ہے اور آخر کار ہر شے کا انجام فنا ہے۔ پھر بھی یہ قصہ صرف ادھورا ہے۔ یہ اس خلا کو بھرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ شعور کے ایک الگ دائرے میں قدم رکھنا چاہتا ہے، ایک ایسا شعور جو زندگی اور موت کے دہرے پن کو حل کرتا ہے، نیز سمجھداری حاصل کر کے نشاط حاصل کرلیتا ہے۔ یہ نروان، یہ ہے مکتی۔

اس نروان اور مکتی کے عرفانی معنی کھوجنے کی ضرورت یہ دنیا سے انکار کے مترادف نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ تو اس پر ایک نئے طریقے سے کام کرنے کے مترادف ہوگا۔ یہ اودیا (جہالت) سے ودیا (آگہی) کی جانب ایک سفر ہے۔ یہ کھوئی ہوئی دانش کی بحالی کی ایک ایسی کوشش ہے جو ہماری دنیاوی سرگرمیوں کو ایک وسیع تر اور ارفع بصیرت سے مربوط کرتی ہے۔ اس سیاق میں زندگی کی اس مدبرانہ بصیرت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جس کی تبلیغ ہندومت کرتا ہے۔ جو بات ہندو دھرم کے بارے میں نمایاں انکشاف کرتی ہے۔ یہ اس کا وہ ارتھ (معنی) ہیں جو اس نے کام (ہوس) کے نکالے ہیں، جو ہماری روزمرہ زندگی کا سیکولر طول و عرض ہے۔ لیکن پھر یہ ان کو دھرم اور موکش (نجات) کے ساتھ مربوط کرتا ہے۔ اس طرح ہندومت ذہن میں ایک مرد کامل کی تصویر یا شکل قائم کرتا ہے جو انسانی وجود کا کل ہے۔ جیسا کہ محترم رادھا کرشنن نے ایک بار کہا تھا:

"ہندو ضابطۂ عمل خواہشات کی دنیا
کو ابدیت کے تصور کے ساتھ جوڑتا
ہے۔ یہ ارضی اور فردوسی سلطنتوں کو ایک
دوسرے کے ساتھ باندھ کر رکھتا ہے۔"

[illegible] زندگی کے چار [illegible] آخری نجات یا مکتی [illegible] مل سکتی ہے جب اس [illegible] سنسار [illegible] ایسا [illegible] غالباً [illegible] کے بارے میں اہم ترین بصیرت ہے۔ [illegible] سے انکار نہیں کیا جاتا [illegible] عظیم عبادت سے [illegible] سرگرمیاں بھی پرستش ہوجاتی ہیں [illegible] دھرم ہے جو

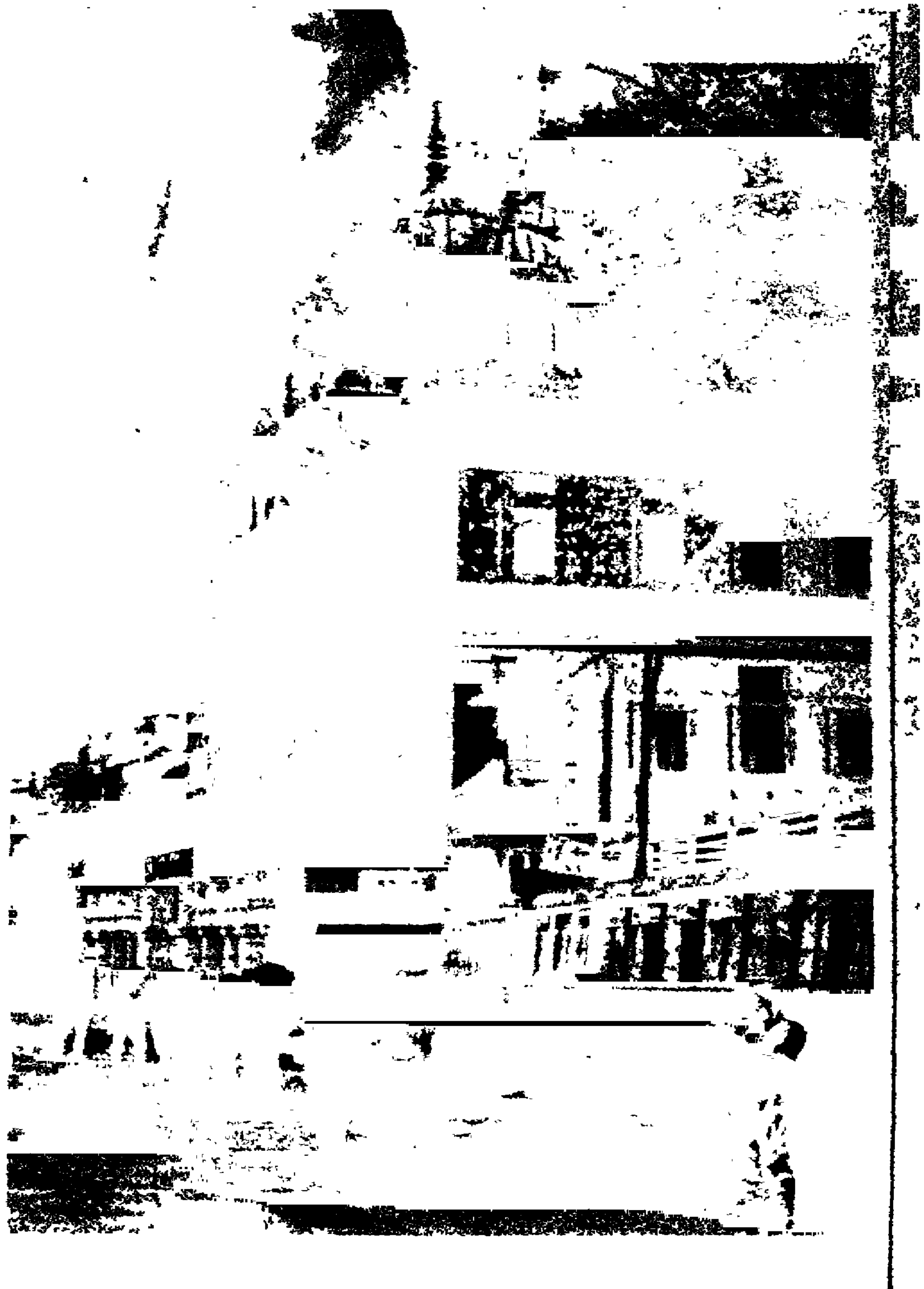


کو لامحدود کے ساتھ مکمل مل جانے کا ایک طریقہ ہے تب دنیا خدا کی ہستی کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اس کی ذات کا برملا اعلان ہوتی ہے۔

زندگی کی اس اہم بصیرت کو خوبصورت انداز سے ہندومت کے انتہائی بردلعزیز صحیفے بھاگوت گیتا میں منعکس کیا گیا ہے۔ دنیا کی ہستی سے کیونکر انکار کیا جاسکتا ہے؟ شری اربندو نے ایک بار کہا تھا "کوروکشیتر ایک حقیقت ہے۔ دنیا نیز ان ٹھوس ذمہ داریوں سے جنہیں پورا کرنا پڑتا ہے، آدمی کو کوئی مفر نہیں ہے۔ بھاگوت گیتا نے انسانی عمل کو نئے معنی دیئے ہیں۔ ایک کرم یوگی اس دنیا کو بھوگتا ہے اور پھر بھی اس زعم میں مبتلا نہیں ہوتا کہ وہ ایک نجات دہندہ ہے یا اس کے بغیر دنیا چل نہیں سکتی۔ اس کا حقیر طور پر محض یہ جاننا کہ صرف اپنے دھرم کا پالن کر رہا ہے اس کو خود پرستی اور خود پسندانہ تفاخر اور اکتسابات سے نجات دلاتا ہے۔ تنہا اس نوع کا انسانی عمل ہی دنیا کو تشدد اور رقابت سے بچا سکتا ہے۔

آج دنیا میں ہر کہیں ایک سیکولر اور سیاسی تہذیب کی بنیادیں ریزہ ریزہ ہو رہی ہیں۔ احیائے مذہب کا رجحان بھی ہر طرف دکھائی دے رہا ہے۔ اس کا اظہار متعدد طریقوں سے ہو رہا ہے۔ جو کہ خمینی سے لے کر ہپی تحریک تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں ہمارے دور کا مذہب دنیا کے عصری نظریے کی مسخ شدہ صورت یا ردعمل ثابت نہ ہو۔ نتیجے کے طور پر ہو سکتا ہے کہ یہ پرتشدد دکٹر پنتھی کی ایک تشکل رجعت پسندی میں بدل جائے (۱) صورت میں مذہب اپنے پاک معنی، اپنی انسانیت، لچکیلے پن اور رواداری سے محروم ہو جائے گا۔ (۲) حالت میں مذہب اپنے عالیشان مقصد سے دور ہٹ کر ایک اعلیٰ جبر و استبداد دکھائی دے گا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایسی رجعت پسندی سیکولر رجعت پسندی سے کسی طرح بھی کم نہیں جس کا مطلب جدید ٹیکنالوجی کے بارے میں ایک ہی مقصد کے لیے وقف ہونا ہے۔ ایسی رجعت پسندی خمینی کی ہو یا ریگن کی، اس کا فیصلہ کرنا واقعی تکلیف دہ ہے۔

تاہم ایک امکان اور بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مذہب ایک عظیم محرک اور موجودہ معاشرتی نظام کی تنقید کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے۔ مذہب اساسی بن جاتا ہے۔ شاید اس سے بھی زیادہ اساسی جتنا کہ بیشتر سیکولر انقلابی سوچ سکتے ہیں۔ ہمارے دور میں موہن داس کرم چند گاندھی نے بھی ایک ایسی کوشش کی تھی۔ گاندھی کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ جاننے کیلئے تیار رہنا ضروری ہے کہ گاندھی ایک سیکولر آدمی نہیں تھے جب ترقی پسند یہ ثابت کرنے میں اپنا پورا زور صرف کرتے ہیں کہ گاندھی ایک



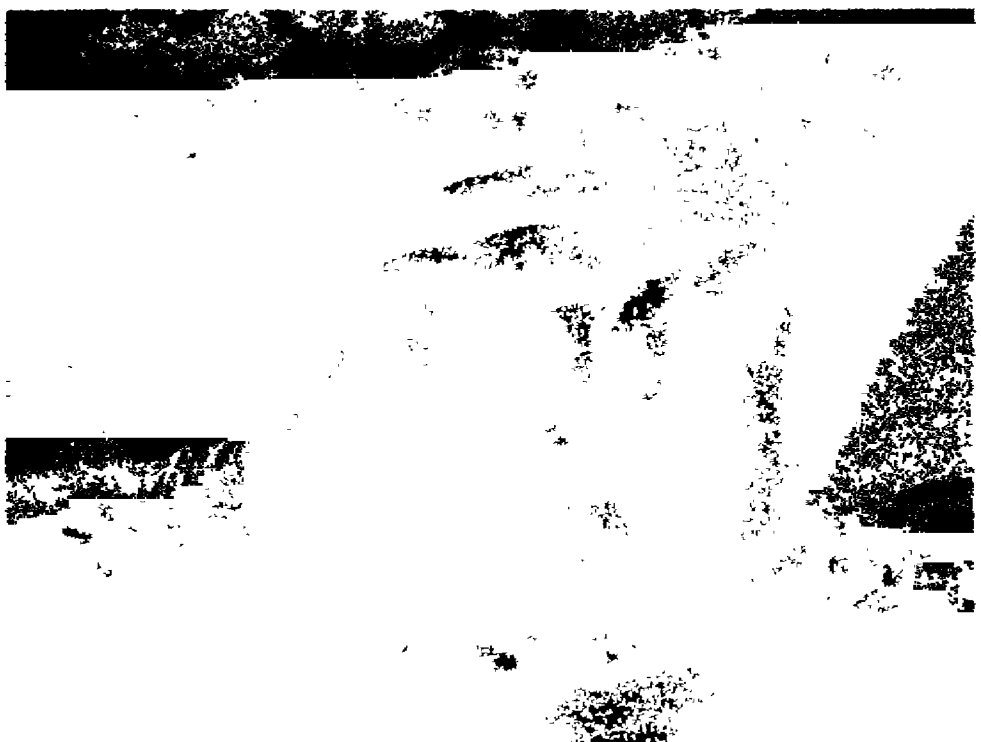
[illegible]یل ۔ورد پانڈے

# قدیم ہندوستان میں سنسر

پرانے وقتوں ہی سے اخلاق عامہ کے محافظ حضرات فنونِ لطیفہ اور ادب کو ہمیشہ شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتے آئے ہیں۔ فنون لطیفہ کے "مخرب اثرات" فلسفیوں اور اہل طریقت کی بے چینی اور خوف کا باعث رہے ہیں۔ فنون لطیفہ اور ادب کے بیچ ایک نقطۂ اتصال ہونے کی وجہ سے ڈرامے نے ان کی اس بے چینی اور خوف کو دوچند کر دیا۔ افلاطون نے نرم و نازک ذہنوں پر شاعری کے فاسق اثر سے خبردار کیا۔ اس نے لذّ بانی اور آیونائی ہم آہنگ سُروں کے میل پر قدغن لگا کر موسیقی پر کڑا سنسر بٹھانے کی رائے دی، کیونکہ ان سے اظہار غم ہوتا تھا۔ وہ ڈراما کا سخت مخالف تھا۔ اپنی کتاب "ریپبلک" میں وہ رقمطراز ہے، "جب کسی بھی شے کی نقل اتار سکنے والے خاموش اداکاروں میں سے کوئی ہمارے پاس آ کر خود کو یا اپنی شاعری کو پیش کرنے کی درخواست کرتا ہے تو ہم اسے ایک باکمال شخص مان کر اس کے آگے جت ہو جاتے ہیں اور اس کی یوں پرستش کرنے لگتے ہیں گویا کہ وہ کوئی دلآویز اور مقدس ہستی ہے۔ لیکن ہمیں لازماً اسے یہ بھی بتانا چاہیے کہ ہمارے ملک میں اس جیسے انسانوں کو موجود رہنے کی اجازت نہیں ہے "قانون انہیں اس بات کی اجازت نہیں دے گا۔ لہٰذا اس طرح ہم اسے عطر مل کر اور اس کے سر پر اونی ہار سجا کر کسی دوسرے ملک میں چلتا کر دیں گے۔" ڈراما کے فن کی بابت یہ تھا افلاطون کا رویہ۔

تھیٹر پر کسی نوعیت کا سنسر عائد کرنے کی کوششیں قدیم ہندوستان میں بھی کی گئیں۔ سماج پر اثر ڈالنے والے ان کے مضر اثرات کے ڈر سے ملّاؤں، مفکروں، حاکموں اور یہاں تک کہ اپنی آزاد خیالی کے لیے مشہور بادشاہوں نے بھی ڈرامائی سرگرمیوں کو دبا دینے اور یہاں تک کہ ممنوع قرار دینے کے اقدامات کیے۔ اس ضمن میں ان کے اعتراضات اور خدشات کا ذکر ذیل کی سطور میں آئے گا۔

ایسا لگتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والے فنکاروں کو اظہار و نمائش کی کھلی چھوٹ تھی۔ رگ وید میں سدا بہار اور مسحور کن صبح کی دیوی کو ایک ایسی رقاصہ بتایا گیا جو زرق برق لباس میں ملبوس اپنے حسن و جمال کو ساحرانہ انداز میں بے نقاب کرتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ موہنجو دڑو میں کھدائی کے دوران کانس کی ایک ایسی ننگی مورتی برآمد ہوئی تھی جس کا انداز اکسانے والا تھا۔ بدھ مت کی ایک قدیم تصنیف "اودیناشتک" میں کووَلیا نامی پری رو رقاصہ کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی کہی گئی ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دلکش مجموعے ترتیب گروکی یہ حسین و جمیل بیٹی گری والگو اجتماع میں رقص کرنے کے لیے راجگریہہ کے شہر میں آئی۔ اس کا سڈول بدن پُر شباب آب و تاب سے دمک رہا تھا۔ اپنے حسن و جمال کے باوصف اس نے دیدہ و دانستہ کچھ اس





[illegible] نہیں کیا گیا اگرچہ جس وقت [illegible] تھی اسے دیکھ کر بیکل ہو گئے اور وہاں کی بیکلی دیکھ کر یہ مسئلہ پیدا ہوا۔ بھکشوؤں کی حالت کچھ اس قدر متزلزل ہو گئی کہ خود مہاتما بدھ کی مداخلت کی ضرورت پڑی اور انھوں نے اس کا فرا دا رقاصہ کو اس زہد شکن رقص کی پاداش میں ایک بدنما مخلوق میں بدل دیا۔ غالباً اسی لیے مہاراج ادھیراج اشوک نے چٹانوں پر کندہ کرائے گئے اپنے کتبوں میں سے ایک میں بڑی برہمی سے کہا ہے کہ تھیٹر کے کھیل تماشے اور اجتماع بدی سے پُر ہوتے ہیں اسے بہو کا بھی دوسرا سماجسا"۔

ڈرامائی کھیل تماشوں کے بُرے اثرات سے اپنے چیلوں کے بیش قیمت ذہنوں کو بچانے کی غرض سے اپنی دانشمندی کے لیے معروف گوروؤں نے ایک آسان راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے اپنے حلقے کے اراکین کو ایسے شرارت آمیز کھیل تماشے دیکھنے سے بالکل منع کر دیا۔ مہاتما بدھ نے رقص موسیقی اور اداکاری کی محفلوں میں شامل ہونے والے بھکشوؤں کے بارے میں اپنے وعظوں میں کچھ بندھن خفگی کا اظہار کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کیشا پہاڑیوں کے دو بھکشوؤں کو تھیٹر ہال میں داخل ہونے کی جسارت کرنے پر اپنے حلقے سے نکال کر باہر کر دیا گیا تھا۔ وہ فرش پر پھیلائے گئے لباس پر ان کو رقص کرنے کے لیے رقاصہ کو شہوانی انداز میں اشارے سے بلاتے ہوئے پائے گئے تھے۔ قانون ساز مہاگرو ان منو نے اپنے متعلقین کو یہ حکم دیا کہ وہ ڈرامائی کھیل تماشے ہرگز نہ دیکھیں۔ سماج کا ردعمل بھی بھکشوؤں کے ان کھیل تماشوں کے دیکھنے کے خلاف تھا۔ چانکیہ کا کہنا ہے کہ راجگیر میں منعقد ایک ڈراما تہوار کے موقع پر اجتماع میں کچھ بھکشوؤں کو دیکھ کر حاضرین ایک دفعہ برہم ہو گئے تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ ساکیہ پتیا سامانس (بدھ بھکشو) دنیاوی عشرتوں میں مشغول عام لوگوں کی طرح ناچ گانے کی محفلوں میں کیوں کر جا سکتے ہیں؟ ان دنوں اس نوع کا معاشرتی اور مذہبی سنسر یا ضابطہ مروج تھا۔

غالباً چوتھی صدی قبل مسیح کے آس پاس موریہ ریاستی انتظامیہ نے آریہ چانکیہ کے ایما پر تھیٹر کے سنسر سے متعلق ایک واضح ضابطہ پیش کیا۔ لگتا ہے وہ عظیم مدبر یہ بھی ٹھیک نہیں سمجھتا ہے کہ عوام الناس کو دنیاوی عشرتوں کا لطف اٹھانے اور اسٹیج کے پُرہنگام کھیل تماشے دیکھنے کی چھوٹ ہو۔ سماجی بہبود کے پیش نظر عوامی کھیل تماشوں پر کچھ پابندیاں لگانے کو وہ پسندیدہ خیال کرتا تھا۔ ایک اخلاق پرست کی حیثیت سے وہ اداکاروں کی طرف سے مسلمہ معاشرتی اقدار کی تضحیک وتمسخر کی ضرر رساں بدعنوانیوں میں شمولیت کے خلاف تھا۔ اس نے عورتوں کو ایسے کھیل تماشے دیکھنے کی فقط اسی صورت میں اجازت دی ہے جب کہ ان کے شوہروں کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ وہ دیہات کے قریب مستقل تھیٹر ہال تعمیر کرنے کے سخت خلاف تھا۔

اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ارتھ شاستر میں چانکیہ نے سنسر سے متعلق امتناعی ضوابط بڑے واضح الفاظ میں درج کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "اداکار جب چاہیں حاضرین کا دل بہلا سکتے ہیں لیکن انہیں اپنے ملک (دیش)، ذات پات (گوتر) اور جاتی، اور کنبوں سے متعلق رواجوں کا مضحکہ اڑانے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ مردوں کی عورتوں کے ساتھ مباشرت کے بارے میں کچھ کہنے یا اس کی پھبتی اڑانے سے انہیں لازماً گریز کرنا ہوگا۔ اداکاروں کی چرب زبانی یا سوقیانہ افعال سے کسی کی دل آزاری ہونے کی صورت میں مجسٹریٹ ان پر جرمانہ لگا سکتا ہے۔ جرمانہ کی رقم کی ادائیگی کی صورت میں انہیں کوڑے لگائے جا سکتے ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں اداکار اپنے تماشائیوں کو ہر قسم کی غیر مہذب باتوں سے محظوظ کرتے تھے۔ ایک جاتک کتھا میں اداکاروں کی حرکتوں کے بیان میں ایک ذی عقل آچاریہ یہ شکایت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ یہ لوگ ناشائستہ قصے پیش کرتے ہیں۔ غالباً اس میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات پر مبنی پُرمذاق کہانیوں کی پیش کش اور اداکاری شامل ہے جن سے تماشائی ہمیشہ خوش ہوتے ہیں۔ پاتنجلی کے مہابھاشیہ میں ایک بہت ہی مزیدار ڈرامائی واقعے کا ذکر کیا گیا ہے [illegible] کے یہ پوچھنے پر کہ تم کس کی ہو اسٹیج پر کام کر رہی اداکارہ جواباً کہتی ہے: آپ کی، آپ کی۔ چانکیہ شاید ان عوامل کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ وہ دل بہلاوے کو سوقیانہ پن سے آزاد کرنا چاہتا تھا تاکہ معاشرت کا ہر فرد بغیر کسی پریشانی کے اس کا لطف اٹھا سکے۔ آریہ چانکیہ غالباً پہلا ہندوستانی آچاریہ تھا جس نے سماجی احساس کے مسائل کی تضحیک کے جرم کو ریاستی قوانین کے تحت واجب التعزیر ٹھہرایا نیز یہ رائے دی کہ بے لگام جنسی گفتگو کے عادی اداکاروں کے خلاف تعزیری اقدامات کیے جائیں۔

ہم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ آریہ چانکیہ کے ان سنسر سے متعلق امتناعی ضوابط کا عصری تھیٹر پر کتنا اثر پڑا۔ شاید کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ یہ جنسیات اور ظرافت ہی تو ہیں جو عوامی طبیعت کو چٹ پٹا بناتی ہیں۔ اونچے معاشرے میں انہیں تہذیب کے ظاہری لبادے میں چھپا لیا جاتا ہے۔ لہٰذا اداکاروں کو چار و ناچار اپنے ناظرین کو چٹ پٹی جنسی گفتگو اور قابل اعتراض ظرافت سے خوش کرتے رہنا پڑتا ہے۔ غالباً اسی سبب سے مہاراجہ اشوک نے اسٹیج کے کھیل تماشوں پر ایک شاہی فرمان کے ذریعے پابندی لگانے کا انتہائی قدم اٹھایا۔ چٹانوں پر کندہ کرائے گئے کتبوں میں سے ایک کے ذریعے اس نے یہ حکم عاید کیا: "دھرم پریتم 'دیونم پریہ' 'پریہ درشی' کے حکم سے کندہ کرایا گیا ہے۔ یہاں کسی بھی جانور کو جان سے مارنا یا اس کی قربانی

ہوتا ہے اور نہ ہی یہاں سماجی تھیٹری کھیل منعقد کیے جاتے ہیں۔ قابل اعتراض تماشوں کے بجائے اس نے مذہب سے متعلق جلوسی تھیٹر کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ایسے جلوسی تھیٹر کی روایت ہندوستان میں جڑ پکڑ گئی تاہم اس کے ساتھ ساتھ دیگر اقسام کے تھیٹری کھیل تماشے بھی بڑی تیزی سے جاری اور پنپتے رہے۔

ایسا لگتا ہے کہ سرکاری فیصلوں اور حکومت کے امتناعی احکام کا مقبول عام تھیٹر کے نفسانی مواد پر عملی طور پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ ہندوستانی فن ڈراما کے بانی مبانی اور ناٹیہ شاستر کے مصنف بھرت نے اداکاروں کی جماعت کے لیے ان کے فرض کے مظاہرے سے متعلق کسی قسم کے ضابطۂ اخلاق مرتب کرنے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں، اسٹیج کے کھیل تماشوں سے متعلق بھرت کے مرتبہ قواعد کے پیچھے کوئی سرکاری منظوری کارفرما تھی یا نہیں۔ البتہ یہ حقیقت کافی ناطق ہے کہ اپنے طبقے کے افراد کے لیے سنسر کا ایک ضابطہ مرتب کرنے کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ اس ضابطے کے بموجب تھیٹر نیز قابل اعتراض اسٹیجی عوامل کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اپنے شہرہ آفاق "ناٹیہ شاستر" میں بھرت نے اداکاروں کی شرارتوں کے بارے میں اظہار افسوس کیا ہے۔ ڈرامائی متن میں اپنے علم کے نشے میں انھوں نے دوسرے لوگوں کی نقالی کے ذریعے ان کا مذاق اڑایا۔ یہ حضرات اپنے بھانڈپن یا پراہاسنوں میں سماج کے مقتدر لوگوں کا مضحکہ اڑانے سے کبھی باز نہ آئے۔ انھوں نے مقصداً ناظرین کے ایک اجتماع میں ایک ایسا ڈراما پیش کیا جو رشیوں کی پھبتی اڑانے کے لیے تھا۔ انہیں قبول نہیں کیا گیا۔ اس میں شرانگیز عوامل (سودر آچارم) شامل تھے جن سے واہیات اطوار کی ترغیب ملتی تھی اور جو نکتہ چینی اس میں کی گئی تھی وہ بڑی بے رحم اور بدشگون ہوتی ہے۔ رشیوں نے اداکاروں کو ان کی گستاخیوں کے لیے بے دخل کر دیا تھا۔ اس میں تعجب نہیں کہ سنسر کا ضابطہ لازمی ہو گیا تاکہ دوسروں کا مضحکہ اڑانے، بے رحم نکتہ چینی اور واہیات اطوار کے ساتھ مظاہرہ کرنے کے رجحان کو دبا دیا جائے۔

چونکہ تھیٹر ایک ایسی مقبول عام سرگرمی ہے جسے ہر کوئی دیکھتا ہے، اس لیے بھرت نے بنیادی بات یہ کہی کہ اسے خود پر کچھ پابندیاں عائد کرنی چاہئیں چنانچہ وہ لکھتا ہے: "چونکہ ناٹک باپ اور بیٹا نیز



ساس اور بہو ساتھ ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں، لہٰذا احتیاطاً اسے چند باتوں سے احتراز کرنا چاہیے۔" اس امر کو ذہن کو مین رکھتے ہوئے بھرت نے ڈرامے سے متعلق اصولوں کا ایک ضابطہ تشکیل کیا جسے اس نے نٹیہ دھرم کا نام دیا۔ اسی ضابطے کے تحت اس نے مندرجہ ذیل پابندیوں پر عمل کرنے کی ہدایت کی:

• عورتوں کو محض ایک کپڑا (ایک وستر) پہنے یعنی بہت ہی ناکافی لباس (اپورت) میں نہیں دکھایا جانا چاہیے۔ اسٹیج پر انہیں غسل کرتے، سنگار کرتے، کنگھی چوٹی کرتے یا پلنگ پر چڑھتے ہوئے دکھانے سے احتراز کرنا چاہیے۔

اسٹیج پر انہیں سوتے ہوئے بھی نہیں دکھایا جانا چاہیے۔ اگر مجبوری میں کسی کو تنہا یا دوسرے کے ساتھ بستر پر لیٹا دکھایا جانا ضروری ہو تو بوس و کنار، ہم آغوشی کسی طرح کا بھی عمل جیسے ناخنوں سے کاٹنا، کمر و نچلا لیوس کے بند ڈھیلے کرنا نیز چھاتیوں اور لبوں کی نمائش نہ دکھائے جائیں۔ خورد و نوش، پانی میں اچھل کود یا کوئی اور بے حیائی (لجا کرم) اسٹیج پر نہیں پیش کی جانی چاہیے۔

"لجا کرم" ایک بہت ہی وسیع اصطلاح ہے جو ہر قسم کی بد حجابی اور فحاشی پر محیط ہے۔ اخلاقی اور جمالیاتی وجوہ پر بھرت نے ہر طرح کی ناشائستگی کو ناپسند کیا۔ اس نے اسٹیج پر جنگ یا موت کے مظاہرے سے بھی اجتناب کیا۔ الغرض وہ جنس اور تشدد کے بیجا اور اعلانیہ مظاہرے یا سوانگ کے بالکل خلاف تھا۔

تاہم اس کے امتناعی ضوابط، شاہی فرمانوں اور سرکاری قواعد پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ یہاں تک کہ سنسکرت کے کلاسیکی ڈراما نگار بھی ان میں سے کئی احکامات اور اصولوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے۔ سنسکرت کے عظیم ڈراما نگار کالیداس نے خود اپنے ڈرامے مالویکا گنی متر کی ایک خوبرو ہیروئن مالویکا کو اسٹیج پر نیم عریاں لباس میں پیش کیا ہے۔ رقص کے ایک مقابلے میں بھی حضرات ناٹک انام مالویکا کے رقص کرتے ہوئے بدن کی دلربا حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ جس کے لیے "الخوش" کا معقول لباس پہننا ایک رکاوٹ خیال کیا۔ سین بیتا تو راجا اگنی متر حسین و جمیل مالویکا کا کم سے کم لباس میں نظارہ کر کے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے لیکن اصل میں یہ پورا منظر ناظرین کے دل بہلا دینے کی خاطر ہوتا ہے۔ کاربور منجری نامی ڈرامے میں جس کا مصنف راج شیکھر ہے تنتر کا عظیم ماہر آچاریہ بھیرو نند اپنی طلسماتی طاقت سے ہیروئن کاربور منجری کو عین غسل خانے سے، جبکہ گیلے کپڑے اس کے خوبصورت بدن سے چپک رہے ہوتے ہیں اور اس کا انگ انگ ان میں جھلک رہا ہوتا ہے، اسٹیج پر لے آتا ہے۔ ایسی کتنی ہی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

بھان نام کے سنسکرت میں یک بابی ڈراموں کی ایک بڑی تعداد اپنی شرارت آمیز شہوت پرستی کے لیے معروف ہے۔ ان ڈراموں میں بالاخانوں کے رنگین تجربوں کا ذکر ہے جس سے جملہ امتناعی احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ متعدد سماجی ریت رواجوں کا مضحکہ اڑانے والے سنسکرت میں لکھے گئے استہزائی سوانگ بھی یکساں طور پر دلچسپ ہیں۔

منو اور چانکیہ جیسے قانون سازوں کے مرتبہ سنسر کے ضابطوں، نیز بھرت جیسے ڈراما نگاروں کے بنائے ہوئے ڈرامے سے متعلق اصولوں کے باوجود، تھیٹر مختلف ادوار میں اپنے ناظرین کو شرارت آمیز شہوت پرستی، قابل اعتراض ظرافت اور پر لطف مذاق سے محظوظ کرتا رہا ہے۔

سنجے کرشن داس

# شا ولیس کے کمپنی امور — ایک جائزہ

دو ڈھائی برس پہلے ایک خاص تجارتی حلقوں میں کافی زور دار چرچا کا موضوع رہا تھا، اور اس کی گونج آج بھی باقی ہے۔ ۱۹۸۴ء کے وسط میں جب شری منوہر راجہ رام چھابڑیا نے شری آر۔ پی۔ گوئنکا کے ساتھ مل کر ڈنلپ انڈیا کے سلسلے میں ایک سودا کیا تھا تو کافی قیاس آرائیاں ہوئی تھیں اور کئی لوگوں کی ابرو پر بل بھی پڑ گئے تھے۔ خاص طور پر شری منوہر کے پس منظر کے سلسلے میں سوالات اٹھائے گئے تھے۔ لیکن تمام خدشات وقیاسات کا سلسلہ یہ حقیقت سامنے آتے ہی ختم ہو گیا تھا کہ شری منوہر دراصل دبئی میں مقیم ایک ہندوستانی تاجر ہیں اور خلیجی علاقے میں وہ جاپان کی سونی کمپنی کے سول ایجنٹ ہیں۔

اس کے بعد گورڈن ووڈرون انڈیا کے سامنے آتے ہی صورت حال خاصی بدل گئی، اور شری چھابڑیا کی جرأت بھی بڑھ گئی، انھوں نے انگلینڈ کی کے۔ جی۔ شا کمپنی پر قبضہ کرلیا۔ اس کمپنی کی اگر کوئی خصوصیت تھی تو صرف یہ کہ کلکتہ کی شا۔ ولیس اینڈ کمپنی میں اس کے ۲۷.۳۸۶ فی صد حصے تھے۔ سارے ڈرامے کی شروعات دراصل یہیں سے ہوئی، اور اس کا ڈراپ سین ۲۹ر نومبر ۸۶ء کو ہی ہو سکا، اور وہ بھی اس وقت جب کہ حکومت نے عملاً شا۔ ولیس اینڈ کمپنی کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

۱۹۸۴ء کے وسط میں جب شا۔ ولیس تحویل میں لیے جانے کے امکانات کے بارے میں خبریں انگلستان کے اخبارات میں شائع ہوئیں، تب کمپنی کے (اس وقت) چیرمین شری ایس۔ پی۔ آچاریہ نے ان کی تردید ہی کی تھی۔

اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شری آچاریہ نے کمپنی کی کچھ املاک کو ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں کمپنی کی ممتاز حصہ دار ملیشیائی ڈرنی بربارڈ کے دباؤ کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ یہ بات بھی مستند ہے کہ شری آچاریہ نے ۲۰ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو کمپنی کی سالانہ عام میٹنگ میں کسی بھی حصہ داروں سے کہا تھا کہ ان کے پاس اس امر کی کوئی مصدقہ اطلاع نہیں ہے کہ شا ولیس میں آر۔ جی۔ شا کے حصے خریدے گئے ہیں۔



بعد ازاں ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو اس تصدیق کے بعد کہ ممکن ہے کہ اب سائم ڈرنی اپنی کچھ غیر ملکی املاک کو ٹھکانے لگائے، شری آچاریہ نے امریکہ کے غذائی اشیا کے بڑے تاجر نوبیسکو کے توسط سے آر۔ جی۔ شا کے حصص خریدنے کی ایک جوابی کوشش کی۔ شری چھابڑیا نے اس کارروائی کے خلاف فوری ردعمل کا اظہار کیا اور اپنی پہلی بولی کی رقم دو کروڑ ۳۵ لاکھ ڈالر سے بڑھا کر ۲ کروڑ ۶۱ لاکھ ۸۰ ہزار ڈالر کردی، اور بالآخر ۱۹۸۵ء میں وہ یہ سودا کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔

اب شری چھابڑیا کی حکمت عملی یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح شا و ولیس کے بورڈ میں داخل ہوا جائے، اور اس سلسلے میں کوئی ہنگامہ نہ ہونے پائے، لہٰذا انھوں نے شری آچاریہ سے ملاقات کے لیے بالواسطہ طور پر خفیہ سلسلہ جنبانی شروع کردی۔ لیکن شری آچاریہ نے نہ صرف اس قسم کی ترغیبات کو مسترد کیا بلکہ کمپنی لا بورڈ میں کھلے عام یہ الزام بھی لگایا کہ یونائیٹڈ بریوریز کے مسٹر وجے ملیا، جو ملک میں شراب کی پیداوار کے بادشاہ سمجھے جاتے ہیں، دراصل انھوں نے ہی شری چھابڑیا کو دربردہ سرمایہ فراہم کیا ہے اور اصل خریدار وہی ہیں۔ کمپنی لا بورڈ نے فوری طور پر آر۔ جی۔ شا کے ووٹ دینے کے حق کو معطل کر دیا اور شا۔ ولیس کے بورڈ میں پہلے جیسی صورت حال کو برقرار رکھا اور یہ شرط لگادی کہ کسی بھی تبدیلی کے لیے حکومت کی پیشگی اجازت ضروری ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی کمپنی لا بورڈ نے یہ پتہ لگانے کے لیے تحقیقات بھی شروع کردی۔ کمپنی کے ان حصص کا اصلی مالک کون ہے، جو آر۔ جی۔ شا کے نام میں درج ہیں۔

شری چھابڑیا اور شری آچاریہ نے ایک دوسرے کے خلاف الزامات عاید کیے۔ شری چھابڑیا نے بورڈ میں متناسب نمائندگی کا مطالبہ کیا اور یہ دلیل پیش کی کہ شری آچاریہ جو کہ محض تنخواہ کے ساتھ ہیں، اور ان کے حصص کی تعداد ایک فی صد سے کم ہے، لہٰذا ان کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں کہ وہ انھیں (شری چھابڑیا) کو ان کے حقوق سے محروم کرسکیں۔ دوسری طرف شری آچاریہ کی جوابی دلیل یہ تھی کہ اپنی اجر کمپنی کے ایک ذمہ داری کی حیثیت سے ان کا یہ حق بھی ہے اور فرض بھی کہ وہ کمپنی کے مفادات کو اولیت دیں، انھوں نے سوال کیا کہ کیا آپ لوگ کسی انجان شخص کو کسی قسم کی تحقیقات کیے بغیر اپنے مکان کی چابی دیدیں گے؟

## کمپنی لا بورڈ کی رپورٹ

کمپنی لا بورڈ نے تحقیقات کے بعد اصولی طور پر کمپنی کے راز سے پردہ اٹھانے اور آر۔ جی۔ شا کے حصص کے اصل مالک کا پتہ چلانے سے انکار کردیا۔ بورڈ نے اس امر کا اعادہ کیا کہ اسے صرف آر۔ جی۔ شا کے نام میں منتقل ہونے والے حصص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ کمپنی لا بورڈ نے پورے معاملہ کا تصفیہ صرف ایک نکتہ پر کیا، اور وہ نکتہ تھا حصص کی اصل منتقلی۔

بورڈ کے فیصلے کے مطابق کمپنی ایکٹ کی

۔۔۔ کے تحت کوئی کارروائی ضروری نہیں تھی اور یہ سفارش بھی کی گئی کہ زیادہ سے زیادہ معاملات کو جرمانہ وغیرہ لے کر رفع دفع کیا جائے۔ اس طرح اس رپورٹ سے شری چھابڑیا کو تنگی کی ستم ریزی گئی اور آر۔ جی۔ شا کے حصص کے ووٹ دینے کے حق پر سے پابندی ہٹا لی گئی۔ اس حکمنامے میں یہ بھی کہا گیا کہ حصص کی منتقلی میں اہم دارے مخالف قانون اور غیر ملکی زرِ مبادلہ سے متعلق قانون کی کوئی خلاف ورزی ہوئی تو متعلقہ اداروں کو اس کے خلاف کارروائی کرنی چاہیے۔

## ملیا کی وابستگی

ایک جانب شری چھابڑیا نے اس بات سے انکار کیا تھا کہ حصص کی منتقلی میں مسٹر ملیا کا کوئی دخل تھا، لیکن انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ ابتداء میں جب سائم ڈربی نے اپنے حصص فروخت کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی تب ضرور مسٹر ملیا نے اس معاملے میں دلچسپی لی تھی۔ شری چھابڑیا نے اس امر کا اعادہ کیا تھا کہ انھوں نے حصص تن تنہا اپنے سرمایے سے خریدے تھے، انھوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار بھی کیا تھا کہ انھیں محض نام کی خریدار سمجھا گیا۔

تاہم شری آچاریہ کو شری چھابڑیا کی معصومیت کا یقین نہیں تھا۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ ان کے پاس ایک ایسا خط موجود ہے جو مسٹر ملیا نے فیلپس اینڈ کمپنی کے کسی مسٹر ایچ۔ یل۔ بھگت کو لکھا ہے نیز اس کمپنی کا تعلق یونائیٹڈ بریوریز گروپ سے ہے، اور اس طرح مسٹر ملیا کا اس معاملے سے تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ فیلپس اینڈ کمپنی کی سالانہ عام میٹنگ میں انھوں نے اس بات سے انکار کیا کہ ان کا کوئی تعلق آر۔ جی۔ شا یا شا ویلیس کے حصص کی خرید سے ہے۔

حسنِ اتفاق کہ ایسی صورتِ حال میں انفورسمنٹ ڈائرکٹوریٹ نے یونائیٹڈ بریوریز کی عمارت پر چھاپہ مارا، اور یہ چھاپے شا ویلیس کے سودے سے مسٹر ملیا کی وابستگی کے سلسلے میں ہی مارے گئے۔ کیوں کہ ان کا یہ تعلق غیر ملکی زرِ مبادلہ قانون کی خلاف ورزی سمجھا گیا۔ یہ الزام بھی لگایا گیا کہ دراصل سنگاپور میں ان کی کمپنی کی ایک ذیلی کمپنی کے ذریعہ سرمایہ اکٹھا کرنے کے معاملے میں یونائیٹڈ بریوریز نے ضمانت لی تھی، اور یہ سرمایہ بالآخر آر۔ جی۔ شا کے حصص کی

۔۔۔ خریداری کے سلسلے میں ۔۔۔ ملیا اور ان کی کمپنی یونائیٹڈ بریوریز کی ۔۔۔ کی تحقیقات میں یہ پایا گیا کہ ۔۔۔ جولائی ۱۹۸۳ء میں ایک سوداسٹیٹ بینک کے حق میں بھی کیا تھا اور دستاویزات پر ان کے دستخط بھی ثبت کی



تھی، تحقیقات سے یہ راز بھی منکشف ہوا تھا کہ اس سلسلے میں جو معاہدہ ہوا تھا اس میں ہیڈ آفس اور برانچ آفس کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا تھا جبکہ غیر ملکی زرِ مبادلہ قانون کے تحت کسی بھی ہندوستانی کمپنی پر یہ پابندی عائد ہوتی ہے کہ وہ بیرونِ ہند کسی کمپنی یا افراد کے لیے قرضوں کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ بین طور پر اس معاہدے سے ملیا اور چھابڑیا کا گٹھ جوڑ بے نقاب ہوا تھا۔

اس کے بعد انفورسمنٹ ڈائرکٹوریٹ نے اکتوبر ۱۹۸۶ء میں مسٹر ملیا کو الزام سے بری کرتے ہوئے ان پر چند تکنیکی خلاف ورزیوں اور ناسمجھی کی پاداش میں صرف پچاس ہزار روپے جرمانہ کیا تھا اور اس طرح واقعات کو ایک نیا رخ دیا تھا۔ بہرحال مسائل کم نہیں ہوئے کیوں کہ وزیرِ مالیات نے مسٹر ملیا کے خلاف معاملے کو از سرِ نو شروع کرنے کا حکم دیا۔ مسٹر ملیا نے اس ضمن میں کرناٹک ہائی کورٹ سے رجوع کیا اور تازہ کارروائی کے خلاف عبوری حکمِ امتناعی حاصل کر لیا۔ مشترکہ زمرہ کے باخبر لوگوں نے یہ خیال کیا کہ اگر مالیاتی اداروں نے اس سے قبل دسمبر ۱۹۸۶ء میں ہونے والی سالانہ میٹنگ میں مسٹر چھابڑیا کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا تو اب وہ اپنے اس فیصلے پر نظرِ ثانی کریں گے

## آچاریہ کی مہم

اسی اثنا میں شری چھابڑیا کے ذریعہ آر۔ جی۔ شا کے حصص کی خریداری کے معاملے میں کمپنی لا بورڈ کی کارروائی سے شری آچاریہ کو بہت صدمہ ہوا تھا، لہٰذا انھوں نے ایک نئی مہم کی تیاری کی تاکہ غیر ملک میں مقیم اس ہندوستانی شخص کو کمپنی سے دور رکھا جا سکے۔ نومبر ۱۹۸۵ء میں شا ویلیس کے ایک ڈائرکٹر اور شا ویلیس کی ایک ذیلی کمپنی تمل ناڈو کی کمپنی نے کلکتہ ہائی کورٹ میں ایسے ہی مقدمات دائر کیے اور کمپنی لا بورڈ کے فیصلے کو چیلنج کیا۔

جب قانونی کارروائی شروع ہوئی تو ۱۹۸۵ء میں ہونے والی سالانہ عام میٹنگ جو ۱۸ دسمبر کو ہونے والی تھی اور جس کا مقصد ریٹائر ہونے والے تین ڈائرکٹروں کی جگہ شری چھابڑیا کے لوگوں کو لانا تھا، اس میٹنگ کو عدالت کے حکم کے تحت ملتوی کرنا پڑا۔ جب مقدمے کو کافی دن گزر گئے تو شری چھابڑیا نے تعطل میں پڑے سبھی مقدمات کو سپریم کورٹ میں تبدیل کرا دیا۔ ان کی نئی حکمتِ عملی اب یہ تھی کہ خود مسٹر آچاریہ کو ہی ہٹا دیا جائے۔

شری چھابڑیا کی توقع کے مطابق سپریم کورٹ نے اگلے ہی دن یہ فیصلہ سنا دیا کہ سالانہ عام میٹنگ ایک نئے صدر کی صدارت میں ہوگی۔ عام میٹنگ کے لیے ۱۹ نومبر کی تاریخ مقرر ہوئی، اور افسروں کی میٹنگ اس کے دو دن بعد ہونا طے پائی۔

## آخری لڑائی

اب دونوں فریقوں کی لڑائی کا آخری دور شروع ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تنگ کرنے کیلئے حملے شروع کیے، اور دونوں نے حصے داروں کو متاثر کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ کمپنی کے حصہ داروں کی پوزیشن اس طرح تھی۔ آر۔ جی۔ شا ۲۸٫۳ فی صد، دیگر غیر مقیم ہندوستانی ۷٫۷ فی صد، آچاریہ گروپ بشمول ڈائرکٹرز، رشتہ دار، افسران اور ملازمین ۳ فی صد، سرکاری مالیاتی ادارے تقریباً ۳۴ فی صد، جنوبی ہند کا سماتا گروپ ۵٫۷ فی صد اور مختلف چھوٹے چھوٹے حصہ دار ۲۱٫۵ فی صد۔

سرکلروں کے ذریعے سے لڑائی شروع ہوئی جو کہ مشترکہ زمرہ کی جمہوریت کا ایک لازمی حصہ ہے بہرکیف کلکتہ ہائی کورٹ نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو چھابڑیا کو سرکلر جاری کرنے سے روک دیا۔

لیکن سپریم کورٹ نے ۶ر نومبر کو ایک فیصلہ دے کر متعلقہ فریقین کو سرکلر جاری کرنے کی اجازت دے دی اور اپنے اپنے نظریات کے حق میں مسالہ شائع کرنے کی بھی اجازت دے دی۔

۱۰ر نومبر کو شری آچاریہ کی قیادت میں کمپنی کی منتظمہ نے ۸۶-۱۹۸۵ء کے لیے ۵ء۲ فی صد منافع کا اعلان کیا، جس کا مقصد غالباً حصہ داروں کو متاثر کرنا تھا۔ اگرچہ کمپنی کی مالی حالت ایسے کسی منافع کی اجازت نہیں دیتی تھی، تاہم کمپنی نے اسٹاک ایکس چینج کے کئی ضابطوں کی خلاف ورزی کر کے یہ قدم اٹھایا۔ لیکن مسٹر آچاریہ کے اس اقدام کا اثر الٹا ہی ہوا۔

مالیاتی اداروں کے پسِ پردہ کردار کے سلسلے میں منوہر چھابڑیا کے بھائی کشری کے. آر. چھابڑیا نے ایک بیان میں کہا کہ:-

"اگر حکومت شاویلیس کمپنی میں
میری موجودگی کو پسند نہیں کرتی
تو اسے کھل کر کہنا چاہیے، میں اپنا
سرمایہ واپس نکال لوں گا، اور پھر
کبھی ہندوستان میں سرمایہ کاری
نہیں کروں گا۔"

انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ۲۱ فی صد چھوٹے موٹے حصوں کی شکل میں اپنی حصہ داری برقرار رکھنے میں یقین نہیں رکھتے، کیوں کہ اگر حکومت نہ چاہے تو ... فی صد حصص خریدنے کے بعد بھی وہ شاویلیس کمپنی کو اپنے کنٹرول میں نہیں لے سکیں گے۔ انھوں نے سوال کیا کہ "میں کس کے خلاف برسرِ پیکار ہوں؟"۔ اگر آچاریہ کے خلاف، تو میں کسی وقت بھی جیت سکتا ہوں، لیکن اگر میرا مقابلہ حکومت سے ہے تو میں لڑنا ہی نہیں چاہتا، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ میں حکومت کے خلاف نہیں لڑ سکتا۔ چھابڑیا بھائیوں نے یہ وضاحت بھی کی کہ وہ غیر مقیم ہندوستانی ہیں، غیر ملکی نہیں ہیں اور وہ ہندوستان کے کسی ضابطہ کو نظر انداز کرنے یا اس کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

۱۴ر نومبر کو کلکتہ ہائی کورٹ نے تیر پوری کمپنی کی درخواست مسترد کر دی، اس کمپنی نے ۳۱ر اکتوبر کے کمپنی لا بورڈ کے حکم کو چیلنج کیا تھا، یہ چھابڑیا بھائیوں کے لیے بڑی فتح تھی۔ اب حملہ کرنے کی چھابڑیا بھائیوں کی باری تھی ——— آر. جی. شا نے کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک حلف نامہ داخل کیا جس میں آچاریہ کی منتظمہ پر کمپنی کے مفاد کے خلاف اور ذاتی مفاد کے لیے کام کرنے کا الزام عاید کیا۔

کلکتہ ہائی کورٹ نے آر. جی. شا کا داخل کردہ پٹیشن منظور کر لیا، اور شاویلیس کمپنی بورڈ اور اس کے ذیلی اداروں کو کوئی بھی املاک فروخت کرنے سے روک دیا۔ اس کے علاوہ تقسیم کاروں یا سیل ایجنٹوں کے تقرر کے سلسلے میں بڑے فیصلے کرنے سے بھی روک دیا۔

ریاستی حکومت کے ساتھ ایک مقدمہ میں الجھ جانے کے بعد شاویلیس منتظمہ کو اور دھکا پہنچا۔ یہ مقدمہ تقریباً ایک کروڑ روپے کی ٹیکس چوری سے متعلق تھا، خود آچاریہ پر بارہ ہزار روپے جرمانہ ہوا۔ کمپنی لا بورڈ نے بھی یہ محسوس کیا کہ آر. جی. شا کے لگائے گئے الزامات ابتدائی مقدمہ قایم کرنے کے لیے کافی وزن رکھتے تھے۔

بہرحال مشترکہ زمرے کے کچھ لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ املاک کو ٹھکانے لگانے کے اور بھی طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایسے طریقے مغربی ممالک میں رائج بھی ہیں، جن میں غلط سلط بیلنس شیٹ بنا کر داخل کرنا اور کمپنی کی املاک کو دوسری کمپنیوں کے نام منتقل کر دینا شامل تھا، تاکہ ان بیرونی لوگوں کے لیے اس کمپنی میں کوئی کشش نہ رہ جائے۔ جو کمپنی پر قبضہ جمانے کی نیت سے اس میں داخل ہونا چاہتے ہیں ——

## یوم حساب

آخر کار یوم حساب بھی آ پہونچا، دونوں خیموں کے مابین کشیدگی کے درمیان ۱۹، نومبر ۱۹۸۶ء کو سالانہ عام میٹنگ کے ایجنڈا میں شامل تمام امور کے بارے میں رائے شماری ہوئی۔ سپریم کورٹ کی جانب سے مقرر کردہ میٹنگ کے چیرمین جسٹس جی. سی. مترا نے اعلان کیا کہ نتائج کا اعلان ۲۵ر نومبر کو کیا جائے گا۔ اس طرح سسپنس چھ دن کے لیے اور بڑھ گیا۔ افسروں کی میٹنگیں ہوئیں ——— رائے شماری پُرامن ماحول میں ہوئی۔ دونوں فریق کا دارومدار بڑی حد تک مالیاتی اداروں پر تھا، اور مالیاتی اداروں نے اپنے موقف کے سلسلے میں کافی رازداری برتی تھی، قیاس آرائیاں جاری رہیں۔ مشترکہ زمرے میں عام خیال تھا کہ مالیاتی اداروں نے اس طرح اپنے حق رائے دہی کا استعمال کیا ہے کہ آچاریہ کی منتظمہ بھی قایم رہے، اور چھابڑیا کے کچھ لوگ بھی بورڈ میں شامل ہو جائیں۔ افواہ یہ تھی کہ ایسا اس لیے کیا گیا ہے تاکہ غیر مقیم ہندوستانیوں میں پیدا ہونے والے اس احساس کو ختم کیا جا سکے کہ حکومت صرف ان کے پیسے پر نظر رکھتی ہے، ان لوگوں کو کاروبار میں شریک کرنا نہیں چاہتی، یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ عدالتی کمرے کی لڑائی اب بورڈ کے اندر منتقل ہو جائے گی، اور کمپنی کے قیام سے سوویں سال میں کمپنی کے مستقبل کے بارے میں کئی تشویش ناک سوالات اٹھائے جائیں گے۔

مشترکہ زمرے کی اس طولانی جنگ کی معراج ۲۶ر نومبر کو سامنے آئی۔ مالیاتی اداروں نے شری آچاریہ اور چھابڑیا برادران دونوں ہی کو نکال باہر کیا تھا اور جس انداز سے ووٹ دیے گئے تھے اس سے یہ واضح تھا کہ درحقیقت حکومت نے کمپنی کی انتظامیہ اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ مالیاتی اداروں نے آچاریہ نواز تین ڈائریکٹروں کو ہٹانے کے لیے اپنے ووٹوں کا استعمال کیا تھا، اور ٹھیک اسی وقت ان کی جگہ چھابڑیا کے تجویز کردہ تین ناموں کو بھی مسترد کر دیا تھا۔ ان میں سے چار ——— مسٹر کے. این. آنتارامانی۔ مسٹر آر. ایم. موگھے۔ مسٹر جی. کے. بھیل اور مسٹر اے. کے. داس کا تعلق مالیاتی اداروں سے ہی تھا۔ باقی دو کے نام مسٹر سین گپتا اور مسٹر بی. کے. ملک تھے۔ سپریم کورٹ سے ان نئے تقررات کی توثیق ہونے تک آچاریہ کی قیادت میں بورڈ کو کام کرتے رہنا تھا۔

بہرحال مشترکہ زمرے سے متعلق حلقوں نے حکومت کی اس تحویل کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا، کیوں کہ ان کا کہنا ہے کہ حکومت کسی کمپنی کو اچھی طرح چلا نہیں پائی ہے۔ غالباً چھابڑیا اور شری آچاریہ کے خلاف اقتصادی ضابطوں کی خلاف ورزی کے الزامات نے ہی مالیاتی اداروں کو ان کا تختہ الٹنے کی ترغیب دی۔ ابھی ملیا کیس ختم نہیں ہوا ہے، اور دوسری جانب مشترکہ زمرے کے حلقے اس حالیہ فیصلے کے خلاف قانونی کارروائی کے امکانات پر برابر غور و خوض کر رہے ہیں، اس لیے ابھی اس ڈرامے کو ختم نہیں سمجھنا چاہیے۔ کسی وقت بھی یہ معاملہ ایک دفعہ پھر اخبارات کی شاہ سرخیوں میں جگہ پا سکتا ہے۔

# صارفین کے تحفظ کی تحریک

مرکزی حکومت نے صارفین کے مفاد کے قانون کا مسودہ بطور نمونہ تیار کیا ہے جو موجودہ قوانین کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے توقع یہ ہے کہ صارفین کے لیے یہ قانون واحد مؤثر ثابت ہوگا۔ پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس میں پیش کیے جانے والے اس بل کے سب صارفین کے حقوق کی حفاظت اور فروغ کے لیے صارفین کے تحفظ کی ایک کونسل کے علاوہ صارفین کے تحفظ کا ایک ڈائریکٹوریٹ قائم کیا جائے گا جو صارفین کی شکایات سنے گا اور قوانین کے نافذ کرنے اور متعلقہ معاملات کی چھان بین کے سلسلے میں ایک نگراں کی حیثیت حاصل ہوگا اور صارفین کے تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک فورم کا کردار ادا کرے گا۔ لیکن یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ مجوزہ قانون اس قدر کمزور ہے کہ اس کے تحت مجرم کو سزا دینا دشوار ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ سزا جو ایک مجرم کو دی جا سکے گی وہ ایسا جرمانہ ہوگا جو نقصان کی رقم کے علاوہ نقصان کی رقم کے بیس گنا پر مبنی ہوگا۔

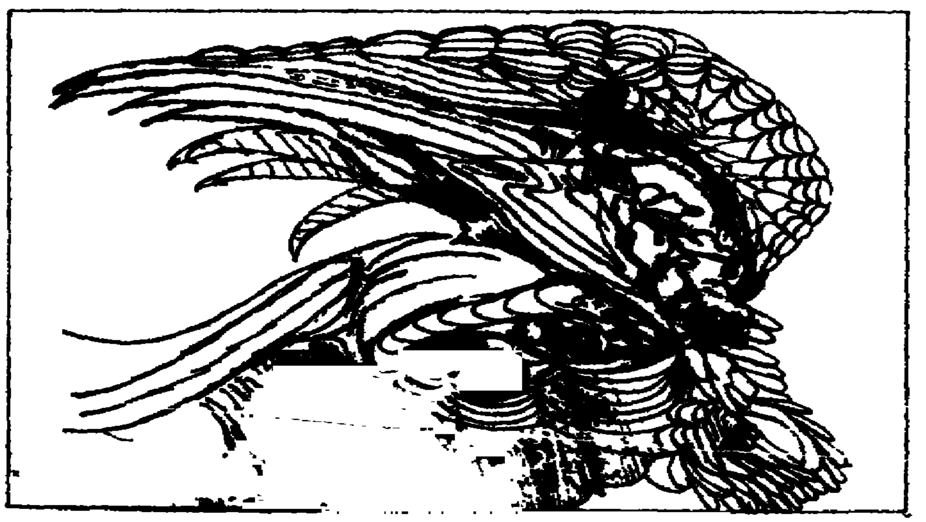
پورے ملک میں یکساں نفاذ کے اعتبار سے شاید یہ قانون تمام ریاستی حکومتوں کی طرف سے بھی لاگو کیا جائے اور ہر وہ قانون جو پہلے ہی سے کسی ریاست میں نافذ ہے، نئے قانون کے بعد منسوخ کر دیا جائے گا وزیر اعظم کے خیال کی روشنی میں صارفین کی تحریک رضاکارانہ ہونی چاہیے نہ کہ حکومتی مشاورتی کونسل برائے تحفظ صارفین نے حال ہی میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ صارفین کی تحریک کلی طور پر شہریوں کی ایک غیر سیاسی تحریک ہونا چاہیے جس میں عورتوں اور نوجوانوں کو شامل کیا جائے۔

ساتویں منصوبہ میں صارفین کے تحفظ کے پروگراموں کے لیے منصوبہ بندی کمیشن کی طرف سے پہلے ہی ایک کروڑ روپے کی منظوری دی گئی ہے لہذا ایک قانونی ادارے کی تشکیل ضروری ہے جو حکومت کو مشورہ دے گا اور ریاستوں میں قائم ہونے والے اس طرح کے دوسرے اداروں کی مدد سے صارفین کے تحفظ کے پروگراموں پر عمل درآمد کروائے گا۔

اس قانونی ادارے کی طرف سے صارفین کی ایک مضبوط تحریک کو ملک بھر میں پھیلانے کی غرض سے ہر طرح کی کوشش کی جائے گی جس کے لیے صارفین کی رضاکارانہ تنظیموں کی ترقی و توسیع کو اور اس کے علاوہ صارفین کے تحفظ کی تحریک کی مختلف سطحوں پر اور اس کے الگ الگ پہلوؤں پر تعلیم، تحقیق، تربیت اور معلوماتی نظام کے فروغ کے سلسلے میں تحریک دی جائے گی

بغیر چوں چرا قبول کر لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک پورے ملک میں ایسے سماج دشمن عناصر کے خلاف ایک ملک گیر تحریک شروع ہو چکی ہوتی۔ لوگوں کی قوت برداشت نے رضاکار اداروں کو بھی مفلوج کر دیا ہے معاشرہ کو یہ جان لینا چاہیے کہ صارفین کسی طرح بھی اشیا بنانے والوں سے سبقت نہیں لے سکتے جو کہ اپنی ایک بڑی لابی اور مضبوط ادارے رکھتے ہیں۔

خریدار کو خبردار رہنا چاہیے کہ ہر جگہ Caveat



حکومت نے چند چیزوں کے لیے جو عوام کی صحت اور تحفظ کے لیے اہم ہیں۔ آئی ایس آئی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا قانونی قرار دے دیا ہے۔ اس وقت تک ۹۷ اشیا ایسی ہیں جو اس قانونی سرٹیفکیٹ کے قانون کے تحت آتی ہیں۔ یہ تمام تدابیر ہندوستان میں تحریک مزاحمت صارفین کے ضمن میں ابھی تک آغازی دور میں ہیں یا بالکل ہیں ہی نہیں۔ معاشرہ ابھی تک ملاوٹ، گرانی اور قلت جیسے سنگین مسئلوں کو

Empton کی عملداری ہے جو ہر اعتبار سے صارفین کے تحفظ کے منافی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ صارفین کی سودا کرنے کی صلاحیت کمزور ہے اور ان کے موقف کو عملی طور پر پیش کرنے کے واسطے کوئی ادارہ بھی نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے لیے خود صارفین اور نام نہاد قانونی ضابطے ذمہ دار ہیں۔ اپنے آپ کو خوف و ہراس سے بچانے کے لیے صارفین لٹ جانے کی زحمت برداشت کرنا بہتر سمجھتے ہیں نہ کہ عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانا یا

ہیں۔ اس صورت میں اشیا بنانے والا ہر چیز کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور قانون دیکھتا رہ جاتا ہے۔ صارفین کی مدد اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے کوئی آگے نہیں بڑھتا۔

استعمال کی چیزوں، مثلاً کھانے پینے کا سامان، کپڑا اور دواؤں میں آپسی مقابلہ نہ ہونے کی صورت میں چیزوں کی تیاری صارفین کی ضرورتوں کے منافی ہے۔ آج مناسب قیمتوں کی نام نہاد دوکانیں بھی صارفین کو ٹھگ رہی ہیں۔ اکثر اچھے قسم کے چاول، گیہوں اور کھانے کے تیلوں کو جو حکومت کی طرف سے ان کو فراہم کیے جاتے ہیں گھٹیا قسم کی چیزوں سے بدل لیتے ہیں اور اس طرح اچھا پیسہ کماتے ہیں۔ ملاوٹ عروج پر ہے۔ وزن اور پیمانے ناقص ہیں جب کہ ملک اس بات کا دعویدار ہے کہ تجارتی بے ایمانیوں سے نپٹنے کے لیے بھی بڑے بڑے قانون بنائے جا چکے ہیں۔ لیکن ان قوانین کی تعمیل ایمانداری اور تندہی سے کام کرنے والے عملے کے نہ ہونے کی صورت میں سست ہو گئی ہے۔ ان حالات میں صارفین نے اس اصلاح ناقابل صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔

ہماری منصوبہ بندی کے کام میں سرمایہ داروں اور سامان بنانے والوں کے نظریات کو تو اہمیت دی جاتی ہے لیکن صارفین کی بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس میں غلطی منصوبہ بندی یا حکومت کی نہیں ہے۔ اس کے لیے خود لوگ ذمہ دار ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو ان اشیا بنانے والوں سے لڑنے کے لیے ایک اہم قوت کے طور پر منظم نہیں کیا ہے۔

عوام کے استعمال کی چیزوں کی ضمن میں حالت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ پبلک سیکٹر نے اپنی کارکردگی اور مستعدی کو بہتر بنائے بغیر مختلف سمتوں میں اپنے آپ کو بڑھاوا دیا ہے۔ ریلوے، بینکوں اور بجلی کے میدانوں میں بھی صارفین کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ شعبہ ٹیلی فون کی کارکردگی ابتری کی ایک اور مثال ہے۔ ملک میں صارفین کی ابتر حالت میں ستم ظریفی یہ ہے کہ پبلک سیکٹر M.R.T.P قانون کی بندش سے باہر ہے جب کہ اس کے کچھ حصے ٹی وی سیٹ، کپڑا، اسکوٹر، سیمنٹ اور دوسری استعمال کی چیزیں بنا رہے ہیں۔

یہ سب اس حقیقت کے باوجود ہو رہا ہے کہ ہندوستان میں صارفین کے تحفظ کے لیے پہلے ہی سے بہت سے قانون موجود ہیں۔ یہ قانونی شہ پارے یوں تو بہت متاثر کرتے ہیں جیسے وزن و پیمانوں کا معیاری قانون، دواؤں پر کنٹرول کا قانون (جس نے اب اپنی تجارتی عبارت وارنی اور اپنی شہرت کا قانون اور بہت سے ایسے کئی اور۔ لیکن صرف قانون ہی اس صورت حال کو بدلنے کے لیے کافی نہیں ہے، خاص طور پر اس صورت میں جب کہ اس کی تعمیل کے لیے کسی دیانت دار نظام کا فقدان ہو۔



بدقسمتی سے ہمارے سماجی کارکن سیاست کی طرف زیادہ راغب ہیں جہاں ان کو کام کرنے کے لیے وسیع اور فائدہ مند میدان ملتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر صارفین کا طبقہ ایسے سچی لگن رکھنے والے رہنماؤں سے محروم ہو جاتا ہے جو اس سماجی خدمت کو پوری طرح کریں۔ صارفین کی تعداد تیار کرنے والوں سے کہیں زیادہ ہے پھر بھی چیزوں کی پیداوار ضرورت اور قیمت کے سلسلے میں ان کی کوئی آواز نہیں ہے۔ استعمال کرنے والے کی آزادی برائے نام ہے وہ تو اس طرز عمل میں بے دست و پا ہے۔

اشیا بنانے والوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی کسی چیز کو کسی بھی طرح تیار کریں، اس کی تقسیم، تشہیر اور قیمت کا تعین کریں لیکن صارفین کے پاس سوائے ان اشیا کی خریداری کے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ حالانکہ یہ بھی درست ہے کہ اس قدر با اختیار دوچار رہتا ہے کیونکہ رد کرنے کا اختیار صارف کے پاس ہی ہے، جو عملی طور پر ایسا بالکل نہیں ہے۔ صارف اپنے حق کے استعمال سے ہمیشہ محروم ہی رہتا ہے۔ صارفین کی توجہ کا مرکز وہ مشہور برانڈ ہی رہتے ہیں جو شہری آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ہمارے دیہی علاقوں میں، صارف کی پسند ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور صارفین اپنے حقوق سے آگاہ بھی نہیں ہیں۔ اس کے برعکس مغرب میں صارفین اقتصادی ترقی کا ذریعہ بن کر ابھرے ہیں۔ اشیا اور خدمات کی وہاں کوئی کمی نہیں اور صارفیت کا بڑا مقصد لوگوں کو چیزوں اور خدمات کے آپسی مقابلے کی موجودگی میں ان کی خوبیوں کو ان پر آشکار کرنا ہے۔ یہ صارفین کے مجموعی نظریے کی نمائندگی کرتی ہے جو اشیا پیدا کرنے والوں کو اپنی ضرورتوں کا احساس دلاتے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں صارفیت کی جڑیں بہت گہری ہیں اور اس کا سہرا ان کی منظم کوششوں کے سر ہے۔

ضروری اشیائے صرف کی ملک میں کمی ہے۔ قیمتوں میں اضافہ سال بہ سال ہوتا ہی جا رہا ہے اور ان کے مستحکم ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ملاوٹ کا ہیولا ایک ایسے خطرناک جانور کی شکل اختیار کر چکا ہے جس کے مہلک پنجے تقریباً ہر صارف اور ہر چیز تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس لیے صارفین معذوری اور موت سے دوچار رہتے۔ قوانین جو ان معاملات سے نپٹنے کے لیے ہیں وقت کی بربادی اور اکتاہٹ کا باعث بنتے ہیں۔ اسی وجہ سے سماجی کارکنوں تک کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ چیزوں کی پرکھ کے لیے اچھی تجربہ گاہوں کا نہ ہونا اور قوانین کا بوجھل طریقہ کار بیشتر صارفین کو اس صورت حال کی اصلاح کرنے سے باز رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں تحریک صارفین کا زیادہ زور آغاز میں چیزوں کی فراہمی، خالص ہونا اور ضروری اشیا کی مناسب قیمت کے تعین کی جانب ہونا چاہیے چونکہ ہندوستان میں صارفین کی زیادہ اکثریت کو آمدنی اور خرچ کے بیچ توازن برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے صارفین کے مفادات کو بڑھاوا دینا آج اور بھی اہم ہو گیا ہے۔ دراصل ہندوستان میں صارفیت کے مفادات کے تئیں لوگوں میں احتجاج اور سپاہیانہ انداز کا جذبہ ہونا چاہیے۔ حکومت کو چاہیے کہ صارفیت کو ادارہ جاتی روپ دے تاکہ نہ صرف ایک مضبوط لابی اس کے حق میں پیدا ہو جائے بلکہ ان سماج دشمن سرگرمیوں کو بھی منظر عام پر لائے جو عوام پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

# لہو رنگ چنار مغلوں کا لازوال عطیہ

کرونا جواتے دیپ سنگھ

کشمیر فردوسِ ارضی ہے، مشرق کا وینس ہے۔ قدرت کی فیاضیوں اور برکتوں نے اسے ایک نادر روزگار خطۂ زمین بنا دیا ہے۔ اس کا حسن لازوال اور اس کا سحر بے مثال ہے۔ کشمیر حسن نظیر کے بے پناہ جادو، بے حد خداداد عنایتوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ خالق کائنات کی یہ نوازشیں وادیٔ کشمیر کے علاوہ شاید کرۂ ارض پر کہیں اور نظر نہیں آتی ہیں۔ خوب صورت چناروں کا حسن ہے آنکھ کو مسحور کر دیتا ہے۔ خاموش پُرسکون جھیلیں، شاہی مغل باغ اور ان میں جا بہ جا چناروں کے جھنڈ۔ یہ سب وادیٔ کشمیر کے لیے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چنار کا تعلق دراصل کھجور کے خاندان سے ہی ہے۔ یہ درخت اتنی کثیر تعداد میں کشمیر کے علاوہ غالبًا کہیں اور نہیں پائے جاتے۔ روایت ہے کہ مغل شہنشاہوں کے حکم سے کشمیر کے ہر گاؤں میں چناروں کے جھنڈ لگائے گئے تھے اور اس کا سہرا بڑی حد تک انسان دوست صوبیدار علی مردان خاں کے سر ہے۔ علی مردان خاں ۱۶۴۲ء سے ۱۶۵۷ء تک صوبۂ کشمیر کا حاکم رہا۔ تاہم کچھ ماہرین کی رائے یہ بھی ہے کہ وادی میں چناروں کے درخت مغلوں کے عمل دخل سے پہلے بھی موجود تھے لیکن پہلا نظریہ ہی اپنے دل چسپ پس منظر کے ساتھ دل کش رہا ہے اور درست تصور کیا جاتا ہے۔

چنار کا عظیم الشان، چھتنار درخت ایک شاندار چھتری کی طرح لوگوں کو دھوپ اور بارش میں پناہ دیتا ہے۔ اس معاملے میں کوئی دوسرا درخت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس طرح بدلتے موسموں میں چنار کا حسن نئے نئے رنگ اختیار کرتا ہے، اسی طرح اس کی افادیت بھی ہر شخص کے لیے الگ ہے، مثلاً ایک عام کشمیری کو صرف یہ انتظار رہتا ہے کہ چنار کے پتّے خشک ہو کر جھڑیں اور وہ انھیں جلا کر ہاتھ تاپے یا بطور ایندھن استعمال کرے۔ لیکن دوسری جانب ان ہی خشک پتیوں کی چرچراہٹ چرنوں کے لیے کچھ اور ہی معنی رکھتی ہے۔ جوان پر پھد کتے وقت خوشی سے پھولی نہیں سماتی ہیں۔ چنار کا موثر وجود باشعور لوگوں کے لیے فکر انگیز ہے اور انھیں تخلیق کی تحریک دیتا ہے، اور مغلوں کا تو ذکر ہی کیا، وہ تو چنار کے ایسے عاشق تھے۔ اس کے حسن کے ایسے گرویدہ تھے کہ دور دراز ایران سے لا کر ان درختوں کو یہاں لگایا، اور آج پھلنے پھولنے کے بعد بھی چناروں کے جھنڈ وادی کا زیور ہیں، اس کے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں اور مغلوں کے اعلیٰ ذوق کے آئینہ دار ہیں۔

نشاط باغ جہانگیر کے دورۂ کشمیر کے بعد اس کے حکم خاص سے لگایا گیا تھا۔ اس باغ میں اور شالیمار باغ میں چناروں کی بہترین قسم موجود ہے۔ استھاودل کی مغربی جانب چناروں کا ایک ایسا جھنڈ آج بھی موجود ہے، جس کے بارے میں روایت ہے کہ اسے شہنشاہ اکبر نے لگایا تھا۔ یہ نسیم باغ کے نام سے موسوم ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہاں پہلے بارہ سو درخت تھے، مگر اب یہ تعداد بہت کم ہو گئی ہے اور بہت سے درختوں کا شباب ڈھل چکا ہے، تاہم بیج بہارا میں ان درختوں کی کثیر تعداد آج بھی موجود ہے۔ مغلوں کے لگائے شاہی باغ کی بربادی کے بعد اس کے آثار میں بھی اب صرف چناروں کی طویل قطاریں ہی باقی رہ گئی ہیں۔

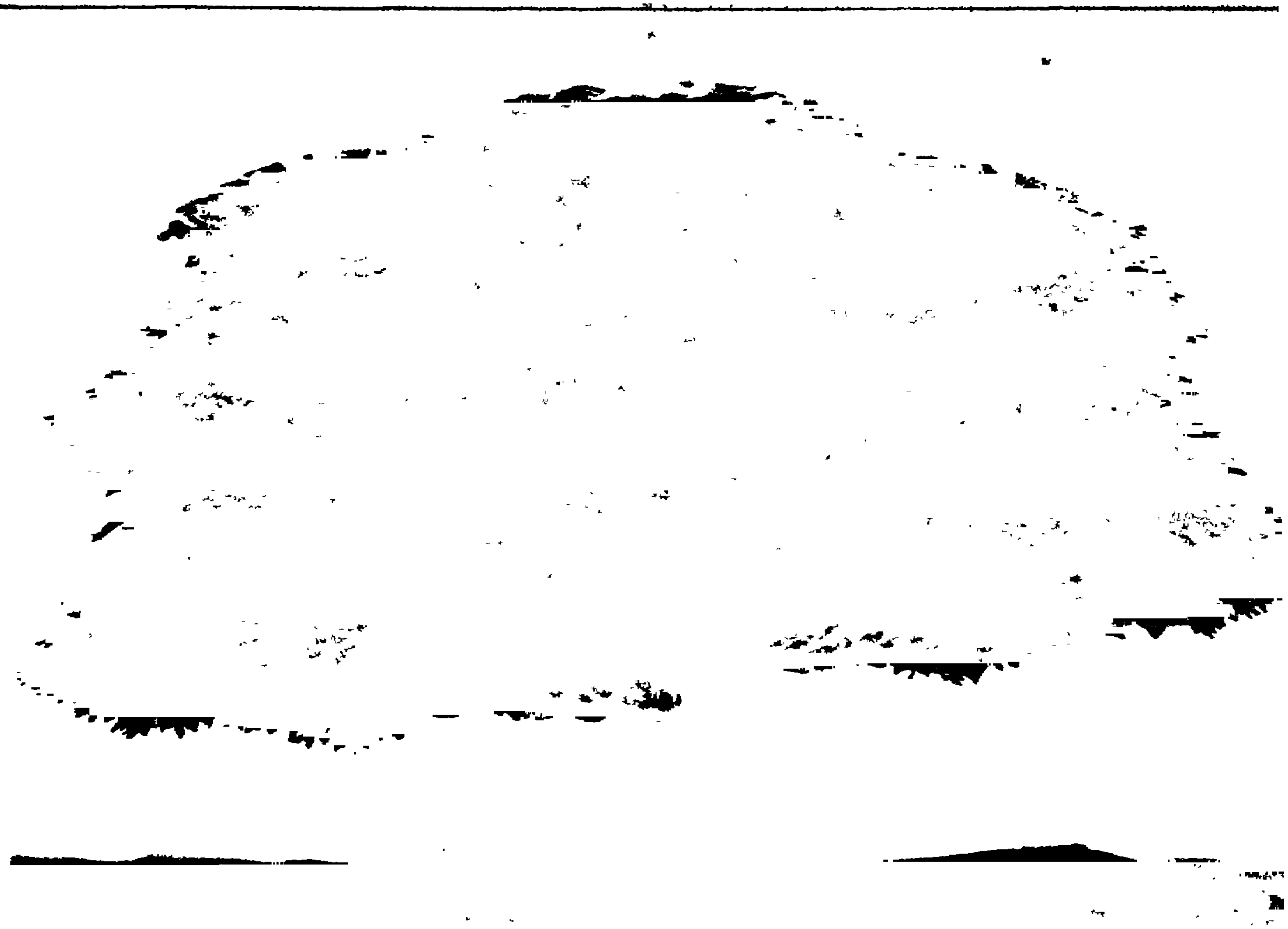
چنار اگرچہ پورے سال ہی حسین معلوم ہوتا ہے، تاہم موسم خزاں کے دوران اس کی دلربائی کچھ اور ہی بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت پوری وادی موسم سرما کے خیر مقدم کی تیاری کر رہی ہوتی ہے اور ہر طرف سکون و خاموشی کا راج ہوتا ہے۔ دوسرے موسموں میں لہروں کے شور کی آماجگاہ بنی جھیلیں اور بارونق سڑکیں غیر معمولی طور پر خاموش بلکہ ویران نظر آنے لگتی ہیں، اور شام کے وقت ٹھنڈی ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی یہ احساس کرا دیتا ہے کہ موسم سرما اب زیادہ دور نہیں، اس فضا میں چناروں کے جھنڈ اور بھی شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی سنہری پتیاں خزاں کی ہلکی ہلکی دھوپ سے درخشاں و تابندہ نظر آتی ہیں، اس منظر کی رعنائی کسی کا بھی دل موہ سکتی ہے، لہٰذا یہ بات قطعًا حیرت ناک نہیں کہ خزاں کے موسم میں کشمیر اور خاص طور پر چناروں کے حسن کا نظارہ کرنا ہر سیاح کا خواب ہوتا ہے اسی لیے تو امریکی فلسفی و ادیب ہنری سنکلیئر نے لکھا ہے کہ:

"موسم گرما میں وادیٔ کشمیر میں کوئی
خاص بات ہی نہیں۔ خاص وقت
تو خزاں کا ہے جب چناروں کے
پتّے سنہرے ہو جاتے ہیں اور انھیں
کی کشش مجھے بار بار یہاں لاتی
ہے۔ یہاں کی فضا کا مجموعی اثر بڑا سحر
انگیز ہے اور یہی ماحول میری بہترین
تخلیقی قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔"

خزاں کے ختم ہوتے ہوتے چنار کے درخت برہنہ ہو جاتے ہیں، ان کا لباس اتر جاتا ہے اور پوری وادی کے ساتھ وہ بھی موسم سرما کی برف باری کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

## چہار سو جلوہ نما

کشمیر میں چنار ہر قدم پر جلوہ گر ہے۔ باغوں میں، شارعِ عام پر، گھروں کے اندر، لکڑی پر کی جانے والی خوب صورت نقاشی میں، کاغذی دستکاری میں، ہر جگہ چنار کی پتی ایسی مرکزی اہمیت کے ساتھ نظر آتی ہے کہ اسے زندگی سے جدا کیا ہی نہیں جا سکتا، چنار نے وادی کے عوام کی فنی و ثقافتی زندگی پر بھی گہرا اثر مرتب کیا ہے، چنار کی ایک ایک پتی آج کشمیر کی شناخت بن گئی ہے۔ اور صرف پتی ہی کیوں، اس درخت کی لکڑی عمارت سازی میں استعمال ہوتی ہے، اس سے فرنیچر تیار ہوتا ہے، دروازے بنتے ہیں۔ لیکن چنار کے درختوں کو کاٹنے پر پابندی عاید ہے اور اس تجرانے کو محفوظ رکھا جا رہا ہے۔



یہ تھا ہندوستان کی تاریخ زریں کی کچھ ایسی ہستیوں کا ذکر جن کا جمالیاتی ذوق اعلیٰ و ارفع تھا، اور فن، فطرت غرض ہر خوب صورت شے سے ان کی محبت بے مثال تھی۔ کچھ درختوں کی عمر دو سو سے تین سو برس تک ہے۔ یہ حقیقت اس یقین کو اور بھی پختہ کر دیتی ہے کہ یہ مغلوں کا ہی تحفہ ہے۔ چناروں کے درخت اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ یہ حسن فطرت کے متوالے مغلوں کی یادگار ہیں، بیش قیمت تحفہ ہیں جو انھوں نے قدرت کے خزانوں سے مالا مال اس سرزمین کے حسن و جمال میں اضافہ کرنے کے لیے عطا کیا تھا۔

اردو کے قدیم و جدید شعرا نے بھی چناروں کے حسن شعلہ فشاں کو اپنے شعروں میں پیش کیا ہے۔ استاد ذوقؔ نے تو اپنے دل کی آگ کو ابدی اظہار دینے کے لیے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ؎

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیرِ خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا

آج کے مشہور جدید شاعر، وادیٔ کشمیر کے چشم و چراغ حکیم منظور نے اپنے تازہ ترین مجموعۂ غزل کو "لہولس چنار" کا عنوان دیا ہے۔ ایک خاص استفہامیہ انداز میں، لہولس چناروں کی حقیقت کا اظہار انھوں نے ہوا ہی کی خاموش بیانی پہ چھوڑ دیا ہے ؎

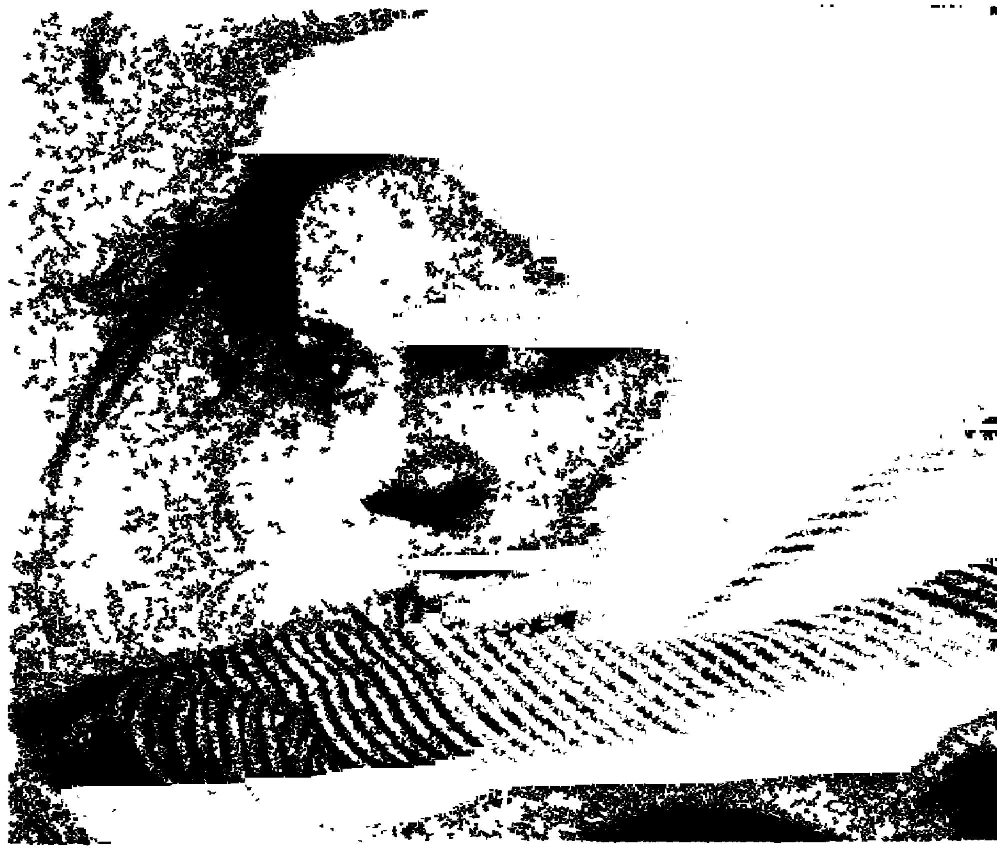
ہوا ہی نہ بولے تو میں کیا کہوں
لہولس ہوتے ہیں کیسے چنار

●

ایم۔ اے۔ سید

## سمیتا پاٹل

# "اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے"



عالم کی موت اگر عالم کی موت ہے، تو فن کار کی موت ایک عہد کی موت ہے۔ کسی اچھے فن کار کی موت کے ساتھ ایک دور کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سمیتا پاٹل ایک ایسی ہی فن کارہ تھی، اور اس کی موت بھی ایک ایسی ہی موت تھی۔ اس عظیم اداکارہ کی موت کے ساتھ ہی ایک شاندار دور ختم ہو گیا، ایک دور جس کی عمر صرف اکتیس ۳۱ برس تھی۔ اکتیس برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے؟ اتنے مختصر عرصے میں کوئی دور ختم نہیں ہوتا، عمر کی اس منزل میں پہونچ کر تو انسان کو اپنی شخصیت کی کچھ سوجھ بوجھ ہونا شروع ہوتی ہے ——— اب اگر اس مختصر سی عمر میں ہی کوئی ہستی بڑے بڑے کارنامے کر کے اچانک گزر جائے

جب ہر طرف اس کی شہرت و عظمت کے پرچم لہرانے لگے ہوں تو اس ہستی کو عظیم ہی کہا جائے گا، اور اس کے عہد کو ایک دور ہی ماننا پڑے گا۔ اکتیس سال کے مختصر عرصے میں ہی ایک دور شروع ہوا، اسے عروج کو پہونچا اور ختم بھی ہو گیا

زندگی ذرا سی ہو اور کام بڑے بڑے ہوں تو انسان کی یاد ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ رہتی دنیا تک نہ سہی مدتوں تک لوگ اس کا نام ادب و احترام سے لیتے ہیں۔ سمیتا پاٹل بھی ایک ایسی ہی ہستی کا نام تھا، جس نے ذرا سی زندگی میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے اور مر کر بھی اپنے آپ کو امر کر گئی

انسان اور فن کار دونوں ہی روپوں میں وہ عظیم تھی بے مثال تھی۔ یہ باتیں بھلے ہی کسی کو مبالغہ معلوم ہوں، مگر ہیں بالکل سچ۔ سو فی صد سچ۔ اکتیس برس کی عمر کو پہونچ کر تو ہمارے سماج کی اکثریت، اپنے کیریر اور اپنی زندگی کی ابتدا ہی کر پاتے ہیں، اور ایک وہ تھی جو اسی سماج میں پیدا ہوئی، بچپن، جوانی گزاری اور زندگی کے صرف تین عشرے گزارنے کے بعد جب اس کا سورج غروب ہوا تو اپنے ملک ہی نہیں، دنیا بھر میں وہ اپنا نام کر چکی تھی، اور نام بھی ایسا ویسا نہیں بری شہرت نہیں بلکہ عزت کے ساتھ، وقار کے ساتھ۔

پیارا وجود تھا اس کا، بڑی مصروف زندگی تھی اس کی، اور مصروفیت بھی ایسی کہ اس کا سارا وقت یا تو اپنے فن کے لیے وقف تھا، یا انسانیت کی خدمت کے لیے۔ کچھ لوگ اس سے متاثر تھے، کچھ اسے جی جان سے چاہتے تھے اور کچھ پر احسان تھا اس کا۔ سبھی سے کچھ نہ کچھ رشتہ تھا اس کا۔

موت کتنی ہی اٹل سچائی کیوں نہ ہو، اس پر ہمارا ایمان کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہو، مگر موت اگر اچانک آئے تو ہم بری طرح چونک ضرور ہیں۔ ہمیں آسانی سے



یقین نہیں آتا۔ سیتا پاٹل کی ناگہانی موت بھی ایسی ہی موت تھی۔ پہلے تو کسی کو اس پر یقین نہیں آیا، اور جب آیا تو پوری فلمی صنعت اُمڈ پڑی۔ اس دن ایسا ہجوم اور ایسا اجتماع دیکھنے میں آیا کہ گزشتہ دنوں چلتی فلمی صنعت کی ہڑتال اور مظاہروں کے دوران بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اتنے فلم والے غالباً کبھی بھی یکجا نہیں دیکھے گئے ہوں گے۔

## آغازِ سفر

سیتا پاٹل مہاراشٹرین تھی۔ اس کا جنم ایک علمی مراٹھا خاندان میں ہوا تھا۔ اس کے والد شری شیواجی راؤ پاٹل کانگریس کے ممتاز رہنماؤں میں سے ہیں، اور مہاراشٹر سرکار کے وزیر بھی رہ چکے ہیں۔

گھر کا ماحول سیاسی و سماجی قسم کا تھا۔ آنکھ کھولتے ہی سیتا نے عوام کے ساتھ ربط ضبط کے نظارے دیکھے۔ طرح طرح کے مسئلے لے کر آتے عام لوگوں کو دیکھا، اسی لیے شروع سے ہی خدمتِ خلق، اور سماجی خدمت کی عادت سی پڑ گئی تھی اُسے۔ سب کے ساتھ ہمدردی اور خاص طور پر غریبوں کے دکھوں کا احساس اس کے دل میں بچپن سے ہی جڑ پکڑ گیا تھا۔ ان ہی سب باتوں نے مل کر آگے چل کر سیتا پاٹل کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔

## خادمِ خلق

اسکول اور کالج کے دنوں میں بھی پڑھائی سے زیادہ اس کا دھیان خدمتِ خلق کے کاموں اور طالب علموں کی تحریکات میں رہتا تھا۔ عورت کے حقوق اور وقار کی فکر سیتا کو شروع ہی سے رہنے لگی تھی۔ یہی احساس آگے چل کر ایک حساس سماجی رضا کار کے روپ میں ڈھلا اور وہ فلاحِ عامہ کے کئی کاموں خصوصاً عورتوں کی ترقی کے لیے وقف کئی تنظیموں سے مستقلاً وابستہ ہو گئی تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اپنے فن سے جو بھی وقت بچتا تھا وہ سیتا نے خواتین کی بھلائی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ بمبئی کے مشہور ادارے 'ویمنز سینٹر' سے وہ باقاعدہ منسلک تھی۔

کچھ عرصہ قبل سیتا پاٹل دہلی آئی تھی، تب اس کے گرد، اس کے فن کے مداحوں سے زیادہ، دہلی کی سرگرم خواتین کی بھیڑ تھی، اور سیتا کی توجہ بھی زیادہ تر اُن ہی کی طرف تھی۔ یہی نہیں بلکہ اسے ان دہلی والیوں کے ساتھ گھلتے ملتے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ سب سے نام بہ نام متعارف ہو، فائیو اسٹار ہوٹل کے اس کمرے میں بحث کے موضوعات بھی فلمی نہیں تھے، بلکہ خواتین کے مختلف مسئلوں پر ہی محیط تھے۔ سیتا کے کھلتے مسکراتے چہرے سے ظاہر تھا کہ یہ سب اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سیتا پاٹل کی زندگی کے اس رُخ سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کے اندر رچی بسی اس کی روح میں قطعی ملی یہی حسیت اور بنی نوع انسان کے دکھ درد کا احساس اس کی فلموں میں بھی نظر آتا ہے۔ اس کا کیا ہوا کوئی کردار ایسا نہیں جس میں سماجی حسیت نہ ہو۔ تھوڑی بہت فکر نہ ہو۔ اور یہی وجہ تھی کہ اچھے رول، اچھے موضوع کی خاطر وہ کبھی پیسے کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔

## فنی سفر

سیتا پاٹل ابھی اسکول ہی میں تھی کہ اس کا رشتہ اداکاری کے ساتھ جڑ گیا تھا۔ پونہ فلم انسٹی ٹیوٹ کے طلباء کی ڈپلومہ فلم 'تیور مادھیم' سے اس نے اداکاری کا پہلا تجربہ کیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر جبار پٹیل کی فلم 'سامنا' میں ایک معمولی سا رول کیا۔ ابھی سیتا انٹر میں پڑھ رہی تھی کہ ہدایت کار شیام بینیگل نے اسے ٹیلیویژن پر خبریں پڑھتے دیکھا، شیام کی پارکھی نگاہوں نے اس سادہ، سانولی رنگت مگر تیکھے نقوش والی مراٹھی دوشیزہ میں چھپی صلاحیت کو آنک لیا، اور انھوں نے اُسے اپنی بچوں کی فلم 'چرن داس چور' میں ایک رول دے دیا، اس فلم میں بہت زیادہ گنجائش نہیں تھی مگر اس مختصر رول نے سیتا کے اسکرین ٹیسٹ کا کام کیا۔ (کالج کی تعلیم کے دوران ہی سیتا پاٹل نے ٹیلی ویژن پر ہندی اور مراٹھی میں خبریں پڑھنا شروع کر دیا تھا۔)

شیام بینیگل نے اپنی فلم 'نشانت' شروع کی تو سیتا پاٹل کو سائیڈ ہیروئن کا رول دیا۔ اب اس کی اصل صلاحیت سامنے آئی۔ 'نشانت' کے بعد 'منتھن' میں اسے ایک اور اہم رول ملا۔ صلاحیت کی گرہیں اور کھلیں۔ پھر آئی 'بھومیکا' اس میں وہ ہیروئن تھی، اس کی اعلیٰ پایہ کی اداکاری کے سبب یہ فلم آج تک سیتا پاٹل کی یادگار فلموں میں گنی جاتی ہے۔

یہ تمام فلمیں شیام بینیگل کی ہدایت میں بنی تھیں لوگ سیتا کو شیام کی ہیروئن کے طور پر ہی جانتے تھے۔ ان فلموں میں اس کے ساتھی فن کار بھی سب چوٹی کے تھے۔ نصیر الدین شاہ، شبانہ اعظمی، اننت ناگ، گریش کرناڈ اور امریش پوری۔ ایسے ماہر فن کاروں کی صحبت اور شیام بینیگل کی راہ نمائی، ان سب نے مل کر سیتا پاٹل کو بطور فن کارہ مانجھ دیا،

## عروج در عروج

[illegible]ب سیتا کے ایکٹنگ کیریئر کی باقاعدہ شروعات [illegible]ی مظفر علی نے اسے اپنی فلم 'گمن' میں لیا۔ [illegible]سب سے زیادہ شہرت ملی راجندر دھرتی کی فلم 'چکر' سے۔ اداکاری و کردار کشی کے اعتبار سے یہ سیتا کی بہترین فلموں میں سے ہے۔ اس فلم کے 'کھلے مناظر' نے اچھی خاصی بحث اور تنازعے کو جنم دیا۔ ایک طبقے نے اسے عریانی و بے حیائی کا مجسمہ سمجھا، تو دوسرے نے اسے سماج کی بیداری کی علامت قرار دیا۔ بحث جاری رہی اور سیتا سب سے لا پرواہ اپنا فنی سفر طے کرتی رہی۔ اس سفر کے دوران 'آکروشس' 'البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے'، 'بازار' اور 'اردھ ستیہ' اس کی قابل ذکر فلمیں رہیں۔ مہیش بھٹ کی تخلیق کردہ 'ارتھ' میں اس کے گلیمر سے بھرے اور 'بولڈ' کردار کو لے کر ایک مرتبہ پھر بحث شروع ہوگئی۔ اس کا اور شبانہ کا مقابلہ کیا گیا۔ 'ارتھ' میں دونوں کے متوازی کردار تھے۔ شیام بینیگل نے اسے ایک بار پھر اپنی فلم 'منڈی' میں موقع دیا۔ یہاں پھر شبانہ سے مقابلہ تھا۔ ساتھ میں نصیر الدین شاہ اور اوم پوری بھی تھے۔

سیتا کے فن کے قدر دانوں کا دائرہ صرف شیام بینیگل اور گووند نہلانی تک ہی محدود نہیں تھا۔ ستیہ جیت رے نے اسے اپنی ٹیلی فلم 'سدگتی' میں پیش کیا۔ بڑا مشکل اور گہرا کردار تھا۔ زبردست تعریف و توصیف بھی ہوئی۔ سیتا کی اور قابل ذکر فلمیں تھیں، 'بھوانی بھوائی' اور 'ترنگ' (ہدایت: کمار ساہنی) گزشتہ برسوں میں سیتا کی ایک اور اہم فلم آئی، 'مرچ'۔ ڈاکٹر جبار پٹیل کی ہدایت میں بنی اس فلم میں سیتا کی اعلیٰ کردار کشی کو زبردست داد ملی۔ اب اسی سال نمائش کے لیے پیش کی جانے والی سیتا کی ایک فلم ہے 'مرچ مسالہ' (یہ فلم حالیہ بین الاقوامی فلمی میلے میں دکھائی گئی ہے) اس فلم اور اس میں سیتا کی اداکاری کے چرچے ابھی تک گرم ہیں۔ فلموں کی اس فہرست سے ظاہر ہے کہ یہ سب فلمیں وہ ہیں جو 'آرٹ' یا متوازی سینما کے تحت آتی ہیں۔ اس میدان میں اپنا سکہ جمانے اور اپنی صلاحیت کا لوہا منوانے کے بعد اس نے متوازی سینما سے منسلک دوسرے فن کاروں، نصیر، شبانہ وغیرہ کی طرح تجارتی سینما میں بھی قسمت آزمانے کی ٹھانی۔ پہلی فلم تھی، 'مشکل' (امیتابھ بچن کے ساتھ)۔ اسی طرح آئی پاس آئی 'تجربہ'۔ مگر یہ تجربہ ناکام رہا۔ لیکن تجارتی سینما کے ہدایت کاروں کو سادہ [illegible] رنگ روپ والی اس اداکارہ میں نہ جانے کیا نظر آیا کہ [illegible] دھڑا دھڑ فلمیں ملنے لگیں جس سے سیٹ اپ اور [illegible] بڑھ گئی۔ اسی کے نتیجے میں 'نمک حلال'، 'حادثہ' 'پیٹ پیار اور پاپ' 'تیرا گھر میرے بچے' 'بدلے کی آگ' 'غلامی' 'آخر کیوں' 'دل ناداں' 'دل والا' [illegible] 'قسم پیدا کرنے والے کی' 'آنند اور آنند'، اور 'آج کی آواز' جیسی ان گنت فلمیں آئیں۔

## تجارتی میدان میں ناکام

یہاں سیتا سے ایک چوک ہوگئی۔ کردار اور موضوع کے انتخاب میں۔ اکثر فلمیں چالو بازاری تھیں سیتا جیسی فن کارہ کے لیے ان کے چوکھٹے میں گنجائش ہی نہیں تھی۔ اور جو ایک آدھ اچھی بھی تھیں ان میں بھی سیتا کے کرنے کو کچھ خاص نہیں تھا (مثلاً 'مشکل'، اور 'آج کی آواز')، پھر بھی تجارتی فلموں کی اس بھیڑ میں 'بھیگی پلکیں' 'درد کا رشتہ' اور 'امرت' جیسی فلموں میں اس نے صرف اپنی بھرپور اداکاری سے رنگ بھرا اور اپنی چھاپ چھوڑی۔ تجارتی فلموں میں اس کی آخری نمائش شدہ فلموں میں 'دہلیز'، 'انوکھا رشتہ'، اور 'انگارے' تھیں، لیکن باکس آفس پر ان تینوں ہی کا حشر اچھا نہیں ہوا۔ سیتا کی موت کے بعد 'انسانیت کے دشمن' کی نمائش ہوئی ہے جس میں سیتا پاٹل مہمان اداکارہ کے طور پر شامل ہے، اور اس کی فلم 'سوتر دھارا' اس کی یادگار کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ یہ فلم اگرچہ تجارتی اعتبار سے ناکام رہی ہے، لیکن اس امر سے سب نے اتفاق کیا ہے کہ اس فلم کی واحد خوبی سیتا پاٹل کی اداکاری ہے۔

## انعامات و اعزازات

سیتا چند فلموں میں بڑے ستاروں (مثلاً امیتابھ) کے ساتھ کھپ ضرور گئی، مگر منڈی میں بکنے والا 'ستارہ' وہ کبھی نہیں بن سکی، اور اس اعتبار سے اسے کامیاب تجارتی 'اسٹار' نہیں کہا جا سکتا، ہاں متوازی سینما کا "بڑا نام" وہ ضرور تھی، اور برسوں تک یاد کے طور پر یہی رہے گی۔ اس نے دولت چاہے کم کمائی ہو مگر شہرت اور نیک نامی خوب حاصل کی۔ تین قومی انعاموں کے علاوہ بے شمار دوسرے انعامات اور پدم شری کا خطاب اس عظیم فن کارہ کے فن کو ملک و قوم کا سلام سمجھنا چاہیے۔ یہی نہیں ۱۹۸۵ء میں فرانس میں سیتا کی فلموں کا ایک خاص میلا ہوا تھا، مغرب سے عالمی سطح پر ملنے والا یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو اس سے قبل کسی ہندوستانی فن کار کا مقدر نہیں بنا تھا۔

## مقناطیسی شخصیت

سیتا کی شخصیت بڑی عجیب سی تھی۔ عام پیمانوں کے حساب سے وہ نہ تو حسین تھی، نہ اس میں کسی بڑے اسٹار جیسا گلیمر تھا۔ زیادہ سے زیادہ اسے پرکشش کہا جا سکتا تھا، ہاں پردے پر وہ ہمیشہ اچھی لگتی تھی، اس کی غیر معمولی اسکرین پریزنس کی وجہ سے ملک کے ایک بڑے صحافی نے اسے "ایک سلگتے ہوئے مقناطیسی جسم" کا مالک کہا تھا، اور یہ بھی لکھا کہ شبانہ میں یہ بات نہیں، شاید یہی ان فلم کاروں کی بھی سوچ رہی ہو جنھوں نے سیتا کو ان کے

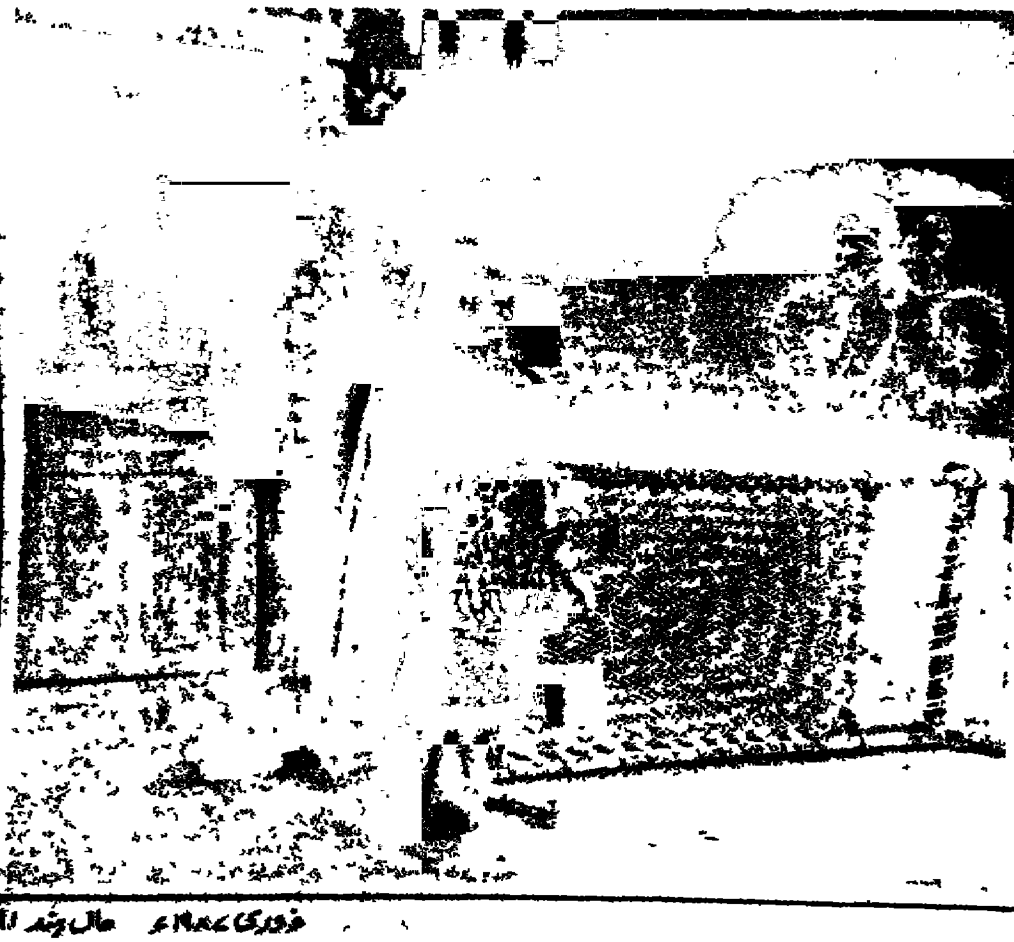
معمولی چہرے مہرے اور سادہ شخصیت کے باوجود) جسے چمک دمک بھرے روپ میں پیش کیا۔ مثلاً 'ارتھ' اور 'منڈی' میں، جب کہ ان ہی فلموں میں شبانہ اعظمی کو زیادہ سنجیدہ اور گلیمر سے عاری کردار دیے گئے تھے۔ ویسے سمیتا کے فن کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ان گلیمر بھرے رولز نے سمیتا سے لیا زیادہ اور دیا بہت کم۔ اس کی بے پناہ صلاحیت کا جوہر جو سیدھے سادے اور چمک دمک سے عاری کرداروں میں اجاگر ہوا تھا، وہ گلیمر رولوں میں ظاہر نہیں ہوا۔ مثلاً 'نشانت'، 'منتھن' اور 'چکر' ——— یہاں 'بھومیکا' والے کردار کا ذکر الگ سے کرنا پڑیگا، جس میں سمیتا نے ایک فلمی ہیروئن کا گلیمر بھرا کردار کیا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ اس کا کافی طاقت ور رول تھا۔ شاید اس کی بہترین کردار کشی کی مثال (دوسری مثالیں 'چکر'، 'صبح' اور 'سدگتی')۔

## ہدایت کار کی اداکارہ

یوں سمیتا کے اداکارانہ اسلوب کو چند فلموں کے دائرے میں محدود کر کے دیکھنے سے اس کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔ بے شمار سنگ میل ہیں، اس کے فنی سفر میں، اب اسے اتفاق کہیے یا کچھ اور کہ یہ تمام اچھے نمونے، آرٹ فلموں کے ہی ہیں، شاید اسی لیے سمیتا کو ہدایت کار کی اداکارہ کہا گیا تھا اس کے اندر کی صلاحیت کو کھینچ نکالنے کے لیے شیام بینیگل یا جبار پٹیل ہونا شرط تھا ——— بھارتی (کمرشیل) سینما کے ہدایت کار جو اکثر فن سے خود بھی واقف نہیں ہوتے، بہت کچھ اداکار کی اداؤں (مینرزم) پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ سمیتا پاٹل ان کے بس کی نہ تھی۔ یہاں ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بھارتی سینما میں سمیتا کی ناکامی کی ذمہ داری خود اس کے غلط انتخابات کے علاوہ اس کے کمرشیل ہدایت کاروں پر بھی رہی، جو اسے اپنی مٹھی میں باندھ نہیں سکے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سمیتا نے اپنے بہت سے ہم عصروں کی طرح کہیں سے بھی اداکاری کی کوئی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی تھی۔

لازوال کیا۔ 'منتھن' کی کچلی ہوئی، استحصال کے شکار طبقہ کی عورت ہو، 'بھومیکا' کی کامیاب ہیروئن 'نشانت' کی دیہاتی عورت، 'ترنگ' کی گھر کے مالک کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھنے والی گھریلو نوکرانی، 'البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے' کی لنگڑی بہن، 'منڈی' کی طوائف، 'آکروش' کی استحصال زدہ عورت، 'اردھ ستیہ' کی بیدار شہری لڑکی، 'بازار' کی مسلم باغی لڑکی، 'غمن' کی گھر میں بیٹھ کر شوہر کا انتظار کرنے والی مجبور عورت، 'ارتھ' کی دوسری عورت، 'صبح' کی باہمت خاتون، یا 'چکر' کی جھونپڑ پٹی میں رہنے والی، اپنی مفلسی، مجبوری کے دائروں میں قید اور اردگرد کے ماحول کے ہاتھوں کھلونا بنی رہنے والی نچلے سے بھی نچلے طبقے کی عورت ان سب کرداروں کے ساتھ سمیتا نے بھرپور انصاف کیا ہے، یہ سب کردار ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ بہر حال ان سب میں ایک چیز یکساں ہے،

سارے کرداروں میں ایک ایسی ہندوستانی عورت کا دل دھڑکتا ہے، جو حالات کے تحت کہیں استحصال کا شکار ہے تو کہیں مجبور۔ اس کے اندر بغاوت کی ایک آگ سلگ رہی ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ یہ آگ جوالا مکھی نہیں بنتی۔ یہ کہیں دلدل سے ابھر پانے میں کامیاب ہوتی ہے تو کہیں نہیں بھی، مگر جرأت اور حالات کو بدلنے کی خواہش کی کمی نہیں۔ عورت کے اس کردار کو ہم آج کی ہندوستانی عورت کی سچی تصویر کہہ سکتے ہیں اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مینا کماری نے ہندوستانی عورت کو جہاں چھوڑا تھا رکھا اسے کچھ آگے لائی تھی، مگر سمیتا اور شبانہ ہی نے اسے اگلی منزل تک کو جہاں چھوڑا تھا، رکھا اسے کچھ آگے لائی تھی، مگر سمیتا اور شبانہ ہی نے اسے اگلی منزل تک پہنچایا۔ یہ حقیقت تو تسلیم کرنی ہی پڑے گی کہ سمیتا نے شبانہ کی طرح جدید دور کی ہندوستانی عورت کو پردے پر مجسم کر دینے میں پوری کامیابی



## ہندوستانی عورت کی سچی تصویر

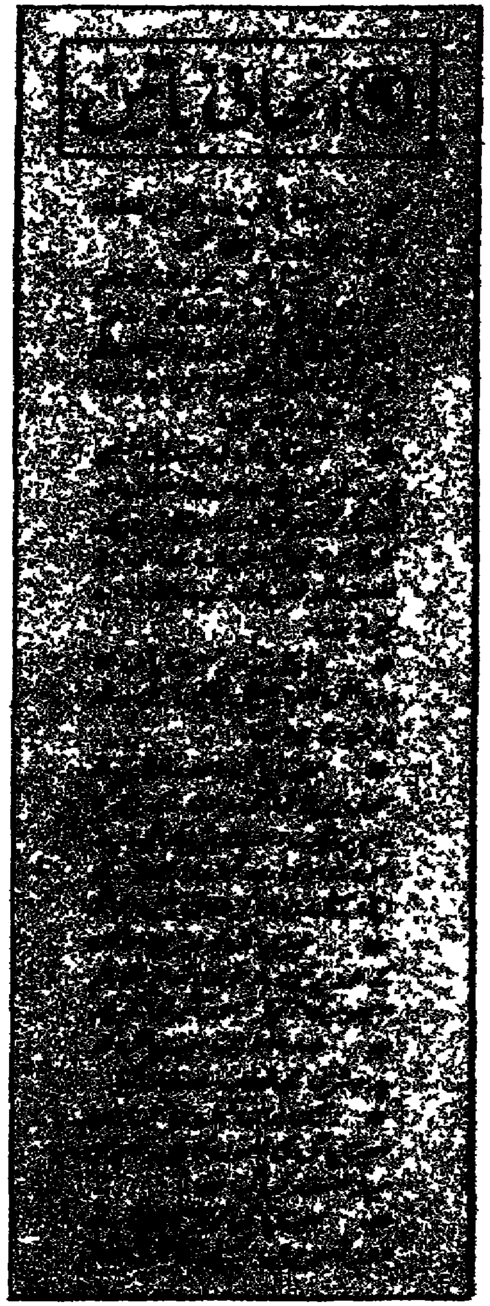
یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اپنی تمام تر محدودیت کے باوجود بھی ... کرداروں کو سچی کر دکھایا، کردار کشی کے ... نمونوں سے اپنی اداکاری کو

حاصل کی اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔

## سادہ زندگی

سمیتا کی ذاتی زندگی بڑی سادہ اور گلیمر سے پاک تھی، نہ کوئی شان و شوکت تھی، نہ بناؤ سنگار، شاید اسی لیے شیام بینیگل سے پہلے جب ششی کپور نے اسے اپنی کسی فلم کے لیے دیکھا اور جانچا تھا تو اس کی گھسی پٹی گھسائی جینس اور ڈھیلی ڈھالی قمیص کو دیکھ کر ہی اسے مسترد کر دیا تھا۔ اب یہ پتہ نہیں کہ بعد میں جب ششی کپور آرٹ فلموں کے مسیحا بنے، تب سمیتا کے بارے میں ان کی رائے کیا ہوگی تھی، اور یہی سمیتا بعد میں فلم والوں کو بڑی حسین اور پرکشش نظر آنے لگی تھی۔ سنیل دت تو سنا ہے کہ سمیتا پاٹل کو سب سے زیادہ پرکشش ہیروئن کہتے تھے، اور اسی کی وجہ سے مراٹھا حسن کے معترف ہو گئے تھے۔ ہاں تو ذکر تھا سمیتا کی ذاتی زندگی کا، وہ سچ مچ سادہ اور سیدھی سادی تھی، تنہائی میں اپنے آپ میں گم رہنے والی، بڑی خاموش پرسکون زندگی تھی اس کی۔ بس ایک دو جلوے ہی آتے تھے اس میں۔ مگر جب اس کی زندگی میں راج ببر داخل ہوا تو کافی ہلچل مچی، لیکن سمیتا پاٹل نے اپنے پردے کے کرداروں ہی کی طرح منہ نہیں چھپایا، بلکہ حالات کا سامنا کیا، دونوں کی شادی ہوئی، ایک بچہ بھی ہوا۔ مگر سمیتا کی اپنی زندگی مختصر تھی، اسے بچے کو بھی چھوڑ کر جانا پڑا۔ خدا نے

بلند و برتر سے دعا ہے کہ وہ اس حسین روح خلوت کی اس اکلوتی اولاد کو اپنی امان میں رکھے اور بڑا ہو کر یہ بچہ بھی مشتاقوں کی یاد کو اور چمکائے۔



## مقبول و ہر دل عزیز

اپنے اخلاق و عادات کی وجہ سے سمیتا پاٹل فلمی صنعت میں بہت مقبول تھی، تبھی تو سب آئے اس کے آخری سفر میں ساتھ دینے، صرف فلم والے ہی نہیں سیاستداں بھی، سماجی رضا کار بھی اور ہزاروں کی تعداد میں عوام بھی، اور تو اور سمیتا کی سوکن نادرہ بھی آئی، اور لوگوں نے اسے پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔

## عقیدت کے پھول

سمیتا پاٹل کی موت کوئی معمولی حادثہ نہیں تھی اس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم نے فوراً تعزیتی پیغامات بھیجے۔ وزیر اعظم نے سمیتا پاٹل کے والد کو سری نگر سے ٹیلی فون کر کے اظہار افسوس کیا تھا۔ صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ " ان کی موت سے فلمی دنیا میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔"

سمیتا کے سارے ساتھیوں اور ہدایت کاروں نے اسے زوردار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔

نصیرالدین شاہ نے کہا کہ " سمیتا ایک اچھی انسان تھی اور ایک اعلیٰ فن کارہ۔ دراصل ہم ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر ہی نہیں سکتے

اوم پوری نے کہا کہ " سمیتا کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس سے محبت کرنے والے ان اقدار کا تحفظ کریں جو سمیتا کو عزیز تھیں۔ "

شبانہ اعظمی نے کہا کہ " یوں، موازنہ کرنا مناسب نہیں ہوتا مگر یہ ناگزیر ہی تھا، خاص طور پر جب کہ دو افراد کے درمیان اتنا سب کچھ مشترک ہو، جیسا کہ میرے اور سمیتا کے درمیان تھا۔ ہم دونوں ایک جیسے کرداروں کی تمنا کرتے تھے، ہم دونوں ایک جیسی فلموں سے منسلک تھے۔ خواتین کے حقوق کے سلسلے میں شدید موقف تھا ہم دونوں کا، اور ہم دونوں ان کے تحفظ کے علمبردار تھے۔"

شیام بینیگل نے کہا کہ "اس کی بے وقت موت سے یقیناً ایک زبردست خلا پیدا ہوا ہے۔ سمیتا اور شبانہ نے ہندوستانی سینما میں عورت کی امیج کے سلسلے میں زبردست انقلاب پیدا کیا ہے اس نے ساری روایتوں کو توڑا تھا، روایتی معنوں میں وہ خوب صورت نہیں تھی، مگر اس کے اندر اچھا لگنے کی بڑی زبردست صلاحیت تھی۔"

دوسروں کی بات غور سے سنتی تھی اور مسلسل سنتی رہتی تھی۔ دوسرے ستاروں کی طرح غائب نہیں ہو جاتی تھی میں اس کو ہیروئن لیے بغیر فلم بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے درمیان بڑی ذہنی ہم آہنگی تھی۔"

صنعت باقی رہے گی، سمیتا پاٹل بھی زندہ رہے گی۔ اس کی ستر سے زائد فلمیں اس کی یاد کو تازہ رکھیں گی، اور آنے والی نسلیں سینما کی تاریخ میں پڑھیں گی کہ ایک اداکارہ تھی، سمیتا پاٹل، جس کی زندگی نے ساتھ نہیں دیا، ورنہ وہ سب سے اور بھی

## [illegible]

1. [illegible]
2. [illegible]
3. [illegible]
4. [illegible]
5. [illegible]
6. [illegible]
7. [illegible]
8. سوری کنسلائنٹ
9. آکروش
10. البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے
11. [illegible]
12. تھیسرہ
13. بازار
14. نمک حلال
15. بھیگی پلکیں
16. [illegible]
17. ارتھ
18. درد کا رشتہ
19. [illegible]
20. حادثہ
21. قیامت
22. اردو ستیہ
23. فرشتہ
24. [illegible]
25. [illegible]
26. آج کی آواز
27. [illegible]
28. بدلے کی آگ
29. [illegible]
30. میرا دوست میرا دشمن
31. [illegible]
32. [illegible]
33. [illegible]
34. [illegible]
35. ترنگا
36. [illegible]
37. کانچ کی دیوار
38. پیٹ پیار اور پاپ
39. میرا گھر میرے بچے
40. امرت
41. دل والا
42. غلامی
43. آپ کے ساتھ
44. قسم پیدا کرنے والے کی
45. مالی جانے خون
46. دہلیز
47. ہم دو ہمارے دو
48. انوکھا رشتہ
49. تیسرا کنارہ
50. انسانیت کے دشمن
51. سوتر دھار
52. مرچ مسالہ

## دوسری زبانوں میں

1. امبرٹھا (مراٹھی)
2. جیت رہے جیت (مراٹھی)
3. [illegible]
4. [illegible]
5. [illegible]
6. [illegible]
7. [illegible]
8. [illegible] (مراٹھی)
9. [illegible] (بنگالی)

## نمائش کے لیے تیار

1. تیرے شہر میں
2. عوام
3. نذرانہ
4. ٹھکانہ
5. وارث
6. گدھ
7. دیب شکھو
8. میرے ساتھ چل
9. گلیوں کا بادشاہ
10. انت

## نامکمل فلمیں

1. راہی
2. ڈانس ڈانس
3. ستم
4. شیر شیواجی
5. [illegible]
6. وشواس
7. سب سے بڑا پاپ
8. [illegible]
9. ہر گنا ہاتھ
10. آج
11. عداوت
12. ہم فرشتے نہیں

## ٹیلی فلم

- سدگتی

## ٹی۔وی سیریل

- ایجنسی

ساغر سرحدی نے ان الفاظ میں نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ "سمیتا پاٹل کا ذہن تازہ تھا، وہ نئے خیالات قبول کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھی، وہ

آئیے، ہم بھی ان حضرات کی آواز میں آواز ملا کر اپنے دور کی اس عظیم ترین فن کارہ کو خراج عقیدت پیش کریں۔ اس کے فن، اس کی صلاحیت کو سلام کریں۔ رہتی دنیا تک نام چلنے کی بات تو محاورہ ہے، مگر یہ سچ ہے کہ جب تک ہماری فلمی

کارنامے انجام دے جاتی۔

ہر بڑی ہستی کی موت کے بعد یہی کہا جاتا ہے کہ اس کی خالی جگہ اب کوئی نہیں بھر سکتا، مگر سمیتا کے بارے میں یہ بات شاید سب سے زیادہ سچ ہے۔

# گووند نہلانی

## ایک عکاس

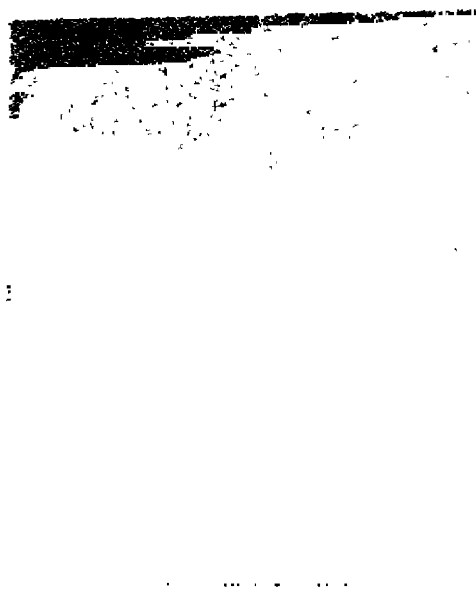
فرزانہ سید

گووند نہلانی کی فلم کاری اقبال اور جوش کی شاعری کی طرح ہے۔ اگر ٹیگور اور مہیش بھٹ کی فلمیں اچھی رومانی شاعری کا لطف دیتی ہیں تو گووند نہلانی کی فلموں میں پُرجوش، ولولہ انگیز نظم کا سا تیور ہے بغاوت اور برہمی کی ایک لہر لیے ہوتی ہے ان کی فلموں میں گووند کی فلمیں مسائل کی آئینہ دار محض ہی نہیں بلکہ ان، میں مسئلوں کے حل کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی ہوتا ہے ان کے کردار حالات سے شکست کھا کر مایوس نہیں ہوتے، بلکہ بھرپور احتجاج کرتے ہیں اور اپنی بساط بھر ہوا کا رخ پلٹنے کی کوشش بھی ضرور کرتے ہیں، کامیابی ملے نہ ملے، یہ الگ بات ہے۔ گووند کی حقیقت نگاری انھیں محض نعرے بازی اور کھوکھلی انقلابیت سے بھی روکتی ہے۔ اگر اشارے میں سماج کا تختہ پلٹ جائے تو پھر گووند کے متوازی سنیما اور عام تجارتی سنیما میں فرق ہی کہاں رہ جائے گا۔

گووند نہلانی نے ہندوستانی فلم کاری کو نئی راہ دکھائی ہے آٹھویں دہائی کی فلموں پر ان کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کی تقلید کی کوشش بھی کافی ہوئی ہے اگرچہ اس سعی میں کوئی کامیاب نہیں ہوا، نہ معیار کے اعتبار سے اور نہ نتائج کے حساب سے۔

گووند نہلانی نے بحیثیت ہدایت کار کل پانچ فلمیں بنائی ہیں — آکروش، وجیتا، اردھ ستیہ، پارٹی اور آگھات — آکروش، پہلی فلم تھی، ایک نئے انداز کی، اس کا زوردار خیر مقدم ہوا، خاص طور پر صحافتی و دانشور حلقوں میں۔ تجارتی محاذ پر بھی یہ فلم گھاٹے کا سودا ثابت نہیں ہوئی، اور اس طرح گووند اپنی پہلی ہی فلم سے صف اول کے فلم کاروں میں گنے جانے لگے۔

آکروش' کے لیے گووند کو ملک کا سب سے بڑا انعام' طلائی مور' ملا تو سرکاری حلقوں میں بھی گووند کا نام گردش کرنے لگا۔ ہندوستانی فضائیہ اپنے جشن زریں کے موقع پر ایک فلم بنوانا چاہتی تھی، اس کے لیے گووند نہلانی سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اب مسئلہ تھا فلم ساز کا۔ ششی کپور اس وقت تک 'جنون' اور 'کل یگ' جیسی فلمیں بنا کر اچھی فلموں کے فلم ساز کے طور پر اپنا سکہ جما چکے تھے، لہٰذا گووند کی نظر ان ہی پر ٹھہری۔



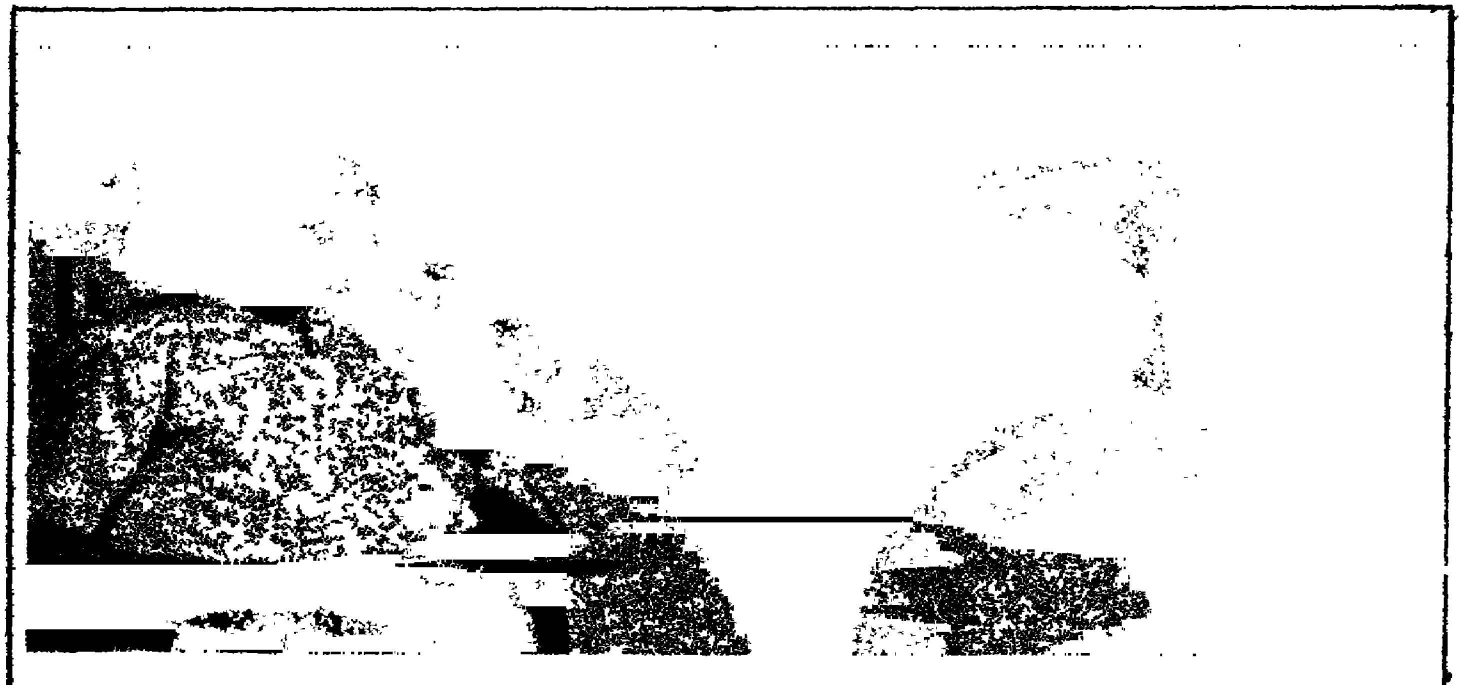
'وجیتا' بنی، اس کی نمائش بھی ہوئی، اگرچہ فلم تجارتی اعتبار سے سخت ناکام رہی، لیکن فضائیہ کے ماحول کی سچی تصویر کشی کی بنا پر یہ ایک یادگار فلم بن گئی۔ اعلیٰ حلقوں میں اسے خوب سراہا گیا۔

اس کے بعد آئی "اردھ ستیہ" یہ گووند نہلانی کی بہترین فلم ہے، فنی اعتبار سے بھی اور تجارتی اعتبار سے بھی۔ "اردھ ستیہ" نے ملک کے دانشور و تعلیم یافتہ حلقوں میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ اس فلم نے گووند کو ہندوستان میں متوازی وخشی سنیما کا مسیحا بنا دیا۔ کاروباری اعتبار سے اردھ ستیہ، کو غیر متوقع کامیابی ملی۔ اور آج تک یہ فلم منافع کا سودا مانی جاتی ہے۔

گووند کی چوتھی فلم 'پارٹی' تھی، مگر اس فلم کو تقسیم کار ہی نہیں ملا — اور یہی حال ان کی اگلی فلم 'آگھات' کا ہوا — بالآخر یہ دونوں فلمیں ٹی۔ وی پر دکھائی گئیں۔

اب گووند نہلانی ٹیلی ویژن کے لیے ایک سیریل 'تمس' (تاریکی) بنا رہے ہیں، نئے سال کے شروع میں یہ سیریل پیش کیا جانے لگے گا۔ (اس سیریل کا موضوع ملک کی تقسیم اور اس کے بعد کے حالات ہیں)

گووند نہلانی بنیادی طور پر عکاس ہیں، اور اس حیثیت سے انھوں نے اٹھارہ فلموں میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ ایک زمانے میں انھیں شیام بینیگل کا فوٹو گرافر کہا جاتا تھا، کیوں کہ وہ شیام کی ساری فلموں کے عکاس ہوا کرتے تھے۔ گووند کے فلموں تک پہنچنے کی کہانی بھی بہت دل چسپ ہے۔ ان کی پرورش اور تعلیم اودے پور میں ہوئی ہے۔ ان کے والد فلموں کے سخت خلاف تھے اور انھیں اپنے ساتھ لے جا کر صرف دھارمک فلمیں دکھاتے تھے، وہ بھی کبھی کبھی۔ گووند کا ایک رشتہ دار نوجوان فوٹو گرافر تھا، اس لیے گووند کو فوٹو گرافی سے دل چسپی ہو گئی تھی، ان ہی دنوں بنگلور کے ایک کالج کا اشتہار نکلا، جس سے گووند کو معلوم ہوا کہ وہاں سنیما کی عکاسی کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ مگر والد صاحب کی اجازت ملنے کا مرحلہ سب سے مشکل تھا۔ یہاں گووند کو ایک ایسے گورو سے مدد ملی، جس کی شاید وہ کبھی خواب میں بھی امید نہ کر سکتے ہوں گے۔ چوایہ کسان کے خاندان کے ایک دھرم گورو تھے، انھوں نے گووند کی جنم کنڈلی دیکھ کر حساب لگایا، اور گووند کے والد سے کہا



[illegible] گووند نے ... تو
ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کی، اور فلمی تربیت بھی مشہور
عکاس وی۔ کے۔ مورتی سے۔ بعد میں گووند نے
مختلف فلمی فوٹو گرافروں کے ساتھ کام کیا اور فلمی
عکاسی کے تمام پہلوؤں پر عبور حاصل کیا۔
شیام بینیگل کے ساتھ بطور عکاس طویل
وابستگی رہی تو گووند کو فلم کے مکمل میڈیم کو سمجھنے
کا موقع ملا۔ شیام کے یونٹ میں گووند کی حیثیت محض عکاس
کی نہ تھی، بلکہ وہ فلم کاری میں برابر کے شریک تھے۔
آہستہ آہستہ گووند کو یہ احساس ہونے لگا کہ اپنی
ذات کے اظہار کے لیے محض عکاسی کافی نہیں بلکہ
اپنی بات، اپنے ڈھنگ سے کہنے کے لیے مکمل فلم
بنانا ضروری ہے۔ انھیں ایک کہانی 'چھالی' بہت
پسند تھی اور وہ اس پر فلم بنانا چاہتے تھے، مگر یہ کہانی
وی۔ شانتارام نے خرید لی۔ (بعد میں انھوں نے
اسی نام سے فلم بھی بنائی)، اس کے بعد گووند نے
کسی شائع شدہ کہانی کی بجائے اصل اسکرپٹ
پر فلم بنانے کا تہیہ کیا۔
ان ہی دنوں ان کی ملاقات مشہور مراٹھی ادیب
وجے تندولکر سے ہوئی۔ کافی بحث و مباحثہ اور تبادلۂ

خیال سے متاثر ہو کر 'آکروش' کی کہانی وجود میں آئی۔ اس
کے بعد سے تندولکر اور گووند کی جوڑی مستقل ہی
ہو گئی ہے۔

گووند نہلانی کی فلموں کو سیاسی فلمیں کہا
جاتا ہے اور ان پر اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں۔
لیکن یہ درست نہیں، گووند کی فلمیں سیاسی فلمیں
نہیں ہیں، بلکہ موجودہ سماج، اس کے حالات اور
مسائل کی سچی دیانت دارانہ عکاس ہیں، ان فلموں نے
(اور خصوصاً آکروش اور اردھ ستیہ نے) ایک
نئے رجحان کو جنم دیا، جس کے تحت بہت سی فلمیں
سامنے آئی ہیں۔

گووند نہلانی کی پہلی فلم 'آکروش' وجے
تندولکر کی کہانی و منظرنامے پر مبنی تھی۔ قبائلی وادی یا ای
پس منظر میں۔ یہ ایک دور افتادہ چھوٹے سے قصبہ
نما شہر کی کہانی تھی۔ جہاں صرف چند با اثر اور دولتمند
افراد کی بالادستی ہے، غریب، کمزور اور مجبوروں کو جینے کا
حق ہی نہیں، وہ صرف استحصال کے لیے ہیں۔ آکروش کا
ہیرو (اوم پوری) ان حالات کے خلاف جنگ تو نہیں کر سکتا۔
لیکن احتجاج ضرور کرتا ہے، خاموش احتجاج۔ اس کی
بیوی کی عصمت دری کی جاتی ہے، پھر قتل کر دیا جاتا ہے
اور اس قتل کا الزام خود اسی کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔ اسے
یقین ہے کہ وہ سماج کے ان ظالموں کے خلاف کچھ نہیں کر
سکتا، لیکن خاموشی سے احتجاج کرنا اس کے بس میں
ہے، اور اس کی بے بسی اس حد تک پہونچتی ہے کہ وہ
احتجاجاً اپنا دفاع بھی نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو سماج کے جبر
کی چوکھٹ پر قربان کر دیتا ہے۔

'اردھ ستیہ' بھی تندولکر کی ہی کہانی ہے۔ یہ
'آکروش' کے بعد کا سفر ہے۔ 'آکروش' میں بے بسی
ہے، خاموش احتجاج ہے۔ اور اردھ ستیہ میں
جذبۂ انتقام ہے، جو ظالم کے ظلم و جبر کا جواب جوں
کا توں دینا چاہتا ہے، ہیرو (اوم پوری) سماج
کی ناانصافی اور بدعنوانی کے خلاف سینہ سپر ہونا چاہتا
ہے، لیکن وہ خود اسی سڑے گلے نظام کا حصہ ہے اور
اسے قدم قدم پر سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں مگر فساد
بربری کا آتش فشاں اس کے سینے میں پرورش پاتا
رہتا ہے اور ایک دن یہ آتش فشاں پھٹ
پڑتا ہے، اپنی ساری آگ اگل دیتا ہے۔ یہاں
یہ خیال کرنا ضروری نہیں کہ مسائل کا حل یہی ہے،
یا درست طریقۂ کار یہی ہے جو گووند نہلانی کے ہیرو
نے اختیار کیا لیکن یہ رویہ ایک بے بس انسان کا

پیش کیا گیا ہے۔ اور "آگھات" کا موضوع ہے ٹریڈ یونین بازی، یونین کے لیڈروں کی موقع پرستی، مفاد پرستی، اور مزدوروں کے استحصال کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ۔ مزدور کا استحصال صرف سرمایہ داری نہیں کرتا، بلکہ خود اس کے یونین لیڈر بھی کرتے ہیں۔ ٹریڈ یونین کی دنیا میں خود بدعنوانی

گووند نہالانی پر کمرشل ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اکثر حلقوں میں خصوصاً "اردھ ستیہ" کے بعد، یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی فلمیں دراصل فن کے لبادے میں خالص تجارتی فلمیں ہیں، اعلیٰ سطح پر نفاست سے بنائی گئی فارمولا فلمیں ہیں۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں۔ گووند نہالانی نے اب تک کسی

آخری حربہ ضرور ہے، جسے وہ انتہائی مجبوری میں اور مایوس ہو کر ہی استعمال کرتا ہے، اور اس کے لیے بھی وہی سڑا گلا نظام ذمہ دار ہے جس نے پہلے اس پر جبر کیا، اس کا استحصال کیا اور پھر اسے باغی بنایا۔ ضرورت اس پورے نظام کو، اس بوسیدہ معاشرے کو بدلنے کی ہے۔ "اردھ ستیہ" میں گووند نہالانی یہی پیغام دیتے نظر آتے ہیں، اور وہ بھی بغیر کسی قسم کی نعرے بازی کے۔

"پارٹی" میں معاشرے کے اعلیٰ ترین طبقے فن و ثقافت کے تئیں اس کے رویے اور نام نہاد دانشوری کے کھوکھلے پن کو بڑی خوب صورتی سے

اور بے ایمانی اس حد تک سرایت کر چکی ہے کہ اگر کوئی ایماندار لیڈر پیدا بھی ہو گیا تو اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور ایک ساتھ دو محاذوں پر جنگ کرنا پڑتی ہے، ایک مالکان کے خلاف اور دوسرے اپنے غدار ساتھیوں کے خلاف۔ یہی تصویر پیش کی گئی ہے "آگھات" میں۔ بلاشبہ اس موضوع پر بنائی جانے والی یہ ایک بہترین فلم ہے۔

گووند نہالانی کی فلم کاری نے ہندوستانی سینما میں ایک نئے اعلان کی حیثیت کو جنم دیا ہے۔ ان کے کردار اصل زندگی کے کردار تو ہیں ہی، ناظرین ان کے ساتھ اپنے آپ کو بہت جلدی ہم آہنگ بھی کر سکتے ہیں، اور ان کی شناخت بھی مشکل نہیں۔ لاثانی کرداروں کو جنم دینے میں گووند نہالانی کا جواب نہیں۔ "اردھ ستیہ" کا ولن راما شیٹی (سداشو امراپورکر) اس کی مثال ہے۔ اسے بھی "شعلے" کے گبر سنگھ کی طرح مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔ آج تک لوگ سداشو کو اس کے اصل نام سے کم اور راما شیٹی کے نام سے زیادہ جانتے اور پہچانتے ہیں۔

مرحلے اور کسی موقع پر اپنے انداز اظہار اور اپنی حیثیت کے سلسلے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا ہے اور محض فیشن میں اعتراضات کرنا بلاشبہ خود غیر دیانت داری کے مترادف ہے۔

جہاں تک تجارتی پہلو کا سوال ہے، گووند نہالانی کی صرف دو فلمیں ہی کامیاب رہی ہیں، ایک اوسطاً اور دوسری مکمل طور پر۔ دو فلموں کو تو تقسیم کار بھی میسر نہ آ سکا، اور مجبوراً کافی کتر بیونت کے بعد، انھیں ٹیلی ویژن کی نذر کرنا پڑا۔ باقی ایک فلم بری طرح ناکام ثابت ہوئی۔ لیکن سوال یہ نہیں کہ تجارتی پہلو ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی فلم کار اچھی فلم، پورے خلوص کے ساتھ، اپنے انداز میں، کسی قسم کا ناروا سمجھوتہ کیے بغیر بنائے اور اسے (اپنی خوبیوں کے باوصف) تجارتی کامیابی بھی میسر آ جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ فلم فن ضرور ہے مگر اس کی تجارتی مجبوریوں اور کاروباری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور پھر اپنی شرطوں پر کاروبار کرنے میں برائی بھی کیا ہے؟

# Making life a tasty affair !

# BHUTAN'S

# DRUK

## Squashes, Juices, Jams, Tomato Ketchup

Prepared from the finest fresh fruits DRUK fruit products provide extra nourishment your family needs. Everybody will relish the taste and ask for more. Give them a healthy break at breakfast Serve them DRUK fruit products.




BFP-NP-121

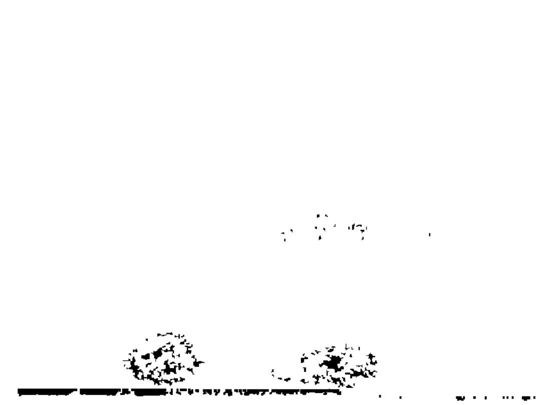
**BHUTAN FRUIT PRODUCTS LTD., SAMCHI-BHUTAN**

Trade enquiries to :

**TRADE LINKS LIMITED**, 'Prabhat Kiran', 17, Rajindra Place, New Delhi.

اجیت جیت گھوش دستیدار

# گیارہواں بین اقوامی فلمی میلہ



وزیر توانائی شری وسنت ساٹھے افتتاح کرتے ہوئے

نئی دہلی میں منعقد ہونے والے گیارہویں بین اقوامی فلمی میلے کے آغاز سے دو روز قبل مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات مسٹر اجیت پانجہ نے نہایت پُرزور لہجے میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ اس بین اقوامی میلے کے ذریعہ ثقافتی تبادلے کے لیے نئی راہیں کھلیں گی۔ اس کے بعد فلمی میلے کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر توانائی مسٹر وسنت ساٹھے نے یہ یقین دلایا کہ حکومت فلمی صنعت کی حتی الامکان امداد کرے گی۔ روایتی شمع ممتاز ہدایت کار ستیہ جیت رے نے روشن کی۔

میلے میں سب سے پہلے جیمز آئیوری کی فلم "A Room with a View" دکھائی گئی۔ فلم ساز اسماعیل مرچنٹ کی یہ فلم ۱۹۰۸ء میں شائع شدہ ای۔ ایم۔ فارسٹر کے ایک ناول پر مبنی ہے اور اس کا منظر نامہ روتھ پراوار جھابوالا نے تحریر کیا ہے۔

یہ فلم فلورنس کے گوتھک فن تعمیر، وہاں کی گندی گلیوں، ڈورکنگ کے ایک دیہاتی مکان اور انگلستان کی چراگاہوں کا احاطہ کرتی ہے۔ فن اور ادب کے پرستار، بی تھوون کے مداح اور انسانی روابط کے مشاہدین، روز و شب کے چکروں کے عناصر کی طرح یکجا ہوتے ہیں۔ فلورنس کے ایک بے چورا ہے پر جھگڑے گھونپنے کی واردات، لیوسی (ہیلینا بونہام کارٹر) اور جارج (جولین سینڈز) میں فی الفور جذباتی لگاؤ، لیوسی اور سیسل وڈسے نیل ڈے۔ لیوس) کی سگائی کا ٹوٹ جانا، یہ سب باتیں گند ہوتے ہوئے بھی، ایک "اطوار کے طریبہ" کی ایسی اختراعات ہیں جو پری کتھاؤں جیسی ہیں۔ مذکورہ ناول کے موافق ابواب کے عنوانات کو عصری صورت حال کی اہم سرخیوں میں بدل دیا جاتا ہے۔ جیمز آئیوری مناسب مزاج پیدا کرتا ہے اور اداکاری صحیح انداز میں متضاد کردار کی وابستہ اور چست و چالاک اداؤں کا اظہار کرتی ہے۔ میگی سمتھ، جو پھوپھی بہن چارلوٹ کا کردار ادا کرتی ہے، ایڈورڈین عہد کی نرم و نازک وضعداری کے ساتھ بروئے کار آتی ہے۔

## ہندوستانی فلموں کی سیر بین

ہندوستان میں منعقدہ فلمی میلوں میں ہندوستانی فلموں کی جو سیر بین پیش کی جاتی ہے اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے توسط سے علاقائی فلمیں منظر عام پر آتی ہیں۔ آزادیٔ وطن کے وقت ہندوستان میں چلنے والی فلموں میں سے ۸۰ فی صد اردو/ہندی میں ہوتی تھیں، اور آج سال بھر میں تیار ہونے والی کل فلموں میں سے صرف سولہ فی صد ہی اردو/ہندی میں ہوتی ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے فلمی صنعت کی آمدنی میں کوئی اضافہ مشکل ہی دیکھنے میں آیا ہے، کیوں کہ فلمی صنعت پر ٹیکسوں کا کافی بار ہے اور پھر ویڈیو اور ٹیلی ویژن کی وجہ سے بھی صنعت کو نقصان ہو رہا ہے، بڑے بجٹ کی فلمیں سنیما ہالوں کا کرایہ تک نکال پانے میں کامیاب نہیں ہوتیں، کیونکہ عام فلم بین کو بھی اب گھسی پٹی ڈرامے بازی، کامیڈی، گانے، بجانے و دیگر مسالوں سے بھری فلموں سے کوئی دل چسپی نہیں رہی ہے۔ ہندوستانی فلمی صنعت کو درپیش گوناگوں مسائل کے لحاظ سے ہندوستانی فلموں کی یہ سیر بین گیارہویں فلمی میلے کا ایک بڑا اہم پہلو کہی جاسکتی ہے۔

تپن سنہا کی بنگالی فلم "آتنک" کا پس منظر کلکتہ کی سڑکیں ہیں۔ ایک بوڑھا استاد (سومترا



جیمز آئیوری کی فلم "A ROOM WITH A VIEW" کا ایک منظر

[illegible] وقت [illegible]
قتل کھیل کے میدان میں ایک سیاسی قتل
دیکھ لیتا ہے۔ دہشت پسند بوڑھے استاد
کے بیٹے اور بچی کو بری طرح خوف زدہ کرتے ہیں۔
یہ فلم خوبصورت ہے۔ اس میں رومانس
بھی ہیں اور انسانی رشتوں کی اچھی تصویر
کی گئی ہے۔ لیکن فلم کئی جگہ تجاوز اداکاری کا
ہو گئی ہے۔ کہانی کی حقیقت کشی کو ایک میلو
ائی اختتام کی وجہ سے سخت دھکا لگتا ہے۔

کلپنا لاجمی کی ہندی فلم "ایک پل" کا مرکزی خیال جرأت مندانہ ہے۔ پریم (شبانہ اعظمی) ایک چائے بجنیئر (نصیر الدین شاہ) کی بیوی ہے اور دونوں سے وحشت زدہ ہیں۔ شوہر کی غیر حاضری کے دوران ربط و ضبط ایک پرانے دوست (فاروق شیخ) ساتھ بڑھ جاتا ہے۔ دونوں قریب آتے ہیں۔ حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل اس کے کئی اسقاط ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ اس مرتبہ اس بچے کو جنم دینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس کا شوہر تمام باتوں کا علم ہونے پر بڑے ذہنی کرب سے گذرنے کے بعد بالآخر بچے کو اپنا لیتا ہے۔ یہ فلم کافی خوبصورتی سے بنائی گئی ہے۔ کردار کی پیشکش کمزور نظر آتی ہے۔ ہیروئن کا کردار ایک کھوکھلا دلن بن کر رہ جاتا ہے اور ہیروئن کی جرأت مندی بھی ادھوری رہ جاتی ہے کیوں کر وہ شوہر کو چھوڑنے کا فیصلہ نہیں کر پاتی۔

شیام بینیگل کی تخلیق ہندی فلم "سسمن" ایک [illegible] دستاویزی فلم معلوم ہوتی ہے۔ ملبوسات [illegible] ڈیزائنر (نینا گپتا) کے توسط سے آندھرا پردیش [illegible] کے ہاتھ کرگھا کاریگروں کی اصل زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ سسمن میں ان کے اندازِ کار، ان کے مسائل، ان کی ضروریات اور آج کے تکنیکی دور میں امداد باہمی کی اقتصادی نوعیت، یہ سب کچھ بڑے [illegible] ڈھنگ سے دکھایا گیا ہے۔ فلم میں جگہ جگہ پندرہویں صدی کے بُنکر شاعر کبیر کے دوہوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ اوم پوری، شبانہ اعظمی، انو کپور اور پلّوی [illegible] سب نے عمدہ اداکاری کے نمونے پیش کیے ہیں۔

منی کول کی ہندی فلم "ماٹی مانس" میں مٹی کے کھلونوں اور برتنوں کے ذریعہ ایک قدیم پس منظر میں ایک نئی دنیا کی تخلیق کی گئی ہے جس میں ایک کمہار کی تخلیقی صلاحیت کیچڑ اور مٹی کو بھی زندہ کر دیتی ہے۔ ایک نوجوان شہری طالب علم انیتا کنور، راجت داس اشوک شرما مٹی کے کام کا مطالعہ بطور فن کرتے [illegible] کمہار کے جھونپڑے سے ہوتے ہوئے کشتیوں میں قید میوزیم تک اور وہاں سے مندر میں نصب مورتیوں تک پہنچتے ہیں۔ منی کول خوبصورت تمثیلوں کی تخلیق میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

کیتن مہتہ کی ہندی فلم "مرچ مسالہ" مغربی انداز لیے ہوئے ہے۔ ایک سنکی قبائلی سردار (نصیر الدین شاہ) گاؤں والوں پر ٹیکس کا بوجھ لاد کر انہیں ڈراتا اور دھمکاتا ہے اور ان سے عورتیں طلب کرتا ہے۔ اس کی آنکھ ٹھہرتی ہے سون بائی (سمیتا پاٹل) پر۔ سون بائی خوف زدہ ہو کر مرچوں کی ایک مل میں پناہ لیتی ہے۔ صرف چوکیدار (اوم پوری) ہی وہ جواں مرد ہے جو اپنے اسلحہ کی مدد سے ظالم سردار کا مقابلہ کرتا ہے۔ سون بائی کا شوہر (راج ببر) ریلوے میں ملازم ہے۔ اس کی رخصت کے وقت سون بائی کے جذبات کو بڑی خوبصورتی سے کیمرے میں قید کیا گیا ہے۔ گاؤں کے مکھیا کی بیوی (دیپتی نول) عورتوں کے ایک جلوس کی قیادت کرتی ہے۔ یہ منظر بھی بہت خوبصورت ہے۔ سمیتا پاٹل اور دیپتی نول کی خوبصورت اداکاری نے اس فلم کو یادگار بنا دیا ہے۔

مظفر علی کی فلم "انجمن" کا پس منظر قدیم لکھنؤ کی حویلیاں اور اس عہد کی مسلم تہذیب ہے۔ اس میں اس کی قدامت پرستی، پسماندگی اور اقتصادی استحصال کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ انجمن (شبانہ اعظمی) ایک مسلمان دوشیزہ ہے، جو اپنے گھر والوں کے چنے ہوئے لڑکے سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور اپنی شخصی آزادی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ایک ماہر چشم اور انقلابی سوشل ورکر سچترا (روہنی ہتنگڈی) اس کی ہمت افزائی کرتی ہے، اور اس کی مدد پا کر انجمن اپنے ساتھی کاریگروں کو منظم کر کے زردوزی کا کام کرنے والوں کی یونین بنا لیتی ہے اور مزدوری میں اضافہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ فلم نئی حقیقت کشی کے اچھے نمونے پیش کرتی ہے تاہم کہیں کہیں مصنوعی بھی لگنے لگتی ہے۔

جی۔ ایس۔ پانیکر کی ملیالم فلم "پانڈو پورم" ایک ایسی ادھیڑ عمر اسکول کی استانی کی کہانی ہے جو گاؤں کے ریلوے اسٹیشن پر بڑی بے چینی سے اپنے محبوب یا اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کرتی ہے۔ اس کے محبوب نے اسے چھوڑ دیا تھا اور اپنے شوہر سے وہ بچھڑ گئی ہے۔ مگر اب بھی وہ ان کی واپسی کی امید میں جیے جا رہی ہے۔ گاؤں کے پس منظر میں گہری حقیقت [illegible] یہ فلم [illegible] اداکارہ [illegible] کردار کشی کے لیے یاد رکھی جائے گی۔

سدھیر مشرا کی ہندی فلم "یہ وہ منزل تو نہیں" میں ادھیڑ عمر کے تین آدمی (حبیب تنویر، اوتپل دت اور پی۔ ایم۔ شاہ) ایک ٹرین کے ذریعے ایک چھوٹے شہر جا رہے ہیں، جہاں انہیں اپنی پرانی درس گاہ کی تقریب میں شریک ہونا ہے۔ وہاں انہوں نے چالیس برس پہلے تعلیم حاصل کی تھی۔ تینوں بوڑھے آدمیوں کی نظروں کے سامنے ان کا ماضی گھوم جاتا ہے، جب ۱۹۴۲ء میں انہوں نے آزادی کے متوالے ایک طالب علم کو دھوکہ دیا تھا۔ جب یہ لوگ اپنی یونیورسٹی والے چھوٹے شہر میں پہنچتے ہیں تو وہاں ہڑتالوں اور مظاہروں کا زور ہے اور سیاسی قتل کی گرم بازاری ہے۔ اس مرتبہ یہ تینوں اپنی بزدلی پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور پولیس کے گھیرے سے بھاگتے ہوئے ایک نوجوان طالب علم لیڈر پنکج کپور کو پناہ دیتے ہیں۔ اس اچھی کہانی کو حقیقت کشی کے ساتھ فلمایا گیا ہے۔

پادری تھرون کی ملیالم فلم "آتو" مسلم پس منظر میں ایک دیہاتی عورت کی مصیبتوں کی کہانی ہے۔ ایک مالدار زمیندار ایک غریب مچھیرے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی حسین بیوی کو طلاق دیدے اور اس کے بدلے اسے مالا مال کر دیتا ہے۔ اب مطلقہ عورت سے یہ زمیندار شادی کر لیتا ہے کیونکہ زمیندار کی پہلی بیوی اسے ایک بیٹا دینے میں ناکام رہی تھی۔ بیس برس گذر جاتے ہیں مگر اس غریب عورت کے دل سے اپنے پہلے شوہر کی یاد نکل نہیں پاتی۔ ادھر اس کا شوہر پشیمانی کے عالم میں جی رہا ہے۔ آخر ذہنی الجھنوں کی آخری حدوں سے گذر کر وہ خود اپنے ہاتھ سے اپنی جھونپڑی میں آگ لگا دیتا ہے۔

جی۔ اروندن کی ملیالم فلم "اوری داتھ" کیرالا کے ایک گاؤں میں (۱۹۵۵ء میں) بجلی کی آمد کی داستان پیش کرتی ہے۔ مختلف واقعات کو جوڑ کر ایک کہانی کی شکل دی گئی ہے۔ شاجی کی عکاسی اس فلم کی بڑی خوبی ہے۔

جاہنو بروا کی آسامی فلم "پاپوری" آسام میں انتخابات سے قبل ہوئے تشدد کے موضوع پر ہے۔ غیر ملکیوں کے سوال پر ہوئے فسادات سے ایک نوشادی شدہ عورت کی زندگی پر زبردست اثر پڑتا ہے۔ واقعات کے تسلسل کے ساتھ فلم سیاسی رنگ اختیار کرتی جاتی ہے اور اپنے اصل موضوع سے ہٹ جاتی ہے۔

# مہانگر کی ریل

دہلی میں مشرق سے مغرب کی سمت ۳۶ کلومیٹر لمبی ریلوے قائم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے جو ساڑھے سترہ کلومیٹر سطح زمین پر اور ساڑھے اٹھارہ کلومیٹر سطح زمین سے اوپر ہوگی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس مہانگر کے لیے تین سو کلومیٹر لمبی چھوٹی ریلوے کی اسکیم کے تحت یہ اپنی نوعیت کی پہلی قسط ہوگی۔

دہلی میں نقل وحرکت کرنے والوں کے لیے کسی سہولت کا وعدہ بڑی خوشخبری ہوتی ہے۔ ریل گاڑی کے ذریعہ تیزی سے نقل وحرکت کرنے کا کوئی نہ کوئی نظام بہت ضروری ہو گیا ہے کیونکہ شہر کے بھیڑ بھڑکے میں لوگوں کی بھاری تعداد کو سرعت اور مستعدی کے ساتھ آمد ورفت کی سہولت مہیا کرنے کا اور کوئی طریقہ قرین فہم نہیں ہے۔ مقامی بسیں (اگر وہ کافی ہوں اور انہیں کوئی بہتر انداز میں چلائے)، شہر کے ماحول میں آلائش، شوروغل اور دھویں وغیرہ سے گھٹن پیدا کر دیا گئے اور سلامتی کو درپیش خطرات اس کے علاوہ ہوں گے۔

لیکن اس ریلوے کے کیا کہنے! سطح زمین پر بھی اور اس سے اوپر بھی۔ سطح زمین سے اوپر کی شہری ریلیں انیسویں صدی کے آخری دہے میں منظر عام پر آئی تھیں اور جلد ہی غیر مانوس ہو گئیں۔ دنیا کے ایک سو پچاس سے زیادہ شہروں میں سے جہاں تیزی سے چلنے والی ریلوے کی سہولت موجود ہے۔ بہت ہی کم شہر ایسے ہیں جہاں سطح زمین سے اوپر کی لمبی پٹریاں باقی رہ گئی ہیں۔ درحقیقت منیلا کے علاوہ آج کل کوئی بھی دوسرا بڑا شہر بڑے پیمانے پر اس طرح کی ریلیں قائم کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ جاپان کے دیہی علاقوں میں سطح زمین سے اوپر چلنے والی طویل راستے کی "نیو ٹوکیڈا" ریلوے ایک الگ چیز ہے جس کے راستے پر پڑنے والے گنجان آباد علاقوں کو بڑی تندہی کے ساتھ طرفین کی دیواروں اور پردوں کی مدد سے محفوظ رکھا گیا ہے۔

اس موضوع پر انسائیکلوپیڈیا بری ٹینیکا کے اندر یہ عبارت درج ہے:

"سطح زمین سے اوپر تعمیر کردہ ریلوے سے جو روپے کی بچت ہوتی ہے وہ آخر کار ایک غلط معیشت کے مترادف ہوتی ہے کیونکہ سطح زمین سے اوپر بنائے گئے ڈھانچے بیوپاری اور رہائشی سڑکوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ دلائل پیش کی گئی ہیں کہ شہر کی سڑکوں پر ایک ہی لائن کے خوشنما اور پرسکون پٹریاں تعمیر کی جا سکتی ہیں تاہم حالیہ تجربہ مقبول نہیں ہوا ہے۔ کسی مرکزی نوعیت کے بیوپاری ضلع کے لیے کوئی کامیاب نظام تعمیر نہیں کیا گیا۔"

اور ہم یہاں اکیسویں صدی کے لیے سطح زمین سے اوپر کا ایک وسیع نظام تعمیر کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں جو کہ ایک ہی لائن والا پرسکون نظام نہیں ہوگا بلکہ وہی روایتی نوعیت کا دو لائنوں کی پٹری پر مشتمل سلسلہ ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ پہلا اقدام، قومی راجدھانی کو مستقبل کے لیے نقل وحرکت کا ایک تیز نظام فراہم کرنے کی بجائے موجودہ "رنگ ریلوے" کی توسیع کی صورت میں کہیں اس کے نیچے میں ملا دیا جائے گا۔ مجوزہ راستے کے لیے مسلسل زمین حاصل کرنے میں جب دشواری پیش آئے گی تو منصوبہ یہ ہے کہ جہاں زمین دستیاب نہ ہوگی وہاں پٹری کو ستونوں کے ذریعہ سے اوپر اٹھا لیا جائے گا۔ زمین دوز راستے کے لیے میٹرو نظام درکار ہوتا ہے جب کہ فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ یہ ریلوے سطح زمین پر ہوگی۔

ذرا سوچیے اس سارے شہر کے بارے میں جس میں سر کے اوپر سے گزرتی گھڑگھڑاتی ریلوے لائنوں کا تانا بانا، کھڑکیوں اور بالکونیوں کو ہلائے گا اور راستے پر درختوں کی بجائے سطح زمین سے اونچے بنائے گئے اسٹیشن ہی آسمان کے پس منظر میں دکھائی دیں گے۔ پرانے گنجان انداز کا یہ مہانگر، آج کی جمالیاتی اور ماحولیاتی اقدار کے پیش نظر نہ جانے کس برے چکر میں آ جائے گا۔ اگر یہ ساری اسکیم کامیاب ہو جائے تو ایک عظیم تاریخی شہر کے نذر ہو جانے کا خطرہ سامنے آ جائے گا۔

سطح زمین کا حصہ اب بھی گنجان آباد اور بھاری تعمیرات والے راستوں پر نقصانات وہ اثرات سے معمور ہے۔ درحقیقت مجوزہ ریلوے کو چند بڑے بڑے تجارتی اور دفتری احاطوں سے درگذر کرنی پڑے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریل گاڑی استعمال کرنے والوں کو وہاں جانے کے لیے زیادہ لمبے راستے عبور کرنے ہوں گے۔ بھیڑ بھڑکے والے شہر میں نئی لائنوں کا راستہ پیدا کرنا ان پرانی لائنوں میں دخل انداز ہوگا جن کے ساتھ ہی شہر فروغ پذیر ہوا تھا۔ ایک ایسی جراحی عمل میں لائی جائے گی جس سے بہت سی سڑکیں اور گلیاں کاٹی جائیں گی، ملی جلی سرگرمیوں میں دخل اندازی ہوگی اور باہمی مواصلات میں خلل پیدا ہوگا۔ ایک اسکول اپنے کھیل میدان سے، ایک کارخانہ اپنے گودام سے اور ایک کالونی اپنے پارک سے علاحدہ ہو جائے گا۔ ایک سطح زمین کا راستہ غیر قانونی قبضے، آدمیوں اور جانوروں کے غیر قانونی طور سے آنے جانے، گاڑیوں کے بے وقت ٹھہرنے، بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں اور افراتفری کرنے والوں کی آماجگاہ بن جائے گا۔

تسلیم شدہ طریقہ یہ ہے کہ سطح زمین کی بجائے زیر سطح راستے بنائیں جائیں۔ بے شک اس کی لاگت زیادہ ہے لیکن یہ طریقہ بہت ہی مرغوب ہے سب طریقوں پر غور کرنے کے بعد ہر کوئی اسے اپنا رہا ہے۔ شور وغل اور آلودگی سے مبرا ہونے کے علاوہ اس سے جگہ کی بچت ہوتی ہے اور جگہ سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ اگر جگہ دستیاب رہے تو زیادہ ہریالی کیوں نہ پیدا کی جائے اور عوامی تفریحات کے زیادہ مقامات کیوں نہ تیار کیے جائیں۔ زیر سطح راستے جن علاقوں سے گزرتے ہیں انہیں نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ وہاں زمین کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ بجلی سے چلنے والی زیر سطح ریلیں تیز ہوتی ہیں ان کی رفتار زیادہ یا کم کرنا آسان ہوتا ہے۔ ان کی خدمات میں غیر معمولی تیزی لائی جا سکتی ہے۔ ان میں سلامتی کے معیار قریباً یقینی ہوتے ہیں برسوں سے کوئی بھی حادثہ دیکھنے میں نہیں آیا ہے داغ فولاد اور المونیم مرکب سے بنے ایئر کنڈیشنڈ ڈبے بڑا آرام دہ سفر فراہم کرتے ہیں۔ اینڈرلیو رابنسن نے "اسپیکٹیٹر" میں لکھا ہے "کچھ عرصہ پہلے میں نے تقریباً کلکتہ میں نئی میٹرو کا سفر کیا میں میدان اسٹیشن سے سوار ہوا اور اسپلینیڈ تک دو مقامات کا سفر کیا۔ یہ سفر آرام دہ، صاف ستھرا اور مستعد تھا اور اس میں وہ سب کچھ تھا جو خود کلکتہ میں نہیں ہے۔ میٹرو نظام کے اس قدر

ے فوائد ہیں جو کسی متبادل نظام سے نہیں ملتے،
ں کر دہلی جیسے بڑے اور گنجان آباد شہروں کے لیے۔
ے زمین پر چلنے والی ریلوے چھوٹے بکھرے بکھرے
کم آبادی والے شہروں کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

تعمیرات کی ٹیکنالوجیاں بہت بہتر ہو گئی ہیں۔
ں بڑی مشینیں جو کان کھودنے والے دیویوں کی طرح
ت کرتی ہیں، کام میں لائی جاتی ہیں۔ (کلکتہ کا تجربہ
ری رہنمائی نہیں کرتا)، یہ کام چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں
حساب سے شروع کیا جاتا ہے۔ سڑک کا متعلقہ
ہ جلدی سے کھودا اور اوپر سے بند کر دیا جاتا ہے
ں سے سطح کے کام میں کم سے کم خلل پیدا ہوتا ہے اکثر
ں بھیڑ والے حصوں پر لوہے کی عارضی پل بنا دی جاتی
تاکہ آمد و رفت جاری رہے۔

دہلی خاص طور سے ایک کاٹ کر ڈھانپ دینے
، زیر زمین راستے کے لیے موزوں ہے۔ یہاں کی
م سڑکیں زیادہ تر چوڑی اور سیدھی ہیں جس کی
ہ سے عمارتوں کے نیچے سے سرنگیں بنانے کی ضرورت
ں۔ زیر زمین پانی سے کوئی رکاوٹ ممکن نہیں واٹر
وف کے طریقے کافی فروغ یافتہ ہیں بہت سی تجارتی
رتیں اور مکانات ایسے تعمیر ہو رہے ہیں جن کے تہ خانے
وبت سے مبرا ہیں۔ زمین کے کھلے ٹکڑوں پر جہاں
ہ زمین کی پٹری ادھر، دھر کی کوئی زیادہ مشکل نہیں پیش
ے گی وہاں اگر ضروری ہو ریل کی لائنیں سطح پر یا سطح
ین سے اوپر بھی بنائی جا سکتی ہیں لیکن مجموعی نظام
ری طور سے میٹرو نوعیت کا اور زیر زمین ہی رہے گا
چاہیے ہمارے نظم و نسق سے ماورا حالات کے مطابق
ہو داخل ہونے اور باہر نکلنے کے مقامات بالکل کنٹرول
ں رہنے چاہئیں۔ کسی کو پٹری پر گھومنے کی اجازت نہ ہو۔
ی بھی شخص مقررہ مقامات سے ادھر ادھر گاڑی میں چڑھنے
اترنے کا مجاز نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کو غیر قانونی
رسے کہیں دھرنا لگانے کی اجازت نہ ہو۔ کوئی بھی جگہ
گلا پھاڑنے والوں کا نشانہ نہ بنے۔ یہ نظام جنگ کے
ول تباہی کی زد میں کم آتا ہے۔

زیر زمین اسٹیشنوں کے بارے میں چند مفید
بلو قابل سفارش ہیں۔ انہیں اہم تجارتی اور دفتری
مپلیکسوں کے بالکل درمیان بنایا جا سکتا ہے
ں سے مسافروں کو زیادہ پیدل نہیں چلنا پڑے گا
نا میں دوکانوں، کھانے کے اسٹالوں نیز دیگر سہولیات
برخاص کر عوامی پاخانوں وغیرہ کے لیے مزید اہتمام کیا
سکتا ہے۔ پالیکا بازار کی کامیابی اس صورت حال
اشارہ ہے۔ زیادہ معروف اسٹیشنوں پر چھوٹے

چھوٹے بازار بنائے جا سکتے ہیں جس سے سطح زمین کی
گنجائش پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

کہا گیا ہے کہ شہری ریلوے کے نظام کا منصوبہ
بنیادی طور سے ریلوے کے ارباب عمل میں لا رہے ہیں۔
ریلوے والوں کے پاس بہت سی زمین رہی ہے اس
لیے انہیں جگہ میں کمی کا مسئلہ پیش نہیں رہا جبکہ شہروں
کے اندر یہ ایک کلیدی عنصر ہے۔ چونکہ ریلوے والے
دیہی علاقوں میں زیادہ دوڑ دھوپ کرتے رہے ہیں
لہٰذا ان کے پاس شور و غل کی آلائش کی واقفیت
اس قدر نہیں ہے۔ ان کے انجن بھی زیادہ سیٹیاں
بجاتے ہیں۔

ریلوے والوں کی روایت ہے کہ وہ کھلی ہوائیں
کارفرما ہونے کے عادی ہیں درحقیقت دہلی میں
ریلوے والوں کے پاس پہلے بھی کافی زمین ہے
جس کا زیادہ فائدہ اٹھانے کا سلسلہ چلایا جا سکتا
ہے پٹریوں کے کچھ حصے اوپر اٹھائے جا سکتے ہیں جس
سے قیمتی جگہ بچے گی اور وہاں کاروں اور بسوں کا
پارک کرنا سمایا جا سکتا ہے یا وہاں کھیلنے کے مقامات
بھی تشکیل دیے جا سکتے ہیں جو ان کے مسافروں
اور ملازمین کی خاطر ہوں گے۔

شہری نقل و حرکت کی سہولیات سے وابستہ
منصوبہ کاری نے بڑے ہی پیچیدہ اور مکمل شعبے
کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ نہ صرف شہری یا نیم شہری
نقل و حرکت کے تمام طریقوں اور ان کے ارتباط کا احاطہ
کرتا ہے بلکہ یہ شہری ترقی اور ماحولیاتی تحفظات سے
وابستہ ہے، شہری کاروباری زندگی نیز شہری کی سماجی
و ثقافتی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے اور القصہ شہری زندگی
کی تمام اقدار پر نظر رکھتا ہے۔ ریلوے والوں کی نقل
و حرکت سے وابستہ اس منصوبہ کاری کو شہری زندگی
کے جملہ ماحول میں بڑی صفائی کے ساتھ سمجھا جانا چاہیے
کیوں کہ یہ ماحول مسلسل بدل رہا ہے۔ اسے ریلوے
کے قومی نظام کی توسیع محض نہیں ہونا چاہیے۔ دہلی کے
لیے شاید نقل و حرکت کی ایک مربوط ایجنسی کی ضرورت
ہے جو کہ لندن ٹرانسپورٹ بورڈ یا نیویارک پورٹ
اتھارٹی کی طرز پر ہو۔ یہاں کا نظام نقل و حرکت
میٹرو کی طرح ہو یا سطح زمین پر ہو، ایسے اہم امور ہیں
جن پر عوامی بحث کی ضرورت ہے۔ دونوں نظاموں
کی اقتصادی اور سماجی لاگتوں کے موازنہ اور دیگر
پہلوؤں کی وضاحت کرنا لازمی ہے۔

دہلی اتنا اچھا شہر ہے کہ اسے جدید ٹیکنالوجی
اور نئے تجربات کی بہترین نعمتوں سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

# غزل

اقبال عمر

کہتے تو ہیں کہ ہم کو خبر ہے بھی اور نہیں
دنیا کے رنج و غم سے مفر ہے بھی اور نہیں

ہم پر تو حادثوں کا اثر ہے بھی اور نہیں
اپنا نگر اب اپنا نگر ہے بھی اور نہیں

ذہنوں میں کیوں نہ آئے نئے شہر کا خیال
اس شہر میں جب اپنا گزر ہے بھی اور نہیں

اک مشغلہ ہے دور خلاؤں میں دیکھنا
یوں کہ اعتبار نظر ہے بھی اور نہیں

آنکھیں کدھر اٹھی ہیں قدم کس طرف اٹھے
جیسے یہ اپنی راہ گزر ہے بھی اور نہیں

جی چاہتا ہے ہجر کا موسم طویل ہو
چہرہ کسی کا پیش نظر ہے بھی اور نہیں

جذبات کے الاؤ میں جلتے ہوئے بدن
اک دوسرے کے دل کی خبر ہے بھی اور نہیں

اپنے دل و دماغ میں ہوتا ہے یوں فساد
ہم کو ادھر ہے کوئی ادھر ہے بھی اور نہیں

کیا جانے اتنی تنگ دلی کا سبب ہے کیا
عالم تمام تنگ نظر ہے بھی اور نہیں

اپنے ہم ہیں اور خواب پریشاں کا سلسلہ
تکیہ ہمارے اشکوں سے تر ہے بھی اور نہیں

[illegible] کی قسمت [illegible]
[illegible] ہے بھی اور نہیں

مہندر سسودیا

# مصنوعی سیارہ
## ابلاغِ عامہ میں عالمگیر انقلاب

مصنوعی سیارے کی ایجاد سے عالمی نظام ترسیل و رسائل میں بڑی دھماکہ خیز تبدیلیاں کی ہیں، اور اس کے ذریعے پیغام رسانی کی سہولتوں میں شاندار اضافہ ہوا ہے، اور اب اس کی حیثیت ایک ایسی آزمودہ تکنیک کی ہے جس نے ہماری روزمرہ زندگی کو خاصے بڑے پیمانے پر متاثر کیا ہے۔

مصنوعی سیاروں کے ذریعے مواصلات میں بے پناہ آسانیاں پیدا ہوئی ہیں، ٹیلی فون ہو یا ٹیلی ویژن، موسمی اطلاعات کی فراہمی ہو یا معلومات کی دستیابی، دور پار کی خبر منگانا ہو، فوجی پیغام رسانی ہو، سراغرسی ہو یا حربیہ کی ضروریات، ان سب میں کافی سدھار ہوا ہے۔ خاص طور پر مصنوعی سیاروں کے ذریعے ٹیلی ویژن کی نشریات میں معجزاتی تبدیلی آئی ہے اور ان کے ذریعے مختلف ملکوں اور لوگوں کے درمیان رابطہ پیدا ہوا ہے۔ یہ رابطہ مصنوعی حد بندیوں کو ختم کرنے اور درمیان کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ خاص قسم کے مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں، اور ضرورت محسوس ہونے لگی ہے کہ مصنوعی سیاروں کے نظام اور اس سے متعلق ضوابط کے سلسلے میں تمام ممالک باہم تعاون کریں۔

مصنوعی سیاروں کے نظام میں مسلسل تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں اور یہ تکنیک ترقی کی جانب مائل رہی ہے، ۱۹۷۲ء تک مصنوعی سیارے کے ذریعے صرف ایک خاص مقام سے دوسرے مقررہ مقام تک ہی پیام رسانی ممکن تھی، اور اس طرح زمین پر ایک مقام سے، زمین پر ہی واقع دوسرے مقام تک بات پہنچائی جا سکتی تھی۔ مصنوعی سیارے کے ٹرانسمیٹر کے ذریعے بھیجا جانے والا اشارہ بہت ہلکا اور کمزور ہوتا تھا اور اسے وصول کرنے کے لیے کافی بڑے اینٹینا کی ضرورت ہوتی تھی، اس کے ساتھ ہی وصول شدہ اشاروں کو صاف کرنے اور آواز کو بڑھانے کے لیے دیگر آلات کا بھی استعمال کرنا ہوتا تھا۔

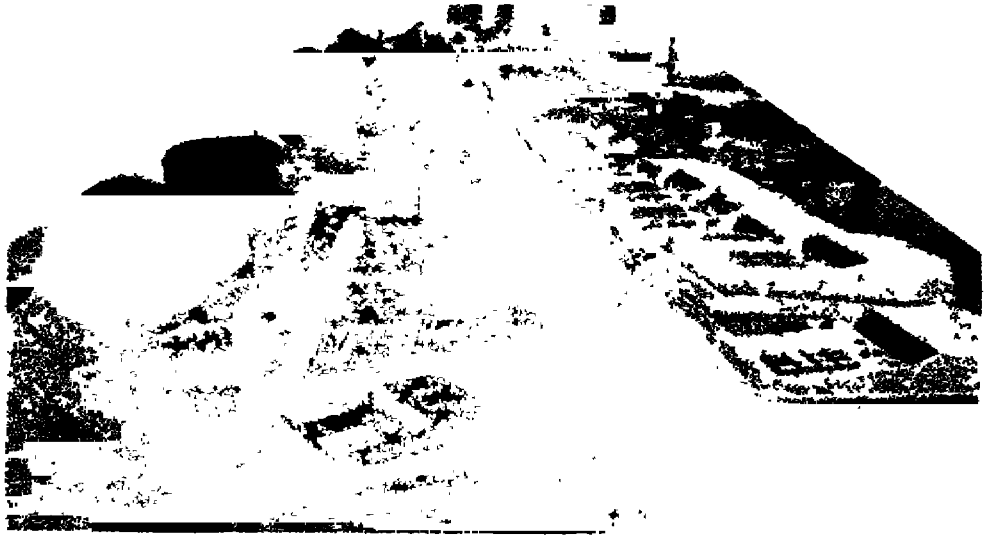
اس کے بعد نئے قسم کا مصنوعی سیارہ ایجاد ہوا، جسے ہم تقسیم کار سیارہ بھی کہہ سکتے ہیں، اس مصنوعی سیارے کے ذریعے بھیجے جانے والے صوتی پیام کافی جاندار ہوتے ہیں، چھوٹے موٹے اسٹیشن بھی انھیں وصول کر سکتے ہیں اور کافی چھوٹے اینٹینا سے بھی کام چل سکتا ہے۔ اس نئے سیارے کے ذریعے مواصلات کے لیے بہت زیادہ تربیت یافتہ افراد کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اور اس کے اخراجات بھی کم ہیں، نسبتاً بہت کم۔ اس نئے نظام کے تحت ایک بڑا مرکزی اسٹیشن تمام پیغامات وصول کر کے انھیں اس طرح تقسیم کرتا ہے کہ گھر گھر میں لوگوں کے ٹیلی ویژن سیٹ تک یہ پروگرام پہنچ جاتا ہے۔ یہ تقسیم کاری عام نشریاتی اسٹیشن کے ذریعے بھی ہو سکتی ہے اور تاروں Cables کے نظام کے ذریعے بھی۔

اب مصنوعی سیارہ جاتی نشریات میں جدید ترین ایجاد ہیں براہ راست نشریات کرنے والے مصنوعی سیارے جنھیں مخففاً عام طور پر ڈی۔ بی۔ ایس کہا جاتا ہے۔ ان سیاروں کی ایجاد کے بعد اب مواصلاتی اخراجات اور کم ہو جائیں گے۔ نیز پیش رو مصنوعی

پیامات کے برعکس ڈی۔بی۔ایس براہ راست گھریلو ٹی۔وی کے اینٹینا تک پیام بھیج سکتے ہیں اس طرح پروگرام فوراً نشر ہوجاتا ہے، اس کے لیے اب ایک درمیانی زمینی مرکز بھی ضروری نہیں رہا، اور مختلف ڈی۔بی۔ایس کو باہم مربوط کر کے کرۂ ارض پر واقع کسی بھی مقام پر ہونے والے کسی پروگرام کو کسی بھی دوسرے مقام پر بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈی۔بی۔ایس کے ترسیل کردہ اشارے اتنے طاقت ور ہوتے ہیں کہ محض ایک چھوٹے سے گول اینٹینا کے ذریعہ دنیا کے چند ممالک امریکہ، کناڈا، برطانیہ، جاپان اور روس نے ڈی۔بی۔ایس نظام کو اپنا لیا ہے، اور آئندہ چند برسوں کے اندر دیگر ممالک مثلاً برازیل، فرانس مغربی جرمنی اور سعودی عرب بھی اس نظام کو قومی پیمانے پر نصب کرلیں گے۔

علاقائی اور قومی پیمانے پر ڈی۔بی۔ایس کے استعمال کے منصوبے تو ہر ملک بنا رہا ہے، لیکن یہ بحث ابھی جاری ہی ہے کہ آیا ڈی۔بی۔ایس کو اپنی تمام تر تکنیکی صلاحیت کا استعمال کر کے ایک عالمی ٹیلی وژن کے خواب کو پورا کیا جائے یا نہیں، دراصل یہ سوال متعدد سیاسی، ثقافتی، نظریاتی اور سماجی مسائل سے جڑا ہوا ہے، اور خصوصاً ایسی حکومتوں کے لیے نئے مسائل پیدا کرسکتا ہے جو اپنے قومی نظریات و ثقافت کی حفاظت کے لیے ذرائع ابلاغ پر اپنی گرفت قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ ایسے ممالک میں جہاں نشریات پر حکومت کا تسلط نہیں ہے، وہاں بھی یہ خدشہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اگر ڈی۔بی۔ایس کے ذریعہ غیر ملکی نشریات کو آزادانہ داخلے کی اجازت مل گئی تو ان کے اپنے نشریاتی نظام کی اہمیت کم ہوجائے گی ثقافتی اقدار پر منفی اثر پڑے گا اور روایتی طرز حیات کے لیے بھی خطرہ لاحق ہوجائے گا۔

اس میں شک بھی نہیں کہ ایک ملک کا کوئی بھی دستاویزی پروگرام دوسرے ملک کے لیے پروپگنڈہ بن سکتا ہے، ایک پروگرام جو ایک ملک کے لیے ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، ممکن ہے کہ کسی دوسرے ملک کے لیے یہ جارحانہ اثرات کا حامل ثابت ہو، جس بات کو ایک ملک تاریخی حقیقت تسلیم کرتا ہے، ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ کسی دوسرے ملک میں جذبات بھڑک اٹھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ نے ایک قرارداد کے ذریعہ یہ پابندی عاید کر رکھی ہے کہ کوئی ملک اپنے ڈی۔بی۔ایس نظام کو دوسرے ملک کی سرحدوں تک اس وقت تک وسیع نہیں کرسکتا جب تک کہ یہ ملک اس کے لیے رضامند نہ ہو۔ یہ قرارداد ۱۹۸۲ء میں ہی منظور کرلی گئی تھی ایشیا اور یوروپ میں مختلف بین ملکی معاہدوں کے ذریعہ بھی ڈی۔بی۔ایس نظام کو صرف داخلی نشریات کے لیے ہی محدود کیا گیا ہے، بلکہ روس نے تو ایک ایسی تکنیک بھی ایجاد کرلی ہے جس



کے ذریعہ ملکی حدود کی خلاف ورزی کر کے در آمد ہونے والی نشریات کو تباہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۶۶ء میں پیرس میں یونیسکو کے ذریعہ منعقدہ مواصلاتی ماہرین کی پہلی کانفرنس میں مختلف مندوبین نے ان مسائل کی نشان دہی کی تھی، جو دوسرے ممالک کے ٹی۔وی پروگراموں کے حملوں سے ان کے ممالک میں پیدا ہوسکتے تھے کیمونسٹ ممالک کے مندوبین نے مصنوعی سیاروں کے ناجائز استعمال کے خلاف حفاظتی تدابیر کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور اس جانب اشارہ کیا کہ اگر بیرونی پروگرام سے متاثر ہونے والے ملک کی اجازت کے بغیر کوئی پروگرام نشر ہو تو یہ اس ملک کی خود مختاری کو مجروح کرنے اور اس کے داخلی امور میں دخل اندازی کے مترادف ہوگا۔

اس کے علاوہ مصنوعی سیاروں کے پروگراموں کی چوری اور دوسری مشکلات بھی پیدا ہوسکتی ہیں، کیوں کہ ڈی۔بی۔ایس نظام کافی طاقت ور ہے، اور براہ راست اشارے بھیج سکتا ہے، اس وجہ سے اس کی چوری کافی آسان ہے۔ جو پروگرام ایک خاص ملک کے لیے نشر کیا جا رہا ہو، اسے کوئی بھی شخص اپنے گھریلو سیٹ کے ذریعہ وصول کرسکتا ہے۔ اس طرح اگر مصنوعی سیاروں کے ذریعہ نشر شدہ پروگراموں کی چوری کا سلسلہ چل پڑے تو پروگرام تیار کرنے والوں، مصنفوں، ہدایت کاروں اور فن کاروں، سبھی کی حق تلفی ہوگی۔ لہٰذا یہ چوری بھی دیگر تخلیقی سرقہ جات کی طرح کاپی رائٹ کے ضابطہ کی صریح خلاف ورزی ہوگی، اور ہمسایہ ممالک کے حقوق بھی سلب ہوں گے اس کے علاوہ بھی مسائل پیدا ہوسکتے ہیں مثلاً اشتہارات کا معاملہ ہر ملک میں ٹیلی وژن پر اشتہار کے لیے پیسے لیے جاتے ہیں، اور اس کے لیے ضابطے بھی ہیں۔ جب کوئی پروگرام دیگر ممالک میں بھی دیکھا جائے گا تو ظاہر ہے کہ اس ضابطے کی خلاف ورزی ہوگی۔

بہر کیف ڈی۔بی۔ایس نظام کے فوائد بھی بے شمار ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کے لیے یہ بہت مفید ہے، اس کے ذریعہ داخلی مواصلاتی نظام کو بہتر بنایا جاسکتا ہے، معاشی ترقی کے سلسلے میں اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، اس نظام کے ذریعہ بکھری ہوئی دیہی آبادیوں کو باہم مربوط کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ:۔

"براہ راست نشریات کا سیارہ جاتی نظام ترقی پذیر ممالک کو اپنی مواصلاتی سہولتوں کو بہتر بنانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ ممالک اپنے عام مواصلاتی نظام کو کافی سدھار سکتے ہیں اور قومی پروگراموں میں اضافہ کرکے یک جہتی، اقتصادی ترقی، صحت، خاندانی منصوبہ بندی، زرعی تعلیم و تربیت اور دیگر عوامی ترقیاتی پروگراموں کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔"

لیکن ترقی پذیر ممالک خود اس نئے نظام سے کافی خوف زدہ ہیں، اس لیے کہ ان کے خیال میں ڈی۔بی۔ایس نظام ان کے ثقافتی ورثے، سماجی ترقی اور سیاسی استحکام پر منفی اثر ڈال سکتا ہے وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ مغربی ممالک کے پروگراموں میں جس طرح کا طرز حیات پیش کیا جاتا ہے اور جس طرح آرام و آسائش کے لوازم پر زور دیا جاتا ہے اُسکے ذریعہ یہاں کے عوام کے دل میں بے جا توقعات جنم لیتی ہیں اور یہ ذہنی رو نتیجتاً معاشی ترقی کی راہ میں روڑا بنتی ہے۔

ڈی۔بی۔ایس کے سلسلے میں اقوام متحدہ (یونیسکو) دیگر عالمی اداروں نیز بین اقوامی مواصلاتی تنظیم کی سطح پر زوردار بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری ہے، اور ضابطوں کی تشکیل و نفاذ کے سلسلے میں غور و خوض ہو رہا ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک تجویز کے ذریعہ ایک ورکنگ گروپ کی تشکیل کی منظوری دی ہے یہ گروپ اس معاملے کے تمام امور کا جائزہ لے گا، اور براہ راست نشریات کے اس جدید مصنوعی سیارہ جاتی نظام (ڈی۔بی۔ایس سسٹم) کے پُرامن استعمال کے سلسلے میں تجاویز پیش کرے گا۔ اس گروپ نے پہلی دو رپورٹیں پیش کردی ہیں۔ دیگر عالمی ادارے بھی اس پر غور و خوض کر رہے ہیں۔

اگرچہ ڈی۔بی۔ایس نظام ابھی اپنے عہد طفولیت میں ہے، لیکن بہت جلد اس کا استعمال دنیا بھر میں ہونے والا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ یہ نظام ہندوستان میں بھی رائج ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظام ایک عظیم تکنیکی کامیابی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زبردست چیلنج کی بھی حیثیت رکھتا ہے اور اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے نیا ڈھانچہ، نئے قوانین، نئے آداب اور نئے عالمی طریق نشر و اشاعت درکار ہیں۔

## حالِ ہند کے قارئین کی خدمت میں

[illegible]

آپ کا مخلص

ڈی۔ڈی۔ٹھاکر

[illegible]

اوما جوشی

# بچّوں کی نشو ونما — مرکزی اسکیم

ہندوستان دنیا کے ان چند ترقی پذیر ملکوں میں سے ایک ہے جس نے بچّوں کی نشو ونما کے لیے اپنے عزم کو بچوں کے لیے ایک قومی پالیسی میں تبدیل کر دیا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں پارلیمنٹ نے اس پالیسی کو اپنایا اس پالیسی کی تعمیل کے لیے۔ پہلا قدم ۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو بچّہ کی مکمل نشو و نما کی ہمہ جہت خدمات (ICDS) کے پروگرام کے ساتھ اٹھایا گیا۔ اس اسکیم کا مقصد ان بچوں کی دیکھ بھال تھا جو کہ نقص تغذیہ کا شکار ہیں اور وہ حاملہ خواتین جو سماج کے کم آمدنی والے طبقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

شروع میں آزمائش کے طور پر ۳۳ ICDS پروجیکٹ شروع کیے گئے تھے۔ اس وقت ۱۳۳۴ پروجیکٹ پورے ملک کے ۵۰۹۲ سماجی بہبود کی بلاکوں میں سے ۱۱۷۷ مرکزوں میں چل رہے ہیں۔

جب کہ دیہاتی بچوں کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے لیکن شہروں کی ۱۵۷ گندی بستیوں میں بھی یہ کام جاری ہے۔ حکومت نے چھ سال سے کم عمر والے بچوں کی نشو و نما کے لیے بڑے پیمانے پر یہ کام شروع کیا ہے۔ ساتویں پلان میں اس مقصد کے لیے ۶۸۰ کروڑ روپیہ مخصوص کیے جانے کی تجویز ہے۔

یہ مرکزی اسکیم جس کو حکومت ہند کی طرف سے صد فی صد مالی امداد حاصل ہے۔ سماجی بھلائی کے شعبہ کی جانب سے صوبوں کی حکومتوں کے سماجی بھلائی اداروں کے ذریعہ چلائی جا رہی ہے۔ اس اسکیم کے تحت آنگن واڑی اسکیم، پروجیکٹ والے علاقوں میں غذا کی صحیح تقسیم اور طفل و مادر تک اس کی دسترس کو مضبوط بنایا گیا ہے۔ عام طور پر دیہاتی علاقوں اور غریب بستیوں میں ایک ہزار کی آبادی پر ایک آنگن واڑی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ آنگن واڑی کا کام ایک مکھیہ سیوکا کی نگرانی میں چلایا جا رہا ہے۔ ایک چائیلڈ ڈیولپمنٹ پروجیکٹ افسر یعنی CDPO ہر ICDS کا ذمہ دار ہے۔

علاوہ چھ سال سے کم عمر والے بچوں کے، حاملہ خواتین اور بچوں کی پرورش کرنے والی ماؤں جو کہ سماج کے پچھڑے دیہاتوں اور گندی بستیوں میں رہتی ہیں، کی دیکھ بھال بھی کرتی ہیں۔ اس کے تحت اچھی غذا، بیماری سے حفاظت، صحت کی دیکھ بھال، چھوٹی بیماریوں کا مناسب علاج، تغذیہ اور عورتوں کی صحت کی تعلیم، ۳ سے ۶ سال تک کے بچوں کے اسکول جانے سے پہلے کی تعلیم جیسی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری سہولتیں جیسے پانی کی فراہمی، علم حفظان صحت وغیرہ بھی دی جاتی ہیں۔ ان خدمات کا مقصد ۵ سال سے کم عمر والے بچوں کی صحت اور تغذیہ کی ضرورتوں میں بہتری لانا ہے۔ اموات و امراض اور تغذیہ کی کمی کو دور کرنا، بچوں کی نفسیاتی، جسمانی اور سماجی نشو و نما کو بڑھاوا دینا اور دوسرے مقاصد ہیں جن پر کام ہو رہا ہے۔

اتر پردیش میں اس طرح کے پروجیکٹ سب سے زیادہ ہیں۔ اس کے بعد بہار، مہاراشٹرا، ویسٹ بنگال اور مدھیہ پردیش کا نمبر ہے۔ ناگالینڈ میگھالیہ، اروناچل پردیش اور میزورم کے قبائلی علاقوں میں اس طرح کی پروجیکٹس چل رہی ہیں۔

ICDC پروجیکٹس کو کامیاب بنانے کے لیے، بلاشک بہت زیادہ کوشش کی گئی ہے۔

آج ہندوستان میں ۶ سال سے کم عمر والے ۱۱۰ ملیون بچے ہیں۔ ان کے بچپن کے یہ سال ان کی شخصیت کی نشو و نما میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے ICDS کو مختلف اداروں کے ذریعہ نظرثانی کے پروسس سے گزرنا پڑتا ہے، جس میں منصوبہ بندی بھی شامل ہے۔

آج اس اسکیم کو شروع ہوئے دس سال ہو چکے ہیں۔ اس کی کارکردگی کے بارے میں غور و فکر مفید ثابت ہوگی۔ اگر آپ پروگرام کی کارکردگی کے ضمن میں ان اسناد اور رپورٹوں پر نظر ڈالیں جو کہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک کوآپریشن اینڈ چائیلڈ ڈیولپمنٹ (NIPCCD) کی طرف سے شائع کی گئی ہیں تو ان کے نتائج سے مایوسی ہی ہوگی جو اسکیم کی تعمیل کے بعد سے حاصل ہوئے ہیں گرچہ مختلف اداروں کا تعاون اس پروگرام کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہے۔ بیماریوں سے حفاظت، معائنہ صحت اور تعلیم حفظان صحت جیسی ضروری خدمات بمشکل ICDS میں دستیاب ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اسکیم کے مختلف اجزا، صحت، تغذیہ و تعلیم کے چلانے والوں میں اکثر مناسب تال میل کا فقدان ہوتا ہے۔ اگر تعلیم پر زیادہ زور دیا گیا تو بیوروکریٹک طریقہ کاری بنا پر مخصوص کیا ہوا فنڈ، کم عمر بچوں، حاملہ خواتین اور پرورش کرنے والی ماؤں تک نہیں پہونچتا۔ اس اسکیم کے تحت ابتدائی تعلیم ۳ سے ۶ سال تک کی عمر والے بچوں کے لیے اہم قرار دی گئی ہے۔ اس ضمن میں صحت اور تغذیہ جو بےحد ضروری ہیں زیادہ سے زیادہ بچوں تک پہونچنا چاہئے ہندوستان میں بچہ مزدور کا مسئلہ اس حد تک جا پہونچا ہے کہ ہر پروجیکٹ کے علاقے سے آشکار ہو



ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے سہولتوں فراہم کرنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔

مناسب کام کاج کی فراہمی کے لیے ٹریننگ ٹریننگ دینے والے اداروں پر نظرثانی ضروری ہے حقیقت ICDS کی کارکردگی میں مناسب ٹریننگ کمی، پروگرام کی تعمیل میں نقص کا سبب بنا ہے۔ ننگ نظریات کی بنیاد پر دی جاتی ہے اور ٹریننگ صل کرنے والے عملی تجربے سے محروم رہتے ہیں۔ وجیکٹ کی کامیابی کے لیے کام کرنے والوں کی ناسب ٹریننگ اور دیکھ ریکھ بہت ضروری ہے۔ بائیلڈ ڈیولپمنٹ پروجیکٹ کے افسران کو دہلی اور ں کے علاقائی اداروں بنگلور اور لکھنؤ میں ٹریننگ ی جاتی ہے۔ ۲۰ اوسط درجے کے مرکز NIDCCD ں، جماعی میں شیر دائرہ روں اور استادوں کو ٹریننگ یتے ہیں۔ اس کے زیر نگرانی تقریباً تین سو آنگن ڑی کے کارندے پورے ملک میں ریچ حاصل کر ہے ہیں۔ انڈین کونسل آف چائیلڈ ویلفیر ICCW) بھی تقریباً سو مرکز چلا رہا ہے صوبائی کومتیں اور کچھ رضا کار ادارے بھی مرکز چلا رہے ہیں۔

ہندوستان میں بچہ مزدوروں کی تعداد تقریباً ۲ ملین ہے جو پوری دنیا میں سب سے زیادہ ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ملک میں مزدوروں کی مجموعی ت کا ۶ فیصد حصہ بچہ مزدوروں پر مشتمل ہے زیادہ یہ زراعتی اور غیر منظم سیکٹروں میں ہے جو حفاظتی انین کے دائرہ سے باہر ہے۔ بچہ مزدوروں سے ہر رح کا کام لیا جاتا ہے، اور بدترین حد تک ان کا بے جا استعمال کیا جا رہا ہے۔ صوبائی حکومتیں اس سلسلے میں اپنے الگ الگ قوانین رکھتی ہیں۔ کن کمی یہ ہے کہ بچہ کی وضاحت ہر صوبے میں یک دوسرے سے جدا ہے۔ کچھ صوبوں میں بچہ کا مطلب ہے کوئی شخص جس کی عمر ۱۶ سال سے کم ہے۔ سوراشٹر اور ویسٹ بنگال میں ۱۸ سال سے کم اور آندھرا پردیش میں ۱۴ سال سے کم ہے۔ س صورت حال سے نمٹنے کے لیے فوری طور پر ایک انون کی ضرورت ہے۔ توقع یہ ہے کہ بچہ مزدور کے سلسلے میں قانون مرتب کرنے کا مرکزی حکومت کا رادہ، بچوں کی حفاظت اور ان کے بیجا استعمال کو روکنے میں مددگار ہوگا۔

یہ ایک حوصلہ افزا بات ہے کہ شیر خوار بچوں کی اموات ہندوستان میں ان ICDC پروجیکٹوں کے تحت ۸۸/۲ فی ہزار ہو گئی ہیں جب کہ قومی تخمینوں کے مطابق ۱۱۰ تھی۔ بچوں کے اسکول جانے کی تعداد میں بھی قابل ملاحظ ترقی ہوئی ہے۔ قبائلی علاقوں میں ان پروجیکٹوں کے وسیلہ سے سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ ICDC کے ادارے جو ٹریننگ دیتے ہیں ان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر ادارے رضا کارانہ ہیں جو موجودہ انسانی قوت اور دیگر بنیادی سہولتوں سے استفادہ کر رہے ہیں۔ لیکن ٹریننگ کا نصاب، اس کی دیکھ ریکھ اور نظرثانی ICDC کے سلسلے کا کمزور پہلو ہے کیونکہ اس سمت میں ابھی زیادہ کام نہیں کیا گیا۔ اس لیے ضرورت ہے اس بات کی کہ اسکیم کا ایک غیر جانب دار آزاد ادارے کے ذریعہ ملک گیر مطالعہ کیا جائے اور اس طرح کہ پلاننگ کمیشن فنڈ کے استعمال کو درست قرار دے سکے۔

ICDC کا اثر ان بچوں کی زندگی جو ان خدمات کے تحت آتے ہیں ان کی پیدائش کے وقت ان کے وزن، تغذیہ کی کمی کا ہو نا بیماریوں سے حفاظت اور شیر خوار بچوں کی اموات کی شرح میں کمی وغیرہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک بڑی آبادی جو غریبی کی لائن سے نیچے زندگی گزار رہی ہے اس کے لیے مناسب غذا فراہم کرنا یقیناً ایک ناممکن کام نظر آتا ہے۔ علاوہ اس کے مرد، عورت اور دوسرے بالغ افراد گھر کی خوراک کا بڑا حصہ ہضم کر جاتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کی سوچ میں جس کی وجہ سے لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ فرق برتا جاتا ہے، میں فوری طور پر تبدیلی آئے۔ متناقض طور پر اس پروگرام کا تیل سب سے پہلے عورتوں پر کی جانی چاہیئے کیوں کہ خاندان میں یہ عورت ہی ہے جو خوراک فراہم کرتی ہے اور بقیہ لوگوں کی دیکھ بھال کی بھی ذمہ دار ہے۔ یہ تبدیلی گھر ہی سے شروع کرنا چاہیئے۔ ہمیں توقع ہے کہ ساتویں پلان کے اختتام تک اس اسکیم کے دائرے میں تمام بچے آجائیں گے۔ ICDS ایک ایسے کلچر کی ترفیع اور تعاون کے لیے کوشاں ہے جس کا مرکز بچہ اور ماں ہے۔ یقیناً بچے کی صحیح نشو و نما، نفسیاتی، جسمانی اور طور پر اس طرح ممکن ہو سکے گی

○

# پہاڑی مقامات اور فنِ تعمیر

سنیت پال

برطانوی راج کے دوران پہاڑی علاقوں میں بہت سے صحت افزا مقامات دریافت کیے گئے۔ یہ کوشش اس قدر عیاشی کے لیے نہیں تھی جس قدر کہ ضرورت کے پیش نظر انگریز لوگ ہندوستان کے میدانی علاقوں کی سخت گرمی میں حسب معمول کام نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے ہم پر فتح تو حاصل کر لی تھی لیکن ہمارے ملک کی جھلسا دینے والی دھوپ کے آگے وہ جھک گئے تھے۔ شمال میں شملہ، ڈلہوزی، مسوری اور جنوب میں چی کنی، کنڈالا، مہابلیشور اور اوٹاکمنڈ کے ایسے مقامات ہیں جہاں پہاڑی علاقے کے برطانوی فن تعمیر کی کچھ بہترین مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

انگریزوں کے تعمیر کردہ پہاڑوں پر واقع ان صحت افزا مقامات میں سے ہر ایک اپنی خصوصی اور یگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ ہر ایک خطے میں جو تعمیراتی حلیہ انھوں نے تشکیل دیا تھا آج بھی دلآویز دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ڈیزائن اور ان کی تعمیر لازمی طور سے آب و ہوا، مقامی ساز و سامان اور پلاننگ کشادگی کے لیے ترجیحات پر مبنی تھے۔ عمارتی لکڑی، پتھر اور ٹائلیں وہ عام ساز و سامان تھے جو آسانی سے دستیاب ہو جاتے تھے۔ ان بالائی خطوں میں برف باری اور بارش کی کثرت کے پیش نظر انھوں نے ڈھلان دار چھتوں کو اپنایا تھا۔ عمارتی لکڑی جو جنگلات میں دستیاب تھی اسے اس وقت کی ٹیکنالوجی کے ساتھ موسموں کے موافق بنا کر بڑی مقدار میں فرشوں، دیواروں اور چھتوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ آرام دہ لکڑی کے ڈھانچے نہ صرف آسانی سے بنائے جا سکتے تھے، بلکہ گرد و نواح سے پوری طرح ہم آہنگ بھی تھے۔

ان وقتوں کے منصوبہ ساز بڑی بڑی کوٹھیوں اور دیگر عمارات کے لیے محل وقوع انتخاب کرنے میں خصوصی طور سے دھیان دیا کرتے تھے۔ خوشگوار مناظر، کشادہ گرد و نواح اور پرسکون جگہ کو اولین اہمیت دی جاتی تھی۔ کوٹھیوں کے بارے میں اگر ہم ان کے نقشوں کا مطالعہ کریں تو ان میں سے زیادہ تر کوٹھیوں میں ایک مشترک موضوع فروغ پذیر دکھائی دیتا ہے۔ ایک بلند سطح باغ میں داخل ہو کر ہم ایک کھلے دروازے والے برآمدے کے پاس آ جاتے ہیں جو ایک بہت کھلے ہال کو چلا جاتا ہے جو بیٹھک اور کھانا کھانے کے لیے اور اکثر سماجی اجتماعوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ہال کے دونوں طرف کنبے کے افراد کے لیے الگ الگ کمرے ہوتے ہیں۔ رسوئی گھر اور دیگر خدمات ان ذاتی رہائشی کمروں کے عقب میں ڈال دی جاتی ہیں۔ عجیب سی بات ہے کہ اگرچہ انگریز لوگ اپنے آپ کو کہیں دور کے باشندے تصور کرتے تھے، پھر بھی انھوں نے جو مکان بنائے وہ انہیں مقامات سے وابستہ تھے جہاں پیدا ہوئے تھے۔

چاہے رہائش کے لیے ہوں یا دفتروں کے لیے، اوائل میں تعمیر شدہ عمارات سے ان میں رہنے والوں کے حسن انتخاب، خصوصیات اور قوت کا پتہ چلتا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ ان عمارات سے ان لوگوں کے دل میں انسان اور فطرت کے باہمی ربط کے لیے فطری میلان کا پتہ چلتا تھا۔

ان صحت افزا مقامات کا فروغ و تعمیر ایک ہی طرز کا دیکھنے میں آیا ہے۔ ایک بڑی سڑک جسے عام طور سے مال روڈ کہا جاتا تھا، اہم بازار ہوا کرتی تھی۔ اس پر ایک اسکوائر ہوتا

شملہ میں برطانوی عہد کی ایک عمارت جو گرد و نواح سے اپنی ہم آہنگی اور جمالیاتی انفرادیت کی مظہر ہے

تھا جو مال روڈ کا مرکز اور سماجی شور و شغب کا مقام ہوتا تھا۔ کوہستانی سلسلوں کے مختلف رنگ و آہنگ کی نمائندگی کرتی ہوئی پیدل چلنے والوں کے لیے خصوصی پگڈنڈیاں تعمیر کی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر ڈلہوزی میں ایک پگڈنڈی ساری پہاڑی کا احاطہ کرتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ پگڈنڈی سیاحوں کو راستہ دکھا کر پہاڑی کے گرد ہر نکڑ سے روشناس کرا رہی ہو۔ صحت افزا مقام کو مہمان نوازی میں فروغ پانے کے لیے بنایا جاتا تھا تاکہ سیاحوں کو گرد و نواح کی مسرتوں سے بے روک لطف اندوز ہونے کی ترغیب حاصل ہو۔

بڑے صاحب لوگ ایسے مقام کے بالائی حصے میں رہتے تھے جبکہ نچلے حصوں میں مقامی لوگ رہتے تھے جو بڑے لوگوں کی عافیت اور عیاشی کا ساز و سامان مہیا کرتے تھے۔ بدقسمتی کی بات ہے اور شاید اس میں بے انصافی بھی ہے کہ انگریزوں نے ہماری پہاڑی کی ایکانت فضا کو محض اپنے لیے ہی مخصوص رکھا۔ تاہم انھوں نے ان خطوں کو اس قدر محفوظ و مخصوص رکھا کہ جب وہ یہاں سے گئے انہیں جوں کا توں ہمارے لیے چھوڑ دیا۔

ماضی کے عظیم صحت افزا مقامات آج ایک مختلف کہانی سناتے ہیں۔ آزادی کے بعد ہمارے ارباب تعمیر نے جو کاروباری اخلاقیات کی علامت ہیں، ان مقامات پر گڑبڑی مچا دی ہے۔ ہماری پہاڑیوں پر وہ صحت افزا مقامات نہیں رہے ہیں، اب تو وہ شور و غل سے بھری ایسی جگہیں ہیں جو ایک ناخوشگوار فرسٹ قیام ہی پیش کرنے والی ہوا کرتی ہیں۔ ہمارے تجارتی سربراہ جب پکے چہچہے الفاظ میں سیر و سیاحت کی فراوانی کے نام سے مشتہر کرتے ہیں وہ محض بڑے کاروبار کی طرف سے ایک ایسی پُراسراری کا اشتباہ ہو

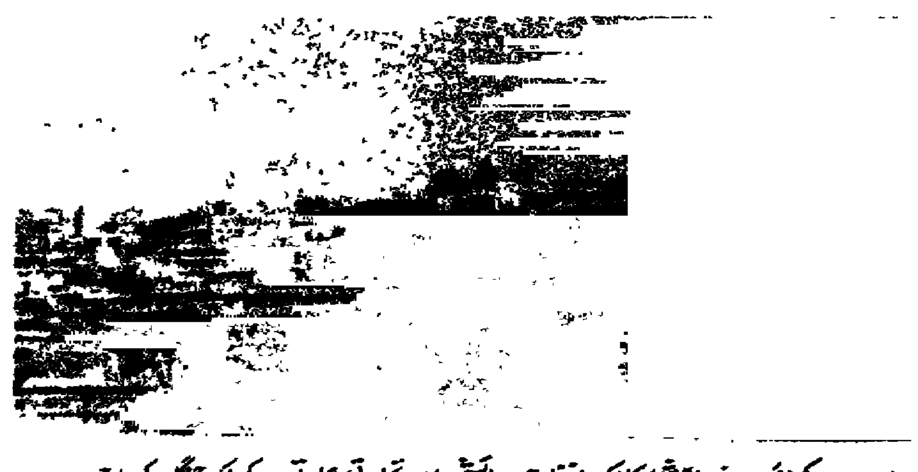
کے تحت خوبصورت، زندگی سے بھرپور پہاڑیوں
بنانے کے کرہے اور سیاہ بلاکوں کے نیچے زندہ درگور
جاتا ہے۔ اگر پہاڑوں پر واقع عمارات خود پہاڑوں
رنہ ہوں اور اس ماحول ہی سے ابھرتی ہوئی دکھائی
یں تو آنے والے سیاح ذہنی طور پر اپنے آپ کو شہری مراکز
بچتے ہوئے محسوس کرتے چلیں گے جہاں سے بھاگ کر
یہاں پناہ لینے آتے ہیں۔

ہمارے کاروباری ارباب کو درحقیقت سیر و سیاحت
کے شائقین کو بھگوڑوں کے لیے متعین پناہ گاہوں کے علاوہ
فراہم کرنا ہوتا ہے اور وہ ہے انہیں مقامی آب و
جبلا ک سانس لینے کا موقع۔ لیکن جیسا کہ دیکھا
ہے کاروباری مفاد کے لیے ان کا بڑی تیزی سے
بت تعمیر کرنا، ایسی عمارتوں کے لیے ڈیزائن سازی
جو ان عمارتوں کے بنیادی اصولوں سے ماورا ہوتا
ان مقامات کی توسیع کا کام بے تکا سا کیا جا رہا ہے
یہ کاری محض تھوڑی سی جگہوں پر ہے جب کہ ہر جگہ
سے قطع نظر کیا گیا ہے۔ ہمارے ارباب تعمیر کے لیے
کی کنٹرول کے ضوابط اور جمالیات ثانوی ماہیت کے
ہیں۔ اگرچہ پہاڑوں کی ڈھلانوں پر دلکش نوعیت
ارات تعمیر کرنے کے لیے بڑی مثالی گنجائش ہوتی ہے۔
ے صحت افزا مقامات کی تصویر بہت ہی زیادہ پُرنور
ئے اگر ہمارے کاروباری ارباب اپنے کام میں تخلیقی
یت کے مناسب حصے کو گنجائش دیں۔

آج کی حالت تو قدرے شدید ہے۔ صحت افزا مقامات
انی شان و شوکت، ابتدائی خصوصیت اور طرز تعمیر رنگ
ہوتے رہے ہیں۔ شملہ کی مثال لیجیے جو شاید ہمارا سب

سے زیادہ مقبول عام مقام ہے۔ دور سے دیکھا جائے تو
یہ ایک خشک اور دھول بھرے پہاڑ پر عمارتوں کا ڈھیر سا
معلوم دیتا ہے۔ چاروں طرف زیادہ سے زیادہ تعمیر کے لیے
جنگلات صاف کیے جا رہے ہیں۔ تجارتی کاروبار اس قدر بڑھ
گیا ہے کہ جگہ اور سہولیات سے قطع نظر ہوٹل اور اپارٹمنٹ
کی تعمیر ہر جگہ سر اٹھا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر بھی بڑا غصہ آتا ہے
کہ پہاڑی علاقوں میں تعمیر کے لیے کنکریٹ کے کالم اور بیم کے

طریقہ تعمیر کے بجائے سیمنٹ کے کالم اور بیم کا طرز اپنایا جا رہا
ہے۔ عمدہ ڈھلانی چھتوں کی بجائے چپٹی سیمنٹ کی چھتیں پڑ
رہی ہیں۔ آب و ہوائی حالتیں نہ تو مالک مکان اور نہ ہی
فن تعمیر کے ماہر کی سوجھ بوجھ پر اثر کرتی نظر آتی ہیں اور فن
تعمیر کا ماہر نہ تو ایک فن کار کی حیثیت سے اپنے تاثر کی پرواہ
کرتا ہے اور نہ گرد و پیش پر اپنی تخلیقات کے اثرات کی۔
اس کے لیے محض اپنی فیس کو جلد حاصل کرنا بڑی اہم بات ہے۔



دور سے دکھائی دینے والا شملہ کا ایک منظر جو رہائشی اور تجارتی عمارتوں کے ایک جنگل کی طرح ہے

ان لوگوں کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ایسی ہر ایک عمارت ایک
زندہ پہاڑی سلسلے پر پھپھولے کی چوٹ کی طرح ہے جو کہ دھیرے
دھیرے اس کا خون نچوڑ لیتی ہے۔

ایک وقت تھا کہ ہمارے صحت افزا مقامات محدود
سی رونق اور محبوبیت کی تصویر ہوا کرتے تھے اور یہ گرمیوں
کے دنوں میں بھلی بازار بنے ہوئے ہیں، جب لوگ جلتے میدانوں
کی گرمی کے مارے یہاں بڑی تعداد میں آ جاتے ہیں۔

سارا سال پہاڑیوں کو نوجوان جوڑے گھپا ڈل
کی طرح استعمال کرتے ہیں، جو اپنی دیوانی نظریں ایک
دوسرے پر توجمائے رکھتے ہیں، لیکن ادھر اُدھر کے مناظر
پر نظر نہیں کرتے۔ اگر میونسپل کمیٹی کے حکام اپنے فرض کے تئیں
بیدار ہو جائیں اور اپنے نئے تعمیراتی کام میں معقولیت سے
کام لیں تو رہن سہن کے خوشگوار ماحول میں سیاحوں کو پہاڑوں
کے قدرتی حسن کے بہت قریب لا سکتے ہیں۔ صحت مند رہن
سہن مہیا کرنا یقیناً اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ صحت افزا مقام
میں داخل ہوتے ہوئے چنگی کا محصول وصول کرنا۔

فطرت نے ان پہاڑی مقامات کو اپنی حیرت انگیز
خوبصورتی عطا کرنے میں بڑی فراخدلی کا اظہار کیا ہے اور
انسان کو اپنے ذرائع روں کی بدولت قدرت کے اس
نادر عطیے کو زیادہ موثر بنانے کی سعی کرنی چاہیے۔ آج کی
ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے ان تفریحی مقامات کی دلکشی اور
کردار کو ہر قیمت پر بحال کریں۔ اس کے پہلا قدم یہ ہونا
چاہیے کہ مقامی انتظامیہ عمارتوں کے محل وقوع اور کوالٹی
کا فیصلہ کرتے ہوئے زیادہ ثابت قدمی سے کام لے۔ اس
کے علاوہ حکام کو چاہیے کہ وہ اپنے شہری ڈھانچے کو سیاحوں
کی آمد کا مد مقابل بنائیں اور سیاحوں کی تعداد کو ہمارے
مقبول عام تفریحی مقامات میں کھلانے پلانے کی گنجائش و
صلاحیت تک ہی محدود رکھیں۔ یہ کام بڑی آسانی سے کیا
جا سکتا ہے۔ اگر حکومت دوسرے ایسے مقامات کا فروغ عمل
میں لائے اور انہیں مرغوب بنائے جو ابھی اچھوتے ہیں یا نسبتاً
کم جانے پہچانے ہیں۔

شملہ اور سری نگر کو ہر موسم میں رو پذیر ہونے
والے بحران اور بدحالی سے ضرور نجات دلائی جائے
کیونکہ لوگوں کے لیے کسی دور کے مقام پر جانا میسر نہیں آتا
یہ واقعی ایک المیہ ہے کہ پہاڑوں کے بہت سارے قدرتی
حسن کے باوجود گزشتہ دہائیوں کے دوران سیاحوں
کی عافیت کے لیے بہت ہی کم مقامات کی نشاندہی کی گئی
ہے اور انہیں مناسب طور سے سنوارا گیا ہے۔ اچھے کام
کرنے کے لیے تاخیر کا عذر بے سود ہے۔ ضرورت اس بات کی
ہے کہ ان رجحانات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے جو ہماری جیتی
جاگتی خوبصورت پہاڑیوں کو فنا کرنے کے درپے ہیں۔



DIGJAM

اداریہ

# میزو نیشنل فرنٹ کی کامیابی

میزو نیشنل فرنٹ نے حالیہ چناؤ میں قطعی اکثریت حاصل کرکے یہ ثابت کر دیا کہ میزورم کے عوام کی بھاری اکثریت لال ڈینگا کی رہنمائی کو قبول کرتی ہے۔ تک بھگ ۲۰ برس کی پُرتشدد سرگرمیوں کے بعد وزیر اعظم نے لال ڈینگا صاحب کے ساتھ مصالحت کرکے کافی دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ اس مفاہمت سے میزورم جیسے حساس سرحدی علاقے میں، جہاں غیر ملکی طاقتیں اپنے اثر و رسوخ سے تشدد اور تناؤ کے ذریعہ ملکی یک جہتی کو نقصان پہونچانے کی اہمیت رکھتی تھیں امن و آشتی کا ماحول بن چکا ہے۔ حالیہ چناؤ کے نتائج سے یہ صاف ظاہر ہے کہ لال ڈینگا مفاہمت میزورم عوام کے جذبات کی ترجمان ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میزورم کو مرکزی علاقے کی بجائے صوبے کی حیثیت دیئے جانے سے بھی عوام کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی ہونے کی امید ہے۔

البتہ کانگریس (آئی)، جس نے میزورم اسمبلی میں صرف ۱۳ نشستیں حاصل کی ہیں، کو کس کی مخالفت کا [illegible] ہے۔ لال ڈینگا صاحب نے [illegible] [illegible]

[illegible]

ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ملک کی مجموعی فلاح کے لیے [illegible] طرز فکر میں بھی تبدیلی لائے اور لال ڈینگا صاحب کے اس خدشے کو دور کرنے کی کوشش کرے کہ مقامی کانگریس ان کے راستے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ جب ملک کا وسیع تر مفاد پیش نظر ہو تو وقتی طور پر جماعتی مفاد کو قربان کرنا پڑتا ہے [illegible] ملک کی سیاست ملک کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

شمال مشرق کا سرحدی علاقہ ہندوستان کے جغرافیہ میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سارے علاقے کو چھوٹے چھوٹے صوبوں اور مرکزی علاقے میں تقسیم کرنے کا عمل اس حقیقت پر مبنی تھا کہ ان علاقوں [illegible] رہنے والے لوگ جو نسلی طور پر اپنی [illegible] رکھتے ہیں یہ محسوس کر نا شروع کریں کہ ان کے [illegible] ہندوستان کے باقی صوبوں کی طرح [illegible] اپنی خواہش کے مطابق حکومتیں [illegible] [illegible]

[illegible]

# احباب کہتے ہیں

بلاشبہ حالِ ہند میرے لیے نئے سال کا ایک حسین اور گراں قدر تحفہ ہے۔ آپ نے اپنی کاوشوں سے اس نیوز میگزین کو ایک مکمل اور معیاری جریدہ بنا کر پیش کیا ہے میرے خیال میں یہ ہندوستان کا واحد رسالہ ہے جو کسی بھی زبان کے معیاری رسالوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ رسالہ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مصداق ہوگا۔ میں آپ کی جرأت ذہانت اور حوصلہ مندی کی داد دیتا ہوں۔ خدا اس بے مثال جریدے کو قایم و دایم رکھے۔ آمین

مناظر حسن شاہین
گیا۔ (بہار)

حالِ ہند آپ (ظفر صاحب) کی تابناک سیاسی اور علمی زندگی کا یقیناً آئینہ دار دکھائی دیتا ہے۔ یہ ریاستی عوام کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ ایسے تابناک اور مخلص سیاسی رہنما، حالِ ہند جاری رکھ کر دوبارہ جہد سے ان کی خدمات کے لیے منظرِ عام پر آگیا ہے۔ یقیناً اس کا صحافتی معیار اس قدر قابلِ رشک ہے کہ چند ہی مہینوں میں اس کا شمار ملک کے معیاری رسائل میں ہو چکا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ملک کے کونے کونے سے اس کی طلب کے لیے آوازیں آ رہی ہیں۔ اگر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] خدمت کے لیے ایک [illegible]

[illegible]

حالِ ہند اردو کا پہلا نیوز میگزین ہو، ہر جو، ریاست جموں و کشمیر کا واحد اعلیٰ ترین ظفر صاحب جیسا اردو صحافی اس کے اوراق کی بدولت اس وقت سارے ہندوستان کی صفِ اول میں شمار ہوتا ہے۔ حالِ ہند نیوز میگزین کیا نکلا ہے جس کا انتظار بے تابی سے کیا جاتا ہے۔ یہ جریدہ سیاسی، معاشی، اخلاقی، ثقافتی اور خاص کر اردو صحافت کے ہر پہلو کو چھوتا ہے اور مجموعی طور سے نہایت دل کش ہے۔ اس جریدے کی روز افزوں ترقی کا دعا گو ہوں۔

عبدالعزیز بالی
رام بن، ادھمپور، کشمیر

حالِ ہند کا شمارہ بابت دسمبر ۱۹۹۴ء ایک دوست کے یہاں دیکھا۔ پہلی نظر ہی میں، میں اس ماہنامے کا گرویدہ ہوگیا۔ اس کی ترقی و توسیعِ اشاعت کے لیے تمام تر نیک تمناؤں کے ساتھ میں ہوں شیدائے اردو کا ایک [illegible]

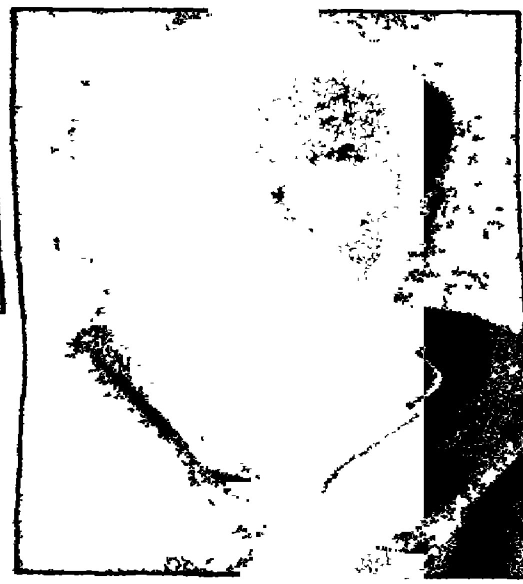
عظیم [illegible]
میسور

حالِ ہند کا پہلا [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible]

# فہرست







# مخالف جماعتیں اور ملکی سیاست

## بھارتیہ جنتا پارٹی

[illegible]
[illegible] ہے۔

## ایل کے ایڈوانی (صدر بھارتیہ جنتا پارٹی)

کسی بھی جمہوریت میں حزب اختلاف کو بڑا اہم رول ادا کرنا ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ عوام کی جانب سے ایک نگراں کی حیثیت سے حکومت کی کارکردگی پر نظر رکھتا ہے، اور دوسری طرف پالیسی، حکمت عملی، قیادت اور نظام کے متبادل



پیش کرتا ہے۔ بہت سے لوگ صرف دو جماعتی نظام کے [illegible] ہیں۔ ان کے مطابق ہندوستان کے لیے متبادل نظام حکومت یہی ہو سکتا ہے۔ میرا نظریہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہندوستان میں قومی سطح پر دو جماعتی نظام سرے سے ہی ناقابل عمل نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حزب اختلاف کی سرگرمیوں کے اعتبار سے ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۹ء تک کا دور سب کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ اس دوران حزب اختلاف نے کانگریس کی مرکزیت کو بے نقاب کیا [illegible] کانگریس [illegible] کی [illegible] کیونکہ [illegible] نظر نہیں آیا۔

دراصل [illegible] مخالف جماعتوں نے [illegible] سیاسی جماعتوں [illegible] کانگریس کی [illegible] کانگریس [illegible]

گر اقلیتوں [illegible] قیادت [illegible] پالیسیوں اور دیگر [illegible] متبادل پیش کرتی۔

پنجاب کے مسئلے کے سلسلے میں بھی میں حزب اختلاف کی دیگر جماعتوں سے اختلاف رکھتا ہوں۔ میں حزب اختلاف کے ساتھ اس نکتہ پر تو اتفاق کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ صرف موجودہ صورت حال سے تیزی سے ابھرا ہے کہ سلسلے میں حکمراں جماعت کے غلط رویہ کی بنا پر [illegible] آیا ہے۔ تاہم میں یہ رائے بھی رکھتا ہوں کہ اکالی اور کانگریس دونوں ہی اس معاملے میں مساوی طور پر ذمہ دار ہیں اور آج جب کہ یہ واضح ہو گیا ہے کہ اب نرم رویہ سے کام چلنے والا نہیں تو پھر سختی برتنی ہی پڑے گی۔ اگر اب بھی نرمی برتی جاتی رہی تو اس سے بے اطمینانی اور بڑھے گی۔

## نیشنل کانفرنس اور کانگریس (آئی)

دونوں کے نقطہ نظر سے یہ نیا گٹھ جوڑ اعلیٰ پیمانے کی موقع پرستی کا نمونہ ہے۔ لیکن کانگریس کے نقطہ نظر سے یہ اقدامات اس کی بڑھتی ہوئی کمزوری کا مظہر ہیں۔ مقبولیت میں کمی اور اپنی پارٹی پر گرفت ڈھیلی ہونے کے سبب ہی شری راجیو گاندھی کو شری کشمیر پور کو خوش آمدید کہنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر فاروق عبد اللہ کے معاملے میں ابھی چند ماہ پہلے تک سارے کانگریسی انھیں برا بھلا کہہ رہے تھے، اور راتوں رات، اچانک کانگریس نے ان کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ یہی نہیں کانگریس نے جموں و کشمیر میں انھی کی قیادت میں انتخاب لڑنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔

بار بار کیے جانے والے وزارتی ردوبدل اس حکومت کی مجموعی خامیوں کا جو شریک سے ایک حصہ رہے ہیں، اور میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی ناکامی یہی ہے، اس کی کوئی سمت ہی نہیں ہے اور نہ کوئی مجموعی تناظر ہے۔ حکومت کا روبہ کام چلاؤ قسم کا ہے۔

جہاں تک لوگوں کی توقعات اور خواہشات کا تعلق ہے تو دو برس قبل راجیو گاندھی نے عامی اونچی بلندی سے سفر شروع کیا تھا۔ اور جب ان کے سامنے نشیب میں چلنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے اور وہ تیزی سے سائل پر زوال ہیں۔

میرا خیال ہے کہ عوامی زندگی اور حکومت میں کامیابی کے لیے لوگوں کے احساسات سے جڑی واقفیت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی قیادتی [illegible]



اور بعض چیزوں کے سلسلے میں ٹھوس رویہ ضروری ہے اور شری راجیو گاندھی کے یہاں اس کا فقدان [illegible] ہوتا ہے۔

ہمارے وزیر اعظم نے فیاضیوں کا جو سلسلہ اعلانات وغیرہ شروع کیا ہے وہ غلط بھی ہے اور نا پختہ کاری بھی، اور یہ بھی طے ہے کہ اس سے ان کی ایک صاف ستھرے سیاست داں کی وہ تصویر بھی مسخ ہوئی ہے جس کے ساتھ انھوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تھا، اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اکثر معاملات میں تو رقمیں پہلے ہی منظور کی جا چکی تھیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے گزشتہ سال انھوں نے بمبئی شہر کے لیے جس سو کروڑ روپے کی رقم کا اعلان کیا تھا، اسے کسی بھی جانب سے منظوری حاصل نہیں ہوئی تھی۔

میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ ہم ایک حقیقی متبادل پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں، اور کانگریس نے اس کا فائدہ اٹھایا ہے، کیونکہ متبادل بننے میں وقت لگتا ہے، بعض متبادل صورت حال کی پیداوار بھی ہوتے ہیں، ورنہ کسی سیاسی جماعت کو صحیح معنوں میں پروان چڑھانے کے لیے وقت اور مسائل دونوں کی ضرورت ہے، [illegible] کام صرف ہم کر رہے ہیں یا پھر کمیونسٹ کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں اکثر سیاسی جماعتیں کانگریس سے ٹوٹ کر الگ ہونے کے بعد وجود میں آئی ہیں، ظاہر ہے کہ اس صورت میں زیادہ کچھ توقع نہیں کی جا سکتی۔

موقع پرست جماعتیں صرف [illegible]

ہیں۔ اس سلسلے میں [illegible]

[illegible]

بات یہ ہے کہ [illegible] ملک کے [illegible] حصول
ہی محدود ہے۔ مارکسی کمیونسٹ پارٹی [illegible]
رہ سکتی ہے کہ دوسری جماعتوں کے مقابلے میں اس کے
پاس ایک متبادل نظریہ ہے جو کہ نظریاتی شناخت ہے
پارٹی کی قیادت کا دعویٰ ہے کہ قومی سطح پر پارٹی نے
کافی پیش رفت کی ہے۔ ان کا اشارہ طلباء اور [illegible]
کی تحریکات کے فروغ کی جانب ہے۔ بہرکیف ہم اس
بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ طلباء کی یہ تحریکات کتنی
صحت مند ہیں۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ
بنگال اور کیرلا کے آئندہ انتخابات قومی سطح پر مارکسی
کیمونسٹ پارٹی کی حیثیت و مرتبے پر کوئی خاص اثر نہیں
ڈالیں گے، خواہ وہ ان انتخابات کو کتنی ہی آسانی سے کیوں
نہ جیت لیں۔

## ہری کشن سنگھ سرجیت ممبر پولٹ بیورو، مارکسی کیمونسٹ پارٹی

جب تک قومی حزب اختلاف کی جماعتیں بنیادی تبدیلیوں کے لیے کسی متبادل پروگرام کے ساتھ سامنے نہیں آتیں، اس وقت تک صحیح معنوں میں کسی متبادل کے ابھرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہی جنتا حکومت کا تجربہ رہا ہے، اس کی عمر تین برس سے زیادہ نہیں ہوسکی کیوں کہ ابتدا میں اس حکومت نے ایمرجنسی کے دور کے ڈھانچے کو توڑنے کے لیے تو بہت کچھ کیا گیا مگر اس کے پاس کوئی متبادل اقتصادی پروگرام نہیں تھا۔

ریاستوں میں انتخابات ایک الگ ہی مسئلہ ہیں، آئندہ انتخابات کے دوران کم سے کم دو ریاستوں (بنگال اور کیرالا) میں اصل لڑائی ہمارے اور کانگریس کے درمیان ہے، اور ہمارا منصوبہ صاف ہے۔ یعنی کانگریس کو اقتدار سے محروم رکھنا۔ بنگال میں پارٹی میں کچھ توڑ پھوڑ ہوئی تھی، مگر اب ہم نے اس پر قابو پا لیا ہے۔ جہاں تک کیرالا کا سوال ہے تو وہاں کانگریس نے صرف ذات پات اور فرقہ وارانہ طاقتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے بل پر اپنا اقتدار برقرار رکھا ہے۔ اب آپ یہی دیکھئے کہ بابری مسجد کے معاملے میں انڈین یونین مسلم لیگ نے واضح موقف اختیار کیا اور بابری ایکشن کی حمایت کی، مگر کانگریس نے پھر بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا۔ جہاں کانگریس نے نظریات کا کام کیا ہے [illegible] کانگریس صرف اس لیے اقتدار کے ساتھ چپکی ہوئی ہے کہ [illegible]

کانگریس بہرحال اب ایک چھوٹے سے علاقے میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ اب یہ وہ کانگریس نہیں رہی ہے، جو [illegible] کانگریس کو ملنے والی فتح صرف مسز گاندھی کی قیادت کے طفیل میں آتی۔

پانچ ریاستوں میں ہونے والے انتخابات میں کانگریس کا حال بہت برا رہے گا، لیکن اس کا تعلق قومی منظر نامے سے نہیں ہوگا۔ تمام ریاستوں میں [illegible] انتخاب کرا کر الیکشن کمیشن ایک بڑی [illegible] قائم کر رہا ہے۔ آج یہ چھ ریاستوں میں ہورہا ہے کل سولہ ریاستوں میں ہوگا۔

جہاں تک صدارتی طرز حکومت کا سوال ہے تو میں اس سلسلے میں کھلے ذہن کے ساتھ غور کرنا چاہتا ہوں لیکن [illegible] اس کی حمایت نہیں کی ہے۔ میں نے صرف ایک کمیشن کے قیام کی تجویز رکھی ہے، اور ملک میں سرگرم عمل انتشار کی قوتوں کو دیکھتے ہوئے یہ معاملہ ایسے معاملات میں سے ایک ہے جن کا از سر نو جائزہ لیا جانا چاہیئے۔

## مارکسی کیمونسٹ پارٹی

بنگال اور کیرالا میں ہونے والے انتخابات [illegible] ترکی بہ ترکی میں شورش پسندانہ سرگرمیوں کے [illegible] سے محروم [illegible] جانے کے بعد آج کل مارکسی کیمونسٹ پارٹی پھر کشتی میں آگئی ہے۔ یہ پارٹی [illegible] کانگریس سے [illegible]

وادی میں شدت پسندی کو فروغ ہوا ہے۔ پہلی بار فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، اور یہاں کی اقلیتوں کے دلوں میں جان و مال کا خوف ہے اور انھوں نے (نیشنل کانفرنس اور کانگریس) جو موقف اختیار کیا ہے وہ ملک کے اتحاد کے کاز کے لیے سخت مضر ہے۔

راجیو گاندھی کی کارکردگی کا جائزہ ان وعدوں کی بنیاد پر لیا جا سکتا ہے جو عوام سے کیے گئے تھے۔ ابتدا میں بڑا جوش و خروش تھا، وہ لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے کوشاں بھی تھے۔ کم از کم ایسا تاثر ضرور تھا۔ بہرحال اب ان کے خلاف بگڑتی ہوئی اقتصادی [illegible] اقدامات وغیرہ۔ (اگر آپ ان کی بنیاد پر فیصلہ کریں تو) کے بعد اب ہم پریشانی میں پڑ گئے ہیں، اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔

وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ [illegible] ہیں، وہ کسی منصوبہ بند حکمت عملی کے تحت نہیں آتی۔ جہاں تک بنگال کا سوال ہے ہم وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انھیں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ [illegible] معاملات طے ہو چکے تھے [illegible] اعلان کر دیا ہے [illegible] کرنے کا مقصد محض حکومت کے [illegible] اجاگر کرنا ہے۔

[illegible]

... ہے ... [illegible] ... جماعتوں نے مشترکہ طرز حکومت کی بحالی ... [illegible] ... اب [illegible] ضروری ہو گئی ہے۔

کانگریس کی سیاست کی ناکامی واضح ہے، کسی ... [illegible] ... پشت پناہی کے لیے عوام کو تحریک ... [illegible] ... ہے۔ ... ایک ... [illegible] ... کانگریس ... تیار کیا تھا لیکن

پنجاب میں کانگریس کی ... [illegible] ... آپ جانتے ہیں کہ ساتھ ملی ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہ ٹی۔ این۔ وی کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ ... [illegible] ... کانگریس ... آپ جانتے ہیں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ تریپورہ کے وزیر اعلیٰ نے اس سلسلے میں خاصی معلومات فراہم کی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ٹی۔ این۔ وی نے اپنی

ایمرجنسی کا سہارا لیا تھا۔ اور اب جب کہ کانگریس کی کمزوری بڑھ گئی ہے تو اب یہ لوگ ایک ... [illegible] ... طریقہ سے اس صورت حال کو نمٹانا چاہتے ہیں۔

قومی اتحاد کے لیے یہ مسئلہ کے مترادف ہے — [illegible] صدارتی طرز حکومت کو اس کے حل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ مارکسی کمیونسٹ پارٹی اس کی مخالف ہے۔ صدارتی نظام میں نہیں ہے، بلکہ حکمراں پارٹی ... [illegible]

وہ حزب اختلاف، اس پارلیمان وراسمبلی کے سلسلے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ وہ مشترکہ اقدامات کے سلسلے میں بھی سنجیدہ نہیں ہیں۔ وہ تو صرف واؤں پیچ سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ کوئی علاقائی پارٹی اگر ایک متبادل پروگرام لے کر آتی ہے تو لوگ اس کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ... [illegible] ... ہو جاتے ہیں۔ عوام اب زیادہ باشعور ہو گئے ہیں، اب وہ اپنی بات پر زور دیتے ہیں، جو پارٹیاں ان کی خدمت نہیں کرتیں انھیں وہ مسترد کر دیتے ہیں۔

مارکسی کمیونسٹ پارٹی کا موقف، گورکھا لینڈ تحریک ... [illegible] ... ملک دشمن کیوں کہا جا رہا ہے۔ جب ... [illegible] ... پارٹی اپنے مسائل کے حل کے ... [illegible] ... کو غلط ... تو آپ اسے کیا ... [illegible] ... [illegible] ... [illegible] ... ان ... [illegible]

سرگرمیوں میں اضافہ کیا ہے اور بنگلہ دیش کی حکومت بھی اس کی پشت پر ہے۔ ممکن ہے کہ میزو بھی وسطے سے بھی ٹی۔ این۔ وی کے ممبروں کی حوصلہ افزائی ہوئی ہو، کیوں کہ وہ لال ڈینگا، انتخاب کے لیے غیر ملکی سر زمین اور غیر ملکی سامان استعمال کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کے ساتھ سمجھوتہ کیا گیا۔

پنجاب میں بھی مرکزی حکومت صرف انتقامی اقدامات کے سلسلے میں غور کر رہی ہے۔ پنجاب میں معاملات کی کلید یہ ہے کہ اقلیتوں میں اعتماد پیدا کیا جائے۔ جب تک یہ نہیں ہو گا، کوئی حل برآمد نہیں ہو سکتا، عوام کو سرگرم کار کرنے کے لیے معاہدہ پر فوراً درآمد ہونا چاہیے۔ ویسے بھی معاہدہ میں وقت کا تعین کیا گیا تھا۔

صدارتی طرز حکومت کے سلسلے میں اتنی بحث مباحثہ کیوں ہے؟ حزب اختلاف اپنے وعدوں کو نہیں دیکھتا، اور دوسرے راستوں کی تلاش میں ہے ... [illegible] ... انھوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے

ہے، جو اپنے اقتدار کو دائمی بنائے رکھنا چاہتی ہے۔

مارکسی کمیونسٹ پارٹی کی کامیابی کا دائرہ صرف کیرالا، بنگال اور تریپورہ تک محدود ہے، کیوں کہ ہماری ترقی اس طرح ممکن نہیں جس طرح دوسری بورژوائی قومی جماعتیں کرتی ہیں، ہم تو پورے سماجی نظام کو ہی سرے سے بدل دینے کی بات کرتے ہیں۔ طلبا، اور خواتین کی تحریکات کو ہی دیکھئے، انھیں فروغ حاصل ہوا ہے۔ ہماری طاقت کو ... [illegible] ... وشمار سے ہی نہیں ناپنا چاہیے۔

میرے خیال میں کانگریس ... [illegible] ... قومی سطح پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکے گی۔ ... [illegible] ... ہے اور اس کی ... [illegible] ... ہیں۔ ... [illegible] ... کانگریس ... [illegible] ... پارٹی ... [illegible] ... [illegible]

## اکالی دل

[illegible]

## [illegible] والیا

[illegible]



نہیں کیا جا سکتا۔

[illegible]

## [illegible] — وزیر اعلیٰ آسام

علاقائی سیاسی جماعتوں کا اپنا نظریہ ہے۔ ہم ابھی [illegible] کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ قومی سطح کی مخالف [illegible] اپنا اثر کھو رہی ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ [illegible] نہیں [illegible] دیکھیے یہ بڑا ہی مختصر [illegible] ترقی کے لیے [illegible] نہیں [illegible] علاقائی [illegible] ہیں۔

مخالف جماعتوں کو ملک اور قوم کی ترقی کے [illegible] سوچنا چاہیے۔ انہیں اقتدار کے لیے [illegible]

[illegible]

گئی۔ پنڈت نہرو کے عہد میں تو علاقائی قائدین قومی سطح کے قائد بھی ہوا کرتے تھے۔ اب راجیو گاندھی کے سوا کوئی قائد ہی نہیں ہے، کوئی شخص علاقائی جذبات واحساسات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔ جو علاقائی نعرے لے کر اٹھتا ہے، وہ علاقائیت کی لہر میں بہہ جاتا ہے۔ ایسا کوئی بندوبست ضرور ہونا چاہیے جس سے سیاسی مرکزیت کو غیر مرکوز کیا جاسکے۔

گزشتہ دو برس میں انھوں نے خود کو کانگریس پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے مستحکم کیا ہے، جو چیز اہم ہے وہ ہے 'کلی'، اور کوئی گروپ اہم نہیں ہے، اور نہ ہی پالیسیاں اور نظریات اہم ہیں، ان کے طریقۂ کار کے تحت تمام پرانے رہنما، مثلاً کملاپتی ترپاٹھی، سیاسی بن باس میں ہیں ـــــ شری راجیو گاندھی جو امدادی رقوم عنایت فرما رہے ہیں، یہ بھی انتخابات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے۔ اس مسئلے پر میں مزید کوئی رائے زنی کرنا نہیں چاہتا۔

میرے خیال میں مستقبل قریب میں حزب اختلاف میں کوئی اتحاد نہیں ہوسکے گا، کیوں کہ وزیر اعظم کے پاس ایک حکمت عملی ہے، اور حزب اختلاف میں اس کا فقدان ہے ـــــ وزیر اعظم ان تمام لوگوں کا دل جیتنے کی کوشش کر رہے ہیں جو کسی بھی اعتبار سے اہم ہیں یا جن کا کوئی مقام ہے۔ حالیہ انضمام واتحاد بھی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ حزب اختلاف کے قائدین جو وزیر اعظم کے خلاف اس شدت کے ساتھ بولتے تھے، وہ اب ان کے شریک کار بن چکے ہیں۔ اس سے حزب اختلاف کے وقار کو مجموعی طور پر نقصان پہنچا ہے۔

حزب اختلاف حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے میں بھی ناکام رہا ہے۔ یہ لوگوں کو متاثر کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔ پنجاب کی ہی مثال لے لیجیے۔ اس مسئلے کو اس کی پوری گہرائی اور شدت کے ساتھ سمجھا ہی نہیں گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے قتل و غارت کا سلسلہ بند ہو، اس کے بعد کوئی سیاسی حل نکالا جاسکتا ہے۔ تو کیا آپ کے خیال میں ہمارے پاس کوئی جن ہے جس کے بند کردینے سے قتل و غارت کا یہ سلسلہ بند ہو جائے گا؟ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ دراصل بعض کارروائیوں کا ردِ عمل ہے۔ لہٰذا حکومت کو کھلے ذہن اور مستحکم عزم کے ساتھ سامنے آنا چاہیے، تاکہ انتہا پسند قوتوں کو الگ تھلگ کردینے میں مدد مل سکے۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں میں حکومت کے عمل اور اس کی کارکردگی کے تئیں اعتماد بھی پیدا ہوگا۔ آج ہمیں سیاسی دور اندیشی

توقع کیوں کی جاتی ہے کہ ہم تنہا لڑیں گے۔ ۰ا فی صد شر پسندوں کے لیے ۹۰ یا ۹۹ فی صد عوام کو کیوں مورد الزام قرار دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے تو علاحدگی پسندی کا رجحان اور بڑھے گا، اور اس سے دہشت پسندوں اور شر پسندوں کا خواب ہی پورا ہوگا۔ اب یہ سوچنا سیاسی آقاؤں کا کام ہے کہ وہ ریاست کے عوام کے دل جیتنا چاہتے ہیں یا صرف انتخاب۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد ہی ملک میں امن وامان کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

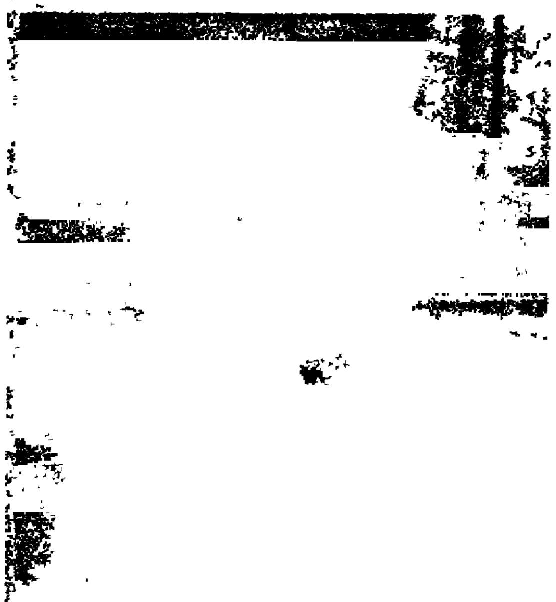
## جنتا پارٹی

ایک دوسرے سے قطعی مختلف اور متضاد عناصر کے اجتماع سے وجود میں آنے والی جنتا پارٹی کو ہنگامی حالات کے بخار کے بعد ۱۹۷۷ء میں اقتدار مل گیا تھا۔ اور جلد ہی شخصیات کے باہمی تصادم اور پرانی سیاسی جماعتوں و بنیادی وابستگیوں کے ٹکراؤ کے سبب یہ جماعت کسی بے جان گھروندے کی طرح ڈھیر ہوگئی تھی ـــــ موجودہ جنتا پارٹی میں شامل سابق کانگریسیوں کے علاوہ بھی اس جماعت اور کانگریس جماعت کے مابین بہت کچھ مشترک ہے، پالیسی کے تعلق سے، پروگراموں کے اعتبار سے اور نظریات و تنظیم کی رعایت سے بھی ـــــ اور یہ مماثلت اس حد تک ہے کہ اصلاً یہ پارٹی کانگریس کا نعم البدل نہیں بن پائی ہے بلکہ اگر کرناٹک کی شاخ کو نکال دیا جائے تو آج کی جنتا پارٹی اپنے پرانے وجود کا محض ایک سایہ ہے ـــ اور کرناٹک شاخ اپنی جگہ محض ایک علاقائی جماعت بن کر رہ گئی ہے، اور پھر صرف ایک ہستی یعنی رام کرشن ہیگڑے کا کرشمہ کام کرتا ہے وہاں! پارٹی کی کامیابی ان ہی کے طفیل ہے، نہ کہ جنتا پارٹی کے مرکزی و قومی قائدین کے اثر سے۔

## سید شہاب الدین (ممبر پارلیمنٹ)

جہاں تک یوم جمہوریہ کے موقع پر بائیکاٹ کے نعرے کا سوال ہے تو ہماری ناراضی ملک کے خلاف نہیں ہے۔ ہمارا غصہ حکومت کے خلاف ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ جو حکومت آئین کا دفاع نہیں کرسکتی، اس کا تحفظ نہیں کرسکتی اس کے سبھی افعال واعمال بے خلوص ہیں اور اس لائق نہیں کہ ان میں شریک ہوا جائے۔ خود میری جماعت کے اندر ایک گروپ ہے جو بیّن طور پر مجھ سے خفا ہے، اور ان کی جانب سے خفگی کے اظہار کا سلسلہ

حزب اختلاف کا منتشر ہونا اگر تو صرف اسی امر کا مظہر ہے کہ مرکز میں جو سیاسی جماعت برسر اقتدار ہے، وہ ملک کے مختلف حصوں میں عوام کے جذبات و



احساسات اور جائز خواہشات کی تکمیل میں ناکام رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ غیر مطمئن ہیں اور وہ علاقائی تنظیموں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ علاقائی تنظیمیں قومی مسائل کو حل نہیں کرسکتی ہیں۔ لہٰذا میں جہاں ایک جانب علاقائی جماعتوں کے فروغ کو ایک فطری عمل مانتا ہوں، وہیں میں یہ بھی خیال کرتا ہوں کہ یہ محض ایک عبوری دور ہے، مستقل صورت حال نہیں ہے۔

حزب اختلاف اپنے عدم اعتماد کے سبب عوام کو عام طور پر متاثر کرنے میں ناکام ہی رہا ہے۔ آج عوام اور ایک عام رائے دہندہ صرف کامیاب و کامران فریق کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ اگر متناسب نمائندگی کا طریق کار رائج کیا جائے تو یہ ایک نمائندہ نظام بن سکتا ہے ویسے میرا خیال ہے کہ اب کوئی نہ کوئی متبادل سامنے آئے گا کیوں کہ حزب اختلاف کی جماعتوں پر بھی دباؤ پڑ رہا ہے اور انھیں اب کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن محض انتخاب کی خاطر ہونے والے کسی موقع پرستانہ اجتماع سے عوام متاثر ہونے والے نہیں، اور نہ ہی اس سے سیاسی جماعتوں کے وقار میں کوئی اضافہ ہوسکتا ہے۔ اتحاد کی

حزب اختلاف کو متحد ہونے میں کتنا وقت لگے [illegible] پر منحصر ہے کہ حکومت کس حد تک ملک کو [illegible] کا شکار بناتی ہے۔ حکومت کا ہر غلط قدم حزب [illegible] کو ایک نئی زندگی دے گا، جمہوریت کا کھیل یہی ہے، [illegible] چلانے کے لیے یہ حکومت گزشتہ دو برسوں میں [illegible] کر چکی ہے۔

میں مسٹر راجیو گاندھی کے دو سالہ دور کو محض وقت کی بربادی کہتا ہوں۔ اس دوران ہندوستانی سیاست [illegible] سمت ہی بگڑ چکی ہے، ہم ایک ایسی سمت میں چل رہے ہیں جو لوگوں کی خواہشات کے برعکس ہے ہماری [illegible] آزادی کی روح سے متضاد ہے اور آئین میں جو [illegible] درج ہیں، ان کے خلاف ہے، ہم تو ایک عجیب [illegible] عالیت (ELITISM) کی جانب رواں دواں ہیں۔ اس حکومت نے ایک ایسا انتظامی طریقہ کار [illegible] ہے، جو پالیسیوں کا نعم البدل نہیں ہو سکتا، اور یہی [illegible] حکومت کی ناکامی ہے۔

ہماری اپنی محدودیتیں ہیں، کیوں کہ ہمارے پاس [illegible] کا علاج ہے اور نہ ہی ہم اتنے طاقت ور ہیں کہ حکومت سے نبرد آزما ہو سکیں، میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ہماری جماعت مہاتما گاندھی اور شری جے [illegible] کی وراثت کی بھی دعویدار ہے۔ ایک ایسی وراثت کی جو غیر مرکز نظام، سیکولرازم اور جمہوری ڈھانچے وغیرہ سے [illegible] ہے۔

جنتا پارٹی کے پاس وسیع تر پالیسیاں ہیں، اور ایسا انداز فکر ہے جو غالباً اس ملک کو متحد رکھ سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو تازہ ترین سیاسی سمجھوتے ہوئے ہیں، انھیں پورا ملک محض موقع پرستانہ سیاست [illegible] خیال کرتا ہے۔ دو برس قبل ڈاکٹر فاروق عبداللہ ملک دشمن تھے (جو بہ آج کہے جا رہا ہے) اور آج وہ وزیر اعظم کے بہترین دوست ہیں۔ اسی طرح شرد پوار کے بارے میں جو کچھ کہا جائے کم ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک دفعہ پھر سے مغل دربار کے عہد میں واپس پہونچ چکے ہیں، آج ریاستوں کو جو امداد دی جا رہی ہے وہ کسی ادارہ جاتی ڈھانچے میں نہیں سما سکتی، بشرطیکہ ہم کسی قسم کی منصوبہ بند ترقی میں یقین رکھتے ہیں تو۔ آخر وہ فوری فیصلے کس طرح کر سکتے ہیں۔ اگر ان فیصلوں کی توثیق منصوبہ بند کمیشن سے کرائی جاتی ہے تو پھر یہ سب فرضی ہے، مصنوعی ہے، عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش ہے، یہ غیر [illegible] داری ہے تو، اور اگر فریب ہے تو، دونوں صورتوں [illegible]

قیادت کی تعریف نہیں کی جا سکتی، کیوں کہ قیادت ایک بالکل الگ چیز ہے اور وزارت عظمیٰ بالکل الگ —— اس نظام کے ایک حیثیت پسند ناقد کی حیثیت سے میری رائے یہ ہے کہ یہ نظام ہر گزرتے دن کے ساتھ اتھلا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں قیادت کو لوگوں کی مشکلات و مصائب میں حصہ داری کرنا چاہیئے۔ ایک ایسی حکومت جو کروڑوں روپے ایک تماشے پر خرچ کر دیتی ہے اور کروڑوں عوام کے حالات زندگی کو بدلنے کی پروا نہیں کرتی، ایسی حکومت کو اقتدار سے محروم ہو جانا چاہیئے بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری جمہوریت ابھی مکمل طور پر پختہ نہیں ہے، ہم لوگوں کے سامنے پانچ برس میں ایک دفعہ جاتے ہیں، اور اس وقت ہم اس کاروبار سیاست کا ہر داؤں، ہر حربہ آزماتے ہیں، روپیہ، افرادی طاقت مشینری سب کچھ، اور ہم کامیاب ہو جاتے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آیا یہ نظام لوگوں کی فلاح کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے یا نہیں؟ —— مسئلہ تو یہ ہے کہ جو لوگ اس وقت زمام اقتدار سنبھالے ہوئے ہیں، میں تو ان کے مقاصد پر ہی اعتبار نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جیسے ملک کے لیے صدارتی نظام بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جمہوریت کے ساتھ بھارتیہ جنتا پارٹی کی وابستگی بڑی سطحی قسم کی ہے یہ وابستگی بہر جہت جمہوریت کے تئیں نہیں ہے، وہ ہمیشہ ایک مضبوط مرکز کی بات کرتے رہے ہیں۔ وہ ایک اجتماعی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ اس

ایک ہی مذہب ہے اس لیے حکومت بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اسی لیے انھیں صدارتی حکومت زیادہ قدرتی سی معلوم ہوتی ہے۔

حکومت کا یہ فیصلہ کہ پانچ ریاستوں میں ایک ساتھ انتخابات نہ کرائے جائیں، اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ساتھ حملہ نہ کر کے یکے بعد دیگرے کرنا چاہتے ہیں۔ پارلیمان آج ایک مرتا ہوا ادارہ ہے آخری نگرانی عوام کے اختیار میں ہے۔

وزارتی ردوبدل کے سلسلے میں کیا کہوں مجھے ایک کارٹون یاد آتا ہے، جس میں ایک بچے ایک گوٹ سے کھیلتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

کرناٹک سے قطع نظر، ہم پارلیمنٹ میں ایک چھوٹے سے گروپ کی شکل میں ہیں، لیکن ذرا یہ ملاحظہ کریں کہ ہم کتنی ریاستوں کی نمائندگی کرتے ہیں، ہمارا قدم ہر [illegible] میں موجود ہے، اور ہم کسی نہ کسی طور قومی سطح پر آ رہے ہیں۔

مسٹر ہیگڑے نے کہا ہے کہ ان کا دم گھٹتا ہے صحیح ہے کہ وہ کبھی بھی وزارت اعلیٰ کے متمنی نہیں رہے ہیں، انھوں نے کرناٹک پر گہرا اثر ڈالا ہے اور قومی منظر پر بھی چھاپ چھوڑی ہے، اور اب ان کے سامنے سوال یہ ہے کہ اب کیا ہو؟ اور یہ عین فطری امر ہے۔ مجھے لگتا ہے انھیں کوئی اور مناسب اور موزوں موقع بھی ملے گا جب وہ ملک کی اور زیادہ خدمت کر سکیں گے



## راشٹریہ سماج وادی کانگریس

[illegible]

[illegible]

ان کا دعویٰ ہے کہ کانگریس میں ابھی بہت سے
ایسے لوگ موجود ہیں جو پارٹی کی کارکردگی سے غیر مطمئن
ہیں اور مناسب وقت پر وہ ان کے ساتھ آکر مل جائیں
گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کوئی جماعت ایسے موقع پرست
لوگوں کے بل بوتے پر برقرار ہو سکتی ہے اور پھر
زندہ رہ سکتی ہے، جن کے اندر اتنی ہمت بھی نہ ہو کہ
وہ ناراضگی کی آواز بلند کر سکیں، اور خاموش رہنے پر اکتفا
کریں۔ راشٹریہ سماج وادی کانگریس کے پاس نہ تو کوئی
نظریہ ہے نہ پالیسی اور نہ ہی تنظیمی طاقت۔ اس صورت
میں اس جماعت کا مقصد بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس
کے سیاسی ستارے اپنی مرضی سے آتے رہیں اور جاتے
رہیں، اور یہ پارٹی ان کے لیے بشرط ضرورت ایک عارضی
پناہ گاہ بنی رہے۔

## پرنب مکرجی ― صدر راشٹریہ سماج وادی کانگریس

حزب اختلاف ماضی کی مانند آج بھی منتشر و

منقسم ہے۔ اس سے قبل مختلف رائے رکھنے والے لوگوں
کے ساتھ کانگریس میں ہی جگہ ہوتی تھی۔ آٹھویں دہائی کے
وسط میں ہمارے ملک میں ایک ایسی صورت حال پیدا
ہوئی تھی جس کے نتیجے میں مختلف سیاسی جماعتیں اپنے
باہمی اختلافات کے باوصف ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک
کر سکتی تھیں۔ لہٰذا اگر ویسی ہی صورت حال درپیش ہو تو
یہ تجربہ ایک دفعہ پھر دہرایا جا سکتا ہے۔ جب قومی حزب
اختلاف یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ قومی سطح پر کانگریس کے
ساتھ مقابلہ آرائی کی قوت نہیں رکھتا، سب مخالف جماعتیں
اپنی سرگرمیوں کے دائرہ کو اپنے اثر رسوخ والے علاقوں تک
محدود کر دیتی ہیں ―― ہمارے ملک میں علاقائی
جماعتوں کا فروغ لگاتار ہی ہوتا ہے، اور علاقائیت
کی اس طوفانی لہر کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ یہ علاقائی
جماعتیں باقی رہ سکیں گی اور قومی جماعتوں کا وجود
بے مصرف ہو کر رہ جائے گا۔ یہ ایک عارضی سلسلہ
ہو سکتا ہے۔ کانگریس کا انحصار زیادہ تر عوام الناس پر
ہی ہے، اور عوامی جماعت ہونے کے ناطے اس کی اپنی قوت
ہے اور اپنی حدود ہیں۔ ان کے ساتھ ہمارا تصادم کس

طرح ہوگا اس کا تعین کیا ہوگا، اس بارے میں ابھی کچھ کہا نہیں
جا سکتا۔

میرے اور گنڈو راؤ کے اخراج کے بعد یکا [illegible]
کسی اور جماعتی کارکن یا رہنما کے ساتھ اس کے [illegible]
کے باوجود نہیں کی گئی۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس
معاملے میں پارٹی کے اندر شدید ردعمل ہوا ہے ہم کانگریس
کے مخالف نہیں ہیں اور اس بات کے مخالف ہیں کہ یہ
فیصلے تنہا قائدین ہی کر لیتے ہیں۔ آج کل تنظیم میں کانگریس
کارکنوں کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی طرح
کے بکھراؤ و اتحادوں سے مسٹر راجیو گاندھی یہ تاثر دینا
چاہتے ہیں کہ لوگ کانگریس چھوڑ کر نہیں جا رہے ہیں بلکہ
اس میں شریک ہو رہے ہیں، اور اس کا مقصد ظاہر
ہے کہ کانگریس کا حوصلہ بڑھانا ہے۔ لوگوں کا کانگریس
سے جانا اور اس میں آنا تو ایک عام بات ہے اور یہ کانگریس
کی تحریک ہے۔

مختلف علاقائی پارٹیوں کے ساتھ مسٹر راجیو
گاندھی کا گٹھ جوڑ ایک اشارہ دیتا ہے، جو ایک
روایتی کانگریسی کے لیے خاصا پریشان کن ہے، اور



کئی ریاستوں میں کانگریس ریاست کی حکومت یا حکومت کی حصہ دار نہیں ہے، یہ کام علاقائی پارٹیاں کر رہی ہیں ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ کانگریس انھی باتوں کا انکار کر رہی ہے اور اب یہ قومی جماعت نہیں رہی ہے۔ کانگریس تو اپنے پس منظر، کردار اور ہر اعتبار سے علاقائیت کے خلاف تھی۔

راجیو گاندھی کے منصب اقتدار پر آنے کے بعد پارٹی کی کامیابیاں بڑی غیر اہم ہیں، مجموعی طور پر میرے خیال میں ان کا طرز فکر سرسری اور عارضی قسم کا رہا ہے جیسے امدادی رقوم غیر ضروری، غیر منصفانہ اور کسی حد تک خود فریبی کے مترادف ہیں۔ وزیر اعظم سے بہتر ملک کے وسائل کے بارے میں کوئی اور علم نہیں رکھ سکتا۔ ایک جانب تو وزیر مالیات تمام وزراء کے پاس گشتی مراسلے روانہ کر رہے ہیں کہ وہ اپنے منصوبہ بند اور غیر منصوبہ بند دونوں قسم کے اخراجات میں ۵ فی صد کی تخفیف کریں اور دوسری جانب وزیر اعظم کروڑوں روپے کی راحت کا اعلان کر رہے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ کس طرح ہو سکتی ہیں، اور اگر یہ تمام اعلانات انتخابات کے پیش نظر ہیں تو یہ بالکل ہی غلط بات ہے خاص طور پر اس لیے کہ یہ خود وزیر اعظم کے ذریعہ ہو رہا ہے کسی اور کے ذریعہ نہیں۔

سیاست کا مقصد طاقت کا حصول ہے، یہ کوئی سنیاس تو ہے نہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ کچھ ناراض لوگ کچھ چاہتے ہیں ——— ناراض لوگ اپنی بے چینی کا اظہار تو کر سکتے ہیں، لیکن اگر اس کی پشت پر کوئی عوامی مقصد نہیں ہے، تو یہ گروپ کسی جماعت کی تشکیل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے آپ کو کانگریسی پہلے کہتا ہوں پارٹی بعد میں۔

راجیو گاندھی پارٹی میں کوئی تبدیلی نہیں لائے ہیں، انھوں نے تو کرسیوں کے کھیل کی مانند صرف حلقہ کو تبدیل کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسز اندرا گاندھی بھی کانگریس کمیٹی کو فروغ پانے اور اسے کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں، مگر وہ کم سے کم ذاتی طور پر رابطہ تو رکھتی تھیں۔ وہ ہر ضلع کے کم از کم دس افراد کو نجی طور پر جانتی اور پہچانتی تھیں، ان سے کسی بھی درجہ کا کوئی بھی کارکن ملاقات کر سکتا تھا اور وہ ہر قسم کی پریشانیوں اور تکلیفوں کے بارے میں سنتی تھیں۔ لیکن اب تو یہاں نہ ذاتی رابطہ ہے اور نہ ہی تنظیمی پلیٹ فارم ہے۔

پارلیمانی نظام سے صدارتی نظام کی طرف مراجعت کے سلسلے میں، میں سب سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس نظام کے بنیادی نقائص کیا کیا ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم صرف لباس بدلنا چاہتے ہوں، کیونکہ اب اس کا فیشن نہیں رہا ہے، یہ پرانا ہو گیا ہے۔ میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ اگر کوئی صاحب اس نظام کی خرابیوں کو سامنے لائیں تو میں اس پر غور و خوض کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر ابھی تک یہ کام کسی نے نہیں کیا ہے۔

ہمارے ملک میں ہر سیاست داں کو موقع ملا ہے، مسز گاندھی بھی مستقلاً اقتدار پر قابض نہیں رہ سکی تھیں، نہ میں رہ سکا۔ یہی راجیو گاندھی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ محرومی اور مایوسی ہر شخص پر اپنا اثر ڈال سکتی ہے، لیکن سیاست داں پر نہیں۔

## کانگریس (ایس)

کانگریس (ایس) بھی نیشنل کانگریس سے علاحدہ ہونے والے گروہوں میں سے ایک گروپ ہے۔ اس کی کشتی کانگریس (آئی) نام کی چٹان سے ٹکرا کر غرق ہو گئی اور اس کے نتیجے میں اس کا کپتان (شرد پوار) ہی غرق ہو گیا۔ ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ شرد پوار ہندوستانی سیاست کے بحر اعظم میں گم ہو کر رہ جائیں گے یا دوبارہ ابھر سکیں گے۔ اس سلسلے میں شاید وزیر اعظم راجیو گاندھی کے علاوہ کوئی دوسرا روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اگرچہ کانگریس (ایس) کے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ شرد پوار نے اپنا شاندار سیاسی کیریئر تباہ کر لیا ہے، تاہم ایک ہی سانس میں وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ شرد پوار کے جانے سے کانگریس (ایس) پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ یہ لوگ جزوی طور پر ٹھیک ہیں، کیوں کہ کانگریس (ایس) کوئی قابل لحاظ قوت کبھی نہیں تھی، شرد پوار کے ہوتے



ہوئے بھی نہیں، اور مسٹر کے بغیر بھی یہی بات درست ہے، خاص طور پر مہاراشٹر میں۔ کالج والا تازہ ترین اسکینڈل جس نے ایس۔ بی۔ چوان کی حکومت ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس کی روشنی میں شرد پوار کو مہاراشٹر میں موقع مل سکتا ہے۔ بہرکیف کانگریس (ایس) کا شمار زیادہ سے زیادہ بہت سے بولنے والوں میں ہی ہو سکتا ہے۔ اتحاد کے منصوبوں اور حزب اختلاف کی کانفرنسوں کے باوجود مستقبل قریب میں تو یہی امکان نظر آتا ہے۔

## آئی کرشنن: کانگریس (ایس)

مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے، مگر مسٹر شرد پوار کی موجودگی میں پارٹی کی کوئی حیثیت نہیں تھی، لیکن اس کا ادراک انھیں بہت دیر سے ہوا۔ انھوں نے سوچا تھا کہ وہ پارٹی کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک مختصر عرصہ کے لیے ریاست کے وزیر اعلیٰ رہنے کے بعد وہ کہیں نہیں تھے، جب ہم چند لوگوں نے انھیں اٹھا کر قومی سطح پر پہنچایا۔ اب وہ پھر واپس چلے گئے ہیں۔ خدا ان کا بھلا کرے۔

اس وقت حزب اختلاف کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے، کیوں کہ مخالف پارٹیوں میں شاید ہی کوئی پائیدار ہو اور شاید ہی کسی کی کوئی حیثیت ہو، اس حقیقت کے باوجود کہ قومیں ہیں، تحریکیں ہیں اور پارٹیاں ہیں، جو ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو سکتی ہیں۔ یہاں تک کہ جنتا پارٹی اور لوک دل کے مابین بھی بہت زیادہ اختلافات نہیں ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور کمیونسٹ پارٹیوں کو چھوڑ کر باقی سبھی پارٹیوں کی حیثیت ایک ہے یعنی مرکز سے بائیں بازو کی جانب قدرے جھکاؤ۔ ان میں اتحاد ممکن ہے۔ لیکن ابھی تک ان کی صحیح تشکیل نہیں ہو پائی ہے۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ حزب اختلاف کی کانفرنسوں کے سلسلے میں جو جوش و خروش ابتدا میں پایا جاتا تھا وہ بھاپ بن کر اڑ گیا ہے، تو سیاسی امور کے سلسلے میں کم از کم میں جوش و خروش کا قائل نہیں، بہرحال تیلگو دیشم نے صرف ایک میٹنگ بلائی تھی، اور یہ ایک خوش آئند قدم تھا، مگر باقی سب کاوشیں دوسری سیاسی جماعتوں کی تھیں۔ لیکن مسز گاندھی کی موت کے بعد سیاسی منظر نامہ ایک دم بدل گیا۔ یہ ایک نازک موڑ تھا، اور اس کے بعد بڑی بے چیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ خیر یہ میرا یا کسی ایک فرد کا کام نہیں کہ اس کا حل تلاش کرے۔
[illegible]

کانگریس صرف ایک پست حال شہسوار سکتی تھیں اس کا مقصد کوئی نئی جماعت قائم کرنا کبھی نہیں تھا۔

اب وہ دور بھی ختم ہو چکا ہے جب علاقائی جماعتوں کو فروغ ہو رہا تھا۔ اب تو صرف ایک سیاسی خلا ہے، حوصلے پست ہیں اور طلسم ٹوٹ چکے ہیں۔ حکمراں پارٹی کے اندر نہ جوش ہے نہ ہمت، اور عوام پر جو سرزدگی طاری تھی وہ غائب ہو گئی ہے۔ راجیو گاندھی نے ایک پُر امید اکثریت کی حمایت و ہمدردی کے ساتھ شروعات کی تھی۔

میں نے دہلی، بمبئی جیسے بڑے شہروں کو چھوڑ کر ان کی فتح کو کبھی ان کی کامیابی نہیں سمجھا۔

میرا خیال ہے کہ پانچوں ریاستوں میں ایک ساتھ انتخاب نہ کرانے کا ان کا فیصلہ اس لیے ہے کہ انھیں اپنی جیت کا یقین نہیں ہے۔ عام طور پر الیکشن کمیشن کو آزادانہ طور پر اپنے اختیارات کا استعمال کرنا چاہیے۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوتا، اور مرکز ہمیشہ اپنی ٹانگ ضرور اڑاتا ہے۔

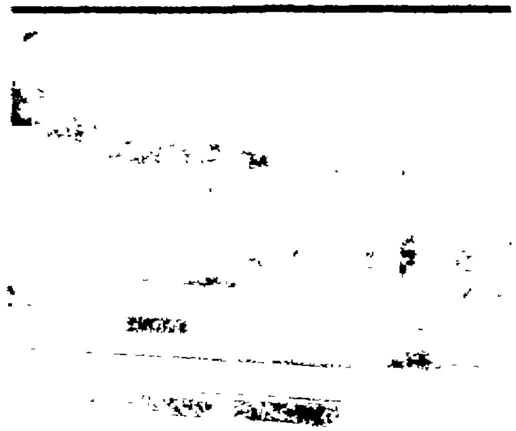
امدادی رقوم کے اعلانات بے معنی ہیں۔ جب پیسہ نہ ہو تو اعلانات کے کیا معنی۔ یا تو ان پر پہلے ہی غور ہو چکا ہے، رقم مخصوص کی جا چکی ہے، اور پھر اعلان کیا گیا ہے۔ اس صورت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی سوائے اس کے کہ اعداد و شمار سے کھیلا جائے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ اتنا کچھ کیا جا رہا ہے ——— یا اگر ان امدادوں کو کسی با اختیار دستوری ادارے کی طرف سے منظوری نہیں دی گئی ہے تب یہ سب قطعی طور پر غیر آئینی ہے، اس طرح تو وہ (وزیر اعظم) سانتا کلاز کی طرح ہوتے کہ جیب میں ہاتھ اور بخش دیا۔ فلسفہ ایسا ہی ہے۔

حزب اختلاف کو پائیدار بنانے کے لیے صرف قیادت ہی کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ قائدین ایسے ہوں جو وقار بنا سکیں ― وقار صرف کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ جماعت کا اور اس کے پروگرام کا۔ ہمارے یہاں افراد تو بہت ہیں جو کرشموں کی بنیاد پر عوام کے دل جیتنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے کو جتنی جلدی ختم کیا جا سکے اتنا ہی بہتر ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ سیاست رہ ہی نہیں گئی ہے، صرف شخصیت ہے۔ حزب اختلاف کی جماعتوں میں افتراق و اختلاف کی وجہ سے کوئی معقول متبادل ہے ہی نہیں، خود حکمراں جماعت کے اندر کی بھی سب بکھر ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ [illegible] سیاسی جماعتیں ہیں، ان کی جڑیں [illegible] جلد ہی ادھر جا سکتی ہیں

بھی ادھر چلے جا سکتے ہیں۔

وزارتی رد و بدل بھی عدم استحکام کی علامت ہے، خاص طور پر اس شخص کے لیے جو پیشوائی کر رہا ہو۔ وزیر اعظم خود اپنے سائے سے بھی خوف زدہ ہیں، میرے خیال میں یہ بالکل درست انداز بیان ہے۔

میں صدارتی طرز حکومت کے یکسر خلاف ہوں یہ نظام ہندوستان کے لیے کسی وقت بھی مناسب نہیں، اس سے تو اور عدم اعتماد کو فروغ ہوگا، کیونکہ اتحاد میں تو تیح پلک تو ہے نہیں، جلد ہی پارہ پارہ



سیاسی اختلاف کا اظہار کبھی یوں بھی ہوتا ہے!

ہو سکتا ہے۔ پوری قوم کا مزاج اور رنگ ڈھنگ ہی اس (صدارتی) نظام کے لیے موزوں نہیں ہے۔ انتخاب تو بادشاہ کا بھی کیا جا سکتا ہے، کیوں نہیں؟ مگر پھر ہندوستانی اتحاد کے تصور کا خاتمہ ہو جائے گا۔ میری نظر میں پارلیمانی نظام ہی اپنی تمام ترخامیوں کے باوجود ہندوستانی برصغیر کے لیے بہترین نظام حکومت ہے۔

جو کچھ ہو آج ہمارے یہاں وزیر اعظم کی حکومت ہے، جو کسی صدارتی حکومت سے بھی ابتر ہے۔ کیوں کہ اس میں تو وہ نگرانی اور دیکھ بھال بھی نہیں ہے صدارتی

نظام میں جن کا اہتمام رکھا جاتا ہے۔

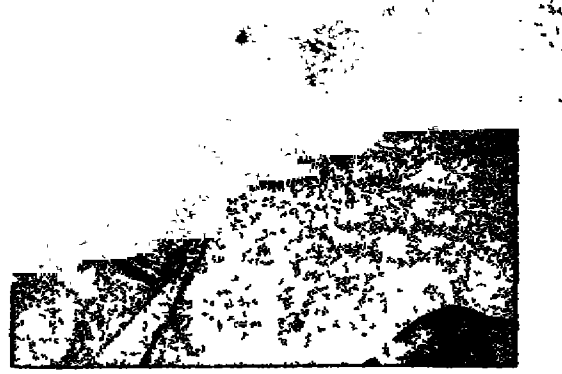
بھارتیہ جنتا پارٹی اس مسئلے کو ہمیشہ دوسرے زاویے سے دیکھتی رہی ہے، ان کا اتحاد کا تصور بھی بالکل الگ ہے۔ ہندی، ہندو، ہندوستان، لہٰذا صدارتی حکومت، انھیں خود بخود اچھی معلوم ہوتی ہے۔

متناسب نمائندگی بھی میرے خیال میں قرین قیاس قابل عمل ہے ہی نہیں، لیکن نظام کی کوئی نہ کوئی شکل وضع کی جا سکتی ہے، جس کے تحت سیاسی جماعتوں کو فروغ پذیر ہونے کا موقع مل سکے، لیکن سیاسی جماعتوں کو بھی اپنے پروگرام اور دیگر تمام امور کو واضح طور پر رائے دہندگان کے سامنے لانا چاہیے۔

خیر! میں تو فی الحال صرف کانگریس (آئی) کی حکومت کا خاتمہ چاہتا ہوں، میرا مقصد ان کو تنگ کرنا نہیں بلکہ ان کا تختہ پلٹنا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ راجیو گاندھی گدی چھوڑ دیں۔ لوگ ان سے تنگ آ کر بھاگ رہے ہیں۔

حزب اختلاف کی جماعتیں، قومی اور علاقائی، دونوں کو ایک تحریک کی ضرورت ہے۔ اصلاحی بھی ضروری ہیں، اس کے بعد پھر ربط پیدا ہوگا، وقار بنے گا اور ایک منزل، ایک مقصد، کا احساس جنم لے گا، اور یہ سب ہماری مخالف جماعتوں کی موجودہ بے عمل کیفیت میں بھی ممکن ہے، کیوں کہ ہماری قوم کے ذہن میں جمہوریت کا تصور بہت پختہ ہے۔ تاہم جس طرح ثقافتی و نسلی بنیادوں پر لوگوں کو بیدار کیا جا رہا ہے، اور جس طرح تشدد کو ہوا دی جا رہی ہے اور علاقائیت کو بڑے خوش رنگ انداز میں پیش کیا جا رہا ہے اور یہ سمجھا جا رہا ہے کہ اس طرح کوئی انقلاب آ سکتا ہے، تو یہ سب بہت دن تک چلنے والا نہیں۔ سیاسی جماعتوں کو، بلکہ پوری قوم کو یہ سمجھ لینا چاہیے آج ہمارے عوام جس طرح الجھنوں اور مصائب کا شکار ہیں، یہ صرف اس بات کو آشکار کرتا ہے کہ ہماری قیادت جمود کا شکار رہی ہے، اس کا دائرۂ کار تنگ ہو گیا ہے وہ اقدامات نہیں کر پا رہی ہے، اور حکمراں جماعت بھی اس الزام سے بری نہیں ہے۔

عوام کی توقعات و خواہشات کے پیش منظر میں حکمرانوں کی فیصلہ کرنے اور قدم اٹھانے کی صلاحیت غیر متوازن معلوم ہوتی ہے، اور اس کی وجہ صرف حکمراں طبقہ کی خراب کارکردگی ہے اور کچھ نہیں۔ وہ دن ہوا ہو چکے ہیں جب "کانگریس اعلانیہ سیاست کو جانکر ان سے اتفاق و اعتماد کیا جاتا تھا۔



## تیلگو دیشم

آندھرا پردیش کبھی کانگریس کا گڑھ تھا، مگر وہاں قوت کے چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جانے، وزراء اعلیٰ کے من مانی تبدیلی اور این۔ ٹی۔ راما راؤ کے کرشمہ نے مل جل کر تیلگو دیشم کو جنم دیا اور استحکام بخشا۔ این۔ ٹی۔ راما راؤ کے خوابوں کی کوئی حد نہ تھی انھوں نے کانفرنسوں کی سیاست کا آغاز کیا، جسے ایل کے۔ ایڈوانی توقیری سیاست کا نام دیتے ہیں، تاہم کانگریس کا ایک قومی متبادل تیار کرنے کی تمام مساعی بُری طرح ناکام ہو گئیں۔ شخصیات کا باہمی تصادم اور ایک دوسرے کے عزائم کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنا۔ ان سب خرابیوں نے مل کر اس اسکیم کا بیڑہ غرق کر دیا۔ اس کے بعد بھارت دیشم کا تصور سامنے آیا، جس کی قیادت گیروا کپڑے پہننے والے رہنما کرنے والے تھے۔ لیکن یہ رنگا رنگ خیال بھی کسی پالیسی یا نظریاتی اساس سے عاری تھا، یہ بات عوام پر عیاں ہو گئی۔ مرکز اور ریاستوں کے کشیدہ تعلقات سے پیدا شدہ صورت حال سے این۔ ٹی۔ راما راؤ خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اپنی پارٹی کو مستحکم کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ریاست میں مختلف مسائل اپنا سر ابھار رہے ہیں، اور اب این۔ ٹی۔ راما راؤ کی انتظامی محدودیت بے نقاب ہو رہی ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تیلگو دیشم ایک علاقائی طاقت ہی ہے اور قومی سطح پر کوئی قابلِ قبول متبادل پیدا کرنے کے اس کے عزائم حقیقت سے دور ہی رہیں گے۔

## پی۔ اُپیندر۔ ممبر پارلیمنٹ تیلگو دیشم

این۔ ٹی۔ راما راؤ اور تیلگو دیشم حزبِ اختلاف کی کانفرنسوں کے موجد ہیں۔ ایسی پہلی کانفرنس ۱۹۸۳ء میں ہمارے اقتدار میں آنے کے فوراً بعد ہوئی تھی۔ اس کے بعد چار پانچ اسی طرح کی کانفرنسیں اور منعقد ہوئیں اور اس سلسلے میں جوش وخروش کم ہوتا گیا۔ مسز اندرا گاندھی کی شہادت اور پھر پارلیمانی انتخابات کے بعد اس خیال کو پھر بروئے کار نہیں لایا گیا۔ دوسری اور تیسری کانفرنسوں میں بھی الجھن سامنے آئی تھی کیونکہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور لوک دل ان کانفرنسوں میں شامل ہونا نہیں چاہتے تھے اور این۔ ٹی۔ آر نے اپنی تمام ترغیبی صلاحیت کا استعمال کر کے انہیں دہلی کانفرنس میں شرکت کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اس کے بعد پارلیمانی انتخاب کے وقت این۔ ٹی۔ راما راؤ نے فاروق عبداللہ کے ساتھ مل کر حتی الامکان کوشش کی کہ حزبِ اختلاف کی جماعتیں آپس میں نشستوں کے بارے میں سمجھوتہ کر لیں، مگر ان کی یہ کاوشیں ناکام رہیں۔ این۔ ٹی۔ آر نے اس سلسلے میں ایک فارمولہ بھی تیار کیا تھا کہ نشستوں کی تقسیم کس طرح ہو، مگر کچھ سیاسی جماعتیں اور رہنما اڑے رہے اور نتیجتاً کوئی معاہدہ ممکن نہیں ہو سکا۔

حزبِ اختلاف کی جماعتوں کو عوام ناکام نہیں بناتے ہیں بلکہ خود یہ جماعتیں عوام کو ناکام کرتی ہیں۔ آج مرکز میں کانگریس (آئی) کی کارکردگی کے سلسلے میں مایوسی پائی جاتی ہے۔ داخلی جھگڑے بھی ہیں اور ابھی تک کوئی قابلِ قبول متبادل نہیں بن سکا ہے، جو اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکے اور یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے، خود ان لوگوں کے لیے بھی جو کانگریس کی قیادت سے ناخوش ہیں۔ کوئی راستہ نہیں ہے کیونکہ کوئی متبادل موجود نہیں ہے بہرکیف حزبِ اختلاف کو مثبت عناصر کی تشہیر کرنی چاہیے، کیونکہ بالآخر اسی کے ذریعے رائے دہندگان کو مائل کیا جا سکتا ہے۔

آج کے حالات میں، میں صدارتی نظام حکومت اختیار کیے جانے کی مخالفت کرتا ہوں کیونکہ میرا پختہ یقین ہے کہ اتنے بڑے اور گوناگوں تہذیبی طبقوں وعلاقوں والے ملک کے لیے پارلیمانی طرز حکومت ہی مناسب ہے، یہاں کوئی تنہا شخص یا سیاسی جماعت تمام لوگوں کو متاثر نہیں کر سکتی۔ موجودہ نظام زمانے کے سرد وگرم سے گذر چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناکامیاں بھی سامنے آئی ہیں، لیکن ان کا سبب غیر موثر قیادت ہے اور یہ ہے کہ پارلیمانی طریق کار وضابطوں کی جانب پوری توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ میرے خیال میں حالات پورے نظام میں کسی تبدیلی کے متقاضی نہیں ہیں۔ میری رائے میں ترقی پذیر ممالک میں صدارتی طرز حکومت آمریت میں بدل جاتا ہے۔

دوسرا قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ کانگریس پارٹی اپنے بے شمار وسائل کے سبب دوسروں پر سبقت رکھتی ہے۔ وہ انتخابات میں دھاندلی کر سکتے ہیں اور انتخاب پر اثر انداز بھی ہو سکتے ہیں۔

اب حزبِ اختلاف کی کانفرنسوں کا خاتمہ ہو چکا ہے، کیونکہ اس کے بعد کوئی کارروائی سامنے نہیں آئی۔ جنوری ۱۹۸۶ء میں ہم نے حیدرآباد میں ایک اور میٹنگ بلائی تھی، جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم خیال جماعتوں کا ایک فورم بننا چاہیے۔ اس کے پشت پر یہ تصور تھا کہ مختلف پارٹیوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق بنا لیا جائے اور یہ وفاق اس طرح کا ہو کہ ان پارٹیوں کی علاحدہ شناخت بھی باقی رہے۔ اس کے بعد دوسری میٹنگ ہی نہیں ہو سکی۔ ہر موقع پر تیلگو دیشم اور این۔ ٹی۔ راما راؤ ہی پہل کرتے تھے مگر دوسری جماعتوں کی جانب سے جواب بھی سامنے نہیں آتا تھا اور اس کے بعد آپ نے دیکھا کہ کیا ہوا؟ نیشنل کانفرنس (فاروق) نے کانگریس سے ہاتھ ملا لیا اور کانگریس (س)، اس میں ضم ہو گئی۔

مسٹر برنالہ کو پنجاب میں برسرِ اقتدار رہنے کے لیے کانگریس کی حمایت کی ضرورت ہے۔ اس لیے اگر آپ ایک وفاق بھی تشکیل دیں تب بھی کچھ نہ کچھ لوگوں کو تو آگے آنا ہی پڑے گا ورنہ عوام مایوس ہو جائیں گے اور ایسی کوششوں پر سے ان کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ہم مرضی کے خلاف لوگوں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے، کیونکہ ممکن ہے کہ ایک خاص وقت میں ان کی اپنی مجبوریاں رہی ہوں۔ تاہم علاقائی جماعتیں بھی ہیں جن کے اچھی طرح بچے ہوئے ہیں اور جو ایک مرکزی قومی اختلاف میں شامل ہونا چاہتی ہیں۔

ہم بھارت دیشم کے تصور کو آگے نہیں بڑھا رہے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ علاقائی جماعتیں اپنی ریاستوں کی نمائندگی بہتر طور پر کر سکتی ہیں

ابھی ریاست کے لیے بہتر مواقع فراہم کرسکتی ہیں اور ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ قومی جماعتیں ناکام ہوگئیں ہیں۔ لہٰذا اب وہ خیال ہمارے ذہن میں بہت زیادہ پختہ نہیں ہے۔ لیکن قومی سطح پر متبادل کیا ہے۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ علاقائی جماعتیں ریاستوں میں حکومت کریں اور مرکز میں خلار رہے۔ اسی لیے ہم چاہتے تھے کہ ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق بن جائے جس میں سب پارٹیوں کی نمائندگی ہو۔ ایک مشترکہ فورم ہو جو قومی مسائل کے لیے مل جل کر کام کریں۔ تاکہ ہم بعد میں مرکز میں ایک مخلوط حکومت بھی بنا سکیں۔ کانگریس (آئی)، کا حقیقی نعم البدل یہی ہو سکتا ہے۔

حالیہ اتحاد کانگریس (آئی) اور اس کی قیادت کی کمزوری کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہم پارلیمان کے آئندہ اجلاس میں راجیو گاندھی کے ذریعہ بخشی جانے والی اس مالی امداد کا سوال اٹھائیں گے۔ یہ عمل واقعی قابل اعتراض ہے کیونکہ یہ کسی کی جاگیرداری یا زمینداری تو ہے نہیں کہ وہ جائیں اور جو دل چاہے اعلان فرما دیں۔ اگر یہ امداد منصوبے کے تحت ہے تب بھی انہیں متعلقہ ریاست میں جاکر اس کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو ایک مقررہ طریقہ کار کے مطابق ہی ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہیں تو پھر انہیں اختیار کس نے دیا؟ آخر پارلیمان کی مرضی کے بغیر یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ ایک دوسرا اہم نکتہ: صرف وہی ریاستیں کیوں چنی گئی ہیں جہاں انتخاب ہونے والا ہے؟ یہ تو پورے پارلیمانی نظام کا مذاق ہے۔

راجیو گاندھی کے اقتدار کے دو برس کا جائزہ لیتے ہوئے میں دو باتیں کہوں گا۔ ایک ان کا خلوص اور چند چیزوں کے تئیں وابستگی اور کچھ کرنے کی ان کی مساعی، مگر یہ نتیجہ کہا نہیں جا سکتا کہ کوئی قابل فہم تبدیلی ظہور پذیر ہوئی ہے۔ خواہ وہ سیاسی ہو، اقتصادی ہو، سماجی ہو یا خارجہ تعلقات کے سلسلے میں ہو۔

صرف کرشمہ کے سہارے نتائج کا حصول تو نہیں ہو سکتا۔ جلد جلد ہونے والے وزارتی ردّ و بدل سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو انہیں اپنے لوگوں پر اعتماد نہیں ہے یا پھر انہیں ابتدا میں آدمی کی پہچان نہیں ہو پاتی۔

ہمارے اوپر ذمہ داری یہ ہے کہ ہم پارلیمان میں خاص مخالف پارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ہماری جماعت صرف آندھرا پردیش تک ہی محدود ہے تاہم ہم اپنے فرائض کی انجام دہی کی حتی الوسع کوشش کر رہے ہیں۔ ایک بڑی دقت یہ ہے کہ ہماری جماعت نئی ہے، ہمارے زیادہ تر ممبران نئے سیاستدان ہیں اور پہلی بار ہی پارلیمان میں گئے ہیں۔ اپنی دو برس کی مدت کار میں ہم نے دوسری مخالف جماعتوں کے ساتھ باہمی ارتباط قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، کم سے کم پارلیمان کے اندر تو یہ مقصد حاصل ہوا ہی ہے

ہمارے ملک کو ایک پائیدار حزب اختلاف کی قیادت کے لیے ایک دور اندیش رہنما کی ضرورت ہے۔ ایک قائد جو ملک کو متحد رکھ سکے۔ جو ہر ایک کے ساتھ انصاف کرے اور جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہو۔ آج سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ قیادت ہمیشہ ہندی علاقوں سے آتی رہی ہے۔ وزیراعظم ہمیشہ اتر پردیش کا ہی ہوتا ہے۔ اب اگر صدارتی حکومت قائم ہو جائے تب بھی آخر کار سب سے بڑی ریاست کا وزن ہی سب سے زیادہ ہوگا۔

# چین اور ہم

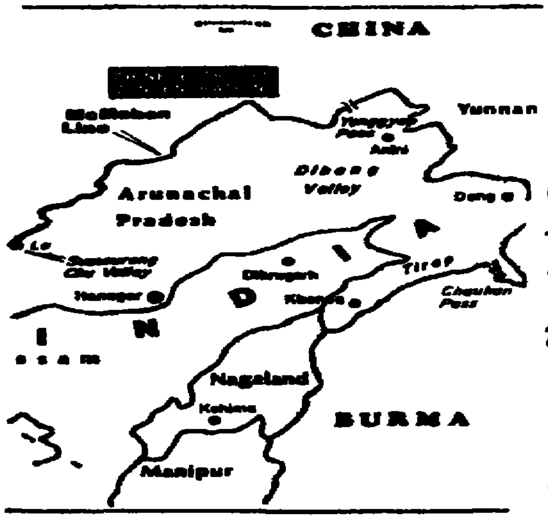
## ارادے اور امیدیں



اروناچل پردیش کی سمڈورونگچو وادی میں چینیوں کی بیجا مداخلت اور اروناچل کو انڈین یونین کی ایک ریاست بنا دینے پر ان کی ہاہاکار کے پیش نظر ایک لحاظ سے چین کا شکرگزار ہونا چاہیے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارا ملک بڑے مزے سے ان دو حقائق سے بے خبر رہتا کہ چین ہندوستان کا انتہائی طاقتور بہت بڑا اور سب سے زیادہ اہم ہمسایہ ملک ہے نیز یہ کہ اس عوامی جمہوریہ کے ساتھ ہمیں کون کون سے مسائل اب درپیش ہیں یا آئندہ پیش آ سکتے ہیں۔

بلاشک، پاکستان بارہا ہمارے حق میں مصیبت کی جڑ ثابت ہوا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں ہمالیہ کی سرد ترین اور اُجاڑ بلندیوں پر، ہم نے چین کے خلاف ایک ہی مختصر سرحدی جنگ لڑی، لیکن پاکستان کے خلاف ہمیں تین لڑائیاں لڑنی پڑی ہیں۔ ساڑھے تین اس لیے کہ کچھ کے تنازعے کو ہم آدھی جنگ شمار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آج بھی چین کے مقابلے میں پاکستان کے ساتھ کسی تازہ جھڑپ کا امکان زیادہ ہے۔ مگر اس کے باوجود فوجی یا جنگی اعتبار سے چین، نہ کہ پاکستان، ہندوستان کا حریف ہے۔ لیکن پھر بھی قریب قریب سبھی ہندوستانی پاکستان کے خیال میں اس قدر محو ہیں کہ چین کی موجودگی، طاقت اور امکانی قوت کو وہ بھول ہی جاتے ہیں۔ بین اقوامی امور میں بھارت کی دعویداری، ایک سربرآوردہ شخصیت نے چند برس قبل ایک چنوتی دینے والے عنوان کے تحت ایک مقالہ سپردِ قلم کیا تھا۔ عنوان یہ تھا: "کیا اپنے پڑوسی ممالک کے تعلق سے، ہندوستان ضرورت سے زیادہ مسلح ہے؟" اس مقالے میں چین کا ذکر تک نہ تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر فاضل مضمون نگار نے اپنے سوالات کے جواب اثبات میں دیے۔ اس کے پیشِ نظر پاکستان اور دیگر چھ سارک ممالک ہی ہندوستان کے ہمسایہ ملک تھے۔ اس ملک کے ساتھ ایک طویل اور متنازعہ سرحد کے باوجود، ہندوستان کے ہمسایہ ممالک کی فہرست میں چین کا ذکر محض بھی نہیں تھا۔

شکر کا مقام ہے کہ ہندوستان کے ارباب بست و کشاد نے ایک بار پھر، تنہا پاکستان کی فکر چھوڑ کر، چین کی جانب بھی نگاہ اٹھانی شروع کر دی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستانی مسئلے کو ناکافی اہمیت دی جائے یا مغربی حدود پر چوکسی میں کسی طرح کی ڈھیل کی جائے۔ چنانچہ خارجہ حکمت عملی اور دفاعی امور میں ایک بہتر تناظر حاصل ہوتا دکھائی دے رہا ہے




اگرچہ ابھی تک یہ ایک حقیقت بن کر سامنے نہیں آیا۔ چینیوں کے سمڈورونگچو وادی میں چوری چھپے گھسنے اور اس مقام پر، جہاں پہلے انڈین انٹلی جنس بیورو نے دشمن کی نقل و حرکت دیکھنے کی چوکی بنا رکھی تھی، ان کے مضبوطی سے جم جانے کے کچھ دیر بعد نئے روسی سربراہ نے ولاڈی واسٹک میں اپنی مشہور تقریر کی۔ اپنی اس تقریر میں گورباچوف نے چین کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ایک طاقتور روسی پیش قدمی کی جھلک پیش کی۔

نیز اس نے ایشیائی پیسیفک خطے کی مجموعی سلامتی کو فروغ دینے کے لیے بعد میں کسی مناسب وقت پر زیادہ تفصیلی بات چیت کرنے کا بھی ذکر کیا۔

چین، نیز اس کی جسامت کے پیش نظر اس کی بے پناہ اہمیت کے تعلق سے، ہندوستانی آگہی کو ازسرِ نو بیدار کرنے میں یہ امر بھی ممد ہوا ہے۔ روس چین روابط میں آنے والی کسی تبدیلی کا مطلب لازماً یہ ہے کہ ہند۔ روس، ہند۔ چین اور چین۔ امریکہ روابط کے ساتھ ساتھ پورے کرۂ ارض پر دیگر اہم روابط میں تبدیلیوں کا سلسلہ جاری ہو جائے گا۔ دنیا کے اس حصے میں اپنی حیثیت پر نظرثانی کرنے کے لیے شاید ریاستہائے متحدہ کو بھی اجتناب نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ جب تک ایشیا کے دو دیو ممالک، چین اور ہندوستان، آپس میں اَن بَن رہے گی، ایشیائی سلامتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بہتر صورتِ احوال میں بھی خواہ وہ کتنی ہی مستحکم اور محفوظ کیوں نہ ہو، ہندوستان اور چین کے مابین کچھ رقابت تو رہے گی ہی۔ لیکن ان ممالک کے درمیان کشیدہ تعلقات کی صورت میں استحکام یا مجموعی تحفظ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ساؤتھ بلاک میں بیٹھے پالیسی سازوں کو اسی پس منظر ہی میں چین کے بارے میں ایک جامع اور طویل المدت حکمت عملی کو وضع کرنے کی موجودہ مشق جاری رکھنا ہوگی۔ یہ بات دراصل بہت پہلے کرنی چاہیے تھی۔ کیونکہ فریقِ ثانی کے ہر قول و فعل کے لیے ایک عارضی ردعمل کا اظہار کرنا اور ہر واقعے، مسئلے، تار یا مسل کی روشنی میں، بغیر کسی موزوں معینہ نقشے یا دیکھ بھال کے، جداگانہ عمل کرنا سب سے زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔

اس امر کا اشارہ کرنا بھی بہت ضروری ہے کہ جب ہندوستان اور چین کا سرحدی مسئلہ اہمیت رکھتا ہے، یہ مسئلہ بھی اپنی جگہ اتنا ہی

کہ سرحدی تنازعے کے باوصف چین کے ساتھ ہمارا رویہ کیسا ہو۔ دیگر الفاظ میں سرحدی مسئلے کو باہمی تسلی کی بنا پر حل کرنے کی غرض سے ہماری پوری کوشش کے باوجود بھی اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ اس مسئلے کی یکسوئی کے بعد، چینی مسئلہ رفع ہوجائے گا۔

ویت نام کی بُری حالت کا بھی مشاہدہ کیجیے چین اور ویت نام کے درمیان بّری سرحد کے بارے میں کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ اس کا تعین واقعی بڑے اچھے ڈھنگ سے کیا جاچکا ہے۔ لیکن بحری حدود کے بارے میں واقعی ان میں اختلاف ہے تاہم ان دو کیمونسٹ ممالک کے بیچ، جن میں ایک وقت گوشت اور ناخن کا ساتھ تھا۔ کبھی کوئی بڑی جھڑپ نہیں ہوئی۔ البتہ ان کی بّری سرحدوں پر خونریزی ہو چکی ہے۔ ۱۹۷۹ء کی مختصر جنگ کے بعد، ان کے مابین حالیہ ترین جھڑپیں سب سے بڑی اور بدترین رہی ہیں۔

چین نے برما کے ساتھ اپنی سرحدیں چوتھائی صدی پہلے، ۱۹۶۱ء میں طے کر لی تھیں۔ دراصل چین نے برما کی شمالی سرحد کے طور پر میکموہن لائن کو بخوشی تسلیم کرلیا تھا۔ لیکن ان اڑھائی دہوں میں چینی بڑے بھائیوں نے بیچارے برمیوں کو چین کا سانس نہیں لینے دیا۔ برما میں کیمونسٹوں کی اعانت سے پیدا کی ہوئی بغاوت، اس ملک کو پریشان کرنے والوں مسئلوں میں ایک ہے جس کی چین مسلسل طور پر اس پُرفریب بنا پر حمایت کرتا رہا ہے کہ ملک اور ملک تیر پارٹی اور پارٹی کے باہمی روابط دو مختلف چیزیں ہیں۔

اس سے الگ جاپان کی مہیب اقتصادی اور ٹیکنالوجیکل قوت اور چین کی ضرورت اس امر کو یقینی بنا دیا ہے کہ ٹوکیو کی حسیات کا بیجنگ میں زیادہ سے زیادہ خیال رکھا جائے۔ چینی کبھی کبھی ان کے تئیں ماضی میں روا رکھی گئی جاپان کی بدسلوکی کے لیے اس کے احساسِ جرم کا استحصال ضرور کرتے ہیں۔ لیکن جاپانی جنگی تیاریوں کی چین کی جانب سے شاذ ہی مذمت کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ایسا لگتا ہے جیسے وہ ان کا خیر مقدم کرتا ہو۔ چینی منڈیوں کا جاپانی مال سے اٹا ہوا ہونا اس امر کا بیّن ثبوت ہے۔

سرحدی مسئلے کا الجھاؤ اور اس کو حل کرنے کے لیے کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔ فی نفسہٖ ایک وسیع اور پیچیدہ موضوع ہے اور اس پر الگ بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ فی الحال صرف دو موزوں نشانے مدِ نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

اوّل، ارونا چل پردیش میں یا ہمارے پڑوس میں چین کے موجودہ پھڑکوں کا جواب ہمالیہ کی بلندیوں پر نہیں بلکہ نئی دہلی میں موجود ہے۔ ہمارے سبھی پڑوسیوں کے ساتھ ہمارے مسائل میں اپنی ٹانگ اڑانا چینی حکمت عملیوں کا ایک مستقل عنصر ہے۔ جب تک ہماری اندرونی حالت آج کی طرح متزلزل اور مائل بہ تشدد رہے گی، چین کی طرف سے ہمیں کوئی اہمیت دینے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اپنی قوت کے نشے میں مخمور چینی ایسے لوگ ہیں جو صرف طاقت ہی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس حقیقت سے، اس مقالے کے ذریعہ دیا جانے والا دوسرا اور اہم تر پیام پیش آتا ہے۔

ہندوستان اور چین کے درمیان طاقت کا نمایاں عدم توازن اس ملک کے لیے لگاتار مصیبت کا باعث رہے گا، خاص کر اگر چین۔ روس تعلقات میں سدھار آجائے۔ اگر چین کی بڑھتی ہوئی نیوکلیائی قوت کے باوجود ہندوستان غیر نیوکلیائی ملک بنا رہنا پسند کرتا ہے تو اس کے ناگزیر ضمنی نتیجے کے طور پر، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چین کے تعلق سے ہم اپنے آپ کو اپنی مستقل کمتری کے احساس کا مورد ٹھہراتے ہیں

رنجیت کمار پادھی

# ہند-نیپال تعلقات

## ایک جائزہ



ہندوستان اور نیپال کے ڈھائی ہزار برس پرانے تعلقات آج خوف، نفرت اور غیر یقینی کی فضا میں ایک تباہ کن موڑ پر پہونچ گئے ہیں۔ در اصل چھٹی دہائی سے ہی ہندوستان کے بارے میں نیپال کے تصورات کی بنیاد خوف پر مبنی رہی ہے۔ سیاسی، جغرافیائی، اقتصادی اور ثقافتی طور پر اپنے وجود سے محروم ہو جانے کا خوف مسلط رہا ہے اور سیاسی، اقتصادی و ثقافتی طور پر زیر تسلط آجانے کا خوف بالکل ہی بے بنیاد نہیں ہے لیکن سکم جیسا یا افغانستان جیسا حشر ہونے کا خوف درست نہیں، یہ تو بہت دور کی بات ہے اور اسے صرف مبالغہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسری جانب ہندوستان کی طرف سے نیپال کے جذبات کو شاید کبھی صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا، اور نیپال کے ذریعہ اپنی شناخت پانے کی کوششوں کو محض چھوٹی قومیت کا جذبہ کہہ کر مسترد

اس پڑوسی سے صرف اور دور کر رہے ہیں، اور نیپال کے سلسلے میں ہماری خارجہ پالیسی کا جو حال ہے، اس کی روشنی میں وہ دن دور نہیں رہ گیا جب نیپال کا رجحان ہندوستان مخالف ہو جائے گا۔ ہندوستان اور نیپال کے باہمی تعلقات میں موجودہ کڑواہٹ کی وجہ نیپال کا بے جا جذبہ قومیت نہیں بلکہ ہندوستان کا حد سے بڑھا ہوا جاگیردارانہ انداز ہے۔

نیپال نے عالمی برادری میں اپنی شناخت کی تلاش کی کوششیں چھٹی دہائی میں ہی شروع کر دی تھیں، اور اس عمل میں ہندوستان نے بھی بڑی حد تک حصہ لیا تھا۔ پنڈت نہرو نے چین کے مقابلے میں نیپال کو کھڑے ہونے کی ترغیب دی تھی۔ بہرحال یہ امر واضح نہیں ہے کہ ہندوستان اور چین کے مابین یہ بات کس حد تک طے شدہ مان لی گئی تھی کہ نیپال دراصل ہندوستان کے دائرۂ اثر میں رہے گا۔ شاہ تربھون کے بعد ۱۹۵۵ء میں شاہ مہندر نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو نیپال کی خارجہ پالیسی میں اہم تبدیلی آئی۔ شاہ تربھون کے برعکس ان کے جانشین شاہ مہندر کا جھکاؤ نفسیاتی طور پر ہندوستان مخالف تھا۔ لہٰذا شاہ مہندر کے عہد میں ہی ہندوستان اور نیپال کے رشتے بگڑنا شروع ہوئے۔ بہرحال اس کا سبب نیپال کے ذریعہ اپنی جدید شناخت کی تلاش ہی ہے، اور اس کے لیے صرف شاہ کی نفسیاتی کیفیت کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ساتویں دہائی کے وسط میں نیپال کے خارجہ تعلقات میں دو اہم تبدیلیاں سامنے آئیں۔ اول سیاسی رجحانات کی کثیر جہتی، جس کے تحت ملک در ملک تعلقات کا آغاز ہوا۔ چین سمیت تمام ممالک سے علاحدہ علاحدہ سطح پر روابط قائم کیے گئے۔

دوم، ہندوستان کے ساتھ سیاسی و ثقافتی افتراق کا رویہ۔ اس کے تحت 'نیپالیت' کے تصور کو فروغ

سیاسی بلکہ ثقافتی سطح پر بھی ہندوستان سے دوری اختیار کی جائے۔ بہرحال ڈھائی ہزار سال کی تاریخ کو یک قلم مسترد کر دینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا لیکن ہندوستانی جس وقت مشترکہ تہذیب و تمدن کی بات کرتے تو نیپالیوں کو عجیب سا احساس ہوتا تھا۔ وہ تو ہندوستان کے ساتھ بھی رسمی سا رشتہ رکھنا چاہتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرا یہ حقیقت واضح ہوتی گئی۔ برطانوی عہد حکومت میں نیپال کا جھکاؤ برطانوی ہند کی طرف تھا۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک نیپال ایک علاحدگی پسند خارجہ پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ بہرحال یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا اور نیپال نے باہر کی دنیا کے ساتھ رشتے بنانے شروع کیے۔ نیپال نے ہندوستان اور چین کو مساوی سطح پر رکھنے کی کوشش کی اور یہیں سے اس خوف کی شروعات ہوئی کہ ہندوستان نیپال کو ہڑپ نہ کر لے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چینی خطرہ کو کافی کم کر کے دیکھا گیا۔ اس خطرہ کے پیش نظر جو ردعمل سامنے آیا وہ اس سے زیادہ شدید تھا۔

بہرحال سیاسی و ثقافتی طور پر 'نیپالیت' کے جذبے کو فروغ دینا خاصا محال تھا، اور اس کے لیے ہندوستان سے دوری رکھنا ضروری تھا۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ تاریخی روابط جغرافیائی و سیاسی صورت حال کے تحت نیپالیوں کی یہ سیاسی خواہشات پوری ہونا مشکل تھیں۔ اس کے علاوہ نیپال پس ماندہ تھا، اور اس کے عوام غریب تھے اور اقتصادی ترقی کے لیے ملک کو بیرونی امداد کی سخت ضرورت تھی اور اس کے لیے ہندوستان سے بھاری مالی مدد مانگی گئی، اور اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی مالی امداد کی وجہ سے نیپال کے موقف میں بڑی حد تک نرمی آئی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ نیپال اس معاہدے کو منسوخ کرنا چاہتا ہے جس کے تحت ہندوستان اور نیپال کے مابین 'خاص قسم کے تعلقات' قایم کیے گئے تھے۔ یہ ہند۔نیپال امن و دوستی معاہدہ' ۱۹۵۰ء میں ہوا تھا۔ اچانک نیپال کو یہ احساس ہوا کہ اس

معاہدے کے تحت یہ التزام ہے کہ دونوں ملکوں میں سے کسی ایک ملک پر اگر بیرونی حملہ ہوگا تو دوسرا ملک اسے اپنے اوپر حملہ تصور کرے گا۔ سابق وزیراعظم پنڈت نہرو نے پارلیمنٹ میں بھی کہا تھا کہ نیپال پر حملہ ہندوستان پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اس معاہدہ کی اس شق کی روشنی میں یہی سمجھا گیا کہ اس کی حیثیت فوجی معاہدے کی سی ہے۔

پنڈت نہرو کی خارجہ پالیسی کے تحت کوہ ہمالیہ کو ہندوستان کی ناقابل گزر شمالی سرحد تسلیم کیا جاتا تھا۔ لہٰذا نیپال کے ساتھ ہندوستانی دفاع کا خاص تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ پنڈت نہرو کے عہد کی خارجہ پالیسی میں چین کے ساتھ دوستی کو کافی مبالغہ کے ساتھ اہمیت دی گئی تھی، اور ہندوستانی دفاع کے لیے نیپال کی اہمیت کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا تھا، جس کا خمیازہ ملک کو ۱۹۶۲ء کی جنگ میں بھگتنا پڑا۔ اس وقت نہ صرف چین اپنے اصلی روپ میں کھل کر سامنے آگیا، بلکہ نیپال نے بھی ہند، چین تنازعہ میں اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھ کر دونوں ملکوں کے ساتھ مساوی فاصلہ قائم رکھا۔

نیپال کے رویے نے نہ صرف ہندوستانی توقعات پر پانی پھیر دیا بلکہ چین کے مقابلے میں ہندوستانی دفاع کی غیر محفوظ حیثیت نے نیپال کو اور بہادر بنا دیا، اور وہ مساوی دوری پر زور دینے لگا۔ ہندوستان کی جانب سے بار بار اس امر پر اصرار کیا گیا کہ نیپال جنوب ایشیائی دفاعی ڈھانچے میں ہی شامل ہے، اور اسی کی روشنی میں نیپال کو چین کے زیادہ قریب نہیں آنا چاہیے اور ہندوستانی مفادات سے متصادم رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ نیپالیوں نے اس درخواست کو بار بار نظر انداز کیا ہے، یہی نہیں انھوں نے اس کے برعکس عمل بھی کیا ہے۔

نیپال میں چینیوں کی موجودگی اور خاص طور پر ہندوستانی سرحد کے پاس چینی فوجیوں کی نقل و حرکت کے خلاف ہندوستان شدید ناراضگی کا اظہار کرتا رہا ہے۔ دراصل یہ چینی تعمیراتی کاریگروں، تکنیکی ماہروں اور انجینیروں کے بھیس میں وہاں آتے ہیں۔ اور یہی دراصل وہ چیز ہے جسے نیپال کے ہاتھ میں 'چینی پتا' کہا گیا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے معاہدۂ دوستی کو نیپال میں اکثر لوگ ایک غیر مساوی معاہدہ کا نام دیتے ہیں، اور ماضی و حال کے سیاق و سباق میں اس معاہدہ کو نئی شکل دینے کی بات کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ نیپالی اپنے بیانات اور عمل کے ذریعہ اس معاہدے میں [illegible]

کرتے رہے ہیں۔

ہندوستان کے 'خطرہ' کو کم کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً نیپال کے ذریعہ 'چینی پتا' کو استعمال کیا جاتا ہے۔ چینی، نیپالی ترائی کے علاقے میں بہت سے شہری پروجیکٹوں میں ملوث ہیں۔ جب یہ خبر نئی دہلی پہونچی کہ اس امر کا امکان ہے کہ نیپال میں تعمیر ہونے والی 'شاہراہ شرق و غرب' کا ٹھیکہ چینیوں کو ملے گا تو ہندوستان سے اس وقت کے وزیر خارجہ شری شیو شنکر فوراً کھٹمنڈو گئے تھے۔ معاملہ صرف چین کی ہی حد تک نہیں، نیپال نے پاکستان سے پینگ بڑھانے کی بھی کوششیں کی ہیں، اور ہند، نیپال دریائی تنازعے میں بنگلہ دیش کو بھی ملوث کر لینے کی کوشش کی ہے۔ یہی نہیں ماضی میں نیپال میں ہند، مخالف مظاہرے بھی ہوتے رہے ہیں، اور شاید یہ سب کچھ برسراقتدار طبقہ کی چشم پوشی سے ہوا ہے۔

بہرکیف ہند، نیپال تعلقات کو صحیح طور پر 'خطۂ امن' کی تجویز پر غور کیے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ یاد رہے کہ خطۂ امن کا یہ تصور سب سے پہلے شاہ بیریندر نے ۱۹۷۳ء میں الجزائر چوٹی کانفرنس کے موقع پر پیش کیا تھا۔ اس تجویز کو باضابطہ طور پر ۱۹۷۵ء میں تحریک کی شکل دی گئی۔ اس وقت سے دنیا کے ۷۷ ممالک (جن میں ہندوستان اور بھوٹان کے علاوہ جنوب ایشیا کے تمام ممالک اور اس کے علاوہ سلامتی کونسل کے سبھی مستقل ممبران شامل ہیں) اس کی حمایت کر چکے ہیں۔ نیپال کے آئین میں اس تصور کو ایک رہنما اصول کے طور پر درج کیا گیا ہے، اس تجویز پر عمل درآمد کو نیپال کے جملہ مسائل کا حل خیال کیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ خطۂ امن قرار دیے جانے کے بعد اور اپنی نیز علاقائی حفاظت سے بے نیاز ہو کر نیپال پوری دلجمعی و تندہی سے اپنی ترقیات کی طرف توجہ کر سکے گا۔ نیپال اس تجویز کے حق میں ہندوستان کی حمایت حاصل کرنے کی سمت میں بھی برابر کوشاں رہا ہے۔ دوسری جانب ہندوستان اس تجویز کو باہمی معاہدۂ دوستی کے متضاد خیال کرتا ہے اور اسے یہ خدشہ ہے کہ نیپال کے علاقہ خطۂ امن قرار دیے جانے کے بعد وہاں غیر ملکی قوتوں کا اثر و رسوخ بڑھ جائے گا، اور سلامتی و دفاع کے نقطۂ نظر سے یہ چیز ہندوستان کے مفادات کے خلاف ہوگی۔ اس سلسلے میں ہندوستانی وزارت خارجہ نے غالباً نیپالی عزائم کو مبالغہ کے ساتھ دیکھا ہے، خوف و خدشات زیادہ ہیں، اور اسی لیے ہندوستان اس کا مخالف [illegible] ہند اور نیپال کے تعلقات میں

مستقلاً دراڑ رہی ہے۔

نیپال میں ہندوستانی تاجروں، کاریگروں اور ماہرین کے آزادانہ داخلے سے وہاں کی آبادی کو زبردست مسابقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، قابل ذکر ہے کہ معاہدۂ دوستی کے تحت ہر دو ممالک کے شہریوں کو ایک دوسرے ملک میں مساوی شہری سہولتیں حاصل ہیں، حالانکہ نیپالی حکومت اس معاہدہ پر لفظ بہ لفظ عمل نہیں کرتی ہے، اور ایک غریب ملک سے یہ توقع کی بھی نہیں کی جا سکتی۔

اب یہ اطلاعات بھی آنے لگی ہیں کہ نیپال میں کچھ بااثر طاقتیں ہندوستان میں سرگرم گورکھا نیشنل لبریشن فرنٹ کی حمایت و ہمت افزائی کر رہی ہیں۔ نیز یہ کہ وہ اس تحریک کو مالی امداد بھی دے رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا نیپال معاہدۂ دوستی کو منسوخ کرانے کی غرض سے گورکھا تحریک کی حمایت کرنے لگا ہے۔ اس سے قبل یہ خیال بھی کیا گیا تھا کہ سکم میں غیر جمہوری قوتوں کو بھی نیپال کی حمایت حاصل رہی تھی۔ اگر یہ باتیں درست ہیں تو نیپال پھر ایک خطرناک کھیل کھیل رہا ہے، اور ہندوستان بجا طور پر اسے ان سرگرمیوں سے باز رہنے کے لیے کہہ سکتا ہے۔

طویل کھلی سرحد، دریائی پانی میں حصہ داری اور تارکین وطن کی شہریت۔ یہ وہ مسئلے ہیں جو ہند نیپال تعلقات پر وقتاً فوقتاً خراب اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ نیپال کو یہ شکایت بھی رہی ہے کہ شاہ کے مخالف اپنی سرگرمی کے لیے ہندوستانی سرزمین کو استعمال کرتے ہیں۔

اگرچہ ہندوستان نیپال کو غیر ملکوں سے ملنے والی کل ترقیاتی امداد میں سے نصف تک دیتا رہا ہے اور اس وقت بھی ہندوستانی امداد ۱۱ فی صد ہے، اس کے علاوہ ہندوستان نے نیپال کو ہوائی اڈہ، شاہراہیں تعمیر کرنے اور زرعی صنعتیں لگانے کے لیے مدد دی ہے لیکن اس کے باوجود نیپال ہندوستان کے ساتھ مستقلاً وابستہ رہنا نہیں چاہتا، اور اسی لیے وہ دوسرے ملکوں (مثلاً چین) سے بھی اسی قسم کی امداد قبول کرتا رہا ہے۔ نیز گزشتہ برسوں میں نیپال کی یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستان اس کے ساتھ رسمی سلوک کرے اور مشترکہ ثقافتی میراث وغیرہ کی بات نہ کرے۔

قصہ مختصر! اب نئے جغرافیائی و سیاسی کوائف کی روشنی میں ہندوستان کو نیپال کے تعلق سے اپنی پالیسی میں مناسب تبدیلی کرنی چاہیے۔

بھرت سنگھ بالی

# پنجاب میں مذہبی سیاست اور برنالہ کا استقلال



قومی رہنماؤں کی زندگی کے سفر میں کبھی کبھی ایسے مشکل اور دشوار موڑ آتے ہیں جب حق، مناسبت اور جوازیت کی کسوٹی پر کیے گئے فیصلوں کی مخالفت کی جاتی ہے اس لیے نہیں کہ ان فیصلوں میں نظر ثانی کی گنجائش ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ عوامی مزاج مناسبت اور جوازیت کے دائرے سے باہر جذبات کی بنا پر فیصلے کی درستی اور جوازیت سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ اعینہ یہ صورت پنجاب کے وزیراعلیٰ سردار سرجیت سنگھ برنالہ کے ساتھ پیش آئی، جب سکھ مذہب کے سب سے مقدس مقام اکال تخت سے سکھ مذہب کے گرنتھیوں کی طرف سے ایک حکم نامہ جاری ہوا کہ وہ اپنی جماعت اکالی دل (لونگووال) کی صدارت و سرپرستی سے مستعفی ہو جائیں اور اس جماعت کو برخاست کر دیں اور اس کے سبھی عہدیداران اور ممبران اسمبلی کے استعفے پیش کر دیے جائیں۔

سردار سرجیت سنگھ برنالہ نے بہت عاجزی و انکساری کے ساتھ حکم نامے پر نظر ثانی کی درخواست کی جو مسترد کر دی گئی اور نتیجتاً برنالہ صاحب کو "تنخواہیہ" قرار دے دیا گیا اور جب وزیراعلیٰ نے گرنتھی صاحبان کے حضور میں حاضر ہونے کی ہدایت کو مسترد کر دیا، مسترد اس لیے کر دیا کیوں کہ ان کی جماعت کے اعلیٰ رفقاء نے ان کو ہرمندر صاحب میں جانے سے روک دیا۔ چنانچہ ان کے ہرمندر صاحب میں نہ جانے پر برنالہ صاحب کو سکھ مذہب سے خارج کر دیا گیا۔

برنالہ صاحب نے ایسا کر کے ہندوستان کے سیکولر نظام کی بنیادوں کو مضبوط تر بنا دیا۔ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ پنجاب میں جو واقعات اس وقت ظہور پذیر ہوتے ہیں، اس سے سارا ملک فکرمند ہے، اور ملک کا کوئی گھرانہ ایسا نہیں جس میں پنجاب کا تذکرہ روزانہ نہ ہوتا ہو۔

یہ امر بھی صاف عیاں ہے کہ برنالہ صاحب پنجاب کے وزیراعلیٰ اور اکالی دل (لونگووال) کے صدر کی حیثیت سے پنجاب کے اندر ہندوستان کی یکجہتی،

امانت داری کی حیثیت سے صرف پنجاب میں ہی سکھ بھائیوں کی ذمہ داری تک محدود نہیں بلکہ ہندوستان کے ۸۰ کروڑ عوام کی فلاح و بہبود بھی ان کی ذمہ داری میں آتی ہے۔ انھوں نے مذہب اور سیاست کو علاحدہ رکھ کر جو فریضہ انجام دیا ہے، ان کی آئینی و قومی ذمہ داری کے ساتھ بالکل مطابقت رکھتا ہے۔

ہندوستان ایک جمہوری و سیکولر ملک ہے اور اس کے آئین کی دفعہ ۲۵ کے تحت یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جہاں ہر ہندوستانی کو اپنی ضمیر کے مطابق کوئی بھی مذہب اختیار کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا بنیادی حق حاصل ہے، وہاں حکومت کو وہ سیاسی عمل روکنے کا حق حاصل ہے جو کسی بھی مذہبی روایت کے ساتھ وابستگی رکھتا ہو۔ مذہبی ادارے اور ان اداروں کے سربراہ یہ حق بے شک رکھتے ہیں کہ وہ مذہبی مقاصد کی خاطر وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق مذہبی فرمان جاری فرمائیں، مگر ایسے اداروں یا ان اداروں کے سربراہوں سے حکم ناموں کے ذریعہ سیاسیات میں

سکھ مذہب کے رہنماؤں کا براہ راست یا بالواسطہ طور پر کوئی تعلق کسی جماعت کی اچھائی یا برائی سے نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی سیاسی جماعت اس قسم کے حکم ناموں کی پابند تصور کی جا سکتی ہے۔ اکالی دل (لونگووال) ایک سیاسی جماعت ہے۔ ہر سیاسی جماعت کے کچھ مقاصد ہوتے ہیں۔ اس جماعت کے اندر سال گزشتہ میں جو بٹوارہ ہوا وہ بھی کچھ بنیادی اصولوں پر اختلاف کی وجہ سے ہوا۔ اکالی دل (لونگووال) کے علاوہ متحدہ اکالی دل بھی موجود ہے۔ جس کا طرز فکر اکالی دل (لونگووال) کے طرز فکر سے مختلف ہے۔ اسی طرح سے اکالی دل (بادل) کی سوچ بھی متحدہ اکالی دل اور اکالی دل (لونگووال) سے متضاد ہے۔ ان حالات میں اگر ان تینوں جماعتوں کو باہم مربوط کرنے کی کوئی کوشش ہو سکتی ہے تو وہ اسی صورت میں ممکن ہے جب بنیادی اصولوں پر ان کے درمیان اتفاق ہو۔ یہ کہنا کہ حکم نامے کی رو سے نامزدہ عہدیداران کی سربراہی ہر فکر و عمل کے لوگ قبول کر لیں، قرین قیاس ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ کوئی بھی ایسا مفصل اور واضح پلان عوام کے سامنے نہیں رکھا گیا جس سے باہمی اختلاف کو دور کر کے مختلف جماعتوں کے اندر ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہو۔ عہدیداران، جن کو نامزد کیا گیا ہے، ان میں بھاری اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو انتہا پسندی میں یقین رکھتے ہیں یا جن لوگوں کا براہ راست اکالی دل (لونگووال) کے رہنماؤں کے ساتھ کھلم کھلا ٹکراؤ رہا ہے۔ ان حالات میں سردار سرجیت سنگھ برنالہ کا یہ فیصلہ کہ وہ اپنی جماعت، اس کے عہدیداروں اور ممبران اسمبلی کو برخاست نہیں کریں گے، ایک صحیح اور قابل ستائش فیصلہ ہے۔

یہ امر یقینی ہے کہ سرجیت سنگھ برنالہ کے فیصلے کو ان کے مخالفین نے سکھ عوام میں غلط ڈھنگ سے پیش کر کے ان کے خلاف غم و غصہ اور نفرت کی لہر پیدا کرنے کی



کے ادوار کو تنخواہ بیہ قرار دے کر جو کوشش سردار سرجیت سنگھ برنالہ کو سکھ عوام کی نگاہ میں گرانے کی گئی ہے اس کوشش کے خلاف ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ آواز بلند کرے اور مذہب کو سیاست کے ساتھ ملانے کے خلاف ایک تحریک شروع کی جائے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کی حکومتی جماعت کانگریس پر بھی ایک بھاری ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ بھی اس قسم کے خطرناک رجحانات کے خلاف سیاسی اختلافات کو ایک طرف رکھ کر پوری تندہی کے ساتھ ایک ملک گیر تحریک جاری کرے۔ خصوصی طور سے ضرورت اس بات کی ہے کہ پنجاب کے سکھ عوام میں اس بات کا احساس پیدا کیا جائے کہ اکالی دل (لونگووال) کا فیصلہ واقعات اور حقائق کی بنیاد پر صحیح فیصلہ ہے۔

قابل تعریف بات یہ ہے کہ سردار سرجیت سنگھ برنالہ نے ۲۰ فروری کو موضع لونگووال میں جو کہ سنت ہر چند سنگھ لونگووال کا پیدائشی گاؤں ہے، اکالی دل لونگووال کی ایک اہم کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا ہے جس میں اکالی دل کے اس فیصلے کی تشریح کی جائے گی۔ اتنا ہی کافی نہیں بلکہ پنجاب میں کام کرنے والی ہر سیاسی جماعت کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں ان خطرناک رجحانات کے خلاف ایک ہمہ گیر مہم

ہندوستان کے اندر فرقہ وارانہ رجحانات صرف سکھ مذہب میں ہی نہیں بلکہ ہندو اور مسلمانوں میں بھی رونما ہو رہے ہیں۔ یہ رجحانات ملک کی سالمیت کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ ملک کی غریبی اور اس کی پس ماندگی کو ہم پہلے ہی کچھ عرصہ اور برداشت کر سکتے ہیں لیکن ان رجحانات کے خلاف ایک مصمم ارادے سے بھرپور مقابلہ ناگزیر ہو چکا ہے۔ جس کے لیے ہر ہندوستانی کو تیار رہنے کی ضرورت ہے۔

ایک پہلو اور اہم ہے جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ جن عناصر کی ایما پر یہ حکم نامے جاری کرائے گئے، وہ پنجاب میں غیر یقینی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ان عناصر کی یہ کوشش کامیاب ہو جاتی اور سردار سرجیت سنگھ برنالہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جاتے تو پنجاب میں صدر راج کا نفاذ یقینی ہو جاتا۔ عوام کی منتخب شدہ حکومت کی برطرفی یا برخاستگی بذات خود ایک ایسا فعل ہوتا جو جمہوری طرز عمل کے بالکل برعکس ہوتا۔ صدر راج کے دوران فوج کی موجودگی یقینی ہو جاتی۔ کیوں کہ بڑھتی ہوئی انتہا پسندی کی وارداتوں کا انسداد عام طریقوں سے ناممکن ہوتا۔ نتیجے میں عام لوگوں کے اندر بھارت سرکار کے خلاف رنج و غصے کی لہر تیز تر ہو جاتی جس سے ان عناصر کے ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچنے میں مدد ملتی۔ یہ کوئی صحیح فیصلہ نہ ہوتا اور نہ ہی اس فیصلے سے سکھ مذہب یا پنجاب کے عوام کو خصوصی طور پر اور باقی ملک کے لوگوں کو عمومی طور پر کوئی فائدہ پہونچتا۔

پنجاب میں حالیہ واقعات سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وطن دشمن عناصر اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہوں گے اور سیکولر جمہوری طاقتیں مضبوط تر ہوں گی۔ سردار سرجیت سنگھ برنالہ کا فیصلہ قابل تعریف ہے، جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

"میں نہیں چاہتا کہ میرا گھر ایسا فصیل بند قلعہ ہو جس کی کھڑکیاں ہر طرف سے مقفل کر دی گئی ہوں۔ میرے گھر کی آغوش ہر ملک و قوم کے تہذیبی دھاروں کے لیے تاقیامت وا ہے۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ کسی ایک دھارے کے تیز بہاؤ سے میرے اپنے پاؤں ہی اکھڑ جائیں۔"
(گاندھی)

اونکار سنگھ

# جموں و کشمیر: کانگریس (آئی) ـ این سی (ایف) کے داؤ پیچ



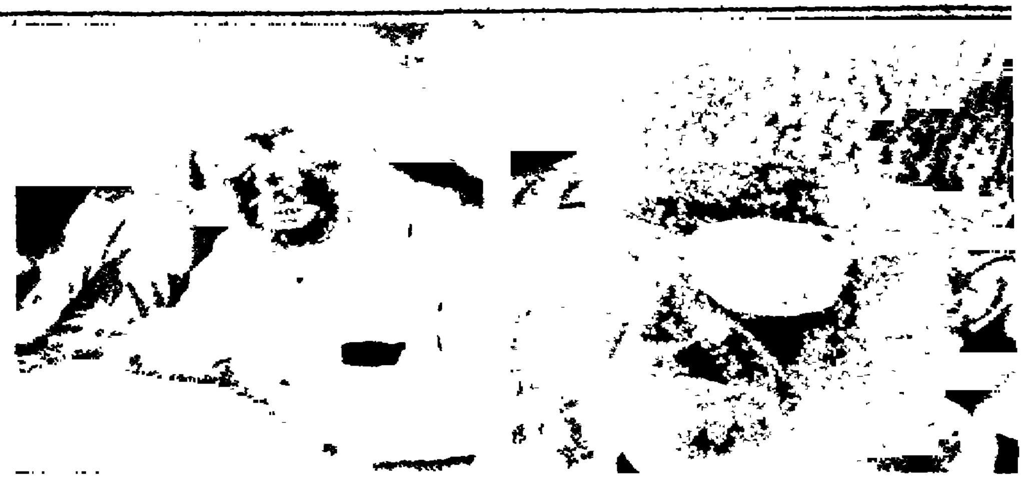
جموں و کشمیر کے سیاسی افق پر بادل بکھرے نظر آرہے ہیں کانگریس (آئی) این سی (ایف) کا متحدہ محاذ مشکلات سے دوچار ہے ابھی ایکارڈ کی سیاہی خشک نہیں ہوئی ہے لیکن دونوں جماعتوں میں ناراضی کے آثار رونما ہونے شروع ہو گئے ہیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ کانگریس کے کچھ وفود وزیر اعظم سے کچھ عرصہ پہلے ملے اور کابینہ کے اندر ہم آہنگی کے فقدان پر حیرت کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر فاروق صاحب کے طرز عمل سے ہر کوئی واقف ہے، وہ کافی اہم فیصلے جو کابینہ کے حدِ اختیار میں ہوتے ہیں تنہا کرنے کے عادی ہیں، جس سے کانگریس کے ممران کا بینہ کافی حد تک مایوس ہیں۔ اعلیٰ افسروں کی تبدیلی کے احکامات صادر کرتے وقت بھی وزیر اعلیٰ صاحب نے کابینہ کے رفقار کار سے مشورہ نہیں کیا تاہم اس قسم کی مشکلات ایک مخلوط وزارت میں ناگزیر ہیں۔ زیادہ مشکل تو سیاسی نوعیت کی ہے چناؤ کمیشن نے انتخاب کی تاریخ ۲۳ مارچ متعین کر دی ہے لیکن چناؤ مہم کا صحیح معنوں میں آغاز نہیں ہوا ہے۔ امیدواروں کی فہرست مشتہر کرنے کے باوجود بھی وہ رنجشیں کم نہیں ہوئیں جو ایکارڈ سے پہلے تھیں۔

ڈاکٹر فاروق صاحب کے کہنے کے مطابق دونوں جماعتیں ایک ہی پلیٹ فارم سے چناؤ مہم چلائیں گی لیکن عملاً ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ کانگریس کے جن سرکردہ رہنماؤں نے جولائی ۸۴ء کے واقعات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، ان کی نشستوں میں ان کے خلاف ایسے عناصر کو ابھارا جا رہا ہے جو بادی النظر میں بغیر کسی سہارے کے مقابلہ کرنے کے لائق نہیں ہیں۔

کانگریس کے ایک اہم رہنما کے علاقے میں نیشنل کانفرنس (ف) کے ایک وزیر نے حال ہی رہنما ان کے ساتھ نہیں تھے۔ اس جلسہ کا اہتمام ان لوگوں سے کرایا گیا جو کانگریس کے مخالف ہیں۔ اگر یہ صورت چناؤ مہم شروع ہونے سے پہلے کی ہے تو مہم شروع ہونے کے بعد مشترکہ پلیٹ فارم کا استعمال کافی محال دکھائی دیتا ہے۔ کانگریس (آئی) کے اندر امیدواروں کی تعداد نشستوں کی تعداد کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے اور یہی صورت این سی (ایف) کی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ نشستوں کی تقسیم اور امیدواروں کی نامزدگی کے بعد ناراضی دونوں جماعتوں میں کافی حد تک بڑھ جائے گی۔ جہاں تک جموں صوبہ کا تعلق ہے وہاں مخالف جماعتوں میں سے کوئی ایسی جماعت نہیں جو موثر مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہو لیکن جہاں تک کشمیر وادی کا تعلق ہے، نیشنل کانفرنس کے ناراض عناصر مسلم متحدہ محاذ کے ساتھ سازباز کر کے این۔ سی۔ ایف کو کافی نقصان پہنچانے کی نشستوں پر زیادہ کارگر ثابت ہو سکتی ہے جو وا سے کانگریس کے حصہ میں آئیں گی۔

جموں صوبہ میں کانگریس کی کامیابی ز اہمیت کی حامل نہیں بلکہ اس کے برعکس مـ محاذ کی کامیابی کانگریس این سی (ایف) اتحـ کے بنیادی مقاصد کے لیے بہت ہی مضر ثا ہو سکتی ہے۔ اگر وادی سے مسلمانوں کی اکثر نے کانگریس این سی (ایف) کے خلاف فیصلہ تو جموں کشمیر کی سیکولر روایات کے لیے ایک بڑا سانحہ ہوگا۔

خواجہ غلام محمد شاہ نے متحدہ مسلم اپنا تعاون دینے کا فیصلہ کر دیا ہے خواجہ موصوف نیشنل کانفرنس کے سرکردہ رہنما ہیں اور پہلے کبھی بھی انھوں نے فرقہ وار سیاست کو پسند نہیں کیا۔ یہ امر قابلِ تـ کہ ان کو کانگریس (آئی) اور وزیر اعظم



غور طلب ہے کہ آیا وہ اس بنا پر سیاسی عقیدوں سے منحرف ہو جائیں۔

جب ہمارے نامہ نگار نے شاہ صاحب کے حالیہ دہلی کے دورے کے دوران ملاقات کی تو شاہ صاحب سے اس تہیہ کا اعادہ کیا کہ وہ کانگریس کی بیخ کنی کریں گے۔ اگر شاہ صاحب این سی (کے) کے نام پر مسلم محاذ سے علاحدہ انتخاب لڑیں اور بنیادی سیاسی عقیدوں کی کسوٹی پر عوام کے سامنے جائیں تو شاید کسی تنقید کی گنجائش نہیں رہ سکتی۔ ان کی برطرفی کے بعد کشمیری عوام میں ان کی ہر دلعزیزی متقابلتاً بڑھ چکی ہے اور اس کا فائدہ براہ راست ان کو ملنے کے بجائے مسلم محاذ کو مل سکتا ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ کشمیر وادی میں این سی (ایف) کے مقابلے میں کانگریسی امیدواروں کو متحدہ محاذ سے زیادہ خطرہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گاؤں اور حلقے کی سطح پر این سی (ایف) کے ورکرس اور کانگریس کی تنظیم میں جذباتی ہم آہنگی نہیں پیدا ہو سکتی۔ نیشنل کانفرنس کے اندر بھی وہ عناصر جو کانگریس کے ساتھ الحاق کے خلاف تھے ان کا بالواسطہ تعاون کانگریسی مخالف امیدواروں کے حق میں ہوگا اسی لیے وادی سے کم سے کم سیٹیں کانگریس کو دی گئی ہیں۔

دوسری طرف ریاستی کانگریس کے سابق سربراہ اور موجودہ مرکزی وزیر سیاحت مفتی محمد سعید صاحب جنھوں نے وادی میں کانگریس کی ساخت کے لیے انتہائی کوشش کی ہے ان کو بھی ایک اہم مشکل درپیش ہے اور وہ یہ کہ کشمیر وادی سے کانگریس کو جو سیٹیں ملی ہیں وہ ہر علاقے کے تنظیمی ورکروں کے اطمینان کے لیے کافی نہیں۔ یہ وقت ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک اپنی اس تنظیم کو جسے انھوں نے اپنے پسینے سے سینچا ہے، تازہ ترین صورت حال میں کانگریس (این سی (ایف)) کے اتحاد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ان کے جانشین خواجہ غلام رسول کار بھی کافی خوبیوں کے مالک ہیں اور ہر شخص توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنے تنظیمی ڈھانچے کو جو ان کے پیش رو نے کھڑا کیا ہے، بنیادی مقاصد کے لیے استعمال کر کے سیکولر جمہوری تقاضوں کو تقویت پہنچا سکتے ہیں۔

## Statement about ownership and other particulars about HAL-E-HIND

Form IV

(As required by Rule 8 of Press Registrar s Act)

| | |
|---|---|
| Place of Publication | 90 Shah Jahan Road New Delhi |
| Periodicity of Publication | Monthly |
| Printer s Name | Balraj Verma |
| Nationality | Indian |
| Address | 90 Shah Jahan Road New Delhi |
| Publisher s Name | Balraj Verma |
| Nationality | Indian |
| Address | 90 Shah Jahan Road New Delhi |
| Editor s Name | Balraj Verma |
| Nationality | Indian |
| Address | 90 Shah Jahan Road New Delhi |
| Owner s Name | Horizon Publishing House |
| Address | 90 Shah Jahan Road New Delhi |

PARTNERS D.D. THAKUR
DHARAM VIR BATRA
AMRIT LAL BATRA

I, Balraj Verma hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief

Balraj Verma
Publisher

کرناٹک

# فرقہ وارانہ تشدد

وی.سی.بھاسکرن

وزیر اعلیٰ رام کرشن ہیگڑے کے ۴۸ ماہ کے دور اقتدار میں فرقہ وارانہ تشدد ایک مستقل سلسلہ بن کر رہ گیا ہے تشدد کے واقعات ایک مسلمان کی مظلومی سے شروع ہوتے ہیں اور زیادہ تعداد میں مسلمانوں کے ظلم کا شکار ہونے پر جاکر ان کا خاتمہ ہوتا ہے۔ حکمراں جماعت اور حزب اختلاف دونوں جانب کے سیاست داں ہر فساد سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مسلمان قائدین آگ کو اور ہوا دیتے ہیں جس سے خود انہی کے فرقے کے غریب اور معصوم لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے

پہلا بڑا فساد ۱۶، ۱۷، ۱۸ فروری ۱۹۸۳ء کو شری ہیگڑے کے مسند اقتدار پر بیٹھنے کے صرف ایک ماہ بعد ہوا تھا۔ یاد رہے کہ ۱۹۸۳ء میں کانگریس کی شکست کے بعد وزیر اعلیٰ گنڈو راؤ کی جگہ شری رام کرشن ہیگڑے پہلے جنتا وزیر اعلیٰ بنے تھے۔ اس فساد کی تفصیل یہ تھی کہ ۱۴، ۱۵ فروری کی رات کو خورشید نام کی ایک اٹھارہ سالہ مسلم لڑکی کو بیلاری شہر کے کوول بازار تھانہ میں لے جایا گیا، وہاں تھانے کے انچارج ایک سب انسپکٹر سمیت پانچ پولیس والوں کے گروہ نے اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا۔ بیلاری مٹکے کا دھندہ کرنے والوں کا مرکز ہے اور مٹکے والوں کا پولیس و سیاسی حلقوں میں اچھا اثر رسوخ ہے، اس بے گناہ لڑکی کے ساتھ ہوئی زیادتی کے بعد تشدد کا سلسلہ شروع ہوا پولیس نے ۸۳ راؤنڈ گولیاں رائفل سے اور ۱۶ راؤنڈ ریوالوروں سے چلائیں جن سے سات افراد ہلاک ہو گئے۔ آتشزنی اور لوٹ مار کی زد میں ایک بینک بھی آیا۔ کل نقصان کروڑوں میں ہوا۔ فسادات کے دوران وزیر اعلیٰ ہیگڑے نے ڈائرکٹر جنرل پولیس مسٹر کے سی. کے راجہ کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا مسٹر راجہ کا قصور یہ بتایا جاتا ہے کہ جب وزیر اعلیٰ بیلاری آئے تو وہ دوڑ کر ان کے خیر مقدم کے لیے نہیں گئے بلکہ اپنے مقام پر رہ کر فسادات کو کنٹرول کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔

فساد کے بعد ہوئی عدالتی تحقیقات نے فساد پھیلنے کی ذمہ داری ایس۔پی، ڈی ایس۔پی اور کوول بازار کے تھانے دار پر ڈالی۔ ڈاکٹری رپورٹ اور عصمت دری کی شکار ہوئی لڑکی کے ذریعہ ڈویژنل کمشنر کے سامنے پیش کی گئی شہادت کے باوجود لڑکی کے ساتھ زیادتی و جبر کرنے والے پانچ پولیس والوں میں سے صرف ایک کانسٹبل کو معطل کیا گیا' اسی کانسٹبل کے خلاف پولیس نے چارج شیٹ بھی لگائی اور ستمبر ۱۹۸۵ء کے وسط میں بیلاری ضلع جج نے شہادت نہ ملنے کی بنیاد پر مقدمہ خارج کر دیا ظاہر ہے کہ پولیس نے اس مقدمے کو اتنا بے دم کر دیا تھا کہ وہ ٹک نہیں سکا

دلچسپ بات یہ ہے کہ فساد کے دوران جب مسٹر ہیگڑے نے بیلاری کا دورہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ لوگ پولیس سے اس قدر تنگ آ چکے ہیں کہ انھوں نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا ہے اور اس کے باوجود مسٹر ہیگڑے نے اسی پولیس کو زنا بالجبر کے الزام سے صاف بری ہو جانے دیا اور اس پر کسی مسلم رہنما نے آواز اٹھائی نہ کسی اور سیاست داں نے۔ اتنے بڑے پیمانے پر فساد ہوا' پھر بھی مجرم صاف بچ گئے اور یہ سب اس اقتدار کے تحت ہوا جسے صاف



ستھرا کہا جاتا ہے اور جس کا سربراہ ایک ایسا شخص ہے جو اقتداری سیاست کا دعویدار ہے ـــ آج بیلاری کا نام تاریخ میں درج ہو چکا ہے۔

مشہور ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور کبھی کبھی زیادہ شدت کے ساتھ، ۱۰ اور ۱۳ مارچ کے درمیان بنگلور کے شیواجی نگر علاقے میں بڑے پیمانے پر فساد ہوا۔ یہ فساد بنگلور کے مضافاتی علاقے ٹینری روڈ تک پھیل گیا، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

شیواجی نگر کے فساد کا سبب یہ بنا کہ منشیات کا ناجائز کاروبار کرنے والے ایک شخص کی پولیس کی حراست میں موت واقع ہوگئی، یہ شخص دیگر مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے بھی بدنام تھا۔ دریں اثنا حکمراں پارٹی کے ایک ایم۔ ایل۔ اے نے مسلمانوں کے لیے ایسے ہتک آمیز الفاظ استعمال کیے جس سے لوگوں کے جذبات اور بھڑک اٹھے۔ اس کے بعد بڑے پیمانے پر فساد شروع ہوگیا۔ برہم مسلمانوں نے پولیس اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا۔

جب بھی کوئی فساد ہوتا ہے، سیاست داں اسے دوسرا رخ دے کر کسی ایسے پولیس افسر کو قربانی کا بکرا بنا دیتے ہیں جس نے غنڈہ گردی کو روکنے کے لیے سخت اقدامات کیے ہوں، مسلمان خوش ہو جاتے ہیں۔ تب تک کسی جانب سے ایک اشتعال انگیز تقریر ہوتی ہے، "جہاد" کا نعرہ لگتا ہے اور اشتعال بڑھتا جاتا ہے۔ مارچ ۸۵ء کے بنگلور فساد میں کم سے کم دس افراد گولیوں کا شکار ہوئے۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق شیواجی نگر تھانے کے حوالات میں ہوئی ایک مسلمان کی موت کے نتیجے میں شہر کے مختلف حصوں میں فساد ہوا۔ ایک مقامی انگریزی ہفتہ وار میں ایک اشتعال انگیز مضمون شائع ہوا، جس میں مسلمانوں کے بارے میں جنتا پارٹی کے ایک ایم۔ ایل۔ اے کے خیالات کا حوالہ دیا گیا تھا۔ اس مضمون سے مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے جس کے نتیجے میں پولیس نے گولی چلائی۔

کرناٹک کے دوسرے سب سے بڑے شہر ہبلی میں ۴ مئی ۸۴ء کو فساد ہوا، اس فساد کی چنگاری اس طرح پھوٹی کہ ایک مسلمان ڈرائیور نے سڑک پر پیدل چلتے ایک ہندو کو زخمی کر دیا تھا۔ اگرچہ تقریباً روز ہی کوئی نہ کوئی ڈرائیور کسی نہ کسی پیدل چلنے والے کو زخمی کر دیتا ہے، بھلا اس بات کا کسی ذات یا مذہب سے کس تعلق [illegible]

پر اصل مسئلہ کچھ اور ہی تھا۔ ایک درگاہ سے متصل میدان کی ملکیت کے سلسلے میں تنازعہ چل رہا تھا۔ بتایا جاتا تھا کہ یہ سرکاری زمین تھی، مسلمان اس زمین کو درگاہ سے ملحق کرنا چاہتے تھے۔ اس فساد میں ہوئی پولیس فائرنگ سے دس جانیں تلف ہوئیں

کرناٹک میں ۱۹۸۴ء کے دوران پولیس نے تیس (۳۰) مرتبہ گولی چلائی ـــ اس میں سے ۱۹ مرتبہ یہ گولیاں لوگوں کے مجمع پر چلائی گئیں اور ان میں سے پانچ مرتبہ یہ گولیاں ہندو مسلم فساد کو کنٹرول کرنے کے لیے چلائی گئیں۔ کل ۲۱ افراد ہلاک ہوئے۔

گذشتہ سال ۲۴ جولائی کو بنگلور سے ۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع رام نگرم میں ایک مندر کے جلوس پر چند شریر مسلمان لڑکوں نے پتھراؤ کر دیا فساد پھوٹ پڑا اور چھ افراد ہلاک ہو گئے۔ ان ہلاک شدگان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہوئے۔ اس مرتبہ بھی اصل مسئلہ ایک سرکاری زمین کی ملکیت کا تنازعہ تھا۔ مسلمان اس زمین کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ قابل ذکر ہے کہ وزیر اعلیٰ رام کرشن ہیگڑے کو کبھی اس فساد زدہ شہر کے دورے کے لیے مہلت نہیں ملی۔

پھر، دسمبر ۸۶ء آیا۔ ریاست کے ممتاز انگریزی روزنامے 'دکن ہیرلڈ' میں ایک افسانہ شائع ہوا اور یہی افسانہ بھاری تشدد کا باعث خیمہ بن گیا۔ تین روزہ فساد، آتش زنی اور لوٹ مار میں ۱۷ جانیں تلف ہوئیں جن میں سے گیارہ بنگلور میں، پانچ میسور میں اور ایک منگلور میں، یہ سبھی لوگ پولیس کی گولی سے ہلاک ہوئے۔

یہ افسانہ دراصل ملیالم زبان کا تھا اور دس برس قبل کیرالا کے ایک بڑے اخبار میں شائع ہو چکا تھا۔ اس وقت اس کے خلاف ایک آواز بھی نہیں اٹھی تھی۔ حالانکہ کیرالا میں مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے کئی مسلمان وزیر بھی ہیں۔ یقیناً کیرالا کے مسلمانوں سے بھی اس امر کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے عقیدے کے خلاف کوئی جارحیت برداشت کریں گے۔

لیکن بنگلور کے کچھ مفاد پرست لوگ شاید موقع کے انتظار میں تھے تاکہ وہ حکومت سے حساب کتاب برابر کر سکیں۔ کیونکہ ریاستی حکومت کی کچھ کارروائیوں سے ان کی عرب ملکوں سے آنے والی بے حساب آمدنی کو کافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ انہیں اخبار میں شائع شدہ اس افسانے کا بہانہ مل گیا،

ہزاروں مسلمانوں کو بھڑکا دیا گیا اور ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو کوئی اخبار نہیں پڑھتے ہیں، 'دکن ہیرلڈ' کا تو ذکر ہی کیا۔ مشتعل لوگوں نے بے گناہوں پر سوڈا واٹر کی بوتلیں اور دوسری اسی قسم کی اشیاء پھینکیں، املاک کو آگ لگائی اور پولیس پر حملے کیے اور یہ سب اپنے اجداد کے عقیدے کو سربلند رکھنے کے لیے۔

وزیر اعلیٰ نے امن و قانون کا نفاذ کرنے والے اداروں کو بے خوفی سے کام کرنے کی اجازت دینے کی بجائے شہر کے پولیس کمشنر کو ان کے منصب سے ہٹا دیا۔ کمشنر مسٹر پی۔ جی۔ ہارلنکر پر اس لیے غصہ اتارا گیا کیوں کہ انھوں نے مسٹر ہیگڑے اور ان کے ساتھیوں کے احکامات کا اتباع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی طرح ۱۹۸۴ء میں جس منشیات فروش کی موت واقع ہوئی تھی، بتایا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک وزیر کا "خاص آدمی" تھا اور یہ وزیر مسٹر ہیگڑے کے قریب ہیں۔ ہارلنکر کا ایک آخری گناہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے جنتا پارٹی کے ایک سینئر کارکن کو درمیانہ درجے کے ایک جرائم پیشہ شخص کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ یہ بات نہیں کہ جنتا پارٹی کا یہ کارکن ایک غنڈے کو قتل کرا کے کوئی سماجی خدمت انجام دے رہا تھا بلکہ اصل بات یہ تھی کہ مقتول کا تعلق غنڈوں کے ایک مخالف گروہ سے تھا۔ اس شخص کو گرفتار نہ کرنے کے سلسلے میں مسٹر ہیگڑے کے اعلیٰ سطحی رفقا کی درخواستوں پر دھیان نہیں دیا تھا، باوثوق ذرائع کے مطابق خود مسٹر ہیگڑے نے بھی مسٹر ہارلنکر کے پاس اس طرح کے اشارے بھیجے تھے۔ مگر انھوں نے بے نیازی برتی اور اس شخص کو گرفتار کر ہی لیا آخر اس شخص کی ضمانت کا بندوبست کیا گیا۔ اگرچہ ہارلنکر کو ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر ترقی دی گئی ہے، کیونکہ ان کی یہ ترقی واجب تھی لیکن انہیں امن و انتظام کا موقر شعبہ نہیں دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے اپنے سیاسی آقاؤں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

اوپر جن بڑے فرقہ وارانہ فسادات کا تذکرہ کیا گیا ہے، گذشتہ چار برس کے دوران ان کے علاوہ بھی چھوٹے موٹے فرقہ وارانہ واقعات ہوتے رہے ہیں اور مسٹر ہیگڑے کے دور اقتدار میں مسلمانوں کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں رہی ہے۔ عدم تحفظ کا احساس اور انتقامی جذبہ در پردہ موجود ہے ـــ جو ذرا سا اشتعال سے بھی بھڑک سکتا ہے اور اس کے بعد تشدد اور جوابی حملوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ـــ یہ چکر چلتا رہتا ہے ـــ اس کا اختتام کہاں ہوگا؟

ڈاکٹر آشش نرائن رائے

(۲)

# دیس دیس بکھرے ہندوستانی

## ہندوستانی مشرقِ بعید میں

قرونِ اولیٰ سے ہی ہندوستانی مذہب، ثقافت، فلسفہ، فنونِ لطیفہ اور ادب نے پورے جنوب ایشیا پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں۔ نیز اس خطے میں رونما ہونے والے ثقافتی و اقتصادی تغیرات میں ہندوستان کا ممتاز رول رہا ہے۔ اس خطے کے ممالک میں ہندوستانیوں کی سب سے زیادہ تعداد برما، ملیشیا اور سنگاپور میں مقیم ہے۔ ملیشیا میں مقامی ملائی اور چینی باشندوں کے بعد ہندوستانی یہاں کا تیسرا سب سے بڑا نسلی گروہ ہیں۔ مجموعی طور پر مشرقِ بعید کے ممالک میں ۲۰ لاکھ ہندوستانی متوطن ہیں۔

دراصل نوآبادیاتی طاقتوں کو اس علاقے میں پوشیدہ معدنی ذخائر کو نکالنے کے لیے افرادی قوت کی ضرورت تھی لہٰذا ان کی توجہ ہندوستان کی جانب منعطف ہوئی، جہاں آدمیوں کی کمی نہ تھی۔ ہندوستان سے لوگوں کی جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں آمد کا سلسلہ ۱۹ویں صدی کے اوائل ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ شروع میں اپنا گھربار چھوڑ کر دیارِ غیر میں جا کر بسنے کے لیے بہت کم لوگ آمادہ ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ تعداد بڑھی جیسے جیسے یہاں ملنے والی ملازمتوں کی شرائط بہتر ہوئیں، سہولتوں میں اضافہ ہوا، ویسے ویسے یہاں آنے والے ہندوستانیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، اور پھر تو انھوں نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستانیوں کی آمد سے جنوب ایشیائی معاشرہ مختلف نسلوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اس خطے کے بارے میں "ایشین ڈرامہ" کے مشہور مصنف گنار مِرڈال نے شاید ٹھیک ہی لکھا ہے کہ:-

"یہاں مختلف گروہ ایک دوسرے سے ملتے تو ہیں، مگر مدغم نہیں ہوتے"

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی چینیوں کی طرح یہاں کی مقامی آبادی کے ساتھ زیادہ گھلتے ملتے نہیں ہیں، اور اس کی وجہ ان کا یہ چھوٹا تفرقہ ہے کہ وہ [illegible]

اور اس کی وجہ سے اکثر اب بھی رہنمائی کے لیے "مادرِ ہند" کی طرف ہی دیکھتے ہیں، تاہم انھوں نے یہاں کے سماج میں ایک چابک و چوبند عنصر کا اضافہ ضرور کیا ہے۔ یہاں آنے کے بعد ہندوستانیوں نے محض مشقت اور مزدوری سے بڑھ کر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے دھان کو یہاں کی ایک اہم فصل بنا دیا، آبپاشی میں اپنی مہارت کے نمونے پیش کیے، اور صرف یہی نہیں صنعت و حرفت کے میدان میں انھوں نے اپنی صلاحیت و کارکردگی کا لوہا منوایا۔

لیکن ان تمام حقائق کے باوجود آج یہاں مقیم ہندوستانیوں کی اقتصادی حیثیت کچھ بہت زیادہ جاندار نہیں ہے جب کہ چینیوں نے تجارت اور صنعت میں اپنی خاص جگہ بنائی ہے، اور وہ ان میدانوں میں غالب نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس گزشتہ برسوں میں ہندوستانیوں کی سماجی و اقتصادی حالت دگرگوں ہوئی ہے۔ ہندوستانی بیروزگاروں کی تعداد بھی دوسروں سے زیادہ ہے۔ تقریباً پچاس فی صد ہندوستانی یہاں باغات میں ملازم ہیں اور ۴۰ فی صد زراعت سے وابستہ ہیں، بہرحال انفرادی طور پر کچھ ہندوستانیوں نے سماجی و اقتصادی طور پر کافی ترقی کی ہے۔

## ہندوستانی افریقہ میں

اس تاریک براعظم سے ہندوستانیوں کا تعلق پرانوں کے وقت سے رہا ہے، پرانوں میں "سپت دویپ وسومتی" سرزمین کا ذکر ہے، جس میں سے ایک کا نام "کشا" بتایا گیا ہے، بعض محققین کے نزدیک حبش (ایتھوپیا) کا ذکر ہے۔ بعض مآخذ کے مطابق ہندوستانی تاجر ازمنۂ قدیم سے مشرقی افریقہ کا سفر کرتے تھے۔ جغرافیہ کی قدیم کتابوں میں ذکر موجود ہے کہ افریقہ اور بیری گاتا سے گیہوں، چاول، سوتی کپڑا، شہد بحرِ روم کے ممالک میں بھیجا جاتا تھا، ایک عالم ولفریڈ شراف نے نشان دہی کی ہے کہ پرانی کتا



میں جس علاقے، دریا کا ذکر ہے وہ دراصل آج کا کچھ، کاٹھیاواڑ اور گجرات ہے، اور بیری گاٹا آج کا بڑوچ ہے۔ مارکو پولو نے اپنی سیاحتی دستاویزوں میں ذکر کیا ہے کہ مغربی ہند کے مالابار ساحل اور زنجبار کے مابین تیرھویں صدی میں تجارتی لین دین ہوتا تھا، اور دو صدیوں کے بعد آنے والے پرتگالی سیاح، واسکوڈی گاما نے بھی اس امر کی شہادت دی ہے کہ ہندوستان اور مشرق کے درمیان تجارتی روابط تھے۔

پس اس بات کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ ہندوستانی تاجر اکثر و بیشتر افریقہ کا سفر کیا کرتے تھے۔ جن میں سے بہت سوں نے وہاں اپنا گھر بنالیا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ باقی دنیا کے لیے گمنام اور پُراسرار افریقہ سے سب سے پہلے ہندوستانی ہی روشناس ہوئے۔ سفید فام مغربی باشندوں نے تو صرف اس راستے پر قدم بڑھائے جسے ہندوستانیوں نے پہلے ہی ہموار کردیا تھا۔

ماضی قریب میں ہندوستانی نقل وطن کرکے ناٹال، مشرقی افریقہ، اور ماریشس میں آباد ہوئے ہیں معاملہ یہاں بھی وہی تھا نوآبادیاتی طاقتوں کو سستے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ گنے کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے۔ ہندوستان سے قلیوں کی پہلی کھیپ ۱۸۴۹ء میں لائی گئی تھی۔ ۱۸۷۴ء اور ۱۸۷۵ء میں ہندوستانی قلیوں سے بھرے گیارہ بحری جہاز کلکتہ سے روانہ ہوکر ڈربن پہونچے تھے۔ نقل وطن کا یہ سلسلہ ۱۹۱۱ء تک



جاری رہا، جب تک کہ حکومت ہند نے اسے روک نہیں دیا۔ ہندوستانی مزدوروں نے مشرقی افریقہ میں مومباسا سے وکٹوریہ نینزا تک ریلوے لائن کا جال بچھانے کا کام انجام دیا۔ ان میں سے اکثر لوگ معاہدے کے خاتمے کے بعد ہندوستان واپس لوٹ گئے واپس جانے والے اکثر لوگوں کو اپنے دیس کے پرانے ماحول میں دوبارہ گھلنا ملنا خاصا مشکل معلوم ہوا۔ کچھ لوگ اپنی گانٹھ کی رقم خرچ کرکے بھی دوبارہ افریقہ جانے کی خواہش کرنے لگے۔ لیکن بالآخر انڈین نیشنل کانگریس کے زبردست دباؤ سے مجبور ہوکر حکومت ہند کو یہ سلسلہ روک دینا پڑا۔ مشہور کانگریسی رہنما گوپال کرشن گوکھلے نے اس رواج کی شدید مخالفت اور کہا کہ مزدوروں کو اس طرح لے جانے کا یہ طریقہ ایک باوقار اور جذبۂ قومیت سے سرشار ملک کے لیے توہین کے مترادف ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ناٹال اور ماریشس کے برعکس فجی اور ویسٹ انڈیز میں ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ تر ہنرمند کاریگروں پر مشتمل تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرقی اور جنوبی افریقہ میں ہندوستانی خواہ تاجر، دستکار یا زرعی مزدور جس حیثیت سے بھی گئے ہوں، انھوں نے ان ممالک کی ترقی و خوشحالی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستانی یہاں کے قوانین تک پر اثرانداز ہوئے۔ ہندوستانی شہادتی قانون اور تعزیرات ہند کی دفعات آج بھی یہاں بہت سے مقامات پر استعمال کی جاتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ افریقہ میں ہندوستانیوں کا مستقبل کیا ہے؟ آج یہاں مقیم ہندوستانی اپنے آپ کو ایک دوراہے پر کھڑا محسوس کرتے ہیں۔ آیا وہ کبھی یہاں سماجی وقار اور اقتصادی خوش حالی کے ساتھ چین سے رہ سکیں گے۔ یہ سوال مستقل سر پر ننگی تلوار بن کر لٹکا رہتا ہے۔ اس صورت حال کی پشت پر تاریخی اسباب ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ہندوستانی کسی نوآبادیاتی جذبے کے تحت افریقہ نہیں گئے تھے، بلکہ تجارت کی غرض سے گئے تھے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ یہاں ہندوستانیوں نے خود کو بڑی حد تک سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رکھا۔ یہاں تک کہ یہاں جاری قومی تحریک کے سلسلے میں بھی ان کا رویہ غیر جانب دارانہ رہا —— دوسری جانب ہندوستان میں رہنے والے قوم پرستوں نے بھی کبھی غیر ممالک میں بسے ہندوستانیوں کی صحیح حیثیت کو نہیں سمجھا۔ ہر ہندوستانی کو ہندوستان کا ہی ایک حصہ سمجھا گیا، اور نتیجہ یہ کہ یہ ہندوستانی جس ملک میں بھی بسے تھے، وہاں اجنبی ہی رہے، اور ان کی حیثیت دوسرے درجے کے شہری سے اوپر نہیں اٹھ سکی۔

## ہندوستانی خلیجی ممالک اور عرب دنیا میں

دنیائے عرب کے ساتھ ہندوستان کے ثقافتی وتجارتی روابط [illegible]



تہذیب ـــــ اس امر کی شہادتیں موجود ہیں کہ ہندوستانی ۲۸۰۰ قبل مسیح سے ہی مصر، شام اور بابل میں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے، دستیاب مواخذ کی رُو سے حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ہندوستان اور قدیم شام کے درمیان تجارت ہوتی تھی۔ مہاراجہ اشوک نے شام کے حکمراں انطیقوس اور مصر کے حکمراں بطلیموس کے دربار میں بدھ مذہب کے پرچار کے لیے اپنے سفیر روانہ کیے تھے۔

۱۹۶۰ء کے بعد سے ہندوستانی باشندوں اور خصوصاً مزدور پیشہ لوگوں نے ہندوستان سے باہر جانا شروع کیا۔ نوآبادیاتی دور کے برخلاف نہ صرف مزدور اور کاریگر بلکہ سند یافتہ لوگ، پڑھے لکھے ماہرین، تکنیکی کاریگر، کلرک اور نیم ہنرمند لوگ۔ ان سب نے بڑی تعداد میں نقل وطن کیا ہے ـــــ سب سے زیادہ ہندوستانی خلیجی ملکوں میں گئے ہیں اور وہاں کی افرادی قوت کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو ان لوگوں نے پورا کیا ہے۔

۱۹۷۰ء کے وسط تک، افرادی قوت بھرتی کرنے والی صدہا ایجنسیاں وجود میں آگئی تھیں۔ جن میں سے بہت سی حکومت کے ذریعہ تسلیم شدہ بھی تھیں۔



چلے جا رہے تھے۔ گزشتہ دس برس کے دوران پاسپورٹ بنوانے والے لوگوں میں ۸۰ فی صد کی منزل خلیجی ممالک ہی تھے، ان بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں نے بھاری رقوم اپنے گھروں کو بھیجی ہیں۔ کیرالہ کی موجودہ خوش حالی کا سبب بڑی حد تک یہ خلیج سے آیا ہوا پیسہ ہی ہے۔ اس کے بعد صورت حال نے ایک ناخوشگوار موڑ لیا، اور کیرالہ سے لڑکیاں خلیجی ممالک میں جانے لگیں۔ یہ لڑکیاں عموماً دو ہزار سے پانچ ہزار روپے تک کے عوض



یہ ایجنسیاں شاندار بزنس کر رہی تھیں۔
سبھی پیشہ ورانہ ماہر، نرسیں، دائیاں، مکان کن،

فروخت کی جانے لگیں۔ اور اسی طرح کیرالہ میں تیار ہونے والی سینکڑوں بلو فلمیں بھی خلیج کی منڈیوں میں جا رہی

## ہندوستانی امریکہ و برطانیہ میں

ہندوستان سے نقل وطن کر کے امریکہ جانے کی موجودہ لہر کا آغاز ۱۹۶۵ء کے امریکی نقل وطن قانون سے ہوا۔ اس قانون نے ملک وار کوٹے کو ختم کر دیا، اور اس کے نفاذ کے بعد سے امریکہ میں بسنے والے ایشیائی باشندوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ امریکی اسپتالوں میں ڈاکٹروں، نرسوں کی زبردست کمی تھی۔ ایک مرتبہ جب محکمۂ صحت نے ہری جھنڈی دکھا دی تو اسپتالوں نے بڑی تعداد میں ڈاکٹروں اور نرسوں کو بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستانیوں کے پرے کے پرے اپنے خاندانوں سمیت امریکہ میں قیام کرنے اور روزی کمانے کے لیے آنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی بے شمار انجینیئر، سائنس داں، تکنالوجی کے ماہرین، فارمیسٹ، استاد اور تکنیکی کاریگروں نے بھی محکمۂ محنت سے سرٹیفکٹ حاصل کیا اور امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ نیشنل سائنس فاؤنڈیشن رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۰ء سے قبل امریکہ میں موجود ایشیائی سائنس دانوں اور انجینیئروں میں سے دو تہائی ہندوستانی ہیں۔

ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں ہندوستانی برادری سب سے زیادہ ترقی پذیر برادری ہے، اور نیویارک، شکاگو، سان فرانسسکو اور لاس اینجلز میں بہت سے ہندوستانی مستقل طور پر بس گئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت امریکہ میں تقریباً ۴ لاکھ ہندوستانی تارکین وطن مقیم ہیں۔

ہندوستانی تارکین وطن بہ حیثیت مجموعی اعلیٰ تعلیم یافتہ ... اور خوش حال ہیں

وطن ہوا ہے، وہ اس سے قبل کے بڑے پیمانے پر ہوئے نقل وطن کے واقعات سے یکسر مختلف ہے۔ ۱۹ویں صدی میں ہندوستانی تارکین وطن دوسرے طبقوں کے مقابلے میں کمتر سماجی و اقتصادی درجہ رکھتے تھے۔ مگر آج کے ہندوستانی ایک ایسی برادری کی نمائندگی کرتے ہیں، جس میں تعلیم کا معیار دوسروں کے مقابلے میں کہیں اچھا ہے۔ ان کی اقتصادی حالت بھی دن بدن ٹھوس ہوتی جارہی ہے۔

۱۹۸۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۴۷ فی صد ہندوستانی اعلیٰ مقامات پر فائز تھے۔ مثلاً منیجر، پیشہ ور ماہر اور کمپنی کے افسر۔ ہندوستانیوں کی اوسط آمدنی ۱۸٬۰۷۰ ڈالر ہے، یہ آمدنی امریکہ کی اوسط قومی آمدنی سے زیادہ ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخری ربع میں اور پوری انیسویں صدی کے دوران ایشیائی بحری عملہ جسے عام طور پر 'لشکر' کہا جاتا تھا۔ اُسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بحری جہاز بھرتی کرتے تھے۔ اس طرح ہندوستان سے برطانیہ کی جانب نقل وطن کا سلسلہ شروع ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اور بعد میں جب برطانیہ میں افرادی قوت کی شدید کمی تھی، تب ہندوستان سے دیہاتیوں کے جہاز بھر بھر کر انگلینڈ جاتے تھے، ان میں زیادہ تعداد پنجاب کے ہوشیار پور اور جالندھر اضلاع کے لوگوں کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اب ان کی تعداد کئی گنا ہوگئی ہے۔ سکھ تارکین وطن کے بعد بنگالی مسلمانوں اور گجراتی کسانوں کا نمبر ہے۔ انھوں نے بھی بڑی تعداد میں نقل وطن کیا اور انگلینڈ پہونچے۔ دراصل یہ گروپ سابق لشکروں کے جانشین ہیں۔

ساؤتھ آل کو چھوٹا سا ہندوستان یا چھوٹا موٹا پنجاب کہا جاسکتا ہے۔ یہ عرصۂ دراز سے برطانیہ میں ہندوستانی تارکین وطن کا پشت پناہ رہا ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق برطانیہ میں ۲۲ لاکھ نسلی اقلیتوں میں سے ۵۵ فی صد ایشیائی نسل کے ہیں، اور ۴۷ فی صد برصغیر ہندوستان کے ہی ہیں، ان میں سے ۳۰ فی صد ہندوستانی، ۴،۱۳ فی صد پاکستانی اور ۲،۹ فی صد بنگلہ دیشی ہیں۔

خواہ امریکہ ہو یا انگلینڈ یا مغرب کا کوئی اور ملک، ہندوستانیوں میں ایک بات مشترک ہے کہ وہ مشرقی انداز سے رہنے سہنے کی شدید خواہش رکھتے ہیں، وہ اپنے اصل وطن [illegible] ہندوستان کی [illegible] آبادی، بدحالی،

لیکن وہ ہندوستان کے بنیادی اقداری نظام اور ادب و روایات پر شاذو نادر ہی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ تقریباً تمام ہندوستانی اپنے اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہے ہیں، وہ اپنی زبان بولتے ہیں، ان کے کھانے پینے کی عادتیں وہی ہیں اور وہ آج بھی اپنی ان ہی ثقافتی قدروں میں یقین رکھتے ہیں، کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ:-

"آپ کسی ہندوستانی کو ہندوستان
سے باہر تو لے جاسکتے ہیں، مگر آپ
کسی ہندوستانی کے اندر سے
ہندوستان کو نہیں نکال سکتے۔"

## غیر ممالک میں مقیم ہندوستانیوں کے تئیں ہندوستان کا رویّہ

ابھی تک ہم نے دیکھا کہ بیرون ملک مقیم ہندوستانی نہ صرف سارے کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ہیں، بلکہ ان کا تعلق ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہے، ان کے پیشہ ورانہ تجربات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اگر ویسٹ انڈیز اور ماریشس میں بسے ہندوستانی زیادہ تر بہار اور اتر پردیش کے ہیں، تو مشرقی افریقہ میں گجرات اور پنجاب سے گئے ہوئے لوگ زیادہ ہیں، سری لنکا اور جنوبی افریقہ میں تمل بولنے والے علاقوں کے لوگ زیادہ ہیں۔ فجی، ٹرینی ڈاڈ، گی آنا، ماریشس اور ملیشیا میں ہندوستانیوں کی تعداد نوآبادیاتی تارکین وطن میں افریقی باشندوں کے بعد سب سے زیادہ تھی۔

زیادہ تر ہندوستانی تارکین وطن مقامی آبادی سے الگ تھلگ رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے ہی دائروں میں قید رہتے ہیں اور انھوں نے اپنی ذاتوں کے حساب سے کلب تک قائم کررکھے ہیں۔ مثلاً مشرقی افریقہ کا پٹیل کلب"۔

بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں کے مفادات بہت سے ہندوستانی قومی رہنماؤں کو عزیز تھے، مثلاً گاندھی جی، گوکھلے، آچاریہ کرپلانی اور رام منوہر لوہیا ——— ان سب نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ان لوگوں کے مفادات کی نگرانی کے لیے واضح پالیسی تشکیل دی جانی چاہیئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے صریح الفاظ میں اعادہ کیا تھا کہ:-

"جب ہندوستان آزاد ہوجائے گا،
تب اس کے ہاتھ زیادہ دراز اور طاقتور
ہوں گے، اور وہ بیرون ملک بسے اپنے
ہر بچے کا تحفظ کرسکے گا۔"

یوگنڈا سے بری طرح نکال باہر کیا گیا تو ہندوستانی حکومت اس تذلیلی تجربے کے سدباب کے لیے کچھ نہیں کرسکی۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے چالیس سال بعد بھی، ہم ابھی تک بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں کے سلسلے میں کوئی صریح، واضح اور مربوط پالیسی نہیں بنا سکے ہیں۔ اب وقت ہے کہ فیصلہ کرلیا جائے کیونکہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ سیاہ فاموں سے بہتر سلوک نہیں ہوتا۔ دیگر چند ملکوں مثلاً ٹرینی ڈاڈ اور ماریشس میں اگرچہ ہندوستانی وہاں کی آبادی کا بڑا حصہ ہیں، اس کے باوجود ان کا استحصال ہورہا ہے اور اقتصادی طور پر دوسرے باہر سے آئے ہوئے گروہ ان پر حاوی ہیں۔ سری لنکا میں ہندوستانی الاصل تمل باشندے بدترین انداز کی انسانی حقوق کی پامالی کا شکار ہیں۔ ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے ہم کیا کررہے ہیں؟۔ حکومت ہند کو چاہیئے کہ وہ یا تو بیرون ملک مقیم ہندوستانیوں سے صاف کہہ دے کہ وہ ہندوستان کی جانب نظریں نہ اٹھائیں اور اپنے آپ کو مقامی آبادی کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ کریں یا پھر ہماری حکومت کو کسی نہ کسی طور ان لوگوں کے لیے اپنی خارجہ پالیسی میں کوئی گنجائش نکالنی چاہیئے۔ ہمیں ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیئے اور ایسی تدابیر کرنی چاہئیں جن کے ذریعہ یہ لوگ ہندوستان کے تحفظ کے سائے میں آسکیں۔

تاہم ہمیں اس فریب میں نہیں رہنا چاہیئے کہ تارکین وطن صرف وہی ہیں جو ملک سے باہر چلے گئے ہیں، ہمارے اپنے ملک کے اندر بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ملک کی ثقافت اور روایات سے علاحدہ ہیں، جو آج کے دور میں ملک کو درپیش حقائق سے قطعی بے نیاز ہیں اور جہاں تک "اشرافیت" کا تعلق ہے تو وہ ابھی تک اپنے سابق حکمرانوں کے ساتھ مساوات کے مصنوعی دعووں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ وہ درحقیقت ملک کے اندر رہتے ہوئے بھی کسی "اجنبی" کی طرح زندگی گزار رہے ہیں، مفروضوں میں جی رہے ہیں اور اس میں شان اور تفاخر محسوس کرتے ہیں۔ اس صورت میں تو بڑی حیرت کے ساتھ یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ اصلی تارک وطن یا جلاوطن کون ہے؟

محمد شمیم اختر

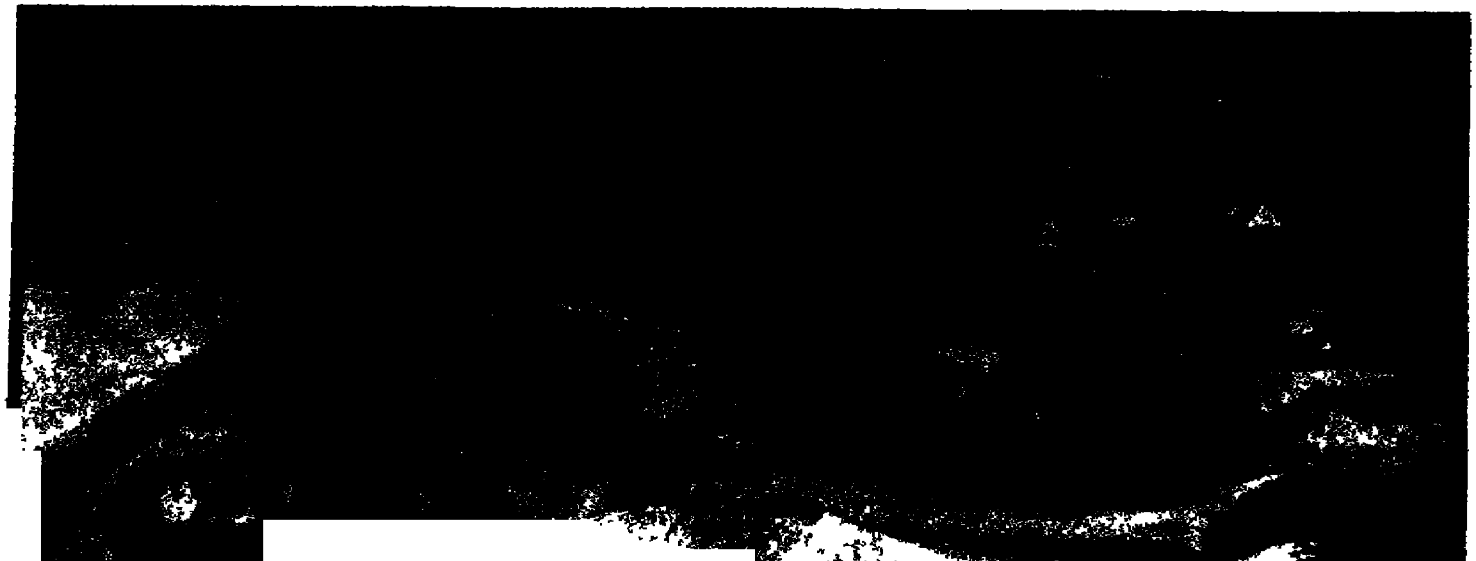
# جنگ کے ماحولیاتی اثرات

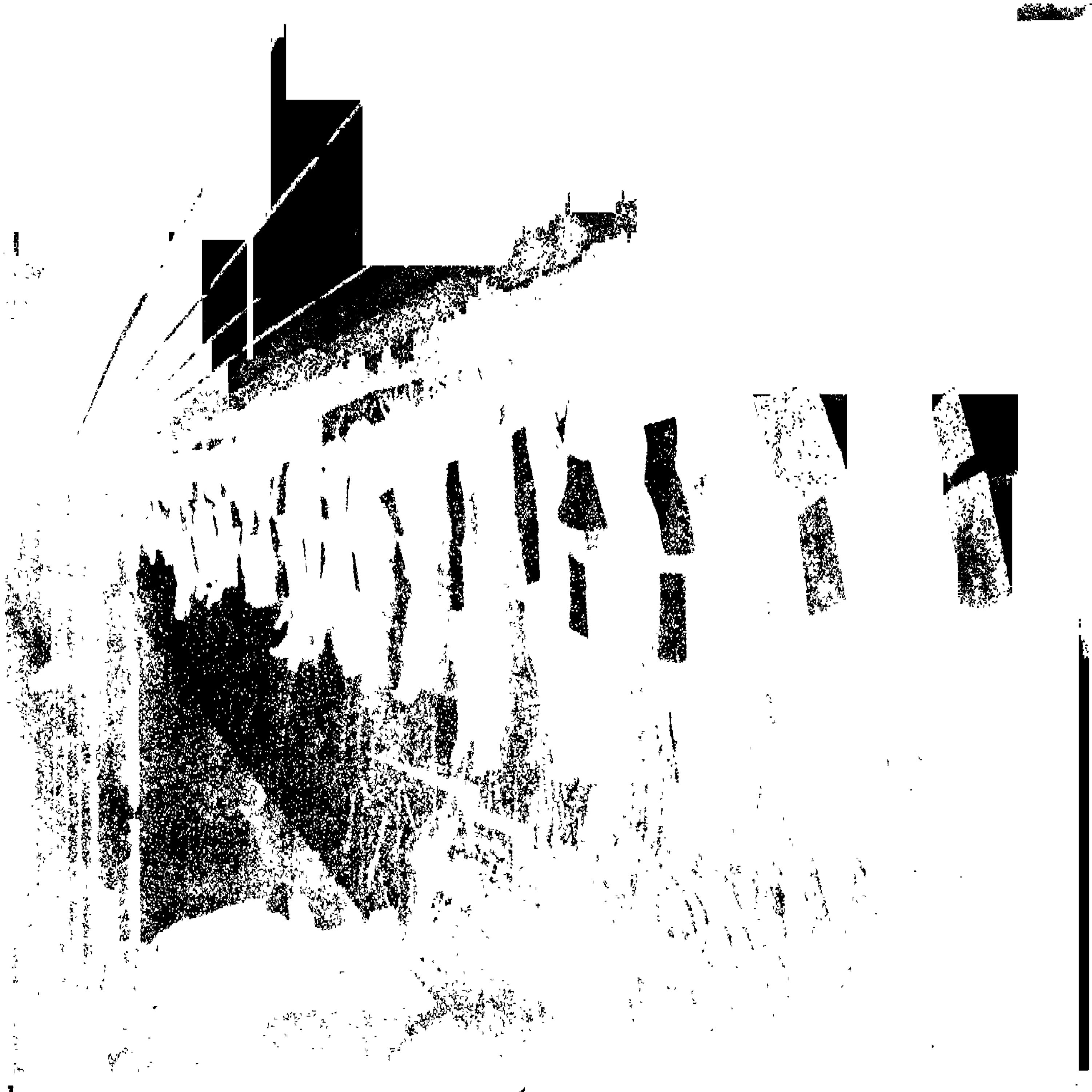
ایٹمی جنگ کا عفریت، کرۂ ارض کو تباہ و برباد کرنے کے لیے افق پر منڈلا رہا ہے۔ بنی نوع انسان اور اس کے ماحولیات کے لیے یہی ایک سب سے بڑا خطرہ ہے۔ ...۵ ایٹمی ہتھیاروں کے انبار نے تکنیک انسان کی بقا ہی کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ کولمبیا کے نوبل انعام یافتہ گیبرئیل گارسیا مارکویز کے الفاظ میں "آخری دھماکے کے ایک منٹ بعد نصف سے زائد نوعِ انسان موت کا نوالہ بن چکی ہوگی، شعلہ زار بنے براعظموں کے غبار اور دھوئیں سے سورج کی روشنی پسپا ہو جائے گی اور ایک بار پھر دنیا پر گھپ اندھیرا مسلط ہو جائے گا۔" یہ ایک عدیم المثال صورت حال ہے جسے عوام الناس اب بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ سویڈن کے ڈیفنس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مطابق ۱۹۴۲ء اور ۱۹۸۳ء کے بیچ ۱۴۷۰ نیوکلیائی ٹسٹ کیے گئے جن میں ۴۹۳ محض خلا میں کیے گئے۔ ان میں ۵۴۶ میگاٹن دھماکہ خیز مواد تخلیق ہوا۔ ماحول میں پھیلی تابکاری نب ...۳ جان لیوا کینسر کے روگوں کا سبب بنی۔ بعد میں اس کی وجہ سے مزید ...۲ افراد کو کینسر ہو جانے کا خطرہ بھی لاحق تھا۔

ایک حالیہ تخمینے کے مطابق، افواج پر خرچ کی جانے والی رقوم ایک ٹریلین ڈالر سے بھی تجاوز کر گئی ہیں۔ آج دنیا کا فوجی عملہ ۲۷ ملین افراد پر مشتمل ہے جن میں ۱۷ ملین نفری ترقی پذیر دنیا کی ہے۔ ایجنسی برائے ضبط و تخفیف اسلحہ کے بموجب گزشتہ دہے کے دوران اسلحہ کی منتقلی کی قیمت تگنی سے بھی زائد ہو گئی ہے۔

جنگ اور ماحولیات کے مسائل کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک کے بارے میں تشویش کا مطلب دوسرے کی فکر بھی ہے۔ حیاتیاتی اور کیمیاوی ہتھیاروں کے استعمال کے نتیجے میں سنگین ماحولیاتی الجھاؤ پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنوبی ویت نام میں کیمیاوی نباتات کش ترکیب سے ۱۵۰۰ مربع کیلومیٹر کے رقبے میں پھیلے ہوئے سا... جنگلات کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا نیز لگ بھگ ۱۵۰۰ مربع کیلومیٹر مزید ایسے جنگلات کو نقصان پہنچایا گیا۔ وہاں گرد و پیش کی بحالی انتہائی طور پر کم ہے اور اس کام میں دسیوں سال لگنے کا احتمال ہے۔ کیمیاوی عامل کے فعل کا انحصار اس کے طریق استعمال پر ہوتا ہے۔ پیڑ پودوں کو پتوں سے محروم کرنے کا خاص مقصد انہیں بے جان کیے بغیر پتیوں کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ ایسا موسمی پت جھڑ کا باعث ہونے والے نظام میں کیمیاوی خلل اندازی کے ذریعے کیا جاتا ہے، دوسری قسم کا فعل نباتات کش کیمیاوی تراکیب سے پودوں کو زہر دے کر ختم کر دینا ہوتا ہے۔ تیسرے قسم کے طریقے سے زمین کو کیمیاوی طور پر بانجھ بنا کر پیڑ پودوں کی تخلیق اور نو تخلیق کا روکنا مقصود ہوتا ہے۔

ویت نام کے لوگ جنگ کے بعد ممکنہ اثرات کی وجہ سے روز افزوں متفکر رہتے ہیں۔ ان کے ایک





اے رہبرِ ملک و قوم بتا یہ کس کا لہو ہے کون مرا (فیض احمد فیض)

صومالیہ میں "تاریکی عامل" کے جزو' ڈائی آکسین کے مردہ بچے پیدا ہونے کی وبا میں نمایاں اضافہ ہو گیا تھا۔ ڈائی آکسین وسیع نامیوں میں پھیلی جگر کے ابتدائی ناسور کے مرض میں اضافے کے لیے بھی ذمہ دار ہو سکتی ہے۔ اس جنگ کے غیر ارادی نتائج کے طور پر زرعی وبائیں اور متعدد انسانی امراض پھیلی ہیں۔

جب سے ٹی۔ایچ۔مائمن نے اپنی یاقوتی لیزر شعاع کا مظاہرہ کیا ہے' تب سے ہی ایک ایسی طاقتور شعاع کی کھوج زوروں سے کی گئی ہے جس سے فوجی ٹھکانوں کو تہس نہس کیا جا سکے۔ اونچی توانائی لیزر شعاعوں کی ٹیکنالوجی پر پینٹاگن کی طرف سے ۲۰۰ ملین ڈالر سالانہ خرچ کیے جا رہے ہیں۔ لیزر شعاعیں ایندھن پمپوں اور فوجی ساز و سامان سے لے کر دشمن کے طیاروں اور میزائلوں تک کا صفایا کر سکتی ہیں۔ میدان جنگ میں فوجی ٹکڑیوں کے اوپر بھاری مقدار میں توانائی کا چھوڑنا بھی لیزر شعاعوں کے دیگر فوجی استعمالات میں شامل ہے۔ لیزر ہتھیاروں کا استعمال دشمن کی میزائلوں کو دفاعی طور پر بیچ میں روک لینے کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔

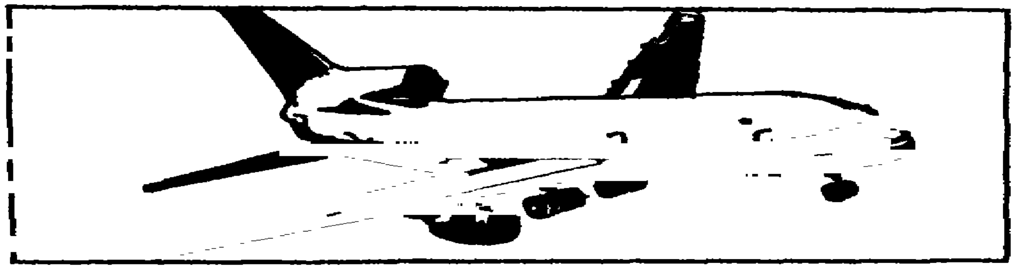
نیوکلیائی اسلحہ' مہلک مصنوعی سیارے' مواصلات اور دشمن کی جاسوسی کے کاموں میں خلائی ٹیکنالوجی کے استعمال کا تیسری دنیا کے ممالک سے گہرا تعلق ہے۔ الیکٹرانی اور تصویر کشی کرنے والے مصنوعی سیارچے' اسلحہ کی مستعدی اور نشانوں کی شناخت کیلئے استعمال کیے جا چکے ہیں۔ ایران عراق جنگ چھڑنے سے قبل اور بعد' مصنوعی سیارچے سے لی گئیں تصاویر میں نظر آنے والے شفاف سرخ نقوش سے تیل کارخانوں کی تباہی کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔

بارش' دھند یا ژالہ باری' زلزلہ اور لہروں کا ابھار' اوزون گیس کی پرت میں مداخلت نیز کشتوں اور خوراکی فصلوں کی تباہی کا باعث بننے والے سطح زمین کے خلل جیسے ماحولیاتی تغیر و تبدل کے امکانی ظہور کے بارے میں روز افزوں تشویش لاحق ہے خواہ یہ اثرات پُرامن مقاصد کے لیے ہی مرتب کیے جا رہے ہوں' تاہم ان کو واضح فوجی اغراض کے لیے بھی استعمال میں لایا جا سکتا ہے' جن کا پتہ لگانا یا دفعیہ کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ایسے افعال کے زیادہ تر امکان سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا کہ آیا سیلاب' خشک سالی یا فصلیں خراب ہو جانے کا باعث آفات سماوی تھیں یا افعال خصیم۔

کسی

جگہ سے دوسری جگہ کو انسانی ہجرت ہے۔ جنگ لوگوں کو اپنے گھربار چھوڑنے پر مجبور کرتی ہے۔ لاکھوں جنگی پناہ گزین اقتصادی و سماجی نقصانات اور انتشار کی اذیتیں برداشت کرتے ہیں اور جہاں وہ ہجرت کر کے جاتے ہیں' وہاں کے ماحولیاتی نظام پر بھی دباؤ ڈالتے ہیں۔

دنیا میں پناہ گزینوں کی اکثریت جنگ کے شکار شہری لوگوں کی ہے۔ ایسے کچھ لوگ حملہ آوروں کے ڈر سے اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں کے دوران لگ بھگ ایک ملین افغان پناہ گزینوں نے پاکستان کی راہ لی ہے۔ افریقہ کے پورے برّاعظم میں ایک پرآشوب طول و عرض کے



پناہ گزینی مسئلے کا سامنا ہے۔ صومالیہ کے رفیوجی کیمپوں میں ہر روز ایک ہزار سے زائد ایتھوپیائی داخل ہو رہے ہیں۔ ایتھوپیا میں جانشینی جنگ کے نتیجے میں بنے پناہ گزین' سوڈان میں بھی داخل ہو رہے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں نامیبیا کے دفاع کے لیے لڑنے والے گوریلوں کے خلاف جنگ کی بدولت بھاگنے والے افراد انگولا میں سر چھپا رہے ہیں۔

یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ کچھ دلوں سے فوجی تحقیق و تعمیر پر دنیا بھر میں سالانہ لگ بھگ ۲۵ ہزار ملین ڈالر کا خرچ کیا جا رہا ہے جو دنیا بھر میں طبی تحقیق پر کیے جانے والے خرچ سے چوگنا ہے۔ ۴۰۰,۰۰۰ سے زائد سائنسدان اور انجینئر جو موٹے طور پر دنیا کی کل سائنسی اور تکنیکی افرادی قوت کا نصف ہیں' اب موجودہ فوجی اسلحہ کو بہتر بنانے اور نئے نئے ہتھیار ایجاد کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ کیا اب سائنسی اور تکنیکی افرادی قوت' سماجی ترقیات سے فوجی قوت کو بڑھانے کی سمت موڑی جا رہی ہے۔ فوجی مقاصد کے لیے کیا جانے والا عالمی خرچ اس مجموعی امداد سے' جو ترقی یافتہ ممالک' ترقی پذیر ملکوں کو دیتے ہیں' ۲۰ مرتبہ زائد ہے۔ نیز کچھ ترقی پذیر ملک انہیں ترقیات کے

کے طور پر خرچ کرتے ہیں۔ عراق کے خلاف جنگ کی محض پہلی ششماہی میں ایران کو ۱۵۰۰ ملین ڈالر کا خرچہ اٹھانا پڑا' جبکہ بے شمار بلین ڈالر فوجی مقاصد میں برباد کیے جا رہے ہیں' ۱۵۰۰ ملین افراد ایسے ہیں جنہیں موثر طبی خدمات بھی حاصل نہیں ہیں لگ بھگ ۵۷۰ ملین افراد ناکافی غذا کا شکار ہیں تقریباً ۳۰۰۰ ملین افراد ایسے ہیں جنہیں پینے کا صاف پانی تک میسر نہیں ہے اور قریب ۵۰,۰۰۰ افراد ہر ماہ گندے پانی پینے سے لاحق ہونے والے امراض سے لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں۔

اسلحہ کی دوڑ کے ہولناک انجام کا اس حقیقت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آج کرۂ زمین پر ہر ایک ذی روح بشر کے لیے ۱۵ ٹن گولہ بارود موجود ہے' جو اس کو کئی بار موت کی نیند سلانے کے لیے کافی ہے۔

تخفیف اسلحہ کی سمت میں کوئی بڑی پیش رفت ترقی یافتہ نیز ترقی پذیر ممالک' ہر دو میں زیادہ تخلیقی کاموں کے لیے وسیع مالی تکنیکی اور انسانی وسائل فراہم کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر سالانہ فوجی اخراجات کا فقط ۲۰ فیصد ہی بین اقوامی ترقیاتی منصوبوں پر صرف کیا جائے تو بھی ترقی پذیر ممالک اپنے معاشرتی و معیشتی مقاصد کو زیادہ موثر انداز میں حاصل کر سکتے ہیں۔

کل عالمی فوجی بجٹ کا صرف ڈیڑھ دن کا حصہ' کم آمدنی والے ممالک کو محض ایک دہے کے دوران' خوراک کے معاملے میں خودکفیل بنا دینے کے لیے کافی رہے گا۔ جیسا کہ کئی تخمینوں سے پتہ چلتا ہے۔ ۳۰-۲۵ برسوں کی مدت میں ۵ ر ۴ سے لے کر ۵ ملین ڈالر کی رقم کا خرچ' دنیا میں بھکمری اور ناقص تغذیہ کا قلع قمع کرنے کے لیے کافی ہوگا' یعنی ۲۰۰ ہزار ملین ڈالر کا سالانہ خرچ جو اسلحہ پر کیے جانے والے اخراجات سے کہیں کم ہے۔

سنجے کرشن داس

# بچّہ مزدور



شوراما سیوا کاسی کے چھ ہزار ماچس بنانے والے کارخانوں میں سے ایک کارخانے میں کام کرتا ہے۔ وہ علی الصبح اپنے آٹھ افراد خاندان کو چھوڑ کر، چار روٹیاں بغل میں دبائے کام پر جاتا ہے۔ ایک بار کارخانے میں پہونچتے ہی وقت جیسے ٹھہر جاتا ہے۔ وہ اس بات سے غافل ہے کہ آگ کی یہ لپٹیں، جن کی تپش ہر سانس کے ساتھ اس کے اندر داخل ہو رہی ہے، وہ اس کے لیے کتنی مضر ہے۔
ایک بار کام میں جُٹ جانے کے بعد شوراما اسی وقت اپنا سر اٹھاتا ہے جب کارخانے کا چھٹی کا گھنٹہ بولتا ہے، تبھی ہو کر سستا سکتا ہے ——— کر، چودہ گھنٹے کی مشقت والا ایک دن اور بیت گیا۔ اپنے جیسے دوسرے سینکڑوں [illegible]

اور اسے دن بھر کی محنت کا معاوضہ مبلغ چھ روپیہ مل جاتا ہے ——— اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک ہے۔ وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے بیڑی نکالتا ہے اس کا ایک ساتھی گنیش اس کی بیڑی جلاتا ہے۔

دوسری جانب کشن دن چھپنے کے بعد گھر سے نکلا تھا، اور فیروز آباد کے ان گنت شیشے کے کارخانوں میں سے ایک کارخانے میں پہونچا تھا۔ اس نے بارہ گھنٹے تک ننگے پیر ایک بھٹی کے سامنے بیٹھ کر مسلسل کام کیا ——— بھٹی کا درجۂ حرارت چودہ سو ڈگری سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے، رات بھر کی اس مشقت کے عوض [illegible] صبح کو [illegible] ساتھ سمیع خاں کے

ساتھ وہ گھر لوٹا، سمیع کو اس رات کام نہیں ملا تھا، اور اسے سردی میں کارخانے کے باہر ہی رات بتانی پڑی تھی۔

یہ لوگ کون ہیں؟ ——— شوراما، گنیش، کرشن اور سمیع خاں۔ یہ لوگ اپنے خاندان کی گزربسر میں حصہ بٹانے کے لیے مجبور ہیں۔ شوراما کی عمر تیرہ برس ہے، گنیش کی آٹھ برس، کرشن نو سال کا ہے اور سمیع ابھی سات برس کا ہی ہے۔

ان مزدور بچوں کی کہانی وہی ہے جو سیوا کاسی کے پچاس ہزار، فیروز آباد کے پندرہ ہزار بچوں کی، بھیونڈی میں بجلی کرگھے پر کام کرنے والے ۵۰ ہزار بچہ مزدوروں کی اور مرزاپور، پالامئو، اور بنارس میں



قالین بافی کی صنعت میں لگے ہزاروں بچہ مزدوروں کی کہانی ہے ——— حقیقت یہ ہے کہ ملک میں ۴ کروڑ ۴۰ لاکھ بچہ مزدوروں کی کہانی یہی ہے۔ ان سب کی عمر چودہ برس سے کم ہے، اور ان میں سے کچھ بدنصیب تو تین یا چار برس کی عمر سے کام کر رہے ہیں۔

ہماری پارلیمان نے بچہ مزدوری بل ۱۹۸۶ء میں پاس کر دیا ہے، اور اب ملک کے ان تقریباً ساڑھے چار کروڑ بچہ مزدوروں کی تقدیر کا دار و مدار اسی بل پر ہے۔ بہر حال یہ بل بھی کارخانوں، کانوں اور دوسرے خطرناک پیشوں میں لگے دو کروڑ ستر لاکھ بچوں کے حالات بدلنے کے سلسلے میں کوئی بہت ٹھوس تجاویز لے کر نہیں آیا ہے، اور نہ ہی چھوٹے موٹے کام میں لگے ایک کروڑ ستر لاکھ بچوں کے مصائب کے خاتمے کا کوئی حل اس بل میں پوشیدہ ہے۔ دراصل اس سے قبل بھی اس سلسلے میں پندرہ مرتبہ مختلف قوانین بن چکے ہیں، لیکن ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے — اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان کے ہر چار بچوں میں سے ایک بچہ مزدوری کرتا ہے — ظاہر ہے کہ یہ ایک سماجی لعنت ہے اور اس کا استیصال چھوٹے موٹے اقدامات سے نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اگلے دس برس کے اندر ہندوستان سے بچہ مزدوری کے مسائل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تاہم مختلف حلقوں میں اس خوب صورت

کہ موجودہ بل بچہ مزدوری کو خلاف قانون قرار دینے کے بجائے اُلٹا اس کے وجود کو استناد بخشتا دکھائی دے رہا ہے۔ کئی اعتبار سے یہ بل ۱۹۸۵ء میں منظور شدہ کاریگر بچوں کے بل کے خطوط پر ترتیب دیا گیا ہے۔ کاریگر بچوں کے متعلق بل نے ان کے کام کے اوقات کا تعین کر کے انھیں کچھ تحفظ بہم پہونچایا تھا نیز خطرناک صنعتوں میں ان کے کام کرنے پر پابندی عاید کی تھی،

مختصر یہ کہ کاریگر بچے کو ایک قانونی درجہ مل گیا ظاہر ہے کہ اس صورت حال کے بعد فطری طور پر کئی قسم کی پیچیدگیاں سامنے آئیں۔ اگر بل کی مخالفت اس بنیاد پر کی گئی کہ اگر بچہ مزدوروں کو قانونی شکل دے دی گئی تو یہ بات ہمارے آئین کی روح کے منافی ہوگی۔ آئین ہند کی دفعہ ۲۴ کے تحت چودہ برس سے کم عمر کے بچوں کو کارخانوں، کانوں اور دوسرے خطرناک کاموں میں روزگار پر لگانا غیر قانونی ہے۔ اور آئین میں درج رہنما اصولوں کے مطابق کمسن بچوں کا استحصال ممنوع ہے۔

دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو بچہ مزدوری کے حامی ہیں، اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ان میں بعض ٹریڈ یونین والے بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ اس دلیل کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں کہ ملک کے موجودہ سماجی و اقتصادی ماحول میں بچہ مزدوری کو سرے سے ختم نہیں کیا جا سکتا، اور تیسری طرف حقیقت پسند حضرات ہیں، مثلاً مرکزی وزیر محنت مسٹر پی۔ اے۔ سنگما، بچوں کو روزگار میں لگانے اور ان کا استحصال کرنے کے مابین خاصا فرق کرتے ہیں۔ بہرکیف اس سلسلے میں مزاحمت کسی جانب سے نہیں کی جاتی کہ آخر بچوں کو روزی کمانے پر مامور کیوں کیا جائے۔ جب کہ دوسری طرف بالغوں کے پاس ہی روزگار نہیں ہے۔ کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں کہ بچہ مزدور بہ آسانی ملتا



ان سے کام لینا یا ان پر قابو رکھنا آسان ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب بہت آسان اور صاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ہم اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کر پانے میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔ برطانوی دور حکومت میں ۱۸۸۱ء اور ۱۸۹۱ء میں فیکٹری قانون بنائے گئے تھے۔ یہ قوانین برطانیہ کے صنعت کاروں کے اصرار پر بنائے گئے تھے، کیوں کہ انھیں ہندوستان کے صنعت کاروں سے مقابلہ آرائی کا سخت خطرہ تھا۔ ہندوستان میں مزدور سستے تھے اور بآسانی مل جاتے تھے۔ پہلا قانون بچہ مزدوروں سے متعلق تھا اور دوسرا خاتون مزدوروں کے سلسلے میں۔ ان قوانین کے تحت عورتوں اور بچوں کو بہتر سہولتوں اور زیادہ معاوضہ کا حق دار ٹھہرایا گیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں بچوں سے پوشیدہ کام کرانے پر پابندی لگائی گئی، ۱۹۳۸ء میں ایک اور قانون کے ذریعہ قالین بافی اور بیڑی سازی میں بچوں کے کام کرنے پر پابندی عاید کی گئی۔ اس کے بعد آزاد ہندوستان میں ۱۹۴۸ء میں بنا فیکٹری ایکٹ، ۱۹۵۰ء میں آئین ہند اور ۱۹۵۴ء کا دکانوں سے متعلق قانون — ان سب کے تحت چودہ برس سے کم عمر کے بچوں کو غیر محفوظ قسم کے کاموں میں لگانا ممنوع ہے، اس کے علاوہ اور بھی قوانین ہیں۔ جو بعض خاص پیشوں میں ۱۴ برس سے کم عمر کے بچوں کو کام پر لگانے پر پابندی عاید کرتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ رہی کہ ایسا کوئی قانون نہیں ہے، جس میں یہ صراحت کی گئی ہو کہ کون کون سے پیشے، کام اور روزگار بچوں کے لیے غیر ممنوعہ ہیں۔ دوسری جانب بہت سے شعبے ایسے ہیں جن میں بچوں کے کام کرنے پر پابندی نہیں ہے۔ مگر ان میں بڑے منظم طریقے سے بچوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کی اصلاح اور ان بچوں کی مزدوری کو ایک ضابطے کے تحت لانے کے لیے بھی کوئی قانون موجود نہیں ہے۔

بہرکیف نئے بل میں بہت سی خوبیاں ہیں، مثلاً،

۱۔ اس کے تحت پانچوں میں بچوں کے کام کرنے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

۲۔ اس قانون میں یہ شرط ہے کہ کسی بھی ادارے میں بچوں کے کام کے اوقات، اس ادارے کے لیے مقررہ اوقات کار سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔

۳۔ بچوں سے ایک وقت میں تین گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا، اس کے بعد انھیں ایک گھنٹہ آرام کے لیے دینا ضروری ہے۔

۴۔ کسی بھی صورت میں آرام کے وقفہ سمیت اوقات کار چھ گھنٹے سے زاید نہیں ہو سکتے۔

۵۔ شام کو ۷ بجے کے بعد اور صبح ۸ بجے سے پہلے کسی بچے سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

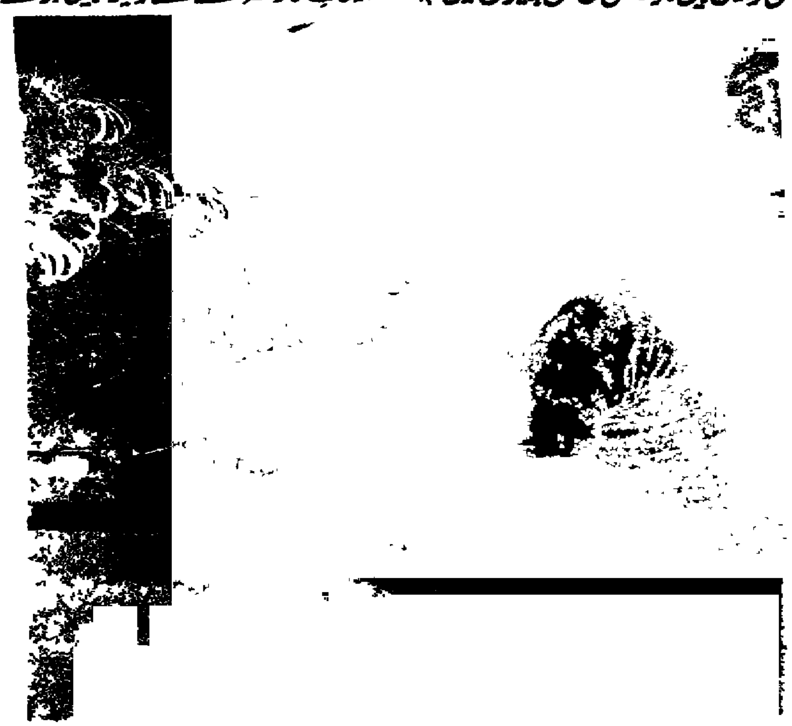
۶۔ بچوں سے اوور ٹائم نہیں کرایا جا سکتا۔

۷۔ اس بل کے تحت بچہ مزدوری سے متعلق ایک تکنیکی مشاورتی کمیٹی کے قیام اور بل کے مطابق انسپکٹروں کے تقرر کا اہتمام کیا گیا ہے۔

لیکن سب سے بڑا سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ کیا بچہ مزدوری کا مکمل سدِّباب ممکن ہو سکا ہے؟ یا یہ کہ کیا اس بل کے قانون بننے اور نافذ ہونے کے بعد ہندوستان سے اس لعنت کا خاتمہ ہو سکے گا؟ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ ہندوستان میں مزدوروں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور یہاں کے سماجی و اقتصادی حالات دنیا میں سب سے زیادہ دگرگوں ہیں، اور ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان میں قوانین کے نفاذ کس قدر ڈھیلے پن کے ساتھ عمل میں آتے ہیں، اور یہی نہیں ہمارے ملک میں ۶۰ فی صد بچہ مزدور دس برس سے بھی کم عمر کے ہیں۔ تقریباً ۳۶ فی صد بچے گھریلو کام کرتے ہیں اور یہ وہ شعبہ ہے جس کے بارے میں کوئی بھی ضابطہ بنانا سب سے زیادہ محال ہے — اور اگر دس لڑکے کام کرتے ہیں تو ان کے مقابلے ۱۲ لڑکیاں کام میں لگی ہیں۔

ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ بل اس سماجی برائی کو ختم کرنے میں کس حد تک کامیاب ہو گا — لیکن ہم یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ بل پوری طرح تو مؤثر ہو ہی نہیں سکتا، کیوں کہ اس میں مسئلے کی اصلاح کی کوشش تو ضرور کی گئی ہے لیکن اس کے خاتمے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب تک ترقیاتی پروگراموں کے ذریعہ بازآبادکاری پر زور نہ دیا جائے اس وقت تک اصلاحی مساعی بھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم بچہ مزدوری کے اس شدید مسئلے کا کوئی حل تلاش نہیں کر لیتے، اس وقت تک عام تعلیم، سب کے لیے صحت اور بیسویں صدی کے اواخر تک آبادی میں اضافے کی شرح کو ۱.۲ فی صد کے نشانے تک لانے میں کامیابی حاصل ہونا مشکل ہے۔ اور جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت تک شوروغل، جشنوں، کنونشنوں اور جمع خانوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اور عجب نہیں کہ اس صدی کے آخر تک ملک میں بچہ مزدوروں کی تعداد ایک کروڑ ہو جائے۔



آر۔ایل۔ چاولہ

# تجارتی عدم توازن : برآمدات و درآمدات کی پالیسی

ہندوستانی تجارت میں برآمد درآمد کے باہمی عدم توازن نے جو خطرناک رخ اختیار کیا ہے اس کے سلسلے میں سرکاری پالیسی سازوں اور منصوبہ کے ماہرین میں بجا طور پر تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے۔ سرسری طور پر موصولہ معلومات کے مطابق ۸۶-۱۹۸۵ کے دوران تجارت کا یہ عدم توازن ۸۶ ارب ۱۶ کروڑ تک پہنچ گیا تھا جب کہ اوسطاً چھٹے منصوبے کے دوران یہ فرق صرف ۵۴ ارب کا رہا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ساتویں منصوبے کے دوران تجارتی توازن کے اس فرق کے سلسلے میں تخمیناً جو مقدار مقرر کی گئی ہے، موجودہ اعداد و شمار اس سے محض تیس فیصد کم ہیں۔

اس زبردست افتراق کے خاص پہلو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ کاروباری خسارہ جی۔ ڈی۔ پی کے اعداد و شمار کے حساب سے (موجودہ قیمتوں پر) ۸۱-۱۹۸۰ء کے دوران کے ۶ر۴ فیصد کے مقابلے میں ۸۵-۱۹۸۴ء میں گھٹ کر ۶ر۲ فیصد رہ گیا ہے۔ یاد رہے کہ ۸۱-۱۹۸۰ چھٹے منصوبہ کا پہلا سال تھا اور ۸۵-۱۹۸۴ء اسی منصوبے کا آخری برس ہے۔ بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ ساتویں منصوبے کے پہلے سال میں بھی اسی نسبتی مقدار میں اضافے کا اشارہ مل رہا ہے۔ یہ مقدار اس وقت ۶ر۴ فیصد ہے۔

۲۔ ۸۰-۱۹۷۹ء میں جب تیل برآمد کرنے والے ممالک نے دوسری بار تیل کی قیمتوں میں اضافہ کیا تھا اور ۱۹۸۰ء کے آغاز میں اس کا مخالف اثر ہمارے کاروباری توازن پر پڑا تھا اور اب جو کاروباری خسارہ ہے اس کی وجہ تیل کے علاوہ دیگر اشیاء کی درآمدات میں ہونے والا اضافہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ہماری برآمدات سست رفتار رہی ہیں۔ اس سے اہم بات یہ نہیں ہے کہ خسارہ کس قدر ہوا بلکہ اہم بات یہ ہے کہ آیا ہندوستان کے اندر اتنی صلاحیت ہے کہ وہ اس خسارے کو بخوبی پورا کر سکے اور اس کے لیے خواہ نئے غیر ملکی وسائل کا فائدہ اٹھایا جائے یا پھر غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخیرے کو کم کیا جائے یا پھر ان دونوں اقدامات کو ملا جلا کر کام چلایا جائے۔ اس طرح طویل المدتی پروگرام کے تحت برآمدات میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

چھٹے منصوبے کے دوران بین الاقوامی مالیاتی ادارے کی بھاری مالی امداد، ایڈ انڈیا کنسورشیم

> ہندوستان کو چاہیے
> ملک کو مناسب جوڑ توڑ کرکے
> عالمی تجارتی رجحانوں کو اپنے
> ضروریات کے مطابق کو استعمال
> کر کے ... فائدہ اٹھانا
> چاہیے۔

کی مدد اور بیرون ملک سے اپنے وطن کو رقم بھیجنے والے ہندوستانیوں کے جمع کھاتوں سے فوری طور پر راحت ملی ہے۔ اگر ان میں سے کسی بھی ذریعہ یا وسیلے پر تکیہ کیا جائے تو معاملہ مشکوک ہی رہے گا۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں لیے گئے ایک اقتصادی جائزے میں ان تمام مجبوریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

ایک جانب تو یہ تجارتی عدم توازن، پھر قرضوں کا بوجھ، غیر ملکی امداد کی صورت حال بھی کوئی بہت امید افزا نہیں ہے اور نہ ہی ملک سے باہر رہائش پذیر ہندوستانیوں کی جمع شدہ رقومات میں بہت زیادہ اضافہ ہو رہا ہے۔ ایسے حالات میں مستقبل قریب میں ملک ... برآمدات ... [illegible]

ہوتی ہے۔ برآمدات کی راہ میں داخلی و بین الاقوامی سطح پر جو رکاوٹیں ہیں، ان کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے اس جائزے کے بعد برآمداتی حکمت عملی ترتیب دینا سہل ہو سکتا ہے۔

داخلی سطح پر جو چیزیں ہندوستانی برآمدات کے فروغ میں سد راہ بنی ہیں، ان میں سب سے اول ہے لاگت، پھر اندرون ملک مانگ کا بھی اثر پڑتا ہے سپلائی کی کروٹیں سامنے آتی ہیں، دوسری رسمی کارروائیاں رکاوٹ بنتی ہیں۔ مال کی خوبی بھی بڑے معنی رکھتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے زیادہ تر تاجروں کے ذہن پر برآمد کا بھوت سوار رہتا ہے۔ اگرچہ ان تمام امور پر حکومت اور تجارتی وصنعتی اداروں کے درمیان طول طویل مباحثے ہوتے رہے ہیں۔ تاہم یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ ان امور کے سلسلے میں ہمارے پالیسی سازوں نے کیا رویہ اپنایا ہے، کیونکہ عموی طور پر آزاد اقتصادی پالیسی اور خاص طور پر نئی درمیانی مدت کی برآمداتی پالیسی کے بعد سے ہمارے پالیسی سازوں کے ذہنوں میں یہ خیال عام ہے کہ یہ دونوں پالیسیاں ہی برآمدات کی راہ میں حائل داخلی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی معیشت کافی کچھ قید و بند سے آزاد ہوئی ہے اور گزشتہ برسوں میں عاید پابندیوں اور ضابطوں کو دور کرکے ایک ایسی پالیسی نافذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے ذریعہ نتائج برآمد ہو سکیں۔ یہ آزادانہ طریقۂ کار کا خوش آئند ہے، لیکن اس سے ایک طرح بحران بھی پیدا ہوا ہے، حکومت اور تجارتی وصنعتی حلقوں کے درمیان بے اعتمادی کی فضا بنی ہے اور اس کے نتیجے میں اس آزادانہ طریقۂ کار کا ٹھوس فائدہ سامنے نہیں آیا ہے برآمداتی پالیسی کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کی ابتدا ۱۹۷۰ء کی برآمداتی پالیسی کا تجزیہ ... [illegible] ... قائم کی گئی

ہیں۔ الیگزینڈر کمیٹی، ٹنڈن کمیٹی اور حالیہ عابد حسین کمیٹی۔ برآمدات کے سلسلے میں قائم کی گئیں اور کپور کمیٹی انجینئرنگ سے متعلق برآمدات کے سلسلے میں قائم کی گئی تھی ـــــ ان کمیٹیوں نے مجموعی طور پر برآمداتی پالیسی میں زبردست تبدیلیوں کی سفارش کی تھی اور ایک مستحکم برآمداتی درآمداتی پالیسی کی ضرورت پر زور دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ برآمدات کو مائل بہ فروغ کرنے کے لیے آزادانہ طور پر فراہم کیا جانے والا مالی تعاون اور دیگر امداد بے سود رہی ہیں لیکن ذرا وسیع تر تناظر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ برسوں سے قرضہ جات و دیگر امداد کے سلسلے میں چلی آنے والی بحث کو ختم کرکے اور چھان بین کرکے کوئی نیا اور زیادہ موثر طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے۔

تاریخی تناظر میں دیکھیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پہلے ۱۹۷۳-۷۴ء میں اور پھر ۱۹۷۹-۸۰ء میں تیل کی قیمتوں میں اضافہ ہوا تو مغربی ممالک میں بھی ترقیات کی رفتار کم ہو گئی تھی، افراط زر میں اضافہ ہوا تھا اور بے روزگاری بڑھی تھی۔

گزشتہ چند برسوں میں ایک متبادل حکمت عملی کے طور پر جنوب۔جنوب تعاون کے بارے میں بھی کافی بات چیت ہوتی رہی ہے لیکن لاطینی امریکہ کے چند ملکوں کو چھوڑ کر اس سمت میں بھی کوئی بہت زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ تاہم لاطینی امریکہ کے ملکوں نے ۱۹۷۷ء کے بعد سے اس ضمن میں گہری دل چسپی دکھائی اور ان ممالک کی برآمدات کا ۱۵ فیصد حصہ ترقی پذیر ملکوں کے لیے ہی وقف رہا ـــــ لیکن ایشیائی ممالک کی برآمدات کا صرف ۲۴ فیصد ہی ترقی پذیر ممالک کے حصے میں آیا۔ ملک وار جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ارجنٹینا نے ۶۳ فیصد، سنگاپور نے ۴۴ فیصد اور برازیل نے ۴۳ فیصد برآمدات ترقی پذیر ممالک کو فراہم کیں اور ہانگ کانگ نے صرف ۱۴ فیصد اور کوریا نے صرف ۱۵ فی صد برآمدات ہی ترقی پذیر ممالک کے لیے وقف کیں۔ ہندوستان نے بھی تیار کردہ اشیا کا ۲۴ فیصد حصہ ترقی پذیر ممالک کو دیا۔ یہ رویہ میانہ درجہ کا کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ہمیں اس راہ میں بہت آگے بڑھنا ہے، اور ترقی پذیر ملکوں کی تجارتی صلاحیت و امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہے۔

بہرکیف اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سبھی

کے ساتھ اپنی برآمدات کو بڑھانے کے معاملے میں قطعی طور پر مجبور رہے ہیں۔ اس کے اسباب اور بھی ہوسکتے ہیں۔ عالمی تجارتی منڈی کا اثر بھی پڑتا ہے اور عالمی تجارتی منڈی میں اکثر نشیب و فراز آتے رہتے ہیں، ان کے حالات ایک جیسے کبھی نہیں رہتے۔ اس کے علاوہ کسی بھی ملک کے لیے انفرادی طور پر یہ بات زیادہ اہم ہے کہ وہ اپنی طاقت، کمزوری، امکانات اور خطرات، نیز متعلقہ بازار میں مقابلے پر آنے والے دیگر ممالک کی قوت و صلاحیت کا جائزہ لے۔ اس طرح ہم دوسرے ملکوں کے تجربات سے سیکھ بھی سکتے ہیں، اور فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔

سرکاری سطح پر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی برآمدات کے حق میں عالمی فضا اکثر ناسازگار رہتی ہے، لیکن حقائق کی روشنی میں یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی، ہمیں یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جن ممالک سے (برآمداتی میدان میں) ہمارا مقابلہ ہے وہ بھی ان ہی منڈیوں میں کاروبار کرتے ہیں اور ان کی برآمدی مساعی کو تو کبھی کوئی شدید دھکا لگا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر تیل پیدا نہ کرنے والے ترقی پذیر ممالک نے ترقی یافتہ ملکوں کو جو برآمدات کیں ان میں ۱۹۸۲-۸۳ء کے دوران ۱۵ ماہ کے عرصے میں ۲۵ فی صد کا اضافہ ہوا، اور موجودہ رجحان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۸۶ء میں برآمدات کا فروغ جاری رہے گا۔

یوں صورت حال بالکل واضح ہے ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک کو مناسب جوڑ توڑ کرکے، عالمی تجارتی ماحول کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھال کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ لیکن داخلی طور پر جو رکاوٹیں سامنے آتی ہیں وہ اپنی جگہ ہیں، اس کے لیے ایک بہت موثر اور بامعنی برآمداتی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ عالمی برآمدات میں ہندوستان کا حصہ (۰ء۴ فی صد) بہت کم ہے، ترقی یافتہ ملکوں کا ذکر ہی کیا، بعض ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں بھی یہ تعداد بہت کم ہے، اور ہندوستان کو اس صورت حال کو بہرصورت بہتر بنانا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ایک نئی برآمداتی پالیسی کے مشمولات کیا ہونا چاہئیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ ہماری برآمدات کے سلسلے میں کوئی مرکزی منصوبہ بندی نہیں کی گئی، اور مختلف اداروں کے مابین ربط بھی نہیں رکھا گیا ہے۔ لہٰذا ایک مرکزی منصوبہ بندی کے نظام کی سخت ضرورت ہے اور [illegible]

نئی اشیا کی تلاش بھی ہونا چاہیے۔

سیدھی سادی بات یہ ہے کہ برآمدات کو قومی سطح پر ترجیح دی جانی چاہیے اور اس کے لیے ایک مرکزی منصوبہ بندی ضروری ہے۔ اکثر ہم مختلف ملکوں کی برآمداتی فتوحات کا ذکر سنتے ہیں۔ ارجنٹینا اور میکسیکو کے نام لیے جاتے ہیں۔ جنوبی کوریا بھی اس میدان کے کامیاب کھلاڑیوں میں سے ہے، اور برازیل کی کامیابی تو داستانی اہمیت رکھتی ہے، یہاں یہ ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ برازیل میں طرز حکومت بدلتا رہا ہے، کبھی جمہوریت رہی، کبھی آمریت اور کبھی انقلاب پسندوں کی حکومت آئی، کبھی بائیں بازو والے اقتدار میں آئے تو کبھی دائیں بازو والوں کی حکومت بنی، لیکن ان تبدیلیوں سے بھی برازیل کی تجارت پر کوئی منفی اثر کبھی نہیں پڑا۔ اس کی حکمت عملی یکساں رہی، اور وہ دنیا بھر کی برآمداتی منڈیوں کا جائزہ لیتا رہا، اور اس کے قدم ہر جگہ پہنچے۔

اب اس روشنی میں ہندوستان کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو صورت حال بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ دنیا بھر میں تیل کی مندی کا زور کم ہوا ہے لیکن ۱۹۸۴-۸۵ء کی ہی مثال لیں تو ہم نے تیل برآمد کرنے والے ممالک سے ۱۹٫۲ فی صد درآمدات تو کیں مگر ان کو کی جانے والی ہماری برآمدات ۱۱٫۸ فی صد سے آگے نہیں بڑھیں۔ اس صورت حال کی اصلاح آسانی سے ہوسکتی ہے، ہندوستان ان ملکوں کو اپنا تیار کیا ہوا سامان برآمد کرسکتا ہے، اور اس کے بدلے میں تیل حاصل کرسکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہماری برآمداتی و درآمداتی تجارت میں جو زبردست عدم توازن ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری معیشت کا ڈھانچہ شاید ابھی بہت مستحکم نہیں۔ اپنی کمزور برآمداتی کارکردگی کے لیے عالمی صورت حال کو مورد الزام قرار دینا درست نہیں۔ یہ صورت حال سبھی کے لیے ہے اور جن ممالک سے (برآمداتی میدان میں) ہماری مسابقت ہے ان کی کارکردگی کہیں بہتر ہے۔

اصلاح کا راستہ صرف یہ ہے کہ روایتی طریقہ کار چھوڑ کر، نئے انداز سے برآمداتی حکمت عملی تیار کی جائے، جس کا مقصد برآمد کو ایک دم فروغ دینا ہو، اور عالمی منڈی میں اپنی شرکت بڑھانے سے پہلے ہمیں اپنی سطح پر پوری تیاری کر لینا [illegible] کے بعد ہی قدم [illegible] مقصد ہوگا۔

نوین چندر جوشی

# صنعتی پیداواریت کے مختلف پہلو

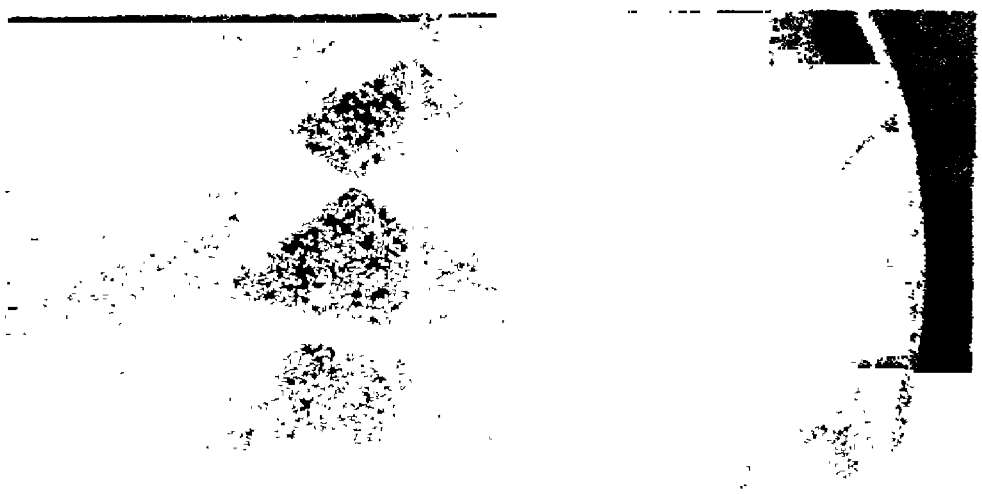
تمام دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں "پیداواریت" کا لفظ ابھی تک پردۂ راز میں ہے اگرچہ ہم اسے پیداوار اور اس کے لیے لگائے گئے ساز و سامان کے مابین نسبت کی ایک سادہ سی صورت کے طور پر ہی سمجھ لیں تو بھی اسے مختلف تفسیروں اور نظریات کے تحت لایا جاتا ہے جس سے صورت حال اور بھی الجھ کر رہ جاتی ہے

یقیناً پیداواریت کا مطلب محض یہ نہیں کہ پیداوار میں اضافہ ہو جو کہ بلاشک اس کے لیے لگائے گئے ساز و سامان میں اضافہ کرنے سے ممکن ہوتا ہے مثال کے طور پر زراعت میں پیداوار کو بڑھایا جاسکتا ہے اگر زیادہ زمین کو زیر کاشت لایا جائے۔ صنعت میں زیادہ پیداوار کی صورت حال مختلف عناصر کے امتزاج تازہ ترین ٹیکنالوجی بروئے کار لانے، بہتر خام مواد کے استعمال، سائنسی انداز کا انتظام لاگو کرنے وغیرہ سے پیدا کی جاسکتی ہے۔ بنیادی ساز و سامان کو زیادہ کرکے پیداوار زیادہ کرنا کوئی غلط بات نہیں، لیکن اس کا یہ لازمی مطلب نہیں کہ اس سے کاروبار کی پیداواریت میں بہتری آجائے گی پیداواریت میں حقیقی اضافہ لانے کے لیے ساز و سامان کے کم استعمال سے پیداوار میں اضافہ ہو۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ مقررہ طور سے استعمال میں لائے گئے ساز و سامان سے شرح پیداوار میں اضافہ ہو، چاہے وہ بنیادی ساز و سامان انسانی یا موادی ہو یا دونوں طرح کا ہو۔ آخری تجزیے کی صورت میں، پیداواریت کا تصور ایک ایسا تصور بن جاتا ہے جس کی بدولت کمیاب وسائل کے استعمال میں زیادہ سے زیادہ بچت کی جائے۔ صرف اسی صورت میں ہی ملک خود کفالت کی جانب اہم پیش رفت کرسکتا ہے

مناسب تناظر میں موثر پیداواریت پر مشتمل چند اہم عناصر پر غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اپنے ترقی پذیر ملک کے شعبۂ صنعت میں اسے لاگو کیا جائے۔ توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے اس بات پر کہ معیشت

یہ عالمی ماحول میں مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا ملک کے اندر جب تک پیداواریت میں اضافہ نہیں ہوتا

رہن سہن کے بہتر معیار کے لیے شہریوں کی امیدوں کو پورا کرنے میں بڑی مشکل پیش آئے گی اور قوم کی



قیمانہ ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوسکیں گی۔ آج کل ترقی پذیر ممالک کی حکومتیں بہتر اور مزید خدمات کے لیے بڑی بھاری مانگوں سے دوچار ہیں۔ یہ تسلیم شدہ ہے کہ ملک کے جی۔ این۔ پی کے فروغ کا زیادہ تر حصہ پیداواریت کی بہتری سے دستیاب ہونا ضروری ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ پیداواریت کی زیادہ شرح فروغ کوئی اتفاقی بات نہیں۔

پیداواریت کی بہتری' ایک خاص حالت میں بہت ہی موافق طریقوں اور انداز عمل کو دانستہ طور سے اپنانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ میکانکیت کی سطح دستیاب تکنیکی اور انتظامی ہنر، ساز و سامان' تیز طریقوں کا مناسب استعمال' پیداواریت کے تکنیک اور فیکٹری میں موجود صنعتی تعلقات' یہ سب چیزیں پیداواریت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان تمام عناصر میں سے کسی ایک کے استعمال کرنے میں کوتاہی' پیداواریت کو بھی اسی قدر کم کر دیتی ہے۔ پیداواریت کو محض تیار شدہ اشیاء کے پیمانے سے ظاہر کرنا اتنا ہی بے محل ہوگا جتنا کہ ناکافی ہوگا۔ مثال کے طور پر' کارخانے کی سطح پر پیداواریت کا ناپ تول' کام کی سطح کے مقابلے میں مختلف ہوگا۔ مؤخر الذکر سطح پر سرگرمی کے مختلف مرحلوں کا تجزیہ اور ان مرحلوں کے لیے لوازم بھی در آئیں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پیداواریت میں

اشیاء جلد از جلد تیار کرنے کی تحریک دیں گے جو کہ مقداری اور اقداری حساب سے صحیح ہوگی۔ اس کے علاوہ موجودہ زیر استعمال ساز و سامان کو بدل دینا' پیداواری نتائج کے لیے مزید ساز و سامان فراہم کرنے کی نسبت زیادہ معاون ہوگا۔

سرکاری دائرہ کار میں پیداواریت کو بہتر بنانا' وہ فضا پیدا کرنے کے لیے بنیادی چیز ہے جس کی بدولت مجموعی معیشت میں شرح فروغ کو بڑھاوا ملے گا۔ یہ چیز اس لیے بنیادی ضرورت ہے کیونکہ سرکاری دائرہ کار بڑا ہے اور معیشت کا سریع طور سے ایک فروغ پذیر حصہ ہے۔ یہ اہم اس لیے ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر میں پیداواریت کو بہتر بنانے کے ترغیبی پروگرام کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ اگر سرکاری دائرہ کار کے کاروباری ادارے ایک غلط مثال قائم کریں گے' اس لیے سرکاری دائرہ کار کے انتظامیہ کو یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ ان کے یہاں وسائل کے فی یونٹ حساب سے بہتر اور زیادہ پیداوار دستیاب ہو۔ ایسا کرتے وقت انہیں پیداواریت کو محض کارکنوں یا مشینوں کا عمل ہی تصور نہیں کرنا چاہیے۔ انتظامیہ کو لاگتوں کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی جو چیز زیادہ ضروری ہے' وہ ہے خود پیداوار کی کارکردگی میں بہتری لانا جس کے لیے وقتاً فوقتاً نئی

کاروبار میں تیار شدہ ساز و سامان کو مؤثر طریقے سے استعمال کرنا۔ دراصل ایسا نہ کرنا پیداواریت کے تصور کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ نامستعدی سے کام کرنا یا خرچے میں کفایت کرنا' کاروبار میں لاگت کے ایسے عنصر کے مترادف جیسے کہ بجلی کی توانائی کا استعمال۔

اس کے علاوہ انتظامیہ کو ان لاگتوں کو بھی درمیان رکھنا چاہیے جو ان کی طرف سے نہیں ہوتی لیکن وہ تیار شدہ اشیاء میں شامل ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ لاگتوں کو مدنظر رکھنے والے کاروبار اپنے لاگتوں کے کنٹرول سسٹم کو اپنی حدود سے باہر بھی توسیع دینی چاہیے۔ خام مواد' فالتو پرزے اور اجزاء مہیا کرنے والے جو لاگتیں عمل میں لاتے ہیں اور اس کے ساتھ جو خرچے خود ان کی اپنی تقسیمی تنظیم کرتی ہے' ان کو کم کرنے کے طریقے تشکیل دینے چاہئیں۔ کاروباری ادارہ ان مختلف ایجنسیوں کو مشورہ اور تکنیکی رہنمائی بھی فراہم کرسکتا ہے۔ جس کے ساتھ اس کا اپنے اخراجات کے سلسلے میں کچھ تعلق پڑتا ہے۔ صرف اسی صورت میں مجموعی لاگت میں متواتر کمی لائی جاسکتی ہے۔ اس سے اس ضرورت پر زور دینے کی بات پیدا ہوتی ہے جس کے تحت کاروبار کے مختلف مرحلوں پر لاگت پر کنٹرول رکھنے کا معقول نظام اختراع کرنا پڑے گا جو کہ ادارے کے اندر اور باہر بھی ہوگا۔

ترقی پذیر ممالک میں پیداواریت کی ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ انسانی ہنرمندی بہت مہنگی ہوتی ہے۔ ایسے میں ضروری ہو جاتا ہے کہ انسانی ہنرمندی کو زیادہ سے زیادہ صلاحیت کی حد تک لیس کرنا اور استعمال کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ ضروری ہے کہ سرکاری دائرہ کار اور پرائیویٹ سیکٹر کی تمام تنظیموں کے بارے میں سائنسی انداز مکمل مطالعات کار رچالو کیے جائیں۔ ایسے مطالعہ کے دو جزو ہوں گے یعنی طریق کار کا مطالعہ اور کام کا ناپ تول' پہلے جزو میں مستعمل طریق کار آئے گا اور دوسرے میں ہر فرد کے فرض کے تحت کام کی قدر و قیمت۔ اس سے لازمی طور پر ساری تنظیم کے بہت سے لوگوں کے فرائض اور ذمہ داریوں پر اثر پڑے گا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ملازمین کو یہ یقین دلایا جائے کہ پیداواریت کو فروغ دینے کے لیے جدید تکنیک نہ صرف ان کی آمدنی اور کاروباری ماحول میں بہتری کا باعث بنیں گے بلکہ ان کے لیے ترقی کے مواقع بھی بہتر ہو جائیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مطالعہ کار کے تجزیے کے نتیجے میں کارکنوں کی طرف سے کوشش میں بھی بہتری کے اقدامات سے پہلے کی نسبت کمی آجائے گی۔ ترقی یافتہ ممالک میں



ش رفتہ ان عناصر سے بھی رو پذیر ہوسکتی ہے جو
ن ساز و سامان کے استعمال کے علاوہ ہوں گے۔
وباری طریق کار میں خاطر خواہ تبدیلی' طریقۂ کار'

مصنوعات کو درمیان میں لانا' نئی ٹیکنالوجی اور بہتر ہنرمندی کا استعمال کرنا' نقصان کو بند کرنا اور طے شدہ صلاحیت کو بروئے کار لانا ضروری ہوگا۔ ان اقدامات

**مطالعوں کا رسے تجربات سے ظاہر ہوا ہے کہ مستعدی کا اضافہ کام کی مقدار کا مترادف نہیں**

لیکن پھر بھی ایک سب سے زیادہ پریشان کن اور اڑیل مسئلہ جس سے مالکان دوچار ہوتے ہیں وہ ہے کارکنوں کا کسی بھی تبدیلی کے خلاف ہو جانا۔ یہ مخالفت عام طور سے کم کارکردگی، چھوڑ جانے والوں کی تعداد میں اضافہ، تبادلے کے لیے درخواستیں، دائمی جھگڑوں، آہستہ کام کرنے والوں کی ہڑتالوں، تبدیلی کے کارآمد نہ ہونے کی مختلف وجوہات وغیرہ وغیرہ کے روپ میں رونما ہوتی ہے۔ اس لیے انتظامیہ کو ایسی مخالفت پر قابو پانے کے لیے کارکنوں کو تبدیلی میں شامل کرلینا پڑتا ہے۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ اربابِ انتظامیہ تبدیلی کی ٹیکنالوجی میں اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ وہ ان مختلف باتوں سے درگذر کر جاتے ہیں جو کارکنوں کے لیے تعطیت کا باعث ہو رہی ہوتی ہیں اس لیے انہیں تبدیلی کے لیے عملے کی دلچسپی کو وسعت دینی پڑتی ہے جس کے لیے انہیں معقول وقت مقرر کرنا ہوتا ہے اور کارکنوں سے مناسب رابطہ بھی برقرار رکھنا ہوگا۔

انتظامیہ کو جاننا چاہیے کہ انسانی کوشش اور پیداواریت میں باہمی تال میل ان کے لیے ایک اہم اقدام ہو جاتا ہے۔ زیادہ پیداواریت کے لیے موافق رویے اسی وقت غالب آتے ہیں جب تنظیم کے اندر انسانی تعلقات باہمی احترام پر مبنی ہوں۔ اس سے پہلے کی نفسیات کہ کارکن کو "گاجر اور لاٹھی" کے اصول پر کام کرنے کی تحریک دی جاسکتی ہے یعنی یا تو مزید مالی معاوضے کے وعدہ کی بدولت یا کام سے برطرف کردیے جانے کے خوف سے، اگرچہ سودمند ہے، پھر بھی پیداواریت میں اضافہ لانے کے لیے اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس سے کارکن کو محض ایک جنس تصور کرلیا جاتا ہے —— وہ ایلٹن میو ہی تھے جنھوں نے اپنے مشہور ہاتھارن تجربے بعد اس بات پر زور دیا تھا کہ کارکن روپے کے علاوہ چند سماجی اور نفسیاتی تسکینیوں کی تلاش بھی کرتا ہے۔ اگر ان کے لیے کوئی موقع نہ دیا جائے تو پیداواریت میں اضافہ لانے کی راہ میں شدید رکاوٹ بن جاتا ہے —— درحقیقت جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ انسانی لحاظات کے ساتھ سختی کی ضرورت کو مربوط کردیا جائے۔ اس طرح کا توازن پیدا کرنے والا عمل کوئی بے معنی چیز نہیں۔



دستیاب نہیں ہے۔ اربابِ انتظام کو اپنا عملی شعور، نگہداشت اور احساس عمل میں لاکر ہر دم بدلتی قوتوں پر اپنی گرفت رکھنی چاہیے، جس کے لیے انہیں پیداواریت بڑھانے کے اہم مفاد کو پیش نظر رہنا چاہیے۔ اس بات کا بھی خیال رہنا چاہیے کہ صنعتی تعلقات اور پیداواریت کے شعبے میں مستقبل کے دوران بے اطمینانی کی ناگفتہ بہ قوتیں سر اٹھائیں گی۔ جونہی مختلف ممالک اپنی صنعت کاری عمل میں لاتے جائیں گے کوئی غیر معمولی ذہن جو کارپوریشنوں کے سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان قوتوں کو امن کے فوری نعروں سے نہیں روک سکتا۔ اسے بدلتے ہوئے ماحول کی حقیقتوں سے مفاہمت کرنی پڑے گی مالکوں کی وساطت اور "اپنے ہی انداز میں" کام کرنے کی حکمرانی، دونوں کو ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ تصور کیا جاتا ہے۔ انتظامیہ کے اختیارات کا طلسم ٹوٹے گا تو مسلسل انتشار اور تبدیلی سے نمٹنے کے لیے انتظامیہ کی قابلیت سراسر اس بات پر منحصر ہو گی کہ وہ اپنے رفیق کار افراد کی توانائی اور استعداد کو

چنانچہ یہ قابلِ غور ہے کہ پیداواریت کی منزل اپنے وسیع تر معانی کے اعتبار سے ایک ایسے ٹھوس مقصد کے مترادف ہے جو کوئی ملک اپنے ترقیاتی پروگراموں کے تحت اپنے لیے مقرر کرلیتا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے جس جوش و خروش کو کوئی ملک پیدا کرے گا اسی سے ہی اس رفتار کا تعین ہوگا جس کے ساتھ اس کا اقتصادی فروغ حاصل کیا جاسکتا ہے، جب پیداواریت میں اضافہ ہوتا ہے تو اس سے رہن سہن کے معیار میں تبدیلی آتی ہے جس سے لوگوں کے طریق زلیست پر خود بخود اثر پڑتا ہے۔ اقدار، نظریات، ذوق و شوق اور تعلقات سب بدل جائیں گے اور زندگی کی ایک نئی تشکیل میں معاون ہوں گے۔ ان تمام تبدیلیوں کی بدولت لوگ ان تمام اقدار کو بہتر طور سے پہچان سکیں گے جو ایک ثقافتی میراث کی صورت میں ان تک پہنچائی گئی ہیں۔

کوٹلیہ

# سرکاری دائرہ کار

## اعلیٰ رفعتوں کی تلاش

سائنس اور ٹیکنالوجی کے بڑے پیمانے پر استعمال نے معاشرے اور بشری حالات کو غیر معمولی انسانی صفات سے متصف کر دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ان میں ملکی حکومت کے عدیم المثال اور متواتر کردار کو ترویج ملی ہے۔ سائنسی انقلاب کی تین صدیاں، لبرل اور مارکسی نظریات کی وسیع اشاعت، سابق نوآبادیات کی یکے بعد دیگرے بسرعت آزادی نیز مابعد جنگ دور میں نئے ممالک کا ظہور، ان سب نے اجتماعی طور پر ہمہ گیر انسانی فروغ اور سریع معاشرتی ترقیات کے لیے مذکورہ کردار ادا کرنے کے لیے حکومتی سروکار کو اور بھی جلا دی۔ لہٰذا ایسے سرکاری ادارے اور کلیدی صنعتیں جن کی مالک، منصرم اور نگراں خود حکومت ہے، اسی شدید سروکار کا براہ راست نتیجہ ہیں۔

آزادی کے بعد ہمارے پالیسی سازوں اور رہنماؤں کے لیے معاشی ترقی کے لیے ایک ایسا تقلیدی نمونہ تلاش کرنا اور اپنانا ضروری ہوگیا جس سے معیشت اور معاشرے کا مسلسل فروغ یقینی بن جائے۔ اس ضمن میں کسی ایسے تقلیدی نمونے کا انتخاب کرنا، جس سے سرمایہ دارانہ اور نجی کاروبار راہ پا جائے، جہد آزادی کے جملہ نصب العینوں اور مقصودات کی نفی کے مترادف تھا۔ جس تواریخی صورت حال میں ہندوستان کو آزادی ملی، اس میں سابق نوآبادیاتی آقاؤں، ترقی یافتہ مغرب اور نوآبادیات میں معاشی تفاوت کی ایک بڑی خلیج حائل تھی۔ لہٰذا مغرب کے شانہ بشانہ کھڑے ہو پانا اور ضائع کی ہوئی صدیوں کی تلافی کرنا فقط ایک وسیع اجتماعی معاشرتی سعی ہی سے ممکن تھا۔

اس تعلق سے واحد روسی تجربے ہی کی مثال ہمارے رہنماؤں کے سامنے تھی۔ لہٰذا ہندوستان کے بانی مبانی پالیسی سازوں نے معاشی منصوبہ کاری کے روسی تقلیدی نمونے کے خد و خال کو اپنی پالیسی میں سمونے کا اقدام کیا اور سرکاری اداروں کو اپنے ہی ڈھنگ . . . کردار سونپنے کی کوشش کی بمقابلہ روسی تقلیدی نمونے کے جس میں سبھی معاشی کاروبار، سوویت سرکار کے توسط سے مجموعی طور پر معاشرے کی ملکیت میں ہوتا ہے ہندوستانی سعی یہ تھی کہ نجی کاروبار اور صنعت کو سرکاری ملکیت کی عوامی صنعتی اکائیوں کے ساتھ متحد کر دیا جائے۔ موخرالذکر طریق کو معیشت کی "ذیشان رفعت" پر فائز ثابت کیا گیا۔ عملاً "ملی جلی معیشت" کے ذریعے ایک اشتراکی معاشرے کی یہ جستجو آغاز ہی سے قدرتی مشکلات سے پُر تھی۔ ایک اشتراکی جمہوری کا پایلٹ کو یقینی بنانے کی غرض سے، منصوبہ بند معاشرتی فروغ کے اس انوکھے تقلیدی نمونے کے انتخاب میں ہمارے منصوبہ کاروں کو اس حقیقت کا احساس نہ ہوا کہ اشتراکی معیشت کی تعمیر میں صرف ہونے والی روسی اجتماعی کاوش کو، مارکسی اقدار کی بنیاد پر کل روسی عوام کی بھاری اجتماعی بیداری کی تائید حاصل تھی۔ سوویت روس نے یہ ثابت کیا اگر پوری قوم منطقی مادہ پرستی اور اجتماعی خصوصیات پر زور دینے والی اشتراکی کائنات کی اصلاح میں سوچنے کی شرط پر راضی ہو تو وہ بلاشک شرح نمو اور معاشرے کے عام فروغ میں بے مثال اضافے کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ دوسری طرف ہمارے ملک میں ایسا بھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ عوام کی اجتماعی آگہی ٹکڑے ٹکڑے رہی اور تاریخی اعتبار سے شرابور کسی ایک بصیرت کی پرورش و پرداخت نہ کی گئی۔ اسی بنیادی خامی سے آگے چل کر سرکاری اداروں میں دیوقامتی، نااہلی اور روز افزوں خسارے کی سبھی علامات ظاہر ہونے لگی ہیں۔

ہندوستان میں سرکاری اداروں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ضمن میں کی گئی سعی بھاری اور ٹھوس رہی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ٹکنالوجیکل لاگتوں اور ہزارہا کارکنوں میں نئی ہنرمندیوں کے فروغ کے معنوں میں "پھیلاؤ اثرات" کے ساتھ کوئی نیا کارخانہ لگانا، ایک کے بعد دوسرے رد عمل اور تعداد بڑھانے والے نتائج کے نہ ختم ہونے والے عمل کو جنم دیتا ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں صنعتی اداروں کو جدید طرز پر لانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

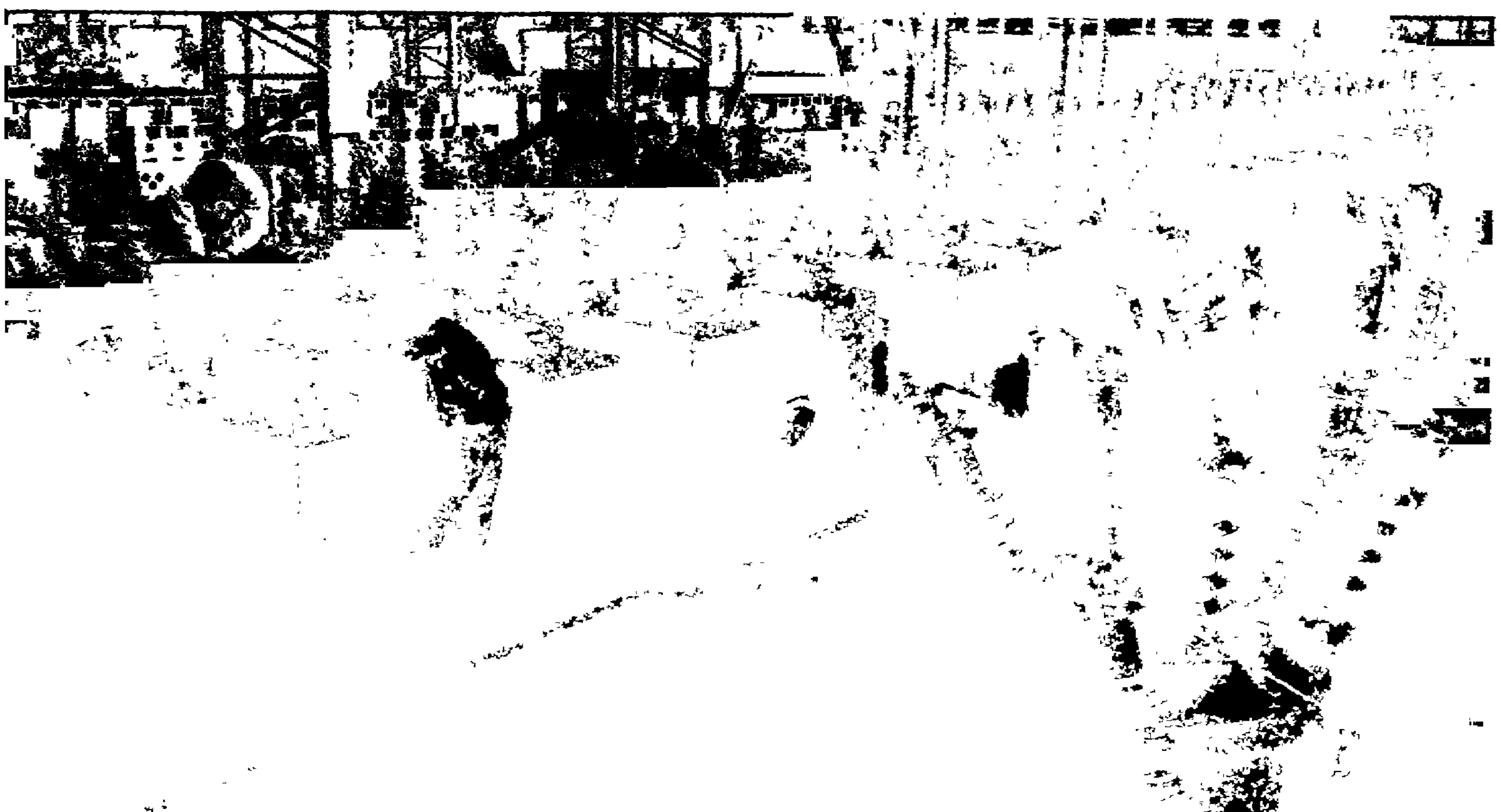
ملکی حکمت عملی کے رہنمایانہ اصولوں، صنعتی حکمت عملی سے متعلق ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۶ء کی قراردادوں اور ایک اشتراکی طرز کے معاشرے کے اعلانیہ مقصود کے حصول کے لیے ہندوستان میں سرکاری دائرہ کار، صنعتی فروغ پر اشد زور دینے کے لیے ایک بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔ اسے صریحاً اور اشارتاً معاشی فروغ میں تیزی لانے، صنعتی کارخانے لگانے کے کام کو تیز تر کرنے، روزگار کے مواقع بڑھانے نیز ہندوستانی عوام کی بے پناہ آبادی کا معیار زندگی اور جینے کی نسبتی نوعیت بہتر بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

چنانچہ اس کے باوجود کہ سرکاری سیکٹر نے معیشت کی "ذیشان رفعتوں" کا ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے شروع شروع میں بھاری امیدیں پیدا کی تھیں، تاہم بعد کے برسوں میں اس کی کارگزاری ان مرصع امیدوں سے بہت کم رہ گئی۔ اسے قومی معیشت کی اصلی محرک کے طور پر اگر گزشتہ حالات کی بنا پر دیکھا جائے تو آج یہ لگے گا کہ اس کی مالیت ضرورت سے زیادہ لگائی گئی تھی۔ معاشی فروغ کا نہرو ـــــ مہالانوبیس تقلیدی نمونے، جس کا زور بھرپور پونجی چاہنے والی بھاری صنعتوں پر مشتمل اصلی زمرے پر تھا اور جو پیداواریت بڑھانے والی قوتوں کو بے لگام کرنے پر تیار تھا، نے واقعی بڑی مایوس کن صورت حال پیش کی ہے۔ اس کے لیے بصیرت کی ناکامی اتنی ذمہ دار نہیں، جتنی کہ انتظامی مہارت اور لگاؤ کی کمی یا ماحولیاتی مجبوریاں ہیں۔ لہٰذا قدرتی طور پر مرکزی سرکار کے ۱۵۹ صنعتی اداروں نے ایک رپورٹ کے مطابق دمارچ ۱۹۷۹ء کے اختتام تک، ۱۹٫۶۳ ملین روپیوں کا خسارہ اٹھایا، جبکہ ان میں کل ۱۵۶٫۰۲ ملین روپیے لگائے گئے تھے۔ ناقص صنعتی روابط کے باعث کام کے

دنوں کے مسلسل نقصان جیسے تنقیدی مظاہر ... کے
اصطلاح میں ... کارگزاری کی نوعیت نے رو بہ تنزلی کا مظاہرہ
کیا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں سرکاری ذریعے کے اداروں نے
تک پہنچ ۶۰۶۶ ملین کام کے دن کھو دیے یعنی کام
کے دنوں کی کل تعداد کا ۱۹ فیصد اور اس سال کے
دوران ۱۰ر۳ ملین کام کے دنوں کا نقصان ہوا۔

افرادی قوت کی اس تقسیم کے منفی نتائج بشکل
ہی واضح کیے جا سکتے ہیں اور یہ انتظامی عملے کی سخت
نااہلی کی علامت ہیں۔ بدقسمتی سے یہ رجحان ابھی جاری
ہے۔ سرکاری ادارے جو ملکی حکمت عملی کے رہنمایانہ
اصولوں کی تہہ کے معاشی اور عہد یعنی عوام کے معیار
زندگی میں تیز رفتار ترقی کو فروغ دینے والے خاص
ذرائع پر مشتمل ہیں۔ مایوس کن کارگزاری کی عکاسی
کرتے ہیں۔ اگر سرکاری ادارے اسی طرح مستعدی کے
فقدان اور ناکافی معاشرتی توفیر کی عکاسی کرتے رہے،
تو اس بے پناہ بیروزگاری جو خطرناک طور پر بڑھ رہی
ہے کے ہولناک انجام کا تصور کرتے ہی رونگٹے کھڑے
ہونے لگتے ہیں۔ محنت کش قوت، جو ۱۹۶۱ میں ۱۹۰ ملین
نفوس پر مشتمل تھی، ۲۰۰۰ء میں بڑھ کر ۴۲۰ ملین
نفوس ہو جائے گی۔ آج بے روزگاروں کی تعداد
۲۰ ملین کے مساوی ہے۔ اگر سرکاری اداروں کی
بے پایاں ناقص کارگزاری کا یہی حال رہا تو ۲۰۰۰ء
تک یہ تعداد بے پناہ طور پر بڑھ جائے گی۔ سرمایے
کی ٹھوس ترتیب اور معاشرتی توفیر کے مسلسل فروغ
کی عدم موجودگی میں مکمل روزگار کے مقصود کی تکمیل
کے لیے ۲۵۰ ہزار کروڑ روپیوں کی سرمایہ کاری کو
جٹا پانا ناممکن ہو جائے گا۔ سرکاری اداروں کے
کارگزاری امکانات کو از سر نو تشکیل اور مربوط کرنے
کے لیے متعدد دیگر امور مثلاً ترقیات کی نہج، پیداوار
کی شعبہ جاتی اور بین صنعتی ترتیب، پیداواری
اکائیوں کی جسامت، ٹیکنالوجیکل درجہ افزائی، رفتہ
رفتہ متروک ہوتا، دیسی ٹیکنالوجیکل تخلیقیت، معاشی
سرگرمیوں کے لیے تعین مقام کا ڈھب نیز فیصلہ لینے
والوں اور منتظموں کو تحریک دلانے کی طاقت اور
البتہ قوت ارادی کو بھی شمار میں لانا ہوگا۔

معاشی ترقیات کے فروغ کے خاص ذمہ دار،
سرکاری ادارے ذرہ بھر ۳ فیصد سے زائد شرح نمو
نہیں دے پائے، نیز لاکھوں اشخاص کی بڑھتی ہوئی
آبادی کو روزگار مہیا کرنے میں از حد ناکافی ثابت
ہوں گے اور یہی حال ان کا زراعت کو بسرعت جدید
بنانے کے لیے لاگتی اشیاء اور شہری اور دیہی محنت
کش قوت کو مزدوری کے بدلے میں اشیاء مہیا کرنے
نیز متوازن علاقائی ترقیات کو عمل میں لانے کے تعلق
سے ہوگا۔ تجویز ہے کہ آئندہ ۲۰ برسوں میں زیادہ
سے زیادہ ۱۵۰ ملین روزگار کے مواقع پیدا کرنے



ہی پڑیں گے اور اس مقصود کو پانے کے ۳ فیصد شرح نمو بُری طرح ناکافی رہے گی۔ ۱۰ر۵ فیصد کی اونچی شرح نمو پر بھی سنہ۲۰۰۰ء تک ۹۶ر۶۴ ملین صنعتی کام کے مواقع پیدا کرنا ناممکن ہوگا۔ تقریباً گذشتہ ۲۵ برسوں میں سرکاری اداروں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ تاہم سرکاری دائرہ کار نے زیادہ تر کفالت اور اونچے منافعوں کے ضمن میں قوت عمل اور انتظامی بصیرت کے فقدان کا مظاہرہ کیا ہے۔ بڑھتے ہوئے گھاٹوں کا قصہ واقعی افسوسناک ہے۔ ٹھیک ۱۹۷۷-۷۸ سے لے کر ۱۹۸۰-۸۱ء تک مسلسل ٹوٹے کا مورد ہونے کے بعد سرکاری دائرہ کار میں ابھی حال ہی میں کچھ منافع ہوا ہے۔ صرف ۱۹۸۴-۸۵ء کے دوران سرکاری دائرہ کار نجی دائرہ کار سے پہلے تحویل میں لے لی گئی اکائیوں کے خالص ۴۳۶ر۹۲ کروڑ روپیوں کے خسارے کو وضع کرنے کے بعد کل ۹۲۸ر۵۷ کروڑ روپے کا خالص منافع دکھا پایا ہے۔ چھٹے منصوبے کی مدت کے دوران' سرکاری دائرہ کار نے اپنے ارتقا کے روشن پہلو کو جاری رکھتے ہوئے اندرونی ذرائع کے تعلق سے ۱۱،۶۵۳ کروڑ روپے پیدا کیے ہیں۔ سرکاری اداروں نے اب ملک کی برآمداتی آمدنی میں اپنا خاصہ حصہ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ ۱۹۸۴-۸۵ کے دوران سرکاری اداروں کی طرف سے کی گئی سامان اور خدمات کی برآمدات سے ۵۸۲۷ کروڑ روپے کے بقدر زرمبادلہ کمایا گیا۔ اپنی موجودہ ساخت کے اعتبار سے تعریفاً ملی جلی معیشت کے چوکھٹے کے اندر کام کرنے والے سرکاری اداروں کو لازماً ضابطہ پرستی کی سخت گیری برداشت کرنی پڑتی ہے لہٰذا وہ ترقی کے لیے اشد ضروری جوکھوں بھرے کاروبار کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ حقِ ملکیت اور تعلق کے احساس کے بغیر مزدوروں کی اجتماعی آگہی اور سماجی لگاؤ بھی ایسے نہیں کیے جا سکتے، جن میں حصولِ مقصد پر زور دیا گیا ہو۔ وہ خود کو ایسے سرکاری اداروں کے مقصودات سے ہم آہنگ نہیں کرتے۔ ملی جلی معیشت کے ... رنگے چوکھٹے میں کام کرنے والے ان سرکاری اداروں کی تنظیمی بے ربطی اور مزدوروں کی برگشتگی قابلِ لحاظ ہیں اور یہی تھوڑی پیداواریت کے لیے ذمہ دار ہیں۔ ہڑتالیں اور ہر سال کام کے دنوں کا بھاری نقصان بھی اسی لیے ہوتا ہے - بات سال بہ سال بار بار اجاگر کی جاتی رہی ہے کہ کام کاجی ثقافت کو انسانی قدروں سے زیادہ طور پر متصف کیا جانا چاہیے۔ کارخانوں میں لازماً جمہوریت مسلسل استعداد کار محض اونچی ٹیکنالوجی کی لاگت اور سرمایے کی پیداوار کے اوسط کے معاملات نہیں ہیں بلکہ اول چیز انتظامی ثقافت زیادہ انسانی بنانا ہے۔ البتہ آج تک ایسا کوئی اخلاقِ کار نظر نہیں آرہا ہے۔

اس کے علاوہ آج کل جب کہ ٹیکنالوجی بسرعت متروک ہو جاتی ہے۔ اس کی لگاتار بہتری ایک حقیقی ضرورت بن گئی ہے۔ اب ایسا نہیں کیا جا سکتا کہ دہوں میں ایک بار اس کا درجہ بڑھایا جائے۔ تکنیکی اختراعات کچھ اتنی تیزی سے ہو رہی ہیں کہ ان کے ساتھ ہم قدم رہنے کے لیے ہندوستانی صنعتی اداروں کو' خواہ وہ سرکاری زمرے میں ہوں یا نجی زمرے میں' پہلی کوشش کرنی ہوگی اور یہ دقت اور وسائل کے خلاف دوڑ کے مترادف بھی ہوتے جا رہا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ موجودہ پیداواری سہولیات مشنری اور بنیادی ساز و سامان کا ناقص رکھ رکھاؤ ہندوستانی کارخانوں کی بدحالی کا شاید سب سے بڑا سبب ہے۔ سرکاری زمرے میں خاص کر یہی وجہ ہے۔ سرکاری زمرے کے کارخانے صاف طور پر بحرانی حالت سے دوچار ہیں۔ اس گڈمڈ سے انہیں باہر نکالنے کے لیے تشخیص علل کی ضرورت ہے۔

بشمول ممتاز مفکروں اور ایل۔ کے۔ جھا وغیرہ جیسے ممتاز ماہرینِ اقتصادیات کی متعدد تحقیقات عمل میں لائی گئی ہیں۔ ان سبھی تشخیصی تجزیوں سے ظاہر ہوا ہے کہ انتظامی ہنرمندی اور بصیرت کی کمی یا بیشی، کارگزاری کے تعین کے لیے نہایت اہم عوامل ہیں' تاہم سرکاری دائرہ کار میں اور بھی کتنی اندرونی اور بیرونی ساختی خامیاں موجود ہیں' جو اس کی کارگزاری کو بُری طرح متاثر کرتی ہیں۔ لازم ہے کہ ان اداروں کو کام کرنے کی کھلی چھوٹ دی جائے اور حاصل شدہ نتائج کے لیے انہیں جوابدہ بنایا جا سکے۔ ان کی ذمہ داری محض وزارتوں اور محکموں کے عارضی احکام اور ضابطوں کی بے سوچی سمجھی تعمیل نہیں ہونی چاہیے۔ ۱۹۵۶ء کے انڈسٹریل پالیسی ریزولیوشن میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ سرکاری دائرہ کار کو لازماً کاروباری قوتِ عمل اور تخلیقی اسراوب کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اسی امر کا ادعا کیا گیا تھا کہ ان اداروں کی کامیابی کے لیے فوری فیصلے اور ذمہ داری اوڑھنے کی خواہش بے حد ضروری ہیں اس کے لیے جہاں کہیں ممکن ہو اختیار کی مرکزیت کو توڑ دینا چاہیے اور ان کا انتظام و انصرام کاروباری خطوط پر کیا جانا چاہیے۔ سرکاری اداروں کے بارے میں کوئی رائے ان کے مجموعی نتائج کی بنا پر ہی قائم کی زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے۔ انہی ملفوظات کی بدولت سرکاری اداروں کو ریلوے جیسے محکمہ جاتی اداروں کی سی ہیئت کی بجائے اجتماعیہ ہیئت دی گئی تھی۔ بدقسمتی سے تخلیقیت اور پیداواریت کے لیے لابدی' انتظام خود مختاری کی بجائے سرکاری دائرہ کار کا انتظامیہ متعلقہ محکموں کی ڈھیروں معاملوں میں منظوری کی ضرورت جیسی ضابطوں کی سخت گیری کی دلدل میں پھنس گیا ہے۔ سرکاری دائرہ کو لگی بڑی بیماریوں میں ایک یہ ہے۔ ہندوستان مشین ٹولز اور لاہا مودر ویلی کارپوریشن کی کارگزاریوں نے ثابت کر دیا ہے کہ سرکاری زمرے کے کارخانوں کے عمدہ نظم و نسق سے زمین آسمان کا فرق پڑتا ہے۔ سرکاری دائرہ کار کی اکائیوں مثلاً بستیوں' اسپتالوں اور بجلی پانی کی فراہمی کے بنیادی ڈھانچوں نیز سودا سلف خریدنے کے لیے مارکیٹوں وغیرہ کی تعمیر کے متعلقہ اخراجات میں بھاری سرمایہ کاری کے باعث اونچی پونجی لاگت جیسی ساختی خامیوں کی وسیع حکمرانی تاہم ایک مستقل رکاوٹ کا کام کرتی ہے۔ لہٰذا کم خود کفالتی سرکاری دائرہ کار کی صنعتوں کی قدرتی خصوصیت ہو کر رہ جاتی ہے۔ معاشرتی فلسفہ بھی اسے زندہ رکھنے میں مدد کرتا ہے۔

اس کے علاوہ سرکاری دائرہ کار میں صنعتی پراجیکٹوں کی تکمیل میں' مشنری اور دیگر ساز و سامان کے حصول کے ضمن میں بھی اکثر بے حد تاخیر ہو جاتی ہے بعض اوقات کوالٹی کے لحاظ سے بھی یہ گھٹیا ہوتے ہیں۔ اس کے نتائج ہمیشہ پونجی لاگت میں اضافے کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اگرچہ یہ منطقی طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ سرکاری دائرہ کار میں اصل سے زیادہ تشخیص قیمت اور کافی اونچی لاگتوں کا باعث اس کے روزگار پیدا کرنے والے مساواتی رول ہیں جو آگے چل کر گھٹیا پیداواریت کا موجب بنتا ہے' تاہم یہ بھی سچ ہے کہ سرکاری دائرہ کار کو ایک اشتراکی طرز کے معاشرے کے قیام کے لیے تبدیلی لانے والے ذریعے کے خالق کا کردار بھی ادا کرنا ہے۔ پس سماجی کایا پلٹ اور زیادہ تر اقتصادی خود کفالتی کو آپس میں استحکام کرنے کے بلند تر کام کی تکمیل بھی سرکاری دائرہ کار کے لیے ایک بہت بڑی للکار ہے۔ سرکاری دائرہ کار میں کام کرنے والی صنعتوں کا نظم و نسق' جسے بڑی حالتوں میں غیر فوجی حکام چلاتے ہیں' توقعات سے بہت ہی کم رہا ہے دراصل ناقص انتظامی ہنرمندیاں و بصیرت' معقول ٹکنالوجیکل شعور کا فقدان' تنازعات کو حل کر پانے کی صلاحیت کی کمی اور سب سے زیادہ مسٹر دانتے والا کے بیان کے مطابق "عمرانی تخیل" کا نہ ہونا پہلے ہی پیمانے

پبلک انٹرپرائزز کے ایک تخمینے کے بموجب صنعتی اداروں کے قیام کے تعلق سے پراجیکٹوں کی منصوبہ کاری اور ان پر عمل درآمد کو اس لیے نقصان پہنچتا ہے، کیونکہ ایک کارخانہ لگانے میں لگ بھگ اسے ۴½ سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ باریک سے باریک سطح تک کی منصوبہ کاری کے فقدان کے نتیجے میں پھر اس کی پوری صلاحیت کا بھرپور استعمال نہیں ہوتا۔ یہ بھی عام ہے کہ مشینری اور دیگر سازوسامان کے علاوہ، خریدا ہوا خام مال بھی گھٹیا کوالٹی کا ہوتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ عملہ نیز بڑھایا چڑھایا ہوا انتظامیہ بھی سرکاری زمرے کے کارخانوں کا دوسرا بڑا عیب ہیں۔ فضول خرچی کی عادات اور ناقص رکھ رکھاؤ، نظم ونسق ایک اور بڑی رکاوٹ ہیں۔ قیمت لگانے کی ناقص حکمت عملیوں اور کم تر عملی وانتظامی صلاحیت کے باعث سرکاری دائرہ کار کی صنعتیں قابل رحم حالت میں ہیں۔ سنگین مقابلہ آرائی سے ناموزونیت اور عالمی رجحانات سے عام عدم واقفیت کے باعث سرکاری دائرہ کار کی صنعتوں کو معقول حکمت عملیوں، فیصلے اور باخبر نظم ونسق، مزدوروں کی اعلیٰ درجے کی شرکت، تیز روشن خیال مزدور۔ انتظامیہ روابط سے پیدا ہونے والی معنوی اعانت کی بری طرح ضرورت ہے۔ عظیم للکار کا سامنا کرنے کے لیے نظم ونسق کو کمر کسنا ہوگی۔ پیداوار کی قدر وقیمت، فروخت، کل منافعوں، منافعوں کا معقول استعمال، خالص اور کل منافعے، کمپنیوں کے منافعے، محفوظ کیے ہوئے منافعے، کل مقررہ مدتی اثاثے، خالص مقررہ مدتی اثاثے، املاک کی فہرستوں کی سطح، چالو کام اور تیار مصنوعات، کل پونجی بناوٹ، مجموعی اثاثہ بناوٹ، بیرونی وسائل وغیرہ جیسے اہم غیر مستقل عوامل میں تخلیقی ربط کے حصول کے امکانات میں تیز تر بصیرت سے انہیں لیس کرنا ضروری ہے۔

ایک ماہر کے بموجب سرکاری ونجی دائرہ کار کی ہندوستانی صنعتوں کی ناقص کوالٹی اور زیادہ لاگت کی بڑی وجوہات ضمناً ناموزوں سازوسامان کا حصول، ناقص آلات کا استعمال، دیسی معیشت کی ناقص جانکاری اور رکھ رکھاؤ کا ناقص نظم ونسق وغیرہ ہیں۔

چنانچہ ان مسائل کے تئیں نظم ونسق کو فقط [illegible] صحیح طور پر پابند کرنے کا عمل ہی، جس میں کوالٹی [illegible] حاصل کرنے کے لیے ایک [illegible] کا سوال [illegible] تیز قدم نشوونما [illegible] سکتا ہے۔

# تبصرہ

تناظر: کالی داس گپتا رضا نمبر
مدیر: بلراج ورما
ناشر: تناظر پبلی کیشنز۔ ۲۴-ڈی، پاکٹ: ۳، میور وہار، دہلی ۱۱۰۰۹۱
صفحات: ۲۰۴۔ قیمت: سو روپے

تناظر کے عجیب وغریب جریدے کا سلسلہ جو جناب بلراج ورما کی سربراہی میں پٹنا اور دہلی کے حلقۂ احباب نے ۱۹۷۷ء میں شروع کیا تھا، آج بھی جاری وساری ہے۔ وقت کے اعتبار سے اس جریدے کی اشاعت میں بے قاعدگی کا کفارہ ان تحریروں کی ضخامت، ماہیت اور بے پناہ جاذبیت سے ہو جاتا ہے جنھیں اس کے "PRIME MOVER" جناب بلراج ورما ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں اور انھیں عملی جامہ پہناتے ہیں۔ تناظر کی اشاعت ان کے لیے استاد ذوق کے مصرع:- "چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی" کے مصداق ہے اور جب بے قاعدگی کی خلیج ناگزیر کے کنارے تک سے جاتے ہیں تو ان کی اولی جولانی غالب کے اس مصرع کے مصداق ہوتی ہے:-

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

زیر نظر پیش کش بلراج ورما صاحب کے اشاعتی اجتہاد، نظریاتی وسعتوں اور ادبی صلاحیتوں کے منظرنامے کی صورت میں صرف جناب کالیداس گپتا رضا کے فن اور شخصیت پر ایک عصری اور دبیز دستاویز ہے۔ اس کی ترتیب وتہذیب، جمالیاتی خدوخال اور ان کے اوراق میں ایک واحد ادبی شخصیت کی بے پناہ تخلیقی وتحریری کائنات کی تلاش وتعارف کا سلسلہ خلوص واحترام کے ساتھ دیکھنے کی شے ہے۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

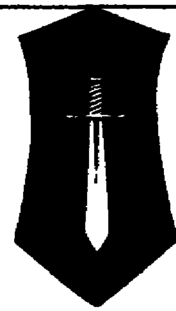
رضا صاحب کم سے کم ۱۸ طبع زاد تصنیفات اور تحقیقی تالیفات سے منسوب ہیں۔ بطور شاعر ان کی دنیائے تخلیق غزل، نظم، رباعی اور قطعات پر مشتمل ہے۔ ان کا شعری وجدان روایات کے سانچے میں ڈھل کر بھی عصری رجحانات کے رنگ وآہنگ میں ڈوبا ہوا ہے جس سے تنوع کی شعاعیں پھوٹتی ہوئی محسوس کی جاسکتی ہیں۔ ان کی شعری کاوشوں میں ایک VERSATILE GENIUS کے معیار ووقار کے خدوخال خاصے نمایاں ہیں۔ اس جریدے میں شامل ان کے شعری فن پارے انتخاب کی حیثیت سے سارے قابل مطالعہ ہیں۔

شاعری کے بعد رضا صاحب کا مرغوب شعبہ تحقیق ہے جو کسی ادارہ جاتی پلیٹ فارم پر نہیں بلکہ ایک صاحب ذوق، اہلیت کے منچلے اور وساطت کے قدر شناس قلمکار کے شرب مدام کا پائیدار سلسلہ ہے۔ غالب پر ان کی تحقیق شاید مالک رام صاحب کی کاوشوں پر بھی سبقت لے گئی ہے۔ انھوں نے "متعلقات غالب" اور "غالبیات چند عنوانات" میں غالب پر ماضی کے وہ گوشے کھنگالے ہیں جو ابھی تک پردہ راز میں آنکھوں سے اوجھل تھے۔ چکبست اور جوش ملسیانی حضرات پر ان کی تحقیق اپنا جواب آپ ہے۔

تناظر کے اس شمارے میں ہندوپاک کے ممتاز ادیبوں نقادوں اور دیگر ارباب خلوص کے مقالات رضا صاحب کے فن اور شخصیت پر گراں قدر ارشادات ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، ڈاکٹر گیان چند جین، عالی، مالک رام، حمیرہ خاتون، قاضی عبدالودود، اے بی اشرف کی تحریریں خاصی توجہ کی دعوت دیتی ہیں۔ تناظر کا یہ شمارہ جناب کالی داس گپتا رضا کے فن اور شخصیت کے کن کن گوشوں پر تفصیلی واجبات پیش کرتا ہے، اور کن پہلوؤں سے بچ کر نکل گیا ہے۔ اس کا اندازہ اس کے مطالعے سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔

اتنی ضخیم اور اس قدر عظیم پیش کش کی قیمت اگر مہنگائی کے اس دور کے مطابق ہے تو یہ پہلو قاری کے لیے باعث تشویش نہیں ہونا چاہیے۔

ویلونندر اسٹر

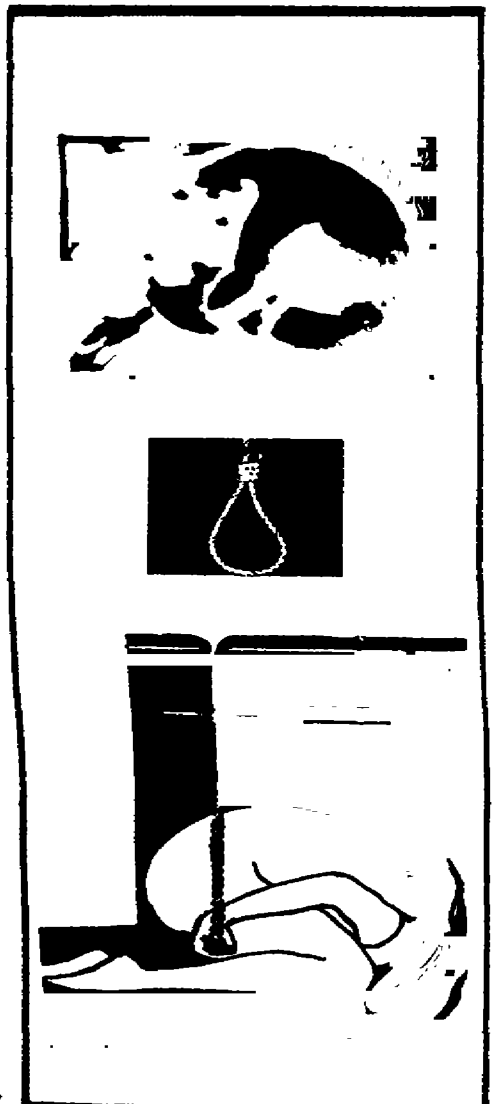


## خودکشی

# باعزت مرنے کا حق

۱۹۸۰ء میں پونہ کے ایک معروف سماجی کارکن گوپال شورام منڈلیک نے زہر کھا کر خودکشی کرلی۔ یہ زہر اسے اس کے ایک دوست نے بھیجا تھا۔ اپنے پیچھے چھوڑے ایک رقعے میں مرحوم نے تحریر کر رکھا تھا: "گذشتہ ڈھائی برس سے میری یہ کوشش رہی ہے کہ گورنمنٹ ایک ایسا ایکٹ پاس کرے جس کی رُو سے جسمانی اور روحانی اذیت میں زندگی گزارنے کے بجائے ایک شخص کو جب چاہے عزت سے اپنی جان لینے کی اجازت ہو۔ میں نے اس ضمن میں کئی رجسٹری شدہ خطوط مختلف سرکاری ذمہ داران، بشمول وزیر اعظم، کو لکھے، مگر عوام کی خدمت سے انہیں فرصت ہی کہاں کہ میرے خطوں کا جواب دیتے۔"
مرحوم منڈلیک نے جو کچھ کیا وہ سہل اور بے ایذا موت کو قانوناً جائز ٹھہرائے جانے کے حق میں ایک قربانی کے مترادف تھا۔ اسے اس بات کا افسوس رہا کہ اس کی آنکھیں اور گردے، جنھیں وہ انسانیت کے ناطے بعد از مرگ کسی حاجت مند کے لیے عطا کرنا چاہتا تھا، خودکشی کی صورت میں اس کام نہ آسکے۔

عزت کے ساتھ مرنے کا حق حاصل کرنے کے لیے ایک انجمن ۲۹۔ مئی ۱۹۸۱ء کو تشکیل کی گئی جس نے بمبئی میں ۱۹۸۳ء کے دوران ایک سیمینار منعقد کیا، جس کا موضوع تھا "رضا کارانہ طور پر سہل اور بے ایذا موت مرنے کی حدود اور اس کا مفہوم۔" اس سیمینار میں مذکورہ انجمن کی طرف سے دو ڈرافٹ بلوں پر بحث و مباحثہ ہوا۔ پہلے بل میں دفعہ ۳۰۹ کو جس کی رُو سے اقدام خودکشی تعزیری جرم قرار پاتا ہے ضابطۂ تعزیراتِ ہند سے خارج کرنے کی مانگ کی گئی تھی۔ ۱۹۶۱ء میں ایک اسی نوع کی دفعہ کو برطانیہ میں خارج کیا گیا تھا۔ دوسرا بل ان ڈاکٹروں اور سرجنوں کے تحفظ کے لیے تھا جو ایک ایسے مریض کی خواہش کے احترام میں، جس کے بچنے کی کوئی امید نہ ہو، اس کا دوا دارو ترک کر دیں۔



ریاستہائے متحدہ کی سات سے زائد ریاستوں میں ایسا قانون پہلے ہی موجود تھا اور جمہوری دنیا کے ایک بڑے حصے میں یہ رائج ہے۔

ہندوستان میں پروفیسر سدانند وردے (ایم۔ ایل۔ اے) نے ایک بل کچھ عرصہ پہلے مہاراشٹر قانون ساز اسمبلی میں پیش کیا، جس کا مقصد مہلک امراض کے شکار مریضوں کے معالجوں اور سرجنوں کو دیوانی اور فوجداری مامونیت دلوانا تھا جو محض ان کی سانسیں جاری رکھنے کی بجائے ان کا دوا دارو بند کر دیں۔ اس بل کی نمایاں خصوصیات بیان کرتے وقت پروفیسر وردے نے کہا کہ اس سے قبل معالج اور سرجن کسی ایسے مریض کو برائے نام زندہ رکھنے کا علاج معالجہ ترک کریں، ایک مجاز مشیر خودمختارانہ طور پر اس امر کی توثیق کرے گا کہ مرض کی نوعیت مہلک ہے۔ کوئی شخص جو بے کار زندگی جینا نہ چاہتا ہو، اسے آنکھوں کا عطیہ کرنے والے شخص کی مانند اس مقصد کے لیے ایک پیشگی تحریری اقرارنامہ اور مختارنامہ داخل کرنے ہوں گے۔ اگر ایسے مختارنامے کو متعلقہ شخص کسی وقت تحریراً منسوخ کر دے تو وہ نافذالعمل نہیں ہوگا۔ اسی نوع کا ایک اور بل تیرہ سال پہلے راجستھان سے کانگرس (آئی) کے رکن پارلیمنٹ، مول چند ڈاگا نے بھی لوک سبھا میں پیش کیا تھا۔

اگرچہ ان بلوں پر ابھی بحث ہونا تھی، بمبئی ہائیکورٹ نے ریاست مہاراشٹر بنام ماروتی شری پتی ڈوبل نامی مقدمے میں ۲۵ ستمبر ۱۹۸۶ء کو اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ضابطۂ تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۰۹ کو آئین ہند کی دفعات ۱۹ اور ۲۱ کے تعلق سے خارج از اختیار ٹھہراتے ہوئے کالعدم قرار کر دیا۔ جسٹس ساونت اور جسٹس کو تھے۔ پاٹل کی رائے میں "دستور ہند کی دفعہ ۲۱ کی رُو سے تسلیم کیے گئے 'جینے کے حق' میں نہ جینے کا حق بھی شامل ہے۔ اسے مثبت انداز میں بیان کرتے

ہوسکے چرانہ جیسے جیسی مرنے یا اپنی زندگی ختم کرنے کا حق شامل ہے۔ بیماری، بے رحم یا ناقابلِ برداشت حالاتِ زندگی، احساسِ ندامت یا زندگی سے بیزاری جیسے انھوں نے متعدد حالات گنوائے جن میں لوگ اپنی زندگی ختم کرنے کی خواہش ظاہر کرسکتے ہیں۔ وہ اس امر کے قائل تھے کہ ہر ایک شخص کو جب چاہے وہ اپنی زندگی سے پیچھا چھڑانے کی آزادی ہونی چاہیے۔ "ستی" اور "جوہر" کے حوالے سے انھوں نے جیتنے طور پر کہا، خودکشی یا اس کی کوشش کبھی قابلِ تحقیر یا مذمت نہیں رہی اگر زندگی فی نفسہ قابلِ احترام تصور کی جاتی تو ایسا نہ ہوتا۔ یہ تو اس کے خاتمہ کا سبب یا وہ حالات ہوتے ہیں جن میں اسے ختم کیا جاتا ہے، جو اس کے تئیں سماج کے رویے کا تعین کرتے ہیں۔

ستی کے انسداد کے لیے انگریزوں کے تعزیراتِ ہند میں دفعہ ۳۰۶ کا اضافہ کیا خواہ یہ خودسوزی کی کوشش اپنی مرضی سے ہو یا کسی دوسرے کے دباؤ میں آکر، اس اقدام میں ہر اعانت، ہر حال میں قابلِ سزا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں شہادت ایکٹ میں ایک ترمیم کے ذریعہ خودکشی کی ترغیب کے مقدموں میں شہادت کا معیار وسیع بنا دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اب شادی سے سات سال کے اندر کسی عورت کی طرف سے کی جانے والی خودکشی کے معاملے میں یہ ثابت کرنے کا بار کہ اس میں کسی اور کا ہاتھ نہیں ہے، متوفیہ کے شوہر اور اس کے لواحقین پر ڈال دیا گیا ہے ایک سال قبل دہلی ہائیکورٹ کے جسٹس راجندر سچر نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ دہلی کی مختلف عدالتوں میں زیرِ دفعہ ۳۰۹ سبھی زیرِ سماعت مقدمے فوراً ختم کر دیے جائیں ان کی رائے میں، اس دفعہ کے رجسٹر قوانین میں جاری رہنے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا بعد میں ایک انٹرویو کے دوران انھوں نے بتایا کہ اقدامِ خودکشی کے متعدد مقدموں میں انھوں نے یہ پایا کہ ایک مفلس یا ذہنی طور پر بیمار شخص کو پیچ در پیچ اذیت رساں مقدمے کا ہدف بنایا گیا۔ قانون میں ایک بے ضابطگی ہے کہ جو خودکشی کی کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں، وہ فوجداری عدالتوں کے دائرہ اختیار سے خاصے پرے ہو جاتے ہیں لیکن جو ناکام ہو جاتے ہیں ان کو مجرم گردانا جاتا ہے۔

رضاکارانہ سہل اور بے ایذا موت کا نیا تصور اب لگ بھگ آفاقی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو پال ای بروپی، جو کہ نزع کی حالت میں پڑا

مقدمے نے ایک مریض کے عزت سے مرنے کے حق کے تعلق سے قانونی طول و عرض کا امتحان لیا تھا اور وہ بوسٹن میں راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اس کے بعد اسپتال والوں نے اس کو مصنوعی طور پر خوراک نہ پہنچانے کے لیے اس کی بیوی کی درخواست قبول کرلی تھی۔ اسی طرح سیراکوس (نیو یارک) میں ایک کالج کے پچاسی سالہ صدر کو جس نے فاقہ کشی کرکے اپنی جان لینے کی کوشش کی تھی، عدالت العالیہ کے ایک جج نے بری کردیا، نیز اپنی مرضی سے مرنے کا اس کا حق بحال رکھا گیا۔ آچاریہ ونوبا بھاوے نے بھی کوئی دوا یا غذا لینے سے انکار کردیا تھا اور "سمادھی" اختیار کرلی تھی سہل اور بے ایذا موت سے کیا مراد ہے؟ ایک یونانی لفظ سے ماخوذ، اس اصطلاح کا مطلب ہے "ایک عمدہ اور خوشگوار زندگی"۔ اب اس کے "ایک سہل بے ایذا اور باعزت موت" کے معنی لیے جاتے ہیں۔ یونیورسل ویبسٹر ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی "ایک لاعلاج مرض کے شکار مریض کو بے ایذا موت عطا کرنے" کے دیئے گئے ہیں۔ ایک ناقابلِ علاج مرض میں گرفتار جب کوئی برضا و رغبتِ خود پیشہ ورانہ مدد سے موت کو گلے لگائے تو اس کے اس فعل کو "رضاکارانہ سہل اور بے ایذا موت مرنا" کہا جاسکتا ہے لیکن اسے اس ہلاکت کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے، جو کسی مریض کو ازراہِ ترحم عطا کی جاتی ہے کیوں کہ اس میں کئی خامیاں ہوسکتی ہیں۔ رضاکارانہ سہل اور بے ایذا موت کا چلن قدیم زمانے سے رہا ہے سقراط نے اپنی جان لینے کے لیے زہر کا پیالہ پیا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے کیلیفورنیا میں تشکیل کی گئی سے بین الاقوامی انجمن کو ہیملوک (زہر) کا نام دیا گیا ہے۔ جس کے ساتھ دنیا کی دیگر انجمنیں ملحق ہیں۔ رضاکارانہ سہل اور بے ایذا موت کا رواج پہلی صدی ق۔م سے چلا آرہا ہے۔ اس وقت یونانی جزائر کے ضعیف اور ازکار رفتہ لوگ ایک سالانہ تہوار میں اکٹھے ہو کر سم قاتل ملی ایک ایسی خوش ذائقہ شراب پیتے تھے جس سے ان پر ایک بے ایذا موت کی غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ ہندو مت کے فلسفے میں پریوپیش نامی مذہبی قاعدے کی رُو سے رضاکارانہ طور پر اپنی زندگی ختم کرنے کی اجازت ہے۔ موت کے حق سے متعلق ہندوستانی انجمن کے صدر جناب ایس۔ کیا رکی رائے میں رضاکارانہ سہل اور بے ایذا موت کا استحقاق نہ صرف ضعیف اور ازکار رفتہ افراد کو حاصل ہونا

روگیوں کو بھی ملنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں متعدد افراد ایسے ہیں جو امراضِ کہنہ میں مبتلا ہیں اور جن کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے، بہت سے ایسے مریض بھی ہیں جو کئی برسوں سے مسلسل نزع کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں کتنے ہی لوگ جان لیوا امراض کا شکار ہیں اور لگاتار اذیت ناک درد میں تڑپتے رہتے ہیں۔ ایسے لاعلاج جان لیوا اور کربناک مصائب و آلام جھیلنے والوں کے تئیں سماج عوام اور سرکار کے نئے نقطۂ نظر سے غور و خوض کی مانگ کرتا ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ان اذیت کشوں کو عزت اور چین سے مرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ ایسی موت جس سے پہلے ایک طویل مدت تک شدید درد سے تڑپتے رہنا پڑے، یا نزع کا عالم طاری رہے یا پھر ایک جان لیوا مرض کا مسلسل عذاب اٹھانا پڑے، ایک باعزت موت نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک ذلت آمیز انجام کے مترادف ہوتی ہے۔

جب ایک ختم کر دینے والی بیماری کے ۸۷ سالہ مریض علی کاہن کو نیو یارک کے ایک اسپتال میں داخل کیا گیا تو اس نے اپنی حالت ان الفاظ میں بیان کی، "انجن ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ انجینئر اسے چھوڑ دے"۔ لیکن طبی انجینئروں نے اس کی متواتر درخواست کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، اس کا علاج معالجہ جاری رکھا۔ لیکن اس کی حالت بگڑتی ہی گئی اور اسے میکانکی آلۂ تنفس پر رکھنا پڑا۔ اس رات اس کی نیند کھلی اور ہاتھ بڑھا کر آکسیجن پہنچانے والے آلے کا بٹن دبا کر اس نے اپنی جان دیدی۔ لیکن ہوش کھونے سے پہلے اس نے اپنے معالج کے واسطے یہ پیام گھسیٹ لکھا، "ڈاکٹر، موت انسان کی دشمن نہیں، بلکہ بے رحمی اس کی دشمن ہے"۔ اس سانحے کو شہرۂ آفاق ڈاکٹر کرسچین برنارڈ نے اپنی "اچھی زندگی، اچھی موت" نامی کتاب میں نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر برنارڈ نے رضاکارانہ سہل اور بے ایذا موت کی وکالت کی ہے اور اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ خود اس نے ختم کر دینے والے امراض میں مبتلا اپنے مریضوں کو اذیت اور دکھ سے نجات دلانے کی غرض سے اس پر عمل کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ محض "سانس لینا" اہم نہیں ہے، اہم شے تو ایک شخص کی زندگی کی خوبی ہے، جو وہ موت سے پہلے گزارتا ہے۔ ایک نوجوان مفلوج، الزبتھ بویا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جو بھوک سے نجات

ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔ اس کے معاملے میں بحث عام کے باوصف اس نے کہا: "مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے ایک کام سرانجام دیا ہے۔ میں نے اس کام میں بارہ سال لگائے ہیں۔ اور اپنی زندگی کے تعلق سے جو کچھ میں نے کیا ہے، بس کر دیا ہے۔ میری زندگی اب بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔

ڈاکٹر برنا ہوڈ نے اس خیال کی نفی کی ہے کہ ہر معالج کا مقصد موت پر فتح پانا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ڈاکٹروں کو محض سائنسدان نہ ہو کر انسان دوستی پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ جب مریض کے بچنے کی امید نہ ہو تو اس حالت میں انہیں زندگی کو سہارا دینے والی تراکیب اور جدید ٹکنالوجی کے دیگر پہلوؤں کے استعمال سے احتراز کرنا چاہیے اور جب کوئی مریض شدید درد میں مبتلا ہو تو ادویہ کی مدد سے اسے اس سے چھٹکارا دلانا چاہیے، خواہ اس کا مطلب اس کی زندگی کو کم کرنا ہی کیوں نہ ہو۔" ان لوگوں کو بھی، جو "بقراطی عہد" جس کے تحت معالجوں کو ہر اُس فعل کی "مناہی ہے" جو مریض کی جلد تر موت کا باعث بن سکتا ہو، کی آڑ لیتے ہیں، یہ جان لینا چاہیے کہ اب اس عہد کو بھی بڑی وسعت دیدی گئی ہے۔ مغرب کے کئی اداروں نے اس عہد کو غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیا ہے۔ طب میں اخلاقی مسائل پر امریکی صدر کے کمیشن نے طے کیا کہ "افراد سے متعلق فیصلوں میں اولین اہمیت خود مریض کے فعلی اختیار کو دی جانی چاہیے۔" بہرحال یہ زندگی کس کی ہے؟ نامی ڈرامے کا ہیرو کہتا ہے، میری زندہ رہنے کی خواہش کے برخلاف سماج اگر مجھے مار ڈالنا چاہے تو ہولناک ہوگا۔ اسی طرح میری موت کی تمنا کے برخلاف سماج اگر مجھے بقیدِ حیات رکھنا چاہے تو یہ بھی اتنا ہی ہولناک ہوگا۔" درحقیقت کئی بطور ایک انسان مرجانے کو، ایک طبی کارنامے کی بدولت بچ جانے پر ترجیح دیتا ہے۔ (یہ وہی حق ہے جس کا استعمال عالمی شہرت کے مالک مصنف آرتھر کوسلر اور اس کی اہلیہ نے خودکشی کے ارتکاب سے کیا تھا۔ جب ایگزٹ (۵۰ سال پرانی انجمن والینٹری یوتھینیا سوسائٹی آف برٹن کا نیا نام) نام کی ایک برطانوی تنظیم نے اپنی اس "راہنمائے نجات نفسی" عنوان کی کتاب کی اشاعت کا اعلان کیا، جس میں خودکشی کرنے کے تعلق سے تفصیلات بیان کی گئی ہیں تو اس کی رکنیت اچھال کھا کر ...۹ تک پہنچ گئی ہے۔ ایگزٹ کے اعلیٰ ترین عہدے دار نکولاس جیمز ریڈ کو چار بیمار اور مایوس افراد کو خودکشی کی ترغیب دینے یا دانش میں ڈھائی سال کے لیے جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہوا کہ ایگزٹ نے اس کتاب کے بیجا استعمال کے خلاف سبھی احتیاطی تدارکات کر لیے تھے اور اس کے حصول کے لیے تفصیلی شرائط عائد کر دی تھیں۔

رضاکارانہ سہل اور بے ایذا موت کے حق کے خلاف متعدد آوازیں اٹھائی گئی ہیں۔ وجہ یہ دی گئی ہے کہ زندگی خدا کی دین ہے، لہٰذا فقط اس کی ذات ہی اسے واپس لے سکتی ہے، تب دق جیسی لاعلاج امراض اب قابلِ علاج ہیں۔ بے ایمان لوگ اپنے ضعیف اور بیمار لواحقین کو جان سے مار سکتے ہیں۔ اس لیے اس ضمن میں زیرِ غور کسی بھی قانون کے غیاضانہ دفعات کے غلط استعمال کے خلاف خبرگیری کرنا ہوگی۔

باعزت موت مرنے کے حق کے لیے بنائی گئی انجمن کے چیئرمین اور عالمی فیڈریشن کے صدر میتو سالی نے اس انجمن کے اغراض و مقاصد کی صراحت یوں کی ہے: "ہر سلیم الذہن مرد اور خاتون کا قانونی شرائط کے دائرے میں رہ کر موت یا زلیست کا انتخاب کرنے کے اپنے حق پر اصرار۔"

## کالی داس گپتا رضا

عجب گم ہو گیا ہوں زندگی میں
کہاں ہوں میں خودی یا بے خودی میں
اضافہ ہو گیا ہے دیکھ کتنا
مرے اشکوں سے تیری دلکشی میں
مجھے آہستہ سے آواز دینا
کہیں چونکا نہ دینا خامشی میں
چمن نے تو ہزاروں گل کھلائے
ہمیں مرجھا گئے اس تازگی میں
مرا بچپن، مری خوشیاں، مرے خواب
دھواں سی کچھ لکیریں روشنی میں
خزاں کے ڈر سے برگ و بار لرزاں
وہ جی رہنے کی خواہش تھرتھری میں
رضا کا بھی ٹھکانا ہے وہیں اب
[illegible]

جل کے صحرا جب دھواں دینے لگا
دل نویدِ کارواں دینے لگا
عدلِ قاتل، منصفیٔ خنجر بکف
ملزمِ ہستی بیاں دینے لگا
جب بگولے نقشِ پا بھی لے اڑے
خارِ خوں خوردہ نشاں دینے لگا
لذتِ عصیاں کہ بج اٹھے ہیں سنکھ
اور موذن بھی اذاں دینے لگا
کوئی کہہ بیٹھا حدیثِ زندگی
اک دیا بجھ کر دھواں دینے لگا
اک دھندلکا، اک فسانہ، ایک خواب
ہائے میں کس شے پہ جاں دینے لگا
اے رضا پاتے ہی خرقہ فقر کا
دل حرر دیرنا ادینے لگا

دل نے جس شے کو بہ ہر رنگ جواں دیکھا ہے
زندگی نے اسے بے تاب و تواں دیکھا ہے
کرتے دیکھا ہے خدا والوں کو گنگا اشنان
اہلِ ناقوس کو سرمستِ اذاں دیکھا ہے
کبھی تائیدِ خزاں سے ہوئی تائید بہار
ردِ خنداں میں کبھی ردِ فغاں دیکھا ہے
مل رہی ہے مرے افکار کو پرواز نئی
دوشِ افلاک پہ اک تختِ رواں دیکھا ہے
شیشۂ دل لیے گھومے، کوئی پتھر نہ گرا
تجھ کو ارزانیٔ غم! آج گراں دیکھا ہے
کون لذتِ غمِ نوخیز کی جانے جز خار
جس نے کونپل کے ابھرنے کا سماں دیکھا ہے
جس کو کہتے ہیں رضا ایسا پرانا وہ نہیں
اپنے بچپن میں اسے ہم نے جواں دیکھا ہے

رام پرکاش راہی



## یادِ آزاد

# بے در و دیوار

لال قلعہ سے اُدھر کچھ دُور مغرب کی طرف
الغرض طنّاز میناروں سے محرابوں سے دور
مسجدِ جامع کے اقدس آستانے کے قریب
وسطِ دِلّی کے قدیمی منظروں پر خندہ زن
اک نشیب قبر پہ ڈالے ردائے امتیاز
مختصر چھتری کا سایہ کروٹیں لیتا ہُوا

●

خامشی کا اک جزیرہ شور و غل کے بحر میں
حاشیوں کے ضبط میں اک سادگی کا آئینہ
سیڑھیوں سے سیڑھیوں تک سرخ جادوں کا محیط
پھر گل و سبزہ بہ اندازِ تکلف در کنار
ایک خاکی جسم کا دارالاماں، دارالقرار
بے در و دیوار سا، یہ گھر ہے کس کی یادگار

●

دھوپ چھاؤں سے، گھٹاؤں سے سراسر بے نیاز
دامنِ فطرت کی رنگینی کا رس پیتا ہُوا
اس شہنشاہِ خموشاں کا حسین و سادہ مزار
مستقل مأویٰ اسی کا ہے یہی آزاد کا
جس کی تحریروں نے تقریروں نے تھرّا دیا
سامراجی تخت کا ڈھانچہ، حکومت کا وجود

جنگ آزادی کا اک سچا مجاہد کامیاب
نفسیاتِ ملک و ملت کا خطیبِ باریاب
فقرِ مشرق، فکرِ مشرق کا نقیبِ لاجواب
ذہنِ کامل سے اُبھرتا حرفِ تفسیرِ کتاب

●

وہ لسان القوم اک جادو بیاں، جادو نگار
تھا ہر اک شہکار اس کا انفرادی یادگار
الہلال البلاغ کا حسین آئینہ دار
نقشِ لافانی "غبارِ خاطرِ" زار و نزار

●

وہ فراست، وہ سیاست، وہ قیادت اب کہاں
وہ ظرافت، وہ عقیدت، وہ عبادت اب کہاں
وہ محبت، وہ اخوت، وہ نفاست اب کہاں
وہ اشارت، وہ ارادت، وہ جسارت اب کہاں

●

معمورۂ ہستی کی ہر تفسیر کا حاصل سہی یہ
اس امام الہند کی تقریر کا حاصل سہی یہ
سرگزشتِ اہلِ دل کی ہے یہی اک ترجمانی
جیتے جی آزاد تھا وہ مر کے بھی آزاد ہے



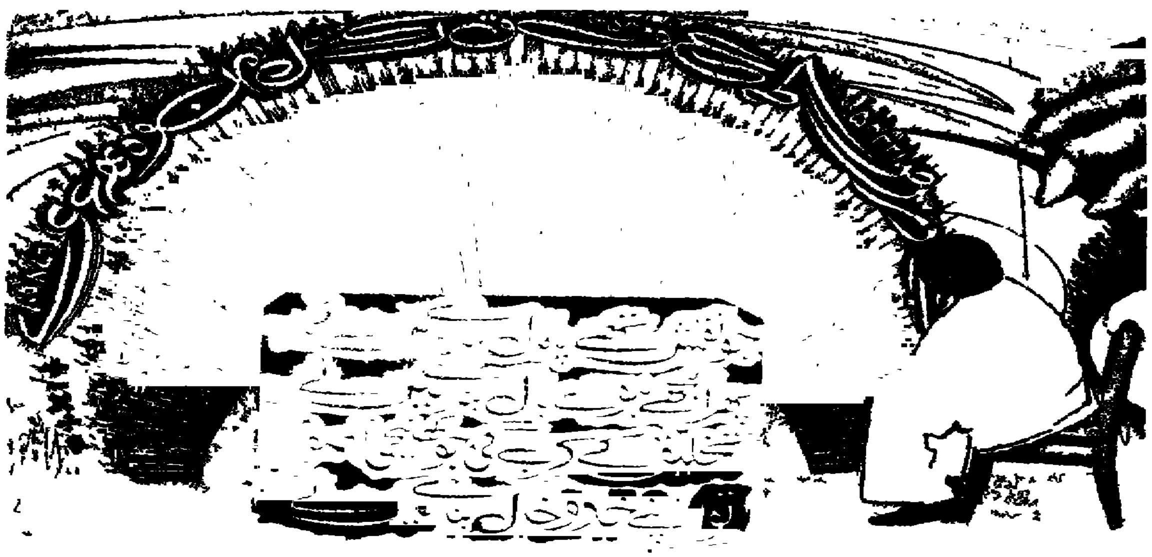
## جلال و جمال کا پیکر

# صادقین : ایک قلندر

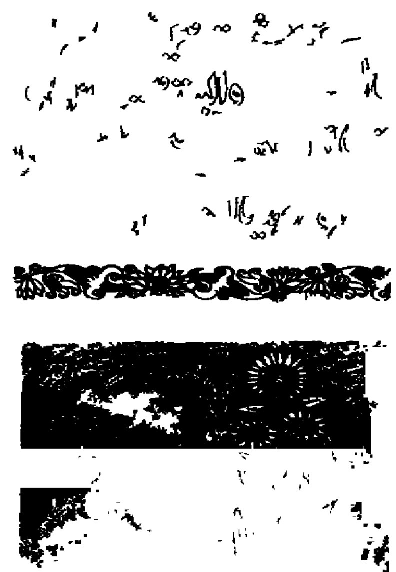
صادقین کے نام سے ادب اور آرٹ کی ساری دنیا واقف ہے اگر یورپ انھیں ایک بڑے مصوّر کے طور پر جانتا ہے تو عرب ممالک ایک بہت بڑے مصوّر اور خطاط کے طور پر۔ برصغیر میں صادقین ایک عظیم مصوّر، ایک بے مثال خطاط اور رباعی گو شاعر کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔

رباعی گوئی اردو شاعری میں نسبتاً مشکل صنف سخن مانی جاتی ہے۔ خطاطی (خصوصاً جس قسم کی صادقین کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے) بھی کوئی ایسی سہل شے نہیں۔ نقاشی اور مصوری تو ظاہر ہے کہ محنت اور ریاضت کے بغیر اپنے معراج کمال تک کبھی بھی نہیں پہونچتیں

چاہیں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
ش کے ہوتا قفس کا در کھلا



صادقین کی وفات [illegible] آرٹ کی دنیا کا ایک ایسا المیہ
ہے جس کی کسک [illegible] باقی رہے گی۔



ب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
ک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

اودی جیت پاٹھک

# عالمی نظریات اور دانشور

دانشوروں پر بحث مباحثہ کرنا ایک اعلیٰ پائے کی بات ہوتی ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں مقدم اور افضل فرض کر لیے جانے والے دانشور، عقلمند، حساس اور اضطراری قسم کے لوگوں کا ایسا گروہ ہوتا ہے، جس کی اولین ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ عوام کو "روشن خیال" بنایا جائے۔ یہ قریب قریب اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ "باضمیر بنانے والے" دانشور اوصاف کے اعتبار سے باقیماندہ معاشرے سے الگ قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ روز بروز کی دنیاوی سیاست ان کے شعور کو شاذ ہی بدل پاتی ہے!

اسے یہ زعم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ جانتا ہے۔ یہ اس کا المیہ ہے۔ وہ یہ تو کبھی محسوس ہی نہیں کرتا کہ وہ بھی اسی معاشرے ہی کا ایک رکن ہے جنہیں وہ "درس دینا اور روشن خیال بنانا" چاہتا ہے، خود کو انہی سے جدا مانتا ہے۔ ایسے میں یہی کافی ہے کہ وہ مار دھاڑ اور افراتفری مچانے والا ایک دہشت گرد نہیں ہے۔ لیکن پھر وہ ایک ایسی گداز دل ماں کی طرح بھی تو نہیں ہے جو اپنی دنیا کے تئیں اخلاقی اور جذباتی ردِعمل کا اظہار کرتی ہے بس یہی چیز اس کا فرق بتاتی ہے۔

کے معمولی اظہارِ خیال کو بھی اہمیت نہیں دیتی تاکہ بے جوڑ اقتداری رابطے ہوتے ہیں لہٰذا بات یہ کہ غالب آدرشوں کی چودھراہٹ کے عقب میں جھانکا جائے اور اس کے متبادل ممکن بنائے جائیں۔

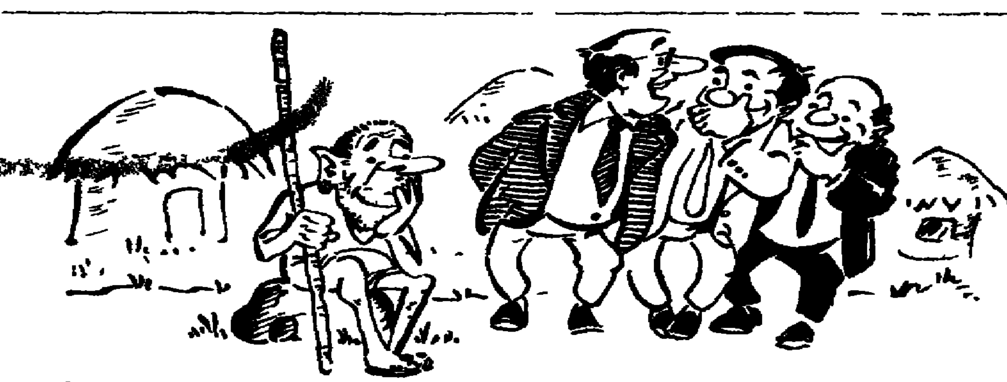
یہ ایک مبارز طلب کام ہے، جسے بالعموم چند اضطراری اشخاص ہی شروع کرتے ہیں جی ہاں، ایسے اشخاص کو دانشور کہہ کر پکارا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک دوسری قسم کے دانشور ہوتے ہیں۔ گرامسی کے الفاظ میں "ایسے لوگ فطری طور پر مظلوموں کے طرفدار ہوتے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ فطری دانشور ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے لیے علم تنہا ایک "غیر عملی علمی تجسس" نہیں ہوتا بلکہ ان کے لیے شدید غم و محن اور کشمکش کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ ایک عالی ظرفانہ خواہش کی تخلیق ایک ایسی خواہش جو ایک ہمدرد اور مساوات پسند معاشرے کو وجود میں لانا چاہتی ہے۔

ایسی صورت حال المناک ہے۔ جی ہاں، افلاس بڑا بے درد ہوتا ہے! ماہرینِ اقتصادیات منصوبہ ساز اور ماہرینِ اعداد و شمار خطِ فاصل کھینچنے کے عادی ہوتے ہیں — وہ خطِ فاصل جو یہ دکھاتا ہے کہ روئے زمین پر ہم میں سے کتنے آفات کے مارے ہیں! لیکن اندر خانے کی بات کون بتائے گا! ناکافی ترقی، ترقی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ نظریہ ہے نوآبادیاتی دنیا کا۔ ایک گورے کے پیش نظر جدیدیت کے نمونے میں تشدد کا استدلال مضمر ہوتا ہے۔ ایک ایسا نمونہ جو گورے اور کالے بالائی طبقوں کو یکساں طور پر حریص اور مقلد بناتا ہے۔ ہاں ممکن ہے کہ نئی ایجاد کردہ ٹیکنالوجی کی بدولت خاص لوگوں کا "معیارِ زندگی" اونچا ہو جائے جیسا کہ ایوان ایلچ جیسے انسان شناسوں کا استدلال ہے، پینے کے صاف پانی سے محروم

یہ ایک طرح کا تشدد ہے — زیادہ لطیف اور خطرناک۔ پہلی بات جو ایک دانشور سیکھتا ہے وہ ذوقِ اتحاد نہیں ہوتا بلکہ پھوٹ اور انتشار کا استدلال ہوتا ہے۔ اس کا علم تعلق اور قرابت کے فن کی نفی کرتا ہے۔ وہ عوام کی قیمت لگا سکتا ہے۔ اس کا طریقِ استدلال، بدلتے ہوئے معاشرے کی منطقی بحثوں کا مطالعہ کرنے میں مؤثر ثابت ہو سکتا ہے اپنے رفتارِ کار کے ساتھ مل کر وہ کچھ اس طرح کے امتیازی مشق کا ذوق بھی خود میں ڈال سکتا ہے کہ "دس ممتاز تاریخ دانوں کی ہندوستانی عوام سے

دانشوری کی منزلیں طے کرنے میں جبر کا عمل دخل دکھائی دیتا ہے جو ایک عام آدمی کے سنہرے سپنوں کو دبا دینے کے مترادف ہے۔ ایسی صورتحال میں جس میں قیاس اور عمل، ہوش اور جوش میں کوئی فطری ربط نہ ہو، دانشور اور عام آدمی کا رشتہ خوشگوار نہیں رہتا۔

یہ شبیہہ — ایک سرد مہر، بے لوث اور لاشخصی فکر کی شبیہہ توڑنا ہوگی۔ اس ریاکاری کو آشکار کرنے کی ضرورت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہم میں سے



"Don't laugh at him! He must be an intellectual, if not crazy."

معاشرے کے ایک بڑے طبقے کو اپاہج اور لاعلم بنائے بغیر اسکولوں، آلات اور مشینوں کو، جو کہ جدیدیت کے لوازمات ہیں، خریدا نہیں جا سکتا۔ ایلیچ کے الفاظ میں جسے پیداوار کے صنعتی انداز کی "بنیادی اجارہ داری" کہا جاتا ہے، وہ جینے کی ان گنت صورتوں کی نفی کرتی ہے۔ مساوات کی بات ناممکن سی ہو جاتی ہے۔ کاریں اور آسائش کے دیگر آلات اگر ہر کسی کے پاس ہو جائیں تو ان کی "وقعت" جاتی رہے گی۔ سچ کڑوا ہوتا ہے اس لیے سچ نہیں بولنا چاہیے۔ اس واہمہ کو زندۂ جاوید بنتے دیجیے۔ راہِ نجات مغرب میں واقع ہے۔ کون نہیں جانتا کہ عصری ہندوستان کے آورش وادیوں میں وی۔ ایس۔ نائپالوں اور نرد چودھریوں کی کمی نہیں ہے۔

اپنے نوآبادیاتی آقاؤں کے عالمی نظریے کو بین الاقوامی نہ بنانا مظلوموں کے لیے واقعی دشوار تھا۔ یہ فاتح اور مفتوح کے درمیان قریب قریب ایک طرح کے باہمی فریب کا عہدنامہ تھا۔ گوروں کی تعقل پسندی ایک آفاقی تعقل پسندی بن گئی۔ اس سے ذرا سا بھی انحراف ایک شخص کو "غیر مہذب" اور "پسماندہ" بنا دے گا۔ لہٰذا اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ کارل مارکس جیسی شخصیت نے بھی ہندوستان پر گوروں کی عملداری کے حق میں کچھ مثبت پہلو گھڑ لیے تھے۔ جی ہاں، ہمیں "مہذب" بنانے کے لیے یہ ضروری تھا!

کیا یہ سچ نہیں کہ ہندوستان کے برہم سادھو سوامی وویکانند بھی اکثر اپنے ہم وطنوں کو گوروں کے "راجسک" (حکومتی) اوصاف اختیار کرنے کا مشورہ دیتے رہتے تھے؟ یا کہ بنکم چندر نے بھی بھگوان کرشن کی نئی توضیح پیش کی تھی؟ اس کی مجروح نفسیات پر بال بھگوان نے نہیں بلکہ کرشن کے ساونت روپ نے اثر ڈالا تھا۔ ایک ممتاز سماجی ماہر نفسیات آشیس نندی نے کافی ذکاوت سے صورت حال کی تشریح کی ہے۔ مغرب ہماری "اصلی دشمن" ہے۔ اپنی ثقافت کو بدلنے کے لیے ہم نے خود کو مغرب میں رہنے والوں کی آنکھوں سے دیکھنا پسند کیا۔ ہو سکتا ہے کہ نندی دوسرے سرے تک بھی چلا جاتا، تاہم یہ ظاہر ہے کہ چند استثنیات کو چھوڑ کر عصری ہندوستان کے دانشوروں نے "تعمیر و ترقی" کی نوآبادیاتی توضیح کو مان لیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جدید ہندوستان کے دانشور اس نمونے کی مثال ہیں، جس کی نمائندگی جواہر لال نہرو [illegible]

کا مطالعہ کیا تھا اور وہ مغرب، وہاں کی تعقل پسندی نیز سائنس اور ٹیکنالوجی میں سرانجام دیے گئے اہلِ مغرب کے کارناموں سے گہرے طور پر متاثر تھے۔ وہ اپنے ملک کو ایک مغربی کی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ایم۔ این۔ رائے کے ادائلی مارکسی نظریے نے اسے مہاتما گاندھی کا کتنا شدید مخالف بنا دیا تھا۔ اس کی رائے میں مہاتما گاندھی متعدد غیر مہذب اور رجعت پسند خیالات کی نمائندگی کرتے تھے۔ مانا کہ اپنے حالیٔ آزادی مارکسزم" کے باوجود نہرو، گاندھی کا پیروکار تھا۔ گاندھی ہی اس کا ضمیر، اس کی دبی گھٹی شخصیت اور اس کی گمشدہ ہندوستانی شناخت تھا تاہم اس کی "ہندوستان کی نو دریافت" تناؤ اور دو رنگی سے پُر تھی۔ نہرو کو علم تھا کہ گاندھی ملک کے درپیش کارِ عظیم میں معاون نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کارِ عظیم جس سے ہندوستان کو ٹیکنالوجی کے اعتبار سے ترقی یافتہ اور سیکولر بنانا تھا محض بکری کا دودھ پینا، چرخہ کاتنا یا رام راج قائم کرنا نہ ہو کر "سائنسی مزاج" اور "منصوبہ بند اقتصادی ترقی" نہرو کے من بھاتے الفاظ تھے۔

ہماری یونیورسٹیوں اور تحقیق لیبارٹریوں میں کام کرنے والے دانشور بھی قریب قریب ویسی ہی بولی بولتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ پر مسلط اور پسندیدہ "سائنسی مزاج" "تعقل پسندی اور سیکولرزم" میں ایک گہرا لطیف عزور مضمر ہوتا ہے۔ "حقیقی آگہی" ان کی اجارہ داری ہوتی ہے اور اس کو اوپر سے ٹھونسنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لوگوں کا کیا ہوا ہر ٹھوس کام ان کے تئیں توہم پرستی ہوتا ہے۔ ان کا مذہب فرقہ پرستی کا باعث ہوتا ہے، نیز ان کی ہی بے حرکتی "تعمیر و ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔

"تعمیر و ترقی" سے متعلق ان کے دل میں بیٹھا ہوا خیال انہیں واحد یہی ترغیب دیتا ہے کہ "غیر عصری" تہذیب کے بچے کھچے تکملی جزو کو بھی پلٹ دیا جائے۔ اس عمل کے دوران جو چیز شکار ہو جاتی ہے، وہ ہی بنیادی انسانیت یعنی عام لوگوں، ان کی ثقافتوں اور ان کی امنگوں کو سمجھنے کی لگن۔ یہاں تک کہ جب کچھ حساس چیندہ لوگ اپنی ڈراما ٹولیوں کو گاؤوں اور گندی بستیوں میں لے جاتے ہیں، تب اس کے پیچھے یہ مقصد کارفرما رہتا ہے، دنیا بے جوڑ ہے اور اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے جاہل عوام کو یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے دانشوروں کی ضرورت ہے۔

کے دانشور اپنی ساکھ کھو چکے ہیں۔ وہ اپنے نوآبادیاتی آقاؤں سے پُرمعنی طور پر زیادہ مختلف نہیں لگتے۔ "عوام" کیڑے مکوڑے نہیں ہیں، وہ بھی اپنی عزت کا پاس رکھنے والے انسان ہیں۔ وہ ایسے لوگوں میں کیوں اعتقاد رکھیں، جو یہ سمجھتے ہوں کہ منطقی مباحث یا ریاکارانہ تعقل پسندی کے چند اسباق جیتی جاگتی ثقافت کو مسترد کرنے کے لیے کافی ہیں؟

البتہ جو چیز درکار ہے، وہ ہے ایک متبادل تلاش کرنے کی بصیرت، مغرب کی ثقافتی چودھراہٹ کے خلاف رزم آرا ہونے کی لگن۔ مائیکل فوکالٹ کے الفاظ میں اس کام کے لیے مخصوص دانشوروں کی ضرورت ہے یعنی ایسے دانشور جو یہ ماننے سے انکار کریں کہ علم کی صرف ایک ہی قسم ہے، یعنی وہ علم جس کا پرچار سیکولر مغرب ہی کرتا ہے۔ "آفاقی" دانشوروں کے برعکس، وہ مقامی ثقافتوں اور روایات کے حق میں لڑیں گے۔

جی ہاں، مخصوص دانشور آج بھی "جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور دہلی اسکول آف اکنامکس جیسے "مراکزِ کمالات" میں نہ ہو کر، گمنام دیہات اور بستیوں میں دکھائی پڑتے ہیں۔ لیکن مابعد — گاندھیائی دور میں ان کی تعداد روز بروز ———— کم ہوتی جا رہی ہے۔ آفاقی دانشور انہیں ایسے رجعت پسند کہہ کر پکارتے ہیں، جو تاریخ کے دھارے کو پلٹنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہوں۔ وہ سائنسی مزاج اور سیکولرزم کا کم ذکر کرتے ہیں لیکن مذہبی روایات اور متبادل ترقیاتی نمونوں کی بات کرتے نہیں تھکتے۔ وہ ایسی زبان میں بات کرتے ہیں جسے ہندوستان کے دیہی عوام اور قبائلی لوگ بخوبی سمجھتے ہیں۔ لازماً انہیں زیادہ بااثر بن جانے سے روکنا ہوگا! وگرنہ ہو سکتا ہے کہ وہ سیکولر جنت یعنی کمپیوٹروں اور آلات کی عظیم اکیسویں صدی کی منزل کی جانب، قوم کی پیش قدمی میں مزاحم ہو جائیں۔

مرتضیٰ کریم

# ترقی پسند تحریک: گولڈن جوبلی

ترقی پسند ادبی تحریک کے جشن طلائی کے سال میں ۲۶ تا ۲۸، دسمبر ۱۹۸۶ء دہلی میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سوویت یونین، پاکستان، فرانس اور مشرقی جرمنی سے آئے ہوئے ادیبوں نے بھی حصہ لیا

۲۶، دسمبر کی شام کو افتتاحی اجلاس میں جنرل سیکریٹری ڈاکٹر قمر رئیس نے کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالی کہ اس پچاس سالہ تقریب کے موقع پر "نشان سجاد ظہیر" کے پچاس ممنٹو ترقی پسند ادیبوں کو پیش کیے جائیں گے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر جناب اندر کمار گجرال نے اپنے خطبہ میں ترقی پسند تحریک کی عہد ساز خدمات کو سراہا اور بتایا کہ کس طرح تحریک آزادی کو ایک نیا رُخ دینے میں ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں نے بہت اہم رول ادا کیا تھا انھوں نے کہا کہ وہ اور ان کی پیڑھی کے بیشتر لوگ اسی تحریک کے زیر سایہ پروان چڑھے ہیں۔ ملک کی موجودہ صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ترقی پسند ادیب آج بھی قومی ہم آہنگی اور قومی اتحاد کی طاقتوں کو مضبوط بنانے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ آنند نرائن ملاؔ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرے نزدیک ترقی پسند ادب وہ ہے جو آنے والے کل کا ادب ہو جس کی معنویت مستقبل میں بھی قائم رہے۔ علی سردار جعفری نے اپنے صدارتی خطبہ میں ملک میں سیکولر جمہوری قدروں کو فروغ دینے میں ترقی پسند ادیبوں کی خدمات کا ذکر کیا۔ انھوں نے قومی زبانوں اور ملک کی مشترکہ تہذیب کے بارے میں ترقی پسند ادیبوں کے موقف کی وضاحت کی اور کہا کہ اردو زبان ہر دور میں اس تہذیب کی علامت رہی ہے۔ ان کے خطبہ کی بنیاد پر ہی کانفرنس کا اعلان نامہ ترتیب دیا گیا۔ پاکستانی ادیب "عابد حسن منٹو" اور سوویت اسکالر "میلا وسیلووا" نے بھی اجلاس کو خطاب کیا۔
[illegible] ۲۷ اور ۲۸، دسمبر کو آندھرا [illegible]

پہلے اجلاس کا موضوع تھا "ادب نظریہ اور وابستگی" اس میں "اصغر علی انجینئر اور ڈاکٹر اتا سووا روّوا اور ڈاکٹر ش۔ اختر نے مقالے پڑھے۔ اس اجلاس کی بحث میں وہاب اشرفی، کمال احمد صدیقی، ریوتی سرن شرما، احمد رشید شیروانی، اشتیاق عابدی اور رضی الدین نے حصہ لیا۔ اس میں موضوع کے مختلف پہلو سامنے آئے بیشتر ادیبوں نے اس خیال سے اتفاق کیا کہ موجودہ



حالات میں ادیب انسانی مقدر سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ لیکن اسے کسی سیاسی جماعت کے بجائے اپنے ضمیر کا اور انسانیت کا وفادار ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر اتا نے سوویت یونین میں ترقی پسند ادب کی مقبولیت کا جائزہ لیا۔ دوسرے اجلاس کا موضوع تھا "ترقی پسند ادب اور ادبی روایت" اس میں پروفیسر سید عقیل رضوی، ڈاکٹر صادق اور سوویت اسکالر میلا دیسلیپا [illegible]

سے اظہار خیال کیا۔ پروفیسر عقیل اور صادق نے اپنے مقالوں میں وضاحت کے ساتھ ترقی پسند ناول اور افسانہ کی روایت کا جائزہ لیا اور اسے اردو افسانوی ادب کی بنیادی روایت قرار دیا۔ اس اجلاس کی بحث میں قدوس جاوید، علی احمد فاطمی، وہاب اشرفی، وامق جونپوری اور دوسرے ادیبوں نے حصہ لیا۔ تیسرے اجلاس کا موضوع تھا، "ہم عصر ادب اور نئی ترقی پسندی" اس میں بحث کا آغاز ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے مقالوں سے ہوا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے کئی اہم سوالات اٹھائے۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک سماج سے ادب کی وابستگی اور ادب کے ذریعے زندگی کو بدلنے کا سوال ہے ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے یہ باتیں کہی اور مانی جا چکی تھیں۔ ڈاکٹر فاطمی نے عصر حاضر کے اردو افسانہ کا تجزیاتی مطالعہ پیش [illegible] زندگی

عابد سہیل، ریوتی سرن شرما، مجروح سلطانپوری اور دوسرے ادیبوں نے بھی حصہ لیا۔
آخری اجلاس میں قرار دادیں اور اعلان نامہ

# اعلان نامہ



منظور ہوا۔ ایک قرار داد میں ملک کی موجودہ فرقہ وارانہ فضا کے بارے میں ادیبوں نے اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا اور تمام ادیبوں سے اپیل کی کہ وہ ڈٹ کر فرقہ پرستی کا مقابلہ کریں۔ ایک دوسری تجویز میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ یو۔پی اور دوسری ہندی ریاستوں میں اردو کو ثانوی زبان کا درجہ دیا جائے۔ کانفرنس کے اعلان نامہ میں بھی اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر کرتے ہوئے اسے ہندی ریاستوں میں دوسری زبان کا درجہ دیے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

اس اجلاس میں علی سردار جعفری کو نئی مجلس صدارت کا چیرمین اور ڈاکٹر قمر رئیس کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کا جنرل سیکریٹری چنا گیا کانفرنس کے رفقاء میں دہلی کی اردو اکیڈمی نے ہر ممکن تعاون لیا۔ اس کے علاوہ ہریانہ اردو اکیڈمی اور جناب شاہد صدیقی (ایڈیٹر نئی دنیا) کی طرف سے کانفرنس کے مندوبین کو ضیافت دی گئی۔ کانفرنس کے اجلاس کے علاوہ بزم مشاعرہ اور شام افسانہ بھی منعقد ہوئی جس میں باہر سے آئے ہوئے فنکاروں نے حصہ لیا۔

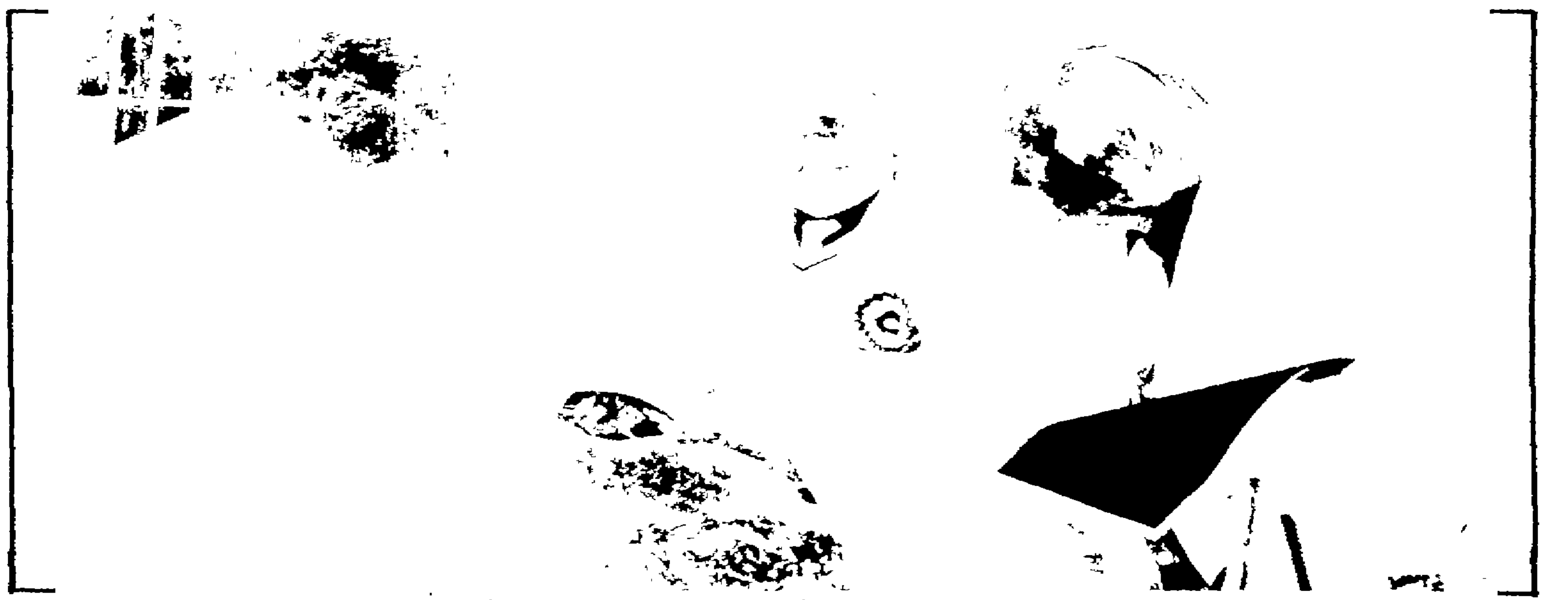
ہندوستان ایک جمہوری اور سیکولر ملک ہے جس کی منزل سوشلزم ہے۔ جمہوریت اور سیکولرزم لازم وملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن نہیں۔ سوشلزم کے حصول کے لیے ان دونوں کا برقرار رہنا ضروری ہے۔

ہندوستان ایک سے زیادہ مذہبوں، تہذیبوں اور زبانوں کا گہوارہ ہے اور ہر مذہب، ہر تہذیب اور ہر زبان کو ... کے حقوق حاصل ہیں۔ اکثریت اور اقلیت کے بنیاد پر کسی مذہب، کسی تہذیب اور کسی زبان کے ساتھ بدسلوکی کرنا یا اس کو حقارت سے دیکھنا ہمارے بنیادی تصور حیات کے خلاف اور ہندوستان کی صدیوں پرانی روایت کی توہین ہے اور ہمارے دستور اساسی (CONSTITUTION) سے بغاوت کے مترادف ہے۔ ترقی پسند ادیب کسی مذہب، کسی تہذیب، کسی زبان کی بالادستی کو قبول نہیں کرتے۔ ہم کسی کو برتر اور کم تر تسلیم نہیں کرتے۔ اگر کوئی فرقہ اپنے حق کی حفاظت یا فروغ کے لیے کسی دوسرے فرقے کے حقوق کو پامال کرنا ضروری سمجھتا ہے تو اس ناعاقبت اندیش اور ناحق شناس فرقے کی مخالفت میں آواز بلند کرنا ہمارا جزو ایمان ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ ایسا کوئی فرقہ ہندوستان میں وجود نہیں رکھتا جو بحیثیت مجموعی ناحق شناس ہو، ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی فرقے کے چند گمراہ افراد کسی وقت کسی حماقت میں مبتلا ہو جائیں اس کے لیے سارا فرقہ قابلِ مذمت نہیں ہو سکتا۔

ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مختلف تہذیبوں کے وجود کے باوصف ہندوستان کی رگوں میں ایک مشترکہ اور ملی جلی تہذیب، جو صدیوں کے باہمی لین دین کا نتیجہ ہے، خون بہار کی طرح رواں ہے۔ ہم آج جس کو جدید ہندوستان کہتے ہیں اس کے مزاج کی تعمیر میں آریائی اور غیر آریائی دیسی عناصر کے علاوہ یونانی، ایرانی، وسط ایشیائی، عربی اور جدید مغربی عناصر بھی شامل ہیں۔ اس امتزاج کا نمایاں اثر ہمارے فنون لطیفہ میں جلوہ گر ہے۔ مصوری، بت تراشی، عمارت گری، موسیقی، رقص، شاعری سب اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ہم ایک ایسی شاندار روایت کے وارث ہیں جو قوس وقزح کی طرح حسین ہے۔ اس دھنک کے رنگوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ایک خوبصورت مثال اردو زبان ہے۔



ہمیں فخر ہے کہ ہم اس زبان کے ادیب ہیں جس نے امیر خسرو کے عہد سے لیکر اس وقت تک چھ سات سو سال کی تخلیقی زندگی میں ہمارے ملک کے ادبی اور تہذیبی خزانے کو بیش بہا جواہر پاروں سے مالا مال کیا ہے۔ اردو زبان تحریک آزادی میں پیش پیش رہی ہے۔ اس کی کتابوں میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لیکر آج تک کی تہذیبی اور سیاسی تاریخ محفوظ ہے اس نے دار و رسن سے سرفروشی کے گیت گائے ہیں اس کا ایک "ترانۂ ہندی" ملک کی ہر زبان کے بولنے والوں نے گایا ہے اور آج بھی گا رہے ہیں اور اس کا ایک نعرہ "انقلاب زندہ باد" ہر لسانی اور تہذیبی خطے میں آزادی کی مشعلیں روشن کر چکا ہے ہماری زبان کا ادب قرون وسطیٰ میں بھی سیکولر تھا اور آج



بھی ہم اس کی سیکولر تخلیقات پر نازاں ہیں جو نفرت اور تعصب کے سیاہ طوفانوں میں بھی چراغوں کی طرح فروزاں ہیں۔

یہ ہمارا جمہوری حق ہے کہ ہم اپنی زبان کی حفاظت اور پرورش کریں اور اپنے بچوں کو اپنی زبان میں تعلیم دیں اور اپنی زبان میں اپنے جمہوری اور سیاسی اور کاغذی فرائض ادا کریں۔ چونکہ شمالی ہندوستان میں اردو کی کوئی ریاست نہیں ہے اس لیے یہ غلط فہمی عام ہے کہ اردو زبان کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح درخت کی جڑ بھی ایک علاقہ درکار ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اردو زبان کا علاقہ وہی ہے جو ہندی زبان کا علاقہ ہے اور ہمارے نزدیک ہر ہندی ریاست بیک وقت اردو ریاست بھی ہے۔ اس لیے بہار، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، ہماچل پردیش، راجستھان، ہریانہ اور دہلی کی یونین ٹیریٹری میں اردو زبان کو ہندی زبان کے بعد ثانوی زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔

یہ خوش فہمی اردو کی زندگی اور بقا کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ بہت حسین زبان ہے جس کو سب پیار کرتے ہیں اور اس کی شاعری ہر دلعزیز ہے۔ اردو زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بنیادی حقوق کاغذی اور دستوری طور سے محفوظ کر دیے جائیں اور اس کے عام استعمال پر کوئی پابندی نہ ہو۔ اردو کو اقلیت کی زبان قرار دینا ایک بہت بڑی ستم ظریفی ہے۔

گزشتہ دور کے مقابلے آج اردو کے لیے فضا زیادہ سازگار ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ خطرات بھی بڑھ گئے ہیں۔ ایک خطرہ تو یہ ہے کہ اردو آہستہ آہستہ علم اور سائنس سے محروم ہوتی جا رہی ہے اور تفریح کے لیے زیادہ استعمال ہو رہی ہے۔ ایک تاجرانہ معاشرے میں جہاں ماس میڈیا سہولتیں بڑھتی جا رہی ہوں۔ ہوس زر آسانی سے غارت گر ناموس بن سکتی ہے۔ اس معاشرے میں زبان کا استعمال ہے دوسرا اور سب سے بڑا خطرہ بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور باہمی مذہبی منافرت ہے جو کبھی کسی مسلح شکلوں میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ فرقہ پرستی اردو زبان ہی کی نہیں بلکہ ہندوستان کے اتحاد اور سالمیت کی بھی دشمن ہے۔ ایسی صورت میں اردو کی بقا کے لیے جدوجہد ہمارے ملک کی بقا کی جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔ اس جدوجہد میں ہم تنہا نہیں ہیں ہندی کے روشن خیال ادیب اور دوسری زبانوں کے ادیب اور دانشور ہمارے ہمنوا ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر جس بقائے باہمی (COEXISTANCE) کو امن عالم کی ضمانت سمجھا جاتا ہے وہی تصور ہندوستان کے اندر ہمارے اتحاد اور سالمیت کی ضامن ہے۔ ملک کی تمام زبانوں کا پر امن طریقے سے ایک ساتھ فروغ صرف اس وقت ممکن ہے جب کسی ایک زبان کو مسلط کرنے کی جارحانہ کوشش نہ کی جائے۔ چونکہ ہندوستان مختلف زبانوں کا گہوارہ ہے اور اس کے مختلف لسانی علاقوں ہیں اور چند علاقے ریاستوں کی شکل میں منظم ہیں اس لیے ملک کے کاروباری اتحاد کی خاطر ایک رابطے کی زبان ضروری ہے اور وہ زبان ہندی ہے۔ اس لیے ہندی والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ دوسری زبانیں بولنے والوں کے دل جیتنے کی کوشش کریں اور ان کو یہ یقین دلائیں کہ ہندوستان کی ساری زبانیں قومی زبانوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ سب قومی اتحاد کے آفتاب کی روشنی میں پروان چڑھیں

ہے۔ اس کے ساتھ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کی طرح ہندی زبان کا بھی احترام کریں اور ہندی زبان و ادب کے ساتھ اپنا ربط ضبط بڑھائیں، تاکہ اس سے اتنا ہی آشنا ہو سکیں جتنے اپنی زبان و ادب سے آشنا ہیں اور اس قربت کے ذریعے سے مغائرت کے وہ پردے اٹھا دیں جو فرقہ پرستی اور تعصب نے حائل کر دیے ہیں۔ لیکن ہم کو یقین ہے کہ جب اردو کو شمالی ہندوستان کی ہندی ریاستوں میں اپنے حقوق مل جائیں گے تو مغائرت کے پردے باقی نہیں رہ جائیں گے۔ ہماری دونوں زبانیں مل جل کر آگے بڑھیں گی اور ترقی کریں گی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں یہ یقین اور اعتماد پیدا ہو گا کہ ہندی زبان سب زبانوں کی دوست ہے اور سب کی بھلائی چاہتی ہے۔ ہندی زبان ایک عظیم الشان سرزمین سے پیدا ہوئی ہے، وہ سرزمین جس میں گنگا بہتی ہے اور جو کرشن، رام اور گوتم بدھ کے مقدس ناموں کی عظمت سے پہچانی جاتی ہے۔ امیر خسرو، کبیر داس، ملک محمد جائسی، میرا بائی، سور داس، تلسی داس کے نام اس زبان سے وابستہ ہیں۔ کھڑی بولی ہندی کی عمر کم ہے لیکن اس کو رابطے کی زبان کی حیثیت سے ہندوستان میں ایک تاریخی فریضہ انجام دینا ہے۔ اگر حالات سازگار ہوئے تو ایک شاندار مستقبل اس کا انتظار کر رہا ہے۔ ہمارے دیس کی عظیم روایت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہندی اپنی بڑائی کا اظہار نمرتا اور انکساری کے انداز میں کرے۔

ہندوستان کی موجودہ صورت حال انتہائی خطرناک ہے۔ اردو زبان کے وجود کو اگر بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی سے خطرہ ہے تو ہندوستان کے وجود کو ان اتحاد دشمن طاقتوں سے خطرہ ہے جن کے ہتھیار نفرت اور تشدد ہیں اور ان کو تقویت پہنچانے والے بیرونی عناصر وہی ہیں جو بنی نوع انسان کو آن واحد میں غارت کر دینے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ آگے بڑھنے کی بجائے دورِ وحشت کی طرف واپس جا رہی ہے اور سارے کرۂ ارض کو بظاہر مہذب لیکن روحانی طور سے وحشی سامراجی ریاستوں اور حکومتوں کی دہشت پسندی کا خون آلودہ اندھیرا آہستہ آہستہ اپنے گھیرے میں لے رہا ہے۔ آسمان کے وہ ستارے جن کو دیکھ کر بچے خوش ہوتے ہیں اور ہماری آنکھیں روشن ہوتی ہیں اور روح راحت محسوس کرتی ہے آج نیوکلیر جنگ کے ہتھیاروں کی جولانگاہ بنائے جا رہے ہیں۔ ان ستاروں کو زہر آلودہ کرنے کا سامان ہو رہا ہے۔ کہتے کروڑ سال لگے جب پہلی تتلی نے ہوا میں اپنے رنگین پر پھیلائے اور فطرت اٹھارہ کروڑ سال کے تخلیقی عمل سے گزری۔ جب گلاب کے پھول نے مسکرا کر اپنے حسن کو بے نقاب کیا اور انسان جو قدرت کا شاہکار ہے، کروڑوں سال میں اپنے حیاتیاتی سفر طے کر کے علم اور سائنس کی موجودہ منزل پر پہنچا ہے۔ یہ تصور کتنا اذیت ناک ہے کہ انسان اپنی ہوس زر اور ہوس اقتدار میں اپنے وجود کو ختم کر سکتا ہے اور ختم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ انسان نے جتنے بھی ہتھیار ایجاد کیے ہیں وہ کسی نہ کسی وقت ضرور استعمال ہوئے ہیں اور بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اہل اقتدار کی خباثت نیوکلیر ہتھیاروں کو استعمال نہیں کرے گی۔ چیخوف نے کہا ہے کہ اگر ڈرامے کے پہلے سین میں دیوار پر پستول لٹکا ہوا نظر آئے تو وہ آخری سین میں ضرور چلے گا۔ ہمیں ڈرامے کے اس قانون کو تبدیل کرنا ہے تاکہ نیوکلیر ہتھیاروں کے استعمال کی نوبت نہ آئے۔

منشی پریم چند نے اپنے ۱۹۳۶ء کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ ادب سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں ہے۔ یہ وہ مشعل ہے جو سیاست کو راہ دکھاتی ہے۔ آج یہ چیلنج ہمارے سامنے ہے، ہم سیاست کے پیچھے چلیں گے یا اس کو راہ دکھائیں گے۔ یہ ہمارے قلم کی آزمائش کا وقت ہے۔ ہم جنوں کی حکایات خونچکاں لکھتے رہیں گے چاہے اس میں ہمارے ہاتھ ہی قلم کیوں نہ ہو جائیں۔

ہم اردو کے ترقی پسند اہل قلم اپنی زبان کے تمام ادیبوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ انسانیت کے اس مقدس جہاد میں ہمارے ساتھ شریک ہوں۔ ہم دوسری زبانوں کے صاحبانِ قلم سے بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ ہم مل کر اپنے حرف کی طاقت آزمائیں۔ حرف جس سے ظلمت پسند صاحبانِ اقتدار گھبراتے ہیں، کیونکہ حرف صداقت بھی ہے اور احتساب بھی اور شمشیر برہنہ بھی۔ حرف کے بے شمار رنگ ہیں، بے شمار روپ ہیں۔ حرف گنگناتا نغمہ بھی ہے اور تلوار کی جھنکار بھی، عشق و حسن کی سرگوشی بھی ہے اور مجاہد کی للکار بھی۔ وہ ضربِ کلیم بھی ہے اور اعجازِ مسیحا بھی، وہ ہر حال میں انسان کا مونس و غمخوار ہے۔ حرف کو قید کیا جا سکتا ہے، دار پر بلند کیا جا سکتا ہے لیکن حرف کو موت نہیں آتی۔ وہ زندہ اور تابندہ رہتا ہے۔ حرف ناقابلِ شکست ہے۔

## اعلان نامے کا لب لباب

- ہم [illegible] مطالبہ کرتے ہیں کہ اردو کو ملک کی تمام ہندی ریاستوں میں ثانوی زبان کا درجہ دیا جائے۔ دیگر ریاستوں میں بھی اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔
- ہم اردو کے ترقی پسند ادیب ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت، انتہا پرستی اور دہشت پسندی کی پرزور مذمت کرتے ہیں اور جمہوری، سیکولر اور ترقی پسند ادیبوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان میلانات کے خلاف متحد طور پر صف آرا ہوں۔
- ہم اردو کے ترقی پسند ادیب اور جمہوری [illegible] عالمی سطح پر چھائے ہوئے نیوکلیائی خطرے کا مقابلہ کرنے اور امن عالم کے تحفظ کے لیے فضا ہموار کرنے کی اپیل کرتے ہیں۔
- ہم ترقی پسند ادیب ملک کے اور ملک کے باہر جہاں کہیں بھی استبداد اور استحصال موجود ہے اور جہاں کہیں سماجی بے انصافی اور نسلی امتیاز اور عدم مساوات موجود ہے، اس کے خلاف آواز بلند کرنے اور جدوجہد کا عہد کرتے ہیں۔
- ہم ترقی پسند ادیب ہم عصر ادیب سے اپیل کرتے ہیں کہ عوام سے گہرا رابطہ قائم کریں، خاص طور سے عوامی ادب کی روایات اور جمالیات سے قریب تر ہوں اور ایسا ادب بھی پیش کریں جس میں ہمارے لوک کلچر اور اعلیٰ انسانی اقدار کی ترجمانی ہو۔

جمیل اختر

# نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس

دہلی ہمیشہ سے اردو تہذیب وادب کا مرکز رہی ہے میر و غالب سے لے کر آج تک اردو کا وقیع سرمایہ ہمارے لیے وجہ افتخار ہے۔ رجانے کتنی تحریکیں یہاں سے اٹھیں اور اپنے نقوش پورے ملک پر ثبت کرتی چلی گئیں۔ آج بھی ہماری یہ دلی اسی طرح علم وادب کا مرکز ہے جس طرح ماضی میں تھی۔ یہاں بڑے بڑے علمی وادارے ہیں، دانش گاہیں ہیں جہاں علم وادب کے چراغ روشن ہوتے رہتے ہیں۔ قومی اور بین اقوامی سطح کے سیمیناروں، مذاکروں اور تقریبات کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ان ہی اداروں کے درمیان دلی اردو اکاڈمی نے اپنا ایک امتیاز قائم کیا ہے، اور اپنی شناخت بنائی ہے۔

۷، ۸، فروری کو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار "نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس" کے موضوع پر دوروزہ کل ہند سیمینار دلی اردو اکاڈمی دہلی کے دفتر گھٹا مسجد میں منعقد ہوا۔ جس میں ملک کے ماہر تعلیم اور ادیبوں نے شرکت کی۔ اس سیمینار کا مقصد نئی تعلیمی پالیسی میں اردو اور اردو تدریس کے مسائل پر غور وخوض اردو کے جائز مقام کے تعین کی نشاندہی کرنا تھا۔




سیمینار کا پہلا اور افتتاحی اجلاس جناب سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی صدارت میں ۱۰ بجے شروع ہوا۔ سیمینار کمیٹی کے چیرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سیمینار کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو والوں نے نئی تعلیمی پالیسی کا اپنے مطالبات کی روشنی میں احتساب نہیں کیا اور یہ سیمینار اس لحاظ سے اہم ہے کہ ہم اپنے مطالبات کا احتساب کریں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی سماج کثیر لسانی سماج ہے۔ ضروری ہے کہ شمالی ہندوستان میں سہ لسانی فارمولے کی تعبیر میں اب ہندی اور انگریزی کے بعد جنوبی ہند کی زبانوں کو جگہ دی جا رہی ہے۔ اردو والے اس کے بارے میں غور کریں۔ اردو والوں

میں تیسری زبان شمالی ہند میں اردو ہونی چاہیے۔ انھوں نے اردو والوں سے یہ بھی کہا کہ دوسری ریاستوں کی صوبائی اور علاقائی زبانیں بھی سیکھیں۔

جناب مشتاق احمد نے "تعلیم بالغان اور اردو" نئی تعلیمی پالیسی کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے سنٹر پورے ہندوستان میں برائے نام ہیں۔ جس کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کرانی چاہیے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں چوں کہ اردو ہی کو کوئی مقام نہیں دیا گیا ہے۔ اس طرح اس کا مستقبل اور بھی تاریک ہو جاتا ہے۔

جناب ظفر پیامی نے اپنا مقالہ نئی تعلیمی پالیسی اور تہذیبی قدریں پیش کرتے ہوئے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی اس حد تک خوش آئند ہے کہ اقلیتوں کی تعلیمی پس ماندگی

کی گئی ہے، اور اسے لسانی فارمولے سے بھی غائب کر دیا گیا ہے۔ اسے جائز مقام دلانے کے لیے انھوں نے اردو والوں کو چند اہم اور مفید مشورے دیے۔

پروفیسر باقر مہدی نے "نئی تعلیمی پالیسی میں اردو کی تعلیم اور این سی آر ٹی کا رول" کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کونسل نئی تعلیمی پالیسی کے پیش نظر قومی سطح پر رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے لیے سیکولر نصاب اور مختلف سطح پر اور مختلف زبانوں میں قومی یکجہتی کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے کتابوں کی تیاری کا کام تیز رفتاری کے ساتھ کر رہی ہے۔

مسز ڈی۔ آر۔ بوتھیتی نے "اردو اسکول اور محکمہ تعلیمات" پر اظہار خیال کرتے ہوئے دلی میں اردو کے

خاص ذکر کیا جس میں مختلف مضامین میں اردو کتابوں کی تیاریوں پر خصوصی توجہ مبذول کرائی۔

صدر جلسہ جناب سید حامد نے "اقلیتوں کے لیے درس و تدریس کے آئینی تحفظات اور نئی تعلیمی پالیسی" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ گرچہ نئی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں کو تمام آئینی تحفظات فراہم کیے گئے ہیں لیکن اردو کو نظر انداز کر کے بڑی ناانصافی کی گئی ہے۔ انھوں نے اردو عوام اور اقلیتوں کو بیدار ہونے کا مشورہ دیا، اور اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے ارباب اقتدار کے ساتھ گفتگو اور اشتراک کا عمل شروع کریں اور نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ میں جہاں کہیں بھی ناانصافی ہو فوراً اس کی نشان دہی کریں، اور نئی تعلیمی پالیسی سے جو فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اس کی تیاری جانفشانی، عرق ریزی اور بیدار مغزی کے ساتھ کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم صرف احتجاج میں لگ جائیں اور جو کچھ ملا ہے اور جو امکانات پیدا ہوئے ہیں ان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔

دوسرا اجلاس سہ پہر تین بجے جناب سید حسین علی جعفری کی صدارت میں شروع ہوا۔ ڈاکٹر ساجدہ زیدی نے "نئی تعلیمی پالیسی پس منظر اور پیش منظر" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ شمالی ہندوستان میں پہلی زبان کی حیثیت سے ہندی وابتدائی اردو کے ساتھ یا اردو وابتدائی ہندی کے ساتھ پڑھائی جائے، اور بچہ کو اختیار ہو کہ ان میں سے کسی ایک زبان کا انتخاب کر سکے۔ مزید یہ کہ تمام شمالی ہندوستان کے اسکولوں میں اردو کی تدریس کا باقاعدہ غیر مشروط اور مناسب انتظام کیا جائے، جو پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک ہو۔

جناب ابوالفیض سحر نے "نئی قومی تعلیمی پالیسی اور اقلیتیں" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے فکری اور انتظامی پہلو پر الگ الگ بحث کی اور نئی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں کو فراہم کیے گئے تحفظات پر اطمینان کا اظہار کیا۔

"نئی تعلیمی پالیسی کا نفاذ اور اردو اساتذہ کی ذمہ داریاں" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے جناب صفدر نقوی نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے سلسلے میں استاد کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ سماج در حکومت استاد کی حیثیت ابھارنے کی کوشش کریں۔ اساتذہ کے فرائض کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ استاد اسکول کے منتظمین اور عوام سے رابطہ قائم

ضابطۂ اخلاق خود بنائیں جو دوسروں کے لیے مشعل راہ کا کام دے۔

۸ رفروری کو تیسرا اجلاس جناب سید ہاشم علی وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صدارت میں شروع ہوا۔ جناب سید ذیشان ہاشمی نے "نئی تعلیمی پالیسی اور اخلاقی قدریں" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اساتذہ اور طلبا دونوں ہی کے لیے ضابطۂ اخلاق مرتب کیا جائے اور نصاب تعلیم میں اخلاقی کتابوں کو مناسب مقام دیا جائے۔

جناب آر۔ کے شیروانی نے "سیکنڈری اور سینئر سکنڈری سطح پر نئی تعلیمی پالیسی کے تحت اردو کا مقام" پر مختلف ریاستوں میں اردو کی تعلیم کا جائزہ پیش کرتے ہوئے عدم اطمینانیت کا اظہار کیا، اور عملی اقدام کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اردو والوں کی بے حسی اور بے توجہی پر سخت تنقید کی، اور نئی تعلیمی پالیسی سے جو مراعات مل سکتی ہیں، اس سے استفادے پر زور دیا۔

فہمیدہ بیگم ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو نے "نئی تعلیمی پالیسی میں ترقی اردو بیورو کی ذمہ داریاں اور کردار" میں بیورو کی کارگزاری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا اور کہا کہ بیورو وہ واحد ادارہ ہے جس نے مختلف مضامین کی کتابیں اردو میں شائع کیں۔ بچوں کے ادب کا بھی بڑا ذخیرہ اس نے شائع کیا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت عوامی ادب کی اشاعت کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

جناب سید ہاشم علی نے اپنے صدارتی کلمات میں تمام مقالوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ایک مشورہ دیا کہ اگر تمام مذاہب کی اخلاقی قدروں کو اردو میں ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو قومی یک جہتی کو مزید مستحکم بنایا جا سکتا ہے۔

چوتھا اور آخری اجلاس جناب آئی کے گجرال کی صدارت میں شروع ہوا۔ پروفیسر عبدالمغنی نے "اردو میں تعلیم پائے ہوئے امیدواروں کی ملازمت کا مسئلہ" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا، جس میں انھوں نے اردو کے سرکاری چلن پر زور دیا تاکہ اس کا رشتہ ملازمت سے جوڑا جا سکے۔ انھوں نے تمام سطح پر اردو میں تعلیمی مقابلے کے امتحان میں اردو کے چلن اور ملازمتوں میں صرف لیاقت کی بنیاد پر ایمان داری سے فیصلے کرنے کی بات کی۔ اور سہ لسانی فارمولے پر منصفانہ عمل درآمد کا مشورہ دیا تاکہ فضا اردو والوں کے حق میں کچھ ہموار ہو سکے۔

جناب سید ہاشم علی نے اپنے مقالے میں "کالج [illegible] کی سطح پر نئی تعلیمی پالیسی اور اردو" پر

اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں اردو کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور لسانی اقلیتوں کو اپنی زبان کی تعلیم سے محروم کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اردو داں بچے اپنی پرائمری سیکنڈری سطح تک اردو کی تعلیم سے محروم رہیں گے۔ لہٰذا پہلے ان جماعتوں میں تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے۔

ڈاکٹر قاسم صدیقی نے "ٹیچرس ٹریننگ کالجوں میں اردو زبان وادب اور اردو میڈیم اساتذہ کی ٹریننگ" پر گفتگو کرتے ہوئے ٹریننگ کالجوں میں اردو کی مایوس کن حالت کا ذکر کرتے ہوئے تمام ٹریننگ کالجوں میں اردو زبان میں ٹریننگ کے انتظام کی ضرورت پر زور دیا اور تجرباتی اسکول کے قیام کا بھی مشورہ دیا۔

ڈاکٹر محمد صابر خان نے "نئی تعلیمی پالیسی میں اردو کی درسی کتب بشمول میڈیکل انجینئرنگ وغیرہ" پر اظہار خیال کرتے ہوئے این سی ای آر ٹی کے کردار اور منصوبوں کی تفصیلی وضاحت کی۔

آخر میں چند اہم تجاویز ایوان کی منظوری کے لیے پیش کی گئیں۔ تو تجویزیں مرکزی اور ریاستی سرکاروں کو عملی اقدام کے لیے بھیجی جائیں گی اور باقی قراردادوں کا روئے سخن خود اردو والوں کی طرف ہے کہ اپنی زبان کے تحفظ و بقا کے لیے ان پر کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں اور نئی تعلیمی پالیسی سے وہ کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔

حکومت کو بھیجی جانے والی قراردادوں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی میں سب سے بڑی اقلیتی زبان اردو کا ذکر ہونا چاہیے اور تیسری زبان کے طور پر مغربی ہندوستان کی زبانوں کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ دراصل اردو کی قیمت پر ہے۔ ہندی علاقوں میں ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو کے لیے گنجائش نکالنی چاہیے تھی جب کہ وہاں جنوبی ہندوستان کی زبانوں کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔ سیمینار کی عام رائے یہ تھی کہ پہلے تیسری زبان کے طور پر کلاسیکی زبان کو شامل کر کے اردو کے ساتھ بے انصافی کی جاتی رہی ہے اور اب جنوبی ہندوستان کی زبانوں کا تذکرہ کر کے اردو کا راستہ بند کر دیا جائے گا۔ اردو والے تو جنوبی زبانوں کو آندھرا، کرناٹک وغیرہ میں پڑھیں گے ہی۔ نئی تعلیمی پالیسی اور نوادے اسکولوں میں ہندی علاقوں میں اردو کی تعلیم کا خصوصی انتظام بہت ضروری ہے۔ جناب سید شریف الحسن نقوی سکریٹری اردو اکادمی کے شکریہ پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

# عالمِ ہند کے قارئین کی خدمت میں



بلراج ورما

# بیچارہ اکیلا آدمی

مکان کی تلاش میں ہم نئی دلّی کے جنوب کی تقریباً ہر کالونی چھان مار رہی تھی۔ مکان تو بہت تھے مگر ہماری ضرورت کے مطابق کہیں بھی کوئی مکان ہمیں نہ ملا تھا۔ میاں بیوی اور چھوٹے بڑے ملاکر چار بچے بچیاں۔ تین کمرے تو ہر صورت میں ہونے ہی چاہئیں۔ ایک بچوں کے لیے ایک ہمارے یعنی میاں بیوی کے لیے اور ایک مہمانوں کے لیے جسے مغربی اسٹائل میں ڈرائنگ روم کہا جاتا ہے۔ اگر کہیں کوئی اس قسم کا سیٹ تھا بھی وہ ہماری دسترس (جس کی حد پانچ سو روپیہ ماہانہ تھی) سے باہر تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس نئی کالونی میں کوئی نہ کوئی گھر ہماری ضرورت اور حیثیت کے مطابق ضرور مل جائے گا اور واقعی مل بھی گیا۔

دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے مکان مالک رہتا تھا اور اوپر کا حصّہ کرایہ کے لیے تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ اس طرح مالک مکان کرایہ دار پر نگرانی کے علاوہ اسے پوری طرح قابو میں بھی رکھ سکتا ہے۔ بوقت ضرورت اوپر والوں کا پانی بند کر سکتا ہے اور پانی آپ جانتے ہیں فی زمانہ بہت بڑا ہتھیار ہے۔ پانی کی ضرورت بڑے بڑے ہنگامے کھڑی کر سکتی ہے۔ نہ معلوم کتنی لڑائیاں پانی کے لیے لڑی گئی ہیں۔

نوکر (یا نوکر نما ایک صاحب) ہمیں صاحب خانہ کے ڈرائنگ روم سے ملے بغیر باہر والے برآمدے میں بٹھا کر نہ جانے کہاں چلا گیا اور ہم میاں بیوی نہ جانے کب تک چپ چاپ بیٹھے مکان مالک کا انتظار کرتے رہے۔ سامنے سینٹرل ٹیبل پر پڑے رنگا رنگ میگزین و رسائل وغیرہ نہ ہوتے تو وقت گزارنا مشکل ہو جاتا۔ کوئی بیس منٹ بعد وہ حضرت دوبارہ تشریف لائے تو ساتھ میں چائے کی ایک پر تکلف ٹرے بھی تھی جس میں دو پیالی چائے اور دو گلاس ٹھنڈے پانی کے علاوہ ایک پلیٹ تازہ تلے ہوئے آلو کے قتلوں کی بھی تھی۔ ”آپ چائے پیجئے پھر آپ کو آپ کا سیٹ بھی دکھا دیں گے — آپ کا سیٹ تو گویا ان حضرت نے ہمیں اپنا کرایہ دار چن لیا تھا۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو چائے پی کر ہی آئے ہیں“ ہم نے تکلفاً مسکرا کر اس صبح کا پہلا جھوٹ بولا۔

”چائے تو حضرت ایک رسم ہے کوئی غذا تو ہے نہیں جس کی کمی یا زیادتی سے کوئی ایسا فرق پڑ جائے گا“

ظاہر تھا کہ اس قسم کا برجستہ جملہ کوئی ایسا شخص جو محض نوکر ہو ادا نہیں کر سکتا تھا ابھی ہم کچھ اس قسم کا سوچ ہی رہے تھے کہ دوسرا جملہ آیا۔

”علاوہ ازیں باہر بارش بھی تو ہو رہی ہے ظاہر ہے کہ آپ کو ادھر کچھ دیر تو رکنا ہی

جی میرا نام چندر سین۔ چندر موہن۔ مجھے یار لوگ چندو بھی کہتے ہیں۔ میں فوٹو کے ایک مقامی اسٹوڈیو میں سیلز مین ہوں اور پروفیسر صاحب یعنی صاحب خانہ اور دوست ہوں چونکہ ہم دونوں اس دنیا میں اکیلے ہیں اس لیے میں بھی ان کے ساتھ رہتا ہوں۔

اب ہمیں آپ کا سیٹ اور چائے اور تلے ہوئے آلوؤں کی بات سمجھ آئی۔ ہماری بیگم کو ایک نظر دیکھ کر ہی چندر، چندو یعنی چندر موہن صاحب نے کم از کم اپنی طرف سے ہمیں کرایہ دار چن لیا تھا۔

”جی گھر ہی میں ہیں مگر اس وقت ذرا سو رہے ہیں رات کو بہت دیر سے سوئے ہیں اس لیے صبح اٹھتے بھی بڑی دیر سے ہیں۔ چھٹی والے دن تو دس سے پہلے کبھو اٹھتے تو گیا، ہم کہتے کہتے رک گئے کیونکہ اب دس تو بجا ہی چاہتے تھے۔

چائے سے نبٹ کر ہم تینوں اوپر گئے۔ مکان ہر لحاظ سے معقول تھا دو بیڈ روم تھے دو باتھ رسوئی گھر اور ڈرائنگ روم ان کے علاوہ صاف ستھری کھلی چھت سارے کا سارا آسمان اور ستارے اور چاند اور سورج اور ہوا جو شہروں میں آتی ہوتی ہے۔

ہم نے کرایہ پوچھا تو چندر موہن صاحب نے ہمیں براہ راست مکان مالک سے بات کرنے کا مشورہ دیا، پیشتر اس کے کہ ہم کوئی اور بات کرتے نیچے سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

”چندو شرما جی نے مکان دیکھ لیا ہو تو انھیں نیچے لے آؤ“

شرما جی؟ ظاہر تھا کہ مکان مالک یا جن صاحب نے بھی ہمیں پکارا تھا جانتے تھے، ہم نے سوالیہ نگاہوں سے چندر کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے۔

ہم نیچے اتر آئے تو دیکھا کہ پروفیسر چندر پرکاش صاحب حیدر آبادی باندھے ننگ دھڑنگ کھڑے ہیں۔ ہمیں بیگم کے ساتھ دیکھ کر قدرے جھجکتے ہوئے!

”ارے چندو تو نے بتایا کیوں نہیں کہ بھابی جی ساتھ ہیں“ وہ بیگم کے لقب کچھ اس ڈھنگ سے استعمال کر رہے تھے گویا مدتوں سے انھیں اسی طرح کرنے کے عادی ہوں۔ ان کے جھجکنے کے ڈھنگ سے البتہ صاف ظاہر تھا کہ انھیں بیگم کی موجودگی کا علم تھا اور وہ جان بوجھ کر اس طرح آدھے ننگے کھڑے تھے کہ بیگم کو اپنے جسم کی خوبصورتی اور تناسب وغیرہ سے مرعوب کرنے کی غرض سے۔

ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھاکر اور خود ڈھنگ کے کپڑے پہن کر لوٹنے کو گھر کے اندر چلے گئے اور کوئی دس منٹ بعد لوٹے۔ اس بیچ ہم دونوں نے کمرہ لینا شروع کر دیا تھا چندر صاحب باہر تشریف لے گئے تھے۔ اب ہم اور بیگم کیلے تھے۔

کمرہ کے ایک کونہ میں بڑے بک شیلف کے اوپر کسی بڑی ہی خوبصورت عورت بڑے خاصے بڑے اور قیمتی فریم میں جڑی سارے کمرہ کی فضا میں ایک خاص قسم کا تہذیبی اضافہ تھی۔ تصویر میں جانے کیا تھا، بار بار ہماری نظریں اسی طرف اٹھ اٹھ جاتی تھیں، دونوں اٹھ کر اس تصویر کے قریب چلے گئے۔ ''ارے'' ایک دم ہم دونوں کی سے نکلا۔ ''یہ کیا''

یہ تصویر ہماری چہیتی سالی یعنی بیگم کی چھوٹی بہن منجو کی تھی۔ منجو جو آج کل لندن میں ایک خوبصورت بچے کی ماں تھی۔ منجو کو خط لکھنے کا بڑا شوق تھا اور ہر مہینہ اپنی ست سے مطلع کرتی رہتی تھی دونوں بہنیں ایک دوسرے پر جان چھڑکتی ۔ مگر وہ تصویر یہاں کیسے چلی آئی۔ بالکل ایسی ہی گرچہ قدرے چھوٹی ایک تصویر اری فیملی البم میں بھی تھی اور ابھی چند روز پہلے ہی ہم نے اس تصویر کی دو درجن کاپیوں اسٹوڈیو کو آرڈر دیا تھا۔ یہ تصویریں منجو کی سسرال والوں نے طلب

۔

بیگم جو ابھی تک نئے مکان کو دیکھ کر بے حد مسرور تھیں یکایک سیریس ہو گئیں۔ پروفیسر صاحب قبلہ لوٹے تو خوب بنے ٹھنے تھے۔ ہمیں بک شیلف کے قریب پا کر ایک دم کھل اٹھے کیسی لگی میری سلیکشن؟

''بہت اچھی'' ہم نے جواب دیا۔ ظاہر ہے کہ آپ جیسے علم و ادب کے ایک کامیاب گھر میں اسی قسم کی کتابیں ہونا چاہئیں۔ آپ کا شوق قابل ستائش ہے۔ ''ہم بوجھ کر عورت کے پورٹریٹ کا ذکر نہ کیا۔

''شکریہ شکریہ'' پروفیسر صاحب واقعی بے حد خوش تھے۔

مگر یہ محترمہ؟ بیگم نے پوچھ ہی لیا۔

''ارے یہ ایک لمبی کہانی ہے بھابی صاحبہ'' پروفیسر نے ایک دم جیسے لوکھلا کر ، کے چہرے کے رنگ یکایک بدلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسی عجیب و غریب ۔ طاری ہو گئی ان کے وجود پر گویا وہ ماضی کے کسی بہت ہی اہم مرحلہ میں وٹ گئے ہوں۔ اور ماضی کی کوئی بڑی ہی دکھ بھری یاد انھیں بے پناہ ذہنی بلکہ اذیت پہنچا رہی ہو۔ بیگم اب ایک دم چپ ہو گئیں تھیں ان کی بہن کا یا کسی بھی غیر مرد سے کبھی اس قسم کا گہرا تعلق رہا تھا، یہ انھیں قطعی معلوم نہ تھا اور یک دم جان لینے کے اشتیاق میں وہ یہ بھی بھول گئی تھیں کہ وہ ہمارے ساتھ مکان ۔ یکھنے آئی تھیں۔

وفیسر جو ایک ٹک اس تصویر کو دیکھے جا رہا تھا اور ظاہر تھا کہ وہ اسی میں قطعی ۔ ہے۔ خاصے لمبے وقفے کے بعد جب ہماری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں نمناک ھتے ہے، دیکھتے [illegible] سے آنسوؤں کی دو مہین مہین ندیاں بھی بہہ نکلیں۔

کافی دیر اسی طرح حیران و ششدر سنجیدہ اور چپ رہنے کے بعد وہ جب گویا ہوئے تو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زبان سے نہیں، دل کے کسی کونے سے کوئی پرانی بھولی بسری آواز نکالنے کی ناکام سعی کر رہے ہوں مگر کوشش کے باوجود بات زبان پر نہ آ رہی ہو۔

''مرد کی آنکھوں میں آنسو ہے نا شرم کی بات؟''

ہم دونوں میں سے جب کوئی کچھ نہ بولا تو وہ پھر چپ ہو گئے۔

اب ہم لوگ صوفہ پر آ بیٹھے تھے۔ بڑی سیٹ پر ہم دونوں اور پروفیسر چندر پرکاش ہمارے بالمقابل رکھی صوفہ چیئر پر۔

ہمت اور حوصلہ جمع کر کے آخر ہم نے کہا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے ان جانے میں آپ کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یقین جانیے۔ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔

''یہ سکیشنی کی تصویر ہے سکیشنی جو میری ہم جماعت تھی۔'' پروفیسر نے ہماری رسمی معذرت کو قطعی نظرانداز کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''مگر یہ تو'' بیگم نہ جانے کیا کہتے کہتے سنبھل گئیں۔

''ایک نوجوان عورت کی تصویر ہے۔'' پروفیسر نے جیسے بیگم کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ اس بیچ ہم نے بیگم کو چپ رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ خود بھی چپ رہنے ہی میں مصلحت سمجھتے ہوئے ہم نے پروفیسر کی طرف کچھ ایسے انداز سے دیکھا جس کا مطلب تھا۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتے بخدا ضرور کہیے اس سے آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

''یہ بیس سال پرانی تصویر ہے بھابی مگر سکیشنی زندہ رہی ہوتی تو بھی میرا ایمان ہے کہ وہ آج بھی ایسی ہی لگتی کم از کم اُسے اسی طرح ایسے ہی بنائے رکھنے کے لیے میں اپنی جان تک دے سکتا تھا۔''

اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رُک گئے۔ یک عجیب حزین سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر یکایک نمودار ہوئی اور وہ پھر اداس ہو گئے۔ اس اداسی میں بے بسی بھی تھی اور شرمندگی بھی۔ . . . . . .

''کون مرتا ہے کسی کے لیے کسی کے لیے جان دینے کا حوصلہ آج کس میں ہے۔ مرنا بہت مشکل ہے سر ما بی!'' اب وہ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ''آج کل تو ماں بھی اپنے جوان بیٹے کے لیے نہیں مر سکتی۔ میں تو ایک . . . .'' وہ پھر رک گئے۔

''لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، رومیو جولیٹ پرانے قصے ہیں محبت کے۔ کلاسیکی عہد کی روایات۔ جانے وہ کیسے لوگ تھے، ہم تو شرما جی بے حیا لوگ ہیں، بے حیا اور طوطا چشم۔ ہم میں سے کون کسی کے لیے مرتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے جان تک دے سکتے ہیں وہ مر گئی۔ میرے سامنے میرے ہاتھوں میں بوند بوند اس کی زندگی بہتی رہی اور میں محض ایک تماشائی کی طرح دیکھا کیا۔ اس کے درد کی کیا شدت رہی ہوگی۔ موم کی طرح پل پل پگھلتی ہوئی بہتی ہوئی زندگی کے درد کا کون اندازہ کر سکتا ہے مگر اپنے آخری لمحات میں بھی وہ اپنے آنچل سے میرے ہی آنسو پونچھتی رہی۔ جیسے میرے آنسوؤں کے لیے اپنی موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس کے بجائے اگر کہیں میں مر گیا ہوتا تو وہ کیا کرتی۔ وہی جو میں

سنے کیا۔ نہ جانے مجھے کیوں کر یقین ہے کہ وہ میری طرح بے حیا نہ تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی جان دے دیتی۔ ایک بار اس نے کہا تھا "تم یہ کاشش ہو میں تمھاری چھایا ہوں۔ تم ہو اسی سے میں ہوں، تمھارے بغیر میرا کوئی وجود نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" گویا میری ذات ہی اس کی ہستی کا واحد سہارا تھی میں نہ رہتا تو وہ بھی نہ رہتی۔ عورت بہت مہان ہوتی ہے ستر ماجی۔ آدمی عورت کی دُنیا ہوتا ہے مگر آدمی کی دنیا بہت نبی چوڑی پھیلی ہوئی دھوپ چھاؤں ہے جس میں عورت ہے تو مگر سب کچھ نہیں۔ کچھ ہے تو بادلوں کے سایوں میں چھپے واسے رنگین شیریں خوابوں کی سی ایک ہستی ہے۔ نہ جانے ایسا کیوں ہے نہ جانے یہ سب جانتے بوجھتے ہوئے بھی لوگ کیوں محبت کرتے ہیں کیوں ایک ساتھ جینے مرنے کے جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔ کیچڑ میں پڑے پڑے سبھی ستاروں کی طرف جھانکتے رہنا آدمی کی پرانی عادت ہے۔ یہ عادت کبھی نہیں جائے گی۔ یہ چلی جائے تو زندگی کیسے چلے۔ یہ میٹھا سا سہرا جھوٹ ہی تو زندگی کا سہارا ہے اسی پر تو یہ دنیا اور اس کے رشتے ناتے قائم ہیں۔ ۔ ۔

"جھوٹ فریب کی یہ خوبصورت دُنیا ۔ ۔ ۔"

دیکھئے نا وہ نہیں ہے اور میں نے یہ گھر بنوایا ہے اسے خوبصورت اور آرام دہ بنانے کی ہر طرح پوری کوشش کی ہے۔ یہ کمرہ سجایا ہے یہ نیا فرنیچر، یہ قیمتی قالین، یہ کتابیں، یہ الماری، اس بات کی تو ضامن ہیں کہ میں زندہ ہوں اور اسی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ آنسو جو میں اپنے محبوب کی یاد میں کبھی کبھی بہا دیتا ہوں میں سمجھتا ہوں یہ بھی جینے کا ایک حربہ ایک ڈھنگ ایک بہانہ ہے۔

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔ آنکھیں موند کر انھوں نے اپنا سارا جسم صوفہ چیر کی بیک پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ۔ ۔ ۔ جب دیر تک وہ یوں ہی پڑے رہے تو ہمیں لگا کہ مصلحتاً ہی سہی کچھ نہ کچھ کہنا ہمارے لیے بھی ضروری ہے۔ مگر ہم نے جو کیا وہ بناوٹ دھتی ہمارے دل کی آواز تھی۔ آپ نے اچھی صورت، صحت، جائداد اور آمدنی وغیرہ کے باوجود آج تک شادی نہ کی، یہی کیا کم ہے۔ مرجانا میرے نزدیک اتنی بڑی قربانی نہیں جتنی درد کو اس طرح دل میں سموئے اور سمیٹے ہوئے جانے میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں اچھا ہی ہوا جو آپ نے کبھی شادی نہ کی۔ سکیشنی سے آپ کی شادی ہو گئی ہوتی تو آپ کے جذبۂ عشق میں یہ شدت نہ رہتی۔"

پروفیسر نے آنکھیں کھول کر حیرت سے ہم دونوں کی طرف دیکھا "آپ کیا کہہ رہے ہیں سکیشنی تو میری بیوی تھی۔"

تو آپ نے شادی بھی کی تھی۔" اب تو بیگم کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ بوکھلا سی گئیں۔ "سکیشنی میرے سکول کے ہیڈ ماسٹر کی چھوٹی بیٹی تھی"

ہم نے دیکھا کہ بیگم کے تنے ہوئے خدوخال قدرے ڈھیلے پڑے ہیں اور انھیں قدرے تسلی بھی ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ تصویر والی لڑکی کی بڑی بہن تو ہو سکتی تھیں۔ مگر ان کے والد کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر وغیرہ نہ تھے۔ محکمہ جنگلات کے ایک بڑے افسر تھے۔ یہ تو اب ظاہر ہی تھا کہ پوری مشابہت کے باوجود تصویر والی لڑکی منجو نہ تھی، سکیشنی تھی۔ کون جانے۔ کہتے ہیں دنیا میں کوئی دو چہرے ایک جیسے نہیں ہوتے،

سوا جڑواں بہنوں یا بھائیوں کے۔ مگر دنیا کو بنانے والے کے لیے کیا مشکل وہ سب کچھ کر سکتا ہے ہو سکتا ہے ہماری منجو سکیشنی ہی کا دوسرا جنم ہو۔ ہو گا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہے۔ پروفیسر کو بتا دیا جائے کہ سکیشنی مری نہیں، زندہ ہے اور آج بھی اسی طرح لگتی ہے جیسے بیس سال پہلے لگتی تھی تو کیا ہو۔ وہ خوشی سے مر جائے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے منجو کا بنا بنایا سورگ بن جائے۔ مصلحت اسی میں ہے کہ چپ رہا جائے۔ یہ غم پروفیسر کا نجی اثاثہ۔ گذری ہوئی وہ ساعتیں اب مٹی بن چکی ہیں، اب اس مردہ مٹی میں دوسری الجھنوں کے جھاڑ بو دیے گئے تو انھیں لہو کی کھاد سے سینچنا ہو گا۔

" اچھا طالب علم ہونے کی وجہ سے میں ہیڈ ماسٹر کا چہیتا شاگرد تھا اور گھر میں میرا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا کبھی ان کی کوئی فائل پہچانے تو کبھی سکول۔ مختلف امتحانات کے ریزلٹ ٹیبولیٹ کرنے میں ان کی مدد کے لیے جس کا کوئی بھائی نہ تھا۔ تب مجھے دادا کہہ کر بلاتی تھی اور خدا گواہ ہے کہ تب من میں بھی اس کے تئیں کوئی ایسا ویسا وچار نہ تھا۔ وہ میرے گورو کی بیٹی تقریباً میری ہی ہم عمر۔ اس کا احترام کرنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی پڑھائی بھی اس کی مدد کیا کرتا تھا۔ خاص کر حساب وغیرہ میں جس میں اسے کوئی دل نہ تھی۔ ایک روز اس نے کہا تھا "حساب خالص مردانہ سبجیکٹ ہے مجھے تو بس پاس کرنا ہے"۔ "آگے نہیں پڑھو گی" میں نے پوچھا تھا۔

"تم کہو گے تو پڑھ لوں گی ورنہ نہیں۔ مجھے نوکری وکری تو کرنا نہیں ان کتابوں سے ماتھا پچی کی جائے۔"

"میرے کہنے پر ہی کیوں پڑھو گی۔"

"لوگ کیوں پڑھتے ہیں؟۔

اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے۔

نہیں سورج میں کھڑا ہونے کے لیے اس نے انگریزی کے مشہور محاورے کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

تمھیں سورج میں کھڑا ہونا پسند نہیں۔

سورج کی چھایا میرے لیے زیادہ سکھ دایک ہے۔ اپنے بل بوتے پر کھڑے کا نہ میرا کوئی ارادہ ہے نہ اس کی سکت ہی مجھ میں ہے۔ میں تو تمہاری چھایا بن چاہتی ہوں یہی ڈیڈی اور پاپا چاہتے ہیں۔"

کسی عام لڑکی کے لیے اس طرح کی بات کہہ سکنا کتنا مشکل ہے۔ سکیشنی کے لیے یہ بات اس طرح بغیر اُلجھے الجھائے کہہ دینا فطری تھا۔

پیار کا یہ پہلا انکر تھا جو بعد میں ایک وشال پیڑ بن گیا۔

کالج میں ہم لوگ اکٹھے داخل ہوئے تھے اور بی۔ اے بھی ہم نے اکٹھے کیا۔ میرے اصرار پر ایم۔ اے میں بھی اس نے داخلہ لے لیا۔ ہم دونوں انگریزی زبان و ادب کے طالب علم تھے اور گھنٹوں اپنے سبجیکٹ کے کسی ایک مضمون پر ہم بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ سکیشنی بڑی ذہین لڑکی تھی اور مجھے اک

# فکشن

نہ سے کہیں زیادہ جانتی ہے۔ اس کے والد انگریزی زبان کے ماہرین میں جاتے تھے اور یہ ظاہر تھا کہ ان کی قربت میں رہ کر سکیشنی کی علم اور لٹریچر سے واقفیت مجھ سے کہیں زیادہ تھی پھر بھی اس نے میرے برابر نمبر کبھی نہیں لیے بعد میں معلوم ہوا کہ جان بوجھ کر وہ میرا مقابلہ نہ کرتی تھی۔ مبادا اس سے شکنی ہو۔

یم۔ اے کا آخری سال تھا۔ ایک دن وہ کالج نہ آئی، دوسرے دن آئی تو مجھ یر چپ چلی گئی۔ پھر اُس کا آنا جانا اسی طرح رہنے لگا۔ کبھی آتی کبھی نہ آتی۔ میں نے اُسے ڈانٹا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو پڑی میں نے پیار سے تھا سہلایا تو معلوم ہوا کہ اسے بخار ہے۔ ماتھا سُلگتے ہوئے اپلے کے مانند۔ ظاہر تھا کہ وہ بہت بیمار تھی۔ بے ماں کی بچی کس کو بتاتی اپنے دُکھ کی سپرین کھانے سے بخار اتر جاتا تو کالج چلی آتی ورنہ گھر پڑی رہتی۔

ند ہی دنوں میں اس کی بیماری جیسے مشتہر ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے بیماری کو فرسٹ سٹیج قرار دے دیا۔ آج کل تو ٹی بی کوئی ایسی خطرناک بیماری نہیں تب یعنی آج سے بیس سال پہلے یہ موذی بیماری تقریباً مہلک مانی جاتی س سے بچ جانا ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ سننے میں آیا کہ اس کی ماں بھی ری سے مری تھی۔

"تو کیا میں بھی مر جاؤں گی" ایک بار اس نے ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے

"نہیں تم کیوں مرو گی۔ ابھی تو ہمیں شادی کرنا ہے۔ تمھیں میرے بچوں کی ہے"

"سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم مجھ سے شادی کر لو گے"

"اصل شادی تو ہماری کب کی ہو چکی ہے اب تو صرف گونا ہونا باقی ہے"

جانے میرے ان بظاہر معمولی الفاظ میں کیا جادو تھا کونسی دوا یا مرہم تھی کہ وہ دیکھتے دیکھتے تندرست ہونا شروع ہو گئی اور چند ہی دنوں میں گھر بھی لوٹ . . . . . بیماری کی وجہ سے اس کا فائنل نہ ہو سکا تھا اور میں ایم۔ اے پاس ہنے ہی کالج میں لکچرار بن گیا تھا۔ نوکری کے پہلے ہی سال گرمیوں کی چھٹیوں ہفتہ بھر پہلے خاندان کے ہر فرد کی مرضی کے خلاف میں نے سکیشنی سے یا اور پورے دو مہینے ہم رانی کھیت میں ہنی مون مناتے رہے۔

تنا پیار کیا میں نے سکیشنی سے اور اتنا پیار دیا اس نے مجھے کہ اس میں تو کیا اگلے دس جنموں تک مجھے کسی دوسری عورت کے پیار کی ضرورت۔ پھر ایک دن معلوم ہوا کہ سکیشنی ماں بننے والی ہے یعنی میں باپ بننے والا لگ رہا تھا کہ میں دنیا میں پہلا باپ بننے والا تھا سکیشنی جیسی اپسرا کے بچے کا اکوئی معمولی بات نہ تھی۔

[illegible]

سب جلدی ہو جائے تمہیں نہ ہو مگر مجھے جلدی ہے کون جانے۔" شاید اسے سب کچھ معلوم تھا. . . . . . .

آپ مانیں گی نہیں بھابی مگر یہ واقعی سچ ہے کہ سکیشنی جیسی خوبصورت عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ آپ نے ابھی ابھی اس کی تصویر دیکھی ہے یقین مانیے کہ تصویر میں بھی اگرچہ وہ بے پناہ حسین دکھائی دیتی ہے اور یہ تصویر بھی ایک بڑے اچھے فوٹوگرافر کا کارنامہ ہے مگر یہ بھی پورے طور سے میری سکیشنی کی تصویر نہیں، اس کا محض ایک عکس ہے ایک سایہ ہے۔ خدا کی اپنی ہاتھوں سے بنائی ہوئی اس اپسرا اور کیمرہ کے محدود آرٹ کے اس عکس میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اے کاش! اس کی تصویر بنانے والا کوئی روی ورما ہوتا، کوئی ڈاونچی کوئی ریمبرانٹ، کوئی مائکل اینجلو ہوتا۔

سچ تو یہ ہے بھابی کہ اب مر جانے کو جی چاہتا ہے چندر موہن جسے آپ لوگوں نے ابھی ابھی دیکھا ہے میرا دور کا رشتہ دار ہے۔ اس نے بھی سکیشنی کو دیکھ رکھا ہے۔ سکیشنی کے بارے میں میرے دل کی دھڑکنیں سننے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا ہے محض اسی وجہ سے مجھے اسی کی قربت گوارا ہے ورنہ ؎

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن<br>
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

ظاہر تھا کہ بیگم کے ذہن میں ایک ساتھ سو سو سوالات ابھر رہے تھے اور ان کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا تھا۔ ہم نے انھیں اشارے سے منع کر دیا تھا ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ کیا کیا کہہ یا پوچھ بیٹھتیں۔ اچانک پروفیسر کے منہ سے نکل گیا۔ "بھابی آپ حیران ہوں گی مگر یہ واقعی سچ ہے کہ آپ کے اور میری مرحوم بیوی کے کچھ انگ جیسے ماتھا، سر کے بال، بھویں، آنکھیں، ناک اور ہونٹ اتنے ملتے جلتے ہیں ایک دوسرے سے کہ گمان ہوتا ہے کہ آپ دونوں سگی بہنیں ہیں۔

بیگم نے جواب نہیں دیا۔ پروفیسر اپنی سکیشنی کا راگ اسی رَو میں اور بھی نہ جانے کب تک الاپتا رہتا اگر اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز اُسے نہ روک لیتی۔

اس نے ٹیلی فون اٹھا لیا۔ تار کے دوسرے سرے پر نہ جانے کون تھا مگر جو تھا اور جو بھی بات وہ کہہ رہا تھا پروفیسر کو غیر معمولی طور پر پریشان کیے جا رہی تھی۔ وہ بہت گھبرا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اپنی خفت چھپا رہا تھا۔ دوسری طرف کے سوالوں کی بوچھاڑ کے جواب میں جو الفاظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے اس بات کی نظیر تھے کہ ہم لوگوں سے وہ کچھ چھپانا چاہتا ہے۔ ان کی ہاں ہوں، سوری، ویری سوری کے علاوہ بالآخر جو الفاظ ہماری سمجھ میں آئے وہ یہ تھے کہ چندر موہن گھر میں نہیں ہیں اور وہ ان کے آتے ہی وہ چیز لوٹا دیں گے جس کو لے کر آتی۔ جھک جھک ہو رہی تھی۔ آخر میں انھوں نے جھلا کر کہا "آپ نے آدمی بھیج ہی دیا ہے تو پھر اس قدر چلّانے کی کیا ضرورت تھی۔"

ریسور ٹیلی فون کے آلے میں رکھ کر پروفیسر صاحب لوٹے تو بری طرح بوکھلائے

کوئی دو تین منٹ تک وہ کچھ نہ بولے۔ ہم دونوں میں سے بھی کچھ کہتے نہ بن پڑا۔

ہم سوچ رہے تھے کہ پروفیسر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ ان کا اس کا ذاتی معاملہ ہو سکتا ہے۔ دوست ہیں تو کیا ہوا۔ کن لوگوں میں یہ کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانا سہے۔

ادھر بیگم سوچ رہی تھیں ..... ہو سکتی مگر دو صورتیں ایک جیسی کیسے ہو سکتی ہیں۔ سکیشی میں سال پہلے ..... ایک اسی عمر کی سے ہو سکتا ہے سکیشی ..... مجھے پروفیسر ..... ایک دوسرے ..... خوبصورت بچے کی ماں ..... پروفیسر ..... یہ کون سا جنون سوار ہو گیا تو کیا ہو گا ظاہر ہے ..... اس عورت کی ہو بہو زندہ عورت دیکھ کر کوئی ..... ہو سکتا ہے اور سکیشی سمجھ کر کوئی ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے ..... ہو جائے ..... جیب رہنے ہی میں مصلحت ہے اور یہ بھی طے ہے کہ یہ مکان چاہے کیسا بھی اچھا اور سستا ملتا ہو ہمیں یہاں آ کر نہیں رہنا ..... ہی صورت میں بھی ..... بیوی کے خدوخال دکھائی دیتے ہیں ..... ویسے ہی اتنے تنگ مزاج ہیں۔ مجھے حال پوچھ کر ..... گھر میں طوفان کھڑا نہیں کرنا۔ کون سا ہم مکان خرید رہے ہیں کرایہ پر ہی تو لینا ہے یہ نہیں اور سہی۔

مشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ باہر ایک سکوٹر آ کر رکا جس میں چندر موہن صاحب کے علاوہ ایک دوسرے حضرت بھی تھے۔ ان لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر پروفیسر گھر کے اندر چلا گیا۔

وہ لوگ جیسے ہی کمرے میں گھسے چندر موہن نے آگے بڑھ کر سکیشی کی تصویر کو اٹھا لیا۔ یہ رہی آپ کی امانت، داس صاحب بلاوجہ گھبرا رہے تھے میں تو محض بھائی صاحب کو فریم دکھانے کے لیے لے آیا تھا۔'

نو وارد نے کہا" ابھی پرسوں ہی میں نے اس تصویر کی درجن بھر کاپیاں نکالی ہیں۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر وہ قدرے جھکا۔

" ارے ستر ماجی آپ ا۔ یہ آپ کی سالی ہی کی تصویر ہے۔ داس صاحب پریشان تھے کہ آج شام جب آپ تصویریں لینے آئیں گے تو وہ کیا جواب دیں گے۔ بدقسمتی سے نگیٹیو خراب ہو گیا ہے اور کاپیاں اب نکالی نہیں جا سکتیں۔

ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا" میں نے دیکھا کہ بیگم صاحبہ کا غصہ بھی کافور ہو گیا ہے۔ اور وہ بڑے لطیف انداز سے مسکرا رہی ہیں۔

"چندر موہن نے پوچھا مکان آپ کو کیسا لگا۔"

جواب بیگم نے دیا" مکان تو ٹھیک ہے بھائی صاحب مگر اب صاحب خانہ کو اسے ہمیں اٹھلتے رہے گے۔ اتنا کہہ کر ہم باہر نکل آئے۔ راستے میں کافی دور

"مکالمے پر ہی کیا موقوف ساری کہانی پڑھ یا سکتی !!"

" وہ مکالمہ سرت چندر چیٹر جی کی مشہور کہانی " پرکاش تھا یا " کا ہے۔

" ظاہر ہے کہ پروفیسر بہت پڑھتا ہے۔"

بیچارہ اکیلا آدمی۔

# یہ کون ؟

اختر .....

یہ کون ؟
کہ موت کی آہٹ ہے
جس کی زہریلی سانسوں میں
جبڑوں سے خون ٹپکتا ہے
آنکھوں سے آگ برستی ہے

یہ کون ؟
ہتھیلی سے جس کی
بارود کے ناگ نکلتے ہیں
اور ڈستے ہیں معصوموں کو
مظلوموں کو، مجبوروں کو

یہ کون ؟
کہ جس نے توڑی ہیں
پھولوں سے لدی نازک شاخیں
قدموں سے جس نے روندی ہیں
انسانوں کی ..... فصلیں

یہ کون ؟
کہ جس کے خنجر نے
کاٹی ہے دودھ بھری چھاتی
..... رنگ گلکاریاں بچوں کی
یہ میں بھی نہیں، یہ تم بھی نہیں
اپنا کوئی ہم سایہ بھی نہیں
پھر کون ہے ؟
پھر کون ہے یہ



# صارفین کی خدمت

## چلتا پھرتا بازار

"چلتے پھرتے بازار" کی ۳۵ چلتی پھرتی دکانوں نے دسمبر ۱۹۸۶ء تک ۶ کروڑ ۱۰ لاکھ روپیہ قیمت کی روزانہ کام میں آنے والی چیزیں فروخت کی ہیں۔ یہ بازار اکتوبر ۱۹۸۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ پچھلے تین برسوں میں اس بازار کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور صارفین میں ایک نئی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ اس بازار سے دور دراز کی کالونیوں کے خاص کر جہاں کمزور طبقوں کے لوگ رہتے ہیں، ۲۵ لاکھ ۲۵ ہزار سے زیادہ خاندانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

یہ چلتی پھرتی گاڑیاں روزانہ ۱۰۰ سے زیادہ مقامات پر روزمرہ کے کام میں آنے والی چیزیں مناسب داموں پر لوگوں کو ان کے گھر کے پاس دستیاب کراتی ہیں۔

انتظامیہ اس بازار کے لیے گاڑیوں کی تعداد میں اور فروخت کے لیے روزمرہ کے کام میں آنے والی چیزوں کی تعداد میں اضافہ کر کے اسے اور مضبوط بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ انتظامیہ کا منشا ہے کہ یہ انتظام دلی کے سبھی علاقوں کے لیے دستیاب ہو۔

دلی انتظامیہ نے امور صارفین کے محکمے کی تشکیل کی ہے جو سرکاری اور رضاکار تنظیموں کی کوششوں میں تال میل رکھ کر صارفین کے فائدے کے لیے تقسیم عامہ کے نظام کو مضبوط بنانے کا کام کر رہا ہے۔ تحریک صارفین کو مضبوط کرنے کے لیے اگر آپ کے پاس کوئی تجویز ہو تو تحریر کیجیے۔

**جگ پرویش چندر**
چیف ایگزیکیٹو کونسلر، دلی
اولڈ سیکریٹریٹ، دلی ۱۱۰۰۵۴

محکمہ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ دلی

# CHANGE IS PERMANENT

Change is the essence of growth, an edict of management.

And in today's world, the choice before an organisation is not between 'change' and 'no change', but between managing the change and being managed by events.

Change, when consciously imposed from within, opens up new opportunities, new avenues of growth. Paradoxically, the process of change is, and has to be permanent.

This is the philosophy behind the changing role of MMTC—from a mere canalising agency to an international trading house.

Change, to MMTC, has meant expanding into new global markets, new areas of trade, new products... adopting new strategies like Counter Trade, developing the infrastructure, creating new employment opportunities, growing beyond minerals and metals to a multi-merchandise global trader...

This change, this broadening perspective is reflected in MMTC's performance. MMTC's turnover crossed the Rs. 3,000 crore mark in 1985-86—a three fold increase in three years. Exports doubled to Rs. 600 crore from Rs. 300 crore in 1982-83. Notably there has been a quantum leap in the value of non-traditional exports, from Rs. 1 crore in 1982-83 to Rs. 212 crore in 1985-86! In 1985-86 MMTC earned through exports over 30% of its foreign exchange requirement for imports. Next year the figure is expected to be 50%.

Yes, change is permanent. A philosophy chiselled in the minds of everyone at MMTC, the cornerstone of its success.

**MMTC**
The Minerals and Metals Trading Corporation of India Limited
Express Building Bahadurshah Zafar Marg
New Delhi-110 002

# Making life a tasty affair-!

## BHUTAN'S

# DRUK

**Squashes, Juices, Jams,
Tomato Ketchup**

Prepared from the finest fresh fruits DRUK fruit products provide extra nourishment your family needs. Everybody will relish the taste and ask for more. Give them a healthy break at breakfast. Serve them DRUK fruit products.




BFP-NP-121

**BHUTAN FRUIT PRODUCTS LTD., SAMCHI-BHUTAN**

Trade enquiries to :

**TRADE LINKS LIMITED,** *'Prabhat Kiran'*, 17, Rajindra Place, New Delhi.

ادیب سہیل (پاکستان)

# میاں تان سین

"تان سین جیسا باکمال موسیقار ہزار برس کے اندر پیدا نہیں ہوا" ابوالفضل

تعجب ہے کہ تان سین کے متعلق آئین اکبری میں ابوالفضل نے بھی چند جملوں سے زیادہ نہیں لکھا۔ تان سین کی عظمت کے معترف ہوتے ہوئے بھی ابوالفضل نے اس کے متعلق تفصیلات میں جانے سے نہ جانے کیوں اور کس مصلحت کی بنا پر احتراز کیا۔ اگر آئین اکبری میں یہ چند جملے نہ ہوتے تو سند کے ساتھ تان سین کے دور کا تعین بھی مشکل ہو جاتا۔ مختلف ذرائع سے جو پیدائش اور وفات کی تاریخیں حاصل ہوئی ہیں وہ اس قدر اختلافی ہیں کہ قاری کے ساتھ ساتھ اہل علم حضرات کے لئے بھی کسی نتیجے پر یقین کے ساتھ پہنچنا دقت طلب ہے۔ تان سین ہی پر کیا موقوف ہے اس کے ہم عصروں میں کسی کے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات فراہم ہونا مشکل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس دور میں کسی فنکار کی شخصیت اور اس کے فن پر مضامین لکھنے کا رواج کم تھا۔ ان کے متعلق جو معلومات ہم تک پہنچتی رہی ہیں وہ ناکافی ہیں، اور سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں۔

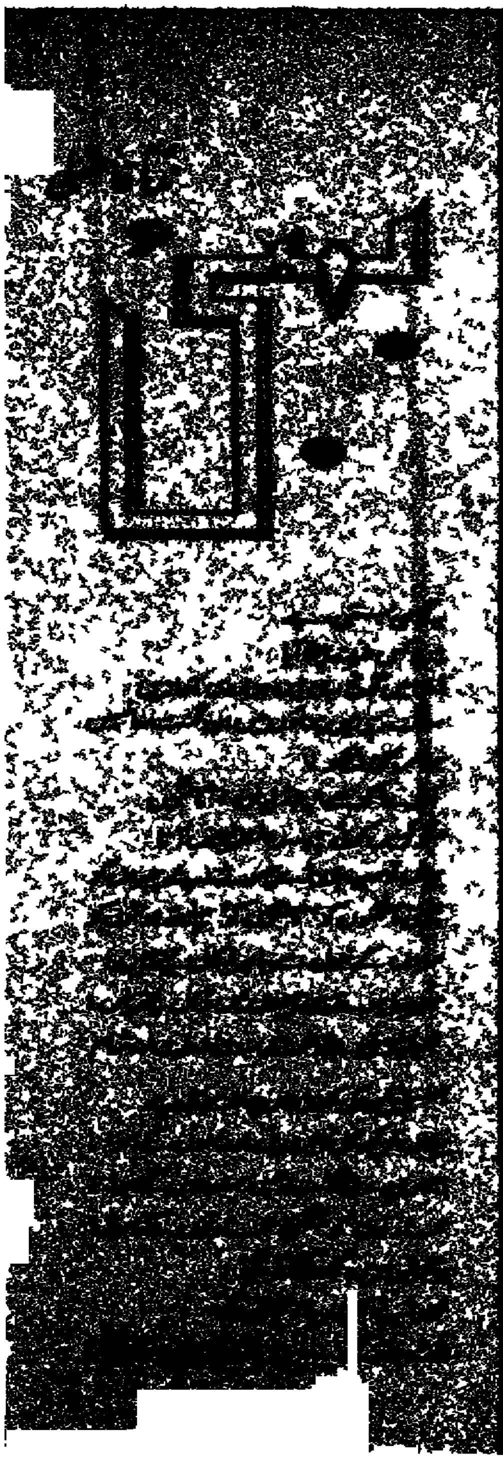
یہ بات بھی نہیں کہ ہم میں سے ایسے صاحب علم نہیں جو فن موسیقی کے دونوں شعبوں (میرا مطلب ہے تحریری اور عملی) پر یکساں قدرت نہ رکھتے ہوں۔ پاک و ہند میں یقیناً ایسے بہت سے افراد ہیں جو اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے حضرات آگے آئیں اور اپنی فنی بصیرت کو بروئے کار لاکر آنے والی نسلوں کو اس بے چارگی سے بچالیں جس کا آج کی نسل شکار ہے۔ میرا مطلب ہے فنکاروں کی زندگی کے حالات، شخصیت اور فن کے بارے میں جاننے کے لئے جس طرح ہم آج مضطرب ہیں۔ ہماری اولادوں کو اس کرب و اضطراب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بہرحال میاں تان سین کے سلسلے میں مختلف ذرائع سے جو مواد فراہم ہو سکے ہیں ان کی ترتیب یوں ہو سکتی ہے۔

میاں تان سین بیہٹ کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ کا نام مکرند پانڈے تھا اور میاں تان سین کا اس وقت کا نام ترلوچن داس۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ایک صوفی بزرگ حضرت محمد غوث گوالیاری کے زیر سایہ ہوئی۔ اس کا سبب یوں بتایا جاتا ہے کہ مکرند پانڈے کے گھر کوئی اولاد نہ ہوتی تھی اس زمانے میں کسی کے گھر اولاد نہ ہونے کو خاصا بڑا حادثہ خیال کیا جاتا تھا۔ مکرند پانڈے کو جب ان بزرگ کی خبر لگی تو وہ ان کے حضور میں پہنچے اور اپنی بپتا سنائی۔ حضرت غوث نے جواباً کہا کہ تیرے گھر ایک لڑکا پیدا ہوگا وہ تیرا نام روشن کرے گا۔ مکرند کے گھر سال بھر بعد تان سین پیدا ہوا۔ خوشی منائی گئی اور جب چار پانچ سال کا ہوا تو مکرند پانڈے نے اس کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت غوث گوالیاری ہی کا انتخاب مناسب سمجھا کچھ محقق حضرا

غزل

[illegible]



کی شخصیت کی تعمیر میں حضرت غوث محمد کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ ان بزرگ کے ملنے والوں میں متھرا کے سوامی ہری داس بھی تھے جو ان کے یہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ اور یہیں سے تان سین کا تعارف سوامی ہری داس سے ہوا جو ان کے فن موسیقی کے استادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں نائک بخشو کی صاحبزادی (مقیم حیدرآباد دکن) کا بھی ذکر کیا ہے جو اپنے باپ کی صحیح نمائندہ تھی۔ ان کے علاوہ نائک بخشو کے دو بڑے جانشین مچھوا اور بھنور کا بھی گان ودیا لگرالیار میں ساتھ رہا ہے۔ وہ گان ودیالیہ جسے دھرپد کے موجد اور وقت کے بڑے نائک راجہ مان سنگھ نے قائم کیا تھا۔ اور جس کے اعلیٰ فنکاروں میں خود اس کی بیوی مرگ نینی شامل تھی۔

عجب اتفاق دیکھئے کہ تان سین کی بیوی حسینی (مرگ نینی کی شاگرد) کی بھی پرورش حضرت محمد غوث ہی نے کی تھی۔ وہ بھی برہمن لڑکی تھی اور تب اس کا نام پریم کاری تھا۔ ان ساری تفصیلات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تان سین اور حسینی کی شخصیت وفن کی تعمیر میں اس مثلث نے بہت اہم فرائض انجام دیئے ہیں جس کی تین شاخیں، حضرت غوث محمد، سوامی ہری داس اور گان ودیا گرالیار (یعنی مرگ نینی، راجہ مان سنگھ اور بھنو نائک)۔

تان سین ابتدا میں شیر شاہ کے لڑکے دولت خان کے پاس تھا جس سے اسے بہت قربت تھی۔ اس کے بعد وہ عزت واحترام کے ساتھ راجہ رام چند گھیلہ کے یہاں رہنے لگا۔ راجہ رام چند نے اس کے فن کے احترام میں اس کی سواری کو کاندھا تک لگایا۔ انعام واکرام کی تو انتہا کر دی تھی۔ جب اس کی شہرت شہنشاہ اکبر تک پہنچی تو اس نے سردار جلال الدین کرچی کے ذریعے اسے اپنے دربار کے لئے مانگ لیا۔ (ایک روایت کے مطابق زین خان نے اکبری دربار تک پہنچایا تھا۔)

تان سین نے مختلف راگ بھی اختراع کئے ہیں جن میں درباری کانہڑا، میاں کی ٹوڈی، میاں کی ملہار، میاں کی سارنگ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ راگوں کی مناسبت سے بولوں کی تصنیفات بھی جابجا کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ عطیہ بیگم فیضی کی تحریر کے مطابق ٹھاٹ کی پہلی ترتیب کا کام بھی تان سین ہی نے شروع کیا تھا۔ ہندوستانی موسیقی (کرناٹکی موسیقی اس میں نہیں آتی) میں آج بھی سب سے زیادہ میاں تان سین اور ان کی اولادوں کی گائیکی ہی کا عمل دخل ہے اور ہر دور میں دوسری گائیکی کے مقابلے میں اسے ہی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ خود فرماں روائے اودھ واجد علی شاہ جیسی عظیم شخصیت نے بھی دربار کی زینت کے لئے میاں تان سین ہی کی اولاد میں سے پیار خاں، باسط خاں اور جعفر خاں کا انتخاب کیا اور زانوئے تلمذ ان کے آگے تہ کیا۔ ان سے قبل محمد شاہ فرماں روائے دلی کے درباری گویوں میں بھی تان سین کے نواسوں کے گھرانے کے ایک بزرگ میاں نعمت خان سدا رنگ مشہور و معروف ہوئے اور خیال کو ایک نئے سرے سے بنا سجا کر قبول عام کا درجہ دیا۔ جن کے سیکڑوں بول آج بھی زبان زد ہیں۔ پنڈت وی۔ این۔ بھاتکھنڈے اسی گھرانے کے ایک بزرگ محمد علی خاں کے شاگرد تھے۔ استاد حافظ علی خاں اور استاد علاؤ الدین خاں اس دور کے عظیم سرود کار بھی اسی گھرانے کے ایک بزرگ اور رام پور کے درباری سرود کار وزیر خاں کے تربیت یافتہ ہیں۔

گوالیار کے رہنے والے خلیفہ بادل خاں، محمد شاہ کے دربار کے چھجو خاں کے گھرانے سے تعلق رکھتے

بنارس کے رہنے والے پنڈت سدرشن شاستری جی تان سین کی اولاد میں سے ایک عظیم سازکار امرت سین کے شاگرد تھے۔

گوالیار کے راجہ کے خاندان کے ایک فرد بھیا جی گنپت راؤ نے وینا استاد بندے علی خاں سے سیکھی تھی۔ اور بندے علی خاں سین خاندان کے فرد تھے۔

بڑے سرود کار استاد کرامت اللہ کی تعلیم و تربیت بھی سین خاندان کے افراد سے ہوئی تھی۔

رام پور کے عظیم سرود کار فدا حسین نے بھی سین گھرانے سے یہ فن حاصل کیا تھا۔ پوربی اور پچھمی باج کے استادوں اور ماہروں میں تھے۔ راگ ودّیا اور راگ اور گت پر ماہرانہ دسترس تھی۔ اندور کے مشہور بین کار مجید خاں صاحب استاد بندے علی کے شاگرد تھے۔ اس طرح ان کا تعلق بھی سین گھرانے سے ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہوئیں بڑی بڑی ہستیاں۔ ان کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے رباب کاروں سرود کاروں اور بین کاروں نے میاں تان سین کی اولادوں کی اولاد سے اس عظیم ورثے کو حاصل کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ محمد علی خاں نے ٹھیک ہی کہا تھا ہندوستانی موسیقی کی ترویج و اشاعت میں سین خاندان کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ رباب کاری کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ میاں تان کے بیٹے کی طرف سے چلا اور بین کاری بیٹی کی طرف سے۔ میاں تان سین کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے بلاس خاں (معدن الموسیقی میں داماد بتلایا گیا ہے۔ جو غلط معلوم ہوتا ہے) ترنگ سین، سرت سین، صورت سین اور بیٹی سرسوتی تھی۔ سرسوتی کی شادی مصری سنگھ (راجہ سموکھن سنگھ کے بیٹے) سے ہوئی تھی۔ معدن الموسیقی کے مصنف نے سموکھن سنگھ ہی کو تان سین کا داماد بتایا ہے۔ جو قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ راجہ سموکھن سنگھ تان سین کا ہم عمر تھا اور اکبر کا درباری تھا جس کا نام قبول اسلام کے بعد نوبت خاں (؟) پڑا تھا۔

اب اپنے محترم قارئین کی مزید معلومات اور دلچسپی کے لئے بیٹے اور بیٹی کی جانب سے میاں تان سین کی اولادوں کے شجرے بھی ذیل میں درج ہیں۔

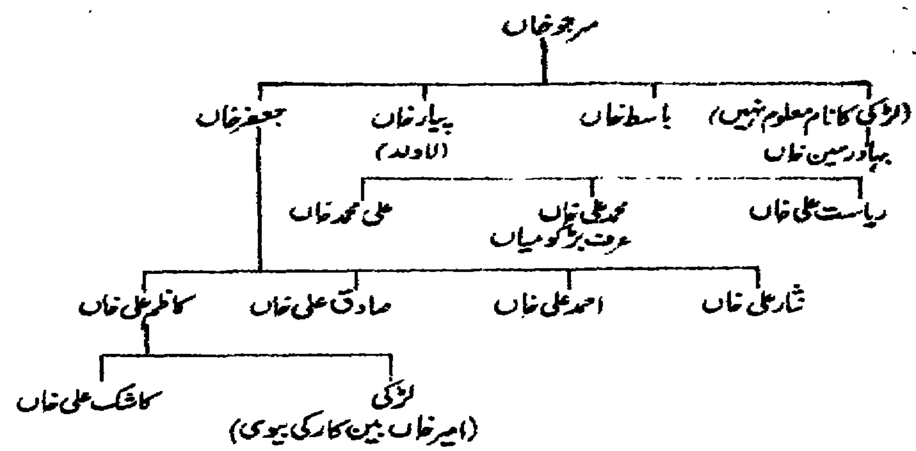
**بیٹے کی طرف سے**

- میاں تان سین
  - سرسوتی دیوی
  - بلاس خاں
    - دیال سین (لاولد)
    - اودے سین
      - کریم سین
        - راگ رس خاں
          - مسیت خاں
            - بہادر خاں (لاولد)
        - سود ھر خاں
          - حسن خاں (سفید دیو بھی کہلاتے تھے)
            - گلاب خاں
              - جیون خاں
                - بہادر خاں
                - حیدر خاں
                - باقر خاں
              - گیان خاں (لاولد)
              - چھجو خاں یا سرجو خاں
  - ترنگ سین
  - سرت سین
  - صورت سین

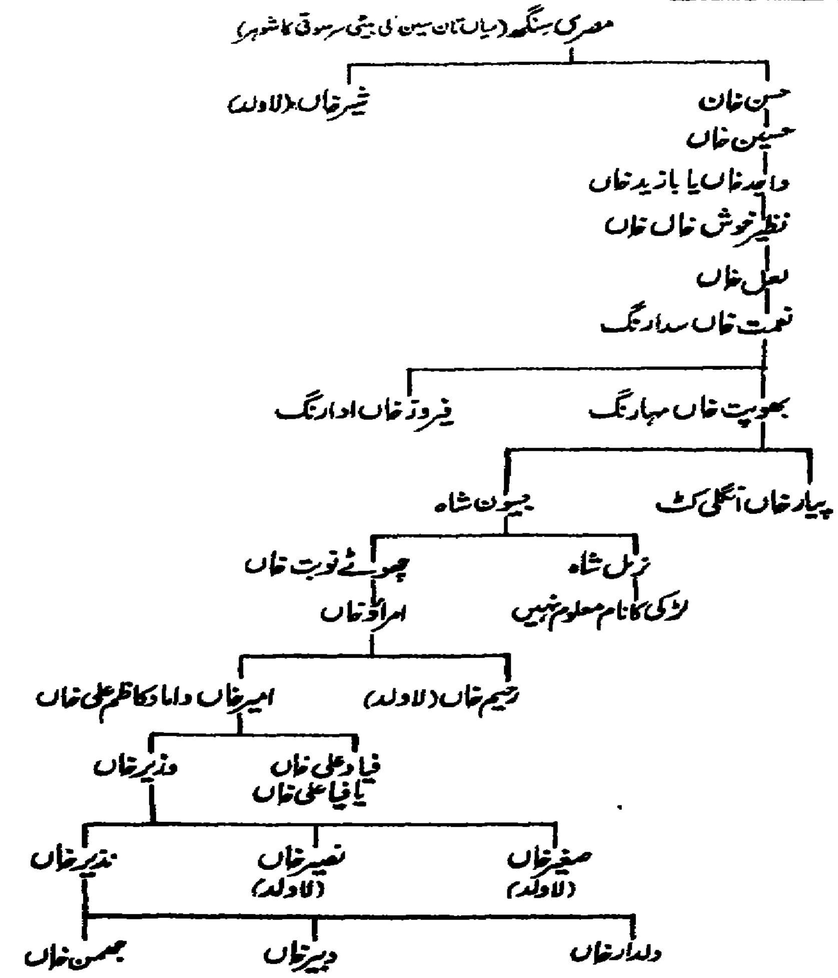
## غزل

**کالی داس گپتا رضا**

دل بھیگی رات بن گیا ہے
یادوں کی برات بن گیا ہے
پلکوں پہ گھٹا دھنک نظر میں
جو بن برسات بن گیا ہے
آرام ہمہ جہت اب آرام
دکھ جزو حیات بن گیا ہے
آتے جاتے رُلا رہا ہے
تار خیرات بن گیا ہے
لحظہ لحظہ سرود زنجیر
قیدی کی نجات بن گیا ہے
اللہ رے سماں ۔ یہ تیرہ بختی؟
دن کالی رات بن گیا ہے
تھا تلخ زمانہ، تیرے ہوتے
اب قند نبات بن گیا ہے
رگ رگ میں یہ رقص ناز ۔ تو یہ
غم ، غمزۂ ذات بن گیا ہے
محفل میں رضا کا یوں پہنچنا
افسوس کی بات بن گیا ہے




بیٹی کی طرف سے



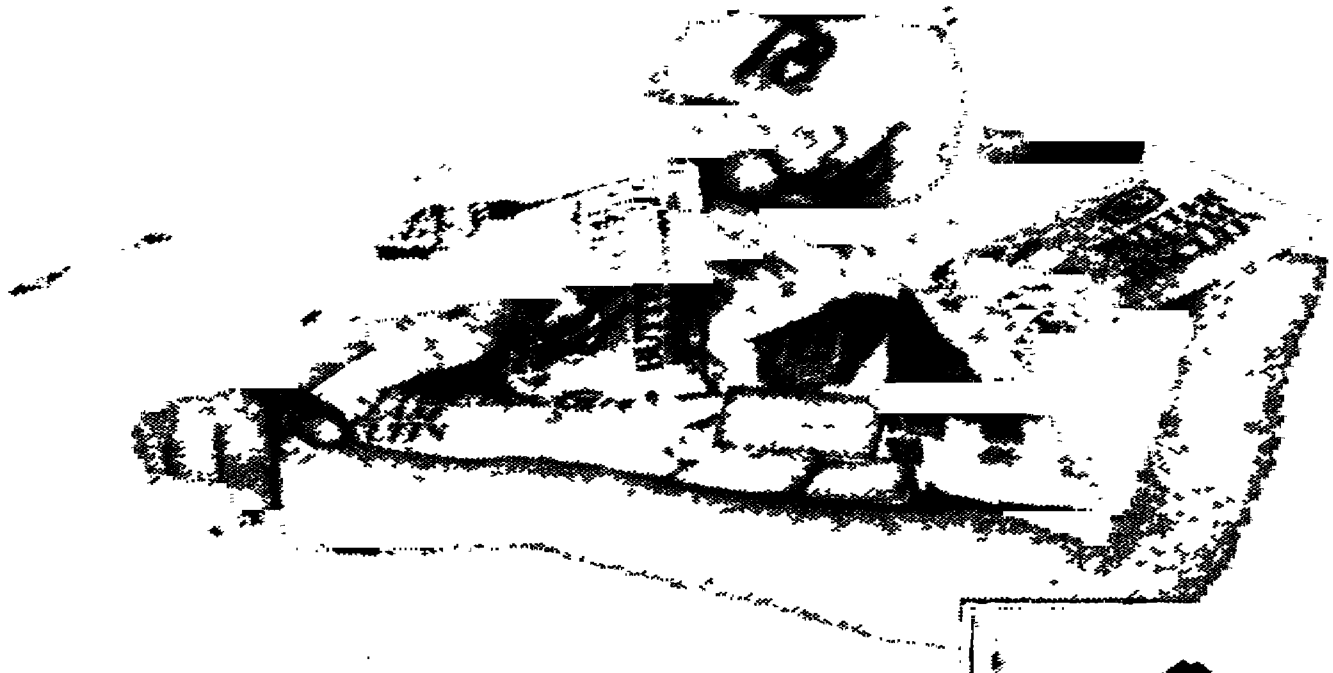

[illegible]

[illegible]

ہائے وہ تنہائی [illegible]
ساری بستی [illegible]
سارے چہرے [illegible]
دل میں کوئی چور چھپا ہے
[illegible]
بچھڑے ساجن کب ملتے ہیں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
پھر سے [illegible] دنیا
جام تمنا [illegible]

---

[illegible]





# A LOT OF CRUNCH IN EVERY MUNCH!

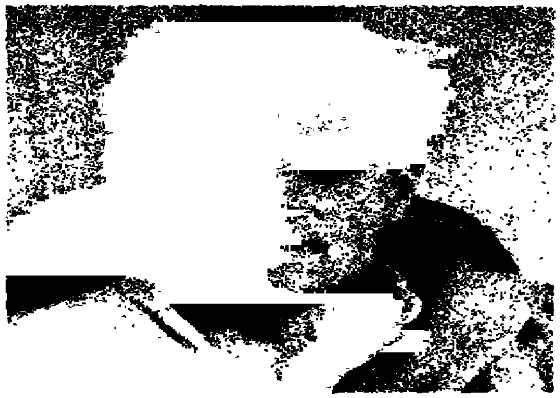
- BUTTER CREAM BISCUIT
- ORANGE CREAM BISCUIT

**Introduce your family to the crisp, wholesome goodness of K.C. Biscuits TODAY.**

- **Address:**

**K.C. Food Products Pvt. Ltd.**
**Jammu 180001, India**

# HIMACHAL IS SIXTEEN



*Prime Minister*

Since 1971, when Himachal Pradesh was admitted as a State to the Union of India, the simple, honest, peace-loving and hard-working people of the Pradesh have crossed many a milestone in their endeavour for a better life.

Thanks to the special consideration shown to us by Pandit Nehru, Smt Indira Gandhi and our forward-looking Prime Minister Shri Rajiv Gandhi, we have never looked back.

**Facts speak for themselves:—**

| | 1971 | 1987 |
|---|---|---|
| Fruit Production | 1.78 lakh tonnes | 3.91 lakh tonnes |
| Food Production | 9.34 lakh tonnes | 13.20 lakh tonnes |
| Roads | 7,746 kms. | 16,000 kms. |
| Villages with piped water supply | 2,236 | 13,632 (80% of total villages) |
| Electrified villages | 4,085 | 15,776 (93%) |
| Health Institutions | 620 | 2,184 |
| **Education** | | |
| Literacy percentage | 31.96 | 45 (estimated) |
| Schools | 4,945 | 9,600 |
| Colleges | 17 | 30 |
| Universities | 1 | 3 |
| **Transport** | | |
| No. of buses | 525 | 1,308 |
| No. of routes | 214 | 1,060 |
| Route kilometerage | 90 lakhs | 8.44 crores |
| **Per Capita Income** | Rs. 676.01 | Rs. 2,316 (1984-85) |
| **Annual Plan Outlay** | Rs. 17.28 crores | Rs. 205 crores (1986-87) |
| **Annual Budget** | Rs. 98.32 crores | Rs. 602.87 crores (1986-87) |

**Today, we rededicate ourselves to the unity and integrity of the nation and development and defence of the country, and reiterate our commitment to secularism and socialism.**



**—:Him lok sampark:—**

ماہنامہ
# حالِ ہند

جلد ۲ • شمارہ ۴ • اپریل ۸۷ ۱۹ء






# حرفِ دانش

سچائی کی سازگار زمین پر قدم جمانے سے جو نشاط ملتی ہے اس کا مقابلہ کوئی دوسری خوشی نہیں کر سکتی ۔

سچائی انسان کے اندر ہوتی ہے ۔ یہ باہر سے وجود پذیر نہیں ہوتی ۔

جو بات عجیب سی لگتی ہے وہ ضرور سچی ہوگی کیونکہ سچائی ہمیشہ بلکہ افسانوں کی نسبت بھی زیادہ عجیب و غریب ہوتی ہے ۔

سچائی تو سورج کی ایک کرن کی طرح ہے جسے کسی باہری لمس سے میلا نہیں کیا جا سکتا ۔

سچائی بہت سی قسموں پر مبنی نہیں ہوتی ۔ سچائی کے لیے ایک ہی قسم کافی ہے ۔

سچائی ہر محاسبے کے اختتام تک سچائی ہی رہتی ہے ۔

ایک سادہ سی سچائی دیانت دار انسان کی سب سے بڑی ہنرمندی ہے ۔

مہاپرشوں کا کہنا ہے کہ سچائی ایسے عجیب و غریب مکان میں رہنا پسند کرتی ہے ۔ جو کنویں کی تہہ میں ہوتا ہے ۔

اچھے انسان کا وجود ایسی اچھائی پر مبنی ہے جو سچائی اور دیانت داری پر مشتمل ہے ۔

دیانت دار اور سنجیدہ لوگ سچائی کو چھپانے کی فضول کوشش میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے ۔

سچائی اکثر مصلوب ہوتی ہے اور برائی نے راج کیا ہے ۔ پھر بھی سچائی نے مستقبل میں مقام پایا ہے اور خدا کو مانوس رہی ہے ۔

اس دنیا پر سچائی ، حسن کے روپ میں ظاہر ہوئی ہے اور اسے اسی صورت میں دیکھنا چاہیے ۔

[redacted]

# احباب کہتے ہیں

حال ہند برابر مل رہا ہے۔ قیام دہلی کے دوران ادبی محفلوں میں آپ کی شخصیت کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا تھا۔ حال ہند دیکھا تو جو دیکھا تھا وہ محض افسانہ نہیں تھی۔ اردو میں حال ہند سے پہلے ایسا پرچہ نہیں نکلا۔ بات اختلافی ضرور ہے مگر جن رسائل کا نام گنوایا جاتا ہے ان میں کتابت اور طباعت کس معیار کی ہوتی تھی یہ بھی سب جانتے ہیں۔

فاروق بخشی
کوٹہ

مجھے امید ہے کہ قارئین حضرات اس رسالے کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد یقیناً محسوس کریں گے کہ جناب ڈی ڈی ٹھاکور صاحب، جمنا داس اختر صاحب، اور بلراج ورما صاحب نے حالیہ اردو ادب میں جس قسم کے ایک سنجیدہ متوازن اور خوبصورت رسالے کی ضرورت تھی اس کو بروقت پورا کیا ہے۔

سید شمیم شاہ
نئی دہلی۔

ماہنامہ "حال ہند" کے دو شمارے نظر افروز ہوئے۔ بے شک ہم اردو والوں کے لیے جشن منانے کی بات ہے کہ اب ہماری مادری زبان میں بھی انگریزی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں شائع ہونے والے نیوز میگزین سے بھی زیادہ دیدہ زیب دلکش، اعلیٰ درجہ کی صحافت کا نمونہ ایک مکمل نیوز میگزین معرض وجود میں آچکا ہے، جو کتابت طباعت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے اور جس کی صحافت میں جانب داری، پاسداری اور فرقہ واریت کی بو نہیں آتی۔

این۔ اے
مونگیر

"حال ہند" کا تازہ شمارہ برائے فروری دیکھا دل باغ باغ ہو گیا۔ حال ہند اپنی نوعیت اور ہیئت کے لحاظ سے اردو میں بے مثال رسالہ ہے۔ اس کے مندرجات عالمانہ اور علم و فہم کو بڑھانے والے ہیں۔ مجھے خاص طور پر "قدیم ہندوستان میں سفر اور شاویلس کمپنی کے امور" بہت پسند آئے۔ اقتصادی امور پر لگاتار توجہ رکھیں چونکہ عام طور پر اقتصادی شعور ہم لوگوں میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور اس کی شدید ضرورت ہے۔

بہ حال حال ہند سے آپ نے اردو میں ایک ایسے خلا کو پُر کیا ہے کہ اگر یہ نکلتا رہا تو اردو صحافت کی تاریخ میں سنگ میل بن جائے گا۔

انوار رضوی
نئی دہلی۔

"حال ہند" شمارہ ۳ مارچ ۱۹۸۷ ملا حیرت ہوتی ہے کہ ایک ماہ کے اندر اندر آپ اتنا مسالہ کیسے اکٹھا کر لیتے ہیں۔ لیکن اس میں سیاست۔ ریاست۔ تجارت۔ جماعتیں۔ تحریکیں۔ صنعت۔ جنگ۔ مزدور وغیرہ کی باتیں زیادہ ہوتی ہیں اور ادب کی بات آٹے میں نمک کے برابر۔ بہر صورت مختلف موضوعات پر تازہ بہ تازہ مال مسالہ یہی پرچہ دیتا ہے۔

رام لعل نابھوی

# فہرست







اداریہ

# وزیراعظم کے لیے لمحۂ فکریہ

گزشتہ ایک ماہ میں ملک میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں، جو براہ راست وزیراعظم راجیو گاندھی پر ذاتی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں، وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ کے درمیان کشیدگی جو کافی عرصہ تک قیاس آرائیوں تک محدود تھی، وہ صدر جمہوریہ ہند کے ۹ مارچ کے خط کے بعد منظر عام پر آچکی ہے۔ لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے اندر حزب مخالف نے اس کشیدگی کا پورا فائدہ اٹھا کر اس کو ایک ملک گیر مسئلہ بنانے کی کوشش کی، اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کی تین ریاستوں میں انتخابات کے نتائج بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ کیرالہ کی ریاست کانگریس (آئی) کے حلقۂ اثر سے نکل گئی ہے، اور اسی طرح ہندوستان کی چوبیس ریاستوں میں سے گیارہ ریاستوں پر مخالف جماعتیں قابض ہو چکی ہیں۔ مغربی بنگال میں وزیراعظم کی بھرپور کوشش کے باوجود کانگریس کی نشستیں ۹۴ سے گھٹ کر ۴۰ تک پہونچ گئی ہیں، جب کہ جموں صوبہ میں کانگریس ۲۳ سے بڑھ کر صرف ۲۴ تک ہی پہونچ سکی ہے۔ یہ نتائج اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ کانگریس (آئی) کیرالہ اور مغربی بنگال میں اپنا باقی ماندہ اثر بھی کھو رہی ہے اور جموں و کشمیر میں متحدہ محاذ کی کامیابی ۱۹۸۳ء کے انتخابات سے کچھ ایسی بہتر نہیں ہے۔ حوصلہ افزا بات صرف اتنی ہے کہ ضمنی انتخابات میں آٹھ میں سے سات نشستیں، اور لوک سبھا کی تین کی تین نشستیں کانگریس نے حاصل کر لیں، تاہم مجموعی طور پر کانگریس کے لیے یہ صورت حال کسی بھی طرح حوصلہ افزا تصور نہیں کی جا سکتی۔ ہریانہ کے انتخابات راجیو گاندھی اور ان کی کانگریس کے مستقبل کے لیے ان حالات میں فیصلہ کن ثابت ہوں گے۔ اگر کسی وجہ سے کانگریس ہریانہ میں بھی ہار گئی تو اس کا اثر نہ صرف ہندی بولنے والی ریاستوں پر براہ راست پڑے گا بلکہ کانگریس کی پارلیمانی پارٹی بھی اس سے خاصی متاثر ہوگی۔ کافی عرصہ سے کانگریس میں بے راہ روی پیدا ہو رہی ہے۔ دراصل اندرونی انتشار ہی کیرالہ اور بنگال میں کانگریس کی ناکامی کا سبب بنا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پارٹی میں ہم آہنگی اور یک جہتی لانے کی کوشش برقرار رکھی جائے۔ ملک اس وقت مشکلوں سے دوچار ہے اور حزب مخالف اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ کانگریس کا متبادل بن کر سامنے آسکے۔ کوئی بھی غیر یقینی صورت حال جو کانگریس میں پیدا ہوگی، اس کا براہ راست ملک پر اثر پڑ سکتا ہے، اس لیے وزیر اعظم کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے اور ان پر لازم ہے کہ صدر جمہوریہ کے ساتھ کشیدہ تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش کریں اور کانگریس کے معاملات میں احتیاط و تدبر کے ساتھ قدم اٹھائیں۔ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور اگر وقت پر ان حالات پر قابو پانے کی کوشش نہ کی گئی تو کافی حیران کن نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں۔

ایم ایچ سید

# پاکستان کا ایٹم بم



آج کا سب سے گرما گرم موضوع ہے پاکستان کا
سلامی بم اور اس کے خالق سائنسداں عبدالقدیر خاں۔
سلامی بم کا چرچا یوں تو کئی برس سے ہے، مگر گذشتہ دنوں
بدالقدیر خاں کے ایک انٹرویو نے اس گرما گرم بحث کو
ازہ کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق کی کرکٹ ڈپلومیسی نے جس
شگوار فضا کو جنم دیا تھا، اس کا اثر یکسر ختم ہوتا نظر آرہا
ہے، اب تو سرحد کے دونوں طرف صرف اور صرف بم کا ذکر
ہے۔ اُدھر انکار ہے، کچھ بوکھلاہٹ ہے اور کچھ غصہ۔
دھر اندیشے ہیں، وسوسے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ
م و غصہ بھی ہے، اس غصہ کی وجہ ظاہر ہے کہ ہندوستان
بھی بھی ایٹمی طاقت کے فروغ اور اسلحہ کی دوڑ کے حق
یں نہیں رہا۔ اس لیے اگر اچانک یہ دھماکہ خیز اطلاع
لے کہ پاکستان نے خاموشی کے ساتھ "بم" تیار کر لیا

ہے تو اس پر حیرت اور غصہ دونوں فطری ہیں۔
دوسری جانب پاکستان دو ٹوک لفظوں
میں بم کے وجود کا منکر ہے۔ خیر انکار کا لہجہ کتنا ہی سخت
اور لفظ کتنے ہی واضح ہوں، مگر انداز و اطوار یہ چغلی
کھا رہے ہیں کہ غصہ کی اصل وجہ در اصل افشائے راز
ہی ہے۔
یہ سارا قصہ پاکستان کے اسلامی بم کے بانی

آدم ڈاکٹر خان کے ایک انٹرویو سے شروع ہوا ہے
انٹرویو جو ہندوستان کے مشہور و معروف صحافی
جناب کلدیپ نیر نے جنوری کے آخری دنوں میں لیا
تھا، مگر یہ شائع ایک ماہ کے بعد ہوا۔ اور اس کی اشاعت
کی اگلی صبح ہی پوری دنیا میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا
دراصل کلدیپ نیر گذشتہ تین برس سے ڈاکٹر
خان سے ملنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر انہیں کامیابی
نہیں مل پا رہی تھی، اس مرتبہ جب جنوری کے آخری
دنوں میں وہ پاکستان گئے تو ان کے دوست اور انگریزی
اخبار "مسلم" کے مدیر مشاہد حسین نے ان کی یہ مشکل آسان
کر دی۔ وہ جس دن اسلام آباد پہنچے اسی دن ڈاکٹر
خان سے ان کی ملاقات کا بندوبست ہو گیا۔ یہ ملاقات
ڈاکٹر خان کی سرکاری رہائش گاہ پر ہوئی، انھوں نے

کھلے دل سے ہندوستانی صحافی کا استقبال کیا، ان کی
تواضع کی اور ستر منٹ تک گفتگو کی — اور ایک گھنٹہ
دس منٹ کی یہی گفتگو بعد میں دنیا میں طوفان کھڑا
کر دینے کا باعث بنی۔
فروری کے پہلے ہفتے میں کلدیپ نیر ہندوستان
واپس آئے اور انھوں نے اس ملاقات کی بنیاد پر ایک
رپورٹ تیار کر کے لندن کے شہرۂ آفاق اخبار "آبزرور"

کو ارسال کر دی۔ "آبزرور" سے اشاعت کے حقوق کا
سودا اس شرط پر ہوا کہ یہ رپورٹ "آبزرور" کے علاوہ
بھی کئی دوسرے عالمی اخباروں میں شائع ہوگی اور اس
کا معاوضہ "آبزرور" کو ملے گا۔ (یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ
اس کے عوض "آبزرور" نے کافی خطیر رقم کلدیپ نیر کی
خدمت میں پیش کی ہوگی۔) بہر کیف، یہ رپورٹ
"آبزرور" میں شائع ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ
ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے "چائنا مارننگ
پوسٹ" اور کناڈا کے "ٹورنٹو میل" میں بھی شائع ہوئی
دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے قبل ہی اس گفتگو کے
کچھ حصے پاکستان کے کچھ اخباروں میں چھپ گئے تھے
مگر ان پر کوئی واویلا نہیں ہوا تھا، کسی نے توجہ ہی نہیں
کی تھی — لیکن جب یہی رپورٹ بڑی تفصیل اور
پورے اہتمام کے ساتھ "آبزرور" میں شائع ہوئی تو
چہار سو طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔
اطلاعات مظہر ہیں کہ امریکہ کے محکمہ سراغرسانی کو
اس رپورٹ کے بارے میں پیشگی اطلاع مل گئی تھی، انھوں
نے اس بات سے پاکستانی حکومت کو خبردار کیا، اور
اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ کسی بھی طرح اس خبر کو شائع ہونے
سے روکے۔ حکومت پاکستان نے "آبزرور" کی انتظامیہ
پر دباؤ بھی ڈالا، ترغیب بھی دی، مگر وہ لوگ ٹس سے
مس نہیں ہوئے۔ رپورٹ حسب پروگرام شائع ہوئی
البتہ صحافتی دیانت داری کے اعلیٰ ترین معیار کو ملحوظ
رکھتے ہوئے "آبزرور" نے اس رپورٹ کے ساتھ ہی
حکومت پاکستان کا تردیدی بیان بھی شائع کر دیا، مگر
سچ یہ ہے کہ اس وقت اس بیان کو تو کسی نے نہیں پڑھا
سنا، اس پر توجہ دی، لیکن عبدالقدیر خاں کا انٹرویو راتوں
رات زبان زد خاص و عام ہو گیا۔

بھٹو نے کہا تھا:
"ہمیں علم ہے کہ عیسائی، یہودی
اور ہندو قوموں نے بم کی مہارت
حاصل کر لی ہے۔ کمیونسٹوں کے
پاس بھی بم ہے۔ صرف اسلامی
برادری ہی اس سے محروم تھی۔
مگر اب صورت حال بدل گئی"



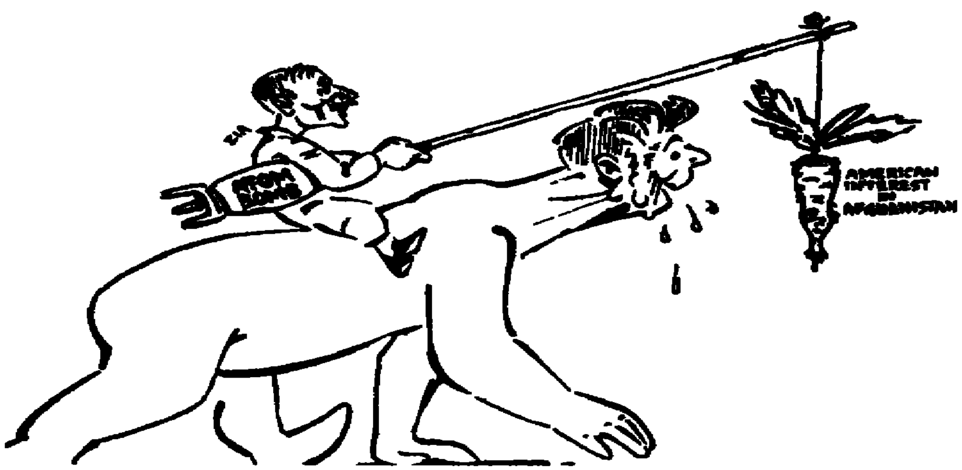


اسی انٹرویو میں عبدالقدیر خاں نے یہ انکشاف
کہ پاکستان ایٹم بم بنا چکا ہے۔ ویسے اس بات کا
ثبوت نہیں کہ پاکستان نے ایٹمی تجربہ کیا ہے لیکن
خاں تجربہ کو ضروری خیال نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے
روری نہیں کہ تجربہ زمین پر ہی ہو۔ تجربہ تو تجربہ گاہ کے
ہی ہو سکتا ہے۔ تاہم انھوں نے کہا کہ پاکستان اس
استعمال اس وقت تک نہیں کرے گا جب تک کہ
کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہے۔
جس وقت کلدیپ نیّر اور ڈاکٹر خان کی یہ ملاقات
، اس وقت 'مسلم' کے مدیر مشاہد حسین بھی موجود
، ساری گفتگو ان کے سامنے ہوئی۔ اس کا خمیازہ
یں یہ بھگتنا پڑا کہ جب پاکستان بھر میں ان کے
طوفان اٹھ کھڑا ہوا تو انہیں عہدۂ ادارت سے استعفیٰ
پڑا۔

جیسے ہی 'آبزرور' کی رپورٹ شائع ہوئی ویسے
عبدالقدیر خاں نے یہ بیان جاری کیا کہ میں تو کسی
دستانی صحافی کلدیپ نیّر کو جانتا ہی نہیں۔ میرے
دوست میرے پاس شادی کی دعوت دینے آئے تھے
کے ساتھ ایک ہندوستانی صاحب بھی تھے انھوں
پاکستان کے سائنسی پروگراموں کے بارے میں ایک
سوالات ضرور کئے تھے، لیکن میں نے یہ ہرگز نہیں کہا
پاکستان کے پاس ایٹم بم موجود ہے۔

مگر چند ہی دن کے بعد پاکستانی سائنسداں
اپنا بیان تبدیل کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے
ہے پہلے سے علم تھا کہ نیّر صاحب اخبار نویس ہیں
انھوں نے ملاقات کے لئے وقت مانگا تھا۔ تاہم
القدیر خاں اس بات پر مصر رہے کہ انھوں نے بم
موجودگی کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا، بلکہ صرف اتنا ہی
تھا کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام مکمل طور پر پرامن

اس کے برعکس کلدیپ نیّر کا بیان کچھ اور
ہی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے




ملاقات کا وقت عمداً دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ نیّر
صحافی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وہ کھلے عام سب
کے سامنے ڈاکٹر خان کی کوٹھی کے اندر گئے تھے۔
(البتہ ڈاکٹر خان نے کلدیپ نیّر کو ٹیپ ریکارڈر
استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی تھی)۔

اس انٹرویو کی جو بھاری قیمت مشاہد حسین
کو چکانی پڑی اس کے سلسلے میں کلدیپ نیّر کا
کہنا ہے کہ لوگ ان سے پہلے سے ناخوش تھے،
بس انھیں موقع مل گیا۔ قابل ذکر ہے کہ مشاہد حسین
کے بہت سے نظریات اور خصوصاً افغانستان کے
سلسلے میں ان کے انداز فکر کو پاکستان میں پسند
نہیں کیا جاتا — اب تازہ ترین خبر یہ ہے کہ
مشاہد حسین کے خلاف کارروائی کا بھی مطالبہ کیا

جارہا ہے۔
حکومت پاکستان نے واضح الفاظ میں بم
تیار کئے جانے اور کسی بم کے موجود ہونے کی
خبروں کو بے بنیاد قرار دیا ہے اور خود صدر ضیاء
نے بھی اس کی تردید کر دی ہے، دوسری جانب
امریکہ بھی مسلسل اس پر زور دے رہا ہے کہ پاکستان
کے پاس کوئی بم وم نہیں ہے — سچی بات یہ ہے
کہ امریکہ (اپنی مجبوریوں کے سبب اور پاکستان کی
دفاعی وجغرافیائی اہمیت کے پیش نظر) پاکستان کو
اپنی دفاعی امداد جاری رکھنا چاہتا ہے صدر کارٹر
کے عہد میں نافذ ہوئے 'سمنگٹن ترمیم' نام کے ایک
ضابطے کی رو سے ایٹمی تیاریوں کی صورت میں پاکستان
کو امریکہ کی جانب سے کوئی دفاعی امداد نہیں مل سکتی ستم
ظریفی یہ ہوئی کہ جن دنوں عبدالقدیر خان کا یہ انکشاف
سامنے آیا، انہی دنوں امریکی کانگرس پاکستان کے
لیے سو ارب ڈالر کی دفاعی امداد کی منظوری دینے ہی والی
تھی۔ بہرحال جیسا کہ حالات کے رخ سے ظاہر ہے
صدر ریگن کسی بھی قیمت پر پاکستان کو ملنے والی امداد
بحال و برقرار رکھنا چاہتے ہیں اسی لیے تاویلات
در تاویلات کا سلسلہ جاری ہے۔

عبدالقدیر خاں کے بیان کے بعد ہندوستان
میں اس پر دو طرح کا ردعمل ہوا۔ ایک حلقے کا
• خیال ہے کہ پاکستانی سائنسداں نے محض ہندوستان
کو ڈرانے کے لیے یہ بیان داغ دیا ہے — ورنہ اصلاً
پاکستان کے پاس بم نہیں ہے — دوسرے حلقے
کا زاویۂ نظر یہ ہے کہ پاکستان کے پاس بم ہو بھی سکتا
ہے۔ اور نہ ہو تو کم از کم وہ بم بنانے کی صلاحیت اور



پاکستان کا ایٹمی مرکز

[illegible]

وسائل ضرور رکھتا ہے۔

اس صورت حال میں سیاسی و دفاعی ماہرین کے نزدیک ہندوستان کے سامنے دو راستے ہیں کہ یا تو وہ خود بھی بم تیار کرے تاکہ پاکستان کی یہ دھمکی بے اثر ہو جائے، اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ کسی طرح پاکستان کے ایٹمی مرکز واقع کہوٹہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔

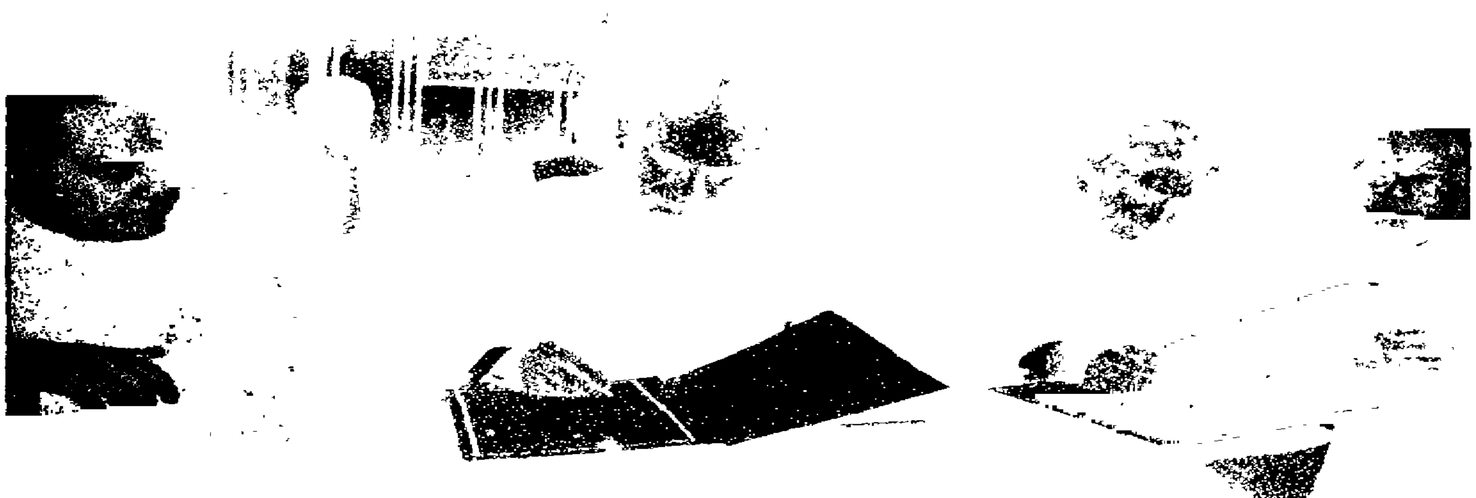
بعض ذرائع کا دعویٰ ہے کہ اسرائیل نے برسوں پہلے ہندوستان کو یہ پیش کش کی تھی کہ وہ پاکستان کے ایٹمی مرکز پر بمباری کر کے اسے تباہ کر سکتا ہے لیکن اس کے عوض ہندوستان کو اس کے ایف ۱۶ طیاروں کے لیے ہوائی میدان مہیا کرنا ہوگا بتایا جاتا ہے کہ اسرائیل کی اس پیش کش کو پہلے مسز اندرا گاندھی، مسٹر مرار جی ڈیسائی اور اس کے بعد حال ہی میں جناب راجیو گاندھی کی حکومت نے بھی مسترد کر دیا ہے۔ تاہم ہندوستان میں بم سازی کے ایک بڑے وکیل وحامی جناب کے سبرامینم کا خیال ہے کہ کہوٹہ ایٹمی مرکز کو تباہ کرنے کا عمل محض حماقت ہی ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس مرکز کو تباہ تو کیا جا سکتا ہے، مگر اس سے پاکستان کی سرگرمی متاثر نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں خود عبدالقدیر خاں کا کہنا ہے کہ اس مرکز کے لیے بڑے زبردست حفاظتی انتظامات کئے گئے ہیں اور پھر پاکستان نے سب کچھ ایک ہی جگہ نہیں رکھا ہے یہی اشارہ ہے کہ کچھ خفیہ مراکز اور اڈے بھی ہو سکتے ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے پاکستان کے وزیر اعظم محمد خاں جونیجو نے کہا تھا کہ اگر کہوٹہ پر بمباری کی گئی تو پاکستان جنگ چھیڑ دے گا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان

[illegible]

دونوں ایٹمی اسلحہ کے فروغ کے بالاعلان مخالف ہیں اور حال ہی میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ بھی ہو چکا ہے جس کی رو سے دونوں ایک دوسرے کے ایٹمی مراکز پر حملہ کرنے سے باز رہیں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیوں کیا؟ کیا محض یہ بتانے کے لئے کہ پاکستان فوجی قوت کے سطح میں کس



منزل پر ہے، یا اس کا کوئی اور دُور رس مقصد بھی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ جس وقت کلدیپ نیّر اور ڈاکٹر خان کی ملاقات ہوئی، وہ وقت وہ تھا کہ جب ہندوستان



محمد خاں جونیجو ۔ وزیراعظم پاکستان

اور پاکستان کی فوجیں اپنی اپنی سرحدوں پر تعینات تھیں اور ماحول خاصی کشیدگی کا تھا۔ کیا سمجھا جائے کہ بم کا ہوّا دکھا کر ڈاکٹر خان ہندوستان کو خوفزدہ کرنا چاہتے تھے اور اپنے ملک کو کسی بھی امکانی حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے ہی انہوں نے اتنا بڑا راز اُگل دیا۔ لہٰذا سوال یہ نہیں ہے کہ ڈاکٹر خان نے واقعی کلدیپ نیّر کو 'بم' کے بارے میں اطلاع فراہم کی ہے یا نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ انھوں نے اس ڈرامائی انکشاف کے لیے وہی وقت کیوں چنا؟۔

کوئی کچھ کہے یہ بات تو مانی ہی نہیں جاسکتی کہ ڈاکٹر خان نے اتنا زبردست بیان "غلطی" سے یا "جوش" میں دے دیا ہوگا۔ پاکستان کے دفاعی و فوجی تناظر میں ان کی جو حیثیت ہے اس کے پیش نظر وہ ایسی کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہیں کرسکتے۔ اور نہ ہی ان کی یہ ملاقات خفیہ ہوسکتی ہے۔ اس امر کو طے شدہ سمجھنا چاہیے کہ پاکستانی سائنسدان اور ہندوستانی صحافی کی یہ ملاقات ارباب اختیار کے علم میں بخوبی تھی، اور جو کچھ بھی ڈاکٹر خان نے کہا، وہ اگر اپنی حکومت کے اسبار پر نہیں تو کم از کم اس یقین کے ساتھ ضرور تھا کہ اس سے ان کے ملک کے مفاد کو نقصان ہرگز ہرگز نہیں پہونچے گا۔ بلکہ ان کا یہ عمل (خواہ کسی طرح بھی) قوم کے عین مفاد میں ہوگا۔ اور یہی اصل نکتہ ہے۔



اور ضیاء الحق کا تازہ فرمان

## کلدیپ نیّر سے چند سوالات

# انکشافِ کیسے ہوا؟

"پاکستان نے اپنے سارے انڈے ایک ہی ٹوکری میں نہیں رکھے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے ایٹم بم بنانے کی سخت مخالفت کی جارہی ہے۔ اور ہندوستان یا اس کا کوئی ساتھی پاکستان کی ایٹمی بھٹیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔"

یہ تھا جواب ملک کے ممتاز صحافی جناب کلدیپ نیّر کا جب ان سے میں نے یہ سوال کیا کہ کیا پاکستان کو بم کا راز افشا کرتے ہوئے یہ علم نہیں تھا کہ ہندوستان کوئی احتیاطی کاروائی بھی کرسکتا ہے۔

جناب نیّر نے کہا کہ ان سے ملاقات کے دوران پاکستان کے ایٹمی توانائی کے کمیشن کے صدر عبدالقدیر خان نے خود اس خدشے کے جواب میں کہا تھا کہ ان کے سب انڈے ایک ہی ٹوکری میں نہیں ہیں۔ ہمیں ان الفاظ کا مطلب نکال کر مزید تفتیش کرنی چاہیے تھی لیکن یہ کام اخبار "آبزرور" نے کیا ہے اور یہ پتہ لگایا ہے کہ پاکستان کا دوسرا ایٹمی اڈہ اسلام آباد ہوائی اڈے کے نیچے ایک تہہ خانے میں ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ایٹم بم کے لیے مقصد دوسرا سالہ تیار کرکے اپنے انڈے بھی ادھر ادھر پھیلا سے ہیں۔ لیکن ساتھ عبدالقدیر خاں نے یہ وارننگ بھی دی تھی کہ ان اڈوں پر حملہ کرنا اتنا آسان نہیں ہے ہم بھی جوابی کاروائی کرسکتے ہیں۔ جناب نیّر نے کہا کہ ہندوستان کے بہت سے اہم ٹھکانے پاکستانی حملے کی زد میں پہلے سے ہی ہیں لیکن اب پاکستان میں ایٹم بم کی موجودگی سے وہ اور بھی محفوظ ہوگئے ہیں۔

یہ دریافت کرنے پر کہ پاکستان اپنے ایٹم بم کو اسلامی بم کا نام کیوں دے رہا ہے جناب نیّر نے کہا کہ ابتدا میں اس بم کی تیاری اسرائیل میں ایٹم بم تیار کرنے کی کوششوں کے جواب میں شروع ہوئی۔ عرب ممالک اسرائیل کے دھماکے سے منہ دیکھتے رہ گئے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ کوئی عرب یا مسلم ملک بھی اس کے جواب میں بم تیار کرے۔ چنانچہ عرب رہنماؤں نے جن میں کرنل

●

"پاکستان (نیوکلیائی) بم بنانے کی صلاحیت سے لیس ہے۔ ہم جب چاہیں بم بنا سکتے ہیں۔ بم بنانے میں دِقّت کیا ہے؟۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم ایسا کر نہیں سکتے۔ ہم نے یہی کہا ہے کہ ہم نہ تو (بم سازی کا کوئی) ارادہ رکھتے ہیں اور نہ یہ ہماری خواہش ہی ہے۔"

۲۳ مارچ ۸۷ء

●

قدافی پیش پیش تھے۔ پاکستان کی سعودی عرب نے بھی اور اسے بھرپور مالی مدد بھی دی جس سے یہ کام [illegible] ہوا چونکہ اس قسم کے ایٹمی بم تک سب ملکوں کی رسائی ہو سکتی تھی اس لیے اس کا نام اسلامی بم رکھا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جیسا کہ عبدالقدیر نے کہا پاکستان کی اسرائیل سے کوئی دشمنی نہیں ہے پاکستان کی آزاد ہستی کو اگر خطرہ ہے تو ہندوستان سے ہے اس لیے اس نے "اسلامی بم" ہندوستان کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا ہے۔

میں نے ان سے یہ سوال کیا کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ عبدالقدیر خاں نے آپ سے دھوکہ کیا ہو۔ انہوں نے ایٹم بم تیار کرنے میں کامیابی نہ حاصل کی ہو لیکن چونکہ وہ جانتے تھے کہ سرحدوں پر کشیدگی کم کرنے کے لیے پاکستان کی ایک جماعت ہندوستان سے بات چیت کرنے دہلی گئی ہے۔ اس لیے اس خبر کی اشاعت سے اس کے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے اس لیے انہوں نے آپ سے یہ کہہ دیا ہو کہ پاکستان کے پاس بھی ایٹم بم ہے ورنہ وہ اس خبر کی اشاعت پر اتنا کیوں سٹپٹاتے اور امریکہ تک ایٹم بم کی موجودگی سے انحراف کیوں کرتا۔

جناب کلدیپ نیئر جو اس سوال کے جواب میں قدرے چونکے انہوں نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے دھوکہ دینے کا سوال ہی نہیں تھا اگر ہندوستان کو ایٹم بم کی موجودگی سے ڈرانا ہی مقصود تھا تو وہ ایسا پہلے کئی مواقع پر کر سکتے تھے کچھ تو خاص کی پردہ داری تھی۔ انہوں نے پہلے مجھے ملاقات کا کبھی موقع نہیں دیا اور اس بار بھی وہ کھل کر یہ نہیں کہنا چاہتے تھے کہ انہوں نے ایٹم بم بنا لیا ہے میں نے انہیں اشتعال دلایا تو اس کے جواب میں ان کے منہ سے نکل گیا کہ اگر پاکستان کی ہستی خطرے میں پڑ جائے اور آپ ہمیں کسی کونے میں دھکیل دیں تو ہم اپنی ہستی بچانے کے لیے ایٹم بم کا استعمال بھی کر سکتے ہیں۔ اس طرح بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ اگر عبدالقدیر خاں مجھے دھوکہ دینا چاہتے تو ویسے بھی کہہ سکتے تھے کہ پاکستان کے پاس بھی ایٹم بم ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے مجھے گمراہ کرنے یا ہندوستان کو دھوکہ دینے کے لیے یہ راز فاش نہیں کیا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ان کے پاس ایٹم بم ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بم ایک ہے یا کئی ہیں جب ایک بم بن گیا تو کئی بنانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ دوسرے ان کے عزائم کی تصدیق اس بات سے ہو جاتی ہے کہ وہ اشتعال میں آکر یہ بھی کہہ گئے کہ ان کے سائنسداں ہندوستان کے سائنسدانوں سے کئی درجہ اچھے ہیں کیونکہ جہاں ہندوستان کو ایٹم بم بنانے میں بارہ برس لگے تھے وہاں پاکستان نے یہ کام سات برس میں مکمل کر لیا ہے۔ میں نے مزید ثبوت کے لیے یہ بھی پوچھا کہ اگر پاکستان نے ایٹم بم بنا ہی لیا ہے تو وہ اس کا تجربہ کیوں نہیں کرتا تو انہوں نے کہا کہ اب اس قسم کے آلات ایجاد ہو گئے ہیں کہ ایسے تجربوں کی ضرورت نہیں رہی۔ اب ہوائی جہاز تیار کر کے

"میرے ذریعہ انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ پاکستان نے بم بنا لیا ہے۔ ڈاکٹر خان کو ہدایت تھی کہ وہ اشارہ کریں تاکہ ہم خوف زدہ ہو جائیں



مگر اس کے [illegible] حیثیت کچھ نہ کہیں جس سے پاکستان کے پاس بم موجود ہونے کی تصدیق ہوتی ہو۔"

کلدیپ نیئر

اس کی آزمائش پرواز کے بغیر کارخانے ہی میں کر لی جاتی ہے اسی طرح ایٹمی طاقت کا اندازہ بھی اسی طرح کی مشینوں کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے مجھے کوئی شک نہیں رہا کہ عبدالقدیر جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ غلط نہیں ہو سکتا اور نہ مجھے گمراہ کیا جا رہا ہے۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے جس کے لیے ایٹم بم بنانا ایک بہت مہنگا سودا ہے۔ امریکہ اسے اس کام میں مالی مدد نہیں دے سکتا پھر اس نے ایٹم بم کیوں بنایا ہے اور اس مقصد کے لیے اربوں روپے کے مصارف کیوں برداشت کر رہا ہے؟

جناب کلدیپ نیئر اس سوال کے جواب میں اتفاق میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگے کہ بے شک یہ بہت مہنگا کام ہے پاکستانی حیثیت اس بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتی لیکن اسرائیل دشمن عرب ممالک اور ہندوستان کے مخالف ایشیائی ملک اس کی پشت پر ضرور ہیں جنہوں نے اس کی مدد کی ہے۔ جیسا کہ عبدالقدیر خان نے خود تسلیم کیا ہے کہ پاکستان کی ہستی کو خطرے میں سمجھتے ہیں اور اس کا وجود قائم رکھنے کے لیے ہی ایٹم بم تیار کیا ہے جناب نیئر نے کہا کہ پاکستان میں آہستہ آہستہ یہ تاثر زور پکڑ رہا ہے کہ پاکستان کا قیام ایک غلطی تھا اور یہ ملک مصنوعی بنیادوں پر فوج کے سہارے زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے پاکستان کا حکمراں ٹولہ عوام میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ہندوستان کی یلغار اب مغربی پاکستان کے ٹکڑے کرنے کے لیے ہوگی۔ وہ عوام کے دلوں میں یہ خوف تازہ رکھنا چاہتے ہیں جس سے وہ عوامی جمہوری تحریکوں کو بھی دبا کر رکھ سکتے ہیں۔ اسی خوف کے ازالے کے لیے پاکستان نے ایٹم بم بھی تیار کیا ہے جس کا اظہار عبدالقدیر خان نے کھل کر کیا کہ اگر ہم نے محسوس کیا کہ ہماری ہستی خطرے میں ہے تو ہم ایٹم بم کا استعمال کریں گے اور اسے جوابی کارروائی کے لیے استعمال کریں گے۔ دوسرے یہ کہ پاکستان ہر میدان میں ہندوستان کی بالادستی محسوس کرتا ہے اس کے لیے اس نے ہندوستان کے اس احساس کو ختم کرنے کے لیے ایٹم بم تیار کرنا ضروری خیال کیا اس طرح پاکستان اب نہ صرف برصغیر میں ہندوستان کی ٹکر کی طاقت بن گیا ہے بلکہ اس نے اپنے عوام کو بھی یقین دلایا ہے کہ پاکستان کا بازو آسانی سے نہیں مروڑا جا سکتا۔ وہ جوابی حملہ کر سکتا ہے اور انہیں اب ہندوستان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے ان سے آخری سوال یہ پوچھا کہ جب ہندوستان پوکھران میں ایٹمی دھماکہ کر چکا ہے اور اس کے پاس ایٹم بم بنانے کی صلاحیت ہے جسے وہ بے شک استعمال نہیں کرنا چاہتا تو پھر اسے پاکستان کے ایٹم بم بنانے پر اتنی پریشانی کیوں ہے۔ حکومت ہند دنیا کے دیگر ممالک کی توجہ اس طرف کیوں مبذول کرا رہی ہے۔

جناب کلدیپ نیئر کہنے لگے کہ سیدھی سی بات ہے کہ جنوبی ایشیا ہو یا شمالی امریکہ ہر ملک اپنی جغرافیائی و مالی و مادی حیثیت کے مطابق ایک مرتبہ چاہتا ہے اور ایک توازن اس مرتبے کے مطابق برقرار رکھنا چاہتا

ہے۔ پاکستان کے ایٹم بم بنانے کے لیے جنوبی ایشیا میں طاقت کا یہ توازن درہم برہم ہوگیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے ہندوستان نے ایٹمی پروگرام صرف پرامن مقاصد کے لیے بنا رکھا ہے ضروری نہیں کہ پاکستان بھی اسے پرامن ہی رکھے پاکستان چین تعلقات اور چین کے ہندوستان کے خلاف عزائم کو دیکھتے ہوئے وہ دونوں ملک ہندوستان کو کشمیر میں علاقائی رعایتیں دینے کے لیے مجبور کر سکتے ہیں ہندوستان کو ایک پریشانی یہ بھی ہے کہ امریکہ پاکستان میں اسلحہ کے ڈھیر لگا رہا ہے۔ اسے پوری پوری مالی مدد دے رہا ہے اب جب پاکستان کے پاس ایٹم بم موجود ہے اور اسے کوئی خطرہ نہیں کہ یہ اسلحہ کس کے لیے؟ اور سوائے ہندوستان کے اور کس کے خلاف استعمال ہوگا۔ پاکستان جس طرح پنجاب میں ہندوستان کو پریشان کر رہا ہے اب وہ اور بھی بڑھ چڑھ کر شرارت کر سکتا ہے۔ جنوبی ایشیا میں ہندوستان کی قوت اور قدر و منزلت کو نقصان پہنچا ہے اسی لیے اسے پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے اختلاف ہے۔ امریکہ ایٹمی طاقت رکھنے والوں کو امداد نہیں دیتا لیکن پاکستان کے لیے یہ شرط ہٹائی جا رہی ہے اور اسی لیے اس کے ایٹم بم سے چشم پوشی کی جا رہی ہے۔ (م۔ک۔م)



عبدالقادر خان

"ہندوستان اچھی طرح واقف ہے کہ اگر اس نے کہوٹہ پر حملہ کیا تو اسے کیا قیمت چکانی پڑے گی۔"

"وہ کہتے تھے کہ پاکستان بم نہیں بنا سکتا، مگر ہم نے بنا لیا ہے اگر ہمارے وجود کو خطرہ لاحق ہوا تو ہم اس کا استعمال بھی کریں گے۔"

"بم بنانے میں ہندوستانیوں

"بم بنانے میں ہندوستانیوں کو بارہ برس لگے، مگر ہم نے محض سات سال میں یہ کام انجام دے دیا۔"



جب گلے سے مل گئے سارا گلہ جاتا رہا

م ک۔ مہتاب

## ہند، پاک تعلقات

# جنگ ٹل گئی ہے

ہندوستان اور اس کے قریبی ہمسائے پاکستان کے موجودہ رشتوں کو ایک جملے میں قلمبند کیا جا سکتا ہے کہ "جنگ ٹل گئی ہے۔ ختم نہیں ہوئی۔"

افسوس کا مقام ہے کہ باہمی جنگ کو ٹالنے کا یہ عمل گزشتہ چالیس سال سے جاری ہے۔ اس دوران جنگ کے یہ بادل کبھی بہت گھنے ہو جاتے ہیں، کبھی ان میں بجلیاں بھی چمکتی ہیں اور تین بار ان میں سے مختصر وقفوں کے لیے زوردار بوچھاریں بھی پڑی ہیں۔ لیکن خطرات کے یہ بادل چھٹے ضرور ہیں، چھٹے نہیں۔ خواہشات کے باوجود مطلع صاف نہیں ہوا۔

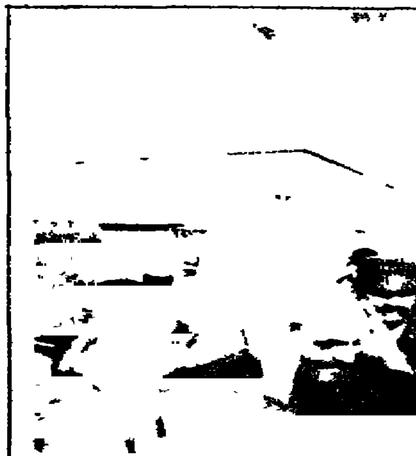
دونوں ممالک میں دوستانہ رشتے استوار کرنے اور تعلقات کو معمول پر لانے کا عمل بھی جاری رہتا ہے لیکن اچانک کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے کہ سیاسی و سفارتی کوششوں سے بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ بساط اُلٹ جاتی ہے۔ کشیدگی پہلے سے بھی بڑھ جاتی ہے اور امن کے خواہش مند عوام جو سرحد کے دونوں جانب بھاری تعداد میں موجود ہیں، منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہ باہمی سرد اور گرم جنگ کیوں ختم نہیں ہوتی اور رشتے بنتے بنتے بگڑ کیوں جاتے ہیں۔ اس کا علم دونوں ملکوں میں برسرِاقتدار لوگوں کو ہی بہتر طور پر ہو سکتا ہے تاہم دونوں طرف کے سیاسی دانش مندوں کا کہنا ہے کہ خوشگوار تعلقات کی ہوائیں چلنے یا کشیدگی کے بگولے اٹھنے میں سیاسی مصلحتیں اور برسرِاقتدار لوگوں کی مجبوریاں کارفرما رہی ہیں۔

دونوں ملک اب تک تین لڑائیاں لڑ چکے ہیں۔ اگر ان کے اسباب کو دیکھا جائے تو ظاہر ہے کہ ان میں عوام بے شک شریک ہوئے لیکن وہ ان لڑائیوں کا سبب نہیں تھے۔

پہلی لڑائی کشمیر کے محاذ پر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں آزادی کے فوراً بعد لڑی گئی جب قائد اعظم محمد علی جناح جنھوں نے پاکستان حاصل کیا ابھی زندہ ہی تھے۔ مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں کو رنج تھا کہ علاقائی تقسیم میں ان سے انصاف نہیں ہوا

دونوں ملکوں میں دوسری بڑی لڑائی ستمبر ۱۹۶۵ء میں لڑی گئی، جس میں جنگ کے شعلے جموں و کشمیر کے متنازعہ علاقے تک محدود نہیں رہے بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان پوری سرحد اس کی لپیٹ میں آ گئی۔

پاکستان میں سیاسی عدم استحکام کے بعد ۱۹۵۸ء کے شروع میں پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف محمد ایوب خاں نے ملک میں مارشل لا لاگو کر دیا وزارت برخاست کر دی گئی۔ ایوب خاں نے پاکستان کو سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے مضبوط کرنے کے کئی قدم اٹھائے لیکن وہ جمہوریت کی بحالی کے وعدے پورے نہیں کر سکے، انھوں نے پنچایتی نظام اور بنیادی



خواجہ کے دربار میں حاضری

جمہوریت جیسے کئی پینترے بدلے لیکن پاکستان کے عوام جمہوریت چاہتے تھے۔ ان عرضیوں کو دبانے کے لیے پاکستان کے ڈکٹیٹر کے پاس ایک ہی طریقۂ کار تھا کہ عوام کو ہندوستان کے خلاف بھڑکایا جائے اور کشمیر کا مسئلہ زندہ رکھا جائے

اقوام متحدہ نے فائر بندی کرا دی۔ جنگ بند کرانے کے لیے روس اور امریکہ کے ذریعہ بات چیت ہوئی۔ روس نے ایوب خاں اور لال بہادر شاستری کو تاشقند میں بلا کر ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو ایک سمجھوتہ کرا دیا، جس کے تحت طے پایا کہ دونوں ممالک کشمیر کے سوال کو باہمی بات چیت سے طے کریں گے۔ اس کو دونوں ملکوں کے درمیان پہلا نا جنگ یا امن سمجھوتہ کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اس معاہدے سے امن کی امیدیں پوری نہیں ہو سکیں، اور جنگ بند نہیں ہوئی بلکہ ایک بار پھر ٹل گئی۔ پاکستان کے عوام جنھیں ہندوستان کے خلاف بھڑکا دیا گیا تھا، محمد ایوب خاں کے سخت مخالف ہو گئے۔ معاہدہ معطل ہو گیا۔ جو تھوڑی بہت جمہوریت بچی اسے تحریکوں نے ختم کر دیا۔ ۱۹۶۲ء کے آئین کو معطل کر دیا گیا اور فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل یحییٰ خاں نے خود اقتدار سنبھال کر ملک میں تیسرا مارشل لا قایم کر دیا۔ انھیں صرف مغربی پاکستان کی ہی نہیں مشرقی پاکستان کی بھی مخالفت کا سامنا تھا، کیوں کہ بنگالی یہ سوچتے تھے کہ حکومت کی تمام آمدنی مغربی پاکستان پر ہی خرچ کی جاتی ہے اور ترقی کا عمل بھی وہیں ہوتا ہے۔ اس غصے نے وہاں تحریک کی شکل اختیار کی اور پاکستان سرکار کو مغربی پاکستان میں انتخابات کرانے پر مجبور کر دیا، جس میں

شیخ مجیب الرحمان اور ان کی عوامی لیگ کامیاب ہوئی، لیکن جنرل یحییٰ خاں نے انھیں اقتدار سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے فوجی جنرل اور صدر کا اس کام میں ساتھ دیا۔ مجیب کو گرفتار کر لیا گیا۔ لاکھوں کی تعداد میں بنگالی ہندوستان آ گئے، اور انھوں نے یہاں جلاوطن عوامی لیگ کی حکومت قایم کر لی۔

ان حالات میں بھٹو دن رات ہندوستان کے خلاف زہر اگلتے رہتے تھے۔ انھوں نے پاکستان کے عوام کو ہندوستان کے خلاف ایک ہزار سال تک لڑائی لڑنے کا پیغام دیا۔ کشمیر کے گرشے فردے اکھاڑے گئے۔ بدلہ لینے کی فضا پیدا کی گئی۔ ان نعروں کے نیچے پاکستان میں جمہوریت نواز طاقتیں اور تحریکیں دبائی جا رہی تھیں۔ لوگوں کی توجہ پوری طرح ہندوستان دشمنی کی جانب موڑ دی گئی۔ یہ فرض کر کے کہ مشرقی پاکستان ہی عوامی لیگ کی مکتی باہنی جو کچھ کر رہی ہے وہ ہندوستانی فوج کی سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ جنرل یحییٰ خاں نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں کشمیر سے لے کر گجرات تک مغربی سرحد پر حملہ شروع کر دیا۔ ہندوستانی فوج بھی جوابی حملے کے لیے تیار تھی اور اس نے ہر محاذ پر پاکستان کے دانت کھٹے کر دیے۔ پاکستان کے عوام میں احساس برتری ختم ہونے لگا تھا وہ ایک پاکستانی برابر ہے چار ہندوستانی کے تناسب سے کم ہو کر مساوات کے تناسب پر آ گئے تھے۔ لوگوں نے پوری طرح پاکستانی حکمرانوں کا ساتھ بھی نہیں دیا۔

یہ دونوں ملکوں کے درمیان تیسری جنگ تھی جس میں پاکستان کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا، اور اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ایک لاکھ سے زیادہ پاکستانی فوجی ہندوستانی فوج کے قیدی بن گئے۔

بھٹو اب پاکستان کے صدر بن گئے تھے انھوں نے ہندوستان سے صلح کرنے اور اپنے ایک لاکھ جنگی قیدی واپس لینے کے لیے ۲ جولائی ۱۹۷۲ء کو شملہ میں مسز اندرا گاندھی کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کیے جس سے یہ امید پیدا ہو گئی کہ آئندہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ نہیں ہوگی۔ کشمیر اور دیگر باہمی مسئلے بات چیت سے طے کر لیے جائیں گے۔ امن و خوشحالی کی نعمتوں سے دونوں ملکوں کے عوام مستفید ہوں گے۔ بنگلہ دیش بھی وجود میں آ گیا لیکن پاکستان نے اپنا ایک حصہ الگ ہونے کا الزام ہندوستان پر ہی عاید کیا۔

لیکن جس طرح مسز گاندھی جو مشترکہ کانگریس پارٹی کو توڑ کر برسر اقتدار آئی تھیں اور عوام کو بتانا چاہتی تھیں کہ وہ ان کے اور ملک کے لیے کیا کچھ کرنا چاہتی ہیں اور کر سکتی ہیں، اسی طرح صدر بھٹو کی بھی مجبوریاں تھیں۔ وہ پاکستان کے عوام کو مایوس نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے شملہ معاہدہ کے فوراً بعد ہی جو رویہ اختیار کیا اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ پاکستان ہندوستان سے دوستی پیدا نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس سے ایک نہ ایک دن اپنی شکست کا بدلہ ضرور لے گا چنانچہ ایسا دکھائی دینے لگا کہ جنگ ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک بار پھر ٹل گئی ہے۔

شملہ معاہدہ کے بعد رشتے استوار کرنے کی کوششیں بھی ہوئی ہیں لیکن اس سے زیادہ باہمی رقابتوں کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ پاکستان کا مسئلہ جمہوریت کی بحالی کے لیے پاکستانی عوام کا روز افزوں مطالبہ ہے اور تقسیم پاکستان کے بعد وہاں ایک اور مسئلہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ سندھ، بلوچستان اور سرحد کے صوبے پنجابی غلبے سے نالاں ہیں۔ ان دونوں خطرات کو ٹالنے کے لیے ان کے پاس سب سے بڑا حربہ یہ ہے کہ انھیں بتایا جائے کہ پاکستان کا وجود ہی خطرے میں ہے۔ ہندوستان ایک حصے کو ختم کرنے کے بعد مغربی پاکستان کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے کیوں کہ ہندو نے پاکستان کے قیام کو دل سے کبھی قبول ہی نہیں کیا، اس لیے جمہوری اور علاقائی مسئلوں کو فراموش کر کے پاکستان کو فوجی اور اقتصادی لحاظ سے اتنا مضبوط



وزیراعظم راجیو گاندھی اور مسز سونیا گاندھی، صدر و بیگم ضیاء کا خیر مقدم کرتے ہوئے

شاید یہ ہے کہ ہندوستان اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔ مسز اندرا گاندھی کے دور میں پوکھران کے صحرا میں ہندوستان نے ایٹمی قوت کا جو تجربہ کیا تھا وہ پاکستانی حکمرانوں کے ہاتھ میں ایک بڑا ہتھیار بن گیا ہے جسے وہ عوام کی توجہ گھریلو مسائل سے ہٹانے کے لیے اکثر استعمال کرتے رہے ہیں۔ بھٹو کی معزولی کے بعد صدر ضیاء الحق کی فوجی حکومت کا دور شروع ہوا ہے۔ انھوں نے کئی محدود ٹی ستکیں سے ساتھ امن کا پرچم بلند رکھا ہے کسی نہ کسی بہانے سے امریکہ سے بھاری فوجی امداد لی جا رہی ہے خصوصی اسلامی ممالک سے احسانوں میں ہندوستان کا ذریعہ بنا کر کے بھاری رقوم اور سامان اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ وہ جہاں دونوں ملکوں میں دوستی کے حامی ہیں اور ثقافتی و کھیلوں کے محاذ پر بہل قدمی کا مظاہرہ بھی کرتے رہتے ہیں، اس کے ساتھ ہی وہ ہندوستان کو پریشان کرنے یا کمزور کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان کا بھارت پر یہ الزام رہا ہے کہ وہ جیئے سندھ یا سندھو دیش کے نام سے صوبہ سندھ کی علاحدگی پسند تحریک کی پشت پناہی کر رہا ہے

اس کے جواب میں پاکستان نے ہندوستان کی ریاست پنجاب میں علاحدگی پسند عناصر کی تربیت اور اسلحہ کی مدد سے ہندوستان کو پریشان کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہندوستان کے صدر، وزیر اعظم اور دیگر لیڈر بار بار پاکستان کی توجہ اس جانب مبذول کرا چکے ہیں لیکن وہ ہر بار اس الزام کی تردید کر دیتا ہے۔

چنانچہ گزشتہ چالیس برس سے دونوں ملک تین نامکمل لڑائیوں کے باوجود دیرپا امن کے کسی حل پر نہیں پہونچ سکے، اور موجودہ حالت یہ ہے کہ ماہ جنوری کے آخری ہفتے اور فروری کے پہلے ہفتے میں پھر ہند پاکستان سرحد پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ فوجوں کی زبردست نقل و حرکت دیکھنے میں آئی تھی اور سرحدی علاقے شہریوں سے خالی کرا لیے گئے تھے۔ اس حالت کے لیے دونوں ملک ایک دوسرے کو ذمہ دار قرار دے رہے ہیں جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کے ارادوں پر اعتبار نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ ان کی ملکی مجبوریاں اور مصلحتیں بھی اس کے عقب میں کارفرما ہیں

دونوں ملکوں کے خدشات اور مصلحتیں کہاں تک درست ہیں یہ تو وقت ہی ثابت کرے گا لیکن دونوں حکومتوں کو اپنی مقصد براری میں ضرور مدد ملی ہے۔ حیرانی مگر اس بات کی ہے کہ جنگ کا خطرہ اگر اتنا ہی زیادہ تھا تو دونوں ملک کشیدگی ختم کرنے کا معاہدہ کرنے کے لیے اتنی جلدی تیار کیسے ہو گئے۔

۳۰ جنوری کو کشیدگی انتہا پر تھی اور ۳۱ جنوری کو پاکستانی وفد عبدالستار کی قیادت میں دہلی آ گیا۔ ۵ فروری کو دونوں ملکوں کے درمیان پنجاب اور راجستھان سیکٹر سے فوجیں ہٹانے اور ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا عہد و پیمان ہو گیا۔ دہلی کے معاہدے کے بعد پاکستان نے اودی جناب کا بیڑہ سے فوج ہٹا لی، اور اسلام آباد میں معاہدے کے بعد جو مارچ کے پہلے ہفتے میں ہوا، راجستھان سرحد پر کشیدگی ختم کرنے کے معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ دونوں ملکوں کے عوام نے راحت کی سانس لی کہ جنگ کے بادل ہٹ گئے ہیں اور شاید دوستی کے رشتے استوار ہوں۔ اس ضمن میں پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ایک قدم اور آگے بڑھایا صرف یہ دکھانے کے لیے کہ جہاں راجیو گاندھی پاکستان جانے میں ہچکچا رہے ہیں وہ صرف کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے بھی ہندوستان آ سکتے ہیں۔ وہ ۲۱ فروری کو دہلی تشریف لے آئے۔ جے پور میں میچ دیکھنے کے بعد عقیدت کے طور پر اجمیر شریف بھی گئے۔

اس دوران میں وہ راجیو گاندھی، سونیا گاندھی، ذیل سنگھ اور دیگر ہندوستانی رہنماؤں سے جس خلوص اور تپاک سے ملے اسے دیکھ کر بس یہی کہا جا سکتا ہے سہ

کون کہتا ہے کہ ہم تم میں لڑائی ہوگی  
یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

نئی دہلی اور اسلام آباد کے معاہدوں اور جنرل ضیاء کے دورے کے بعد دونوں ملکوں پر جنگ کے خطرے کا جو بادل ابھر آیا تھا وہ چھٹ گیا ہے۔ لوگ حیران ہیں کہ اتنی جلد یہ سب کچھ کیسے ہو گیا ہے۔ دونوں ملک کشیدگی کم کرنے میں پہل کرنے کا کریڈٹ بھی لینے لگے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جنگ ٹلی ہے ختم نہیں ہوئی۔ کیوں کہ کشیدگی کی اگر ایک وجہ ختم ہوتی ہے تو دوسری شروع ہو جاتی ہے۔ جب تک دل صاف نہیں ہوتے ذہن میں شک موجود ہے،

ابھی دونوں ملکوں کے خارجہ سیکریٹری اپنی کرسیوں پر واپس تشریف فرما بھی نہیں ہوئے کہ اس مسئلے پر بحث چھڑ گئی ہے کہ پاکستان نے ایٹم بم بنا لیا ہے۔ ہندوستان اس انکشاف پر سخت چیں بہ جبیں ہے، اور چاہتا ہے کہ امریکہ ایٹمی ہتھیار تیار کرنے والے ملک کو ۴۰۲ لاکھ ڈالر کی فوجی و اقتصادی مدد نہ دے۔ امریکہ کو اس خبر پر یقین نہیں ہے پھر بھی وہ کسی نہ کسی بہانے پاکستان کی فوجی مدد منظور کر دے گا کیوں کہ وہ چاہتا ہے کہ افغان مہاجر پاکستان میں رہ کر افغانستان میں موجود روسی فوجوں کو الجھائے رکھیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر سانپ نکل گیا ہے تو لکیر پیٹنے کا کیا فائدہ ہے۔



کون کہتا ہے کہ ہم تم میں لڑائی ہوگی + یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

مظفر حسین سید

## گورکھا لینڈ تحریک

# ریاست نہیں تو ووٹ بھی نہیں

"میں ہندوستانی ہوں، اول تا آخر ہندوستانی"! یہ نوشتہ دیوار دارجیلنگ میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ یہ اعلان گورکھا لینڈ تحریک کے علمبردار سبھاش گھیشنگ کا ہے وہ یہ اعلان بار بار کر رہے ہیں، مگر شاید کوئی ان کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔

"ہماری خواہش ہے کہ ہمیں ہندوستانی سمجھا جائے، متوطن نہیں" یہ جملہ سبھاش گھیشنگ نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا ہے، لیکن ان کے ارادوں پر نہ تو مرکزی حکومت بھروسہ کرتی ہے اور نہ ہی مغربی بنگال کے وزیراعلیٰ جیوتی باسو انہیں قابل اعتماد سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہر سطح پر ان کے عزائم کو شک و شبہ کی نظر سے ہی دیکھا جا رہا ہے۔

بہر حال، یہ سچائی بھی اپنی جگہ ہے کہ گذشتہ دس گیارہ ماہ کے عرصے میں سبھاش گھیشنگ ہندوستان میں رہنے والے تمام گورکھا باشندوں کے "نجات دہندہ" بن کر ابھرے ہیں۔ اگرچہ ابھی کچھ عرصہ قبل تک ان کی سرگرمیوں کا دائرہ شمالی بنگال میں ضلع دارجیلنگ کی تین تحصیلوں تک ہی محدود تھا، مگر اب انہوں نے اپنے اختیار کی سرحدوں کو پورے ملک میں پھیلانے کا فیصلہ کیا ہے، یعنی ان تمام علاقوں تک جہاں جہاں نیپالی (یا گورکھالی) زبان بولنے والے لوگ آباد ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ملک کے مختلف حصوں سے نیپالیوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا ہے اور درخواست کی ہے کہ میں ان کی ترجمانی کا فرض انجام دوں۔ لہٰذا اب میں محض ضلع دارجیلنگ کے پہاڑوں پر آباد گورکھوں کا ہی نمائندہ نہیں ہوں" یہ دعویٰ بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے، لیکن اسے یکقلم مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اطلاعات مظہر ہیں کہ سبھاش گھیشنگ کی رنگین تصویروں سے مرصع کیلنڈر اور ان کی شعلہ بیانی سے بھرے ٹیپ صرف دارجیلنگ اور گرد و نواح میں ہی نہیں بلکہ وادیٔ دہرہ دون اور گڑھوال کے علاقوں میں بھی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں۔ ان علاقوں میں کوئی گورکھا خاندان ایسا نہیں جس نے ان اشیا کو سینے سے نہ لگا رکھا ہو۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سبھاش گھیشنگ بنیادی طور پر شاعر ہیں، اور کم از کم ایس کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ پہلے ہندوستانی فوج میں تھے۔ فوج سے سبکدوش ہو کر انہوں نے تصنیف و تالیف کو مشغلہ بنایا اور اپنی درسی تعلیم بھی جاری رکھی ——— مگر پتہ نہیں کیسے کچھ عرصہ بعد انہوں نے قلم رکھ دیا اور شمشیر



**مسکراہٹوں کا تبادلہ:** (دائیں سے) سبھاش گھیشنگ، پروفیسر نور الحسن گورنر مغربی بنگال، جیوتی باسو وزیراعلیٰ مغربی بنگال اور وزیراعظم راجیو گاندھی

اتحاد اور میدان سیاست میں کود پڑے گذشتہ برسوں کے دوران انہوں نے انتخاب بھی لڑا تھا جو سماش گھیشنگ "گورکھا قومی محاذ آزادی" کے صدر ہیں۔ انہوں نے گذشتہ چند ماہ کے اندر کافی اثر و رسوخ اور طاقت حاصل کر لی ہے۔

آج کل گورکھا محاذ نے اپنی بات لوگوں تک پہنچانے اور سارے عوام کو اپنے حق میں کرنے کے لیے دیواری پروپیگنڈے کی مہم چلا رکھی ہے۔ پورے علاقے میں جگہ جگہ انگریزی اور نیپالی میں نعرے لکھے نظر آتے ہیں۔ مثلاً: "بنگال ہمارا آقا نہیں ہے"۔ "ہم بنگال سے علاحدگی چاہتے ہیں"۔ ایسے نوشتہ دیوار دارجیلنگ اور کورسیونگ میں ہر جگہ نظر آتے ہیں لیکن سب سے زیادہ شدت کالم پونگ میں دیکھنے میں آتی ہے۔ یہاں گورکھوں کی بنگال سے نفرت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

گورکھا تحریک میں گھیشنگ کی حیثیت کم و بیش ایک آمر کمانڈر کی ہے۔ وہ اور ان کے کارکن ایک بار نہیں کئی بار اپنی طاقت کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ کامیاب بندھوں کے ذریعہ عمارتوں اور دفتروں کو نذر آتش کر کے اور لوگوں کو اغوا کر کے قتل و غارت کا بازار گرم کر کے۔ گورکھا محاذ کو حاصل عوامی حمایت کا ایک نمونہ دسمبر میں وزیر اعظم کی ایک میٹنگ کے دوران دیکھنے میں آیا تھا۔ جہاں ایک چشم دید گواہ کے بیان کے مطابق صرف پانچ سو حاضرین ہی جلسہ گاہ تک پہنچے تھے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ گورکھا محاذ نے دارجیلنگ کے لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ اس جلسے میں شریک نہ ہوں ـــ ویسے محاذ کی قیادت نے اپنے اس اقدام کا جواز یہ پیش کیا تھا کہ اگر جلسہ گاہ میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آجاتا تو اس کا سارا الزام ان کے لوگوں کے سر آتا اور بعد میں ریاستی پولس انہیں حیران و پریشان کرتی ـ سو یہ ایک احتیاطی تدبیر تھی۔

تاہم گذشتہ دنوں اس صورت حال میں خاصی تبدیلی بھی آئی ہے۔ نئے ایس۔ایس۔پی مسٹر آر۔ کے ہانڈا کی آمد کے بعد گورکھا محاذ، تحریک کی ابتداء کے بعد سے پہلی بار اپنے دفاع پر مجبور نظر آنے لگا ہے ضلع پولس نے محاذ کے سرگرمیوں کے خلاف زبردست کارروائیوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کے نتیجے میں بہت سے کارکن اپنے گھر چھوڑ چھوڑ کر فرار ہو گئے ہیں عام طور پر ایس۔ایس پی بہ نفس نفیس پولس پارٹی کی قیادت کرتے ہیں اور ان کی قیادت میں جب محاذ کے خفیہ ٹھکانوں پر چھاپہ مارا جاتا ہے تو پولس دروازے توڑ کر مکانوں میں گھس جاتی ہے، محاذ کے جھنڈے نوچ پھینکتی ہے اور ایک کے بعد دوسرے گھر میں توڑ پھوڑ کرتی چلی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے کی پژمردہ اور بے حوصلہ پولس فورس میں نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا ہے۔ پہاڑی علاقوں کے باشندوں کے لیے پولس کی یہ سختی و درشتی ایک بالکل نیا تجربہ ہے۔ ایس۔ایس پی تو اپنی جگہ یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی بڑی خوبی سے کر رہے ہیں، مگر تصویر کا دوسرا رخ اس قدر روشن نہیں۔ کیونکہ گھیشنگ اپنی جگہ کافی مسرور




خیالوں کی جنت

وطلب ہیں۔ اگرچہ ان کے حامیوں کو پولس کے ظلم وغضب کا شکار رہنا پڑ رہا ہے۔ لیکن انہیں یہ اطمینان ہے کہ عوام جس قدر ہراساں ہوں گے، اتنا ہی گولیاں چلائیں گے اور اتنی ہی شدت سے ریاستی حکومت کے ساتھ ان کی نفرت بڑھتی جائے گی۔ اور پھر قدرتی طور پر آخری سانس تک لڑنے کا ان کا عزم بھی پختہ سے پختہ تر ہوتا جائے گا۔

## آندولن معطل، مگر ختم نہیں

اس پس منظر میں ——— فی الحال گورکھا محاذ کا آندولن نسبتاً سرد ہے، سبھاش گھیشنگ نے دو ماہ کے لیے اپنی تحریک کو معطل کردیا ہے۔ یہ فیصلہ گزشتہ دنوں دہلی میں سکریٹری برائے امور داخلہ کے ساتھ ان کی گفت وشنید کے بعد سامنے آیا۔ وزیر داخلہ مسٹر بوٹا سنگھ نے بھی مسٹر سبھاش گھیشنگ سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنا آندولن واپس لے لیں کیونکہ مرکز کے ساتھ ان کی بات چیت شروع ہوگئی ہے اور یہ بات مغربی بنگال کی ریاستی حکومت کے علم میں بھی ہے۔

دہلی ملاقات کے بعد سبھاش گھیشنگ کے دستخطوں کے ساتھ ایک بیان جاری کیا گیا۔ جس میں کہا گیا کہ آندولن کی معطلی اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ وہ مسئلہ کے پرامن حل کے لیے مخلصانہ کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ کسی قسم کے تصادم کی صورت حال کو ٹالنے کی غرض سے محاذ پرامن رہے گا۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ اس سلسلے میں حکومت مغربی بنگال کا ردعمل بھی مثبت اور تعمیری ہوگا ——— انھوں نے یہ توقع بھی ظاہر کی کہ دارجیلنگ کی ضلع انتظامیہ اور مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے مقامی کارکن بھی ایسے کسی بھی اقدام سے احتراز کریں گے جس کا نتیجہ تشدد کی شکل میں ظاہر ہو۔ ورنہ گورکھا محاذ بھی اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے کے لیے مجبور ہوگا۔

بہرکیف مرکزی حکومت کے ذمہ داروں کے ساتھ گفتگو کے بعد سبھاش گھیشنگ نے اس امر کا اعادہ واضح الفاظ میں کیا ہے کہ گورکھا لینڈ کے مطالبہ کو ترک نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا یہ بات ظاہر ہے کہ آندولن کو صرف معطل کیا گیا ہے، ختم نہیں کیا گیا ہے۔

## علاحدہ ریاست کا مطالبہ

گورکھا تحریک آزادی ایک علاحدہ ریاست کا مطالبہ کرتا رہا ہے، جس میں دارجیلنگ، کرسیونگ، کالم پونگ، اسلی گوڑی، جلپائی گوڑی کے کچھ حصے اور سالکوش کا علاقہ شامل ہوگا۔ اس نئی ریاست کی چاروں سرحدوں پر چار دریا جالدھا، سالکوش، رنگیت اور بالاسون ہوں گے۔ اس مجوزہ ریاست کا رقبہ ۲۵۵۴ مربع میل اور متوقع آبادی پندرہ لاکھ ہوگی جس میں ۹۵ فی صد گورکھے ہوں گے۔ محاذ کا

## معاملہ وزیراعظم کی عدالت میں

دعوی ہے کہ اس مجوزہ ریاست میں مکمل اقتصادی ترقی ہوگی اور ہر شخص کو روزگار ملے گا ——— نئی ریاست کی اسمبلی ۴۵ ممبران پر مشتمل ہوگی اور یہ ریاست پارلیمان میں اپنے چار نمائندے بھیجے گی۔ (اس وقت یہاں سے صرف ایک ہی ایم۔ پی۔ ہوتا ہے) اتنا ہی نہیں اس ریاست کی اپنی فوج بھی ہوگی جو چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہوگی، جس میں سارے افسر گورکھے ہوں گے۔ اس کے باوجود سبھاش گھیشنگ اس بات پر مصر ہیں کہ ان کی مجوزہ ریاست ہندوستان کا ہی ایک حصہ ہوگی اور اسی آئینی ڈھانچے کے تحت ہوگی۔

## آیا تحریک ملک دشمن ہے؟

ابتدا میں مرکز اور حکومت مغربی بنگال کے مابین اس مسئلے پر اختلاف رائے تھا کہ آیا گورکھا لینڈ کی تحریک ملک دشمن ہے یا نہیں؟ ایک جانب وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی اور وزیر داخلہ مسٹر بوٹا سنگھ کی رائے تھی کہ گورکھا لینڈ کی تحریک ملک دشمن نہیں ہے دوسری جانب ریاستی وزیراعلیٰ مسٹر جیوتی باسو کا اصرار تھا کہ گورکھا لینڈ کا مطالبہ غیر آئینی ہے، کیوں کہ سبھاش گھیشنگ نے اپنی تحریک کی حمایت کرنے کے لیے اقوام متحدہ اور کچھ غیر ممالک سے اپیل کی تھی۔ مگر اب مسٹر جیوتی باسو نے سبھاش گھیشنگ کے اس فعل سے چشم پوشی کرلی ہے کیونکہ انھوں نے اپنی غلطی کے لیے معافی مانگ لی ہے۔

## گورکھا تحریک کے اسّی برس

گورکھا تحریک کی عمر اس وقت کم وبیش اسی برس ہے۔ اس کا پہلا سراغ ۱۹۰۷ء میں لگتا ہے جبکہ پہاڑی باشندوں کے ایک وفد نے اس وقت کی (برطانوی) حکومت ہند کو ایک یادداشت پیش کی تھی، اس یادداشت میں ضلع دارجیلنگ کے لیے ایک خودمختار انتظامیہ کا مطالبہ کیا گیا تھا ۱۹۲۹ میں ایک مرتبہ پھر اس مطالبہ کو دہرایا گیا اور یہ معاملہ سائمن کمیشن کے روبرو بھی پیش کیا گیا۔ ۱۹۳۵ میں ایک دفعہ پھر اس مطالبہ کا اعادہ کیا گیا اس کے بعد ۱۹۴۳ میں گورکھا لیگ قائم ہوئی۔ اور علاحدہ انتظامیہ کے قیام کا سوال از سرنو برطانوی حکومت کے سامنے رکھا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً متحدہ بنگال کی تمام سیاسی تنظیمیں کمیونسٹ عام مدد گورکھستان ... کی حمایت کرتی رہیں یہاں

ملک کر منقسم کمیونسٹ پارٹی نے بھی ۱۹۴۶ میں اس مطالبہ کی حمایت کی تھی۔ را[illegible] اسی کمیونسٹ پارٹی کا ایک حصہ مارکسی کمیونسٹ پارٹی، مغربی بنگال میں حکمراں ہے، اور یہی پارٹی گورکھا لینڈ کے تصور کے بھی خلاف ہے)

بعدازاں، آزاد ہندوستان میں تشکیل شدہ حکومت مغربی بنگال نے اصولی طور پر پہاڑی علاقوں کے باشندوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کیا۔ لیکن ان تمام واقعات کا عروج تو ۱۹۷۰ کے بعد سامنے آیا، جب مارکسی کمیونسٹ پارٹی اور گورکھا لیگ نے مشترکہ طور پر ان لوگوں کو سوراج دلانے کے لیے کوشش کی —— پھر ۱۹۸۰ میں گورکھا لیگ نے گورکھا اکثریت والے علاقوں میں ایک علاحدہ ریاست کے قیام کے لیے ایک باقاعدہ منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے کے تحت مجوزہ ریاست میں دارجیلنگ، کوچ بہار اور داودر کو شامل کیا گیا تھا، اور متبادل حل کے طور پر یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ دارجیلنگ کے علاقے کو سکم کی ریاست میں شامل کر دیا جائے۔

## گورکھا قومی محاذِ آزادی کا جنم

گورکھا قومی محاذ آزادی کا قیام ۱۴ جولائی ۱۹۸۰ کو سبھاش گھیسنگ کی قیادت میں عمل میں آیا

سبھاش گھیسنگ: مطالبہ نہ مانا گیا تو آندولن شدید کر دیا جائے گا

انہوں نے شاہ نیپال کو ایک یادداشت پیش کی، جس میں شاہ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ اپنے تمام معاہدوں کو یک قلم منسوخ کر دیں اور نئے معاہدے کریں تاکہ گورکھوں کی سیاسی حیثیت کا تصفیہ ہو سکے اور اس مخصوص علاقے کی حیثیت کا بھی تعین ہو سکے جسے برطانوی حکومت نے شامل کر لیا تھا (بہر حال، برطانوی دستاویزات کی رو سے دارجیلنگ کی تشکیل کے لیے سکم اور بھوٹان کے دو حصوں کو کاٹ کر یکجا کیا گیا تھا) اسی یادداشت کی نقول کھٹمنڈو میں مامور امریکہ، انگلینڈ، روس، فرانس، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور بھوٹان کے سفراء کو بھی ارسال کی گئی تھیں۔

اور بعد میں انہوں نے عملی طور پر اس پوری تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ ۱۹۸۱ میں گورکھا لیگ پھر ابھری اور اس نے صدر جمہوریہ کو ایک یادداشت پیش کی، جس میں گورکھا لینڈ کی علاحدہ ریاست کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ بہرکیف ۱۹۸۳ میں پنچایت کے انتخابات کے موقع پر مارکسی کمیونسٹ پارٹی اور گورکھا لیگ میں سمجھوتہ ہو گیا۔ دونوں نے مل کر انتخاب لڑا، لہٰذا عارضی طور پر یہ مطالبہ دب گیا۔

آہستہ آہستہ سبھاش گھیسنگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۸۳ میں انہوں نے اس مسئلے کو بین الاقوامی بنانے کی بھی ایک کوشش کر ڈالی

## کانگریسی زاویہ

۱۹۸۴ کے عام انتخاب کے موقع پر گورکھا تحریک نے ایک نیا رخ اختیار کیا، اس وقت کانگریس امیدوار مسٹر نریلا نے دارجیلنگ کو مرکز کے زیر انتظام علاقہ قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد اس وقت کے دارجیلنگ ضلع کانگریس کے صدر مسٹر علی نے بھی اس مطالبہ کا اعادہ کیا۔ اور اب معتبر ذرائع کے مطابق کانگریس ہائی کمان نے دارجیلنگ ضلع کانگریس کو اشارہ کیا ہے کہ وہ اس مسئلے کو نئے سرے سے اٹھائے۔

## مطالبہ مسترد

وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی ہمالیائی کوہ پیمائی ادارے کی میٹنگ میں بحیثیت صدر شرکت کے لیے ۶ فروری کو دارجیلنگ گئے تھے سبھاش گھیسنگ نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک یادداشت وزیر اعظم کو پیش کی۔ بعدازاں اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے گھیسنگ نے گورکھا لینڈ کے مطالبے کا اعادہ کیا۔ اور کہا کہ مسئلے کا حل صرف اور صرف یہ ہے کہ گورکھا لینڈ کی علاحدہ ریاست کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ گورکھا محاذ اپنے مطالبے پر اصرار کرتا رہے گا۔

حالانکہ وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے ٹھیک اسی دن مسٹر جیوتی باسو کی موجودگی میں اپنی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے گورکھا لینڈ کے مطالبہ کو مسترد کر دیا تھا اور مغربی بنگال کی مزید تقسیم کو بھی خارج از امکان قرار دیا تھا اور یہ واضح کر دیا تھا کہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں دونوں اس موقف پر کاربند رہیں گی کہ دارجیلنگ کے مسائل گورکھا لینڈ کے مطالبہ کو تسلیم کیے بغیر ہی حل ہو سکتے ہیں —— لیکن ایسا لگتا ہے کہ سبھاش گھیسنگ نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ وزیر اعظم کی دارجیلنگ سے روانگی کے فوراً بعد اسی سہ پہر گورکھا محاذ نے چوک بازار میں ایک ریلی کی، جس میں مسٹر گھیسنگ اور دوسرے لیڈروں نے مرکزی حکومت کو دھمکی دی کہ اگر گورکھا لینڈ کا مطالبہ نہ مانا گیا تو آندولن کو اور شدید کر دیا جائے گا۔

# دہرا کھیل

حالیہ چند ماہ میں مرکزی حکومت کے تئیں گورکھا محاذ کے رویہ میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ اس سے قبل محاذ کا آندولن بنیادی طور پر مرکزی حکومت کے خلاف تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس مطالبہ کو تسلیم کرنا صرف مرکز کے ہی اختیار میں ہے، لیکن گذشتہ سال جب سبھاش گھیشنگ نے بغیر کسی طے شدہ پروگرام کے دہلی کا سفر کیا تو اس کے بعد محاذ کی تحریک میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں ——بتایا جاتا ہے کہ اس سفر کے دوران گھیشنگ کو کانگریس کے اندر کچھ لوگوں سے ملنے اور تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملا اور وہ ان کی ہمدردی حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہے۔ محاذ کے انداز فکر میں تبدیلی کا اشارہ تو اس یادداشت سے ہی مل گیا تھا، جو دہلی سے واپسی کے فوراً بعد سبھاش گھیشنگ نے مرکزی حکومت کو روانہ کی تھی۔

اس کے بعد مرکزی وزیر داخلہ کے نام ایک خط میں، سبھاش گھیشنگ نے خوشگوارانہ لہجہ اپنایا اور اپنی پوزیشن کی وضاحت کی۔ اور گورکھا محاذ دہری پالیسی پر عمل پیرا نظر آتا ہے ایک جانب وہ مرکزی حکومت کو خوش رکھنا چاہتا ہے اور دوسری جانب ریاستی حکومت کے خلاف شدید حملوں کا سلسلہ جاری ہے۔

# ریاست نہیں تو ووٹ بھی نہیں

گورکھا محاذ آزادی نے اپنے تمام تر خیر سگالانہ جذبات اور رجحان و رویہ میں نرمی کے کچھ آثار کے بعد بالآخر ریاستی اسمبلی کے ہونے والے انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا تھا۔

ریاستی حکومت نے محاذ کے ذریعہ انتخابات کے بائیکاٹ کے فیصلے کو افسوسناک قرار دیا اور یہ خدشہ ظاہر کیا کہ اس اعلان سے شورش زدہ پہاڑی علاقوں پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔

جس وقت تک یہ سطور شرمندہ اشاعت ہونگی، اس وقت تک انتخابات کے نتائج آچکے ہوں گے۔ سردست جو سیاسی صورت حال ہے اس میں یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں کہ انتخاب کا نتیجہ خواہ کچھ ہو، لیکن یہ طے ہے کہ کم از کم دارجیلنگ اور جلپائی گوڑی اضلاع کے سترہ اسمبلی حلقوں میں سے سات حلقوں میں فیصلہ کی کنجی گورکھا محاذ کے ہاتھوں میں ہی رہے گی

قابل ذکر ہے کہ محاذ نے (بائیکاٹ کے اعلان کے باوجود) انتخابی دنگل میں اپنے نقلی امیدوار اتارے ہیں ظاہر ہے کہ محاذ یہ نہیں چاہتا کہ بائیں بازو اتحاد آسانی سے فتح حاصل کرے۔ اس کے علاوہ محاذ انتخابی سیاست اور اقتدار کی جنگ سے دست بردار ہونا بھی نہیں چاہتا۔

دریں اثنا دارجیلنگ کی ترائی میں محاذ کی سرگرمیاں جاری رہی ہیں۔ اور آندولن کو دو ماہ کے لیے معطل کرنے کے اعلان کے باوجود محاذ کے حامیوں نے آتشزنی، توڑ پھوڑ، لوٹ مار، اغوا، پولس پر حملے غرض اپنی تمام تر تخریبی سرگرمیوں کو جوں کا توں بحال رکھا ہے۔ اور بندھ تو آئے دن کی بات ہو کر رہ گئے ہیں۔ بایں وجہ صورت حال دن بہ دن دگرگوں ہی ہوتی جا رہی ہے۔

# دارجیلنگ کی طرف

جس وقت مرکزی حکومت نے گورکھا محاذ کے ساتھ براہ راست گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تھا اور سبھاش گھیشنگ نے اپنا آندولن دو ماہ کے لیے معطل کر دینے کا اعلان کیا تھا تو یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب دارجیلنگ کے راستے کی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ لیکن اب انتخاب کے بائیکاٹ کا شدید موقف اختیار کرکے گورکھا محاذ نے ایک بار پھر سے فضا کو مسموم کر دیا ہے

سردست اس مسئلے کا کوئی فوری حل سامنے نظر نہیں آتا۔ وزیر اعظم نے واضح اسباب کی بنا پر گورکھا محاذ کے خاص مطالبے کو تو مسترد کر ہی دیا ہے اب اس صورت میں سبھاش گھیشنگ کو ممکنہ چیزوں کے لیے جدوجہد کرنا چاہیئے مثلاً، نیپالی زبان کو دستوری درجہ، شہریت کے مسئلے کا تصفیہ اور سب سے بڑھ کر علاقے کی پسماندگی دور کرنے کا مسئلہ۔

بصورت دیگر، اپنے حامیوں کی کمزور معاشی حالت کے پیش نظر سبھاش گھیشنگ کے لیے تحریک کو عرصہ دراز تک جاری رکھنا خاصہ محال ہوگا۔



سبھاش گھیشنگ: دہرا کھیل

سارے سیاح کہاں گئے ؟




تحریک کا بازار گرم، سیاحت کی منڈی سرد



# حالیہ انتخاب

بھرت سنگھ بالی

# کانگریس (آئی) کی ہار جیت

حالیہ انتخابات میں ہندوستان کی دو اہم ریاستوں مغربی بنگال اور کیرالہ میں کانگریس ہار گئی، جبکہ جموں و کشمیر میں کانگریس و نیشنل کانفرنس کے متحدہ محاذ نے دو تہائی اکثریت سے بھی زیادہ سیٹیں حاصل کر لیں۔ کیرالہ میں جمہوری متحدہ محاذ جس کی سربراہی کانگریسی رہنما وزیر اعلیٰ شری کرونا کرن کر رہے تھے۔ بائیں بازو کے جمہوری محاذ سے مات کھا گئے اور آخر الذکر محاذ کے رہنما شری نینار وزیر اعلیٰ چنے گئے۔ متحدہ جمہوری محاذ کی ناکامی کی دو خاص وجوہات بیان کی جاتی ہیں ایک تو یہ کہ اس محاذ کے شرکا آپسی اختلافات کی وجہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہے دوسرے یہ کہ کیرالہ کے رائے دہندگان نے کانگریس (آئی) اور انڈین یونین مسلم لیگ کے اتحاد کو ناپسند کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم عوام جن میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی متحد ہو گئے اور انھوں نے بائیں بازو کے محاذ کو کامیاب بنا دیا جہاں تک متحدہ محاذ کے آپسی اختلافات کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ کافی عرصے سے اس محاذ میں شامل جماعتوں کا رویہ ایک دوسرے کے تئیں قابل اعتراض رہا ہے۔ یہ اختلافات سیٹوں کی تقسیم میں پوری شدت کے ساتھ انتخابی مہم میں پیش پیش رہے، جس سے مجموعی طور پر اس محاذ کے امیدواروں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ تاہم جہاں تک مسلم لیگ اور کانگریس (آئی) کی ملی جلی سرکار کا تعلق ہے یہ کسی بھی صورت میں کانگریس کے لیے نہ تو کیرالہ میں اور نہ ہی ہندوستان کی کسی دوس[illegible]ت میں فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے کانگر[illegible]س کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس نے ہمیشہ فرقہ پرستی کے خلاف جنگ لڑی ہے۔ اور مسٹر جناح کے دو قومی نظریے کو بھی مسترد کر دیا۔ ایک حقیر سے فائدے کے لیے کانگریس کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ ایک ایسی جماعت کے ساتھ ملی جلی سرکار بنائی جو مذہبی بنیادوں پر مبنی ہو اور اگر یہ وجہ کیرالہ کے عوام کے لیے باعث تشویش تھی تو باقی ہندوستان میں بھی ایسے اتحاد کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی سیکولر سیاست کے کچھ بنیادی اصول ہیں اور ان اصولوں کی آبیاری کرنا ہر فرد و بشر کا فرض ہے۔ اور اس سے زیادہ ایک ملک گیر سیاسی جماعت کانگریس کا جو سیکولرازم کا دعویٰ کرتی ہے۔ کیرالہ میں بائیں بازو کے جمہوری محاذ کا پھر برسر اقتدار آ جانا ایک کافی اہم واقعہ ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کیرالہ ہندوستان کی ایک ایسی ریاست ہے۔ جس میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ہندوستان کی تمام ریاستوں سے کہیں زیادہ ہے۔ رائے دہندگان کا پڑھا لکھا طبقہ اگر کمیونزم کی طرف اپنا جھکاؤ ظاہر کرتا ہے تو یہ امر کانگریس اور دوسری جمہوری جماعتوں کے لیے بھی ایک المیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی کافی اہم ہے کہ ہندوستان کی ۲۴ ریاستوں میں سے کیرالہ سمیت ۱۱ ریاستیں کانگریس کے دائرہ اثر سے باہر ہو چکی ہیں۔

جہاں تک مغربی بنگال کا تعلق ہے۔ سی۔ پی۔ ایم کی رہنمائی میں بنے ہوئے بائیں بازو کے محاذ کی کامیابی اور اس محاذ کا دو تہائی سیٹوں سے زیادہ حاصل کرنا بھی ایک ایسا واقعہ ہے جو کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۸۲ کے انتخابات میں کانگریس (آئی) نے ۴۹ نشستیں حاصل کی تھیں جبکہ اس بار صرف ۴۰ نشستیں حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے حالانکہ وزیر اعظم نے اس ریاست کے اندر انتخابی مہم میں سب سے زیادہ وقت صرف کیا اور سب سے زیادہ پبلک جلسوں سے خطاب کیا ۲ ہزار کروڑ روپوں کے گرانٹ کے وعدے بھی اس ریاست کے رائے دہندگان پر کوئی اثر نہ ڈال سکے بلکہ اس کا رد عمل بھی نقصان دہ ثابت ہوا۔ مغربی بنگال میں کانگریس (آئی) کی بھی دو وجوہات سامنے آئیں۔ ایک وجہ تو یہ کہ مغربی بنگال میں کانگریس پارٹی کے اندر زبردست انتشار رہا جس کے نتیجے میں بہت سے کانگریسی رہنما پوری شدت کے ساتھ مہم میں حصہ نہیں لے سکے۔ پریہ رنجن داس منشی مغربی بنگال کانگریس کے صدر جن پر وزیر اعظم کا پورا اعتماد رہا اپنی پرانی کانگریس وابستگی کارکنوں کو پارٹی ٹکٹ دلوانے میں کامیاب ہو گئے جبکہ پارٹی رہنماؤں کے ہمدرد

حواریوں کو اس سے محروم رکھا گیا۔ غنی خان چودھری صاحب کے مالدہ ضلع کی ۵ نشستوں میں سے ۴ پر سی پی ایم کامیاب ہوگئی صرف ایک نشست ہی کانگریس کو مل سکی یہ امر کافی حیران کن ہے کہ کانگریس ہائی کمان نے اس معاملے میں وقت پر توجہ نہیں دی جس کا خمیازہ اس کو بھگتنا پڑا۔ الکشن کے بعد کانگریس ہائی کمان کا ردعمل یہ ہے کہ اس نے مسٹری پریہ رنجن داس منشی کے کہنے کے مطابق پارٹی ٹکٹیں دے کر ایک اہم غلطی کی ہے اور یہ کہ ان کو ایک ہی ڈگر سے میں سبھی انڈے نہیں رکھنے چاہیے تھے۔

دوسری وجہ کانگریس کی ہار کی یہ ظاہر کی جاتی ہے کہ مرکزی سرکار اور وزیر اعظم نے گورکھا لینڈ



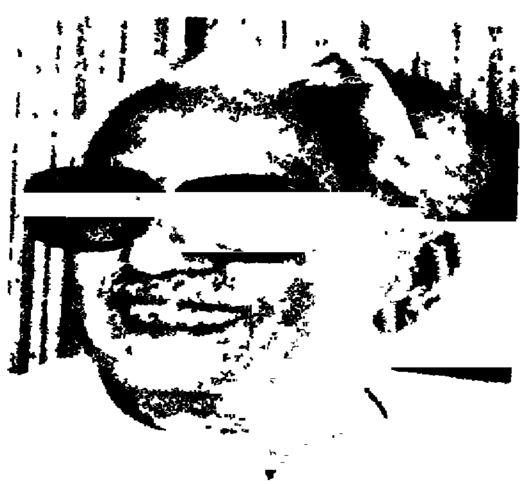
تحریک کے تئیں اپنی پالیسی کو صحیح انداز سے ترتیب نہیں دیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جیوتی باسو اور

بنگال کی کمیونسٹ سرکار گورکھا لینڈ تحریک کو ملک دشمن تحریک تصور کرتی رہی ہے اور اس کے برعکس مرکزی سرکار اور وزیر اعظم نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ یہ بھی صاف طور پر ظاہر ہے کہ مرکزی سرکار کا یہ رویہ اس بات پر مبنی تھا کہ گورکھا لینڈ تحریک مغربی بنگال کی کمیونسٹ سرکار کے خلاف ہے اور اس نقطہ نظر سے اس تحریک کی بالواسطہ حمایت مرکز کی طرف سے ہونے کی صورت میں کانگریس آئی کو انتخابات میں فائدہ پہنچے گا جو نہیں ہوا۔ اس سوال پر وزیر اعظم راجیو گاندھی اور مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ جناب جیوتی باسو کے درمیان کافی تلخی ہوئی۔ اور ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی بھی کی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب وزیر اعظم نے

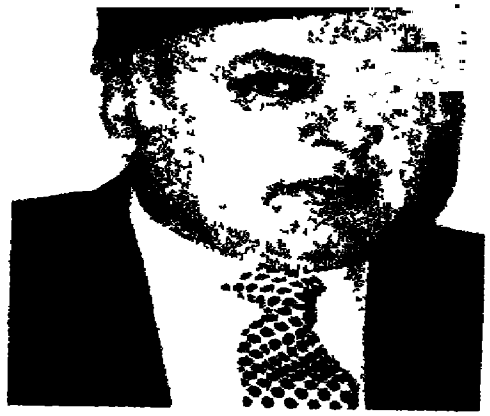


جب تک عمر وفا کرے گی، مغربی بنگال پر حکومت کروں گا۔ جیوتی باسو

مغربی بنگال کے گورکھا لینڈ والے تین اضلاع کا
دورہ کرنا چاہا تو جیوتی باسو نے ان کے ہمراہ جانے
سے انکار کر دیا۔ انتخاب کے نتائج کی روشنی
میں اگر دیکھا جائے تو مرکزی سرکار کا یہ رویہ مغربی
بنگال کے بائیں بازو کے حق میں اور کانگریس (آئی)
کے خلاف نکلا۔ اس کے علاوہ وزیر اعظم نے اپنی
انتخابی تقریروں میں جو حملے جیوتی باسو اور ان
کی سرکار پر کیے ان کے متعلق بھی یہ عام رائے ہے کہ
وہ ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو ہزار کروڑ روپیہ کی
مرکزی امداد کے وعدے ایک ایسے وقت پر جب
الیکشن آ رہے ہوں کرنے بھی شاید انتخابی اصولوں
کے خلاف ہیں۔ تاہم مغربی بنگال کے حالیہ انتخاب
کی وجہ سے وزیر اعظم اور کانگریس (آئی) ہائی کمان
کے سامنے کافی اہم سوالات درپیش ہیں اور ان
میں سے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اپنی جماعت کو
کیسے یک جہتی اور ہم آہنگی سے ہم کنار کریں۔
کچھ عرصے سے کانگریس میں کافی بے راہ روی پیدا
ہو چکی ہے اور اس کا اثر جماعت کی اعلیٰ سطحوں پر
بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے
بمبئی کانگریس کے صد سالہ اجلاس میں کانگریس
ورکرز کو سیاسی طاقت کے دلال کہہ کر پارٹی کی مختلف



کروناکرن :
ع مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا



ڈاکٹر فاروق عبداللہ : ادھورے اقتدار سے مطمئن

سطحوں پر ایک چوٹ ماری ہے جو شاید جماعت
کے مجموعی مفاد کے لیے فائدہ مند نہیں۔
جہاں تک جموں و کشمیر کا تعلق ہے یہ درست
ہے کہ مسلم متحدہ محاذ جس نے وادی کشمیر کی ۴۲
سیٹوں سے اپنے نمائندے کھڑے کیے تھے۔ صرف
چار ہی سیٹیں حاصل کر سکا ہے اور باقی سیٹیں فاروق
کی نیشنل کانفرنس نے حاصل کر لیں لیکن یہ کامیابی
۱۹۸۳ء کے انتخاب سے کسی بھی صورت میں بہتر نہیں
ہے۔ جبکہ وادی میں فاروق کی نیشنل کانفرنس نے
۴۲ میں سے ۳۸ سیٹیں حاصل کی تھیں اس کے برعکس
کانگریس نے جموں صوبہ میں ۳۲ میں ۲۳ نشستیں
۱۹۸۳ء کے انتخاب میں حاصل کی تھیں آج کے انتخابات
میں بھی صورت حال تقریباً ایسی ہی ہے۔ صوبہ جموں میں
کانگریس کی کامیابی وادی کشمیر میں مسلم یونائیٹڈ فرنٹ
کی ابھرتی ہوئی طاقت کا نتیجہ ہے۔ خصوصی طور پر جب ۸۳ء
کے الیکشن میں کانگریس نے بھارتیہ جنتا پارٹی
کو اپنے رول سے پورے طور پر محروم کر دیا تھا۔
جموں و کشمیر میں متحدہ محاذ کی کامیابی سے مغربی
بنگال اور کیرالہ میں ناکامی کا موازنہ نہیں کیا
جا سکتا۔ وادی کشمیر میں مسلم متحدہ محاذ بھلے ہی زیادہ
سیٹیں حاصل کرنے میں ناکام رہا ہو تاہم اس
امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فرقہ وارانہ سیاست
کے بیج جس پیمانے پر وادی کشمیر میں اس انتخاب
میں بوئے گئے ہیں ریاست کی تاریخ میں کبھی

نہیں بوئے گئے فاروق عبداللہ اور ان کی نیشنل
کانفرنس کو آنے والے ۵ سالوں میں مسلم فرقہ
پرستی کے خلاف سیاسی طور پر جنگ لڑنی ہوگی۔
حکومتی طاقت کے استعمال سے تحریکیں ابھرتی ہیں
دبتی نہیں۔
ہریانہ میں انتخابات عنقریب ہونے والے
ہیں موجودہ صورت حال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ
کانگریس (آئی) کے لیے ہریانہ میں انتخاب جیتنا آسان
نہیں اور اگر کانگریس ہریانہ میں کامیاب نہیں
ہوئی اور وزیر اعظم راجیو گاندھی ووٹ کھینچ
ثابت نہیں ہوئے تو اس کا اثر سارے مرکزی
اور شمالی ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ کانگریس کی
پارلیمانی پارٹی پر بھی پڑے گا۔ وزیر اعظم اور صدر
جمہوریہ کے درمیان تعلقات کی کشیدگی پہلے ہی
حزب مخالف کو فائدہ پہنچا رہی ہے اور کانگریس
پارلیمانی پارٹی میں تذبذب بڑھ رہا ہے۔ وزیر اعظم
پر ان حالات میں لازم ہو جاتا ہے کہ وہ کانگریس
(آئی) میں ہم آہنگی اور یک جہتی لانے کے پورے
اقدامات کریں۔ اور صدر جمہوریہ کے ساتھ اپنے
کشیدہ تعلقات میں بہتری لانے کی کوشش کریں
تاکہ ملک کے اندر حالات سازگار رہیں۔ خصوصی طور پر
ایسے مرحلے پر جب ہندوستان بیرونی طاقتوں
کی سازش کا شکار ہے۔



دیوی لال :
ہریانہ میں انتخاب کراؤ تو جانیں

چندکرتی

# مرحبا ! پنجاب

ب کی موجودہ صورت حال کے لیے تنہا اکالی ہی
نہیں ہیں۔ اکالی دل شروع سے ہی مذہب اور
وایک مانتا رہا ہے پنجاب میں اس کے اثر و رسوخ
یاسی پارٹیوں نے فیضیاب ہونے کی کوشش کی
ں دونوں کمیونسٹ پارٹیاں تک شامل رہی ہیں۔
پرست گندی سیاست نے آج پنجاب کو تباہی کے
ڑا کیا ہے۔ مذہب کو زہر ماننے والے کمیونسٹوں
ں یا سنگھ پر اعتراض نہیں کیا کہ پنجاب میں خالصہ
اور کالجوں۔ آریہ اسکولوں اور کالجوں۔ سناتن
ولوں اور کالجوں میں شروع سے ہی طلبا کے
ین مذہب کے نام پر فرقہ پرستی کے جو بیج بوئے
وہ غلط ہیں۔ ایک سیکولر ملک میں تعلیم کا جو ڈھانچہ
ہ اس پر آج تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ پنجاب
ی اسکولوں کی بہ نسبت پرائیویٹ اسکول زیادہ
ں آنے والے کل کے وارثوں کو ملک کے تئیں
داریوں سے آگاہ کرنے کی بجائے اور انہیں
ہندوستانی بنانے کی بجائے ہندو یا سکھ بنایا جا رہا
ادارے آج پیار محبت کا جذبہ پیدا کرنے کی
ں نفرت کے بیج بو رہے ہیں۔ آج اگر ایک طرف
ڈنٹ فیڈریشن کا پنجاب میں بول بالا ہے تو دوسری
دو دیارتھی پریشد نے جنم لے کر وہی لبادہ اوڑھ
یرانی تو اس بات کی ہے کہ جس طرح کٹر مذہبی سکھ
میں گاترہ (آٹھ انچ تلوار) لٹکاتے ہیں اسی
ہندو شیو سینا والوں نے اپنے گلے میں ترشول
رنا کر دیے ہیں۔ پتہ نہیں کہ عمل اور رد عمل کا یہ
ں کہاں لے جائیگا؟
شتہ دنوں پنجاب کے سیاسی حالات میں کچھ تبدیلی آئی
رچ کو چنڈی گڑھ میں ایک آل پارٹی میٹنگ ہوئی
درشن سنگھ راگی کی طرف سے بنائے گئے تھے
اکالی دل کو چھوڑ کر باقی سبھی پارٹیوں کے نمائندوں
ت کی جن میں مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے ہرکشن سنگھ سرجیت، ڈاکٹر فاروق عبداللہ، مرکزی وزیر
سنگھ ڈھلوں۔ جنتا پارٹی کے سریندر موہن، ناڈی
کے گوپال سوامی۔ کمیونسٹ پارٹی کے اندرجیت گپتا
پریشد کے دینش گو سوامی اور بی ستیہ نارائن ریڈی

کے نام قابل ذکر ہیں۔ میٹنگ میں عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ
پارٹی مفادات سے اوپر اٹھ کر آئندہ ایسی ہی ہونیوالی
میٹنگوں اور بڑے اجتماعوں میں زیادہ سے زیادہ تعداد
میں شامل ہوں اور انتہا پسندی کے خلاف اور برنالہ سرکار
کے موقف کے تئیں عوامی طاقت کا مظاہرہ کریں۔ سبھی لیڈروں



نے موجودہ حالات میں پانچوں سنگھ صاحبان کی طرف سے
ادا کیے گئے رول کی سخت مذمت کی اور اکال تخت کے
سبھی حکمناموں کو رد کر دیا اور برنالہ کو یقین دلایا کہ اس
معاملے میں سارا ملک انکے ساتھ ہے۔ اس میٹنگ میں یہ بھی فیصلہ
کیا گیا کہ آٹھ مارچ کو لدھیانہ میں سبھی پارٹیوں کی طرف سے
صوبائی سطح کی کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کے بعد
۲۳ مارچ کو شہید اعظم بھگت سنگھ کے آبائی گاؤں کھٹکڑ کلاں
ضلع جالندھر اور شہیدوں کی سمادھ فیروزپور میں بھاری
کانفرنس کے بعد ۱۳ اپریل بیساکھی کے دن امرتسر کے جلیانوالہ
باغ میں کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

درحقیقت گذشتہ سال ۳۰ نومبر کے بعد حالات
میں یکے بعد دیگرے کئی تبدیلیوں کا دور شروع ہو گیا
تھا اس نے ساری قوم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور ملک کی
سلامتی اور یکجہتی کو ان حالات نے جس طرح خطرے میں
ڈال دیا ہے کوئی بھی وطن پرست اسے نظرانداز نہیں
کر سکتا۔ ۳۰ نومبر کو شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی
کے چناؤ میں گورچرن سنگھ ٹوہڑہ پندرھویں دفعہ پھر
صدر چن لیے گئے اور سرجیت سنگھ برنالہ کے امیدوار
قابل سنگھ بری طرح سے ہار گئے۔ اسی اجلاس میں شرومنی
گوردوارہ پربندھک کمیٹی کی جو پندرہ ممبری ورکنگ کمیٹی
بنائی گئی تھی اس میں بھی سبھی ٹوہڑہ کے ہی حامی تھے۔ کمیٹی
کی ورکنگ کمیٹی کی پہلی میٹنگ ۲۴ دسمبر ۱۹۸۶ء کو امرتسر میں
بلائی گئی کیونکہ کمیٹی کے دوبارہ بنے صدر گورچرن سنگھ
ٹوہڑہ نے جیل سے ورکنگ کمیٹی کے لیے کچھ خفیہ ہدایات
بھیجی تھیں جن پر جلد عمل کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا اس
میٹنگ میں اکال تخت کے جتھیدار گیانی کرپال سنگھ کو
ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہ درشن سنگھ راگی کو قائم مقام
جتھیدار بنا دیا گیا اس کے ساتھ ہی ہرمندر صاحب کے
ہیڈ گرنتھی گیانی صاحب سنگھ کو بھی ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہ
دمدمی ٹکسال سے تعلق رکھنے والے گیانی پورن سنگھ کو
لگا دیا گیا۔ اس کے بعد ۲۳ جنوری کو شرومنی گوردوارہ
پربندھک کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کی دوسری میٹنگ ہوئی
جس میں تخت سری کیس گڑھ صاحب آنندپور کے جتھیدار
ہرچرن سنگھ مہالوں اور تخت سری دمدمہ صاحب کے
ہیڈ گرنتھی سنت مکھا سنگھ کو ان کے عہدوں سے برخاست
کر دیا گیا جبکہ اکال تخت کے ہیڈ گرنتھی پرتم سنگھ کو لمبی
چھٹی پر بھیج دیا گیا۔ گورداسپور کے گیانی سوندر سنگھ کو
کیس گڑھ صاحب کا اور گیانی جسونت سنگھ کو دمدمہ صاحب
کا ہیڈ گرنتھی بنایا گیا اور گیانی پرتم سنگھ کی جگہ کشمیر سنگھ
کو نامزد کیا گیا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ان پانچوں نئے
صاحبان کی نامزدگی کی توثیق ۲۶ جنوری کے سربت
خالصہ میں کی جائے گی۔

۲۶ جنوری ۱۹۸۷ء کے سربت خالصہ نے ساری قوم
کو چونکا دیا جو کہ خالصتان کا اعلان کرنے والی پنتھک
کمیٹی نے بلایا تھا اس سربت خالصہ میں پاس کیے گئے
ریزولیشن میں پنجاب کی سبھی ہند مخالف طاقتوں کی حمایت

کی گئی۔ حالانکہ ہیڈ گرنتھیوں کو نامزد کرنے اور برخاست کرنے کا حق شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو ہے لیکن اس سربت خالصہ نے یہ حق اب پنتھک کمیٹی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پنتھک کمیٹی نے اس سربت خالصہ کی آڑ میں ملک کی تمام انتہا پسند اور علیحدگی پسند طاقتوں کو متحد کر کے دہلی کے خلاف جہاد کا اعلان بھی کر دیا۔ اسی واقعہ سے پنجاب میں ایک ایسا موڑ آگیا ہے کہ جو لوگ قومی اتحاد میں یقین رکھتے ہیں وہ ایک طرف اور جو پنجاب کو ملک سے الگ کرنا چاہتے ہیں وہ دوسری طرف کھڑے ہو گئے ہیں۔ سکھوں کو ان کے رہنماؤں نے ایک دفعہ پھر باہم دست و گریباں کر دیا ہے کسی نیک مقصد کے لئے نہیں بلکہ ہوس اقتدار کے لئے ان لوگوں نے سکھوں کو دھوکہ دیا ہے۔ اس سربت خالصہ میں صرف خالصتان کی مانگ ہی نہیں دوہرائی گئی بلکہ یہ وارننگ بھی دی گئی ہے کہ اگر مسز اندرا گاندھی کے قاتلوں کو پھانسی دی گئی تو نتائج خطرناک ہوں گے۔ اکال تخت اور ہرمندر صاحب کے کام کاج کے معاملات میں انتہا پسندوں کا پنتھک کمیٹی کی رہبری قبول کرنا۔ سمرن جیت سنگھ مان کو اکالی دل کا سب سے بڑا لیڈر بنانا کچھ ایسی باتیں ہیں جو ملک و قوم کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس دفعہ دربار صاحب پر انتہا پسندوں کا قبضہ اس وقت سے بھی مضبوط ہے جب وہاں سے بھنڈراں والا کے احکامات جاری ہوتے تھے کیونکہ اب تو نئے سنگھ صاحبان بھی ان کے ساتھ ہیں۔ اس لئے اب شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی بھی پنجاب کی سیاست میں تب تک ہی کوئی رول ادا کرے گی جب تک یہ پنتھک کمیٹی اور دمدمی ٹکسال کا کہنا مانتی ہے پنتھک کمیٹی دمدمی ٹکسال اور سکھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے مستقبل کے کیا منصوبے ہیں غالباً ایسی تمام باتوں کے بارے میں فیصلے کئے جا چکے ہیں اسی لئے ۲۶ جنوری کے سربت خالصہ کے بعد ۲ فروری کو اکال تخت کے نئے جتھیدار درشن سنگھ راگی کی رہنمائی میں نئے سنگھ صاحبان نے ایک حکمنامہ جاری کر کے سبھی اکالی دلوں کے پردھانوں کو ہدایت دی کہ وہ اپنے اپنے دھڑے ختم کر کے اپنا استعفیٰ ۵ فروری شام پانچ بجے تک اکال تخت بھیج دیں۔

۵ فروری کو بادل اکالی دل کے پرکاش سنگھ بادل متحدہ اکالی دل کے باباجوگندر سنگھ اور جگدیو سنگھ تلونڈی نے اپنا استعفے بھیج دیا، جبکہ لونگوال اکالی دل کے صدر سرجیت سنگھ برنالہ نے سات ممبری کمیٹی بھیج کر حکمنامہ کے بارے میں کچھ وضاحتیں مانگیں لیکن وزیر خزانہ بلونت سنگھ کی رہنمائی والی اس کمیٹی کو دربار صاحب میں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ سنگھ صاحبان نے جیل میں بند سابق پولیس افسر سمرن جیت سنگھ مان کو سبھی اکالی دل توڑ کر نئے بنائے گئے متحدہ اکالی دل کا صدر نامزد کر دیا جس میں ۱۳ ممبران ورکنگ کمیٹی کے نامزد کئے گئے۔

۷ فروری کو سنگھ صاحبان نے سرجیت سنگھ برنالہ کو لونگوال اکالی دل کی صدارت سے مستعفی ہونے کے لئے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی۔

۸ فروری۔ برنالہ نے استعفے دینے کی بجائے وضاحت بھیجی۔ اکال تخت کے جتھیدار نے اسے پنتھ کے ساتھ دھوکہ بتایا۔

۹ فروری۔ برنالہ کو تنخواہیا قرار دیدیا گیا انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اکال تخت کے سامنے ۱۱ فروری تک سزا قبول کرنے کے لئے حاضر ہوں۔

۱۱ فروری۔ برنالہ نے گیارہ فروری کے کے خلاف سکھ عوام کا فتویٰ لینے کے لئے ۲۰ فروری لونگووال میں کانفرنس بلائی۔

۱۶ فروری۔ پردھان منتری راجیو گاندھی۔ پنجاب کے نئے حالات کے پیش نظر اپوزیشن لیڈر کی نئی دہلی میں میٹنگ بلائی جس میں پنجاب میں جلسے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۲۰ فروری۔ ضلع سنگرور کے موضع لونگووال سنت ہرچند سنگھ لونگووال کا آبائی گاؤں ہے اس میں سکھوں کا عظیم الشان اجتماع ہوا جس میں شریک ہونے والوں کی تعداد کا دعویٰ چاہے منتظمین نے لاکھ کا کیا ہو لیکن غیر جانبدار لوگوں نے بھی اس کو تین لاکھ قرار دیا ہے۔ یہ اجتماع نے سنگھ صاحبان کی طرف سے سرجیت سنگھ برنالہ کو سکھ پنتھ سے خا



## "ہم برنالہ کے ساتھ ہیں" سکھ برادری کا فیصلہ

۱۱ فروری۔ برنالہ سزا قبول کرنے کے لئے اکالی تخت نہیں گئے۔ انہیں سزا کے طور پر پنتھ سے خارج کر کے سکھوں کے لئے اُن سے روٹی بیٹی کا رشتہ رکھنا ممنوع قرار دیدیا گیا۔ اکالی دل (ماسٹر تارا سنگھ گروپ) کے صدر رچھپال سنگھ کو بھی اکال تخت کے سامنے نہ حاضر ہونے کے لئے تنخواہیا قرار دیدیا گیا۔ سبھی اکالی ممبران پارلیمنٹ۔ اسمبلی۔ وزیروں اور ضلع جتھیداروں کو حکم دیا گیا کہ وہ ۱۳ فروری تک نئے متحدہ اکالی دل اور اکال تخت کو اپنی خدمات سپرد کرنے کا حلف بھیج دیں یا خود اکال تخت حاضر ہوں۔

۱۳ فروری۔ بارہ بجے تک صرف چار اکالی دل لونگووال کے ممبران اسمبلی حاضر ہوئے۔

کئے جانے کو جائز یا ناجائز قرار دینے کے لئے اکالی دل نے بلایا تھا جس میں سکھوں نے یک سنگھ صاحبان کے فیصلہ کو رد کرتے ہوئے کہا کہ فیصلہ سیاسی دباؤ کے تحت کیا گیا ہے اس مقصد ریزولیشن بلدیو سنگھ خیالہ نے پیش کیا۔ اس پر تقریر کرتے ہوئے سرجیت سنگھ برنالہ نے اکال تخت صاحب کے اقتدار اعلیٰ کو کوئی بھی چیلنج نہیں کر سکتا۔ ہم سب اُسے سب سے اونچا مانتے لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس وقت اکال صاحب کو سیاسی مفادات کے لئے استعمال کیا مجھے آپ نے کہا کہ سری اکال تخت کی طرف سے مجھے جو پنتھ سے خارج کیا گیا ہے یہ بھی سیاسی ڈرامہ ہے

س فیصلہ سے قطعی نہیں گھبرایا بلکہ اور بھی پختہ ۔آپ نے کہا میں گورو کا پکا سکھ ہوں اور پنتھ مدی کلا کے لئے میں نے اکالی دل کی طرف سے ہر مورچہ میں قید کاٹی ہے لیکن نئے سنگھ نے میری وضاحت کو سنے بغیر ہی میرے خلاف ملہ سنا دیا۔ اس اجتماع کو وزیر خزانہ بلونت سنگھ طاب کرتے ہوئے اپنے بارے میں غلط فہمیوں حت کرتے ہوئے کہا کہ میں پوری طرح سے ا کے ساتھ ہوں۔ اجتماع میں حصہ لینے کے لئے ز صاحب کے بھائی مان سنگھ اور تخت سری احب کے ہیڈ گرنتھی بھائی دیا سنگھ بھی پہنچے ں نے سنگھ صاحبان کی کارروائی کو ناجائز قرار دیا۔ وسری طرف اسی دن ضلع سنگرور کے موضع بھوانی

کے مطابق سزائیں دی جائیں گی۔ اس شہیدی کانفرنس میں نئے پانچ سنگھ صاحبان میں سے کیس گڑھ صاحب کے جتھیدار بھائی سوندر سنگھ۔ تخت سری دمدمہ صاحب کے جتھیدار بھائی جسونت سنگھ اور ہرمندر صاحب کے ہیڈ گرنتھی بھائی کشمیر سنگھ موجود تھے جن کی حاضری میں بار بار خالصتان کے نعرے لگتے رہے جبکہ ۲۶ جنوری والے سربت خالصہ کے سبھی ریزولیشنوں کی بھرپور تعریف کے ساتھ ان کی تائید کی گئی۔ اس سماگم میں دمدمی ٹکسال اور فیڈریشن کی طرف سے کئی پولیس مقابلوں میں مارے گئے خطرناک انتہا پسندوں کے وارثوں کو سروپے دیئے گئے۔ جن میں ۲ اکتوبر کو وزیر اعظم راجیو گاندھی پر گولی چلانے والے کرمجیت سنگھ سنام کی والدہ ۵.۵. گوردیال کور۔ سنت ہرچند سنگھ قتل کیس کے بھگوڑے



ہیرو: توسیعی خدمات

یں دمدمی ٹکسال اور سکھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن نے ایک متوازی اجتماع منعقد کیا گیا تھا تاکہ ل والے اجتماع میں لوگ شرکت نہ کریں۔ ویسے سٹوڈنٹ فیڈریشن کی طرف سے لوگوں کو لونگووال سے روکنے کے لئے دھمکیاں بھی دی گئی تھیں کے باوجود لونگوال میں لاکھوں کی بھیڑ تھی جبکہ بھوانی یں بمشکل تمام دو ڈھائی ہزار لوگ ہی پہنچے تھے۔ جتماع کو شہیدی سماگم کا نام دیا گیا تھا جس میں برنالہ رسے خارج کرنے کی تائید کی گئی اور لونگووال اجتماع ہ پنتھ سے نکالے گئے اور ردہلی دربار کے جھاڑو بردار ۔کی طرف سے کئے گئے سیاسی ڈرامے کا نام دیا اس یں پاس کی گئی قرارداد میں کہا گیا کہ اکال تخت کے ات کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سکھ روایات

ملزم مہندر سنگھ کے والد گوربچن سنگھ بھی شامل تھے کچھ جیلوں میں بند انتہا پسندوں کے وارثوں کو بھی سروپے دیئے گئے جبکہ استقبالیہ گیٹ نامور انتہا پسندوں کے ناموں پر بنائے گئے تھے۔ علاقہ کے لوگوں میں اس شہیدی کانفرنس کے بارے میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی جب کہ لونگووال اجتماع میں کئے گئے فیصلوں کو سننے کے لئے واپس جا رہے لوگوں کو جگہ جگہ روک کر پوچھا جا رہا تھا

۲۲ فروری کو امرتسر میں بلائے گئے نام نہاد اجلاس جس کا ۱۵ فروری کو ایک ہفتے کا نوٹس برنالہ وزارت سے نکالے گئے وزیر ہربجن سنگھ سندھو نے دینے کا دعوہ کیا تھا اس کے مطابق پارٹی کے کل ۴۶۸ مندوبین تھے جن میں سے سولہ کی موت ہو چکی ہے ۱۲ جیلوں میں ہیں ۲۳ کو متحدہ اکالی دل یا جوگندر سنگھ، میں

جانے کی وجہ سے پارٹی سے نکال دیا تھا جن کی جگہ ۱۴ ممبر نامزد کئے گئے تھے اس طرح اس وقت کل ڈیلی گیٹوں کی تعداد ۴۴۳ ہے۔ اس ڈیلی گیٹ اجلاس میں ان میں سے ۳۱۶ کے شامل ہونے کا دعویٰ کیا گیا سرجیت سنگھ برنالہ کو پارٹی کی صدارت اور ابتدائی ممبر شپ سے خارج کرنے کا ریزولیشن برنالہ وزارت سے ہی نکالے گئے وزیر تعلیم بسنت سنگھ خالصہ نے پیش کیا جس کی تائید ہریانہ اکالی دل کے صدر کرتار سنگھ ٹھکرسنگی نے۔ اکالی دل کا صدر ہربنس سنگھ گھمن کو بنایا گیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اکالی دل کے آئین کے مطابق ڈیلی گیٹ اجلاس ہی پارٹی کی پالیسیاں اور دیگر معاملے طے کرنے کے لیے اعلیٰ ترین ہے۔ ہر پانچ سال بعد ابتدائی ممبروں میں سے مندوب چنے جاتے ہیں جو سنت ہرچند سنگھ لونگووال کے قتل سے پہلے پارٹی کی ابتدائی بیس لاکھ ممبر شپ کی بنیاد پر چنے گئے تھے جس کے بعد مندوبین کا کوئی چناؤ نہیں ہوا۔ اجلاس میں ایک اور ریزولیشن برطرف وزیر ہربجن سنگھ سندھو نے پیش کیا جس کے مطابق ان گیارہ ڈیلی گیٹوں کو دل کے دوبارہ عہدیدار چنے جانے کا حق دیا گیا جنہیں پارٹی صدر سرجیت سنگھ برنالہ نے پارٹی کی ابتدائی ممبر شپ سے خارج کر دیا تھا۔ ان لوگوں میں اونکار سنگھ تھنگل، پریتم سنگھ اوبرائے، اندرجیت سنگھ باغی اور کلدیپ سنگھ شامل ہیں۔ یہ اجلاس ۵ منٹ میں اپنی کارروائی کر کے ختم ہو گیا۔

دوسری طرف اسی دن یعنی ۲۲ فروری کو ہی سرجیت سنگھ برنالہ نے نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے چنڈی گڑھ میں ہوئے اجلاس کے سبھی دعووں کو جھٹلاتے ہوئے کہا کہ آج امرتسر میں مجھے پارٹی سے نکالنے اور صدارت سے ہٹانے کی ساری کارروائی غیر قانونی اور پارٹی آئین کے خلاف ہے کیونکہ مجھے ہربجن سنگھ سندھو اور اس کے حامیوں کی طرف سے کوئی ریکوزیشن نوٹس نہیں ملا اس لیے میں نے کوئی ڈیلی گیٹ اجلاس نہیں بلایا۔ آپ نے کہا کہ اکال تخت کے نئے نامزد درشن سنگھ راگی واضح کریں کہ ۲۰ فروری کو بھوانی گڑھ میں تین سنگھ صاحبان کی حاضری میں خالصتان کی مانگ کی پرزور تائید کی گئی حالانکہ درشن سنگھ بار بار کہتے ہیں کہ سکھ خالصتان نہیں چاہتے۔ آپ نے کہا کہ اگر سنگھ صاحبان پھوٹ پڑ گئی تو یہ ساری سکھ قوم کے لیے فکر و پریشانی کی بات ہوگی اس لیے پانچوں سنگھ صاحبان کو ایک جیسے خیالات رکھنے چاہئیں۔ آپ نے امرتسر والے ڈیلی گیٹ اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس میں بمشکل تمام بیس فیصد ہی اصلی

ڈپلی گیٹ شامل ہوئے ہوں گے۔ نریتا سنگھ مگر اور بھلو سنگھ اکالی دل کے ڈپلی گیٹ نہیں رہے جنہیں سنت لونگو وال نے پارٹی سے نکال دیا تھا آپ نے بتایا کہ کل ۹۰۴۶ ڈپلی گیٹ ہیں جن میں سے دو ورکن کی موت ہو چکی ہے باقی ۴۴۴ میں سے ۴۴ بابا جوگندر سنگھ کے ساتھ چلے گئے اور ۳۱۱ بادل اکالی دل کے ساتھ چلے گئے تھے باقی مندوب آج بھی ان کے ساتھ ہیں۔ سرجیت سنگھ برنالہ نے اپنی وزارت کے منسٹر مہیندر سنگھ او بوکے اور لوکل باڈی منسٹر مہندر سنگھ سائیاں والا کے اپنے ساتھ ہونے کا دعویٰ کیا حالانکہ مسٹر او بوکے لونگو وال کنونشن میں حاضر نہیں ہوئے تھے اور پچھلے ہی دنوں ان کا پرائیویٹ سیکریٹری انتہاپسندانہ کارروائیوں میں ملوث پایا گیا تھا اور اسی طرح مہندر سنگھ سائیاں والا کا بیٹا گرفتار ہو گیا تھا جس کی ضمانت کروائی گئی۔ سجن سنگھ سدھو پہلے ہی وزیراعلیٰ کو دھوکہ دے کر باغیوں سے جا ملے ہیں اور بسنت سنگھ خالصہ اس سے بھی پہلے برنالہ کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ایک موقع پر وزیر خزانہ سردار بلونت سنگھ نے بھی وزیراعلیٰ کو چھوڑ کر خود وزیراعلیٰ بننے کے لیے خفیہ دوڑ دھوپ شروع کر دی تھی اور اس سلسلہ میں انھوں نے مدرشن سنگھ راگی اور کچھ مرکزی وزرا سے ملاقاتیں بھی کی تھیں لیکن دونوں طرف نئے حالات کے پیش نظر سودا طے نہیں ہو پایا تھا۔ اس لیے بلونت سنگھ نے برنالہ کے ساتھ رہنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی۔ لہٰذا اب برنالہ بھی اپنے چالاک اور چست وزیر خزانہ سے چوکنے ہو گئے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ برنالہ نے اپنے مخالفوں کے اس منصوبہ کو ناکام بنا دیا ہے جس کے تحت نئے مذہبی پیشوا نامزد کر کے انہیں نہ صرف اقتدار سے محروم کرنا تھا بلکہ اکالی دل کی صدارت سے بھی الگ کر کے انہیں گمنامی کی گہری غار میں دھکیلنا تھا۔

۲۳ فروری کو بھارتیہ جنتا پارٹی نے پنجاب بچاؤ کے نام پر دہلی میں ایک بہت بڑا مظاہرہ کیا ملک کے کونے کونے سے اس مظاہرہ میں قریب دو لاکھ لوگ شامل ہوئے بی جے پی کی مانگ تھی کہ انتہاپسندی سے نپٹنے میں فیل برنالہ سرکار کو ہٹا کر پنجاب میں راشٹرپتی راج قائم کیا جائے۔ ضروری جگہوں پر فوج تعینات کی جائے۔ سرحد کے ساتھ حفاظتی پٹی بنائی جائے۔ یہ پارٹی پنجاب کے مسئلہ کو سیاسی کم اور انتظامیہ زیادہ سمجھتی ہے۔ ایک سادہ لوح انسان اس پارٹی کی ان مانگوں کو درست بھی تصور کرتا ہے کیونکہ ۲۳ فروری سے پہلے پنجاب میں کل ملا کر ۱۴۳۰۷ قتل ہو چکے تھے جبکہ صرف برنالہ کے راج میں اس وقت تک ان کی تعداد ۹۱۲ ہو چکی تھی۔ ان میں سے ۷۹ بے گناہ بسوں سے اتار کر مارے گئے۔ ۳۹ بینک لوٹے گئے جن میں سب سے بڑا ڈاکہ ۱۲ فروری کو لدھیانہ کے پنجاب نیشنل بینک میں پڑا جہاں سے ۵.۷۰ کروڑ روپے ڈاکو لوٹ کر لے گئے۔ اسی دوران ۱۱۷ انتہاپسند جیلوں سے بھاگ دوڑے اسی سے زیادہ پولیس والے یا ان کے عزیز و اقارب مارے گئے لیکن سوال یہ ہے کہ دربارہ سنگھ وزارت کے بعد پنجاب میں جتنی دیر راشٹرپتی راج رہا کیا اس میں بے گناہوں کے قتل راہزنی کی وارداتیں بند ہو گئی تھیں؟ نہیں سنجیدگی سے اس بات کو مدنظر رکھنا ہو گا کہ ایک جمہوری ملک میں فوج کی کارکردگی کچھ حدود سے اگر باہر چلنے لگے گی تو اس کے نتائج بھی اتنے ہی خطرناک نکل سکتے ہیں۔

۲۴ فروری کو دہلی میں ہی پنجاب سے باہر کے سکھوں کا ایک شاندار اجتماع ہوا جو راقم الحروف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کیونکہ ان دنوں پورا



مرکزی وزیر داخلہ بوٹا سنگھ

ایک ہفتہ یہ نامہ نگار دہلی میں ہی تھا اس اجتماع نے سرجیت سنگھ برنالہ کے اسٹینڈ کی جس طرح بھرپور تائید کی اس سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ پنجاب سے باہر کے سکھ برنالہ مخالف اکالیوں کی اقتدار کے لیے تگڑم بازیوں سکھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن، دمدمی ٹکسال اور خالصتان کی مدمی پنتھک کمیٹی سے کتنے پریشان ہیں اور ماحول کو جلد سے جلد نارمل ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ پنجاب میں آج بھی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ ہر روز حسب معمول کبھی پانچ۔ دس یا اس سے بھی زیادہ بے گناہوں کو موت کی نیند سلایا جا رہا ہے۔ راہزنی کی وارداتیں بدستور جاری ہیں ہر روز ڈاکے بھی پڑتے ہیں اس کے باوجود ماہ فروری کا مہینہ پنجاب کے حالات کو ایک نیا موڑ دینے کا موجب ضرور کہا جا سکتا ہے جب برنالہ جیسے گورو کے سکھ جس کے مذہبی عقائد پر شک بھی نہیں کیا جا سکتا نے دھرم کے نام پر سیاسی شطرنج کھیلنے والوں کو مات دے دی ہے۔ لونگو وال کنونشن سکھ تاریخ میں آگے چل کر ایک سنگ میل ثابت ہو گا جو مستقبل کے تاریخ دانوں کو بتائے گا کہ جب اکالی دل اپنے راستے سے بھٹک گیا تھا اور اقتدار کے متوالوں نے ملک و قوم کے تئیں اپنے بنیادی فرائض کو فراموش کرتے ہوئے ملک دشمن طاقتوں کے منصوبوں کے لیے سازگار حالات پیدا ہونے جیسے خطرہ کو بھی محسوس کرنا بند کر دیا تھا تب سنت ہرچند سنگھ لونگو وال کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انہی کے گاؤں لونگو وال میں ایک تاریخی فیصلہ کیا گیا تھا اس وقت کے نیک دل سچے سکھ اور محب وطن سرجیت سنگھ برنالہ نے کہا کہ ایک ہی دھرم کے عقیدے کے لوگ الگ الگ سیاسی نظریات کے حامل ہو سکتے ہیں یہ بات مساوی طور پر ہندو، سکھ، مسلمان، عیسائی اور ایسے سبھی مذاہب کے پیروؤں پر لاگو ہوتی ہے لیکن کوئی مذہب اپنے پیروکاروں کو کسی ایک سیاسی نظریہ کے لیے پابند نہیں کرتا۔ سرجیت سنگھ برنالہ نے مذہب اور سیاست کے الگ ہونے کی آج کے دور کی تلخ حقیقت کو پوری طرح تسلیم کرنے میں چاہے تھوڑی دقت محسوس کی ہے لیکن مذہب کے ٹھیکے داروں کے ایسے احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے جو درحقیقت مذہب کی آڑ میں سیاسی گدی کے لیے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں

ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں نے اور مجموعی طور پر عوام نے برنالہ کے اس جرأت مندانہ قدم کی حمایت کی ہے۔ ۸ مارچ کی لدھیانہ ریلی اس کا منہ بولتا ثبوت تھی جب پنجاب کے کونے کونے سے آئے ہوئے لاکھوں پنجابیوں نے ملکی سلامتی و قومی یکجہتی کے حق میں اور انتہاپسندی و علیحدگی پسند طاقتوں کے خلاف حلف لیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایسی ریلیاں انتشار کی طاقتوں کے عمل کو یکسر روک نہیں سکتیں بلکہ ایسی طاقتوں کے دائرہ عمل کو محدود کر کے ان طاقتوں کو اپنی موت خود مرنے پر مجبور کر دیں گی اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

## ایک اور جلیانوالہ

سنجے کرشن داس

# ارول کا قتل عام

اس صدی کے اوائل میں دوسری دہائی اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس عرصہ میں وطن عزیز کی تحریک آزادی ایک نئے دور میں داخل ہوئی، اور حب وطن کے نشے میں سرشار آزادی کے متوالوں نے غیر ملکی استبداد کے پنجے سے مادر وطن کو آزاد کرانے کے لیے اپنی جدوجہد تیز تر کر دی تھی۔ تبھی اپریل ۱۹۱۹ کے ایک منحوس دن جلیانوالہ باغ کا خونیں واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا۔ اس بھیانک قتل عام نے پورے عالم انسانیت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بے رحم حکمرانوں کے طاقتور پہرے داروں نے اس باغ سے نکاسی کے تمام راستے بند کر دیئے تھے اور اس کے بعد وہاں جمع بے گناہ انسانوں پر گولیوں کی بارش کی تھی، گولی کا شکار ہونے والوں میں صرف مرد ہی نہیں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے، سیکڑوں افراد اسی جگہ جاں بحق ہو گئے تھے۔ موت کا نوالہ بننے والے ان بے گناہوں کی خطا صرف اتنی تھی کہ وہ اپنے دو قائدین کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔

اس خونی ڈرامے کے ۶۷ برس بعد ریاست بہار کے ضلع جہان آباد کے قصبہ ارول میں گاندھی سنگھرالیہ کے میدان میں انسانوں کا ایک اور اجتماع ہوا۔ یہ بے گناہ اور معصوم انسان ایک مقامی زمیں دار کے ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کے لیے جمع ہوئے تھے، جس نے ان کی جھونپڑیوں اور کچے مکانوں کو منہدم کر کے ان کی زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ ستم ظریفی تو یہ ہوئی کہ ان معصوموں پر گولی چلانے کا فریضہ اسی پولس نے انجام دیا جو دراصل ان کی حفاظت کی ذمہ دار سمجھی جاتی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ یہ کارروائی ریاست میں بڑھتی ہوئی انتہا پسندی، کے سدباب کے نام پر کی گئی۔

محکمۂ مال کے ذرائع کے مطابق متنازعہ زمین دراصل رامیشور ربک نام کے ایک شخص کی ملکیت ہے۔ اور یہ زمین وسیل پور گاؤں میں واقع ہے یہ گاؤں تھانہ ارول کے دائرہ اختیار میں ہے نئے ریکارڈ کے بموجب اس زمین کا کھاتہ نمبر ۳۰ ہے اور پلاٹ نمبر ۴۵۹ ہے۔ پرانے اندراجات کے مطابق یہ نمبر بالترتیب ۲۱۱ اور ۲۱۲ تھے یہ پلاٹ زیادہ تر گڑھوں پر ہی مشتمل ہے۔ کچھ غریب اور بے زمین لوگوں نے کڑی محنت کر کے اس زمین کے کچھ حصوں کو ہموار کیا تھا اور اس پر مٹی کی دیواریں کھڑی کر کے جھونپڑے بنا لیئے تھے تاکہ کم سے کم سر چھپا سکیں۔ سیارام مقامی ڈاکخانے میں کام کرتا ہے۔ اس کا کمسن بیٹا چندیشور اس پولس فائرنگ میں ہلاک ہوا تھا۔ دکھ سے ٹوٹے ہوئے سیارام نے بتایا کہ اس کے خاندان نے اس متنازعہ زمین پر ۱۹۸۰ میں ایک جھونپڑی ڈالی تھی سیارام کے پاس ایک باقاعدہ فائل بھی ہے، جس کے کاغذات بتاتے ہیں کہ نو افراد گنوری کالو، جنک ساب، سیجن ساہ، یاموا ساہ، للن رام، سیا سرن کہار، بابو رام، چندیشور کاہر اور راجندر ساہ نے مشترکہ طور پر اس زمین کو حاصل کرنے کے لیے درخواست



بندیشوری دوبے، وزیر اعلیٰ بہار

دی گئی تھی۔
ان لوگوں کی جھونپڑیاں متنازعہ زمین کی مشرقی حد کے قریب واقع ہیں، ان لوگوں میں سے جیمد لیشور کہ اور راجندر ساہ اب اس دنیا میں نہیں، سیارام کے پاس ایک درخواست ہے جس پر ۱۲ دسمبر ۸۵ کی تاریخ درج ہے، یہ درخواست ایس۔ڈی او۔جہاں آباد کے نام لکھی گئی تھی اس درخواست پر یہ ہدایت درج ہے کہ اگر درخواست دہندگان بے زمین ہیں، تو اس رقبہ کے سلسلے میں ان کے ساتھ تصفیہ کر لیا جائے۔

اس زمین کے سلسلے میں سرکاری موقف کی وضاحت سرکل افسر رمیش لال نے کی۔ انہوں نے بتایا کہ دراصل یہ زمین غیر کاشت زمین تھی اور نجی ملکیت تھی، یہ سونو ریاست کے زمین دار کی جاگیر میں شامل تھی، اس جاگیر دار نے اپنی تمام زمین دراؤل ریاست کے ہاتھ فروخت کر دی تھی، زمیندار نے اس کی مالگذاری کا کوئی حساب داخل نہیں کیا تھا بہرکیف رجک اپنے دعوے کی توثیق میں ۱۹۴۳ء کا ایک سادا حکمنامہ پیش کرتا ہے۔ ۶۲-۱۹۶۱ء کے مازاوتیں رجک کا نام درج ہے۔ سرکل افسر مسٹر لال نے

گئی تھی۔ مسٹر لال کے پاس اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں تھی کہ اس معاملے کو طے کرنے کے لیے کیا کاروائیاں کی گئیں، بہرحال انہوں نے یہ بتایا کہ مندرجہ بالا حکمنامہ ہی دراصل رامیشور رجک کے حق میں کرایہ کا تصفیہ کرنے کی بنیاد بنا تھا۔
حیرت کی بات ہے کہ حکام مال نے محض ۱۹۴۳ء میں جاری کیے گئے ایک سادہ حکم نامے کو رامیشور رجک کی ملکیت کا ثبوت تسلیم کر لیا تھا جبکہ اس زمیندار نے اس زمین کی مالگذاری کے سلسلے میں کوئی حساب کتاب بھی پیش نہیں کیا تھا۔ یہی نہیں رامیشور رجک



ظلم سہنے والے اہل اردل اکیلے تو نہیں

سیارام کے پاس ایک اور حکمنامے کی نقل ہے، یہ حکمنامہ اس زمین کے سلسلے میں ۱۲ دسمبر ۸۵ کو جہان آباد کے سب سے بڑے مجسٹریٹ مسٹر جے ایم داس کے دستخط سے جاری کیا گیا تھا، اس کاغذ کا نمبر ۱۸۵۰/ایم/۸۵ ہے۔ اس میں یہ بھی درج ہے کہ کاغذات میں اس زمین کو ناآباد بہار سرکار لکھا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمین سرکاری ملکیت ہے کسی کی نجی جائیداد نہیں ہے۔

نجی ملکیت کی غیر کاشت زمین کے ضابطے کی دفعہ ۹ اور ۱۳ کے تحت تیار کیے گئے ریکارڈز کے سلسلے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ تاہم انہوں نے کھل کر بات کرنے کے سلسلے میں معذوری ہی ظاہر کی۔ انہوں نے بتایا کہ بات تصفیہ کی نہیں تھی، بلکہ یہ تھی کہ جو مطالبہ اکتوبر ۸۴ میں سامنے آیا تھا اسی کو دوبارہ شروع کیا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں تمام رسمی کارروائی ۲۲ جون ۸۱ کو مکمل کر لی

نے پچاس سال کے عرصہ میں کبھی بھی اس زمین کے کاغذات میں اپنے نام کے اندراج کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے علاوہ رامیشور رجک نے از سر نو سروے کے وقت بھی کوئی اقدام اپنے حق کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں نہیں کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ محکمہ مال کے افسران رامیشور رجک کی طرف داری کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں حکومت کے بنائے گئے ان تمام قوانین کو طاق پر رکھ دیا گیا

تھا جو "مزارعہ خاص زمین" کے سلسلے میں بنائے گئے تھے۔ اور جو خاص عمل ضابطہ میں درج ہیں۔ دخل ات گزاروں کی جائز مانگ کو بڑی درشتگی سے مسترد کر دیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ کہ اس مالدار کسان نے ان غریبوں کو اجاڑنے کے لیے پولس اور محکمہ مال کے افسران کی مدد بھی حاصل کی، مقامی پولس کا رول بھی بہت خراب رہا۔ اس نے صرف جلتی آگ میں تیل ڈالنے کا کام کیا اور اس زمین پر فروری ۸۶ میں چہار دیواری بنوانے میں رامیشور ریک کی بڑھ چڑھ کر مدد کی۔

ان اجڑے بے گھر لوگوں کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ مزدور کسان سنگرام سمیتی کی مدد لیں۔ یہ تنظیم اس علاقے میں سرگرم عمل ہے اور سماج کے کمزور طبقوں کی مدد کرتی ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس تنظیم کا جھکاؤ کافی حد تک بائیں بازو کی طرف ہے اور یہ حقیقت بھی افسوس ناک ہے کہ اس تنظیم کے بارے میں ریاستی حکومت اور پولس کی رائے اچھی نہیں ہے۔

اب ہم ۱۹ اپریل کے سیاہ دن کی طرف آتے ہیں۔ اس دن تمام دکھی لوگ مزدور کسان سنگھرش سمیتی کے جھنڈے تلے جمع ہوئے اور انھوں نے پرجوش جذباتی انداز میں زمین کی نئی چہار دیواری گرانے کی کوشش شروع کی۔ پولیس کی مداخلت کے باوجود دیوار کا ایک بڑا حصہ گرا دیا گیا۔ اس کے بعد اپنے لیڈران کی ہدایت کے مطابق مجمع گاندھی پستکالیہ کی طرف چلا۔ یہ لائبریری یہاں سے ۵۰۰ گز کے فاصلے پر داہنی جانب واقع ہے۔ لائبریری کے سامنے ایک کھلی جگہ ہے جہاں سات آٹھ سو افراد جمع ہو سکتے ہیں۔ اس کے ایک طرف سڑک ہے اور دوسری جانب پرائمری اسکول! اس میدان کے پیچھے پولیس اسٹیشن کی چہار دیواری ہے۔ اس میدان سے باہر جانے کے صرف دو راستے ہیں۔ ایک سڑک اور دوسری وہ تنگ گلی جو پرائمری اسکول کے برابر ہے۔ یہ لوگ یہاں تبادلۂ خیال کرنے اور اپنے لیڈروں کی بات سننے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ جلسہ پر امن طریقے جاری تھا تبھی جہاں آباد کے ایس۔ پی پولس کی بھاری جمعیت میں وہاں پہنچے اور ان نہتے لوگوں پر فائرنگ کرنے کا حکم دیا۔ یہاں پر عورتوں اور بچوں کی بھی خاصی تعداد موجود تھی۔ ۵۳ راؤنڈ گولیاں چلیں اور پھر ایک ہٹلر کی یاد تازہ ہو گئی۔ عورتوں سمیت کسی کو بھی بخشا نہیں گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں موت کا سناٹا طاری تھا۔ لاشوں اور زخمیوں کو پولیس گاڑیوں میں پٹنہ میڈیکل کالج بھیجنے کے لیے کہا گیا۔ راستے میں بھی کئی افراد دم توڑ گئے اور کچھ صحیح وقت پر طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے جاں بحق ہوئے۔ اسپتال میں صحافیوں کو کسی بھی زخمی یا مرنے والے کے وارثوں سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

ہیومن رائٹس ٹریبونل:۔۔ ریاستی حکومت کی غفلت اور انسانی حقوق کی پامالی کو دیکھتے ہوئے انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے اس ادارے نے اس مسئلے کو ریاستی حکومت کے سامنے رکھا۔

جنوری کے آخر میں دہلی میں اس سلسلے میں سماعت کی۔ اس کے بعد کمیشن نے دو نشستوں میں ارا ول میں ۲۱ فروری اور پٹنہ میں ۲۲ فروری کو میٹنگ کی۔ ٹریبونل نے جو جناب پی سی پوئی (سابق چیف جسٹس گجرات ہائی کورٹ) اور جناب ڈی پی مہتا (سابق چیف جسٹس ہماچل پردیش ہائی کورٹ) پر مشتمل تھا۔ اس کمیشن نے پہلے ارول میں متنازعہ زمین کا معائنہ کیا اور پھر گاندھی پستکالیہ کے میدان کا جائزہ لیا جہاں یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ اس کے بعد یہ لوگ ارا ول پولیس اسٹیشن گئے۔ جہاں کے ایس ایچ او مسٹر اوجھا نے اپنا بیان دیا اور وہ سامان (دیسی رائفلیں اور پستولیں) دکھایا جو ان کے مطابق مجمع کے قبضے سے برآمد کیا گیا تھا۔ پولیس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ پہلے مجمع نے ان پر حملہ کیا تھا اور انھوں نے صرف اپنے دفاع کے لیے جوابی کارروائی کی تھی۔

اس کے بعد ٹریبونل نے ۱۴ افراد کے بیانات سنے جس میں شانتی دیوی جن کا شوہر اس فائرنگ میں ہلاک ہوا تھا۔ مالتی دیوی جن کا پوتا انل کمار بھی اس کیس میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ منگر موچی، روپ لال لکشمن اور کمار بھی شامل تھے۔ جو بری طرح سے زخمی ہو گئے تھے۔ ان متاثرہ افراد کے علاوہ کمیشن نے



ارول کہاں نہیں، ظلم کہاں نہیں

بہت سے صحافیوں، سماجی کارکنوں، وکیلوں کے علاوہ شری چندر شیکھر سنگھ (سابق ایم پی کمیونسٹ پارٹی) کے بھی بیانات قلم بند کیے جو اس المیہ کے چشم دید گواہ تھے۔ جن متاثرہ افراد کے بیانات قلم بند کیے گئے ان کے بیانات خاصے الجھے ہوئے تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر شخص ایسی بھیڑ کے بارے میں بالکل صحیح اور حرف بحرف بیان نہیں دے سکتا، جو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہو۔ اس کے علاوہ اس واقعہ کو دس ماہ گذر چکے ہیں۔ بہرحال اس کے باوجود اس سماعت اور ان بیانات سے ایک ایسی تصویر ضرور ابھر آئی جس کے ذریعے پولیس اور ریاستی حکومت مورد الزام قرار پائی ہے۔ تمام چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ جلسہ پرامن طور پر جاری تھا، کہ ایس پی صاحب کی گاڑی آئی اور انھوں نے آتے ہی مجمع پر فائرنگ کا حکم دے دیا، اور فوراً ہی پولیس نے لوگوں کو دوڑانا اور مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ رپورٹ کے مطابق پولیس نے آتے ہی بغیر کسی طرح کی وارننگ دیئے ہوئے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ لوگوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ اور جانوروں کی طرح مارنا شروع کر دیا گیا۔ چندر شیکھر سنگھ نے پوری داستان قلم بند کروائی۔

دوسری طرف پولیس کا بیان ہے کہ پولیس نے گولی اس وجہ سے چلائی کیونکہ لوگ تشدد پر آمادہ تھے۔ اور انھوں نے پولیس اسٹیشن پر پتھراؤ شروع کر دیا تھا اور اسے تہس نہس کرنا چاہتے تھے۔ "ٹائمز آف انڈیا" پٹنہ کے نامہ نگار ارون سنہا اور ایک مقامی اخبار نویس منی کانت ٹھاکر نے ٹریبونل کو بتایا کہ پولیس اسٹیشن پر پتھراؤ کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے اور پولیس اسٹیشن پر جو گولیوں کے نشانات دکھائی دے رہے ہیں وہ پولیس والوں کا اپنا کارنامہ ہے۔ "اسٹریٹیجی ویکلی آف انڈیا" کے نامہ نگار خصوصی عابدی نے ضلع مجسٹریٹ گیا شری اشوک سنگھ کا ایک بیان بھی ٹیپ کیا جس میں انھوں نے اس بڑی تعداد میں ہلاکت کو ناانصافی قرار دیا۔"

بدقسمتی سے حکومت بہار اس سماعت کے حق میں نہیں تھی۔ اس سماعت سے اس کی غیر حاضری اس کا کھلا ثبوت ہے۔ یہی نہیں حکومت نے سرسری چھان بین میں بھی کوئی تعاون نہیں کیا۔ حکومت کی اس غفلت سے اس کا اخلاقی دیوالیہ پن ظاہر ہے۔ اس وقت غیر سرکاری تفتیش پی۔ یو۔ سی۔ ایل اور جمہوری حقوق کی علم بردار ایک تنظیم نے کی۔ پی۔ یو۔ سی۔ ایل کے سکریٹری مسٹر روی شنکر پرشاد نے ٹریبونل کے سامنے حکومت کی بے توجہی کی شکایت کی۔ بعد میں انھوں نے اپنی لرزتی آواز میں اسی نمایندہ کو بتایا کہ "جو ہم کر سکتے تھے ہم نے کیا۔ اگر اس اخلاقی دباؤ اور عوام کی آواز کا اثر افسران پر نہیں ہوا تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا" روی شنکر پرشاد کی آواز میں عوام کی آواز کی گونج صاف سنائی دے رہی تھی۔

اس معاملے کی آخری سماعت ۵ اپریل کو دہلی میں ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ کیا مظلومین کو انصاف ملے گا یا حکومت انہیں ان کا حق دلائے گی جیسا کہ ٹریبونل کی سماعتی کارروائی سے ظاہر ہے اس کا فیصلہ متاثرہ افراد کے حق میں ہونے کا امکان ہے۔ حکومت بہار کے مبینہ رویے کے پیش نظر یہ کہنا مشکل نہیں کہ ریاستی حکومت جھکے گی نہیں۔ کیونکہ ٹریبونل کے فیصلے کا قانونی طور پر اطلاق تو ہوتا نہیں ہے۔ بہرحال یہ بدقسمتی ہی ہے۔ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

# میزورم

# انتخاب کے بعد کا مرحلہ

ملک فردوس

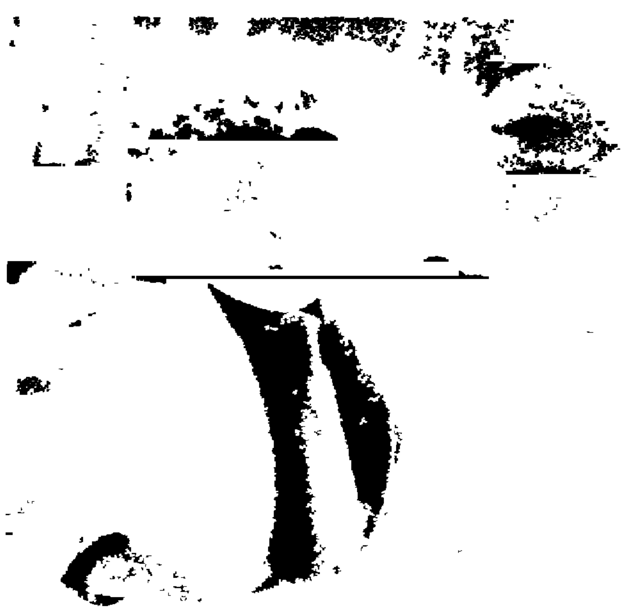
۲۰ برس کی شورش اور تشدد پسندی کے بعد ۳۰ جون کو میزورم سمجھوتے کی صورت میں ملک کے اس انتہائی شمال مشرقی حصے میں امن کی جانب جو سفر شروع ہوا تھا اس کا پہلا مرحلہ ۲۰ فروری ۱۹۸۷ کو ایک نئی ریاست کے قیام اور ایک نئی حکومت کے برسراقتدار آنے سے تکمیل پا گیا ہے۔

تاہم دہلی کے سیاسی حلقوں نے ۱۶ فروری کو ریاست کی اسمبلی کی ۴۰ نشستوں کے لیے انتخاب کے نتائج پر جس میں ۱۴۵ امیدواروں نے حصہ لیا راحت کا سانس لیتے ہوئے محسوس کیا ہے کہ ایک دردسر ختم ہوا۔ ایک نئی ریاست قائم ہوئی مگر ایک اور ریاست کانگریس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

انتخاب کے نتائج خواہ کچھ بھی نکلے ہوں متوقع ہوں یا غیر متوقع لیکن انتخاب کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ میزو نیشنل فرنٹ جو بندوق کی نالی سے بات کر رہا تھا اب ایک علیحدگی پسند تنظیم کی بجائے ایک قانونی طور پر برسراقتدار سیاسی جماعت بن گیا ہے جس کے کندھوں پر ایک ریاست کی ترقی اور پیش رفت کی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے

## ۲۳ویں ریاست

میزورم ملک کی ۲۳ ویں ریاست ہے جس کا رقبہ ۲۱۰۸۱ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی قریب پانچ لاکھ ہے۔ یہ ایک انتہائی نازک سرحدی علاقہ ہے جس کی ۱۱۰۰ کلومیٹر لمبی سرحد بنگلہ دیش اور برما سے ملتی ہے اور جہاں سے چین جانا بھی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ گذشتہ کئی برسوں سے اس علاقے میں غیر ملکی شہہ پر شورش پسندی کا عمل جاری رہا ہے۔ میزورم پہلے آسام کا حصہ تھا لیکن مسلسل شورش اور دہشت پسندی سے نمٹنے کے لیے اسے ۱۹۷۱ میں مرکز کے زیر انتظام علاقے کی شکل دیدی گئی تھی۔ پھر بھی یہ گوریلا قسم کی سرگرمیوں کے سبب مرکزی حفاظتی تنظیموں کے لیے ایک دردسر بنا رہا۔ طویل سیاسی کوششوں کے بعد ۳۰ جون ۱۹۸۶ کو راجیو گاندھی اور میزو نیشنل فرنٹ کے رہنما لال ڈینگا کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا جس کے تحت ریاستی اسمبلی کی چالیس نشستوں کے انتخاب کرانے اور اس مرکزی علاقے کو مکمل ریاست کا درجہ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ سمجھوتے کے دونوں فریقوں نے مختلف سیاسی حلقوں کے ظاہر کردہ کئی خدشات



: آزمائش کی گھڑی تو اب ہے :
لال ڈینگا وزیر اعظم راجیو گاندھی کے ساتھ

کے باوجود اس سمجھوتے کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ مرکزی علاقے میں پر امن چناؤ کرائے گئے ہیں اور اسے پوری ریاست کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ ریاست کے عوام نے نئی ریاست کے قیام پر خوشی اور جوش و مسرت کا بے پناہ اظہار کیا۔ جگہ جگہ خوشی کی تقریبات ہوئیں۔ خود وزیر اعظم راجیو گاندھی اس موقع پر ایزول گئے اور لال ڈینگا کو مبارکباد دیتے ہوئے ریاست کی ترقی کے لیے مرکز کی ہر ممکن امداد کا یقین دلایا۔ وزیر اعلیٰ لال ڈینگا نے انھیں ایک تقریب میں میزورم کا سب سے بڑا شہری اعزاز "تھنگ چوا" عطا کیا۔ لال ڈینگا نے کہا کہ بے شک ان کے مقامی کانگریس سے اختلافات رہتے ہیں لیکن وہ مرکزی حکومت کے ساتھ دوستانہ اور مضبوط تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اقلیتوں کو پوری حفاظت کا یقین دلایا۔

ان نتائج نے غلط یا صحیح ریاستوں میں یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ جو طاقت بھی مرکز کی بالادستی سے ٹکر لیتی ہے عوام اس کا ساتھ دیتے ہیں اور یہ تاثر جہاں علاقہ پرستی کے حق میں جا سکتا ہے وہاں قومی یکجہتی کے عمل کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ان نتائج سے یہ تاثر بھی پیدا ہوا ہے کہ جو فریق مرکز کا ساتھ دیتا ہے وہ چناؤ میں ہٹ جاتا ہے۔ لال تھنوالا کبھی لال ڈینگا کے رفیق کار تھے لیکن ان سے الگ ہو کر کانگریس سے آملے۔ انھوں نے مرکز میں برسر اقتدار پارٹی کی خواہشات کے مطابق قربانی کی۔ کشمیر کے میر قاسم کی طرح وزیر اعلیٰ کی گدی خالی کر کے عبوری سرکار کے لیے لال ڈینگا کے حوالے کر دی اور خود ڈپٹی چیف منسٹر کا عہدہ قبول کر لیا۔ لیکن ان کا تمام پروپیگنڈہ کہ کانگریس نے قیام امن کے لیے یہ قربانی دی ہے نیز عوام کو یاد دلانا کہ ان کی اس قربانی اور راجیو گاندھی کی کوششوں سے ہی انھیں امن نصیب ہوا ہے کام نہیں آسکا اور وہ میزورم کے سیاسی شہید بن گئے ہیں اگرچہ وہ کامیاب ہو کر ریاستی اسمبلی میں آگئے ہیں۔

البتہ میزورم کی اقلیتوں میں عدم سلامتی کا احساس موجود ہے اور لال ڈینگا کو اپنے "فیلڈ" کو (لال ڈینگا پارٹی کا چناؤ نشان شیر تھا) قابو میں رکھنا ہوگا۔ میزورم نیشنل فرنٹ کی کامیابی کا بڑا سبب اس کے جوشیلے اور متعصب پیروکار تھے یا وہ لوگ جنھیں کانگریس آئی اور پیپلز کانفرنس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ خود میزو نیشنل فرنٹ کے رہنما بھی اپنی تقریروں میں لوگوں کو بھاری ترقی کے لیے مختلف ذرائع سے مالی امداد کے سہانے خواب دکھانے کے ساتھ ساتھ یہ اشارے بھی دیتے رہے کہ اگر فرنٹ اقتدار میں نہ آیا تو ریاست کو پھر سے شورش پسندی اور بدامنی کا سامنا کرنا پڑیگا۔ دوسری جانب کانگریس کی حامی اقلیتیں ہزیمت کے علاوہ بے عزتی کا احساس کر رہی ہیں۔ انھیں ڈر ہے کہ لال ڈینگا کے وعدوں کے باوجود میزو



لال ڈینگا: حق رائے دہی کا استعمال

نوجوان انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ پوری ریاست کا درجہ ملنے سے ان کے ہاتھ اور بھی مضبوط ہو جائیں گے کیونکہ مرکز کو امن و قانون کے امور میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں رہے گا۔ جیسے کہ پنجاب میں ہو رہا ہے۔ کچھ خبریں آنے لگی ہیں کہ ان نوجوانوں نے اقلیتی باشندوں سے زبردستی ٹیکس وصول کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ اس لیے میزورم کے داخلی امن کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ

مرکزی سرکار لال ڈینگا پر زور دے کہ وہ نئی مشکلات کھڑی نہ ہونے دیں۔ میزورم کے چناؤ میں میزو نیشنل فرنٹ کی کامیابی نے ثابت کر دیا ہے کہ کوئی پارٹی اپنا نصب العین خون بہائے بغیر بھی جمہوری طریقوں سے حاصل کر سکتی ہے۔ یہ چناؤ ملک کے دوسرے حصوں میں اٹھنے والی تحریکوں کے لیے بھی مشعل راہ ہو سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کامیاب پارٹیوں پر امن کی راہ پر سفر کی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ میزورم میں ابھی بہت سے گوریلے موجود ہیں جنھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے وہ لال ڈینگا کے ساتھی رہے ہیں اور انھیں راہ راست پر لانا بھی ان کا ہی فرض ہے اگر وہ لوگ راہ راست پر نہ آئے تو امن کا قافلہ ترقی کی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی پہاڑی پر ٹھٹک کر بیٹھ جائے گا

ویربھدر سنگھ

# ہماچل پردیش
# ترقی کے سولہ برس

۲۵ جنوری ۱۹۷۱ کو ہماچل پردیش کو ملک کی ویں ریاست بنانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ں ریاست نے کئی سنگ میل پار کر لیے ہیں ترقیاتی رگرمی کے میدانوں میں کئی نئے ریکارڈ قائم کئے گئے ب۔ کارآمد بنیادی سہولیات مہیا کی گئی ہیں۔ اور سے اعتماد کے ساتھ ۲۱ ویں صدی میں داخلے ے لیے منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔

پہاڑی لوگ آج نمایاں طور پر بہتر معیار زندگی ے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ تعلیم کا تناسب قومی وسط سے کہیں زیادہ ہے۔ ریاست میں زائد از ۹۶۰۰ تعلیمی ادارے ہیں، تقریباً ۱۶ ہزار کلومیٹر بی سڑکیں اور ۲۱۸۴ صحت کے ادارے ہیں۔ اندازاً ۹۰ فی صد دیہات میں بجلی پہنچائی جا چکی ہے ر ۸۰ فی صد دیہات کو نلوں کے ذریعہ پینے کا پانی مہیا یا جا رہا ہے۔

پھلوں، غیر موسمی سبزیوں اور فصلوں کی یداوار اتنی بلندیوں تک پہنچ گئی ہے۔ جن سے سال ۵۰۰ کروڑ روپے کی مالیت کی اقتصادی رگرمی پیدا ہو رہی ہے۔ جنگلوں کی کٹائی کا کام مکمل ر پر سرکاری تحویل میں لے لیا گیا ہے اور ۲۰۰۰ ب ریاست کے نصف راستے میں جنگل لگانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ بجلی کی تیاری کے شعبے میں ۱۹۹ تک ۴۷۰۰ میگا واٹ بجلی تیار کرنے کے منصوبے پر عمل کے لیے قدم اٹھائے گئے ہیں۔

گذشتہ ایک برس میں کچھ نمایاں کامیابیاں صل ہوئی ہیں۔ ہمیرپور میں علاقائی انجینئرنگ لج نے کام شروع کر دیا ہے اور پالم پور میں ج مویشیاں کی تعلیم کے کالج میں کام شروع ہو گیا۔ جنگلات اور باغبانی کی یونیورسٹی جو دسمبر ۱۹ میں قائم ہوئی تھی کی بنیادیں اور پختہ کی گئی۔ ریاست کی تعلیم کا دس جمع دو کا نظام ثانوی



سکولوں اور تمام ۲۵ کالجوں کے ذرائع رائج کیا گیا ہے۔ تیکنیکی تعلیم کا ایک نیا بورڈ قائم کیا گیا ہے

## ڈبے بنانے کا کارخانہ

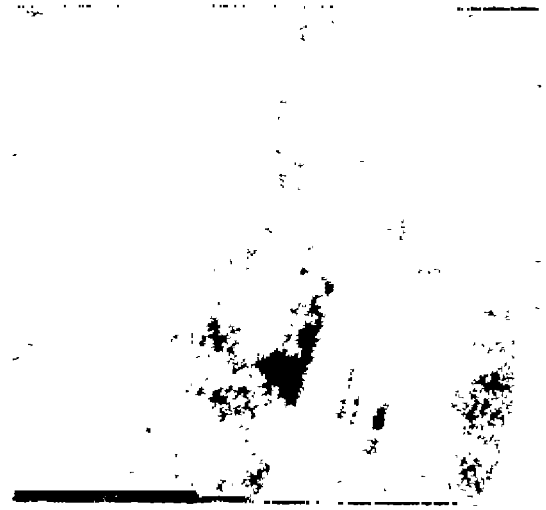
حال کا سب سے انقلابی فیصلہ لکڑی کے روائتی ڈبوں کی جگہ گتے کے ڈبے استعمال میں لانے کا ہے اس فیصلے کی پشت پر یہ خیال کارفرما ہے کہ صنوبر اور سفیدے کے درختوں کو بچایا جائے جو گذشتہ ۵۰ برسوں سے پھل بند کرنے کی پیٹیاں تیار کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں طویل مدت میں اگنے والے یہ درخت نہ صرف بیش قیمت ہیں بلکہ اگر ایک بار کاٹ لیے جائیں تو انہیں دوبارہ اگنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ ہمالیہ کا نازک ماحول اس زیاں کاری اور عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا حکومت نے ساڑھے سترہ کروڑ روپے کے مصارف سے نالی دار گتے کی چادریں تیار کرنے کا ایک پلانٹ لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جہاں دو شفٹوں میں کام ہوگا اور جہاں سے ہر سال ایک کروڑ گتے کے ڈبے بنانے کے لیے چادر مہیا کی جائے گی۔

ڈبے بنانے کا کام نجی دائرہ کار میں ہوگا۔ یہ کارخانے پھل اگانے والے علاقوں میں کام کریں گے ہماچل سرکار نے مرکز کو بعض مراعات کے لیے لکھا ہے تاکہ گتے کے ڈبے معقول نرخوں پر فروخت کیے جا سکیں۔ بعد ازاں ہم ریاست میں ہی کرافٹ پیپر تیار کرنے کا کارخانہ لگانا چاہتے ہیں۔ لیکن فی الحال زیادہ مضبوط قسم کا کرافٹ پیپر تیار کیا جائے گا۔ اور درمیانہ قسم کا کرافٹ پیپر ریاست اور ملک کے دیگر حصوں سے حاصل کیا جائے گا۔ اس برس قریب بیس لاکھ ڈبے پھل اگانے والوں کو مہیا کیے گئے اور منڈیوں میں بہت مقبول ثابت ہوئے۔ مختلف سائز کے سیبوں، سیلے اور گٹھلی والے پھلوں کے لیے ایسے ڈبے تیار کرنے کے بارے میں تحقیق کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ جن میں پانی داخل نہ ہو سکے اور جو نمی کو روک سکے ہوں۔

۱۹۸۶ میں ریاست میں ایک انتظامیہ ٹریبونل بھی قائم کیا گیا ہے جو سرکاری ملازموں اور سرکاری دائرہ کار کے ملازموں کی درخواستوں اور اپیلوں کا تیزی سے فیصلہ کرے گا۔ اس ٹریبونل کا سربراہ ہائی کورٹ کا ایک جج ہے جو حال ہی میں ملازمت سے سبکدوش ہوا ہے۔

رانگ تانگ کا پن بجلی گھر جو سطح سمندر سے ۱۲ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع شاید دنیا کا سب

۳۰۰ میگا واٹ) اور تھ ار (۱۲۰ میگا واٹ) کے بجلی گھروں کے پراجیکٹوں پر کام تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور یہ دونوں بجلی گھر آئندہ دو برس میں چالو ہو جانے چاہیے۔ کانگڑہ ضلع کے گج اور باتھری بجلی پراجیکٹوں پر کام کی پیش رفت کو



تیز کرنے کے قدم بھی اٹھائے گئے ہیں۔

## قدرتی آفات

اس دوران میں ریاست کو بعض سنگین حالات کا بھی مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ جب ابھی حکومت زیادہ بارشوں برف باری اور خشک سالی کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے عوام کو راحت مہیا کرنے میں مصروف تھی تو کانگڑہ چنبہ اور منڈی کے اضلاع کے کچھ علاقوں کو زلزلے نے ہلا کر رکھ دیا۔ ان زلزلوں سے ۱۰۶ ۶ کروڑ روپے کی جائیداد کو نقصان پہنچا۔ یہ زلزلے دوپہر کے وقت آئے جبکہ دیہات کے اکثر لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اور شہروں کے لوگ دوپہر کے کھانے کے وقفے کے لیے باہر تھے ورنہ جانی نقصان بہت زیادہ ہوتا۔ ریاستی سرکار موقع پر پوری اتری اور لوگوں کو غیر معمولی پیمانے پر امداد مہیا کی گئی۔ راحت دینے کے لیے مقررہ شرحوں میں ترمیم کی گئی تاکہ امداد کی مقدار میں کافی اضافہ کیا جا سکے۔ زلزلوں سے متاثرہ کنبوں کو امداد دینے کے لیے ۱۳ کروڑ ۵۵ لاکھ روپیہ منظور کیا گیا۔

آئندہ برس کے لیے ایسے علاقوں میں سڑکوں کی تعمیر کے لیے ۱ کروڑ روپے فراہم کیے گئے جو

پانگی کے لوگوں کے لیے جولائی ۱۹۸۶ ناقابل فراموش دن تھا۔ کیونکہ علاقے کی تاریخ میں پہلی بار موٹر گاڑیوں کی سڑک روہلی کے مقام پر پانگی وادی پر پہنچی ہمیں یقین ہے کہ ساتویں منصوبے کے آخر تک یہ سڑک کلر تک پہنچ جائے گی۔

ہم ایسے علاقوں تک رسائی کے لیے ہیلی پیڈ کے راستے تعمیر کریں گے جہاں سڑکوں کی تعمیر خطرناک ہے۔ اور اس پر وقت اور پیسہ بہت خرچ آتا ہے۔ کانگڑہ ضلع میں گاگل کے مقام پر ہوائی اڈے کی تعمیر کا کام ۱۹۸۶ء میں شروع کیا گیا۔ اور شملہ کا ہوائی اڈہ اس برس گرمیوں تک کام کرنے لگے گا ہماری کوشش ہے کہ اس ہوائی اڈے کو جیٹ ہوائی جہازوں کے استعمال کے قابل بنایا جائے ہم منالی ہمیرپور، کانزا اور کچھ دیگر مقامات پر چھوٹے ہوائی جہازوں کے استعمال کے لیے ہوائی پٹیاں تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم الگ تھلگ مقامات پر ہیلی کوپٹروں کے اڈوں کا ایک جال بھی بچھانا چاہتے ہیں تاکہ ان علاقوں میں خاص طور پر سردیوں میں جب برف باری سے راستے بند ہو جاتے ہیں وہاں ہیلی کوپٹر سے آمدورفت کی خدمتیں مہیا کی جاسکیں۔

ہماری ریاست ۵۵۶۷۳ مربع کلومیٹر علاقے میں پھیلے ہوئے ۱۶۹۱۶ دیہات میں آباد عوام کی بنیادی ضروریات سے پوری طرح باخبر ہے اور ان کو مزید ترقی کے مواقع مہیا کرنا چاہتی ہے۔ صنعتوں پر بہت زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ ہم نے صنعت کاری کے لیے مراعات میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے اور مرکزی سرکار سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ مرکزی بکری ٹیکس کے بارے میں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرے۔ ہم نے اندرونی علاقوں میں کارخانوں کو مزید ترغیبات مہیا کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے جس میں کم نرخوں پر بجلی مہیا کرنا بھی شامل ہے۔ ہم نوجوانوں کو حرفتوں کی تربیت دے کر صنعتی کارخانوں کی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے صنعتی روزگار کے خصوصی دفاتر بھی قائم کر رہے ہیں۔

ہماچل اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ وہاں کوئی کشیدگی یا گڑبڑ نہیں ہے۔ ہم مل جل پرامن زندگی اور سب کی بھلائی میں یقین رکھتے ہیں صدیوں سے ہمالیہ سب مذاہب کے دانشوروں کی مہمان نوازی

کاہوں، نوردواروں، گرجا گھروں، مسجدوں، خانقاہوں، جین ستھانوں پر فخر ہے اور ہم ان کی عزت کرتے ہیں۔



آج ہمیں شریمتی اندرا گاندھی کے احسـ آتے ہیں۔ جن کے بغیر ہماچل کو ۱۹۷۱ میں اس مرتبہ بلکہ ۱۹۴۸ میں مناسب شکل حاصل نہ ہوتی ان سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو اور لال بہا سے ہمارے وزیر اعظم تھے۔ جنہوں نے کھلے سے ہماری مدد کی۔ شری راجیو کو جنہیں ہما بہت پیار ہے ہمیشہ ہماری ضرورتوں کا ا رہا ہے اور انہوں نے ہمارے ترقیاتی منـ کے لیے فراخدلی سے مالی مدد کی ہے۔ ہم اپنی ج قوم کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ہمالیہ کے امن پ محنت کش بیٹے بیٹیوں کے اپنے روایتی تصو رکھیں گے۔ جو لوگ ہمارے ملک سے محبت آتے ہیں ہم ان کے مخلص دوست ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کی جانب بری نگاہ سے دیکھ اس کیلئے ہمیشہ مزاحمت کی ناقابل عبور دیـ ہوں گے۔

آصف برنی

# تلخ وشیریں

ہند و پاک تناؤ کم ہوگیا ہے ــــ "ایک عنوان" ــــ مگر دونوں ملکوں کے سربراہوں کا ذہنی تناؤ بھی کم ہوا ہے، یہ کیسے پتہ چلے؟۔

ملک میں غریبی کم ہوئی ہے ــــ "زیل سنگھ" ــــ بیشک مگر صرف حکمرانوں کی۔

لکھنؤ گومتی کے پانی میں پیدا ہوئی کثافت کے اسباب پر تحقیقات کا حکم جاری کر دیا گیا ہے ــــ "ایک خبر" ــــ دیکھنا ہے کہ یہ تحقیقات کثافت سے الگ رہ پاتی ہے یا نہیں۔

لوک دل کے لیڈر مسٹر بھگوت دیال فرماتے ہیں کہ ــــ "آج جمہوریت صرف کاغذ پر رہ گئی ہے" "ایک خبر" ــــ بھگوت جی یہ بہت پرانی ہوگئی کوئی نئی لائیے۔

کناڈا میں دو سکھ دہشت گردوں کو جہاز اغوا کرنے کا پلان بنانے پر عمر قید کی سزا سنائی گئی ہے ــــ اجی وہاں تو صرف پلان بنانے پر عمر قید کی سزا دی گئی، مگر اپنے یہاں تو ہزاروں افراد کو ہلاک کر دینے کے بعد بھی دہشت گرد مونچھوں پر تاؤ دیے گھوم رہے ہیں۔

ہیما مالنی کے شیدائیوں پر لاٹھی چارج کیا گیا "ایک خبر" ــــ کوئی بات نہیں ہندوستانی اس کے عادی ہیں۔

ہندوستان پر کسی بھی وقت حملہ ہو سکتا ہے "ایک عنوان" ــــ چلو اس سردی کے موسم میں ایک گرما گرم خبر تو آئی۔

وزیر اعظم راجیو گاندھی جب لکھنؤ آئے تو حفاظتی انتظامات کی وجہ سے عوام ان کے درشن بھی نہ کر پائے ــــ یہ لوگ بالکل جھوٹ بولتے ہیں کیا ٹی۔ وی نے ان کے درشن نہیں کرائے یہی کیا کم خوش قسمتی ہے۔

شیوسینا کے لوگوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ لوگوں سے گھر گھر جا کر ملاقاتیں کریں گے ــــ "ایک خبر" ــــ تاکہ فرقہ واریت کے جراثیم گھر گھر پہونچائے جا سکیں

مسز کملا پتی ترپاٹھی نے راجیو گاندھی کے اس بیان پر کہ انھوں نے کانگریس کے کارگزار صدر کی حیثیت سے کسی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا ــــ اپنے آپ کو بدقسمت قرار دیا ہے ــــ "ایک عنوان" ــــ پنڈت جی، شاید آپ بھول رہے ہیں کہ بچے جب بالغ ہو جاتے ہیں تو یہی کہتے ہیں۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر اٹل بہاری باجپئی نے کہا ہے کہ ملک میں کسی بھی وقت بین مدتی انتخابات ہو سکتے ہیں ــــ "ایک خبر" ــــ اٹل جی اچھا ہے کہ درمیان میں الکشن ہو جائیں، کم از کم اس طرح حزب مخالف لیڈروں کی نیند تو کھلے گی۔

دہشت گردی کو مزید برداشت نہیں کیا جائے گا ــــ "راجیو گاندھی" ــــ راجیو جی، خدا کرے آپ کے منھ سے نکلی بات صحیح ہو، ویسے تو یہ بات سُنتے سُنتے کان پک گئے ہیں۔

لکھنؤ میں وزیر اعظم کے جلسے میں وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کی ہوٹنگ کے بارے میں ریاستی وزیر سنجے سنگھ نے صفائی دی ہے کہ اس ہوٹنگ کے پیچھے ان کے ہاتھ کی خبر بے بنیاد ہے ــــ "ایک بیان" ــــ اجی آپ کا ہاتھ نہیں ہوگا تو آپ کے لوگوں کا ہاتھ ہوگا۔

اتر پردیش کی جیلوں میں بند قیدیوں کو اب اور اچھی غذا فراہم کی جائے گی ــــ "ایک عنوان" ــــ اب بھی کوئی کہے گا کہ ہندوستان غریب ملک ہے۔

ریلوے منسٹر مادھو راؤ سندھیا نے اعلان کیا ہے کہ بہت جلد ملک کے بڑے بڑے اسٹیشنوں پر نشستوں کے ریزرویشن کے لیے کمپیوٹر لگا دیے جائیں گے ــــ اور اس پر آنے والے خرچ کو کرایے میں اضافہ کرکے مسافروں سے مع سود وصول کیا جائیگا

حکومت نے قیمتوں پر قابو پالیا ہے ــــ "ایک بیان" ــــ حیرت ہے کہ قیمتوں پر قابو پالیا لیکن اپنے بیانات پر قابو نہیں رکھ پائے۔

اتر پردیش کے اپوزیشن لیڈر ملائم سنگھ یادو کو لیڈرشپ سے بے دخل کر دیا گیا ــــ "ایک بیان" ــــ گھبرائیے نہیں، وہ پارٹی سے بھی بے دخل کر دیے جائیں گے اگر اجیت سنگھ کی ُکر پارہی۔

میں اپنے جسم کو ننگا نہیں کروں گی ــــ "پدمنی کولھاپوری" ــــ حیرت ہے ابھی کچھ ننگا کرنے کو بچا بھی ہے۔

وزیر داخلہ مسٹر گوپی ناتھ جی فرماتے ہیں کہ ریاست میں بدعنوانی کی وارداتیں گھٹ رہی ہیں "ایک خبر" ــــ مگر انھوں نے یہ واضح نہیں کیا کہ عوام میں بدعنوانی گھٹ رہی ہے یا سرکار میں۔

# حالِ ہند کے قارئین کی خدمت میں

قومیں جب ماضی کے خول سے باہر آتی ہیں تو وہ امید کی دولت سے مالا مال ہو کر جد وجہد کی نئی راہیں اور نئی سمتیں تلاش کرتی ہیں۔ نئے آفاق کی جانب قدم بڑھاتے وقت انہیں تکان بھی محسوس ہوتی ہے، پسینہ بھی آتا ہے اور کبھی کبھی لہولہان بھی ہونا پڑتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کا سفر جاری رہتا ہے۔ ہندوستانی قوم نے اپنا سفر صرف چند دہائی قبل شروع کیا تھا اس کا یہ سفر کٹھن اور مشقت طلب بھی ہے اور اکثر بے کیف اور مایوس کن بھی۔

اس قوم کے مسائل گوناگوں ہیں اور جن میں سے اکثر کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہیں۔ یہاں کثرت میں وحدت ہے۔ یہاں مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں، علاقائی امتیازات بھی اپنا کام کرتے ہیں۔ پھر اس کی بھاری آبادی اور اقتصادی ترقی کی سست رفتار بھی تو ایک مسئلہ ہے۔ بہرکیف ہم میں سے اکثر لوگوں کو یقین ہے کہ ہم اپنی قوم کا عروج دیکھ سکیں گے اور تمام تر درپیش خطرات کا بھی ہم پر کوئی اثر نہیں ہوگا مگر شرط یہ ہے کہ ہمارا انداز فکر اور ہمارا طریقۂ کار مثبت ہو۔ اپنے نصب العین کے تئیں ہمارا خلوص مسلّم ہو کیونکہ گرتی ہوئی اخلاقیات کے بل پر آج کی عظیم قوم استوار نہیں رہ سکتی۔ اب اگر ہمیں آئین کی روشنی میں اظہار رائے کی آزادی کا بھرپور استعمال کرنا ہے تو منفی نوعیت کی سنسنی خیزی کی جگہ تعمیری تجزیہ نگاری کو راہ دینی ہوگی اور صحیح مواصلت قائم کرنا ہوگی۔

انہی خیالات سے تحریک حاصل کرکے میں نے اپنے ممتاز دوستوں کی مدد سے دو ماہانہ جریدے جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے ایک انگریزی میں اور ایک اردو میں، جن کے نام ہیں — "دی رائزنگ نیشن" اور "حالِ ہند"۔ ان دونوں رسائل کی اشاعت باقاعدہ طور سے جاری ہے۔ ان رسالوں کا دامن بڑا وسیع ہے۔ اس میں سیاست، اقتصادیات، ادب، تازہ ترین امور، قومی، بین اقوامی حالات، فلم، کھیل اور قانون وغیرہ سبھی کچھ موجود ہے۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان رسائل میں بہت سا ایسا مواد بھی ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ ملک کے ممتاز ترین قلمکاروں کا تعاون ان رسائل کو حاصل ہے۔ یہ دونوں جریدے "ہورائزن پبلشنگ ہاؤس" کے ذریعہ ۹۔ شاہجہاں روڈ، نئی دہلی سے شائع ہو رہے ہیں۔

مجھے اس میں چنداں شک نہیں کہ آپ اس کوشش کو پسند فرمائیں گے۔ اسی احساس کے ساتھ میں آپ سے رجوع کرکے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ آپ ان جریدوں کے خریدار بنیں۔ سرپرست کی حیثیت سے، حیاتی ممبر کی حیثیت یا عام قاری کی حیثیت سے — آپ مقررہ مطلوبہ رقم منیجر ہورائزن پبلشنگ ہاؤس کے نام منی آرڈر، چیک یا ڈرافٹ کی صورت میں ارسال کر سکتے ہیں۔

مخلص

**ڈی۔ ڈی۔ ٹھاکور**

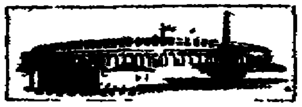
ایڈیٹر انچیف

بانی سرپرست فیس ——— مبلغ تین ہزار روپے (فی رسالہ) ۳۰۰۰

حیاتی رکنیت ——— مبلغ ایک ہزار روپے ( " ) ۱۰۰۰

سالانہ فیس ——— مبلغ ساٹھ روپے ( " ) ۶۰

م۔ک۔ مہتاب



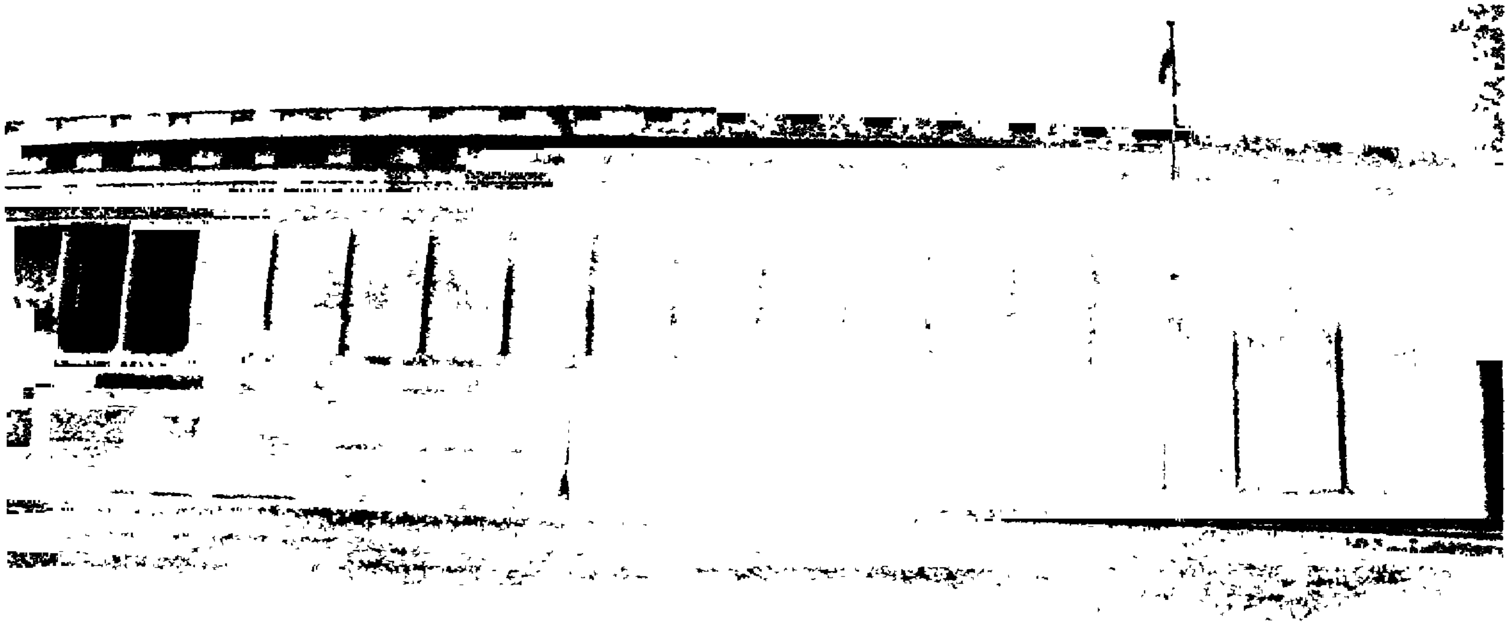
# پارلیمان کے وقار کا سوال

پارلیمان کے گزشتہ بجٹ اجلاس میں یہ دلچسپ بات سامنے آئی کہ جوں جوں اجلاس آگے بڑھتا گیا حاضری کم ہوتی گئی۔ ایک بار تو نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ بار بار گھنٹی بجانے پر بھی لوک سبھا کے کل ممبروں کی تعداد کے دسویں حصے کے برابر یعنی ۵۴ کا کورم پورا نہیں ہو سکا، اور اسپیکر کو اجلاس مقررہ وقت سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ختم کر دینا پڑا۔ یہ صورت حال یقیناً افسوس ناک تھی، کیوں کہ پارلیمنٹ ملک کا سب سے بڑا قومی و جمہوری ادارہ ہے جو قوم کے ضمیر کا ضامن اور عوام کی خواہشات کا ترجمان ہے اور جس کے اجلاس پر فی منٹ دو سو روپیہ خرچ آتا ہے۔ اگر ممبر اس کی کارروائی سے اس طرح بے رخی اختیار کریں تو اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یا تو انھیں اس کام میں دلچسپی نہیں رہ گئی یا پھر گزشتہ دو برسوں میں ان کی تنخواہوں اور یومیہ بھتوں میں کافی اضافہ ہو چکا ہے یا ان کا اس جمہوری ادارے میں اعتماد کم ہو رہا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو اس صورت حال کے لیے حکمراں پارٹی اور مخالف جماعتیں دونوں ہی ذمہ دار نظر آتی ہیں۔ خود وزراء ہی کی تعداد کورم یعنی ۵۴ سے زیادہ ہے۔ اگر صرف تمام وزراء ہی آجائیں تو لوک سبھا کا اجلاس جاری رہ سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بحث کے دوران کئی بار متعلقہ وزراء ہی موجود نہیں رہتے۔ اگرچہ ایک روز ہی ایسا ہوا کہ کورم کی کمی کے سبب اجلاس اٹھا دیا گیا لیکن سچ پوچھا جائے تو حاضری اکثر بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن یہ روایت سی ہے کہ کورم پورا نہ ہونے پر بھی یہ سوال نہ اٹھایا جائے اور سرکاری کاروبار کو چلنے دیا جائے لیکن ۲۰ مارچ کو اکالی ممبر شمشیر سنگھ نے پروفیسر این۔ جی۔ رنگا کی اپیل رد کرتے ہوئے کورم کے سوال پر زور دیا۔ مسٹر شرد دیگھے نے جو اسپیکر کی کرسی پر تھے، دس منٹ تک گھنٹی بجوائی لیکن ۴۲ سے زیادہ ممبر ایوان میں نہ آئے اور اجلاس ختم کر دیا گیا۔ اس سے پہلے ۱۱ اپریل ۱۹۸۶ء کو کورم نہ ہونے کی وجہ سے اجلاس مقررہ وقت سے سترہ منٹ پہلے ختم کیا گیا تھا۔

پارلیمانی امور کے وزیر شری ایچ کے ایل بھگت نے حکمراں پارٹی کے ممبران کو سخت تاکید کی ہے کہ وہ ایوان میں حاضر رہیں۔ اس کے باوجود بہت کم لوگ لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں دکھائی دیتے ہیں اور لنچ کے وقفے کے بعد اجلاس شروع کرنے کے لیے کئی کئی بار گھنٹی بجانی پڑتی ہے جس کی زوردار آواز سے پارلیمنٹ کے کمرے اور برآمدے گونجتے رہتے ہیں۔

پارلیمنٹ کے کام میں ممبروں کی دلچسپی



کم ہونے کا بڑا سبب یہ دکھائی دیتا ہے کہ حکمراں پارٹی کو لوک سبھا میں ¾ اور راجیہ سبھا میں دو تہائی سے زیادہ اکثریت حاصل ہے۔ ممبروں میں تساہل پسندی پیدا ہوگئی ہے کہ اگر وہ نہ بھی جائیں گے تو حکومت کا کوئی کام رکنے والا نہیں ہے۔ دوسرے نئیں خاص طور پر نوجوان ممبروں کو بولنے کی اجازت بھی کم ہی دی جاتی ہے۔ اور ان میں یہ احساس بھی پیدا ہوگیا ہے کہ اگر وہ عوام کی خواہشات کے مطابق کوئی مدعا بیان کریں گے بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہائی کمان اسے پسند نہ کرے اور انھیں لینے کے دینے پڑ جائیں لہٰذا ان میں اُولوالعزمی کا جذبہ قریب قریب ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ عوام کے نہیں حکمراں طبقے کے نمائندے معلوم ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب کسی اہم سوال پر ان کے ہاتھ گننے کی ضرورت ہوگی انھیں وہپ جاری کرکے طلب کرلیا جائے گا۔ ہوگا وہی جو وزیراعظم اور ان کے قریبی ساتھی چاہیں گے۔

حزب مخالف پر بھی پارلی منٹ کی کارروائی کو چلتا رکھنے، حکمراں جماعت کی گردن پر انکس رکھنے اور عوامی مسائل کو پارلی منٹ میں لانے کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے لیکن مخالف پارٹیوں کے ممبران جن کی تعداد کل ۱۰۹ ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے، اور پھر ان میں سے بھی اکالی دل کے کچھ ممبر اور انا ڈی ایم کے ممبران اکثر حکومت کا ساتھ دیتے ہیں کچھ ممبروں کا کہنا ہے کہ اسپیکر کا رویہ ہمیشہ حکومت کو مخالف پارٹیوں کی نکتہ چینی سے بچائے رکھنے کا ہوتا ہے اور وہ ایک 'اسکول ماسٹر' کی طرح کسی طالب علم کو اٹھ کر بات کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ مخالف جماعتوں کے ممبروں کو یہ بھی احساس ہے کہ وہ خواہ کتنا ہی شور مچائیں گے وہی ہوگا جو منظور حکومت ہوگا۔ اس لیے وہ کسی بات پر ووٹوں کی تقسیم کا مطالبہ ہی نہیں کرتے۔ وہ وقفہ صفر میں ضرور کچھ آواز بلند کرتے ہیں۔ ایک ممبر سے جب اس عدم دل چسپی کا سبب پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ سہ

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

کوئی وقت تھا جب پارلی منٹ کے ممبروں کو اخبارات اور گزشتہ ریکارڈوں میں بہت دل چسپی ہوتی تھی، اب اکثر اوقات لائبریری خالی دکھائی دیتی ہے۔ یہی نہیں پارلی منٹ کا سینٹرل ہال جو کبھی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز کہا جاتا تھا اور ہمیشہ کچھ بھرا رہتا تھا اب اکثر و بیشتر خالی دکھائی دیتا ہے حالاں کہ اب وہاں کرکٹ میچ اور دوسرے پروگرام دیکھنے کے لیے رنگین ٹی۔ وی بھی لگا دیا گیا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پارلی منٹ یا اس کے ارکان کے لیے کوئی کام نہیں ہے یا اٹھانے کو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بوٹ کلب پر ہر روز درجنوں جلسے ہوتے ہیں، بھوک ہڑتالیں اور مرن برت کے مظاہرے ہوتے ہیں، رنگ برنگے جھنڈے اور پوسٹر دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان لوگوں کی آواز پارلی منٹ میں سنائی نہیں دیتی جس کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کا کوئی نمائندہ لوک سبھا یا راجیہ سبھا میں نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ حکمراں پارٹی کے ممبران یہ آواز اٹھانے سے ڈرتے ہیں، اور



بلرام جاکھڑ، اسپیکر لوک سبھا

مخالف پارٹیوں کے ارکان میں شکست خوردگی کا احساس پیدا ہوگیا ہے کہ کچھ ہوگا نہیں، بے کار گلا پھاڑنے سے کیا حاصل ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟ ایک سرکردہ ممبر پارلی منٹ سے جب یہ سوال کیا گیا تو وہ کہنے لگے کہ پارلی منٹ میں عوام کا اعتقاد کمزور ہونے اور ممبروں کی دل چسپی گھٹ جانے کی زیادہ تر ذمہ داری عوام پر ہے۔ جمہوری نظام میں دل چسپی اور اثر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جمہوری ایوانوں میں حکمراں اور مخالف دھڑے متوازن تعداد میں موجود ہوں تاکہ حکمراں دھڑے کو ہر وقت 'گرفت' کا خوف رہے اور مخالف دھڑے کو اعتماد ہو کہ وہ اپنی بات منوا سکتا ہے لیکن ہندوستان میں گزشتہ کئی انتخابات سے یہ رجحان پیدا ہوگیا ہے کہ عوام اپنے تمام



وزیراعظم بجٹ کو آخری شکل دیتے ہوئے

ووٹ ایک ہی جماعت کو دیتے ہیں، جس سے وہ اتنی بڑی تعداد میں ایوان میں آجاتی ہے کہ حکمراں مغرور، اور مخالف معذور یا بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ پارلی منٹ میں اس طرح کم ہوتی دل چسپی کے باوجود سرکاری کام کاج جاری رہتا ہے۔

بجٹ اجلاس میں جس وقت صدر کی تقریر کے بعد ہال تالیوں سے گونج رہا تھا اس وقت پارلی منٹ سے باہر بھارتیہ جنتا پارٹی کی طرف سے ایک بہت بڑی ریلی اور مظاہرے کا اہتمام کیا جا رہا تھا بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر مسٹر ایل کے۔ ایڈوانی کے بیان کے مطابق ریلی اور جلوس میں پانچ لاکھ لوگوں نے شرکت کی، لیکن وزیراعظم راجیو گاندھی نے راجیہ سبھا میں صدر کے خطبے پر شکریہ کی تحریک کا جواب دیتے ہوئے تعداد پچاس ہزار بتائی ہے۔ یہ ریلی پنجاب کے سوال پر وزیراعظم کو کارروائی کرنے یا گدی چھوڑ دینے کی مانگ اور بنگلہ دیش سے مہاجروں کی ہندوستان آمد کو روکنے کے مطالبے کو لے کر کی گئی تھی، جس سے مسٹر ایڈوانی اور مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے خطاب کیا۔ پارلی منٹ کے کسی اجلاس کے افتتاح کے وقت اتنا بڑا مظاہرہ شاید ہی اس سے پہلے ہوا ہو۔

عالمی منظر نامہ

اجے ناتھ جھا

# ایران : روس کی الجھن؟

ایران عراق جنگ کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ کے کئی ممالک میں کشیدگی کافی بڑھ گئی ہے۔

اس بات کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ایران عراق کی ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ کارروائی نے اس علاقے میں بڑی طاقتوں کی دلچسپی بڑھا دی ہے۔ خاص طور سے ایران میں۔ یہ خیال بھی لوگوں کے دلوں میں پرورش پا رہا ہے کہ شاید ۱۹۸۸ء کا سال ایران میں خمینی کا آخری دور ثابت ہو۔ ملک میں حالات بدستور بدلتے جا رہے ہیں اور چھ سال پرانی یہ خلیجی جنگ ایک تشویشناک صورت حال کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کونسی بڑی طاقت اس علاقے میں اپنا اثر قائم کرتی ہے اور اسے اس کی کیا قیمت چکانی پڑے گی۔

ایران اپنے جغرافیائی اور سیاسی پس منظر کی وجہ سے خلیج میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مغرب کے لیے اس کی اہمیت تیل اور خلیج فارس سے متعلق دفاعی اقدامات کی وجہ سے ہے۔ دوسری جانب روس کے لیے ایران کی اہمیت اس کی جغرافیائی اور نسلی حیثیت کی وجہ سے ہے کیونکہ دونوں ممالک کے سرحدی علاقوں میں تقریباً ایک ہی نسل کے لوگ آباد ہیں۔

باوجودیکہ ایران کے معاملے میں امریکا نے اپنا اعتماد کھو دیا تھا اور پوری عرب دنیا، خاص طور سے جدید عرب کی نمائندگی کرنے والے ممالک اردن کویت اور مصر سے اس کے تعلقات میں فرق آیا تھا لیکن اب وہ پھر اپنا وقار اور اعتماد بحال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا واضح ثبوت امریکا کی تہران کے سلسلے میں خارجہ پالیسی ہے۔ امریکا کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر جارج شلز کا حالیہ بیان بھی اس سلسلے میں اہم ہے جس میں انھوں نے نااتفاقی دور کرنے کی بات کہی ہے۔ انھوں نے ایران کے سلسلے میں روسی نظریہ یعنی "ایک تشویشناک جغرافیائی حصہ" کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "امریکا ایرانی انقلاب کو زندگی کی حقیقت کی طرح تسلیم کرتا ہے" یہ اشارہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکا ایک بار پھر تہران میں اپنے رسوخ بحال کرنا چاہتا ہے جس نے اسے "ایک شیطان عظیم" سے تشبیہ دی تھی۔

دوسری طرف سوویت یونین بھی اس معاملے میں اپنی دلچسپی کا اظہار صاف طور پر کر رہا ہے ظاہر ہے کہ وہ بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا چاہتا ہے اور طاقتور پڑوسی ملک کو ہیجانی حالت سے باہر لاکر اپنے نظریاتی مخالفوں پر اثر انداز ہونا چاہتا ہے۔

جب ۱۹۷۹ء میں شاہ کو معزول کیا گیا اور اسلامی بنیاد پرستوں نے وہاں حکومت سنبھالی تھی تو کریملن کو یہ امید ہو چلی تھی کہ انہیں خود بخود اس علاقے میں برتری حاصل ہو جائے گی۔ انقلاب کا روس نے اس لیے بھی خیر مقدم کیا کہ وہاں سے امریکا کے نصب شدہ راڈار اسٹیشن اور سماعت کے آلے دور ہو جائیں گے جو اس کے ایٹمی تجربات کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ روس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ نئے اقتدار کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ تمام جارحانہ اقدامات کا رخ امریکا کی جانب کر دے اور اس علاقے میں اس کی مرضی سے جنگی چالیں چلی جائیں۔



روس کو یہ خوف بھی ہے کہ امریکا دوبارہ اس علاقے کے داخلی معاملات میں سبقت نہ حاصل کر لے۔ اگر امریکا وہاں پر اپنا فوجی اڈہ قائم کر لیتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روس کے جنوب خطے کی طرف امریکی طاقت مستحکم ہو جائے گی۔ اس کی وجہ سے ایک تشویشناک صورت حال یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مشرق وسطیٰ میں اسے کسی بھی اقدام میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر روس کا اثر اس علاقے میں قائم ہو گیا تو ایک فائدہ تو اسے یہ ہے کہ خلیج فارس سے بحر عرب تک تمام خطہ اس کے زیر اثر ہوگا جو جغرافیائی لحاظ سے اس کے متصل ہے۔ دوسری طرف اس کی بین اقوامی حیثیت بھی بلند ہوگی۔

نو تشکیل شدہ حکومتوں میں اپنا اثر قائم کرنے اور اسلامی طاقتوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے صدر برژنیف نے انقلاب ایران کو خوش آیند قرار دیا تھا جسے ایران کو ظالمانہ اور جابرانہ دور شہنشاہیت سے نجات دلوادی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ "ایران کے معاملات میں کسی بھی طرح کی فوجی مداخلت کو روس کی دفاعی قوت پر حملہ تصور کیا جائے گا"۔ اس کے علاوہ عراق سے کشیدہ تعلقات کے باوجود دونوں میں مصالحت کرانے







کی کوشش سے بھی روس ایران کے نزدیک آگیا۔ عراق نے بھی اپنے فوجی نظام سے ان لوگوں کو خارج کرنا شروع کر دیا جنہوں نے مارکسی نظریہ کی طرف اپنا جھکاؤ ظاہر کیا تھا۔ اور بھی کئی مواقع ایسے تھے جب دونوں ممالک ایک دوسرے کی نفی کرنے پر مجبور ہو گئے، اس میں معاشی اور فوجی امداد کے علاوہ ٹکنالوجی کے لیے عراق کا مغربی ممالک کی طرف جھکاؤ خاص ہیں۔

## دوستی کی پالیسی

حسب دستور ماسکو نے نئی حکومتوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور دوسری طرف ان ممالک سے بھی اپنی نفرت برقرار رکھی جنہوں نے اس کی قیادت قبول کرنے سے انکار کیا۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے روس کی حیثیت ہمیشہ مشکوک رہی سیاسی سطح پر سوویت یونین نے خود کو اسلام اور ایران کا خیر خواہ ثابت کیا جبکہ سچ یہ ہے کہ اسی نے ایرانی حکومت کو گرانے کی پوری کوشش کی۔ "تودہ" پارٹی پھر سے سرگرم ہوئی اور روس نے ایرانی حکومت اور اسلامک ری پبلکن پارٹی میں پھوٹ ڈالنے اور فوج میں سرایت کرنا تھا بلکہ کئی اہم ایرانی لیڈروں کو ختم کرنے کا منصوبہ بھی شامل تھا۔ ایرانی حکومت کا عتاب روسیوں پر اس وقت شروع ہوا جب ۱۹۸۳ء میں ایرانی حکومت کا تختہ الٹنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ نتیجتاً تودہ پارٹی کے ایک ہزار ارکان گرفتار کیے گئے اور کچھ کو سزائے موت دی گئی۔ اس کے علاوہ روسی سفارت خانے کے اٹھارہ افراد کو ملک چھوڑ دینے کو کہا گیا۔ اس سے سوویت ن کے وقار کو سخت دھکا لگا۔ دوسرے ممالک روسی مداخلت کی ایک اور مثال افغانستان ماں بڑے پیمانے پر روسی پروپیگنڈے کے ذ کشیدگی برقرار ہے۔ برسر اقتدار طبقہ کا درست ہے کہ کریملن ان کے مسائل کو پیچیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہران افغان مجاہدین کو تم فراہم کر رہا ہے اور اس نے ۱۵ لاکھ افغان ون کو بھی اپنے یہاں جگہ دے دی ہے۔ سکو کو ہر جانب سے اس وقت پریشانیوں رنا پڑا جب ۱۹۸۰ء میں خلیج کی جنگ شروع حال یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ایران

اور عراق خود ہی اپنا مسئلہ طے کر سکتے ہیں مگر عراق کو روسی مدد کا خیال خود اس کے لیے بھی نقصان دہ ہے کیونکہ اس طرح ایران کے علاوہ مصر اور شام سے بھی اس کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔ دوسری ایران کو مدد دینا بھی ایک جوئے شیر لانے سے



کم نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے عراق اسے نکال باہر کرے گا جیسا کہ ماضی میں مصر اور صومالیہ میں ہو چکا ہے۔ سرکاری اعلانیہ کے مطابق روس غیر جانبدار ہے اور اس کوشش میں ہے کہ دونوں طرف اپنا اثر قائم کرے جیسا کہ ۱۹۶۵ء میں ہند و پاک جنگ میں مصالحت کرانے سے حاصل ہوا تھا۔

درحقیقت اس وقت ماسکو بھی ایک سنجیدہ اقدام کے بارے میں غور کر رہا ہے اور وہ یہ کہ کابل سے اپنی فوجوں کو واپس بلا لیا جائے جن کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔ افغانستان کے مسئلہ میں اگر اسے فوجوں کی واپسی سے کامیابی حاصل ہوتی ہے تو نہ صرف اسے بھی مشکلات سے چھٹکارا مل جائے گا بلکہ ان مسلم ممالک کا اعتبار بھی حاصل ہو جائے گا جو ان کے سخت مخالف ہیں۔

روس نے اسرائیل کی طرف قدم بڑھائے ہیں ساتھ ہی عمان اور متحدہ عرب امارات سے سفارتی تعلقات بھی قائم کر لیے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا گورباچوف کی یہ حکمت عملی اسلامی ممالک سے ان کی تعلقات کی استواری برقرار رکھ سکیں گی۔ بہر حال روس اور ایران کے تعلقات کا انحصار اس بات پر ہے کہ عراق اور ایران جنگ کے محاذ پر کون کیا حاصل کرتا ہے۔

ڈاکٹر پرمانند

# سری لنکا کی یک جہتی مسئلہ لاینحل

سری لنکا کی قومی یکجہتی کا مسئلہ اکثر جنوبی ایشیائی ممالک میں مختلف سطحوں پر کم و بیش عام طور پر موجود ہے۔ یہ کوئی غیر قدرتی امر بھی نہیں ہے کیونکہ جنوبی ایشیا کے اکثر ملکوں میں حکومت ایک ایسے طبقے کی نمائندہ ہوتی ہے، جو خواہ کسی بھی جمہوری طریقے سے منتخب ہوا ہو، لیکن اس کی سماجی بنیاد تنگ ہوتی ہے۔ اور اس سے بھی بدتر یہ کہ حکمراں اعلیٰ طبقہ اپنی علیحدہ شخصیت کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے جس سے سماج کے دیگر طبقوں کو حیرانی، پریشانی اور تکلیف ہوتی ہے۔ کوئی سیاسی نظام اپنے نام سے جمہور ہو سکتا ہے اس کا جمہوری ڈھانچہ اور جمہوری اداروں کے انتظامات بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر جمہوریت کے ثمرے فیضیاب نہ ہونے والے لوگوں اور طبقوں کی درخواستوں التجاؤں اور احتجاجوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلے تو تشدد اور دہشت گردی ابھر کر اوپر آجاتے ہیں اور سماج کو آگے دھکیل کر کشیدگی کے خطے میں لے جاتے ہیں۔ اس عمل میں یہ بات فراموش کی نہیں جاتی ہے کہ کوئی بھی حکمراں اعلیٰ طبقہ یا گروہ ملک کی سماجی زندگی کے گوناگوں اور کثیر دھاروں کی موجودگی کی نظر انداز کر کے زعدہ برتک سے متحد نہیں کر سکتا۔

سری لنکا جنوبی ایشیا کا ایک ایسا ملک ہے جسے قومی یکجہتی کے سنگین مسئلے کا سامنا ہے۔ اور جہاں افراد گروہوں اور سرکار کا تشدد اور دہشت گردی قومی زندگی کا لازمی جزو بن گئے ہیں۔ چونکہ حکومت کی طرف سے اٹھائے گئے متعدد اقدامات سے سری لنکا کا معاشرہ ٹکڑے ہو کر تقسیم ہو کر یا مختلف امور کا تجزیہ کیا جائے جو موجودہ صورت حال کے لئے ذمہ دار ہیں اور یہ دیکھا جائے کہ آیا اس الجھن میں سے نکلنے کی کوئی راہ ہے؟

اس سلسلے میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں سری لنکا سماج کی ہیئت ترکیبی کیا ہے؟ سری لنکا سماج کا کونسا طبقہ نام نہاد قومی دھارے سے بیگانگی محسوس کرتا ہے؟ حکمراں طبقے نے دوسرے طبقے کو الگ رکھنے کے لئے کون کون سی چالیں چلی ہیں۔ محروم طبقے نے اپنی مایوسی کا اظہار اب تک کس طرح کیا ہے؟ ان محروم اور مستفیذ نہ ہونے والے طبقوں کے حقیقی نمائندے کون ہیں جو ان کے مفادات کی ترجمانی کر رہے ہیں؟ حکمراں طبقے کا ان کی کارروائیوں کے بارے میں ردعمل کیا ہے؟ یہ قومی یا نام نہاد گھریلو معاملہ کہاں تک بین الاقوامی بن گیا ہے؟۔



سری لنکا کے شمالی ہمسائے یعنی جنوبی ایشیا کے خطے کے قلبی ملک ہندوستان کا اس پورے معاملے کے تئیں موقف کیا ہے؟ تمام معاشرہ فریقین کو اس گرداب میں سے نکالنے کے لئے کیا حل تجویز کیا جا سکتا ہے؟

سری لنکا کا رقبہ ۶۵۶۱۰ مربع کلومیٹر اور آبادی ایک کروڑ ۴۳ لاکھ ۱۶ ہزار ہے۔ ان میں سے سنہالی ۹۸ء۷۳ فی صد، تامل ۱۶ء۱۸ فی صد (جن میں ۶۰ء۱۲ تامل سری لنکا کے اور ۵۶ء۵ فی صد ہندوستانی تامل ہیں) مسلم یا ۶۴ء۷ فی صد، برگر ۶ء۰ فی صد، ملائی ۳۴ء۰ فی صد، اور دیگر ۲۴ء۰ فی صد ہیں۔

مذہب وار بودھ ۲۹ء۶۹ فی صد، ہندو ۴۳ء۱۵ فی صد، مسلمان ۶۶ء۷ فی صد، عیسائی ۶۹ء۷ فی صد، اور دیگر ۱۰ء۰ فی صد ہیں۔ چنانچہ بے شک ملک کی آبادی مقابلتاً کم ہے۔ پھر بھی سری لنکا کے معاشرے کی نمایاں خصوصیت وہاں کی نسل، زبان اور مذہب اور کم و بیش کئی ایک خطوں کے کثرت یا گوناگونی ہے

یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ سری لنکا سرکار کی طرف سے تاملوں کے ساتھ جو امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا اظہار بھی مختلف علاقائی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ تاریخی طور پر سینہالی ملک کے جنوبی، مغربی اور مرکزی حصوں میں آباد ہیں جب کہ تامل آبادی زیادہ تر شمالی مشرقی اور شمال مغربی حصوں میں رہتی ہے۔ اس لیے یہ محض اتفاق نہیں کہ سری لنکا کے تامل باشندے جافنا، سعار، دیو ویتا، ملاعقیو و، بٹیکالووا اور ترنکوملی کے شمالی صوبوں کو اپنا روایتی گھر یا سرزمین ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

آج سری لنکا کے سماج کا سب سے بیگانہ اور الگ تھلگ حصہ مجموعی طور پر تامل آبادی کا حصہ ہے اگرچہ مسلمان بھی کل آبادی کا ۷ فی صد ہیں۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بیگانہ نہیں سمجھتے۔ ان کی قوم پرستی کسی خطے یا زبان پر نہیں بلکہ مذہب پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں حالات کے مطابق تبدیل ہونے کی خاصیت بھی ہے اور انہوں نے اپنے آپ کو قومی زندگی کے دھارے میں سمو لیا ہے۔ جہاں تک ملائی، برگر اور دوسرے باشندوں کا تعلق ہے۔ ایک تو ان کی تعداد بہت کم ہے دوسرے ان کی آبادی اس جزیرہ ملک کے مختلف حصوں میں اس طرح بکھری ہوئی ہے کہ قومی دولت میں ان کی موزوں حصے داری کے مطالبے کے لئے انہیں متحد اور متحرک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

چنانچہ سری لنکا کی آبادی کا تامل حصہ ہی ایک ایسا طبقہ ہے جو یہ محسوس کرتا ہے کہ اختیارات کی تقسیم کے ناقص نظام کا حصہ انہیں بے حساب نقصان پہنچاتا ہے اگرچہ سری لنکا کے معاشرے کے تامل حصے میں کوئی داخلی اتحاد یا یکجہتی نہیں ہے لیکن اب تک جو مختلف سماجی و اقتصادی تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں سے اکثر افراد کو یقین ہو گیا ہے کہ

اختیارات کی تقسیم کے مقصد کے لئے وہ سب تامل ہیں اور یہ محض وقت کا سوال ہے کہ کب اور کسے نقصان پہنچایا جائے گا۔

ہو سکتا ہے کہ حکومت کو ہمیشہ تاملوں کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ ہو یا دوسرے الفاظ میں وہ سنہالیوں کی اتنی مدد نہ کرنا چاہتی ہو کہ تامل آبادی کے لئے کچھ باقی نہ بچے لیکن اپنے آپ کو جزیرے کا حقیقی یا قلبی حصہ سمجھتے ہوئے سنہالیوں کا کھل کر بولنے والا طبقہ تامل آبادی کو بہت حد تک یہ احساس دلاتا رہتا ہے کہ وہ باہر سے آنے والے لوگ ہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ انہیں یہاں برداشت کیا جا رہا ہے۔ جب یہ امتیازی سلوک مذہب سے مل جاتا ہے اور مذہبی تعصب رکھنے والے جوشیلے لوگ جنگجو افراد کے ساتھ مل جاتے ہیں تو یقینی بات ہے کہ محروم لوگوں کی زندگی دوبھر ہو جائے گی۔

جب سے سری لنکا نوآبادیاتی نظام کے تسلط سے آزاد ہوا ہے۔ حکمراں طبقے کا کسی تبدیلی کا مخالف اور کٹر حصہ سنہالی سیاست دانوں کا ہی ایک حصہ رہا ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ وہ سب کے سب لوگ تامل باشندوں کے خلاف تھے۔ یا ان سے امتیاز روا رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر آزاد سری لنکا کے پہلے وزیر اعظم ڈوان شیفن سینا نائکے (ستمبر ۱۹۴۷ سے مارچ ۱۹۵۲) مکمل طور پر سیکولر بیان کئے جاتے ہیں۔ اور جان لیونل کوٹیلوالا پر بھی (اکتوبر ۱۹۵۳ سے اپریل ۱۹۵۶) نسل کی بنا پر کسی جانب داری کا الزام نہیں لگایا جاتا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ موجودہ صدر جے۔ آر۔ جے وردھنے بھی تامل آبادی کے بارے میں بہت فراخدل خیال کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تامل نژاد ہونے کے فخر کو کبھی چھپا کر نہیں رکھا۔ چنانچہ اس حد تک موجودہ برسر اقتدار جماعت یو۔ این۔ پی کو زیادہ معاملہ فہم اور ہوشیار کہا جا سکتا ہے۔

تاہم وزیر اعظم سولومن ولیٹ رگ وے ڈائس بندرا نائکے (اپریل ۱۹۵۶ سے ستمبر ۱۹۵۹) اور ان کی بیوہ سریماوو رتواتے ڈائس بندرا نائکے (جولائی ۱۹۶۰ سے مارچ ۱۹۶۵) اور جولائی ۱۹۷۰ سے جولائی ۱۹۷۷ تک) اور ان کی جماعت ایس۔ ایل۔ ایف۔ پی نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر سری لنکا کی سیاست اور شہری حکومت کے نظام کو سنہالیوں کا نظام اور سیاست بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہوں نے جو گناہ کیا اس کے اثرات ان کے بعد بھی موجود ہیں اور اس کا سایہ آج بھی سری لنکن سماج پر چھایا ہوا ہے۔

۱۹۵۶ میں "صرف سنہالا" کا قانون بنایا گیا جس کے تحت سری لنکا کے ہزاروں سرکاری ملازموں کو سنہالی زبان سیکھنے یا ملازمت چھوڑ دینے پر مجبور کیا گیا۔ یونیورسٹیوں داخلے کے لئے معیار بندی کا عمل ایک اور انتہائی امتیازی چال تھی جس کے تحت انتہائی ذہین تامل نوجوان بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے معاملے میں عام قسم کے سنہالی نوجوانوں کے مقابلے میں نہایت امتیازی سلوک کیا

جا رہا ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۷۰ کے دہے کا ہے۔

۱۹۶۰ کے دس برسوں میں سرکاری دائرہ کار کے اداروں میں تامل ملازموں کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہونے لگی ۱۹۵۶ سے ۱۹۷۰ کے برسوں میں سرکاری انتظامیہ ملازمتوں میں تامل باشندوں کا تناسب ۳۰ فی صد سے کم ہو کر ۵ فی صد اور کلرکوں کی سروس میں ۵۰ فی صد سے گھٹ کر ۵ فی صد رہ گیا۔

جہاں تک تاملوں کے خلاف فسادات کا تعلق ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب ایک بار سنہالیوں کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ اس جزیرے میں جیتنے یا منتخب لوگ ہیں تو انہوں نے تامل باشندوں کو گھٹیا کمتر اور غیر ملکی سمجھ کر ان سے نفرت شروع کر دی اور باقاعدہ وقفوں کے بعد ان کے خلاف گروہی تشدد کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ ۱۹۵۶ - ۱۹۶۱ - ۱۹۶۹-۱۹۷۰- ۱۹۷۷ - ۱۹۷۹ - ۱۹۸۱ اور ۱۹۸۳ میں تامل باشندوں

کے خلاف ملک گیر پیمانے پر منظم قتلوں کا سلسلہ شروع کیا گیا جس میں سے ہر مہم میں معصوم تامل باشندوں قتل کے دل ہلا دینے والے گھناؤنے واقعات ہوتے تامل عورتوں سے بدسلوکی کی گئی ان کی عصمت دری کی گئی اور تامل باشندوں کی کروڑوں روپے کی جائیدادیں تباہ کی گئیں کہا جاتا ہے کہ ۱۹۸۳ میں تقریباً تین ہزار تامل باشندے قتل کئے گئے حکومت جسے مکمل



اختیارات حاصل تھے صورت حال سے نمٹ نہ سکی وہ نہ تو کچھ کر سکتی تھی اور نہ ہی کچھ کرنا چاہتی تھی اس صورت حال سے بہت سے لوگوں نے سمجھا کہ یہ سب کچھ حکمراں طبقہ کی ملی بھگت سے ہو رہا ہے تاکہ تامل لوگوں کو سری لنکا سے بھگایا جائے

۱۹۳۰ میں اور ۱۹۴۰ میں تامل رہنماؤں نے قانون ساز اسمبلی میں تامل اور دیگر اقلیتوں کے لئے سنہالیوں کے مساوی نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب باغیچوں میں کام کرنے والے ۱۰ لاکھ تامل کارکنوں کو شہریت کا حق دینے سے انکار کر دیا گیا تو انھیں سنگین حالات کا زیادہ علم ہوا۔ مشہور تامل رہنما ایس۔ جے وی چیلوا نائکم تامل کانگریس سے الگ ہو گئے اور انھوں نے اپنی پارٹی بنا لی جس کا نعرہ تھا آج ہندوستانی تامل باشندوں کی باری ہے۔ کل کلہاڑے کی ضرب سری لنکا کے تاملوں پر پڑے گی۔ ۱۹۵۳ میں فیڈرل پارٹی کی سالانہ کانفرنس میں پہلی بار تامل باشندوں



کے حق خود اختیاری کے بارے میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ تاہم معاملہ بھی اور ردو کد کی سیاست کے سبب اس جانب کوئی سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا جاسکا۔

چونکہ تامل باشندوں کے خلاف سیاسی سماجی اور اقتصادی امتیاز جاری رہا اس لیے تامل کانگریس، فیڈرل پارٹی اور سیلون ورکرز کانگریس جماعتوں کا ایک مشترکہ اجلاس مئی ۱۹۷۲ میں ہوا جہاں تامل متحدہ محاذ قائم کیا تھا ۱۹۷۶ میں تامل متحدہ محاذ نے اپنے کو تامل متحدہ محاذ آزادی کے نام سے پھر سے منظم کیا۔ اور تامل ایلام کے نام سے ایک ریاست قائم کرنے کا عہد کیا۔ اس فیصلے کے نتیجے کے طور پر سیلون ورکرز کانگریس متحدہ محاذ آزادی سے الگ ہو گئی کیونکہ یہ جماعت اس تجویز کو ناقابل عمل خیال کرتی تھی۔ ۱۹۷۷ میں تامل متحدہ محاذ آزادی نے الگ ملک کے لیے ووٹ کے واحد مطالبے پر پارلیمانی چناؤ لڑے اور تاملوں کی بھاری اکثریت نے ایلام کے قیام کی حمایت کی۔

جہاں تامل متحدہ محاذ آزادی تامل باشندوں کی حالت سدھارنے میں ناکام رہا وہاں نوجوان تامل باشندوں کی مایوسیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ان میں سے پڑھے لکھے نوجوانوں کو روزگار کے محاذ پر ایک سنگین صورت حال کا سامنا تھا۔ اسکول اور کالج جانے والے طالب علموں کو معیار بندی کے اصولوں کے سبب قابل رحم حالات درپیش تھے۔ جوشیلے اور کھل کر بات کرنے والے نوجوانوں نے اپنی ریاست ایلم کو سنہالیوں سے آزاد کرانے کے لیے جزیرے کے مختلف حصوں میں کئی ٹولے منظم کر لیے۔ پدمانابھن کی قیادت میں ایلم پیپلز انقلابی محاذ آزادی، بالاکمار کی زیر قیادت انقلابی تنظیم، وی پربھاکرن کی زیر کمان تامل ایلم کے آزادی کے سرلکا مہشورن کی زیر قیادت تامل ایلم کی عوامی آزادی کی تنظیم اور سری سبرتنم کی زیر قیادت تامل ایلم ریفریشن آرگنائزیشن کے نام سے پانچ سرکردہ گروہ وجود میں آگئے۔ ان میں سے تین گروہوں نے مل کر ایلم نیشنل فرنٹ کے نام سے ایک بڑی تنظیم قائم کر لی جو کبھی متحد ہو جاتے ہیں اور کبھی الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ باہمی طور پر کئی اقسام کے اختلافات کے باوجود ان سب کا نصب العین تامل ایلم ہی ہے۔

تشدد کی حامی یہ گوریلا تنظیمیں ۱۹۷۰ کے آخری برسوں سے ملک کے لیے مسائل پیدا کر رہی ہے۔ لیکن ان تشدد پسند جماعتوں کے اندرونی جھگڑے جن کے دوران انہوں نے بہت سے بے گناہ تامل باشندوں کو اغوا اور قتل کیا۔ تامل ناڈو میں (جہاں وہ ۱۹۸۳ کے قتل عام کے بعد سے مقیم ہیں) امن و قانون کے مسائل پیدا کرنے کے سبب ان تنظیموں کی بدنامی ہوتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر سری لنکا پارلیمنٹ میں تامل متحدہ محاذ آزادی کا کوئی نمائندہ نہیں ہے۔

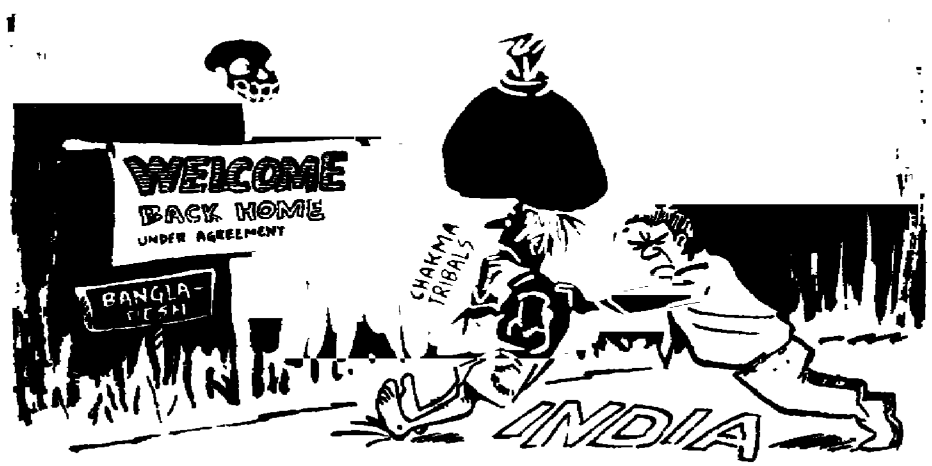
اس لیے اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ تامل باشندوں کی صحیح معنوں میں نمائندگی کون کرتا ہے۔ یہ گتھی صرف اسی صورت میں سلجھ سکتی ہے جب پرامن ڈھنگ سے انتخاب کرائے جائیں۔



ڈاکٹر پرمانند

# بنگلہ دیش : چٹاگانگ کا کوہستانی خطہ اور قومی یکجہتی

بنگلہ دیش جو کہ جنوب ایشیا کا ایک بالکل نیا نیا سا ملک ہے، اصطلاحی معنوں میں تو قومی طور پر ایک متحد و سالم ملک دکھائی دیتا ہے، لیکن جو کچھ وہاں کے چٹاگانگ کے کوہستانی خطے میں ہو رہا ہے، اسے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس ملک میں قومی یک جہتی کا نہ صرف بھاری فقدان ہے، بلکہ اس سے ہندوستان کے ساتھ شدید نوعیت کا دو رخا سرحدی مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا ہے جس نے کچھ حد تک دنیا بھر کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ایسی صورت حال میں ایک شخص قدرتی طور پر جاننا چاہے گا کہ چٹاگانگ کے کوہستانی خطے کے لوگ آخر کس غیر معمولی حالت میں رہ رہے ہیں، نیز وہ کن مخصوص مسائل سے دوچار ہیں؟ بنگلہ دیش میں مختلف حکومتوں نے اس خطے کے عوام کیساتھ کیسا سلوک روا رکھا ہے اور یہاں کی آبادی کی ترتیب کو کیونکر بدلنے کی کوشش کی ہے؟ اس علاقے میں بسنے والے قبائلیوں نے ان ظہورات کے پیش نظر کس ردعمل کا مظاہرہ کیا ہے، بین اقوامی سطح پر اس مسئلے کی کیا حالت رہی ہے نیز اس سنگین مسئلے کا حل کیا ہو سکتا ہے؟




"WHAT'S THE HITCH?"

## مخصوص کیفیت

چٹاگانگ کا کوہستانی رقبہ برما کے حدود اور بعید لوشائی ہلز (میزورم) سے لے کر ہندوستان میں تری پورہ کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے، نیز انسانی بود و باش کے لائق نہیں ہے، اگرچہ یہ خطہ بنگلہ دیش کے کل رقبے کے ۷۲ر۹ فیصد پر محیط ہے، تاہم اس ملک کے دیگر اضلاع کے بہ نسبت، انسانوں کے رہنے لائق اراضی یہاں بہت کم ہے ۵۰۹۳ مربع میل کے کل رقبے میں ۴۳۸۳ مربع میل کا ۸۵ر۳ فیصد علاقہ جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے۔ اپنے طبیعاتی محل وقوع کی بدولت یہ خطہ، متعدد میدانی اضلاع کے مقابلے میں صنعتی اور زرعی ترقی کے لیے ضروری، قدرتی وسائل سے زیادہ مالا مال ہے۔ اس کے علاوہ یہ خطہ بیش قیمت جنگلات معدنیات، آبپاشی اور پن بجلی کے لیے موزوں وافر آبی ذخائر، نیز پھلوں اور دیگر نقدی فصلوں کی کاشت کے لیے بڑھیا زمین کی دولت سے بھی بھرپور ہے ملک کے سب سے بڑے پن بجلی باندھ سمیت متعدد کارخانوں کا اس خطے میں لگایا جانا بے سبب نہیں ہے۔ بشمول کپتائی کے کرنافلی کثیر المقاصد پراجیکٹ اور چندراگھنا کے کرنافلی ریعین اینڈ کیمیکلز لیمیٹڈ اس علاقے میں کتنے ہی بڑے بڑے کارخانے شامل ہیں۔ زرعی اور خوردنی اشیا، فلزاتی کار سازی، بید، بانس اور چوبی مصنوعات وغیرہ پر مشتمل کتنی ہی چھوٹی پیمانے کی صنعتوں کو اس علاقے میں فروغ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ علاقہ ربڑ اور متعدد ایسے تازہ میوے اور پھل پیدا کرتا ہے جو ملک کے دوسرے حصوں میں نہیں ہوتے۔

یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس خطے

جن لٹیرے حالوں نے بنگلہ دیشیوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ حالیہ بنگلہ دیش میں اس علاقے کی اسی خاص حیثیت کے باعث ہی دوسرے علاقوں کے لوگ کشاں کشاں یہاں چلے آئے ہیں حالانکہ ۱۹۰۱ء میں چٹاگانگ کے کوہستانی علاقے کی آبادی ایک لاکھ پچیس ہزار تھی تاہم ۱۹۹۱ء میں یہ بڑھ کر ساڑھے سات لاکھ ہوگئی۔ آبادی میں یہ اضافہ سات گنا کے مساوی تھا مگر اسی دوران ملک کی مجموعی آبادی فقط تین گنا ہی بڑھ پائی ظاہر ہے بنگلہ دیش میں چٹاگانگ کے کوہستانی علاقے کے باشندوں، خاص کر وہاں کے آدی باسیوں کو ایک خاص مقام حاصل ہے



## آدی باسیوں کے مسائل

چٹاگانگ کے کوہستانی خطے کے آدی باسیوں کو جو کہ زیادہ ترقی یافتہ ہیں، متعدد مخصوص مسائل کا سامنا ہے۔ بنگلہ دیش میں ۱۹۸۱ء میں کی گئی مردم شماری کی رپورٹ میں مذکور ہے کہ چکما، مارما، تریپورہ، تینچنگیا، مرو، ابچاں، لوشائی، بون، پنکیا، چک، خیانگ اور کھئیو قبائل اس خطے کے باسی ہیں۔ چکما، مارما اور تریپورہ قبیلوں کے لوگ اس خطے میں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ تین قبیلے دیگر چھوٹے قبیلوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ان تین قبیلوں میں چکما آبادی کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصہ ہیں۔ چونکہ سبھی قبائلیوں میں چکما سیاسی طور پر زیادہ سے زیادہ باشعور ہیں، اس لیے بنگلہ دیش میں حالیہ برسوں میں انہی سے بیش از بیش صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ علاقائی اور بین اقوامی طول و عرض کے مسائل کھڑے کرنے والے بھی یہی لوگ ہیں کہا جاتا ہے کہ لگ بھگ ۳۰،۰۰۰ چکما ہندوستان میں پناہ گزین ہیں، جو بنگلہ دیش کی حکومت کی ان کے خلاف انتقامی کارروائیوں کے خوف سے، وطن لوٹنے پر ہرگز راضی نہیں ہیں۔

ایک سوال جو قدرتی طور پر اس ضمن میں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ چکما لوگ آخر اس زبوں حالی کا شکار کیوں ہیں؟ اس کی وجہ کا پتہ لگانا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ چکما قبائلی بنگلہ دیش کے ان عوام کا جو وہاں کے خاص دھارے پر مشتمل ہیں، ایک قطعی الگ حصہ ہیں۔ یہ لوگ برمی رسم الخط میں لکھی جانے والی بگڑی ہوئی بنگالی زبان بولتے ہیں، بنیادی طور پر وہ بودھ ہیں، وہ متعدد ہندو دیوی دیوتاؤں کی بھی تعظیم کرتے ہیں، انہوں نے اپنی زبان، ادب اور نسلی خصوصیت کے بارے میں متعدد معیاری کتب تخلیق کی ہیں، نیز اپنی زبان، ادب اور ثقافت کو ابھارنے کے لیے تعلیم یافتہ چکما کئی رسائل شائع کرتے ہیں۔ البتہ چونکہ چکما اپنی انفرادی شناخت کو، بنگلہ دیش کے اس قومی دھارے سے، جو بنگالی زبان، نیز اب ایک بڑی حد تک اسلام پر مبنی ہے، ہٹ کر برقرار رکھنے کے خواہاں ہیں۔ وہاں کی حکومت کے کل پرزے، ان کی امیدوں اور امنگوں پر پانی پھیرنے اور انہیں ملک سے باہر بھگانے کے لیے بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے ہیں۔ چکماؤں کا علاقہ ملک کے دیگر علاقوں جیسا گنجان آباد نہیں ہے بنگلہ دیشی معاشرے کے دیگر لوگوں کو جو زیادہ تر بنگالی مسلمان ہیں، وہاں آباد کرنے کی کوششیں بھی جاری رہتی ہیں، جس سے ان کے لیے سنگین اور شدید مسائل کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہیں شروع ہی سے قومی آمدنی میں ان کے جائز حصے سے محروم رکھا گیا ہے۔

مذہبی و ثقافتی عوامل کو چھوڑ کر، ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا حصہ بنے رہنے کی تمنا کا اظہار، یہاں سے پاکستان بھاگنے والی پاکستانی افواج کے عملے کو پناہ دینے اور بنگلہ دیش کی جہد آزادی میں ان کا غیر جانبدار رویہ، چکماؤں کے تئیں وہاں کی حکومت کے مخاصمانہ رویے کے لیے ذمہ دار کہے جا سکتے ہیں۔ فی الحقیقت آزادی کی لڑائی کے دوران مراجعت کرتی ہوئی پاکستانی افواج کے ساتھ چکماؤں کی خوش سلوکی کے باعث مکتی باہنی اور ان قبائلیوں کے بیچ دشمنی پیدا ہو گئی تھی۔ اصل قصور واروں کو پکڑنے کی کوشش کیے بغیر مکتی باہنی نے ان کی پوری کی پوری قبائلی آبادی کو بنگلہ دیش کا دشمن ہونے کا کلنک کا ٹیکا لگایا، نیز ان سے بدلہ لینا شروع کر دیا۔ بے گناہ لوگوں کو بے حد پریشان کیا گیا اور ان میں سے اکثر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے جس کے نتیجے میں اس خطے میں کشیدگی پھیل گئی۔

چونکہ چکما متحدہ پاکستان کے زمانے ہی سے اپنی شکایات اور مطالبات کا اظہار واضح انداز میں کرتے رہے ہیں اور چونکہ سیاسی شعور اور آگہی کا ان میں فقدان نہیں ہے۔ اس لیے یوں لگتا ہے جیسے بنگلہ دیشی سرکار ان کی بابت نہایت محتاط ہو گئی ہے۔ اس کے عقب میں چٹاگانگ کے کوہستانی علاقے کے آدی باسیوں اور خاص کر چکماؤں کے لیے خصوصی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو چہ جائیکہ ان کی پریشان حالی سے انہیں کوئی عارضی تسکین نصیب ہو، لگتا ہے آنے والے دنوں میں یہ اور بھی زیادہ آلام و مصائب میں مبتلا ہوں گے جو شاید انہیں صفحۂ ہستی ہی سے مٹا ڈالیں۔

## حکومت کا رویّہ

بنگلہ دیش، بلکہ متحدہ پاکستان کی مختلف حکومتوں کا بھی چکماؤں کے تئیں رویّہ، چاہے ہی یہ الگ الگ پیمانے پر رہا ہو، کم و بیش سنگدلی اور بے اعتنائی کا رہا ہے چونکہ چکما پاکستان یا بنگلہ دیش کی مملکتوں میں کبھی سیاسی اقتدار میں حصہ دار نہیں رہے، اس لیے ان کی شکایات کو سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے ساتھ ان کے مذہبی تعلق اور جغرافیائی قرب کے باعث انہیں وطن دشمن ہونے کا کلنک لگانا آسان ہے مختلف حکومتیں ان کی ثقافتی لگن کو تسلیم کرنے میں ناکام رہی ہیں اور انھوں نے ان کی ثقافت کو عجائب گھر میں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے، دوسری طرف اسکولوں اور کالجوں کی کمی کی وجہ سے قبائلی علاقوں میں تعلیم کا پھیلاؤ زیادہ نہیں ہوا۔ اقتصادی ترقی کی سطح پر مختلف حکومتوں کی کارکردگی نہایت ناپسندیدہ اور قابل مذمت رہی ہے۔ دیہی علاقوں کے بارے میں بری طرح لاتعلقی برتنے کے ساتھ ساتھ شہری علاقوں میں لگے کارخانوں میں بھی چکماؤں کو روزگار کے مناسب مواقع نہیں دیے گئے۔ حالانکہ عام صورت حال ایسی ہی رہی ہے، تاہم چکماؤں کے ساتھ برتاؤ میں حکومت حکومت میں فرق بھی رہا ہے

ایوب سرکار نے آئین میں ترمیم کر کے چٹاگانگ

کے کوہستانی خطے کی ایک قبائلی علاقے کی حیثیت ختم کر دی اور قبائلی سرداروں کو اپنے عہدوں سے برطرف کر دیا۔ جنرل ایوب نے ایک قبائلی رئیس تری دیب رائے کو وزیر مقرر کر دیا۔ ایوب کی حکمت عملی یہ تھی کہ بودھ چکماؤں کو ہندوؤں کے خلاف استعمال کیا جائے نیز اقلیتوں کے تئیں اپنی بناوٹی فکرمندی دنیا پر عیاں کی جائے۔ بلاخوف تردید وہ اپنی چال میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ البتہ چکماؤں کی ابتر حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔

شیخ مجیب کی عوامی لیگ کا چکماؤں کے تئیں رویّہ بھی قدرے جارحانہ رہا۔ یہ سرکار انہیں بنگالیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ ۱۵ فروری ۱۹۷۲ء کو قبائلی رہنما منبندرا نارائن لارما کی سرکردگی میں ایک وفد نے شیخ مجیب سے ملاقات کر کے چار مطالبات پر مشتمل ایک منشور پیش کیا۔ وہ مطالبات یہ تھے:

۱۔ اپنی جداگانہ مقننہ کے ساتھ چٹاگانگ کے کوہستانی خطے کے لیے خود اختیاری حکومت

۲۔ بنگلہ دیش کے آئین میں ۱۹۰۰ء میں مدوّن کیے گئے سی۔ایچ۔ٹی۔ مینوئل کو قائم رکھنا

۳۔ قبائلی چیف افسروں کے عہدے کو جاری رکھنا

۴۔ ۱۹۰۰ء میں مدوّن کیے گئے ضابطے میں کسی ترمیم پر روک کی غرض سے آئینی اہتمام اور غیر قبائلی آبادکاروں کے امڈ کر آنے پر پابندی عائد کرنا۔

مجیب نے یہ سبھی مطالبات یک قلم رد کر دیے۔ چکماؤں کی امنگوں کی نفی کرنے والی دفعات کے حامل ۱۹۷۲ء کے آئین کے نفاذ کے بعد کشیدگی شروع ہو گئی۔

ضیاء الرحمٰن سرکار کے رویّے کو جبر اور دھارس کا آمیزہ کہا جا سکتا ہے۔ دھارس کے طور پر اس نے ایک قبائلی خاتون بنیتا رائے کو ایک وزیر کے مرتبے کے ساتھ صدر کی مشاورتی کونسل کا رکن مقرر کیا۔ اس نے تین قبائلی سرداروں کو ایک ہزار روپے ماہوار اور ہر ایک مکھیا کو ایک سو روپے ماہوار ادا کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ البتہ چھوٹے پیمانے کی دھارس کی یہ حکمت عملی پروان نہ چڑھ پائی کیونکہ مطالبات بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ مطالبات کے منشور کی نامنظوری کے بعد سرکار نے اس علاقے میں زیادہ فوج تعینات کر دی، باوجودیکہ اس علاقے میں زیادہ کارخانے لگائے گئے، روزگار کے تعلق سے قبائلیوں کو کوئی اہم یا بامصرف مقام نہ دیا گیا۔ معاشرے کے مسلم گوشے سے تعلق رکھنے والے نوآبادکاروں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں انہیں ترجیحات اور سہولیات فراہم کی گئیں۔

صدر ارشاد کے دورِ حکومت میں ان کی حالت مزید خراب ہو جانے سے چکماؤں کی کشمکش جاری ہے۔ البتہ یہ بات اس کے حق میں جاتی ہے کہ اس نے ان چکماؤں کی بحالی کے لیے چھ نکاتی لائحہ عمل کا اعلان کیا، جو ملک کے خلاف غداری چھوڑ کر ہتھیار ڈالنے پر رضامند ہوں۔ وہ چھ نکات یہ تھے: ہتھیار ڈالنے والے کو اس کی روزی روٹی کے لیے پہلے سال ۵۰۰۰ روپے کا عطیہ، جو چٹاگانگ کے کوہستانی علاقے میں رہنا چاہے اور کھیتی باڑی کرے اسے ۵ ایکڑ خاص اراضی کی الاٹمنٹ، انفرادی صلاحیت کی بنا پر خواہشمند افراد کو نیم فوجی تنظیموں اور سیکورٹی افواج میں ملازمت نیز انتخابات میں حصہ لینے کا حق۔ اس نے میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں قبائلی طلبا کے لیے نشستیں مخصوص کرنے کا بھی اعلان کیا۔ البتہ فقط ۹۰۰ چکماؤں ہی نے ارشاد کے اس چھ نکاتی پروگرام کو قبول کیا۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ یہ لوگ چکما جنگجو نہیں تھے بلکہ بنگلہ دیش کی غیر چکما آبادی کے ایک حصے نے ارشاد کے اسی اعلان سے فائدہ اٹھایا۔

کل ملا کر ارشاد کے دور میں چکماؤں کی حالت مزید اور ابتر ہو گئی ہے۔ شانتی باہنی نے جو کہ چکماؤں کا فوجی بازو ہے، واقعی نوآبادکاروں پر زیادہ تند و تیز حملے کیے ہیں، نیز ان کے خلاف فوج و پولیس کی انتقامی کارروائی میں کتنے جانیں بھی گنوا چکے ہیں۔ اس اثنا میں میدانی لوگوں کا اس خطے میں آکر بسنا جاری ہے۔ زیادہ سے زیادہ نوآبادکار ملک کے فوجی زمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ چکماؤں سے لوہا لینے کے لیے سرکار انہیں اسلحہ فراہم کرتی ہے۔ آبادی کے تعلق سے یہاں کا تغیر و تبدل ایک حقیقت بن جانے کے بعد چکماؤں کا خود کو یہاں محفوظ خیال کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

## علاقائی و بین اقوامی ردِّ عمل

سیلاب کی صورت عوام کی کسی بھی علاقائی ہجرت کی طرح، چکماؤں کی بے پناہ تعداد میں ہندوستان کو ہجرت نے بھی اس ملک کے لیے ایک مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ ان پناہ گزینوں کا مسئلہ اس بنا پر اور بھی پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے کہ چکما تریپورہ میں رہ رہے ہیں جہاں قبائلی قومی رضاکار تنظیم مبینہ طور پر قدرے بنگلہ دیش کی اعانت سے اس صوبے کی غیر قبائلی آبادی پر شدید حملے کرنے میں مصروف ہے۔ پناہ گزینوں کی نگہداشت اور امن و ضبط کا قیام ہر دو نے ہندوستان کے لیے مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ چکماؤں کے مسائل سے ہندوستان اور دوسروں کی توجہ ہٹانے کی غرض سے بنگلہ دیش مبینہ طور پر قبائلی فوجی رضاکار تنظیم کی مدد کر رہا ہے۔ اس محاذ پر بنگلہ دیش مسلمہ طور پر کچھ حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔ مزید برآں بشمول اقوام متحدہ، عام معافی کی عالمی تنظیم (ایمنسٹی انٹرنیشنل) اور غلامی مخالف انجمن، متعدد بین الاقوامی تنظیموں نے وقتاً فوقتاً بنگلہ دیش میں چکماؤں کی زبوں حالی کو اپنی توجہ کا خاص مرکز نیز اس کے لیے وہاں کی حکومت کو ہدف تنقید بنایا ہے۔

## خلاصہ

القصہ یقینی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بنگلہ دیش جیسے نئے ملک کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ مذہب کے علاوہ ایک ثقافتی عنصر تھا جس نے مشرقی بنگال کے عوام کو مملکت پاکستان کے خلاف جنگِ حریت لڑنے پر مجبور کیا۔ ایک وقت وہ تھا جب مشرقی بنگال کے مسلمان پاکستان کے قیام کے لیے لڑ رہے تھے لیکن آخرکار انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں سے ان کے لیے پیچھے مڑنا ممکن نہ تھا۔ چکماؤں اور بنگلہ دیش میں رہنے والے دیگر قبائلیوں کو اس حق سے محروم نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ بنگلہ دیش میں اپنے قیام کو بے حاصل نہ سمجھنے لگیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے اردو اور اسلام پر مبنی ملت پرستی پاکستانی ضروریات کی تکمیل کا سامان نہیں کر پائی تھی، بنگالی زبان اور اسلام پر مبنی ملت پروری بھی غیر فانی اور ہمہ گیر نہیں ہو سکتی۔ بنگلہ دیش کے حکمراں طبقے کے لیے خواہ اس کی نوعیت غیر فوجی ہو یا فوجی، اس حقیقت کو سمجھ لینا بہتر ہوگا کہ کوئی دھارے یا نعرے کی شکل میں ٹھونسا گیا ہو وہ مذہب اور تمدن جسے عوام ذہنی طور پر قبول کرنے پر تیار نہ ہوں، الٹا پڑتا ہے اور جب معاشرہ کا متاثرہ حصہ ناقص تقسیمی نظام کے مضر نتائج کا بھی شکار ہو تو یہ الٹا پڑنا اور بھی زیادہ سنگین بن جاتا ہے۔ لہٰذا ایک کھوکھلی اور ناپائیدار ملت پروری کے بجائے قومی یکجہتی کی اہمیت کو ذہن نشین کرنا بنگلہ دیش کے مفاد میں ہوگا۔

# Making life a tasty affair·!

## BHUTAN'S

## DRUK

**Squashes, Juices, Jams, Tomato Ketchup**

Prepared from the finest fresh fruits DRUK fruit products provide extra nourishment your family needs. Everybody will relish the taste and ask for more. Give them a healthy break at breakfast. Serve them DRUK fruit products.




BFP-NP-121

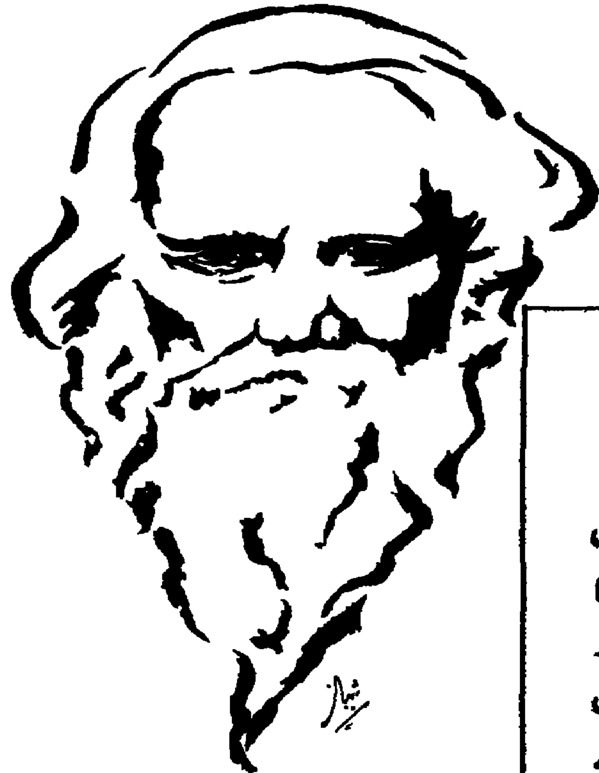
**BHUTAN FRUIT PRODUCTS LTD., SAMCHI-BHUTAN**

Trade enquiries to :

**TRADE LINKS LIMITED**, 'Prabhat Kiran', 17, Rajindra Place, New Delhi.

پروفیسر محمد حسن

# آڑے ترچھے آئینے



ٹیگور اور اقبال ہمارے دو ایسے شاعر ہیں جنھوں نے جغرافیہ اور تاریخ ہی نہیں سیاست کی حدبندیوں پر بھی فتح حاصل کرلی۔ اقبال کا 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' ہندوستان کا قومی گیت مانا گیا اور اہل پاکستان صحیح یا غلط شاعر اقبال کو پاکستان کا بانی مانتے ہیں۔ ٹیگور کا گیت 'جن گن من' ہندوستان کا قومی ترانہ ہے اور بنگلہ دیش کا قومی شاعر آج بھی ٹیگور ہے۔ جگر صاحب نے غلط نہیں کہا تھا۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اور یہ شاعر بھی کوئی خدا کا پیغام لانے والے پیغمبر یا ولی نہیں تھے' انسان تھے ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں اور ان کے افکار و نظریات میں کچھ الٹ سلٹ بھی ہے تضاد بھی ہے کچھ ایسا بھی ہے جو اب غلط ہو گیا اسی لیے تو گوئٹے نے کہا تھا کہ افراد میں اچھائیاں ان کی اپنی ہوتی ہیں اور برائیاں ان کے دور کی۔

بہر حال جو کچھ بھی ہو ہندوستان کے چار صوبے تو ایسے ہیں ہی جن کا اقبال پر حق ہے تین ان میں سے اقبال پر اپنا حق جتاتے رہتے ہیں جو نہیں جتاتا اس کا حق شاید سب سے زیادہ ہے۔ مگر ٹھہریے، یہ پہیلی آپ خود ہی بوجھیے۔

اگر آپ سے کوئی یہ پوچھے کہ ایک شاعر ایسا ہے جس کے کلام میں امید اور عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے' جو قوت اور توانائی کی بات کرتا ہے جو ہمت اور حوصلے کا شاعر ہے' جس کے یہاں جوش اور جذبے کا پلڑا بھاری ہے ـــــ ذرا بتائیے تو وہ ہندوستان کے کس صوبے کا شاعر ہو سکتا ہے آپ دل ہی دل میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے مزاج کا جائزہ لیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ بنگال کا مزاج ہے نہ مہاراشٹر کا۔ نہ اتر پردیش کا مزاج ہے نہ آندھرا پردیش کا۔ لے دے کے یہ خصوصیات اگر کسی صوبے سے وابستہ ہیں تو وہ پنجاب اور صرف پنجاب ہے۔ لہٰذا اگر ہندوستان کے کسی صوبے کا اقبال پر سب سے زیادہ حق ہے تو پنجاب کا۔ یہ اور بات ہے کہ اقبال کے آبا و اجداد کشمیر سے آئے تھے۔ اور اقبال کا آبائی وطن کشمیر ٹھہرا لہٰذا دوسرا حق اور آبائی اور جسمانی تعلق والا حق ـــــ ہوا ریاست جموں و کشمیر کا۔

"مجھے ڈر ہے کہ ہمارے چاروں طرف سستے اور گھٹیا ادب کا ایک بازار بھر رہا ہے، اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے بازوؤں کے سینے پر لٹکے ہوئے تمغے اتنے بھاری اور اتنے زیادہ نہ ہو جائیں کہ ان کے بوجھ سے وہ [illegible] دھنس جائیں۔"

شولوخوف

مگر سچ یہ ہے کہ یہ حق سب سے زیادہ نبھایا مدھیہ پردیش نے جہاں کی راجدھانی بھوپال نے ایک طویل و عریض میدان کو اقبال میدان کا نام دیا اور شاعر کے قیام بھوپال کی یادگار کے طور پر مینار تعمیر کرایا اور دنیا کے مشہور فنکار سوامی ناتھن سے اقبال کے شاہین کا نشان تیار کرا کے نصب کیا' پچاس ہزار کا اقبال انعام قائم کیا جو اس بار مشہور اقبالی جناب علی سردار جعفری کو ملا

پھر ہے آندھرا پردیش جہاں اقبال اکادمی بھی قائم ہے اور اقبال ریویو بھی شائع ہوتا ہے مگر جیسے جیسے اقبال پر توجہ بڑھتی جاتی ہے میرے اندیشے بھی بڑھتے جاتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر ادبی افکار و نظریات میں اقبال اس طرح استعمال ہو جائیں کہ شاعر اقبال کا پتہ نشان ہی نہ ملے اور وہ صرف اس قبیلے کی نذر ہو جائیں جس پر انھوں نے جابجا پھبتیاں کسی ہیں۔

سردار جعفری کا ذکر آیا تو مجھے ان کا سنایا ہوا ایک لطیفہ یاد آگیا، ماسکو میں روسی ادیبوں

کی کوئی کانفرنس ہو رہی تھی جس میں بعض بین الاقوامی مہمان ادیب بھی شریک تھے۔ جب سارے سرکاری ادیبوں کی تقریریں ہو چکیں تو کسی نے شولوخوف سے بھی تقریر کرنے کی فرمائش کی۔ شولوخوف نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے چاروں طرف سستے اور گھٹیا ادب کا ایک بدرو بہہ رہا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے ادیبوں کے سینوں پر لگے ہوئے تمغے اتنے بھاری اور اتنے زیادہ نہ ہو جائیں کہ ان کے بوجھ سے وہ اس بدرو میں دھنس جائیں۔"

ادب اور ادیب کی سرپرستی کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ ایک طرف تو یہ صورت ہے کہ ۲۰-۲۲ سال کا ایک لڑکا جس کی مجھے اہانت مقصود نہیں کچھ سال کی محنت، ریاضت اور شوق سے کرکٹ کے میدان میں ایک یا دو سینکڑے بناتا ہے یا گیند بازی میں کمال حاصل کرتا ہے تو اس کی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا جاتا ہے کہ بہترین غیر ملکی کار اسے تحفے میں ملتی ہے، اس کے عہدے میں ترقی ہو جاتی ہے۔ ہاتھ پر بھی پچاس ہزار بطور اعزازیہ ملتا ہے اور واپس اپنے ملک لوٹتا ہے تو اس کی ریاست کی حکومت ایک قطعہ زمین اسے مکان بنانے کے لیے دیتی ہے اور حکومت وقت خطاب سے نوازتی ہے دوسری طرف یہ حال ہے کہ جوش ملیح آبادی یا فیض احمد فیض کے مرتبے کا بھی کوئی شاعر ادیب یا دانشور ہو جو نصف صدی محنت، ریاضت اور خلوص کے بعد الفاظ و افکار کے شہزور گھوڑوں پر فتحیاب ہوتا ہے اور ملک کی حسیت کا رخ بدل کر رکھ دیتا ہے اسے مشاعرے سے بھی جو رقم ملتی ہے وہ دو تین ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ آخر اس کا قلم اور اس کی سیاہی کی ایک بوند کی قیمت گیند اور بلے تو زیادہ ہی ہوتی ہے اور صدیوں تک زیادہ رہے گی۔

یوں بھی ہے کہ ادیب اور شاعر بھی کچھ اپنی قدر و منزلت آسائش اور مالی معاوضے کی شکل میں نہیں سوچتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مشہور فلم ساز سہراب مودی، مرحوم عمر خیام پر ایک فلم بنانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ جوش ملیح آبادی ان دنوں بمبئی میں تھے۔ مودی نے ان سے مشورہ کیا انھوں نے سیماب اکبر آبادی کا نام تجویز کیا کہ ان سے بہتر منظوم ترجمہ کرنے والا اور کون ہو سکتا تھا۔ مودی نے معاوضہ طے کرنے کے لیے حضرت سیماب کو خط لکھا۔

دروغ برگردن راوی سیماب صاحب نے اپنے حساب سے نہایت زرِ خطیر بطور معاوضہ طلب کیا اور صاف صاف لکھا کہ ایک رباعی کے منظوم ترجمے کے لیے کسی حالت میں پانچ روپے سے کم معاوضہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

مودی جوش صاحب کے پاس فریاد لیکر پہنچا کہ آپ نے کس سستے شاعر کا پتہ بتا دیا وہ تو پانچ روپے فی رباعی پر ترجمہ کرنے کو تیار ہیں کوئی بڑا شاعر بتائیے۔

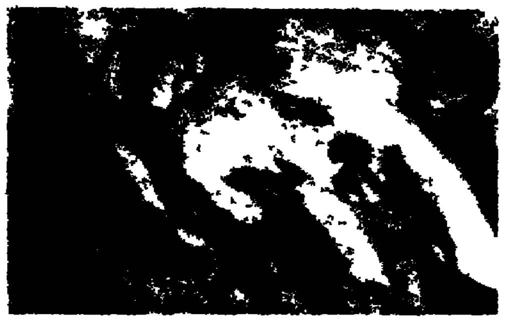
سیماب نے شاعروں اور فنکاروں کی قلندری اور بے نیازی کا نمونہ پیش کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اہل ثروت ان کو اسی طرح آنکتے بھی رہے۔

ساحر لدھیانوی سے پہلے ایک فلم کے لیے آٹھ گانے لکھنے کا معاوضہ دس ہزار سے زیادہ نہ تھا، ساحر نے اسے ایک لاکھ تک بڑھا دیا اور پھر بھی ان کے دروازے پر اہل طلب کی دستک کم نہ ہوئی کہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

موسم آیا ہے کچر کا۔ ابھی ابھی راجدھانی اپنے مہوتسو کے رنگ و نور میں ڈوب کر ابھری ہے۔ اس میں رقص بھی تھا موسیقی بھی لیکن سب سے کم رنگ تھا تو ادب کا، محض مشاعرے تک ہی محدود رہی لیکن ادب تو اس کے آگے بھی ہے





اور اس قسم کے مہوتسو کو کم سے کم سطحیت سے آگے جانا چاہیے محض تفریحی نہیں، تھوڑا بہت تربیتی بھی تو ہونا ہی چاہیے اور دیکھیے تو ان دونوں میں کچھ تضاد بھی نہیں ہے۔ آپ کا ذوق جمال خود تربیت کا حصہ ہے۔

بات پھر ٹیگور اور اقبال تک پہنچتی ہے ان کے نغمے ان دلوں کو بھی جوڑ دیتے ہیں جو ان سے نہیں خود ایک دوسرے سے بھی اختلاف رکھتے ہیں۔ قومی یکجہتی کا چرچا بہت ہے جتنا اس لفظ کو زور زور سے رٹا جائے گا اس کا اثر اتنا ہی زائل ہوتا جائے گا اور قومی یکجہتی کی جگہ فرقہ واریت اور بے اعتمادی لیتی جائے گی۔ مناسب یہ ہے کہ اس لفظ کو بار بار دہرائے بغیر جہاں یہ کیفیت رنگ دکھاتی ہے ان کیفیات کو بار بار ملک اور قوم کے سامنے لایا جائے۔ کیا کبھی فراق کا کلام سنتے وقت آپ نے یہ سوچا ہے کہ فراق کا اصلی نام کیا ہے یا وہ کس صوبے سے تعلق رکھتے ہیں؟ ملک کو بنیادی رشتے دیجیے اور وعظ و نصیحت کی لے مدھم کیجیے۔

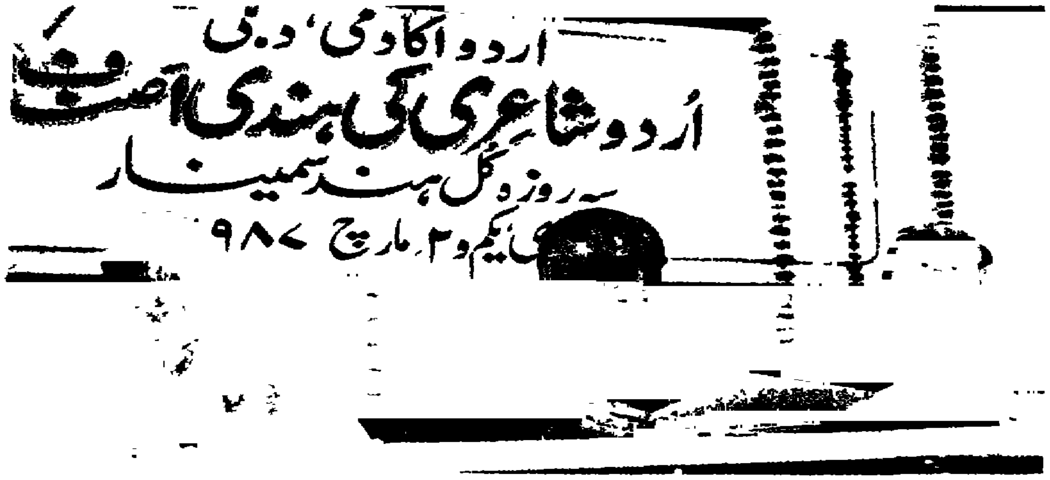
مگر شاعروں اور ادیبوں تک پہنچنے کے لیے اور بہتر طریقے تک پہنچنے کے لیے سرپرستی اور معاوضے کے اشتہار کے بجائے ضرورت ہے قدردانی اور احترام کی کہ وہ مخلوق ہے جو غذا کی کمی سے نہیں مرتی قدردانی کی کمی سے مرجاتی ہے یا کم سے کم مرجھا ضرور جاتی ہے اور وہ قوم اپنے کو کس حد تک ترقی یافتہ یا ترقی پذیر کہہ سکتی ہے جس کے پاس فولاد کے کارخانے تو ہوں، مادی ترقی کے نمونے تو ہوں مگر اقدار و افکار سے اس کے خزانے خالی ہوں جو نغمہ کی کیفیت، حرف کی مستی، رنگ کی گلکاری اور رقص کی سرشاری سے محروم ہو یہ بھی ملک اور قوم کی اتنی ہی بڑی ضرورتیں ہیں جتنی تازہ ہوا اور صاف پانی۔

## اردو اکادمی

سہ روزہ سمینار

رپورٹ: جمیل اختر

# اُردو شاعری کی ہندی اصناف




۲۸ فروری تا ۲ مارچ ۱۹۸۷ء ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار "اردو شاعری کی ہندی اصناف" کے موضوع پر غور و فکر کے لئے ایک سہ روزہ کل ہند سیمینار اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام "غالب اکیڈمی" میں منعقد ہوا۔ یہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار تھا جس کا مقصد اردو اور ہندی کے باہمی رشتے اور رشتوں کی ان بنیادوں کی نشاندہی کرنا تھا جس سے یہ دو زبانیں اپنے وجود سے لے کر اب تک ایک دوسرے کی بقا اور ترقی میں معاون و مددگار رہی ہیں تاکہ ان زبانوں میں جو فاصلہ ہے وہ کم ہو سکے اور ملکی اتحاد و سالمیت کو مزید مستحکم بنایا جا سکے۔

سیمینار کا افتتاحی اجلاس پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں صبح ساڑھے دس بجے شروع ہوا۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے دلی کے لفٹیننٹ گورنر اور اکادمی کے چیرمین جناب ایچ ایل کپور نے کہا کہ ملک کے موجودہ حالات میں جب زبان، ثقافت اور مذہب کے نام پر بھائی کو بھائی سے لڑانے کی مذموم کوشش کی جا رہی ہے یہ ضروری ہے کہ وہ مشترکہ تہذیبی اور لسانی قدریں تلاش کی جائیں اور ان کی پہچان بھی عام کی جائے جو پوری قوم کو یکجہتی کے رشتے میں پروتی ہے۔ تاکہ قومی اتحاد و سالمیت ان سے حرارت و توانائی حاصل کر سکے۔

سیمینار کمیٹی کے چیرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس سیمینار کا مقصد صرف دو زبانوں کے لسانی رشتوں کی نشاندہی کرنا ہی نہیں بلکہ تخلیقی رویوں اور شعری سرچشموں کا بھی جائزہ لینا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ عوامی رواجوں کا فیضان کہاں تک پہنچا ہے۔ انھوں نے علم لسانیات کی روشنی میں اردو اور ہندی کے باہمی رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کے بیشتر مصادر، افعال، امدادی افعال اور اسماء دیہی ہیں جو ہندی میں بھی موجود اور مروج ہیں۔ نارنگ صاحب نے ان تخلیقی سرچشموں کی بھی نشاندہی کی جن سے دونوں زبانوں کے فنکاروں نے مشترکہ طور پر فیض اٹھایا ہے۔

اجلاس کے مہمان خصوصی اور دلی یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے سابق صدر ڈاکٹر نگیندر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو اور ہندی کے باہمی رشتوں کو پھر سے اجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ تاکہ وحدت قائم ہو سکے۔

خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے کہا کہ اردو ہندوستان کے مشترکہ کلچر کی زبان ہے اردو کا نقصان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا نقصان ہے۔ اردو شاعری ہماری پوری تہذیب کے جلوۂ صد رنگ کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب میں تین خاص عناصر آریائی، دراوڑی اور وسط ایشیائی کی نشاندہی کی اور کہا کہ اردو شاعری آریائی عناصر کے میل جول کو پیش کرتی ہے خواجہ حسن ثانی نظامی کے شکریے کے ساتھ یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

سیمینار کا پہلا اجلاس پروفیسر نذیر احمد کی صدارت میں ہوا جس میں دو مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں نے "اردو کے آگرہ شعر دکن میں ہندی عناصر" کی جلوہ گری کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے قدیم شعرا مثلاً میرا انشا کے شعری سرمایے میں ہندی الفاظ کی جلوہ گری دکھائی اور کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں ہندی کا ایک لفظ لائے بغیر کوئی جملہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

"اردو میں بارہ ماسے کی روایت" پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کہا کہ بارہ ماسے کی روایت کا آغاز راسو گرنتھوں سے ہوا۔ اردو بارہ ماسے کی روایت بھی اسی روایت سے جڑی ہے جو چار سو سال پرانی ہے۔

دوسرا اجلاس پروفیسر مغنی تبسم کی صدارت اور اختر الواسع کی نظامت میں ہوا۔ "اردو میں گیت اور نعت کی روایت" پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے کہا کہ ہندوستان میں گیت کو ہمیشہ تقدس حاصل رہا ہے اور یہ اولیاء و صوفیاء کی محفلوں میں گایا جاتا رہا ہے۔ انہوں نے نعت کی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ واضح شکلوں میں نعت گوئی کا سلسلہ سولہویں صدی سے شروع ہوتا ہے اور منقبت بھی اسی دور میں وجود میں آیا۔

جناب شہاب سرمدی نے "اردو اور ہندی کا اشتراک عمل" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے

کہا کہ اردو اور ہندی قومی زبان کی حیثیت سے برابر کا درجہ رکھتی ہے اور آج کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دونوں کو اشتراک عمل کا اپنا وہ تاریخی رول ادا کرنا ہے جو شروع سے ان کا اپنا رہا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے "دکنی و گجری شاعری میں ہندی اصناف" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ دوہا، کبت، جھولنا اور گیت کی روایت ان دونوں زبانوں کی شاعری میں ملتی ہے۔ دکنی و گجری شعراء کے کلام کے حوالے سے ان اصناف کی نشاندہی کی اور ان شعراء سے بھی متعارف کرایا جنھوں نے اصناف کو برتا ہے۔

پروفیسر نذیر احمد نے "مسعود سعد سلمان اور بارہ ماسہ" پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ گرچہ فارسی ادب میں بارہ ماسہ کا وجود نہیں لیکن مسعود سعد کے یہاں ایسے قطعات اور نظمیں پائی جاتی ہیں جو بارہ ماسہ کے ضمن میں آتی ہیں اور جن میں الگ الگ بارہ مہینوں کا ذکر ملتا ہے۔

یکم مارچ کو تیسرا اجلاس ظ انصاری کی صدارت میں شروع ہوا۔ ڈاکٹر محمد صابرین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ یہ اجلاس لوک گیت کے لیے مخصوص تھا اس میں پانچ مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر ساجدہ اسد نے "اردو کے قدیم لوک گیت" پر اظہار خیال کرتے ہوئے قدیم شعری سرمایے میں لوک گیتوں کی نشاندہی کی اور کہا کہ لوک گیتوں کا رواج قدیم زمانے میں بھی مختلف سماجی، سیاسی اور مذہبی رسومات میں ہوتا تھا۔ اور یہ ہماری زندگی اور ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔

جناب جیشور دیال نے دکنی کے لوک گیت پر اپنا مربوط مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے جو لوک گیت ہم تک پہنچے ہیں ان کا سلسلہ دلی میں مسلم حکمرانوں کے دور سے شروع ہوتا ہے عہد مغلیہ میں یہ روایت مضبوط ہوئی اور مسلمان صوفیاء نے اسے ترقی دی۔

کاظم علی خاں نے "اتر پردیش کے لوک گیتوں کی روایت" پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں گیت کی روایت کا آغاز امیر خسرو سے ہوتا ہے جو اتر پردیش کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مختلف مواقع پر گائے جانے والے لوک گیتوں کے ناموں کی نشاندہی کرتے ہوئے امانت، واجد علی شاہ اور حشر کے ڈراموں میں لوک گیتوں کی دریافت کی۔

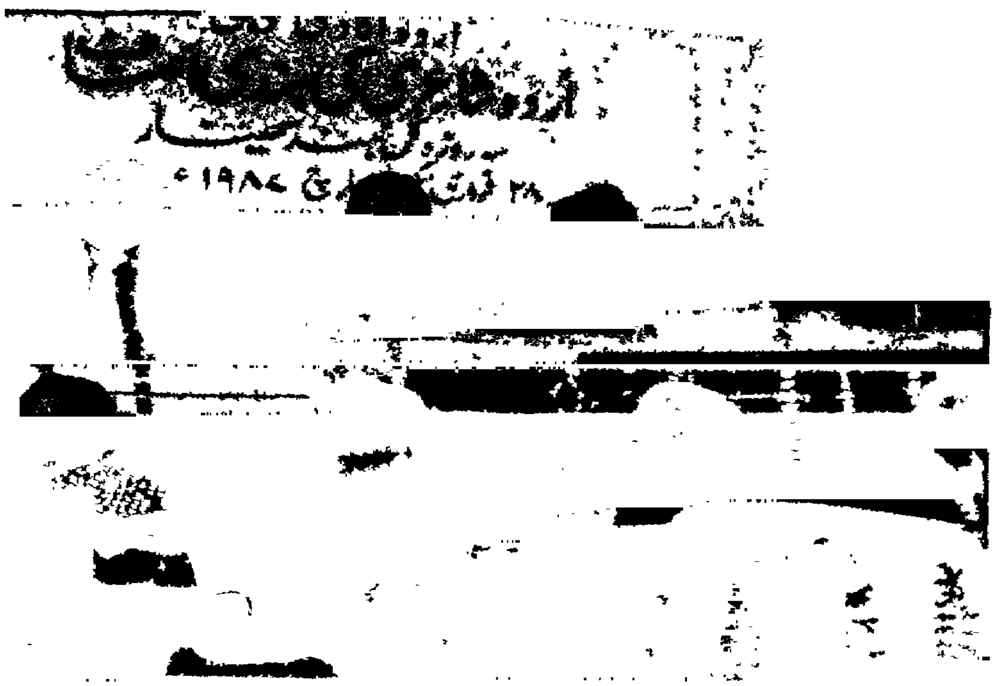
پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے "جدید اردو شاعری میں گیت" کے موضوع پر اپنا مبسوط مقالہ پیش کرتے ہوئے زبان و بیان، اسلوب اور موضوعات کی سطح پر گیت کی عہد بہ عہد تبدیلی پر روشنی ڈالی اور کہا کہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی تبدیلی نے گیت کی زبان اور موضوعات پر اثر ڈالا ہے۔ داخلیت، اظہار ذات اور عشق و محبت کی جگہ خارجیت، واقعات و واردات اور معاملات و مسائل نے لے لی۔ تحریک آزادی نے گیت کو باغیانہ اور انقلابی آہنگ و لہجہ عطا کیا اور آج آزاد شاعری کی طرح آزاد گیت لکھے جا رہے ہیں۔

چوتھا اجلاس پروفیسر مسعود حسین خاں کی صدارت میں ہوا۔ حبیب خاں نے "اردو میں دوہے کی روایت" سے گفتگو کرتے ہوئے دوہے کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ شمس الرحمن فاروقی نے میر کی ہندی بحریں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میر نے اپنی غزلوں میں جو بحریں استعمال کی ہیں وہ نہ ہندی ہیں نہ فارسی بلکہ میر کی خاص ایجاد ہیں اور انہیں بحر میر کہنا درست ہوگا ممکن ہے کہ ان بحروں کی ایجاد میں میر نے ہندی سے استفادہ کیا ہو۔

پروفیسر عابد پشاوری نے "کلام انشاء میں ہندی اصناف" کی نشاندہی کرتے ہوئے رانی کیتکی کی کہانی کو پہلی ہندی صنف قرار دیا۔ اور انشاء کے کلام میں چو بولا، چو کھٹا، دوہے اور پہیلیاں وغیرہ اصناف کی بھی نشاندہی کی۔

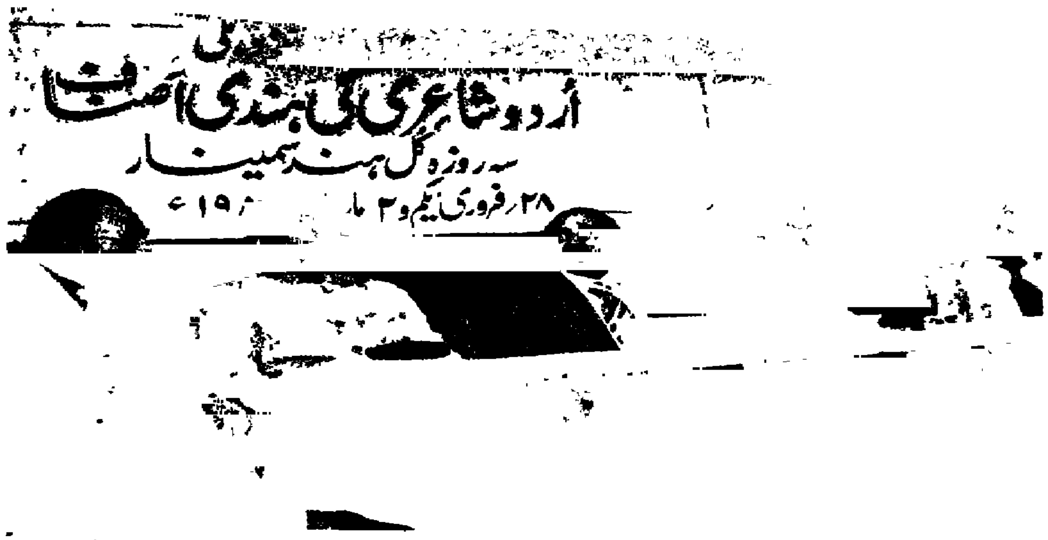
ڈاکٹر جعفر رضا نے "نظیر کی شاعری پر برج بھاشا کے اثرات" پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کرشن بھگتی یعنی برج بھاشا کا شاعر قرار دیا۔ کہا کہ نظیر کے یہاں ریتی درشن کے ساتھ ساتھ درشن بھی ملتا ہے۔

پروفیسر مسعود حسین نے خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے دوہے کی اقسام اس کے فنی لوازم اور فکری میلانات پر روشنی ڈالی۔



۲ مارچ سنہ کو سیمینار کا پانچواں اجلاس جعفر رضا کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر صلاح[illegible] نے "سودا کے کلام میں ہندی پنجابی اصناف" پر اظہار خیال کرتے ہوئے سودا کے [illegible] میں ہندی اصناف کی نشاندہی کی اور کہا کہ یہاں دوہرا بند مرثیہ، چوپائی، دوہا اور پہیلیاں مرثیوں میں گیت کا آہنگ ٹیپ کے بند [illegible]

قیصر جہاں کا مقالہ "قدیم اردو شاعری کی روایت" پر تھا۔ انھوں نے گیت کو فن قدیم روپ قرار دیتے ہوئے امیر خسرو کو اس کا بانی قرار دیا جہاں روایت دکن میں پروان [illegible] اور یہیں سے ہندوستان میں پھیلی اور یہاں کے یہاں گیت کی واضح شکل ابھر کر سامنے




" اردو عروض پر ہندی پنگل کا اثر " کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی نے کہا کہ متقدمین سے متاخرین تک تمام شعراء نے ہندی پنگل کے اوزان میں شاعری کی ہے اردو کے بہتر اوزان ایسے ہیں جو ہندی پنگل سے مماثل ہیں۔ بحر اور چھند میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے " ایہام گو شعرائے دہلی پر ریتی کال کی ہندی شاعری کا اثر " پر اپنا مربوط مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ برج کے دوہوں سے الفاظ و معنی کی تہداریاں اردو میں آئی ہیں۔ شلیش جو ایہام سے ملتی جلتی صنف ہے کے واضح اثرات بھی ان شعراء کے یہاں ملتے ہیں۔

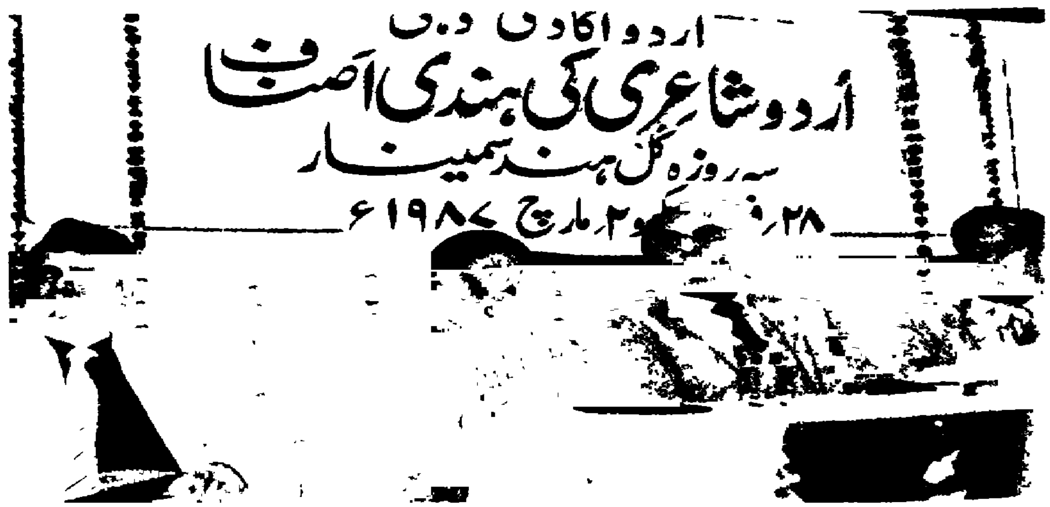
چھٹا اور آخری اجلاس ہندی کے نامور ادیب پروفیسر نامور سنگھ کی صدارت میں ہوا۔ پروفیسر مغنی تبسم نے " اردو غزل اور گیت " پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ابتدائی دور سے ہی غزلوں پر گیت کا رنگ غالب رہا ہے اور یہ عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے اور آج بھی جذبات نگاری میں گیت کے پیرایوں سے بھرپور استفادہ کیا جا رہا ہے۔

رشید حسن خاں نے " اردو میں کبت کی روایت " سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ باغ و بہار اور نو طرز مرصع کے علاوہ اردو کی قدیم کتابوں میں کبت ملتے ہیں۔ انھوں نے کلام سودا میں بھی کبت کی نشاندہی کی۔ ظ انصاری نے " اردو شاعری اور ہندوستانی موسیقی کے رشتوں پر چند خیالات " کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ابتدا ہی سے اردو شاعری اور موسیقی کا اٹوٹ رشتہ رہا ہے جن کو فراموش کر دیا گیا آج ان رشتوں کو پھر تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے " امیر خسرو کے ہندوی کلام " پر اپنا مربوط مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ خسرو کے یہاں تین طرح کے ہندوی کلام پائے جاتے ہیں اور سبھوں کی اہمیت مسلم ہے البتہ استناد میں فرق ضرور ہے۔ انھوں نے خسرو کے پہیلیوں کے ایک نو دریافت مخطوطے کی اطلاع بھی دی جو حال ہی میں انھوں نے مغربی یورپ میں دریافت کیا ہے اس میں کئی پہیلیاں وہی ہیں جن کا ذکر اشپرنگر نے کیا ہے۔

سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ڈی۔ پی پٹنایک نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے اردو اور ہندی کے رشتوں کے کئی اہم گوشوں پر روشنی ڈالی صدر جلسہ پروفیسر نامور سنگھ نے اپنی عالمانہ صدارتی تقریر میں گنگا جمنی تہذیب کی ان بنیادوں کی تلاش پر زور دیا جس سے مشترکہ کلچر پھر سے وجود میں آسکے اور قومی اتحاد و سالمیت کی فضا کو مزید سازگار بنایا جا سکے۔ انھوں نے اس سلسلے میں اس سیمنار کو بہت اہم قرار دیا۔

تین دنوں سے جاری یہ سیمنار اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے بہت اہم تھا۔ اجلاس سید شریف الحسن نقوی سکریٹری اردو اکادمی کے شکریے پر اختتام پذیر ہوا۔



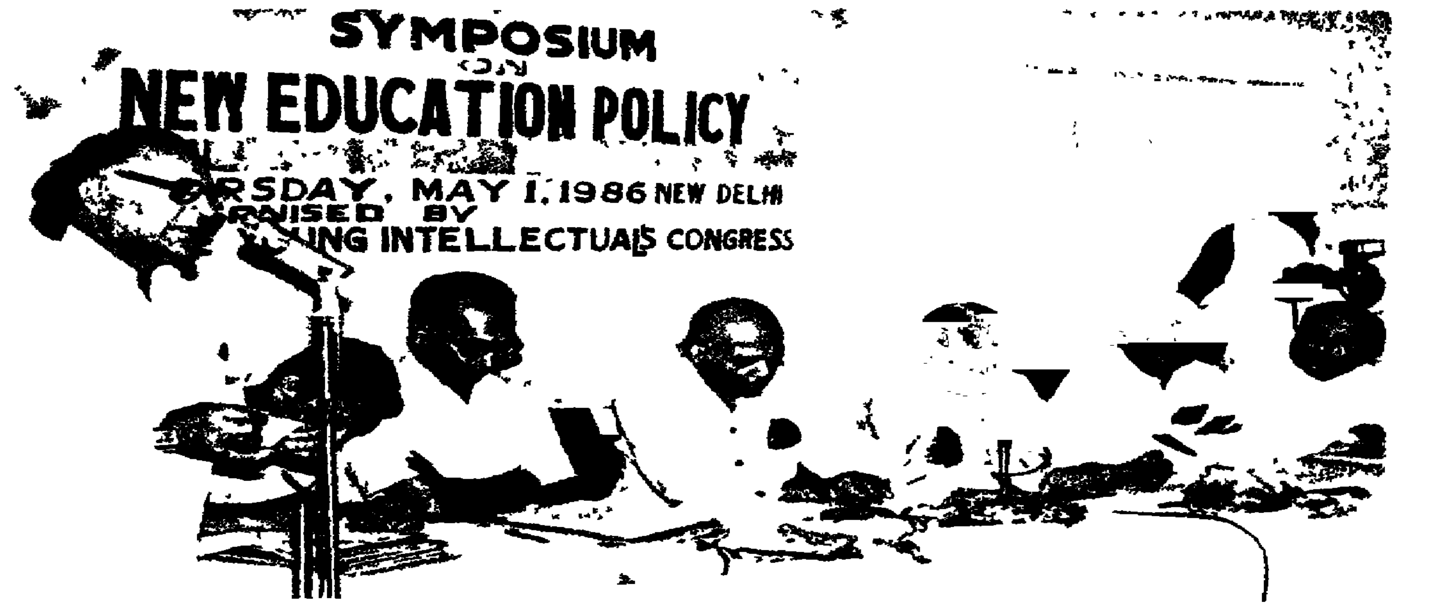

**اعلان**

تمام علمی و ادبی انجمنوں سے گزارش ہے
کہ وہ اپنی سرگرمیوں کی رپورٹ مع
تصاویر ارسال کریں (ادارہ)



اوما جوشی

# تعلیم بالغان: ضرورت و اہمیت




اکیسویں صدی کے نئے دور میں داخل ہونے سے پہلے پہلے تمام ہندوستانیوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا قومی مقصد ہمارے سامنے ہے۔ اسی لیے تعلیمی پالیسی کے نئے ڈھانچے میں تعلیم بالغان کو اولین اہمیت دی گئی ہے۔ مرکزی حکومت نے ایک زبردست منصوبہ کے تحت ملک بھر میں ۱۹۹۰ء سے قبل دو لاکھ نئے مرکز کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان مراکز کی زیادہ تعداد اُن ۹ ریاستوں میں ہوگی جو تعلیمی محاذ پر زیادہ پسماندہ ہیں اور ان مراکز میں سے نصف خواتین کے لیے مخصوص ہوں گے۔ مجموعی طور پر اس پروگرام کے تحت گیارہ کروڑ افراد کو تعلیم کی دولت سے مالا مال کیا جا سکے گا اور ظاہر ہے کہ ان کی غالب اکثریت دیہی آبادی پر مشتمل ہوگی۔ فی الحال پورے ملک میں تعلیم بالغان کے مراکز کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ نہیں۔ ان میں سے [illegible] ہزار خواتین کے لیے ہیں۔ ۸۴-۱۹۸۳ کے اعداد و شمار کے مطابق ان مرکزوں میں زیر تعلیم بالغوں کی تعداد ۵۲ لاکھ تھی۔ سرکاری نشانہ یہ ہے کہ ہر سال ۵۹ لاکھ نئے افراد کا داخلہ ہونا چاہیے، نیز یہ کہ ۱۹۹۰ء سے قبل ملک میں ۱۵ برس اور ۳۵ برس کے درمیان کی عمر والا کوئی شخص ناخواندہ نہ رہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ حکومت ہند نے اکتوبر ۱۹۷۸ء میں تعلیم بالغان کا پروگرام شروع کیا تھا اور یہ طے کیا گیا تھا کہ پانچ برس کے عرصے میں دس کروڑ اَن پڑھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھا یا جائے گا۔ اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ غیر رسمی انداز سے دیہی لوگوں کو ان کے گھر کے قریب، ان کی فرصت کے وقت میں، انہیں تعلیم دی جائے اور اس طرح ان کی دلچسپی برقرار رہے، تعلیم انہیں بوجھ نہ معلوم ہو، نیز یہ کہ اس تعلیم کا کسی نہ کسی سطح پر دیہی آبادی کے پیشوں مثلاً زراعت وغیرہ کے ساتھ بھی تعلق ہو تاکہ اس سے انہیں عملی زندگی میں بھی پورا پورا فیض ہو سکے۔ یہ تعلیم زرعی پیداوار میں اضافے میں مدد معاون ہو اور کسان و زرعی مزدور کو روایتی افلاس سے نجات مل سکے۔ اسی طرح صنعتی مزدوروں کے درمیان تعلیم بالغان کا خاص مقصد انہیں ان کی حرفت سے متعلق جانکاری فراہم کرانا ہو اور انہیں ایسی تدابیر سکھائی جائیں جن کے ذریعہ وہ اپنی پیداواری صلاحیت کو فروغ دے سکیں اور ان کی پُر مشقت زندگی کہیں زیادہ

بامعنیٰ ہو سکے۔

حکومت تعلیم بالغان کے سلسلے میں مخلص ہے۔ اس امر کا ثبوت یہ ہے کہ حرف شناسی کو بنیادی انسانی ضرورت تسلیم کیا گیا ہے، نیز حکومت کے ۲۰ نکاتی پروگرام میں بھی شامل ہے۔ اس میدان میں مرکز کی توجہ زیادہ تر زرعی، صنعتی و کاروباری تربیت کی جانب ہے اور درسی لوازمات کی فراہمی بھی اس کی ذمہ داری ہے — دوسری جانب ریاستیں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعہ اس پروگرام کو سماج کی نچلی سے نچلی سطح تک پہنچا کر اس معاملے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

اعداد و شمار مظہر ہیں کہ ۲۰۰۰ء تک دنیا بھر کی غیر تعلیم یافتہ آبادی ہندوستانیوں پر مشتمل ہوگی اور اس کے بعد کے ۲۰ سال کے دوران دنیا بھر کے ان پڑھوں میں ۱۵ کروڑ کا جو اضافہ ہوگا ان میں سے ۱۰ کروڑ ہندوستان میں ہوں گے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہندوستان میں ۵۷ ہزار گاؤں ایسے ہیں جہاں کوئی پرائمری اسکول تک نہیں ہے ملک کے تقریباً پانچ کروڑ بچے تعلیم کی نعمت سے یکسر محروم ہیں۔ ان میں سے سوا دو کروڑ سے زائد لڑکے اور ڈھائی کروڑ سے زائد لڑکیاں ہیں۔ یہ سبھی چھ سے گیارہ سال کے درمیان کی عمر کے ہیں۔ اگر یہی صورت رہی تو ظاہر ہے کہ یہ بچے بڑے ہو کر ان پڑھ بالغوں کی تعداد میں اضافہ کریں گے

ہر سطح پر بالکل مفت اور لازمی تعلیم کا تصور ابھی بہت دور کی بات ہے اور ۱۹۸۱ء کی مردم شماری سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر تعلیم یافتہ آبادی میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے — تعلیم بالغان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن یہی سچ ہے کہ اس کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کو عام نہیں بنایا جا سکتا یہ تو زیادہ سے زیادہ ایک مجبوری اقدام ہو سکتا ہے جہاں تک ایک مستحکم تعلیمی ڈھانچے کا سوال ہے تو اس کی تشکیل و تکمیل تو عام ابتدائی تعلیم کے نظام کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

ملک کے عوام کی اکثریت کی جانکاری میں اضافہ کرنے اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے لیے تعلیم بالغان ضروری ہے۔ اس کا کردار پابند وقت نصابی تعلیم سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا ایک خاص مقصد بالغ شہریوں کو ان عوامل سے واقف کرانا ہے جن کے سبب ان کی آزادانہ نشو و نما میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ایک عام غریب غیر تعلیم یافتہ شخص کے لیے تعلیم برائے تعلیم کی کوئی افادیت نہیں ہے اور اسے تعلیم سے صرف اسی وقت دلچسپی ہو سکتی ہے جبکہ یہ اس کے متعلقہ پیشے میں مددگار ثابت ہو

ہمارے ملک میں تعلیم بالغان کی تحریک کا دار و مدار زیادہ تر غیر سرکاری اداروں پر ہے جبکہ دیگر ترقی پذیر ممالک میں یہ ذمہ داری حکومتوں نے اپنے سر لے رکھی ہے یہ امر باعث مسرت ہے کہ ہماری حکومت نے بھی حالیہ برسوں میں اس سمت میں دلچسپی لی ہے۔

تعلیم بالغان کا مسئلہ اچھی خاصی بحث کا موضوع رہا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ حرف شناسی پر زور نہ دے کر ہمیں چاہیے کہ دوسرے طریقے اپنا کر عوام کو تعلیم دیں یعنی ان کے لیے جانکاری فراہم کریں۔ درسی نصاب کے علاوہ ٹی۔وی، ریڈیو، سنیما اور ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے دکھا اور سنا کر بھی بہت کچھ سکھایا جا سکتا ہے، لیکن اعلیٰ تعلیمی اور سیاسی سطح پر تعلیم کی ترغیب کا مسئلہ کافی اہمیت اختیار کر چکا ہے اور اس پر کافی غور و خوض ہو رہا ہے — ابھی تک کا تجربہ یہ ہے کہ رسمی تعلیم سے صرف مٹھی بھر لوگوں کو ہی فائدہ پہنچا ہے، بلکہ اس کے ذریعہ باقاعدہ تربیت یافتہ لوگوں کی تھوڑی سی تعداد اور تعلیم سے بے بہرہ لاکھوں کروڑوں لوگوں کے درمیان کی خلیج اور وسیع ہوئی ہے

تعلیم کے فقدان نے ہماری خواتین کی زندگی پر کافی برا اثر ڈالا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ جو عورتیں کارخانوں، کانوں، باغوں، ریلوے اور دیگر عوامی اداروں میں برسرکار ہیں انہیں تعلیم بالغان کے پروگرام میں شریک کیا جائے۔ سر دست صنعتی میدان میں روزگار سے لگی عورتوں (دیہات میں کام کرنے والیوں کا تو ذکر ہی کیا) کو بھی ایسے کاموں سے محروم رہنا پڑتا ہے جن میں تھوڑی بہت ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے، نتیجہ یہ کہ عورتوں کو معاوضہ بھی کم ملتا ہے اور کسی قسم کی تربیت کا بندوبست نہ ہونے کے سبب ان کے ترقیاتی مواقع کا راستہ بھی بند ہی رہتا ہے۔ غیر منظم زمروں مثلاً تعمیرات بیڑی سازی وغیرہ سے وابستہ خواتین کو اگر ذرا سی تربیت مل جائے تو ان کے حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ دیگر چھوٹے موٹے کاموں میں تو صورت حال اور بھی خراب ہے۔

خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے ضروری ہے کہ جس وقت تعلیم بالغان کا پروگرام چلے تو انہیں ان کے کام سے چھٹی دی جائے اور ان کی تدریس کا انتظام ان کے کارخانوں وغیرہ کے اندر ہی ہو اس سلسلے میں اگر حکومت کچھ مالی ترغیبات دے تو یہ کام آسان ہو سکتا ہے۔

مجموعی طور پر تعلیم بالغان کے سلسلے میں کافی منظم تحقیق اور جائزے کی ضرورت ہے تاکہ اس ضمن میں سبھی عوامل سامنے آ سکیں اور کوئی جامع طریقۂ کار وضع کیا جا سکے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ زیر تعلیم بالغ افراد صرف اس لیے پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ انہیں اس تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ضرورت ہے کہ تعلیم بالغان کو دلچسپ بنایا جائے اور ابتدائی حرف شناسی کے بعد انہیں وہی باتیں بتائی اور سکھائی جائیں جو ان کی دلچسپی کی ہوں۔ ان کی روزمرہ زندگی سے متعلق ہوں اور ان کے پیشے میں بھی فائدہ مند ثابت ہوں۔

تعلیم بالغان کی تحریک سے وابستہ مدرسوں کی تنظیم بھی بہت ضروری ہے ہمارے ملک میں زیادہ تر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے استادوں یا پھر تکنیکی اداروں کے ماہرین کو جز وقتی بنیادوں پر یا رضاکارانہ طور پر اس کام میں لگایا جاتا ہے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ استاد اپنے شاگردوں کو اپنی بات سمجھانے میں کامیاب نہیں ہو پاتا زیادہ تر استادوں کا تعلق شہری سے ہوتا ہے اور وہ دیہی باشندوں کی روزمرہ زبان اور ان کے محاورے میں انہیں اپنی بات نہیں سمجھا سکتے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ استادوں کی بھرتی اسی طبقے سے کی جائے جس کو انہیں تعلیم دینا ہے — اس کے ساتھ ہی درسی و نصابی لوازمات پر بھی وقتاً فوقتاً نظرثانی ہوتے رہنا چاہیے۔

قصہ مختصر، غیر رسمی تعلیم کی اہمیت کو یہ کہہ کر کم نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مقصد سماج کے کم اہم یا نچلے طبقے کو تعلیم دینا اور سکھانا پڑھانا ہے بلکہ اس کے لیے تو اور زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا دائرہ رسمی (اسکولی) تعلیم سے کہیں زیادہ وسیع ہے تعلیم بالغان کا مقصد محض حرف شناسی نہیں ہے اس کا مقصد لوگوں کو بیدار کرنا، گرد و پیش کے مسائل سے انہیں واقف کرانا اور ان کے شہری حقوق سے انہیں آگاہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو اچھا شہری ہوگا وہی اچھا رائے دہندہ بھی ثابت ہوگا اور ہمارے جمہوری نظام کے لیے یہ بہت ضروری ہے

ایک کہانی ناروے سے

تھور اوگے برنگس ویرو
ترجمہ:۔ ہرچرن چاولہ

# بے زبان

تھور آوگے برنگس ویرد کا جنم ۱۲ر نومبر ۱۹۳۹ء کو شی ان (SKIEN) میں ہوا۔ شی ان کے شہر کو ابسن کا بھی جنم استھان ہونے کا فخر حاصل ہے۔ جان بینگ (JAN BING) اور برنگس ویرو نے سائنس فکشن کی کافی کتابوں اور ڈراموں کے انتخاب شائع کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہانیوں کے سات مجموعوں اور بچوں کی ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں اور اکثر ریڈیو اور ٹی۔ وی کے لیے بھی لکھتے رہتے ہیں۔ آج کل ناروے کی راجدھانی اوسلو میں مقیم ہیں۔

گرجا کا خدمت گار خیرات کے ڈبے کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ آج بہت گرمی تھی۔ آج کے وعظ کا پادری نیا تھا، اور اسے اپنی آواز سننے کا بہت شوق تھا۔ وعظ کے دوران اگر کوئی اپنا دھیان ادھر اُدھر کیے بنا آدھی بند آنکھوں سے بیٹھ سکتا تھا تو وہ گرجا کا خدمت گار ہی تھا اور یہی اس کا روز کا معمول تھا۔

آج کا وعظ اٹھارویں باب کے بیسویں شعر پر مشتمل تھا۔ جس کا لب لباب تھا۔ "جہاں ست سنگ کے نام پر دو تین انسان ہوں، وہاں میں بھی موجود ہوتا ہوں۔"

اتنے میں گرجا کا دروازہ چرمرایا۔ خدمت گار کے ماتھے پر تیوریاں ہیں۔ اس نے سوچا ضرور کوئی نام رکھوانے والے لوگ ہوں گے، لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ وہاں دروازے کے بیچ ایک اونچا لمبا حبشی کھڑا تھا۔

"وحدت تیرے کی۔" خدمت گار نے کہا۔ "دیکھتے نہیں یہ چرچ سفید لوگوں کا ہے۔"

اُدھر سے کوئی جواب نہ پاکر منہ لٹکائے وہ آگے بڑھا۔ "تم باہر نکل جاؤ۔" خدمت گار نے اونچی آواز میں کہا۔ "تم ———— تم کالے کلوٹے باہر جاتے ہو کہ ————"

اس سب کے بیچ پادری اپنے وعظ میں مگن رہا مگر اس کے دو چار بار اوپر دیکھنے سے پتہ لگتا تھا کہ اُسے صورت حالات کا علم ہو گیا ہے۔ قطاروں میں بیٹھے لوگوں نے مڑ کر بھی دیکھ لیا تھا۔

حبشی بت بنا کھڑا رہا۔ اس نے آنکھیں جھپکے بغیر گرجا میں اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کی ایک کے بعد ایک سے ٹکراتی ہوئی آنکھیں پادری پر جا ٹکیں۔

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ پھر سب سے پہلے خدمت گار نے اچھل کر اس کا گلا جا دبوچا۔ اور ساتھ ہی چلایا۔ "تم ———— تم بے وقوف حبشی۔ چلے جاؤ یہاں سے کیا تم پڑھ نہیں سکتے۔ کیا تم نے باہر لکھا بورڈ نہیں دیکھا کہ یہ چرچ سفید لوگوں کے لیے ہے۔"

اس نے اجنبی حبشی کو کندھوں سے جھنجھوڑا اور باہر نکالنا چاہا مگر حبشی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ گرجا کے اندر ہل چل ہوئی۔ کچھ لوگ اپنی سیٹوں سے تھوڑا اوپر کو اٹھے۔ اتنے میں پادری اونچی آواز سے چلایا۔ "اچھا ہے کہ تم باہر چلے جاؤ۔" اس کے بعد اپنی نظریں فرش پر جھکاتے ہوئے اس نے کہا ————

"یہ چرچ سفید لوگوں کے لیے ہے اور کسی بھی دوسرے رنگ کے لوگوں کو اس کے اندر آنے کی اجازت نہیں۔" اندر بیٹھے لوگوں میں سے ایک نے اونچی آواز میں سوال کیا۔

خدمت گار نے اسے باہر نکالنے کی ایک اور کوشش کی۔ پیچھے والے بنچ پر بیٹھے لوگوں میں سے ایک دو آدمی اس کی مدد کو آگے بڑھے۔ "اسے پکڑ کر باہر نکالو۔" ایک طرف سے ایک لڑکی چلائی۔ "دیکھو یہ کس طرح ہم لوگوں کو گھور رہا ہے۔"

"اے خدا۔ اسے باہر نکال۔ حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔" ایک بوڑھی عورت بولی۔ "ہمیں خدا کے گھر میں بھی چین نصیب نہیں۔"

اُدھر سے ایک آدمی لپک کر حبشی کے پاس آگیا اور اس کی ٹھوڑی پر گھونسہ دے مارا۔ بولا۔ "تمہارے جیسے لوگ کار کے پیچھے باندھ کر کیچڑ میں گھسیٹنے کے لائق ہیں۔"

حبشی ویسا ہی پُرسکون کھڑا رہا۔

دوسرے نے ویسا ہی کیا جیسا پہلے نے کیا تھا۔ پھر گرجا میں بیٹھے سبھی لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

حبشی کی گردن سے خون کی ایک لکیر بہہ نکلی۔ پھر بھی اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

پادری نے مقدس کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔ "ہم خدا کے گھر میں ہیں۔" پھر رک کر وہ بولا۔ "ہمیں اسے پکڑ کر باہر لے جانا چاہیئے۔ آخر کب تک ہم یہ سب جاری رکھ سکتے ہیں۔"

خدمت گار نے دروازہ کھولا اور اپنے دونوں ساتھیوں کی مدد سے حبشی کو دھکیل کر باہر نکال دیا۔ آس پاس کے لوگوں نے اس منظر کو بڑی حیرانی سے دیکھا۔ جلد ہی گرجا کی سیڑھیوں پر ایک بھیڑ جمع ہو گئی۔

"کیا معاملہ ہے؟" لوگوں نے پوچھا۔

باقی صفحہ پر

سنگھ مترا شیل

# سنہ ۲۰۰۰ء کی دہلی

صبح چھ بجے، جماہیاں لیتے ہوئے بمشکل آپ اپنا بستر چھوڑتے ہیں۔ کھڑکی کا پردہ کھینچ کر باہر جھانکنے سے اچھا لگ رہا ہے کیونکہ آج اور دنوں کی بہ نسبت دھند کم ہے اور صرف دو ہی فٹ تک نہیں بلکہ تقریباً دس فٹ کی دوری تک صاف نظر آرہا ہے۔ صبح کی مصروفیات سے فارغ ہوکر آپ ساڑھے سات بجے تک بس اسٹینڈ پہنچ گئے ہیں۔ بسوں، کاروں اور دوسری گاڑیوں کی لمبی قطاریں، جن کے شور وغل اور دھویں وغیرہ سے آپ کے جوش وخروش میں کمی آجاتی ہے۔ بس پکڑنے کے لیے کشتی لڑنا اکثر آپ کو ادھر اُدھر کر دیتا ہے لیکن ہر حال میں آپ کو ساڑھے نو بجے تک دفتر تو پہنچنا ہی ہے۔ کسی نہ کسی طرح آپ دفتر تو وقت پر پہنچ جاتے ہیں لیکن آپ کا جوش پہلے ہی دھیما پڑ چکا ہے اور موڈ خراب ہے۔ یہ ۲۰۰۰ء میں، دہلی میں رہنے والے پانچ آدمیوں میں سے ہر چار آدمیوں کے روزانہ معمول کا آغاز ہے اور صرف اسی حد تک نہیں، جب آپ روزمرہ کے شور وغل اور ٹریفک کے سیلاب میں گھرے ہوں گے تب آپ کو فضائی آلودگی کا سامنا بھی کرنا پڑے گا جبکہ سانس لینا زندگی کی بجائے موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ زندگی میں مزید رنگ بھرنے کے لیے آپ کے خوابوں کی دہلی ۱۵ ملین افراد سے بھری پڑی ہوگی، جن میں سے آدھے لوگ جھونپڑیوں میں، ایک چوتھائی غیر قانونی اور خستہ ڈھانچوں میں رہائش رکھتے ہوں گے۔ جی ہاں، زندگی آج جیسی بالکل نہیں رہے گی، چاہے سڑکیں ہوں، ہوٹل ہوں، دھاتر یا پارک حتیٰ کہ آپ کا گھر ہی کیوں نہ ہو، اگر آپ دہلی ہوں جس وقت کہ دنیا سنہ ۲۰۰۰ء میں قدم رکھے گی۔

اگر شہری منصوبہ بندی کا نقطۂ آغاز اس خیال پر منحصر ہے کہ آبادی ہماری فکر سے بھی کہیں زیادہ بڑھے گی اور اگر منصوبہ بندی کا مرکزی مقصد ضروریات کو منصوبہ بند آبادکاری اور شہروں کے بنیادی ڈھانچے سے پورا کرنا ہے تو ان منصوبوں کی تعمیل سے کام کاج کے مزید مواقع پیدا ہوں گے اور منصوبہ بنانے والوں کے تصورات سے بھی زیادہ آبادی بڑھے گی۔ منصوبہ بنانے والے اور حکومت شاید جس بات کو نہیں سمجھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ دہلی کی متوقع آبادی کو بسانے کی کوشش آبادی کی افزائش کو کہیں زیادہ تیز تر کر دے گی، اس کی وجہ یہ ہے کہ شہری ترقی کے ساتھ ساتھ تعمیر کی رفتار بھی بہت تیزی سے بڑھ جائے گی اور زراعت کے علاوہ کوئی دوسرا اقتصادی عمل کام کاج کے اتنے زیادہ مواقع فراہم نہیں کرتا جتنا





کہ تعمیر کی صنعت کرتی ہے۔ اس طرح علاج نہ صرف بیماری کو ہوا دے گا بلکہ سرانجام بیمار کو ہی ختم کر ڈالے گا۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے میں صرف دہلی کے لیے جو مصارف مقرر کیے گئے ہیں مرکزی حکومت کی طرف سے پورے ملک کے دو سو درمیانے درجہ کے شہروں کی مجموعی رقم سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ ساتویں منصوبے میں دہلی کے لیے ۲۴۶۴ کروڑ روپے مختص کیا گیا ہے جبکہ باقی قومی مرکزی علاقہ کے لیے صرف ۳۵ کروڑ روپے طے کیے گئے ہیں۔ منصوبہ کار اور حکومت شاید یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ بڑھتی ہوئی آبادی کی آباد کاری کی کوشش اس کی مزید ترقی کے لیے محرک ثابت ہوگی۔ ایسی غلطی کی بنا پر پہلا ماسٹر پلان ناکام ہوا تھا۔ دہلی کے بہت سے خیر خواہوں کی تسلی کے لیے، اس حماقت کو کسی حد تک دوسرے منصوبہ میں درست کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ کام کاج کے مواقع فراہم کرنے والے کاروبار کو شہر سے باہر لے جانے کی ضرورت کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس میں مزید سرکاری دفاتر کھولنے سے بڑی اور چھوٹی صنعتوں میں سرمایہ کاری کی [illegible] کی حدود میں زیادہ [illegible] لیکن اس [illegible]

طرح حکومت اگر منصوبہ کاروں کے مشوروں پر عمل کرے گی تو تھوڑے ہی سے چیدہ چیدہ لوگوں کو شہر سے باہر لے جا سکے گی جبکہ نئے آنے والوں کے غول کے غول مزید داخل ہو جائیں گے۔

حکومت اپنے ماسٹر پلان کے ابتدائی مرحلہ میں دہلی کے لیے سنہ ۲۰۰۱ء میں ۱۳ ملین لوگوں کے لیے زمین اور شہری نوعیت کا بنیادی ڈھانچہ فراہم کرنے میں قطعی سنجیدہ ہے۔ اس طرح آبادی کو اس تعداد سے بڑھنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ سڑکوں، اوپری پلوں، نواحی ریلوں، بدر روؤں، پینے کا پانی، بجلی کے کنکشن اور تعمیر مکانات کا تو ذکر ہی کیا۔ ان سب کے لیے بنیادی ڈھانچوں کے لیے سرمایہ کاری کی وجہ سے دیہی علاقوں سے دہلی میں آنے والوں کا سیلاب سا امڈ پڑے گا۔ آبادی کا جغرافیائی یا مکانی طور پر نقل و حرکت کرنا اقتصادی منصوبہ کاروں کی براہ راست پریشانی کا باعث ہے، کیونکہ یہ معیشت میں آبادی کی تقسیم، پیدائش و اموات کی طاقتوں اور اقتصادی نیز سماجی تبدیلیوں کے دیگر پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ دہلی کے سلسلے میں موجودہ شہری علاقے آبادی کے بڑھنے اور حدود میں وسعت آنے کی وجہ سے زیادہ بڑے ہو گئے ہیں۔ نئے علاقے جو شہر ہو جانے کی حد تک [illegible] ہو گئے ہیں، اس کا سبب ان کی اپنی شہری [illegible] مرکزی حکومت واقعی دہلی مہانگر

کے علاقوں میں ایک ناقابل ضبط بڑے شہر کے وجود میں آنے کو روکنا چاہتی ہے تو اس کو اس حقیقت کا مقابلہ کرنا چاہیے جس سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔ اگر دہلی میں زیادہ روپیہ پھیلا دیا جائے گا، زیادہ لوگ دہلی کی طرف راغب ہوں گے۔ زیادہ اخراجات کا مطلب ہوگا، کام کاج کے زیادہ مواقع اس لحاظ سے دہلی میں ایشیاڈ ۸۲ء کا قائم ہونا ایک تباہ کن فیصلہ تھا جس کے اثر سے یہ شہر ہرگز چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ آج دہلی کے ان غیر متوازن معاملات سے نپٹنے کے لیے سب سے پہلے دہلی میٹروپولیٹن ایریا کے باہر گرد و نواحی شہروں کے فروغ پر بہت بڑی مقدار میں روپیہ لگانا ضروری ہے۔ دوسرے نمبر پر ان شہروں اور دہلی کو ایک بہتر ٹرانسپورٹ کے نظام سے جوڑنا اور ٹیلی فون اور دوسری مواصلاتی سہولتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مستحکم کرنا اہم ہے

ان پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے، شہر میں کام کاج کے مواقع پیدا ہونے سے روکے جا سکتے ہیں۔ جب تک حکومت اس بات کو محسوس نہیں کرتی، شہر کی توسیع کو روکنے یا اسے دوسری جانب موڑ دینے کی کوئی توقع نظر نہیں آتی۔ چونکہ بنیادی ڈھانچے کے اخراجات شہری ترقی کا پہلا مرحلہ ہوتے ہیں، اس لیے منصوبہ بندی کا اصل مقصد، تمام مجوزہ سرمایہ کاری کو دہلی کے شہری علاقے سے نواحی شہروں میں اور نیشنل کیپٹل ریجن کے دیگر پرکشش

مقامات میں منتقل کرنا ہونا چاہیئے۔ ان نواحی شہروں میں سے ہر ایک میں ایک کاروباری مرکزی ضلع اور خرید و فروخت نیز تفریح کا علاقہ ہونا چاہیئے، جو کہ دہلی کے جدید تجارتی ضلعوں سے نسبتاً بہتر ہو۔ اس طرح شہر اور نواحی شہروں کے دو طرفہ ٹریفک پر قابو پانا ممکن ہو سکے گا جو کہ روز افزوں راجدھانی سے مربوط ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی بڑے شہر کی ابتداء ہے جو اب وجود میں آ رہا ہے۔ دوسرے ماسٹر پلان کا مسودہ، پہلے ہی کی طرح اس امر کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہا ہے اور اس طرح شہری ٹرانسپورٹ اس بہت بڑے شہر کو مضبوطی کے ساتھ ایک بہت بڑے یک مرکزی شہر میں جکڑ لے گی۔ یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ شہر کے بنیادی ڈھانچے پر سرمایہ کاری سے بچاؤ نہ تو عملی ہے اور نہ ہی امکان پذیر۔ اس لیے لوگوں کی آمد کو منحرف نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ شہر میں آبادی کے قدرتی اضافے کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ پہلی بات سے انکار یا دوسری چیز کو ترک کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ بہرحال بہترین پالیسیوں کے نفاذ سے جو توقع ممکن ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ شہر کی آبادی کی شرحِ اضافہ میں پانچ فیصد سالانہ سے تین فیصد سالانہ طور پر کمی واقع ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سن دو ہزار تک آبادی ۱۳ ملین کے مقابلے گیارہ ملین کے قریب ہوگی جبکہ منصوبہ کاروں کی توقعات کے مطابق یہ ۱۵ ملین ہوگی۔ اگر اگلے دو منصوبوں کے دوران منصوبے کے حقیقی اخراجات کی سطح کو بڑھایا نہیں گیا تو ۲۰۰۰ء تک ۱۳ ملین لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کی بدولت ڈھائی ملین لوگوں کا شہر کی آبادی میں مزید اضافہ ہوگا۔

گیارہ ملین لوگوں کی آبادکاری، اس وقت جبکہ آبادی کی شرحِ افزائش سالانہ طور پر ۳ فیصد کم ہو جاتی ہے، یقیناً آبادی کی کثافت کو بڑھا دے گی۔ آج دہلی جو کہ بڑے بڑے پارکوں اور کھلی جگہوں پر مشتمل ہے، ساڑھے چھ ملین لوگوں کی آبادی کا حامل ہے جس سے یہاں اوسطاً شہری کثافت ۱۵۰ فی ہیکٹر کی ہو جاتی ہے۔ گیارہ ملین لوگوں کی آبادکاری کے لیے شہری کثافت ۲۴۰ فی ہیکٹر تک بڑھ جائے گی۔ اس طرح دہلی گنجان آباد شہر بن جائے گا لیکن پھر بھی انتہائی بھیڑ بھاڑ والا شہر نہیں ہوگا اس کے برخلاف بمبئی جو پہلے ہی انتہائی بھیڑ بھاڑ والا شہر ہے، وہاں ۱۹۸۱ء میں شہری کثافت ۴۳۸ فی ہیکٹر تھی، جو شاید آج ۷۰۰ تک پہنچ رہی ہے۔ اس طرح منصوبہ بندی کی توجہ کا مرکز آبادکاری ہوگی۔ اس وقت حکومت کو تین کام فوری طور پر کرنے ہوں گے۔ پہلا کام تمام موجودہ غیر قانونی جھگی جھونپڑی والے کالونیوں کی حالت سدھارنا اور انہیں منظور کرنا اور شہر کے غریب لوگوں کو مکانات بنانے کے لیے زمین مہیا کرنا۔ دوسرا کام اوسط درجے کے ملازمت پیشہ تنخواہی خاندانوں کی مکاناتی ضرورتوں کو پورا کرنا جن کے پاس نہ تو زمین خریدنے کے لیے سرمایہ ہوتا ہے اور نہ ہی اتنی آمدنی رکھتے ہیں کہ کرایوں پر رہ سکیں۔ تیسرا کام دہلی کی ایک POLYNODAL شہر کی حیثیت سے فروغ و ترقی جس کے ہر حصے میں تجارتی تفریحی اور رہائشی حصے ہوں گے۔ تاکہ ان حصوں کے مابین نقل و حمل کی دشواریاں کم سے کم ہوں۔

ایک مؤثر مواصلاتی نظام کا فقدان لامرکزیت کی راہ میں ایک روڑہ ہے اور یہ نواحی





شہروں کے مواصلاتی نظام کو راجدھانی کے مواصلاتی نظام سے منسلک کرنے کی بدولت ممکن ہو سکتا ہے دہلی میں نہ صرف سیدھے راستوں اور نواحی ریلوں کی ضرورت ہے بلکہ دہلی اور دوسرے شہروں و قصبوں کے درمیان بھی جو کہ نیشنل کیپٹل ریجن ایریا کے تحت آتے ہیں' ان کا ہونا ضروری ہے تاکہ تجارتی آمدورفت تیز اور آسان ہو جائے۔ یہ بات قابل ذکر ہوگی کہ روز کے سفر کرنے والوں کے مقابلے میں جو کہ اپنے کام پر آنے یا جانے کے لیے مجبور ہیں تجارتی سفر کے لیے کسی سرکاری امداد کی ضرورت نہیں ہوگی ٹرانسپورٹ کے اخراجات کو بڑی حد تک کم کیا جا سکتا ہے اگر موجودہ شہر کے اندر روزگار کے مواقع لامرکزیت کے زوردار پروگراموں کے تحت لائے جائیں۔

۱۹۵۹ء کا ماسٹر پلان میں ایک متعدد مراکز والے شہر کا منصوبہ شامل تھا جس میں دفاتر اور تجارتی کام کاج کو تقریباً ایک درجن تجارتی اضلاع میں پھیلانا مقصود تھا۔ اگرچہ ان میں سے اکثر جیسے نہرو پلیس، بشونت پلیس اور راجندر پلیس بن چکے ہیں اور شہر میں زیادہ بھیڑ کے وقت ٹریفک کو یکساں کرنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں پھر بھی ٹریفک کی مقدار میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی ہے اس کی ایک جزوی وجہ تو یہ ہے کہ ڈی ڈی اے ان تجارتی اضلاع کے آس پاس کم آمدنی والے کارکنوں کے لیے رہائشی کالونی مہیا کرنے سے قاصر رہی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کرایہ کنٹرول قوانین و ٹیکسوں نے تقریباً یہ ناممکن بنا دیا ہے کہ کوئی فرد شہر کے ایک حصے میں اپنا گھر یا جائداد کو کرایہ پر دیدے یا بیچ دے اور اپنے کام کے نزدیکی علاقے میں جا کر بس جائے

دہلی کی توسیع کو محدود کر دینے کے لیے ایک دوسری اہم پالیسی یہ ہے کہ خود شہر کے بڑھنے پر پابندیاں لگا دی جائیں۔ ۱۹۶۱ء کے ماسٹر پلان کے تحت شہر کے فروغ کے لیے مقرر کردہ ۱۰۹۰۰۰ ایکڑ زمین کے گرد ایک سبز پٹی تشکیل دی گئی تھی جس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ماحولیات کو محفوظ کیا جائے (کیونکہ یہ تصور چھٹی دہائی کے آخری برسوں میں موجود ہی نہیں تھا) بلکہ اس کا مقصد تھا دہلی کو مادی طور سے فریدآباد، گوڑگانوہ اور ان کے منسلک چھوٹے شہروں سے الگ رکھا جائے۔

آج یہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ضروری ہے کہ سبز پٹی کی ماہیت کو محفوظ رکھا جائے کیونکہ بدرپور فریدآباد، بلبھ گڑھ، گوڑگانوہ، سونی پت اور غازی آباد سے متصل ہو جانا بہت ہی عنقریب نظر آیا ہے۔ پھر بھی ۳۷،۵۰۰ ایکڑ زمین کا بیشتر حصہ' جو دوسرے ماسٹر پلان کے مسودہ کے مطابق تعمیر کاری کے لیے مقصود ہے وہ اسی سبز پٹی میں موجود ہے اور ڈی ڈی اے نے سبز پٹی کے باہر بھی ۶۵۰ رہائشی یونٹوں کی تعمیر چار مختلف کامپلیکسوں میں پہلے سے ہی شروع کر دی ہے۔

دوسرا کام یہ ہونا چاہیے کہ اپنی تمام تر کوشش کو موجودہ شہر کی کام تر ترقی میں صرف کرے اور آبادی کی کثافت کو ۱۵۰ فی ایکڑ زمین کے حساب سے شروع کیا جائے۔ یہ تبھی ممکن ہو سکے گا جب شہر کے اطراف کی سبز پٹی کو برباد کرنے کے بجائے اس کے تحفظ کی طرف دھیان دیا جائے۔

اس لیے دہلی کے لیے ایک ایسی ترقیاتی پالیسی کی ضرورت ہے جو آج تک اپنائی گئی پالیسی سے مختلف ہو۔

محمد [illegible] قریشی

# یہ فلمی مقدمے بازی کیوں؟

اکثر دیکھنے اور سننے میں آتا ہے کہ کوئی فلم اچھی خاصی چل رہی ہے۔ لوگوں کا ایک ہجوم سنیما ہال کے باہر جمع ہے تب ہی ملک کے کسی کونے سے کوئی آدمی اس فلم کے خلاف دعویٰ دائر کر دیتا ہے۔ اور عدالت سے حکم نامہ لے کر فوراً ہی اس فلم کو رکوانے کی کوشش کرتا ہے۔ زیادہ تر صورت

کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ تیسرا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ فلاں فلم ایک خاص مذہب یا اس کے ماننے والوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتی ہے۔ یہ مقدمات کوئی سیاسی لیڈر، سوشل ورکر، وکیل، صحافی یا کوئی بھی عام آدمی دائر کر سکتا ہے۔ اور صرف تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے فلم کے پروڈیوسر

کے حق میں [illegible] خلاف بھی ہو سکتا ہے مگر ایک حقیقت ہے کہ ان [illegible] زیادہ [illegible] نہیں ہوتا۔

[illegible] سلطان [illegible] کی فلم [illegible] سو گیٹ [illegible] کے خلاف [illegible] تھا [illegible] لوگ پھر لوک [illegible] اور [illegible] کی نمائش پر پابندی کی مانگ کی گئی تھی۔ [illegible] اٹھائے گئے۔ ان مقدموں [illegible] فلم [illegible] پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے [illegible] کا پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے اور وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ [illegible] انجمن الگ ہوتی ہے۔ کبھی [illegible] کر فلم والوں کے لیے اپنی مشغولیت کی وجہ سے [illegible] عدالت میں حاضر ہونا محال ہے [illegible] جلد کسی بھی قیمت پر معاملے کو ختم [illegible] کی کوشش کرتے ہیں۔

[illegible] فلم والوں کو عدالت میں طلب کرانے کا سلسلہ [illegible] سے جاری ہے روز ہی کوئی نہ کوئی مقدمہ [illegible] کسی نہ کسی فلم پر دائر ہوتا رہتا ہے، لیکن [illegible] کافی دلچسپ کہانی ہے جنھیں لوگ عرصہ [illegible] نہیں بھول سکے۔

راجکپور کی فلم "ستیم شیوم سندرم" کے خلاف دلی، [illegible] جبل پور اور گجرات میں عریانیت کے الزام میں مقدمے دائر کیے گئے۔ صرف راجکپور ہی نہیں بلکہ فلم کے ہیرو ششی کپور، اور ہیروئن زینت امان کو بھی عدالت میں بلوانے کا سامان کر دیا گیا۔ ان مقدمات میں قانون کے مطابق اگر پوری سزا ہوتی تو سات سال قید اور پانچ ہزار روپیہ جرمانہ، ہر ایک کو بھگتنا پڑتا۔ ورنہ [illegible] کی قید اور دو ہزار روپیہ جرمانہ تو تھا ہی۔ یہ مقدمات ۱۹۷۸ میں شروع ہوئے۔ جموں کے ایک [illegible] کیا تھا۔ راجکپور نے مشہور وکیل شیام کیشوانی کی خدمات حاصل کیں جنھوں نے جموں جا کر راجکپور اور دوسرے لوگوں کے خلاف [illegible] وارنٹ جاری ہونے سے پہلے ایک اپیل دائر کر دی۔ یہ اپیل منظور کر لی گئی۔ اس وقت تک [illegible] مقدمات دلی، گجرات اور بہار سے دائر کر دیے گئے [illegible] راجکپور نے [illegible] میں اپیل کی اور [illegible] تک گئے۔

راجکپور [illegible]



[illegible] عدالت سے [illegible] پاتا اس [illegible] یا [illegible] کی فلم [illegible] خلاف [illegible] یہاں اس بات سے [illegible] کہ یہ فلم کیسی تھی لیکن [illegible] عدالت میں چلا گیا۔

[illegible] کے مقدمات [illegible] ہوتا ہے کہ فلاں فلم میں [illegible] جن سے عام [illegible] دوسرا الزام یہ ہوتا ہے کہ [illegible] کے درمیان نفرت اور کشیدگی

ہدایت کار [illegible] کسی [illegible] کر سکتا ہے۔

یہ [illegible] کے لوگوں [illegible] مفاد عامہ میں دائر کیے جا[illegible] ان مقدمات کی ایک نوعیت اور بھی ہوتی ہے جو مصنفین کے ذریعہ دائر کیے جاتے ہیں۔ کسی بھی فلم کی کہانی کے مرکزی خیال کو، مختلف حصوں یا کرداروں کو، اپنی کسی بھی تحریر سے نقل کرنے کا الزام لگاتے ہوئے ہندوستان کا کوئی بھی مصنف، کسی بھی فلم کے پروڈیوسر پر مقدمہ دائر کر دیتا ہے۔ کچھ دن تک ان کی خبر گرم رہتی ہے پھر خاموشی چھا جاتی ہے [illegible]

...گئی تاش کی اور سنسر نے اسے منظوری
...سنسر اگر چاہتا تو اس فلم پر پابندی
...سنسر بورڈ ایک سرکاری ادارہ ہے اور سنسر
...کے بعد فلم ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔
...سب سے دلچسپ مقدمہ فلم ستیہ
...ان پر بس" پر دائر کیا گیا تھا۔

لباس استعمال کیا ہے جو ہندوستانی تہذیب کے خلاف ہے اور قومی روایات کی توہین کے باعث ہیں ان اداکاروں کو سزا ملنی چاہیے۔

یہ دلچسپ مقدمہ عدالت نے خارج کر دیا طوالت کی سے دوسری عدالتوں میں بھی یہ مقدمہ دائر کیا اور سب نے اسے خارج کر دیا۔ آخر میں کلکتہ ہائی کورٹ نے ایک



مقدمہ ایک مارواڑی نے کلکتہ کی ایک عدالت میں ۱۹۷۷ میں فلم کی نمائش کے ایک ہفتہ بعد دائر کیا تھا۔ بعد میں اس نے ملک کے مختلف حصوں سے بار بار مقدمے دائر کیے۔ اس مقدمہ میں فلمساز، ہدایت کار، شکتی سامنت کے ساتھ ساتھ شمی کپور، شرمیلا ٹیگور اور پران کو بھی کھینچا گیا تھا۔ مارواڑی کا الزام تھا کہ فلم میں ان تینوں اداکاروں نے جو

حکم جاری کیا کہ اب ... اگر اب کہیں بھی مقدمہ دائر کرے تو اسے عدالتی حکم سے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ آج کل جو مقدمہ کافی شہرت حاصل کر رہا ہے وہ ہے "کہانی پھول وتی کی" کا۔ اسے دائر کیا ہے پھولن دیوی نے جو آج کل گوالیار جیل میں ہے۔ اس کے خلاف کئی مقدمے ہیں۔ مگر اب تک کسی بھی کیس میں اسے سزا نہیں ہوئی ہے

اس پر وہ ایک آزاد شہری کی طرح اپنے حق اور عزت کے لیے لڑ سکتی ہے۔ پھولن دیوی کا الزام ہے کہ "کہانی پھولن وتی" کی میں اس کی ہتک عزت ہوتی ہے اسے ایک ڈاکو کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جس سے اس کے دوستوں، رشتہ داروں اور عوام کی نگاہ میں اس کی عزت کم ہو گئی ہے۔ پھولن دیوی نے فلم کے ضبط کیے جانے اور جلانے کا مطالبہ بھی کیا ہے۔

یہ مقدمہ ۲۹ اگست ۸۵ کو دائر کیا گیا جس میں فلمساز گیتا رائے ہدایت کار اشوک رائے، ہیروئن ریتا بھادڑی اداکارہ پدما ترائن، پدما کھنہ، سریش اوبرائے، جانے کرپی اور جانکی داس کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے گئے اب یہ مقدمہ جبل پور کی عدالت میں زیر سماعت ہے۔ "رام تیری گنگا میلی" پر پابندی لگانے کے سلسلے میں بھی خاصہ شور اٹھا مگر اب وہ دب چکا ہے۔

مصنفین کے ذریعے کہانی کے سلسلے میں دعوی کرنے کی بھی بہت سی مثالیں ہیں جن میں "وقت"، "دہار یار" اور "نکاح" کے معاملے کافی مشہور ہوئے ان تمام لوگوں نے اپنی کہانی کی چوری کی شکایت کرتے ہوئے ہرجانے کی مانگ کی تھی۔ بعض ہدایت کاروں کا خیال ہے کہ یہ مقدمے عام طور پر ہدایت کار کو تنگ کرنے کے لیے ہی دائر کیے جاتے ہیں۔ بی آر چوپڑا کی رائے میں ایسے معاملات کو پہلے "فلم رائٹرس ایسوسی ایشن" کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے۔

گزشتہ دنوں اس قسم کا ایک بڑا دلچسپ مقدمہ فلم "بہے کی دھارا" کے فلمساز اور مصنف منو بھنڈاری کے درمیان چلا۔ مصنف کا الزام تھا کہ فلمساز نے فلم کی کہانی کا مرکزی خیال ان کے ناول "آپ کا بنٹی" سے لیا ہے بلکہ اصل کہانی کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ بہر حال فیصلہ فلمساز کے حق میں ہوا اور اب یہ فلم نمائش کے لیے پیش کی جانے والی ہے۔

بی آر چوپڑا کا کہنا ہے کہ فلم کی کامیابی سے بھی کچھ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ فلم والے خود بھی زبردست شو بازی میں یقین رکھتے ہیں اور شہرت حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے طریقے اپناتے رہتے ہیں۔ مگر کچھ لوگوں نے "نہلے پر دہلا" والی مثل کے مصداق ان کا ہتھیار خود انہیں کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ انہیں مہرہ بناتے ہیں، شہرت تو حاصل کرتے ہی ہیں، اگر داؤ لگ جائے تو پیسہ بٹورنے سے بھی نہیں چوکتے۔

ایم۔ ایل۔ چند پانڈے

# سوپن سُندری سے ایک مُلاقات

سوال:۔ آپ ہندوستان میں آج رقص کے منظر نامے کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہیں۔ خاص طور پر ۱۹۸۶ء میں کیا حال رہا؟۔ کچھ رجحانات، کچھ تجربات اور کچھ روایات کے احیاء کے بارے میں بتائیے۔

جواب:۔ ۱۹۸۶ء میں ہندوستان میں کلاسیکی رقص کے رجحانات میں خاصی کمی آئی ہے۔ اس دوران زیادہ زور اس بات پر رہا کہ، بڑی بڑی باتیں سوچو، بڑی بڑی باتیں کرو، اور شاندار شو کرو۔ یہی رویّہ ہندوستان میں تھا اور یہی دنیا بھر کے لیے تھا، اور ٹھیک بھی ہے، کیونکہ اس طرح کم سے کم عوام کی توجہ تو اس طرف مبذول ہوتی ہے ثقافت کی اہمیت لوگوں پر اجاگر ہوتی ہے۔ اور کیا چاہیئے۔

میں پوچھتی ہوں کہ عوام میں سے کوئی مجھے یہ بتانے کی زحمت کریگا کہ وہ آخر ہم ثقافتی فنکاروں سے کیا چاہتے ہیں۔ کیا ثقافت کی ٹھیکیداری صرف ہماری ہے۔ ہمارے عوام اتنے خاموش اور بے زبان کیوں ہیں؟ آخر ہمارے اخبارات، بلکہ سبھی ذرائع ابلاغ لوگوں کو ہر معاملے میں ملوث کرنے کے لئے موجود ہیں۔ لہٰذا عوام کو ثقافت کے بارے میں بھی اپنی رائے قائم کرنی چاہئے۔ اپنی ضروریات کا اندازہ لگانا چاہئے۔ اور اس سلسلے میں مطالبات بھی سامنے رکھنے چاہئیں۔ میں تو صرف فنکاروں کی ہی نمائندگی کر سکتی ہوں اور اس ضمن میں بھی میرا ساتھ دینے والے زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ کیونکہ بیشتر فنکار اور خصوصاً رقاص زبان کھولنا پسند نہیں کرتے یا یوں کہنا چاہیئے کہ وہ اپنی بات کہنے پر قادر ہی نہیں ہیں۔ مگر میں اپنی بات کہنا چاہتی ہوں۔ مفقود ہوتے ہوئے سیاحت اور ناظرین کے سلسلے میں اپنی تشویش ظاہر کرنا چاہتی ہوں۔ اور مجھے اس سلسلے میں بھی شدید تشویش ہے کہ معیاری ثقافتی پروگراموں کے لئے سرمایہ کی کمی ہمیشہ رہتی ہے، جبکہ پروگراموں کی تشہیر پر ہونے والے اخراجات میں زبردست اضافہ ہو چکا ہے۔ اور تشویش کی سب سے بڑی وجہ ہے گرتا ہوا معیار، عوام کی پسند کا معیار، اور اسی وجہ سے فن کی سطح بھی گرتی جا رہی ہے۔ کلاسیکی رقص پر بہت برا اثر پڑ



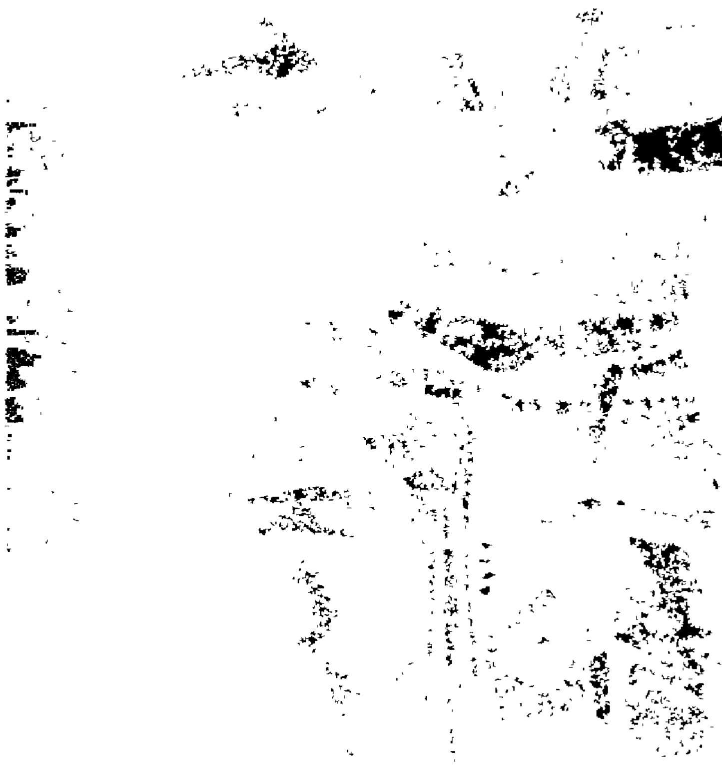
رہا ہے۔ یہ خیال مجھے رہ رہ کر پریشان کرتا ہے کہ اگر فن کا معیار اسی طرح سے سطحیت کی نذر ہوتا گیا تو انجام کیا ہوگا؟ پھر وہ چند ماہر رقاص کہاں جائیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو صرف اور صرف فن کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم فن رقص کی صحت کی حفاظت کے لئے بھی ایک مرکز کھولیں؟

سوال:۔ آج کے ہمارے ملک کے حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی فنکار رقص کو اپنا مستقل مشغلہ بنا کر گذر بسر کر سکتا ہے؟ اس سلسلے میں پیشہ ورانہ دقتیں کیا ہیں؟

جواب:۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ کسی رقاص کو مستقل کام ملتا رہے گا۔ اور اسے معاشی تحفظ حاصل ہو سکے گا۔ کیونکہ ہم رقاصوں کی کوئی ایجنسی یا ادارہ تو ہے نہیں جو ہمارے مفادات کو فروغ دینے کے لئے کام کریں، اور معاہداتی بنیاد پر ہمیں پروگرام دلائیں۔ اس صورت میں کھلا میدان ہے، جس میں ضروری نہیں کہ کامیابی بہترین اور لائق رقاص ہی کے ہاتھ لگے۔ بلکہ یہاں جیت ان کی ہوتی ہے جن کے پاس دوسرے ہتھیار بھی ہوں، مثلاً سیاسی اثر و رسوخ، درمیانی لوگوں کی مٹھی گرم کرنے کی اہلیت ہو، موقع پرستی کی لیاقت ہو، تھوڑی سی جارحیت ہو، سماجی رابطے ہوں جان پہچان اور تعلقات ہوں۔ جوڑ توڑ کرنا آتا ہو، اب اگر کوئی ایسا شخص میدان میں آتا ہے، جس کے پاس یہ تمام چیزیں نہیں ہیں تو تب پھر سارا معاملہ صرف قسمت کے ہاتھ ہے اور میرا تعلق اسی آخری خانے سے ہے، اسی لئے میں سب کو پہچانتی ہوں اور آزادانہ رائے بھی دے سکتی ہوں۔ قصہ مختصر معاملہ بہت سخت ہے یہاں عورتوں کے لئے اور بھی مشکل ہے۔ اس میدان میں وہی لوگ ٹک سکتے ہیں۔ جن کی فنکارانہ طبیعت انہیں اس کے لئے مجبور کرتی ہے۔ نیز جو اخلاقی و جذباتی قوتوں سے مالا مال ہیں۔ زیادہ تر لوگ بس ایک دو راؤنڈ کے بعد ہی ہمت ہار جاتے ہیں۔

میرے لئے عوام کی پسند اور ان کی تعریف و توصیف ہی سب سے بڑا انعام ہے، یہی جذبہ مجھے میدان میں بنے رہنے کی طاقت بخشتا ہے، اگرچہ سماجی وقار اور مرتبہ و عزت بھی ملتی ہے اگر میری نظر میں ان چیزوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ فنکار جذباتی ہوتا ہے۔ عوام کی



[illegible] زندگی کی دولت ہے۔ میں اپنے [illegible]
انہیں جو الہامی مسرت بخشتی [illegible] وہ
مجھے حوصلہ دیتے ہیں۔

سوال:- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ استاد شاگرد کے رشتے کی روایت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کیا اس سے بھی کلاسیکی رقص کا معیار مجروح ہوا ہے؟

جواب:- جہاں تک کلاسیکی رقص کا سوال ہے تو استاد اور شاگرد کے باہمی رشتے کی روایت کب کی ختم ہو چکی ہے۔ آج اگر کوئی یہ کہے کہ وہ اسی روایت پر عامل ہے تو سمجھئے کہ وہ غلط [illegible] ہے۔ آج ہر استاد معاوضہ [illegible] مقرر کرتا ہے، مگر [illegible] گھنٹوں [illegible] استاد اپنے طالب علموں [illegible] ایک کو اپنی مہربانی کے لئے [illegible] انہیں طرح طرح کے کھوٹے [illegible] ہیں۔ ایسے کھوٹے جوان کے پیشروؤں نے شاید پہلے کبھی نہ کئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ استاد، شاگرد کا رشتہ تو اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب رقص کے فن کو طوائفوں کی نذر کر دیا گیا۔ اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے آج کے شاگرد، نہ تو گرو کے پاس رہ کر اس کی خدمت کرتے ہیں، نہ اس کے کپڑے دھوتے ہیں، نہ اس کے گھر کے برتن دھوتے ہیں، آج کے شاگردوں کے لئے شاید یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح استاد کے حوالے کر دیں، آج تو پوری دنیا کے فنکاروں کا مزاج بدل رہا ہے۔ نفسیات بدل رہی ہے جہاں تک میرا سوال ہے تو میں چونکہ اس صدی کے ایک اہم موڑ پر پیدا ہوئی، اور آج کے حالات میں زندگی بسر کر رہی ہوں، پہلے انسان کی حیثیت سے، پھر فنکار کی حیثیت سے، پھر کیف میں لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ ایک بڑی [illegible] آپ میں ایک [illegible]

سوال:- آج کے دور [illegible] کے موزوں ہیں [illegible] خاص تجربہ ہے۔ وہ آج [illegible] کے سامنے گم ہو کر رہ گیا ہے [illegible] میں کیا رقص کے [illegible] تھیٹر یا [illegible] بڑے بڑے تھیٹر ہالوں نے رقص کو کسی طور پر متاثر کیا ہے کیونکہ [illegible] کی آخری قطار میں بیٹھے ناظرین رقص سے کیا خاک لطف اندوز ہوسکتے ہوں گے۔

جواب:- [illegible]

ہے۔ بلکہ کلاسیکی رقص میں تو [illegible] ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا [illegible] موقع، حاضرین اور [illegible] پروگرام کی [illegible] مناسبت سے [illegible]

اسی سماجی احساس کا حصہ ہے۔ تاہم بیشتر فنکار اس معاملے میں کامیاب نہیں ہیں۔ کیونکہ انہوں نے رقص کے ایک ہی دو پہلوؤں پر زور دیا ہے۔ اور اسی میں مہارت حاصل کی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ فنکار صرف تیز رفتار رقص کے ہی ماہر ہوتے ہیں۔ کچھ ابھینے (اداکاری) کے ماہر ہوتے ہیں۔ کچھ بڑی چھلانگ اور ایک بڑے دائرے میں حرکت کے ماہر ہوتے ہیں۔ کچھ نے جسمانی شعبدہ بازی کو اپنی خصوصیت بنایا ہے۔ سطحی طور پر یہ تمام فنکار اپنی اپنی جگہ کامیاب ہیں۔ لیکن جہاں تک فن کا سوال ہے تو انہوں نے کافی سمجھوتے کئے ہیں۔ لہٰذا اب اگر رقص بازی گری بن کر رہ گیا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ شعبدہ بازی حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس میں تعیشہ بال کا یا۔ تماشائیوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمیں چھوٹے اور بڑے دونوں قسم کے تھیٹروں کی ضرورت ہے۔ پروگرام منتظمین اور رقاص دونوں ہی کو اپنی انفرادی کاوشوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے تاکہ یہ پروگرام مثالی بن سکے۔

سوال:۔ جہاں تک مرکزی خیال کا سوال ہے تو رقص صرف ایک دائرے کے اندر ہی گھوم رہا ہے یعنی رادھا کرشن سے ہجا مارکرشن تک ——

آپ کے خیال میں کیا یہ خیالات اب فرسودہ ہو کر نہیں رہ گئے ہیں، یعنی قصہ پارینہ، اور آج کے ناظرین دور جدید کے ناظرین ہیں، اسی لئے وہ ان باسی پروگراموں میں دلچسپی نہیں لے پاتے لہٰذا کیوں نہ جدید خیالات کو فروغ دیا جائے؟ کیا اس رویہ کو اپنانے سے رقص کی کلاسیکیت پر زد پڑے گی۔

جواب:۔ سرسری طور پر تو میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ رادھا کرشن جیسے بنیادی خیال اب فرسودہ ہو چکے ہیں لیکن یہ اس بات پر بھی تو منحصر ہے کہ کوئی فنکار ان خیالات کو کس سطح پر پیش کرتا ہے۔ ان کی تشریح کس طرح کرتا ہے۔ اگر آپ فنکاروں کی کارکردگی کا جائزہ تفصیل سے اور قریب سے لیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ دراصل خیال باسی نہیں ہوا ہے بلکہ پیش کش کا انداز گھس پٹ گیا ہے۔ اگر رقاص ماہر فن ہو اور پورا علم رکھتا ہو تو وہ خواہ مرد ہو یا عورت، وہ اسی خیال اور اسی تصور کو نیا اور دلچسپ بنا کر پیش کر سکتا ہے۔

اور رقص کا بنیادی جذبہ تو "محبت" ہے۔ یہ ایک آفاقی جذبہ ہے، جو وقت کے کسی دائرے میں قید نہیں ہے۔ یہی محبت جب عقیدت کا روپ لے لیتی ہے تو بھکتی شرنگار کی بنیاد بن جاتی ہے۔ اگر کسی طرح آج کے دور کے ناظرین کو رقص میں پیش کئے جانے والے جذبوں کی موزونیت کا ادراک کرایا جا سکے تو پھر وہ قدیم رقص کے ساتھ بھی اجنبیت محسوس نہیں کریں گے یہی وہ نکتہ ہے، جہاں "ابھینے" اپنی جلوہ گری کا نمونہ دکھاتا ہے۔

یقیناً جدید تصورات کو بھی کلاسیکی انداز سے پیش کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ کہانی، موقع محل اور موسیقی سب کچھ موزوں ہو، اور رقاص و رقص کے ساتھ ساتھ ہدایت کار بھی جو اتنا ہوشیار ہو جو اس کے سیاق و سباق میں چند لطیف سی تبدیلیاں کر سکے، اور اس کے ساتھ ہی اس مخصوص رقص کی خصوصیات بھی مجروح نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب بہت مشکل ہے۔ یہ ایک جنوتی بھرا کام ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حاضرین محفل کے ردعمل کے سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ عام طور پر لوگ ایک ہی جیسے پروگرام دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ صرف چند انفرادی تبدیلیوں کو تو انگیز کر لیتے ہیں۔ بس!

سوال:۔ اچھا کیا ابھینے کی تکنیک کے تعلق سے کلاسیکی رقص کے فروغ کی مزید گنجائش نہیں رہ گئی ہے کیا آپ کو ترسیل کے لیے وہی پرانی مدرائیں استعمال نہیں کرنی پڑتی ہیں۔ جبکہ ان مدراؤں میں سے بیشتر اب دور جدید میں قابل ترسیل ہی نہیں رہی ہیں۔

جواب:۔ نہیں آپ۔ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ مدراؤں کی قوت ترسیل ختم ہو گئی ہے۔ کیا اب آپ کسی شخص کی جانب انگلی اٹھا کر اشارہ نہیں کرتے؟ یہی سوچی مدرا ہے۔ کیا آپ کبھی خاموشی کے ساتھ صرف ہاتھ اٹھا کر ہی کوئی سوال نہیں کرتے ہیں۔ اسی کو تو رقص کی زبان میں الاپدما یا شکار ابستا کہتے ہیں۔ مدرائیں بھی تو زندگی سے ہی لی گئی ہیں۔ انسان نے اپنے تاثرات کے اظہار کے طریقوں کا جائزہ لیا، کس طرح وہ دوسروں تک اپنی بات پہنچاتا ہے۔ اور اس طرح مدرائیں وجود میں آئیں۔ پھر انسان نے رقص و نغمہ کے طرز کو جنم دیا۔ ایسے طرز کو جو پوری برادری سے ہم آہنگ ہو سکے، اس کے اجتماعی جذبات کی نمائندگی کر سکے۔ اس طرح لوک ناچ اور قبائلی رقص وجود میں آئے۔ پھر جوں جوں دانشورانہ سطح پر ترقی ہوتی گئی، انسان فن کی اور اعلیٰ و ارفع جہتیں تلاش کرتا گیا۔ اور آخر کار شاعری، مصوری، کلاسیکی موسیقی، کلاسیکی رقص یہ تمام فنون لطیفہ اپنی اپنی بلندیوں پر پہنچ سکے، اور اس کی بنیاد انسان کے اپنے دانشورانہ، جمالیاتی و روحانی تقاضے ہیں اور فروغ مسلسل کی خواہش ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ بحیثیت سماج ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم ترقی معکوس میں مبتلا ہیں۔ ہمارے معیارات گر رہے ہیں اور ہم اپنے آپ کو اعلیٰ و ارفع فنون سے کٹا کٹا محسوس کرتے ہیں کلاسیکی رقص میں مزید فروغ کی گنجائش ہے۔ کافی کچھ ترقی ہو بھی چکی ہے۔ مثلاً یہی کرشنا مورتی سے پہلے کوئی رقاص طویل "جاتی" حصص رقص پیش نہیں کرتا تھا۔ اندرانی سے پہلے کوئی بھی تین چار مختلف طرز نہ تو سیکھتا تھا نہ ان کا مظاہرہ کرتا تھا۔ برجو مہاراج سے پہلے کوئی پیمائش رقص، کوریوگرافی، میں کتھک کا استعمال نہیں کرتا تھا۔ تبدیلی کا یہ عمل تیس برس پہلے شروع ہوا تھا۔ اب ہماری نسل بھی رقص کے ساتھ مختلف رویے اپنا رہی ہے۔ مثلاً میں خود کوچی پوڑی میں پیمائش رقص کے مختلف امکانات کا جائزہ لیتی ہوں۔ کچھ طرز ایسے ہیں جن میں میں آہستہ روی و تن آسانی کو بحال کر رہی ہوں۔ کوچی پوڑی میں میں "گلو کا" رقاص کی روایت کو از سر نو زندہ کر رہی ہوں۔ میرے خیال میں آج کا رقص بھائی کا علمبردار ہے۔ یہ بیک وقت دوام کا امین بھی ہے اور جدت کا خالق بھی۔ موجودہ نسل کے لوگ دان کا صحیح اندازہ آپ کو پندرہ بیس برس میں جا کر ہوگا۔ کیونکہ جس وقت انقلاب آتا ہوا ہوتا ہے۔ اس وقت کوئی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا من حیث القوم ہم صرف فرسودہ اور سڑی گلی چیزوں کو ہی قابل احترام سمجھتے ہیں۔ اور جس وقت کوئی

بھی، طاقت ور تبدیلی ظہور پذیر ہو رہی ہو، کوئی نیا یوگ دان اپنا روپ لے رہا ہو تو ہم اس کی جانب سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

**سوال** آج کے رقص اور اس سے متعلق ماحول میں آپ کیا تبدیلیاں محسوس کرتی ہیں۔

**جواب** میں نے ۱۹۷۳ء میں اس میدان میں قدم رکھا، اس طرح مجھے اس میدان میں تیرہ، چودہ برس ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اتنی مختصر مدت میں، میں کسی بڑی تبدیلی یا انقلاب کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتی۔ ہاں پرانے



فنکار، مثلاً یامنی، اندرانی، اور سونال وغیرہ اس سلسلے میں بہتر طور پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

میرے فنی سفر کے دوران ویسے بھی کوئی بڑی تبدیلی سامنے نہیں آئی ہے، سوائے اس کے کہ معیار مجروح ہوا ہے، فن کے اوپر شو بازی حاوی ہونے لگی ہے۔ بعض لوگوں نے اس لطیف فن کو بھی تجارت و صنعت بنا لیا ہے، جس کا خاصا بُرا اثر پڑ رہا ہے، یہ شکوہ میں پہلے بھی کئی بار کر چکی ہوں۔

**سوال** اچھا، آپ کے خیال میں بھی بوتری رقص یا مجموعی طور پر ہندوستانی رقص میں آپ کا اپنا کیا یوگ دان ہے۔

**جواب** میں پہلے بھی کئی بار، کئی موقعوں پر کہہ چکی ہوں کہ میں رقص کے میدان میں ایک خاص رجحان اور ایک خاص رویے کی نمائندگی کرتی ہوں اور یہ تبدیلی آج کی نسل کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کافی ہے، میں اپنے فن کو بہتر سے بہتر بنانے کی اور نئی جہتیں تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی، یہ مساعی جاری رہیں گی۔

**سوال** آپ کے خیال میں سنگیت ناٹک اکادمی جیسے سرکاری ادارے یا اپنا اُتسو جیسی تقریبات کیا کردار ادا کر رہی ہیں، کیا ان کے ذریعہ کلاسیکی رقص کو قبولیت عام مل رہی ہے۔

**جواب** بات یہ ہے کہ ہم سرکاری مدد اور تعاون کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری سوچ پر ابھی تک جاگیردارانہ انداز حاوی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ہم پر حکومت کرے۔ سوال یہ ہے کہ کتنے لوگ اتنی ذہانت یا فہم رکھتے ہیں کہ ثقافت اور سیاست کا باہمی تعلق سمجھ سکیں۔ کتنے ہندوستانی ہیں جو اس نہج پر سوچتے ہیں، اور کتنے ہیں جو اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ جب تک لوگ خاموش رہ

بے جبر رہیں گے، تب تک یہ تماشے ہوتے رہیں گے، لوگوں کو خوش کرنے کے لیے، انھیں تفریح بہم پہونچانے کے لیے۔ اب اگر عوام چاہتے ہیں کہ ثقافت کے سلسلے میں رویّہ بدلے، بہتری پیدا ہو، تو انھیں زبان کھولنی چاہیے، اپنی بات سامنے رکھنی چاہیے لیکن ثقافت محض تفریح کا نام تو نہیں ہے۔ ثقافت تعلیم بھی نہیں ہے، ثقافت تو جمالیاتی اقدار کے فروغ کا نام ہے، اس ردعمل کا نام ہے جس کے نتیجے میں انسان محض ایک حیوانی وجود سے بلند اٹھ کر 'مہذب انسان' کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا صرف بڑی بڑی باتیں سوچنے کا نام ثقافت نہیں ہے، بلکہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں حسن تلاش کر لینے کا نام ثقافت ہے۔ اگرچہ اُتسو کی پُشت پر مقصد یہی تھا کہ عام آدمی کو مسرت بہم پہونچائی جائے لیکن عملی طور پر اپنا اُتسو کے ذریعہ فنکاروں کو یا عوام کو شاید کم ہی فائدہ پہونچا، اور کچھ لوگوں نے (ثقافتی نہیں)، استفادے کر لیے۔

دیانتداری کی بات ہے کہ یہ جو درمیانی لوگ تھے، وہ سرکاری ملازمین نہیں تھے، اس لیے میں یہ الزام تو نہیں لگا سکتی، دراصل یہ تو ثقافتی خوانچہ فروش تھے، جو ثقافت کو بیچتے پھرتے ہیں، اور ستم ظریفی یہ ہوئی کہ پروگراموں کا انتخاب کرنے اور پیش کرنے کا فرض ان ہی کو سونپا گیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ انھوں نے جی بھر کر من مانی کی۔

بہرحال، سنگیت ناٹک اکادمی جیسے سرکاری ادارے ثقافتی میدان میں زبردست کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان کی کارکردگی کا دائرہ صرف کلاسیکی رقص تک ہی محدود نہیں ہے، لہٰذا اس سارے امدادی نظام میں رقص کو بہت تھوڑا سا حصہ ہی مل پاتا ہے۔

**سوال** فلمی ناچ نے کلاسیکی رقص کے طالب علموں پر کیا اثر ڈالا ہے، کلاسیکی رقاصاؤں مثلاً وجنتی مالا وحیدہ رحمٰن، مینا کشی، شیشا دری اور ہیما مالنی وغیرہ کی فلموں میں رقص کرنے کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا ان اداکاراؤں نے کسی 'نچلے پھسلے رقص' کو جنم دیا ہے، نیز یہ کہ آپ فلم کے میڈیم کو رقص کی صحیح روایت کو منتقل کرنے

لانے کے لیے کیوں نہیں استعمال کرتی ہیں۔

**جواب** میں نے وحیدہ رحمٰن یا میناکشی کو کبھی اسٹیج پر نہیں دیکھا ہے، اس لیے میں ان کے رقص کے بارے میں رائے نہیں دے سکتی، اور یہ بھی ہے کہ ان میں سے کسی نے فلمی ہیروئن بننے سے پہلے کلاسیکی رقص میں کوئی بہت زیادہ نام نہیں کمایا تھا۔ ہیما مالنی کو رقص سے بہت زیادہ عشق ہو سکتا ہے، مگر وہ اچھی رقاصہ نہیں ہے۔ اگر اسے فلمی پس منظر کی مدد حاصل نہ ہوتی تو وہ کلاسیکی رقص کے ذریعہ کوئی بھی مقام حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ ان سب میں وجینتی مالا بہتر ہے، لیکن وہ بھی کافی کم عمری میں فلموں میں آگئی تھی، حالاں کہ وہ اب رقص کے معاملے میں زیادہ سنجیدہ ہے، اور اس نے اب خود کو زیادہ بہتر طور پر رقص کے لیے وقف کر رکھا ہے، لیکن اس کے باوجود میں وجینتی مالا کو برجو مہاراج اور یمینی کرشنا مورتی کی صف میں تو نہیں رکھ سکتی۔ بچپن میں، میں وجینتی مالا کی بڑی مداح تھی، مگر میں جب خود فنکارہ بنی تو مجھ میں فن کی سمجھ بھی پیدا ہوئی اسی لیے میں آج یہ رائے دے رہی ہوں۔

جہاں تک ہلکے پھلکے کلاسیکی رقص کا سوال ہے تو، یہ ان خواتین کی تخلیق نہیں ہے، وہ تو صرف فلمی فنکارائیں ہیں جو ہدایت کار یا فلمساز کے کہنے کے مطابق رقص کرتی ہیں اور انھیں اس کا معاوضہ ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس رقص کا کلاسیکی رقص سے کوئی موازنہ نہیں ہے۔ یہ تو کلاسیکی رقص کی بڑی سطحی سی نقل ہے، جس میں صرف کلاسیکی رقص والا لباس اور علاقائی موسیقی استعمال کی جاتی ہے اور ہر وہ جنبش و حرکت روا رکھی جاتی ہے جس سے رقاصہ کے جسم کے خطوط نمایاں ہو سکیں، اور یہ منظر عوام کو گدگدا سکے۔

ہاں، ایک فلم تھی، 'شنکرا بھرنم' یہ ایک اچھی کوشش تھی، مگر اس سے کلاسیکی رقص کی کوئی خدمت نہیں ہوئی ہے کیونکہ اس میں کلاسیکی رقص کہیں تھا ہی نہیں۔ 'بکی پوزیں' حرکات، انتہائی تنگ و چست لباس میں پیش کی گئی تھیں۔ کوئی کلاسیکی رقاصہ تو اتنے چست لباس میں حرکت بھی نہیں کر سکتی۔

بہرحال، 'نورنگ'، اور 'جھنک جھنک پایل باجے'، کے بعد یہی ایک فلم بنی ہے جس میں رقص کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ ان فلموں میں کلاسیکی رقص کو پوری تخلیقیت کے ساتھ پیش کیا جا سکتا تھا لیکن فلمساز مستقل طور پر سمجھوتے کرتے رہے اور کلاسیکیت کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔ اس سلسلے میں ہمیں مغرب میں بننے والی فلموں سے سبق لینا چاہیے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جب ہمارے عوام اسی گھٹیا معیار سے مطمئن ہیں اور خوش ہیں تو پھر فلمسازوں کو کیا پڑی کہ وہ ذوق کی آبیاری اور عوامی ذہن کی اصلاح کی زحمت فرمائیں۔

**سوال** آپ دہلی میں پیدا ہوئیں اور یہیں آپ کی پرورش و تعلیم ہوئی۔ اس طرح عملی طور پر آپ خاص شمالی ہندی ہیں۔ کیا آپ محسوس نہیں کرتیں کہ جنوبی ہند کے گیتوں اور تمثیلوں کو ہندی میں ترجمہ کر کے شمالی ہند میں زیادہ مقبول بنایا جا سکتا ہے۔

**جواب** دیکھیے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کر لیجیے کہ میں دہلی میں پیدا ہوئی ہوں یا میری تمام تر تعلیم و تربیت یہاں ہوئی ہے، میرا بچپن تو اچھا خاصا خانہ بدوشی میں گزرا ہے، پیدائش کے بعد بچپن کے پانچ سال تو مدراس میں ایک بڑے سے مشترکہ خاندان میں گزرے، اس کے بعد میں اپنے والد کے ملازمتی تبادلوں کے ساتھ ساتھ شہر در شہر پھرتی رہی، کیوں کہ وہ ان دنوں فوج میں تھے۔ اس طرح چودہ برس کی عمر تک میں نے حیدرآباد، وشاکھاپٹنم، پونہ، بمبئی وغیرہ کے ثقافتی ماحول کا تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں ہم لوگ دہلی آگئے۔ اس کے بعد سے ہی میں نے دہلی میں مستقل قیام کیا ہے، اس طرح میں نے اپنی صرف نصف زندگی دہلی میں گزاری ہے، اور اس کا مطلب بھی یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں نے اپنا سب کچھ تج کر 'دہلی کلچر' کو اپنا لیا ہے، جی نہیں، اور پھر 'دہلی کلچر' نام کی کسی شے کا وجود بھی کہاں ہے؟

اب میں آپ کے سوال کی طرف آتی ہوں، یہ درست ہے کہ میں نے شمالی ہند کی ثقافت کا خاصا تجربہ کیا ہے، لیکن شمالی ہند میں تو اتر پردیش، بنگال، راجستھان، گجرات اور کتنے ہی اور خطوں کی ثقافت شامل ہے، اور پھر اس کے ساتھ ساتھ قدیم مسلم تمدن ہے، ان سب کو ملا کر ہی تو شمالی ہند کی تہذیب اور شمالی ہندی ثقافت وجود میں آئی ہے۔ دہلی کی اپنی تو کوئی تہذیب یا مخصوص ثقافت ہے نہیں۔ یہاں تو باہر سے آئے مختلف طبقے ہیں۔ جنوبی ہند کے لوگوں کی بڑی اکثریت ہے اور یہ سب باہم مل کر ایک ثقافتی بیداری پیدا کر رہے ہیں، اور مختلف ریاستوں کی ثقافتی میراث کے باہم خلط ملط ہونے کا یہ عمل تو آزادی وطن کے بعد سے پورے ہندوستان میں جاری و ساری ہے۔

میرے لیے تو یہ بات بڑی مسرت خیز اور اطمینان بخش ہے کہ میں اس انوکھے امتزاج کی پیداوار ہوں۔ میں اپنے آپ کو نوجوان ہندوستانی کہلوانا زیادہ پسند کرتی ہوں، بہ نسبت اس کے کہ یہ وضاحت کروں کہ میں جنوبی ہندی ہوں کہ شمالی ہندی۔ اس طرح کے امتیاز کی میری نظر میں چنداں اہمیت نہیں اور اپنے طالب علموں کے ساتھ، دوستوں کے ساتھ تعلقات یا فن کے تئیں میرے رویے میں اس پس منظر کا نہ کوئی کردار ہے نہ اہمیت۔

اگر میں کہیں اور پیدا ہوتی مثلاً منی پور میں یا کسی قبیلے میں، تو میں منی پوری رقاصہ ہوتی، یا قبائلی رقص کرتی۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ میں رقص پیش کروں کہ اس کا اثر سب کے اوپر یکساں ہو۔ رقص خود ہی بڑی طاقت اور قوت اظہار رکھتا ہے، اس لیے آئیٹم پیش کرنے سے پہلے چند لفظوں میں ہندی میں اس کا تعارف کرا دینا کافی ہوتا ہے، اور اس طرح یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ جنوبی ہند کی زبانوں کو دہلی کی اکثریت نہیں سمجھتی ہے، میں نے تو اپنے رقص میں تلسی داس، سور داس اور میرا جیسے شعرا کی تخلیقات کو شامل کیا ہے۔ شاعری کا انتخاب کرتے وقت میں زبانوں کو ترجیح نہیں دیتی بلکہ فلسفہ اور خیال کو اہمیت دیتی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر رقاصہ یا رقاص جہاں پروگرام پیش کیا جا رہا ہے، اس علاقے یا ریاست کے گیتوں

کو شامل کر لے تو اس سے لوگوں کی توجہ بآسانی حاصل کی جا سکتی ہے اور پروگرام کی مقبولیت میں زبردست اضافہ ہو سکتا ہے ایک کام اور ہو سکتا ہے، جس طرح جنوب میں ہندی نے ترقی کی ہے، اسی طرح شمالی ہندوستان میں لوگوں کو جنوبی ہند کی زبانوں سے کم از کم مانوس تو کرایا جا سکتا ہے میں ثقافتی تبادلے کی بات کر رہی ہوں، 'علاحدگی یا مقبول عام' کی تجویز پیش نہیں کر رہی ہوں۔ میں یہ یقین بھی نہیں رکھتی کہ کسی بھی اعلیٰ و ارفع فن کو رات بھر میں عوامی بنایا جا سکتا ہے، اور نہ ہی ایسا ہونا چاہیے ورنہ تو ہم دیکھیں گے کہ تاج محل کی جگہ سی، پی، ڈبلیو ڈی کی تعمیر کردہ کوئی بلند و بالا عمارت کھڑی ہے۔

سوال ہندوستان میں رقص کی تنقید کا معیار کیا ہے؟

جواب مستقلاً تو کچھ نہیں۔ انفرادی طور پر کچھ تنقیدی شہ پارے اچھے ہوتے ہیں، کبھی بہت عمدہ بھی ہوتے ہیں، خاص طور پر انگریزی میں جو تبصرے ہوتے ہیں ان کا معیار بہت پست ہے، کیوں کہ نقاد بڑے گنجلک الفاظ اور فقرے استعمال کرتے ہیں۔ شاید ان کا مقصد لوگوں کو اس فن سے واقف کرانا نہیں بلکہ الجھانا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بہت کم لوگ پابندی سے رقص کی تنقید پڑھتے ہوں گے، زیادہ تر لوگ تو ایک سرسری سی نگاہ ڈالتے ہیں، تصویر دیکھتے ہیں اور صرف شروع کی چند سطریں پڑھ لیتے ہیں، بس! شاید اسی لیے کچھ نقاد چونکانے والا طریقہ اختیار کرتے ہیں تاکہ قاری ان کا تبصرہ پڑھنے پر مجبور ہو۔

نقادوں کے ساتھ میرے تعلقات صرف رسمی اور پیشہ ورانہ حد تک ہی ہیں۔ ہندوستان میں بڑے اچھے صحافی ہیں، مگر رقص پر لکھنے والے صرف چند ہیں۔

سوال رقص کی نئی روایات جنم نہیں لے رہی ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟۔ مثلاً ٹیگور نے دلچسپی لی تو منی پوری رقص کو بھی کلاسیکی رقص کا درجہ ملا۔ اب کوئی کلاسیکی رقاص فنی کھوج کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتا۔ کیا کوئی چیلنج کو قبول کرنا نہیں چاہتا۔

جواب میں "رقص کی نئی روایت" کی اصطلاح کو بھی کافی الجھا دینے والا لفظ سمجھتی ہوں۔ شاید آپ کی مراد ایسی روایات سے ہے جنھیں ہم نے کھو دیا ہے یا جن سے ہم مانوس نہیں ہیں۔

دراصل روایت وقت کے ساتھ پنپنے اور نکھرنے والی چیز ہے، اس لیے اگر کوئی فن وقت کے ساتھ اپنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کھو بیٹھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عصری جواز ختم ہو گیا ہے، اس میں دم نہیں رہا ہے۔ لیکن جو فنون ارفع و معیاری ہیں لیکن وقت کی گرد میں دب کر گئے ہیں۔ ان کے احیا کے لیے کوشش ہونی چاہیے اور اسی طرح محنت ہونی چاہیے جس طرح کہ ہم بھارت ناٹیم، کچی پوڑی وغیرہ کے لیے کر رہے ہیں، میں اس بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ رقاصوں کو گم شدہ فنون کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مگر میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ 'ترغیبات' بھی بہت کم ہیں، شائقین کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے، دوسری طرف نقاد ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہیں، اسی لیے کوئی نیا رقاص اس طرح کے تجربے کرنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔

سوال روایت کے تحفظ کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے؟۔ سوال یہ ہے کہ کیا روایت کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟۔ دوسری جانب روایت کو جامد بنا کر کیا اس کے فروغ کو روکا نہیں جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر کیا آج کا بھارت ناٹیم داسی اٹم کا ہی نیا روپ نہیں ہے۔ آپ کے خیال میں موجودہ بھارت ناٹیم کی عمر کتنی ہوگی۔ ہم بدلتے ہوئے وقت کے اثرات کو کس طرح روک سکتے ہیں۔

جواب آپ جس چیز کو بھی "روایت" سمجھیں اسی کی تشہیر کر سکتے ہیں اور اسی کو 'محفوظ' رکھ سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک طریقۂ عمل کا سوال ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مخصوص روایت کے اندر رہی زبردست تبدیلیاں ظہور پذیر ہو رہی ہیں، اور ضروری نہیں کہ ہم اس جاری انقلاب سے آگاہ بھی ہوں۔

اس معاملے میں، آج موجود کلاسیکی فن کے ہر علمبردار نے روایت کے اندر تبدیلیاں کی ہیں



ان میں استاد بھی شامل ہیں، پنڈت بھی، رقاص بھی۔ رہی اپنی جگہ سبھی کچھ نہ کچھ لوگ دان کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ روایت کیا ہے؟۔ دراصل روایت نام ہے مختلف خیالات و تصورات کو یکجا کر کے ایک مرکزی دھارا بنانے کا۔ اور روایت بنانے والوں کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی روایت زندہ رہتی ہے۔ لہٰذا ہمیں روایت کو محض ماضی کی یادگار ہی نہیں سمجھنا چاہیے، جسے اس کی سرد، منجمد اور غیر متحرک شکل میں برقرار رکھا جائے۔

آج کا بھارت ناٹیم پچاس اور سو برس پہلے کے بھارت ناٹیم سے قطعی مختلف ہے اور داسی اٹم یا سادر سے قطعی مختلف ہے۔ لہٰذا آج ہم نے جس بھارت ناٹیم کو اپنا رکھا ہے وہ اس روایت کا نسبتاً نیا روپ ہے۔

یقیناً میں روایت کے فروغ کی حامی ہوں، میں اس بات کی بھی حامی ہوں کہ نئے طریقے اپنائے جائیں، نئی تشریح ہو، میں اپنی شخصیت اور مزاج کی رعایت سے اسے منتقل کروں اور اس صورت حال میں میں وہی کر رہی ہوں جو میرے پیش روؤں نے بھی کیا تھا اور وہی میرے بعد آنے والے بھی کریں گے روایت کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہیے۔ اسے اپنے شارح کی تخلیقی صلاحیت کے مطابق فروغ دیا جانا چاہیے۔ فن کو اپنے تمام تر امکانات کے ساتھ پھلنا پھولنا چاہیے۔



ہرنند سچدیوا

# دیسی جاسوس

وہ کون سا جاسوس، سراغرساں یا کھوجی ہوگا جس کو شرلاک ہومز یا ہرکلے پائرٹ کے کارنامے مسحور نہ کرتے ہوں ؟ زیر نظر تحریر میں ہرنند سچدیو نے جاسوسوں کی جاسوسی کی ہے۔

کیا گچوری سے گاؤں والا پینگ کپور جس کا دماغ "کرم چند" نامی ٹی۔وی سیریل میں بلا کا کام کرتا ہے یا اعلیٰ درجے کی تخلیق "تارگٹ" کا سپرنٹنڈنٹ ہیکیٹ یا شرلاک ہومز کے کارناموں کا ڈھیلے ڈھالے ہاتھ پاؤں و لباس والا، آگے اور پیچھے سے اٹھی ہوئی ٹوپی اوڑھنے والا شخص تمہیں یاد ہے ؟

یہ سبھی حضرات مثالی جاسوسوں کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ یعنی اپنے شکار کے تعاقب میں سرگرم، منکسر الصورت، کبھی اُفتاں و خیزاں اور قریب قریب ناگزیر طور پر ہمیشہ ہی آخر میں اپنے مقصد میں فاتح اور کامران ہونے والے اولوالعزم اور جانباز لوگ۔ لیکن کیا یہ تصویر سچی بھی ہے ؟ آج کے جاسوس، خاص کر "دیسی جاسوس" کس مادّے کے بنے ہوئے ہیں ؟

شرلاک ہومز اور ہرکلے پائرٹ اگر آج کے دور میں کام کرتے تو ان کا بھٹہ بیٹھ جاتا۔ اغلب ہے کہ سخت جان افسانوی سراغرساں آج کے ان جاسوسوں سے منہ کی کھاتے، جو خلا بازوں اور دھنا سیٹھوں کے تحفظ کا اہتمام کرتے ہیں، نیوکلیائی توانائی کی تنصیبات کی رکھوالی کرتے، اپنے شوہر کی سکریٹری پر شک کرنے والی اپنی موکلہ کے لیے ثبوت حاصل کرتے ہیں، نیز کبھی کبھار ایک آدھ خون کا معاملہ بھی حل کر لیتے ہیں۔

ہندوستان میں لگ بھگ ۲۵۰ تحفظ ایجنسیاں نگرانی اور تحفظ کی خدمات کا اہتمام کرتی ہیں، نیز جاسوسی تنظیمیں ہونے کا بھی دعویٰ کرتی ہیں۔ ان میں فقط ایک درجن کے قریب ہی ایسی ہیں جو کافی بڑے پیمانے پر اور اپنے صحیح معنوں میں کام کر رہی ہیں۔ ایسی ایجنسیوں کی گرم بازاری ۱۹۷۰ء میں شروع ہوئی، جب قریب قریب ملازمت سے سبکدوش ہر اعلیٰ پولیس اور فوجی افسر نے اپنی خصوصی ہنرمندی اور تجربے کو کاروبار میں لگانے کا فیصلہ کیا۔ ملازمت کے دوران قائم کیے گئے اپنے تعلقات کے طفیل انہیں اچھے خاصے گراہک مل جاتے ہیں۔ آج کل اکثر ایسی ایجنسیاں تجارتی جاسوسی، معلوماتی چوٹے پن یا افشائے راز میں لگی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے گراہک کی درخواست پر اس کے کسی ایسے ملازم کا پیچھا بھی کرتی ہیں جس پر چوری کا شبہ ہو یا بچوں کو بالک چوروں سے بچاتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ غیر ملکی خریداروں کی ساکھ اور مشترکہ کاروبار قائم کرنے کے تعلق سے بھی پتہ لگاتی ہیں۔

بیشتر معاملات جنہیں یہ ایجنسیاں سلجھاتی ہیں تجارتی جاسوسی اور چوٹے پن سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ بمبئی میں کام کر رہی کیپٹل مورز نامی ایک ایسی ایجنسی کے ۱۹۸۵ میں کیے گئے ۳۰ لاکھ سے بھی زائد مالیت کے کام کا تقریباً ۹۰ فیصد حصہ کاروباری فرموں ہی سے متعلق تھا۔ اسی ایجنسی کے ہنری باوا کا کہنا ہے کہ حال میں کمپنیوں کی کارگزاری کی خفیہ رپورٹوں اور تکنیکی اعداد و شمار کا افشا تشویشناک حد تک بڑھ گیا ہے۔

دہلی میں مقیم گلوب ڈیٹکٹو ایجنسی بھی، جس کی درجن بھر شاخیں پورے ہندوستان میں کام کر رہی ہیں، خاص کر کاروباری فرموں کے لیے جاسوسی کا کام کرتی ہے۔ یہ ایجنسیاں ملازمت میں رکھے جانے سے قبل، احتمالی امیدواروں کے چال چلن کی تحقیقات کرتی ہیں، ایسے دست فروشوں اور انتظامی عہدے داروں کا پیچھا کرتی ہیں جن پر حریف کمپنیوں کے ساتھ ملی بھگت رکھنے کا احتمال ہو، ٹریڈ مارک کی خلاف ورزیوں کی چھان بین کرتی ہیں، نیز سرقہ کی ہوئی کتب یا خلاف ورزی کردہ کیسٹیں اور گاڑیوں کے فاضل حصے پرزوں جیسے جعلی سامان کی تیاری کو بے نقاب کرتی ہیں۔

بمبئی کی سیکورٹی اینڈ پرسنل سروسیز، جس کا عملہ لگ بھگ ۸۰۰۰ افراد پر مشتمل ہے، کے سربراہ میجر ایس۔ ایس۔ بھنکی کا کہنا ہے، "ہم بڑے بڑے کارخانوں کے لیے حفاظتی عملے کا اہتمام کرتے ہیں جس سے ہماری "دال روٹی" چلتی ہے لیکن ہم امیدوار دلچسپ اس نوع کے کئی کاموں میں جانچ پڑتال بھی کرتے ہیں۔ البتہ کل سراغرساں ایجنسیوں میں ۹۰ فیصد ایک یا دوسرے معنی میں بناوٹی ہیں۔ ہر ایرا غیرا نتھو خیرا بورڈ لگا کر کسی سراغرساں ایجنسی کا سربراہ بن بیٹھتا ہے۔ مغربی ممالک کی طرح، ایسی ایجنسی قائم کیے جانے سے قبل پولیس اور متعلقہ سرکاری کارندوں کو متعلقہ شخص کی حقیقت اور نیک نیتی کا پتہ لگا کر ہی اسے ایسا کرنے کا اجازت نامہ جاری کرنا چاہیے۔ یہ لازمی ہے کہ کسی سراغرساں ایجنسی کے سربراہ کو پولیس یا فوج کے شعبہ سراغرسانی میں کم از کم ۱۰–۱۵ سال کام کرنے کا تجربہ ہو۔

حالانکہ ان ایجنسیوں کی کام کرنے کی فیس مغرب میں کام کرنے والی ایجنسیوں کی فیس سے لگ بھگ دس حصے کم ہے، پھر بھی یہ زیادہ ہے۔ معاملے کی نوعیت اور نزاکت کے مطابق یہ ۵۰۰۰ روپے اور اس سے زائد ہوتی ہے۔ ہندوستانی سراغرساں ایجنسیاں اس پیشے کو جس میں بالواسطہ اور بلاواسطہ نصف ملین افراد کو روزگار ملنے کا اندازہ ہے، باضابطہ اور باقاعدہ بنانے کی غرض سے قانون بنانے کے لیے سرکار پر زور دیتی رہی ہیں۔ ایکسپرٹ سروسیز بیورو (پرائیویٹ) لمیٹڈ کے لفٹننٹ کرنل (ریٹائرڈ)، کا مٹے کے مطابق، معلومات حاصل کرنے کے لیے کارندوں کو مردم شناسی، قوت مشاہدہ، تعلقات اور 'پیسے' پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ پتہ چلا ہے کہ ایک سراغرساں ادارہ ٹریڈ یونینوں میں پھوٹ ڈالنے اور ہڑتالوں کو بے اثر کر دینے میں خصوصی مہارت رکھتا ہے۔

جرائم کو حل کرنے کے لیے اب سراغرساں جدید آلات اور یہاں تک کہ کمپیوٹر کو بھی استعمال میں لا رہے ہیں، باوجود اس کے کہ ہندوستانی سراغرساں ایجنسیاں لیزر ٹرانسمیٹر جیسے بیش قیمت آلات کی استطاعت نہیں رکھتیں، جو مقفل کمروں کے عقب کی بات چیت کو گرفت کر سکتے ہیں، یا مریخ عکاسی کرنے والے ویڈیو کیمرے بھی نہیں لے سکتے، پھر بھی وہ چلتے پھرتے بات چیت کر سکنے کے آلے "واکی ٹاکی" چھوٹے ٹیپ ریکارڈر اور

انتہا یہ کہ کبھی کبھی مجرموں کی ٹیلی فون پر کی گئی بات چیت کو صدا بند کرنے والی تراکیب کا استعمال کر رہی ہیں۔ ایک دیا سلائی کی ڈبیا میں رکھے ہوئے یا ایک میز یا غالیچے کے نیچے چھپائے ہوئے ایک بہت ہی ننھے سے ٹرانسمیٹر کی مدد سے ایک کلومیٹر دور یا پاس کھڑی گاڑی میں ہو رہی کسی بات چیت کو صدا بند کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسرا آلہ جسے ہارمونا کہتے ہیں اور جو ایک چھوٹی سی سیاہ رنگ کی ڈبیا ہوتی ہے کسی ڈاک و تار کے محکمے کے ملازم کی اعانت سے ٹیلی فون میں نصب کی جاتی ہے تب ٹیلی فون کرنے والا ایک خفیہ نمبر کی مدد سے ڈائل گھما کر اس کمرے میں ہو رہی بات چیت کی متعلقہ افراد کی لاعلمی میں چوری چھپے سن لیتا ہے۔ سراغرساں حقائق کی بازطلبی کے لیے نرم توجہ کی حالت سے بھی اور جھوٹ کی گرفت کرنے والی تراکیب سے بھی مدد لیتے ہیں۔

ملازمین اور حریف کمپنیوں کے تعلق سے انتہائی خفیہ معلومات کو مجتمع کرنے کے لیے کمپیوٹروں کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ ساکھ اور وقار سے متعلق جانکاری مجتمع کرنے کے علاوہ، کمپیوٹروں کا استعمال ایسے عہدے داروں کی شناخت کے لیے بھی کیا جاتا ہے جو تکنیکی جانکاری اور رازوں کے افشا کی راہیں بند کرنے میں مفید ہو سکتے ہوں۔ کمپیوٹر کی مدد سے منتخب کیا ہوا ایسا فرد سراغرساں ایجنسی کی فہرست میں شامل کر لیا جاتا ہے اور مجرموں کی گرفت کرنے کے لیے اس سے مخبر کا کام لیا جاتا ہے۔ مغربی سراغ رساں ایجنسیاں ایسے ویڈیو کیمروں کا بھی عام استعمال کرتی ہیں، جن کی روشنی بہت ہی نیچے رہتی ہے اور جو گھپ اندھیرے میں پردے کی ترکیب سے تصویریں لے سکتے ہیں۔

دو برس قبل کتنے ہی شہرہ آفاق اور اپنے پیشے میں ممتاز سراغرسانوں نے دہلی میں منعقدہ سراغرسانوں کی عالمی انجمن میں ۵۹ ویں سالانہ اجلاس میں شرکت کی تھی۔ کچھ اسمائے گرامی میں شامل تھے واس موریس جس نے ۱۹۷۷ء میں ایئر انڈیا کے ۷۴۷ بوئنگ کنشک کے حادثے کے تعلق سے ۴۰۰ ملین ڈالر کی مانگ کی تفتیش کی تھی، ہیرلڈ پیسٹ جو رسوائے جہاں واٹرگیٹ جاسوسی اسکینڈل میں ملوث تھا اور جے ڈی۔ وسٹن جو جعلی پاسپورٹوں اور غیر قانونی تارکین وطن کی کھوج لگانے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ مؤخرالذکر نے خود کو پال ڈریک کی نہج پر ڈھالا ہے، جو پیری میسن زنجیرے میں ظاہر ہونے والا، ارل اسٹینلے گارڈنر کا تخلیق کیا ہوا معروف سراغ رساں ہے۔ پیسٹ نے اپنے کارناموں کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتایا "مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک ایسا معاملہ حل کیا تھا جس میں ایک جرمن جوڑا سان فرانسسکو سے کروڑہا ڈالر کی مالیت کے ہیرے چرا کر ہوائی جہاز سے جنیوا فرار ہو گیا تھا۔ بالآخر میں نے ۴۸ دنوں بعد چھ ملکوں میں ان کا تعاقب کر کے ان کی کھوج لگائی اور ہیرے برآمد کر لیے۔ اس کے بموجب امریکہ میں ۲۵۰۰۰ نجی سراغرساں ہیں اور ہندوستان میں محض کوئی ۵۰۰۔ بمبئی کی انڈسٹریل سیکورٹی آرگنائزیشن اور ڈیٹکٹو ایجنسی پرائیویٹ لمیٹڈ کے کلدیپ سنگھ نے بھی کچھ ایسے ہی ہیجان انگیز واقعات بیان کیے "ہماری ایجنسی کو ایک صنعتی ادارے نے یہ پتہ لگانے کو کہا کہ ان کے انتظامیہ کے اعلیٰ عہدے داروں کو بدنام کرنے کی نیت سے کون ہتک آمیز مکتوب لکھ رہا ہے؟ مکتوب کی عبارت زیدہ سے ہم نے پہلے متعلقہ علاقے کی شناخت کی اور بعد میں مشتبہ ٹائپ رائٹر کو ڈھونڈ لیا، ایک دفعہ تو یوں کہیے کہ میں گولی سے مرتے مرتے بچا۔ یہ تب ہوا جب میں ایک ایسے مردہ شخص کو بس دبوچنے ہی والا تھا جس نے کسی دوسرے کی لاش کو خود کی لاش کہہ کر زرکثیر کا مطالبہ کیا تھا۔

بظاہر زیادہ سے زیادہ ایسی ایجنسیاں سراغرسانی سے متعلق ہیجان خیز تعریف پر صادق آتی ہیں۔ کسی بوسیدہ عمارت میں، ہلا جلا زینہ چڑھ کر تین منزل اوپر کبوتر خانے میں بنا ہوا دفتر جس کے باہر لگی تختی پر لکھا ہوگا "ایکس، وائی، زیڈ سراغرساں ایجنسی۔ لیکن یہ سب کچھ جیمز بانڈ کی طرح کی تیز رفتار کاروں، تیز قدم دوشیزاؤں اور پاگل کر دینے والی تراکیب کے پُراسراریت سے عاری ہوتا ہے۔ ایک ہندوستانی سراغرساں ایجنسی کی کہانی دلنواز ہونے سے زیادہ ناگوار ہے، کیونکہ اس سے پیشتر کہ یہاں کچھ ہو پائے، گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے، ان کے خلاف اپنے گراہکوں اور زیر تفتیش موضوعات کو افشائے راز کی دھمکی دے کر روپیہ وصول کرنے کے الزامات صاف طور پر عام ہیں۔ بلاشک یہ سراغرساں اپنے آپ کو کرم چند، شرلاک ہومز اور پال ڈریک سمجھتے ہیں لیکن حقیقت اور افسانے میں بہت بڑا فرق ہے اور ہمارے "دیسی جاسوس" کو مغربی سراغرسانوں کی ہمسری کرنے یا حقیقی زندگی میں ان کے سورماؤں کو آنا رنے کے لیے ابھی کئی منزلیں طے کرنی ہوں گی۔



شرلاک ہومز

کمال پرویز

# کھیل کے میدان سے

# ہندوستانی سرزمین پر پاکستان کی پہلی فتح



کپل دیو

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پانچ ٹسٹ میچوں کی سیریز ختم ہو چکی ہے۔ چار میچ ڈرا ہونے کے بعد پاکستان نے بنگلور کے آخری ٹسٹ میں ۱۱۶ رنوں سے فتح حاصل کی، اور عمران خاں کا ہندوستان کو شکست دینے کا وہ خواب پورا ہو گیا جو انھوں نے دورہ شروع ہونے سے قبل دیکھا تھا۔ شروع کے چار ٹسٹ جن میں ہندوستان کا پلڑا یقیناً بھاری تھا، نہایت غیر دلچسپ طریقے سے ڈرا ہوئے۔ اور ایسا لگ رہا تھا کہ ایک روزہ مقابلوں کو جو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اس کی وجہ ٹسٹ میچوں کا اسی طرح سے ڈرا ہوتا ہے۔ لیکن بنگلور ٹسٹ میں تمام دلچسپیاں اپنے نقطۂ عروج پر تھیں۔ پہلی بال سے لے کر آخری بال تک ٹسٹ نے شائقین نے داد و تحسین سے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ چار دن میں ختم ہو جانے والے اس میچ کی اہمیت اس لیے تو تھی ہی کہ سیریز کا دار و مدار اسی پر تھا، لیکن ہندوستان کے لیے یہ ایک تاریخی ٹسٹ بھی تھا، کیوں کہ اس میچ میں عظیم بلے باز سنیل منوہر گواسکر اپنے ٹسٹ کرکٹ کے دس ہزار رنز مکمل کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ریکارڈ گواسکر نے اور بنایا، وہ یہ کہ پاکستان کے خلاف اپنے دو ہزار رنز بھی مکمل کر لیے جو اس سے پہلے صرف ویسٹ انڈیز کے کپتان کلائیو لائیڈ نے کیے تھے۔

اس سیریز کے شروع میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ حسب دستور ہند، پاک کے درمیان اس مقابلے میں دلچسپی ختم ہو گئی، بلکہ اگر مستقبل میں ان پر توجہ نہ کی گئی تو ہندوستانی کرکٹ کے معیار کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس سلسلے میں اہم ترین مسئلہ امپائرنگ کا ہے۔ بنگلور کے علاوہ چار میچوں میں ایک دو فیصلوں کو چھوڑ کر امپائرنگ غنیمت تھی۔ مگر بنگلور میں امپائرنگ کا معیار کافی گر گیا۔

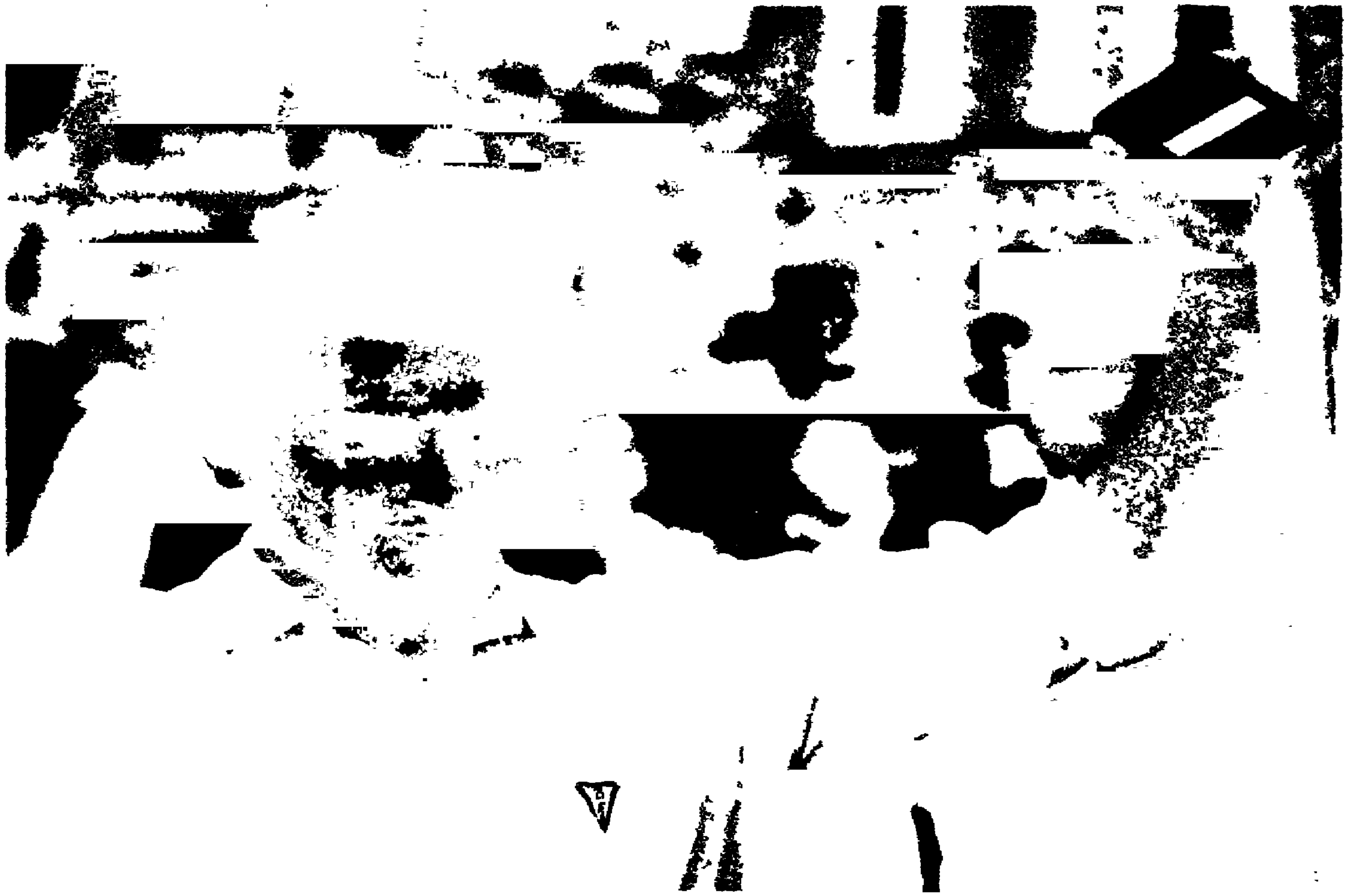
ہندوستان میں پچ کی تیاری کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ جس طرح سے بے جان پچیں تیار کی گئی ہیں وہ صرف میچ ڈرا ہونے میں مدد دے سکتی ہیں مگر فیصلہ کروانے میں شاید مددگار ثابت نہ ہوں۔ کچھ لوگ اس سلسلے میں پچ تیار کرنے والے ماہرین، اور کچھ کپل دیو کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ کلکتہ میں ٹسٹ شروع ہونے سے پہلے پچ کی گھاس کپل دیو نے صاف کرائی تھی۔ بہر حال سال رواں کے آخر میں ورلڈ کپ کی تیاری کے سلسلے میں اچھی پچوں پر دھیان دینا ہوگا، اگرچہ یک روزہ میچوں میں ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہتی۔



عمران خان



عبد القادر



سنیل گواسکر: دس ہزار سنگ میل

اس سیریز میں ہندوستان کی جانب سے قابل ذکر سنیل گواسکر ہیں جنھوں نے اپنی ٹسٹ زندگی کے دس ہزار رن احمد آباد ٹسٹ میں مکمل کرلئے۔ یہ رن انھوں نے ۱۲۴ ٹسٹ میچوں میں بنا کر یہ ثابت کردیا کہ وہ دنیا کے عظیم بیٹسمین ہیں۔ "ٹسٹ ماسٹر" کے اس ریکارڈ کا مستقبل قریب میں ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں ہے، کیونکہ ان کے بعد ٹسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ رن انگلینڈ کے جیف بائیکاٹ نے بنائے ہیں اور وہ ٹسٹ کرکٹ سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں گواسکر کا کہنا ہے کہ میں اس کام کو سب سے پہلے انجام دینے کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیا جاؤں گا"

گواسکر کی ریکارڈ سنچریز کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اکثر ماہرین نے گواسکر پر ایک تنقید یہ کی ہے کہ تمام ہندوستانی بلے بازوں کی طرح وہ بھی تیز گیند بازوں کو کھیلنے میں پریشانی محسوس کرتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ گواسکر نے سب سے زیادہ رن ویسٹ انڈیز کے خلاف (۲،۷۴۹) بنائے ہیں جن کے پاس دنیا کے عظیم اور تیز ترین گیند بازوں کی ایک کھیپ موجود رہی ہے۔ حالانکہ بنگلور ٹسٹ میں پاکستان کو فتح حاصل ہوئی لیکن کرکٹ کے شائقین کو گواسکر کی ۹۶ رن کی اننگ ہمیشہ یاد رہے گی جو یقیناً ان کی کئی سنچریز پر بھاری ہے۔ ایک طرف گرتے ہوئے وکٹ، دوسری طرف گواسکر کی صبر و تحمل اور کلاسیکی انداز سے کھیلی ہوئی اننگ۔ اور بقول شخصے کہ اگر بیٹنگ سکھانے کے لئے کوئی موزوں ترین ماڈل بن سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف گواسکر ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ گواسکر کا ایک ایک رن کوئی نہ کوئی ریکارڈ ضرور بناتا ہے اور یہ خود اپنے میں ایک ریکارڈ ہے۔

یک روزہ میچوں میں اگرچہ ہندوستان کو

۱-۵ سے شکست سے دوچار ہونا پڑا مگر ہندوستانی
ٹیم کو ایک نیا کھلاڑی منوج پربھاکر کی شکل میں مل
گیا جمشید پور میں منوج کے ۱۰۶ رن کی اننگ اس
کے شاندار مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس
نے جارحانہ انداز میں پاکستان کے تیز گیند بازوں
وسیم اکرم، عمران خان اور سلیم جعفر کی بالنگ کے
بخیے ادھیڑ دیئے۔ ورلڈ کپ سے پہلے ان کا ٹیم میں
شامل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان
اس مقابلے میں اپنی گذشتہ پوزیشن کو قائم رکھنے
کے لیے کوشاں ہے۔ مگر ضرورت اس بات کی بھی
ہے کہ کچھ اور نئے کھلاڑیوں کو موقع دیا جائے

ایک اور مسئلہ شائقین کا ہے۔ احمد آباد
میں جس طرح کھلاڑیوں پر پتھراؤ کیا گیا
وہ ہماری تہذیب کے منافی ہے۔ اس پتھراؤ میں کئی
مہمان کھلاڑی زخمی ہوئے۔ یہ حرکت اس لیے اور بھی
شرم ناک ہے کہ احمد آباد وہ شہر ہے جہاں سے گاندھی
جی نے اہنسا کی تحریک کو نیا رنگ و آہنگ دیا تھا

ایک روزہ مقابلوں میں اب تک دو میچ
پاکستان جیت چکا ہے

یہ سیریز اس لحاظ سے بھی تاریخی ہے کہ سیاسی
اصطلاحوں میں بھی ایک اضافہ کر گئی جب جے پور
میں کھیلے جا رہے ٹسٹ میچ کے دوران صدر پاکستان
جنرل ضیاء الحق میچ دیکھنے پہنچے تو سیاسی ماہرین
نے ان کے اس دورے کو "کرکٹ ڈپلومیسی" کا نیا
نام دیا۔

## ڈیوس کپ

ٹینس میں ہندوستان نے اس وقت قابل قدر
کارنامہ انجام دیا جب دہلی کے لان ٹینس ایسوسی ایشن کے
کورٹ پر کھیلے جا رہے ڈیوس کپ میں اس نے ارجنٹینا
کو ہرا دیا۔ سنگلز مقابلوں میں ہندوستان کے وجے
امرت راج نے ارجنٹینا کے نیشنل چیمپئن مارٹن جیتے
کو ۲-۶، ۶-۸، ۴-۶، ۶-۳، ۶-۳ سے شکست دے دی
وجے شروع کے دو سیٹ ہارنے کے بعد اپنے شباب پر
آگئے اور لگاتار تین سیٹوں میں ارجنٹینا کو روند ڈالا
ساتھ ہی رمیش کرشنن نے ارجنٹینا کے نمبر دو کھلاڑی
جوارشیو ڈی لا پینیا کو ۲-۶، ۵-۷، ۴-۶ سے ہرا کر اپنی
صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑیوں کا مختصر
تعارف اس طرح ہے۔

[illegible] اس وقت ہندوستانی ٹیم کے تجربہ کار کھلاڑی
ہیں۔ ڈیوس کپ میں وہ اس وقت سے کھیل رہے ہیں جب ۱۹۸۴ء
میں نگر مو ولاس نے اپنی ایک چوٹ کی وجہ سے مقابلے
سے ہٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت سے اب تک
وہ لگاتار ڈیوس کپ میں شرکت کر رہے ہیں۔

۲۳ سالہ مارٹن، ہیوگس آئیرس میں پیدا ہوئے
اور اس وقت بلاشبہ وہ اپنے ملک کے نوجوان کھلاڑیوں
میں سب سے زیادہ ہونہار ہیں۔ ان کی کھیل پر گرفت
کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۴ء میں وہ
اے۔ ٹی۔ پی کی ترتیب کے لحاظ سے دنیا میں ۱۵۶ ویں
نمبر پر تھے، مگر ۱۹۸۶ء ختم ہونے تک وہ ۱۷ویں نمبر پر
آ چکے تھے۔ ان کے کھیل کی خصوصیات میں ان کی ٹاپ
اسپن تیز رفتار اور طاقتور والیز شامل ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں
وہ کئی بین الاقوامی مقابلوں کے فائنل میں پہونچے اور بورس
بیکر، نگر مو ولاس اور وکٹر پیسی کو شکست دی، انھوں
نے امریکی زون ڈیوس کپ سنگلز مقابلوں میں اپنے
ملک کو چلی کے خلاف فتح دلوائی۔ اسی بنا پر اس سال
ارجنٹینا ڈیوس کپ کے عالمی گروپ کے سولہ منتخب
ممالک میں سے ایک ہے۔



وجے امرت راج

## کھیل جگت

ہوراشیوڈی لا پینا، پینا ارینٹا تا ڈریوس کپ ٹیم کے دوسرے نمبر کے سنگلس کھلاڑی ہیں۔ سال گذشتہ میں انھوں نے بھی چلی کے خلاف اپنے دونوں سنگلس مقابلے جیتے تھے۔ بائیں ہاتھ سے کھیلنے والے پینا پانچ فٹ ایک انچ لمبے ہیں۔ ۱۹۸۹ء کی اے۔ ٹی۔ پی ترتیب کے مطابق ان کا نمبر دنیا میں ۳۶ واں ہے، جب کہ ۱۹۸۸ء میں ان کا نمبر ۹ تھا۔ ۸۹۔۱۹۸۵ء میں انھوں نے مار بیلا میں فائنل جیتا، اور بوئنس آئرس میں فائنل تک پہونچے۔ فرینچ اوپن ٹورنامنٹ میں وہ چلی کے کلاڈیو اور اٹلی کے کلاڈیو پناتا کو شکست دے کر کوارٹر فائنل تک پہونچ گئے، جہاں فرانس کے لیکونٹے سے ہار گئے۔

کرسٹین مِنّوسی:۔ ارجنٹائنا ٹیم کے سب سے کم عمر کھلاڑی ہیں، جن کا قد چار فٹ ایک انچ ہے۔ گذشتہ سال سے وہ ڈیوس کپ میں اپنے ملک کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ فراناکے ساتھ وہ ڈبلس مقابلوں میں چلی کے خلاف کھیلے۔ انھوں نے ہرارٹیمن سٹیلائٹ کرکٹ مقابلے میں فتح حاصل کی اور فرینچ اوپن ٹورنامنٹ کے تیسرے راؤنڈ تک پہونچے۔

جیویر فرانا:۔ بائیں ہاتھ سے کھیلنے والے بیس سالہ جیویر فرانا ارجنٹائنا کے نوجوان کھلاڑیوں میں سے ایک ہیں۔ اے۔ ٹی۔ پی ترتیب کے لحاظ سے وہ اس وقت دنیا کے ۱۴۳ ویں ہیں۔ اسی سال کے شروع میں وہ فرینچ اوپن ٹورنامنٹ کے تیسرے دور تک پہونچے۔

موڈیسٹو وہار کوبز:۔ موڈیسٹو ارجنٹائنا ٹیم کے دیکھنے والے کپتان ہیں۔ اسپین میں پیدا ہونے والے موڈیسٹو سترہ سال کی عمر میں امریکا چلے گئے، جہاں سے انھوں نے معاشیات میں گریجویشن کیا۔ وہیں اپنے دور کے بہترین پروفیشنل کھلاڑیوں پانچو سیگورا، پانچو گونزیلز سے ٹریننگ حاصل کی۔ وہ امریکن اوپن ٹورنامنٹ کے سنگلس مقابلوں کے آخری آٹھ کھلاڑیوں میں سے تھے۔ ولاس کے ڈبلس میں شرکت کی۔ اب وہ کوچ کی حیثیت سے ارجنٹائنا کے کھلاڑیوں کے ساتھ ہیں۔

وجے امرت راج:۔ وجے امرت راج ایک خداداد صلاحیت کے کھلاڑی ہیں۔ اپنے چھوٹے بھائی آنند امرت راج کے ساتھ انھوں نے بین الاقوامی ٹینس میں ہندوستان کا نام تقریباً ایک دہائی سے زیادہ عرصہ سے روشن کر رکھا ہے۔ داہنے ہاتھ سے کھیلنے والے وجے کے کھیل کی جان ان کے طاقتور اسٹروک ہیں۔ وہ گزشتہ چند برسوں سے ہندوستانی ڈیوس کپ ٹیم کے کپتان ہیں۔ وجے بین الاقوامی ٹینس کے منظر پر اس وقت آئے جب ۱۹۷۳ء میں ومبلڈن اور امریکا اوپن ٹینس ٹورنامنٹ کے کوارٹر فائنل میں پہونچے۔ اس وقت سے اب تک وہ دنیا کے کئی نامور کھلاڑیوں جیسے راڈ لیور، بورگ، جان میکنرو، کنارس، روزویل اور ایوان لینڈل کو شکست دے چکے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں اے۔ ٹی۔ پی ترتیب کے لحاظ سے ۲۰ویں نمبر پر تھے۔ پچھلے سال ڈیوس کپ سنگلس میں دنیا کے تیسرے نمبر کے کھلاڑی سویڈن کے میٹس ولینڈر کو ہرایا تھا۔ ان کی موجودہ پوزیشن دنیا میں ۱۰۷ واں نمبر ہے۔

رمیش کرشنن:۔ ۲۸ سالہ رمیش کرشنن مدراس میں پیدا ہوئے اور ۱۸ سال کی عمر میں اس وقت منظر عام پر آئے جب ۱۹۷۹ء میں انھوں نے ومبلڈن اور فرینچ عالمی جونیئر فائنل حاصل کیے۔ اس وقت سے مستقل وہ اپنی عالمی ترتیب بہتر بنا رہے ہیں۔ اس وقت ۴۶ ویں نمبر پر ہیں۔ رمیش اپنے والد راما ناتھن کرشنن کی طرح ٹینس کورٹ پر ایک فن کار نظر آتے ہیں۔ ان کے تیز شاٹ شائقین کا دل جیت لیتے ہیں۔ گزشتہ سال انھوں نے جاپان اوپن ٹورنامنٹ اور ہانگ کانگ گرانڈ پرکس بھی جیتا۔ ان مقابلوں میں انھوں نے پیٹ کیش (آسٹریلیا)، جمی کانرس (امریکا) اور اینڈرس گومز (ایکوڈور) کو شکست دی۔



رمیش کرشنن

آنند امرت راج:۔ امرت راج بھائیوں میں سب سے چھوٹے آنند نے ہندوستانی ٹینس کو ایک وقار بخشا ہے۔ وہ دنیا کے بہترین کھلاڑیوں میں ایک ہیں جو ڈبلس میں بائیں کورٹ سے کھیلتے ہیں۔ سنگلس میں بھی انھوں نے کئی اہم مقابلے جیتے ہیں۔ ان کی قابل ذکر فتح ۱۹۷۷ء میں ومبلڈن میں ہوئی جب انھوں نے جان میکنرو کو شکست دی تھی۔ ۱۹۷۴ء کے ڈیوس کپ میں بھی انھوں نے ہندوستان کی فتح میں ایک اہم رول ادا کیا۔ کلکتہ میں آنند اور وجے نے ڈبلس میں آسٹریلیا کے جان الیگزینڈر اور کولن ڈبلے کو ۱۸۔۱۶، ۳۔۱۶، ۸۔۱۶، ۱۵۔۷ سے ہرایا اور یہ ڈیوس کپ کی تاریخ کا دوسرا طویل ترین مقابلہ بھی تھا۔

ذیشان واسودیوان:۔ ۱۹۶۲ء میں مدراس میں پیدا ہونے والے واسودیوان نیشنل ٹینس کے سنگلس اور ڈبلس میں اپنی برتری ثابت کر چکے ہیں۔ اس وقت وہ ہندوستان کے نمبر ایک کھلاڑی ہیں اور اے۔ ٹی۔ پی ترتیب کے لحاظ سے دنیا میں ان کا نمبر ۱۴۲ واں ہے۔ ان کا کھیل بگ سروس اور ایک تیز ہاتھ کے اوپر ہے۔ انھوں نے ڈیوس کپ ۱۹۸۳ء سے کھیلنا شروع کیا۔



سنیل صوبیدار

# ضمیر کا کرب

یہ ایک بڑے عبوری دور کی بات ہے۔ انسانی آفرینش صرف بن مانس (APE) کے مرحلے تک ہی پہنچ پائی تھی۔ انسانی اقدار کی سطح تک پہنچنے کی آرزو بیچارے بن مانس کو پریشان کر رہی تھی۔ وہ حیوانی فطرت اور نیک تقاضوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ اس کی فطرت کہتی تھی کہ یہ اس کے مفاد میں نہیں کہ وہ اپنی حیات ارضی کے ان عیش و آرام کو چھوڑ دے جن سے اسے راحت ملی ہے۔ اور ادھر ضمیر کی موجودگی محسوس کرنے پر اس میں ایک ایسا جذبہ لشا ط جگا دیتی تھی جسے قابو میں رکھنا مشکل تھا۔

ابھی انسان حیوانی جبلتوں کا حصہ دار نہیں تھا اور اس لیے پنچ تنتر یا لقمان کی حکایات میں جس دنیا کو پیش کیا گیا ہے وہ اپنی تمام ترسادگی کے ساتھ موجود تھی۔ شیر ظالم تھا، عقاب باوقار تھا، لومڑی مکار اور میمنہ معصوم تھا۔ تمام سلطنت کا بادشاہ ابھی شیر ہی تھا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ اس کی پھرتی اور قوت میں بڑی کمی آگئی تھی۔ وہ دن کو اونگھنا اور رات کو سو جانا بہتر سمجھتا تھا۔ وہ اپنی سلطنت کے باقاعدہ یا دفتری دورے کرنے سے بھی قاصر تھا۔ البتہ، حکومت کے کاروبار ان قوانین، ضوابط اور احکام کے تحت چلتے تھے جو وقتاً فوقتاً حضور اعلیٰ شیر کی طرف سے جاری کیے جاتے تھے۔

شیر کے سخت ارشادات تھے کہ صرف پالیسی امور کے سلسلے میں ہی اسے زحمت دی جائے۔ نجی شکایات اور ناانصافی کے چھوٹے چھوٹے معاملات کی چھان بین کرنا شیر کے حضور اعلیٰ کے رتبے کے مطابق نہیں تھا۔ چند غیر معمولی معاملات میں جب کسی خطے کے امن و امان میں قابل برداشت حد سے زیادہ خلل پیدا ہوتا تھا، تو شیر معاملے کی چھان بین کرتا تھا اور اپنا فرمان صادر کرتا تھا جو تمام فریقین پر لاگو ہوتا تھا۔

ایک دن، بھیڑیوں اور لومڑیوں کے لگاتار چلانے کی وجہ سے شیر کو بڑی پریشانی کا احساس ہوا۔ تفتیش کرنے پر اسے مطلع کیا گیا کہ میمنے نے دریا کا پانی گندہ کر دیا تھا، جس سے جانوروں، پرندوں اور مچھلیوں کی صحت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ بھیڑیے اور لومڑیاں میمنے کے چلن پر بڑے خفا ہوئے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ میمنے کو فوراً ہی معطل کر دیا جائے تاکہ ہر چھوٹے بڑے پر نظم و نسق نافذ کیا جائے۔ چونکہ میمنے نے کوئی شور نہیں مچایا لہٰذا یہ نتیجہ نکال لیا گیا کہ اس نے اپنا قصور تسلیم کر لیا ہے۔

بڑھاپے، جسمانی کمزوری، اور اپنے عظیم مرتبے کی رکاوٹوں کے باوجود، شیر نے موقع تاڑ لیا۔ مختلف وسائل سے حاصل شدہ اطلاعات کا اس نے جائزہ لیا تفصیلی خذرات بھی طلب کیے، معاملے کا ہر پہلو سے مطالعہ بھی کیا، محکمہ قانون کا مشورہ لیا اور آخر میں سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ دیا کہ پانی گندہ کرنے کے سلسلے میں میمنہ بے قصور ہے۔ حضور اعلیٰ نے مزید کہا کہ لومڑی نے ہی پانی گندہ کیا تھا۔ انہوں نے حکم دیا کہ ان کے فیصلے پر آبی آلودگی روکنے کے بورڈ کو عمل درآمد کرنا چاہیے۔

مذکورہ بورڈ میں بھیڑیوں اور لومڑیوں کی بڑی بھاری اکثریت تھی۔ جب بورڈ نے معاملے پر غور کرنا آغاز کیا تو میمنے کا تنہا نمائندہ بھی غیر حاضر تھا۔ بورڈ نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا کہ شیر کا یہ کہنا کہ لومڑی قصوروار ہے۔ قابل قبول نہیں۔ بورڈ نے یہ قرارداد بھی منظور کی کہ انہیں لومڑی پر پورا اعتماد ہے جو کہ بورڈ کی سکریٹری تھی۔

حضور اعلیٰ شیر، بڑی کشمکش و پیچ میں پڑ گئے انہیں بتلایا گیا کہ بورڈ کو ان کے اختیارات کا بہت ہی پاس ہے اور ان کے خلاف جانے کا بورڈ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ البتہ اس معاملے میں یہ بتایا گیا کہ شیر نے تو محض اپنی رائے ظاہر کی تھی۔ انہوں نے کوئی فرمان یا حکم صادر نہیں کیا تھا جو بورڈ کے لئے لازم العمل تھا۔ جب شیر اس بات پر غور کر رہا تھا کہ ان حالات میں کسی ضابطے کا اجرا ضروری تھا یا ایک فرمان پر دستخط کرنا ہی کافی رہے گا، تو انہیں بورڈ کی جوبلی تقریبات کی صدارت کرنے کے لئے دعوت نامہ موصول ہوا۔ دعوت نامے کو قبول کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے شیر کے سکریٹری سانڈ نے یہ تحریر کیا کہ دعوت نامے کو بورڈ کی طرف سے احترام و لحاظ کی علامت تصور کیا جائے۔

اعلیٰ حضرت شیر کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔ جوبلی کی تقریبات میں یہ تجویز کیا گیا کہ مملکت کا سب سے بڑا اعزاز "محافظ انصاف" شیر کی نذر کیا جائے۔ ہر بھیڑیا اور ہر لومڑی اس قدر انکسار کے ساتھ اپنی دم ہلا رہی تھی کہ اعلیٰ حضرت حیرت میں تھے کہ آیا انہیں میمنے کی امداد کے لئے اپنی دلچسپی ظاہر کرنی چاہیے۔ ان کے سکریٹری نے انتباہ کیا کہ اگر وہ حتمی فرمان جاری کریں گے تو بورڈ معاملے کو نظرثانی کے لئے واپس کر سکتا ہے اور اس سے خراب سی حالت پیدا ہو جائے گی۔

اس جمود کو توڑنے کا کوئی راستہ نکالنے کے لیے شیر نے جسٹس عقاب کی "یک ممبری تفتیش کمیٹی" مقرر کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ بورڈ نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ اور کہا کہ یہ ایک ایسا موقع ہے جس سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ بھیڑیے اور لومڑیاں سب سے زیادہ معیاری دیانت داری اور اخلاقی معیار کے جانور ہیں۔

جسٹس عقاب نے پوچھ تاچھ کو پہاڑی کی چوٹی پر دن دہاڑے عمل میں لانے کی تجویز پیش کی۔ بورڈ کا کہنا تھا کہ جسٹس عقاب کو چاہیے کہ وہ انتظامی سہولیت کے پیش نظر تفتیش کا کام ایک چھپے ہوئے جنگل میں ایک خاص خندق میں کرے۔ جب بورڈ کی گذارش قبول نہ کی گئی تو اس نے فوراً احتجاج کیا کہ تفتیش کی جگہ کا انتخاب اس کے خلاف جانبداری ظاہر کرتا ہے۔ تعصب زدہ تنظیم انصاف کے آگے شہادتیں پیش کرنا بے معنی ہے۔ انہوں نے تفتیش کی کارروائی سے گریز کر لیا۔ بندروں کے ایک ٹولے نے شہادت دینے کی پیش کش کی اور جسٹس عقاب کے بال و پر نوچنے لگے۔ میمنے کی برادری نے دلیل پیش کی کہ بھیڑیوں، لومڑیوں اور بندروں کے بیچ گٹھ جوڑ ہے۔ اعلیٰ حضرت شیر کو اس رویے کے بارے میں تشویش ہوئی، لیکن چونکہ وہ اس تنازعے سے برطرف رہنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے مداخلت نہیں کی۔

جسٹس عقاب کی رپورٹ شیر کے حضور میں پیش کی گئی۔ میمنے کی برادری اعلیٰ حضرت شیر کے غار کی طرف چلانے لگی۔ ان کی چلاہٹ کی گونج دن، رات پہاڑیوں اور وادی میں گونجنے لگی۔ میمنے اپنی بھاری توانائی کا اظہار کر رہے تھے۔ انہیں جتایا گیا کہ آپ کا رویہ دل شکن ہے آپ صبر سے کام لیجیے۔ لیکن وہ سننے سے انکار کر رہے تھے۔ زبان چلانے سے ان کے گلے بیٹھ گئے لیکن انہوں نے چلانا بند نہیں کیا۔

باقی صفحہ [illegible] پر

یدھشٹر

# تاثرات

دن کے دس بجکر پچاس منٹ ہو چکے ہیں۔

نئی دہلی میں نہرو ہاؤس کے سامنے کی سڑک پر آمدورفت رک سی گئی ہے اور سڑک پر کھلبلی ہوئی، شوروغل مچاتے ہوئے اسکوٹروں، موٹر کاروں اور بسوں کی قطاریں ہی قطاریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان سب کے علاوہ پیدل چلنے والے آدمی، عورتیں اور بچے، تھکی ہوئی آمدورفت کی بھیڑ میں سے نکلتے ہوئے بڑی جلدی میں کہیں نہ کہیں جانے اور اپنی اپنی منزل پا لینے کے آرزومند ہیں۔

نہرو ہاؤس کی دیواروں پر موجود گوتیا فوں کا رنگ اڑ چکا ہے۔ لیکن اب بھی ان کی پرانی آنکھوں میں یہ سوال اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ "اے لوگو! آپ کدھر جا رہے ہیں؟ یہ ہماری آنکھوں کے آگے کیسا جمہید سا یہ ہے؟ میں گاندھی جی اور نہرو کے کیے ہوئے کام کے بارے میں سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کیا انہوں نے کبھی اپنے خوابوں میں بھی اس طرح کی صورت حال کا اندازہ کیا تھا؟"

اچانک میری توجہ ایک بس کی طرف مبذول ہو جاتی ہے، جس پر یہ لکھا ہوا ہے کہ "آزادی کے بعد ہم نے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔ لیکن ہمیں قطاروں میں کھڑے ہونا ابھی تک نہیں آیا"۔ ہاں ہم نے قطاروں میں رہنا نہیں سیکھا۔ لیکن کیا ہم سیکھ سکتے ہیں، اس طویل و عریض صحرا میں جہاں ہر کوئی اپنی جان بچانے کے درپے ہے اور اپنا مقصد پورا کر سکنے کے لئے ہر وسیلہ اور سب وسیلے کام میں لانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ یہ سب گندے پانی کے زندہ جرثومے کی طرح ہے اور کوئی شخص جو جوہڑ میں قطار باندھنے کا کبھی تصور کر سکا ہے؟ یہ تو ایک زندہ نظام ہے، جس کے اپنے ہی قوانین ہیں۔ ان قوانین کو ہر علم کا ماہر ترین سائنسدان بھی ابھی تک دریافت نہیں کر سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے زندگی کے تمام نظام اس جوہڑ میں ہی اپنا وجود کھو بیٹھے ہیں۔

گاڑیوں کا شوروغل سے بھرا جمگھٹ پھر سے حرکت میں آ گیا۔ میں نے اس انبوہ میں دوسرے مسافروں کا خیال کیا۔ میں حیران تھا کہ آیا وہ بھی صورتاً کچھ سوچ رہے تھے۔ ہاں، میری طرح اس حالت میں نووارد لوگ، بلاشک حیران ہو رہے ہوں گے۔ وہ بحران میں مبتلا اور شاید خوف زدہ بھی ہوں گے، تاہم سوچ میں ضرور ڈوبے ہوں گے۔ مقامی لوگ اپنے کام، دھندوں، نوکریوں، دفتروں، اور تاخیروں کی فکر میں ہوں گے۔ آپ قارئین حضرات کیا پیش کر سکتے ہیں۔

میں یہ سوچ سکتا ہوں کہ ہم اس صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے انفرادی طور سے دراصل معاون نہیں ہو سکتے۔ گندے جوہڑوں کو بیرونی طرف سے تازہ اور صاف پانی کے فواروں سے ہی صاف کیا جا سکتا ہے۔ اس سے نظام میں راحت آئے گی اس میں نئی توانائی پیدا ہو گی اور شاید یہ تبدیلی بھی ہو جائے غالباً آپ قارئین کے پاس کچھ خیالات ہیں۔ اور اگلی بار آپ بھی ان کالموں کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کریں، ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

دوسری ہر ریاست کے متمول لوگ دہلی کے متمول لوگوں کے قریب آنے پر مائل رہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا پاگل پن ہے جو آج ہندوستانی فطرت میں گھر کیے ہوئے ہے۔ دوسرے لوگوں کو دہلی آنے کے لئے کئی وجوہات میسر ہیں۔ اور حسب معمول ہر متمول آدمی کے پیچھے دس غیر متمول افراد دہلی جا کر میں آ جاتے ہیں کیونکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ متمول اور غیر متمول افراد کا باہمی میل جول کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

میری آٹو رکشا کا ڈرائیور کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ جوں ہی بھیڑ کی وجہ سے گاڑی ایک جگہ رکی تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا بول رہا تھا۔ وہ بولا "میری گاڑی میں پٹرول ختم ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ سب وقت کی خرابی اور پٹرول کی کھپائی رکاوٹیں اور ہماری راہنمائی میں ہر روز ٹریفک میں خلل پڑتا ہے۔ اور سلامتی کے مسائل در آتے ہیں آخر ہم کیا کر سکتے ہیں حضور، ایسا ہی چلتا ہے" ان الفاظ کے ساتھ اس نے میرے زحمت سے دوچار ہونے کے لئے معذرت چاہی۔ اس نے اپنی گاڑی ایک طرف کر لی۔ میں نے کرایہ ادا کیا اور پیدل چلنے لگا۔

اچانک میری نگاہیں انڈیا گیٹ کے گرد چند کھلے مقامات پر پڑیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس کشادہ فضا سے امید کی ایک کرن نمودار ہوئی۔ فروغ و ترقی کے لئے ہمارے سامنے صاف صاف راستے ہیں۔ ہمیں اپنے رویے بدلنے ہوں گے اور اپنی منزل مقصود کا پھر سے تعین کرنا ہوگا۔ سب سے زیادہ ہمیں اپنے پیش نظر پہلے سے کہیں اوپر کی جانب دیکھنا ہوگا۔ یہ صرف ممکن ہی نہیں بلکہ بالکل ضروری بھی ہے۔

اگر ہم کوشش کریں، سوچیں، اور جم کر کام کریں، تو ہم اپنے مقاصد کو پا سکتے ہیں اور سب کے لئے بہتر زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔

## بقیہ: ضمیر کا کرب

بن مانس جانب داری کے حق میں نہیں تھا اور وہ اس افراتفری سے بے رخی برت رہا تھا۔ کوئی جنگلی جانور اس کے راستے پر آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ حالات کوئی بھی رخ اختیار کریں اس کے مفادات برقرار رہتے تھے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بیٹھے ہوئے گلے کے ساتھ میمنوں کا چلانا اس کی آتما کو اندر اندر جھنجھوڑ رہا تھا۔ انصاف میں تاخیر، تعطل اور کم ہوتی امید کا کرب اسے ایک ذاتی اذیت کی طرح دکھ دے رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک عجیب و غریب آن دیکھا جذبہ تھا۔ گویا پاگل پن کے جوش کے ساتھ وہ حضور اعلیٰ شیر کی خلوت میں جا گھسا اور چلا کر کہا حضور اعلیٰ میں نے اپنے راستے میں دیکھا کہ بیچارے میمنے کو، جو اس تمام جھگڑے کا سبب تھا، دریا کے پار لومڑی کی طرف پھینک دیا گیا ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں سرکشی کر رہا ہوں۔ آپ معاملات کو سنوارتے نہیں تو میں قانون اپنے ہاتھ میں لے لونگا۔

اس لمحے میں، بادل میں بجلی کی چمک کی طرح "انسان" اس جانور کے وجود سے باہر نکل آیا جو کبھی بن مانس تھا۔ حکایت کا اخلاقی سبق یہ ہے کہ قانونی کھلواڑ جبر اور بے حسی کا شکار ہو جاتا ہے: ضمیر کا کرب

# تبصرہ

(ادارہ)

**بمبئی کی بزم آرائیاں (خود نوشتہ سرگذشت)**
**مصنف : رفعت سروش**

انگریزی ادب میں ہر دور کے ممتاز شاعر اپنے وقت کے تنقید نگار بھی تھے۔ تنقید نگاری کی بدولت انھیں صاحب طرز نثر نگار ہونے کا شرف بھی حاصل رہا۔ میتھیو آرنلڈ، کالرج اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ یہی صورت حال ہمیں اردو ادب میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ فراق گورکھپوری جوش ملیح آبادی، آل احمد سرور، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، علی سردار جعفری، اور وزیر آغا جیسے چند نام ایک ایسے ہی مثالی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ ان حضرات کا بنیادی طور سے شاعر ہونا اور تنقیدی نگاری وغیرہ کے وسیلے سے صاحب طرز نثر نگار بن کر منظر عام پر آنا خاصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ مختصر یہ کہ جو قلم کار بنیادی طور سے شاعر ہوتا ہے وہ اپنی نثر نگاری میں بھی تلاش و توازن، تہذیب و تناسب کی ایسی کائنات اجاگر کرتا ہے جس میں فصاحت بولتی ہے اور رمز و کنایہ سر دھننے کی دعوت دیتے ہیں۔

جناب رفعت سروش کی سابقہ نثری پیشکش، "نقوش رفتہ" کا اجرا کرتے ہوئے اردو کے معتبر محقق جناب مالک رام نے کہا تھا "کاش رفعت سروش شاعری چھوڑ کر نثر نگاری اختیار کر لیتے" حالانکہ جناب مالک رام کا یہ ارشاد شاعری کے بارے میں ان کے ذہنی تحفظ کا غماز ہے، پھر بھی ان کا یہ کہنا بجا تھا۔ کاش انہیں یہ بھی محسوس ہوتا کہ ایک شاعر کا نثر نگاری میں صاحب طرز ہونا اکثر و بیشتر اس کی شعری صلاحیت اور تخلیقی جولان سے براہ راست ودیعت ہوتا ہے۔

لہٰذا نقوش رفتہ کے قلم کار اور اس صورت حال کی تہہ میں نظم، گیت، اوپیرا کے غیر معمولی تخلیق کار اور اس کے ساتھ ہی جستہ جستہ غزل کی قوس قزح سے بہلنے والے فنکار کی تحریری مینا کاری کا نظارہ کرنا ہو تو جناب رفعت سروش کی زیر نظر نثری تصنیف "بمبئی کی بزم آرائیاں" کا مطالعہ خاصا دلچسپ ہے تیرہ سال پر محیط بمبئی میں ان کا قیام اور اس سے وابستہ تمام ترواجیاتی، منصبی، سماجی اور ادبی پہلوؤں کی جزئیات نگاری نہ صرف رفعت صاحب کی بے پناہ یادداشت کا بین ثبوت ہے۔ بلکہ یہ ان معاشی ماحولیاتی اور جمالیاتی حقائق کا منظر نامہ بھی ہے جو سماج کے درمیانہ طبقے سے وابستہ ادیب کو بمبئی جیسے رنگارنگ شہر میں "چالوں" کی زندگی سے لے کر فلمی دنیا کے شوخ و شنگ ماحول اور دیگر رئیسانہ فضاؤں کو بے نقاب کرتا ہے۔ رفعت صاحب کا اسلوب نگارش ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک کے بمبئی کے نقش و نگار، کوچہ و بازار، نشہ و خمار، عجز و وقار اور شعور و شعار کے نمایاں خد و خال کی بھرپور نقاشی اور عکاسی کرتا ہے۔ ان کے اسلوب میں زبان کی سادگی، بے ساختگی، برجستگی اور ان خوبیوں کی تہہ میں بذلہ سنجی اور لطیف سے طنز و مزاح کی نرم رو زیریں لہریں ان کی تحریر کی دلکشی کو برقرار رکھتی ہیں جس کی وجہ سے قاری ان کی اس تصنیف کو ایک تازہ ترین سفرنامے اور فسانۂ عجائب کی طرح پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

جناب رفعت سروش کے شاعرانہ منصب سے ہٹ کر ان کی ادیبانہ شخصیت کا جو حلیہ ان کی نثر نگاری میں دریافت کیا گیا ہے۔ اگر وہ سونا ہے تو زیر نظر کتاب کی جمالیاتی ساخت پرداخت اس پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔ مہنگائی کے اس دور میں اس قدر عمدہ طباعت، کاغذ کی خوبی اور صحت بیان سے لیس کتاب کی قیمت جہاں حقائق کی آئینہ دار ہے وہاں قیمت کا جواز بھی پیش کرتی ہے۔ اردو میں اس پایہ کی خود نوشتہ سرگذشتیں شاذ و نادر ہی منظر عام پر آئی ہیں۔ گویا جوش ملیح آبادی کی یادوں کی برات کے بعد یہ تصنیف اردو ادب میں ایک منفرد اضافہ ہے۔ امید ہے قارئین اس کا تہہ دل سے خیر مقدم کریں گے۔

**کتاب "آٹھویں دہائی میں بہار کا اردو ادب"**
**مرتب : ارتضیٰ کریم**

(ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ) نے ادبی تنقید و تحقیق کی حمایت میں لکھا ہے۔

میں سمجھتا ہوں اس قسم کی خدمت ادب کے ہر ذمہ دار طالب علم پر فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ ایلیٹ کا اشارہ بیجا ماضی پرستی کی جانب نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ یگوں سے چلی آرہی علم و ادب کی لڑی ہر صورت بحال رکھی جانی چاہیئے تاکہ اس کا کوئی موتی وقت کے نٹ کھٹ ہاتھوں کی چھیڑ چھاڑ میں تاریخ کے دھاگے سے علاحدہ ہو کر گردش زمانہ کا شکار نہ ہو جائے۔

ہم اپنے فنکاروں کے بت نہیں بنا سکتے مگر انہیں اپنی ادبی اور ثقافتی تاریخ کے اوراق میں تو محفوظ کر ہی سکتے ہیں۔ یہ کام جو پچھلی صدی کے چند تذکرہ نویسوں نے شروع کیا تھا اور جسے ہمارے ہمعصر بزرگ مالک رام صاحب، کالیداس گپتا رضا اور گوپی چند نارنگ دیوار کے اس طرف اور شفق خواجہ اور طاہر تونسوی جیسے مدبرین ادب اس طرف اس نیک کام کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں آج جو کام ہو رہا ہے۔ وہ اسی جذبہ کی توسیع ہے جس کے زیر اثر اردو زبان و ادب کے محترم بزرگ مولانا محمد حسین آزاد (مرحوم) نے وقت کا ساقی بن کر آب حیات پلا دی تھی۔ برطانیہ میں

نام کی سیریز جو پہلی جنگ عظیم سے بھی پہلے شروع ہوئی تھی، آج تک جاری و ساری ہے۔

ارتضیٰ کریم کی کتاب "آٹھویں دہائی میں بہار کا اردو ادب" میں برصغیر کے ایک واحد خطۂ زمین کے اردو مصنفین کی ان تمام نگارشات کو مناسب تفصیلات سے آراستہ کیا گیا ہے جو ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۰ء تک کتابی صورت میں شائع ہوئیں مطبوعات کی فہرست سازی صنف وار بمطابق حروف تہجی کی گئی ہے سن اشاعت کو ترجیح دی گئی ہے۔ تاکہ ترتیب کا ایک باقاعدہ سلسلہ بن جائے اور دس سال کے اس عرصے میں شائع ہونے والی

ہر کتاب یعنی تمام تصنیفات اور تالیفات کا اندراج ہو جائے اور یہ وضاحتی کتاب حتی الامکان ایک ایسا معتبر ادبی کیٹیلاگ بن جائے جسے اردو زبان و ادب کے محققین اور ناقدین بوقت ضرورت مستقبل میں بھی حوالے کے طور پر استعمال کر سکیں۔

(زعفنی کریم باضابطہ طور پر ابھی نقادوں کی فہرست میں نہیں آتے، میرا مشورہ ہے کہ وہ کبھی بھی اس فہرست میں شامل نہ ہوں کیوں کہ وہ خاصے اچھے تخلیق کار ہیں اور کہانی سے باضابطہ طور پر جڑ رہے ہیں۔ آج کل وہ جس قسم کے افراد کی صحبت اور جس قسم کے ذہنی ماحول سے اپنے آپ کو وابستہ کیے ہوئے ہیں وہ انہیں کسی دوسری سمت جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ وہ ادھر اُدھر کبھی بھٹکے بھی تو گھوم پھر کر لوٹ آئیں کہ غم روزگار غم جاناں سے بھی ظالم ہوتا ہے۔ مگر ادب اور فنون لطیفہ کی دنیا غریب اور بے سہارا ہوتے ہوئے بھی جب اپنے شہری چن لیتی ہے تو انہیں ادھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتی۔ تخلیق کا نشہ افیون یا شراب کا نشہ نہیں جو چڑھتا ہے تو اُتر بھی جلد ہی جاتا ہے۔ یہ نشہ ایک بار کسی کے خون کی ناڑیوں میں بہنا سیکھ جائے تو تا حیات وہیں رما رہتا ہے)

یہ کتاب کوئی تخلیقی یا تنقیدی معرکہ نہیں مگر ایک اچھے طالب علم کی نصابی ضروریات کے تحت ترتیب دی ہوئی بہار کی ان تمام اردو مطبوعات کا محاصرہ ہے جو اس صدی کے آٹھویں دہے میں منظر عام پر آئیں۔ ان میں جہاں شعری نگارشات (غزل، نظم، مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ) شامل ہیں وہیں نثری نگارشات (افسانہ، انشائیہ، خاکہ، ڈراما، رپورتاژ، سفرنامہ، سوانح اور ناول) کی تفصیلات بھی درج ہیں۔ ان تخلیقی کارناموں کے علاوہ بہار کے علما اور فضلا کی تحقیقی، تنقیدی اور صحافتی تصنیفات بھی مع تبصروں یعنی چھوٹے چھوٹے آئینوں جیسے تنقیدی جائزوں کے درج ہیں۔ ان تاریخ وار اشاریوں کو ایک نظر دیکھ کر ہر نکتہ رس طے کر سکتا ہے کہ پوری کتاب کہاں تک دلچسپ یا مفید ہوگی۔ یہ کتاب نوجوان مرتب کی صحافتی صلاحیتوں کا ایک ایسا پیش خیمہ ہے جس میں وہ تمام امکانات جھلکتے دکھائی دیتے ہیں جن سے ادبی شخصیتیں نشوونما پاتی ہیں۔ لہٰذا ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب بہار اکیڈمی کے مالی تعاون کی ہر اعتبار سے حق دار تھی لہٰذا اراکین اکیڈمی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں

**کتاب : تصوف کی باتیں**

**مصنف : ڈاکٹر ظہور الحسن شارب**

ڈاکٹر ظہور الحسن شارب کی کتاب "تصوف کی باتیں" جسے تاج پبلشرز نے جنوری ۱۹۸۶ء میں دہلی سے شائع کیا تھا، ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ یہ کتاب جو ہر اعتبار سے اعلیٰ اور معیاری ہے، اپنی نوعیت کی غالباً پہلی کاوش ہے۔ اس میں تصوف کی تعلیمات، اصطلاحات، معمولات و متعلقات نہایت سلیس عبارت میں بیان کی گئی ہیں۔ مشکل زبان و بیان سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے تاکہ اسے آسانی اور دلچسپی سے پڑھا جا سکے۔ فاضل مصنف نے تصوف پر کیے جانے والے تمام اعتراضات کا مناسب اور قابل فہم جواب دیتے ہوئے قارئین کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی شریعت اور حقیقت جیسا کہ عام طور پر سمجھا اور کہا جاتا ہے، دراصل متضاد نہیں ہیں۔

۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ چھوٹی سی کتاب ہر اس گھر میں رکھی جانے کے قابل ہے جس کے افراد تصوف کی باتوں میں دلچسپی رکھتے ہیں اور مذاہب کا احترام کرتے ہوئے بھی سیکولر نقطۂ نظر سے زندگی کی تعبیر کرتے اور جیتے ہیں۔ مضامین عام روش کو چھوڑ کر چودہ

خطوط کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔ ایک
اگر فلسفۂ تصوف پر جانے مانے اعتراضات ہ
دوسرے میں ان کا تفصیلی جواب دیا گیا ہے
اس انداز سے کیا گیا ہے کہ تصوف کے دونوں ر
اپنے آپ سامنے آجاتے ہیں اور اس عظیم ف
حیات کی پوری افادیت و اہمیت کا قاری ک
اندازہ ہو جاتا ہے۔

انسان کو روحانی پستی، زبوں حالی، لا
اور جھوٹے اوہام سے نجات دلانے کے لیے ہی
حیات مسیحائی درس اور وجدانی کیفیت کے طور
ہوا تھا۔ ذوق و شوق اس کی بقا ہے عشق و مح
اس کا رکن اول اور ذات مطلق تک پہنچنے کا
معرفت اس کی خصوصیت، فنا فی الذات حق اس ک
اور بقا در بقا اس کا نتیجہ ہے۔ یہ آدمی کو آدم
محبت کرنا سکھاتا ہے اسے رب کی رضا میں رہ
سکھاتا ہے۔

سیکولر لٹریچر میں یہ کتاب اتنا ہی اہم اضافہ ہے جتنا
لٹریچر میں۔

مناسب ڈھنگ سے کتابی صورت میں
یہ قیمتی دستاویز دس روپے میں فی زمانہ بے حد

**بقیہ بے زبان**

جن لوگوں نے ابھی تک اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ ان میں سے ا
اس پر جھپٹتے ہوئے جواب دیا۔ "اس کالے آدمی نے ہمارے چرچ پر
بجائی ہے۔"

حبشی تب بھی خاموش رہا اور محض اپنی آنسوؤں سے خشک آنکھو
دیکھتا رہا۔

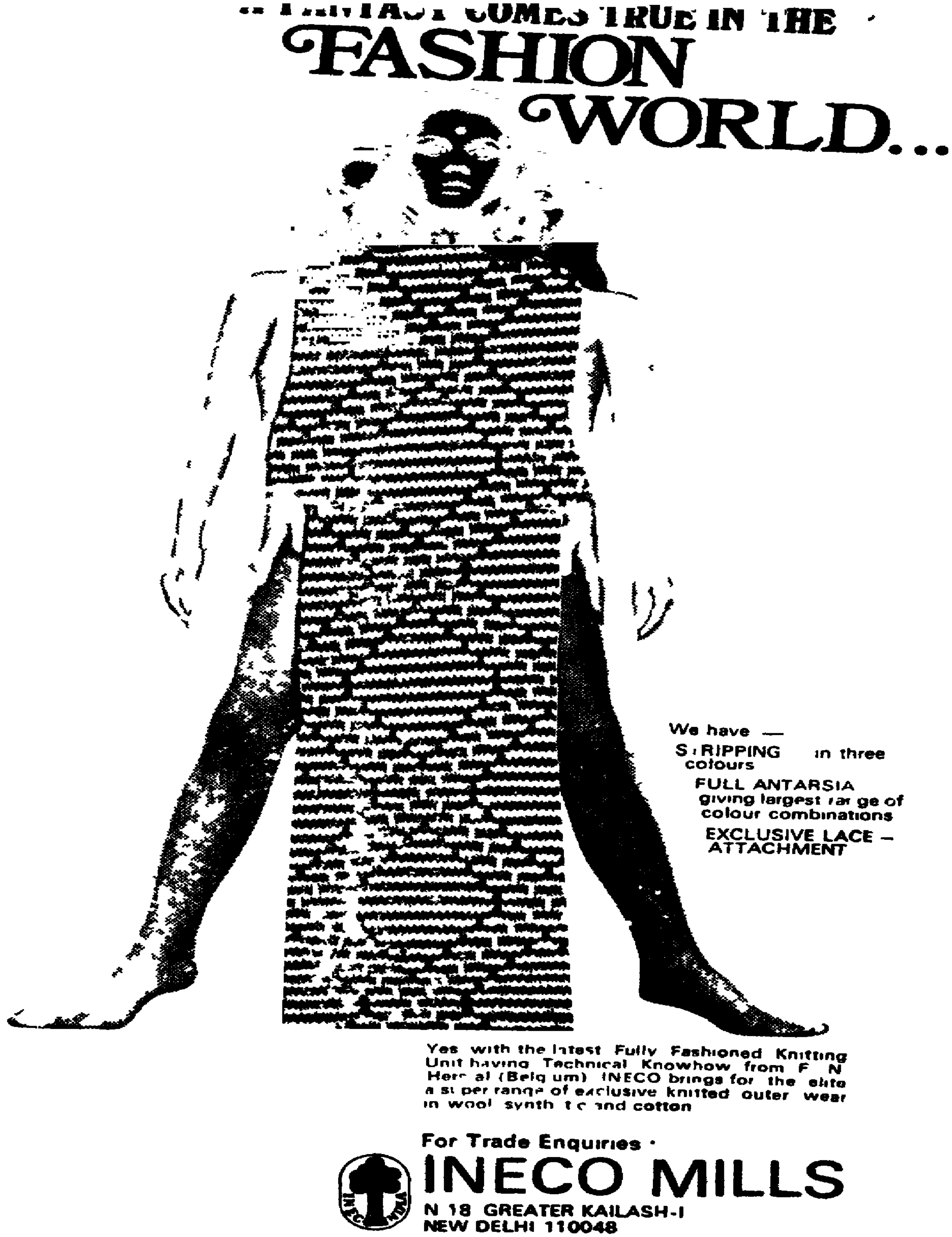
ایک نے آگے بڑھ کر اس کے منھ پر تھوکتے ہوئے کہا "تم کمینے جم
پھانسی کے لائق ہو۔"

بھیڑ اور بڑھنے لگی۔ کوئی چلایا۔ "ہمیں شروع ہو جانا چاہیے۔ ہمیں
تیل ڈال کر اسے جلا دینا چاہیے۔ غلیظ، گندگی کا ڈھیر۔"

اتنے میں پولیس کا ایک سپاہی آگیا۔ اپنی گولیوں سے بھری پستول
تھامے، ہجوم کو چیرتا ہوا وہ حبشی کے پاس پہنچ گیا اور اسے گھسیٹتا ہوا
کے پاس لے آیا۔

اسی شام حبشی کو خدا کے گھر میں دخل در معقولات کرنے کے الزام پ
طرفہ فیصلے کے مطابق پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔

پھانسی دینے والے نے بعد میں اپنی بیوی سے کہا۔ "جانے وہ کیسا انس
تھا کہ پوری کارروائی کے دوران اپنے حق میں ایک لفظ بھی منھ سے نہ بولا
سب کو وہ صرف اپنی کتے جیسی مظلوم آنکھوں سے تکتا رہا۔ وہ اتنا کالا تو
تھا۔ شاید وہ اصلی نیگرو نہ ہو یا شاید حرام کی اولاد ہو۔ اس کی ہتھیلیوں کی
کو دیکھنے سے لگتا تھا جیسے کسی نے ان میں کیلیں گاڑ دی ہوں ـــــ بے چا


COMES TRUE IN THE
FASHION
WORLD...
We have —
STRIPPING in three colours
FULL ANTARSIA giving largest range of colour combinations
EXCLUSIVE LACE — ATTACHMENT
Yes with the latest Fully Fashioned Knitting Unit having Technical Knowhow from F. N. Herstal (Belgium) INECO brings for the elite a super range of exclusive knitted outer wear in wool, synthetic and cotton
For Trade Enquiries :
INECO MILLS
N 18 GREATER KAILASH-I
NEW DELHI 110048

اداریہ



# سیاسیات میں دوستی کا دخل

سیاست، سیاسی امور اور سیاسی مسائل عوام کے ساتھ ایک گہری وابستگی کے حامل ہیں، بلکہ سادہ الفاظ میں سیاست اس عمل کا نام ہے جس کے ذریعہ ملک کے عوامی مسائل حل کرنے کے لیے حکومتی طاقت حاصل کی جاتی ہے۔ اس لیے اس عمل میں ذاتی دوستی اور رشتہ داری کا اصولاً کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی دوستی اور رشتہ داری سیاسیات میں دخل انداز ہوئی، تو سیاسی رہنماؤں کے لیے بلا وجہ مشکلات پیدا ہوئیں۔ جمہوری نظام میں جب حکومتیں عوامی رائے سے تشکیل پاتی ہیں اور جب رہنماؤں کو قوم کا اعتماد حاصل ہوتا ہے، تو وہ اعتماد اگر کسی ایسے طبقے کے لیے استعمال کیا جائے جو عوام کی نگاہ میں اس مفاد کا مستحق نہ ہو تو ناراضگی کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے، جس کے جواز سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کے پس منظر میں کار فرما اصول یہ ہے کہ کوئی بھی سیاسی عہدہ یا رتبہ کسی شخص کو تحفتاً محض اس لیے کہ وہ کسی رہنما کا منظور نظر ہے، نہیں بخشا جا سکتا، اور ایسا عہدہ صرف استحقاق و اہلیت کی بنا پر ہی عطا کیا جا سکتا ہے۔ اس اصول کی خلاف ورزی فی الحقیقت جمہوری طرز فکر اور نظم و نسق کے منافی ہے۔

گزشتہ چند ہفتوں کے دوران پیدا شدہ صورت حال اس اصول کی درستی اور جواز کو پوری طرح ثابت کر دیتی ہے۔ کانگریس (آئی) اور کانگریسی سرکار کے اندرونی حلقے جو ملک کے اہم فیصلوں میں شریک کار ہوتے ہیں، وہ بہت حد تک ایسے اشخاص پر مشتمل ہیں جو نہ تو جماعت کے اندر نہ حکومت میں کسی تسلیم شدہ عہدے پر فائز ہیں۔ فیصلوں کی تشکیل میں ان کی شمولیت محض وزیراعظم کے ساتھ دوستی اور ذاتی تعلقات پر مبنی ہے۔ حالیہ صورت حال میں ایسے لوگوں کی وزیراعظم کے ساتھ قربت کچھ اہم فیصلوں اور کارروائیوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں سدّ راہ بنی جو حکومت ہند اور کانگریس پارٹی کے لیے ہی نہیں بلکہ وزیراعظم کے لیے بھی باعث تشویش ہوئی۔ اگر عوامی غم و غصہ کے باوجود دوستی اور ذاتی تعلقات کا یہ سلسلہ جاری رہا تو اس کے اثرات کانگریس اور کانگریسی ارباب حکومت پر فیصلہ کن حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ہمارے طرز فکر کے مطابق دوستی کو سیاسیات سے الگ رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مذہب کو سیاسیات سے علاحدہ رکھنا۔

کیا اچھا ہو کہ ہمارے رہنما اس اصول کی حقیقت کو تسلیم کر کے اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔

(ایڈیٹر ان چیف)

[illegible]

[illegible]

ماہنامہ حال چاند پابندی سے ماہ مارچ [illegible]
کا شمارہ حوالے ہوا۔ میری دانست میں حال چاند [illegible]
معیاری رسالہ ہے جو اسی سلسلے کو [illegible]
پھولتے پھلتے ترقی کی منازل پر گامزن رہے۔ کیونکہ اردو کی
[illegible] میں ترقی جو اس دور میں [illegible] اردو کی نشر
و اشاعت آپ حضرات کی مرہون منت ہے۔ حال
چاند کے اوراق پر [illegible]
خوبصورتی کے لحاظ سے دوسرے پرچوں سے [illegible]
بہتر ہے۔ آپ نے اس گلستان حال چاند کو ایسا
خوبصورت بنا دیا ہے جو دوسرے پرچوں کو نصیب
نہیں۔ شاید اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا

کوئی سامان ان اوراق پریشاں میں نہیں
پھول وہ تم نے چنے ہیں جو گلستاں میں نہیں

عبدالحق الصدیقی
[illegible]

حال چاند پر نظر پڑی [illegible]
[illegible] مشمولات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ اردو
کا ایک خوبصورت کارنامہ اور منفرد رسالہ ہے۔ [illegible]
کے خرچ کی وجہ سے ہر روز کی [illegible] کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور
سوچنے سمجھنے والوں کی [illegible]
اپنے آپ پر افسوس [illegible]
[illegible] رہا۔ اردو میں [illegible] معیار کے ساتھ [illegible]
[illegible]
ملے۔ حال چاند کے اجرا نے اردو صحافت کو وقار اور معیار
بخشا ہے۔

ابو الاحتشام
ناگپور

# فہرست

## سرورق کہانی



## حالاتِ حاضرہ



## احوالِ وطن



## عکس ریز



## ادبی دنیا



## پردۂ سیمیں



## جہانِ تمثیل

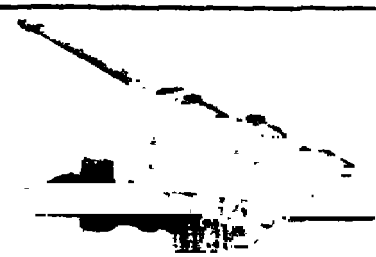


## کھیل کے میدان سے



## سرگرمیاں



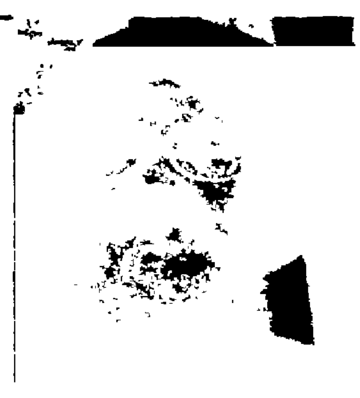
**سرورق کہانی ۴**

قوموں کی تاریخ میں ایسے مواقع کبھی کبھی آتے ہیں۔ جب کوئی ایک حادثہ دھماکہ پوری عمارت کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور اس کی گونج دیر تک، دور تک سنائی دیتی ہے۔ وشوناتھ پرتاپ سنگھ، فیرفیکس اور بوفورس کے شکنجے کی کہانی۔

**احوالِ وطن ۲۶**

برنالہ کا پنجاب۔

عوام کو اعتماد میں لے کر مسئلے کا حل تلاش کرنے کا نیا نسخہ: مفصل رپورٹ۔





**حالاتِ حاضرہ ۲۲**

ہریانہ میں دیوی لال اور بنسی لال کی ٹکر، بقاء کی جنگ: ہلچل کی کہانی۔

وشوناتھ پرتاپ سنگھ

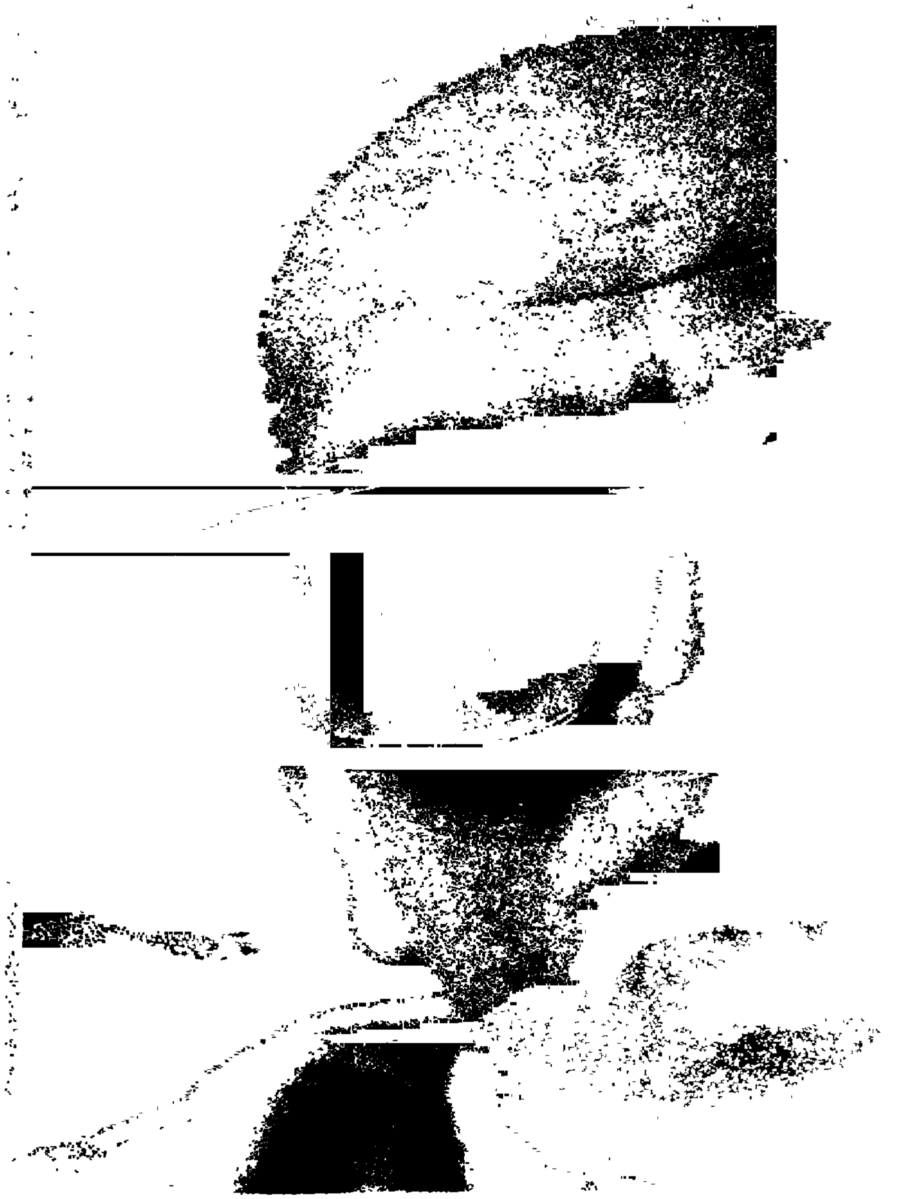
# بڑے بے آبرو ہو کر تر

قوموں کی تاریخ واقعات و حادثات سے پُر ہوتی ہے۔ ایسی ہی کسی ایک واقعہ یا حادثہ کی عمر چند دن، چند ہفتے اور کبھی چند ماہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لوگ ایک حادثے کو بھلا کر دوسرے حادثے پر بحث شروع کر دیتے ہیں اور پھر کسی نئے حادثے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح زندگی کی ہماہمی حادثوں سے عبارت ہے۔ لیکن کبھی کوئی ایک واقعہ یا کوئی ایک حادثہ اتنا اہم ہو جاتا ہے۔ اس کے اثرات کے سائے اتنے لمبے ہو جاتے ہیں کہ پورا ملک اور پوری قوم اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں اور اس ایک حادثے کی گونج ایوانوں سے لے کر گلی کوچوں اور جھونپڑیوں تک سنائی دینے لگتی ہے۔ قانون ساز اداروں کی بلند و بالا کرسیوں پر ایستادہ حکمراں طبقہ سے لے کر پُر تعیش و دولت کدوں میں نیم دراز حسن آسان طبقۂ اعلیٰ تک، دانش گاہوں کے مقدس ماحول میں غور و فکر میں غرق عالموں و دانشوروں تک، عدالتوں کے گلیاروں میں گرما گرم تبادلۂ خیال کرتے وکیلوں تک، کارخانوں میں مشینوں سے جوجھتے کاریگروں و مزدوروں تک اور کھیتوں میں فصل کاٹتے کسانوں تک سب اسی ایک واقعہ کا چرچا کرنے لگتے ہیں۔ ایوانِ بالا کی فصیلوں کے پیچھے سرگوشیوں میں شور سے ہونے لگتے ہیں، سازشیں ہوتی ہیں اور سازشوں کے توڑ کی تدبیریں تلاش کی جاتی ہیں۔ اخبارات شہ سرخیاں جماتے ہیں۔ دھماکے دار اداریے قلم بند ہوتے ہیں اور عوام صبح و شام ریڈیو سے کان لگاتے ہیں۔ اپنا کام کاج چھوڑ کر ٹیلی ویژن کے سامنے جم کر بیٹھتے ہیں اور چند دنوں میں ہی ایک حادثہ بھی ایک واقعہ سب سے گرما گرم سلگتا ہوا عصری موضوع بن جاتا ہے۔ پھر ایک واقعہ، ایک حادثہ ایسا زبردست روپ دھارن کرتا ہے کہ پورے ملک پر چھا جاتا ہے۔ کبھی دیو زاد بن کر پوری قوم کو جھنجھوڑ دیتا ہے تو کبھی زلزلہ بن کر ایوانِ حکومت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

ایسے بے شمار تاریخ ساز واقعات برطانیہ میں بھی ہوئے ہیں۔ امریکہ میں بھی، جاپان میں بھی اور تیسری دنیا کے کئی ملکوں میں بھی۔ واٹر گیٹ کی گونج آج تک باقی ہے اور اپنے جھٹکے اثرات کے سبب یہ لفظ ایک خاص معنی اختیار کر کے جدید لغت کا حصہ بن گیا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ہمارے وطن ہندوستان جنت نشان میں بھی پیش آیا ہے جس کی گونج آج پوری فضا میں ہے۔

یوں پوری قوم میں کسی ایک شخص کا بساطِ سیاست سے ہٹ جانا کوئی اہم واقعہ نہیں۔ مگر کبھی کبھی صرف ایک ہستی کے جانے اور آنے یا جگہ بدل لینے سے پورے معاشرے میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ ہر ایک کی زبان پر بس اسی ایک شخص کا نام ہوتا ہے۔ اس مرتبہ بھی ہوا ہے۔

# [illegible] سے آہ نکلے



[illegible]

آزاد ہندوستان کی ۴۰ سالہ جمہوری تاریخ میں بارہا لوگوں نے اعلیٰ عوامی عہدوں سے استعفے دیے ہیں آئندہ تاریخ میں بھی کئی بار ایسے حالات پیدا ہوں گے جب بلند عوامی عہدوں سے لوگ مستعفی ہوں گے۔ اس قسم کے اعلیٰ عہدوں سے مستعفی ہونا اس اصول پر مبنی ہے کہ جب کوئی وزیر اپنے وزیر اعظم یا اس کی کابینہ کے ساتھ اتفاق رائے نہ رکھتا ہو تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے، اور اگر وزیر اعظم کی رائے میں اس وزیر کا کردار جماعت یا سرکار کی مجموعی پالیسیوں سے تضاد رکھتا ہو تو اتنا ہی حق وزیر اعظم کو حاصل ہے کہ وہ وزیر متعلقہ کو عہدے سے مستعفی ہونے کی ہدایت کرے۔ تاہم ہندوستان کے وزیر دفاع شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کا استعفیٰ اتنا اہم ہے کہ تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ وزیر دفاع کے استعفے سے ہندوستان کی سیاست کو اور خاص طور پر راجیو گاندھی کی سرکار کو جو دھکا لگا ہے اس سے شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کا کردار

کروڑوں عوام کی نگاہ میں بلند ہوا ہے۔

اس استعفے سے کچھ ایسے اہم سوال پیدا ہوئے ہیں جو کافی عرصے تک بحث و تمحیص کا موضوع بنے رہیں گے۔ جو سوال اس استعفے سے پیدا ہوئے ہیں اور جو سوال ملک کے کروڑوں عوام کو درپیش ہیں، ان میں یہ سوال شامل ہے کہ کیا امریکہ کی سراغرساں ایجنسی فیرفیکس کی خدمات اس مقصد کے لیے حاصل کرنا کہ وہ ایسے تاجروں اور کارخانہ داروں کے اس سرمایے کا پتہ لگائے جو سوئٹزرلینڈ اور دوسرے ملکوں کے بینکوں میں جمع ہیں، ایک ناپسندیدہ فعل سمجھا جا سکتا ہے، کیا اس قسم کا فیصلہ کرتے وقت وزیر خزانہ کے لیے وزیر اعظم اور مرکزی کابینہ کی منظوری حاصل کرنا ضروری تھا۔ کیا اس منظوری کے بغیر وزیر خزانہ ایک غیر ملکی ایجنسی کو یہ کام نہیں سونپ سکتے تھے۔ کیا ایسا کرنے سے کابینہ کی قانون سازیہ کے تحت مشترکہ ذمہ داری کے اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ کیا وزیر دفاع کے طور پر شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ آبدوزوں کی خرید کے

سودے کے سلسلے میں ۳۰ کروڑ روپے کی رقم ایک ہندوستانی ایجنٹ کو بطور کمیشن دیے جانے کی تحقیقات کرانے کے مجاز نہیں تھے، اور اگر یہ ناجائز ایسا کیا جا چکا تھا تو کیا وزیر اعظم اس صورت حال سے نپٹنے میں ذہانت اور موقع کا ثبوت دیا یا اس صورت حال کے ساتھ کسی ڈھنگ سے بھی نپٹا جا سکتا تھا کیا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے ان اقدامات سے کانگریس (آئی) کو بحیثیت تنظیم اور ہندوستان کی حکومت کو کوئی نقصان پہنچا ہے، جس کی پاداش میں یہ سمجھا جائے کہ شری وشوناتھ



پرتاپ سنگھ نے مرکزی وزارت کی رکنیت کا حق کھو دیا۔

یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے حکومت سنبھالتے ہی ملک کے کروڑوں رائے دہندگان کو اپنے انتخابی منشور کے ذریعہ باقی چیزوں کے علاوہ ایک دیانت دار اور پاک دامن سرکار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس امر سے بھی کوئی ناواقف نہیں کہ وزارت خزانہ کے مختلف شعبوں میں بد دیانتی اور رشوت خوری تاریخی طور پر موجود رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی مسلّمہ تھا کہ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ہندوستان کے گنے چنے دیانت داروں میں سے ایک ہیں، جن کے دامن پر کوئی داغ نہیں تھا اور ان کو وزارت مالیات، سونپے کی سب سے بڑی وجہ بھی ان کی دیانت داری اور پاک دامنی تھی۔

چنانچہ شری راجیو گاندھی نے نیک نیتی سے یہ محسوس کیا تھا کہ ان کے دلی مقاصد کے حصول کے لیے شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ہی ایک صحیح شخص ہو سکتے ہیں جو ٹیکس چوری اور دیگر گھناؤنے قسم کے جرائم، جن سے ہندوستان کی معاشیات پر بڑا غلط اثر پڑ رہا تھا، وہ ان کا انسداد کر سکتے ہیں، شری سنگھ نے وزیر اعظم کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے سارے ہندوستان میں ٹیکس چوری کے خلاف ایک ہمہ گیر جنگ کی ابتدا کی جو گزشتہ ڈھائی سال کے دوران جاری رہی۔ وزیر اعظم نے کسی مرحلہ پر بھی شری سنگھ کی طرف سے کیے گئے اقدامات کی مخالفت نہیں کی، ان کو اس امر کا پورا علم تھا کہ وسیع پیمانے پر کارروائی جاری ہے کلکتہ میں دیے گئے ایک بیان میں مختصر طور پر انھوں نے ضرور کہا تھا کہ سرکار کا کوئی ارادہ دیانت دار صنعت کاروں کو تنگ کرنے کا نہیں البتہ وزارت مالیات کی طرف سے ڈالے گئے تمام چھاپے وزیر اعظم کے علم میں تھے۔

یہ کسی حد تک درست ہو سکتا ہے کہ شری سنگھ نے ایسے چھاپے ڈلواتے وقت جو اختیارات اپنے افسروں کو سونپے، وہ غیر محدود تھے، یہ بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ کئی لوگ جو بے گناہ تھے اس کارروائی کے بلاوجہ شکار ہو گئے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جن افسروں نے اس کارروائی کو تکمیل تک پہنچایا، کسی حد تک زیادتی کے مرتکب ہوئے ہوں، مگر اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سلسلے میں شری سنگھ نے انتہائی دلیری، ثابت قدمی اور دیانت داری کا ثبوت دیا ہے، جس سے وزیر اعظم راجیو گاندھی، ان کی سرکار اور ان کی تنظیم کا وقار عام لوگوں میں بہت حد تک بڑھا ہو، اور اس کا سہرا شری سنگھ کے مقابلے میں حکومت کے سربراہ کے سر بندھا۔

چھاپوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ ولڈ بنک کی رپورٹ شائع ہوئی جس میں ہندوستانیوں کا ۱۴۱ ارب روپیہ سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں جمع ہونے کا انکشاف ہوا۔ اس قدر بھاری رقوم دوسرے ممالک کو منتقل کرنا، ہندوستانی قوانین کی خلاف ورزی کے بغیر ممکن نہیں تھا، اور اگر ملک کے اندر قوانین کی اس خلاف ورزیوں کی شہادت معقول اداروں سے فراہم نہ ہو سکتی ہو، تو اس میں کوئی امر مانع نہیں تھا کہ ایک پیشہ ور غیر ملکی سراغرساں ایجنسی سے رابطہ قائم کیا جائے جو اس کا پتہ لگا سکے کہ یہ روپیہ کیسے؟ کس نے؟ اور کہاں جمع کرایا، اور اگر شری سنگھ نے اس بنیادی پالیسی کے عین مطابق جو وزیر اعظم اور ان کی حکومت نے ۱۹۸۴ کے انتخابات کے بعد مشتہر کی تھی، ایک غیر ملکی سراغرساں ایجنسی کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تو کسی بھی صورت میں نہ تو یہ سرکار کی پالیسی

کے خلاف تھا اور نہ ہی وزیر اعظم اور کانگریس (آئی) کے اصولوں کے منافی۔ نیز کسی مجرم کو قانون کی زد میں لانے کے لیے شہادت یا اطلاعات حاصل کرنا کسی بھی صورت میں پالیسی کا حصہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔

غیر ملکی سراغرساں ایجنسی کی تقرری سے پہلے ایسے لوگوں کے شبہات وی پی سنگھ کے متعلق بڑھ گئے جو وزیر اعظم سے قربت رکھتے تھے اور جن کو اس سراغرساں ایجنسی کی تقرری سے زک پہونچنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ ایسے لوگوں نے وزیر اعظم کے کان بھرنا شروع کر دیے اور شری سنگھ کے تئیں ان کے

ساتھ قربت کا دم بھرتے تھے، چنانچہ اس مسئلہ کو پارلیمنٹ کے حدود سے باہر رکھنے کے لیے سپریم کورٹ کے دو ججوں کا ایک کمیشن مقرر کیا گیا کہ وہ اس امر کی تحقیقات کریں کہ کن حالات میں فیرفیکس کی تقرری عمل میں آئی۔

سرکار کا یہ فیصلہ حقیقت میں بالکل بے سود اور بے کار تھا، جب سابق وزیر خزانہ پارلیمنٹ میں اس بات کی ذمہ داری قبول کریں کہ ان کے حکم کے تحت ایجنسی کی تقرری عمل میں لائی گئی تھی اور انفورسمنٹ ڈائرکٹر بھورے لال نے ان کی اجازت سے امریکہ جا کر اس ایجنسی کے نمائندوں کے ساتھ

کے ڈائرکٹر شری بھورے لال بھی تبدیل کر دیے اور شری پانڈے سے محکمہ آمدنی چھین کر فائنانس سکریٹری شری وینکٹ رمن کے سپرد کر دیا گیا یہ امور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جو لوگ امریکہ کی سراغرساں ایجنسی کی تقرری کے ذمہ دار تھے برداشت نہیں کیے جا سکتے۔ ایسا کرنے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وزیر اعظم اور ان کی حکومت نہیں چاہتی تھی کہ ان لوگوں کا پتہ چلایا جائے۔

شری سنگھ کے وزیر خزانہ کے طور پر بحال رہنے سے ان کی طرف سے شروع کی گئی تحقیقات کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے پاکستان کے ساتھ




دل میں جو اعتبار تھا اس میں لرزش پیدا کر دی

شری سنگھ نے پارلیمنٹ کے ایوان میں وزیر خزانہ نہ ہوتے ہوئے بھی اس امر کی ذمہ داری قبول کی کہ فیرفیکس ایجنسی کی تقرری ان کی اجازت سے ہوئی ہے البتہ ان کے جانشین شری برہم دت نے اس امر سے انکار کیا کہ ہند سرکار نے مذکورہ بالا ایجنسی کے تقرر کا کوئی حکم دیا تھا۔ مسئلہ بڑھتا گیا حزب مخالف نے اس انتشار کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کانگریس (آئی) کے ممبران نے کھلم کھلا فیرفیکس کی تقرری کی مخالفت کی اور اس مخالفت میں وہ لوگ شامل تھے جو صریحاً وزیر اعظم کے

بات چیت کی تھی، تو پھر ایسی تحقیقات کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ یہ تحقیقات تو سرکار خود کر سکتی تھی۔ اور ایسی تحقیقات میں مرکزی وزارت کے شعبۂ مالیات کے سکریٹری شری ونود پانڈے، انفورسمنٹ کے ڈائرکٹر شری بھورے لال اور اس وقت کے وزیر خزانہ شری وی۔ پی۔ سنگھ ہی حقیقی اور چشم دید گواہ ہو سکتے تھے، تاہم کمیشن کی تقرری اس مسئلے سے توجہ ہٹانے کے لیے عمل میں لائی گئی ہے، جس کا درحقیقت کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

معاملہ اس حد تک ہی نہیں رہا، شری سنگھ کے وزارت خزانہ سے چلے جانے کے بعد انفورسمنٹ

تناؤ کے ایک غیر حقیقی سبب کو بنیاد بنا کر شری سنگھ وزارت خزانہ سے ہٹا کر ان کو وزارت دفاع سپرد کر دی گئی، اس سے تاریخ کا ایک باب اختتام پذیر

وزیر دفاع کے طور پر جب شری سنگھ علم میں یہ بات آئی کہ مغربی جرمنی کی ایک فرم نے چار سو پچاس کروڑ روپے کی مالیت کی آبدوز کشتیاں وزارت دفاع کو فروخت کی ہیں، ان کو یہ بھی معلوم کہ اس سودے میں ۷ فی صد کمیشن ایک ہندوستانی ایجنٹ کو دیا گیا جس کی کل مالیت ۳۰ کروڑ روپے ہے یہ امر بھی مسلم ہے کہ مرکزی سرکار نے ۱۹۸۰ء سے وزارت دفاع کی طرف سے خریدے گئے سامان -

سلسلے میں کمیشن ایجنٹوں کو دور رکھنے کا فیصلہ کیا تھا، اس امر کا انکشاف اس وقت کے وزارت دفاع کے وزیر مملکت شری سی۔ پی۔ این سنگھ نے لوک سبھا میں اپنی مختصر تقریر میں کیا تھا، اس سے ظاہر ہے کہ یہ مرکزی حکومت کی پالیسی تھی کہ وزارت دفاع میں سامان کی خریداری کے سلسلے میں کمیشن ایجنٹوں کو کوئی کمیشن نہ دیا جائے۔ اور اگر یہ پالیسی مرکزی سرکار کی تھی اور اس پالیسی کے باوجود وزیر دفاع کے علم میں یہ امر آئے کہ کسی ایجنٹ نے ۳۰ کروڑ کی بھاری رقم کمیشن کے طور پر حاصل کی ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وزیر دفاع ایسے فعل کی تحقیقات کرانے کے خود مجاز نہیں تھے، مشترکہ ذمہ داری کا اصول پارلیمانی جمہوری نظام میں بے شک کارفرما ہے لیکن یہ اصول صرف ان فیصلوں تک محدود ہے جو فیصلے پالیسی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اگر یہ درست نہ ہو تو انفرادی طور پر سرکاری محکمے وزارتی تحویل میں رکھنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر شری سنگھ کو یہ بتایا جاتا کہ پالیسی کے برعکس کسی کمیشن ایجنٹ نے اتنی بھاری رقم حاصل کی ہے تو ان پر فرض عاید ہوتا تھا کہ وہ اس معاملے کی تحقیقات کرائیں اور اس بے ضابطگی کی ذمہ داری کا تعین کریں۔ اس معاملے میں نہ تو وزیراعظم سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت تھی نہ ہی کابینہ سے۔

جب شری وی۔ پی۔ سنگھ نے ایوان میں تحقیقات کرانے کا فیصلہ کیا تو وزیر داخلہ نے اس اعلان کو چیلنج کیا اور دراصل اسی وقت سے شری سنگھ پر بوچھار شروع ہو گئی۔ ان کے خلاف مختلف الزامات لگائے گئے یہ بھی کہا گیا کہ انھوں نے وزیراعظم کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے اور مرکزی سرکار اور تنظیم کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ ان لوگوں کی اکثریت وزیراعظم کے ساتھ قربت کا دم بھرتی تھی۔ کلپ ناتھ رائے اور سیتا رام کیسری نے تو یہ بھی مطالبہ کیا کہ اگر شری سنگھ خود مستعفی نہیں ہوتے تو انھیں برطرف کر دیا جائے۔ دنیش سنگھ اور بی۔ آر۔ بھگت نے ایوان ہی میں شری سنگھ پر حملہ شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کمتر لوگوں نے بھی اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے شری سنگھ کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اس طرح صورت حال یہ بنی کہ شری سنگھ نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا جس کی منظوری کے لیے وزیراعظم نے اپنی سفارش پیش کر دی۔

سارے ہندوستان میں وزیراعظم کے خیرخواہوں میں صدمے کی لہر دوڑ گئی، اس لیے نہیں کہ شری سنگھ کے اقدامات سے وزیراعظم کو کوئی نقصان پہنچا تھا یا ان کی حکومت اور تنظیم کے وقار میں کوئی فرق آیا تھا بلکہ اس لیے کہ شری سنگھ کے جاری کردہ دونوں ایوانوں میں یہ اعلان کرنے کہ شری سنگھ کے جاری کیے گئے احکامات عین ان کی پالیسی کے مطابق ہیں کیوں کہ ۱۹۸۰ء سے ہی کمیشن ایجنٹوں کو وزارت



## اندرا جی کی بات اور تھی

احکامات سے پیدا شدہ صورت حال سے صحیح ڈھنگ سے نہیں نپٹا گیا۔ اور وزیراعظم کے چاپلوسوں، مشیروں اور وفاداروں نے غلط مشورے دے کر انھیں ایسے جنجال میں پھنسا لیا۔ بعینہ یہ صورت ۱۹۷۵ء میں پیش آئی تھی جب الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد اس وقت کی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے چاپلوسوں اور نام نہاد وفاداروں نے، جن میں اس وقت کے کانگریسی صدر شری ڈی۔ کے۔ بروا، اور مغربی بنگال کے اس وقت کے وزیراعلیٰ شری سدھارتھ شنکر رے شامل تھے، نے مسز گاندھی کو ایمرجنسی نافذ کرنے کا مشورہ دیا تھا، جس کے نتیجے میں ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں کانگریس کو شکست ہوئی۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ کسی شخص نے حالات کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی اور ایک نام نہاد وفاداری کی بنا پر وزیراعظم کو یہ باور کرایا گیا کہ شری سنگھ کے اقدامات براہ راست ان کے خلاف ہیں اور ان کی حکومت کو کمزور کرنے کے لیے ہیں۔ وزیراعظم کے لیے صحیح طریقۂ کار تو یہ تھا کہ وہ پارلیمنٹ کے دفاع کے سامان کی خرید سے الگ۔ کہا گیا تھا اگر وزیراعظم نے ایسا کیا ہوتا تو شری سنگھ کے ان اقدامات سے نہ صرف وزیراعظم کے اپنے وقار بلکہ ان کی تنظیم کے استحکام کو انتہائی تقویت پہنچی ہوتی اور ان کے مخالفوں کے منھ بند ہو جاتے۔ ایسا کرنے سے وزیراعظم یہ ثابت کر سکتے تھے کہ اصولوں کی تکمیل کے لیے کسی کو بھی قربان کیا جا سکتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسے معاملہ میں ملوث ہو تو اسے بچایا نہیں جا سکتا۔ رہا سوال تحقیقات کا تو وزیراعظم اس امر کے مجاز تھے کہ وہ انکوائری کو کسی بھی ڈھانچے میں ڈھال سکیں اور تحقیقات کے نتیجے کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا، شری سنگھ کا استعفیٰ منظور کیا گیا اور ان کے بار بار اعلان کرنے کے باوجود کہ وہ تنظیم اور اپنے قائد کے وفادار ہیں، ان پر حملے کیے گئے اور انھیں اب بھی مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ تمام صورت حال کی وضاحت ان تمام وجوہات کی روشنی میں کریں جن کی موجودگی میں فیرفیکس کی تقرری عمل میں آئی اور ۳۰ کروڑ روپے

سنہری موقع میسر کیا کہ جب وہ سارے ملک میں جاکر کروڑوں عوام سے یہ کہہ سکیں گے کہ کانگریسی سرکار بین الاقوامی سودوں میں اربوں روپے کمیشن کے طور پر حاصل کر رہی ہے اور یہی اربوں روپے جموں و کشمیر، کیرالہ اور مغربی بنگال کے انتخابات میں خرچ کیے گئے۔

اس سے زیادہ افسوس ناک ردِ عمل کانگریس (آئی) ورکنگ کمیٹی کے ریزولیشن سے ہوا، جس میں فیئرفیکس اور وزارت دفاع کی خریداری کے علاوہ سویڈن کی فرم 'بوفورس' کے سودے کا





سیتارام کیسری

کے کھیلے کے راستے سبھی پر دہا سکیں۔ جب کہ متعدد بار شری سنگھ اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ وہ اپنے قائد اور اپنی تنظیم کے وفادار رہیں گے، قطع نظر اس امر کے کہ وہ کسی عہدے پر فائز رہیں یا نہ رہیں۔

سب سے حیران کن امر تو یہ ہے کہ وزیر اعظم اپنی ذہانت کے باوجود ایسے چاپلوسوں کے بے تکے مشورے سے گمراہ ہو گئے اور ایک انتہائی دیانت دار رفیق کو سرکار سے علاحدہ ہونے پر مجبور کیا گیا۔ وزیر اعظم نے اس بات کا بھی صحیح اندازہ نہیں لگایا کہ ایسے مرحلے پر شری وی پی سنگھ کا استعفیٰ منظور کرنے سے وہ ملکی عوام کے اس شک کو یقین میں بدل دیں گے کہ ان تحقیقات سے وزیر اعظم اور ہند سرکار کی نیک نیتی سے یہ خواہش نہیں تھی کہ ان لوگوں کو جنہوں نے اربوں روپے ملک سے باہر جمع کرائے تھے، طشت از بام کیا جائے۔

وزیر اعظم نے سرِ اجلاس یہ کہنے میں بھی ہوشیاری سے کام نہیں لیا کہ شری سنگھ نے متذکرہ بالا دو تحقیقات کا حکم جاری کرنے سے پہلے ان سے مشورہ نہیں کیا۔ اس انکار سے صرف ایک ہی قیاس پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر شری سنگھ نے ان سے مشورہ کیا ہوتا تو شاید انہوں نے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی ہوتی۔ ایسا کر کے وزیر اعظم نے اپنے ڈھائی سالہ برسر دیانت داری کے عکس کو خود ہی نقصان پہنچایا اور حزب مخالف کو ایک

ذکر کیا گیا۔ ریزولیشن میں یہ بھی کہا گیا کہ ملک کے اندر اور باہر کچھ عناصر ملک کے استحکام کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ الزام تراشی سے ہندوستان کی سرکار کو گرانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور سب سے مضحکہ خیز بات تو یہ تھی کہ اوپر بیان کردہ طاقتوں کو ہندوستان میں رائج سیاسی سسٹم کو تہہ و بالا کرنے کا ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔ ریزولیشن میں یہ طے پایا کہ کانگریس قومی سطح سے لے کر دیہی سطح تک لوگوں کے اندر پیدا شدہ شکوک کو دور کرنے کی مہم چلائے۔

کاش کہ اس ریزولیشن کے ارادت کا صحیح جائزہ لیا جا سکتا ... کا یہ الزام کہ سرکار کرپٹ ہے سرکار کے اپنے قول و فعل سے ثابت ہوتا ہے۔ جیہ فیکس اندری سنگھ کی طرف سے مغربی جرمنی کی جانب سے ایک فرم میں ۳۰ کروڑ روپے کے گھپلے اور سویڈن ریڈیو کے اعلانات بذات خود ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ یہ معاملے تفتیش طلب ہیں۔ ٹھکر کمیشن کی تقرری شری سنگھ کی طرف سے جاری کی گئی تحقیقات کو ختم نہ کرنا اور سویڈن ریڈیو کے اعلان کے مطابق ۵۰ لاکھ ڈالر ہندوستانی کانگریسی لیڈروں کے سوئٹزرلینڈ کے بینک کے اکاؤنٹس میں منتقل ہونا بادی النظر میں ہی نہیں بلکہ فی الواقع واضح طلب معاملے تصور کیے گئے۔ اور اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو پھر گاؤں کی سطح سے لے کر ملک کی سطح تک کانگریس کی تنظیم کو کیا کہہ کر یہ شک دور کرنا ہے کہ ہندوستان کی سرکار اعلیٰ کرپشن اور رشوت ستانی کے نامراد مرض میں مبتلا ہے۔

ان امور سے ظاہر ہے کہ ورکنگ کمیٹی کی طرف سے پاس کیے گئے ریزولیشن سے وزیر اعظم، ان کی سرکار اور کانگریس کی تنظیم کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے جس کا احساس ابھی ارباب اقتدار کو نہیں ہوا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ کا ریزولیشن ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کے لیے ایک مذاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ کانگریس کے اپنے وزراء یہ کہیں کہ ۳۰ کروڑ روپے کا گھپلا ہوا ہے یا فیئر فیکس کی تقرری سے ہندوستان کے بااثر حلقے خطرے میں پڑ گئے تو پھر یہ کہنا کہ ان بیانات سے ملک کی سالمیت کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے ... یہ کہ حزب مخالف یہ نہیں چاہتا کہ ہندوستان کا ڈیفنس مضبوط ہو سراسر ایک مضحکہ خیز بیان ہے۔ ریزولیشن میں یہ بھی کہا گیا کہ اوپر بیان کردہ طاقتیں ہندوستان کے سیاسی سسٹم یعنی جمہوری



وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

طرز زندگی کو تہہ و بالا کرنے پر تلے ہوئے ہیں، یہ بھی ایک انتہائی افسوسناک بیان ہے۔ اگر مرکزی سرکار کے اہم عہدیداروں کے اپنے فعل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کچھ ایسے معاملات کی جانچ اور تحقیقات کرنا ضروری ہے جو رشوت اور بددیانتی سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ سمجھنا محال ہے کہ کیسے سسٹم کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔

بدقسمتی کا امر تو یہ ہے کہ وزیر اعظم کے گرد ایسے



صلح و صفائی یا شکوہ شکایت ؟

لوگ جمع ہو گئے ہیں جو ان سے دوستی کا دم بھرتے ہیں، جب کہ کانگریس کے اعلیٰ اور قابل انسان کنارہ کشی اختیار کر چلے ہیں۔ گزشتہ ہفتہ حال ہی میں ... کے نمائندوں کو کچھ کانگریسی ممبران پارلیمنٹ سے مندرجہ بالا اہم معاملات پر تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملا تو ہر ایسے ممبر پارلیمنٹ نے مایوسی، بے بسی اور بے کسی کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ تو اس ماحول میں بالکل غیر متعلق ہو گئے ہیں اور ملک کی پالیسی کو ترتیب دینے کا اختیار وزیر اعظم کے چند دوستوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ کچھ کانگریسی رہنما جو عرصے سے وزیر اعظم سے ملاقات کرنے میں ناکام رہے تھے، ان کو بھی سویڈن ریڈیو کے اعلان کے بعد وزیر اعظم کے دربار میں بلا لیا گیا، ان کے چہروں پر بجائے افسوس کے اطمینان کے آثار نمایاں طور پر ظاہر تھے۔ وہ اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ ان کو دی گئی دعوت اس کے ساتھ پیار، عزت و ہمدردی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ ان سے ایک مشکل مرحلے پر تعاون کی بھیک مانگی جا رہی ہے۔

گزشتہ دو ہفتوں میں نمودار ہونے والے واقعات یقیناً ہریانہ میں ہونے والے الکشن پر اثر انداز ہوں گے۔ اور وہ بھی فیصلہ کن طریقے پر۔ اس کے باوجود شاید کانگریسی حکومت کو خطرہ نہ ہو لیکن ۱۹۹۹ء میں ہونے والے پارلیمانی انتخابات کے لیے پیغام ضرور ملا ہے۔ پرانی کہاوت مشہور ہے کہ انسان کو عقل ٹھوکر کھانے کے بعد آتی ہے۔ کانگریس اور اس کی حکومت کو ٹھوکر لگی ہے۔

اب کانگریس کا ہر ایک ہمدرد و خیر خواہ یہ امید رکھتا ہے کہ کانگریس کی قیادت ملک میں پیدا شدہ صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے غور و فکر سے کام لے گی، قبل اس کے کہ ناقابل تلافی تاخیر ہو جائے۔

## فیئر فیکس کا قضیہ

# وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

م۔ ک۔ مہتاب



جس دن کو ۱۵ اور ۱۶ اپریل کو لوک سبھا میں محکمہ دفاع کے ... دو رستیوں کی خرید کے ایک سودے میں ایک ہندوستانی ایجنٹ کو مبینہ طور پر سات فی صد کمیشن کی ادائیگی کی وجہ والا محرکہ پر بحث اور وزارت دفاع کے وزیر مملکت کی طرف سے بحث کا جواب ... موقع ملا وہ ... راسے رکھتے ہوں گے کہ وسط اپریل کے اس سیاسی ہنگامے یاڈرامے میں ... وزیر دفاع وشوناتھ پرتاپ سنگھ کا کوئی طرف دار تھا یا ... ان کا کوئی دفاع کر رہا تھا تو وہ دفاع کے وزیر مملکت ارون سنگھ ہی تھے۔

ایک ہنگامہ خیز اور بعض اوقات دشنام طرازی کی حد تک پر شور طویل بحث کے دوران حسب ... اقتدار کے ... رکن نے شاید وی پی سنگھ کو مورد الزام ... اسے کی قسم کھا رکھی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس (آئی) پارلیمنٹری پارٹی کے اجلاس میں یہ حکمت عمل طے کی گئی ہے کہ سابق وزیر دفاع پر حملہ ... کو ... وزیر اعظم ... اور ... کے دفاع اور ... کو کمزور کرنے کے ... ارون سنگھ ... وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے عمل کو

درست قرار دے رہے تھے بلکہ ان کی تعریف بھی کر رہے تھے۔

جہاں بحث میں حصہ لینے والے دیگر وزیروں اور کانگریس (آئی) ممبران کا کہنا تھا کہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ۳۰ کروڑ روپے کے کمیشن کی اطلاع کو وزیر اعظم سے چھپا رکھا ہے۔ وزیر اعظم سے مشورہ کیے بغیر اس معاملے میں محکمہ دفاع کے سیکریٹری کے ... تحقیقات کا حکم جاری کر دیا ہے اور اس تحقیقات کی اطلاع ایک پریس نوٹ کے ذریعہ پریس کو بھی دے دی ہے۔ اس طرح انھوں نے وزارت کی اجتماعی ذمہ داری کے اصول کو توڑا ہے۔ ایک اہم معاملہ ... کابینہ کی سیاسی امور کی کمیٹی میں زیر غور لانے سے گریز کیا ہے جس سے انھوں نے سرکار دشمن عناصر کی شہ پر ملک کے وزیر اعظم کو مزید پریشانیوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے اور ملک کے دفاع کو کمزور کیا ہے اس لیے انھیں اس اہم محکمے سے الگ کر دینا ہی بہتر تھا۔ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے خلاف حکومتی پارٹی کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ کسی ممبر کو وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی حمایت میں بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی البتہ ارون سنگھ بحث کا جواب دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ کو سات فی صد کمیشن کی مبینہ ادائیگی کی تحقیقات کرانے کا حق اور اختیار



ارون سنگھ

حاصل تھا۔ تحقیقات کا حکم دینا کلیتاً انتظامیہ معاملہ تھا اور اس کے لیے کابینہ کی کسی منظوری کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے قبل بھی وزارت دفاع وزارت خزانہ کو کئی معاملات میں کمیشن کی ادائیگی کی جانچ کرنے کے لیے کہہ چکی ہے۔ شری ارون سنگھ نے کہا کہ وزیر دفاع کے طور پر وہ ایسی تحقیقات کے مجاز تھے۔ انھوں نے اس سارے معاملے کے بارے میں ۱۰ مارچ ... اپریل کو وزیر اعظم کو بھی بھیج دیا تھا۔ انھوں نے نہ جانے کیوں اس محکمہ جاتی تحقیقات کے بارے میں ایک پریس نوٹ بھی جاری کر دیا جو اگلی صبح جب متعلقہ فائل وزیر اعظم کے پاس پہنچی تب ... اخبارات میں شائع ہو گیا تھا۔

شری ارون سنگھ کے بیان کے مطابق وزیر دفاع کو تحقیقات کے لیے نہ وزارت میں معاملہ پیش کرنے کی ضرورت تھی نہ وزیر اعظم سے مشورہ کرنے کی۔ تحقیقات جو خفیہ رہنی چاہیے تھی اس کی اطلاع اخبارات کو دے دی گئی یہ وی پی سنگھ کا قصور تھا جس کے لیے انھیں وری پا ... نے گردن زدنی قرار دے دیا اور انھیں ۱۲ اپریل کو استعفیٰ دینے کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۱۱ اپریل کو ہی استعفیٰ دے دینا چاہتے تھے لیکن اس رات انھوں نے وزیر دفاع کے طور فوج کے افسروں کے ڈنر کا اہتمام کر رکھا تھا اس لیے انھوں نے ۱۲ تاریخ کو استعفیٰ دیا۔ دفاعی سودے میں کمیشن کی ادائیگی کے بارے میں تحقیق کی خبر سے پارٹی کے ممبران کی طرف سے ان کی جو سخت نکتہ چینی ہوئی تھی اور ان پر جو ... طرح کے ... لگائے گئے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ پارٹی کو داؤ پر لگا کر اپنا مقام بلند کر رہے ہیں اور ... سرکار کے دشمنوں کے ہاتھ میں ایک مہرہ بن گئے ہیں انھیں دیکھتے ہوئے وشوناتھ پرتاپ سنگھ کو احساس ہو گیا تھا کہ اب ان کا وزارت میں رہنا ممکن نہیں ہے لہٰذا ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے ...

کوئی بھی بڑا درخت اپنے نیچے گھاس اگنے نہیں دیتا اس لیے وزیر اعظم کے مشیر انھیں مشورہ دیتے رہتے تھے کہ وشوناتھ کے پر کاٹے جائیں۔ لیکن راجیو گاندھی اسی خیال کے زیر اثر رہے کہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ جس ڈھنگ سے وزارت خزانہ چلا رہے ہیں اور ملک کی اقتصادیت کو بدعنوانیوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں اس سے ان کی حکومت کا وقار بلند ہوگا اور خود اُن کی "مسٹر کلین" کی تصویر اور اجلی ہوگی لیکن اُن کے مشیروں اور ساتھیوں نے جو کانگریس (آئی) اور

کو ہی استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس سارے معاملے میں حکمراں جماعت کو جو بات ناگوار گذری ہے وہ یہ نہیں کہ کمیشن کی ادائیگی کے بارے میں تحقیقات کیوں کرائی گئی یا اتنی موٹی رقم یعنی تیس کروڑ روپیہ کون ڈکار گیا بلکہ یہ کہ پریس نوٹ کے ذریعہ اس کی اطلاع عوام یا پارلیمنٹ کو کیوں دے دی گئی ہے۔ یعنی اعتراض فعل پر نہیں اس کی خبر پر ہے۔ اس لیے ذرا گہرائی میں جا کر دیکھنا ہوگا کہ کیا وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے صرف اتنی سی غلطی



ارون سنگھ وزیر اعظم کے ساتھ : گوش بو آواز

کی جو بعض اعلیٰ سیاسی حلقوں کے بیان کے مطابق کوئی غلطی نہیں تھی اور وشوناتھ پرتاپ سنگھ اگر عوام کو اتنے بڑے گھوٹالے کے بارے میں اطلاع دینا چاہتے تھے اور وہ اس میں حق بجانب تھے تو ان کو اتنی بڑی سزا کیوں دی گئی ہے؟

دراصل وشوناتھ پرتاپ سنگھ کو پریس نوٹ جاری کرنے کی سزا نہیں دی گئی ہے یہ تو حکمراں جماعت کے ہاتھ میں ایک ہتھیار آچکا ہے ورنہ حکومت ماضی میں کئی ایک بدعنوانیوں بلکہ محکمہ دفاع کے سکنڈلوں لارکن برادرز کی اطلاعات صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے عوام کو خود مہیا کرتی رہی ہے کہ وہ رشوت ستانی اور بدعنوانیوں کا قلع قمع کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے خلاف لاوا پہلے سے ہی پک رہا تھا۔ پارٹی میں جہاں جماعتی سے زیادہ شخصی وفاداری کا دور دورہ ہے یہ کھلے بندوں کہا جا رہا تھا کہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ اپنی ایمانداری کا ڈھنڈورہ پیٹ کر اقتدار کا متبادل مرکز بنتے جا رہے ہیں اور شری راجیو گاندھی کی تصویر کو بگاڑ رہے ہیں۔ انھیں پارٹی میں دوسرا مقام حاصل ہو گیا ہے وہ کسی بھی وقت پہلا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

کانگریس سرکار سے زیادہ شری راجیو گاندھی کے وفادار ہیں اُن کو یہ تاثر دیا کہ وشوناتھ کی ایک ایماندار اور بے داغ شخص کے طور پر عوام میں مقبولیت بڑھ رہی ہے اور وہ اقتدار کا متبادل مرکز بن رہے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود راجیو گاندھی اور وشوناتھ کے تعلقات نہایت اچھے اور دوستانہ تھے وشوناتھ راجیو جی کو اپنا اور پارٹی کا رہنما مانتے تھے اور ہر کام پارٹی کی تصویر اجاگر کرنے کے لیے کر رہے تھے

وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے وزارت خزانہ کو کو جس طرح چلایا صنعت کاروں کو جس قدر مراعات دیں اور ٹیکسوں کے ڈھانچے میں جو تبدیلیاں کیں ان سے حکومت کی براہِ راست ٹیکسوں سے آمدنی میں ایک برس میں دو ہزار کروڑ روپے کا اضافہ ہوگیا جو گذشتہ چالیس برس میں ایک ریکارڈ تھا۔ دوسرا قدم انھوں نے ٹیکس چوری روکنے کے سلسلے میں اٹھایا۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے دسمبر ۱۹۸۵ میں بمبئی میں پارٹی کے صد سالہ اجلاس میں ملک میں سیاسی و اقتصادی زندگی میں بدعنوانیوں پر غم و غصہ کا اظہار کیا تھا اور پارٹی ممبران سے سیاسی و اقتصادی زندگی سے بدعنوانی ختم کرنے کے لیے کہا تھا۔ اپنے رہنما کے اسی اشارے

کے مطابق وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے کئی ایک جلسوں میں جہاں صنعت کار اور تاجر موجود ہوتے تھے کہا تھا کہ ملک میں ترقی کے لیے سرمایہ اس لیے حاصل نہیں ہو رہا ہے کہ یہ لوگ جو کچھ ہندوستان میں کماتے ہیں وہ غیر ملکی بنکوں میں جمع کرا دیتے ہیں۔ وزیر خزانہ کی ان تقریروں سے اُن کے ارادے ظاہر ہوتے تھے کہ وہ غیر ملکوں میں حسابات رکھنے والوں کا محاسبہ کرنا چاہتے ہیں۔

انھوں نے ملک میں بڑے بڑے صنعتی اداروں اور تاجر گھرانوں پر چھاپے مارنے کا جو سلسلہ شروع کیا ان سے بھی یہ ثبوت ملے کہ ملک کا ہزاروں کروڑ روپیہ غیر ملکی بنکوں میں جمع ہو رہا ہے ان چھاپوں میں کرلوسکر، ٹاٹا اور برلا جیسے گھرانے بھی آئے جو اپنے آپ کو متبرک گائے سمجھتے تھے کیونکہ وہ حکمران جماعت کو بھاری چندے چناؤ کے لیے دیتے تھے لہٰذا کبھی کسی نے انھیں چھوا نہیں تھا۔ انھوں نے وزیر اعظم اور کانگریس (آئی) سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا لیکن راجیو گاندھی نے وشوناتھ کے راستے میں روڑا نہیں اٹکایا حالانکہ بڑے بڑے پونجی پتی کانگریس (آئی) سے ناراض ہو کر پریس اور دیگر ذرائع سے اس کے لیے سردرد پیدا کرنے لگے۔

درحقیقت معاملہ اس وقت بگڑا جب دو مشہور صنعت کار اداروں ریلائنس گروپ اور بمبئی ڈائنگ کے باہمی جھگڑوں سے غیر ملکوں میں ہندوستانی کمپنیوں کے حسابات کے بارے میں انکشافات ہوئے۔ بتایا جاتا ہے کہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے غیر ملکی حسابات کا پتہ لگوانے کے لیے وزیر اعظم سے اجازت چاہی۔ وزیر اعظم نے فائل میں "یس" کر دیا اور اس کے بعد وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے اس معاملے میں



مجھور سے لال

وزیراعظم سے مشورہ کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ باختیار وزیر خزانہ تھے جنھوں نے دو برس میں وزارت خزانہ میں ایسی تبدیلیاں کردی تھیں جو چالیس برس میں نہیں ہو سکی تھیں۔ دوسرے انھیں اپنی پاکبازی اور ایمانداری پر اعتماد تھا۔ انھوں نے امریکہ کینیڈا اور سوئٹزرلینڈ کی کچھ سراغ رساں ایجنسیوں سے امداد لینا چاہی تاکہ ہندوستانیوں کے غیر ملکی حسابات کا پتہ لگایا جا سکے۔ ان میں امریکہ کی ایک ایجنسی فیر فیکس بھی ہے۔ یہ کام وزارت خزانہ کے ایک محکمے کے سپرد تھا جس کے سربراہ مسٹر بھورے لال تھے۔

فیئر فیکس نے حالات کو بگاڑ دیا کہا جاتا ہے کہ یہ ایجنسی ہندوستانیوں کے حسابات کا پتہ لگاتے لگاتے کچھ ایسے افراد کے حسابات تک پہنچ گئی جن کے انکشافات کچھ لوگوں بالکہ سیاست دانوں کے لیے مصیبت کھڑی کرسکتے تھے۔ چنانچہ اس ایجنسی نے بھورے لال کو اور بھورے لال نے وزیر خزانہ کو مطلع کیا کہ اگر اسے مزید رقم دی جائے تو وہ یہ "بہت گرم" اطلاع بھی مہیا کرسکتی ہے۔ اس سطح پر وزیر خزانہ ۱۹ جنوری ۱۹۸۸ کو وزیراعظم سے ملے۔ اس سے قبل فیئر فیکس کو ۲۳ ہزار ڈالر کی فیس ادا کی جا چکی تھی جو کہا جاتا ہے کہ کسی کمپنی کی معرفت ادا کی گئی۔ وزیراعظم کو اس سے قبل ہی سوئٹزرلینڈ سے متعدد افراد کی طرف سے مطلع کر دیا گیا تھا کہ وشوناتھ ان پر ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ اس سلسلے میں امیتابھ بچن کے بھائی اجیتابھ بچن کے نام کی بہت چرچا ہوئی۔

اس کے بعد یہ کہا جانے لگا کہ وزیراعظم اپنے قریبی دوستوں کی اطلاع پر وشوناتھ سے برگشتہ خاطر ہو گئے اور انھیں وزارت خزانہ سے ہی ہٹانے کے لیے سرحدوں پر پاکستانی حملے کا ہوا کھڑا کیا گیا۔ کروڑوں روپیہ کے مصارف سے فوجوں کی نقل و حمل کی گئی اور ایک ایسا ماحول پیدا کیا گیا جس میں وزارت دفاع جیسا اہم محکمہ راجیو گاندھی کا معتمد ساتھی جو ایک کامیاب وزیر خزانہ تھا وہی سنبھال سکتا تھا اور پاکستانی خطرے سے ملک کا دفاع کر سکتا تھا۔ حالانکہ اس تبدیلی سے خود وزیراعظم کی اہلیت اور قابلیت پر حرف آتا تھا۔ وشوناتھ کو وزارت دفاع میں منتقل کرنے سے قبل شری راجیو گاندھی خود وزیر دفاع تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں چرچل برطانیہ کے وزیر دفاع تھے اور وزیراعظم بننے کے بعد بھی پوری جنگ کے دوران وزیر دفاع رہے جس سے ان کے وقار کو چار چاند لگ گئے لیکن یہاں سرحد پر



امیتابھ بچن



کملی واڈیا

[illegible]



[illegible]

پاکستانی فوجوں کی نقل و حرکت سے ہی وزیراعظم اس محکمے سے دست بردار ہو گئے۔ دوسرے مرکزی بجٹ پیش ہونے میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا اور خود راجیو گاندھی کو وزارت خزانہ کا کوئی تجربہ نہیں تھا جس سے سیاسی حلقوں کا یہ شک اور بھی مضبوط ہو گیا کہ وشوناتھ جی کی تبدیلی کوئی معمولی واقعہ نہیں بلکہ کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔

چنانچہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے وزیر دفاع بن جانے کے بعد بھی فیئر فیکس کا معاملہ دبا نہیں حکومت ایسی اطلاعات کی تردید کرتی رہی اور وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے معتمد افسروں کو الفورس منٹ محکمہ سے ہٹا دیا گیا جس سے مخالف پارٹیوں کا ماتھا ٹھنکا کہ فیئر فیکس نے جلتی پر تیل ڈالا کہاں انھیں حسابات کا پتہ لگانے کا کام سونپا گیا تھا۔ مخالف پارٹیوں نے سارے معاملے پر لوک سبھا میں بحث کی مانگ کی۔ ۲۱ مارچ کو بحث ہوئی۔ وزیر مملکت نے فیئر فیکس کی خدمات لینے سے انکار کیا۔ لیکن وزیر دفاع نے یہ کہہ کر حکومت کا سارا کیس ختم کر دیا کہ انھوں نے فیئر فیکس کو کام پر لگایا تھا ان کے افسروں نے ان کے حکم پر تمام کارروائی کی ہے۔ اس بحث میں دنیش سنگھ اور دوسرے کانگریسی ممبران کی طرف سے وی۔ پی سنگھ پر الزامات کی بوچھار کی گئی ان پر جماعت سے غداری کرنے کا الزام لگایا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ فیئر فیکس کا تعلق امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے سے ہے یہ جانتے ہوئے بھی وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ملک کی سلامتی اور استحکام کو خطرے میں ڈالنے کی کوشش کی جس کی سزا کے طور پر وزارت سے نکالا جانے۔ انھیں پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ وہ موجودہ حکومت کا تختہ پلٹ کر وزیراعظم بننا چاہتے ہیں۔ وہ بحث میں حصہ لے کر اپنی صفائی دینا چاہتے تھے لیکن وزیر داخلہ نے اسپیکر سے کہہ کر انھیں بولنے کی اجازت ملنے دی۔ اس طرح ان کا قافیہ تنگ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۶ اپریل کو فیئر فیکس کے معاملے کی جانچ کے لیے وزیراعظم نے ٹھکر کمیشن کے قیام کا اعلان کیا۔ اگلے ہی دن شری سنگھ نے ہوائی اڈے میں اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے پھر فیئر فیکس کو کام پر لگانے کی ذمہ داری قبول کی۔ حکومت نے ۷ اپریل کو ٹھکر کمیشن کی شرائط کار کا اعلان کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے غیر

حسابات کا معاملہ پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور کمیشن پوری تحقیقات کرے گا کہ انھوں نے فیئر فیکس کی خدمات کیوں اور کیسے حاصل کیں۔ پارٹی کے ممبران کے اس ہتک آمیز سلوک کے باوجود وشوناتھ پرتاپ سنگھ جماعت اور اس کے رہنما کے ساتھ وفاداری کا اظہار کرتے رہے اور خاموش رہے۔ ۹ اپریل کو انھوں نے دفاع کے سودے کی تحقیقات کا اعلان کیا جس سے کانگرسی حلقوں میں طوفان آگیا۔ اسے وزیر اعظم کو جو صدر جمہوریہ سے ساتھ کشیدہ تعلقات اور فیئر فیکس کے معاملے میں نکتہ چینی کا شکار اور پریشان تھے مزید پریشان کرنے کی کوشش اور ملک کے دفاع کو کمزور کرنے کی ایک چال قرار دیا گیا۔ انھیں لوک سبھا میں بولنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کانگرس (آئی) پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں اور باہر اُن پر اقتدار کی بھوک تک کے الزامات لگائے گئے۔ اُن کے خلاف دستخطوں کی ایک مہم شروع کی گئی۔ گیارہ اپریل کو کابینہ کی میٹنگ میں اُن کے خلاف سخت نکتہ چینی دفاعی تحقیقات کے سلسلے میں ہوئی اور بعض وزراء نے اُن کو کابینہ سے الگ کرنے کا مطالبہ کیا۔ اور وشوناتھ پرتاپ سنگھ جنھیں بڑے اعتماد کے ساتھ وزارت دفاع کا محکمہ سونپا گیا تھا صرف ۹۰ دن وزیر دفاع رہنے کے بعد اس محکمے سے الگ ہو گئے۔



کسی وزیر دفاع کے لیے عہدے کی یہ میعاد کم سے کم ہے جس سے ظاہر ہے کہ یا وہ اس عہدے کے لائق نہیں تھے یا یہ محکمہ اُن کے قابل نہیں تھا۔

وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے لیے عہدے سے الگ ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے وزارت تجارت اور اُتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کے عہدے سے بھی مستعفی ہو چکے ہیں لیکن وزارت دفاع سے انھوں نے استعفیٰ اس بنا پر دیا ہے کہ اُن پر پارٹی اور لیڈر سے غداری اور اقتدار کی ہوس کا الزام لگایا گیا تھا چنانچہ انھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ آئندہ کسی عہدے پر کام نہیں کریں گے۔ ۱۵ اپریل کو راجیہ سبھا میں بحث کے دوران انھوں نے کہا کہ وہ فیئر فیکس کے سلسلے میں اپنے افسروں کے رویہ کے لیے ذمہ دار ہیں جہاں تک وزیر اعظم کو بے خبر رکھنے یا کابینہ کی مشترکہ ذمہ داری کی خلاف ورزی کا سوال ہے وہ زبان نہیں کھولیں گے جب تک انھیں وزیر اعظم اجازت نہ دیں جن کے وہ وفادار ہیں۔

اُن کی جماعت اور لیڈر سے وفاداری بجا ہے لیکن وہ ملک کے بھی تو وفادار ہیں اگر ملکی مفادات کا تقاضہ ہو تو اُن کے لیے زبان بند رکھنا ملک سے وفاداری نہیں ہوگی۔

## فائدہ

وشوناتھ پرتاپ سنگھ اپنے کردار سے راجیو گاندھی کے لیے ایک چیلنج بن گئے تھے اس لیے اُن کے استعفیٰ سے کانگرس (آئی) نے جو یک زبان راجیو گاندھی کی حمایت پر اُتر آئی ہے راحت کی سانس لی ہے۔ راہ میں اٹکنے والا کانٹا نکل گیا ہے۔ پارٹی میں ذہانت کی کمی نہیں ہے اور وزیر نکل آئیں گے۔ لیکن جماعت میں انتشار کا جو عمل شروع ہونے والا تھا وہ رُک گیا ہے۔ عدم استحکام کے خطرے سے اب پارٹی زیادہ اچھی طرح نپٹ سکتی ہے۔ اور جیسا کہ پارٹی کے سرکردہ افراد کا کہنا ہے کہ وہ اس سیاسی طوفان کا اچھی طرح مقابلہ کرے گی۔

## نقصان

لیکن کانگرس آئی کے منتظموں اور رہنماؤں کے بیانات کے برعکس اس سیاسی تصویر کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے وہ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس پورے ڈرامے میں وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی تصویر ایک ایماندار اور فرض شناس سیاست داں کے طور پر ابھری ہے۔ مخالف پارٹیوں کو کہنے کا موقع ملا ہے کہ کانگرس (آئی) میں ایمانداری اور ایماندار افراد کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ چونکہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ سیاست اور اقتصادی زندگی میں بدعنوانیوں کو بے نقاب کر رہے تھے جس کی تپش اقتدار کی غلام گردشوں تک جا پہنچی تھی اس لیے انھیں قربانی کا بکرا بنا دیا گیا ہے۔ اس مخالفانہ پروپیگنڈے کا لازمی اثر ہریانہ کے اسمبلی چناؤ پر ہوگا۔ شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے جولیس سیزر میں کہا تھا کہ مُردہ جولیس سیزر زندہ جولیس سیزر سے زیادہ خطرناک ہے۔ اسی طرح وشوناتھ پرتاپ سنگھ جو ایمانداری اور ایثار اور ترکِ اقتدار کی علامت بن گئے ہیں اب پارٹی کے لیے زیادہ نقصان کا سبب بن سکتے ہیں۔ صرف انھیں وزارت یا پارٹی سے نکالنے سے ہی بات نہیں بنے گی۔ انھیں عوام کو یقین دلانا ہوگا کہ اُن کے اصطبل غلاظت سے پاک ہیں ورنہ کانگرس (آئی)، جو جنوب اور مشرق میں پٹ چکی ہے شمال اور وسطی ریاستوں میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہو سکتی ہے۔

بوفورس سودا

# توپوں کے گولے

پریم سنگھ

۲۴ مارچ ۱۹۸۶ کو سویڈن کی فرم میسرز بوفورس سے خریدی گئی ۱۵۵ ملی میٹر دہانے کی ۲۵ کلومیٹر کی دوری تک گولے پھینکنے والی توپیں جن پر ایک اندازے کے مطابق محکمہ دفاع ۱۳۰۰ کروڑ روپیہ خرچ کرے گا، کبھی حقیقی جنگ میں استعمال ہوں گی یا نہیں لیکن ان کی گونج ۲۰ اپریل ۱۹۸۷ کو لوک سبھا اور ۲۱ اپریل کو راجیہ سبھا میں گھنٹوں سنائی دیتی رہی جس دوران میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے ارکان نے ایک دوسرے پر الزامات کی زبردست گولہ باری کی۔ اگرچہ یہ محاذ آرائی اپوزیشن پارٹیوں کے ایوان سے واک آؤٹ کرنے سے ختم ہو گئی کیونکہ حکومت نے اُن کی طرف سے اسلحہ کی خرید میں بعض سیاستدانوں اور اعلی سرکاری افسروں کو رشوت دیے جانے کے مبینہ الزامات کی جانچ کے لیے پارلیمنٹری کمیٹی مقرر کیے جانے کی مانگ کو منظور نہیں کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حزب مخالف حکومت کی یقین دہانیوں اور الزامات کی تردید سے مطمئن نہیں تھا اور ایوانوں میں توپوں کی گونج ختم ہو جانے کے بعد بھی گولہ باری کا دھواں ملک کی عوامی اور سیاسی فضا میں پھیلتا رہے گا جس کا فائدہ مخالف جماعتیں آئندہ انتخابات میں یہ کہہ کر اٹھائیں گی کہ برسر اقتدار جماعت اور حکومت دفاعی سودوں سے حاصل ہونے والی رقوم کے بل بوتے پر ملک پر حکومت کرتی ہے۔

میسرز بوفورس سے توپوں کی خرید میں بعض افراد کو کمیشن دیے جانے کی اطلاع ۱۲ اپریل ۱۹۸۷ کو شنڈ آرر در نے اپنی شاہ سرخی میں دی تھی اور کہا تھا کہ وزیر دفاع وی پی سنگھ کو راجیو گاندھی کے بارے میں بھی انکوائری کرانی ہوگی جو اُس وقت وزیر دفاع تھے جب سویڈن کی مذکورہ فرم سے ۱۵۵ ملی میٹر دہانے کی توپیں خریدنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اخبار نے یہ بھی الزام لگایا تھا کہ یہ توپیں آزمائش پر پوری نہیں اتریں اور کہا جاتا ہے کہ جرمن آب دوز کشتیوں کی خرید کے معاملے میں مبینہ کمیشن کی ادائیگی کی طرح اس سودے میں بھی بعض افراد کو بھاری کمیشن ملا۔

اس کے بعد ۱۶ اپریل کو سویڈش ریڈیو کی نشر کردہ ایک خبر کی بنا پر ۱۷ اپریل ۱۹۸۷ کو ملک کے کئی اخباروں نے یہ خبر شائع کی کہ سرکار نے میسرز بوفورس کو توپیں خریدنے کے لیے جو آرڈر دیا تھا اُس میں سرکردہ ہندوستانی سیاستدانوں اور محکمہ دفاع کے اعلی افسران کو [illegible] رشوت دی گئی ہے۔ حکومت نے خبر کی اشاعت
کے ساتھ ہی اس خبر کی تردید کر دی لیکن د
روز سویڈن کے ریڈیو نے اس الزام کو دہ
ہوئے کہا کہ یہ خبر اُن کے نمائندے کی ارسا
ہے اور اس کی تصدیق کے لیے اُن کے پا
ثبوت موجود ہیں۔ سویڈش ریڈیو نے یہاں
کہا کہ یہ ادائیگی آیرلیس نوٹس کے عنوان
کی گئی ہے۔ لاکھوں ڈالر کا یہ کمیشن گذشتہ
دسمبر میں سوئٹزرلینڈ میں متعلقہ افراد کے کھ
جمع کرایا گیا ہے۔ ریڈیو کے حکام نے یہ
کمیشن کی اور قسطیں ابھی ادا کی جانی ہیں
مخالف پارٹیوں کے لیے پارلیم



کے۔ سی۔ پنت

سوال اٹھا سکے اور حکومت و برسر اقتدار جماعت کو بدنام کرنے کے لیے یہ مسالہ کافی تھا۔ حکومت کو بھی توقع تھی کہ ۲۰ اپریل کو جب تین دن کی چھٹی کے بعد لوک سبھا کا اجلاس ہوگا تو سویڈن کی توپوں کی گونج ایوان میں سنائی دے گی چنانچہ اُس نے اپنی حکمت عملی وضع کرلی تھی جو اس بات سے ظاہر ہے کہ لوک سبھا کا اجلاس شروع ہوتے ہی حکومت جھٹ سے وقفہ سوالات معطل کرنے اور بوفورس کی توپوں کے معاملے پر بحث کرانے کے لیے تیار ہوگئی۔ وزیر دفاع شری پنت اس معاملے پر ایک طویل بیان پہلے سے ہی تیار کر کے لائے تھے اور مزید وضاحتوں کے لیے وزیر اعظم بھی لنچ کے وقفہ تک ایوان میں موجود رہے۔

لوک سبھا میں ساڑھے پانچ گھنٹے اور راجیہ سبھا میں بھی قریب اتنے ہی وقفہ تک بحث کے دوران نہ تو حکومت ہی اس سودے کے بارے میں الزامات کی کوئی وضاحت کرسکی اور نہ ہی مخالف پارٹیوں کے پاس راز سے پردہ اٹھانے کے لیے کوئی مواد یا ثبوت موجود تھا چنانچہ اس معاملے پر تاریکی کا جو پردہ پڑا ہے پڑا رہے گا۔ حکومت کا موقف واضح اور کافی مضبوط تھا کہ حکومت بارہا یہ واضح کرچکی ہے کہ وہ دفاعی سودوں میں کسی ایجنٹ یا کسی قسم کی دلالی نہ دینے کی پالیسی پر کاربند ہے۔ اس معاہدے میں بھی میسرز بوفورس، سویڈن سرکار اور خود وزیر اعظم راجیو گاندھی نے سویڈن کے سابق وزیر اعظم اولف پامے سے یہ بات چیت کی تھی کہ یہ توپیں اُسی صورت میں خرید کی جائیں گی جب سودے میں کوئی درمیانی

سویڈن ریڈیو کا نمائندہ والف پیرو ذمیوڈ



آدمی نہ ہو، مال مانگ کے تقاضے پورے کرتا ہو، قیمت بازار سے کم ہو اور کسی شخص کو بھی خواہ وہ کہیں کا رہنے والا ہو کمیٹی کی طرف سے کسی قسم کی رشوت یا کمیشن ادا نہیں کیا جائے گا جب سویڈن کے وزیر اعظم، سویڈن کی حکومت اور میسرز بوفورس نے اس بارے میں یقین دلا دیا تب ہی مارچ ۱۹۸۰ میں یہ معاہدہ کیا گیا۔ چنانچہ وزیر دفاع شری کے۔ سی پنت نے لوک سبھا میں اور وزیر مملکت شری ارون سنگھ نے راجیہ سبھا میں اپنے بیان میں کہا کہ

"اگر کوئی ثبوت یا شہادت اس امر کی پیش کی جائے کہ حکومت نے اس قانون کی خلاف ورزی کی ہے تو اس معاملے کی گہری چھان بین کی جائے گی اور قصوروار لوگوں کو سزا دی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ سویڈن ریڈیو کے نشریے کی بنا پر جاری کی جانے والی خبریں ہمارے سیاسی نظام کو بدنام کرنے اور اسے ڈانواڈول کرنے کی ایک اور کوشش ہے۔ سرکار اور ہندوستان کے عوام اس قسم کی گھناؤنی سازشوں کو ناکام بنانے کا عہد کیے ہوئے ہیں۔"

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے بحث میں مداخلت کرتے ہوئے پارلیمنٹ کو یقین دلایا کہ ان کی حکومت عوامی اور سیاسی زندگی کو پاک کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے اور دفاعی سودوں میں رشوت یا کمیشن کا کوئی بھی ثبوت مہیا کرنے میں متعلقہ شخص کو خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اسے بخشا نہیں جائے گا۔ انھوں نے مخالف پارٹیوں پر الزام لگایا کہ وہ غیر واضح اور بے معنی الزام لگا کر حکومت کو بدنام کرنا چاہتی ہیں فوجوں کے حوصلے پست کرنا چاہتی ہیں اور ملک میں عدم استحکام پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ اگر اُن کے پاس کوئی ثبوت ہو تو پیش کریں حکومت اُس کی ضرور جانچ کرے گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انھوں نے سویڈن ریڈیو کے نمائندے سے بھی پوچھا ہے مگر اُس نے کوئی دستاویز دینے سے انکار کر دیا ہے۔ بحث کے دوران حزب اقتدار کا موقف یہی رہا کہ ملک میں عدم استحکام لانے اور حکومت کو گرانے کی ایک سازش کی جا رہی ہے جب کہ مخالف پارٹیوں کا موقف تھا کہ کرپشن اور اسے چھپانے سے عدم استحکام پیدا ہوتا ہے۔ جنرل ارڈرہ نے راجیہ سبھا میں کہا کہ دفاعی افواج پر اس قسم کی خبروں کا کوئی اثر نہیں پڑتا اُن کے حوصلے اس وقت پست ہوتے ہیں جب انھیں مہیا کردہ ساز و سامان اور اسلحہ وہ کام نہیں کرتا جس کے لیے وہ انھیں دیا گیا ہو۔ انھوں نے کہا کہ محکمہ دفاع کو متبرک گائے بنا کر نہیں رکھنا چاہیے عدم استحکام کا ہوا بدعنوانی کو چھپانے کے لیے کھڑا کیا جاتا ہے۔

مخالف پارٹیوں کے پاس حکومت پر واضح الزامات عائد کرنے کے لیے کوئی ٹھوس مسالہ نہیں تھا البتہ جنتا پارٹی کے رہنما مدھو دنڈوتے کی اس دلیل میں وزن تھا کہ حکومت پر الزامات مخالف پارٹیوں

## ودرودیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
## خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں





نے نہیں لگائے۔ الزامات ایک غیر ملکی سرکاری ریڈیو نے لگائے ہیں اور الزامات کے ثبوت میں کافی مواد اور اعداد و شمار بھی مہیا کیے ہیں۔ اب حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان الزامات کی جانچ کرے اور قصوروار افراد کو سزا دے۔ ہاں مخالف پارٹیاں یہ ضرور چاہتی ہیں کہ معاملے کی چھان بین محکمہ جاتی نہ ہو بلکہ ایک پارلیمانی کمیٹی کے سپرد کی جائے کیونکہ اوّل تو بدعنوانی کا معاملہ بہت بڑا ہے دوسرا اعلیٰ سرکاری افسروں اور سیاست دانوں پر کمیشن اور رشوت خوری کے الزامات لگائے گئے ہیں اس لیے عوام کے دلوں میں جو شکوک پیدا ہو گئے ہیں وہ پارلیمنٹری کمیٹی کی طرف سے کی جانے والی تحقیقات سے ہی دور ہو سکتے ہیں۔

لیکن حکمران جماعت کے ارکان شور اور نعرے بازی سے حزب اختلاف کے ورکروں کی آواز مٹانے کا تہیہ کر کے آئے ہوئے تھے چنانچہ کمیونسٹ پارٹی (مارکسٹ) کے سومناتھ چٹرجی کو اسپیکر سے یہ شکایت کرنی پڑی کہ "انھیں ایک فقرہ بھی پورا بولنے نہیں دیا جاتا"

چنانچہ بوفورس کی توپوں کی خرید کے معاملے کے بارے میں سویڈش ریڈیو کی رپورٹ کو سیاست کو بدنام کرنے اور یہاں کے سیاسی نظام میں عدم استحکام لانے کی غیر ملکی سازشوں کا جزو قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ حزب اختلاف کا زور اپنے ہی گریبان پر چل سکتا تھا وہ پارلیمنٹری تحقیقات کے مطالبے کے رد ہونے پر ایوانوں سے واک آؤٹ ہی کر سکتے تھے۔

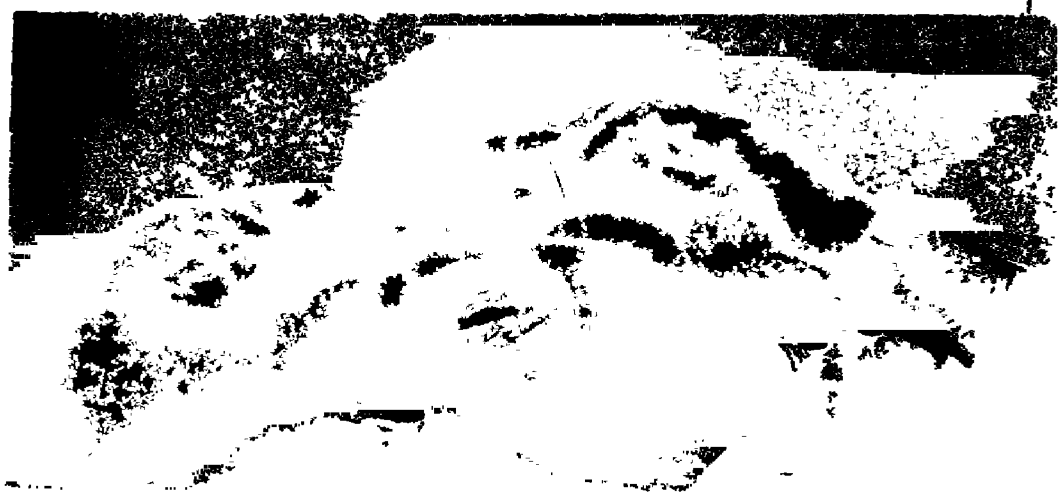
اس سارے معاملے کو اگر ایک فقرے میں بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ حکومت کہتی ہے کہ الزامات کا ثبوت لاؤ اور مخالف جماعتیں کہتی ہیں کہ ثبوت اُن سے مانگو جو الزام لگا رہے ہیں۔

دفاعی سودے دن بدن مہنگے ہوتے جا رہے ہیں ملک کے ۲۵ ارب ۱۲ کروڑ روپے کا بہت بڑا حصّہ غیر ممالک سے ہتھیار خرید کرنے پر خرچ ہوتا ہے لہٰذا عوام کے ذہن اس بارے میں پاک وصاف ہونے چاہئیں کہ اول تو ان سودوں سے کوئی شخص یا پارٹی ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتی اور دوسرے یہ کہ ہماری افواج کو اعلیٰ ترین قسم کا اسلحہ اور سامان استعمال کے لیے دیا جاتا ہے۔ اگر اس بحث سے پہلے جرمن آبدوزوں کی خرید میں ۳۰ کروڑ روپے کے کمیشن کی ایک ہندوستانی ایجنٹ کو ادائیگی کے بارے میں خود وزیر دفاع نے جانچ کا حکم نہ دیا ہوتا تو شاید بوفورس سے توپوں کی خرید کے معاملے پر پارلیمنٹ میں اور پارلیمنٹ سے باہر اتنی تشویش پیدا نہ ہوتی۔ اگر حکومت صرف عدم استحکام پیدا کرنے کی سازشوں کی آڑ میں اس معاملے کو رد کر دے گی تو سرکردہ سیاسی حلقوں کے مطابق پارلیمان کے ایوانوں میں توپوں کے سودے پر ہوئی گولہ باری کا دھواں ملک میں بہت دور تک پھیلتا رہے گا۔

## اتر پردیش

مظفر حسین سید

# وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے بعد



مرکزی حکومت سے جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے اخراج نے ان کی اپنی ریاست اتر پردیش کی سیاسی فضا پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

یکے بعد دیگر جناب ارون نہرو اور پنڈت کملاپتی ترپاٹھی کے بعد یہ تیسرا اہم اخراج ہے جس کا تعلق ملک کی اس بڑی ریاست سے ہے جو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں سو (۱۰۰) ممبران بھیجتی ہے۔ اور اس وقت مرکزی کابینہ کے آٹھ وزرا اسی ریاست سے تعلق رکھتے ہیں (اس کے ساتھ ہی یکے بعد دیگر تین مرکزی وزیروں عارف محمد خان، ارون نہرو، اور اب وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے ماضی قریب میں نکل جانے سے مرکزی کابینہ کی اور بھی کئی نشستیں بدستور خالی ہیں)

اتر پردیش کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ راجیو گاندھی بھی اسی ریاست سے تعلق رکھتے ہیں۔

اب یہ بات راز نہیں رہی کہ یہ تینوں قد آور شخصیات پنڈت کملاپتی ترپاٹھی ارون نہرو، اور وشوناتھ پرتاپ سنگھ پچھلے کافی عرصے تک ریاست کی بساط اقتدار پر چھائے رہے ہیں۔ پنڈت کملاپتی ترپاٹھی اور ارون نہرو کا ریاست کی برہمن لابی پر مشترکہ طور پر قابو رہا ہے اور ماضی میں دونوں ہی بشرط موقع ایک دوسرے کے حلقۂ اثر میں مداخلت کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن ٹھاکر لابی پر بلاشرکت غیرے راجہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ کا تسلط رہا ہے۔ (یہ دوسرے راجہ دنیش سنگھ کے عروج اور سپر اسٹار) حب پارلیمنٹ امیتابھ بچن اور ان کی کاشتہ لابی کے ظہور سے پہلے کی بات ہے)

طاقت ور ارون نہرو اور گرگ باراں دیدہ پنڈت جی کے زوال کے بعد صرف ریاست کے سابق وزیر اعلیٰ وی۔ پی سنگھ ہی تھے جن کو اتر پردیش کا سب سے زیادہ با اثر کانگریسی رہنما تصور کیا جاتا تھا۔ اور وہ اقتدار اعلیٰ سے کافی قریب تھے۔ اس کے علاوہ یہ صرف ان ہی کی شخصیت تھی جو حکمراں جماعت کے اندر مختلف گروہوں، اور مختلف نظریات اور منقسم وفاداریاں رکھنے والوں کو ایک نقطۂ ارتکاز فراہم کر سکی

یو پی کے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ خود ٹھاکر ہیں اور ارون نہرو کے سابقہ منظور نظر ہیں ان کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کہ وہ ایماندار اور با اثر قائد جناب وی پی سنگھ کے سائے میں پناہ تلاش کریں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کی نہ اپنی کوئی ذاتی عوامی بنیاد ہے اور نہ ہی وہ کانگریس اعلیٰ کمان میں کوئی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے حالات میں انہیں اپنے سابق گرو (ارون نہرو) کے بعد اس جائے پناہ کی شدید ضرورت تھی۔ شاید دوسرا کوئی راستہ نہ دیکھ کر انہوں نے عقل مندی سے کام لے کر وی پی سنگھ کے کیمپ میں شامل ہونا ضروری سمجھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اتر پردیش سے تعلق رکھنے والے قائدین میں خود وزیر اعظم کے بعد بظاہر مرکز میں وی پی سنگھ ہی سب سے با اثر تھے ساتھ ہی ساتھ کابینہ میں وہ وزیر اعظم کے بعد سب سے با اثر شخصیت تھے



کملاپتی ترپاٹھی



وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ: پناہ کی تلاش۔

اس پس منظر میں جب ان کا زوال ہوا تو یوپی کی سیاست کو متاثر ہونا ہی تھا۔ کیوں کہ بہت ہی ڈرامائی انداز میں پہلے جناب سنگھ کی وزارت کی منتقلی ہوئی اور بعد میں انہیں مجبور ہو کر تمام حکومتی ذمہ داریوں سے علاحدگی کا اعلان کرنا پڑا۔ لیکن شاید یہ کافی نہیں تھا۔ ان کے مقدر میں یہ بھی لکھا تھا کہ وہ خود اپنی جماعت کے لوگوں کی تنقید کے بوچھار کا بھی شکار ہوں۔ یوپی کے سیاسی حلقوں میں یہ یقین کیا جاتا تھا کہ ہر طرف اور مایوس وی۔ پی سنگھ اپنی ریاست کے سیاسی منظر کو کافی حد تک بدل دیں گے لیکن انہوں نے شرافت اور خاموشی کے ساتھ اپنے رہنما اور اپنی جماعت کے لیے اپنی وفاداری کا اعلان کرنے کو ترجیح دی۔

حقیقتاً سیاسی فضا میں اسی وقت ہلچل مچ گئی تھی جب اپریل کے دوسرے ہفتے میں جناب وی پی سنگھ نے اپنا استعفیٰ پیش کیا تھا۔ اسی وقت ریاستی راجدھانی لکھنؤ کے سیاسی حلقوں میں ان کی دست برداری کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع ہو گئی تھیں۔ تبھی وزیر اعلیٰ نے اپنے مخصوص انداز میں بڑی سرعت کے ساتھ اپنے وزارتی رفقاء کی ایک میٹنگ منعقد کی جس میں بہت سے امور پر غور و خوض کیا گیا۔

اگلے دن وی پی سنگھ نے ریاستی راجدھانی کا دورہ کیا۔ ان کی اچانک آمد نے قیاس آرائیوں کو اور بھی ہوا دی۔ یہاں تک افواہیں اڑائیں کہ جناب وی پی سنگھ کی ہمدردی میں ریاست کے کچھ وزرا حکومت سے علاحدہ ہو جائیں گے۔ کانگریس کے کچھ خاموش طبع رہنماؤں نے بھی یہ اعتراف کیا کہ فضا بہت گرم تھی اور بہت سے مرکزی رہنما بھی لکھنؤ میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں تشویش کا شکار تھے۔ ان میں سے کچھ نے تو ٹیلی فون پر بہت ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں معلومات حاصل کی تھی۔

اس کے بعد جناب ویر بہادر سنگھ نے اپنا میدان کار دہلی میں منتقل کر لیا اور یہاں یوپی ہاؤس میں ایک ظہرانے کا اہتمام کیا تو وزیر اعظم نے اس دعوت میں شرکت کے لیے کسی نہ کسی طرح۔ ۔۔منٹ کا وقت نکالا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ دس منٹ وی پی سنگھ اور ارون نہرو سے سرگوشانہ گفتگو کرنے گزارے۔ حیثیت یوپی کے کانگریسی ممبر پارلیمنٹ اس دعوت میں شریک ہوئے تھے اور ویر بہادر سنگھ کو جو کہ اس دعوت کے میزبان تھے ایک کونے میں کھڑے ہو کر کچھ ممبران پارلیمنٹ سے گفتگو پر اکتفا کرنا پڑی۔ اور وزیر اعظم نے چلتے چلتے جماعت کے کارکنان کو جناب وی پی سنگھ کے نزدیک آنے سے روکنے اور ارون نہرو کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں پھیلانے کے سلسلے میں وزیر اعلیٰ کی سرزنش کی۔ وزیر اعظم کے اس عمل سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان دو سابق یا اثر شخصیات نے ان سے یوپی کے وزیر اعلیٰ کے سیاسی جوڑ توڑ کی شکایت کی ہوگی۔ وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کو مہمانوں سے خطاب کرنے کا موقعہ اس وقت مل سکا جب وزیر اعظم وہاں سے جا چکے تھے۔ جب انہوں نے اپنی حکومت کی کارگزاریاں سنانی شروع کیں تو بیشتر ممبران پارلیمنٹ نے ان کا مذاق بنایا۔ وزیر اعلیٰ کے لیے یہ بات بھی تکلیف کا باعث تھی کہ یہ جاننے کے باوجود کہ وزیر اعظم اس دعوت میں شرکت کریں گے کابینہ میں شامل یوپی کے آٹھ وزرا میں سے صرف جناب ضیا الرحمان انصاری ہی اس دعوت میں موجود تھے جبکہ این ڈی تیواری کے علاوہ تمام غیر حاضر وزراء اس دن راجدھانی میں موجود تھے۔

بہرحال وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ ریاست کے ممبران پارلیمنٹ سے ایک تین سطری بیان پر دستخط کرانے میں کامیاب ہو گئے جس میں جناب راجیو گاندھی کی قیادت پر پورے اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا۔ بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ اس تاثر کو ختم کیا جائے کہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے استعفیٰ سے ریاستی کانگریس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا ہے۔

اگلے ہفتے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ نے بہت زوردار الفاظ میں یہ اعلان کرنا ضروری سمجھا کہ وہ تمام لوگ جو یہ سوچ رہے ہیں کہ وہ غیر ملکی اور دفاعی



وشوناتھ پرتاپ سنگھ





دہلی کے رہنما جناب ملائم سنگھ یادو، جنتا پارٹی کے ریونتی رمن سنگھ، کانگریس (جے) کے جناب رام شنکر کوشک اور سی پی آئی کے رہنما جناب سرجو پانڈے شامل تھے۔ ان سب نے گرفتار ہونے سے پہلے حکومت مخالف نعرے بھی لگائے

# قیاس آرائیوں کا خاتمہ

حالانکہ قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں کہ جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی بیطرفی کچھ نہ کچھ رنگ لائے گی۔ اور وہ کانگریس کے اندر اور باہر کے ناراض لوگوں کے اجتماع کے لیے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر لیں گے لیکن ابھی تک وی پی سنگھ نے خفیہ طور پر یا کھلے بندوں ایسی تمام پیش کشوں سے انکار ہی کیا ہے۔ انہوں نے زوردار طور پر جوڑ توڑ کی سیاست کرنے والوں کے ہاتھوں میں کھیلنے سے انکار کر دیا۔"

ایک حالیہ انٹرویو میں انہوں نے ساری قیاس آرائیوں کا خاتمہ کرتے ہوئے کہا کہ "میں نے جلنے والی تمام قیاس آرائیاں کھوکھلی ہیں؛ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے سوال کیا کہ: صرف میرے مستعفی ہو جانے سے حکومت کس طرح کمزور ہو سکتی ہے؟"

کچھ سیاسی پنڈتوں کا یہ خیال ہے کہ شاید

کے تنازعات کو ابھار کر وزیر اعظم کی شخصیت کو مسخ کر سکیں گے وہ سب احمقوں کی جنت میں رہ رہے ہیں انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ "وزیر اعظم کی شخصیت پر کسی طرح کا کوئی اثر ان کی اپنی ریاست میں نہیں پڑنے والا ہے۔"

دوسری طرف حزب اختلاف نے بھی ریاست میں پہلے ہی سے کافی گرم ماحول میں اور گرمی پیدا کی۔ اپریل کے آخری ہفتہ میں حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے چالیس ممبران اسمبلی سکریٹریٹ سے ملحقات میں داخل ہو گئے اور وہاں راہداری میں دھرنا دے کر بیٹھ گئے ان لوگوں نے دوسرے مطالبات کے ساتھ ساتھ فیئر فیکس اور دفاعی سودے کو لے کر راجیو حکومت کی برخاستگی کی مانگ کی۔

ویر بہادر سنگھ کی سرکار نے ان احتجاجی ممبران اسمبلی کو گرفتار کر لیا۔ گرفتار ہونے والوں میں لوک دل



امیتابھ بچن : نئی نئی طاقت



ارون نہرو

ابھی تک پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا سبق نہیں سیکھا ہے یہ سب کچھ اخبارات کے ذہن کی پیداوار ہے ہماری جماعت میں کوئی داخلی بحران نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اس طرح کی سازش کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں کی

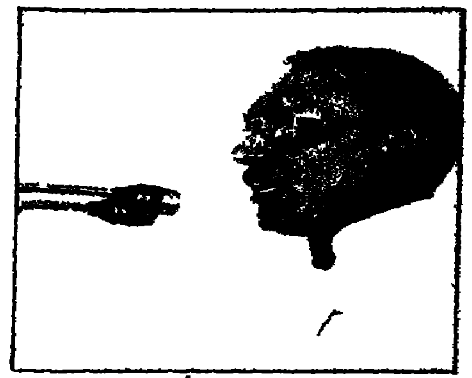
سابق راجہ صاحب اپنے اندر وہ ہمت پیدا نہیں کر پا رہے ہیں کہ بغاوت کا جھنڈا بلند کر سکیں۔ یا ممکن ہے کہ وہ مناسب موقع و محل کے انتظار میں ہوں۔ سیاسی مفکرین اس امر پر متفق نہیں ہیں۔

ہریانہ

# دو لال اکھاڑے میں

ایم۔ ایچ۔ سید

[illegible]



بنسی لال

ہریانہ میں شروع جون میں ہونے والے اسمبلی انتخابات کی تیاری زور و شور سے جاری ہے۔ پوری ریاست میں زبردست سیاسی جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ کورکشیتر اور پانی پت کی جنگوں کے لئے مشہور اس تاریخی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں صف بندی ہو چکی ہے اور تمام سیاسی گروہ اپنے اسلحہ خانوں کی جانچ پڑتال میں مصروف ہیں۔ توپیں نصب کی جا رہی ہیں، گولہ بارود کو دھوپ دکھا کر اس کی سیل اتاری جا رہی ہے۔

ہریانہ کے دونوں لال (دیوی اور بنسی) ایک دوسرے پر حملے کرنے میں مصروف ہیں اور اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اس مرتبہ ان دونوں لالوں کے مابین سیدھی ٹکر ہے اور تیسرے لال (بھجن) انتخابی توازن پر اثر انداز ہونے والا آخری سب سے بڑا حربہ ہیں۔ وہ ترازو کے پلڑے کو کسی سمت بھی جھکا سکتے ہیں اور اس بات کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ آخری لمحات میں ان کے منصوبے اور ارادے کیا ہوں گے۔ ایک جانب وہ کانگریس کے مخالفین کو بڑھاوا دے کر اس ریاست میں برسر اقتدار جماعت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک سکتے ہیں اور دوسری طرف وہ سرکاری گروہ کے موجودہ کپتان بنسی لال کے حق میں اپنا ووٹ ڈال کر انتخابی جنگ میں اس کی کامیابی کے امکانات میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اب یہ بات راز نہیں رہی ہے کہ وہ چودھری بنسی لال سے کس حد تک نفرت کرتے ہیں (درحقیقت وہ کانگریس کے ناراض عناصر کی علامت کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ شاید ان کے سرخیل ہی ہیں)۔

کانگریس کے دیگر بھاری بھرکم لیڈر مثلاً راؤ بیریندر سنگھ اور چودھری سلطان سنگھ کی اپنی اپنی پسند اور اپنے اپنے مسائل ہیں۔ اس سلسلے میں کم سے کم اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ چودھری سلطان سنگھ کا اختلاف اور غصہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اپنی پرانی پارٹی سے ان کی علیحدگی کی خبر کسی وقت بھی آ سکتی ہے جس پر شاید اب کسی کو حیرت نہیں ہوگی کانگریس ریاستی اکائی کو اندرونی جھگڑوں، اختلاف اور داخلی سازشوں کا گھن لگ چکا ہے اور اب پارٹی کے اندر وسیع پیمانے کی نااتفاقی و پھوٹ ایک عام سی بات ہے۔ جناب چودھری دیوی لال اس امر کی تازہ ترین اور روشن ترین مثال ہیں۔ اپنے استعفیٰ کے خط میں وزیر اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے بڑے سخت الفاظ میں جماعت کی بے عملی اور ریاستی حکومت کی ناکامی پر کھلے بندوں اعلان کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آج کانگریس بری طرح پھوٹ کا شکار ہے اب وہ اتنی طاقت ور نہیں ہے کہ وہ اپنے سے بہتر طور پر منظم سنگھرش سمیتی اور چودھری دیوی لال کے لوک دل کے چیلنج کا مقابلہ کر سکے اور مخالف گروہ کے جواں مرد دیوی لال سے یہ امید کی نہیں جا سکتی کہ وہ اس سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کریں گے۔ کیونکہ ظاہر ہے اس مرتبہ وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

روایتی طور پر ہریانہ ذات پات کی سیاست سے متاثر رہا ہے۔ یہاں ذات پات کا عنصر و تعصب





بھجن لال

کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں بہ نسبت حقیقی سیاسی مسائل کے جو عام طور پر پس پشت ہی رہتے ہیں موجودہ انتخابی جنگ بھی صرف دو طویل قامت ہستیوں کا تصادم ہی لگتی ہے اور ریاست کے باقی سبھی لیڈروں کو بڑی آسانی سے نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی تیسری طاقت ابھرتی ہے تو وہ ان دونوں مخالف ہستیوں میں سے کسی ایک کے مواقع بڑھا سکتی ہے۔ پس حقیقی معنوں میں یہ جدوجہد کرسی اور اقتدار کے لئے ہے۔ عوام کو اپنی پسند یا ناپسند کے انتخاب کا حق بہت کم حاصل ہے۔ کیوں کہ انہیں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے دو مدمقابل شخصیتوں میں سے کسی ایک کے ہی سر پہ تاج رکھنا ہے یہاں کسی سیاسی فلسفے یا عام آدمی کے مسائل کو حل کرنے والے بنیادی طریقہ کار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جو مسائل کسی حد تک اہمیت کے حامل ہیں وہ سب علاقائی نوعیت کے ہیں جن سے معاشی مفادات وابستہ ہیں اور جن کا تعلق خوشحال کسانوں کے روزمرہ کے مسائل سے ہے جیسے بنک کے قرضے، سینچائی کی سہولیات، بجلی کی فراہمی میں بہتری، اناج کی قیمتوں میں اضافہ، آمدورفت کا بہتر انتظام اور ان کی پیداوار کی بہتر منتقلی کی سہولیات۔

اس انتخاب میں اگر کوئی موضوع ہے تو وہ ستلج



چودھری ویریندر سنگھ ممبر پارلیمنٹ
نوجوان کانگریسی قیادت

اور جمنا کو ملانے والی نہر ہے۔ چوں کہ اس کا تعلق زرعی طور پر ترقی یافتہ اس ریاست کے کسانوں کی براہ راست خوشحالی سے ہے۔ چنڈی گڑھ کی منتقلی، پنجاب سمجھوتہ اور پڑوس میں دہشت پسندوں کی



سوال : ہریانہ اور ملکی سطح پر لوک دل میں پھوٹ کے کیا اثرات ہو سکتے ہیں ؟

جواب : لوک دل میں کوئی پھوٹ نہیں پڑی ہے صرف ایک سیاست داں ایس۔ پی۔ مالویہ نے پارٹی کو چھوڑا ہے اور کسی ایک فرد کے پارٹی چھوڑنے سے پارٹی کی بنیاد اور مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

س : لیکن اجیت سنگھ نے اپنا الگ گروپ بنا لیا ہے جو لوک دل (اجیت سنگھ) کے نام سے جانا جاتا ہے ؟

ج : یہ اجیت سنگھ کون ہے ؟ یہ پارٹی ملک میں کب سے کام کر رہی ہے۔ وہ صرف ایک "امریکن چھوکرا" ہے وہ چودھری چرن سنگھ کا بیٹا ہے، مگر وہ لوک دل کا رہنما کیسے ہو سکتا ہے آنے والے چند مہینوں میں آپ دیکھیں گے کہ وہ سیاسی طور پر ختم ہو جائے گا صرف ہریانہ کی بات نہیں اس کی کہیں بھی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

س : آپ نے پارٹی کے اتحاد کے لئے کوئی کوشش نہیں کی ؟

ج : میں نے بہت کوشش کی لیکن یہ لڑکا اجیت سنگھ مستقل مزاج نہیں ہے۔ وہ منٹوں میں رنگ بدلتا رہتا ہے۔ دراصل وہ کانگریس (ا) کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔

س : آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں ؟

ج : یہ بات بالکل صاف ہے۔ نٹور سنگھ یہ سب چکر چلا رہے ہیں۔

س : تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بھی طرح ہریانہ کے انتخابات پر اثر انداز نہیں ہو سکتے ؟

ج : قطعی نہیں۔ ہریانہ کے لوگوں کی مکمل حمایت تو مجھے حاصل ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اجیت سنگھ کانگریس (ا) کا ایک ایجنٹ ہے۔ آج ہریانہ کے لوگ میرے، لوک راج کے انتظار میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اسمبلی کی ۹۰ سیٹوں میں سے ۷۰ جیت لیں گے۔



س : کہا جاتا ہے کہ بھجن لال کے کچھ آدمی آپ کی پارٹی میں دراندازی کر کے داخل ہو گئے ہیں ؟

ج : یہ بات سرے سے بے بنیاد ہے۔ یہ صرف کانگریس (ا) کا کیا ہوا پروپیگنڈہ ہے۔ ہریانہ کے لوگ ایسے پروپیگنڈوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ اب وہ ایسی افواہوں پر دھیان نہیں دیتے۔

س : ہردواری لال جی تو آپ کے ساتھ آ گئے ہیں ؟

ج : ہاں انہوں نے اس بدعنوان پارٹی کو چھوڑ دیا ہے اور ہمارے ساتھ شامل ہو گئے ہیں اس سے ہماری تحریک کو دو مزید تقویت حاصل ہوگی

س : آپ ہریانہ میں پھیلی ہوئی بدعنوانی کے بارے میں کیا کہیں گے ؟

ج : صرف ہریانہ کیوں ؟ یہ تو ملک میں ہر طرف ہے۔ دراصل اسے آئی سی سی اب آل انڈیا کانگریس کمیٹی نہیں بلکہ آل انڈیا کرپشن کارپوریشن ہے۔ ہاں اس ریاست میں بھجن لال کی کانگریس حکومت زبردست بدعنوانیوں میں ملوث رہی ہے۔

س : آپ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد چاروں طرف پھیلی اس بدعنوانی کا مقابلہ کیسے کریں گے ؟

ج : یہ میں ابھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ وقت آنے دیجیے پھر میں آپ کو دکھاؤں گا کہ میں بدعنوانی کو کس طرح جڑ سے اکھاڑ پھینکوں گا۔

( آر۔ ایس۔ کسانہ )

سرگرمیوں جیسے مسائل ہریانہ کے لوگوں کے لئے بہت کم اہمیت رکھتے ہیں چاہے وہ جنک ہو یا کوروکشیتر ہو یا انبالہ ہر جگہ ایک عام رائے دہندہ سیاسی جماعتوں کے دعوؤں اور جوابی دعوؤں کے بجائے امیدواروں کی شخصیت کی بنیاد پر ووٹ ڈالنے کی بات کرتا ہے۔ برسر اقتدار کانگریس کے ذریعہ ریاست کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کئے جانے مثلاً قرضے دینے اور ستلج جمنا نہری تعمیر کے کام کو آگے بڑھانے کے دعوے مل کر بھی عام آدمی کو متاثر کرتے نظر نہیں آتے ہیں۔

یہاں سب سے بڑی اکثریت جاٹ (تقریباً ۲۸٪) ہیں باقی آبادی یادو، گوجر، میو اور بشنوئی وغیرہ برادریوں پر مشتمل ہے۔ دیوی لال اب تک جاٹ رہنما کے طور پر ہی جانے جاتے تھے۔ انہوں نے ماضی قریب میں اس چھاپ کو مٹانے کی شدید کوشش کی ہے انہوں نے غیر جاٹ رہنماؤں جیسے رگھو یادو (امیروال سے) خورشید احمد (میوات سے) اور جگپال سنگھ چودھری (انبالوی علاقے سے) کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے اس کے علاوہ سابق وزیر اعلیٰ بھگوت دیال شرما اور بنارسی داس گپتا جیسے سرکردہ و تجربہ کار سیاست داں بھی ان کے حامی ہیں۔ پس ماندہ کے رہنما کرپا رام پونیا بھی چودھری دیوی لال کے ساتھ ہیں۔ اس لئے وہ کانگریس کے روایتی ووٹ بینک میں حصہ بنا سکتے ہیں بڑی دانش مندی سے کام لیتے ہوئے دیوی لال نے پوری توجہ کے ساتھ بنسی لال اور ان کی جماعت کی غلط کاریوں خصوصاً ایمرجنسی کے تاریک دور پر حملے شروع کر دئے ہیں دوسری طرف بنسی لال اس نقطہ پر زور دیتے ہیں کہ صرف وہی ریاستی حکومت ریاست میں خوشحالی لا سکتی ہے

> اس وقت چودھری دیوی لال کانگریس کے خلاف زوروں پر سرگرم عمل ہیں اور لگتا ہے کہ وہ [illegible] گرم ہو ہے پر چوٹ مارنے کا [illegible] سمجھ گئے ہیں اور وہ بھی اس وقت جبکہ کانگریس ابھی [illegible] انتخابات میں لگے زخموں سے پوری طرح صحت یاب بھی نہیں پائی ہے

جس کے تعلقات مرکز کے ساتھ خوشگوار ہوں۔ وہ ایک ایسی حکومت دینے کا وعدہ کرتے ہیں جو فعال ہوگی۔ وہ ووٹروں سے کہتے ہیں کہ "آپ دیوی لال کو تو وزیر اعلیٰ بنا نہیں سکتے لیکن اس چکر میں آپ مجھے بھی کھو دیں گے"

جناب بھجن لال جو اپنی جوڑ توڑ کی صلاحیت اور بہترین سودے بازی کے لئے مشہور ہیں وہ غیر جاٹ قوتوں کو متحد کرنے میں کامیاب ثابت ہوئے تھے (غیر جاٹ مشترکہ طور پر کل آبادی کا بڑا حصہ ہیں)۔ اور اس طرح انہوں نے مضبوط اور منظم جاٹوں کو کبھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ لیکن اس کے برعکس جناب بنسی لال جو خود جاٹ ہیں، غیر جاٹوں کو متحد کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خوشحال اور طاقتور جاٹ طبقہ کے صرف ایک چھوٹے حصے پر ہی قابو رکھنے کا دعوی کر سکتے ہیں۔ چودھری بنسی لال کی ایک مشکل یہ ہے کہ انہیں اختلاف زدہ کانگریس جماعت کے ساتھ اکیلے ہی چلنا ہے جبکہ ان کے مدمقابل دیوی لال کے پاس بھارتیہ جنتا پارٹی کی شکل میں ایک مددگار اور ساجھی دار موجود ہے اور انہیں بائیں بازو کی جماعتوں کی حمایت



چودھری دیوی لال: ہریانہ والو میں تمہیں لوک راج دوں گا۔



کرشمہ بے اثر؟

بھی حاصل ہے۔ نیز بلاشبہ اندرونی طور پر ڈانواں ڈول کانگریسی عناصر کی خفیہ پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ اجیت سنگھ والے لوک دل کے پاس کچھ کرنے کی بہت کم گنجائش ہوگی کیوں کہ ان کے گروپ کے حامیوں کی تعداد اس ریاست میں بہت زیادہ نہیں۔ ایک اور سیاسی جماعت بہوجن سماج پارٹی (بی۔ایس پی) ہے جس نے ریاست کے تمام حلقوں سے اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا اعلان کیا ہے، لیکن اس پارٹی سے زیادہ سے زیادہ یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ چند ایک نشستیں جیت لے گی مگر یہ بات یقینی ہے کہ یہ پارٹی درج فہرست ذات کے ووٹروں کی بڑی تعداد کو متوجہ کرنے میں کامیاب رہے گی، اس لیے کانگریس کی بنیاد کو کمزور کرکے یہ بالواسطہ طور پر صرف چودھری دیوی لال کی ہی مدد کرے گی۔ یہ توقع کرنا مشکل ہے کہ وزیر اعظم راجیو گاندھی کا ذاتی کرشمہ اس ریاست میں کچھ کام دے سکے گا کیونکہ یہ ریاست روایتی طور پر کانگریس مخالف فضا رکھتی ہے۔ وزیر اعظم کے ذریعہ چار ارب کی امداد کا اعلان اور کرنال میں ایک ریفائنری کا سنگ بنیاد بھی ہریانویوں کو بہت زیادہ متاثر کرتا نہیں نظر آتا۔ دوسری طرف چودھری دیوی لال کی جماعت کے پاس وعدوں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں عوامی حکومت دینے کا سنہری وعدہ بھی شامل ہے۔ خاص طور پر اب وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ انہیں اپنی کارکردگی کا نمونہ پیش کرنے اور خوبیوں کا ثبوت پیش کرنے کے لیے، نیز ریاست کے عوام کی خدمت کرنے کے لیے کم سے کم ایک پوری مدت تو ملنی ہی چاہیے۔

اس وقت چودھری دیوی لال کانگریس مخالف لہروں کے دوش پر سرگرم سفر ہیں اور لگتا ہے کہ وہ صحیح وقت پر گرم لوہے پہ چوٹ مارنے کا عزم مصمم کیے ہوئے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ کانگریس ابھی حالیہ اسمبلی انتخابات میں لگے زخموں کے بعد پوری طرح سنبھل بھی نہیں پائی ہے۔

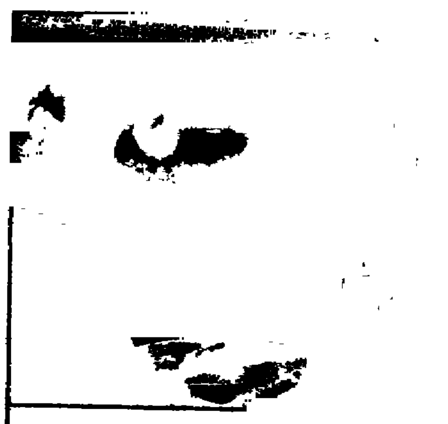


ڈاکٹر منگل سین

بہرحال راجیو گاندھی کی کانگریس کے لیے اب بھی ایک موقع ضرور ہے کیوں کہ برسر اقتدار پارٹی کو یہ سہولت تو حاصل ہوتی ہی ہے کہ وہ طویل مدتی وعدے کرنے کے بجائے ٹھوس تحفے طشت میں سجا کر رائے دہندگان کے سامنے پیش کر سکتی ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں



چودھری سلطان سنگھ۔ پر تولنے کی تیاری





وزیر اعلیٰ چودھری بنسی لال:
امداد اور وعدے سب اپنا جادو کھونے لگے۔

پنجاب

# ایسے ویسے اسم سے کھلتا نہیں جاں کا طلسم

محمد احمد شیون

مسئلہ پنجاب کا تازہ ترین پہلو یہ ہے کہ اب یہ مسئلہ عوام کی عدالت میں آگیا ہے۔ یہ ایک خوش آیند تبدیلی ہے مگر اس کے ساتھ ہی کئی سوال سامنے آجاتے ہیں۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ پنجاب کے مسئلہ کو صرف "لا اینڈ آرڈر" کا مسئلہ سمجھا جا رہا تھا پھر یہ تبدیلی اچانک کیسے آگئی؟ دانشوروں کے ایک حلقے کی سوچ یہ ہے کہ آنجہانی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے صلاح کار یہ نہیں سمجھانے میں کامیاب ہوگئے تھے کہ پنجاب کے مسئلے کو اسی طرح حل کیا جاسکتا ہے جس طرح "لا اینڈ آرڈر" کے مسئلے سے نپٹا جاسکتا ہے۔ پولیس تعینات کردو۔ حفاظتی دستے بھیج دو۔ تشدد اور لوٹ مار کی وارداتیں رک جائیں گی۔ فسادات میں ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ہی حفاظتی دستے کا استعمال ہوا کہ سب کچھ صحیح ہوجاتا ہے۔

مگر پنجاب میں سب کچھ تو کیا، کچھ بھی درست نہ ہوا، حالات اور خراب ہونے لگے۔ اب کیا کیا جائے؟

پھر سیاسی حل کی بات کی جانے لگی۔ حل یہ تلاش کیا گیا کہ پنجاب میں صدر راج نافذ کردو۔ نتائج پھر بھی نہیں نکل رہے تھے۔

اجتماعات ہونے لگے، فائلیں گھومنے لگیں۔ تجزیے اور تبصرے شروع ہوگئے۔

مسز اندرا گاندھی پس و پیش میں تھیں کہ کیا کیا جائے؟ دربار صاحب میں سکونت پذیر دہشت پسند مکمل طور پر چیلنج کرنے کے موڈ میں معلوم ہوتے تھے۔

مرکزی حکومت کے منظور نظر ایک آئی اے ایس افسر کا خیال تھا کہ فوج بھیج کر دربار صاحب کو دہشت پسندوں سے آزاد کرایا جائے۔ اگر ایک بار پنجاب میں فوجی کارروائی کردی جائے تو مسئلہ مکمل طور پر حل ہوجائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ اس پر وزیراعظم نے جاننا چاہا تھا کہ اگر فوجی کارروائی کی جاتی ہے تو سکھ فرقہ اسے کس نظریہ سے لے گا۔

نوکر شاہی کا جواب تیار تھا۔ مثال کے طور پر



بوتاند: عوام کو اعتماد میں لے کر چلنے کا نیا نسخہ

کی دی گئی جہاں بیت اللہ کے احاطہ میں دہشت پسند مقیم ہو گئے تھے تب حفاظتی فوجیوں کو بھیج کر ان کا قلع قمع کیا گیا تھا اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس کارروائی کا خیر مقدم کیا تھا۔ لہٰذا اگر پنجاب میں فوجی کارروائی ہوتی ہے تو پھر کہیں کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔

آپریشن بلیو اسٹار ہوا۔ لگا کہ پنجاب کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ کچھ عرصہ تک سب کچھ صحیح تک رہا تھا مگر اندر ہی اندر کچھ اور ہی پنپ رہا تھا۔ نقصان ہو چکا تھا۔ اس ایک قدم سے!

آج بھی اس امر پر اختلاف ہے کہ جون ۱۹۸۴ء میں پنجاب میں فوجی کارروائی کرنی چاہئے تھی یا نہیں۔

جنتا پارٹی کے ایک قائد کا خیال ہے کہ بلاشبہ وزیر اعظم راجیو گاندھی پنجاب کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں، مگر ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ حل کیسے نکالا جائے۔ کوششیں ہر سطح پہ ہوئی ہیں۔ اب بھی ہو رہی ہیں۔ مگر تصویر کہیں صاف نہیں ہوئی ہے معاملہ الجھا ہوا ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر لال کرشن اڈوانی نے گزشتہ دنوں راجیو گاندھی کی اس عوامی تقریر کا حوالہ دیا تھا جو انہوں نے مسز اندرا گاندھی کے قتل کے کچھ عرصہ بعد کی تھی۔ نومبر فسادات کے بارے میں راجیو گاندھی نے کہا تھا کہ جب کوئی بڑا پیڑ، برگد کا پیڑ گرتا ہے تو زمین کانپنے لگتی ہے۔ اس طرح کے بیان کا مطلب کیا ہے؟

نومبر کے فسادات کی جانچ کے لئے کمیشن کی مانگ اٹھنے لگی تھی مگر نئی حکومت ٹالتی رہی جب دباؤ زیادہ بڑھا تو حکومت نے مشرا کمیشن قائم کیا۔ غیر ضروری تاخیر نے سکھوں کے دل میں پنپ رہے عدم اعتماد کو اور بڑھا دیا۔

وزیر اعظم راجیو گاندھی پنجاب کے حل کے لئے مشتاق تھے، کسی حد تک بے چین بھی، ارجن سنگھ پہ وسیلے کو سونگھنے لگے۔ آخر کار سنت لونگووال سے پنجاب سمجھوتہ ہو گیا۔

مگر پنجاب سمجھوتہ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ بادل اور ٹوہرہ کو اس سے الگ رکھا گیا۔ پنجاب کی سیاست کے ایک شاہد نے اسی وقت تبصرہ کیا تھا "سمجھوتہ ایک فریق سے کر لیا گیا ہے اور دوسرے فریق کو نظر انداز




کر دیا گیا ہے۔"

انجام کار پنجاب سمجھوتے کی ناکامی آہستہ آہستہ سامنے آنے لگی۔

گزشتہ برس ایک موقع پہ ایسی خبریں آنے لگیں کہ حکومت دوسرے گروپ سے شاید بات چیت کرنے کو تیار ہے۔ کچھ اندرونی ذرائع کا کہنا ہے کہ کوشش بھی کی گئی مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ خود وزیر اعظم نے بھی صاف طور پر کہہ دیا کہ دہشت پسندوں سے کوئی بات چیت نہیں کی جا سکتی جب تک وہ اپنا موقف صاف طور پہ نہ ظاہر کریں۔ وزیر داخلہ بوٹا سنگھ نے بادل اور ٹوہرا پہ سخت حملے کئے۔

پنجاب کا مسئلہ پھر اپنے آخری سرے پہ پہنچ گیا شرومنی گرودوارہ پربندھک کمیٹی کا انتخاب ہوا۔ ٹوہرا جی پھر منتخب ہوئے۔ برنالہ دھڑے کو شکست ہوئی۔

اس انتخاب کے بعد حالات نے ڈرامائی موڑ لیا بادل اور ٹوہرا کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری کا مقصد کیا ہے؟ دلی کے ایک روزنامہ نے اپنے اداریے میں لکھا تھا "مقصد جو بھی ہو، نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ اگر کہیں گفت و شنید ہو سکتی تھی تو اس کے راستے بند ہو گئے!"

برنالہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے، مرکز چاہتا تھا کہ برنالہ کامیاب ہوں اس لئے ہر سطح پہ حمایت اور مدد دی گئی۔ لیکن اکالی سیاست صرف برنالہ تک تو نہیں محدود تھی اکالی پارٹی کا ایک گروپ برنالہ کے خلاف ابھرنے لگا آخر کار اکالی دل دو حصوں میں تقسیم ہو گیا مگر غنیمت یہ رہا کہ برنالہ اپنی حکومت بچانے میں کامیاب ہو گئے۔

لیکن دوسری جانب وزیر اعلیٰ برنالہ پنجاب میں پھیلتی دہشت کو محدود کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔ مسٹر ریبرو اور برنالہ کی بے پناہ کوششوں کے باوجود حالت سنبھل نہیں پا رہی۔

اب یہ آواز آنے لگی کہ برنالہ ایک کمزور وزیر اعلیٰ ہیں۔ وہ دہشت پسندوں سے نپٹنے میں ناکام ہیں۔ وزیر اعظم کے کئی ایسے بیانات ہیں جن میں انہوں نے برنالہ سے سخت قدم اٹھانے کو کہا۔

اس درمیان پنجاب کے حالات نے نیا موڑ لیا۔ پروفیسر درشن سنگھ راگی سامنے آئے۔ واقعات کا سلسلہ اتنی تیزی سے بدلا کہ برنالہ کو تنخواہیہ قرار دے دیا گیا مگر برنالہ نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

اب برنالہ اڑا تو گئے مگر آگے کیا کیا جائے؟ اپنے فیصلہ کو کیا اکالی سیاست تک محدود رکھا جائے؟ اگر نہیں تو آگے کہاں تک جایا جا سکتا ہے؟

یہیں سے اس نئے باب کی شروعات ہوتی ہے جسے آج تک پنجاب کے مسئلہ سے دور رکھا گیا تھا یعنی عوام کا اعتماد حاصل کرنا۔ ۲۰ فروری کو لونگووال گاؤں میں جو تاریخی عوامی جلسہ ہوا وہ اس بات کا گواہ ہے کہ اب سیاست داں عوامی اعتماد کے اس مثبت پہلو کو اختیار کرنے کی طرف چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

• اچھا ہے کہ اب مذہب صرف مذہبی جگہوں تک



جی ایس ٹوہرہ: مسئلہ اس طرح حل نہیں ہوگا۔



اور سر کے بال رکھنا پڑیں گے۔ جو لوگ ایسا کرنا منظور نہیں کرتے وہ یا تو پنجاب سے باہر جا کر حجامت کروایا کریں گے یا پھر انہیں پنجاب چھوڑ کر جانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ فرقہ پرست ہندو اس بات کو اندر ہی اندر خوب اچھال رہے ہیں ہندو اب اس بات پر یقین بھی کرنے لگے ہیں کیوں کہ دیہاتی اور چھوٹے قصباتی علاقوں میں ابھی تک ایک حجام کو حفاظت دینے کا یقین دلاتے ہوئے اسے اپنی دکان دوبارہ کھولنے کے لیے نہیں کہا گیا کیوں کہ سرکار کو ایک تو حجاموں سے کوئی آمدنی نہیں ہے، دوسرے برنالہ سرکار کیوں کہ اب بھی خود کو پنتھک سرکار کہتی ہے اس لئے حجاموں کو تحفظ دینے کے نعرے سے خرماتی ہے۔ میٹ اور سگریٹ بیڑی کے دکانداروں کی طرف بھی سرکار کا یہی رویہ ہے البتہ شراب کے ٹھیکیداروں کو زبانی طور پر تحفظ دینے کی بات ضرور کی جا رہی ہے کیوں کہ ان سے ڈھائی سو کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے

کے قریب تین سو ورکر اپریل کے پہلے دو ہفتوں میں گرفتار کئے گئے ہیں۔

دیہات اور چھوٹے قصبات کے لوگوں نے خوف کے مارے اپنے بچوں کو کیسری پگڑیاں پہنا کر اسکول بھیجنا شروع بھی کر دیا ہے۔ ان سب باتوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پنجاب کے حالات کس قدر کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آل پارٹیز ریلیوں میں پنجابیوں نے لاکھوں کی تعداد میں شامل ہو کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ باہمی طور پر اکٹھے رہنا چاہتے ہیں لیکن انتہا پسندوں کے نئے احکامات اور ان پر عمل درآمد نے اقلیتوں میں شک و شبہات کو جس تیزی سے ابھارنا شروع کر رکھا ہے وہ تباہ کن حالات کی صاف ستھری علامت ہے۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ پنجاب میں لوٹ ڈاکے اور قتل و غارت گری کے واقعات نے اب پہلے سے بھی زیادہ شدت اختیار کر لی ہے۔ برنالہ وزارت کی قائمی سے لے کر اپریل کے پہلے دو ہفتوں تک بے گناہوں کے قتل کی تعداد قریب تیرہ سو ہو گئی ہے جن میں سے

انتہا پسند پکڑے بھی گئے ہیں ان میں سے کسی کو باقاعدہ سزا نہیں سنائی گئی۔ ڈاکوں اور قتلوں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ دہشت کے کالے بادل صوبہ میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کو بڑھاتے جا رہے ہیں۔ مذہبی کٹر پن روز نئی بھیانک شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ۳۱ مارچ کو انتہا پسندوں نے شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے ڈپٹی سکریٹری اجناشی سنگھ اور گورورام داس ہسپتال کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر بلدیو سنگھ برار کو اغوا کر لیا تھا۔ یہ دونوں افراد سمرن جیت سنگھ مان کی صدارت والے نئے اکالی دل کے خاص آدمی تھے۔ پنجاب پولیس یا اس کے خفیہ دستے ان دونوں کے زندہ یا مردہ ہونے کا پتہ نہیں لگا سکے۔

۷ مارچ کو ہندوستان ٹائمز نے خبر دی کہ ان دونوں کو اغوا والے دن ہی دریائے بیاس کے نزدیک موضع سبھراواں میں لے جا کر ہلاک کر دیا گیا تھا اور ان کی لاشیں کسی جگہ زمین میں دبا دی گئیں تھیں۔ پنجاب کے سبھی اخباروں نے اس خبر کو سوالیہ نشان کے ساتھ

اخبار نے لکھا کہ سکھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے گورجیت سنگھ اور منجیت سنگھ گروپوں کی طرح انتہاپسند بھی مختلف گروپوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ خالصتان لبریشن فورس کے چار اغوا کنندگان نے ان دونوں کو اس لئے اپنی سازش میں پھنسا کر اغوا کیا کیوں کہ ان دونوں نے دمدمی ٹکسال پانچ ممبری پنتھک کمیٹی اور سکھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن (گورجیت گروپ) کے اشارہ پر درشن سنگھ راگی اور دیگر چار سنگھ صاحبان کو نامزد کروانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ اس کے علاوہ دمدمی ٹکسال اور ایس ایس ایف کے گورجیت گروپ کی حمایت خالصتان کمانڈو فورس کو حاصل ہے۔ اسی کمانڈو فورس اور اس کے حامیوں پر لبریشن فورس والوں کو غصہ ہے کہ ان لوگوں نے لبریشن فورس کے چوٹی کے

براڑ کو اغوا کر کے قتل کر دیا۔ یہ ایک طرح سے خالصتان کمانڈو فورس کو بھی وارننگ ہے کہ اگر وہ لبریشن کے لوگوں کو مروا سکتے ہیں تو لبریشن خود سی کے سی ایف کے ساتھیوں کو ختم کر سکتی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ آج کل پنجاب میں شراب، گوشت، سگریٹ اور حجاموں کے خلاف جو مہم چلائی جا رہی ہے وہ گورجیت سنگھ دھڑے کی طرف سے ہی چلائی جا رہی ہے جسے درشن سنگھ راگی اور دیگر چار سنگھ صاحبان کی بھی پوری حمایت حاصل ہے۔ امرتسر کے پولیس چیف مسٹر محمد اظہار عالم نے، جو خود بھی انتہاپسندوں کی ہٹ لسٹ پہ ہوتے ہوئے جوانمردی سے اپنے فرائض کی تکمیل کر رہے ہیں، ۸ اپریل کو بتایا کہ لبریشن فورس والے راگی اور دوسرے جتھیدار پورن سنگھ کو بھی اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے لیکن ۳۱ مارچ کو یہ دونوں

سے مشورہ کرنے کا بہانہ کر کے انہیں ٹال دیا۔

امرتسر کے پولیس چیف مسٹر عالم نے نامہ نگاروں کو بتایا کہ دربار صاحب میں انتہاپسند کھلے عام ایسے لوگوں کو غیر انسانی اذیتیں دے کر مار رہے ہیں جن پر انہیں پولیس کا مخبر ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے ایک چوبیس سالہ نوجوان چندر سنگھ کو پیش کیا جو کسی طرح انتہاپسندوں کے شکنجہ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نوجوان کا کہنا تھا کہ اس کی نظروں کے سامنے قریب آدھی درجن ایسے نوجوانوں کو بری طرح سے وحشیانہ سلوک کے بعد قتل کر کے ان کی لاشوں کے ٹکڑے کر کے بوریوں میں بھر کر باہر پھینکوا دیا گیا۔ مسٹر عالم کا یہ بھی کہنا ہے کہ انتہاپسند شہر کے دکانداروں سے جزیے وصول کرتے ہیں۔ ایسے جزیوں کے بارے میں اسمبلی میں بھی کافی ہنگامہ



دہشت کی فضا، خوف کا ماحول، انجانے اندیشے، یہ پنجاب کا کوئی بھی شہر ہو سکتا ہے۔

لوگوں کا پولیس کی مدد سے خاتمہ کروایا جس کی وجہ سے کے ایل ایف کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اسی لئے اب کے ایل ایف کے چار لوگوں، جن میں کلدیپ سنگھ مجتل لیڈر۔ موضع منہہ کا جسمیر سنگھ، موضع چینڈا کا بلدیو سنگھ اور موضع ڈھوڈیاں کا برخاست شدہ سپاہی گوردیپ سنگھ شامل تھے، نے گورچرن سنگھ ٹوہرہ کے معتمد ابناشی سنگھ اور ڈاکٹر بلدیو سنگھ

اس لئے بچ گئے کہ امرتسر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ مسٹر راگی اور دیگر سنگھ صاحبان اپنے عہدوں پر آزادانہ طور پہ کام کرنے اور اپنے ہی حامیوں کو بچانے کے لئے کتنے بااختیار ہیں اس کا پتہ اس بات سے لگتا ہے کہ جب اغوا ہونے والے ڈاکٹر براڑ اور ابناشی سنگھ کے لواحقین نے اغوا کی خبر ملنے کے بعد راگی سے مداخلت کرنے کی التجا کی تو اس نے دیگر سنگھ صاحبان

ہو چکا ہے۔ مسٹر عالم نے ۹ اپریل کو نامہ نگاروں کے سامنے ایک اور نوجوان کو پیش کیا جس کا نام اجیت سنگھ ہے۔ اس نوجوان کو پولیس نے حال ہی میں گرفتار کیا ہے جس نے نامہ نگاروں کے سامنے تسلیم کیا کہ گزشتہ ماہ ۲۶ مارچ کو میں نے چھ دیگر انتہاپسندوں کے ساتھ مل کر نریندر سنگھ عرف پنتری کو قتل کرنے سے پہلے اس کی لاش کی ٹانگیں کاٹ کر

گڑھ میں گرانا چاہا لیکن لاش بڑی ہونے کی وجہ سے
جب ایسا نہ ہو سکا تو گوردوارہ مجی صاحب کے سامنے
اسے زمین میں دفنا دیا تھا بعد میں لاش کو وہاں
سے بھی نکال کر کسی اور جگہ ٹھکانے لگا دیا گیا۔ قابل
ذکر بات یہ ہے کہ انتہا پسندوں نے تندی کے
کسی واقف کار دکاندار سے بیس ہزار روپے جزیہ
کے طور پر مانگے، دکاندار کے پاس بیس ہزار روپے
نہیں تھے اس لئے وہ اپنے واقف کار نریندر سنگھ
تندی کے پاس گیا کیوں کہ تندی خود بھی سکھ
اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا ممبر تھا۔ تندی نے دربار صاحب
میں جا کر جب جزیہ کی رقم آدھی کرنے کی سفارش
کی تو انتہا پسندوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار
کر دیا جس پر ان کی آپس میں تکرار ہو گئی۔ تب تندی
کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہوئے انتہا پسندوں نے
اسے مار ڈالنا بہتر سمجھا۔ پہلے تندی کی خوب پٹائی
کی گئی اس کے بعد اسے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ بعد
میں اجیت سنگھ سے اس کی ٹانگیں کٹوائی گئیں
اور لاش کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔ اسی طرح پولیس
کے ایک سپاہی کو دربار صاحب کے کمرہ نمبر ۴۷ میں
جس طرح مارا گیا تھا اس کی کہانی پہلے ہی شائع
ہو چکی ہے۔ دربار صاحب کے اندر ایسے کتنے ہی لوگوں
کو وحشیانہ اذیتیں دے کر قتل کیا جا چکا ہے اور یہ
سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ دربار صاحب میں آپریشن
بلیو اسٹار سے پہلے بھی یہ سب کچھ ہوتا تھا لیکن
اب جب کہ شرومنی پربندھک کمیٹی پر بھی مکمل طور پر
انتہا پسندوں کا قبضہ ہے اور پانچوں سنگھ صاحبان
بھی انہی کے اشاروں پر چلتے ہیں تو ان کے لئے دربار
صاحب و دیگر گوردواروں کا استعمال کھلا ہے۔
اس لئے اب حالات آپریشن بلیو اسٹار کے قبل کے
حالات سے بھی خطرناک ہیں۔

سکھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن اگرجیت سنگھ
گروپ نے شراب، گوشت، سگریٹ بیڑی اور بھالو
کی دکانیں بند کروانے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے یہ
اس لئے نہیں کہ مہم چلانے والے سبھی لوگ دودھ میں
دھلے ہوئے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل مقصد
ایک تیر سے دو نشانے حاصل کرنا ہے۔ ایک یہ کہ
خوف کے مارے دیہاتی علاقوں میں ایسی دکانیں
بند ہونے سے عام لوگوں کو خاص کر جوان لڑکوں اور
نئی عمر کے بچوں اور عمر رسیدہ بوڑھوں کی ہمدردیاں
ان کے ساتھ ہوں گی۔ دوسرے ان علاقوں کے
... سے گھبرا کر سال سے ساگتا شروع

کر دیں گے۔ تیسرے یہ کہ اس خوف کا فائدہ اٹھاتے
ہوئے انتہا پسندوں کو شہری شراب اور سگریٹ
وغیرہ کے تھوک بیوپاریوں سے سودا کرنے میں
آسانی ہوگی۔ دیہاتی کھلبلی کو دیکھتے ہوئے شہری لوگ
بھی بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔

شراب کے ایک بیوپاری نے بتایا کہ کچھ
دن پہلے انتہا پسندوں نے ضلع بینڈ کوارٹروں پر
ایسے بیوپاریوں سے سودا کرنے کے لئے ان کے
پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے لیکن الگ الگ قسطوں کی رقمیں
اتنی زیادہ مانگی گئی تھیں کہ ان کی ادائیگی کے بعد
ٹھیکیداروں کے پلے کچھ بھی نہیں پڑتا تھا۔ اس لئے
ہم نے یہ رقمیں کم کرنے کے لئے کہا۔ اپریل کے پہلے
ہفتہ کے آخر میں ایک تجویز آئی کہ دیہات اور چھوٹے
قصبوں کے جو ٹھیکے بند ہو جائیں گے ان کی وجہ سے
شہری ٹھیکوں کی بکری بڑھ جائے گی۔ پھر بھی مقررہ
رقموں میں پچیس فی صد کی کمی کی تجویز آئی لیکن
سودا سرے نہیں چڑھا۔ دوسرے ہفتہ پچاس فیصد
کی کمی کی تجویز آئی ہے۔ لگتا ہے تھوڑا لے دے کر
کے سودا طے ہو جائے گا۔ جب رقم کی وضاحت کے
بارے میں پوچھا گیا تو بات ٹال دی گئی لیکن اپنے
ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ سودا چار کروڑ روپے
میں یا اس سے کچھ کم طے ہونے والا ہے۔ اس کا
ایک حصہ ڈسٹلری والے دیں گے ایک تھوک والے
اور ایک پرچون ٹھیکیدار۔ اسی طرح کے سودے
سگریٹ بیڑی کے تھوک فروشوں اور گوشت والوں
سے کرنے کا عمل جاری ہے۔ حیران کن بات تو یہ ہے
کہ شراب اور سگریٹ بیڑی کی دیہات اور چھوٹے
قصبوں کی خفیہ سپلائی کے لئے ان لوگوں نے



سنیل دت: ماہا پد یاترا کے بعد؟



جے۔ ایف۔ ربیرو: ڈائریکٹر جنرل پولیس

اپنے ایجنٹ لگانے کی بھی پیش کش کی ہے دوسری
طرف ناجائز شراب کا دھندہ کرنے والے بھی اس
حکمت عملی سے خوش ہیں۔ شراب کے ٹھیکیداروں
یہ بھی کہنا ہے کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ انتہا پسند شراب
اور تمباکو کی دکانیں کسی مذہبی عقیدہ کے تحت بند
کروا رہے ہیں، یہ بات سراسر غلط ہے بلکہ انتہا پسند
شراب اور کباب کے بے حد رسیا ہیں۔ ان کے ایلچی
ان کے لئے بڑھیا سے بڑھیا قسم کی شراب شہروں
سے کر جاتے ہیں اس بات کی تائید تو کئی دیگر ایسے
نے بھی کی ہے جو ان لوگوں سے اپنی خاص واقفیت
کا دم بھرتے ہیں لیکن فیروز پور رینج کے ڈی آئی جی
پولیس جناب ڈی ایس موہی نے تو واضح طور پر
تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ روز ضلع
فرید کوٹ کے تھانہ منہا کے موضع دھور کوٹ
انتہا پسند ہردیپ سنگھ کے گھر میں چھپے ہو...
انتہا پسندوں کو گرفتار کرنے کے لئے جب
گیا تو وہاں سے ناجائز شراب کا بھرا ہوا ایک
افیم اور چار بوریاں پوست برآمد ہوئے۔ آپ
کر کے تلاشی اس گاؤں کے چالیس سرکردہ ا...
حاضری میں لی گئی جنہوں نے بتایا کہ یہ انتہا
اس گھر میں چار دن سے چھپے ہوئے تھے اور
کباب کی محفل چل رہی تھی۔ مشہور
انتہا پسندوں کی شراب سگریٹ مخالفت نہ
کر کھل ہے مذکورہ چھاپہ اس کا منہ بولتا

یہ انتہا پسند کتنے مذہبی عقیدہ کے ہیں اس کا
پتہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ حالیہ عرصہ
میں ہی یہ لوگ قریب دو درجن ایسے لوگوں کو موت
کے گھاٹ اتار چکے ہیں جو کسی نہ کسی گوردوارہ کے
پاٹھی یا سیوادار تھے۔ ان میں جذبۂ انسانیت کتنا
ہے اس کی صرف ایک ہی مثال دینا کافی ہے کہ انہوں
نے سرجیت سنگھ برنالہ کے اپنے شہر برنالہ کے ماسٹر
پیارے لال شرما (جو وہاں کے سوشل ورکر ہیں)
کے چار سالہ پوتے کو ۱۹ مارچ کو اسکول سے واپس
آتے ہوئے اغوا کر لیا اور ۲۰ مارچ کی رات کو
معصوم بچے کے کپڑے بمعہ ایک چٹھی بچے کے وارثوں
کے گھر ایک ٹوکری میں رکھ گئے۔ چٹھی میں بچے کو چھڑانے
کے لئے پندرہ ہزار روپے مانگے گئے تھے۔ چٹھی کے
مطابق مقررہ جگہ پہ یہ رقم رکھ بھی دی تھی لیکن شہر
میں شور مچ جانے اور پولیس کی سرگرمی کے خوف سے
وہ رقم نہ اٹھائی گئی اور ۲۶ مارچ کو ماسٹر پیارے لال
کو ایک اور چٹھی بھیج کر یہ دل دہلا دینے والی خبر دی کہ
تمہارا پوتا چنٹو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد شام
پانچ بجے برنالہ کے سنسان مویشی ہسپتال کے
ایک کونے میں دری میں لپٹی ہوئی معصوم بچے کی لاش



ملی۔ پنجاب میں ایسے دلخراش واقعات کی ایک طویل
داستان ہے۔

پنجاب میں امن قائم کرنے کے لئے ہردوار سے
لے کر امرتسر تک سادھو سنتوں کے ایک بڑے جتھے نے
امن مارچ بھی کیا۔ ملک کی سبھی سیاسی پارٹیوں نے مشترکہ طور
پر صوبہ بھر میں بڑی بڑی ریلیاں بھی کیں۔ صوبہ بھر میں امن
کی قائمی کے لئے دانشوروں کے بے شمار مباحثے بھی ہوئے
اسی مقصد سے ملک کے نامور شاعر کیفی اعظمی کی تنظیم
"اپٹا" نے ڈرامے بھی کئے۔ فلمی ایکٹرز اور ممبر پارلیمنٹ
سنیل دت اور ان کی بیٹی پریہ دت نے بمبئی سے لے کر
امرتسر تک پیدل سفر بھی کیا۔ اس سب کچھ کے باوجود
حالات سدھرنے کے بجائے لگاتار بگڑتے ہی جا رہے
ہیں

کر اس منصوبہ پر عمل درآمد ہونا شروع
ہو گیا تو پنجاب تباہ ہو جائے گا پتہ چلا ہے کہ ملکی پیمانہ
پر کٹر ہندو فرقہ پرستوں کی کچھ خفیہ میٹنگیں دہلی، جیدرآبادی
دہلی اور ناگپور میں ہو چکی ہیں جن میں پنجاب کے
عمل کے ردعمل کا پروگرام طے کیا جا رہا ہے ایسی آخری
میٹنگ بیساکھی کے بعد غالباً دہلی یا اس کے آس پاس
ہونے والی ہے جس میں ہندو کمانڈو فورس کو عملی شکل
دی جائے گی۔ اس فورس کی برانچیں سارے ملک میں
ہوں گی جو پنجاب میں ہونے والے واقعات کے
جواب میں ویسے ہی کام کریں گی۔ ضرورت ہے کہ ملک
کو آنے والے اس بھیانک خطرے سے بچایا جائے
ورنہ فسطائیت، ملکی آزادی، سالمیت اور قومی یکجہتی کو
تار تار کر کے رکھ دے گی۔ اب زیادہ دیر سوچنے کا
وقت نہیں بلکہ ایسے عمل کا ہے جو اس ملک کو ایک
رکھ سکے۔ اس ملک کے عوام کے دلوں سے مذہب،
ذات اور علاقہ پرستی کے زہر کو نکال سکے

# حالِ ہند کے قارئین کی خدمت میں

قومیں جب ماضی کے خول سے باہر آتی ہیں تو وہ ابدی دولت سے مالا مال ہو کر جد وجہد کی نئی راہیں اور نئی سمتیں تلاش کرتی ہیں۔ نئے آفاق کی جانب قدم بڑھاتے وقت انہیں تکان بھی محسوس ہوتی ہے، پسینہ بھی آتا ہے اور کبھی کبھی لہولہان بھی ہونا پڑتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کا سفر جاری رہتا ہے۔ ہندوستانی قوم نے اپنا سفر صرف چند دہائی قبل شروع کیا تھا اس کا یہ سفر کٹھن اور مشقت طلب بھی ہے اور اکثر بے کیف اور مایوس کن بھی۔

اس قوم کے مسائل گوناگوں ہیں اور جن میں سے اکثر کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہیں۔ یہاں کثرت میں وحدت ہے۔ یہاں مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ علاقائی امتیازات بھی اپنا کام کرتے ہیں۔ پھر اس کی بھاری آبادی اور اقتصادی ترقی کی سست رفتار بھی تو ایک مسئلہ ہے۔ بہرکیف ہم میں سے اکثر لوگوں کو یقین ہے کہ ہم اپنی قوم کا عروج دیکھ سکیں گے اور تمام تر درپیش خطرات کا بھی ہم پر کوئی اثر نہیں ہوگا مگر شرط یہ ہے کہ ہمارا انداز فکر اور ہمارا طریقۂ کار مثبت ہو۔ اپنے نصب العین سے ہمیں ہمارا خلوص مسلمہ ہو کیونکہ گرتی ہوئی اخلاقیات کے بل پر آج کی عظیم قوم استوار نہیں رہ سکتی۔ اب اگر ہمیں آئین کی روشنی میں اظہار رائے کی آزادی کا بھرپور استعمال کرنا ہے تو منفی نوعیت کی سنسنی خیزی کی جگہ تعمیری تجزیہ نگاری کو راہ دینی ہوگی اور صحیح مواصلت قائم کرنا ہوگی۔

انہی خیالات سے تحریک حاصل کرکے میں نے اپنے ممتاز دوستوں کی مدد سے دو ماہانہ جریدے جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے ایک انگریزی میں اور ایک اردو میں جن کے نام ہیں۔ "دی رائزنگ نیشن" اور "حال ہند"۔ ان دونوں رسائل کی اشاعت باقاعدہ طور سے جاری ہے۔ ان رسالوں کا دامن بڑا وسیع ہے۔ اس میں سیاست اقتصادیات، ادب، تازہ ترین امور، قومی، بین الاقوامی حالات، فلم، کھیل اور قانون وغیرہ سبھی کچھ موجود ہے۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان رسائل میں بہت سا ایسا مواد بھی ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ ملک کے ممتاز ترین قلمکاروں کا تعاون ان رسائل کو حاصل ہے۔ یہ دونوں جریدے "ہورائزن پبلشنگ ہاؤس" کے ذریعہ ۹۰۔شاہجہاں روڈ، نئی دہلی سے شائع ہو رہے ہیں۔

مجھے اس میں چنداں شک نہیں کہ آپ اس کوشش کو پسند فرمائیں گے۔ اسی احساس کے ساتھ میں آپ سے رجوع کرکے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ آپ ان جریدوں کے خریدار بنیں۔ سرپرست کی حیثیت سے، حیاتی ممبر کی حیثیت یا عام قاری کی حیثیت سے ــــ آپ مقررہ مطلوبہ رقم منیجر ہورائزن پبلشنگ ہاؤس کے نام منی آرڈر، چیک یا ڈرافٹ کی صورت میں ارسال کر سکتے ہیں۔

مخلص

**ڈی۔ڈی۔ٹھاکور**

ایڈیٹر انچیف

بانی سرپرست فیس ــــــ مبلغ تین ہزار روپے (فی رسالہ)

حیاتی رکنیت ــــــ مبلغ ایک ہزار روپے (" ")

سالانہ فیس ــــــ مبلغ ۵۰ روپے (" ")



## لوک دل

ایم۔ ایچ۔ سیّد

# تقسیم در تقسیم



لوک دل کو شمالی ہند کی سب

چودھری چرن سنگھ جنھوں نے لوک دل کو سیاسی سطح پر ایک پُروقار حیثیت دلوائی تھی، وہ آج صاحبِ فراش ہیں اور جسمانی طور پر قطعاً بے عمل ہیں۔ اسی دوران لوک دل کی باگ ڈور حاصل کرنے کے لیے رسّہ کشی شروع ہوگئی ہے۔ اس رسّہ کشی میں ایک بیمار خودان کے صاحبزادے اور وارث اجیت سنگھ کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف میدان سیاست کے پرانے کھلاڑی، گھاگ سیاست داں ہیم وتی نندن بہوگنا ہیں

ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیاں اندرونی خلفشار اور بکھراؤ کا شکار رہی ہیں۔ کانگریس، کمیونسٹ، سوشلسٹ اور جنتا۔ ایک نہیں متعدد بار سیاسی بحران میں مبتلا ہوئیں، اور تقسیم ہوگئیں۔ اب شمالی ہند کی سب سے بڑی مخالف جماعت ان حالات کا شکار ہے۔

اور اب تک جاری ہے کی روایات کے عین مطابق ہے ۔ارٹی کے عمر رسیدہ لیڈروں کے خلاف۔ ۔تی نسل کی، وراثت اور سیاسی ۔۔ پر حکمرانی ۔۔ ایک اور ۔۔نا ہے۔



ہیم وتی نندن بہوگنا

اجیت سنگھ نے بھی اپنے سیاسی بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یہ کام شروع کیا۔ ان کو پارٹی کے بزرگ لیڈروں نے بالکل اسی طرح آگے بڑھایا جس طرح ۔ کے۔ کامراج نے مسز اندرا گاندھی کو سیڑھی دی تھی ہیں۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو ان کے بہنوئی جی۔ ایم۔ شاہ نے

سالہ کلاسیکی روایتی ہے دو سال پہلے بڑھا سکتا روایت کے مطابق بیمار چودھری چرن سنگھ کے اکلوتے بیٹے معتبر، علم یافتہ، اور نرم لب و لہجہ کے مالک اجیت سنگھ جب سیاسی اکھاڑے میں داخل ہوئے اور ان کا خاندانی پارٹی میں داخل ہونے کا رجحان ظاہر ہوا تو عمر رسیدہ لیڈروں نے پہلے پہل ان کو خوش آمدید کہا اور تمام نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔

اجیت سنگھ جن کی تعلیم اور ذہنی تربیت امریکا میں ہوئی ہے، پیشہ کے لحاظ سے ایک کمپیوٹر انجینیئر ہیں۔ وہ اپنے ۸۵ سالہ بیمار والد کے ذاتی ووٹ بینک کو دیکھتے ہوئے پارٹی کی صدارت کے موروثی دعویدار ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ اپنی سا کھ قائم کرنے کے لیے دہلی سے ہیم وتی نندن بہوگنا ہریانہ سے دیوی لال، اتر پردیش سے ملائم سنگھ یادو، بہار سے کرپوری ٹھاکر اور جموں و کشمیر سے میر قاسم کے اثرات کو ختم کر دیں۔ اس چکر میں انھوں نے بی۔ پی۔ موریہ اور شرد یادو جیسے لوگوں کو پارٹی سے نکال باہر کیا۔ اب لوک دل کی نئی نسل کی باگ ڈور نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کہنا ہے کہ اس وقت جب کہ ملک کی عنان حکومت نوجوان نسل کے ہاتھوں میں ہے تو لوک دل کی باگ ڈور کیوں نہ ایک ابھرتے ہوئے نوجوان کو سونپ دی جائے۔

یہ سیاسی ڈرامہ پارٹی کی تقسیم سے دس قبل شروع ہوا۔ اجیت سنگھ نے تمام عمر رسیدہ لیڈروں کو چیلنج کیا۔ ڈرامہ کی شروعات ۱۵



اجیت سنگھ:
باپ کی وراثت کے دعویدار

میں مبتلا ہیں۔

ہریانہ میں بھی اتر پردیش کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پارٹی دوگروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ اس وقت تک صورت حال مکمل طور سے واضح نہیں ہے، اور ہر گروہ اپنے کو زیادہ طاقت ور ظاہر کرنے میں لگا ہوا ہے۔

لوک دل اپنے قیام کے وقت سے اب تک ہمیشہ ذات برادری کی سیاست پر قایم رہا ہے۔ مغربی اتر پردیش میں جاٹ، مشرقی اتر پردیش میں یادو برادری ہمیشہ سے پارٹی کی اہم طاقت رہی ہے۔ اس کے علاوہ کرمی، کیوری اور کاچھی برادری کے لوگ بھی پارٹی میں اپنی جگہ بنانے اور اثر قایم کرنے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ اتفاق سے مسٹر بہوگنا، پارٹی کے اکلوتے برہمن لیڈر ہیں۔ انھوں نے کبھی چودھری چرن سنگھ اور ان کے سیاسی فلسفہ کو پسند نہیں کیا۔ مسٹر بہوگنا پنڈت نہرو اور ان کے اختیار کردہ سوشلزم کے فلسفہ کے زبردست حامی رہے ہیں، جب کہ چودھری



چودھری چرن سنگھ
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

چرن سنگھ کی نہرو اور ان کی پالیسیوں سے نفرت کسی سے بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اختلافات فیصلہ کن ثابت ہوں اور خیالات کا یہ تضاد، علاحدگی کا سبب بن جائے۔

بہر حال اس جنگ میں فاتح وہی ہوگا جسے چودھری چرن سنگھ کی حمایت حاصل کرنے میں کامیابی ملے گی، اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہوگا، جب تک چودھری صاحب خود بولنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ اس لیے اس سلسلے میں ابھی کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا، کہ چرن سنگھ آخر وقت میں اپنا تمام اعتماد اور نیک خواہشات کس کی جھولی میں ڈالیں گے۔

تاہم ابھرتے لیڈر اجیت سنگھ کو پارٹی کے عمر رسیدہ لوگوں سے زیادہ پریشانی نہیں ہے۔ بلکہ وہ پارٹی کو عمر رسیدہ لوگوں کے بار گراں سے نجات دلا کر خوش ہی نظر کرتے ہیں، نیز وہ اس خاندانی وراثت سے محروم نہیں ہونا چاہتے جو ان کو چودھری صاحب سے مل رہی ہے، اور اس میں کسی بھی طرح کی مداخلت کو وہ پسند نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ چودھری صاحب کی بیگم شریمتی گائتری دیوی اور ان کی ۵ صاحبزادیوں کی بھی ہر سیاسی معاملے میں اپنی رائے ہے۔ یعنی مجموعی طور پر یہ ایک خاندانی معاملے سے زیادہ نہیں۔



ملائم سنگھ: مجھے ملائم نہ سمجھ لینا

پارٹی کمان نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے اجیت سنگھ اور ان کے دو قریب ترین ہم نواؤں ستیہ پرکاش مالویہ اور رشید مسعود کو اتر پردیش میں پارٹی مخالف سرگرمیوں کا الزام لگاتے ہوئے پارٹی سے نکال دیا۔ مسٹر دیوی لال نے اس سلسلے میں پانچ صفحات پر مشتمل ایک خط بھی اجیت سنگھ کو تحریر کیا جس میں کافی سخت الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ ان سب کے باوجود اجیت سنگھ اور ان کے ساتھی اپنے منصوبے کے مطابق کام کرتے رہے۔ الزامات، جوابی الزامات، حکمت عملی اور جوابی حکمت عملی کا ایک طویل سلسلہ چلتا رہا۔ یہ سیاسی ڈرامہ اس وقت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا جب پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک کی سربراہی خود چودھری اجیت سنگھ کر رہے ہیں۔ (وہ پارٹی کے نائب صدر ہیں) اور دوسرے گروپ کی سربراہی مسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا نے سنبھالی ہے (نائب صدر)

اس ڈرامہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دونوں گروپ چودھری چرن سنگھ کو اپنا قائد مانتے ہیں۔ اور ان پر مکمل اعتماد ظاہر کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ وہ پارٹی کے صدر ہیں اور اس وقت کوئی بھی عملی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ کیوں کہ اطلاعات کے مطابق وہ ایک طویل عرصے سے نیم بیہوشی

اعجاز اشرف

## کسان تحریک

# مفلسی کے سکوں سے دولت و اقتدار کی تجارت

ملک میں پہلی بار کسانوں کا منظم احتجاج سامنے آیا ہے جو حکومت کی بے حسی اور کسانوں کے مسائل سے لاپروائی کے خلاف متحد ہو رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ نئی تحریک مالداروں کے مقابلہ میں دیہی غریبوں کے لئے مفید اور مددگار ثابت ہوگی؟

ان لوگوں کا ہجوم شہد کی مکھیوں کی طرح بپھرا ہوا بڑھ رہا تھا۔ ان کا ارادہ اسمبلی کا جس کا اجلاس ان دنوں چل رہا تھا، "گھیراؤ" کرنے اور سرکاری کام کاج کو ٹھپ کر دینے کا تھا۔ دوسری طرف سنٹرل ریزرو پولیس فورس کے جوانوں کو بھی سخت احکامات ملے ہوئے تھے ان کا کام تھا کہ وہ اس بپھرے ہوئے ہجوم کو اسمبلی تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہونے دیں۔ ویسا ہی ہوا، لیکن اس قیمت پر کہ اس ... تک ... کے نتیجہ میں ... ہلاک ہو چکے تھے۔

یہ واقعہ ۱۹ مارچ کا ہے جو گجرات ... آیا۔ جو لوگ اسمبلی کا گھیراؤ کرنا چاہتے تھے وہ ... کسان تھے۔ یہ گھیراؤ بھارتیہ کسان سنگھ کی اپیل پر کیا جانے والا تھا۔ فی الواقع یہ مظاہرہ کسانوں کے چھ ماہ سے جاری احتجاج کا نقطۂ عروج تھا۔ جو بجلی پر لگائی گئی اونچی شرحوں اور کھاد، بیج وغیرہ جیسی کاشتکاری کے لئے استعمال کی جانے والی بنیادی اشیا کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے خلاف ایک عرصے سے چل رہا تھا۔

۳ اپریل کو اتر پردیش میں شاملی میں ان کسانوں کی یاد میں ایک ریلی نکالی گئی، جو ایک ماہ پہلے ایک احتجاج میں ہلاک ہو گئے تھے جب پی اے سی نے پاور ہاؤس کا گھیراؤ کرنے والے ایک بے قابو ہجوم پر گولی چلا دی تھی۔ ان جاٹ کسانوں کا بھی مطالبہ تھا کہ حکومت بجلی کی شرحوں میں اضافے سے متعلق اپنا فیصلہ واپس لے۔ ۲ اپریل کو ان کسانوں کے لیڈر مہندر سنگھ ٹکیت نے اعلان کیا کہ اگر حکومت کسانوں کے استعمال کی بجلی کی شرحوں میں اضافہ کا فیصلہ واپس نہیں لیتی تو ہم بجلی کے بل ادا نہیں کریں گے۔



سود میوسی، کسانوں کے نیتا

پنجاب میں "کسان یونین" نے فیصلہ کیا ہے کہ ۳ جون سے گیہوں اور دوسرا اناج کی پنجاب سے دوسری ریاستوں کو سپلائی روک دی جائے گی۔ ان پنجابی کسانوں کا غصہ پیداواری لاگت اور فروخت کی قیمت کے درمیان بھاری فرق ہے۔ کسان یونین کے جنرل سکریٹری مسٹر راجاوالا کا کہنا ہے کہ اس فرق کی وجہ سے بے چارے کسان اپنا غلہ ۸۷ روپے فی کوئنٹل کے گھاٹے پر بیچنے کے لئے مجبور ہیں۔

یہی صورت حال مہاراشٹر میں ہے۔ ۱۳ فروری کو بمبئی میں ریاست کے مختلف حصوں کے کسانوں کا مظاہرہ ہوا۔ یہاں کسان تحریک شرد جوشی کی قیادت میں مہاراشٹر سنگٹھن کے ذریعہ چلائی جا رہی ہے۔ اس دن یعنی ۱۳ فروری کو اخباری نمائندوں سے وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ پر دھرنے کے مجوزہ پروگرام کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے کہا گیا کہ پچھلے سال ۳۱۱ روپے فی کوئنٹل کی حمی قیمت کی ادائیگی کا وعدہ کیا گیا تھا، اگر اسے پورا نہیں کیا گیا تو ہم پورے موسم گرما تک دھرنا دیتے رہیں گے۔ دونوں طرف ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے صورت حال کو خراب ہونے سے بچایا گیا۔

بہار کے دیہاتوں میں خدید کشمکش کی صورت پائی جاتی ہے شکایتوں کے غصہ اور تلخی نے نیچی ذاتوں کے پس ماندہ طبقوں اور اونچی ذاتوں کے مالدار طبقوں کے درمیان خوفناک ٹکراؤ کی صورت حال اختیار کر لی ہے اس خون ریز ٹکراؤ میں جس کے دوران جدید ہتھیار بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ کتنے ہی افراد کو ہلاک کر دیا گیا ہے لیکن اوپر بیان کی گئی چار ریاستوں کی کسان تحریک کے برخلاف بہار میں جاری ٹکراؤ زیادہ تر دیہی علاقوں تک ہی محدود رہا ہے اور ریاستی حکومت ابھی اس کا نشانہ نہیں بنی ہے۔

ہمارا ملک چونکہ ایک وسیع اور رنگا رنگ علاقوں والا ملک ہے، اس لئے علاقائی فرق کے ساتھ مختلف کسان یونینوں کے مطالبات میں بھی فرق ہے، لیکن یہ فرق مختلف علاقوں کے کسان لیڈروں کے لئے آپسی رابطہ قائم کرنے میں حائل نہیں ہوا ہے۔ کیوں کہ مطالبات اور شکایتوں میں جو بھی فرق ہو، کسان تحریکوں کو جس بڑے پیمانہ پر حمایت مل رہی ہے وہ اس بات کی مظہر بھی ہے اور یہی ان تحریکوں کے درمیان رابطہ کی بنیادی کڑی بھی ہے کہ دیہی علاقوں میں ایک کھولتی ہوئی بے چینی موجود ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پنجاب کے راجاوالا اور مہاراشٹر کے شرد جوشی نے اتر پردیش میں شاملی کی ریلی میں شرکت کی۔ ان لیڈروں کے درمیان اس بات پر اتفاق تھا کہ کسان تحریکوں کو مربوط کیا جائے تاکہ حکومت کے دیہی علاقوں کی طرف سے لاپروائی اور بے حسی کے مقابلہ میں یہ تحریکیں ایک جوابی طاقت کے طور پر کام کر سکیں۔

### اہم مطالبات

کچھ مطالبات ایسے ہیں جو ان کسان تحریکوں

کے یہاں مشترک ہیں۔ مثال کے طور پر بجلی کی شرح کم کرنے کا مطالبہ تقریباً متفقہ مطالبہ ہے اور کسان یونینوں کی جانب سے بظاہر پہلی متحدہ کارروائی یہ ہوگی کہ کسانوں سے یہ کہا جائے کہ وہ بجلی کے محصول

طور پر گجرات میں کسان لیڈروں نے ایک شخص کی موت پر پچاس ہزار روپے معاوضہ ادا کئے جانے کا پُرزور مطالبہ کرایا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی اپیل، بجائے خود مضحکہ خیز سہی، لیکن کسانوں کو ایک محفوظ مستقبل

شمار سے بھی کچھ نہ کچھ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کسان تحریک کے مطالبات اور ان اعداد و شمار کے درمیان بھی ربط بھی دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر فلاں اور فلاں مطالبہ کو تسلیم کرلیا جائے



مہندر سنگھ ٹکیت: میں کسان ہوں، سیاسی لیڈر نہیں!

ادا نہ کریں جب تک کہ تمام ریاستوں کے لئے یکساں بجلی محصول طے نہ کیا جائے۔ بیشتر ریاستوں میں کسانوں کی برہمی کا ایک بڑا سبب ان کی یہ خواہش ہے کہ ان کی پیداوار کی سرکاری خرید پر زیادہ قیمت دی جائے۔ اسی طرح کسان تنظیموں کے مطالبات میں ایک اور مشترک مطالبہ پیداواری ذرائع (کھاد، بیج وغیرہ) کی قیمت میں کمی کا ہے۔

ان کسان تحریکوں کا ایک غیر معمولی طور پر نمایاں پہلو وہ وسیع حمایت ہے، جو انہیں دیہی علاقوں سے ملی ہے۔ مختلف سطحوں پر اور مختلف ذرائع سے کئے گئے سروے سے پتہ چلتا ہے کہ اس احتجاج اور تحریک کے لئے خستہ حال طبقات اور عوام میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ دوسری جانب کسان لیڈروں کی جانب سے بھاری بھر کم اور دانو کے مطالبات اٹھائے جاتے ہیں جن سے دیہی عوام کی حمایت حاصل کی جا سکے۔ مثال کے

کا خواب ضرور دکھائے گی، یہ اور بات ہے کہ اس کے تسلیم کیے جانے کا امکان تقریباً صفر ہو۔

کسانوں کے اندر جنگ جو رجحان اور غصہ ملکی افق پر رونما ہونے والے خطرناک بادلوں کی علامت ہے۔ لیکن ایک عام بے چینی اور حکومت کے خلاف غصے کے جذبات فی الواقع دیہی علاقوں میں پھیل چکے ہیں اس صورت حال سے کچھ لوگوں نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرلیا ہے کہ کسانوں کی موجودہ تحریک سے چھوٹے اور کمزور کسانوں کی امنگوں کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس تحریک کو غیر سیاسی نوعیت کی تحریک قرار دینے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ ان حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ تحریک جیسے جیسے آگے بڑھے گی، دیہی علاقوں کے عوام کی حالت زار کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ اس نقطہ نظر کی حمایت میں اعداد و

تو اتنی بڑی تعداد میں کاشتکاروں کو فلاں فلاں فائدے حاصل ہوں گے لیکن اس طرح کا تجزیہ کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اعداد و شمار بالخصوص جو منصوبوں سے متعلق ہوں صرف نظریاتی اور خیالی امکانات کو ظاہر کرتے ہیں، جب کہ اصل سچائی اور عملی حقائق کو چھپا لیتے ہیں۔ بعض اعداد و شمار بلاشبہ ایسے ہیں جنہیں رد نہیں کیا جا سکتا، لیکن ایسے بے شمار معاملات ہیں جن میں اعداد و شمار کے ایک ہی مجموعہ کو ایک دوسرے طریقہ کار سے استعمال کرکے ان سے بالکل مختلف نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان مطالبات اور ان کے سلسلے میں دیے جانے والے اعداد و شمار کے درمیان بہت ہی نازک اور ناپائیدار تعلق ہے اور اس بنا پر کوئی متعین نتیجہ نکال لینا صحیح نہیں۔



مغربی اترپردیش کے کسان : جدوجہد کا عزم

اب سوال یہ ہے کہ یہ تحریک کس قسم کی ہے؟ اس کی نوعیت، اس کا مقصد کیا ہے؟ اس سوال کا جواب پانے کے لئے اس تحریک کے لیڈروں کی طرف سے دیئے جانے والے بیانات کی تہہ میں اترنا اور ان کے مطالبات کے عملی پہلوؤں کا جائزہ لینا ہوگا۔

تمام ہی ریاستوں میں اس تحریک کی جانب سے زرعی پیداوار کے لیے اونچی قیمتیں متعین کرنے کے لئے احتجاج کیا جا رہا ہے اور اس کی بنا پر بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اگر اس مطالبہ کو مان لیا جائے تو چھوٹے کسانوں کو خاص طور پر فائدہ ہوگا۔ لیکن ذرا گہرائی سے دیکھا جائے تو بالکل الٹی تصویر نظر آتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پیدا کی گئی اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ہو تو ایک عارضی عرصہ تک پیداوار کی مقدار میں بھی اضافہ ہوگا۔ لیکن پیداوار میں اضافہ سے یہ ضروری نہیں کہ چھوٹے کسانوں کو فائدہ پہنچے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بیشتر چھوٹے کسان غلہ فروخت نہیں کرتے۔ پیدا کردہ غلہ کی اونچی قیمتوں سے انہیں نقصان ہی ہوگا کیوں کہ جو کچھ وہ پیدا کرتے ہیں عام طور سے وہ یا تو ان کے اپنے استعمال میں آجاتا ہے یا پھر قرض دینے

اس کے علاوہ یہ بات بھی کہ جب پیداوار کی قیمت بڑھے گی تو اس کی مقدار میں بھی اضافہ ہوگا۔ عارضی لحاظ سے تو ٹھیک ہے لیکن طویل مدتی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کھیتوں میں پیداوار کی مقدار بڑھانے کی بھی ایک حد ہے جب کہ چھوٹے کسانوں کے پاس تو اتنا سرمایہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ نئے ذرائع اور تکنیک سے کام لے کر پیداوار بڑھا سکیں۔ اس طرح یہ بالکل واضح ہے کہ غلوں کی (سرکاری) قیمت خرید میں اضافہ سے چھوٹے اور کمزور کسانوں کی خستہ حالت بہتر ہونے کے بجائے صرف مالدار اور بڑے کسانوں کی ہی تجوریاں زیادہ سے زیادہ بھر جائیں گی۔

گجرات میں بھارتیہ کسان سنگھ کا ایک اہم مطالبہ یہ ہے کہ کم سے کم اجرتوں سے متعلق قانون کو ختم کیا جائے۔ سنگھ کا کہنا ہے کہ اس قانون پر عمل کرانے کے پردے میں حکومت کسان اور کھیت مزدور کے درمیان کشیدگی اور تلخی کو بڑھا رہی ہے۔ لیکن اس طرح کی احمقانہ باتوں سے ان فائدوں کو نہیں چھپایا جا سکتا جو مذکورہ قانون کے ختم کیے جانے کی صورت میں کسانوں کو حاصل ہوں گے یہ اصل

مزدور تو بے زمین طبقوں کے لوگ یا چھوٹے اور کمزور کسان ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹے اور کمزور کسان اپنی اور اپنے کنبہ کی محنت کو فروخت کرنے اور دوسروں کے کھیتوں پر کام کرنے کے لئے یا تو نقدی کی ضرورت یا پرانے قرضوں سے چھٹکارا پانے کی خاطر مجبور ہوتے ہیں یا محض اس بنا پر کہ اپنی کاشتکاری میں مسلسل گھاٹا اٹھانے کے بعد مزید سرمایہ لگانے کی پوزیشن میں نہیں رہتے۔ بالآخر ان کے سامنے اپنے اوپر لدے ہوئے بھاری قرضوں کی بنا پر زمین مالکوں کے کھیت پر کام کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اس کی اجرت میں جو کچھ اور جتنا کچھ انہیں ملتا ہے لینا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے مذکورہ بالا قانون کے حوالہ سے حکومت کے خلاف ہنگامہ آرائی کا مقصد صاف طور پر محض لیبر کی لاگت کو کم رکھنا اور بھاری منافع حاصل کرنا ہے۔

بھارتیہ کسان سنگھ کے مطالبات کی فہرست میں ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ چھوٹے اور کمزور کسانوں کی درجہ بندی از سر نو کی جائے۔ سنگھ یہ چاہتا ہے کہ کمزور کسان ان لوگوں کو کہا جائے جن کے پاس دس ایکڑ زمین ہو اور پندرہ ایکڑ زمین والوں کو چھوٹے

درجہ بندی کردی جائے تو کاشتکاروں کو قرضوں کی سہولتیں حاصل کرنے میں آسانی ہوجائے لیکن چھوٹے اور کمزور کسانوں کی کوئی یکساں عمومی کسوٹی طے نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ اس طرح کی درجہ بندی کسی علاقہ کے زمینی وسائل اور ماحولیاتی حالات کی بنیاد پر کی جانی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ کسی نیم بنجر یا بارش پر منحصر علاقہ اور زمینی آب پاشی والے زرخیز علاقہ میں دس ایکڑ زمین کی پیداواری صلاحیت الگ الگ ہوگی۔

اس قانون کو ختم کرنے کا مطالبہ بھی بڑی شدت سے کیا جارہا ہے جس کے تحت کسان کی رہائش سے پندرہ کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ پر زمین کی ملکیت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اس مطالبہ کا مقصد محض مالدار کسانوں کے مفادات کی تسکین کرنا ہے اگر حکومت اس مطالبہ کو تسلیم کرلے تو اس کے نتیجہ میں بے شمار چھوٹے اور اوسط درجہ کے کسان زمینوں سے محروم ہوتے چلے جائیں گے اور کاشتکاری کی زمینیں دور دور تک مالدار کسان حاصل کرلیں گے۔ نتیجہ میں ملکیت اراضی کا پورا ڈھانچہ ہی الٹ پلٹ جائے گا۔

یہی مقصد ٹریکٹروں سے متعلق مطالبہ کا بھی ہے۔ دیہی علاقوں میں ٹریکٹر ٹرانسپورٹ کا ایک اہم ذریعہ بن چکے ہیں۔ بڑے کسان جن کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ ٹریکٹر کی خریداری میں لگا سکیں، یہ چاہتے ہیں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ منافع بخش طریقہ پر استعمال کرکے ان میں لگی ہوئی رقم کی بازیابی کرلیں اس لئے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ دیہی دور دراز علاقوں میں مناسب سرکاری ٹرانسپورٹ کی عدم موجودگی میں ٹریکٹروں کے ٹرانسپورٹ کے لیے استعمال کی مستقل اجازت دے دی جائے، دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس سے رابطہ اور نقل و حرکت میں آسانی ہوگی۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ ٹریکٹر زراعتی مقاصد کے لئے رعایتی قرضوں پر خریدے جاتے ہیں اور ان کے تجارتی منافع بخش کاموں میں استعمال کا مطلب یہ ہے کہ سرکار کی جانب سے دی جانے والی رعایت اور امداد کا فائدہ اٹھا کر بڑے کسان بھاری منافع کمائیں۔ پھر یہ ہوگا کہ ٹریکٹر کھلے عام سرکاری رعایتوں کے تحت آسان قسطوں پر خریدے جائیں گے اور لوگوں سے بھاری کرایہ وصول کرنے کے لئے انہیں کام میں لایا جائے گا۔

تقریباً ایک متفقہ مطالبہ یہ ہے کہ بجلی کی شرح کم کی جائے۔ اس کا فائدہ بھی مالدار کسانوں کو ہی ہوگا۔ اگر دوسرے پیداواری وسائل (بیر کھاد، اچھی کوالٹی کے بیج، صحیح مقدار اور صحیح وقت پر آبپاشی) کے ساتھ مربوط کرکے دیکھا جائے اور ان وسائل کی فراہمی اور خوب تر طریقے پر ان کے استعمال میں چھوٹے اور کمزور کسانوں خصوصاً نیم بنجر علاقوں کے کسانوں کو سرمایہ کی کمی کا بوجھ اور دوسری رکاوٹوں کی صورت میں درپیش مجبوریوں کو سامنے رکھا جائے تو بجلی کی شرح ... کمی چھوٹے اور کمزور کسانوں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ بحیثیت مجموعی دیگر وسائل پیداوار کی قیمتوں میں کمی بھی انہیں خود بخود کوئی فائدہ نہیں دے سکی ... کہ جب گرین ریوولیوشن (سبز انقلاب) کی بات کی جاتی ہے تو اس کے ... در اصل ابتدائی ... رہا ... اور ... کے بعد بھی وسائل کا مسلسل ور ایک خاص مقدار میں یقینی فراہمی کی ضرورت ہے، جو چھوٹے اور کمزور کسانوں کے بس سے باہر ہے۔

مختصر یہ کہ اعداد و شمار پیش کرکے خواہ کتنی ہی آسانی سے یہ دکھا دیا جائے کہ بنیادی پیداواری عوامل کی قیمتوں میں کمی سے اتنی بڑی تعداد میں غریب کسانوں کو فائدہ پہنچے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت کو سمجھنے والوں کے نزدیک یہ خلاف واقعہ ہے۔ موجودہ کسان تحریک اصلاً مالدار کسانوں کے مفادات کے لئے ہے اور اس سے غریب اور محنت کش عوام کی زندگی میں کوئی بہتری نہیں کرے گی۔ اس بات کی وضاحت کچھ بنیادی قسم کے سوالات کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔

مثلاً سوال یہ ہے کہ اس طرح کا کوئی مطالبہ کیوں نہیں کیا گیا کہ غریب کسانوں کی ضرورتوں کے اعتبار سے ڈلیوری سسٹم کو زیادہ بہتر بنایا جائے؟ ان کسان لیڈروں نے ناکام اور کمزور درجہ کے کاشتکاروں کو مالی امداد دینے کی ضرورت کی طرف کیوں توجہ نہیں دی جیسا کہ صنعتی شعبہ میں کیا جاتا ہے؟ ان لیڈروں نے بنیادی ڈھانچہ سے متعلق ان سہولتوں کا مطالبہ کیوں نہیں کیا جن سے زراعتی توسیع کی کوشش غریب ترین لوگوں تک اثر انداز ہوسکے؟ ان تحریکوں کی جانب سے کسانوں کی اور خاص طور پر بارش پر منحصر علاقوں کے کسانوں کو ترقیاتی کوششوں میں زیادہ سے زیادہ شریک کرنے کے لئے اقدامات کرنے کی ضرورت پر کیوں زور نہیں دیا گیا؟ — ان سوالوں کا جواب بالکل سادہ سا ہے۔ اس طرح کے اقدامات سے غریب کسانوں کو فائدہ پہنچے گا اور اس کے نتیجہ میں ان کے مالدار ساتھیوں کی آمدنی میں کمی آسکتی ہے۔

## حمایت کا سبب

اگرچہ تحریک وسیع تر اور طویل مدتی اعتبار سے چھوٹے اور کمزور کسانوں کے فائدے کے لیے نہیں ہے، تو فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کی اتنی بڑی تعداد میں حمایت اس کسان تحریک کو کیوں حاصل ہے؟ اس کا ایک اہم سبب وہ بے چینی ہے جو حکومت کی غیر منصفانہ پالیسیوں پر دیہی علاقوں میں عام طور پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ تجارتی صورتحال بھی کسانوں کے لئے ناموافق رہی ہے کیونکہ غیر زرعی اشیا کے مقابلہ میں زرعی اشیا کی قیمتیں کہیں کم ہیں مزید برآں دیہی غربت کی علامت محض آمدنی کی ہی کمی نہیں ہے بلکہ دوسری بنیادی ضروریات مثلاً طبی سہولتیں، سڑکیں، پینے کا پانی اور اسکولوں کی سہولتیں بمشکل دستیاب ہیں۔ اسی طرح دیہی علاقوں میں جیسے جیسے آبادی بڑھی ہے۔ لوگوں کو حاصل زمینیں گھٹتی چلی گئی ہیں۔ ان تمام باتوں کا سماجی صورتحال پر جو نقصان دہ اثر ہوا ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ حکومت کی پالیسیوں سے کسانوں کی اسی ناراضگی کا کسان تحریک چلانے والوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس میں ہندوستان کی سماجی خصوصیات اور موجودہ تحریک کے لیڈروں کی سیاسی چالاکی دونوں بیک وقت کارفرما ہیں۔

ایک اور عنصر قرضہ دینے والوں اور زمینداروں کا دباؤ ہے جس طرح کسانوں کو اپنی کھیتی کے لئے ٹکنالوجی، فصل وغیرہ کے انتخاب میں قرضہ دینے والوں کی متلون مزاجی کا خیال رکھنا پڑتا ہے، اسی طرح اس کی سیاسی سرگرمیاں بھی پابند ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کمزور کی عددی طاقت کے باوجود ایک چھوٹے سے طبقہ کے معاشی حملہ کا توڑ نہیں کیا جاسکا ہے۔

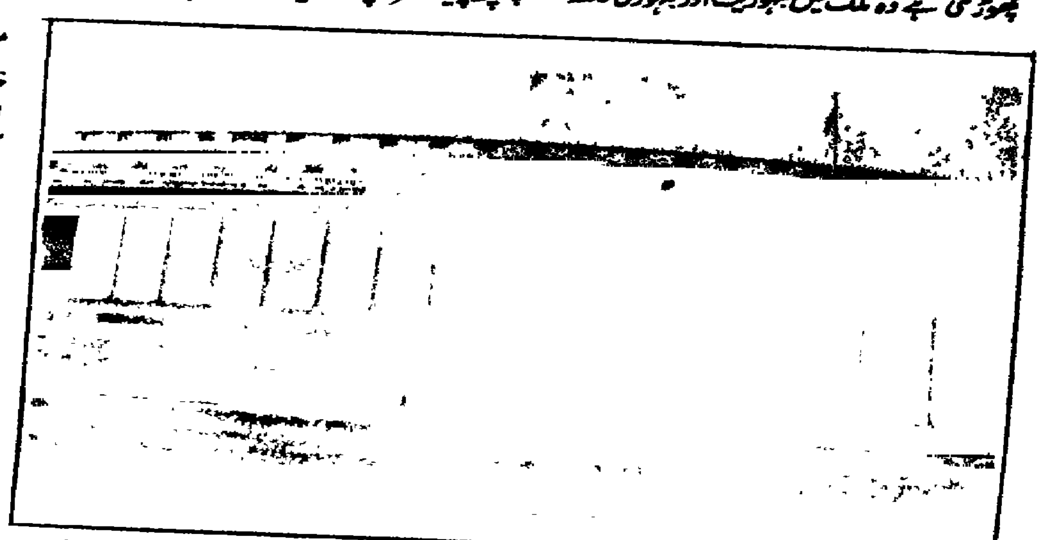
اس تحریک کو چھوٹے کمزور کسانوں سے حاصل ہونے والی حمایت کا سب سے اہم سبب انہیں سبز باغ دکھانے کی وہ کوشش ہے، جو تحریک کے لیڈروں نے کی ہے۔ جن غریب کسانوں کو ایک شاندار مستقبل کا سہانا خواب دکھایا گیا ہے، فطری طور پر وہ آگے بڑھ کر اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی جدوجہد میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہوگی کہ آگے چل کر ان کے یہ مالدار سرپرست انہیں دھوکہ دے جائیں اور انہیں بے سہارا چھوڑ دیں ایسی صورت میں چھوٹے کمزور کسانوں کو کیا ملے گا؟ ممکن ہے کہ انہیں ان کا مطلوبہ مقصد حاصل نہ ہو، لیکن یہ تحریک انہیں بیدار ضرور کردے گی۔



ملک فردوس

# اسپیکر کی اگنی پریکشا

١٥ اپریل کو لوک سبھا کو ایک غیر معمولی بلکہ ہنگامی حالت کا سامنا کرنا پڑا جب ایوان نے چار گھنٹے تک محترم اسپیکر بلرام جھاکڑ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک اور حزب اختلاف کی طرف سے انھیں اس عہدے سے ہٹائے جانے کے مطالبے پر شور شرابے، آوازوں اور طعنوں سے بھرپور بحث کا ناخوشگوار فرض انجام دیا۔ ایوان میں کانگریس کو دو تہائی سے بھی زیادہ اکثریت حاصل ہے اس لیے ایسی کسی بحث کا حشر پہلے سے ہی معلوم تھا لیکن یہ تحریک اور یہ بحث سیاسی مزاج رکھنے والے عوام کے منہ میں جو کڑواہٹ چھوڑ گئی ہے وہ ملک میں جمہوریت اور جمہوری قدروں



کے مستقبل اور جمہوری اداروں کے مقام اور وقار کے شایانِ شان نہیں ہے۔

لوک سبھا میں اسپیکر کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسی سپریم کورٹ میں چیف جسٹس کی۔ جس طرح پورے عدلیہ نظام کو چیف جسٹس کی غیر جانب داری اور انصاف پروری پر اعتماد ہوتا ہے اسی طرح لوک سبھا جو ملک کا سب سے بڑا قانون ساز ادارہ ہے اسپیکر کی غیر جانب داری کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ اس لیے اگر ایوان میں حزب مخالف اسپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرکے اُسے عہدے سے ہٹانے کا مطالبہ کرے تو اِسے غیر معمولی واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ تحریک حسب توقع آوازوں سے اظہار رائے کے ذریعہ رد بھی کردی گئی ہے تو بھی اِسے لمحۂ فکریہ کہا جاسکتا ہے اور اس سے اسپیکر کے عہدے کے وقار اور بلرام جھاکڑ کے ذاتی کردار پر کچھ چھینٹے ضرور پڑے ہیں۔ کیونکہ جمہوریت میں اسپیکر کو ایک ایسی ہستی تسلیم کیا جاتا ہے جسے حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں کے مفادات عزیز ہوتے ہیں اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ جمہوریت میں جہاں حکومت کی اپنی اکثریت کی بنا پر اپنی منشا کے مطابق عمل کرنے کا حق ہے وہاں حزب مخالف کی آواز ضرور سنی جانی چاہیے خواہ وہ کتنی ہی اقلیت میں کیوں نہ ہو۔

اس مقام اور وقار کا تقاضا کیا ہے اس کا پتہ اس مثال سے چلتا ہے کہ جب پرشوتم داس ٹنڈن اُترپردیش اسمبلی کے اسپیکر بنے تو ان سے کہا گیا وہ مکمل غیر جانب داری کے اظہار کے طور پر کانگریس پارٹی کی رکنیت چھوڑ دیں۔ لیکن پرشوتم داس ٹنڈن کا جواب تھا کہ مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہے اور جس روز حزب مخالف نے میرے کردار پر اعتراض کیا اسی روز یہ عہدہ چھوڑ دوں گا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی اسپیکرشپ کے بعد میں اپوزیشن کو ایک بار بھی ان پر اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملا۔

جہاں تک لوک سبھا کا تعلق ہے یہ پہلا موقع نہیں جب حزب مخالف کو اسپیکر کے کردار کے خلاف کوئی شکوہ ہوا ہو۔ ١٩٥٤ء میں حزب مخالف نے لوک سبھا کے اسپیکر وی۔ بی۔ ماؤلنکر کے خلاف ایک قرارداد پیش کی تھی وہ قرارداد بحث کے لیے منظور بھی کرلی گئی تھی لیکن اسے نامناسب خیال کرتے ہوئے خود شری جواہر لعل نہرو نے مداخلت کی اور اس پر کوئی بحث نہیں ہوئی۔ ١٩٦٦ میں سردار حکم سنگھ کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش ہوئی لیکن صرف ٢٢ ووٹ پڑے اس لیے وہ داخل نہیں ہوسکی۔ ١٩٧٥ میں شری جی ایس ڈھلوں (سابق وزیر زراعت) کے خلاف تحریک پیش کی گئی وہ بھی بحث کے لیے داخل نہیں ہوسکی۔ اس لیے یہ پہلا موقع ہے جب لوک سبھا کے اسپیکر بلرام جھاکڑ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کے حق میں ٥٠ سے بھی زیادہ ممبران پارلیمنٹ کھڑے ہوئے اور انھیں موجودہ عہدے سے ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد اس قرارداد پر چار گھنٹے تک ہنگامہ خیز بحث اور شور شرابہ جاری رہا جس میں وزیر پارلیمانی امور، وزیر مواصلات، کانگریس کے وزیر مملکت اور حزب مخالف کی طرف۔

چٹرجی، اندرجیت گپتا، مدھو ڈنڈوتے اور دنیش گوسوامی جیسی سرکردہ شخصیتوں نے حصہ لیا۔

آئین کی دفعہ ۹۴ کے تحت یہ قرارداد کمیونسٹ (مارکسٹ) پارٹی کے رکن سومناتھ چٹرجی اور ۴ دیگر ممبران کی طرف سے پیش کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ شری جھاکڑ نے ۱۹ مارچ کو اپنے رولنگ کے ذریعہ ایوان کے ارکان کے بعض آئینی معاملات پر بحث کرنے کے حق سے انکار کرکے ایوان کے ممبروں کا اعتماد کھو دیا ہے لہٰذا ایوان یہ فیصلہ کرتا ہے کہ انھیں اسپیکر کے عہدے سے ہٹا دیا جائے۔

گذشتہ ساڑھے سات برسوں میں شری جھاکڑ کی بطور اسپیکر کارکردگی خاطرخواہ رہی ہے اور حزب مخالف کو بھی اُن پر زیادہ اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملا لہٰذا خود مخالف ممبران کو بھی حکمران جماعت کے ارکان کی طرح افسوس تھا کہ اُن کے خلاف اس قسم کی قرارداد زیر بحث لائی گئی ہے۔ لیکن حزب مخالف کے ممبران کا کہنا تھا کہ اسپیکر نے صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کے باہمی تعلقات اور اُن کی خط وکتابت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوششوں کو جس سختی سے رد کیا تھا اسے دیکھتے ہوئے ان کے لیے اپنے احتجاج کا اظہار کرنے کے لیے عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا۔ مخالف پارٹیوں کو زیادہ اعتراض رولنگ کے اس حصے پر تھا کہ صدر جمہوریہ کے بارے میں ایوان میں کوئی ذکر ہو ہی نہیں سکتا۔ آسام گن پریشد کے رکن دنیش گوسوامی کا کہنا تھا کہ یہ رولنگ سراسر غیر قانونی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لوک سبھا کو صدر جمہوریہ پر الزام عائد کرکے انھیں اس عہدے سے ہٹانے کا اختیار حاصل ہے اُس وقت کس طرح صدر جمہوریہ کا کردار اور نام لوک سبھا میں زیر بحث آئے گا۔ اس لیے اسپیکر نے ۱۹ مارچ کی رولنگ اپنے اختیارات سے تجاوز کرکے حکمران پارٹی کی سہولت کے لیے دیا ہے۔



پنڈت نہرو اور سردار پٹیل
جنہیں پارلیمان کے وقار اور کرسی صدارت کے وقار کا پاس تھا

وزیر پارلیمانی امور اور ڈپٹی اسپیکر تھمبی دورائی نے قرارداد پر بحث کے راستے میں یہ اڑچن کھڑی کر دی کہ لوک سبھا میں کام کے قواعد کے مطابق اسپیکر کی کسی رولنگ پر بحث نہیں ہو سکتی۔ ڈنڈوتے، اندرجیت اور سومناتھ چٹرجی کا کہنا تھا کہ قرارداد ہی اسپیکر کی رولنگ کے خلاف ہے۔ اور کوئی بات زیر بحث ہے ہی نہیں اس لیے بحث کو روکا نہیں جا سکتا۔ ورنہ تحریک داخل ہی ... دن کی گئی ... بہت شور وغل کے بعد جب کاروا... یک اڑچن کھڑی ہو گئی تھی تو وزیر اعظم نے ... خ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی ... ت کسی بحث پر پابندی نہیں لگائے گی۔ چنا... شری سومناتھ چٹرجی نے عدم اعتماد کی تقریر ... ث کا آغاز ... یا۔ اُن کا اور اُن کے ساتھیوں کا موقف یہ تھا کہ اسپیکر نے پارلیمنٹ کو اس بارے میں بحث کرنے سے منع کرکے کہ اگر وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ کے باہمی تعلقات کے بارے میں آئین کی دفعہ ۸۰ کے تحت وزیر اعظم کی طرف سے آئینی ضمانتیں کی خلاف ورزی کی جائے تو اُس کے ازالے کے لیے کون سے اقدامات کیے جا سکتے ہیں دباؤ کے تحت کام کیا ہے اور ان کی حق تلفی کی ہے۔

اس کے مقابلے میں وزیر اعظم شری گاندھی، وزیر پارلیمانی امور اور شری بھگت وزیر مواصلات اور دیگر کانگریسی ورکروں کا کہنا تھا کہ حزب مخالف کے ارادے کچھ اور ہی ہیں اور وہ کسی خارجی دباؤ کے تحت یہ تحریک لائے ہیں۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے بحث میں مداخلت کرتے ہوئے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسپیکر کی رولنگ کے ذریعہ کسی چیز کو روکنے یا چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اس ایوان میں کبھی کسی بحث کا گلا نہیں گھونٹا گیا لہٰذا کوئی چیز پردہ راز میں رکھنے کی دلیل شرارت آمیز ہے۔ ملک کے اتحاد اور استحکام کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لہٰذا تمام محب وطن اور جمہوری قوتوں کو ان خطروں سے محتاط رہنا چاہیے جن سے ہمیں خطرہ درپیش ہے۔ ہمیں جمہوری اداروں کا لازماً احترام کرنا چاہیے۔ حزب مخالف کی اسپیکر کے خلاف قرارداد پارلیمنٹ کے ادب وتقدس اور جمہوری اداروں کے خلاف ہے۔ انھوں نے کہا کہ شری جھاکڑ نے بہترین خدمات انجام دی ہیں اور انھیں اُن پر پورا اعتماد ہے۔

پارلیمانی امور کے وزیر شری ایچ کے۔ ایل



## وزیر اعظم راجیو گاندھی

### جمہوری اداروں کے احترام کا عزم، پارلیمانی بحث کی آزادی کے حق کا اعلان اور اسپیکر بلرام جاکھڑ پر مکمل اعتماد کا اظہار



بھگت نے اسپیکر کی رولنگ کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ مخالف جماعتیں غیر ملکی طاقتوں کے ہاتھ میں کھیلتے ہوئے ملک کی مستحکم سرکار کا تختہ الٹنا چاہتی ہیں۔ وزارت داخلہ کے وزیر مملکت شری چدامبرم نے الزام لگایا کہ مخالف جماعتیں صدر کو وہ اختیار سونپ کر جو انھیں آئین کی رو سے حاصل ہیں ملک میں بادشاہی نظام لانے کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔

تین گھنٹے کے دوطرفہ دلائل، الزام بازی، طعنہ زنی اور حکومت کی طرف سے شری جاکھڑ کی پرزور حمایت کے بعد بھی تحریک پیش کرنے والے رکن شری سومناتھ چٹرجی کو بحث پر اطمینان نہیں ہوا اور انھوں نے بحث کے اختتام پر شکایت کی کہ وزیر اعظم اور حکمران جماعت کے دیگر ارکان نے خارجی طاقتوں، دباؤ، دھمکیوں اور ملک کو درپیش خطروں کا ذکر تو کیا ہے لیکن حزب مخالف کے ممبروں نے جو نکات اٹھائے ہیں جو الزامات لگائے ہیں ان میں سے کسی کا جواب نہیں دیا۔

اس طرح اسپیکر کے کردار کے بارے میں یہ ہنگامی بحث اکثریت کے شور میں ڈوب کر رہ گئی۔ ہاں اہل فکر کو سوچنے کے لیے ایک سوال دے گئی کہ اسپیکر کے عہدے کا وقار اور مقام کس طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

پارلیمنٹ کی لابیوں میں یہ سنا گیا کہ شری بلرام جاکھڑ جن کا اب تک کا ریکارڈ نہایت اچھا ہے اور جو کہا جاتا ہے کہ گیانی ذیل سنگھ کے بعد صدارت کے لیے سب پارٹیوں کے متفقہ امیدوار بننے کی خواہش بھی رکھتے ہیں لوک سبھا کی اس بحث سے خوش نہیں تھے جس سے ان پر آئین کا غلط مطلب نکالنے اور ایوان کے قواعد و ضوابط کا غلط استعمال کرنے کے الزامات لگائے گئے، اور جہاں حکمران طبقے کی طرف سے حزب مخالف پر سیاسی کھیل کھیلنے، اور اسپیکر کے خلاف قرارداد کے ذریعہ حکومت کا تختہ الٹنے جیسے الزام تراشے گئے۔ اسپیکر کی حمایت میں مخالف پارٹیوں سے اس قسم کا سلوک جمہوری درکروں میں اچھا نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسپیکر اب کس طرح مخالف جماعتوں کے ان ارکان کی طرف سے ادب و لحاظ کی امید رکھ سکتے ہیں جنھیں ایوان میں حکومت نے اس طرح سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے بلرام جاکھڑ کو مرکزی وزارت

میں لے لیا جائے اور کسی ... ڈھلوں کو اسپیکر بنا دیا جائے تاکہ عدم اعتماد کی تحریک سے جو تلخی پیدا ہوئی ہے وہ ختم ہو جائے۔

لیکن یہ مسئلہ کا کوئی مستقل حل نہیں ہے بعض سیاست دانوں کی رائے ہے کہ انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی اسپیکر کا کسی پارٹی سے تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ اسے اپنی پارٹی سے مستعفی ہو جانا چاہیے اور آئندہ انتخابات میں وہ اگر پارلیمنٹ کے چناؤ میں کھڑے ہوں تو ان کا مقابلہ نہیں کیا جانا چاہیے۔

ہندوستان میں اب تک دو اسپیکر وٹھل بھائی پٹیل اور سنجیوا ریڈی اپنی پارٹی سے مستعفی ہوئے ہیں۔ اور بلرام جاکھڑ نے ایک بار خود یہ کہا تھا کہ کسی پارٹی کے رکن اسپیکر سے مکمل غیر جانبداری کی توقع مشکل ہے۔ اس کا جھکاؤ کبھی نہ کبھی اپنی جماعت کی جانب ہو سکتا ہے۔ اب بھی اسپیکر کے خلاف جو عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوئی اور بحث کے دوران جو شدید نکتہ چینی ہوئی اس کا ایک سبب یہی جماعتی وفاداری ہے۔

پارلیمانی طرز جمہوریت کی طاقت اور صحت کا انحصار بہت حد تک اسپیکر کی مکمل غیر جانبداری پر ہے۔ اب بھی اگر کانگرس (آئی) اور مخالف جماعتیں مل کر انگلستان جیسا کوئی نظام قائم

کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے اور پارلیمنٹ ایسے تلخ ہنگاموں سے بچ سکتی ہے جس کا سامنا اسے کرنا پڑا۔

[illegible]

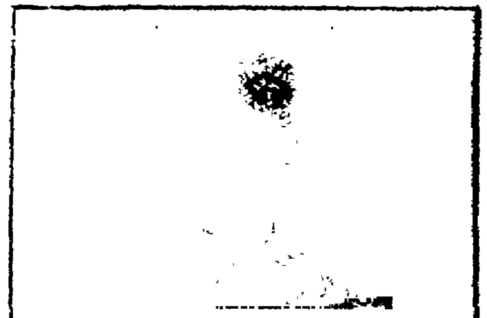
کے ساتھ

آر میسرز فیڈرز لائیڈ (پرائیویٹ) لمیٹیڈ
[illegible] ایم ۱۳، کناٹ پلیس نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۱

مسعود مرزا نیازی

## اقتدار کی غلام گردشوں میں

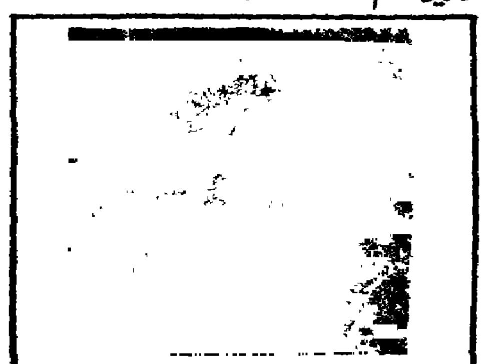
# چھوٹے وزیر، بڑے کارنامے



ارون نہرو

راجدھانی کے سیاسی حلقوں میں آج کل سب سے گرما گرم چرچا کا موضوع (فیرفیکس جیسے وقتی وہنگامی موضوع کے علاوہ) اگر کوئی ہے تو یہ کہ آج مرکزی حکومت کی ساری باگ ڈور کم و بیش وزرائے مملکت کے ہاتھ میں ہے اور کئی اہم وزارتوں کے جونیئر وزیر اپنے سینیئر یعنی کابینہ درجہ کے وزراء سے کہیں زیادہ (عملی) اختیارات کے مالک ہیں۔

تقریباً ہر سیاسی پنڈت نے اپنے تجزیہ میں اشوک سین کا بن باس طے کر رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرکزی کابینہ میں رد و بدل کیا جاتا تھا۔ اس میں نیا وزیر مالیات تو ہٹتا ہی، ساتھ ہی ساتھ وزیر قانون بھی بدلا جاتا۔ وزیر اعظم نے اشوک سین کا استعفیٰ ملتے ہی اعلان



مارگریٹ الوا

کیا کہ نیا وزیر قانون بننے تک وزارت کا کام بھاردواج ہی دیکھیں گے ایسے بھاردواج کو وزارت کا کام نیا نیا ملا ہو۔ دراصل دو تین مہینے گذرنے کے بعد ہی یہ طے ہو گیا تھا کہ اصل وزیر قانون کون ہے سپریم کورٹ میں ججوں کی تقرری کے بارے میں وزیر اعظم کس کی رائے کو آخری طور پر مانتے ہیں؟ اپنے قانونی معاملوں میں وزیر اعظم کس سے صلاح لیتے ہیں؟



کانگریس کے بعض اندرونی حلقوں کے مطابق صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کے مابین کشیدگی کے سلسلے ہیں۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے اشوک سین سے مشورہ ضرور کیا تھا، لیکن دراصل بھاردواج جی کی رائے پر عمل کر کے ہی گوئنکا کے یہاں چھاپا ڈالا گیا۔ اور گرو مورتی اور جانکی رمن کو گرفتار کیا گیا۔

اپنی وزارت کے وزیر مملکت کے سامنے بونا بن جانے کا المیہ صرف اشوک سین کے سامنے ہی نہیں بلکہ راجیو گاندھی کابینہ کے چند اور وزراء بھی اس کا شکار ہیں عوامی فلاح و بہبود وزارت کے پی وی نرسمہا راؤ اور کھیلوں کی وزیر مملکت مارگریٹ الوا کا معاملہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔ وزیر خارجہ نرائن دت تیواری اور وزیر مملکت کے نٹور سنگھ کی آپسی چپقلش سب کے سامنے ہے۔ وزیر

نٹور سنگھ

داخلہ بوٹا سنگھ کو ارون نہرو کے بعد اب پی چدمبرم کے تیزی سے بڑھتے ہوئے اثرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وزیر نقل و حمل بنسی لال کے ذریعہ وزیر مملکت برائے ریل مادھو راؤ سندھیا کے معاملات میں مداخلت کا شاخسانہ سب کے سامنے آ چکا ہے۔ نوبت یہاں تک ہے کہ ایک حلقہ نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ وزیر اعظم وزرائے مملکت کے ذریعے سرکار چلانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

ایمرجنسی میں مسز اندرا گاندھی کے لئے جو حیثیت اوم مہتا کی تھی وہی راجیو گاندھی کے لئے وہی حیثیت وزیر مملکت برائے داخلی تحفظ ارون نہرو کی تھی۔ اخبارول

مادھو راؤ سندھیا

میں کارٹون چھپتے تھے کہ وزیر داخلہ کا سیکریٹری فون کر کے ارون نہرو سے دریافت کر رہا ہے کہ کیا اب وزیر محترم کرسی پر بیٹھ جائیں۔ وزیر مملکت کی حیثیت سے ارون نہرو کی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ بوٹا سنگھ کو نام کا وزیر بنانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے تئے خفیہ شعبے میں محکمۂ مال کے خفیہ شعبہ کو بھی سمیٹ لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن اس وقت کے وزیر مالیات وشوناتھ پرتاپ سنگھ، بوٹا سنگھ نہیں تھے، وہ کیسے برداشت کرتے۔ انھوں نے سیدھے وزیر اعظم سے شکایت کی۔ چار پانچ شکایتیں دینے کے بعد کہیں جا کر وزیر اعظم ارون نہرو سے یہ کہہ پائے کہ بھئی محکمۂ مال کا خفیہ شعبہ راجا صاحب کے پاس ہی رہنے دو۔

ایک زمانہ تھا جب وزرائے مملکت کو کام نہ ملنے کی شکایت رہتی تھی۔ سکریٹری سطح کے افسر ان سے نہ کچھ پوچھتے تھے اور نہ ہی کوئی فائل دکھاتے تھے۔ موٹر، بنگلہ اور ہوائی جہاز کے استعمال کا نام تھا وزیر مملکت اور نائب وزیر۔ اب حالات دوسرے ہو گئے ہیں۔ وزرائے مملکت کے بڑھتے ہوئے حقوق کے خلاف وزرائے کابینہ کو شکایت کرنی پڑی۔ وزیر خارجہ نرائن دت تیواری نے تقریباً چار مہینے پیشتر اس بات کی شکایت کی تھی کہ ان کے شعبہ کے وزیر مملکت سیدھے فائل وزیر اعظم کے پاس کیسے بھیج سکتے ہیں؟ اس عرضی کا نشانہ نٹور سنگھ تھے جو شروع میں نٹور سنگھ وزارت فولاد میں نائب وزیر بنائے گئے تھے۔ دراصل شعبۂ خارجہ کے اعلیٰ افسران، وزیر خارجہ کی حیثیت سے نٹور سنگھ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نٹور سنگھ بہت جونیئر ہیں اور ان کے کام کرنے کا انداز بڑا استادانہ ہے۔ اپنے



نرائن دت تیواری



[illegible] کے نہرو، ارون [illegible] پی [illegible]

پاس کی بات کو وہ کبھی ترجیح نہیں دیتے۔

تیواری جی کی شکایت سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ وزیر اعظم کے سیکریٹریٹ نے ایک ہدایت نامہ جاری کیا جس کے تحت وزرائے مملکت کو ہدایت دی گئی تھی وہ اپنی فائلیں وزرائے کابینہ کے ذریعے ہی بھجوایا کریں۔ لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ [illegible] حلقوں کا کہنا ہے کہ وزیر اعظم نے وزارت میں جان بوجھ کر ایسا وزیر مملکت لا رکھے ہیں جو چند ہی دنوں میں اپنی ہوشیاری سے وزیر کابینہ کا رنگ پھیکا کر دیتا ہے۔

شری نرائن دت تیواری جب وزیر صنعت تھے تو اپنے شعبے کے وزیر مملکت کے۔ کے تیواری سے ہمیشہ خفا رہے۔ ایک تو وزیر اعظم نے کے۔ کے تیواری کو، نرائن دت تیواری کی مرضی کے خلاف مامور کیا تھا۔ بڑھ کر گفتگو کرنے والے اور اپنا حق ثابت کرنے کے لئے بے چین اس وزیر مملکت کا کام کرنے کا انداز وزیر کابینہ سے بالکل مختلف تھا۔ وزارت صنعت سے ہٹائے جانے تک نرائن دت تیواری کے۔ کے تیواری کو قابو میں کرنے کا داؤں نہیں ڈھونڈھ پائے تھے۔ کے۔ کے تیواری کے مخالفت

کا کہنا تھا کہ وہ دروازہ توڑ کر وزارت میں داخل ہونے میں اتنا کوئی کیا لگا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تیواری نے پارلیمنٹ میں صدر پر جو حملہ کیا تھا وزارت میں ان کی شمولیت اسی کا انعام سمجھی جا رہی تھی۔

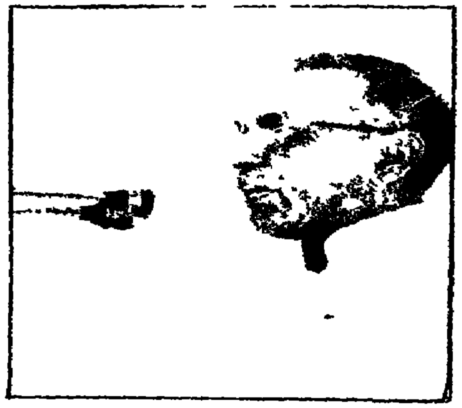
وزیر مملکت مادھو راؤ سندھیا جانتے تھے کہ منی لال ایک اڈیل وزیر کا نام ہے اس لئے انھوں نے تھوڑی نرمی سے کام لیا اور کئی بار انعام ٹالا۔ ہریانہ کے انتخابات میں بھجن لال کی ضرورت مادھو راؤ کے لئے من چاہی مراد تھی۔ اب وہ ریل کے آزاد وزیر مملکت ہیں لیکن جب تک منی لال وزیر نقل وحمل رہے مادھو راؤ برابر ان کے اعلاعہدے کی عزت کرتے رہے۔

شری منی لال اور شری نرائن دت تیواری کی مثال سے ایک بات صاف ہوتی ہے کہ اگر وزیر کی شخصیت پیدا شدہ اور اس میں اپنے حق کو منوانے کی طاقت بھی ہو تو وہ اپنی مرضی چلا سکتا ہے۔ گورباچوف کے دورۂ ہندوستان کے موقع پر جاری کئے گئے اعلان میں روسی قائد نے اہنسا کے اصول کی تعریف زور دار طریقے سے کی تھی۔ وزیر خارجہ کی حیثیت سے نرائن دت تیواری نے پروپیگنڈا کرنے میں

کامیاب رہے کہ اعلان میں لفظ "اجتماعی" شامل
کرانے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ویسے بھی آج کل
فراق و سنجیدگی کے اعتبار سے ... آکر
... زیادہ تو ... سیاست ... کو ...
ہیں۔ آج کل ... اس ... مسائل
دونوں سے ... ہے۔

اس کے بالکل برعکس یہاں پی وی نرسمہا
راؤ کی ہے۔ ان کے پاس دو ... ہیں
جن ما گریٹ الوا اور کرسنا شاہی ان دنوں مار
مارگریٹ الوا کا ستارہ بلند ہے۔ یا ... میں پہلے
ہی ان کا نام زیادہ اچھالا جاتا ہے لیکن وزیراعظم
کے اندرونی حلقوں میں وہ نرسمہا راؤ سے کم اہم نہیں
ہیں۔ مسز الوا کے اثرات بڑھانے میں نرسمہا راؤ
کا ہاتھ بھی کم نہیں ہے۔ نرسمہا راؤ ان لیڈروں میں
سے ہیں جو بغیر کچھ کہے ہوئے اپنی عقل اور ... شس
سیاست کے ہوتے ہیں ہمیشہ دوسرے تیسرے نمبر پر
رہتے آئے ہیں۔ وہ پارلیمانی بورڈ کے ممبر ہیں۔ اور
اپنی دانش مندی کا احساس وزیراعظم کو دلاتے
رہتے ہیں۔ محترمہ الوا اور محترمہ شاہی پر کام کا ...
چھوڑ دینا ان کو راس آتا ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں

نے خود وزیراعظم سے ان دونوں وزرا کی تعریف
کرکے ان کی ہمت بڑھائی ہے۔
... وزیراعظم کے ...
... اطلاعات اور نشریات ...



... ال

ان دونوں اہم وزارتوں میں انھوں نے کابینہ سطح کے
وزیر کا تقرر نہیں کیا۔ شری ... دت پٹے وییم کے



... راؤ

ساتھ مالیات بھی سنبھال رہے ہیں شری احیت
یا ... اطلاعات میں چھپے ہوئے ہیں اس کے
علاوہ وزیراعظم کے ذاتی صلاح کاروں میں بھی
شری ... راؤ ... شری راجیش پائلٹ شری
پی چدمبرم اور شیمتی مارگریٹ الوا جیسے وزرا بھی
شامل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے
ایک ہی منطق کام کر رہی ہے شاید وزیراعظم
یہ محسوس کرتے ہیں کہ نوجوان ان کے کام کرنے
رفتار کے زیادہ نزدیک ہیں۔ یعنی نوجوان
کو زیادہ تیز رفتاری اور مہارت کے ساتھ
کی راہ پر گامزن رکھ سکتے ہیں۔



# ہماچل پردیش

## تیزی سے بدلتی ہوئی صورتِ حال

آج ہماچل پردیش اپنی انتالیسویں سال گرہ منا رہا ہے۔ اس موقع پر بنیادی طور سے یہاں کے عوام ہی مبارک باد کے مستحق ہیں جنہوں نے ریاست کے فروغ و ترقی کے لیے ان تھک کوششیں کی ہیں۔

اس عرصے کے دوران کامیابی کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ریاست کے تمام عوام میں ایکتا کا احساس پیدا ہوا اور پردیش میں سیاسی استقلال دیکھنے کو ملا۔

ان برسوں کے دوران جن شعبوں میں نمایاں ترقی ہوئی ان میں سڑکوں کی تعمیر، زراعت اور باغبانی کا فروغ، سیر و سیاحت کی سہولتوں کی توسیع، بجلی کی پیداوار اور صنعت کاری قابل ذکر ہیں۔ ترقی کے ان عوامل سے سماج کے کمزور طبقوں کو کافی فائدہ رہا اور خاص کر درج فہرست ذاتوں، قبیلوں اور پسماندہ طبقوں کی بہبود کے علاوہ سابق فوجیوں کے مفادات پر توجہ مرکوز رہی۔

ہماچل پردیش جو ۱۹۴۸ء میں علاحدگی، بے توجہی، شدید مفلسی، ناخواندگی اور غیر صحت مندی کی بھیانک تصویر بنا ہوا تھا۔ آج پہاڑی علاقوں کے فروغ کے سلسلے میں سربراہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

۸۸-۱۹۸۷ء کے سال کے دوران ریاست کے ہر عام انسان کی بہتری کے لیے نئی پہل قدمی کی جائے گی جس کے لیے ہمیں وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کی تحریک اور حوصلہ افزا سربراہی نیز وزیر اعلیٰ شری ویر بھدر سنگھ کی قابل قدر رہنمائی حاصل ہے۔

اس سال میں فروغ و ترقی میں اور بھی تیزی لائی جائے گی۔ ریاست نے منصوبہ کاری کی ہے تاکہ سماجی تحفظ کے تحت زیادہ افراد کو مستفید کیا جائے۔ ہزاروں کی تعداد میں دیہی مکانات، پاخانے اور بے دھواں چولہے تعمیر کیے جائیں، قبائلی علاقوں میں درج فہرست قبیلوں کے طلبا کو مفت نصابی کتابیں فراہم کی جائیں، کیمیاوی کھادوں پر مالی امداد جاری رکھی جائے، زمینوں کے نئے الاٹیوں کو عارضی فروغ کے حقوق دیے جائیں، درختوں کے پٹے کی اسکیم چالو کی جائے۔ چھوٹے اور حاشیے کے کسانوں کے لیے قرضوں کی سہولت مہیا کی جائے، بزرگ ریٹائر شدہ افراد کی پنشن میں اضافہ کیا جائے، پنچائتی راج کے اداروں کو زیادہ اختیارات اور ذمہ داریاں دی جائیں اور انہیں فروغ و ترقی کی غرض سے رقوم فراہم کی جائیں اور اس کے ساتھ ہی بنکوں کی خدمات سے دیہی علاقوں میں زیادہ افراد کو مستفید کیا جائے۔

آج ہماچل پردیش میں تمام عوام اپنے پردیش کی ترقی اور قوم کی خدمت کے سلسلے میں زیادہ تندہی اور جوش و خروش کے ساتھ کام کرنے کی غرض سے اپنے ارادوں میں متحد ہو چکے ہیں جس کے لیے وہ اتحاد یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مقاصد کو تقویت دے کر زیادہ مضبوط بنائیں گے۔



(ہماچل لوک سمپرک)

## واتسائن اَگیے

عارف نقوی

# ......روشن دماغ تھا نہ رہا

"میں اب اس بے چین سی کبھری دنیا سے
وداع لے چکا ہوں
اب میں اپنی اس حد سے زیادہ مصروف
دنیا سے الگ ہو چکا ہوں"
(نظم: وداع وداع)

"اے محبوب آج مجھے وداع کر دو
تکلیف کے دن بیتے جا رہے ہیں
روح گھائل ہوتی جائے گی
اے محبوب اب کبھی کبھی مجھے بھی یاد کر لینا
(نظم: آج وداع)

۱۹۴۳ء میں اپنے مجموعہ کلام "چنتا" کی نظموں میں وداع لینے والا شاعر آخر کار ۴ اپریل کو واقعی ہم سے وداع ہو گیا اور ہمارے لیے اپنی یادیں اور اپنے خیالات و افکار کا ایک عظیم سرمایہ چھوڑ گیا۔ سچیدانند ہیرانند واتسائن اَگیے ۴ اپریل کی صبح ۷۰ سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے اور اس مصروف دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اگیے جو اپنے تخلص کے معنی کے اعتبار سے نامعلوم تھے ہندی ادب و صحافت میں ایک منفرد اور اہم مقام رکھتے تھے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور بیک وقت مجاہد آزادی، صحافی، شاعر، ناول نگار، نقاد، مترجم، مفکر اور معلم تھے اس لیے ان کی شخصیت کا مختصر تعارف کرانا ایک دشوار مرحلہ ہے خود اگیے کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ جاتے تھے مگر ہر ایک میں تو یہ صلاحیت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی اگر ان کی ساری زندگی پر نظر ڈالی جائے تو مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنیادی طور پر وہ ایک باشعور صاحب رائے ذہین انسان تھے۔

وہ خود بھی ساری زندگی اپنے آپ پر کوئی چھاپ لگانے کے بجائے اپنے آپ کو صرف ایک انسان کے روپ میں پیش کرتے رہے۔ ان کی شاعری ان کی کہانیاں اور ان کے سیاسی اور سماجی خیالات بھی اپنے عہد کے تمام مروجہ نظریات سے الگ صرف زندگی اور اس سے جوجھتے ہوئے انسان ہی کے مسائل اور فکروں سے متاثر رہے ہیں۔



لیکن پھر آؤں گا میں بھی . . . . . .

اگیے ۷ مارچ ۱۹۱۱ء کو اتر پردیش دیوریہ ضلع کے کاسیا علاقے میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد آثار قدیمہ کی تلاش میں کسی کھدائی میں مصروف تھے ان کے والد پنڈت ہیرانند شاستری محکمۂ آثار قدیمہ میں قدیم رسم الخطوط کے ماہر تھے اور اگیے کا بچپن اپنے والد کے تبادلوں کی وجہ سے مختلف شہروں میں گزرا ان کے بچپن کے ابتدائی ایام لکھنؤ میں گزرے جہاں چھوٹی سی عمر میں ہی گھریلو تعلیم کے طور پر انھیں سنسکرت اشلوک ازبر کرائے گئے۔ ابتدائی تعلیم ۱۹۱۴ سے ۱۹۱۹ء تک سری نگر اور جموں میں حاصل کی۔ اسی دوران فارسی اور انگریزی سیکھی پھر نالندہ اور پٹنہ میں تعلیم حاصل کی۔ جہاں راکھال داس بنگو سے بنگالی سیکھی اس طرح کم عمری میں ہی وہ کئی زبانوں سے واقف ہو گئے کچھ عرصے بعد والد کے تبادلے کے سلسلے میں پنجاب جا کر رہنا پڑا۔ یہ وہ وقت تھا جب سارا ہندوستان اور خصوصاً پنجاب سیاسی ہلچل کا شکار تھا۔ اور آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی سارے ملک میں سیاسی مظاہرے ہو رہے تھے اور حصول آزادی کے لیے جنگ کا جذبہ خصوصاً نوجوانوں میں تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اگیے جس وقت پنجاب گئے اس وقت جلیانوالہ باغ کا سانحہ ہو چکا تھا۔ اور عوام میں غم و غصہ کی شدید لہر دوڑی ہوئی تھی نوجوان اگیے کا ان تمام حالات سے متاثر ہونا فطری تھا۔ چنانچہ انگریزی سامراج واد کے سخت مخالف ہو گئے مگر ان کا رجحان گاندھی جی ستیہ گرہ اور اہنسا وادی لڑائی کے مقابلے میں گرم دل کی انقلابی جنگ کی طرف زیادہ رہا مگر اس وقت تک کم عمری اور تعلیمی مصروفیات کے سبب عملی طور پر انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسی دوران ۱۹۲۴ء میں میٹرک میں ہائی اسکول اور ۱۹۲۷ء میں سائنس سے انٹر ۱۹۲۹ء میں لاہور سے بی ایس سی کیا وہ آگے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر انھیں محسوس ہوا کہ اب انقلابی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینا ضروری ہو گیا ہے چنانچہ وہ آزاد، سکھدیو اور بھگوتی چرن بوہرا کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ سائنس کا علم ہونے کی وجہ سے بم بنانے کا کام انھیں سونپا گیا ان سب مصروفیات اور انقلابی جدوجہد کے دور میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں نے ابھرنا شروع کیا۔ غالباً اس عملی زندگی میں جہاں وہ روز نئے تجربات سے گزر رہے تھے انھیں اپنے احساسات کے اظہار کے لیے مجبور کیا۔ اور ۱۹۴۳ء میں



نے پہلی کہانی اور کچھ عرصے بعد پہلی نظم تخلیق کی۔ لیکن جنگ آزادی کی مصروفیات نے انھیں پوری طرح اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ نہیں دیا۔ اور نہ تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رہنے دیا۔ نہ صرف انھیں ایم۔ اے۔ انگریزی کے پہلے سال ہی میں پڑھائی چھوڑدینی پڑی۔ بلکہ اپنے گھر سے بھی فرار ہونا پڑا۔ شہید بھگت سنگھ کے گروہ میں شامل ہونے کی وجہ سے انھیں ۱۹۳۰ء میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور پھر تقریباً چھ سال تک وہ پہلے جیل اور پھر نظربندی کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ مگر اس دوران بقول حضرت موہانی ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت میں۔

جیل اور نظربندی کے دوران انھوں نے عمرانیات، سیاسیات اور قانون کا مطالعہ کیا۔ اور یہیں رہ کر انہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موقعہ بھی ملا۔ اس عرصے میں انھوں نے بہت سی کہانیاں اور اپنا پہلا ناول "شیکھر ایک جیونی" لکھا۔ اس ناول کو ان کا سوانحی ناول مانا جاتا ہے۔ اس ناول میں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پریم چند کی مثالیت پسندی اور گاندھیائی نظریات سے الگ ماحول ہے۔ اسی لیے اس ناول کو پریم چند کے بعد تخلیق ہوئے افسانوی ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت دی جاتی ہے۔ نظربندی کے عرصے میں انھوں نے "کوٹھری کی بات" اور شعری مجموعہ "چنتا" تخلیق کی۔ اسی دوران اخباروں اور رسالوں میں اگیئے کے نام سے ان کی تخلیقات چھپنا شروع ہوئیں

اور ادیب و شاعر اگیئے کا ادبی سفر شروع ہوا جو مرتے دم تک جاری رہا۔ نظربندی کی قید ختم ہو جانے کے بعد انھوں نے انقلابی زندگی سے سنیاس لے لیا۔ اور صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ ۱۹۳۷ء میں بنارسی داس چترویدی کے اصرار پر "وشال بھارت" کی ذمہ داری سنبھالی۔ اور ڈیڑھ سال تک اس میں کام کیا۔ پھر کچھ عرصے آل انڈیا ریڈیو میں نوکری کی۔ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے دلی میں فاشسٹ مخالف اجلاس منعقد کیا۔ جس کے سلسلے میں انہیں کڑی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دوران جنگ عظیم چھڑ گئی تو وہ فوج میں چلے گئے اور کافی عرصے تک برما کے مورچے پر برسر پیکار رہے۔ جنگ کے زمانے میں بھی ان کی تخلیقی صلاحیتیں کند نہ ہو سکیں۔ اور جنگ کے تجربات نے انہیں "میجر چودھری کی واپسی" جیسی کہانیاں لکھنے پر اکسایا۔ اسی دوران انھوں نے "تار سپتک" مرتب کیا۔ جو نئی نظموں کی تحریک کے پہلے ترجمان کی حیثیت رکھتا ہے جس میں انھوں نے مختلف نظریات اور شاعری میں نئے تجربات کرنے کی اہلیت رکھنے والے شاعروں کی نظموں کو شامل کیا تاکہ نئی شاعری اپنی شناخت حاصل کر سکے۔ خود اگیئے نے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ خیالات کے اظہار کی اپنی صلاحیت کا اظہار کرتے ہوئے شاعری میں کئی نئے تجربات کیے ان کی انھیں کوششوں اور شاعری میں ان کے نئے تجربات کے سبب انہیں ہندی کی جدید شاعری کا بانی کہا جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اگیئے کے ذریعے ہندی ادب میں جدید شاعری اور خصوصاً نظم میں جدید رجحانات کی تحریک کا دور وہی دور ہے جب اردو میں ن۔ م۔ راشد اور میراجی وغیرہ کے ذریعہ جدید نظم کا رجحان پیدا ہو رہا تھا۔ اور ان کے مخالفین ان پر ابہام، فحاشی اور جنس زدگی وغیرہ کے الزامات لگا کر ان کی مخالفت کر رہے تھے۔ اسی طرح اگیئے کی بھی سخت مخالفت ہوئی، مگر اگیئے شاعری کو نیا اسلوب اور نئی نظم کو اس کی شناخت دلوانے میں کامیاب رہے ۱۹۶۵ء تک ان کی شاعری ہندی ادب میں اپنا رنگ جمائے رہی حالانکہ بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر بہت سے ناقدین نے اگرچہ اگیئے کی نظموں میں روایتی اور فرسودہ نظریات کی پروردہ کہہ کر پہلے ہی نظر انداز کر دیا ہو مگر اس نکتہ پر تمام نقاد متفق ہیں کہ ان کی نظمیں خواہ کچھ بھی رہی ہوں مگر اس طور پر جدید ضرور تھیں کہ انھوں نے اپنے دور کی حقیقت پسندی اور ترقی پسندی سے بالاتر ہو کر آنے والی جدید شاعری کو مناسب ماحول دیا۔ ان کی نظمیں نئی علامتیں لے کر سامنے آئیں۔ اور ان کا انداز پیش کش بھی الگ تھا مگر وہ دور ترقی پسندی کا دور تھا جس میں سیاسی افکار و نظریات نے ادب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ مگر اگیئے اس رجحان سے الگ ادب میں کسی سیاسی نظریے سے سمجھوتے کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے ترقی پسند نقادوں اور شاعروں کی نظر میں وہ روایت پسند تھے حالانکہ ایسا نہیں۔ تخلیقی عمل میں روایات سے اپنا ورثہ لے کر اسے ایسا روپ دینا جس میں خود کو شامل کر کے اپنے عہد کی انفرادیت ابھاری جا سکے یہ اگیئے کا خاص نقطۂ نظر تھا۔ وہ نہ ادب کو دل بہلاوے کی چیز سمجھتے تھے اور نہ کوری مقصدیت لیے اصلاح و تبلیغ کا ذریعہ۔ ان کے نزدیک ادب انسانی اقدار کا عکاس ہے جس کے ذریعہ غیر شعوری طور پر ایک صاف ستھری ذہنیت پیدا کی جا سکے اور اس طرز و فکر کے ساتھ وہ ساری زندگی ادب کی تخلیق کرتے رہے۔ وہ انسان کی بدلتی ہوئی حالت اور انسانی برادری میں بڑھتی ہوئی نفرت کو محسوس کرتے تھے۔ اور بغیر کسی سیاسی نظریے کی چھاپ لگائے اس کے تئیں اپنے تاثرات کا اظہار بڑی سچائی کے ساتھ کرتے تھے۔ مثلاً ان کی یہ نظم "سانپ" ملاحظہ ہو۔

اے سانپ!  
میں ایک بات پوچھتا ہوں  
کیا تم اس کا اتر دو گے  
کہ نہ تو تم کبھی سبھیہ بنے  
اور نہ کبھی تمہیں نگر میں بسنا ہی آیا  
پھر تم نے دوسروں کو ڈسنا کیسے سیکھا  
اور تمہیں وِش کہاں سے ملا؟

(جواب۔ مہذب و شہری بن کر)

اس نظم کی تشریح کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ اس کے سیدھے سادے الفاظ میں



انسانی سوچ کی انفرادیت کو اس قدر پراثر ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے کہ پیرایک کی سمجھ میں آسانی سے آسکتی ہے۔ ایک اور نظم دیکھیں "ہم گھوم کیے شہر"

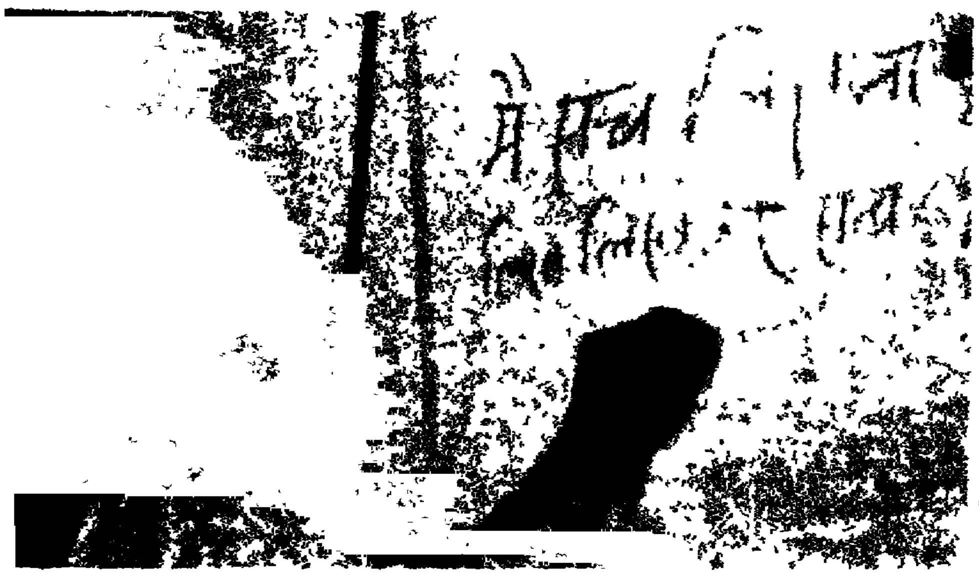
ہم کا ڑی ٹھہرانے کے لیے جگہ کھوجتے کھوجتے
سارا شہر کھوج آئے پیسے کی قسطیں چکاتے چکاتے ساری
زندگی بیت گئی
پھول اور چندن چڑھا کر ہم ایشٹ سے کٹ گئے
اب جیس ورتمان میں ہم جی رہے ہیں
اس سے ملے تو کیا ملے؟
اس سے کیول کھیسیں پورتا ہوا
کتابی اکھینڈ لت ہی مل پاتا ہے
۱۔ ماضی ۲۔ حال ۳۔ صرف ۴۔ خراج تحسین

ان نظموں کو پڑھ کر انھیں روایتی اور فرسودہ خیالات کی پروردہ کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ان میں اگیئے کے جدید خیالات اور ان کے اسلوب کی انفرادیت جھلکتی ہے۔

اگیئے ادب کے میدان کی طرف متوجہ ہوئے اس بیچ اپنی انفرادیت قائم کی صحافت میں 'دنمان' کے ذریعے انہوں نے ہندی صحافت کو نیا موڑ دیا۔ اور اس میدان میں 'پرتیک'، 'نوبھارت ٹائمز' اور انگریزی کے 'ایوری مین' اور 'واک' کے ذریعے اپنے جوہر دکھائے۔ اسی طرح اپنی کہانیوں میں انھوں نے اپنی انفرادیت بنائی۔ اور اپنے وقت کے اہم اسلوب (جسے پریم چند اسلوب کے نام سے جانا جاتا ہے اور جس کا اثر ان کے ہم عصر بہت سے افسانہ نگاروں پر تھا) سے الگ ہٹ کر اپنا ایک منفرد اسلوب اپنایا۔ یہی حال ان کے ناولوں کا ہے جو نہ صرف اسلوب بلکہ خیالات وافکار اور ماحول کے اعتبار سے بھی اس دور کے دوسری ناولوں سے بہت مختلف ہیں۔

دراصل جدید ہندی ادب نے حصول آزادی کے قریب جو موڑ لیا اس کی سمت کا تعین کرنے میں سب سے خاص کردار اگیئے کا رہا ہے۔ انہوں نے ایک طرف فرسودہ ذہنیت کو جھنجھوڑا تو دوسری طرف یورپ میں ہوئے انقلابات کی آندھی نقل کرنے والی سیاسی نعرے بازی سے الگ بنیادی شاعری کو حوصلہ دیا۔ اور اس طرح ترقی پسندی کے دور میں جدید ہندی ادب اور نئی نظم کی اپنی الگ پہچان قائم کی۔ اس کے لیے انہیں سخت تنقید، مخالفت اور سیاسی شوشے بازیوں کا بار بار شکار بننا پڑا۔ ان کے ارد گرد مخالف ادبی گروہ بنے اور بکھرے لیکن اگیئے نے اپنے نظریات کبھی نہیں بدلے اس طرح اگیئے کی شخصیت ہندی ادب میں ایک متنازع شخصیت کی شکل بھی رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ نئی نسل یعنی آزادی کے بعد ابھرنے والے آزاد خیال ادیبوں کی نسل پر (جو تمام تحریکوں کا زوال دیکھنے کے بعد بے یقینی کی کیفیت سے دوچار تھی) ان کے خاص اثرات ہیں۔ اور اس صورت میں جب کہ اس نسل نے تمام سیاسی اور نیم سیاسی ادبی تحریکوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر سیاسی ٹھیکیداروں کے حملے ہو رہے تھے۔ اور یہ نسل اپنی شناخت کی جنگ لڑ رہی تھی۔ اس وقت بزرگ ادیبوں میں اگیئے ہی تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر نئی نسل کو سہارا دیا اس کی ہمت افزائی کی اور اس میں اعتماد پیدا کیا۔

اگیئے نے ہندی ادب کی خدمت کئی اعتبار سے



واتسائن اَگیئے

کی۔ ان کی لسانی خدمات بھی کافی اہم مانی جاتی ہیں۔ انہوں نے ہندی ادب کو سفرناموں کی صنف سے بھی روشناس کیا اور سنجیدہ مضامین کے ترجموں کے ذریعے نہ صرف پورے ہندوستانی ادب کو متاثر کیا بلکہ بے شمار ذاتی اور ثقافتی وفدوں کے ساتھ غیرملکی دوروں میں ہندوستانی ادب کی نمائندگی کر کے اس کا تعارف دوسرے ملکوں میں بھی کرایا۔

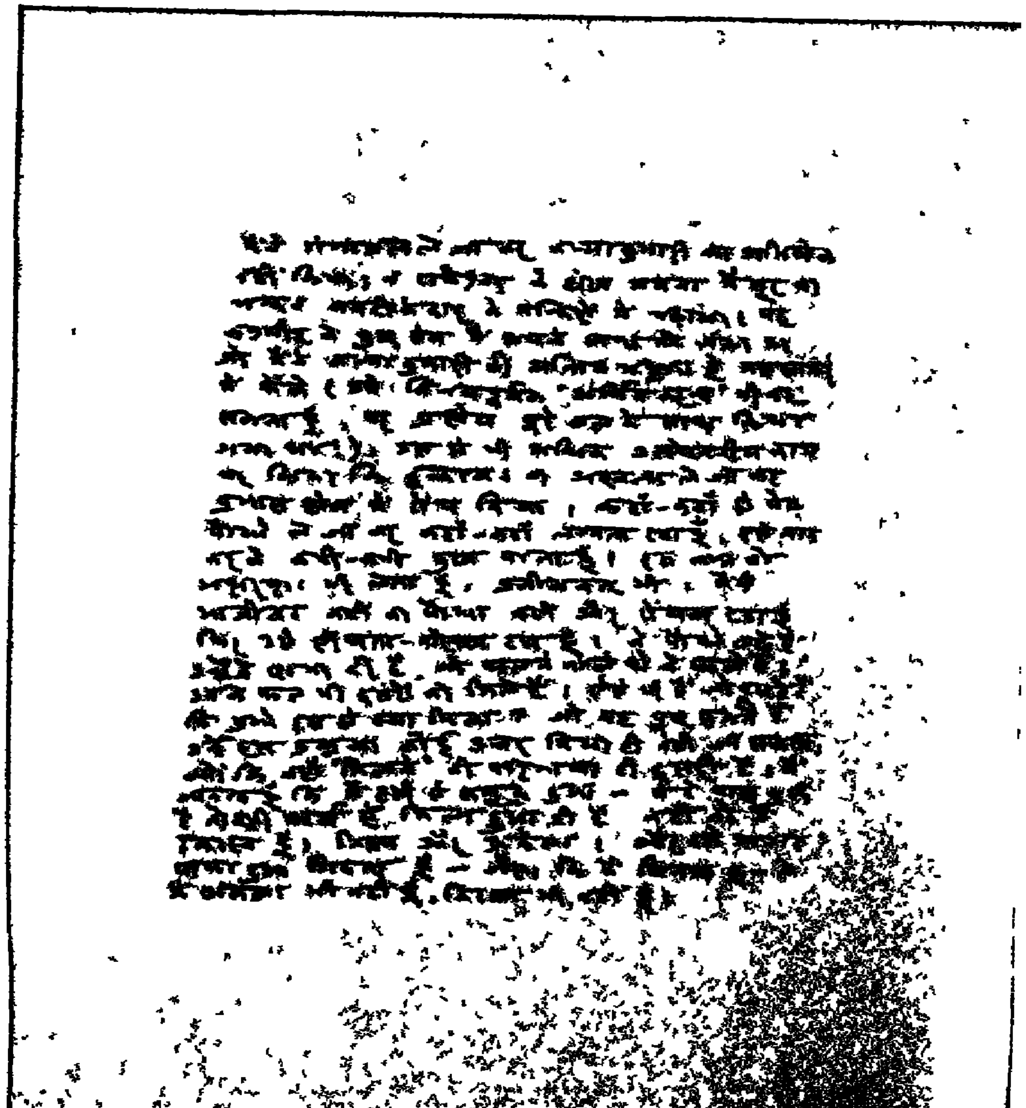
ان ادبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیمی مشغولیات بھی جاری رہیں۔ وہ جودھ پور یونی ورسٹی میں تقابلی ادب کے شعبے کے ڈائرکٹر رہے اور کیلی فورنیا یونی ورسٹی اور ہائیڈل برگ یونی ورسٹی میں اعزازی پروفیسر رہے۔ ان کی ان تعلیمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کئی موقعوں پر انہیں مختلف تنظیموں اور اداروں کے ذریعے اعزازات سے نوازا گیا۔ انہیں 'آنگن کے پار دوار' کا اعزاز دیا گیا اور ۱۹۶۱ء میں ان کے شعری مجموعے 'آنگن کے پار دوار' پر ساہتیہ اکادمی انعام دیا گیا۔ ان کی ادبی و تعلیمی خدمات کو سراہتے ہوئے اجین یونی ورسٹی نے انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی اور پھر ہندوستانی ادب کے سب سے بڑے اعزاز گیان پیٹھ سے ۱۹۷۹ء میں ان کی عزت افزائی کی گئی۔

اگیئے کے انتقال کی خبر سے نہ صرف ہندی ادب بلکہ سارے ہندوستانی ادب اور ادبی دنیا کے لوگوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ ہفتہ وار 'ہندوستانی' کے مدیر راجیندر اوستھی نے اگیئے کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ادب میں اب کوئی نہیں بچا جس کو ادیب و مفکر کہنے کا دعوا متفقہ طور پر کیا جائے"۔ ہندی کی مشہور شاعرہ مہادیوی ورما نے اگیئے کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ان کے انتقال سے ہندی ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ اگیئے ہندی کے بے مثال اور لاثانی ادیب تھے۔ ان کی خدمات

ہندی ادب سالہا سال تک فراموش نہیں کرسکتا" مشہور شاعرہ امرتا پریتم نے اگیے کی شخصیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی "اگیے ہی عظیم شاعر تھے۔ بلکہ ملک کی ان چند شخصیات میں سے تھے جنہیں انسانی اقدار سے بہت زیادہ پیار تھا" ہندی کے ناول نگار افسانہ نگار شانی نے اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کے چلے جانے سے ہندی ادب برسوں تک سُونا رہے گا۔ ان کے انتقال کے ساتھ ہی ایک عہد ختم ہوگیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی بہت سی ادبی اور سماجی ہستیوں نے اگیے کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اور پھر ۴ اپریل کو ۳ بجے سہ پہر اس عظیم ادیب کی آخری رسوم نگم بودھ گھاٹ پر ادا کی گئیں جسم کی موت ہوگئی مگر خیالات کبھی نہیں مرتے اگیے نے اپنی تخلیقات کے ذریعے جو کچھ اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ وہ اپنی ۷۶ سال کی زندگی میں ہم سے بہت کچھ کہہ گئے مگر وہ ابھی اور بہت کچھ کہنا چاہتے تھے ان کی یہ نظم رہ گئے۔ ان کی اس خواہش کا اظہار کرتی ہے

سب اپنی اپنی کہہ گئے
صرف ہم ہی اپنی کہنے سے رہ گئے
میری زبان تو ہے لیکن اس میں آواز نہیں ہے
میری آواز تو ہے لیکن اس میں طاقت نہیں جو صحیح جگہ پہنچ سکے
میرا دل تو ہے لیکن اس میں وہ طاقت نہیں جو جھجک مار کو سکے
یوں سبھی جو آئے
اپنی کچھ نہ کچھ کہہ گئے
صرف ہم ہی ہچکچاہٹ کی وجہ سے اپنی بات نہیں کہہ پائے

## بخطِ شاعر



## اگیے کی تخلیقات

### شعری مجموعے

● بھگندوت ۱۹۳۳ء ● چنتا ۱۹۴۲ء ● اتیلم ۱۹۴۶ء ● ہری گھاس پر چھن بھر ۱۹۴۹ ● باورا اہیری ۱۹۵۴ء ● اندر دھنش روندے ہوئے یہ ۱۹۵۷ء ● اری او رکرونا پربھامے ۱۹۵۹ء ● آنگن کے پار دوار ۱۹۶۱ء ● سنہلے شیوال ۱۹۶۵ء ● کتنی ناووں میں کتنی بار ۱۹۶۷ء ● کیونکہ میں اسے جانتا ہوں ۱۹۶۹ء ● ساگر مودرا ۱۹۷۰ء ● پہلے میں سناٹا بنتا ہوں ۱۹۷۳ء ● مہاورچھ کے نیچے ۱۹۷۷ء ● ندی کے بانک پر چھایا ۱۹۸۲ء ● ایسا کوئی گھر آپ نے دیکھا ہے ● سارا تاری

### افسانوی مجموعے

● وپتھگا ۱۹۳۷ء ● پرمپرا ۱۹۴۴ء ● کوٹھری کی بات ۱۹۴۵ء ● شرنارتھی ۱۹۴۸ء ● بے دول ۱۹۵۱ء ● یہ تیرے پرتی روپ ۱۹۶۹ء ● سنپورن کہانیاں (دو جلدیں) ۱۹۷۵ء۔

### ناول

● شیکھر ایک جیونی پہلا حصہ ۱۹۴۱ء دوسرا ۱۹۴۴ء تیسرا ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ ● ندی کی دیپ ۱۹۵۲ء ● اپنے اپنے اجنبی ۱۹۶۱ء

منیرالدین قریشی

# بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

ابھی پچھلے دنوں ایک خبر نے چونکا یا تھا۔ خبر یہ تھی کہ فلم کار اور ہدایت کار دیو آنند نے اپنی آنے والی فلم "سچے کا بول بالا" کے لیے محبوب اسٹوڈیو میں آٹھ لاکھ روپئے کی لاگت سے کئی شاندار سیٹ لگائے ہیں۔

ظاہر طور پر یہ ایک معمولی سی خبر ہے۔ ہماری فلم انڈسٹری میں روز سیٹ لگتے اور ٹوٹتے ہیں، لیکن آٹھ لاکھ روپئے کی رقم اتنی بڑی ہے کہ اس میں ایک اوسط درجے اور معمولی بجٹ کی آدھی فلم بھی تیار ہو سکتی ہے۔ اتنے ہی پیسوں میں آدھی آرٹ فلم بھی تیار ہو سکتی ہے مگر دیو آنند جیسا "شومین" اتنی کثیر رقم صرف ایک سیٹ پر خرچ کر رہا ہے اور پھر دیو آنند کوئی منموہن ڈیسائی یا پرکاش مہرا یا سبھاش گھئی بھی نہیں، راجکپور یا منوج کمار بھی نہیں کہ لاکھوں میں فلم بنا کر کروڑوں کماتے ہوں۔ وہ تو ایک ایسے فلم کار ہیں جن کی اپنی بنائی اور ہدایت دی ہوئی فلمیں ۸۰ فی صد بری طرح ناکام ہوتی ہیں اس کے باوجود وہ پچھلے سترہ سال سے لگاتار فلمیں بنا رہے ہیں۔ نقصان اٹھا رہے ہیں، مگر ہمت نہیں ہارتے!

ان حالات میں ایک سوال ہر ایک کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ دیو آنند فلمیں کیوں بناتے ہیں؟ ایک ایسی صنعت جہاں آدمی کی پہچان صرف اس کی پچھلی فلم سے ہی ہوتی ہے، جہاں عزت کا تمام دارومدار محض پیشہ ورانہ کامیابی پر ہی منحصر ہے وہاں ایک شخص ناکام فلموں کی طویل فہرست کے بعد بھی نہ صرف پیشہ ورانہ طور پر زندہ ہے بلکہ مصروف ہے، تو یہ بات حیرت میں ڈالنے والی ہے ہی۔ پھر یہی نہیں اس کی عزت اور وقعت بھی بہت ہے۔ آج بھی کسی بڑے سے بڑے ستارے، اچھے سے اچھے فنکار اور معروف ترین اداکار کے لیے بھی دیو آنند کی فلم میں کام کرنا فخر کی بات ہے۔ راکھی سے لے کر نصیرالدین شاہ تک سب خوشی خوشی کام کرتے ہیں۔ "دیو صاحب" کی فلموں میں جیکی جیسا مصروف ہیرو "دیو صاحب" کی فلم میں صرف ایک چھوٹے سے رول کے لیے اپنے کئی دوسرے پروجیکٹوں کی پرواہ نہیں کرتا۔

فلم منڈی کے پیمانے کے حساب سے کامیاب نہ سہی، مگر دیو آنند نے نتیجے کی پرواہ کیے بغیر فلمیں بنانے کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ایک طرف جہاں راجکپور جیسا فلم کار ایک فلم کی ناکامی سے اتنا ہل جاتا ہے کہ کئی کئی سال فلم بنانے کی ہمت نہیں کر پاتا، وہیں دیو آنند ایک فلم کی نمائش کے بعد فوراً دوسری فلم شروع کر دیتے ہیں۔ ریلیز شدہ فلم کا کیا حشر ہوا، وہ مڑ کر نہیں دیکھتے۔

دیو آنند کا فلم کار ادارہ "نیکیتن" تو کافی پرانا ہے، مگر بطور ہدایت کار ان کی پہلی فلم "پریم پجاری" ۱۹۷۰ میں شروع ہوئی تھی۔ پچھلے سترہ برسوں میں دیو آنند نے کل نو فلمیں بنائی ہیں۔ ان میں سے صرف دو کو پیشہ ورانہ کامیابی ملی ہے۔ باقی سات ناکام رہیں۔

دیو آنند کی فلم کاری اور ان کے طور طریقوں کو صحیح ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے ان کی تمام فلموں کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔

پہلی فلم "پریم پجاری" اگرچہ ٹکٹ کھڑکی پر کامیاب نہیں ہوئی تھی اور بطور ہدایت کار دیو آنند بھی کوئی بہت گہرا اثر ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے مگر فلم کا موضوع (بھارت چین جنگ) اچھا تھا اور عام حالات میں اسے کامیاب ہونا چاہیے تھا لیکن جب یہ فلم نمائش کے لیے آئی تو لوگوں کے دماغ میں چینی حملے کی یادیں تازہ تھیں۔ اور اس لیے فلم کے پیغام محبت کو قبول نہ کر سکے فلم شائقین کو پسند نہیں آئی۔

مگر دیو آنند نے اپنی خاص ادا کے ساتھ فلم کی تجارتی حالت کی پرواہ کیے بغیر اپنی دوسری فلم پر کام شروع کر دیا۔ اس مرتبہ انھوں نے ہپی کلچر کے عادی ہپیوں کو موضوع بنایا۔ فلم تھی "ہرے راما ہرے کرشنا"۔ موضوع نیا تھا اور غیر معمولی بھی۔ مگر اس بار بات بن گئی۔ اس فلم

دیو آنند ہدایت کار کے روپ میں، فلم "سچے کا بول بالا" کے سیٹ پر





نے نہ صرف شاندار بزنس کیا، بلکہ کافی دنوں تک اس کی "کریز" بنی رہی۔

اس کے بعد آئی "میرا اپنا"۔ ایک گمکڑ فوٹوگرافر کی کہانی تھی اس کے بعد دیو نے ازالہ کے طور پر ایک خالص رومانٹک فلم بنائی "عشق، عشق، عشق"۔ یہ دونوں فلمیں فلم بینوں کا دل جیتنے میں ناکام رہیں۔ ویسے دیو خود "عشق، عشق، عشق" کو اپنی سب سے خوبصورت فلم مانتے ہیں۔

اب دیو آنند نے ایک اور اچھوتا موضوع اٹھایا مختلف ممالک میں مقیم ہندوستانیوں سے متعلق فلم "دیس پردیس" بنائی۔ اس بار تیر نشانے پر بیٹھا۔ فلم کو اچھی خاصی کامیابی مل گئی۔ مگر دیو اپنی اس بیش ورانہ کامیابی کو دہرا نہ سکے۔ بعد میں آئی "لوٹ مار" بھی باکس آفس پر گھسٹ کر رہ گئی۔ یہ ایکشن فلم تھی اور ایسے وقت میں آئی جب شائقین مار دھاڑ سے بے زار ہو رہے تھے (انھیں دنوں امیتابھ بچن کی بھی کئی فلمیں بنی تھیں) اس کے بعد سوامی دادا میں ایک اور نیا موضوع اٹھایا دیو آنند نے، مگر فلم بینوں نے اسے بھی پسند نہیں کیا۔

"آنند اور آنند" میں دیو نے پہلی بار ہیرو کا رول چھوڑ کر کیریکٹر رول کیا۔ نوجوان ہیرو کے طور پر اس نے اپنے بیٹے سنیل آنند کو پیش کیا۔ فلم کا سبجیکٹ کافی بولڈ تھا۔ جسے شائقین ہضم نہیں کر سکے۔ اس کے بعد بنی "ہم نوجوان" میں دیو نے پہلی مرتبہ سبھی نئے چہروں کو پیش کیا طالب علموں کی ڈسپلن کی کمی، کہانی کا موضوع تھا۔ مگر شاید وقت سے میل نہیں کھا سکا۔ فلم ناکام ہی ثابت ہوئی۔

اب نئی زیر تکمیل فلم "سچے کا بول بالا" کا موضوع صحافی اور صحافت ہے جسے دیو بڑی دھوم دھام سے بنا رہے ہیں۔

دیو آنند نئے چہروں اور خاص طور پر ہیروئنوں کی تلاش کے لیے مشہور رہے ہیں برسوں پہلے انھوں نے کلپنا کارتک (اصلی نام مونا سنگھ) کو اپنی فلم "آندھیاں" میں متعارف کرایا تھا۔ (بعد میں دیو اور مونا نے شادی کر لی تھی) زینت امان (ہرے راما ہرے کرشنا) اور ٹینا منیم (دیس پردیس) جیسی بڑی بڑی ہیروئنیں بھی دیو آنند کی دین ہیں۔ "سوامی دادا" (کرسٹین اونیل) اور "آنند آنند" (رتنا شا سنہا) کے علاوہ "ہم نوجوان" میں ایک ساتھ رچی شرما، تبو، اشلی برار اور بعلی کو متعارف کرا دیا دیو نے!

ایک سچائی سے دیو آنند کا کوئی دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ لگاتار کام کرنے والے ہیں ان کو اگر دورِ جدید کا کرم یوگی کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو ۷۴ سال کی عمر میں بھی جس تیزی اور ڈسپلن سے کام کرتے ہیں اسے دیکھ کر ان کے نوجوان ساتھی بھی تعجب میں پڑ جاتے ہیں

دیو آنند پر ایک الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ صرف اپنا چہرہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، اور فلم کے ہر فریم میں وہ خود موجود ہوتے ہیں۔ یہ بات ان کی نجی ہی نہیں بلکہ



ان کی فلموں کے بارے میں بھی کہی جاتی رہی ہے۔ اگرچہ دیو آنند نے ہمیشہ اس بات سے انکار کیا ہے، مگر کسی نے بھی ان کی صفائی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ بہرحال اب شاید بڑھتی عمر کے احساس کے ساتھ دیو کا یہ شوق کم ہو گیا ہے، اور کم سے کم "ہم نوجوان" کے بارے میں یہ شکایت نہیں کی جا سکتی۔

اب آتا ہے اصل سوال! دیو آنند فلمیں کیوں بناتے رہیں؟

اس سچائی کو ماننا پڑے گا کہ دیو آنند نے اپنی کسی بھی فلم میں بطور ہدایت کار نہ تو کوئی کارنامہ انجام دیا ہے اور نہ کوئی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ کسی خاص یا نئے طرز کو جنم دیا ہو، ایسا بھی نہیں بلکہ ان کی اپنی ہدایت میں بنی فلم آج تک اس معیار پر نہیں پہنچ سکی جو انھیں کے ادارے نے اس سے پہلے (وجے آنند اور چیتن آنند) ہدایت کاری میں قائم کیا تھا پھر جب کسی فلم کے پاس نہ تو کوئی انداز نیا ہے اور نہ بدلی ہوئی طرز۔ تو پھر وہ فلمیں بناتے رہنے کی ضد کیوں کرتے ہیں؟ یہی اصل سوال ہے اور جب کہ ان کی فلمیں تجارتی سطح پر کامیاب بھی نہیں ہوتیں۔

اس سوال کا جواب خود دیو آنند کے الفاظ میں یہ ہے "ہر اداکار ہدایت کار نہیں بن سکتا" میں نے اپنی فلموں کو اپنی زندگی دی ہے آج میں سوچتا ہوں کہ ۱۹۷۰ میں جو فیصلہ میں نے کیا تھا وہ صحیح تھا۔ میں اس ذریعہ کو جانتا ہوں اور کام کر سکتا ہوں۔ میں خطروں سے نہیں گھبراتا۔ میں نئے نئے تجربے کرتا رہتا ہوں۔

اکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ تقریباً ہر فلم ناکام ہونے کے بعد بھی دیو آنند کو اگلی فلم بنانے کے لیے پیسہ کہاں سے مل جاتا ہے؟ خود دیو آنند کا کہنا ہے کہ انھوں نے چالیس برس اداکاری کر کے جو کچھ کمایا ہے اسے وہ فلموں میں لگاتے ہیں۔ اب بھی کسی فلم سے اگر کوئی آمدنی ہو جاتی ہے تو اس کی کل پونجی کو وہ اگلی فلم میں لگا دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دیو آنند کا ایک وقار ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی دوست یا چاہنے والے آج بھی اس کی نت نئی اسکیم کے لیے پیسہ اکٹھا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

اب اگر کوئی شخص نتیجے سے بے پرواہ ہو کر صرف اپنی بات کہنے کے لیے یا اپنی خوشی کی خاطر فلمیں بنا رہا ہے اور اسے کہیں نہ کہیں سے پیسہ بھی مل جاتا ہے تو پھر کسی کو اعتراض کیوں ہو۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ دیو آنند کی فلمیں کافی شو بازی، اچھی موسیقی، مقبول گیتوں رہے رہا ہے



ٹینا مالنی، فلم "سچے کا بول بولا" میں

صحافت کا وقار، کافی حد تک صداقت کی مناسبت سے ہے۔ یہ فلم اگر صحیح وقت پر اسی اچھے معیار سے، جس کا دعویٰ کیا جا رہا ہے، بن گئی اور صحیح وقت پر پیش کر دی گئی تو اس سے کافی امید کی جا سکتی ہے۔

ایک بات سے تو انکار کیا نہیں جا سکتا کہ دیو آنند خالص تجارتی دائرے کے اندر رہنے کے باوجود کبھی گھسے پٹے فارمولے کا سہارا نہیں لیتے اور نئی مسالہ فلمیں بناتے ہیں جیسا کہ ان کی سبھی فلموں سے ظاہر ہے۔ ان کے موضوعات نئے ہوتے ہیں کوئی نہ کوئی پیغام بھی ہوتا ہے ان کی فلموں میں اور وہ اپنی ہر فلم کو دوسری فلموں سے کافی الگ رکھنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ دیو آنج

تک کوئی عظیم کارنامہ (گائیڈ) دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ "ہم دونوں" تو کیا "جیول تھیف" بھی نہیں سائی ہے انھوں نے

وہ خود بھی مانتے ہیں تبھی تو ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ابھی تک کوئی کارنامہ نہیں کر سکا ہوں۔ ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور وقت بہت کم ہے، وہ اعلان کرتے ہیں میں اپنے آخری سانس تک فلموں کی ہدایت دیتا رہوں گا۔

اب بھلا بتلایئے، ایسے دھن کے پکے ہمت کے پورے اور باعمل آدمی کو ہم یا آپ فلم بنانے سے کیسے روک سکتے ہیں، اور کیوں روکیں؟ کم سے کم ایک تسلی ایک یقین تو ہے اس میں

”ہم دونوں“





کرتے رہا کا گیت "دم مارو دم" آج بھی سنائی دے جاتا ہے، اور کافی مسائل کے باوجود کامیاب کیوں نہیں ہوتیں؟ اور وہ بھی ایسی فلم انڈسٹری میں جہاں ایک سے ایک بے تکی فلمیں جوبلیاں منا لیتی ہیں اور جہاں ہدایت کی الف بے بھی نہ جاننے والے، ہدایت کار بنے بیٹھے ہیں؟

ایک بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ دیو آنند کی فلمیں اکثر وقت سے پہلے کے موضوعات پر ہوتی ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ اچھے موضوعات تو اٹھاتے ہیں مگر وہ وقت سے میل نہیں کھاتے۔ اس لیے اکثر شکست ہوتی ہے۔ اس کی مثال "پریم پجاری" اور "ہیرا پنا" ہیں۔ یہ فلمیں آج جہاں نمائش کے لیے پیش ہوتی ہیں پہلے سے اچھا بزنس کرتی ہیں۔ دیو کی ہی بنائی ہوئی "ہرے راما ہرے کرشنا" اور "دیس پردیس" اپنے موضوع کے حساب سے ٹھیک وقت پر بنی اور کامیاب رہیں۔

"نوٹ ماؤ" اگر اپنی نمائش سے چند سال پہلے آئی ہوتی۔ (جب بار ڈسکو کا بول بالا تھا) تو کامیاب رہتی۔ اسی طرح ایک دہائی پہلے جب طلباء کا ڈسپلن وقت کا سلگتا موضوع تھا اس وقت ہم نوجوانوں کا غذر اچھا استقبال کیا



# جہانِ تمثیل

# امیر خسرو

**عارف نقوی**

ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں جو اہم ںصیات گذری ہیں ان میں خسرو کا ایک الگ مقام ہے ,ویں ۱۴, ویں صدی کا دور ہندوستانی تاریخ میں بے چینی ,انتشار کا دور تھا۔ مختلف زبانوں فلسفوں تہذیبوں کے اؤ نے کشیدگی کی کیفیت اختیار کرلی تھی اگرچہ بظاہر یہ چاؤ بہت شدید ہو گیا اندرونی طور پر یہ مختلف زبانیں۔ ستے اور تہ۔ یب آپس میں ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے اور ایک مشترکہ تہذیب کی داغ بیل پڑ رہی تھی ایسے ات میں خسرو کی شخصیت تھی جو نہ صرف اس مشترکہ تہذیب کی ح ترجمان تھی بلکہ عملی طور پر بھی خسرو اس مشترکہ تہذیب کے تقاؤں میں معاون و مددگار رہے۔

خسرو کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں وہ موسیقی ے ماہر بھی تھے۔ شاعر بھی حضرت نظام الدین اولیاء کے ید بھی، اور بہترین سپاہی بھی۔ بحیثیت موسیقی داں وہ نئے ف اور نئے ساز ایجاد کرتے تھے۔ بحیثیت شاعر وہ ام کے دلوں میں بھی راج کرتے تھے۔ اور تصوف کے ہ نکتوں کو شعر میں ڈھال کر صاحب ذوق شعراء کی محفل پیش کرنے میں بھی ان کا ایک منفرد مقام تھا حضرت ام الدینؒ اولیاء کے وہ چہیتے مرید تھے۔

خسرو کی شخصیت کی اسی ہمہ جہتی کو دہلی آرٹ یٹر نے ۱۰ ۱۱, ۱۲ مارچ کو اپنے ڈرامے" امیر خسروؒ" میں ت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ڈرامہ مشہور شاعر و یب جناب نیاز حیدر نے لکھا ہے نیاز حیدر ایک یل عرصے سے تھیٹر سے وابستہ ہیں۔ اس ڈرامے میں وں نے خسرو کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں میں سے ت تین اہم پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی ہے' آپکی عوامی دگی پر' ان کی درباری زندگی پر' اور حضرت نظام الدین یاء سے اُن کے روحانی رشتے پر' ان تینوں زاویوں یشکش اور اظہار کا ذریعہ امیر خسرو کی غزلوں گیتوں' یلیوں کہہ مکرنیوں اور انملوں کو بنایا گیا ہے۔ ڈرامے

خسرو کی مختلف صفات کو اُبھارا گیا ہے۔ نیاز حیدر صاحب کے لئے ڈرامے کی یہ تکنیک نئی نہیں۔ انھوں نے "نیا تھیٹر" میں حبیب تنویر کے ساتھ اس طرح کے ڈرامے "آگرہ بازار" میں کام کیا ہے جس میں اسی طرح نظیر اکبرآبادی کی زندگی کی جھلک پیش کی گئی تھی۔ اور ان کی نظموں سے بہت اہم کام لیا ہے۔

"امیر خسروؒ" کی ہدایت کار محترمہ شیلا بھاٹیہ ہیں جو میوزیکل ڈرامے کی پیشکش میں اپنا ایک الگ انداز رکھتی ہیں۔ اُن کا ہدایت دیا ہوا ڈرامہ "درد آئیگا دبے پاؤں" جو فیض کی زندگی کی جھلک پیش کرتا ہے کئی بار اسٹیج ہوچکا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی درد آئے گا دبے پاؤں کا ہی انداز ہے۔



شیلا بھاٹیہ

مجموعی طور پر اس ڈرامے کے ذریعے عام فہم انداز میں خسرو کی شخصیت کا تعارف خوبی کے ساتھ کروایا گیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کے احاطے میں شہر کے لوگ جمع ہوتے ہیں جہاں خسرو سے عوام کی

قوالی کے طور پر گاتے ہیں۔ اور کچھ لوگوں پر حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس طرح عام لوگوں پر تصوف کے اثرات اور ان اثرات میں خسرو کی شخصیت کے اثر کو بہت پُر اثر طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح ڈرامہ شروع ہوتا ہے اور پھر اس طرح کے مختلف واقعات پیش کئے جاتے ہیں جن میں خسرو کی مختلف صفات اُجاگر ہوتی ہیں۔ کہیں رقاصائیں رقص کر رہی ہیں اور خسرو کا گیت "سکل بن پھول رہی سرسوں" گا رہی ہیں۔ خسرو ہندو عورتوں کے ساتھ بسنت منا رہے ہیں۔ کہیں عورتیں "بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی" اور "اماں میرے باوا کو بھیج کرسا ون آیا" گاتی ہیں آپس میں۔ خسرو کی پہیلیاں بوجھتی ہیں۔ اس سے احساس ہوتا ہے کہ ایک تو خسرو کی ہر دل عزیزی صرف گلیوں بازاروں اور درباروں میں ہی نہیں بلکہ اندرون خانہ بیٹھنے والی خواتین تک میں بھی تھی دوسرے خسرو مذہبی تعصبات سے دور تھے اور ہندوستانی تہذیبی عناصر سے محبت رکھتے تھے۔ اسی طرح ایک اور منظر میں شہر کے مرد درگاہ کے احاطے میں بیٹھ کر خسرو کے انملوں سے دل بہلاتے ہیں۔ درباروں میں خسرو کی غزلیں گائی جارہی ہیں اُن کے ایجاد کئے ہوئے نئے ساز "سہ تار" کو آزمایا جارہا ہے دوسرے شعرا کے مقابلے میں خسرو کی غزلیں فارسی اور ہندوی زبانوں کی آمیزش رکھتی ہیں۔ اور ایسے غیر مسلم سرداروں کی سمجھ میں بھی آتی ہیں جو فارسی

درباری زبان فارسی ہے مگر خسرو عوامی زبان کی ترقی کے لئے وقف ہیں۔ خسرو کے خیالات کا اظہار دوسرے کرداروں سے کرایا جاتا ہے کہ حسب ... کے مطابق عام عوامی زبان میں سمجھائے جائیں گے تو کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ ... خسرو کی جدت پسند طبیعت کی مختلف صفات اُبھاری گئی ہیں۔ لیکن اس دوران پرانے خیالات کے مولوی خسرو کی ان جدتوں سے پریشان ہیں کیونکہ اُن کے فرسودہ عقائد کو ان سے ٹھیس پہنچ رہی ہے وہ خسرو کے رقص، موسیقی سے قربت اور ہندو عناصر میں دلچسپی کو خلاف شریعت مانتے ہیں، وہ خسرو کے خلاف فتویٰ لانے کی کوشش میں لگے ہیں لیکن شیخ حضرت نظام الدین اولیا سے خسرو کی بات چیت بس پردہ ہی ... جو خسرو ... بہت مناسب ہے جو ... میں اور تنہائی میں خسرو سے "... " ... سنتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خسرو کی اس وسیع النظری میں تصوف کی تعلیمات کا بڑا دخل ہے۔ یہاں ایک خاتون تری متی کا کردار بھی شامل کیا گیا ہے جو خسرو کی موسیقی کی گرویدہ ہے اس کردار کا تعارف اُس وقت اچانک ہوتا ہے جب خسرو درگاہ میں حضرت نظام الدین اولیا کو غزل سنا رہے ہیں۔ اس موقع پر اسٹیج کچھ لمحوں کے لئے خالی رہتا ہے جس سے ڈرامے کی رفتار پر برا اثر پڑتا ہے

اس موقع پر یہ خاتون تری متی آگرا اندر سے آدھی غزل کی آواز ... کرتی ہے اور ... خود ہونے کا تاثر پیش کرتی ہے تو کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے یہ خاتون اگرچہ خسرو کی ... آخر میں تک کہیں کہیں خسرو اور تری متی کے معاشقے کا سا تاثر پیدا ہوتا ہے اور خصوصاً ان موقعوں پر جب ... اس تصوف کی غرض ... جیسے ... نظام سے ... یا ... تعلق ... عشق حقیقی کے بجائے عشق مجازی کا تاثر زیادہ پیدا ہوتا ہے ... کے اس خاص ... خسرو ... نظام الدین اولیا سے ... ماحول کے ذریعے خصوصی ... تھی۔

ڈرامے میں موسیقی ... ڈرامے کا بڑا حصہ ہے، بہت کامیاب ہے اُستاد ظہور احمد خاں ... دھنیں ... میں خصوصاً تری متی کے کردار میں مدن بالا ... ہوئے بہت اچھی طرح گایا ہے ... کرداروں میں للت ... ارشاد اور ... نے بھی اچھے انداز میں قوالیاں گائی ہیں۔ مگر ایک اچھی مردانہ آواز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً اگر خسرو کے کردار میں کام کرنے والے اداکار کیدار ناتھ خود گا سکتے تو بہت اچھا تاثر پیدا ہوتا۔

موسیقی دانی براہ راست پیش کی جاتی تو بہت اچھا معلوم ہوتا لیکن مجبوری تھی کہ کیدار ناتھ موسیقی سے واقف نہیں تھے۔ موسیقی کی خوبی نے ڈرامے میں اچھا تاثر پیدا کیا ہے جبکہ ڈرامائی تاثر کی کمی اکثر محسوس ہوتی ہے۔ انفرادی طور پر لیا جائے تو خسرو کے کردار میں اے ایس جولی ... مجذوب کے کردار میں شالو کے کردار میں محمد ابو یوسف ڈرامائیت پیدا کی ہے شالو کا کردار دلی کی تہذیب کا نمونہ ہے کچھ مناظر اچھی ڈرامائیت کے حامل ہیں۔ جیسے مولوی صاحب کی فارسی کلاس جس میں بڑھے بوڑھوں کو فارسی پڑھاتے ہیں۔ اور اسٹیج کے باہر سے بچوں کی آوازیں کلاس کا تاثر پیش کرتی ہیں یا ... کی گرفتاری کا سین یا آخری سین جب حضرت نظام الدین اولیا کا وصال ہوتا ہے اسٹیج کی سجاوٹ اور روشنی کے تاثرات کی خوبصورتی کے ساتھ حالات سے مجموعی طور پر یہ ڈرامہ ایک اچھی کوشش ہے جس میں موجودہ مطابقت پیدا کرنے کی بہت اچھی کوشش کی گئی ہے یہ صرف خسرو کا قصہ نہیں اس مشترکہ تہذیب کا قصہ ہے جس میں مذہبی لسانی تہذیبی اختلافات کے باوجود ہندوستانیت اپنا الگ مقام رکھتی تھی۔ آج اس تہذیب کے اُبھارے جانے کی سخت ضرورت ہے اردو ڈرامے کی حیثیت سے بھی یہ پیشکش نہایت اہم ہے خصوصاً ان حالات میں جب اردو کے معیاری ڈرامے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اردو والوں کو اس ڈرامے کا خیرمقدم کرنا چاہئے۔

# مجھے ابھی ابھی ملازمت ملی ہے۔ میں ترقی کرنا چاہتا ہوں
# لیکن ماں کی ضد ہے کہ میں شادی کرلوں
# کیا کوئی انھیں سمجھا نہیں سکتا کہ
# شادی بیاہ کی ذمے داریاں ابھی میں نہیں اٹھا پاؤں گا؟



سُریش نے زندگی کے آنگن میں ابھی قدم رکھا ہی ہے۔ اس پر ایک دم بوجھ ڈال دینا ظلم ہی تو ہوگا۔ سُریش چاہتا ہے... ابھی دو چار سال میں ایک طرف جی لگا کر ترقی کروں۔ آگے بڑھوں۔ ادھر والدین بہو گھر لانے پر بضد ہیں۔ یہ درست ہے کہ سُریش ملازمت کرنے لگا ہے، لیکن اگر اس کی شادی جلدی کر دی گئی تو وہ اپنے خواب پورے نہ کر پائے گا۔ اسے سمجھ دار اور پکنے کا موقع دیا جانا چاہئے تاکہ وہ ایک ذمے دار شوہر اور سمجھدار والد بن سکے۔

ذرا سوچئے، اگر سریش کی چھوٹی عمر میں شادی کر دی گئی تو اس کی بیوی بھی چھوٹی عمر کی ہوگی، اور انھیں ذہنی اور جسمانی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔

خیال رہے، آپ اپنے بچوں کی بھلائی چاہتے ہیں۔ آپ کی جلد بازی کہیں ان کی خوش حالی اور صحت کو ہمیشہ کے لئے برباد نہ کر دے!

## ڈاکٹر کی صلاح مانئے!

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ لڑکی کے بدن کی نشوونما 18 برس کی عمر تک ہوتی رہتی ہے۔ وہ 15-16 برس میں جوان ضرور دکھائی دیتی ہے، لیکن رحم اور پیڑو کی نشوونما 18 برس تک ہوتی رہتی ہے۔ اگر لڑکی 18 برس سے کم عمر میں ماں بنے تو یہ مشکلات پیش آتی ہیں:

- لڑکی کے بدن کی نشوونما رک جاتی ہے۔
- 18 برس سے کم عمر ماں کی اولاد کمزور اور کم وزن پیدا ہوتی ہے۔
- ایسی کمزور اور کم وزن اولاد کی اکثر موت ہو جاتی ہے۔
- کیونکہ 18 برس سے کم عمر میں رحم اور بچے دانی جیسے بچہ جننے کے عضو کی نشوونما مکمل نہیں ہوتی، اس لئے حمل اکثر گر جاتا ہے۔ ماں بننے میں بھی دقتیں پیش آتی ہیں۔
- پیڑو کی نشوونما 18 سال سے پہلے مکمل نہیں ہو پاتی۔ اس لئے بچے کا سر بڑا ہو سکتا ہے۔ بچہ جننے میں رکاوٹ سے اندرونی اعضا کو نقصان پہنچ سکتا ہے جس سے مثانے یا انتڑی میں کمزوری آجاتی ہے۔
- کم عمر میں مجامعت سے رحم کے دہانے میں کینسر کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی عورتوں میں کینسر کی بڑی وجہ ہے۔

یاد رکھئے: بچپن کے بیاہ بچوں پر بھاری ظلم ہے۔
اٹھارہ برس سے پہلے لڑکی اور اکیس برس سے کم لڑکے کی شادی قانوناً جرم ہے۔
مزید معلومات اور واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس پتے پر لکھئے۔ پوسٹ بکس نمبر 8420 ، نئی دلی 110011

کھیل کے میدان سے

# ڈان اور سنی : کرکٹ کے دو ہیرے

۷ مارچ ۱۹۸۷ء کا دن ہندوستانی کرکٹ کا ایک یادگار دن ہے۔ اس دن سنیل گواسکر نے ایورسٹ کی سی بلندیاں فتح کرتے ہوئے ٹسٹ کرکٹ میں دس ہزار رن کا سنگ میل پار کر لیا۔ [illegible] تک کسی بھی کھلاڑی نے یہ کارنامہ انجام نہیں دیا تھا



انھوں نے ڈان بریڈمین کا ریکارڈ ۶۹۹۶ رن پانچ سال قبل ہی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں انھوں نے جیف بائیکاٹ کا ۸۱۱۴ رنوں کا ریکارڈ بھی توڑا۔ سنیل نے بریڈمین کا ۲۹ سنچریز کا ریکارڈ بھی ۸۴-۱۹۸۳ء ہی میں پیچھے چھوڑا۔ ویسٹ انڈیز کے خلاف مدراس میں کھیلتے ہوئے انھوں نے نہ صرف ۳۰ ویں سنچری بنائی بلکہ ان کا ۲۳۶ رنوں کا اسکور کسی بھی ہندوستانی کھلاڑی کا ٹسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ ذاتی اسکور بھی ہے۔
[illegible]

[illegible] ریکارڈ بھی توڑ دیا۔ [illegible] سی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں انھوں نے [illegible] سب سے زیادہ ۱۲ [illegible] کھیلی [illegible] سر ۳۴ سنچریز [illegible] کرکٹ [illegible] ان کی ہمسری [illegible] کوئی کر سکے۔

انھوں نے پاکستان دورے سے [illegible] ۱۲۲ [illegible] جس میں ۵۰۶۷ رن ہندوستان [illegible] ۵۰۵۵ رن [illegible] ممالک کے خلاف بنائے ہیں۔

سنیل کو [illegible] ایک کیلنڈر سال میں [illegible] رن چار مرتبہ پورے کیے ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں انھوں نے ۱۰۲۴ رن ۱۱ ٹسٹ میں ۱۹۷۸ء میں ۱۰۴۴ رن ۹ ٹسٹ میں، ۱۹۷۹ء ۱۹ ٹسٹ میں ۱۵۵۵ رن، اور ۱۹۸۳ء میں ۱۳۱۰ رن ۱۸ ٹسٹ میں بنائے۔

گواسکر کو ٹسٹ کرکٹ کی تاریخ میں دونوں اننگس میں سب سے زیادہ سنچری بنانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ یہ کارنامہ انھوں نے تین مرتبہ انجام دیا۔ ۱۲۴، اور ۲۲۰، ویسٹ انڈیز کے خلاف پورٹ آف اسپین میں (۷۱-۱۹۷۰ء)، کراچی میں پاکستان کے خلاف انھوں نے یہ رن بنائے۔

کسی بھی ہندوستانی بلے باز کے پاس گواسکر کا سا استقلال و استقامت نہیں ہے، وہ وجہ ہزارے سے بھی آگے ہیں، جو دونوں اننگس میں سنچری بنانے والے پہلے ہندوستانی کھلاڑی ہیں۔

گواسکر کا قدموں کا استعمال نہایت فنکارانہ ہے۔ ان کا دفاعیہ انداز اپنا الگ مقام رکھتا ہے، اور دوسرے "لٹل ماسٹر" پاکستان کے حنیف محمد کی یاد تازہ کر دیتا ہے، ان کی نظر کی مرکوزیت اور ٹھہراؤ کسی بھی کرکٹ کھلاڑی کے لیے نمونہ بن
[illegible]

اس وقت حقیقی مسرت حاصل کرتے ہیں جب وہ وکٹ پر گواسکر کو کھیلتے دیکھ رہے ہوں ان کی نظر کی جادوگری کے بارے میں ایک نقاد کی رائے ہے کہ گواسکر [illegible] گیند [illegible] سے پہلے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ کس طرف جائے گی۔



سنیل گواسکر ۲۲ سال کی عمر میں، کرکٹ کے منظر پر نہایت آن بان کے ساتھ آئے۔ انھوں نے اپنا آغاز طاقتور ویسٹ انڈیز کے خلاف [illegible] میں کیا۔ اپنی پہلی سیریز میں ہی ایک ڈبل سنچری (۲۲۰، پورٹ آف اسپین) کے ساتھ ہی ۴ سنچریاں بنائیں۔ انھوں نے اس کے علاوہ ۳ اور ڈبل [illegible] بنائیں، لیکن ۱۹۷۹ء میں اوول میں انگلینڈ کے [illegible] ۲۲۱ رن کی سب سے یادگار اننگ ہے۔ سر لین ہٹن نے اس اننگ کو دیکھنے کے بعد کہا تھا
[illegible]





اننگ ان سب میں عظیم ترین کہی جا سکتی ہے۔ انھوں نے اپنی ٹیم کی ناامیدی کی حالت میں اپنی اننگ کا آغاز کیا۔ اس کو میں سٹان میکابے کی اننگ (ٹرینٹ برج)، اور والٹر ہیمنڈ کی دوہری سنچری (لارڈس ۱۹۳۸ء) کے مقابلے میں رکھ سکتا ہوں۔ یہ اننگ واقعی ایک عظیم بلے باز ہی کھیل سکتا ہے۔"

عظمت کی بلندیاں اپنے عروج پر اس وقت پہونچیں جب ڈان بریڈمین ۱۹۷۴ء میں تیرہ سال کے بعد لندن آئے تھے اور ان سے کرکٹ کی عظیم ترین بلے بازی کے بارے میں پوچھا گیا تھا، ان کا جواب تھا کہ میکابے کی ۲۳۲ رنوں کی اننگ سب سے شاندار تھی۔

۱۹۷۰-۷۱ء میں گواسکر کی کارگزاری اس قدر شاندار تھی کہ ان کا نام ان تین ہندوستانی کھلاڑیوں میں شامل تھا، جن کو آسٹریلیا کے ایک ٹورنامنٹ میں "ریسٹ آف ورلڈ" کے لیے کھیلنا تھا۔ دس سال کے بعد وسڈن نے ۱۹۸۰ء میں انھیں "سال کے پانچ کھلاڑیوں" میں شامل کیا اور کہا کہ:-

"ان کے شاٹ کے پیچھے جو طاقت اور معیار ہے وہ انھیں سب سے ممتاز کرتا ہے۔"

گواسکر کو ہم ہندوستانی کرکٹ کا "رام" کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے ۱۶ برس سے عمدگی کا معیار قایم کر رکھا ہے اور ہندوستانی کرکٹ کا اہم ترین موضوع سخن رہے ہیں، اور اب جب کہ وہ ۳۵ برس کے ہو چکے ہیں ان کا معیار اور شکل زیادہ نکھرتی جا رہی ہے۔ ہندوستانی ٹیم کے ان کے ہم عصر وشواناتھ تھے جو خداداد اور مکمل صلاحیت کے مالک تھے۔ بدقسمتی سے ۱۹۷۰-۷۱ء کی ویسٹ انڈیز سیریز میں وہ زخمی ہو گئے اور پھر ان کو وہ شہرت نہ مل سکی۔ گواسکر نے خود بھی ان کے کھیل کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:-

"میں کسی بھی بال کو کھیلنے کا صرف ایک طریقہ جانتا ہوں، لیکن وشواناتھ کے پاس چار یا پانچ طریقے ہیں"

اگر گواسکر نے وشواناتھ کی صلاحیتوں کو گلہائے عقیدت نذر کیے ہیں تو بریڈمین نے بھی گواسکر کی خوبیوں کا اقرار کیا ہے۔ انھوں نے آسٹریلیا کو بکھرا دینے والی بیٹنگ کو دیکھ کر گواسکر کے لیے "کرکٹ کا [illegible]" کہا ہے۔ [illegible] نے یہ بھی

تیز طویل القامت کھلاڑی جو
طاقت کے بل پر کھیلتے ہیں، لیکن
ہم پستہ قد والوں کے پاس قدموں
کا کھیل (فوٹ ورک) ہے۔'

اب گواسکر کے معیاری تعین کے لیے ایک جائزہ پیش کرتے ہیں کیوں کہ ڈان بریڈمین اور گواسکر ایسے بلے باز ہیں جو اب تک تمام تاریخ میں عظیم ہیں۔

اس وقت ڈان بریڈمین ۸۰ برس کے ہیں اور سنیل منوہر گواسکر سے چار دہائیاں بڑے ہیں۔ ڈان بریڈمین نے صرف ۵۲ ٹسٹ کھیلے، ۸۰ اننگس کھیلیں لیکن حیرت انگیز طور پر ۹۹٫۹۴ کی شرح سے ۲۹ سنچریاں بنائیں۔ اول درجے کے کرکٹ میں ڈان نے ۲۳۸ اننگس میں ۲۸۰۵۷ رن بنائے، جس کا شرح تناسب ۹۵٫۱۴ ہے۔ انھوں نے ۱۱۷ سنچریاں بھی بنائیں۔ ان کی بلے بازی سے مخالف ٹیم متحیر اور بدحواس ہو جاتی۔ بریڈمین نے شیفلڈ شیلڈ کے ایک میچ میں کوئینس لینڈ کے خلاف ۱۹۳۰ء میں ۴۱۵ منٹ میں ۴۵۲ رن بغیر آؤٹ ہوئے بنائے تھے۔ آسٹریلیا کا دورہ کررہی ہندوستانی ٹیم، جس کے کپتان اب تک آل راؤنڈرز میں سے ایک لالہ امرناتھ تھے۔ بریڈمین نے ہسٹ کی ۶ اننگ میں ۴ سنچریز بنائیں۔ ان کا سب سے زیادہ اسکور ۲۰۱ رن تھا، اور رنوں کی شرح ۱۷۸٫۷۵۔ اس وقت بریڈمین کی عمر تقریباً چالیس برس تھی۔

اوول میں انگلستان کے خلاف ۱۹۴۸ء میں اپنی آخری ٹسٹ اننگ میں، بریڈمین جب بلے بازی کرنے گئے تو اس وقت انھیں صرف ۴ رن کی ضرورت تھی جس سے ان کے رن کا تناسب ۱۰۰ ہو جاتا، لیکن بدقسمتی سے ڈان، دوسری ہی بال پر ڈک کرنے کے چکر میں آؤٹ ہو گئے۔

تمام شائقین کو جیک ہابس کا افسانوی شہرت یافتہ کرکٹ میں داخلہ یاد ہے

ڈان بریڈمین اپنی زندگی ہی میں ایک داستان اور تاریخ بن گئے تھے اور وہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ وہ واحد بلے باز تھے جس نے اپنی ہر تیسری اننگس میں سنچری بنائی ہے۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں تو انھوں نے کمال ہی کر دیا، جب لگاتار اننگس میں ۶ سنچریاں بنائیں۔ ان کو "رن مشین" کہنا ہی ان کا تعارف کرانے کے لیے کافی ہے۔ ۱۹۳۰ء میں ۲۱ سالہ بریڈمین نے انگلینڈ میں آندھی اور طوفان کی طرح بلے بازی کی، وہاں کرکٹ کے افق پر بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح دکھائی دیے۔ ورسٹر شائر کے خلاف ۲۳۶ رن اپنے پہلے میچ میں ہی بنائے۔ وہاں دن بہ دن انھوں نے بغیر زمین سے بال اٹھے ہوئے کٹ، ڈرائیو شاٹ کھیلے، ان کے دونوں جانب کے ہُک قابل دید تھے۔

بریڈمین نے ۳۰۰ سے زیادہ رن بھی ٹسٹ میچ میں بنائے۔ انگلینڈ کے خلاف ان کی ۳۳۴ رن کی اننگ لیڈس کے میدان پر ایک تاریخ مرتب کر گئی۔ جب وہ بلے بازی کرنے کے لیے آئے اس وقت آسٹریلیا کا اسکور ایک وکٹ پر دو رن تھا۔ لنچ تک انھوں نے ۱۰۵ رن بنائے۔ چائے کے وقفے تک وہ ۲۰۰ پر تھے، اور جب دن بھر کا کھیل ختم ہوا تو ان کا اسکور ۳۰۹ رن تھا۔ یہ رن انھوں نے ۶ گھنٹوں اور ۲۳ منٹ میں بنائے تھے۔ کرکٹ کے ایک نقاد نے لکھا ہے ایسی عظیم بلے بازی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا بہرکیف، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی لارڈس میں کھیلی گئی ۲۵۴ رنوں کی اننگ سب سے بہترین تھی۔ خود بریڈمین بھی اس رائے سے متفق ہیں۔

بریڈمین اس کثرت کے ساتھ اسٹروک کھیلا



سے کہ ایک بار ٹیوبلا کارڈس نے یہاں تک کہہ دیا کہ ڈان کو اس وقت آؤٹ دے دینا چاہیے جب بھی ان سے کوئی بال چھوٹ جائے۔ کسی نے طنزیہ یہ بھی کہا کہ ایسی حالت میں بال کو وائڈ قرار دینا چاہیے اس نے یہ بھی کہا کہ ان کے شباب کے زمانے میں کسی بھی بالر کے لیے ان پر قابو رکھنا مشکل ہوتا تھا ان کی بیٹنگ کی خوب صورتی یہ تھی کہ مشکل سے کوئی بال اوپر اٹھتی تھی۔ جب بریڈمین، جنوبی افریقہ کے اسپین گیند باز پیگلر کا "قتل عام" کر رہے تھے تو پیگلر کی ٹیم کے ایک ساتھی کھلاڑی نے کہا کہ وہ کیوں اتنی خراب بالنگ کر رہا ہے۔ پیگلر کا جواب تھا کہ میں نے زندگی میں اس سے بہتر



گیند بازی نہیں کی ہے۔

۱۹۳۴ء میں لیڈس کے میدان پر چوتھے ٹسٹ میں آسٹریلیا کا اسکور ۳۹ رن پر ۳ وکٹ تھا۔ کھیل ختم ہونے کے وقت حالات بہت خراب تھے۔ رات میں بریڈمین نے ڈنر کے طے شدہ پروگرام میں نہ جانے کے لیے معذرت چاہی اور کہا "شکریہ! کیوں کہ کل مجھے کم سے کم ۲۰۰ رن بنانے ہیں"۔ انھوں نے دوسرے دن ۳۰۴ رن بنائے۔ اگرچہ لیڈس ہی میں ۱۹۳۸ء میں انھوں نے پھر سنچری بنائی، لیکن یہ تہری سنچری نہیں تھی، مگر یہ ایک یادگار اننگس اس لیے ہے کہ وہ بالکل اندھیرا ہوتے وقت بلے بازی کرنے گئے تھے۔ بعد میں

کی روشنی میں بھی سنچری بنا سکتے ہیں۔

انگلینڈ والوں پر ان کی کتنی دھاک قائم تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب ۱۹۳۸ء میں آخری ٹسٹ شروع ہوا تو اوول کے میدان پر لین ہٹن نے ۳۶۴ رن بنائے، بریڈمین اس میچ میں بیٹنگ نہیں کر سکے تھے۔ ہیمنڈ کو جب اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ بریڈمین بیٹنگ نہیں کریں گے تب انھوں نے ۷ وکٹ پر ۹۰۳ رن کے عظیم اسکور پر اپنی اننگ ڈکلیئر کی۔

ڈان بریڈمین نے یہ ثابت کر دیا کہ بولنگ صرف ان کے لیے ہی کی جاتی ہے۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں جب آسٹریلین ٹیم انگلینڈ گئی تو "باڈی لائن" بولنگ ایجاد کی گئی تھی۔ انگلینڈ کے لیروڈ نے جارڈینے کی کپتانی میں یہ بالنگ شروع کی۔ اس وقت لیروڈ نے زبردست صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ۹۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گیند کو کمر سے سر کی اونچائی تک اٹھانا شروع کیا۔ جب اس پر اعتراض کیا گیا تو جارڈینے نے کہا کہ اس نے بالر کو لیگ اسٹمپ پر بالنگ کے لیے کہا ہے۔ اس پر آسٹریلیائی بلے باز نے کہا کہ کیا وکٹ ۲ فٹ باہر اور ۲ فٹ اونچا ہے؟۔ لیکن انگلینڈ کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی، مگر بریڈمین نے ہی ان کو قابو میں کیا۔ انھوں نے ۵۶/۵۷ کے تناسب سے رن بنائے۔ جو انگلینڈ

زیادہ تھے۔ اس وقت بھی اس بلے بازی کی عظیم بلے بازی ظاہر ہوئی۔ بریڈمین وہاں صرف ایک ہی سنچری بنا پائے۔ بہرحال یہ ثابت ہو گیا کہ کوئی بلے باز ان کے معیار تک نہیں پہونچ سکتا، جنھوں نے 'باڈی لائن' کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔

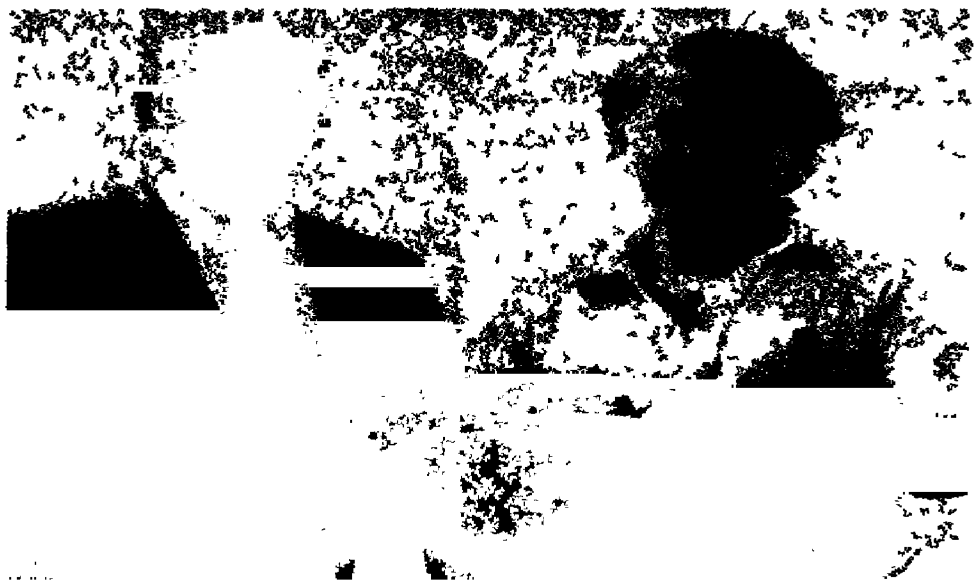
اپنے دور میں بریڈمین کے مدمقابل کوئی فیلڈر بھی نہیں تھا۔ لوگ کسی بھی کھلاڑی کے مقابلے ڈان کو کسی بال کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ بال اٹھانے کے بعد گولی کی سی تیزی کے ساتھ واپس پھینک دینا ان ہی کا کمال تھا۔ کیچ لیتے وقت ان کی حیرت انگیز پھرتی قابل ہوتی تھی۔ ایک فیلڈر کی حیثیت سے گواسکر کا وہ مقام تو نہیں ہے، اگرچہ ۷۲-۱۹۷۱ء کی سیریز میں آسٹریلیا میں سنی نے اپنی بہترین فیلڈنگ کے لیے خراج تحسین حاصل کیا اور بریڈمین کے ہاتھوں ہی بہترین فیلڈر کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

کپتان کی حیثیت سے بریڈمین نے انگلینڈ کے خلاف ۱۹۴۸ء میں آسٹریلیائی ٹیم کو "آئے، دیکھا اور فتح حاصل کی" کے مصداق کامرانی دلائی۔ اس وقت کی آسٹریلیائی ٹیم اب تک کی بہترین اور ناقابل شکست رہی۔ بریڈ کا کہنا تھا کہ کپتان کے لیے سب سے پہلے ٹاس جیتنا ضروری ہوتا ہے۔ وجے ہزارے نے جب اپنے وقت کی عالمی الیون کا انتخاب کیا تو انھوں نے کہا "ٹیم کی کپتانی کے لیے بریڈمین، ہیمنڈ، وارل اور ہٹن، سبھی دعویدار ہیں، مگر بریڈمین کا ہم پلہ کوئی نہیں ہے۔"

سنیل گواسکر نے ۴۶ ٹسٹ میچوں میں ہندوستانی ٹیم کی کپتانی کی۔ حقیقت میں گواسکر نے میچ ڈرا کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔ یہاں پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ کپتان کی حیثیت سے گواسکر کا بیٹنگ تناسب ۵۰/۸۸ ہے، جو ان کا بغیر کپتانی کے اسکور سے کم ہے۔

سنیل گواسکر اور بریڈمین، دونوں ہی مصنف ہیں۔ بریڈمین کی خود نوشت "فیئر ویل ٹو کرکٹ" کو کلاسیکی حیثیت حاصل ہے۔

بریڈمین کا گواسکر سے موازنہ کرنے میں جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اننگس کی شروعات کرنا زیادہ دشوار ہے بجائے اس کے کہ بعد میں بلے بازی



پوچھا کہ چیس اور سکاپچی میں وہ کسے بہتر سمجھتے ہیں
"پلاسشیہ مثل" پینٹرسنہ پیرتنہ۔ احاءہ نن کہا۔
تھیں کر وہ نمبر ایک پر بلے بازی کرنے جاتا ہے۔
جیسا کہ ہم جانتے ہیں ڈان بریڈمین تیسرے نمبر پر
بلے بازی کرنے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں
نے اپنے تمام ابتدائی میچ انگلینڈ اور آسٹریلیا میں
کھیلے اور گواسکر نے تمام کرکٹ کے بڑے ممالک میں اور
مختلف حالات میں اپنے میچ کھیلے

دوسری جانب بریڈمین کی ٹسٹ میں بلے
بازی کا تناسب، سبھی سے میلوں دور ہے۔ گواسکر
کے ساتھ ایسا نہیں ہے حقیقت میں وہ ویوین
رچرڈز ۵۳/۱۶، ایلن بورڈر ۵۲/۸۰، اور ہندوستان
کے اظہرالدین سے پیچھے ہیں۔ اس سوال کے جواب
میں کہ اس وقت کے معاصرین میں اگر عمران خان کی
ترتیب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بہترین بلے بازوں
میں چوٹی کے تین بلے باز ہیں ویوین رچرڈز، آئن چیپل اور
سنیل گواسکر۔

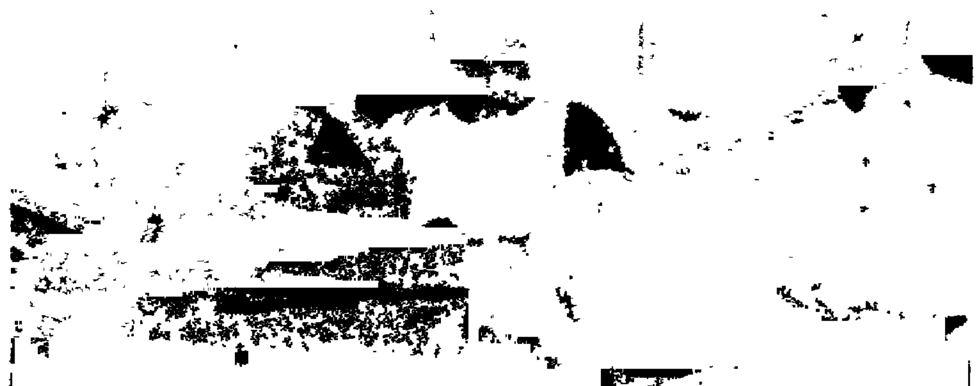
اس سے قطع نظر، ڈان بریڈمین کے اسکورنگ
ریکارڈ پر نظر ڈالی جائے تو انھوں نے ایک سیریز
میں سب سے زیادہ رن (۹۷۴) بنائے ہیں، ۱۰
ڈبل سنچری بنائی ہے اور دو بار تین سنچریز بنائی ہیں۔
گواسکر نے کبھی بھی تین سنچریز نہیں بنائیں ڈبل
سنچری البتہ انھوں نے چار مرتبہ بنائی ہیں۔ لیڈس
میں بریڈمین نے ایک دن میں ۳۰۹ رن بنائے،
جب کہ گواسکر نے اوول میں دن بھر میں سب سے
زیادہ ۱۷۹ رن ۱۹۷۹ء میں بنائے تھے۔ بریڈمین
نے کسی بھی ملک کے خلاف سب سے زیادہ سنچریز
مارنے کا ریکارڈ بھی قائم کیا۔ انھوں نے انگلینڈ
کے خلاف ۱۹ سنچریز بنائیں۔ گواسکر نے ویسٹ
انڈیز کے خلاف سب سے زیادہ ۱۳ سنچریز بنائیں۔
بریڈمین کا ایک ریکارڈ انگلینڈ کے خلاف سب
سے زیادہ رن (۵۰۲۸) ہے، گواسکر نے ویسٹ انڈیز
کے خلاف ۲۷۴۹ رن بنائے۔

بریڈمین نے گواسکر کے ۱۲۴ ٹسٹ کے مقابلے
۸۰ ٹسٹ کھیلے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں انگلینڈ کے خلاف
کھیلنے کے بعد بدقسمتی سے دوسری عالمی جنگ کی
وجہ سے وہ دس سال تک نہیں کھیل سکے۔
انھوں نے دوبارہ ۴۸-۱۹۴۷ء میں ہندوستان
اور انگلینڈ کے خلاف شروعات کی۔ ان کا تناسب
۹۹/۹۴ تھا، اور گواسکر کا ۵۱/۱۲، راؤنڈ فیگر میں
بالترتیب یہ ۱۰۰/ ۱۱۱اور ۵۱/ ہے۔

لین ہٹن نے ان دونوں کا موازنہ کرتے
ہوئے گواسکر کے بارے میں کہا ہے کہ "میں تمام عہد
کے بہترین بلے بازوں میں گواسکر کو شامل کروں گا
وہ ڈان بریڈمین کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے مگر ان سے
بہت قریب ہیں۔"

ڈان کے ایک شیدائی نے حساب لگایا کہ اگر
بریڈمین اتنی ہی اننگس کھیلتے جتنی گواسکر نے
کھیلی ہیں تو وہ ۷۷ سنچریز کے ساتھ ۱۹۵۸۸ رن
بنا چکے ہوتے۔

ویلفریڈ رہوڈس کے الفاظ میں "عظیم
ترین بلے باز" ڈان بریڈمین ہیں۔ اکثر لوگ اس بات
پر متفق ہیں کہ گواسکر عظیم ترین ابتدائی بلے باز ہیں اور
شہرت کی تمام تر بلندیوں پر آتے ہوئے انھوں نے
جیک ہابس اور لین ہٹن وغیرہ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے
تمام ریکارڈز پاش پاش کر دیے ہیں۔



علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مذاکرہ

رپورٹ : راحت ابرار

# دینی مدارس اور سائنسی تعلیم

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی محض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک رواں دواں تحریک ہے جو آج سے ڈیڑھ سو سال قبل سر سید احمد خاں نے حوصلہ شکن حالات میں شروع کی تھی اور اب اس تحریک کو نئی زندگی بخشنے کے لیے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی، یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۱ء کے تحت ہندوستانی مسلمانوں پر سائنسی علوم کی تحصیل و تخلیق کے لیے مسلم زیر انتظام اداروں میں بشمول دینی مدارس سائنسی تعلیم کو فروغ دینے اور اسے بہتر بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔

اب تک کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستانی مسلمان جدید تعلیم میں عام طور سے اور سائنسی تعلیم میں خاص طور سے اپنے دوسرے ہم وطن بھائیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ عصر حاضر میں جبکہ علم کے دائروں میں مسلسل توسیع ہو رہی ہے۔ ملی ترقی اور خوشحالی کا دارومدار سائنسی علوم پر ہے اور کوئی بھی فرقہ اپنے قومی دھارے میں کسی بلند و برتر مقام کے حصول کی توقع اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے آپ کو سائنسی علوم سے آراستہ نہ کرے۔

سائنس اعلیٰ ترین معیار کی ایک ذہنی تحریک ہونے کے علاوہ اپنے تکنیکی، صنعتی اور طبی دائرہ کار سے انسانی معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ یہ عالم انسانیت کی ایک مشترکہ میراث ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مسلم جماعت کی غیر موجودگی سے زیادہ افسردہ دلی اور بے ہمتی پیدا نہیں ہونی چاہیے کیونکہ صرف یہ ہے کہ مسلمان جدید رجحانات سے بے خبر اور قیادت فکر و نظر سے محروم ہیں۔ اگر وسیع پیمانے پر کوئی لائحہ عمل مرتب کیا گیا اور مسلسل کوششیں کی گئیں تو یہ جماعت بھی سائنس کے مخصوص دھارے کے ساتھ تیرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنی پوری توانائی اور قوت عمل کے ساتھ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے میدان عمل میں آئی ہے اور عزم یہ ہے کہ یہ ادارہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی تعلیمی رہنمائی کا کام انجام دیتا رہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر مسلم یونیورسٹی کے مرکز فروغ سائنس کی جانب سے "دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" کے موضوع پر ایک روزہ کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جو برصغیر میں غالباً اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی جہاں دینی مدارس میں عصری علوم کو شامل کیے جانے کے سلسلے میں ملک بھر کے ساٹھ سے زائد علما و اساتذہ شریک ہوئے۔

افتتاحی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر سید ہاشم علی نے کہا کہ مسلمانوں میں تعلیم بڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ جدید علوم میں اس طور پر پیش رفت کی جائے کہ دینی عنصر متاثر نہ ہو۔

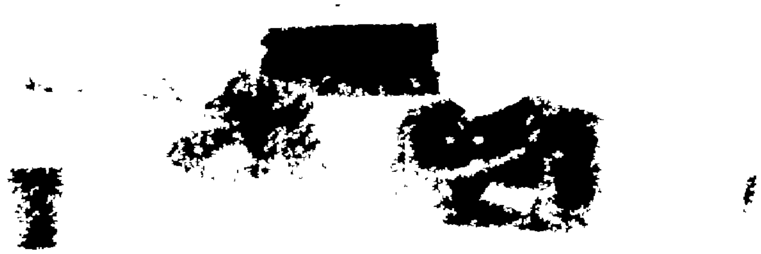
جناب سید ہاشم علی نے کہا کہ خدا کی عظمت کو سمجھنے کے لیے اس کی کائنات کا علم سیکھنا ضروری ہے، اگر خدا کی کتاب کا علم، علم دین ہے تو خدا کی کائنات کا علم سائنس ہے" لہٰذا ان دینی مدارس کو اپنے نصاب میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ کیونکہ آج مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ پسماندہ قوم بن گئی ہے۔ اور اگر یہی حال رہا تو آئندہ پچاس برس میں کسی بھی اہم عہدے پر ایک بھی مسلمان نہیں ملے گا جس کے لیے ہمیں آئندہ پچاس برس تک سخت محنت کرنی ہوگی۔

مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب سید حامد نے اپنے کلیدی خطبہ میں کہا کہ مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے علم کو دو خانوں میں تقسیم کر دیا ہے جیسے دینی علم اور عصری علم جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا دین زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہو۔ وہ خانقاہوں میں جا بیٹھنے کی تعلیم دینے کے بجائے عملی زندگی میں ہماری رہنمائی ہر قدم پر کرتا ہے۔ اگر ہمارے علماء عہد حاضر کے پیچیدہ تمدنی مسائل سے دوران تعلیم واقفیت حاصل نہیں کریں گے تو وہ اس ملت کی مؤثر اور ہمہ جہت رہنمائی کس طور پر کر سکیں گے۔؟

انھوں نے کہا کہ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے اقبال مندی کے دور میں جغرافیائی فتوحات ذہنی اور علمی تسخیرات کے شانہ بشانہ چلیں

جناب سید حامد نے کہا کہ ہم نے اپنے مدارس کے نصاب کو یا تو دینی تعلیم تک محدود رکھا یا اس میں ان غیر دینی مضامین کو شامل کر لیا جن کو دنیا نے علوم کی ترقی میں فرسودہ و از کار رفتہ کر دیا تھا۔

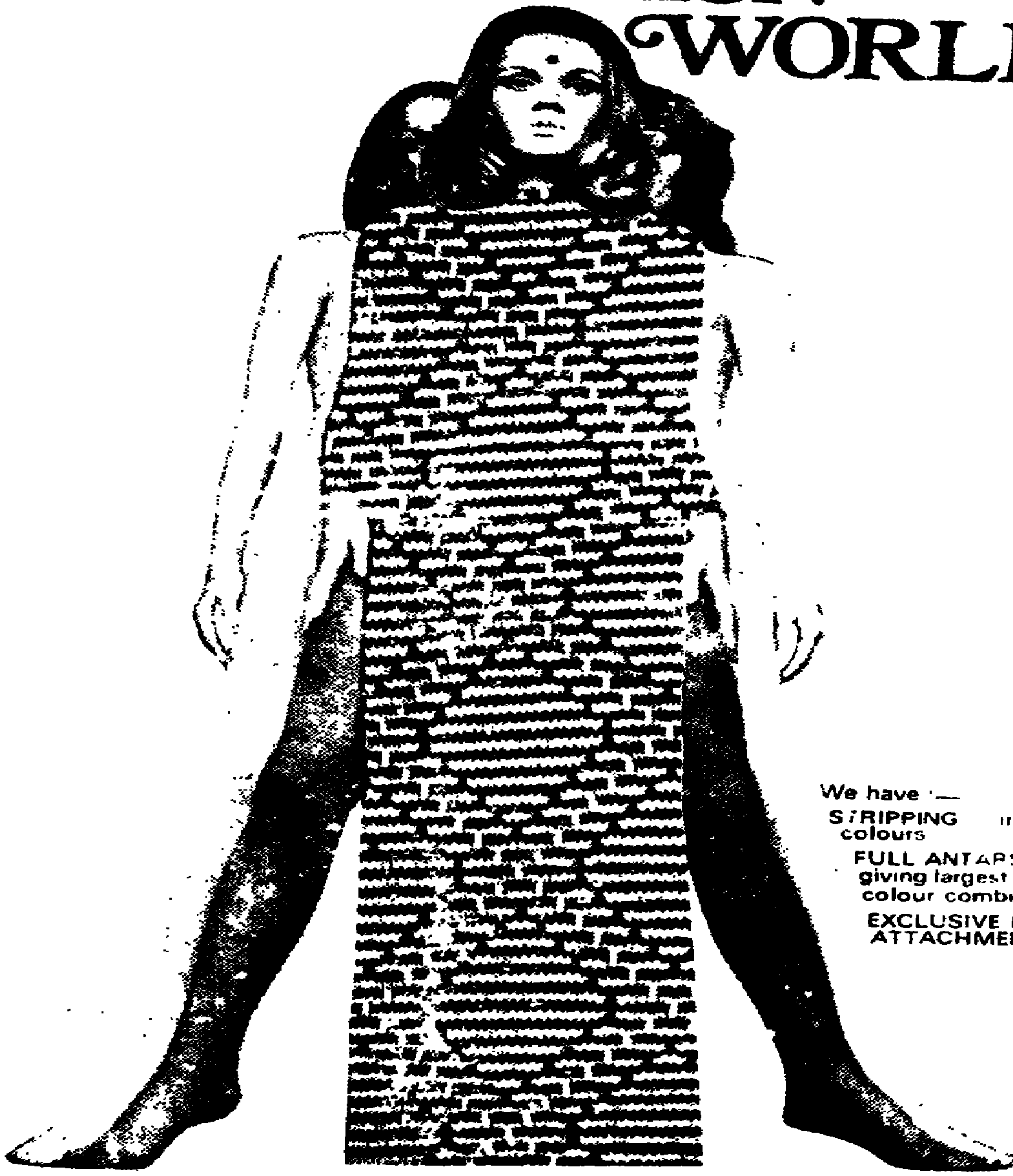
کانفرنس کے اختتامیہ جلسہ میں اتفاق رائے سے چند تجاویز منظور کی گئیں اور طے پایا کہ سائنس اور ریاضی کو دینی مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ مرکز فروغ سائنس مدرسوں کے ارباب حل و عقد کے مشوروں سے تربیتی اور تجدیدی کورس کا انتظام کرے اور اس کے ساتھ ہی مرکز مسلم معاشرے بالخصوص تعلیمی اداروں میں سائنسی مزاج کا ہر ممکن انتظام کرے۔



سابق وائس چانسلر سید حامد، وائس چانسلر سید ہاشم علی اور ساتھ، پرو وائس چانسلر، پروفیسر ...

**A FANTASY COMES TRUE IN THE**

# FASHION WORLD...



We have :—

- STRIPPING in three colours
- FULL ANTARSIA giving largest range of colour combinations
- EXCLUSIVE LACE — ATTACHMENT

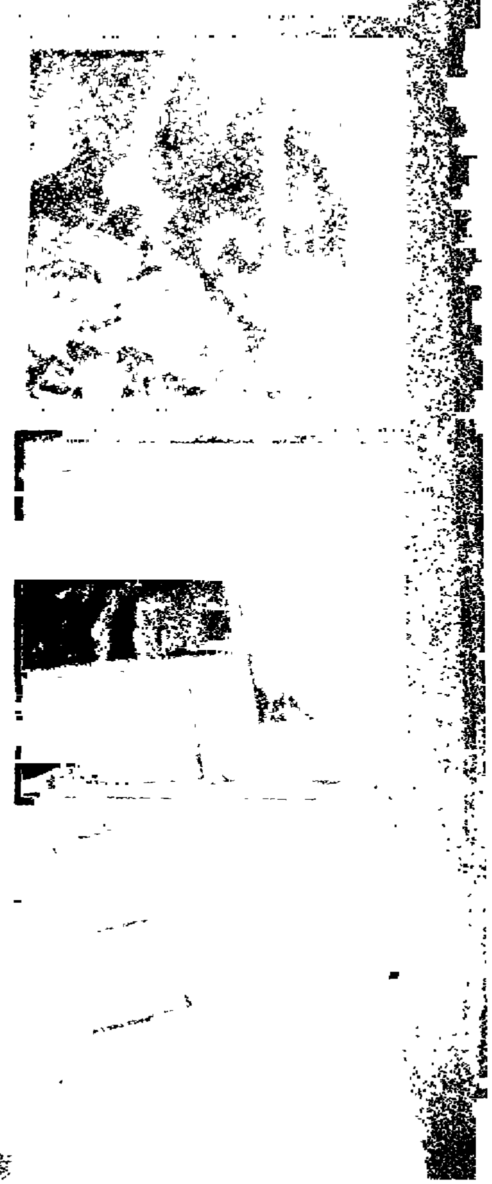
Yes, with the latest Fully Fashioned Knitting Unit having Technical Knowhow from F. N. Herstal (Belgium) INECO brings for the elite a super range of exclusive knitted outer wear in wool, synthetic and cotton.

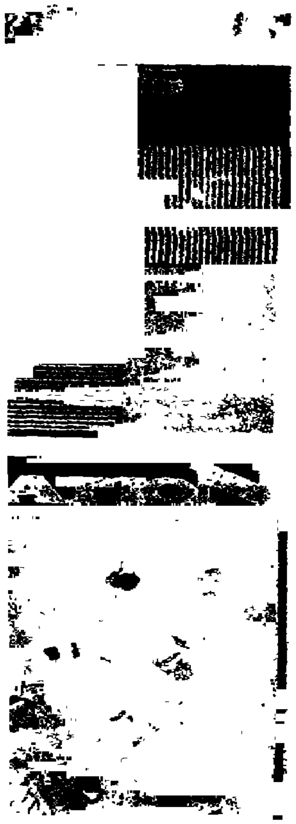
**For Trade Enquiries :**

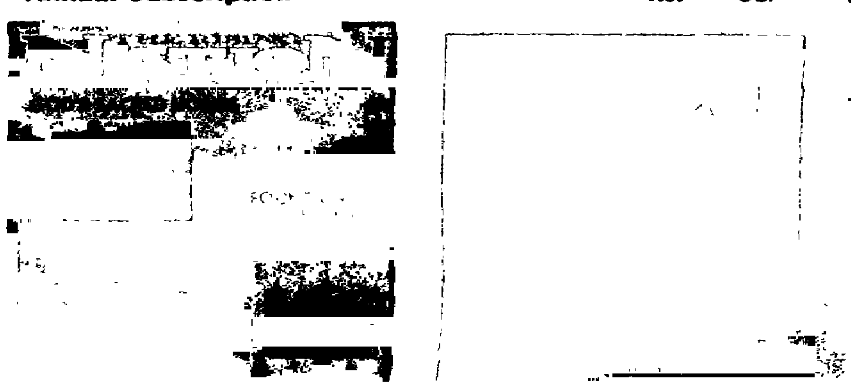
# INECO MILLS











اداریہ

# فیصلہ کن مرحلہ

صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں ایک افسوسناک مباحثہ روز افزوں ہے۔ صدر جمہوریہ کے اس اعلان کے باوجود کہ ان کا ایسا کوئی قدم اٹھانے کا ارادہ نہیں ہے جس سے آئین کی خلاف ورزی ہوتی ہو کیوں کہ انہوں نے اس کے تحفظ کا حلف اٹھایا ہے۔ یہ سلسلہ بے دریغ جاری ہے، وزیر اعظم کی "حکمت شیرینی" سے ایسا تاثر پیدا ہوا تھا کہ تنازعہ رفع دفع ہو گیا، لیکن یہ تاثر بھی چند روزہ ثابت ہوا۔ ۱۶ مئی کی بوٹ کلب ریلی میں وزیر اعظم راجیو گاندھی نے صدر پر براہ راست حملہ کیا اور ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ آئین کو مسخ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کی تقریر کے لہجے سے یوں محسوس ہوا جیسے ریلی کا واحد مقصد صدر کو بدنام کرنا اور انھیں اور وی پی سنگھ کو بیرونی آقاؤں کے اشاروں پر ناچنے والے "میر جعفروں اور جے چندوں" سے تعبیر کرنا تھا۔ پھر بھی صدر نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ وی پی سنگھ ریلی میں موجود تھے اور ان کی موجودگی میں یوتھ کانگریس (آئی) کے کارکنوں نے ان کے خلاف نعرے لگائے۔ شاید اسی لیے انھیں جوابی کارروائی کرنی پڑی اور یہ کہنا پڑا کہ ملک کے اصل دشمن اقتصادی مجرم ہیں، وہ نہیں۔

وزیر اعظم نے ایک اور افسوسناک موقف اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ آئین کی دفعہ ۷۸ کے تحت صدر کو کیا معلومات فراہم کرنی ہیں اس کے تعین کا اختیار صرف وزارتی کاؤنسل کو ہے اس سے صورت حال مزید خراب ہوئی ہے۔ اگر حکومت ہند بوفورس کے معاملے اور اس سے وابستہ خرد برد سے متعلق کوئی بات بھی پس پردہ رکھنا نہیں چاہتی تو اسے صدر کو اس سلسلے میں حاصل شدہ تمام معلومات فراہم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ دفعہ ۷۸ کی عبارت کے ساتھ کوئی زیادتی کیے بغیر اس کی یہ تعبیر کیسے ممکن ہے کہ صدر کو صرف وہی معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں جن کا فراہم کیا جانا وزیر اعظم ضروری خیال کرے۔ دفعہ ۷۸ کی شق (ب) میں صراحت کہا گیا ہے کہ وزیر اعظم کا یہ فرض ہوگا کہ وہ وفاقی امور سے متعلق ہر وہ معلومات صدر کو فراہم کرے جس کا وہ مطالبہ کرے اور یہ کہ صدر کو یہ معلومات فراہم نہ کرنا آئین کی خلاف ورزی کے مترادف ہوگا۔

اس کے بعد کانگریس (آئی) کی قانونی سیل کے ارکان کی جانب سے وزیر اعظم کے نام ایک یادداشت پر دستخطوں کی مہم چھیڑی گئی، اس یادداشت پر جس میں کہا گیا تھا کہ جب تک وزیر اعظم کو ایوان کی حمایت حاصل ہے تب تک آئین کے تحت صدر کو اسے یا اس کی کابینہ کو برخاست کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ صدر، وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کو برطرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے یا نہیں یہ ایک بہت زیادہ بحث طلب سوال ہے۔ بلا شبہ دفعہ ۷۴ کے مطابق صدر وزارتی کاؤنسل کے مشوروں کا پابند ہے تاہم وزارتی کاؤنسل کو برطرف کرنے کے لیے اس کی صلاح لینا خارج از بحث ہے۔ لہٰذا یہاں وہ دفعہ لاگو نہیں ہوتی۔ ایک استدلال یہ بھی ہے کہ اگر صدر وزیر اعظم کے تقرر کے سلسلے میں اپنی ذاتی صوابدید کے مطابق عمل کرسکتا ہے تو وہ اسے برخاست بھی کرسکتا ہے۔ پھر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ اس کا فیصلہ کون کرے کہ صدر کا عمل آئین کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ سپریم کورٹ پہلے ہی یہ فیصلہ دے چکا ہے کہ وزارتی کاؤنسل کے تقرر، اس کی برطرفی اور ریاستی اسمبلیوں کی برخاستگی سے متعلق تمام سوالات سیاسی نوعیت کے ہیں لہٰذا عدالتوں کے دائرۂ اختیار سے خارج ہیں۔ ان باتوں نے تنازعے کی آگ کے لیے ایندھن کا کام کیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ صدر کسی بھی لمحے وزیر اعظم اور ان کی کابینہ کو برخاست کردیں گے۔ صدر کی تردید کے بعد اس احساس کا برقرار رہنا ناقابل فہم ہے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ معاملہ تیز رفتاری کے ساتھ طول پکڑتا جا رہا ہے۔ اور کسی بھی ناخوشگوار صورت حال پر منتج ہو سکتا ہے قطع نظر اس کے کہ اس صورت حال کو آئینی اجازت حاصل ہے یا نہیں۔

آئندہ ماہ ہونے والے ہریانہ کے انتخابات اور وی پی سنگھ کے استعفے یا اخراج کے پس منظر میں ہم اس صورت حال کے ایک موڑ کی جانب گامزن ہیں۔ تادم تحریر دہلی کی فضا طرح طرح کی افواہوں سے گونج رہی ہے۔ موجودہ غیر یقینی اور مشکل حالات میں کون کب کیا کرے گا اس کی پیش بینی مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ملکی سیاست کسی بھی وقت کوئی بھی غیر متوقع رخ اختیار کرسکتی ہے۔

[signature]

# منظر نامہ







بساط سیاست

# ریلی یا ریلا

دیو بھٹیال

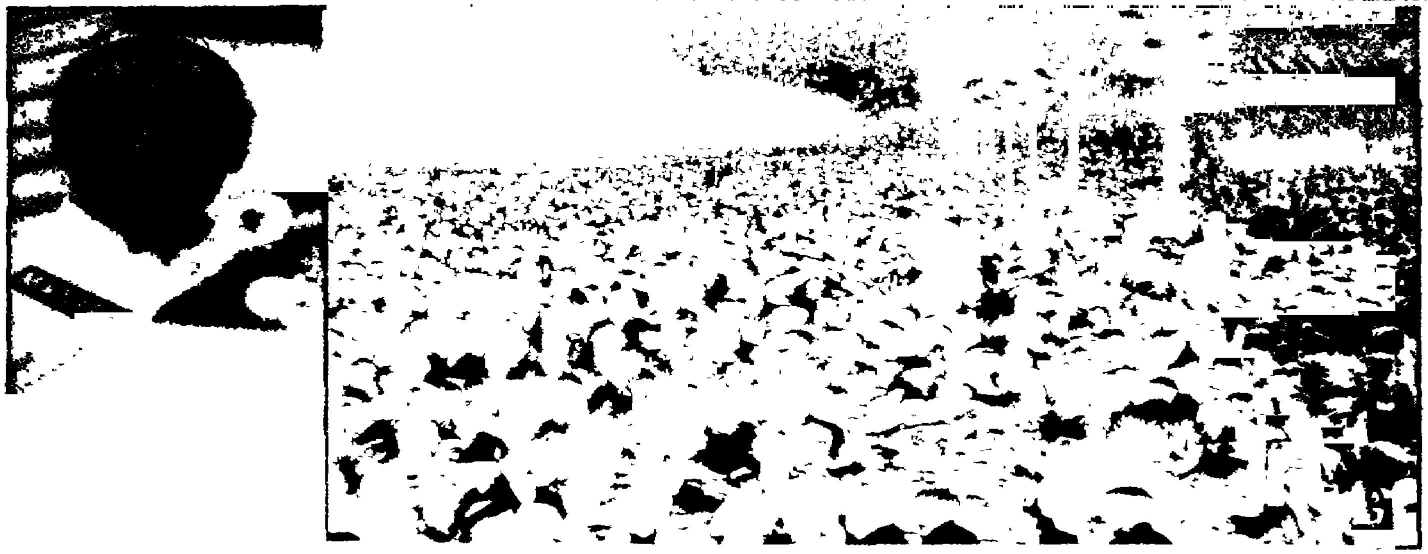
عالمی شہرت یافتہ ماہر فن لٹین کے خواب کی تعبیر نئی دہلی کے قلب میں واقع بوٹ کلب کے لان سے ایک تاریخ وابستہ ہے۔ یہ ہرا بھرا میدان ہندوستان کی حالیہ تاریخ کے دوران منعقد ہونے والے عظیم عوامی



اجتماعات کا گواہ ہے۔ انڈیا گیٹ جس کا سنگ بنیاد ۱۹۲۱ میں ڈیوک آف کناٹ نے رکھا تھا ۷۰ ہزار ہندوستانی فوجیوں کی شہادت کی یادگار ہے جنہوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران افریقہ فرانس اور دیگر ملکوں میں اپنے وطن کے لیے نہیں بلکہ اس سامراج کے تحفظ کے لیے اپنی جانیں قربان کی تھیں جسے بیرونی آقاؤں نے ان کے سر پر صدیوں میں مسلط کیا تھا۔ اس لان کے مغرب میں پرشکوہ راشٹرپتی بھون اور نارتھ ورائٹ بلاک [illegible] کی

تقدیر کا فیصلہ کرنے والے رہا کرتے تھے۔ راج پتھ جو ان لانوں کو دو مساوی قطعات میں تقسیم کرتا ہے پہلے کبھی شاہی رہگزر ہوا کرتا تھا۔ لٹین نے شہر کے اس حصے کی تعمیر میں اپنے تخیل کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ان لانوں کا شکوہ جس کے مشرق و مغرب دونوں طرف تاریخی یادگاریں قائم ہیں، اتنی بے دردی کے ساتھ ملک کے دور دراز دیہی علاقوں میں دھوتی اور پگڑی زیب تن کیے لاکھوں برہنہ پا یا پھٹے جوتوں والے لوگوں کے پاؤں تلے روندا جائے گا۔

وہ پیشین گوئی بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ان میدانوں کو حکمراں پارٹی عوامی مقبولیت اور حزب اختلاف اپنے احتجاج کے مظاہروں کے لیے استعمال کریں گے۔ اس سلسلے کا آغاز ۱۹۵۹ء میں ہوا جب کمیونسٹوں نے ملک میں اپنی واحد ریاستی حکومت کی برخاستگی کے خلاف مظاہرہ کیا۔ مسز گاندھی نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہندوستانی عوام ان کی قیادت کے ساتھ ہیں ۱۹۷۱ء میں ان ہی میدانوں پر مجمع لگایا۔ جے پرکاش نرائن نے ۱۹۷۵ء میں انہیں تاریخی میدانوں پر شاید ہندوستان کی تاریخ کی ایک بے نظیر ریلی سے خطاب کیا۔ چرن سنگھ نے جنتا حکومت کے دنوں میں یہ دکھانے کے لیے کہ عوام صرف انہیں کے ساتھ ہیں اور صرف وہی ملک کا وزیر اعظم ہونے کے اہل ہیں ان میدانوں پر بھیڑ جمع کی۔ راجیو گاندھی نے بھی یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان کے مخالفین میر جعفروں اور جے چندوں کی طرح ان کی قیادت کے تحت چلنے والے ملک میں عدم استحکام پیدا کرنا چاہتے ہیں



۱۶ مئی ۱۹۸۷ء مضامسی روایت کو آگے بڑھایا۔
اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان ریلیوں میں شامل ہونے والوں کی اکثریت ناخواندہ اور بھولے بھالے کسانوں کی ہوتی ہے۔ یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ ان ریلیوں میں کوئی بھی اپنی مرضی اور اپنے خرچ سے شامل نہیں ہوتا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں بسوں اور ٹرکوں میں بھر کر لائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی یہاں ہونے والی تقریروں کو سننے یا سمجھنے سے دلچسپی نہیں ہوتی ان میں ہر ریلی پر لاکھوں اور شاید کروڑوں کا خرچ آتا ہے۔ ریلی اپوزیشن کی ہو تو ٹرانسپورٹ والوں کو پورا کرایہ ادا کرنا ہوتا ہے لیکن حکمران پارٹی کی ریلی میں صرف پٹرول کا بل ہی ادا کیا جاتا ہے۔ ان ریلیوں کے شرکاء گھر لوٹ کر کچھ زیادہ دانشمند ہو جاتے ہوں ایسا بھی نہیں ہے۔ ان کے شرکاء میں سے کسی کی بھی کوئی وابستگی نہیں ہوتی۔ اکثر لوگ ان ریلیوں میں اس طرح شریک ہوتے ہیں جیسے کوئی میلہ یا تماشہ دیکھنے جا رہے ہوں۔ ان ریلیوں میں مقرروں اور سامعین کے مابین کوئی رابطہ قائم نہیں ہو پاتا۔ مجھے ان جیسے کم از کم دو بڑے ساحتوں کے مشاہدے کا موقع ملا ہے۔ ایک چرن سنگھ والا اور دوسرا ۱۶ مئی کو راجیو گاندھی والا۔

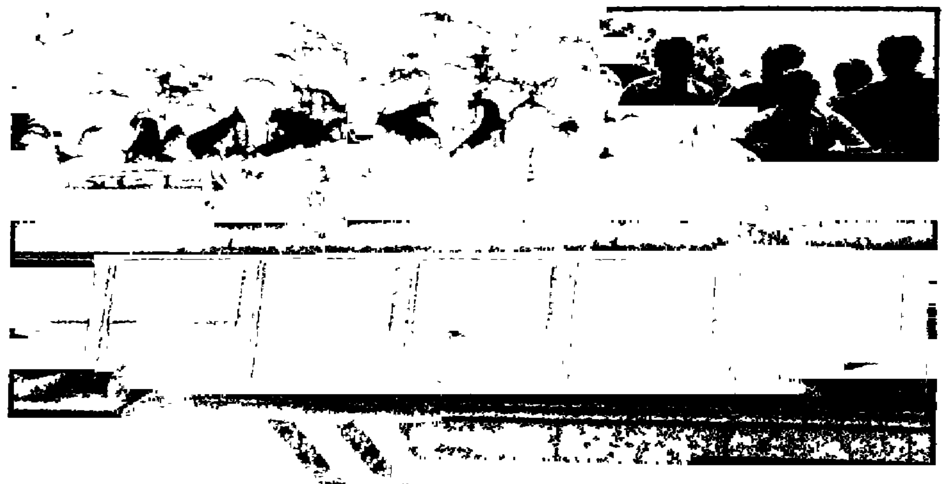
جس روز چرن سنگھ والی ریلی تھی میں علی الصباح ہی گھر سے نکل پڑا۔ باہر ایک دلچسپ منظر میرا منتظر تھا۔ مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل لوگوں کا ایک ... [illegible]

بوڑھے جانوروں کے ریوڑوں کی طرح گڈریوں کے ذریعے ہنکائے جا رہے تھے۔ اپنی بغل میں کھانے کی پوٹلیاں دبائے اور کمبلوں میں لپٹے انسانوں کی دو سے پانچ لاکھ تک کی بھیڑ بوٹ کلب کے میدانوں میں جمع تھی جسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ لیڈر کیا کہہ رہا ہے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ اگر ان کا گڈریا غائب ہو جائے تو اس شہر نا پرساں میں وہ کدھر جائیں گے کیونکہ ان کی جیبوں میں اتنا پیسہ نہیں تھا کہ اپنے طور پر واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ اگر رات کو قیام کرنا پڑ جائے تو ان کے پاس کھانے کے پیسے نہیں تھے۔ انسانوں کے ساتھ اس سے زیادہ بے رحمانہ مذاق اور کیا ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ ان کے یہاں جمع ہونے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ چرن سنگھ کے تقریر کرنے سے قبل ہی لاکھوں لوگ اٹھ کر جا چکے تھے سوائے ان کے جو اگلی قطاروں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ چرن سنگھ کی آدھے گھنٹے کی تقریر کو شاید ہی کسی نے سنا یا سمجھا ہو۔ صرف ایک گھنٹے کے اندر اندر سارا تماشہ ختم ہو چکا تھا اور اس کی پیدا شدہ ذہنیں باقی رہ گئی تھیں۔ کچھ کے لیے یہ ایک ڈراؤنا خواب تھا اور کچھ کے نزدیک ایک یادگار سیاسی زندگی کا آغاز لیکن یہ



خیال صرف گاڑیوں کا تھا، گلے کا نہیں۔

میں ۱۶ مئی والی دلی کا بے چینی سے منتظر تھا خیال تھا کہ اس میں آنی ہی بھیڑ دیکھنے کا موقع ملے گا اس روز میں وہاں صبح دم ہی پہنچ گیا تھا راجپتھ کے دونوں جانب کرسیاں بچھی ہوئی نظر آئیں۔ تمام علاقہ چاروں طرف سے گھیر دیا گیا تھا پھر لوگ آنے شروع ہوئے۔ گروہوں اور جھنڈوں کی شکل میں جیسے جانوروں کے گلے کو گھیرا ہانکتا ہے اسی طرح ان گروہوں کے سربراہ



بھی تھے۔ ہر گروہ یا تو بس سے اترتا تھا یا ٹرک سے لوگ یا تو پا پیادہ تھے یا پھٹے پرانے جوتے یا ہوائی چپلیں پہنے ہوئے۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ان لوگوں کے چہروں پر افلاس حکمراں تھا۔ ان کے پاس کھانے کے لیے روٹی اور چٹنی تھی۔ انہیں دیکھ کر مارکس کا یہ قول بالکل درست معلوم ہوا کہ پارلیمانی جمہوریت بورژوا طبقے کی تانا شاہی کا پردہ ہے۔ میں اس بھیڑ میں ایک کانگریسی کارکن کی طرح شامل ہو گیا اور متعدد گروہوں اور ان کے لیڈروں سے گفتگو کی میں نے ان میں سے ایک کو سگریٹ پیش کی جسے فوراً ہی قبول کر لیا گیا۔ "بھائی صاحب آپ کہاں سے آئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "ہم رڑکی سے آئے ہیں۔" اس نے کہا۔ "آپ کے گاؤں کا کیا نام ہے"۔ جواب ملا "ماجرا"۔ "آپ کے ساتھ اور کون کون آیا ہے" میں نے اس کے ساتھ بیٹھے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے کہا "یہ سب لوگ بھی میرے ساتھ ہیں۔" میں نے کہا کہ میں بھی کانگریسی ہوں۔ راجوری گارڈن میں چھوٹی سی پنساری کی دوکان کرتا ہوں۔ میں بھی اپنے علاقے میں کانگریس کا صدر ہوں لیکن وہاں کے لوگوں نے میرے ساتھ ریلی میں آنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ کانگریس کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ کے علاقے کا کیا حال ہے؟ اس کے جواب میں گروپ کے ترجمان پرتھوی سنگھ نے کہا "بھائی صاحب، ہمارے یہاں بھی یہی حال ہے۔" میں نے پوچھا "ان لوگوں نے ہمیں ریلی میں شرکت کرنے کے لیے کیوں بلایا ہے؟" اس نے کہا کہ "سیدھی سی بات ہے وہ یہ کہ راجیو گاندھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ بھی لوگ ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ دل سے کانگریسی ہیں۔ اس نے کہا "نہیں" ہمارے گاؤں کے مکھیا نے ایک روز قبل کہا کہ وہ ایک بس بھیجے گا اور ہم سب لوگوں کو دہلی پہنچنا ہے۔ لیکن گاؤں کے سارے لوگ نہیں آئے۔ بس کی صرف ۱۵ سیٹیں بھری تھیں۔ باقی خالی آئیں۔ میں نے کہا "آپ لوگوں نے کچھ کھایا بھی یا نہیں۔ میں تو صبح سے بھوکا ہوں۔ میرے علاقے کے آرگنائزر نے مجھ سے بھرپیٹ ناشتہ کرانے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ کہیں بھی نظر نہیں آرہا ہے" اس نے کہا کہ ہمارا آدمی اچھا تھا۔ اس نے ہمیں چلنے سے پہلے بھرپیٹ کھانا کھلایا۔ راستے میں پوری اور کڑھا کھلایا اور واپسی پر بھی اچھا کھانا دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ اس سے پہلے بھی کسی ریلی میں آئے ہیں۔ "ہم چرن سنگھ کی ریلی میں آئے تھے" اس نے جواب دیا۔ "کیا اس میں بھی اچھا کھانا ملا تھا" میں نے پوچھا۔ "ہاں، انہوں نے ہمارا کافی خیال رکھا تھا۔"

راجیو گاندھی ابھی تک اسٹیج پر نہیں آئے تھے اتنے میں وہ لوگ اٹھ کر جانے لگے۔ میں نے پوچھا "آپ لوگ کہاں چلے"۔ انہوں نے کہا کہ ہم گھر جا رہے ہیں کیونکہ اگر جلدی نہ گئے تو گھر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ "کیا آپ لوگ وزیر اعظم کی تقریر نہیں سنیں گے" میں نے پوچھا ان کا جواب تھا "نہیں! اس کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ ہمیں معلوم ہے وہ کیا کہیں گے۔"

میں آگے بڑھا تو کوئی آدھا درجن عورتیں وحشت میں دوڑتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے انہیں آواز دے کر پوچھا "بہن جی آپ کیا ڈھونڈھ رہی ہیں" "بھائی صاحب ہمارے تھیلے اور روٹیاں پولیس والے لے اپنے پاس



رکھ لی ہیں"۔ وہ بولیں میں نے ان کو دلاسا دیا اور بتایا کہ میں بھی کانگریسی ہوں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئی ہیں۔ "مرادآباد سے" انہوں نے بتایا "آپ نے کچھ کھایا" میں نے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ کھانے کی بات تو دور رہی جو کچھ لائے تھے وہ بھی چلا گیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ وزیراعظم کی تقریر کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا نہیں کیونکہ ہمارے پاس تقریر سننے کا وقت نہیں ہے ہمیں تو اپنے تھیلے لینے ہیں بس انچارج کو تلاش کرنا ہے اور شام سے پہلے گھر پہنچنا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے یہاں آنے کا مقصد کیا تھا۔ وہ بولیں کہ گاؤں کے پردھان نے آنے کے لیے کہا تو ہم لوگ آ گئے۔ ہمارا کام پورا ہو گیا تو ہم واپس جا رہے ہیں۔

اور آگے چل کر مجھے دھوپ کا چشمہ لگائے ایک خوش لباس شخص نظر آیا۔ وہ گوالیار کا چندرا ٹھاکر تھا۔ اس کے پاس جا کر میں نے پوچھا کہ گوالیار سے دہلی آنے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ۱۵ گھنٹے۔ میں نے پھر پوچھا "آپ گوالیار سے کب روانہ ہوئے تھے"۔ اس نے کہا "ہم نے رات بھر سفر کیا ہے"۔ وہ تھکن سے چور تھا اور چشمے کے پیچھے اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں دیکھی جا سکتی تھیں۔ اس نے پوچھا کہ آپ کہاں کے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرا تعلق راجوری گارڈن سے ہے لیکن ویسے میں مغربی پاکستان کا ہوں۔ اس نے کہا کہ تمام پنجابی جن سنگھی ہوتے ہیں۔ "مجھے چھوڑ کر" میں نے جلدی سے لقمہ دیا۔ اس نے کہا کہ وہ بھی ۲۵ برسوں تک پکا جن سنگھی رہ چکا ہے لیکن بعد میں کانگریس میں شامل ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کتنے لوگوں کو لے کر آئے ہیں۔ اس نے کہا کہ تقریباً ۳۰۔ "وہ لوگ [illegible]" میں نے پوچھا۔ جواب میں اس نے ایک درخت [illegible] سوتے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر باتوں [illegible] میں ہم لوگ آگے بڑھے اور ایک ایسی جگہ کھڑے ہو گئے جہاں سے بلٹ پروف شیشوں کے پیچھے موجود راجیو گاندھی کا چہرہ دیکھا جا سکے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے علاقے میں کانگریس کی کیا پوزیشن ہے۔ اس نے کہا کہ مدھیہ پردیش میں لوگ زیادہ ناخوش ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ انہی لوگوں نے خوب پیسہ کمایا ہے اور اب یہ لوگ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ہم کانگریسی ہیں اس لیے ہمیں لوگوں کو جمع کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔

اسٹیج کے اطراف کوئی ۵۰ ہزار لوگ رہے ہوں گے جو کئی گھنٹوں سے تپتی ہوئی دھوپ میں بیٹھے تھے۔ پاس ہی ایک جوڑا نظر آیا جو کسی جھگی جھونپڑی کالونی کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے خاتون سے سوال کیا کہ آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں۔ اس نے کہا کہ ہم جمنا پار سے آئے ہیں۔ "کھانے کو کچھ ملا" میں نے پوچھا۔ خاتون نے کہا کہ بس میں سوار ہونے سے پہلے ہم کو ناشتہ کرایا گیا تھا۔ میں نے ہجوم میں دوسرے بہت سے لوگوں سے بھی گفتگو کرنی چاہی مگر سب عجیب دہشت کے عالم میں تھے۔ راجیو گاندھی کی تقریر کے دوران ہی آدھے سے زیادہ لوگ اپنی اپنی بسوں کی طرف کوچ کر چکے تھے اس خوف سے کہ کہیں ان کی بسیں انہیں بے بس نہ کر جائیں۔

کیا راجیو گاندھی کے لیے یہ ریلی ضروری تھی؟ ان کے پاس ۵۴۳ میں سے ۴۰۰ سے زائد ممبران پارلیمنٹ ہیں۔ وہ ۸۰ کروڑ ہندوستانیوں کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کم از کم ۴۰ کروڑ لوگ ان کے پیچھے ہیں۔ ملک کے دور دراز علاقوں سے دو تین لاکھ لوگوں کو دھلی بلانے کی کیا وجہ تھی۔ ایسے لوگ جنہوں نے ان کی بوٹ کلب کی تقریر کو ٹھیک سے سنا بھی نہ ہو ان کے پیغام کو کس حد تک عام کرنے کے اہل ہیں۔ کیا راجیو گاندھی ٹی۔ وی یا ریڈیو کے ذریعے عوام سے خطاب نہیں کر سکتے تھے جن کے ذریعے اس تعداد سے کم از کم دو سو گنا زیادہ لوگوں تک ان کے خیالات پہنچ سکتے تھے یہ بات بھی ناقابل فہم ہے کہ اتنی کثیر رقم آخر کس مقصد کے لیے صرف کی گئی۔ کیا یہ خرچ ان فضول خرچیوں میں شامل ہیں جن کے الزامات اکثر و بیشتر حکومت پر لگائے جاتے رہے ہیں۔ مسٹر راجیو گاندھی کے صلاح کار کون لوگ ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں جو سابق وزیر دفاع کے خلاف نعرے بازی کے ذریعے ان کو اور زیادہ فروغ دے رہے ہیں۔ یہ چند ایسے اہم سوالات ہیں جن کے جواب [illegible]

ایک تماشائی کی حیثیت سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ۱۶ مئی کی ریلی ایک کار فضول تھی۔ یہ ایک بے معنی اقدام تھی۔ ریلی نے راجیو گاندھی کی شخصیت اور ان کی قدر کو داغدار زیادہ کیا ہے اور فائدہ تقریباً نہیں پہنچا۔ وقت کسی طرح سے انتقام لیتا ہے اور مجھے خوف ہے وقت نے اپنا انتقام لے لیا ہے۔



### وزیراعظم کا اگلا قدم ؟

# آزمائش کی گھڑی

اعجاز اشرف

آج کل بساط سیاست پر راجیو گاندھی اور وی پی سنگھ مکمل فن کارانہ مہارت اور ہوشیاری کے ساتھ اپنی اپنی چالیں چلتے ہوئے ایک دوسرے کو مات دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ سیاسی فضا میں دلوں کا غبار چھایا ہوا ہے اور انتقامی سرگرمیاں اپنے عروج پر ہیں۔ اخبارات اور بھانت بھانت کے سیاست باز بھی اس شاہی معرکے میں کود پڑے ہیں۔ سیاسی اخلاقیات کسی تاریک گوشے میں دبکی پڑی ہے اور ملک پھٹی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

اس سیاسی تناتنی نے ۱۷ مئی کو ایک نیا رخ لے لیا۔ اس دن جیسے دہلی کی تمام سڑکیں بوٹ کلب کی طرف جارہی تھیں جہاں وزیراعظم کو ایک ریلی سے خطاب کرتے ہوئے ملک کے خلاف عدم استحکام کی سازشوں کو بے نقاب کرنا تھا۔ راجیو گاندھی کی تقریر برق صفد سے بھری ہوئی ضرور تھی لیکن اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ گزشتہ تین ماہ کی سیاسی اتھل پتھل کے پس پشت کارفرما اسی ہمہ موجود غیرملکی ہاتھ کا ذکر تھا جسے بار بار دہرایا جاچکا ہے۔ ضرورت سے زیادہ جوش یا گھبراہٹ میں انہوں نے اپنے بعض سیاسی حریفوں کے کردار کو داغدار کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس بات پر کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ ریلی کے لیے جس موقع کا انتخاب کیا گیا تھا اس کے پیش نظر اس قسم کی باتوں کا ہونا بعید از قیاس نہیں تھا۔

ریلی کا دن خاص ذہانت کے ساتھ پورا سیاسی حساب کرنے کے بعد طے کیا گیا تھا۔ اس کے چند روز پہلے ہی پارلیمنٹ کا رواں اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ختم ہوچکا تھا۔ اس کے سبب حکومت ایوان میں ہونے والے پریشان کن سوالات سے محفوظ ہوگئی۔ سب کو معلوم تھا کہ ریلی میں سرکاری مشینری استعمال کی جائے گی اور کانگریس کے مخالفین کو غیرملکی طاقتوں سے ساز باز کیے ہوئے وطن دشمنوں کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ پارلیمنٹ کے جاری نہ ہونے کے سبب وزیراعظم کو اپنے مخالفین کے خلاف



کچھ بھی کہنے کی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔

ریلی کا ایک اور مقصد بھی نظر آتا ہے وہ ہے ناراض افراد کی مخالفت کے منہ کو ہی کچل دینا۔ سیاسی تجزیہ نگار مستقل ان خطرات کے بارے میں چیخ رہے ہیں جو پارلیمنٹ کے رواں اجلاس کے اختتام اور صدارتی انتخاب کے درمیانی وقفے میں راجیو گاندھی کو درپیش ہو سکتے ہیں۔ سیاسی افق پر گیانی ذیل سنگھ کے ذریعے حکومت کو برخاست کرنے کے اپنے حق کے استعمال کرنے کا منحوس بادل بھی منڈلا رہا ہے لیکن صدر ایسا کوئی اقدام کرنے کی صرف اسی وقت سوچ سکتے ہیں جب وزارت عظمیٰ کا کوئی متبادل امیدوار موجود ہو اور انہیں اس کا موقع صرف

ایک شخص فراہم کرسکتا ہے۔ وہ ہے سابق وزیر دفاع۔ کانگریس میں صرف وی۔ پی۔ سنگھ ہی وہ واحد شخصیت ہے جسے عوامی حمایت حاصل ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ۱۷ مئی کی ریلی کو راجیو گاندھی نے اپنے متوقع حریف کو بدنام کرنے اور ساتھ ہی یہ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہیں۔

"آج کا مہاتما راجیو گاندھی" کے نعروں کے شور میں وزیراعظم اسٹیج پر وارد ہوئے جہاں سے انہوں نے آئین کے باغیوں اور دور حاضر کے میر جعفروں اور جے چندوں کو پھٹکارنا شروع کیا لیکن کیا میر جعفر اور جے چند کا تذکرہ عمداً تھا؟ اس کا جواب پہلے سے سکھائے پڑھائے پارٹی کارکنوں کے ذریعے لگائے گئے "وی پی سنگھ واپس جاؤ" کے نعروں سے ظاہر ہے۔ بیچارے وی پی سنگھ جو وہیں موجود تھے چپ چاپ رہے۔ پورے ریہرسل کے بعد کی گئی اس ایک گھنٹے کی تقریر نے وزیراعظم اور سابق وزیر دفاع کی سیاسی ہاتھاپائی کی نوعیت تبدیل کرکے رکھ دی ؟ اب دونوں حریف کھل کر سامنے آگئے ہیں۔

جنوری سے نئی دہلی کے سیاسی گلیارے ان دونوں کے درمیان پس پردہ کش مکش کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دونوں ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے اور ایک دوسرے کے تئیں اعتماد اور وفاداری کی قسمیں کھانے کا حربہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ مثلاً راجیو گاندھی نے وی پی سنگھ کو وزارت دفاع میں منتقل کرتے وقت ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا



تو وی پی سنگھ نے کہا کہ اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہونے میں انہیں وزیراعظم کا تعاون حاصل رہا ہے انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے اقتصادی جہاد کا مقصد پارٹی پالیسی پر عمل درآمد کرنا تھا لیکن بوفورس معاملے کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ اس معاملے میں ملوث دلال کی نقاب کشائی کی خاطر انکوائری کے قیام کے عوامی اعلان میں دو امکانات پوشیدہ تھے۔ یا تو وی پی سنگھ بہت زیادہ چڑھ گئے تھے یا وزیر اعظم کی جگہ لینے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

اس کا پورا امکان تھا کہ وہ گھر بیٹھ رہتے۔ انہیں اپنے زخموں کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن کانگریس کے نوجوان کارکن کسی اور ہی دھن میں تھے سیاسی دور اندیشی اور فہم سے عاری ان لوگوں نے ان پر الزامات کی بارش کر دی اور سنگھ کو اپنے غصے اور ناراضگی کا منہ کھولنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ انہوں نے پوری ہٹ دھرمی کے ساتھ اپنے آپ کو ایک شہید کے طور پر ابھارنا شروع کر دیا۔ کانگریسیوں کے ذریعے انہیں بے وقار کرنے کی ہر کوشش کے جواب میں



وزیراعظم راجیو گاندھی اور وی۔پی۔ سنگھ: وہ دن ہوا ہوئے جب۔۔۔۔

ایسا کوئی بھی نہ ہوگا جو شخص کی دیانتداری اور کردار پر شک کرتا ہو لیکن سیاسی آرزومندی کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ مستعفی ہونے کے بعد وی پی سنگھ نے سیاسی گمنامی میں چلے جانا گوارہ نہیں کیا وہ اتر پردیش کے دورے پر نکل پڑے۔ ان دوروں کا مقصد تفریح یا آرام کرنا بتایا گیا لیکن دراصل ان کے ذریعے پوری شائستگی کے ساتھ عوامی حمایت کا اندازہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ وی پی سنگھ کے اقتصادی جہاد میں وزیراعظم کے قریبی افراد کو شکار کرنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ ممکن ہے یہ محض اتفاق رہا ہو لیکن فیرفیکس کی خفیہ کارروائی سے اس امکان کی نفی ہوتی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وی پی سنگھ وزیر اعظم کے ایک ایماندار اور پاک و صاف حکومت کے ہتھیار کو خود انہیں کے خلاف استعمال کر رہے تھے لیکن پھر بھی سنگھ کی پالیسی کو مشکوک، گمراہی کا شکار اور غیر ضروری قرار دینا عوامی زندگی کی اخلاقیات اور قانون کے روبرو ہر شخص کی برابری کی آئینی ضمانت پر یقین کی صریح خلاف ورزی کے مترادف ہوگا۔

کابینہ سے وی پی سنگھ کے اخراج کے بعد وی پی سنگھ نے اپنی بے گناہی اور معصومیت کو پیش کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ رائے عامہ نے سنگھ کا ساتھ دیا اور عوام نے ایک وفادار کانگریسی کارکن کے مقابلے ایک دیانت دار شخص کو ترجیح دی۔

لہٰذا وی پی سنگھ کا میر جعفر اور جے چند سے موازنہ کرنا راجیو گاندھی کے حق میں اچھا نہیں ہوا ان کی تقریر لکھنے والے آخر اس سے کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے؟ ناخواندہ عوام کی اکثریت اس قسم کے تاریخی حوالوں سے واقف تک نہیں ہے۔ خواص کے نزدیک اس موازنے کا مطلب ایک ایسے شخص کی بے عزتی کرنا ہے جو دیانت داری اور وطن پرستی کا بے داغ کردار رکھتا ہے۔ اس کے مخالفانہ ردعمل سے خود کانگریسی قیادت بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔

اس موازنے نے وی پی سنگھ کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا اس مقصد کے ساتھ کہ "میرے پاس اپنے وقار کے سوا اور کچھ نہیں جس کا تحفظ کیا جائے"۔ انہوں نے جوابی حملے کے طور پر اعلان کیا کہ میر جعفر اور جے چند وہ لوگ ہیں جنہوں نے

[illegible] خاص دیانت
کے ساتھ پوری [illegible]
[illegible]
اس کے چند روز قبل ہی
[illegible]
[illegible]
ختم ہو چکا تھا [illegible]
[illegible]
[illegible]
ہو گئی تھی۔

غیر ملکوں میں دولت جمع کر رکھی ہے یہی لوگ ملک کی آزادی اور سالمیت کا سودا کر رہے ہیں سنگھ نے فیئر فیکس کے تیئں حکومت کے دوغلے رویے کی ملامت بھی کی کیوں کہ اس نے ابھی تک اس سراغ رساں ایجنسی کے ساتھ معاہدہ ختم نہیں کیا ہے۔

ایسا لگتا ہے سنگھ کو پارٹی سے خارج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مختلف کانگریسی وزراء اور لیڈروں کے بیانات اور ان کے جوڑ توڑ اس کا ثبوت ہیں۔ کانگریس (آئی) کے ایم۔ ہوئے کہا گیا کہ "وہ اپنی غداری اور عہد شکنی کو اقتصادی مجرموں کے خلاف اس جنگ کا نام دینے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں جس کے تحت سرکاری فائلوں کی چوری کی اجازت دی گئی اور ان فائلوں کی تفصیلات چوری چھپے برطانیہ اور سویڈش ریڈیو کے استعمال کے لیے ملک کے باہر بھیج دی گئیں۔ وفور جوش میں لاشعوری طور پر وہ بوفورس معاملے میں حکومت کے ملوث ہونے کا ثبوت بھی فراہم کر گئے ظاہر ہے کہ جس معاملے کا کوئی وجود ہی نہ ہو اس کی تفصیلات فائلوں تک وی پی سنگھ کو پارٹی سے خارج کیوں نہیں کیا گیا۔

کانگریسی قیادت کے ایسا کرنے کا ایک بڑا سبب ملک کا موجودہ سیاسی منظر نامہ ہے۔ ریاستی انتخابات میں شکست نے اس خیال کو فروغ دیا ہے کہ راجیو گاندھی ووٹ کھینچنے والی کرشماتی شخصیت کھو چکے ہیں۔ ہمارے سیاسی لیڈر موقع پرست ہیں۔ اور قائد کے کمزور ہوتے ہی وفاداریاں بدلنی شروع کر دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر سیاسی لوگ ہوا کے رخ پر چلتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا مبالغہ آرائی نہیں کہ متبادل مرکزی



شروع میں کانگریس
کے ممبران وی پی سنگھ
سے کتراتے تھے۔ لیکن اب
حالات بدلتے نظر آرہے ہیں



پی۔ کلپ ناتھ رائے کے نزدیک سنگھ کا جوابی حملہ ملک کے منتخب لیڈر راجیو گاندھی سے غداری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں بخرہبت اللہ کا کہنا ہے کہ کرپشن مخالف پروگرام میں کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اس کے ذریعے وی پی سنگھ نے ذاتی شہرت کمانے کی کوشش کی سب سے زیادہ بھیانک الزام مرکزی وزیر کے تیواری نے لگایا۔ سیاسی فراست سے بالکل عاری اس بیان میں وی پی سنگھ پر الزام لگاتے ہیں کیسے آسکتی ہیں۔ ایسے بچکانہ تبصروں سے سنگھ صاحب کا سیاسی فائدہ اٹھانا قرین قیاس ہے۔

وی پی سنگھ نے براہ راست عمر شاقی کے ساتھ راجیو کی قیادت اور ان کے اعتبار کو چیلنج کیا ہے اور ایک پاک و صاف حکومت قائم کرنے کے ان کے دعووں کی پول کھول دی ہے۔ گزشتہ ایک یا دو دہائیوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کانگریس میں مخالفانہ خیالات کو برداشت کرنے کا مادہ نہیں ہے۔ اس پس منظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابھی



اب قائد
کو
مشوروں
کی
ضرورت نہیں

قیادت دیکھتے ہی اب تک خاموش پڑے ہوئے طوطا چشم ممبران کھل کر میدان میں آجائیں گے۔ راجیو گاندھی بلاشبہ وی پی سنگھ صاحب کو ایسا مرکز نہیں بنانا چاہیں گے۔ یہ درست ہے کہ مرکزی لیڈروں میں سنگھ صاحب کو زیادہ حمایت حاصل نہیں لیکن دوسری طرف ریاستوں کی سطح پر پارٹی تنظیم کی صفوں میں راجیو کے مستقل حامی بھی بہت زیادہ نہیں ہیں۔ مثلاً یہ بالکل ضروری نہیں کہ اتر پردیش کے ایم۔ پی اور اسمبلی کے ممبران کسی بحران کے لمحے میں راجیو کا ساتھ دیں۔ مزید برآں، دل بدل قانون کے سبب کانگریسی ممبران اپنے دل کی بات ظاہر کرنے سے محروم ہو گئے ہیں۔ پارٹی سے اخراج کا مطلب ہے سیاسی حکومت اور کانگریسیوں نے بغیر کسی قائدے کے اپنی کشتیاں جلانا نہیں سیکھا ہے۔ ایسے میں پارٹی کی تقسیم ہی واحد راستہ ہے۔ اس لیے جب بھی اس کا موقع آئے گا لوگ کھل کر سامنے آجائیں گے۔ اسی امکان نے وی پی سنگھ کے اخراج کو روک رکھا ہے۔

سنگھ صاحب کے اخراج کی راہ میں ہریانہ کے انتخابات بھی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ یہ انتخابات شمالی ہند کے سیاسی مستقبل کے رخ کی نشان دہی کریں گے۔ ہریانہ میں کانگریس کی شکست بڑی سی

ریاستوں میں کانگریس مخالف رجحانات کو ہوا دے سکتی ہے۔ اس نازک گھڑی میں کانگریس اپنی مصیبتوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی۔ اس کے حساب کے مطابق سنگھ صاحب کا گھر کے اندر ہی لڑتے جھگڑتے رہنا زیادہ اچھا ہے۔ پارٹی سے خارج وی پی سنگھ ایک ایسے آزاد لیڈر رہوں گے جو حکومت کے قول وفعل کے تضادات کو بے نقاب کر کے ایک نئی آفت کھڑی کر دیں گے۔ اس کے علاوہ اس اقدام کے سبب سنگھ صاحب کو جو عوامی ہمدردی حاصل ہوگی اس کی مدد سے وہ کانگریس کے غبارے کی تمام ہوا نکال کر رکھ دیں گے۔

یہ خیال بھی کہ وی پی سنگھ کے پاس وزیراعظم کے قریبی لوگوں کے خلاف تصدیق جرم کرنے والے ثبوت ہیں، انہیں پارٹی سے خارج نہیں ہونے دے رہا ہے۔ سنگھ صاحب برابر کہتے رہے ہیں کہ ان کے پاس بعض ایسی معلومات ہیں جنہیں وہ مناسب وقت پر ظاہر کریں گے۔ بعض کانگریسی ممبران نے ان پر کانگریسی لیڈروں کو بلیک میل کرنے کا الزام بھی عائد کیا ہے۔ سنگھ صاحب وار کرنے کے مناسب ترین موقع کے منتظر ہیں اسی خوف سے کانگریسی قیادت بے بسی کے عالم میں

> [illegible]
> چشم مسیران کھول کر
> سامنے آجائیں گے

سر جھکائے بیٹھی ہوئی ہے۔ دریں اثناء ایسے ثبوتوں کی تلاش بھی جاری ہے جن کے ذریعے سنگھ صاحب کے کردار کو داغدار کیا جا سکے۔

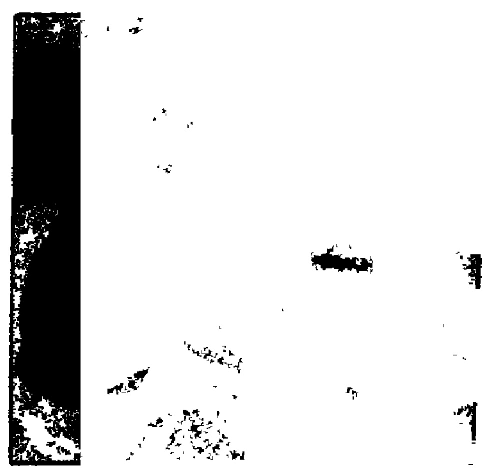
وی پی سنگھ اپنی جنگ ٹھیک دشمن کے خیمے پر لڑ رہے ہیں۔ جب تک یہ رسالہ قارئین تک پہنچے گا تب تک وہ گفتگو، گورکھپور اور بارہ بنکی میں کئی پر ہجوم ریلیوں سے خطاب کر چکے ہوں گے۔ گورکھپور اتفاق سے اتر پردیش کے وزیراعلیٰ کا وطن بھی ہے۔ ان تقریروں میں کیا ہوگا یہ ظاہر ہے۔ اقتصادی مجرموں کے خلاف سخت نفی طعن ہوگی اور ایسے عناصر کے خلاف کیے گئے جہاد کے اسباب بتائے جائیں گے۔ کانگریس پارٹی اس وقت ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ اس کے پاس وی پی سنگھ کو عوامی رابطے کے پروگرام سے باز رکھنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ اتر پردیش سے موصولہ خبروں کے مطابق رائے عامہ سابق وزیر کے حق میں ہوگئی ہے اس کا اظہار الہ آباد کی ریلی میں ہوا جہاں اس ضلع کے چار ایم ایل اے سنگھ صاحب کے ساتھ اسٹیج پر موجود تھے۔ شروع میں کانگریس کے ممبران ان سے کتراتے تھے لیکن اب حالات بدلتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

آئندہ دو ماہ راجیو گاندھی کے لیے سخت امتحان کے ہوں گے۔ لاحاصل مذمتوں اور تاریخ کے غداروں کے ساتھ موازنوں سے کام نہیں چلے گا۔ ممکن ہے راجیو گاندھی کو بعض تاریخی واقعات ازبر ہوں لیکن تاریخ کی حقیقی فہم بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ بنگال کے نواب اقتدار سے اس لیے محروم ہوئے تھے کہ وہ ایک سڑے گلے نظام پر حکمرانی کر رہے تھے اور اس کی خرابیوں کو دور کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ میر جعفر اور جے چند ایسے ہی نظام کا لازمی عنصر ہوتے ہیں۔ لیکن کیا راجیو گاندھی تاریخ سے سبق لیں گے؟

# پنجاب: پھر دوراہے پر؟

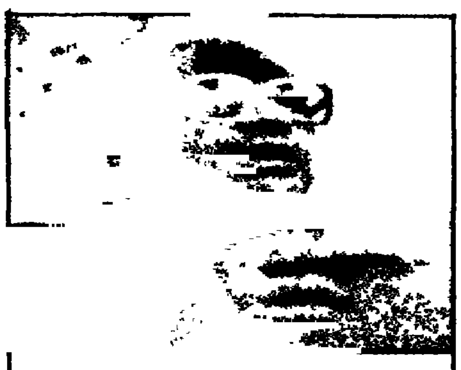
ڈی ڈی ٹھاکر

پنجاب میں سردار سرجیت سنگھ برنالہ کی سرکار کو ۱۱ مئی کو صدرِ جمہوریہ کے حکم سے برطرف کردیا گیا، اور اس بدقسمت ریاست میں ایک بار پھر صدر راج نافذ کردیا گیا۔ معاہدۂ پنجاب کے بعد اس تشویش ناک مسئلے کے حل کی جو ہلکی سی امید افق پر نظر آئی تھی وہ بھی غائب ہوگئی۔ اور ہم واپس اسی دوراہے پر کھڑے ہوگئے جہاں آپریشن بلیو اسٹار کے بعد کھڑے تھے۔



سردار سرجیت سنگھ برنالہ کی برخاستگی پر عوام میں متضاد رائے پائی جاتی ہے، ایک طبقہ تو یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ حکومت بہت پہلے برخاست کردی جانی چاہیے تھی تاکہ جو خونریزی اتنے عرصہ تک ہوتی رہی اس سے عوام چھٹکارا پا جاتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صدر راج سے ہی پنجاب میں حالات سدھر سکتے ہیں۔ دوسرا طبقہ یہ رائے رکھتا ہے کہ پنجاب میں صدر راج نافذ ہونے سے حالات اور زیادہ دگرگوں ہوجائیں گے اور آخر وطن دشمن طاقتوں کو ہی تقویت ملے گی۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ مسئلۂ پنجاب ایک گمبھیر سیاسی مسئلہ ہے، جس کو الجھانے میں غیر ملکی طاقتوں کا بھی ہاتھ ہے، اس لیے اس مسئلے کا حل محض گولی سے نہیں بلکہ سیاسی سوجھ بوجھ سے نکالا جانا چاہیے۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کی رائے میں صدر راج نافذ ہونا ضروری تو تھا مگر ایسا کرنے کے لیے جو وقت چُنا گیا وہ دراصل مرکزی حکومت نے فائدہ حاصل کرنے کے لیے چُنا۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے ۱۶ مئی کو بوٹ کلب لان میں اپنی تقریر میں ببانگِ دہل یہ کہا کہ وہ کسی بھی صورت میں ہندوستان کی پاک سرزمین پر خالصتان بنانے کی اجازت نہیں دیں گے انھوں نے یہ بھی کہا کہ مرکزی حکومت حالات کا جائزہ لیتی رہی ہے اور اگر ضرورت پڑے تو سخت اقدام کرنے کی جرأت بھی رکھتی ہے۔ انھوں نے اشارۃً کہا کہ ہندوستان کے اندر ایک لوہے کا ہاتھ ہے اور اگر ہندوستان کی نرمی سے کسی کو کوئی غلط فہمی مرکزی حکومت کی صحیح طاقت کے متعلق ہوجائے تو وہ ہندوستان کو اتار پھینک بھی سکتی ہے۔ ان واقعات کی روشنی میں پنجاب میں صدر راج کے نفاذ کے جواز کو پرکھا جانا چاہیے۔

وزیر اعظم راجیو گاندھی اور اکالی دل کے رہنما سنت ہرچند سنگھ لونگووال کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی بہت سی شرائط ہیں۔ ان شرائط میں ان تمام مطالبات کا حل موجود ہے جن کے لیے اکالی دل سالہا سال سے پنجاب میں تحریک چلا رہا تھا لیکن بدقسمتی سے اس معاہدے کی کسی بھی شرط کی تکمیل نہ ہوسکی۔ چنڈی گڑھ کا مسئلہ آج بھی حل طلب ہے۔ دریائی پانی سے متعلق کمیشن کی رپورٹ ابھی تک ظہور میں نہیں آئی ہے متھیو، وینکٹ رمیا اور دیسائی کمیشن کے باوجود ہریانہ و پنجاب کے اندر زمینی حدود کا مسئلہ طے نہیں ہوپایا۔ اکالی دل اور اس کے رہنماؤں نے اس معاہدے کی شرائط کی تکمیل کے لیے بسا اوقات مطالبہ کیا لیکن ان کا یہ مطالبہ پورا نہیں ہوسکا۔ پنجاب کے سکھ عوام میں یہ احساس پیدا ہوا کہ دراصل مرکزی سرکار کے ارادے معاہدے کے سلسلے میں



سدھارتھ شنکر رے

نیک نیتی پر مبنی نہیں تھے۔ اس کے نتیجے میں سردار سرجیت سنگھ برنالہ اور اکالی دل تنظیم کا اثر بھی مقابلتاً کم ہوا، جماعت کے اندر بھی بغاوت ہوئی اور ریگ بھگ پچیس ممبران اسمبلی سردار پرکاش سنگھ بادل کی سرکردگی میں اکالی دل سے علاحدہ ہوگئے۔ انھوں نے عوام کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی اور بادل صاحب کے اندر پولیس کے داخلے کو بہانہ بناکر مرکز کے خلاف ایک بھرپور مہم کا آغاز کیا، لیکن برنالہ اور ان کے ۲۷ ممبران اسمبلی نے انتہا پسندوں کا



پوری شدت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اکال تخت سے حکم نامہ جاری ہوا کہ برنالہ اور ان کے ساتھی اکالی دل کے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں جس کا براہ راست اثر یہ ہو سکتا تھا کہ سکھ مذہب کے مختلف سیاسی طبقے متحد ہو کر مرکزی سرکار کے خلاف عوام کو بھڑکانے کی مہم شروع کر دیتے۔ سردار سرجیت سنگھ برنالہ اور ان کے ساتھیوں نے حکم نامے کی تعمیل سے انکار کر دیا اور سکھ سیاست کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس امر کا اعادہ کیا کہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ رکھا جانا چاہیے، نیز یہ کہ اکال تخت کا حکم نامہ براہ راست اور بالواسطہ طور پر سیاسی امور میں بے جا مداخلت ہے۔ برنالہ اور ان کے ساتھیوں کی سارے ملک میں خوب تعریف و توصیف ہوئی، ان کو قومی ہیرو کا خطاب ملا۔ وزیر اعظم اور دوسرے قومی رہنماؤں نے ان کی عزت افزائی کی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ برنالہ حب الوطنی کی کسوٹی پر انتہائی قابلیت کے ساتھ پورے اترے ہیں۔ اس کے بعد بھی مہینے میں ایک دو بار وزیر اعظم اور دیگر مرکزی رہنماؤں نے اس بات سے قطعی انکار کیا کہ برنالہ سرکار کی برخاستگی زیر غور ہے بھارتیہ جنتا پارٹی کا برنالہ کی برخاستگی کا مطالبہ

پائیدار و مستحکم نہیں رہتی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد برنالہ وزارت کے کچھ ممبران کے خلاف یہ الزام لگایا گیا کہ وہ انتہا پسندوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے بچاؤ کے لیے سرکاری مشینری پر بھی دباؤ ڈالتے رہے ہیں۔ وزیر خزانہ سردار بلونت سنگھ کے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ انتہا پسند اجک دار سنگھ کی رہائی میں دلچسپی رکھتے تھے اور چونکہ اس کی رہائی میں وہ کامیاب نہیں ہوئے اس لیے وہ پولیس کے ڈائرکٹر جنرل کی مدت ملازمت میں توسیع کے خلاف تھے۔ لیکن ۱۲ مئی کی پریس کانفرنس میں ریبیرو نے اس واقعہ کو غلط قرار دیا تو بلونت سنگھ کے خلاف لگائے گئے الزامات غلط ثابت ہو گئے۔

جہاں تک سابق وزراء پریم سنگھ چندو ماجرا اور جربجن سنگھ سندھو، جن کو صدر راج نافذ ہونے کے ۴۸ گھنٹے کے اندر گرفتار کیا گیا، ان کا تعلق ہے تو کسی بھی مرحلہ پر ان کے خلاف کوئی ایسا الزام کھلم کھلا ظاہر نہیں ہوا ہے۔ اگر مرکزی یا ریاستی سراغرساں ایجنسیوں کے پاس ان سابق وزراء کے خلاف کوئی شہادت موجود تھی تو یہ انتظامیہ مشینری کے لیے لازم تھا کہ وہ ایسے افسوسناک اور بھیانک معاملے کو وزیر اعلیٰ یا مرکزی وزیر داخلہ

کہ ایسے وزراء کو وزارتی کونسل سے برطرف کر دیا جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوا، نہ ہی شہادت کو منظر عام پر لایا گیا جس کی بنا پر سرکار کو برطرف کیا گیا تھا یا جو سابق وزراء کی گرفتاری کا موجب بنی اس مرحلہ پر یہ کہنا کہ سابق وزراء کی گرفتاری معقول وجوہات پر مبنی تھی اگر ناممکن نہیں مشکل ضرور ہے تاہم چونکہ معاملہ عدالت میں زیر غور ہے اس لیے عدالتی فیصلے کے بعد معلوم ہوگا کہ یہ وزراء کس حد تک بے راہ روی کے مرتکب ہوتے تھے۔

جہاں تک مسئلے کے سیاسی پہلو کا تعلق ہے بادی النظر میں برنالہ سرکار کی برخاستگی نہ تو پنجاب کے لیے اور نہ ہی ملک کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ محض اس بنا پر کہ پنجاب میں قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہا، ایک عوامی منتخبہ سرکار کو برطرف نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرکار کو آئین کے مطابق چلانا ممکن نہیں رہا تھا۔ انتہا پسندی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کوئی جادوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا، ایسے مسئلے کے حل کے لیے یہ لازم تھا کہ مرکزی اور ریاستی سرکار کی انتظامیہ مشینری کے اعلیٰ اہل کار اپنی ذہانت، عقل اور تجربے کی بنا پر ایک جامع لائحہ عمل مرتب کرتے اور اسے عملی جامہ پہناتے۔ یہ یقین کرنا محال ہے کہ مرکزی وزارت داخلہ کو انتظامیہ مشینری میں کوئی دخل نہیں۔ یہ امر بھی قابل یقین نہیں کہ پولیس کے ڈائرکٹر جنرل نے کارروائی کرنی چاہی لیکن اسے وزارتی کونسل نے کارروائی کرنے سے روکا، جب کہ حقیقت تو یہ





ہے کہ پولیس کے معاملات میں وزارتی کونسل کا دخل نہ ہونے کے برابر تھا اور یہی وجہ تھی کہ وزارتی کونسل ڈائریکٹر جنرل کی مخالف ہوگئی۔ اور پولیس چیف اور وزارتی کونسل میں اختلافات بڑھ گئے، اس لیے یہ کہنا کہ صدر راج کے نفاذ سے حالات میں کافی حد تک تبدیلی آئے گی، بہت مشکل ہے۔ آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن، دمدمی ٹکسال اور یونائیٹڈ اکالی دل کے ممبران کی گرفتاری ان حالات میں پہلے ہی لازمی ہو چکی ہو لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ان کی گرفتاری سے دہشت پسندی میں کوئی فرق آئے گا بلکہ ایسے ماحول میں دہشت گردی کے بڑھنے کا امکان اور زیادہ ہے۔

سب سے زیادہ تشویش ناک سوال تو یہ ہے کہ آخر پنجاب کے مسئلے کا حل کیا ہے اس مسئلہ کو عوامی سطح پر ہی حل کیا جا سکتا ہے اور عوامی حکومت ہی اس مسئلے کے حل میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر صدر راج کا نفاذ اس مسئلے کے حل میں سدِ راہ بن سکتا ہے۔ دو فریقین کے اندر تناؤ کے بیج وسیع پیمانے پر بوئے جا سکتے ہیں۔

پنجاب کے سکھ عوام اپنی منتخب کردہ سرکار کی برطرفی پر کسی بھی صورت میں خوش نہیں رہ سکتے بلکہ یہ ان کی ناراضگی کا موجب ہو سکتا ہے کیوں کہ انھیں ایک سکھ جماعت کی سرکار سے محروم کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ تصور بھی دیا گیا کہ مرکزی سرکار پنجاب میں اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے آئندہ مہینوں اور برسوں میں ہندوستان کی مرکزی قیادت اور پنجاب کی قیادت کے درمیان تناؤ بڑھنے کے امکانات ہیں اور اگر ایسا ہوا تو مسئلہ کے اور بھی پیچیدہ ہونے کا امکان ہے جس سے ملک و قوم کو نقصان ہو سکتا ہے۔

حکومت پنجاب نے سابق وزراء کے محافظ ہٹانے کا فیصلہ کیا ہے، یہ فیصلہ درست نہیں۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ انتہا پسندوں نے اکالی دل کے لاتعداد ممبروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ برنالہ کی حکومت کے دوران سرکار اور انتہا پسندوں کے درمیان سخت محاذ آرائی رہی، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو محافظین کا ہٹایا جانا سابق وزراء اور ممبران اسمبلی کے لیے انتہائی خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

گورنر سدھارتھ شنکر رے اور مسٹر جے۔ ایف۔ ریبیرو دونوں تجربہ کار ہیں، ان سے امید ہے کہ وہ ان تمام مشکلات کے باوجود الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کریں گے۔



# مجھے ابھی ابھی ملازمت ملی ہے۔ میں ترقی کرنا چاہتا ہوں
# لیکن ماں کی ضد ہے کہ میں شادی کر لوں
# کیا کوئی انھیں سمجھا نہیں سکتا کہ
# شادی بیاہ کی ذمے داریاں ابھی میں نہیں اٹھا پاؤں گا؟



سُریش نے زندگی کے آنگن میں ابھی قدم رکھا ہی ہے اس پر ایک دم بوجھ ڈال دینا ظلم ہی تو ہوگا سُریش چاہتا ہے ابھی دو چار سال میں ایک طرف جی لگا کر ترقی کروں آگے بڑھوں۔ ادھر والدین بہو گھر لانے پر بضد ہیں یہ درست ہے کہ سُریش ملازمت کرنے لگا ہے، لیکن اگر اس کی شادی جلدی کر دی گئی تو وہ اپنے خواب پورے نہ کر پائے گا اسے سمجھدار اور بڑے ہونے کا موقع دیا جانا چاہئے تاکہ وہ ایک ذمے دار شوہر اور مثالی والد بن سکے

ذرا سوچئے، اگر سُریش کی چھوٹی عمر میں شادی کر دی گئی تو اس کی بیوی بھی چھوٹی عمر کی ہوگی، اور انھیں ذہنی اور جسمانی تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا

خیال رہے، آپ اپنے بچوں کی بھلائی چاہتے ہیں آپ کی جلد بازی کہیں ان کی خوش حالی اور صحت کو ہمیشہ کے لئے برباد نہ کر دے۔

## ڈاکٹر کی صلاح مانئے!

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ لڑکی کے بدن کی نشوونما ۱۸ برس کی عمر تک ہوتی رہتی ہے وہ 15 16 سال میں جوان ضرور دکھائی دیتی ہے، لیکن رحم اور پیڑو کی نشوونما ۱۸ برس تک ہوتی رہتی ہے اگر لڑکی ۱۸ برس سے کم عمر میں ماں بنے تو پریشانیاں پیش آتی ہیں

1. لڑکی کے بدن کی نشوونما رک جاتی ہے
2. ۱۸ برس سے کم عمر ماں کی اولاد کمزور اور کم وزن پیدا ہوتی ہے
3. ایسی کمزور اور کم وزن اولاد کی اکثر موت ہو جاتی ہے
4. کیونکہ ۱۸ برس کی کم عمر میں رحم اور پیڑو جیسے پوشیدہ اعضا کی نشوونما مکمل نہیں ہوتی، اس لئے حمل اکثر گر جاتا ہے ماں بننے میں بھی دقتیں پیش آتی ہیں
5. پیڑو کی نشوونما ۱۸ سال سے پہلے مکمل نہیں ہوتی اس لئے بچے کا سر پھنس سکتا ہے زچگی میں رکاوٹ سے اندرونی اعضا کو نقصان پہنچ سکتا ہے جس سے مثانے یا انتڑی میں کمزوری آ جاتی ہے
6. کم عمر میں مجامعت سے رحم کے دہانے میں کینسر کے امکانات سب سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ بھارتی عورتوں میں کینسر کی بڑی وجہ ہے

**یاد رکھئے بچی کے بچہ ہونا اس پر بھاری ظلم ہے**

**اٹھارہ برس سے پہلے لڑکی اور اکیس برس سے کم لڑکے کی شادی قانوناً جرم ہے**

مزید معلومات اور بلاقیمت کتابچے کے لئے اس پتے پر لکھئے: پوسٹ بکس نمبر 5420 • نئی دلی 110011

# ہریانہ
# انتخابی دنگل

ایم ایچ سیّد

ہریانہ کے واحد مقبول عوامی لیڈر اور سیاہ و لوک دل کے سالار دیوی لال کا بیانگ دہل اعلان ہے کہ "آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا مطلب ہے آل انڈیا کرپشن کارپوریشن اور ہم اس کو شکست دے کر ہی دم لیں گے۔" انھیں نہ صرف ہریانہ میں حکومت میں آنے کا یقین ہے بلکہ وہ عوام سے مرکزی راجیو سرکار کو اقتدار سے بے دخل کرنے کا وعدہ بھی کر رہے ہیں، لیکن وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس دور افتادہ منزل کے حصول کے لیے ابھی ایک طویل سفر درپیش ہے۔ اس کے لیے پہلے انھیں ہریانہ کو موجودہ وزیر اعلیٰ اور اپنے حریفِ اعظم بنسی لال کے چنگل سے چھینا ہوگا جس کے بعد ہی حزب اختلاف کے دیگر دھڑوں کے اشتراک سے تمام غیر کانگریسی طاقتوں کے اتحاد کو حقیقت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ "دہلی کے حکمرانوں" کو کرسیٔ اقتدار سے ہٹانے کا عمل اس کے بعد ہی شروع ہوگا۔ تاہم اس نعرے بازی کو موجودہ حالات کے پیش نظر محض ایک خواب سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

اس کے جواب میں روہتک کے ایک کانگریسی کارکن کا کہنا ہے کہ لوک دل دراصل لڑاکا دل ہے جو بہت جلد "لوٹ دل" میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس نے بڑی شدت کے ساتھ بنسی لال کی مدح و ثنا کرتے ہوئے کہا کہ "صرف وہی ہیں جو ہریانہ کو بچا سکتے ہیں۔ ہمیں پانی کی مناسب مقدار فراہم کر دی جائے تو ہم پنجاب کو زرخیزی اور خوشحالی میں میلوں پیچھے چھوڑ دیں گے۔" یہ الفاظ بنسی لال کے ہیں جن کے شانوں پر آئندہ اسمبلی انتخاب کے منہ زور طوفانی دھاروں کے درمیان سے اپنی پارٹی کی کشتی کو محفوظ کناروں تک پہنچانے کی تمام تر ذمہ داری آ پڑی ہے۔

... [illegible]

فلاح کا ذریعہ بن سکتی ہے۔" یہ اعلان ہے ہریانہ کانگریس کے سربراہ ہرپال سنگھ کا جو اپنے پیروؤں میں سردار صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ پنجاب سے آکر یہاں بسے ہوئے نرم گفتار سردار صاحب کو اپنی پارٹی کی فتح کا پختہ یقین ہے۔ دہلی میں اپنی قیام گاہ پر اس نامہ نگار سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بہرحال یہ تو تسلیم کیا کہ فتح اتنی آسان نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ پُرمزاح انداز میں یہ سوال بھی کیا کہ "وہ کون سے انتخابات ہیں جو آسان ہوتے ہیں"۔ انھوں نے آنجہانی مسز اندرا گاندھی جنھوں نے ہمیشہ فراخ دلی کے ساتھ ہریانہ کو بڑے پیمانے پر مالی امداد فراہم کی، کی تعریفوں کے پُل باندھتے ہوئے کہا کہ "درحقیقت ہریانہ انھیں کی تخلیق ہے۔" انھوں نے مزید کہا کہ "ہریانہ نے جو پہلے متحدہ صوبۂ پنجاب کا ایک پس ماندہ حصہ

ان کے مضمرات سے واقف ہیں اور ملک کو لاحق خطرات کو محسوس کرتے ہیں۔" سردار ہرپال سنگھ کے ایک اور معتمد اور صوبائی کمیٹی کے جنرل سکریٹری کرنل سوڈھی نے اس پوری بحث کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا کہ "کانگریس کو دونوں کی اس جنگ میں شکست نہیں ہو سکتی، ہمیں واضح اکثریت حاصل ہو کر رہے گی۔"

تمام ریاست میں انتخابی بخار زوروں پر ہے اور روہتک، جنید اور ریاست کے دیگر شہروں میں ایک دوسرا ہی منظر نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ دیہی علاقوں میں بھی سیاسی بحث و مباحثے کی گونج سنائی پڑنے لگی ہے۔ ہر جگہ لوک دل کے کارکنوں کو موٹر سائکلوں، سائکلوں یا ٹریکٹروں پر سیاسی مہم پر رواں دواں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے حوصلے بہت بلند ہیں اور دیوی لال کی شکوش

تھا، ۲۱ برس قبل وجود میں آنے کے بعد ایک قلیل مدت کو چھوڑ کر کانگریسی حکومت کے ۱۸ برسوں کے دوران بہت زیادہ ترقی کی ہے۔"

ہریانہ پردیش کانگریس کمیٹی کی لیگل سیل کے کنوینر گوپی چند ایڈوکیٹ کا کہنا ہے کہ "چنڈی گڑھ ہریانہ کے لیے کبھی بھی مسئلہ نہیں رہا، ہم اسے بھول چکے ہیں اور اپنے لیے ایک نئی راجدھانی بنانا چاہتے ہیں۔" وہ مزید کہتے ہیں کہ "ہریانہ کے انتخابات میں قومی معاملات ایک اہم کردار ادا کریں گے، کیوں کہ ہم وطن پرست لوگ ہیں۔ ہم



چودھری دیوی لال ، ایک موقع تو دو، پھر دیکھنا



وزیراعلیٰ بنسی لال: ووٹروں کو لبھانے کے حربے

سیتی آندولن کے سبب انھیں ایک نئی طاقت حاصل ہوئی ہے۔

یُوالوک دل کی ریاستی شاخ کے نوجوان صدر راج سنگھ ہوڈا کا خیال ہے کہ "چودھری صاحب (دیوی لال) وہ واحد شخص ہیں جنھوں نے ریاست کے بکھرے ہوئے حزب اختلاف میں ایک نئی روح پھونکی ہے جو ابھی دو برس قبل تک بالکل مردہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے ہریانویوں کو پھر سے بیدار کر دیا ہے"۔ انھوں نے آگے کہا کہ "ہم پنجاب معاہدے کے سبب مایوسی کا شکار ہو گئے تھے لیکن ہم اب تک اس پر عمل درآمد کروانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ہمیں چنڈی گڑھ نہیں چاہیے ہمیں تو وہ ۷۰ ہزار ایکڑ زمین چاہیے جو ہمیں دی گئی تھی، لیکن ہم ریگستانی یا بنجر علاقہ قبول نہیں کریں گے۔ ہمیں ابوہر اور فاضلکا چاہئیں۔"

روہتک میں ریاستی لوک دل کے صدر دفتر کے ایک آرام دہ کمرے میں اس نامہ نگار سے گفتگو کے دوران نوجوان لیڈر نے دعویٰ کیا کہ ایس۔ وائی۔ ایل نہر کے بارے میں بنسی لال کی حکومت نے جو بھی پروپیگنڈا کیا ہے وہ سب فریب ہے۔ انھوں نے کہا کہ ستلج جمنا نہر کا پنجاب میں پڑنے والا ۱۲۱ کلومیٹر کا حصہ ابھی تک تشنۂ تعمیر ہے۔ نہر پر ۳۰ پُل تعمیر ہونے ہیں۔ لیکن ابھی تک صرف ایک پُل کی تعمیر ہوئی ہے۔ سارا پروجیکٹ افراتفری کا شکار

کی تعمیر ۱۵ برس قبل ہی مکمل ہو چکی ہے، لیکن پنجاب حکومت بعض جگہ اس کے لیے ابھی تک زمین بھی حاصل نہیں کر پائی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ "اگر اب سے شروع ہو کر تین برس تک مسلسل دن رات کام ہو تب کہیں جا کر ایس۔ وائی۔ ایل نہر پروجیکٹ مکمل ہو سکتا ہے"۔ اس درمیان ایک اور یوا لوک دل لیڈر نے مداخلت کرتے ہوئے غصے میں وزیراعلیٰ کے "سرپنچ دورے" کے پروگرام کی مذمت کی اور کہا کہ "ان مہمانوں کو دہشت گردوں کے خطرات کا ہوّا دکھا کر بسوں سے باہر تک نہیں نکلنے دیا گیا تھا، وہ باہر کا نظارہ کیا کرتے؟"

ریاست کے ایک سابق وزیر اور ریاستی کانگریس کمیٹی کے سابق سربراہ چودھری بریندر سنگھ کے مطابق ایس۔ وائی۔ ایل نہر ہریانہ کے لیے جوئے حیات ہے۔ اس نامہ نگار کے ساتھ ذاتی گفتگو کے دوران نوجوان ایم۔ پی نے اس بات سے اتفاق کیا کہ کانگریس کو سخت مقابلہ درپیش ہے۔ انھوں نے کہا کہ "انتخابات یقیناً پھولوں کی رہ گزر نہیں ہوں گے۔ لیکن الکشن کمیٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے مجھے پورا اعتماد ہے کہ آخرکار فتح ہماری ہوگی، اور ہم حکومت تشکیل دینے میں کامیاب ہوں گے"۔ بے تکلف اور بے لاگ گفتگو کرنے والے چودھری بریندر سنگھ نے پارٹی

کی توجیہہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ جس وقت ٹکٹوں کی تقسیم مکمل ہو جائے گی تو سب لوگ پارٹی کو فتح سے ہمکنار کرنے کے لیے متحدہ طور پر کام کریں گے، پھر بھی ہریانہ کے سابق وزیراعلیٰ اور موجودہ مرکزی وزیر بھجن لال کے خلاف اپنے جذبات کو انھوں نے قطعی پس پردہ نہیں رکھا البتہ انھوں نے یہ امید ظاہر کی کہ بھجن لال پارٹی کے وسیع تر مفادات کے پیش نظر بنسی لال کی راہ میں رکاوٹیں پیدا نہیں کریں گے۔

درحقیقت بھجن لال موجودہ انتخابی معرکے میں ایک بہت بڑی طاقت ہیں اور گزشتہ دنوں بنسی لال کی پالیسیوں اور پروگراموں پر کھلے عام تنقید کرتے رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں وزیر اعظم راجیو گاندھی نے ریاست کی ان دونوں دیو قامت شخصیتوں سے ایک ساتھ گفتگو کی تھی اور ان سے دشمن کا متحدہ طور پر مقابلہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ لیکن ابھی یہ واضح نہیں ہے کہ بھجن لال کیا رُخ اختیار کریں گے۔ بنسی لال کے خیمے میں اس طاقت ور شخص کے سبب خاصا خوف پایا جاتا ہے جو ابھی کچھ عرصہ قبل تک ریاست کا سربراہ تھا اور پارٹی کا ایک حلقہ اب بھی ان کے کنٹرول میں ہے۔ بنسی لال خیمے کے بعض لوگ یہ کہتے ہوئے سُنے گئے ہیں کہ ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دیوی لال نہیں بھجن لال ہیں۔

دیکھو وزیراعلیٰ بنسی لال بوری طرح گھاٹے



بھجن لال: ہمیں کم نہ سمجھو



دیوی لال اور راج ماتا وجے راجے سندھیا ۔ مصلحت کی سیاست

میں نہیں ہیں۔ کئی کامیابیاں بھی ان کے نام سے وابستہ ہو چکی ہیں۔ اپنی حکومت کے گیارہ مہینوں کے دوران انھوں نے عوام کے لیے بہت کچھ کیا ہے اور مزید بہت کچھ کرنے کے وعدے بھی کر رہے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقی مشکل حکمراں کی حیثیت سے ان کی کارکردگی میں نہیں بلکہ ایمرجنسی کے دوران ان کے سیاہ کارناموں کے آسیب میں پوشیدہ ہے ایسا لگتا ہے کہ ریاست کے عوام نے ۱۲ برس قبل کے گناہوں کے لیے ابھی تک انھیں معاف نہیں کیا ہے۔ مزید برآں، ان کے صاحبزادے سریندر سنگھ ایم۔پی بھی جو اپنی جگہ اقتدار کا ایک علاحدہ مرکز ہیں عام آدمی اور خصوصاً متوسط طبقے کے لیے وبال جان ہیں۔ چنانچہ چودھری بنسی لال کو جنھیں وزیر اعظم نے شاید اس دہائی کی سخت ترین ذمہ داری سونپ دی ہے، بے شمار دشواریاں درپیش ہیں۔

اُدھر چودھری دیوی لال نے عوام کی نگاہ میں ایک نجات دہندہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ عام کاشت کار اب بھی ان کی وزارت اعلیٰ کے دور میں کو لگان میں راحت، تباہ شدہ فصلوں کے معاوضے اور ایک زمانے میں مشہور "کام کے بدلے اناج" اسکیم کے لیے یاد کرتے ہیں۔ آج کل وہ کاشت کاروں کے قرضوں کو معاف کرنے اور دیگر سہولتیں فراہم کرنے کی یقین دہانی کرانے میں لگے ہوئے ہیں۔ تاہم ان وعدوں کو وفا کرنے کے سلسلے میں ریاستی حکومتوں کے عدم اختیارات کے پیش نظر ان وعدوں کا انجام ظاہر ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی بھی جو دیوی لال لوک دل کی انتخابی حلیف ہے، شہری علاقوں میں زبردست اثر رکھتی ہے۔ بلاشبہ لوک دل، بی۔جے۔پی اتحاد آسانی کے ساتھ انتخابی منظر نامے کو اپنے حق میں تبدیل کر سکتا ہے، لیکن بدقسمتی سے بی۔جے۔پی، بھی اپنے اندر چھپے آر۔ایس۔ایس، کارکنوں کی بغاوت کا شکار ہے جو لوک دل کے امیدواروں کے لیے کام کرنے میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

ہر چند کہ دیوی لال اجیت سنگھ اور ان کے دھڑے کی اہمیت تسلیم کرنے کو تیار نہیں، تاہم یہ حقیقت ہے کہ اجیت سنگھ زندگی اور موت کے درمیان معلق اپنے والد کے آشیرواد کے سبب پانچ اضلاع، فرید آباد، گوڑ گاؤں، روہتک، سونی پت، اور جیند کے کم سے کم ۲۰ انتخابی حلقوں میں ضرور اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

ذات پات کی زنجیروں میں جکڑی اس ریاست میں یوں تو جنتا پارٹی کوئی قابل لحاظ اثرات نہیں رکھتی لیکن برسر اقتدار کانگریس کا ایک قابل عمل نعم البدل قائم کرنے میں چودھری دیوی لال کو مدد ضرور دے سکتی ہے۔ اسی طرح دونوں کمیونسٹ پارٹیاں بھی ریاست میں جن کا وجود محض برائے نام ہے، صرف اپنے اتحادیوں کا حوصلہ بڑھانے کا کام کر سکتی ہیں۔ دیوی لال کو امید ہے کہ وہ ایک ایک سیٹ کی پیش کش کر کے دونوں پارٹیوں کو ساتھ لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

بہوجن سماج پارٹی بھی ایک طاقت ہے جو بیشتر طور پر زیادہ سے زیادہ نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے اور اس نے انتخابات میں تنہا حصہ لینے کا ارادہ بھی ظاہر کر دیا ہے اس پارٹی کا اثر بنیادی طور پر پس ماندہ ذاتوں میں ہے اور اس لحاظ سے وہ کانگریس کی بنیادیں کمزور کرنے کا ہی کام انجام دے گی۔

تادم تحریر (۲۱ رمئی) انتخابی صورت حال پوری طرح واضح نہیں ہے۔ بلاشبہ چودھری دیوی لال نے حزب اختلاف کے تقریباً تمام قد آور رہنماؤں کی حمایت حاصل کر کے محض ایک جاٹ لیڈر ہونے کا داغ بڑی حد تک دھونے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ دوسری طرف اقتدار کی رسّہ کشی اور اندرونی بغاوت کا شکار کانگریس ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہی ہے لیکن کسی بھی لمحے کوئی غیر متوقع تبدیلی پانسہ پلٹ سکتی ہے۔ ممکن ہے ارجن سنگھ کی پیپلز رپورٹ جو منظر عام پر آ چکی ہے، ہریانویوں کو کسی حد تک خوش کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

خلاصہ یہ کہ کرسیٔ اقتدار کے دو دعویداروں دیوی لال کے لوک دل اور بنسی لال و بھجن لال کی کانگریس کے درمیان براہ راست مقابلہ ہے۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی فیر فیکس اور بوفورس تنازعات کے گرد و غبار میں لپٹے ہوئے اپنے انداز سے صورت حال میں کوئی اہم تبدیلی لا پائیں گے اس کی توقع بہت کم ہے۔

ریاست میں یہ انتخابی جنگ بنیادی طور پر علاقائی اور مقامی معاملات مثلاً آبپاشی کی سہولیات، بجلی کی فراہمی، اور سب سے بڑھ کر کاشت کاروں کو حاصل ہونے والی مالی رعایتوں کی بنیاد پر لڑی جائے گی۔ طاقت ور اور خوش حال جاٹ برادری جو ریاست کی واحد بڑی اکثریت ہے وہ انتخابات میں سب سے اہم کردار ادا کرے گی۔ اس کے علاوہ انتخابی نتائج کا دار و مدار بڑی حد تک اس بات پر بھی ہوگا کہ ایک طبقہ کس حد تک انتخابی بے ایمانی کر لینے میں کامیاب ہوتا ہے اور مساوی طور پر طاقت ور اور برہم فریق ثانی کس حد تک انتخابی بوتھوں پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کرے گا۔ شاید بہت کچھ اسی پر منحصر ہوگا۔

# [illegible]

[illegible]



فرقہ وارانہ فسادات سیکولر جمہوری ہندوستان کی زندگی کا معمول بن گئے ہیں۔ ہر صبح ناشتہ کی میز پر ہمارے ساتھ فسادات کی لرزہ خیز خبریں بھی موجود رہتی ہیں۔ ہم نے روز آنے والی ان خبروں پر چونکنا چھوڑ دیا ہے۔ ہمارا ردِ عمل صرف یہ ہوتا ہے کہ گزشتہ روز کی تعداد ہلاکت میں چند مزید اعداد کا اضافہ کرلیں لیکن کچھ لوگوں کو شاید زندگی کی موسیقی سے گونجتی ہوئی بستیاں اور طبعی موت مرنے کا پرانا سلسلہ پسند نہیں۔ اسی لیے آتش زنی اور قتل و غارت میں وہ اپنے لیے صدیوں پرانی انسانی تہذیب کی یکسانیت کے "حبس" سے نجات حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔

میرٹھ اور دہلی پھر آگ کے شعلوں اور خنجر زنوں کی زد پر ہیں کرفیو لگا ہوا ہے۔ کوچہ و بازار پر موت کی خاموشی اور ویرانی طاری ہے۔ قید خانہ نما گھروں کے اندر اپنی سانسوں اور دھڑکنوں کی آواز تک سے خوف زدہ لوگ باہر سے آنے والی ہر آواز کو موت اور تباہی و بربادی کی دستک سمجھتے ہوئے دم سادھے اپنی باری کے منتظر ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ آئندہ کیا ہوگا۔

فسادات کی تفصیل بیان کرنا آسان نہیں۔ فساد کیسے شروع ہوا۔ پہلا پتھر کس نے مارا اور تشدد کے اسباب کیا تھے۔ ان سوالوں کا جواب حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر فریق بشمول حکومت اور ضلع انتظامیہ اپنے حساب اور مفاد کے مطابق حقائق پیش کرتا ہے۔ کرفیو کے دوران کسی بھی جگہ صرف ضلع انتظامیہ اور پولیس کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اور وہ اکثر اوقات اصل واقعات اور حقیقی معلومات فراہم نہیں کرتے۔ اخباری نامہ نگار بھی اکثر و بیشتر سرسری مشاہدے اور ضلع حکام کی فراہم کردہ معلومات پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں لیکن اگر حقیقی اسباب معلوم ہو بھی جائیں تو کیا فرق پڑے گا آئندہ فساد کے لیے کوئی نیا سبب اور بہانہ پیدا نہیں ہو جائے گا؟

اس برس میرٹھ تقریباً ایک ماہ کے وقفے سے دوبارہ فساد کا شکار ہوا ہے۔ ۱۴ اپریل کے فساد میں تقریباً ۵۰ افراد ہلاک اور اس سے کئی گنا زخمی ہوئے تھے۔ اس بار اب تک کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۵۰ اور ایک غیر سرکاری جائزے کے مطابق کوئی ۱۵۰ افراد ہلاک اور بے شمار زخمی ہو چکے ہیں اور تقریباً سو کروڑ روپے کی املاک تباہ و برباد ہوئی ہے۔ میرٹھ کا یہ فساد اپنی سفاکی



کے مطابق ۱۰ افراد ہلاک ہو چکے ہیں اور زخمیوں میں کئی کی حالت نازک ہے۔

ہر فساد کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک فوری اور دوسرا مستقل۔ مستقل پہلو ملک کی عام فرقہ وارانہ فضا سے متعلق ہے جب کہ فوری پہلو کا تعلق فساد کے تئیں حکومت اور انتظامیہ کے رویے سے ہے۔

ہر فساد روکا جاسکتا ہے اگر ضلع انتظامیہ چاہے اور حکومت اس معاملے میں سنجیدہ ہو لیکن انتظامیہ کے سربراہ بھی آخر سرکاری ملازم ہوتے ہیں اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی سے جن کی ازلی دشمنی ہے۔ اس کے علاوہ قوانین کے تحت انسانوں کی ہلاکت اور املاک کی تباہی سے ان کی ملازمت متاثر ہونے والی نہیں تو وہ امن کی بحالی میں غیر ضروری عجلت برتنے کی زحمت کیوں گوارہ کریں؟ ان کا نقطۂ نظر شاید یہ ہوتا ہے کہ جب لوگ قتل و غارت سے اوب اور تھک جائیں گے تو خود بخود امن ہو جائے گا۔ ادھر حکومت کا اپنا سیاسی حساب ہوتا ہے فساد میں کس فرقے کے کتنے لوگ مارے جا رہے ہیں اور اس فرقے سے کتنے ووٹ وابستہ ہیں، اس طرح کے سوالات کی بنیاد پر فساد کے تئیں حکمراں جماعت کا طرز عمل طے پاتا ہے۔ ایسے گوشت پوست کے زندہ انسان محض ووٹوں کی شکل میں ہی نظر آتے ہیں۔

میرٹھ میں جاری و ساری فساد میں کرفیو لگنے اور کئی ہزار پولیس اور فوج کی موجودگی کے بعد بھی



بہیمت اور وسعت کے لحاظ سے سب سے زیادہ بھیانک ہے فرقہ وارانہ جنون نے اس بار نئے علاقے دریافت کیے ہیں یہاں تک کہ مضافات بھی اس آگ میں جلنے لگے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ ایک خانہ جنگی کے آثار جیسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔

دلی میں بھی ۱۹ مئی کو ہی ۸ ماہ کی ترس خاموشی کے بعد اچانک تشدد پھوٹ پڑا دو افراد ہلاک ہوئے آتش زنی ہوئی اور کرفیو لگ گیا۔ لوگ خانہ بند ہو گئے۔ اس وقت تک حالات بہت زیادہ خراب معلوم نہیں ہو رہے تھے۔ کشیدگی ضرور تھی لیکن قابل گرفت۔ اس کے بعد جمعۃ الوداع کی نماز کے لیے کرفیو پوری طرح اٹھا لیا گیا تو بہت بڑے پیمانے پر آتش زنی، لوٹ مار اور خنجر زنی کی وارداتیں ہونی شروع ہو گئیں۔ کئی علاقوں میں ایک ساتھ تشدد پھوٹ پڑا۔ نتیجتاً دوبارہ کرفیو لگا اور اس سے

[illegible]






آتش زنی، قتل اور لوٹ مار کی وارداتوں کے بے دریغ جاری رہنے کا مطلب کیا ہے؟ میرٹھ میں یوپی کے وزیر اعلیٰ کا تقریباً روزانہ کا دورہ اور مرکزی وزیر داخلہ کی آمد کے باوجود تشدد جاری رہنے کا کیا مفہوم ہے اس فساد زدہ بدقسمت شہر میں اَیس پی۔ اے۔ سی کی تعیناتی کے کیا معنی ہیں جس کے بارے میں یہ بات عام ہے کہ وہ وحشیوں کی طرح انسانی بستیوں پر ٹوٹ پڑتی ہے۔

کسی بھی اعتبار سے دیکھا جائے گزشتہ اور حالیہ دونوں فسادوں میں میرٹھ انتظامیہ کی نا اہلی اور یوپی کے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کی بے حسی اور سیاسی بے اصولی ثابت ہو چکی ہے۔ بابری مسجد اور رام جنم بھومی تنازعے کو نئی زندگی دینے میں ویر بہادر سنگھ کی خفیہ کارفرمائی کا تذکرہ بعض اخبارات میں پہلے بھی آچکا ہے۔ جس شخص کے دورِ حکومت میں ریاست فرقہ پرستی کا آتش فشاں اور بعض شہر انسانیت کا مقتل بن کر رہ گئے ہوں اس کے کرسی نشین رہنے کا آخر کیا جواز ہے؟

میرٹھ اور دہلی میں جس طرح دو فرقوں کے درمیان چھڑپیں ہو رہی ہیں اور جس طرح آبادیاں فرقہ وارانہ خطوط پر تقسیم ہیں اس سے لگتا ہے کہ یہ زہر سماج کی رگ و پے میں خاصی گہرائی تک سرایت کر چکا ہے اور حکومت کے پاس اس زہر کا کوئی تریاق نہیں ہے۔ اس کے پاس صرف کرفیو ہے، پولیس کی بندوقیں ہیں اور گرفتاریاں ہیں لیکن یہ زہر اگر گھر گھر پھیل گیا تو کرفیو کہاں کہاں اور کب تک لگایا جائے گا۔ پولیس کہاں کہاں لگائی جائے گی کتنے قید خانے قائم کیے جائیں گے۔ کیا اب یہ ضروری نہیں کہ حکومت فرقہ وارانہ رشتوں پر گہرائی اور سنجیدگی سے غور کرے مستقل تنازعات کا سبب دریافت کر کے انہیں حل کرنے کے لیے اقدام کرے۔ دلوں کی بے چینی کو محسوس کرے اور اسے دور کرنے کی کوشش کرے ایسے طریقے ایجاد کرے جن کے ذریعے فرقہ وارانہ خلیج کو پاٹا جا سکے۔ کسی طویل مدتی تناظر اور وسیع تر سوچ کے بغیر فرقہ وارانہ مسئلے کا حل بہت مشکل ہے اس کے لیے سیکولرزم، جمہوریت اور رواداری اور مساوات پر یقین رکھنے والی سیاسی جماعتوں سیاست دانوں، سماجی کارکنوں، دردمند دانشوروں اور صحافیوں کے تعاون سے ایک قومی تناظر کی تشکیل کرنی ہوگی اور اس کے دائرے میں ٹھوس طریقے وضع ... [illegible]

بھی کیا جائے۔

ہندوستان آج اپنے ترقیاتی سفر کی جس منزل میں ہے۔ اس مرحلے پر وہ فرقہ وارانہ تشدد کا ... [illegible] متحمل نہیں ہو سکتا اس سے سیکولر وشی ...

حاصل کر کمزور کیا ہے اور اگر ایسا ہوا تو ہندوستان کی سیکولر جمہوریت، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کی قدریں شاید ہمیشہ کے لیے گم ہو کر رہ جائیں گی ظاہر ہے کہ ہمیں ایسا ہونے نہیں دینا ہے۔

اعجاز اشرف

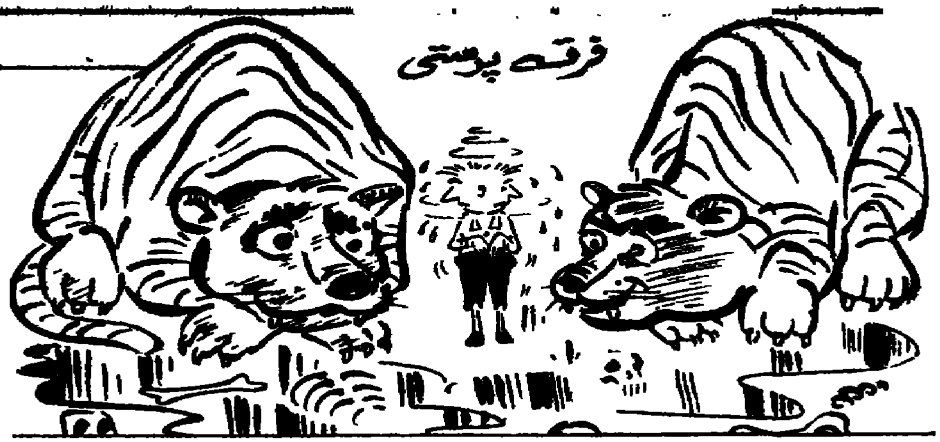
# فرقہ پرستی کا زہر، شجرِ سیاست کا ثمر؟

فرقہ وارانہ منافرت کا خوفناک پھیلاؤ، بے اعتمادی اور بے چینی کا عمومی ماحول اور ایک دوسرے سے تعلق سے روز افزوں عدم رواداری کی صورت حال جو ملک کے مختلف حصوں میں بے مقصد خون ریزی اور فرقہ وارانہ تشدد کا سبب بن رہی ہے، سماج کے ہوش مند طبقے کے لئے پریشان کن اور سنجیدگی کے ساتھ قابل غور صورت حال ہے۔ ملک میں عام ناامیدی اور مایوسی کا ماحول پیدا ہو رہا ہے۔

ہوٹل ہو یا ریستوران، کلب ہو یا کافی ہاؤس، ہر جگہ ایک ہی سوال موضوع بحث ہے اور وہ یہ کہ "کیا ایک قوم کی حیثیت سے ہم باقی رہ سکیں گے؟ کیا ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس وبائی قسم کی زہرناک فرقہ پرستی کا، جس سے ہم دوچار ہیں مقابلہ کر سکیں گے؟" اس بحث میں صرف ایک بات جس پر کوئی اختلاف رائے نہیں ہے، یہ ہے کہ ملک میں موجودہ مذکورہ بالا صورت حال ہماری سیاست کی پیدا کردہ ہے۔

ایک اندھی دوڑ ہے جو "طاقت" کے حصول کے لئے جاری ہے، وہ طاقت اور اقتدار جو ہر طرح کے مفادات کی تکمیل کا ذریعہ ہے — حکمرانی کی طاقت، انتظام و انصرام کی طاقت، معاشی طاقت، وہ طاقت جس کے بغیر کوئی بھی پیشہ پُرامن طور پر زندہ نہیں رہ سکتا، اور وہ طاقت جو اشتعال دیتی ہے، اس حد تک

# فرقہ پرستی

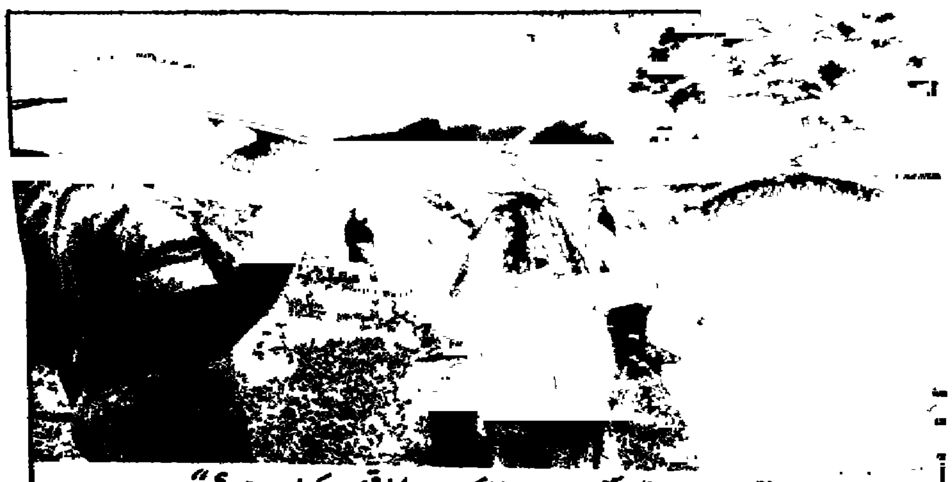


انمول کہ اصولوں اور قدروں کی بھی اس "طاقت" کے آگے کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ بات صرف آزاد ہندوستان کے بارے میں ہی درست نہیں ہے بلکہ برطانوی دور میں بھی یہی کچھ ہوتا رہا۔ برطانوی قوم جبریوں تو اپنے کردار کے لئے شہرت رکھتی تھی، اس نے ہندوستانی نظام سیاست میں مختلف فرقہ وارانہ گروہوں کو بڑھاوا دے کر ٹوٹ پھوٹ، خلفشار اور انتشار کو پختہ کرنے کی کوشش کی تاکہ اپنی حکومت کو برقرار رکھ سکے۔ برطانوی حکمرانوں سے پہلے مغل حکمرانوں نے بھی عوام کی حمایت اور قبولیت حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقوں سے فرقہ وارانہ تقسیم پیدا کی۔ یہاں تک کہ قدیم ہندوستان میں بھی ذات پات کا نظام قائم کرنے کا اصل مقصد ہندوؤں کی دو اونچی ذاتوں کی برتری کو مستحکم کرنا تھا، جین مت اور بدھ مت کے ظہور کا سبب بھی بڑی حد تک اسی دور کی سیاسی فرقہ پرستی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان مذاہب کو شاہی تائید و حمایت حاصل ہوئی، جس کے نتیجہ میں روحانی اور مادی دونوں ہی طرح کی برتری کو ایک خاص طبقہ میں مرکوز کر دیا گیا۔
ہندوستان جیسے وسیع ملک میں تاریخ کے ایک خاص پس منظر میں ہمیں سماجی تنازعات ورثہ میں ملے ہیں، جو کہ فی الواقع تقریباً ایک عالمی صورت حال کے طور پر موجود رہے ہیں، البتہ ان کی شدت، نوعیت اور وسعت کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی مجبوریوں اور نوآبادیاتی ضروریات اور لوازمات کے مطابق بدلتی رہی ہے۔ سیاسی اقتدار رکھنے والوں اور اس اقتدار کے حصول کے لئے کوشش کرنے والوں کے درمیان مفادات کا ٹکراؤ جتنا شدید ہوا ہے، سماجی تانے بانے پر اس کے اثرات اتنے ہی گہرے ہوئے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ قتل عام ایک اسلامی ملک (پاکستان) کے قیام کے ساتھ پیش آیا اور "آپریشن بلیو اسٹار" کا واقعہ ایک سکھ ریاست بنانے کی ناکام کوشش کے ساتھ رونما ہوا۔ اسی طرح کشمیر میں اقتدار کی دوڑ میں مسلم متحدہ محاذ نے فاروق عبداللہ اور ان کے حلیف راجیو گاندھی کے خلاف فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور انتخابات کے ختم ہونے کے ساتھ ہی یہ طوفان بھی تھم گیا۔ وہ تمام لوگ، ہندو، سکھ یا مسلمان، جو فرقہ پرستی کا پرچار کرتے ہیں، خود اس پر یقین نہیں رکھتے دراصل ان کی اس طرح کی بات کے پیچھے ایک خاص مقصد ہوتا ہے اور وہ سیاسی فائدہ کا حصول ہے۔ لیکن اس معاملہ کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ریاستوں اور مرکز میں، جو لوگ برسر اقتدار ہیں، وہ اس صورتحال کو ختم کرنے کے بجائے اسے عملاً تسلیم کرتے رہے ہیں۔
جموں و کشمیر میں سیٹ ایڈجسٹمنٹ کو دیکھئے۔ وادی میں نیشنل کانفرنس (ف) کو حاصل ہونے والی سات سیٹوں میں سے چھ سیٹیں مسلم اکثریتی علاقوں کی تھیں، جہاں مسلم امیدوار کھڑے کئے گئے تھے۔ وادی کی واحد سیٹ جہاں ہندو ووٹروں کی معتد بہ تعداد ہے، سری نگر شہر کی حبہ کدل کی سیٹ ہے، جہاں سے نیشنل کانفرنس (ف) کے کل دو ہندو امیدواروں میں سے ایک پیارے لال ہندو امیدوار تھے۔ یہ ایڈجسٹمنٹ اس بات کا کھلا اعتراف ہے کہ نیشنل کانفرنس ایک مسلم اکثریتی پارٹی ہے اور اس کے امیدواروں میں سے دو کے علاوہ باقی سب مسلمان ہیں چنانچہ صرف نیشنل کانفرنس (ف) ہی مسلم علاقوں میں الیکشن لڑ سکتی ہے جب کہ کانگریس چونکہ ہندو اکثریتی پارٹی ہے لہٰذا ہندو اکثریتی علاقوں میں وہی الیکشن لڑ سکتی ہے۔

گزشتہ آٹھ انتخابات کے دوران تمام سیاسی پارٹیوں نے انتخابی امیدواروں کی نامزدگی کے لئے ذات برادری اور مذہب کو بنیادی کسوٹی کے طور پر عملاً تسلیم کر لیا ہے۔ عیسائی حلقہ سے عیسائی امیدوار، مسلم حلقہ سے مسلم امیدوار، سکھ حلقہ سے سکھ امیدوار، ہندو حلقہ سے ہندو امیدوار کھڑے ہونے کا طریقہ ہمارے انتخابی عمل کا ایک مستقل اور لازمی خصوصیت بن گیا ہے۔

فرقہ پرستی ایک مسئلہ ہے۔ اس فرقہ پرستی پر قابو پانا اور اسے ختم کرنا ناممکن نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مشترکہ اور متحدہ طور پر اس کا مقابلہ کیا جائے۔ پدیاترائیں اور عوامی رابطوں کے پروگرام بے سود اور لاحاصل ہیں۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ ہمارے سیاست داں اپنے ضمیر کو ٹٹولیں اور جتنی جلد وہ ایسا کر سکیں، ملک کے لئے اتنا ہی بہتر ہے۔



"بابو! آپ تو افسر ہو، بتاؤ ہمارا قصور کیا ہے؟"

حمیدالدین محمود

### ہندوستانی باشندوں کا سیاسی استحصال

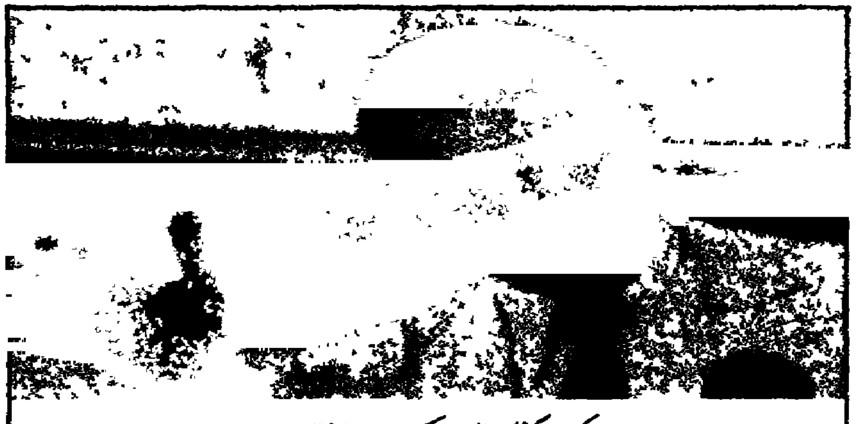
# فجی کا انقلاب

نسلی اور مذہبی تعصب ایک ایسی بیماری ہے جس سے تیسری دنیا کے کئی ملکوں کی سیاست اور سماج میں ابتری پیدا ہوتی ہے جنوبی بحرالکاہل کے ملک فجی میں گزشتہ دنوں جو غیر معمولی صورت حال پیدا ہوئی ہے وہ انہی تعصبات کا انجام ہے جسے مقامی سیاست دانوں نے سیاسی بحران کی منزل پر لا کھڑا کیا ہے۔ فجی ایک جزائری ملک ہے جو نیوزی لینڈ کے ۱۷۶۰ کلومیٹر شمال مشرق میں واقع ہے اس میں چھوٹے بڑے آٹھ سو جزیرے ہیں جس میں سب سے بڑا ویتی لیوو ہے۔ یہ جزیرہ ملک کے کل رقبے یعنی ۱۸،۳۷۶ مربع میٹر کے آدھے سے زیادہ ہے۔ اسی میں فجی کی راجدھانی سووا واقع ہے فجی کا سکہ روپیہ کہلاتا ہے پانچ فجی روپے چار ڈالر کے برابر ہوتے ہیں۔ فجی کی دو زبانیں ہیں۔ انگریزی اور فجیشین۔ آٹھ لاکھ کی آبادی میں ہندو دھرم کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اور باقی میں عیسائی مذہب کے پیروا ہم ہیں جو بیشتر میلانیشین نسل کے ہیں اور ان جزائر کے قدیم باشندے ہیں۔

غدر کے بعد انگریزوں نے ۱۸۷۹ء میں اس ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ یوروپی حاکموں کے نیشکر کے کھیتوں میں مزدوروں کی ضرورت تھی جس کے لیے ہندوستان سے جبری مزدور فجی لائے گئے ان میں سے بیشتر وہیں بس گئے آج ان کی اولادیں فجی کی آبادی کا پچاس فی صد ہے۔ مقامی باشندے یعنی میلانیشین ۴۴ فیصد ہیں باقی لوگوں میں یوروپی اور چینی اقوام شامل ہیں۔

ناریل اور نیشکر ملک کی برآمد کا نوے فی صد حصہ ہیں صنعتیں کم ہیں۔ لیکن پھر بھی بحرالکاہل کے بہت کم جزائری ملک فجی کی خوشحالی کا مقابلہ کر سکتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ فجی ساحوں کا ملک ہے سب سے اہم بین الاقوامی ادارہ جو اس ملک میں ہے وہ ہے جنوبی بحرالکاہل کا کمیونٹی کمیشن یعنی مواصلاتی مرکز۔ فجی ان چند جزائری ملکوں میں سے ہے جن کی ایک منظم فوج ہے جس نے اقوام متحدہ کے پرچم تلے سینائی اور لبنان میں امن قائم رکھنے کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔ جب فجی کی آزادی کی بات چلی تھی تو مقامی باشندوں نے کہا تھا کہ انہیں آزادی کی جلدی نہیں۔ انہیں اندیشہ تھا کہ ہندوستانی نژاد باشندے ان پر حاوی ہو جائیں گے۔ بالآخر دس اکتوبر ۱۹۷۰ء کو فجی آزاد ہوا اور موروثی قبائلی سردار راتو سر کامیسے مارا کی قیادت میں ان کی الائنس پارٹی نے اقتدار سنبھالا۔ اس پارٹی میں تین فریق شامل تھے جن میں سے ایک انڈین الائنس یعنی ہندوستانی نژاد لوگ تھے۔

بعد میں دو اور پارٹیاں ابھریں۔ ایک لیبر پارٹی جو جمعرات (۱۴ مئی) کو معزول شدہ وزیر اعظم ڈاکٹر ٹموڈی بواندرا نے قائم کی اور دوسری نیشنل فیڈریشن پارٹی۔



موجودہ حکمراں کرنل ربوکا: حکومت ہمارا حق ہے

سر کامیسے مارا کی حکومت عالمی سیاست میں مغربی ملکوں کے ساتھ رہی۔ اس پارٹی نے سولہ سال سے زیادہ تک فجی پر حکومت کی۔ لیکن اس سال ۱۱ اپریل کو منعقدہ عام انتخابات میں الائنس پارٹی کو ۲۴ نشستیں ملیں اور نیشنل فیڈریشن پارٹی اور لیبر پارٹی کے متحدہ محاذ نے ۲۸ نشستیں جیتیں۔ لیبر پارٹی کے قائد ڈاکٹر بواندرا نے ۱۳ اپریل کو اپنی مخلوط حکومت تشکیل دی۔

۱۴ اور ۱۵ اپریل کو انہوں نے اپنی کابینہ کا اعلان کیا۔ اس کے تحت نیشنل فیڈریشن پارٹی کے قائد مسٹر ہریش سی شرما کو نائب وزیر اعظم لیبر پارٹی کے مسٹر جے رام ریڈی کو وزیر انصاف، ایک ٹریڈ یونین لیڈر مسٹر مہندر چودھری کو وزیر مالیات و اقتصادی منصوبہ بندی دہلی یونیورسٹی کے سابق طالب علم اور جنوبی بحرالکاہل یونیورسٹی کے لیکچرر ڈاکٹر سیتھ ریڈی کو وزیر صحت و سماجی بہبود اور مسٹر کرشن دت کو وزیر



گورنر جنرل گانی لو



برطرف وزیر اعظم ڈاکٹر باوادرا

خارجہ امور کیا گیا۔
میلانیشین باشندوں میں سے دو کو وزیر مقرر کیا گیا۔ میلانیشین باشندوں نے اعتراض کیا کہ مسٹر جے رام ریڈی نے انتخابات نہیں لڑے تھے تو انہیں کیوں کابینہ میں جگہ دی گئی۔

یہ تو محض عذر تھا کیونکہ انتخابات سے پہلے مارچ ہی سے ہندوستانیوں کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے کہ ہندوستانیوں کی آبادی کا دس فی صد حصہ فجی کی اندرونی تجارت کے نوے فی صد کا مالک ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی مانگ کی گئی کہ ان میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ میلانیشین باشندوں کے حقوق محفوظ ہو جائیں یہ بات بھلا دی گئی کہ فجی کی موجودہ خوشحالی میں ہندوستانی نژاد باشندوں کے آبا و اجداد کا خون پسینہ شامل ہے۔ جب ہندوستانیوں کے خلاف مظاہرے بڑھتے گئے اور ان میں سرکا میسے مارا کی الائنس پارٹی نے بھی حصہ لینا شروع کیا تو مسٹر ہریش پرسادنے ۲۰ مارچ کو پارٹی سے استعفیٰ دے دیا اور انڈین الائنس کے اپنے ساتھیوں کو بھی سرکا میسے مارا کی پارٹی چھوڑنے کا مشورہ دیا۔
جب ۱۱ اپریل کے انتخابات میں سرکا میسے مارا کی پارٹی ہار گئی تو ہندوستانی بیوپاریوں کی دکانوں اور مکانوں پر حملے شروع ہو گئے۔ گیارہ دن بعد ۱۳ اپریل کو سرکا میسے مارا کی کابینہ کے وزیر مواصلات مسٹر اپیٹی تورا نے ایک گاؤں میں قبائلی سرداروں کے اجتماع میں اکثریتی حکومت اور اکثریتی آبادی کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کی اور ہندوستانی نژاد لوگوں کے خلاف بھی متحدہ محاذ بنانے کا مشورہ دیا۔

۱۰ مئی سے صورت حال پر تشدد ہو گئی جبکہ وزیر انصاف مسٹر جے رام ریڈی کے دفتر میں بم پھینکا گیا تین ہندوستانی دکانوں پر بھی ایسے ہی بم پھینکے گئے۔ ۹ مئی کو سوا سے دو سو کلو میٹر دور نائب وزیر اعظم مسٹر ہریش سی شرما کے دفتر کو آگ لگا دی گئی۔

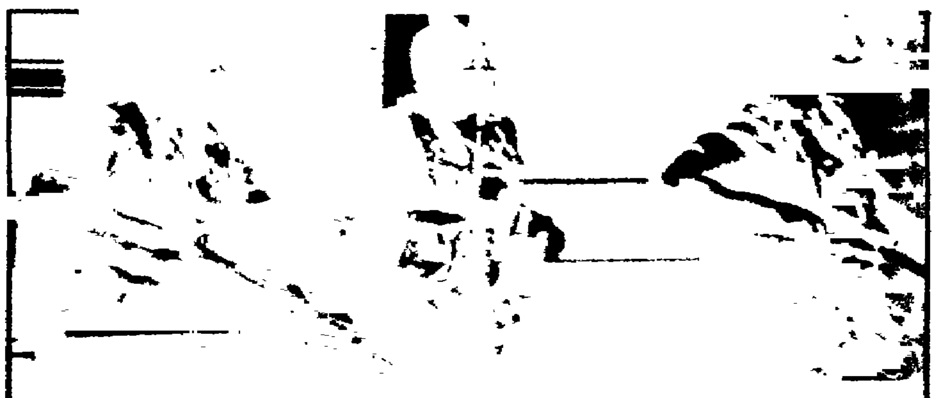
۱۱ مئی کو مسٹر تورا کو ان کے گاؤں میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر نسلی منافرت اور منتخب حکومت کے خلاف بد نظمی پھیلانے کا الزام لگایا گیا جس کی پاداش میں انہیں دو سال کی سزائے قید ہو سکتی ہے۔ انہیں ضمانت پر رہا کرتے ہوئے ۲۰ مئی کو عدالت میں پیش ہونے کا حکم دیا گیا۔
۱۴ مئی کو یعنی نئی کابینہ کے بننے کے ایک ماہ بعد لیفٹیننٹ کرنل سنتی ویتی رابوکا نے پارلیمنٹ میں داخل ہو کر حکمراں جماعت کے وزراء اور ممبروں کو گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر بھیج دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ۱۱ اپریل کے عام انتخابات سے پہلے ہی فوجی بغاوت کرنا چاہتے تھے تاکہ میلانیشین باشندوں کے خلاف بعض گروہوں کی منظم سازشوں کو کچل سکیں۔

۱۵ مئی کو لیفٹیننٹ کرنل ربوکا نے نئے آئین کا اعلان کیا جس کے تحت ایوان نمائندگان میں ہندوستانی نژاد لوگوں کی نمائندگی ۲۲ سے گھٹا کر دس کر دی گئی اور میلانیشین باشندوں کی نمائندگی ۲۲ سے بڑھا کر ۳۲ کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ دوسری اقوام کی نشستیں موجودہ آٹھ سے گھٹا کر دو کر دی گئیں۔ سرکا میسے مارا کو دوبارہ وزیر بنا دیا گیا۔ اور اخبارات بند کر دیے گئے۔

اس سلسلے میں چند باتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلی فجی میں آسٹریلیائی جنگی جہاز کی موجودگی دوسری یہ کہ معزول شدہ حکومت نے عالمی سیاست میں غیر جانبداری اور فجی میں نیوکلیر ہتھیاروں سے لیس جہازوں کو آنے نہ دینے کی پالیسی پر انتخابات لڑے تھے اور جیتے تھے۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ کہ ہندوستانیوں کے خلاف مظاہرے اور پر تشدد واقعات دو دور افتادہ ملکوں یعنی بحرالکاہل میں فجی اور بحر ہند میں مڈغاسکر میں ایک ساتھ مارچ کے مہینے میں ہوئے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟

۲۶ فروری سے ۹ مارچ تک مڈغاسکر کی راجدھانی انٹاناریو اور دیگر چار شہروں میں افریقی نوجوانوں نے ایک سو پچاس ہندوستانی دکانیں لوٹیں جلائیں اور فسادات میں چار کو ہلاک اور ایک سو کو زخمی کیا۔ مڈغاسکر میں بھی انتخابات قریب آ رہے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نسلی اور مذہبی تعصب کی ایک نئی لہر کبھی مڈغاسکر اور کبھی فجی میں ہندوستانیوں کے جان و مال کے لیے خطرے کا سبب بنتی جا رہی ہے۔



نقاب پوش مسلح فوجی پارلیمنٹ ہاؤس کی نگرانی کرتے ہوئے

# ایڈز

## خود کو کیسے بچائیں



ایڈز انتہائی خطرناک بیماری ہے اور ابھی تک اس کا کوئی علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں بے پناہ افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ لیکن خود کو اس سے بچانا مشکل نہیں ہے بشرطیکہ اس سے متعلق آپ چند حقائق کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

**ایڈز کیا ہے ؟**

ایڈز انگریزی کے چار الفاظ ایکوائرڈ امیونو ڈیفی شنسی سنڈروم کے ابتدائی حروف کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک ایسے وائرس کے سبب ہوتا ہے جو انسانی جسم کے خود حفاظتی نظام کو تباہ کر دیتا ہے۔

**یہ کیسے پھیلتا ہے**

صحت مند آدمی ایڈز کے وائرس کا شکار اسی وقت ہی ہوتا ہے جب اس کے جسم میں ایڈز کے مریض کا خون یا مادۂ منویہ داخل ہو جائے۔ زیادہ تر افراد ایڈز کے مریض کے ساتھ جنسی اختلاط کے نتیجے میں ہی ایڈز وائرس کا نشانہ بنتے ہیں۔ باقی لوگ متاثرہ مریض کی استعمال شدہ انجکشن سوئی کو استعمال کرنے سے اس خطرناک مرض کا نشانہ بن جاتے ہیں اور ایسے واقعات زیادہ تر نشیلی دوائیوں کے عادی افراد میں عموماً پائے جاتے ہیں۔ ایڈز کے کسی مریض کا خون دیا جانا ایڈز کے پھیلاؤ کے لئے بہت کم ذمہ دار ہے۔

لازمی نہیں ہے کہ ہر وہ آدمی جس میں ایڈز کا وائرس موجود ہے اس مرض کا شکار بھی ہو جائے۔ درحقیقت زیادہ تر معاملات میں ایسا نہیں ہوتا ہے لیکن کوئی بھی آدمی جس میں یہ وائرس موجود ہے اس وائرس کو دوسرے شخص کو منتقل کر سکتا ہے چاہے وہ خود کو مکمل طور پر صحتمند محسوس کرتا ہو اور دیکھنے میں بھی ایسا ہی نظر آتا ہو۔

**آپ ان چیزوں سے ایڈز کا شکار نہیں ہو سکتے :**

- عمومی سماجی تعلقات جیسے ہاتھ ملانا، چھونا اور بغل گیر ہونا۔
- سوئمنگ پول، ریستوران اور دیگر عوامی مقامات پر۔
- کھانسی، چھینک، تھوک۔
- کپڑوں کے استعمال سے۔
- ٹوائیلیٹ سیٹ، دروازوں کے ہینڈل وغیرہ، کھانا، عینک اور پیالیاں

**آپ ایڈز وائرس کا شکار نہیں ہو سکتے جب :**

آپ خون کا عطیہ کرتے ہیں۔

آپ ڈاکٹر، ڈینٹسٹ یا کسی دوسرے ہیلتھ کیئر ورکر سے انجکشن لگواتے یا علاج کرواتے ہیں۔

**ان چیزوں سے بچیں :**

- اجنبی افراد کے ساتھ جنسی اختلاط۔ یہ ہمیشہ ہی خطرناک ہوتا ہے۔ اجنبی فرد کے بارے میں آپ نہیں جانتے کہ وہ اس مرض سے متاثر ہے یا نہیں۔
- غیر فطری جنسی اختلاط۔ اس میں بہت زیادہ خطرہ ہے اور اس سے ہر حال میں بچنا چاہئے۔
- جتنے زیادہ افراد کے ساتھ جنسی اختلاط ہوگا خطرہ اتنا ہی زیادہ بڑھ جائے گا۔
- نشیلی دواؤں کے عادی لوگوں کی استعمال شدہ انجکشن سوئی استعمال نہ کریں۔

**یاد رکھیئے**

ایڈز ایسی بیماری نہیں ہے جس کے خطرے کو محض خوش فہمی میں نظر انداز کیا جا سکے۔ کیونکہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ایڈز کا کنٹرول لوگوں کے رویے اور انسدادی تدابیر پر منحصر ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے لکھیں :

اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل (ایڈز)
ڈائریکٹوریٹ جنرل آف ہیلتھ سروسز، نرمان بھون
نئی دہلی 110011

**ایڈز کا علاج نہیں**
**لیکن آپ اس سے بچ سکتے ہیں**

جاری کردہ سنٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو
ڈی جی ایچ ایس، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی۔ 110002

davp 87/91

## حزب اختلاف کی نئی صف بندی

# کرتے ہیں جمع جگر لخت لخت کو

م ۔ ک مہتاب

کرناٹک کے وزیر اعلیٰ رام کرشن ہیگڑے نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ تجربہ کرنا کوئی بُری بات نہیں ہے اگر ۱۹۷۷ء کا تجربہ ناکام رہا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تجربے کرنے ہی بند کر دیئے جائیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ۱۹۸۷ء کا تجربہ کامیاب ہو جائے۔

مسٹر ہیگڑے کی مراد سیاسی تجربوں سے تھی۔ وہ بھی دوسری مخالف پارٹیوں کے رہنماؤں کی مانند چاہتے ہیں کہ مخالف جماعتیں متحد ہو کر عوام کو کانگریس کا ایک نعم البدل مہیا کریں۔ لیکن عوام ہیں کہ سب کے لوگ خائف ہیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ کانگریس آئی کے پروپیگنڈے سے یہ آگئے ہیں کہ مخالف پارٹیاں قومی پیمانے پر کانگریس آئی کا کوئی متبادل پیش نہیں کر سکیں اس لیے کانگریس ہی ایک جماعت ہے جو ملکی یک جہتی اور قومی ایکتا کی ضامن ہے چنانچہ عوام کے ذہنوں میں یہ خیال گھر کر گیا ہے کہ مخالف پارٹیوں نے جنتا پارٹی کے نام سے ایک متبادل سیاسی جماعت قائم کرنے کا جو تجربہ کیا تھا وہ بری طرح ناکام رہا اس لیے انہیں اب پھر کوئی ایسا کوئی تجربہ نہیں کرنا چاہیئے کیوں کہ عوام کو ان کے باہمی نفاق کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ خود مخالف رہنما بھی ایسی کسی کوشش کی بات زبان پر لاتے ہوئے ڈرتے تھے لیکن رام کرشن ہیگڑے کی دلیل میں کافی وزن ہے کہ ایک تجربے کی ناکامی دوسرے تجربے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔



چندر شیکھر : خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہوگا؟

## مخالف جماعتوں کا گٹھ جوڑ

۱۹۷۷ء کے پارلیمانی اور اس کے بعد ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں عوام نے جو جنتا پارٹی کی باہمی پھوٹ سے سخت نالاں تھے مخالف پارٹیوں سے پورا پورا بدلہ لے لیا تھا اور پھر سے مسز اندرا گاندھی کو بھاری اکثریت سے فتح دلائی تھی لیکن ایک دو برس بعد ہی عوام پھر سے مسز اندرا گاندھی سے برگشتہ خاطر ہوتے گئے تھے کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ جنتا پارٹی کو شکست دینے کا مطلب یہ نہیں کہ مسز اندرا گاندھی کی شخصی حکومت کے نظام یا انداز حکمرانی میں کوئی تبدیلی آگئی ہے قلت مہنگائی بے روزگاری، ریاستی جھگڑے، فرقہ واریت اور علاقہ پرستی کے مسائل وہیں کے وہیں کھڑے تھے۔ جہاں وہ مسز اندرا گاندھی کے اقتدار سے ہٹنے کے بعد ۱۹۷۷ء میں کھڑے تھے۔ بلکہ کانگریس کے مرکزی اور علاقائی فرعونوں کی فرعونیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے عوام نے پھر سے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ مسز اندرا گاندھی کو پھر سے اقتدار میں لانا ان کے مسائل کا حقیقی حل نہیں تھا۔ بہرکیف نہ جانے رفتن نہ جائے فاندان کے معد اقتے انہوں نے کانگریس کے اقتدار کو کم تر برائی سمجھ کر برداشت کر لیا تھا۔

لوگوں کی اکتاہٹ اس بات سے ظاہر تھی ضمنی اور بلدیاتی انتخابات میں کانگریس کے امیدواروں کو منہ کی کھانی پڑ رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسری ریاست کانگریس کے ہاتھوں سے نکل رہی تھی۔ آسام میزورم پنجاب، تری پورہ اور اروناچل کے مسائل دن بدن پیچیدہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یوں دکھائی دینے لگا تھا گویا مسز گاندھی میں ملکی مسائل کو حل کرنے کی ہمت نہیں رہی اور وہ محض اپنی ہمہ گیر شخصیت



رام کرشن ہیگڑے

کے سبب ان آتش گیر مادوں کو دبائے ہوئے ہیں چنانچہ یہ خیال عام ہوگیا تھا کہ ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں یا تو کانگرس اقتدار میں واپس نہیں آسکے گی اور اگر آبھی گئی تو بہت معمولی اکثریت کے ساتھ۔ ان دنوں جموں وکشمیر اور آندھرا پردیش میں کانگرس کے رہنماؤں نے جو دھاندلیاں



جیوتی باسو

کیں انہوں نے کانگرس کے آمرانہ ارادے بے نقاب کر دیئے تھے اور لوگوں نے ایک بار پھر مخالف جماعتوں کی جانب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ خیال عام ہوگیا تھا کہ کانگرس اب کوئی جمہوری نظام نہیں بلکہ وہ ہر حیلے بہانے سے مرکز اور ریاستوں کی حکومتوں پر قابض رہ کر شہنشاہی کرنا چاہتی ہے۔

آزادی کے چالیس برسوں میں کسی اور پہلو سے ملک میں ترقی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو جمہوریت کی جڑیں ضرور مضبوط ہوئی ہیں [illegible]

چاہیئے۔ ملک کسی ایک شخص یا جماعت کی جاگیر نہیں۔

کانگرس کے خلاف بد دلی کے اس جذبے نے مخالف جماعتوں کی پھر حوصلہ افزائی کی کہ وہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور کانگرس کا کوئی نعم البدل تلاش کریں۔ چنانچہ سری نگر سے کلکتہ تک کئی ریاستی راجدھانیوں میں جہاں کانگرس کی حکومت نہیں تھی غیر کانگرسی حکومتوں کے وزراء اعلیٰ اور مخالف جماعتوں کے رہنماؤں کی میٹنگیں منعقد ہونے لگیں جن کو کان کلیو کا نام دیا گیا۔ مخالف پارٹیوں کے اس گٹھ جوڑ سے عوام کی امیدیں بھی بڑھیں اور وہ سوچنے لگے کہ شاید ملک میں درست قسم کا جمہوری نظام قائم کرنے کے لیے کوئی دوسری مضبوط سیاسی جماعت قائم ہو جائے۔ ان گٹھ جوڑوں میں جہاں کانگرس کی زور زبردستی اور خامیوں کو بے نقاب کیا جاتا رہا وہاں مرکز اور ریاستوں کے باہمی تعلقات میں ریاستوں کے لیے مزید اختیارات کا مطالبہ بھی زور پکڑ گیا۔ اگرچہ علاقائی پیمانے پر یہ میٹنگیں کامیاب ہوئیں لیکن وہ مرکزی یا ملک گیر پیمانے پر کوئی شکل نہیں بن سکی۔ ہر اجلاس کوئی ٹھوس فیصلہ کرنے کی بجائے کسی آئندہ اجلاس کی تاریخ مقرر کرنے کے بعد اٹھ گیا۔ بہرحال ان میٹنگوں سے عوام اور مخالف پارٹیوں پر ایک بار پھر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ عوام دلی رغبت سے نہیں بلکہ ایک مجبوری کے عالم میں کانگرس کو برسر اقتدار لاتے ہیں اور اگر انہیں کوئی قابل اعتماد اور ثابت قدم جماعت یا متبادل رہنما نظر آئے تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ لیں گے۔

غور وفکر اور میل ملاپ کا یہ عمل ابھی زور ہی پکڑ رہا تھا کہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کا وہ المیہ ہوگیا جب مسز گاندھی کو ان کے دو محافظوں نے ہلاک کر دیا۔ اس سانحہ نے ملکی سیاست کا رخ ہی پلٹ ڈالا۔ کانگرس نے اسے ملکی سلامتی اور یک جہتی کا سوال بنا لیا۔ لوگوں میں ایک فرقے کے خلاف جذبات ابھرے اور عوام کو ایک تاثر دیا گیا کہ ملک کے ٹکڑے کرنے کی سازش غیر ملکی طاقتوں نے کی ہے اگر ملک کی وحدت کو قائم رکھنا ہے اور اسے غیر ملکی سازشوں سے محفوظ رکھنا ہے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کانگرس اور اس کے نوجوان رہنما راجیو گاندھی کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔

زور دار پرچار کی مہم نے عوامی فکر کے دھارے کا رخ پھر بدل دیا۔ وہ کانگرس کی تمام کوتاہیوں اور کمزوریوں کو فراموش کر گئے اور مسٹر راجیو گاندھی کو ایسی شاندار فتح حاصل ہوئی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی حتیٰ کہ ہندوستانی جمہوریت کے بانی جواہر لال نہرو بھی اتنی اکثریت سے کامیاب نہیں ہوئے تھے جتنی اکثریت مسٹر راجیو گاندھی کو حاصل ہوئی [illegible]

اب راجیو گاندھی نے ملکی مسائل کو حل کرنے کے لیے حقائق پر مبنی حکومت کے ساتھ ساتھ ایک ایماندار اور کھلا جمہوری نظام دینے کا وعدہ کیا جسے شروع میں عوام نے بہت پسند کیا۔ حکومت کا زیادہ تجربہ نہ ہونے کے سبب سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے نئے وزیر اعظم نے کئی نئی پالیسیاں وضع کیں کئی نئی وزارتیں بنائیں، کئی حکمران وزارت تبدیل کیے اور جلد بازی میں کئی سمجھوتے بھی کر ڈالے جن میں سے کئی ایک میں انہیں بعد ازاں پسپائی بھی اختیار کرنی پڑی۔ نئے وزیر اعظم نے منجھے ہوئے سیاستدانوں اور عوام کے ارادوں و خواہشات سے واقف عوامی نمائندوں کی بجائے اپنے قریبی دوستوں کو اپنا مشیر بنا کر اپنے آپ کو ایک ایسے حلقے میں قید کر لیا جہاں دلو ان کا عوام سے رابطہ رہا نہ صائب رائے حاصل ہو سکی۔ یہاں تک کہ انہوں نے صدر جمہوریہ سے صلاح مشورہ کا سلسلہ بھی محدود کر دیا۔

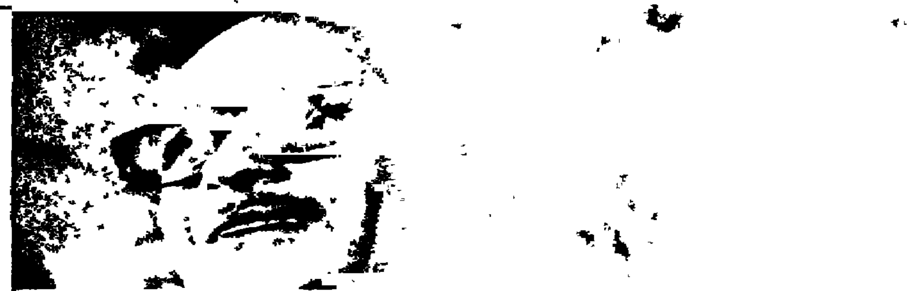
اختیارات وزیر اعظم اور ان کے گرد گھومنے والے چند ہاتھوں میں مرکوز ہونے لگے۔ اکثر وزیر بے کار اور بے معنی نظر آنے لگے۔ بڑے بڑے تجربہ کار سیاست دانوں اور حکومت کے پختہ کار سیکرٹریوں کی پگڑی اچھلنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے کام اور پالیسیوں کی پیش رفت



این۔ ٹی۔ راما راؤ

میں رکاوٹ آنے لگی اور حکومت کے کاروبار پر سیاسی سماجی ومعاشی حلقوں میں چھینٹے اڑائے جانے لگے پنجاب کے واقعات نے مرکز کو بدنام کر کے رکھ دیا۔

مسٹر راجیو گاندھی کی حکومت کے دو برس بعد ملک کے عوام اور دوفریق پھر سمجھنے لگے کہ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے حکومت کی اہلیت کار کے لیے نہیں بلکہ ایک شخص اور اس کی جماعت سے ہمدردی کے نام پر ووٹ [illegible]



ایل کے اڈوانی : بی۔ جے۔ پی مارکہ سیاست

رکا ہوا ہے جہاں وہ مسز گاندھی کے قتل کے وقت رکا ہوا تھا۔ مخالف جماعتیں بھی جو ۱۹۸۵ء کی کمر توڑ شکست کے بعد نیم جاں حالت میں شکستہ پاپڑی تھیں پھر سوچنے لگیں کہ عوام کو اس طرح کی حکومت نہیں مل سکی جیسی وہ چاہتے تھے یا جو ان کے درد کی دوا بن سکے اس لیے اگر وہ پھر کوشش کریں تو ہو سکتا ہے کہ سراب زدہ عوام ایک بار پھر ان کا ہاتھ پکڑ لیں۔

مخالف جماعتوں کے اس خیال کو اس لحاظ سے اور بھی تقویت ملی ہے کہ مغربی بنگال، کیرلا، تری پورہ جموں و کشمیر اور پنچایتوں یا بلدیات کے حالیہ انتخابات میں ووٹروں کو جہاں بھی اچھی مقامی قیادت یا قائد نظر آیا ہے انہوں نے اس کا ساتھ دیا ہے اور کانگرس کہیں اقتدار میں نہیں آسکی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوہا گرم ہے اسے اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔

ان حالات نے مخالف جماعتوں کو اکسایا ہے کہ وہ پھر سر جوڑ کر بیٹھیں اور عوام کی انگلی پکڑیں۔ اس سلسلے میں ۵ ہر اپریل کو دہلی میں غیر کانگرسی ریاستی سرکاروں کے وزرائے اعلیٰ کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں کانگرس اور مرکزی سرکار کی خامیوں اور کوتاہیوں پر صرف غور کیا گیا بلکہ انہیں بے نقاب کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ تیرہ مخالف جماعتوں کے نمائندے بھی اس غور و فکر میں شریک ہوئے اور سبھی نے اس میٹنگ کو بہت کامیاب قرار دیا۔ میٹنگ میں صدر جمہوریہ کا انتخاب کے بارے میں کوئی متفقہ لائحہ عمل اختیار کرنے پر بھی غور ہوا لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے کی بجائے ان معاملات کو سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کی کانفرنس میں طے کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو حیدرآباد میں ہونا طے پائی تھی لیکن ۱۴ اور ۱۵ مئی کو نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔

وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس اور سیاسی جماعتوں کی مشترکہ کانفرنس کے درمیان امید و یاس کے کئی دور گذرے۔ جہاں پی اپیندر، مدھو دنڈوتے، جیوتی باسو اور دوسرے رہنماؤں نے اس اجلاس کو مخالف جماعتوں کا متحدہ محاذ قائم کرنے کی جانب ایک "اچھا آغاز" قرار دیا وہاں بھارتی

جنتا پارٹی کے صدر مسٹر ایڈوانی نے کہا کہ ان جماعتوں کا نقطہ نظر اتنا مختلف ہے کہ کانگرس کا متبادل قائم کرنے کی بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ یہ جماعتیں پارلیمان میں حکومت کی نکتہ چینی کرنے کے لیے یا کسی خاص موضوع پر غور کرنے کے لیے تو متحد ہو سکتی ہیں لیکن مستقل بنیادوں میں یکجا نہیں ہو سکتیں۔

جب مختلف جماعتوں میں بنیادی اختلافات ہوں تو مخالف جماعتوں کا کوئی متحدہ یا مشترکہ فورم کیسے وجود میں آسکتا ہے۔ پھر بھی کانگرس راج سے دل شکستہ عوام نے امید باندھے رکھی کہ ۱۴ اور ۱۵ مئی کو جب مخالف سیاسی جماعتیں جمع ہوں گی تو وہ انہیں کوئی خوش خبری سنائیں گی۔ اس دوران مختلف سیاسی جماعتوں میں یہ سوال زیر بحث رہا کہ مخالف جماعتوں کی کوئی کنفیڈریشن بنائی جائے یا ان کا متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔

کنفیڈریشن کا خیال جنتا پارٹی کے رہنما رام کرشن ہیگڑے کا پیش کردہ ہے۔ آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ مسٹر راما راؤ اس خیال کے پرزور حامی ہیں۔ اس نظریے سے مراد یہ ہے کہ سب پارٹیاں اپنا ریاستی اور کل ہند وجود قائم رکھیں لیکن ملکی پیمانے پر ایک کنفیڈریشن قائم کریں جو ایک جماعت کی شکل میں ہو جس کا ایک پروگرام اور ایک نصب العین ہو۔ اس کے مقابلے میں کمیونسٹ مارکسسٹ مخالف پارٹیوں کے رہنما ایک متحدہ محاذ چاہتے ہیں جیسا کہ انہوں نے مغربی بنگال اور کیرالا میں قائم کیا تھا۔ اس میں مختلف ہم خیال پارٹیوں کی نشستیں مخصوص کر دی جاتی ہیں اور انتخاب کے بعد وہ متحدہ محاذ کی حکومت میں شامل ہو جاتی ہیں۔ دائیں بازو کی جماعتوں کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ اس میں اشتراکی نظریات کے پھیلاؤ کی گنجائش موجود ہے۔ اسی پر بس نہیں کمیونسٹ پارٹی دائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے کی بھی حامی نہیں تھی۔

مخالف جماعتوں میں متحد ہونے اور عوام کو

کانگرس کا متبادل مہیا کرنے کے سوال پر کتنے وسیع اختلافات ہیں وہ ۱۴ اور ۱۵ مئی کو آندھرا پردیش بھون میں گیارہ مخالف جماعتوں (ہم خیال) کے رہنماؤں کے اجلاس میں کھل کر سامنے آگئے۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور آسام گن پریشد اختلافات کے سبب اجلاس میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کو فرقہ وارانہ پارٹی ہونے کے سبب شرکت کی دعوت ہی نہیں دی گئی حالانکہ اکالی دل جیسی خالص فرقہ پرست پارٹی کے نمائندے اجلاس میں موجود تھے۔

اجلاس میں صدر کے عہدہ کے لیے مخالف امیدوار کھڑا کرنے اور بدعنوانیوں کی تحقیقات، سری لنکا اور بعض دیگر معاملات پر قرار دادیں منظور کی گئیں۔ پنجاب میں راشٹرپتی راج نافذ کرنے کی مذمت کی گئی۔ لوک دل کے دونوں دھڑوں پر ایک ہو جانے کے لیے زور دیا گیا مگر جہاں تک کانگرس کا کوئی نعم البدل تیار کرنے کے بارے میں عوام کو کوئی امید افزا خبر سنانے کا سوال تھا مخالف جماعتوں کے اس اجلاس نے بھی عوام کا دل توڑ دیا۔ کنفیڈریشن ہو یا متحدہ محاذ دونوں تجاویز پر کسی آئندہ اجلاس میں غور کیا جائے گا۔ بلکہ اسے ناقابل عمل ہی سمجھا گیا اور مختلف جماعتوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی سطح پر غور کریں مختلف جماعتیں کیسے متحد ہو سکتی ہیں اور قوم کو کوئی متبادل قیادت کس طرح مہیا کی جا سکتی ہے۔

ان واقعات کے پیش نظر یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مخالف جماعتوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ ملکی یا عوامی وفاداری کی نسبت جماعتی وفاداری کو زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ گزشتہ انتخابات میں سب جماعتوں پر روشن ہو چکا ہے کہ ان کے رسوخ کے حلقے کہاں کہاں ہیں اس بنا پر وہ مل کر بیٹھ سکتی ہیں لیکن کوئی جماعت موجودہ حالات میں قناعت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں ہیں۔ حالانکہ ان کوششوں اور باہمی ٹکراؤ کا حشر وہ بارہا دیکھ چکی ہیں۔ مخالف جماعتوں کو رتی بھر احساس نہیں کہ عوام ایک جماعت کی لگاتار حکومت سے دل برداشتہ ہو چکے ہیں وہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا چاہتے ہیں تاکہ اگر متبادل جماعت برسر اقتدار نہ بھی آئے تو بھی برسر اقتدار جماعت کو اس کا خوف تو ہو اور وہ من مانی نہ کرے۔ لیکن گزشتہ تین چار کوششوں کے نتائج سے ظاہر ہے کہ یہ مخالف جماعتیں عوام کے جذبات کو کبھی نہیں سمجھیں گی اور کانگرس کو اپنا مشترکہ دشمن سمجھنے کے باوجود اس کا کھیل کھیلتی رہیں گی تاکہ عوام کہتے رہیں کہ اور کس کی انگلی تھامیں؟

## وطن عزیز کی سیاست کی نیرنگیاں

# محو حیرت ہوں کہ

● جواہر لال کول

ہمارے دیس ہندوستان جنت نشان کی سیاست بڑی رنگارنگ ہے۔ اس کی نیرنگیوں کو دیکھ کر بعض اوقات اقبالؔ کا یہ مصرع بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔ ؎ محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی،

اب اسے ہندوستانی سیاست کی ستم ظریفی کہا جائے کہ مجبوری، کہ جو حزب اختلاف گزشتہ کافی عرصہ سے وزیر اعظم راجیو گاندھی کو سوالوں کے جواب میں پھنسا کر، اور اعتراضات کی بوچھار کا شکار بنا کر ایک ایسے گھیرے میں گھیرنا چاہتا تھا جس سے نکلنا ان کے لیے مشکل ہو جائے، اور اس کے بعد یا تو وہ حزب اختلاف ...سے سپر ڈالیں یا کم از کم کچھ عرصے کے لیے ہی سہی، ان کی حکومت کا قافیہ ضرور تنگ رہے۔

مگر اس کے بعد پچھلے دنوں ایک انہونی ہوئی۔ جب صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کے باہمی اختلافات نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور یہ افواہ پھیلی کہ صدر کے ذریعہ وزیر اعظم اور ان کی کابینہ برخاست کی جا سکتی ہے۔ تو اسی حزب اختلاف نے متحد ہو کر وزیر اعظم کی حمایت شروع کر دی۔

شاید ہی کوئی پارٹی ہو جس نے صدر جمہوریہ کے ذریعہ وزیر اعظم کی برخاستگی کی تجویز کی زوردار مخالفت نہ کی ہو۔ وزیر اعظم اور ان کی کابینہ کی کارکردگی کی سخت نکتہ چینی اور ان کی حکومت کے طریقۂ کار کی شدید ترین مخالفت کے باوجود حزب اختلاف نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کہ بدعنوانی کے الزامات کو بہانہ بنا کر راجیو حکومت کو برخاست کیا جائے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ حزب اختلاف موجودہ کانگریسی حکومت کو ایک دن بھی اقتدار میں دیکھنا نہیں چاہتا اور ایک متبادل کی سعی (لا حاصل) شب و روز جاری ہے۔ تاہم اسے حزب اختلاف کی مجبوری یا ان دیکھے مستقبل کے شکوک و شبہات پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے کہ اس تازہ معاملے میں مخالف جماعتوں نے مرکزی حکومت کی مخالفت نہیں کی بلکہ حمایت کا راستہ اپنایا۔

فطری طور پر اس صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیر اعظم کے رفقاء نے صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کے باہمی اختلافات کو ایک ایسا موڑ دے دیا، اور حزب اختلاف کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا جہاں حزب اختلاف کو مجبور ہو کر اس سمت کا تعین کرنا پڑا، جو بالآخر حکومت کے حق میں جاتی ہے۔

اور شاید اسی بھانپ کا ادراک کرتے ہوئے صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے یہ بیان جاری کیا کہ وزیر اعظم کو برخاست کرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں۔

؎ چشم ما روشن دل ما شاد کے مصداق سرکاری حلقوں نے اس صورت حال کی داد دی ہے۔

صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ وزیر اعظم کے خلاف صف آرائی سے دست بردار ہوتے نظر آرہے ہیں اور اسی کے ساتھ ہی گزشتہ دنوں صدر و وزیر اعظم تنازعے کا گرد و غبار بیٹھنا شروع ہو گیا ہے۔

اس تنازعے کا آغاز صدر جمہوریہ کی اس شکایت سے ہوا تھا کہ وزیر اعظم صدر کے تئیں آئینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو رہے ہیں۔ آئین کی رو سے صدر کو حکومت کے ضروری فیصلوں اور پالیسیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا حق ہے۔ گیانی ذیل سنگھ کی شکایت تھی کہ وزیر اعظم راجیو گاندھی جان بوجھ کر انہیں اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ معاملہ شروع میں اتنا زیادہ سنجیدہ نہیں تھا اور وزیر اعظم چاہتے تو اسے کو فی الفور رفع دفع کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور کہا کہ انہوں نے بہت سی روایات توڑی ہیں اور یہ معاملہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ اسی طرح معاملہ طول پکڑ گیا اور ملک گیر بحث کا موضوع بن گیا۔

دراصل راجیو گاندھی کو شک تھا کہ صدر ناراض کانگریسیوں کو شہ دے رہے ہیں اور کانگریس کی تقسیم کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ پرنب مکھرجی اور ان کے حامیوں کے ایک وفد سے ملاقات کر کے جب صدر نے راجیو گاندھی حکومت کے خلاف فردِ جرم وصول کی تو یہ شک یقین میں بدل گیا۔ کئی کانگریسی ممبران پارلیمنٹ نے اس پر کڑی تنقید کی۔ پارلیمنٹ میں معاملہ اٹھا تو راجیو گاندھی نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے کبھی بھی صدر کو نظر انداز نہیں کیا اور ہر موقع پر ان کو تمام ضروری معلومات فراہم کی جاتی رہی ہیں۔ لیکن ۹ مارچ کو صدر نے وزیر اعظم کے نام ایک خط لکھ کر ان کے اس دعوے کی تردید کی۔ حکومت نے تو اس خط کے بارے میں چپ سادھ لی تھی لیکن دہلی کے ایک اخبار نے اسے کو شائع کر کے معاملے کو ایک قومی آئینی تنازعے کی شکل دے دی۔

خط کی اشاعت سے وزیر اعظم کو خاصا دھکا لگا کیوں کہ انہیں یہ شک تھا کہ خط کو راشٹرپتی بھون کے ذرائع نے اخبار کے حوالے کیا ہے۔ کانگریسی حلقوں نے اسے وزیر اعظم کو بدنام کرنے کی سازش سے تعبیر کیا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر کانگریس کے بعض نیتاؤں کو حزب اختلاف، بیرونی طاقتوں اور خود صدر کی ملی بھگت کے ذریعہ ملک کے نظام حکومت کو تہہ و بالا کرنے کی سازش بھی نظر آنے لگی۔

گزشتہ برس ایک کانگریسی ممبر پارلیمنٹ نے لوک سبھا میں کھلے عام یہ الزام لگایا تھا کہ راشٹرپتی بھون میں چند مشتبہ دہشت گردوں کو پناہ حاصل ہوئی تھی۔ اس ممبر پارلیمنٹ کے۔ کے تیواری کو اس بات پر سخت و سست کہنا تو در کنار وزیر اعظم نے اسے وزیر بنا دیا۔ اس سے ظاہر تھا کہ وہ صدر کے نکتہ چینوں اور ناقدوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

دوسری طرف گزشتہ ایک برس کے دوران صدر گیانی ذیل سنگھ مسلسل حزب اختلاف کے رہنماؤں سے ملاقات کرتے رہے ہیں۔ اپنے حامیوں کے درمیان وہ وزیر اعظم کے طریقۂ کار پر تنقیدیں بھی کرتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راجیو گاندھی سے ناراض بہت سے کانگریسی ممبران پارلیمنٹ اور نیتا چوری چھپے صدر سے ملاقات کرتے رہے ہیں ایسی حالت میں یہ شک ہو نا کہ صدر کانگریس کے اندر تقسیم چاہنے والوں کو شہ دے رہے ہیں غیر فطری



گیانی ذیل سنگھ : اپنی بات منوائی ہے



انہیں لڈو نہیں اطلاعات درکار ہیں

نہیں تھا۔ یہی سبب تھا کہ کانگریس پارٹی گیانی جی کو دوبارہ عہدہ صدارت کا امیدوار بنانے سے پیچھے ہٹ گئی۔ تب تک دن میں راشٹرپتی بھون میں دوبارہ پہنچنے کی خواہش کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی لیکن وہ اس کا برملا اظہار کرنے سے کتراتے رہے ہیں پھر بھی حزب اختلاف کے جو رہنما ان سے ملتے رہے ان کو یہ احساس ہوا کہ اگر تمام حزب اختلاف حمایت کرے تو کانگریس کی تقسیم کے بعد گیانی جی دوبارہ صدر بن سکتے ہیں۔

فیرفیکس تنازعے اور بوفورس توپوں کے معاملے کے بعد وزیراعظم گہرے بحران کی صورت حال میں پھنس گئے تھے۔ پورا حزب اختلاف ان کے خلاف متحد نظر آرہا تھا۔ ایسے موقع پر افواہ اڑی کہ صدر اعلیٰ عہدوں پر بدعنوانی کے معاملے پر وزیراعظم راجیو گاندھی کو ان کے عہدے سے برخاست کر سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ افواہ خود حکمراں جماعت کے چند رہنماؤں کے ذریعے اڑائی گئی تاکہ فیرفیکس اور بوفورس تنازعات سے توجہ ہٹائی جا سکے اس

کے دو مقصد تھے ایک یہ کہ کانگریس میں راجیو گاندھی سے ناراض عناصر پارٹی کی تقسیم کی صورت میں کسی ایک رہنما کے پیچھے کھڑے ہونے کی حالت میں نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں راجیو گاندھی کی حکومت کو صدر کے ذریعے برخاست کیے جانے کے سبب کانگریس کئی ٹکڑوں میں ٹوٹ سکتی ہے۔ ایسا ہوا تو نہ صرف یہ کہ کانگریس اپنا موجودہ رہنما کھو دے گی بلکہ مرکزی اقتدار سے بھی محروم ہو سکتی ہے۔ دوسرا مقصد ... کے بارے میں پھینکنا تھا۔

یہ حکمت عملی کامیاب ہو گئی۔ کمیونسٹ پارٹیوں نے اعلان کر دیا کہ صدر کے ذریعے وزیراعظم کو برخاست کرنے کا کام ملک کے جمہوری آئین کا تختہ پلٹنے کے مترادف ہوگا۔ جنتا پارٹی نے بھی یہ اعلان کیا کہ صدر کو یہ اختیار نہیں دیا جانا چاہیے کہ وہ اکثریت کے باوجود وزیراعظم کو برخاست کر سکیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے وزیراعظم سے استعفیٰ دینے کا مطالبہ ضرور کیا لیکن صدر کے ہاتھوں انہیں برخاست کیے جانے کی حمایت نہیں کی گئی اس طرح صدر گیانی ذیل سنگھ کو حاصل ہونے

والی متوقع حمایت کی بنیاد ہی ہل گئی ایسی حالت میں صدر کے پاس اپنے قدم واپس لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔ حزب اختلاف کی حمایت کا دعویٰ ہوا ہو چکا تھا۔ کانگریس کے اندر راجیو گاندھی کے خلاف عناصر بغاوت کرنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ اپنی لڑائی میں اکیلے پڑ جانے کا یقین ہو جانے کے بعد صدر کے لیے یہی مناسب تھا کہ بندوقیں نیچی کر لیں اور انہوں نے وہی کیا۔ راشٹرپتی بھون کے ایک اعلان میں واضح طور پر کہا گیا کہ وزیراعظم کو برخاست کرنے کے بارے میں صدر جمہوریہ نے کبھی بھی غور نہیں کیا۔ اور اس طرح صدر وزیراعظم تنازعے کے ڈرامے کے ایک سین پر پردہ پڑ گیا۔

یہ مضمون گزشتہ ماہ قلم بند کیا گیا تھا اس کے بعد صورت حال خاصی بدل گئی ہے۔ تاہم مضمون کی دلچسپی کے پیش نظر اسے من و عن شائع کیا جا رہا ہے بہر حال یہ بھی ایک نقطہ نظر ہے۔ مصنف کے نقطۂ نگاہ سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

# تاریک بستیاں

مظفر حسین سید

شہر اعظم دہلی کے ارباب اختیار اس نگری کے حسن وجمال کے کتنے ہی قصیدے پڑھیں۔ راجدھانی میں مہیا شہری سہولیات کی کتنی ہی طویل فہرست گنائیں اور بیرونی سیاح یہاں کی صاف ستھری خوبصورت کالونیوں چوڑی سڑکوں اور عالی شان عمارتوں کو دیکھ کر کتنے ہی متاثر ہوں بلدیہ کے افسران اپنی کارکردگی اور کارناموں کے سلسلے میں کتنی ہی شیخیاں کیوں نہ بگھار لیں لیکن اسی شہر میں کم از کم ساڑھے ایسی انسانی بستیاں ضرور ہیں۔ جن کے باشندوں کے لیے عرصۂ حیات آج بھی تنگ ہے، اور جو اس دور جدید میں بھی قرون اولیٰ کے انداز سے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

راجدھانی کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی ان بستیوں کو عرف عام میں جھگی جھونپڑی کالونیاں کہا جاتا ہے۔ ان آبادیوں کے مکینوں کے لیے بل ڈوزر کی دہاڑ اور پولس کی گاڑیوں کے سائرن ایک روزمرہ کی بات ہیں۔ ان علاقوں میں یہ کہانی ہر دوسرے تیسرے دن دہرائی جاتی ہے جھگیوں کا انہدام اوران کے مکینوں کی بازآبادکاری کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ انتخابات کی شبھ گھڑی آجاتی ہے۔ اوران ناجائز بستیوں کو قانونی درجہ دے دیا جاتا ہے۔

دھلی میں بڑے ادارے ڈی ڈی اے کے سرمایہ کی دوبارہ بسائی ہوئی ان بستیوں کے مکینوں کو متبادل رہائش فراہم کرے۔ اس مقصد کے لیے ڈی ڈی اے کبھی تعمیر شدہ مکان دیتا ہے اور کبھی محض زمین کا ایک قطعہ۔



یا تو دیوانہ ہنسے یا تو جسے توفیق دے
ورنہ اس دنیا میں رہ کر مسکرا سکتا ہے کون

دہلی کے تمام نظر افروز، اعلیٰ رہائشی بنگلوں، ڈی۔ڈی۔اے کی فلک بوس عمارتوں اور دوسری ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے مکانات کے کنارے دکھائی دینے والے یہ گھٹیا نما مکانات، جھگی جھونپڑی کہلاتے ہیں۔ اسے ہم اپنے خوب صورت شہر کا المیہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ فرینڈز کالونی اور ڈیفنس کالونی جیسے علاقوں کے

ساتھ ساتھ یہ جھگی جھونپڑی کالونیاں بھی موجود ہیں۔ تمام بڑے شہروں میں اس طرح کی کالونیاں موجود ہیں، لیکن ہماری راجدھانی دہلی اس سلسلے کی بدترین مثال ہے۔

اگرچہ یہ کالونیاں دہلی بھر میں پھیلی ہوئی ہیں، لیکن شہر کے مشرقی حصے میں زیادہ ہیں، جو جمنا پار کا علاقہ کہلاتا ہے۔ دریا کو پار کرنے کے بعد

کیا جا سکتا کہ اس مسئلے کے حل نہ ہونے میں انتظامیہ کی بدانتظامی اور نااہلی بھی شامل ہے نہ صرف انتظامیہ بلکہ اس سے منسلک تمام ادارے لاپرواہی برتتے رہے ہیں۔ مقامی سیاسی لیڈر بھی جھگی جھونپڑیوں کو بسوانے میں مدد کرتے ہیں۔ راجدھانی میں اس طرح کی تقریباً ۸۰۰ کالونیاں موجود ہیں۔



ہر مہینے ایک جھگی کا اضافہ ہو جاتا ہے، ایک خاندان اور بس جاتا ہے

یہ سیلم پور، ترلوک پوری، شکر پور اور پٹپڑ گنج کے نزدیک نیز نانگلوئی اور جہانگیر پوری علاقوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جنوبی دہلی کی مشہور رہائش گاہوں اوکھلا اور کالکاجی اور یہاں تک کہ اندر پرستھ اسٹیٹ کے علاقے میں بھی موجود ہیں، جو شہر کے قلب میں واقع ہے، اور ڈی۔ ڈی۔ اے کے انجینئرنگ ہیڈکوارٹرز کی فلک بوس عمارت سے چند قدم کے فاصلے پر واقع ہے۔ ڈی۔ ڈی۔ اے عوامی زمین کی محافظ کہلاتی ہے، اور اسے دلی کی بڑھتی ہوئی آبادی کے رہائشی مسائل کے حل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جھگی جھونپڑی کے بڑھنے کی خاص وجہ نہ صرف پڑوسی ریاستوں بلکہ کافی دور دراز، بہار، بنگال، آسام اور یہاں تک کہ بنگلہ دیش سے یہاں آ کر بسنے والوں کا

ان علاقوں میں سیور لائن، پانی، سڑکیں، طبی سہولیات، راشن کی دکانیں، روشنی کا انتظام اور دوسری بہت سی ضروریات زندگی میسر نہیں ہیں۔ تعلیمی اداروں کے یہاں موجود ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔

پورا علاقہ مکھیوں، مچھروں اور گندگی کی ناقابل برداشت بدبو سے بسا رہتا ہے۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو اس کو طبی امداد ملنا بھی محال ہوتی ہے۔ سڑک نام کی یہاں کوئی چیز نہیں ہے۔ کالونیوں کے اندر کیچڑ اور دھول بھری گلیاں دکھائی دیتی ہیں جو کھلی ہوئی سیور لائن کا منظر پیش کرتی ہیں۔ شہر کے دوسرے علاقوں یا پڑوسی اضلاع سے بھاگے ہوئے جرائم پیشہ لوگ ان گم نام جھگی کالونیوں میں پناہ لیتے رہتے ہیں۔

برسوں میں حیرت انگیز طور پر تین گنی ہو گئی۔ ہر برس نقل وطن کر کے دلی آنے والے دو لاکھ افراد میں سے بیشتر ان کالونیوں میں ہی کھپ جاتے ہیں۔

جھگی جھونپڑیوں کا صحیح تجزیہ کرنے کے لیے ہم نے مشرقی دہلی میں سیلم پور کے قریب دن بدن پھیلتی ہوئی ایک کالونی کا جائزہ لیا، جو شاید سب سے بڑی جھگی کالونی ہے اور ویلکم کالونی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ دس سال پرانی بتائی جاتی ہے یہاں تیرہ بلاکوں میں تقریباً پانچ ہزار جھگیاں ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں کی آبادی کسی طرح سے بھی تیس ہزار سے کم نہیں ہے۔ جہاں ایک چھت کے نیچے پانچ یا سات افراد رہتے ہیں۔ جھگیوں کے تمام باشندوں کا اپنا راشن کارڈ ہے۔ ان جھگیوں کے مالک زیادہ تر لوگ وہیں رہتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی جھگیوں میں تالا لگا کر کہیں اور قیام کرتے ہیں۔ وہ زمینوں پر قبضہ کرتے ہیں۔ جھگی بناتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو اسے اچھے داموں میں فروخت کر دیتے ہیں۔ اس وقت ایک جھگی کی قیمت پانچ، چھ ہزار روپے تک ہے۔ کچھ لوگ جنھیں ڈی۔ڈی۔اے دوسری جگہوں پر رہائش فراہم کر دیتی ہے، اپنی ان جگہوں کو بیچ کر پھر ان کالونیوں میں آ بستے ہیں، تاکہ رہائش ملنے کا ایک اور موقع ہاتھ آ سکے۔

اسی کالونی میں دو فلاحی ادارے، وکاس سمیتی اور ناگرک سہیوگ سمیتی کے نام سے کام کرتے ہیں۔ جن کی قیادت بالترتیب افتخار احمد اور حبیب صاحب کرتے ہیں۔ ہر بلاک کا اپنا پردھان ہوتا ہے۔

پانی کی سپلائی کے لیے یہاں کے باشندوں نے ہینڈ پمپ لگا رکھے ہیں، جو ہر بلاک میں کم سے کم ایک جگہ پر ضرور موجود ہیں۔ اس کے لیے ہر آدمی چندہ دیتا ہے۔

آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن یہ سچ ہے کہ ہر جھگی والا غریب نہیں ہوتا۔ یہاں کے کچھ باشندوں کی ماہانہ آمدنی ۲۵۰۰ روپے تک ہے۔ کالونی میں ۵۰ سے ۶۰ تک ٹیلی ویژن، ۳۰، ۴۰ کولر، ۵، ۷ فریج، اور تعیش کی تمام دوسری اشیا موجود ہیں۔ زیادہ تر لوگوں نے اپنے قریب ترین مکانوں سے بجلی لے رکھی ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک ڈی۔ ڈی۔ اے کی سرگرمیوں کا تعلق ہے، اس نے چند ماہ قبل کچھ پہلے ان علاقوں میں لگوائے



ان کے مستقبل کی کتاب میں کیا لکھا ہے ؟

عام طور پر ایک جھونپڑی ۲۵ گز جگہ میں بنی ہوئی ہے لیکن کچھ اس سے بڑی بھی ہوتی ہیں۔ آپ کچھ دو منزلہ جھگیاں بھی یہاں دیکھ سکتے ہیں۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ یہاں رہنے والے لوگوں میں ۲۰ فی صد سرکاری ملازم ہیں۔ مشکل سے ۲۰ فی صد بچے اسکول جاتے ہیں۔ یہاں کوئی ڈاک خانہ تو کیا لیٹر بکس تک موجود نہیں ہے۔ لیکن پوسٹ مین یہاں ہفتہ میں دو یا تین بار آتا ہے، اور اس کا خاص کام پاسپورٹ پہنچانا ہے۔

یہاں ۱۲ مندر، ۶ مسجدیں اور ۷، ۲ ڈھابے ہیں۔ اکثر لوگ طبی سہولیات کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے مرتے رہتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کو زیادہ تر اس بات کی شکایت ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں کی تلاش میں پولیس ان کو تنگ کرتی ہے۔ لیکن ایک دل چسپ پہلو یہ ہے کہ تمام جھگی جھونپڑی والے لیفٹیننٹ گورنر شری اپنے ایل۔ کپور کے بے حد معترف ہیں، جنھوں نے خود اس علاقے کا دورہ کیا اور اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی ان کے لیے کوئی بہتر بندو بست کریں گے۔

اب سب سے اہم بات انتظامیہ کی ذمہ داری کی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس عجیب و غریب ناسور کے پیچھے کیا اسباب ہیں، ان کو تلاش کیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ صرف حکومت، انتظامیہ یا دوسرے سرکاری ادارے جھگیوں کے بڑھنے یا بد ترین حالات کے پیدا ہونے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ تو وہ کون سے عوامل ہیں جو اس کے پیچھے کارفرما ہیں!

اکثر لوگ، دور دراز علاقوں سے تلاش معاش میں راجدھانی آتے ہیں۔ بیشتر لوگ یا تو نوکری کرتے ہیں یا گزر اوقات کے لیے معمولی دھندا شروع کر دیتے ہیں۔ تب ان پر یہ راز بھی کھلتا ہے کہ بڑے شہروں خصوصاً دہلی میں نوکری تلاش کر لینا ہی سب کچھ نہیں ہے، بلکہ اصل معرکہ ایک رین بسیرے کی تلاش ہے، جو ان کی آمدنی سے کہیں زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ اس لیے بغیر کسی پس و پیش کے وہ کہیں بھی عوامی زمین پر قبضہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً ہر مہینے ایک نئی جھگی وجود میں آجاتی ہے۔

دوسری طرف کچھ لوگوں نے جھگیوں کی تجارت کو باقاعدہ پیشے کے طور پر اپنا رکھا ہے۔ وہ زمین پر قبضہ کرتے ہیں، دوسروں کو اکسا کر چند جھگیاں بنا لیتے ہیں اور پھر تیار شدہ جھگیاں یا ان کے بدلے ملی ہوئی زمین فروخت کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا دھندہ چلتا رہتا ہے۔ ناقابل یقین لیکن سچ یہ ہے کہ اس ناجائز دھندے میں، ان لوگوں نے لاکھوں روپے کمائے ہیں۔ بلاشبہ یہ ناجائز دھندہ کرنے والے لوگ، سابق جرائم پیشہ افراد یا پھر تیسرے درجے کے سیاست داں ہوتے ہیں۔

اب انتظامیہ کے سامنے مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اس علاقے کو رہائشی منظوری دے دی جائے سرے سے اجاڑ دیا جائے یا دوسری جگہوں پر مناسب بندوبست کیا جائے۔ اس سلسلے میں کسی بھی طریقے پر عمل کرنے میں سخت مشکل درپیش ہوتی ہے۔ کیوں کہ "سلم" کے معاملے میں ذاتی، سیاسی اور دوسرے دباؤ پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔

ڈی۔ ڈی۔ اے کے ایک اعلیٰ افسر کے مطابق اس صورت حال کو ابتر کرنے میں سیاسی لوگوں کا ہاتھ زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں وزارت داخلہ نے ایک "کوڈ آف کنڈکٹ" دو سال قبل بنایا تھا، جس کے مطابق کسی سیاست داں کو ایسے معاملے میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ سیاست دانوں پر یہ فرض عاید کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو ناجائز قبضوں کی لعنت اور اس سے پیدا شدہ مشکلات سے آگاہ کریں۔

کچھ معاملوں میں سیاسی مداخلت کرنے والے جب ناجائز قبضہ ہٹانے والے اسکواڈ کو روکتے ہیں تو پولیس انھیں گرفتار بھی کر لیتی ہے۔ لیکن حکمراں جماعت کے میٹرو پولیٹن کونسلر اور دوسرے مقامی لیڈران اکثر ڈی۔ ڈی۔ اے کے اس کام میں روڑا اٹکاتے ہیں اور سیاسی اثرات کا استعمال کرکے اسے "روکنے کا حکم نامہ" حاصل کر لیتے ہیں۔

ڈی۔ ڈی۔ اے کے ایک دوسرے افسر کو یہ شکایت ہے کہ اس طرح کے کام ووٹ حاصل کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں اور ہمارے ہاتھ عملاً کٹے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف دہلی کو آپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے مطابق سارا الزام ڈی۔ ڈی۔ اے کے سر جاتا ہے، کیوں کہ وہ دہلی کے شہری گاؤں اور باہر سے آتے ہوئے افراد کے لیے رہائش کا بندوبست کرنے میں ناکام رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ کو وقت مقررہ پر سخت اور مؤثر اقدام سے حل کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ دہلی میں باہر سے لوگ آکر بستے رہیں گے اور حالات بد سے بدتر ہوتے جائیں گے۔

## فیشن کی دنیا

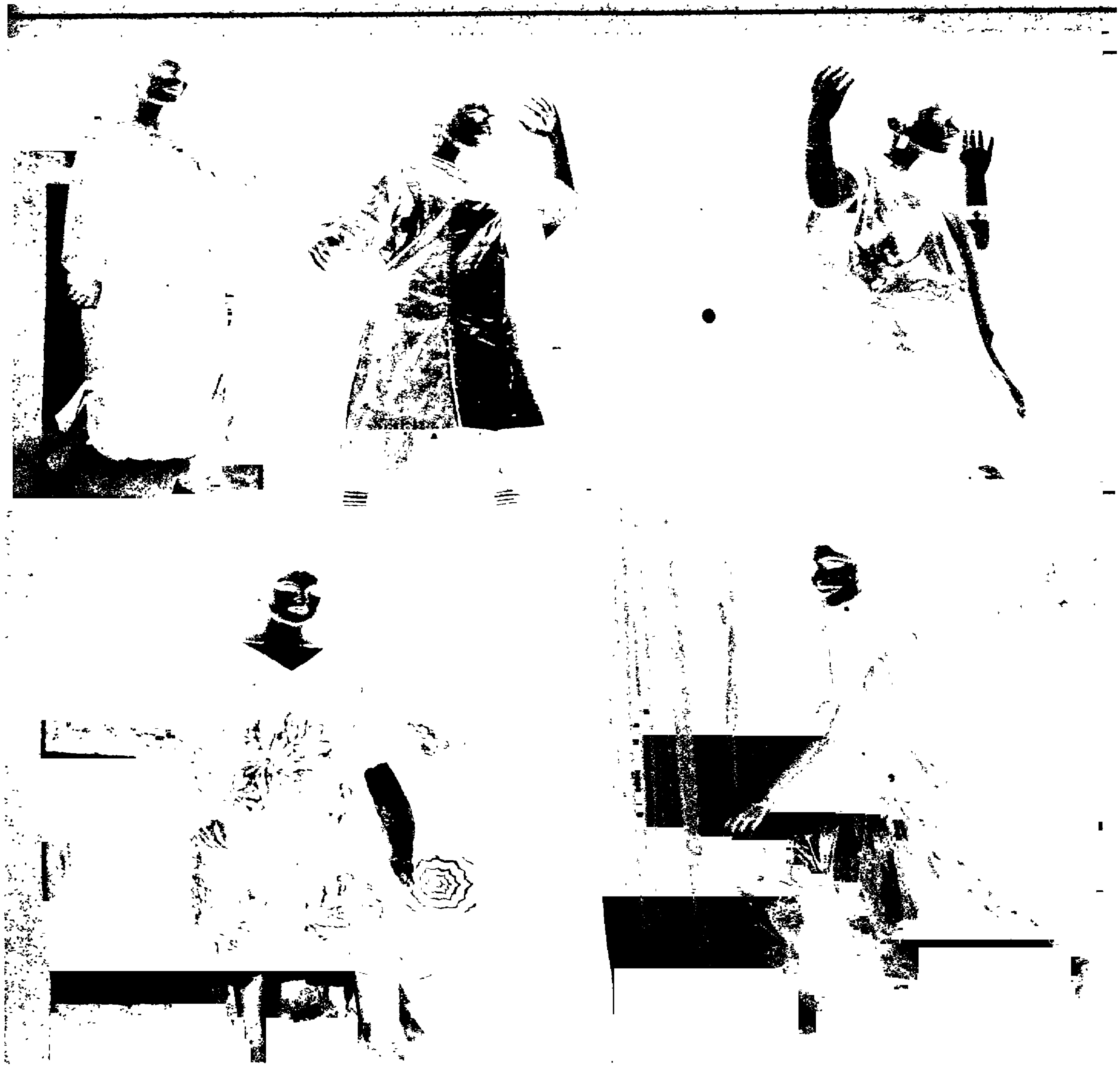
# قوس و رنگ

لباس عام انسانوں کے لیے ایک تہذیبی ضرورت ہیں لیکن اعلیٰ طبقے کی خواتین کے لیے اظہارِ ذات اور ثقافتی ہم جوئی کا وسیلہ ہر موسم، ہر تقریب اور ہر جسمانی ساخت کے لحاظ اور رعایت سے لباس کے طرز و انداز کی تلاش مملکت فیشن کے رہنماؤں کا پیشہ ہے۔

یہ تصویریں موسم گرما کے لیے موزوں ملبوسات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ جسم کے قد و قامت، قوس اور رنگ کس طرح لباس کی تراش خراش میں شیر و شکر ہو کر حسن و جمال کے کیسے کیسے پیکر ابھارتے ہیں انہیں دیکھئے اور سوچئے کہ جسمانی حسن بھی سائنسی مطالعے کا موضوع ہو سکتا ہے یا نہیں؟







سید ضیاء اللہ

# ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل

## دانشوروں کی نظر میں

[illegible]

گزشتہ چودہ سو سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے حاکموں کی حیثیت سے اپنے مسلم اور غیر مسلم محکوموں کے ساتھ نمٹنا سیکھ لیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی سیکھ رکھا ہے کہ غیر مسلم حاکموں کے ساتھ محکومی انہیں کس طرح کرنا چاہیئے۔ لیکن آج ہندوستان میں وہ ایک نئی صورت حال سے دوچار ہیں۔ وہ نہ پہلے کی طرح حاکم ہیں اور نہ محکوم مسلمان اس ملک میں اقتدار میں شریک ہیں۔ لہٰذا انہیں ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ انہیں نئے تجربات کرنے ہوں گے۔ نئے اصول مرتب کرنے ہوں گے اور ان پر نئے انداز سے عمل کرنا ہوگا۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس نے رہنما اصول [illegible] مسلمانوں کا کام اب صرف یہ ہے کہ ان اصولوں کی از سر نو توجیہ اور توضیح کریں اور یہ کام صدیوں سے بند اجتہاد کے دروازوں کو کھول کر کیا جا سکتا ہے۔

نئے دور میں جدید علوم، سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن مسلمانوں میں اب بھی یہ غلط فہمیاں موجود ہیں کہ سائنس کی تعلیم مسلمانوں کو مذہب سے بھٹکا دے گی۔ اور اس کے نتیجے میں مدرسوں اور مکتبوں میں تعلیم پانے والے اپنے آپ کو دیندار اور خدا ترس اور جدید تعلیم سے آراستہ لوگوں کو مذہب سے برگشتہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اسکولوں اور کالجوں کے فارغ التحصیل حضرات علماء کو تنگ نظر، کٹر، بنیاد پرست وغیرہ سمجھتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کی نئی نسل دو دھاروں میں بٹ گئی ہے۔ اور دونوں کے درمیان خلیج روز بروز وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس خلیج کو پاٹنا ضروری ہے۔

چنانچہ مسلمانوں میں یہ بات پھیلانی چاہیئے کہ سائنس کی تعلیم اور مذہب اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ بعض اہم جدید علوم کے موجد خود مسلمان رہے ہیں۔ انہوں نے یونانی علوم حاصل کیے ان پر تجربے کیے اور اپنی نئی فکر انہیں دی۔ یورپ نے ان افکار سے فائدہ اٹھایا اور دنیا بھر کے مسلمان جہاں کے تہاں رہ گئے۔ لہٰذا اب مسلمانوں کو ایک بار پھر جدید علوم کی جانب متوجہ ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ مسلم عوام اب بھی علماء ہی کی بات پر بھروسہ اور عمل کرتے ہیں اس لیے یہ کام یعنی جدید علوم سیکھنے کی ترغیب دینے کا کام علماء ہی کے ذریعہ کرنا چاہیئے۔ حکومت ہند نے ان

## فکر و نظر

مدرسوں کے نصاب میں انگریزی زبان، سائنس اور ٹکنالوجی وغیرہ کو شامل کرنے اور نصاب تیار کرنے کی ذمہ داری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دی ہے لہٰذا یہ ادارہ ایک بار پھر مسلمانان ہندوستان کی تعلیمی جہت بدلنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو اردو زبان اور مذہب اسلام کی تعلیم سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ ایک تجویز یہ پیش ہوئی کہ سابق کی طرح بڑی بوڑھی خواتین مسلمان محلوں میں بچوں کو مذہبی اور اردو زبان کی تعلیم دیا کریں۔ یہ رواج ختم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی تجدید کی ضرورت ہے۔

حکومت ہند نے جو نئی تعلیمی پالیسی وضع کی ہے اس پر بھی ان کانفرنسوں میں سیر حاصل بحث ہوئی اس کے تحت دی جانے والی سہولتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمانوں کو پوری طرح مستعد رہنا چاہیے ان میں کیا سہولتیں موجود ہیں جن سے مسلمان فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ ان سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ کیا ہوگا۔ کس طرح سرکاری حکام سے کام لینا چاہیے۔ وغیرہ یہ ساری تفصیلات پہلے سے موجود اور نئے قائم ہونے والے تعلیمی اداروں کو معلوم کرائی جانی چاہئیں اور یہ کام اردو کے اخبارات کر سکتے ہیں۔ نیز ان تعلیمی اداروں کو کانفرنسیں منعقد کرانی چاہئیں۔

لڑکیوں کی تعلیم پر اس نئی تعلیمی پالیسی میں کافی زور دیا گیا ہے۔ اس کے تحت مسلم اکثریتی علاقوں میں لڑکیوں کے اسکول کھولنے کے لیے حکومت کو آمادہ کرنے کا کام خود مسلمانوں کا ہے۔ اس معاملے میں مسلمان چونکہ بہت پیچھے رہے ہیں، اب انہیں زیادہ سے زیادہ توجہ تعلیم نسواں پر دینا چاہیے۔

تکنیکی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو پوری طرح دھیان دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں اس امر کی نشاندہی کی گئی کہ کمپیوٹر کا استعمال ملک میں رواج پا رہا ہے۔ مسلمانوں میں یہ غلط فہمی ہے کہ کمپیوٹر کے استعمال کے لیے علم الحساب (Matha matics) میں مہارت بہت ضروری ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ معمولی ٹائپسٹ (TYPIST) بھی یہ کام کر سکتا ہے اس کے چھوٹے چھوٹے کورس ہوتے ہیں۔ کمپیوٹروں کا مارکیٹ پھیل رہا ہے اور مسلمانوں کو معاملے میں جلدی کرنا چاہیے ورنہ مانگ گھٹ جائے گی تو انہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔

آئی۔ اے۔ ایس، آئی۔ پی۔ ایس، وغیرہ

ہی نہیں یا اگر آتے ہیں تو آٹے میں نمک برابر بھی ان کی تعداد نہیں ہوتی۔ عام طور پر مسلم نوجوانوں میں یہ غلط احساس پھیل چکا ہے کہ "ہمیں کون نوکری دے گا" اور "یہاں تو تعصب ہے" یا "یہاں مسلمان ہونا گناہ ہے" وغیرہ وغیرہ۔ اس احساس کی بنا پر مسلمان طالب علم جی جان سے محنت نہیں کرتے ان کا خیال ہوتا ہے کہ کتنی بھی محنت کریں ہمیں مسلمان ہونے کی بنا پر تعصب کا شکار بنا دیا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کا یہ احساس غلط ہے تعصب کے وجود سے کلیۃً انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جہاں لیاقت و اہلیت (M ERIT) موجود

> مسلم پرسنل لاء یعنی
> اسلامی قانون مذہب
> کا ایک حصہ ہے اور
> شریعت کے راستے سے
> ہٹنے کی مسلمانوں کو
> اجازت نہیں [illegible]
> [illegible]

ہو وہاں متعصب لوگوں کو بھی اس کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے۔

مقابلے کے ان امتحانات کے لیے مسلمان امیدواروں کو تیار کرنے کے لیے کوچنگ کلاسوں (COACHING CLASSES) کے اہتمام پر زور دیا گیا۔ مثال کے طور پر چند سال قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایسے کوچنگ کلاس قائم ہوئے تھے اور ان کے خاطر خواہ نتائج نکلے تھے یہاں تک کہ دہلی کے سینٹ اسٹیفن (St. Stephen) کالج [illegible]

حیدرآباد دکن میں اس قسم کے کوچنگ کلاس چل رہے ہیں اور ان سے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ دراصل مسلمان طالب علموں اور امیدواروں کو ترغیب و تحریک کی ضرورت ہے۔

اہل حرفت کے لیے بھی نئی تعلیمی پالیسی میں بہت ساری سہولتیں دی گئی ہیں مثلاً اب تک ٹکنیکل اداروں میں امتحانوں کے نتائج اور مارکس شیٹ کی بنیاد پر داخلے دیے جاتے تھے لیکن اب اسّی فیصد نشستیں اہل حرفہ کے بچوں کو دی جائیں گی لہٰذا مسلمانوں میں اس سہولت کی پوری تفصیل کی منادی ہونی چاہیے تاکہ وہ زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کے علاوہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے دیہی اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے کئی ایک اسکیمیں تیار کی ہیں وہ روبہ عمل لائی گئی ہیں۔ لیکن مسلمان اہل حرفت ان تفصیلات سے لاعلم ہیں اور کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ یہ ساری باتیں ان کے علم میں لائی جانی چاہئیں تاکہ وہ فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ کام بھی اگر چاہیں تو اردو اخبارات کر سکتے ہیں۔

ان کانفرنسوں میں مسلمانوں کی شناخت (IDENTITY) کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ عام تاثر یہ تھا کہ جب ایک فرقے کے تشخص کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو وہ اپنے وجود کو تسلیم کرانے کے لیے قومی دھارے سے علاحدہ ہو جاتا ہے اور جارحانہ انداز سے اپنے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مسلمان اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھنا چاہتے ہیں انہیں ڈر ہے کہ اکثریتی فرقہ انہیں اپنے اندر ہضم کر لے گا۔ اگر لسانی یا علاقائی شناخت ختم کرانے کی بات ہو تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن جہاں مذہبی شناخت کھو دینے کی بات آتی ہے اور جہاں ایک فرقہ کو بڑے فرقہ کی راہ پر چلنے کے لیے مجبور کیا جائے وہاں مشکل پیدا ہوتی ہے۔ تقسیم سے پہلے مسلم لیگ نے ہندوستان میں دو قومی نظریہ پیش کیا تھا اور ہندوؤں نے اس کی مخالفت کی تھی لیکن اب ہندوؤں کو اصرار ہے کہ ان کی شناخت اور ان کا کلچر مسلمانوں سے مختلف ہے مسلمانوں کو کئی چیلنجوں کا مقابلہ ہے اس ملک میں مسلمانوں کو مسلمان رہنا ہے لیکن انہیں قومی دھارے میں شامل بھی ہونا ہے اور یہ مؤخر الذکر مقصد کیسے حاصل کیا جائے؟ سرکاری مدرسوں (یو پی وغیرہ میں) اردو کی تعلیم ختم کر دی گئی ہے مسلمان کس طرح اردو، انگریزی اور علاقائی [illegible]

## فکر ونظر

کریں؛ مسلمانوں میں چھوٹی صنعتوں، شیئرز (حصص)، بانڈز، ڈبینچرز (DEBENTURES) سرمایہ کاری، بچت وغیرہ کی طرح ڈالنے کے لیے کیا کیا قدم اٹھائے جائیں! مسلمانوں میں ذات پات قرضہ وغیرہ کی روایات کو ختم کیا جائے اور قرون اولیٰ کی کوئی عربی میں کوئی بھی نہیں والی روایات کی طرف لوٹنے کی ترغیب دی جائے عورتوں کی اس مقصد کے تحت تعلیم کا انتظام کیا جائے کہ وہ آج کے صنعتی معاشرے میں روزگار حاصل کرسکیں۔ موجودہ ترقی یافتہ صنعتی اور کمپیوٹرزدہ دور میں اسلامی تعلیمات کی ازسرنو اجتہاد کے ذریعہ توضیح کی جائے۔ تعلیم کے معاملہ میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جو بچے اسکول چھوڑ کر دوسرے کاموں میں لگا دیئے جاتے ہیں انہیں کس طرح روکا جائے تاکہ وہ اپنی تعلیم پوری کرسکیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات ابھر کر آئی کہ والدین کے افلاس کی وجہ سے بچے تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے۔ اس کا دوسرا پہلو بھی اجاگر کیا گیا کہ اہل حرفہ کے یہاں جب آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اور خوشحالی آنے لگتی ہے تو ماں باپ بچوں کو مدرسوں سے نکال کر اپنے کاروبار میں لگا لیتے ہیں دونوں صورتوں میں بچوں کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے اقدامات کی ضرورت ہے۔

ایک نجی سروے کی تفصیلات بتائی گئیں جس کے مطابق طلبا کی ایک بہت بڑی تعداد نے یہ بتایا ہے کہ ان کے گھر اتنے تنگ ہیں کہ انہیں بیٹھ کر یکسوئی سے پڑھنے کے لیے جگہ نہیں ملتی اسی سلسلے میں ایک مشورہ یہ بھی دیا گیا کہ مسلمان فی الحال نئے نئے پرائمری اسکول کھولنے کے بجائے کچھ عرصہ تک سرکاری اسکولوں سے استفادہ کریں۔ اور ہوسٹل کھولیں ان میں پچاس فی صد نشستیں ایسے بچوں کو دی جائیں جن کے گھروں میں پڑھنے لکھنے کے لیے جگہ نہ ہو یا جن کے والدین اتنے غریب ہوں کہ وہ بچوں کی تعلیم کا بار نہ اٹھا سکتے ہوں۔ ان میں باصلاحیت طلبا کا خاص خیال رکھا جائے اور انہیں مفت یا رعایتی شرح پر ہوسٹل میں قیام وطعام کا انتظام کیا جائے۔ باقی پچاس فی صد نشستیں ایسے بچوں کے لیے مخصوص کی جائیں جن کے والدین مالدار ہوں اور ان سے وصول ہونے والی فیس سے ہوسٹل چل سکے۔

اسلام میں خواتین کا مرتبہ بھی زیر بحث آیا۔ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ایک خاتون اسکالر نے یہ دلچسپ سوال اٹھایا کہ مطلقہ عورتوں کے نان و نفقہ پر جو اتنا شور [illegible]

اٹھائی گئی؟ ایک اور خاتون کو یہ شکایت تھی کہ پہلے لڑکوں کی تعلیم کو اہمیت دی جاتی ہے اور پھر اس کے بعد ایک آدھ ٹکڑا عورتوں کے اسکول قائم کرکے عورتوں کی جانب پھینک دیا جاتا ہے کہ لو تمہارے لیے بھی اسکول کھل گیا جبکہ اس کا انتظام اتنا ناکارہ ہوتا ہے کہ وہاں لڑکیوں کی خاطر خواہ تعلیم ہوتی ہی نہیں۔ عورتوں کی تعلیم خصوصاً مسلم خواتین کی تعلیم کے اعداد وشمار موجود نہیں ہیں۔ بے شمار والدین اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلانا چاہتے ہیں لیکن غربت کی وجہ سے وہ ایسا کرنہیں سکتے بعض لوگ تو لڑکیوں کو اسکول سے اس لیے نکال لیتے ہیں کہ وہ انہیں مناسب لباس فراہم نہیں کرسکتے۔ عورتوں کا دوسرا مسئلہ تغذیہ

یہ کہا گیا ہے کہ لین دین کے معاملات میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں۔ باقی سات جگہ اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا گیا خلفائے راشدین کے دور میں کئی مواقع پر صرف عورتوں کی گواہی پر فیصلے ہوئے ہیں۔ بے شمار احادیث حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں اگر ایک خاتون کی شہادت ناقابل قبول قرار دی گئی تو ان احادیث کا کیا ہوگا؟ تاہم ایک عالم نے یہ بھی کہا کہ یہ خام خیالی ہے کہ اسلام میں عورت اور مرد کو یکساں حقوق دیئے گئے ہیں۔ آں حضرتؐ کے زمانے میں کسی عورت کو حاکم یا گورنر نہیں بنایا گیا۔ آپؐ کے بعد خلافت کے لیے کسی خاتون کا نام پیش نہیں کیا گیا۔

> **قرآن کریم مرد، عورت میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔**
>
> **پردہ مس [illegible] یا روزگار کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔**
>
> **اس ملک میں مسلمانوں کو مسلمیت کی رہنمائی، اور قومی دھارے میں بھی شامل ہونا ہے۔**

بخش غذا کی فراہمی کا ہے۔ عورت اچھا کھانا شوہر اور بچوں کو کھلاتی ہے اور خود اکثر فاقے کرتی ہے جس کی وجہ سے اس کی صحت خراب ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا عورتوں میں غذا کے متعلق رجحانات پیدا کیے جانے چاہئیں

یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا کہ کیا پردہ عورتوں کی تعلیم اور روزگار کے سلسلے میں رکاوٹ بن سکتا ہے بعض مذہبی لیڈروں نے جو موجود تھے اس امر پر زور دیا کہ قرآنی حجاب اور ہندوستان کے مسلم معاشرے میں مروج حجاب میں بہت فرق ہے۔ مسلم عورتیں تعلیم اور روزگار کے لیے ایسا لباس پہن کر جاسکتی ہیں جو ڈھیلا ڈھالا ہو اور دیکھنے والے کے جذبات میں ہیجان نہ پیدا کرتا ہو۔

کیا قرآن کریم مرد اور عورت میں امتیاز کرتا ہے؟ بحث وتمحیص کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کے دربار میں کسی کو کسی پر فوقیت جنس کی بنا پر نہیں بلکہ اعمال کی بنا پر ملتی ہے۔ قرآن کریم میں کہیں یہ واضح حکم نہیں ہے کہ [illegible]

اسلام میں ضبط ولادت کا مسئلہ بھی ان کانفرنسوں میں زیر غور آیا۔ اور یہ واضح کیا گیا کہ قرآن کریم میں اس سلسلہ میں کوئی واضح ہدایت نہیں ہے لیکن آں حضرتؐ کے زمانے میں عزل کا رواج تھا۔ کئی حدیثیں اس ضمن میں آئی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے ذہن میں یہ مسئلہ آیا تھا اور انہوں نے آں حضرتؐ سے وضاحت چاہی۔ آنحضرتؐ نے بھی منع نہیں فرمایا۔ ایک بات جو واضح کی گئی وہ یہ تھی کہ اسلام ضبط حمل کی اجازت تو دیتا ہے لیکن ضبط ولادت (یعنی استقاط حمل) کی اجازت نہیں دیتا۔ عورت کی خوبصورتی برقرار رکھنے کے لیے عزل کی اجازت ہے لیکن لڑکی کی پیدائش روکنے کے لیے عزل کو منع کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اس خوف سے عزل کرنا جائز نہیں کہ بچہ پیدا ہو جائے تو اس کی پرورش کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا۔ اس امر پر زور دیا گیا کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں صرف پیداواری زرعی سماج والی [illegible] صنعتی سماج والی جس کی

اور لوگوں کی اموات میں کمی واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا ان تینوں ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے اور اس معاملہ کو خدا نے انسان کے صوابدید پر چھوڑ رکھا ہے وقت اور اس کی ضرورت کے ساتھ رائے اور طریقۂ کار بدل سکتا ہے۔ یہ دینی مسئلہ ہے ہی نہیں اور ایمان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے مسلمانوں میں ضبط تولید کا رواج کم ہے جوں جوں تعلیم کو فروغ ہوگا اس کا رواج بھی عام ہوتا جائے گا۔

مسلمانوں کی معاشی حالت کیسی ہے۔ اس کا اندازہ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ اس سلسلہ میں ہمارے پاس صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں۔ پچھلی نصف صدی میں مسلمانوں کے معاشی مفادات کو نقصان پہنچا ہے۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مسلمان حکومت سے اقتصادی امداد کی توقع کرتا ہے لیکن حکومت اس کی کوئی مدد نہیں کرتی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان معاشی طور پر زوال پذیر ہیں۔ اور اب حالت یہ ہے کہ ملک کے سو بڑے صنعت کاروں میں کوئی مسلمان نہیں ہے۔ زراعت، تجارت، صنعت، ملازمت ہر ایک میدان میں مسلمان پیچھے ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں نے تھوڑی بہت ترقی کی ہے لیکن شمالی ہندوستان میں ایسی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی سرمایہ کاری زیادہ تر جائیداد غیر منقولہ میں ہے۔ شیئر مارکیٹ اور بینک کاری میں ان کا حصہ تقریباً صفر ہے، ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلمانوں کا ایک حبیب بینک ہوا کرتا تھا لیکن اب ہندوستان میں کوئی مسلم بینک نہیں ہے۔

ہندوستان کی موجودہ صنعتی و زرعی سیاسی

**فرقہ وارانہ فسادات کا لامتناہی سلسلہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کا ہی نہیں، بلکہ پورے ملک کا مسئلہ**

میں سود کا مسئلہ خاصا اہم ہے۔ بینک، تجارت، صنعت یہ سارے کاروبار سود کے بغیر چل نہیں سکتے بلاسودی بینکاری اس معاشرہ میں رائج نہیں ہو سکتی۔ بینک کے سود اور ربٰو میں فرق ہے۔ یہ بات علمائے کرام کو سمجھانا چاہیئے اور ان سے اس سلسلہ میں فتویٰ حاصل کرنا چاہیئے۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ اعداد و شمار جمع کرنے کے لیے ایک ادارہ قایم کیا جائے۔ اور ایک ڈائرکٹری شائع کی جائے جس میں مسلمان تاجروں، صنعت کاروں وغیرہ کی تفصیلات شامل ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک خوش آئندبات جو ظاہر ہوئی وہ یہ تھی کہ آمدنی میں کمی کے باوجود مسلمانوں میں بچت کا رجحان زیادہ ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات کا لامتناہی سلسلہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کا نہیں بلکہ سارے ملک کا مسئلہ ہے۔ اول تو مسلمانوں کو گریبان میں جھانکنے کی دعوت دی گئی اور کہا گیا کہ اکثر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کو اس لیے قتل کیا جاتا ہے لوٹا جاتا ہے اور ان کی خواتین کی بے حرمتی کی جاتی ہے کہ وہ مسلمان ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم مسلمان ہیں بھی؟ کیا ہمارے اخلاق اور کردار مسلمانوں جیسے ہیں؟ مسلمانوں کو فسادات کے دوران بھی جب ان کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں تو قرآن و سنت سے روگردانی نہیں کرنی چاہیئے؟ انہیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انہیں آخرت میں خدا کو جواب دینا ہے مثال دی گئی کہ ایک ہندو محلے میں فساد ہو جاتا ہے جہاں دو مسلمان قتل ہو جاتے ہیں۔ اس کی اطلاع مسلم اکثریتی محلے میں پہنچتی ہے تو مسلمانوں کا ردعمل کیا ہونا چاہیے؟ کیا ان فسادی ہندوؤں کا بدلہ انہیں اپنے محلے کے بے گناہ ہندوؤں سے لینا چاہیے؟ اس طرح کا انتقام اسلام قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا مسلمان بدیوں کا مقابلہ نیکیوں سے کریں۔

بدنصیبی یہ ہے کہ میلاد، محرم، مدح صحابہ وغیرہ کے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ ان چیزوں کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بدعت ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوا کہ "تم رام لیلا کا جلوس نکالتے ہو تو ہم محرم کا جلوس نکالیں گے"۔ یہ جلوس مسلمانوں کے مذہب کا حصہ نہیں۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ رضاکارانہ طور پر یہ جلوس نکالنا بند کر دیں۔

اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ امن و امان بحال رکھنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ فسادات اس لیے ہوتے ہیں کہ حکومت مسلمانوں کو ان کے دستوری حق دینے کے لیے تیار نہیں۔ حکومت کے بعض کارکن بے انصافی اور تعصب سے کام لیتے ہیں اور حکومت ان کا محاسبہ کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ فسادات خود حکومت بھی کراتی ہے۔ کرفیو لگا کر پولیس مسلمانوں کے گھروں میں گھس جاتی ہے، لوٹ کھسوٹ مچا دیتی ہے اور آبروریزی کرتی ہے لہٰذا ٹھنڈے دل سے مسلمانوں کو اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ اس ملک میں انہیں انصاف حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانے ہوں گے۔

لیکن اس کے لیے مسلمانوں نے اب تک کوئی قلیل مدتی یا طویل مدتی عملی پروگرام بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اور دوسری طرف اکثریتی فرقہ پرستی قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ اکثریتی فرقے کی جارحانہ فرقہ پرستی کو ختم کیے بغیر اقلیتی فرقے کی فرقہ پرستی ختم نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں نے کانگریس، جنتا پارٹی، کمیونسٹوں سبھی کا ساتھ دے کر دیکھ لیا۔ زبانی ہمدردی کے سوا انہیں کچھ نہ ملا دولت، اور اقتدار کے لیے لوگ مذہب کے نام کا استعمال کرتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف نفرت کا ماحول تیار کیا جا رہا ہے۔

ایک موقع پر اس امر کی بھی نشاندہی کی گئی کہ بعض مسلمان انتہائی مایوسی کے عالم میں کہتے ہیں کہ سکھ اتنی چھوٹی سی اقلیت ہیں لیکن اپنی جارحانہ کارروائیوں کے ذریعہ اپنے مطالبات منوا لیتے ہیں۔ لیکن یہ طرز فکر درست نہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ سکھ بھاری تعداد میں فوج میں بھرتی ہیں۔ دوم خود پنجاب میں سکھ اکثریت میں ہیں (مسلمانوں کی تعداد ان سے کئی گنا زیادہ ضرور ہے لیکن کسی ایک ریاست میں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں سوائے کشمیر کے)۔ لہٰذا مسلمان

سکھوں کے نقش قدم پر چل نہیں سکتے۔ انہیں تعمیری رویّہ اختیار کرنا ہوگا۔

مسز گاندھی کے انتقال کے بعد سکھوں کا جو مال لوٹا گیا تھا اس کی بازیابی عمل میں آئی اور یہ مال اس کے حقداروں کو واپس کیا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر حکومت چاہے تو لوٹا ہوا مال برآمد کرا سکتی ہے لیکن فسادات میں جب مسلمانوں کا مال لوٹا جاتا ہے تو حکومت اس کو برآمد کرنے میں تندہی سے کام کیوں نہیں کرتی ؟

فسادات میں نقصان اٹھانے والے مسلمانوں کو معاوضہ اور ہرجانہ دینے کا مطالبہ بھی کیا گیا تعلیمی نظام اور ذرائع ابلاغ میں مسلمانوں کی جو تصویر (IMAGE) پیش کی جاتی ہے وہ نہایت شرمناک ہوتی ہے۔ اس پر کڑی نگرانی رکھی جانی چاہیئے۔ اس کے لیے ایک نگرانی ادارہ (MONITORING CELL) قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔

اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ حکومت فسادات کو سختی سے اس لیے نہیں رکواتی کہ انتخابات کے دوران برسراقتدار پارٹی کو ووٹ نہیں ملیں گے۔ یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ فساد کش (ANTIRIOT) فورس قائم کی جائے جو مرکزی حکومت کی تحویل میں ہو۔ اس میں پچاس فیصد مسلمان بھرتی کیے جائیں اور ایک ریاست کی نفری دوسری ریاست میں استعمال کی جائے تاکہ وہ مقامی اثر و رسوخ کے تحت مجبور نہ کی جا سکے جیسے کہ مقامی پولیس کی جاتی ہے۔

مسلم پرسنل لا کے بارے میں یہ واضح کیا گیا کہ اسلامی قانون مذہب کا ایک حصہ ہے اور شریعت کے راستے سے ہٹنے کی مسلمانوں کو اجازت نہیں ہے۔ لیکن اجتہاد کے دروازے کھلے ہیں ضروری تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں لیکن یہ شریعت کے قوانین کی ترمیم کے مترادف نہیں ہوگا بلکہ اس طرح بعض غیر واضح گوشوں کی وضاحت ہوگی۔ اس سلسلہ میں تبنیت کا بھی سوال اٹھایا گیا لیکن یہ واضح کیا گیا کہ تبنیت کی اسلامی معاشرے کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ لحم خنزیر کی طرح تبنیت کیسے حرام ہو گئی ؟ تبنیت کے متعلق پہلا بل جو پارلیمان میں پیش ہوا تھا وہ آٹھ سال بعد واپس لے لیا گیا اور دوسرا بل بھی کالعدم ہو گیا۔ یہ بل ۱۹۸۳ء میں پیش ہوا تھا لیکن مسلمانوں کو اس سے مستثنےٰ قرار دیا گیا تھا۔ لہٰذا اس وقت بحث اس مسئلہ پر لاحاصل ہے۔ اس امر کی نشاندہی کی گئی کہ گو دستور ہند کے رہنما اصولوں میں یکساں سول کوڈ کی بات موجود ہے لیکن ہمارا آئین یہ امر لازم نہیں کرتا کہ یکساں سول کوڈ

> ... فسادات کو سختی سے اس لیے نہیں روک پاتی کہ انتخابات کے دوران برسراقتدار پارٹی کو ووٹ نہیں ملیں گے۔

نافذ کیا جائے۔ یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ کیا یکساں سول کوڈ کی ضرورت ہے اور کیا یہ ضرورت فوری اہمیت کی بھی ہے !

مسلم پرسنل لا پر تین باتوں کے لیے تنقید کی جاتی ہے کثرت ازدواج، طلاق اور متوفی بیٹے کی اولاد کو دادا کی جائیداد میں وراثت۔ ان تینوں مسائل کا حل مسلم پرسنل لا میں کسی ترمیم کے بغیر بھی ممکن ہے۔ ان کے حل کے لیے ایک مشورہ یہ دیا گیا کہ ایک جامع نکاح نامہ تیار کیا جائے ملک کی ساری زبانوں میں اور اسے سارے ملک میں رائج کیا جائے۔ اس میں جاریہ تفصیلات کے علاوہ دو سوال اور بڑھا دیئے جائیں۔ ایک یہ کہ کیا دلہن اپنے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت دیتی ہے ؟ دوسرا یہ کہ کیا وہ تفویض حق طلاق چاہتی ہے اس نکاح نامہ کی بدولت طلاق اور کثرت ازدواج کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ متوفی بیٹے کی اولاد کی وراثت کے لیے ایک قانون بنایا جائے کہ مسلمان کو ⅓ (ایک تہائی) حصے کو نذر کرنے کا جو اختیار حاصل ہے اس کے متعلق قانونی طور پر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ حصہ ان یتیم پوتوں کو ملے گا۔

۱۹۷۴ء میں ایک کمیشن خواتین کے حقوق کے سلسلہ میں تشکیل کیا گیا تھا اور وہ کمیشن اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ طلاق کا رواج مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلموں میں زیادہ ہے۔

اس وقت عورتیں اپنے حق کا پُر زور مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہ قاضی کے پاس جاتی ہیں اور قاضی فیصلہ تو دے دیتا ہے لیکن اس کے پاس قوت نفاذ نہیں ہے للذا وہ سیکولر سرکاری عدالت میں جاتی ہے مسلمانوں کا یہ مسئلہ شرعی عدالتوں کے قیام سے طے نہیں پا سکتا۔ شرعی عدالتوں کے بجائے مسلمانوں کو مصالحتی بورڈ قائم کرنا چاہیئے جو زن و شوہر کے اختلافات کے مسائل حل کر سکیں۔ شادیوں کا رجسٹریشن لازمی قرار دیا جائے کیوں کہ لاعلمی کی وجہ سے مسلم عورتیں نکاح نامہ شوہروں کے حوالے کر دیتی ہیں نیز عورتوں کو ان کے حقوق کے بارے میں پوری تعلیم دی جائے اور پوری تفصیلات فراہم کی جائیں۔

یکساں سول کوڈ پر بحث کے دوران یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ اب تک کسی کو نہیں معلوم کہ یہ کوڈ ہے کیا ! جتنی بھی باتیں اب تک ہو رہی ہیں وہ مفروضوں پر مبنی ہیں۔ خود اکثریتی فرقے کے عائلی قوانین ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ وہ خود یکساں سول کوڈ آنے نہیں دیں گے۔ جب اس کوڈ کو آنا ہی نہیں ہے تو اس پر بحث کیوں کی جائے ؟ اس کی مخالفت سے کیا حاصل ہوگا خواہ مخواہ اس طرح کی بحث سے ایک کشیدگی کیوں بنائی رکھی جائے !

پاکستان

# آگ ابھی بجھی نہیں

سید ضیاء اللہ



پاکستان میں پٹھان مہاجر تصادم کا آغاز کوئی تین برس قبل کراچی کے مضافاتی علاقے میں ایک دین دار نوجوان کے اجتماعی طور پر قتل کیے جانے سے ہوا یہ دین دار نوجوان جس کے چہرے پر سیاہ ڈاڑھی تھی، جو پنج وقتہ نمازی تھا، رمضان کے پورے روزے رکھتا تھا اور مذہبی و دینی جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتا تھا اردو بولنے والا مہاجر تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ سماج کے ایک خادم کی حیثیت سے اس نے منشیات اور منشیات فروشوں کے خلاف ایک انفرادی جہاد چھیڑ رکھا تھا۔ جس ہجوم نے اس کو قتل کیا وہ منشیات کا کاروبار کرنے والوں پر مشتمل تھا جنہیں پولیس کا مخبر ہونے کا شبہ ہو گیا تھا۔

اس واقعہ کے خلاف پُرامن مہاجروں نے پولیس اور مارشل لا ایڈمنسٹریشن کے اعلیٰ حکام سے شکایت کی اور پُرامن مظاہرہ کیا۔ لیکن کوئی گرفتاری عمل میں آئی نہ کسی کو سزا دی گئی۔ منشیات کا کاروبار بے روک ٹوک جاری رہا اور پولیس اس میں سے چند حصہ جسے "معمول" کہتے ہیں حاصل کرتی رہی۔ اس دین دار نوجوان کا خون بظاہر رائیگاں چلا گیا۔

لیکن اس کے بعد ہی کراچی کی ایک اسکول طالبہ بشریٰ زیدی ایک بس کے پہیے کے نیچے کچل کر ہلاک ہو گئی۔ اس بس کو ایک پٹھان نوجوان چلا رہا تھا جو طالبہ کی ہلاکت پر بے رحمی سے ہنستا ہوا دیکھا گیا۔ اس واقعے کے بعد بھیانک فساد پھوٹ پڑا جس میں تقریباً سو افراد ہلاک ہوئے جب حکومت نے "آپریشن کلین اپ" کے تحت کراچی کے دو مضافاتی علاقوں سہراب گوٹھ اور شیر جان سے پٹھانوں کو ہٹانے کی مہم چھیڑی تو ایک بار پھر فسادات پھوٹ پڑے اور ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۷ء تک ہونے والے اس تشدد میں ایک ہزار سے بھی زیادہ انسانی جانیں تلف ہوئیں۔

ان فسادات کے سبب پٹھانوں اور مہاجروں کے مابین مستقل محاذ آرائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دونوں جانب

[illegible]

فراہم شدہ اسلو بیت بڑی تعداد میں حاصل ہو چکا تھا۔ اس کے جواب میں مہاجروں نے اسلحہ جمع کرنا شروع کیا۔ ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ چونکہ کراچی کی بدعنوان پولیس ان کی جان و مال اور ان کی عورتوں کی عزت کا تحفظ کرنے میں ناکام ہو چکی ہے اس لیے انہیں اپنی حفاظت کا انتظام خود اپنے طور پر کرنا چاہیئے۔ معصوم علی نام کے ایک شخص کی دو بیٹیوں کے اغوا اور قتل کے بھیانک واقعے سے اس احساس کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔

اس محاذ آرائی اور تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیش نظر حکومت نے ایک کمیشن قائم کیا جس نے بعض سفارشات پیش کیں ان میں آبادی کے اضافے پر روک لگانے کو نظام سسٹم کے خاتمے نقل و حمل کی بہتر سہولیات کی فراہمی اور پولیس کے کردار میں بہتری لانے کے اقدام شامل تھے۔ ایک اور سفارش یہ تھی کہ پولیس کو جدید اسلحے اور سازوسامان سے لیس کیا جائے۔ اس محکمے میں کراچی کے مقامی افراد کو بھرتی کیا جائے۔ اس وقت ایک عام شکایت یہ تھی کہ سڑک پر جو بھی پولیس والا نظر آتا ہے وہ پنجابی ہوتا ہے۔ لیکن حسب دستور یہ سفارشات دفتروں میں گرد کی تہوں میں دبتی چلی گئیں۔

ادھر پولیس نے جو منشیات فروشوں کے تئیں ان سے حاصل ہونے والے معمول کے سبب نرم گوشہ رکھتی تھی۔ سہراب گوٹھ کی منڈی سے بچائے گئے نشیلی دواؤں اور جدید اسلحوں کا ناجائز دھندہ کرنے والے لوگوں کی نو آبادکاری کا منصوبہ بنایا۔ سہراب گوٹھ میں ہی ایک کمپنی نے متوسط آمدنی والے افراد کے لیے رہائشی کمپلیکس تعمیر کیا تھا۔ ایک عرصے سے متعلقہ افراد مطالبہ کر رہے تھے کہ انہیں اس کمپلیکس میں تعمیر شدہ ان کے مکانات دیئے جائیں۔ ان کے جائز مطالبات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسمگلروں اور منشیات کے کاروباریوں کے تقریباً پندرہ سو کنبوں کو اس میں آباد کرا دیا گیا تھا۔ لیکن جب ان لوگوں کو وہاں سے ہٹایا گیا تو انہوں نے اپنا غصہ ان اردو بولنے والے مہاجروں پر اتارا جو ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے تھے۔ ان کا یہ احساس تھا کہ مہاجران کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اور انہیں کے سبب وہ لوگ اپنی جگہوں سے نکالے جا رہے ہیں۔ انہوں نے مہاجرو! ہندوستان واپس جاؤ، کا مطالبہ بھی شروع کر دیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ تمام تر تلخیوں کے باوجود سندھیوں نے پناہ گزینوں یعنی مہاجروں سے کبھی بھی ہندوستان واپس جاؤ جیسا مطالبہ نہیں کیا۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مہاجر سندھیوں میں گھل مل جائیں اور سندھ کو اپنا وطن سمجھیں۔ ان کی شکایت صرف یہ تھی کہ مہاجر ہمیشہ پنجابیوں کی پونچھ تھامے رہتے ہیں۔



محمد خان جونیجو، وزیر اعظم پاکستان

> وہ ملک جو برصغیر میں مسلمانوں کے ایک علیحدہ وطن کے طور پر قایم کیا گیا تھا آج جرائم کے ایک بہت بڑے اڈے میں تبدیل ہو گیا ہے اور ان لوگوں سے جو اپنے گھر بار چھوڑ کر وہاں گئے، واپس جانے کے مطالبے کیے جا رہے ہیں۔

اب محمود الحق عثمانی کے سندھ یونیٹی بورڈ، الطاف حسین کی مہاجر قومی تحریک، ہارون احمد کے مہاجر سندھ محاذ، خالد ممتاز اور ڈاکٹر سلیم حیدر کی مہاجر اتحاد تحریک اور عمر عالم کے پاکستان مہاجر فرنٹ کے قیام کے بعد سے مہاجر سندھیوں کے قریب آ رہے ہیں۔ اس سے تلخیوں کے ایک باب کا اختتام اور دوستانہ تعاون کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا ہے۔ اب دونوں ان اسمگلروں اور منشیات فروشوں کے مافیا گینگ کے خلاف متحدہ جدوجہد کرنے کو تیار ہیں جس نے کراچی میں ایک متوازی حکومت قائم کر رکھی ہے جو لوگوں کا خیال ہے کہ مافیا کو حکومت اور انتظامیہ کے بعض حلقوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔

کے ایک علاحدہ وطن کے طور پر قائم کیا گیا تھا آج جرائم کے ایک بہت بڑے اڈے میں تبدیل ہو گیا ہے اور ان لوگوں سے جو اپنے گھر بار چھوڑ کر وہاں گئے تھے، واپس جانے کے مطالبے کیے جا رہے ہیں۔ افسوس تو اس کا ہے کہ مذہب پاکستان کے مختلف نسلوں اور ثقافتوں سے وابستہ افراد کے مابین اتحاد کی بنیاد نہیں بن سکا۔

## کراچی۔ چند اعداد و شمار

رقبہ : ۷۷۰ مربع میل

سڑکوں کا طول : ۳۰۰۰ میل

سرکولر ریلوے : ۱۹ میل۔

اسٹیشن : ۱۴

منی بسیں (۱۹۸۶ میں) : ۳۵۳۸

۱۹۸۶ میں سڑک حادثات : ۵۲۳ (۱۹۸۳ء میں ۳۳۷)

سلم علاقوں کا رقبہ : ۹۸۹۰ ایکڑ

(کل آبادی : ۱۶۳۸۰۰۰)

آبادی : ۷۰ سے ۸۰ لاکھ

۲۰۰۰ء تک متوقع آبادی : ۱۳۰ سے ۱۴۰ لاکھ

مکانوں کی مکانیت کے لحاظ سے آبادی کا فی صد تناسب

| | | | |
|---|---|---|---|
| یک کمرہ | مکان | والی آبادی کا تناسب | ۴۳٫۹۲ فی صد |
| دو | " | " | ۳۱٫۶۹ |
| تین | " | " | ۱۴٫۸۷ |
| چار | " | " | ۶٫۰۸ |
| پانچ | " | " | ۳٫۴۰ |
| چھ | " | " | ۱٫۱۴ |
| سات | " | " | ۰٫۳۸ |
| ۹ یا اس سے زیادہ | " | " | ۰٫۳۳ |

وفاقی ٹیکسوں میں کراچی کا حصہ : ۷۰ فی صد

پاکستان کی آبادی میں کراچی کا حصہ : ۳۶٫۳۰ فی صد

دیگر صوبوں سے کراچی منتقل شدہ آبادی : ۳۵ لاکھ

کراچی سے مزدور طبقے کے ذریعے اپنے گھروں کو روانہ کی جانے والی رقم : ۱۰۰۰ کروڑ سالانہ

کراچی میں بڑے بازاروں کی تعداد : ۱۱ (پاکستان میں ۳۵)

۱۹۸۸ء میں رہائشی قلت کا تناسب : ۳۰ لاکھ یونٹ

کراچی کی آبادی کا تجزیہ

مہاجر : ۳۶ لاکھ

پنجابی : ۱۳ لاکھ

پٹھان : ۱۰ لاکھ

سندھی اور دیگر مقامی آبادی : ۶ لاکھ

(ڈان، نوائے وقت، چٹان، دی نیشن، اخبار)

## سری لنکا کا مسئلہ

ڈاکٹر پرمانند



# اسمِ اعظم کی ضرورت؟

### شکوک، کشیدگی اور خوف وہراس کے سائے

سری لنکا کے عوام کا سیاسی شعور اور اس ملک کا موجودہ نسلی تنازعہ دونوں ہم عمر ہیں۔ نسلی بنیادوں پر آبادی کی تقسیم اور باہمی صف آرائی اتنی شدید اور سیاست زدہ ہوگئی ہے کہ اب اس انتہائی پیچیدہ مسئلے کا حل کسی معجزے کے ذریعے ہی ممکن ہے بے شک سیاست میں جو ممکنات کا کھیل ہے ہاتھ کی صفائی جیسے حربوں کا استعمال انہونی نہیں ہے۔ لیکن جب تک اس قسم کا کوئی طریقہ ایجاد ہو اور ماضی کی لفاظی مسئلے کے حل کی کوئی قابل عمل تجویز کی شکل اختیار کرے ہندوستان کے جنوب میں واقع اس ریاست کے سیاسی افق پر شکوک وشبہات، کشیدگی اور خوف وہراس کے سائے منڈلاتے رہیں گے۔

## پس منظر

اس مضمون کو تحریر کرتے وقت (۱۰ مئی) سری لنکا میں عام طور پر امن تھا۔ لیکن اس سے چند روز قبل دو بھیانک واقعات میں سیکڑوں بے گناہ انسان جن میں اکثر سنہالی تھے موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے۔ پہلا واقعہ ۱۷ اپریل کو سری لنکا کے مشرقی علاقے کے شہر ترین کومالی کے نزدیک ایک مقام پر پیش آیا جس میں ایک بس کے سو سے زیادہ مسافروں کو ہلاک کر دیا گیا۔ دوسرے واقعے میں جو زیادہ بھیانک تھا، ۲۱ اپریل کو ملک کی راجدھانی کولمبو میں ہوئے ایک بم دھماکے میں دو سو سے زائد افراد ہلاک ہوگئے۔

سرکاری ذرائع نے ان واقعات کے پیچھے دو تامل دہشت گرد تنظیموں، ایل ٹی ٹی (لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلم) اور ایروز (ایلم ری ولیوشنری آرگنائزیشن) کا ہاتھ بتایا ہے لیکن ان تنظیموں نے اس الزام کی تردید کی ہے۔ حالات اس قدر سنگین ہیں کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تشدد کا آتش فشاں آئندہ کب اور کہاں پھٹے گا۔

## انتقامی اقدام

سری لنکا سرکار نے ان واقعات پر شدید اور فوری ردعمل ظاہر کیا اور تشدد کا جواب تشدد سے دیتے ہوئے جافنا کے ان علاقوں پر بم باری کرائی جنہیں تامل انتہاپسندوں کی کمین گاہ تصور کیا جاتا ہے۔ سری لنکا کی فضائیہ کے طیاروں اور ہیلی کاپٹروں نے ۲۲ اپریل کو جافنا علاقے کے کانکیسن تھورائی اور ناداکلی شہروں پر بموں کی بارش کی جس میں تقریباً دو سو شہری ہلاک ہوئے۔ فضائی حملے کے ساتھ ساتھ جافنا بندرگاہ سے گولہ باری بھی کی گئی جس نے اس فوجی کارروائی کو مزید سنگین بنا دیا۔ کولمبو میں ایک سرکاری اعلان میں کہا گیا ہے کہ دونوں تنظیموں کے ٹھکانوں پر بم باری میں ۸۰ سے زیادہ "دہشت گرد" ہلاک ہوئے۔ دیگر ذرائع سے حاصل شدہ خبروں کے مطابق فضائی حملے میں سو سے زائد افراد جن میں اکثر تامل انتہاپسند تھے ہلاک ہوئے ساتھ ہی انتہاپسندوں کے ٹھکانوں کے نزدیک رہنے والے بہت سے شہری بھی ناحق مارے گئے۔

دوسری طرف ۲۲ اپریل کو ہی سری لنکا کی کابینہ نے "قانون کا احترام کرنے والے اور جمہوری ملک (یعنی سری لنکا) میں امن اور نظم ونسق کی سلامتی کے لیے دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ملکوں" سے تعاون اور مدد کی درخواست کی۔ کابینہ کے ہفتہ واری اجلاس کے بعد جاری ہونے والے ایک بیان میں اس عزم کا اعادہ کیا گیا کہ ملک سے اور خصوصاً شمالی ومشرقی صوبوں سے "دہشت گردوں اور دہشت گردی" کو نیست ونابود کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جائے گی۔

بالفاظ دیگر سری لنکا نے یک طرفہ طور پر جو جنگ بندی کر رکھی تھی اور جو خاصی حد تک کامیاب ہوتی نظر آتی تھی اس سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ صدر جے وردھنے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کے لیے وہ شیطان سے بھی مدد لینے کو تیار ہیں۔ اسی طرح پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے سری لنکا کے وزیراعظم رن سنگھے پریم داس نے کہا کہ جو لوگ تامل مسئلے کا سیاسی حل تلاش کرنے کی بات کریں گے انہیں ہم اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کریں گے۔

پہلے یہ خبریں آئی تھیں کہ جب تک انتہاپسند عناصر مذاکرات کے لیے تیار رہنے کا فیصلہ اور اعلان نہیں کرتے تب تک تامل اکثریت والے علاقوں پر جنہیں انتہاپسندوں کے ذریعے کمین گاہوں کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے بم باری جاری رہے گی لیکن بعد میں اس اعلان کے ساتھ یہ کارروائی روک دی گئی کہ صورت حال پر نظر رکھی جا رہی ہے اور اگر شہریوں کا مزید قتل عام ہوا تو فضائی حملے پھر شروع کر دیے جائیں گے۔

## ہندوستان میں ردعمل

ہندوستان نہ چاہتے ہوئے بھی کسی نہ کسی طرح اس سنگین مسئلے میں الجھ گیا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ

اس سے گلو خلاصی بہت مشکل ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے تامل ناڈو میں تامل انتہاپسند اور سری لنکا کے عام تامل شہری قیام پذیر ہیں۔ اور اسی لیے سری لنکا میں رونما ہونے والے ہر واقعے کے اثرات ہندوستان پر پڑتے ہیں اور نتیجتاً حکومت ہند کو ردعمل ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ہندوستان نے بے گناہ شہریوں کے قتل عام کی مذمت کی اور ان کے پس ماندگان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی وزیر اعظم پریم داس کے مذکورہ بالا بیان پر تشویش ظاہر بھی کی کیونکہ اس کا نشانہ واضح طور پر ہندوستان ہی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ ہندوستان نے برابر سری لنکا کے نسلی تنازعے کے پُرامن اور مذاکرات کے ذریعے سیاسی حل پر زور دیا ہے۔

اس وقت جو ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں تاملوں کے خلاف سری لنکا سرکار کے کسی بھی اقدام کو ہندوستان میں غیر جذباتی اور منطقی انداز میں دیکھا جانا محال ہے چنانچہ یہی ہوا کہ تامل دہشت گردوں کے ذریعے بے گناہ سنہالیوں کے قتل عام کو تو جلد ہی فراموش کر دیا گیا اور تامل علاقوں پر بم باری کی بات ہی یاد رہ گئی۔ دریں اثناء حکومت ہند وقفے وقفے سے مسئلے کے سیاسی حل کی اہمیت پر زور دیتے رہنے کے باوجود سری لنکا سرکار کی نقل وحرکت پر ایک بامعنی خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے لیکن مختلف رنگوں کے رائے عامہ بنانے والے دیگر عناصر شدید اور تیکھا ردعمل ظاہر کر رہے ہیں۔ مثلاً ۵ اپریل کو سابق خارجہ سکریٹری جناب اے۔ پی۔ وینکٹیشورن نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے سری لنکا سے کہا کہ وہ تاملوں کا قتل عام بند کرنے کے لیے فوری اقدامات کرے ہر چند کہ انہوں نے اس نسلی تنازعے کو حل کرنے کے لیے ہندوستان کی فوجی مداخلت سے اتفاق نہیں کیا تاہم یہ ضرور کہا کہ ہندوستان کو سری لنکا کے تاملوں کو وہاں کی فوج کے "قاتلانہ حملوں" سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔

اسی طرح ڈاکٹر سبرامنیم سوامی نے جو فی الحال لوک دل (اجیت سنگھ) سے وابستہ ہیں کہا ہے کہ اب چوں کہ مسئلے کے حل کے لیے ہندوستان کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں اس لیے اسے سری لنکا پر چڑھائی کر دینی چاہیئے۔ جنتا پارٹی کے صدر چندر شیکھر کا خیال ہے کہ ہندوستان سری لنکا کے

اس وقت جب کہ بیرونی طاقتوں کا عمل دخل بڑھتا جا رہا ہو۔ تامل ناڈو کی برسر اقتدار جماعت اے آئی ڈی ایم کے اور حزب اختلاف ڈی ایم کے، اکثر و بیشتر نہایت سختی اور شد و مد کے ساتھ فوجی مداخلت کا مطالبہ کر چکی ہیں اور ابھی حال میں راجیہ سبھا اور لوک سبھا میں اس مسئلے پر ہوئی بحثوں کے دوران بھی انہوں نے اپنے اس مطالبے کا اعادہ کیا۔ واقعتاً اس سوال پر یہ دونوں ہی جماعتیں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی دوڑ میں لگی ہوئی ہیں۔ اسی رسہ کشی کے نتیجہ میں ہی تامل ناڈو کے وزیر اعلا ایم جی رام چندرن نے جافنا کے تاملوں کے لیے تامل ناڈو کے عوام کی جانب سے انسانی بنیادوں پر چار کروڑ روپیوں کی امداد کا اعلان کیا تھا۔ جیسا کہ ہونا تھا سری لنکا نے اس اقدام کو اپنے داخلی معاملات میں دخل اندازی سے تعبیر کیا سری لنکا کے ایک وزیر جامنی دیسا نائیکے نے اس اعلان کو "احمقانہ" قرار دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ دیسا نائیکے ۱۹۸۳ء کے تامل سنہالی فسادات کے بعد مدراس وارد ہونے والے پہلے سنہالی وزیر تھے۔

کے بعد سے ہندوستان ایک عجیب و غریب پیچیدہ اور نازک صورت حال سے دوچار ہے۔ ایک جانب تو سری لنکا حکومت اور تامل انتہاپسند دونوں ہی مسئلے کے حل کے تئیں ہندوستان کے اثرات کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ اور دوسری جانب جب موقع آتا ہے تو دونوں دامن جھاڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ تامل انتہاپسندوں کا بظاہر یہ احساس ہے کہ ایلم (خود مختار ریاست) کے قیام کے ان کے خواب کی تعبیر کی راہ میں ہندوستان آخری حد تک ان کا ساتھ نہیں دے گا سری لنکا حکومت یہ محسوس کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ ہندوستان انتہاپسندوں کو مسئلے کے پُرامن سیاسی حل کی اہمیت کا یقین دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے اور اسے یہ واضح یقین دہانی کرانی چاہیئے کہ تاملوں کو چند مراعات دے بھی دی جائیں تب بھی وہ سری لنکا کے وحدت مرکوز ریاستی نظام کی برقراری میں اس کی مدد کرے گا۔ یہ ایک عجیب المیاتی طربیے کی سی صورت حال ہے جس میں ہندوستان دونوں فریقوں کو اپنی صدق دلی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے اور دونوں فریق اس پر شک کر رہے ہیں۔

جو لوگ نسلی تنازعے کا فوری حل چاہتے ہیں انہیں دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جو فوجی کارروائی کے حامی ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہی مسئلے کا



تمل جنگجو : محاذ آرائی کی تیاریاں

## ہندوستان مخمصے میں

۱۹۸۳ء کے نسلی فسادات اور مخمصہ ۱۹۹۵ء

واحد حل ہے۔ دوسرے خیمے کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان اپنے اثرات کا سرگرم اور ڈٹ کر استعمال کرے تو جلد یا بدیر دونوں فریقوں کو کسی قابل عمل حل کے لیے رضامند کیا جا سکتا ہے۔

## فوجی مداخلت کے حامی

فوجی مداخلت کے حامیوں کے پاس یہ دلیل ہے کہ سری لنکا حکومت چوں کہ آنا کانی کر رہی ہے اور مسئلے کا قابل عمل اور پائیدار حل نکالنے کے لیے دلچسپی نہیں رکھتی، اس لیے ہندوستان کے ذریعے فوجی مداخلت اسے نہ صرف سبق سکھا سکتی ہے بلکہ ہوش کے ناخن لینے پر بھی مجبور کر سکتی ہے۔ ان کی یہ دلیل بھی ہے کہ سری لنکا پر انسانی حقوق کے تحفظ کے نام پر حملہ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس معاملے میں وہاں کی حکومت کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں یہ بات محل نظر ہے کہ تامل ناڈو کے وزیر اعلا نے انسانی بنیادوں پر ہی سری لنکا کے تاملوں کے لیے چار کروڑ کی امداد کا اعلان کیا تھا۔ فوجی مداخلت کے وکیلوں کا کہنا ہے کہ تمام دنیا میں سری لنکا کے تاملوں کے لیے ہمدردی پائی جاتی ہے اور ہندوستان کے علاوہ دیگر بہت سے مغربی ملکوں نے کسی نہ کسی پیمانے پر تاملوں کو پناہ دی ہے۔

فوجی اقدام کا دم بھرنے والوں کا یہ خیال بھی ہے کہ ہندوستانی مسلح افواج سے سری لنکا کی فوج کا کوئی مقابلہ نہیں اور یہ کہ جنگ میں فتح کے بارے میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ ساتھ ہی امریکہ اس صورت حال میں سری لنکا کی مدد کو نہیں آئے گا کیوں کہ وہ ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات اس حد تک نہیں خراب کرنا چاہے گا اور ان کے مطابق کمیونسٹ چین تو محض ایک کاغذی شیر ہے جو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں تمام شور شرابے کے باوجود پاکستان کی مدد کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ لہٰذا ان کی رائے میں اس اقدام کے لیے علاقائی اور بین الاقوامی فضا بالکل سازگار ہے۔

## مذاکرات کے وکیل

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اب بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس مسئلے کا پُرامن اور سیاسی حل نکالا جا سکتا ہے اگر ہندوستان مصمم ارادے کے ساتھ اپنے اثرات کا استعمال کرے۔ ان کے خیال میں یہ ہندوستانی ڈپلومیسی کا امتحان ہے۔ اس مکتب فکر کے افراد کی یہ رائے بھی ہے کہ تشدد کی کوکھ سے تشدد ہی جنم لیتا ہے۔

اور اسی پس منظر میں ایک آزاد تامل ریاست کی تشکیل لازمی طور پر ہندوستان کے قومی مفاد اور سلامتی کے حق میں نہیں ہوگی اور ہندوستان سردست اس قسم کی کسی بھی صورت حال کو انگیز کرنے سے قاصر ہے۔

مزید برآں چوں کہ سری لنکا کے عوام کی اکثریت ریاست اور حکومت کے ساتھ ہے اس لیے ان کے پاس بنگلہ دیش کے معاملے کے برعکس ہندوستانی فوج کا سہارا لینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ نکتہ بھی زیر بحث ہے کہ ہندوستان کے لیے ایسے کسی بھرپور فوجی اقدام سے قبل سری لنکا میں قاضی لینگ ڈپ ڈورجی یا شیخ مجیب الرحمان جیسی کسی شخصیت کی تلاش کر پانا ممکن نہیں۔ درحقیقت سب سے بڑا خدشہ یہ ہے کہ فوجی مداخلت کی صورت میں جے وردھنے اور سری ماؤ بھنڈار نائکے دونوں اپنے گزشتہ تمام اختلافات کو فراموش کر کے متحدہ طور پر ایک چٹان کی طرح اس کا مقابلہ کریں گے کیوں کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی سیاسی بقا کے پیش نظر سنہالی اکثریت کو برگشتہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔

اس کے علاوہ آخری چارۂ کار کے طور پر سری لنکا اپنی حمایت اور مدد کے لیے لازمی طور پر امریکہ نہیں تو پاکستان اور چین کو ضرور آواز دے گا۔ اس برس پانچ کے مہینے میں وزیر اعظم پریم داس کے دورۂ پاکستان کے موقع پر وہاں ان کا جو شاندار خیر مقدم ہوا تھا اور ۱۸ ماہ قبل صدر ضیاء نے جس طرح ۱۹۷۱ء کی ہند پاک جنگ کے دوران جنرل یحییٰ خان کی سری لنکا کی حمایت کا ذکر کیا تھا اس سے کافی کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جولائی ۱۹۸۵ء میں صدر جے وردھنے کا دورۂ چین بھی اس لحاظ سے بامعنی اہمیت کا حامل ہے۔ مسز بھنڈار نائکے کی حکومت ختم ہونے کے بعد سری لنکا سے امریکہ کی قربت خاصی بڑھ گئی ہے۔ سری لنکا کے مشرقی علاقے میں واقع ترنکومالی اڈے میں امریکہ کی دلچسپی جگ ظاہر ہے۔ لہٰذا فوجی مداخلت کی صورت میں امریکہ کتنا غیر جانب دار رہے گا اس کے بارے میں قیاس کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔

اس پوری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ حکومت ہند اپنے سیاسی اثرات کے استعمال میں حتی الامکان جتنی زیادہ پختہ کاری اور پکے ارادے کا ثبوت دے اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ اس کا کوئی متبادل نظر نہیں آتا۔ اب تک کا تجربہ تو یہ ہے کہ سری لنکا نے ہمیشہ ہندوستان کے ذریعے ڈالے گئے ہر جائز اور مناسب دباؤ کو تسلیم کیا ہے اور آئندہ بھی ایسا نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ البتہ سری لنکا کے مختلف سیاسی رہنما بعض تلخ بیانات ضرور دیں گے جن کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے ساتھ ہی تامل انتہا پسند بھی تنقید اور مذمت سے بالاتر نہیں ہیں ان کی حالیہ بعض کارروائیوں سے ہندوستان میں ان کے ہمدردوں کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ ادھر سری لنکا حکومت نے نہ صرف یہ کہ ۱۹ دسمبر کی تجویز میں اپنے یقین کا اعادہ کیا ہے بلکہ مذاکرات کے ذریعے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے انتہا پسندوں سے اس کے لیے رضامند ہونے کی بات بھی کہی ہے۔ زیادہ اہم بات سری لنکا کے زرعی ترقی کے وزیر دیسا نائکے کا یہ بیان ہے کہ صوبائی کاؤنسلوں کی تشکیل سے متعلق بل کا مسودہ تیار ہے اور اسے جلد ہی پارلیمنٹ کے ذریعے منظور کرا لیا جائے گا۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ سری لنکا حکومت تامل گروپوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ ہونے کی صورت میں بھی اس پر عمل درآمد کر سکتی ہے چنانچہ ہندوستان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔



جنگی پیمانے پر تیاریاں؟

محمد احمد شیون

# فلسطینی بے گھر
# داغ داغ جد و جہد

ایک گولی سنناتی ہوئی آئی اور مکان کی کھڑکی کو توڑتی ہوئی اس خاتون کو جا لگی، جو مکان کے اندر اپنے بچے کے ساتھ کمین کر اپنے کرب کا مداوا کر رہی تھی۔ لیکن اس بے رحم گولی نے اسے ہمیشہ کے لئے خاموش اور گرد و پیش کی تمام کرب ناکیوں سے بے نیاز کر دیا اور معصوم بچہ ابدی نیند میں ڈوبی ہوئی اپنی ماں کا بے بسی سے ماتم کرتا رہ گیا۔ کوئی بھی اس بچہ کی مدد کو نہ آیا اور کون تھا جو اس کی خبر لیتا۔ اس کے گھر کے بڑے تو امل ملیشیا کے حملوں کی مزاحمت اور عملاً موت و زیست کی جنگ میں مصروف تھے —— یہ واقعہ ۶ مارچ ۱۹۸۸ء کا ہے، جو بیروت کے نواح میں فلسطینیوں کے پناہ گزین کیمپ برج البراجنہ میں پیش آیا۔

مشین گنوں کی گولہ باری اور کلاشنکوف رائفلوں کی گولیوں کا شور اور انسانی آہ و فریاد کے درمیان ماں باپ اس فکر میں پریشان نظر آتے ہیں کہ اپنے بچوں کی بھوک کیسے مٹائیں۔ ہفتوں سے انہیں کوئی ایسی چیز میسر نہیں ہو سکی ہے، جسے انسانی غذا کہا جا سکے، بلکہ اس دوران تو پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کتے، بلیاں اور چوہے تک اور ہر وہ زندہ شے جو ان کے ہاتھ لگ سکی، ان کی غذا بن گئی ہے۔ اگر کوئی چیز اب تک باقی رہ گئی ہے تو وہ انسانی گوشت ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال کی خوفناک سنگینی بالآخر مردہ سپاہیوں کے گوشت کو بھی زندہ فاقہ کشوں کی خوراک بنا کر رہے گی۔ اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ فلسطینی کیمپوں میں محصور فاقہ کش لوگوں کی جانب سے علماء سے پوچھا گیا ہے کہ وہ بھوک سے جاں بہ لب ہونے کی حالت میں جب کہ کھانے کی کوئی چیز میسر نہ ہو، ان حالات میں جن سے وہ دوچار ہیں، کیا انسانی گوشت کھایا جا سکتا ہے؟ ایک اطلاع کے مطابق ایک عالم نے لبنان میں پناہ گزین کیمپوں میں مہینوں سے محصور فلسطینیوں کے لئے جان بچانے کی آخری تدبیر کے طور پر بمباری سے ہلاک ہونے والوں کا گوشت کھانا "جائز" قرار دیا ہے۔

یہ دردناک صورت حال دراصل امل ملیشیا لیڈروں کی جانب سے مغربی بیروت میں گنجان فلسطینی علاقوں کی مکمل ناکہ بندی کے فیصلہ کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ مقصد اس کا صرف یہ ہے کہ ایک طرف گولہ باری اور



بمباری کے ذریعہ اور دوسری طرف فاقہ کشی میں مبتلا کر کے فلسطینیوں کو بے دست و پا کر دیا جائے اور



خانہ جنگی کے زخموں سے چور لبنان پر اپنا قبضہ قائم کیا جائے۔ شیعہ امل ملیشیا کی پالیسی کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ لبنان میں "کیمپوں کی جنگ" کی تاریخ اور لبنان کی موجودہ سیاسی صورت حال میں محصور فلسطینیوں کی اہمیت پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

لبنان کی موجودہ اتھل پتھل کا آغاز گزشتہ سال نومبر میں "کیمپوں کی جنگ" کے دوبارہ چھڑ جانے سے ہوا۔ امل کے لوگوں کو اس وقت بڑا غصہ آیا جب فلسطینیوں نے دروز ملیشیا کے ٹھکانوں کا فائدہ اٹھا کر امل ٹھکانوں پر بمباری شروع کردی۔ امل کے شیعہ لیڈروں نے ان دونوں گروہوں کے درمیان اس تال میل کو ایک نئے فلسطینی دروز دستی گٹھ جوڑ سے تعبیر کیا، جو ان کے نزدیک ایک سنگین خطرہ تھا۔

دراصل یہ دروز فلسطینی اتحاد امل کے اس خواب کے لئے تباہ کن ہے، جو وہ اپنے غلبہ اور ترقی کے لئے دیکھتی رہی ہے۔ ماضی قریب تک امل گروہ لبنان کا سب سے بڑا لیکن تاریخی اعتبار سے سب سے پس ماندہ گروہ رہا ہے لیکن لبنان میں سیاسی ہنگامہ خیزی اور اتھل پتھل نے انہیں علاقائی اور سیاسی لحاظ سے اہمیت اختیار کرنے کا موقع دیا ہے۔ ہتھیاروں کی فراوانی مرکزی حکومت کی مکمل ناکامی اور سیریا کی سرگرم پشت پناہی وہ سازگار عوامل ہیں جنہوں نے امل کے اندر اپنے مقاصد کے حصول کے لئے خود اعتمادی پیدا کی ہے۔

لیکن دوسری طرف لبنان میں کچھ مخالف قوتوں کی موجودگی امل کے اس دیرینہ خواب کے عملی تعبیر میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ ملک کے سیاسی انقلابات میں اکثر و بیشتر مختلف گروہوں کے درمیان ایک دوسرے کے یکطرفہ ممکن تسلط کو ختم کرنے کے لئے حلیفانہ اتحاد ہوتا رہتا ہے۔ اس بنا پر دروز لیڈر

ولید جنبلاط نے فلسطینیوں کے ساتھ اتحاد قائم کرلیا، جو کئی سال پہلے خود جنبلاط کے حملوں کا نشانہ بھی بن چکے تھے۔

لبنانیوں اور فلسطینیوں کے ان دو طاقت ور اور آزاد جنگجو گروہوں کا اس انداز میں ابھرنا لبنان کے روایتی نیم گروہی توازن پر سنگین اثرات مرتب کرنے کا باعث بنا۔ ان نے حلیفوں نے عیسائیوں کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور اور بالادست حیثیت حاصل کرلی اور یہی بات امل ملیشیا کو جوابی کارروائی کرنے پر اکسانے کا سبب بنی جہاں ایک کو حاصل فائدوں کو ہمیشہ دوسرے کے نقصان کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نئی صورت حال میں عربوں کو شامیوں کی حمایت حاصل رہی جن کے لئے یہ دروز فلسطینی اتحاد پریشانی کا سبب تھا۔ اس اتحادی گروپ کی اسرائیل کے خلاف انقلابی سرگرمیاں، نتیجہ کے طور پر شام کو اسرائیلی انتقامی کارروائیوں کا ہدف بنا سکتی تھیں، جو صورت حال ۱۹۸۱ء میں تقریباً پیش آچکی ہے۔

ابتدا میں دروز اور امل کے درمیان محض گروہی جنگ کا نقشہ نظر آتا تھا۔ شامی صدر حافظ الاسد کی مداخلت سے یہ ٹکراؤ اگرچہ عارضی طور پر رک گیا تھا لیکن اس دوران دروز اپنے حلیفوں یعنی فلسطینیوں کی شیعی ملیشیا کے ساتھ کشمکش میں مدد کرتے رہے۔ حالات اس وقت زیادہ بگڑ گئے جب دروزیوں نے فلسطینیوں کو اپنے پہاڑی اڈے عربوں پر بمباری کے لئے استعمال کرنے کی سہولت دے دی اور صورت حال ۱۹۸۲ء سے ماقبل کے دنوں کے مشابہ نظر آنے لگی جب بائیں بازو کی پارٹیوں کا "قومی تحریک" کا اتحاد پی ایل او کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔

نئی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے امل قیادت نے فلسطینی کیمپ کی ناکہ بندی کرنے کا فیصلہ کیا، جس کا مقصد پی ایل او کو لبنان میں طاقت پکڑنے سے روکنا

تھا۔ اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ درمیانی عرصہ میں پی ایل او اپنی صفوں کو مضبوط کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ لیکن لبنان میں موجود سیاسی مخمصہ میں یہ صورتحال امل کی خواہشات کے خلاف تھی۔ مثال کے طور پر اعلیٰ شیعی کونسل کے کارگزار صدر شیخ مہدی شمس الدین لبنان میں "عددی جمہوریت" کے قیام کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ اس کے تحت شیعوں کو سب سے بڑے گروہ کی حیثیت سے وسیع فوائد حاصل ہوجائیں گے۔ اسی بنا پر ان کی جانب سے یہ مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ انہیں وہی مراعات دی جائیں جو مارونی عیسائیوں کو ماضی میں حاصل رہی ہیں۔

فلسطینی کیمپ میں دردناک حالات کی اولین اطلاعات ایک برطانوی سرجن کے ذریعہ سامنے آئیں، جو کیمپ کے اندر رہ چکا تھا۔ فلسطینی پناہ گزینوں کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ "میں نے خود کتوں کا گوشت کھایا۔ بچے بھی چوہے کھانے پر مجبور ہیں۔" فاقہ کشی، صحت کے لئے تباہ کن ماحول اس کے نتیجہ میں پھوٹ پڑنے والی بیماریوں نے بے شمار افراد کو لقمۂ اجل بنا دیا ہے۔

فلسطینی کیمپوں میں جاری افسوسناک اور خوفناک صورت حال کے بارے میں حاصل ہونے والی مزید معلومات اور چشم دید اطلاعات نے امل محاصرہ کے خلاف عالمی سطح پر احتجاج کا ایک طوفان برپا کردیا۔ نتیجہ کے طور پر اقوام متحدہ کی امدادی ایجنسی (UNRWA) اور دوسری بین الاقوامی تنظیموں کو کیمپ کے اندر کسی حد تک غذائی اشیاء پہنچانے کی اجازت دی گئی۔ لیکن یہ محض عارضی نوعیت کی راحت تھی، کیونکہ امل ملیشیا اپنا محاصرہ ختم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ گویا بالفاظ دیگر امل ملیشیا فلسطینیوں کو تسکین شکم کے لئے اپنے فیصلوں کا مرہون منت رکھنا چاہتی ہے۔

اس تنازعہ کے حل ہونے کی ایک صورت اس وقت پیدا ہوئی تھی جب پی ایل او کے سپاہیوں نے مقدوشہ کا گاؤں امل ملیشیا کے سپرد کردیا تھا لیکن امل ملیشیا کو فلسطینیوں نے صیدون کے عین الحلوی اور میہ میہ کیمپوں کے قریب ٹھکانوں میں داخلہ کی اجازت نہیں دی جب تک کہ دوسرے کیمپوں پر سے امل محاصرہ ختم نہ کردیا جائے۔ فلسطینیوں کے اس اڑیل رویہ پر بھڑک کر جھلاہٹ میں مبتلا امل نے غذائی ناکہ بندی کا حربہ اختیار کیا۔

حالیہ دور میں مغربی طاقتوں اور ذرائع ابلاغ کی جانب سے جانبداری کا ایسا مظاہرہ کسی اور معاملہ

بھی ساتھ نہیں آیا جیسا کہ فلسطینی بحران کے تعلق سے کہا گیا ہے۔ ذرائع ابلاغ کو چند بے شمار افراد کی حالت بے اس قدر تشویش اور تکلیف لاحق تھی کہ اس کے لئے فلسطینیوں کے کیمپ میں در پیش انسانیت سوز اور بے یار و مددگار حالت کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا اور کسی حلقہ سے اگر ان حالات کا ذکر کیا گیا تو الٹے فلسطینیوں کو ہی مورد الزام قرار دیا گیا۔

فلسطینی پناہ گزینوں کے معاملہ میں مغربی تجزیہ کا ایک اہم پہلو اس اظہار ناراضگی پر مشتمل ہوتا ہے کہ یہ فلسطینی اپنی تہذیبی شناخت سے چپکے رہنے پر مصر ہیں۔ ان حلقوں کی دلیل یہ ہے کہ عربوں کی جانب سے جو فیاضانہ امداد انہیں دی جاتی ہے، اسے فلسطینیوں کو بجائے اس کے کہ ہتھیاروں کے حصول پر صرف کریں، اپنے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے کام میں لانا چاہیے۔ اکثر یہ مغربی حلقے فلسطینی گروہوں پر اپنے قیام کے ملکوں کی آبادی میں ضم نہ ہونے پر لعن طعن کرتے نظر آتے ہیں۔ ان ساری باتوں کے پردے میں دراصل جو بات کہی جاتی ہے، وہ یہ کہ فلسطینیوں کا اپنے وطن کے لئے جدوجہد اور اس کا خواب محض ایک سراب ہے۔ نیز یہ کہ اس جدوجہد کو جاری رکھنے کے حامیوں کو عرب برادری کا حصہ بن جانے کی کوشش کرنی چاہیے یا پھر جیسا کہ حالیہ عرصہ میں سامنے آیا ہے، مغرب کی طرف مستقل کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

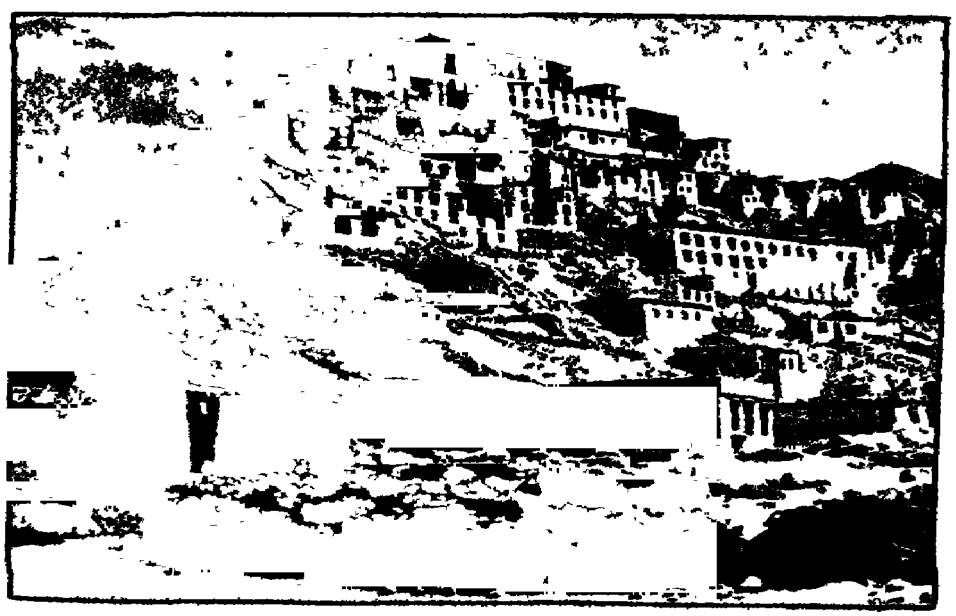
یہ احمقانہ انداز فکر درحقیقت مغربی تجزیہ کاروں اور لیڈروں کے احساس جرم کی عکاسی کرتا ہے۔ آخر تاریخ تو اس گھناؤنی سازش کا ثبوت ہے، جو ان مغربی طاقتوں نے فلسطینی عوام کو ان کے وطن سے نکال کر جدید خانہ بدوشوں کی حالت سے دوچار کرنے کے لئے کی ہے۔ اس ضمن میں اسرائیل کے قیام کی تاریخ کا ایک جائزہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جس سے اسرائیل کے اپنی تاریخی بنیادوں سے متعلق مغالطہ آمیز دعووں کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی۔

قدیم عبرانیوں کا محض ایک مختصر عرصہ تک اور ناپائیدار طور پر فاتح کی حیثیت میں فلسطین میں وجود رہا۔ ۷۰ء میں رومیوں نے یروشلم کو تاراج کر کے یہودی فلسطین کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اسی "تاریخی حق" کی بنیاد پر یہودیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین یہودیوں کا خصوصی وطن ہے۔ فلسطین پر اس دعوے کی تحریک کو مزید قوت اور تحرک ان برطانوی حاکموں نے دی جنہیں ۱۹ویں صدی کے وسط سے فلسطین پر سیاسی تسلط حاصل رہا تھا۔ چنانچہ صیہونیت میں یورپی کلچر کا خصوصی سامراجی تصور ایک اہم عنصر کے طور پر شامل کیا گیا اور فلسطینیوں کو پسماندہ قرار دے کر ان پر اپنے تسلط کو اپنا حق قرار دیا گیا۔

صیہونیوں کی سب سے پہلی کانفرنس سوئٹزرلینڈ میں باسلے میں ہوئی، جس کا مقصد ایک بین الاقوامی یہودی تنظیم کا قیام تھا۔ صیہونی تحریک کا بنیادی مقصد فلسطین میں ایک یہودی وطن کا قیام تھا جسے ایک قانونی ریاست کی حیثیت حاصل ہو۔ اسی کانفرنس نے فلسطین میں بڑے پیمانہ پر یہودی زراعتی اور صنعتی محنت کشوں کو آباد کر کے ایک یہودی نو آبادی بنانے، یہودی احساس کو فروغ دینے اس کی اشاعت کرنے اور صیہونی مقاصد کے لئے حکومت کی حمایت حاصل کرنے کا پروگرام مرتب کیا۔ صیہونی تحریک کے یہ اغراض و مقاصد اس کی نسل پرستانہ اور سامراجی خصوصیات کو واضح کرتے ہیں۔ یہ تحریک ان تمام یہودیوں کو متحد کرنے کے لئے کوشاں ہوئی جو اپنی یہودی شناخت برقرار اور نمایاں رکھنا چاہتے تھے۔

برطانوی سامراج نے ان مقاصد میں فلسطین میں جسے یہودیوں کا مستقبل کا وطن قرار دیا گیا تھا۔ یہودیوں کی آبادکاری کے لئے سہولتیں مہیا کر کے تعاون کیا۔ برطانوی سامراجیوں نے یہودیوں کے فلسطین کے ساتھ تاریخی اور مذہبی رابطہ کو تسلیم کر لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کے لئے فلسطین کا جائے وقوع عسکری اعتبار سے بے حد اہم تھا اور یہاں یہودیوں کی موجودگی کے ساتھ برطانیہ بندرگاہ خلیج سے تیل کے راستہ اور مقامی عرب آبادی پر بآسانی اپنا کنٹرول قائم رکھ سکتا تھا۔ ۱۸۹۳ء میں فلسطین میں یہودی آبادی صرف ۹۷۰۰ تھی۔ اسی سال برطانیہ نے یہودیوں کے تحفظ کے مقصد سے یروشلم میں اپنا ایک قونصل خانہ قائم کیا۔ اس کے بعد بالخصوص یورپی ملکوں سے بھاری تعداد میں یہودیوں کے نقل وطن کے نتیجہ میں ۱۹۱۶ء میں یہودیوں کی تعداد بڑھ کر ۸۵ ہزار ہو گئی۔ اس یہودی پھیلاؤ اور قبضے کے خلاف عرب مزاحمت ترک پالیسی یا سلطنت عثمانیہ پر برطانوی دباؤ کے تحت کامیاب نہ ہو سکی۔ فلسطین پہلی عالمی جنگ سے پہلے سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا اور فلسطینیوں نے ترک غلبہ کو ختم کرنے میں برطانوی فوجوں کا ساتھ اس وعدہ پر دیا تھا کہ برطانیہ عربوں کو مکمل قومی آزادی فراہم کرے گا۔

۲ مارچ ۱۹۱۷ء کو برطانوی وزیر خارجہ آرتھر بالفور نے انتہائی ناانصافی پر مبنی اس اعلانیہ پر دستخط کئے جو بعد میں بالفور اعلانیہ کے نام سے معروف ہوا۔ اس

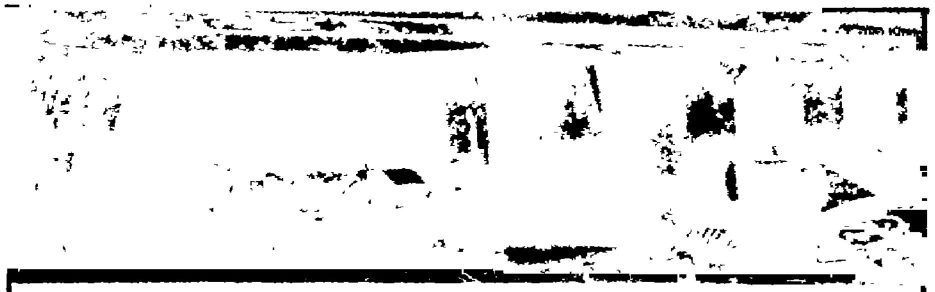


خوابوں کا آشیانہ

اعلانیہ کا مقصد عربوں کو اپنے وطن کے باشندے اور مالک کی حیثیت سے ان کے حقوق سے بتدریج محروم کرنا تھا۔ فلسطین کو آزاد کرنے کا اپنا وعدہ پورا کرنے کے بجائے، اتحادی طاقتوں نے انتدابی نظام [illegible] کا حربہ

ایجاد کیا، جو فی الواقع عرب ریاستوں پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے ایک قسم کا بالواسطہ نوآبادیاتی نظام تھا۔ اس انتدابی حق کو ۱۹۲۱ء میں، جب کہ معروف صیہونی ہربرٹ سموئیل ہائی کمشنر تھا، قانونی منظوری دے دی گئی۔ عربوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے ساتھ ہی عربوں اور یہودیوں کے تعلقات میں بگاڑ کا آغاز ہو گیا۔ عرب جذبات کا متعدد مرتبہ پرتشدد مظاہرہ ہوا۔ پہلی بار یہ احتجاج اپریل ۱۹۲۰ء میں پھر مئی ۱۹۲۱ء میں اور پھر اگست ۱۹۲۹ء میں ہوا اور ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء کے عرصہ میں تو اس نے عمومی بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔

۹ مئی ۱۹۴۹ء کو برطانوی انتدابی حکومت MANDATORY GOVERNMENT افراتفری کی اس صورت حال کے آگے بے بس ہو کر، جو گزشتہ کئی عشروں کے دوران یہودیوں کے بیرون فلسطین سے مسلسل آمد اور صیہونیوں کے بڑھتے ہوئے جارحانہ رویہ کی بنا پر پیدا ہو چکی تھی، معاملہ اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا۔ اقوام متحدہ کی جانب سے ایک خصوصی کمیٹی برائے فلسطین (UNSCOP) صورت حال کا جائزہ لینے اور ضروری تدابیر تجویز کرنے کے مقصد سے بھیجی گئی۔ اس کمیٹی نے جو حل پیش کیا وہ یہ کہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے جن کے درمیان اقتصادی رابطہ قائم رہے۔ اس کے تحت اقوام متحدہ کے زیر اختیار یروشلم کے ایک انٹرنیشنل زون کے قیام کا بھی مشورہ دیا گیا تھا مزید برآں تقسیم کے اس منصوبہ میں یہودیوں کو فلسطین کا ۵۶ فیصد علاقہ دیا گیا تھا جب کہ یہودیوں کی آبادی عربوں کی آبادی کی آدھی تھی۔ اس یہود نواز تجویز کا صیہونیوں کو بہر طور پر خیر مقدم کرنا ہی چاہیے تھا جب کہ عربوں نے اس پر شدید برہمی کا اظہار کیا۔ اس وقت فلسطین کی کل آبادی ۲۱۱۵،۰۰۰ تھی، جس میں سے ۱۴۱۰،۰۰۰ یا دو تہائی مسلمان اور عیسائی عرب ۷۰۵ ہزار یا ایک تہائی یہودی اور ۲۵ ہزار کی تعداد میں دوسرے لوگ تھے۔ یونسکوپ (UNSCOP) کے اس منصوبہ کو اقوام متحدہ (جہاں پہلے ہی صیہونیت کی سرپرست طاقتوں کا غلبہ تھا) نے منظور کر لیا لیکن عربوں نے اسے مسترد کر کے اس کی مزاحمت کرنے کا اعلان کیا۔



یہاں کبھی ہم آباد تھے

دوسری جانب برطانوی سامراج، یہ انتظار کیے بغیر کہ اقوام متحدہ کی خصوصی کمیٹی برائے فلسطین (یونسکوپ) علاقہ کا انتظام سنبھال لے اور پھر تدریجاً اسے عربوں اور یہودیوں کے سپرد کرے، اچانک فلسطین سے دستبردار ہو گیا اور اس طرح ایک انتظامی خلا پیدا کر دیا۔ اس موقع کا صیہونیوں نے، جو ان کے لیے خاص طور پر دانستہ پیدا کیا گیا تھا، بھرپور فائدہ اٹھایا اور ۷۰ فیصد سے زائد فلسطینی علاقہ پر قبضہ کر کے اسی دن اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا۔ تل ابیب کے ایک میوزیم سے ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو شام ۴ بجے ڈیوڈ بن گوریان نے "یہودی ریاست اسرائیل" کے قیام کا اعلان کیا۔ بن گوریان نے اسرائیل کے سیاہ طغرے پر دستخط کیے اور یہودی آرکسٹرا اسرائیل کا قومی ترانہ "حتیقوہ" کی دھن بکھیرنے لگا۔ بن گوریان نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ اس نوتشکیل ریاست اسرائیل کے مستقبل کا انحصار عسکری طاقت پر ہوگا۔ یروشلم کے بڑے حصہ کو اسرائیل میں شامل کر لیا گیا اور تقریباً دس لاکھ عربوں کو جبراً نکال دیا گیا۔ اس طریقہ پر اس ریاست اسرائیل کا وجود عمل میں آیا۔ جس کی تشکیل طاقت کے بہیمانہ مظاہرہ اور اقوام متحدہ کے چارٹر کے اصولوں، حقوق انسانی کے عالمی اعلانیہ اور یونسکوپ کی سفارشات پر مبنی اقوام متحدہ کی قرارداد کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کے ذریعہ کی گئی۔ عرب نیشنلزم، جو سلطنت عثمانیہ کے مظالم کے خلاف جدوجہد کے دوران ابھرا تھا اسے برطانوی سامراج نے، جو اس علاقہ میں یہودی نیشنلزم کا طاقتور حامی اور سرپرست بنا ہوا تھا، گروہی کشمکش کو ہوا دے کر اور پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کی پالیسی کے ذریعہ بے اثر کر دیا تھا۔ فلسطین میں صیہونی نسلی برتری کی تحریک مغربی نوآبادیت کا ایک اٹوٹ حصہ تھی اور فلسطینی عوام اس فریب کاری اور ناانصافی کو ختم کرنے کی تلخ و صبر آزما

جدوجہد میں مصروف ہیں، جو ان کے ساتھ صیہونی سامراجی سازش کے تحت کی گئی ہے۔

یہ درست ہے کہ بعض فلسطینی افراد یا گروہوں نے دہشت گردانہ کارروائیاں کرنے کی غلطی کی ہے، جن کا نشانہ اکثر بے قصور لوگ ہی بنتے ہیں۔ گو کہ ان کی یہ کارروائیاں درست نہیں ہیں لیکن یہ مایوسی اور حرماں نصیبی کی ان حالتوں کے مظہر ہیں، جن کی جانب سے کوششیں اور ارباب اقتدار محض سرسری توجہ دیتے ہیں اصل مسئلہ کو حل کرنے کے لیے شاید ہی کبھی کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی ہو۔ امریکہ کھلے عام اور پوری بے شرمی کے ساتھ اسرائیل اور اس کے عزائم کی حمایت کر رہا ہے، جب کہ اسرائیل کا مغربی کنارہ اور غازہ پٹی پر نوآبادیاتی سلسلہ جاری ہے۔ ایسی صورت میں فلسطینیوں کے بارے میں یہ کہنا یا ان سے یہ توقع رکھنا نادانی ہوگی کہ وہ اپنے مسئلہ کا کوئی حل پائے بغیر اسرائیل کو ایک قانونی ریاست کے طور پر تسلیم کر لیں۔ لیکن امریکہ اور اسرائیل فلسطینیوں سے اس احمقانہ مطالبہ کو دہرائے جا رہے ہیں۔

اپنے حق خود اختیاری اور اپنے وطن کے حصول کے لیے فلسطینی عوام کی جدوجہد اب تک کتنے ہی نشیب و فراز دیکھ چکی ہے۔ اس جدوجہد کے آلام و مصائب نے ان کے عزم میں مزید ثبات اور پختگی پیدا کی ہے آزمائشوں کے بے رحم طوفانوں سے گزر کر اب وہ پہلے سے زیادہ طاقتور اور پرجوش ہیں۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین (پی ایل او) کے مختلف گروپوں اور دیگر فلسطینی گروہوں کے درمیان اتحاد کی حالیہ کوششوں کو اگر اب تک کے حاصل شدہ اجتماعی تجربات کے ساتھ مربوط کر کے ایک ٹھوس شکل دی گئی تو ان کی جدوجہد اور اس کے ساتھ ہی خود بے وطن فلسطینیوں کا مستقبل تابناک ہے، کیونکہ باہمی اتحاد تاریخی ظلم کے خلاف جدوجہد میں ان کی اہم ترین ضرورت ہے۔

ڈاکٹر آشیش نرائن رائے
اے۔ این۔ جھا

# شام: لبنان کی دلدل میں

دنیا کے کسی بھی علاقے میں ایسی خوں ریزی اور غارت گری دیکھنے میں نہیں آئی جیسی مشرق وسطیٰ میں ہو رہی ہے۔ یہ سلسلہ نصف صدی سے پہلے فلسطین کے ساتھ برطانیہ کی بدسلوکی کے بعد شروع ہوا تھا۔ پورے خطہ میں لبنان کی صورت حال سب سے زیادہ تشویش انگیز ہے، جہاں نہ صرف عرب ممالک اور اسرائیل برسرِ جنگ ہیں بلکہ عرب ممالک کی ذاتی کشیدگی بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ یہاں بے قاعدہ افواج کی مسلح جھڑپیں مسلسل جاری رہتی ہیں۔ لبنان کی بدنظمی اور انتشار کی خبریں، اسی طرح سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتی ہیں جس طرح دو دہائی قبل کانگو کی خبریں نظر آیا کرتی تھیں۔

غیر ملکی طاقتوں کی لبنان میں دلچسپی اس بات کا واضح اور بیّن ثبوت ہے کہ مستقبل قریب میں اس مسمار شدہ ملک میں امن قائم ہونا بعید از قیاس ہے۔ ایک حالیہ جائزے کے مطابق اس وقت تقریباً چالیس سیاسی اور نیم فوجی گروہ، ملک کے مختلف حصوں پر اپنا اقتدار جمائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند کافی بڑے پیمانے پر منظم کیے گئے ہیں اور کسی ایک قوم یا نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے سیاسی تسلط حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے گروہ جو ایک خود مختار طاقت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، شام جیسی علاقائی طاقتوں کے اشارے پر کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ "اسلامی جہاد" اور "حزب اللہ" جیسے نئے فوجی گروہوں کے ابھرنے اور آپس کے انتشار کی وجہ سے بھی لبنان کی سماجی اور نسلی عمارت چور چور ہو کر رہ گئی ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ کوئی بھی گروہ مرکز کو مضبوط بنانے کی بات نہیں کرتا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ایک مستحکم مرکزی حکومت ہی اس بے وجہ انتشار کو ختم کرنے کے لیے لائحہ عمل تیار کر سکتی ہے لیکن سردست حریف گروہوں کے درمیان حکومت کی حیثیت محض رسمی ہے۔ ان گروہوں میں "مارونی"، سنی اور دروزی بھی شامل ہیں۔

لبنان کی شطرنجی تاریخ کا سیاہ ورق، وہ خانہ جنگی ہے جو شامی حمایت یافتہ گروہ 'امل' اور فلسطینیوں کے درمیان گزشتہ دو سال سے جاری ہے۔ ۱۹۷۶ء کی خانہ جنگی کے بعد سے فلسطینی ہی ہر قدم پر بدقسمتی کا شکار رہے ہیں۔ تازہ ترین "خیمہ جنگ" جو گزشتہ ستمبر میں شروع ہوئی تھی، نومبر میں شدت اختیار کر گئی۔ پی ایل او پر شیعہ گروپ کے مستقل حملوں اور محاصروں سے ایک ہزار سے زیادہ جانیں تلف ہوئیں، دوگنے لوگ زخمی ہوئے اور بڑے پیمانے پر لوگ بے گھر ہو گئے۔ پی ایل او کے پناہ گزین کیمپ پر 'امل' کے حملے کی وجہ سے تیس ہزار فلسطینی اور عیسائی آبادی کو جنوبی بیروت کی نواحی بستیوں میں پناہ لینی پڑی۔ وہاں ان کو فاقہ زدگی کی وجہ سے کتے، بلیاں اور ضرر رساں کیڑے مکوڑے کھانے پر مجبور ہونا پڑا۔ خاص طور سے طائر، سیدون اور برجناح میں حالات زیادہ قابلِ رحم ہو گئے تھے جہاں تقریباً پندرہ یا اٹھارہ ہزار افراد پر غذا کی قلت کی وجہ سے عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا اور زیادہ تر اموات کی وجہ بھی یہی تھی۔

'امل' اور اس کے حلیف شام پر جب بین الاقوامی دباؤ ڈالا گیا تو اسے غذائی پابندی ہٹانے پر بادلِ ناخواستہ مجبور ہونا پڑا۔ یو۔ این۔ آر۔ ڈبلیو۔ اے اور دوسرے بین الاقوامی اداروں نے کافی مشکلات کا سامنا کر کے متاثرہ کیمپوں میں غذا فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے علاوہ 'امل' نے اس وقت تک محاصرہ بندی ختم کرنے سے انکار کیا جب تک فلسطینیوں نے سیدون ان کے حوالے نہیں کر دیا، جس پر پی ایل او نے دسمبر میں قبضہ کر لیا تھا۔ 'امل' کو پہاڑی چوٹی پر واقع گاؤں، مغدوشہ، واپس دیا گیا لیکن فلسطینیوں نے شیعوں کو سیدون کے قریب عین الحلوہ اور میہ میہ پرانے علاقوں میں رہنے کی اجازت دینے سے انکار کیا اور دوسرے کیمپوں سے محاصرہ ختم نہیں کیا۔ اس وقت شام نے بھی فلسطینیوں پر "منحرف گروہ" ہونے کا الزام لگایا، ساتھ ہی لبنانیوں کو بھی تمام حالات اور قتل و غارت گری میں شرکت کے لیے مورد الزام ٹھہرایا۔

دوسری طرف دمشق اور دوسری راجدھانیوں میں انتشار کو ختم کرنے کے لیے مذاکرات شروع ہو گئے۔ اس میں ایران، لیبیا، شام اور عرب لیگ کے افسران شامل ہوئے۔ دروزی حمایت یافتہ بائیں بازو کے گروپ سے زبردست جنگ کے بعد 'امل' نے بیروت سے محاصرہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس جنگ سے مغربی بیروت مکمل طور پر شعلوں کے نرغہ میں آ گیا۔

تاریخی اعتبار سے 'امل'، اس وقت شیعہ فرقہ کا سب سے بڑا گروہ ہے جسے خاص مراعات حاصل ہیں۔ وہ شامی تسلط کی داری "بقاع" اور جنوبی لبنان میں محدود ہیں اور شیعہ شامی حکومت سے مالی اور فوجی امداد حاصل کرتے ہیں۔ ساتویں دہائی کے اوائل سے ہی وہ سیاسی اور علاقائی اثرات قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ شیعہ کونسل کے صدر شیخ مہدی شمس الدین اور 'امل' کے دوسرے قائدین اکثریتی طبقہ کی حیثیت سے لبنان میں "اعدادی جمہوریت" قائم کرنے کے لیے زور دے رہے ہیں۔ وہ تقریباً وہی مراعات چاہتے ہیں جو ماضی میں "مارونیوں" کو حاصل تھیں۔

'امل' کو قومی سطح پر اثر پیدا کرنے کا حوصلہ لبنان کے سیاسی تعطل کے بعد ہی ملا۔ انہوں نے خود کو فلسطینیوں کے مقابلے پر کھڑا کیا لیکن شام کی مدد کے باوجود 'امل' فلسطینی افواج پر کوئی دباؤ ڈالنے میں ناکام

رہا۔"اس کی پریشانی کی دوسری وجہ فلسطینیوں، دریوزیوں اور سنیوں کا باہمی اتحاد تھا۔ پی ایل او لیڈر یاسر عرفات نے ولید جنبلات کی دریوزی فوج کے ساتھ از سر نو جدوجہد کے لیے تیاری کی۔ انہوں نے ایران نواز دل سے سمجھوتہ کر کے عیسائیوں کو بھی ہموار کیا جنہوں نے حالیہ جنگ سے بچنے کے لئے "امل" سے دور رہنا پسند کیا تھا۔

امل کے خلاف کھڑے گروہوں کے باہمی اتحاد کو "قدیم قومی تحریک" کا پیوند کہا جا سکتا ہے۔ بائیں بازو کی یہ پارٹیاں ۱۹۸۲ء کے اوائل سے ہی پی ایل او کی حمایت کر رہی ہیں۔ ان کا اصل مقصد صدر حافظ الاسد کو ہٹانا ہے۔ یہ یاسر عرفات کا دیرینہ خواب بھی ہے جو انہوں نے فاتح کی حیثیت سے بیروت آنے کے سلسلے میں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ لبنانی وزیراعظم رشید کرامی کی اپیل نے بھی حافظ الاسد کو یہ موقع دے دیا کہ وہ فلسطینیوں اور دریوزیوں سے پرانے بدلے چکا سکیں۔ شامی صدر نے جب بیروت میں سات ہزار فوج داخل کی تو تمام مشاہدین نے محسوس کیا کہ لبنان کی طوائف الملوکی کا خاتمہ اور امن کا قیام بہت مشکل ہے۔ ماضی میں بھی شام نے کئی مواقع پر لبنان میں مداخلت کی ہے۔ بہرکیف اس وقت ۱۹۷۶ء جیسے حالات نہیں ہیں جب شام نے لبنان میں یکطرفہ مداخلت کی تھی۔



۱۹۷۵ء میں جب لبنان میں پہلی خانہ جنگی ہوئی تھی، شام نے منصفانہ طور پر فلسطینی گوریلاؤں کی حمایت کی تھی، جن پر اسرائیل اور دائیں بازو کے عیسائی گروہ نے حملہ کر دیا تھا۔ جب یاسر عرفات اور بائیں بازو کے لبنانی مسلم حلیف، عیسائیوں پر حاوی ہونے لگے تو صدر اسد کا رویہ بھی تبدیل ہونا شروع ہوا۔ ایک طرف عیسائی گروہ شام کے خلاف نئے سرے سے متحد ہو رہا تھا اور دوسری طرف ۱۹۸۲ء کے آخر میں مغربی طاقتیں اور اسرائیل لبنان میں اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ ان حالات میں حافظ الاسد نے لبنانی عیسائی فوج اور بین الاقوامی امن قائم کرنے والی افواج کے خلاف آہستہ آہستہ ناکارہ کر دینے والی جنگ شروع کر دی۔ اس کے علاوہ اسد کو اس نئے شیعہ گروہ کو تباہ کرنے میں بھی کامیابی حاصل ہوئی جس نے بائیں بازو کی مدد سے امین جمائل کی عیسائی غلبہ رکھنے والی فوجوں کو مغربی بیروت سے باہر کر دیا تھا اور بعد میں امریکی بحری بیڑے کو بھی نکال دیا۔

اکثر مشاہدین نے تازہ ترین شامی مداخلت کو حافظ الاسد کی اس مایوس خواہش سے تعبیر کیا ہے جو لبنان میں اپنا اثر قائم کرنے کے لئے انہوں نے کی تھی۔ لیکن اس میں انہیں کافی نقصانات اٹھانے پڑے تھے۔ اس کی وجہ سے انہیں یہ موقع بھی ملا کہ وہ امن قائم کرنے والی کوششوں میں غیر جانبدار ہیں۔ حالیہ برسوں میں امریکہ اور مغربی یورپ میں بھی شامی وقار کو ٹھیس پہنچی اور اسے بین الاقوامی دہشت پسندی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اسد نے اپنے یقین کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے موقع غنیمت جانا اور امریکی فرانسیسی اور جرمنی قیدیوں کو شاندار طریقے سے رہائی دے دی۔ مشاہدین کے نزدیک اسد کے لئے یہ کام زیادہ آسان تھا۔ ان کے اس اہتمام میں تیری والٹ سمیت کئی قیدی شامل تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ ضرورتاً اسے پروپیگنڈے کے ذریعے اپنے حق میں استعمال کیا جا سکے۔ بہرکیف اس طرح لبنان میں فلسطینیوں کی پیش قدمی رک گئی۔



حمید الدین محمود

# عالمی بنک : نئے ردّ و بدل

گزشتہ جون میں امریکی کانگریس کے سابق رکن مسٹر باربر کونیبل نے عالمی بنک کی صدارت سنبھالی اور اپنے افتتاحی خطبے میں اشارہ کیا کہ وہ عالمی بنک کے انتظامی ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں کریں گے جو بنک کی نئی حکمت عملی کو نافذ کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ حکومت ہند یا عالمی بنک کے دیگر رکن ممالک اس نظریے سے متفق ہوں۔

بہر حال ہم جی کو واشنگٹن میں جہاں عالمی بنک کا صدر مستقر ہے مسٹر کونیبل نے انتظامی تبدیلیوں کا خاکہ پیش کیا اس کے جواب میں تیسری دنیا کا ردّعمل ابھی سامنے نہیں آیا ہے تاہم ان تبدیلیوں کے موثر ہونے کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔ پہلی یہ کہ عالمی بنک کی سرمایہ کاری کا اثاثہ کس حد تک بڑھایا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ بین اقوامی ترقیاتی ایجنسی ایں آئی ڈی اے کے آٹھویں تجدیدی قرضوں کے اجراء کے حق میں کب فیصلہ کیا جائے گا۔

ہر دو نکات پر امریکی حکومت کی آمادگی مبہم ہے۔ آئی ڈی اے کے آٹھویں تجدیدی قرضوں کی اجرائی ۱۹۸۸ء سے شروع ہو جاتی ہے۔ امریکی حکومت نے امریکی کانگریس سے اس غرض کے لیے ساڑھے بارہ ارب روپے یعنی ایک ارب ڈالر کی مانگ کی ہے۔ امریکی کانگریس کا عمومی رویہ یہ ہے کہ امریکی بجٹ میں بھاری خسارے کے پیش نظر اتنی بھاری رقم کی منظوری مشکل ہے۔ لیکن اس سے اہم بات یہ ہے کہ امریکی کانگریس اس رقم کی منظوری پر اس لیے مائل نہیں ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ عالمی بنک کا انتظامی ڈھانچہ بوجھل ہے اور جب تک بنک کے عملے میں تخفیف نہیں کی جاتی اس رقم کی منظوری ممکن نہیں ہے امریکی کانگریس کو اس ضمن میں سال رواں کے ختم ہونے سے پہلے فیصلہ کرنا ہے۔ اس پس منظر میں مسٹر کونیبل کی انتظامی اصلاحات بنیادی طور پر امریکہ اور چار مغربی ممالک کے اطمینان کے لیے ہیں۔

چنانچہ مسٹر کونیبل کی اصلاحی تجاویز کے مطابق تین سو عہدوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ یہ تعداد گھٹ کر چھ سو تک بڑھ سکتی ہے۔ فی الحال عالمی بنک میں چھ ہزار ملازمین کام کرتے ہیں۔

ان عہدوں کی برخاستگی کے نتیجے میں بیکار ہونے والے ملازمین کو ایک سو ستاسی کروڑ روپے یا پندرہ کروڑ ڈالر بطور اعانت کی شکل میں ادا کیے جائیں گے۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ موجودہ دو سینئر وائس پریسیڈنٹس کی بجائے چار سینئر وائس پریسیڈنٹس ہوں۔ یہ چار افراد ہیں۔ پاکستان کے مسٹر معین قریشی، مسٹر ارنسٹ اسٹرن، مسٹر ڈبلیو ڈیوڈ ہاپر، اور مسٹر ولی اے وپن ہا۔ ان چار افراد کو پالیسی کمیٹی میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ کمیٹی بنک کے ایگزیکٹو ڈائرکٹرز کے بورڈ سے رابطے کی بھی ذمہ دار ہے۔ ان چار سینئر وائس پریسیڈنٹس کے تحت ریجنل وائس پریسیڈنٹس ہوں گے جن کی علاقہ واری ذمہ داریوں کی بھی ترتیب نو کی گئی ہے۔ یہ ترتیب حسب ذیل ہے۔ ایشیا، یورپ، مغربی ایشیا، شمالی افریقہ اور جنوبی امریکہ۔

چین اور ہندوستان کو ایشیا میں اور پاکستان کو مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ساتھ شمار کیا جائے گا۔ اس علاقائی ترتیب سے یہ صاف ظاہر ہے کہ عالمی بنک پاکستانی اور امریکی نظریے کو قبول کرتے ہوئے پاکستان کو اسلامی دنیا کے زمرے میں گنتا ہے۔ یاد رہے کہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد امریکی وزارت خارجہ نے پاکستان کو جنوبی ایشیا سے الگ کر کے مشرق وسطیٰ کے ساتھ گننا شروع کر دیا ہے۔

اس علاقائی ترتیب میں کس کی رائے کارفرما رہی یہ بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ پاکستانی نمائندے کا پالیسی کمیٹی میں شامل ہونا خاصی اہم بات ہے۔ تیسری تبدیلی یہ ہے کہ مسٹر کونیبل نے تیسری دنیا کی قرض داری کے مسائل سے نمٹنے کے لیے ایک علاحدہ وائس پریسیڈنٹ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے چوتھا فیصلہ ماحولیاتی ایجنسیوں کے اصرار پر کیا گیا ہے۔ اور اور وہ یہ کہ بنک عالمی ماحولیاتی مسائل سے نمٹنے کے لیے ایک علاحدہ محکمہ ماحولیات قائم کرے گا۔

یہ سارا نیا ڈھانچہ مقروض ملکوں کی مالی پالیسی کی تشکیل یا تبدیلی پر براہ راست اثر انداز ہوگا۔ خیال ہے کہ جاریہ پارلیمانی اجلاس میں عالمی بنک کے ڈھانچے میں ان بھاری تبدیلیوں پر گفتگو ہونا چاہیے کیونکہ ان کا ہمارے ملک پر بالواسطہ اثر ضرور پڑیگا۔

اس سلسلے میں مرکزی وزیر تجارت جناب شیو شنکر کا یہ انکشاف خاص اہمیت رکھتا ہے کہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ نے حکومت ہند کو روپے کی قدر میں تخفیف کرنے کا مشورہ دیا ہے تاہم وزیر موصوف نے یہ امر واضح کر دیا ہے کہ حکومت ہند نے اس مشورے کو سر دست قبول نہیں کیا ہے۔

روشن لعل چاولہ

# تیل کا بحران اور ہندوستان

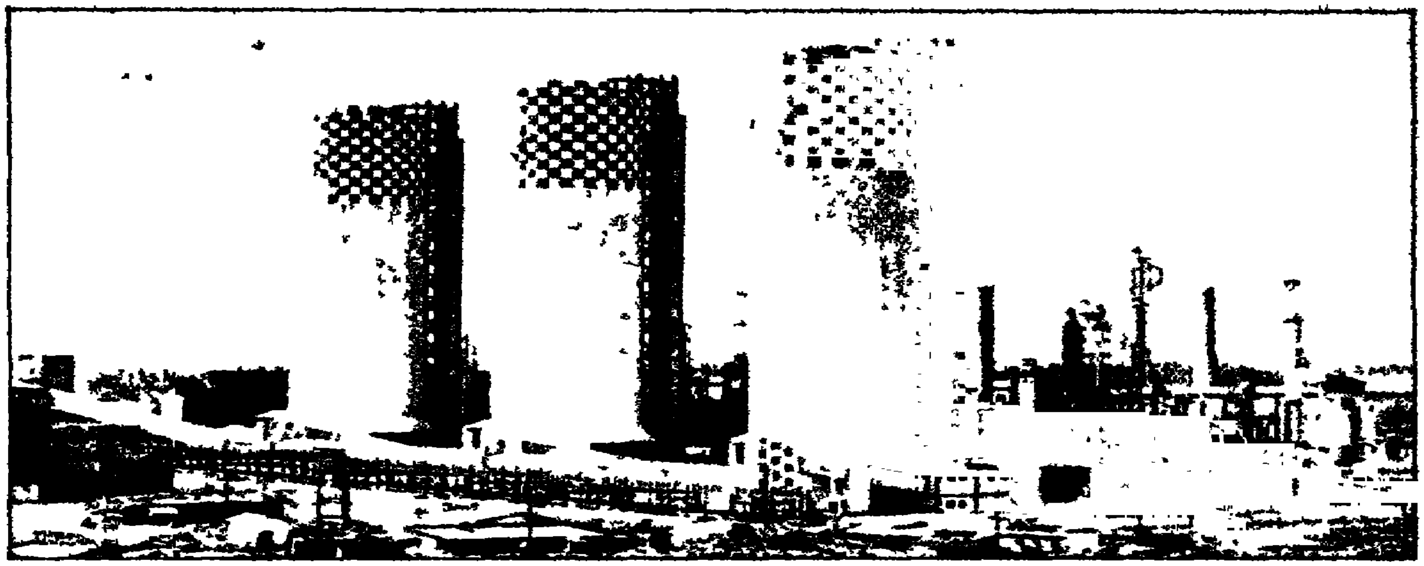
اپنے اراکین ممالک کے مابین، غیر معمولی طور پر طویل مذاکرات کے نتیجے میں ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶ء کو اوپیک نے تیل کی قیمت اور پیداوار کی بالائی حد کے سلسلے میں تصفیہ کیا، جس کے مطابق ۱۹۸۷ء کے نصف اول میں اس کے ممبر ممالک (عراق کے علاوہ) کے لیے یکم فروری ۱۹۸۷ء سے فی بیرل اوسط مقرر شدہ قیمت ۱۸ ڈالر، نیز فی یوم مجموعی پیداوار کی بالائی حد ۱۵.۸ ملین بیرل (ایم۔ بی۔ ڈی) مقرر کی گئی۔ اس کا مقصد ان ممبران کو راحت پہنچانا تھا جنھوں نے پورے سال ۱۹۸۶ء کے دوران، تیل کی قیمتوں میں مسلسل گراوٹ کے رجحان کا سامنا کیا تھا۔ دوسرے اس سے غیر یقینی عالمی تیل منڈی میں قدرے استحکام لانا مقصود تھا۔ مثال کے طور پر، مارچ ۱۹۸۶ء کے اوائل میں، فی بیرل خام تیل کی قیمت، نومبر ۱۹۸۵ء کی فی بیرل ۳۰-۲۵ ڈالر کی قیمت سے گھٹ کر ۱۵ ڈالر ہوگئی، اور جولائی ۱۹۸۶ء میں مزید گھٹ کر ۱۰-۷ ڈالر ہوگئی، جو اتنی کم تھی، جتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ خام تیل کی بین الاقوامی تجارت، ۱۹۷۹ء میں ۱-۳۳ ایم۔ بی۔ ڈی کی اپنی اونچی سطح سے گر کر ۱۹۸۵ء میں ۲۲-۵ ایم۔ بی۔ ڈی رہ گئی، معنی خیز طور پر خام تیل میں تجارت کا غیر اوپیک حصہ، ۱۹۷۹ء میں حقیر فیصد سے بڑھ کر ۱۹۸۵ء میں ۲۷ فیصد ہوگیا۔ نوعیت کے اعتبار سے، ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخر تک کی اتحاد کی ظاہرہ مشابہت کے برعکس، تیل کے بحران کی صورت حال کے تعلق سے ہیں۔ اوپیک خدشات اور متضاد احساسات خوفناک انداز سے ابھر کر سامنے آئے۔ لہٰذا یہ سب کچھ ۱۹۸۶ء میں اوپیک کو نقطہ بحران تک لے آیا، جہاں اس کی ۲۵ سالہ تواریخ میں ٹھیک اس کی بقا داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

## اوپیک کا ظہور

اگرچہ اوپیک ۱۹۶۰ [illegible] کے اوائل میں وجود میں آئی تاہم اپنی موجودگی کا احساس اس نے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اوائل ہی میں کرایا۔ ۱۹۷۳ء کے برس تیل کی قیمتیں چوگنی ہوگئیں اور اسی کے ساتھ اوپیک نے اپنا احساس فیصلہ لیا جس میں امریکہ اور نیدرلینڈ جیسے چند صنعتی ممالک کو تیل کی برآمد پر پابندی کا اعلان کیا گیا۔ بلاشک اس کے باوجود تیل درآمد کرنے والے ترقی یافتہ ممالک کے دلوں میں خوف بیٹھ گیا تھا۔ اس کے علاوہ تیل بحران کا اہل مغرب پر تاثر، تیل کی کم مانگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مزید برآں اس سے حقیقی اقتصادی سرگرمیاں دب گئیں، انھیں توانائی کے متبادل ذرائع اور تیل کی فراہمی کے لیے پرجوش تلاش کے ساتھ ساتھ، تیل کی بین الاقوامی تجارت میں کمی آگئی۔ دوسری طرف خوش قسمتی سے مغربی بینکاری نظام نے تمام نہاد پیٹرو ڈالروں کے سلسلے کو پھر سے تیل کی کمی اور تیل درآمد کرنے والے ضرورت مند ممالک میں چلا دیا۔ ۱۹۷۸ء تک یہ اقدامات عالمی معیشت میں وہ توافق لا چکے تھے جس کی سخت ضرورت تھی، ۱۹۷۵ء میں لگ بھگ ۶۰ بلین ڈالر کی باقی ترین توفیر سے گھٹ کر ۱۹۷۸ء میں پیٹرو ڈالر زد اندر ۶ بلین ڈالر رہ گئے، او۔ پی۔ ای۔ سی ممالک میں بازیابی نے ترقی پذیر ممالک کو تحریک دلائی نیز صحیح معنوں میں تیل کی قیمتوں میں استحکام کے باعث دنیا بھر میں تیل پر انحصار رکھنے والی پیداوار کو کوئی گزند نہ پہنچی، ۸۰-۱۹۷۹ء کے دوسرے تیل بحران نے، ایک بار پھر عالمی معیشت کو کاری ضرب لگائی۔ تیل کی قیمتوں میں ۱۵۰ فیصد اضافے کے باعث اس کے صریح انجام کے طور پر، تیل کی مانگ میں کمی آگئی اور توانائی کی بچت کی تدابیر پر نیا زور دیا گیا۔ تیل کی قیمتوں میں دوسرے اضافے نے ایک سے زائد صورتوں میں، عالمی معیشت کے لیے بالعموم اور ترقی پذیر ممالک کے لیے بالخصوص، ایک قریب الوقوع بحران کی خبر دی۔ اولاً، اگرچہ قیمتوں میں بے حد اضافے کے نتیجے میں مغربی معیشتوں میں پس روی اور افراط زر کے رجحانات کی تجدید ہوئی، تاہم روایاتی ذرائع سے تیل کی مانگ میں قابل لحاظ کمی اور بحر شمالی اور میکسیکو جیسے نئے ذرائع سے تیل کی سریع فراہمی کے لیے پرزور کوششوں کے تعلق سے اس کا فوری اثر محسوس ہوا۔ ثانیاً بڑے بڑے تیل درآمد کرنے والے ترقی پذیر ممالک مشکلوں میں مبتلا تھے کیونکہ تیل کی قیمتوں میں سلسلہ وار اضافوں کا ان کے ادائیگیوں کے توازن پر تباہ کن اثر پڑا، ان کے دوان کھاتوں کے خساروں میں پھر سے روپیہ لگانے کے کام میں قابل لحاظ مندی آگیا اور زیادہ بڑی یا بہ ہوئی کران کے برآمدی مال کی گرتی ہوئی قیمتوں اور ان کے پہلے جمع شدہ قرضوں کے تعلق سے چکرا دینے والی اداے گی قرض کی قانونی ذمہ داریوں نے ان کی بحرانی صورت حال میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ ثالثاً یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ متعدد تیل برآمد کرنے والے ترقی پذیر ممالک خود اپنے ہی جال میں پھنس چکے تھے، اور وہ اس سے نکلنے کی جتنی زیادہ کوشش کرتے، اور زیادہ اس میں پھنستے جاتے تھے۔ تیل کی قیمتوں میں اضافے کی مہربانی سے ایر شکوہ پروجیکٹوں پر رو پیہ لگانے کی ان کی دھن کی بدولت، بہت ہی جلد، نہ صرف ان کا پیٹرو دھن ہی ختم ہوگیا، بلکہ ان میں متعدد کو مغربی بینکاری برادری کا بری طرح مقروض بھی بنا دیا گیا۔

## ۱۹۸۶ کا حالیہ بحران

یہ کہنا سادہ لوحی ہوگا کہ حالیہ بحران کی ابتدا ایک واحد توضیحی غیر یکساں عنصر کی وجہ سے ہوئی۔ بلکہ یہ بحران تو کئی عوامل کا اجتماعی اثر تھا، جو سیاسی اور اقتصادی دونوں تھے اور یہ کہ اوپیک کو جن کا سامنا ایک مدت سے تھا۔ صحیح معنوں میں یہ بحران تیل کی قیمتوں میں دوسرے اضافے کے ساتھ شروع ہوا اور اپنے عقب کے واقعات کے سلسلے میں عالمی معیشت کے لیے مذکورہ دور اس اقتصادی نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ سیاسی سطح پر شاہ ایران کی اپنے ملک سے رخصتی سے ایران سے تیل کی فراہمی میں انتشار محسوس کیا جانے والا خطرہ لاحق ہوگیا۔ یہیں پر اکتفا نہ کرتے ہوئے۔ کچھ دیر بعد خلیج کے خطے میں ایران اور عراق کے درمیان جنگ بھڑک اٹھنے سے تیل کی فراہمی قابل لحاظ حد تک کم ہوگئی۔ خلیجی خطے میں واقع تیل کے کارخانوں کو بھی ممکنہ خطرہ پیدا ہوگیا اہم ترین بات سب سے کہ مالی مشکلات کے دباؤ کے باعث، ۱۹۸۶ء کے اوائل سے شروع ہونے والی تیل کی قیمتوں میں بے پناہ گراوٹ کی وجہ سے تیل بحران کی صورت حال کے بارے میں ان کے ادراک میں آثار چڑھاؤ پیدا ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں، حالیہ ہلچل پر ایک متحدہ موقف اختیار کرنے کے بارے میں اوپیک کے اراکین میں وسیع اختلافات پیدا ہوگئے۔ غیر اوپیک تیل سپلائی کرنے والوں کے ظہور نے حالیہ بحران میں ایک اور پرمعنی وسعت کا اضافہ کر دیا۔ الغرض، ایک بات البتہ صاف تھی کہ تیل کی فراہمی کے بارے میں اوپیک کی من مانی کا ٹی گڑ بڑ گئی۔ اور مستقبل میں تیل کی پیداوار اور اس کی قیمتوں کے بارے میں کوئی بھی قلیل المدت حکمت عملی غیر اوپیک اہم رسائیوں کے تعاون کے بغیر اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور لگے گی۔ یہ صورت حال



باوجود اس حقیقت کے ہے کہ اوپیک اب بھی دنیا بھر میں تیل کے ثابت شدہ ذخائر کے ۸۰ فیصد سے زائد کے لیے ذمہ دار ہے اور صرف اس کی ۴۰ فیصد صلاحیت کو کام میں لانا باقی ہے اگرچہ تھوڑی مدت کے لیے اپنی آمدنی کو زیادہ سے زیادہ بنانا متعدد تیل برآمد کرنے والے ممالک کا مسلہ مقصد ہو سکتا ہے۔ تاہم دسمبر سمجھوتے پر دستخط ہونے تک اوپیک اور غیر اوپیک ہم رسانوں اور بین اوپیک ممبران کے بیچ بھی تیل کی پیداوار اور قیمتوں کے فیصلوں پر معنی خیز اختلافات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان سب حقائق کے مفہوم کا تجزیہ کرنے سے قبل آئندہ برسوں میں عالمی تیل منڈی میں طلب اور رسد کے عوامل کا جائزہ لینا کارآمد ہوگا۔

## طلب اور رسد

آیئے پہلے تیل کی عالمی طلب کا تجزیہ کریں۔ اپنے دسمبر ۱۹۸۵ء کے شمارے میں "مڈل ایسٹ پٹرولیم اکانومسٹ" نے عالمی معیشت کے لیے خام تیل کی طویل المدت مانگ کے تخمینے دیئے ۱۹۸۵ء میں ۱۔۴۴ ایم۔ بی۔ ڈی کی مانگ کی سطح سے اس نے ۱۹۹۰ء میں ۵۔۴۸ ایم۔ بی۔ ڈی ۱۹۹۵ء میں ۸۔۵۱ ایم۔ بی۔ ڈی اور ۲۰۰۰ء میں ۶۔۵۴ ایم۔ بی۔ ڈی تیل کی مانگیں تجویز کیں۔ اگرچہ تیل کی طویل المدت مانگ کی تجویز پر متعدد ناگہانی عوامل کی وجہ سے شک ہو سکتی ہے تاہم ۱۹۹۰ء تک کی ۴۵ تا ۴۸ ایم۔ بی۔ ڈی کی تیل کی مانگ کی تجویز میں ایک صحیح اندازہ دکھائی دیتی ہیں۔ تیل کی مانگ پر اثر انداز ہونے والا ایک اہم تشریحی غیر یکساں عنصر توانائی۔ جی ایم۔ پی کا تناسب ہے۔ حالانکہ یہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے بارے میں جداگانہ ہوتا ہے۔ تیل کی قیمتوں میں سلسلہ وار اضافوں کے نتیجے میں تیل کی بچت کی تدابیر کی مہربانی سے، بالعموم ترقی پذیر ممالک کو ۱۔۰ کی اوسط شرح کے مقابلے میں او۔ ای۔ سی۔ ڈی ممالک میں توانائی کی شرح ۵۵۔۰ کے لگ بھگ ہے۔ لہٰذا تجویز ہے کہ او۔ ای۔ سی۔ ڈی تیل مانگ ۱۹۸۵ء۔ ۲۰۰۰ء کے دوران محض ۷۔۰ فیصد فی سال کی شرح سے بڑھے گی جب کہ اسی مدت میں ترقی پذیر ممالک میں یہ شرح ۵۔۱ فیصد کی شرح سے تھوڑی زائد ہوگی۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ آئندہ کچھ سالوں میں موجودہ تیل کی قیمتیں جوں کی توں رہیں گی ایک انتہائی امید پرستانہ پیشگوئی سے یہ اندازہ لگتا ہے کہ ۱۹۹۵ء تک تیل کی مانگ میں ۴۔۳ ایم۔ بی۔ ڈی (مکمل بدل) اور ۳۔ ایم۔ بی۔ ڈی (ری۔ فیڈ ٹیک) تک بیش از بیش اضافہ ہوگا۔ الغرض، موجودہ تیل قیمتوں کے پیش نظر قلیل اور طویل مدت کے دستیاب طلب تخمینوں میں بمشکل کسی ابھار کی صلاحیت نظر آتی ہے۔

کم و بیش غیر لچکدار طلب رجحانات کی صورت میں تطبیق کا بار تکنیکی عالمی تیل سپلائی پر پڑتا ہے۔ البتہ یہ بات بھی اہم ہے کہ پچھلے چند سالوں میں عالمی تیل سپلائی میں کئی پر معنی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اول، غیر اوپیک سپلائی میں قابل لحاظ حد تک اضافہ ہوا ہے، خاص کر ۱۹۷۹ء کے بعد مثلاً ایک اندازے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۸۴ء میں ۱۶ ایم۔ بی۔ ڈی کی اوپیک سپلائی کے مقابلے میں غیر اوپیک سپلائی ۸۔۲۹ ایم۔ بی۔ ڈی کے لگ بھگ تھی۔ دوم عالمی تیل منڈی میں اس رجحان کے پیش نظر حالیہ برسوں میں اوپیک ایک باقیماندہ ہم رساں کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ جبکہ دوسرے تیل بحران سے پہلے غیر اوپیک رسدات بہت ہی معمولی تھیں۔ تیسرے، اس امر کا بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۹۰ء تک عالمی منڈی میں اوپیک کا حصہ ۴۰ فیصد سے زیادہ نہیں بڑھ پائے گا اور اس کے رواں صدی کے خاتمے تک ۵۰ فیصد سے نیچے رہنے کا امکان ہے۔

## حکمت عملیاں

اگرچہ تیل کی طویل مدتی فراہمی کا انحصار عالمی معیشت میں مسلمہ قومی تیل ذخائر پر ان کی اقتصادی ترقی کے لیے تیل پیدا کرنے والے ممالک کی وسائلی ضروریات، توانائی کے متبادل ذرائع کے معیشتی امکانات پر درست ممالک کو حکمت عملی پر مبنی تیل کی ہم رسانیاں جیسے دیگر کئی غیر معیشتی وجوہ پیداوار سے متعلق فیصلوں میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اصل مسئلہ تب کھڑا ہوتا ہے جب قلیل میعادی تخمینوں کے دوران منڈیوں میں بے پناہ مال جمع ہو جانے کے باعث تیل سے ہونے والی مجموعی آمدنی میں کمی آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے بحرانی دور کے باعث اس حکمت عملی کے خود مکتفی ہونے پر بھی شک ہونے لگتا، جس پر مجموعی طور پر پورا گروہ عمل پیرا ہوتا ہے۔ وضاحت کے طور پر سعودی عرب کی تیل سے متعلق اس حکمت عملی پر جسے دسمبر ۱۹۸۵ء سے کویت اور متحدہ عرب امارات کی تائید

حاصل ہے۔ چند اوپیک کے اراکین سمیت متعدد تیل برآمد کرنے والے ممالک جیسے چین ہوتے ہیں سعودیہ کی حکمت عملی دراصل ان مفروضوں پر مبنی ہے (۱) تیل کی مانگ میں تیزی لانا۔ (۲) غیر اوپیک بہم رسانیوں میں سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی کرنا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے حکمت عملی میں سراسر غیر لچکدار قیمتوں کے نظام کی پیروی کرنے کے بجائے منڈی کے حصے کے حصول پر زور دیا گیا۔ اس کا بڑا مقصد غیر اوپیک سپلائی کو کم کرکے اوپیک کا کوٹہ ۱۶ ایم بی۔ ڈی سے ۲۰ ایم۔ بی۔ ڈی تک بڑھانا تھا۔

تاہم ۱۹۸۶ کے اوائل تک سعودی عرب کی حکمت عملی خود کو تیزی سے گرتی ہوئی تیل کی عالمی قیمتوں، نیز غیر اوپیک حریفوں کے اس ضمن میں شدید رد عمل، یہاں تک کہ اوپیک کے ممبروں کے بیچ کھلے اختلافات کی موجودگی میں، برقرار نہ رکھ پائی۔ غیر اوپیک سپلائرز ایک بات پر سعودیہ کی حکمت عملی کے آگے نہیں جھکے۔ قیمت کا خیال نہ کرتے ہوئے ۱۰.۵ ایم۔ بی۔ ڈی کا اعلان کرنے کی میکسکو کی ناگزیر ضرورت، چار ڈالر فی بیرل یعنی ایک ایسی قیمت پر جو محض جیب خرچ ہی پورا کرتی تھی۔ بحر شمالی سے تیل کی کھیپیں بھیج سکنے کا امکان اوپیک کی توقعات پر بمشکل پورا اترتا تھا۔ نیز اس کی وجہ سے اس کے حریف اس کاروبار سے باہر ہوگئے۔ دوسرے، اوپیک میں سے الجزائر، ایران اور لیبیا جیسے سختی کے قائل ممالک نے سعودیہ کی حکمت عملی کو ناپسند کیا۔ بلکہ ایران نے کچھ مدت تک اس تجویز کی پرزور وکالت کی جس کا مقصد اوپیک سے جملہ تیل کی کھیپوں کی روانگی کو عارضی طور پر معطل کردینا اور بعد میں کوٹوں میں بھاری کمی اور تیل کی قیمتوں میں اضافہ کرنا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے، دسمبر ۱۹۸۶ کا معاہدہ زیادہ سے زیادہ ایک عارضی اقدام دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کا ماحصل، ایران، عراق جنگ کی صورت، غیر اوپیک ذرائع سے تیل کی فراہمی، نیز ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں یکساں طور پر کیے جانے والے توانائی کے بچاؤ کے پرزور اقدامات پر انحصار رکھتا ہے۔

## مفاہیم

ایک حالیہ تخمینے کے بموجب، خالی ۱۹۸۶ میں خام تیل کی قیمتوں میں بھاری کمی نے ترقی یافتہ معیشتوں کے درآمدی بل میں ۶۰ بلین ڈالر کے بقدر بچت کرلی ہوتی اس کے ساتھ ۱۹۸۰ کے دہے کی باقی ماندہ مدت میں امید کی جاتی ہے کہ تیل کی مستحکم قیمتیں نیز گرتی ہوئیں اصل سود کی شرحیں عالمی معیشت میں جی۔ ڈی۔ پی کی پیداواری حد کو اونچا اٹھا دیں گی۔ بدقسمتی سے، تیل برآمد کرنے والے ممالک، خاص کر ان میں سے وہ جو مقروض ہیں، ایک سنگین بحرانی صورت حال سے دوچار ہیں۔ پہلے تیل کے بحران کے برعکس، جب پیٹرو ڈالروں کے دوبارہ سلسلے سے تیل درآمد کرنے والے ممالک کو راحت نصیب ہوئی تھی۔ اب اس سلسلے کو پیچھے کی طرف پھر سے چالو کرنا تقریباً ناممکن دکھائی دیتا ہے۔

## ہندوستانی منظر نامہ

برازیل اور ہندوستان جیسے بڑے بڑے تیل درآمد کرنے والے ترقی پذیر ممالک نے ۱۹۸۶ کے دوران تیل کی کم قیمتوں کے باعث فائدہ اٹھایا کیونکہ ان کے درآمدی بل کا ۳۰ تا ۴۰ فیصد تنہا تیل سے متعلق تھا۔ اس کے باوجود، تیل کی نازک قیمتوں کا ایک اہم مفہوم ہندوستان جیسے ملک میں توانائی کے تیل کے اور بغیر تیل کے، وسائل کی آئندہ ترقی سے تعلق رکھتا ہے فراہمی کے نقطۂ نظر سے، تیل سیکٹر نہ صرف ایک ایسا شعبہ ہے جس میں بھرپور سرمایہ کاری کی ضرورت ہے، بلکہ طویل تکمیلی مدت اور غیر یقینی حالت بھی اسی میں داخل ہے دوسری طرف، چونکہ توانائی۔ جی۔ ڈی۔ پی تناسب ہمارے ملک میں نسبتاً اونچا ہے۔ تیل اور اس سے متعلق مصنوعات کی کھپت کم از کم اسی قدر بڑھ جانے کا امکان ہے۔ جس قدر پلان کچھ مدت میں جی۔ ڈی۔ پی کی پیداواری شرح مقرر کی گئی ہے۔ نقشہ نمبر ۱ میں گزشتہ دہے میں پٹرولیم کی کھپت کی شرح نمو اور جی۔ این۔ پی کو دکھایا گیا ہے۔

نقشہ نمبر ۲ ہندوستان کی مجموعی تجارت پوزیشن (روپے کروڑوں میں)

| مقدات | ۱۹۸۳-۸۴ | ۱۹۸۴-۸۵ | ۱۹۸۵-۸۶ |
|---|---|---|---|
| ۱. درآمدات | ۵۷۶۳ | | |
| درآمدات | ۱۵۷۶۳ | ۱۶۱۷۳ | ۱۹۶۲۲ |
| ان میں پی او ل | | | |

مزید براں، تیل کی قیمتوں میں حالیہ اضافے کے، ہندوستان کی ادائیگیوں کے توازن پر اثر کا احتیاط سے جائزہ لیا جائے۔ یہ ایک اچھی طرح مسلمہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی تجارت کے توازن کی صورت حال خاصی سنجیدہ ہے۔ جیسا کہ نقشہ نمبر ۲ میں دکھایا گیا ہے، تجارتی خسارہ پٹرولیم کی بھاری درآمدات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے دکھایا جاچکا ہے۔ ہماری جی۔ این۔ پی کی شرح نمو کے مقابلے میں پٹرولیم کی کھپت کی شرح نمو خاصی اونچی رہی ہے۔ یہ اس کے باوجود ہوا ہے کہ حکومت ہند نے پٹرولیم کی مصنوعات کی منتظم قیمتوں میں سال بسال قابل لحاظ حد تک اضافہ کردیا۔ خام تیل کی قیمتوں میں حالیہ اضافے کے نتیجے میں، ہماری پٹرولیم کی مصنوعات کی قیمتوں میں کوئی اضافہ ہندوستانی معیشت میں افراط زر کے مجموعی دباؤ سے پُر ہوگا۔ جیسے ہائی بحری تیل کی مہربانی سے، چھٹے پلان کے خاتمے تک ہندوستان نے تیل کے معاملے میں قریب قریب خود کفالت حاصل کرلی ہے۔ البتہ سر دست اضافہ شدہ دیسی فراہمی تبھی ممکن ہے جب تیل سیکٹر پر زیادہ اخراجات صرف کیے جائیں۔ ورنہ گھریلو کھپت اور تیل کی پیداوار کے بیچ کے خلا کو زیادہ درآمدات سے پُر کرنا پڑے گا۔ حالیہ سالوں میں ہندوستان کی تیل معیشت پر ایک قریبی نگاہ ڈالنا غالباً دلچسپ ہوگا۔ نقشہ نمبر ۲ ہندوستانی معیشت کے سیاق میں تیل کے منظر نامے کو بہ تفصیل ظاہر کرتا ہے۔ دستیاب معلومات کی بنا پر اس بات کی دلالت کرنا خوش آئند ہے کہ خام تیل کی دیسی پیداوار ایک سطح مرتفع پر پہنچ گئی ہے اور ساتویں منصوبے کے آغاز کے ساتھ خالص درآمدات میں اضافے کا رجحان نظر آیا ہے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خام تیل کی پیداوار جو چھٹے پلان کے پچھلے دو سالوں میں مستحکم رہی تھی، ساتویں پلان کے پہلے دو سالوں میں بڑھنے لگی ہے۔ اسی طرح پچھلے چند سالوں میں کیے گئے تیل کی قیمتوں میں اضافے کے باوجود بڑھتی ہوئی مانگ کے جواب میں پٹرولیم کی مصنوعات کی دستیابی میں سال بسال بڑھوتری ہوئی ہے۔ اس مجموعی منظر نامے کی موجودگی میں اس امر کی ضرورت ہے کہ ہماری پالیسی وضع کرنے والے اور منصوبہ ساز اس بات کی کامل جانچ کریں کہ توانائی کی بچت کے اقدامات کے ساتھ ساتھ، درآمدات اور ملکی پیداوار کو تے بیش از بیش فائدہ رساں پالیسی مرکب پر عمل کیا جائے۔

اگرچہ گزشتہ سال دسمبر میں اوپیک نے ایک معاہدہ کرلیا ہے، لیکن اب تک اس امر کا کوئی یقین نہیں کہ عالمی تیل منڈی کدھر کا رخ کرے گی، خاص کر جب تیل پیدا کرنے والے خلیجی ممالک اندرونی خلفشار کا شکار ہیں اور میکسیکو، وینزویلا اور ایکویڈر جیسے کتنے ہی تیل برآمد کرنے والے ممالک دنیا کی مالی منڈیوں کے قرضوں کے تلے دبے ہوئے ہیں۔ تاہم، ایک دلیل بڑی آسانی سے دی جاسکتی ہے۔ یعنی تیل کی بہت زیادہ یا بہت کم قیمتوں نے دنیا کی معیشت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچایا ہے۔

## جنوب ایشیا

# مذہب اور سیاست کی آمیزش

ڈاکٹر پرمانند

مذہب میں سیاست کے عمل دخل نے، جنوب ایشیائی معاشروں کے معاشیاتی معاشرتی اور سیاسی تانے بانے کو شدید زک پہنچائی ہے اور یہ نقصان آج بھی جاری ہے۔ جہاں کہیں بھی اتفاق رائے کی یا اس کی مماثل صورت حال بسرعت قصۂ پارینہ بنتی جارہی ہے مذکورہ عمل دخل نے وہاں ایک کشیدہ یا اس نوع کی حالت پیدا کردی ہے۔ مذہب سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ ولیم پن کے عقیدے کے مطابق "خدا اور اس کے بندوں" سے پیار کرتا ہے یا کارل مارکس کے بیان کے مطابق "عامۃ الناس کے لیے افیون" کا درجہ رکھتا ہے؟ کالٹن نے پرکیو نکر لکھا ہے کہ "مذہب کے لیے ہمیشہ جھگڑتے رہیں گے، اس کے حق میں لکھتے رہیں گے، اس کے لیے مذم آ۔ا ہوتے رہیں گے، اس کے لیے جان دیتے رہیں گے، حتیٰ کہ ماسوائے اسے ترک کرنے کے، اور سب کچھ کر گذریں گے۔" جوگندر سنگھ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "دہشت گردوں کے ہاتھوں لوگوں کی ہلاکت کو ہم واہگورو کی مرضی مانتے ہیں۔"

عام طور پر ۲۰ویں صدی کو سیکولر بنانے کے عمل کا دور خیال کیا جاتا ہے، جس میں مذہب کو ایک نجی معاملہ بتلانے کی بیش از بیش گنجائش ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اگر تعمیری، فعال اور بامقصد بننے کے بجائے سیاست جوڑ توڑ اور افراد کی مشترک الاغراض ٹولی کے کسی فرد میں ہر نوع کے اقتدار کو مرتکز کرنے کی جویا ہو جائے، تو سیاسی عمل دخل کے بھاری امکانات کے حامل عناصر کو استعمال کرنے اور کام میں لانے کی ضرورت ہوتی ہے، چونکہ جنوبی ایشیا ایک ایسا خطہ ہے، جہاں تعمیری، فعال اور بامقصد سیاست بھی ایک حقیقت نہیں بن پائی، مذہب کو خود بخود سیاست میں ایک نمایاں کردار حاصل ہے چونکہ جنوبی ایشیائی معاشرہ چارو ناچار مجموعی طور پر پہلی چال کا بن رہا ہے، اس لیے مختلف صوبوں میں رہنے والے [illegible] اقتدار

کھونے کے ڈر سے مذہب کو ایک نجی معاملہ بنائے جانے کی حمایت سے گریز کرتے ہیں، لہٰذا وہاں ایک ا۔ی صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے، جس میں سیاست کو مذہب کے ساتھ کامل طور پر جوڑنے کا عمل جاری وساری ہے۔ جنوبی ایشیا میں مذہب میں سیاست کی آمیزش بالکل آسان ہے کیونکہ اس خطے کے مختلف حصوں میں مذاہب



کا تنوع ہے۔ مذاہب کی رنگارنگی اس خطے کے مختلف ممالک، یہاں تک کہ ایک ملک کے الگ الگ حصوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ چونکہ جنوبی ایشیا کے قریب قریب سبھی ممالک ۔۔۔ ہے، مذہب میں سیاست

کی ملاوٹ اکثر اتفاق رائے پر مبنی سیاست کے فقدان کا باعث بنتی ہے اور اس کے بجائے افراتفری اور جبر کی سیاست کو جنم دیتی ہے۔

اس ضمن میں متعدد برمحل سوالات اٹھتے ہیں۔ مذہب میں سیاست کے عملاً عمل دخل کا مفہوم کیا ہے؟ اس خطے میں مذہب کو سیاسی رنگ دینے کا طریقہ کیا ہے؟ جنوب ایشیائی معاشرے پر مذہب میں سیاست کے عمل دخل سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ ان سوالات کا باری باری سے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

## طریق عمل

مذہب میں سیاست کی آمیزش کے طریق عمل کے ضمن میں دو قسم کے سیاسی بالائی طبقوں کی طرف سے جانے والے کل ملاکر دو حربے دکھائی پڑتے ہیں یہ دو طبقے حکمراں بالائی طبقے اور مقابل بالائی طبقے سے عبارت ہیں۔ آئیے، پہلے حکمراں بالائی طبقے کے طریق عمل کو لیں اگر حکمراں بالائی طبقہ یہ محسوس کرتا ہے کہ موجودہ نظام بدلی پر بحث و مباحث کا بہت زیادہ امکان ہے (کیونکہ ملک میں کوئی قابل قدر ترقی نہیں ہوئی)، تو وہ اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے ارادے سے، ایک خاص مذہب کو، جسے پہلے یہ حیثیت حاصل نہیں تھی، کچھ نہ کچھ سرکاری یا آئینی منظوری دینے کی سعی کرتا ہے، اس امر کا جواز اس ضمن میں مختلف ممالک کی آئینی دفعات کے بغور مطالعے سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

## بنگلادیش

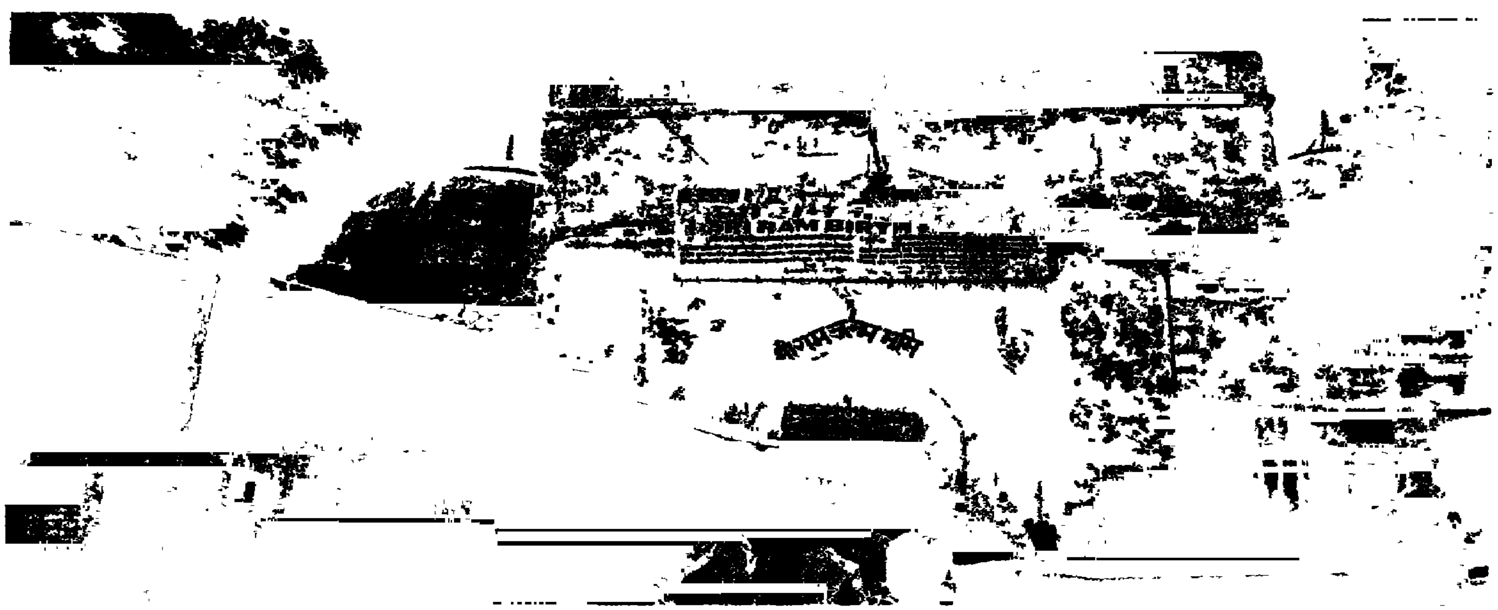
ابتدًا بنگلادیش کے آئین (جو ۴ نومبر ۱۹۷۲ کو معرض وجود میں آیا) کے ابتدائیے میں یہ عہد کیا گیا کہ قوم پرستی، اشتراکیت، جمہوریت اور سیکولرازم کے اونچے نصب العین آئین کے بنیادی اصول ہونگے، لیکن ۱۹۷۷ کے ایک ترمیمی حکم کی رو سے لفظ سیکولرازم کو خداوندتعالیٰ میں کامل ایمان وایقان" سے بدل دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۷۷ میں حکمراں بالائی طبقہ اپنے ان پیشروؤں سے قطعًا مختلف تھا، جنہوں نے آزادی کی لڑائی سیکولر بنیادوں پر لڑی تھی ۷ امارچ ۱۹۸۳ کو لیفٹننٹ جنرل ارشاد نے کہا کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور ہم اسی کے نصب العین کو اپنی قومی زندگی میں منعکس کرنا چاہتے ہیں۔"

## بھوٹان

اگرچہ بھوٹان کی ہمالیائی سلطنت کا کوئی قلم بند دستور نہیں ہے، تاہم اس ملک کے بطن البطون کی مطلق العنان حکومت اور بادشاہت کے توسط سے نمائندگی کی جاتی ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا۔ جب دنیاوی امور کی دیکھ بھال کے لیے ایک الگ حکمراں ہوا کرتا تھا، جسے دھرم راجہ کہا جاتا تھا۔ اگرچہ ۱۹۰۵ میں دھرم راجہ کا منصب، بھوٹان کے ڈرک گیالپو نامی واحد متحدہ اقتدار کی سرداری کے تحت آگیا، تاہم بھوٹانی سیاست میں مذہب کا اثر و رسوخ کم نہیں ہوا۔ بھوٹان کے مذہبی نظام میں، لگ بھگ ... ۵ لاما اعلیٰ ترین اہمیت کی جگہوں پر متمکن ہو کر عوام کی مذہبی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بھوٹان سرکار ان لاماؤں کی گذر بسر کے لیے امداد دیتی ہے جو قومی مذہبی انجمن کے متعدد آشرموں اور مٹھوں کو چلاتے ہیں، جو ہمیشہ ڈزونگس میں واقع ہوتے ہیں (جو انتظامیہ، سیاست اور مذہب کے مراکز ہیں) چنانچہ مذہب اور سیاست کے مابین ربط واضح ہے



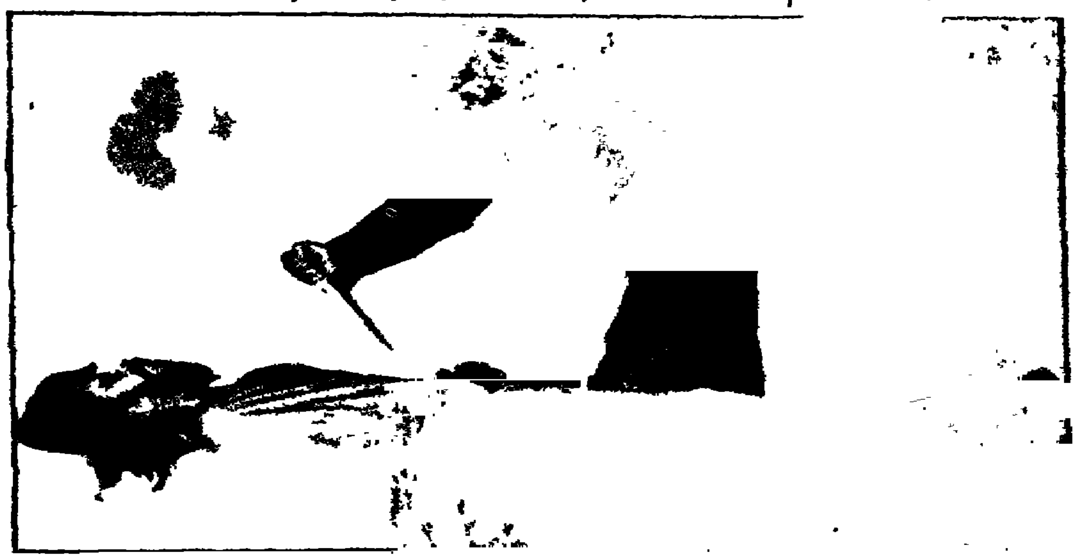
جگمے وانگ چک - لامائی اقتدار



ہے اور اپنے آپ کو اس کے تحفظ کے لیے پابند کرتا ہے۔

## ہندوستانی سیکولرزم

کتنے ہی مذہبی گروہوں کی موجودگی کے باوجود پورے جنوب ایشیائی خطے میں، ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے، جو غیر مذہبی ہے۔
کسی خاص مذہب کے آئینی اعتراف کے مفہوم کے تعلق سے، جس حصولیابی کی عام طور پر خواہش کی جاتی ہے، وہ دراصل معاشرے کے ایک حصے کے تئیں ترجیحی سلوک ہوتا ہے، جو بالآخر اصول مساوات اور یہاں تک کہ بھائی چارے کے اصول کی بھی خلاف ورزی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ خاص کر جب کہ معاشرہ یک جہت نہ ہو۔
مذہبی سطح پر زیادہ کٹر انداز اختیار کرنے کے سبب، آگے چل کر یہ خود بخود کسی ملک میں چند حریف اور مقابل بالائی طبقوں کو جنم دینے کا باعث ہوتا ہے۔



پنجاب میں متعدد باب وہاں کے سیاسی قائدین پر اپنے شدید اثر و رسوخ کا استعمال کرتے رہے ہیں۔ بابری مسجد کا معاملہ اور مسلم خواتین (تحفظ) بل کچھ اور نظیریں ہیں، جو اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں
اگر زبان، خطہ، روزگار اور تعلیم جیسے عناصر کے ساتھ رابطے قائم کیے جائیں تو مذہب میں سیاست کا
[illegible]

پر زیادہ آسان، بلکہ زیادہ موثر ہو جاتا ہے۔ سری لنکا کے بارے میں، مذہب کو زبان، خطے، روزگار، اور تعلیم عناصر کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے جو عوام کے دوسرے حصے کے لیے مضر ہے۔ بنگلا دیش کے معاملے میں، چٹاگانگ کے کوہستانی علاقے کے عکما قبائلیوں کے لیے دشواریاں پیدا کرنے کی نیت سے، مذہب، خطہ اور زبان نے باہم مل کر ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا لیا ہے۔ ہندوستان کے ضمن میں، پنجاب میں مذہب خطے کے ساتھ جڑ گیا ہے۔ فی الحقیقت، اگر مذہب میں سیاست کا عمل دخل کئی دیگر عناصر پر مبنی ہو تو ایک مذموم سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

## مذہب سے سیاست کو جوڑنے کے نتائج

جنوب ایشیائی ممالک میں، مذہب کے ساتھ سیاست کو جوڑنے کے ایک سے زائد نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ مختلف ممالک میں، حکمراں بالائی طبقوں کے اقتدار کی بنیاد کمزور ہو گئی ہے۔ ماسوائے ہندوستان کے جو کچھ استثنیات کے باوجود، اب تک کم و بیش ایک سیکولر ملک رہا ہے کیونکہ یہ محض معاشرے کے ایک حصے کی امنگوں اور محرکات کا سامان کرنے لگتے ہیں۔ چونکہ حکمراں بالائی طبقے کا میلان ملک کے آئینی اور اقتصادی تقاضوں کی مختلف دفعات کا واحد مفسر بننے کی طرف ہو جاتا ہے، عمومی اقتدار کی بنیاد کمزور
[illegible]

چل کر یہ ایک ایسی صورت حال پر منتج ہوتی ہے، جس میں جمہوری طریقوں کے ذریعے، کسی ملک میں حکمراں طبقے کو شاذ ہی اقتدار سے محروم کیا جا سکتا ہے۔
اس کے علاوہ جنوب ایشیائی ممالک میں مذہب کے ساتھ سیاست کا جوڑ، اکثریت اقلیت مطابقت کا باعث ہوا ہے۔ اگر یہ دونوں گروہ علاقائی اور لسانی طور پر متحد ہوں، یا اگر مفلسوں کے متعدد گروہ ہوں تو ایسا تشدد، جس کا نصب العین اقتدار اور مراعات ٹھہرائے گئے ہوں، بڑھتا ہی جاتا ہے۔ سری لنکا، ہندوستان اور بنگلا دیش ایسی مثالیں ہیں، جو اس بارے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔
مذہب کے ساتھ سیاست کا مسلسل جوڑ ایک ایسے منظر نامے کی طرف لے جاتا ہے، جہاں ایک فرد کو ایک آزاد فرد کے طور پر نہیں بلکہ ایک خاص مذہبی گروہ کے رکن کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکسی نمونے اور مذہب کی بنا پر معاشرے کی مقررہ زمرے بندی کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں رہ جاتا۔ ایک فرد کی حیثیت اتنے بڑے معاشرے میں گھٹ کر انتہائی غیر اہم رہ جاتی ہے۔
جنوبی ایشیا کے متعدد ممالک میں مذہب کو سیاسی رنگ دیئے جانے کا انجام، اس خطے کے ایک سے زائد ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے، بین علاقائی کشیدگی کی صورت میں بھی سامنے آیا ہے۔ اگر ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ کچھ زیادتی ہوتی ہے تو اس کے بارے میں نہ صرف حکومت کی طرف، بلکہ حزب مخالف کی طرف سے بھی پاکستان میں واویلا شروع ہو جاتا۔ اسی طرح اگر سری لنکا میں رہنے والے تمل باشندوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہو جاتی ہے، تو ہندوستان کی سرکار اور حزب مخالف دونوں مل کر اس کی مذمت کرتے ہیں۔ پاکستان نے ہندوستان پر سندھیوں (جن میں اکثر ہندو ہیں) کو بھڑکانے کا الزام لگایا ہے ہندوستان کا کہنا ہے کہ سکھ دہشت گردوں کو پاکستان اکسا رہا ہے اور امداد دے رہا ہے۔
چنانچہ مذہب میں سیاست کے عمل دخل نے مختلف میدانوں میں معاشرہ جاتی ترقی کو روک دیا ہے۔ معاشرہ جاتی تعمیر و ترقی کے لیے بلکہ ایک خوش تر تر سماج کے لیے بھی، سیاسی ثقافت کا سیکولر بنایا جانا اشد ضروری ہے۔ اس کے بغیر، فرد کو محض
[illegible]

## مالدیپ

اسلام مالدیپ کا ملکی مذہب ہے۔ فی الواقع مالدیپ کے سبھی باشندے سنی ہیں اور شافعی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کی شہریت فقط مسلمانوں تک محدود ہے۔ مالدیپ کا صدر اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ وہ دین اسلام کا احترام کرے گا۔ اس جمہوریہ میں عدل و انصاف کی بنیاد بھی اسلامی شریعت پر ہے۔

## نیپال

۱۹۶۲ سے نافذ، نیپال کے آئین کی دفعہ (۱) ۳ کی روسے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ نیپال ایک خود مختار، ناقابل تقسیم اور مقتدر اعلیٰ مطلق العنان ہندو ملک ہے، نیپال روئے زمین پر واقع واحد ہندو ملک ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ لیکن قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ بنگلادیش کی طرح نیپال نے بھی شروع میں اپنا کوئی سرکاری مذہب اختیار نہیں کیا تھا۔ ہندومت کو نیپال کا سرکاری دھرم قرار دینے والا موجودہ پنچایتی آئین تو راجہ شاہ مہندر نے دسمبر ۱۹۶۲ میں عطا کیا۔ غالباً اس نے یہ سوچا ہوگا کہ ہندومت نیپال کو ایک واضح پہچان عطا کر پائے گا۔ چونکہ اُن دنوں اس ملک کی اندرونی اور گرد و پیش کی صورت حال انتہائی غیر واضح تھی، شاہ مہندر نے اپنے مذکورہ نظریے کو بہت زور و شور سے بیان کیا تھا۔ موزوں طور پر، دفعہ ۳ کو دفعہ ۲۰ کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے، جس کی روسے یہ مطلق العنان سلطنت اس کے اقتدار اعلیٰ کی امین قرار دی گئی ہے اور جس کو فقط راجہ پرتھوی نارائن شاہ کے خاندان کے ورثا تک ہی محدود رکھا گیا ہے۔

## پاکستان

پاکستان شروع ہی سے ایک اسلامی ملک رہا ہے یہ سراسر الگ بات ہے کہ وہاں کے متعدد سیاسی قائدین نے اسلام کو کون کون سے معنی پہناتے ہیں اور یہ وقتاً فوقتاً انھوں نے اسلام کو کتنی اہمیت دی ہے۔ لیکن ایک بات جو اظہر من الشمس ہے، وہ یہ ہے کہ وہاں حکومتی اور حزب اختلاف کی سطحوں پر مذہب اور سیاست کا ایک مرکب موجود ہے۔

## سری لنکا

سری لنکا کا ۱۹۷۸ میں نافذ کیا دستور، بطور ایک مذہب کے بدھ مت کو انتہائی اہمیت دیتا ہے اس کے باب کی دفعہ ۹ جس کا عنوان بدھ مت ہے، اس میں درج ہے کہ سری لنکا جمہوریہ بدھ مت کو اولین مقام دے گی اور اس لیے حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ دیگر تمام مذاہب کو دفعات ۱۰ اور (۱) (د) ۱۴ کے تحت حاصل جملہ حقوق کا یقین دلاتے ہوئے بدھ راج کی حفاظت کرے گی نیز اسے فروغ دے گی ظاہر ہے کہ سری لنکا مذہب کو ایک سنجیدہ اہمیت دیتا




ہڑک مہلک ہوتا ہے
مگر آپ اسے
روک سکتے ہیں
یہ ہوتا کیسے ہے؟
— ہڑک، پاگل جانور، خاص کر کتے کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔
— ہڑک ہو جانے پر موت ہو جاتی ہے۔
کیونکہ اس سے بچنے کا کوئی علاج نہیں ہے۔
احتیاطی تدابیر
— ہڑک سے بچا جا سکتا ہے، اپنے پالتو کتوں کو ہڑک کا ٹیکہ لگوالیں۔
— آوارہ کتوں کو پکڑنے اور ختم کرنے میں حکام کی امداد کریں کیونکہ آوارہ کتوں کو ہڑک (ریبیز) لاحق ہوتا ہے اور وہ پالتو کتوں کو کاٹ کر انہیں بھی اس مرض میں مبتلا کر دیتے ہیں۔
— اگر آپ کو کتا کاٹ لے تو زخم صابن اور پانی سے اچھی طرح دھو ڈالیں اور فوراً قریبی اسپتال یا شفاخانے میں جائیں۔
ہڑک سے بچاؤ کا ٹیکہ
— ڈاکٹر کے مشورے سے ہڑک سے بچاؤ کا ٹیکہ لگوائیے۔
سینٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو،
ڈی-جی-ایچ-ایس، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی
davp 87/72

عابد سہیل

# ترقی پسند تحریک کے پچاس برس

۱۹ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء : یعنی آج سے کچھ اوپر پچاس سال قبل اسی شہر لکھنؤ سے وہ شعلۂ جوالہ بھڑکا تھا جس نے چند ہی برسوں میں کشمیر سے کنیا کماری تک اور بحیرۂ عرب سے خلیج بنگال تک ہر حساس ادیب و شاعر کے قلب و جگر کو منوّر کر دیا تھا۔

ہم اسی شعلۂ جوّالہ کی وراثت کے امین ہیں۔

ہمیں فخر ہے کہ ہم ایک ایسی زبان کے ادیب ہیں جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، جس کے ایک عظیم ادیب یعنی پریم چند نے، جو ہندی کے بھی اتنے ہی بڑے ادیب تھے، انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صدارت اسی شہر میں کی تھی اور اس تحریک کے دل و دماغ تھے، سجاد ظہیر اور ڈاکٹر علیم جو ہندی اور اُردو کے علاوہ عربی، فارسی، جرمن، فرانسیسی اور متعدد دوسری زبانوں کے عالم اور ماہر تھے۔

اُردو اور ہندی کی، بساطِ عالم کی دوسری زبانوں سے اس رفاقت نے، مغربی اور مشرقی زبانوں کے علم و ادب کے دروازے بھی ہم پر وا کر دیے تھے۔ چنانچہ آج ہم نہ صرف اپنی زبان کے اعلیٰ ادب کی بہترین روایات کے وارث ہیں بلکہ ساری دنیا کا عظیم ادب، خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو، ہمارا سرمایہ اور ورثہ ہے اس ورثہ نے ہمیں مادرِ وطن سے محبت کرنا سکھایا ہے اسی ورثہ نے ہمیں عالمی برادری کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔ اسی ورثہ نے ہمیں مظلوموں کی ہمنوائی کا شرف بخشا ہے اور اسی ورثہ نے ہمارے شعر و ادب کو ظالموں کے لیے شمشیرِ بے نیام اور ستم رسیدہ لوگوں کے لیے ڈھال بنا دیا ہے۔ ہمیں اپنے اس رول پر کسی قسم کی ندامت نہیں بلکہ فخر ہے۔

ہم ہندوستان ایسے عظیم ملک کے شہری ہیں۔ اس عظیم ہندوستان کے جس کے افق و زمین سارے موسموں اور ساری رتوں سے منوّر اور روشن۔ جس کے پیڑ پودے ساری دنیا کے پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے ہیں اس طرح ہمارا ملک ایک (miniutare) دنیا ہے۔ دنیا کے سارے مذاہب، ساری رنگین رتیں اسی ہندوستان کی فضا میں بھی سانس لیتی ہیں۔ بارش سردی اور گرمی کا لطف اور ان کی انتہاؤں سے واقفیت ہم اسی ملک میں حاصل کرتے ہیں۔ ہندو ازم جس کی رواداری کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں، اسی ملک میں جنما اور پروان چڑھا، اسلام اسی ملک میں پھلا پھولا، بدھ ازم اور جین ازم کا بیج اسی دھرتی سے اُگا اور پھر اپنی خوشبو بکھیرنے کے لیے ساری دنیا میں پھیل گیا۔ ہمارے دل و دماغ ان سارے مذاہب اور ان ساری تہذیبوں کی مُشکِ گندھ سے بسے ہوئے ہیں۔

ہندوستان ایک عظیم جمہوری مُلک ہے۔ پنچائتوں کے ذریعہ جمہوریت کی داغ بیل اسی ملک میں پڑی۔ مذہبی رواداری کا بیج اسی ملک میں پھوٹا۔ زیر دستوں کی حمایت کے جذبے سے اس ملک کا قدیم ادبی سرمایہ پٹا پڑا ہے۔ مظلوموں کی اسی حمایت نے ہمارے رشتے، ہماری جمہوریت کے رشتے سوشلزم سے جوڑ دیے اور آج سوشلزم ہماری منزل ہے

ہمارا ملک ایک ایسا خطۂ زمین ہے جس پر درجنوں مذہبوں کے ماننے والے اور درجنوں زبانیں بولنے والے بستے ہیں۔ یہ سب ہندوستانی ہیں اور ہر وہ زبان جو ہندوستان میں بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہے ہماری قومی زبان ہے۔ ہر مذہب ہمارا مذہب ہے اور ہر مذہب کا ماننے والا ہمارا ہم مذہب اور ہم مشرب دستورِ ہند کی تیسری اساس یعنی سیکولرزم کے یہی معنی ہیں۔ یہ سارے مذاہب اور ساری زبانیں ہندوستانی قومیت کا اٹوٹ حصہ ہیں اور یہ قومیت ایک ایسے گلدستہ کی مانند ہے جس کے ہر پھول کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔

ہر گُل ترٔیست و ہر لالہ مشکبو ئے

لیکن ان سب کے رگ و پے میں ایک ہی خون جاری ہے اور وہ خون ہے ہندوستانیت۔ ان میں سے کسی پھول، کسی زبان، کسی مذہب اور کسی طرزِ حیات کو کسی دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ ہم ان سب کے درمیان مکمل مساوات اور مکمل برابری کے حامی ہیں۔ صرف عددی اکثریت کے بل بوتے پر کیے جانے والے فیصلے، بظاہر جمہوری نظر آنے کے باوجود جمہوریت کی رُوح کے منافی ہیں کیونکہ جمہوریت کی اصل روح ہے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا اس کا احترام کرنا اور اس طرح زندگی کرنا کہ

ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ہمیں فخر ہے کہ پریم چند نے پچاس سال قبل انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں خطبۂ صدارت پڑھا تھا اور جس نے ادب کا سارا منظرنامہ ہی بدل دیا تھا وہ اُردو میں تھا۔ ہمیں اس بات کا بھی فخر ہے کہ ترقی پسند ادبی خیالات کی داغ گونج سب سے پہلے اُردو کے ادیبوں کی تحریروں ہی میں نظر آئی تھی، ہمیں یہ بھی فخر ہے کہ ہم نے ہی ان خیالات کو سب سے پہلے قبول کیا اور انھیں ہندوستان کی ہر زبان میں پھیلانے کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔

ترقی پسند تحریک نے ادب کی کایا ہی پلٹ دی اور پریم چند کے اس جادوئی جملے نے کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہے گوبر، دھنیا، کالو بھنگی، ٹوبہ ٹیک سنگھ موذیل، لاجونتی اور بابو گوپی ناتھ کو عام انسانوں کی سطح سے اٹھا کر ہیرو کی مسند پر بٹھا دیا۔ ہمیں فخر ہے کہ یہ سارا کردار اُردو کے توسط سے ہی ہندوستان کو ملے۔

ہمیں اس بات کا بھی فخر ہے کہ ہماری زبان کے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے آزادیٔ وطن کے لیے نہ صرف قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں بلکہ دار و رسن کو چوما بھی۔ یہ بات بھی ہمیں سربلند کرتی ہیں کہ ہماری زبان ہی کی ایک غزل پڑھتے ہوئے رام پرشاد بسمل نے اس موت کو گلے لگایا جس نے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا۔

ہندی دوسری زبانوں کی طرح ہماری ایک قومی زبان ہے لیکن یہ اس ملک کی رابطہ کی بھی زبان ہے۔ رابطہ کی زبان کا کام دلوں کو توڑنا نہیں جوڑنا ہوتا ہے کیونکہ رابطہ چیزوں اور دلوں کو جوڑنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ رابطہ کسی چیز کا انہدام نہیں کرتا، علاوہ

دوریوں کے، کسی چیز کی نفی نہیں کرتا علاوہ نفرتوں کے بلکہ تعمیر کرتا ہے، ملاتا ہے، جوڑتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندی یہ عظیم کام انجام دے گی کیونکہ سوادِ منزل تک یہی راستہ جاتا ہے کوئی اور راستہ نہیں۔

ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو بھی اس ملک کی ایک عظیم زبان ہے جس کی سات آٹھ سو سال کی تاریخ وطنِ عزیز کے موسموں، گرم و سرد، خوشبوؤں، پھولوں کی سوگندھ اور چڑیوں کی چہکار سے مالا مال ہے۔ امیر خسرو سے لے کر، جن کی شاعری سے زیادہ کسی ملک کی تہذیب و ثقافت کا اظہار دنیا کے کسی شاعر کے کلام میں نہیں ہوا ہے۔ میر، غالب، اقبال، پریم چند، برج موہن ناتھ چکبست، دیاشنکر نسیم، انیس، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی اور رگھوپتی سہائے فراق تک ہندوستان کی زندگی کا کونسا پہلو ہے جس کی جلوہ گری اس میں نہیں، مسرت کا کونسا لمحہ ہے جس سے اس کا دامن سرشار نہیں، اور اور غم و اندوہ کا وہ کونسا آنسو ہے جو اس کی آستین کو بھگو نہیں گیا ہے۔ پہلی جنگِ آزادی میں ہزاروں ماؤں کی سونی ہو جانے والی گودیں ہوں یا ہزاروں عورتوں کی اُجڑ جانے والی مانگ کا سیندور، انگریزوں کا ظلم و استبداد ہو یا قحطِ بنگال، جنگِ آزادی کی لاثانی قربانیاں ہوں یا آزادی کے جلو میں پروان چڑھنے والا خاک و خون کا سیلاب، آپ جب بھی پلٹ کر دیکھیں گے اس زبان اور اس کے ادب کو اپنا اپنا ہم رکاب پائیں گے۔

ایک تاریخ سنوں، بادشاہوں، حکمرانوں اور ان کی معرکہ آرائیوں اور فتح و شکست سے عبارت ہوتی ہے اور دوسری تاریخ عوام کی جدوجہد اور تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ سے ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں اگر کوئی ہندوستان کی پچھلے ایک ہزار سال کی اس دوسری تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہے، دلوں کی دھڑکنیں بوجھل آہیں، چہروں کی مسکراہٹیں اور رزم و بزم کی جھلکیاں دیکھنا چاہے تو اردو سے بہتر اور بڑا کوئی نگار خانہ اسے نہیں ملے گا۔

اتر پردیش میں آج یہی زبان موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے اور اس کے ساتھ ہی گنگا جمنی تہذیب، میل ملاپ اور قومی یکجہتی کی وہ روایت بھی جس کو فروغ دینے میں اس زبان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اُردو جو اس ریاست کی ایک بہت بڑی زبان ہے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہے، اس کے جسمِ ناتواں کو پھولوں اور خوشبوؤں سے سجایا اور سنوارا جا رہا ہے، غازہ اور پاؤڈر سے اسے رنگ و روغن بخشنے کی کوششیں ہو رہی ہیں لیکن اس کی جڑوں کو پانی سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی وسائل فراہم کیے جا رہے ہیں، سمیناروں اور مشاعروں کے لیے خزانوں کے مونہہ کھول دیے جاتے ہیں لیکن ایسا کچھ نہیں کیا جا رہا ہے جس سے اس کی جڑیں اور تنے مضبوط ہوں اور اسے ان نمائشی بیساکھیوں کی ضرورت نہ رہے۔

پچھلے چالیس برسوں سے اتر پردیش میں اُردو محض امیدوں، وعدوں اور عوام کی پُرزور حمایت پر زندہ ہے۔ اس دوران کار و بارِ زندگی سے اس کے رشتے ایک ایک کر کے کاٹ دیے گئے ہیں لیکن اس کی سخت جانی دیکھیے کہ وہ نہ مستقبل سے مایوس ہے نہ ہار ماننے کے لیے تیار اور مایوسی کی کوئی ایسی وجہ بھی نہیں۔ اسے احساس ہے کہ یہ اس کی اپنی قوت اور عوام کی پرزور حمایت ہی ہے جس نے جائز مانگوں کے تسلیم کیے جانے کے مبہم وعدوں سے اسے اس جگہ پہنچا دیا ہے جہاں ملک کی سب سے بڑی اور با اثر سیاسی جماعت نے اپنے انتخابی منشور میں اسے بہار کے طرز پر اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا وعدہ کرنے پر خود کو مجبور پایا ہے۔

یہ وعدہ ابھی شرمندۂ وفا نہیں ہوا ہے اور اس کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں لیکن اردو بولنے والے خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب کشمیر، ہماچل پردیش، آسام اور گوا ایسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں ایک سے زیادہ زبانیں سرکاری زبان کا درجہ حاصل کر سکتی ہیں تو ملک کی سب سے بڑی ریاست میں ایک سے زیادہ سرکاری زبانیں کیوں نہیں ہو سکتیں۔ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اردو کی پُرامن جدوجہد ایک ایسی جدوجہد ہے جس کی کوئی دوسری مثال آزاد ہندوستان میں نہیں ملتی۔ ایک پتھر، ایک حرفِ سخت اُردو کی طرف سے آج تک نہیں آیا اور نہ کبھی آئے گا۔ ہمیں اپنے مطالبہ کی سچائی پر یقین ہے۔ پتھر اور حرفِ سخت کا سہارا وہ لیتے ہیں جن کے سینے یقین اور ایمان کی روشنی سے خالی ہوتے ہیں۔

تسلیم کہ "ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں" "لیکن" "ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں" کے مصداق یہ ضرور کہیں گے کہ وہ دن ہندوستان کی جمہوریت کا تاریک ترین دن ہوگا جب انتخابی منشوروں پر سے عوام کا یقین اٹھ جائے گا۔ جب لوگ یہ باور کرنے پر خود کو مجبور پائیں گے کہ منشور لائحۂ عمل نہیں بلکہ ووٹ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن گئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ صورت حال پیدا ہوئی تو ہر نظریہ، ہر وعدہ، ہر پُرخلوص پروگرام بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ خدا نہ کرے کہ یہ دن کبھی آئے۔

اردو کے لیے جدوجہد جمہوریت کے لیے جدوجہد کا دوسرا نام بھی ہے۔ اس خوبصورت اور شیریں زبان کا پودا اگر خدانخواستہ سوکھ گیا تو ہماری زبان، ہماری بات چیت، ہماری تہذیبی زندگی اور ہماری محفلیں ان ہزاروں الفاظ، اشعار اور ضرب الامثال سے محروم ہو جائیں گی جن کے بغیر دو میٹھے بول بولنا بھی مشکل ہے۔

پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کے

لیکن ہمیں ہندوستان کے شاندار مستقبل پر یقین ہے، ہندوستان کے عوام کی وسیع المشربی پر اعتماد ہے ہندی کے ہزاروں ادیب و شاعر ہمارے ہمنوا ہیں اور اردو کو بھی اپنی ہی زبان سمجھتے ہیں۔ جمہوریت اس ملک میں دفن نہیں ہوگی، پروان چڑھے گی اور اگر ترقی پسند طاقتوں کی قسمت میں فروغ لکھا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہے، تو اردو کا مستقبل محفوظ ہے اور اس کے حقوق کے لیے جدوجہد ایک تاریخی فریضہ۔ آئیے آج ہم عہد کریں کہ ملک کی دوسری ساری ترقی پسند قوتوں کے ساتھ، ہاتھ سے ہاتھ ملا کر، ہم اُردو کو زندہ رکھنے کی جدوجہد جاری رکھیں گے اور اسے اتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ ضرور دلائیں گے اور یقیناً کامران و کامیاب ہوں گے۔

دنیا کی ترقی خطِ معکوس نہیں ہے
جو آنکھ ہے ہشیار وہ مایوس نہیں ہے

ایسا نہیں کہ "عنایت کی یہ نظر" صرف اردو ہی کی جانب ہو۔ اور بھی بہت کچھ ہے جسے سڑک کوٹنے والے انجن کے تلے ڈال کر بظاہر زمین کو ہموار کیا جا رہا ہے۔ یہ ہمارے ملک کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ کم سے کم اتنا ہی بڑا جتنا وہ نقطۂ نظر ہے جو تفریق پر اتنا زور دیتا ہے کہ قومی یگانگت کا نام و نشان تک مٹ سکتا ہے۔ یہ خطرہ کہیں فرقہ پرستی کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے اور کہیں علاقائی عصبیت کی شکل میں، کہیں زبان سے ہتھیاروں کا کام لیا جا رہا ہے اور کہیں ہتھیاروں سے زبانوں کو خاموش کیا جا رہا ہے یہ مانا کہ اس قتل و غارت گری میں ہماری ہی آستینیں لہو سے تر ہیں۔ اس لہو سے جسے ہم غیر کا لہو سمجھ کر خوش ہو لیتے ہیں [illegible]، اور ملک کے کسی دوسرے

کونے میں یا دنیا کے کسی اور حصہ میں خود ہمارا الیوعیز کا ہو سمجھا جا سکتا ہے اور سمجھا جا رہا ہے۔ اگر ہم ایک لمحہ کے لیے توقف کر کے سوچیں اور "سنہری چلمن" اٹھا کر دیکھیں تو اسی ساحر مکر وفن کی شبیہ نظر آئے گی جو کبھی ہمارا ہمدرد بن جاتا ہے اور کبھی ہمارا دشمن۔ یہ وہی ساحر مکر وفن ہے جو افریقہ میں ہو یا وسط ایشیا میں، نکاراگوا میں ہو یا شری لنکا میں ہمارا خون خود ہمارے ہی ہاتھوں سے بہا رہا ہے۔

اب اسے اپنی سازشیں بنے کے لیے یہ زمین بھی چھوٹی محسوس ہو رہی ہے اور وہ تارے جو کل تک عروج آدم خاکی سے یہ سوچ کر سہمے جاتے تھے۔

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا کہیں مہِ کامل نہ بن جائے

وہ آج خود ان سازشوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں اور ہمیں اقبال ہی الفاظ میں بار بار یاد دلا رہے ہیں

تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

آسمانوں پر بربادیوں کے یہ مشورے جنھیں اسٹار وار کا نام دیا جا رہا ہے اس کرۂ ارض پر سے کروڑوں برسوں میں پروان چڑھنے والی ہماری تہذیب اور تمدن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ اس خطرہ سے ہمیں بے خبر رکھنے کے لیے کہیں وجودیت کی اس جہت سے مدد لی جا رہی ہے جس میں انا صرف اپنا وجود رکھتی ہے یا صرف اس سے باخبر ہو سکتی ہے اور کہیں لقافی حوالہ سے آزاد کر کے ادب کو ہوا میں معلق کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہر شخص کو اپنی انا کا اس حد تک اسیر کرنے کی سازش کہ وہ اپنی ذات کے حصار میں رہ کر "غیر ذات" یا دوسرے سے قطعاً بے تعلق ہو جائے اسی دستور زباں بندی کا حصہ ہے جس میں زباں بات کرنے کو ترستی ہے یہ انسان اور انسان کے درمیان کے پلوں، تعلق کو، رابطہ کو توڑنے کی ایک ناپاک کوشش ہے۔

ادب پل بناتا ہے؟ انسان اور انسان کے بیچ، دلوں کے بیچ، زبانوں کے بیچ۔ ہم ان پلوں کی حفاظت کریں گے، انھیں ٹوٹنے نہیں دیں گے۔

••

# ہوتا ہے جادہ پیما......

(انجمن ترقی پسند مصنفین (اتر پردیش) کی گولڈن جوبلی کانفرنس لکھنؤ میں ۲۲ تا ۲۴ فروری (۱۹۸۶ء) منعقد ہوئی جس میں ریاست کے مختلف اضلاع سے تقریباً ایک سو مندوبین کے علاوہ کیفی اعظمی، غلام ربانی تاباں، راجہ سکینہ، حسن کمال، ڈاکٹر [illegible] ڈاکٹر [illegible]، ریوتی سرن شرما، رتن سنگھ [illegible] ڈاکٹر [illegible] ڈاکٹر [illegible] اور متعدد دوسرے ادیبوں [illegible] شرکت کی۔ کانفرنس کا افتتاح مجروح سلطانپوری [illegible] اور افتتاحی اجلاس کی صدارت [illegible]

[illegible] کانفرنس [illegible] کا اظہار کرتے [illegible] کہا کہ ایک [illegible] اور [illegible] ادب ایک [illegible] ہے۔

مجروح سلطانپوری نے [illegible] کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسند ادیبوں نے ہمیشہ [illegible] آواز بلند کی ہے اور جب بھی ضرورت پڑی ہے [illegible] کر تلوار اٹھائی ہے اور ضرورت ہوگی تو [illegible] کر تلوار اٹھا لیں گے۔

انھوں نے کہا کہ ادب کو ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے کا حوصلہ ترقی پسند ادیبوں ہی نے دیا ہے۔

اردو اکادمی کی صدر اور سابق ریاستی وزیر حامدہ حبیب اللہ صاحبہ نے اس سے قبل اپنے خطبہ استقبالیہ میں مطالبہ کیا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے جس کا وعدہ کانگریس نے اپنے انتخابی منشور میں بار بار کیا ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر ایل ایل ایس مستقیم، ریوتی سرن شرما، حسن کمال، راجہ سکینہ اور غلام ربانی تاباں نے بھی افتتاحی اجلاس کو خطاب کیا۔

عابد سہیل نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ "ہمارا ملک ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں چودہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ سب ہندوستانی ہیں اور ہر وہ زبان جو ہندوستان میں بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہے ہماری قومی زبان ہے۔ ہر مذہب ہمارا مذہب ہے اور ہر مذہب کا ماننے والا ہمارا ہم مذہب اور ہم مشرب۔ دستور ہند کی تیسری اساس یعنی سیکولرزم کے یہی معنی ہیں۔

انھوں نے کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ پریم چند نے پچاس سال قبل انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اور جس نے ادب کا سارا منظر نامہ ہی بدل دیا تھا وہ لکھنؤ میں تھا۔ ہمیں اس بات کا بھی فخر ہے کہ ترقی پسند ادبی خیالات کی داغ بیل سب سے پہلے اردو کے ادیبوں کی تحریروں ہی میں نظر آئی تھی۔ ہمیں یہ بھی فخر ہے کہ ہم نے ہی ان خیالات کو سب سے پہلے قبول کیا اور انھیں ہندوستان کی ہر زبان میں پھیلانے کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔"

رویندر رالیہ کے اسٹیج پر انجمن کی پہلی کانفرنس کے صدر پریم چند اور انجمن کے بانی سجاد ظہیر اور ڈاکٹر علیم کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔

افتتاح کے بعد رویندرالیہ کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں ہی ایک طنزیہ ڈرامہ "منڈی کی منزل" پیش کیا گیا۔

۲۳ اور ۲۴ فروری کو کانفرنس کے چار دن اجلاس حبیب اللہ اسٹیٹ، حضرت گنج میں ہوئے۔ ان اجلاسوں میں کم و بیش ایک درجن مقالے پڑھے گئے اور ان مقالات میں ظاہر کیے جانے والے خیالات پر کھل کر بحث ہوئی۔ پہلے تین اجلاسوں کے موضوعات تھے "اتر پردیش میں ترقی پسند تحریک"، "ترقی پسند تحریک اور نئی نسل کے مسائل" اور "ترقی پسند تحریک اور شعری روایت کا تجزیہ"۔

کاروباری اجلاس میں جو کانفرنس کا آخری اجلاس تھا قراردادیں منظور کی گئیں اور اتفاق رائے سے انتخابات عمل میں آئے جن میں ڈاکٹر سید محمد عقیل کو صدر، عابد سہیل کو کارگزار صدر اور اطہر نبی کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

••••

## ہندوستانی ٹیلی ویژن

# منزل بہ منزل، رواں دواں

انجم عثمانی

ہندوستانی ٹیلی ویژن کی عمر اب تقریباً ۲۸ برس ہے اور ان ۲۸ برسوں میں ہمارے ملک میں اس ذریعہ ترسیل و ابلاغ نے ترقی یافتہ ممالک کے برابر نہ سہی لیکن ترقی پذیر ممالک میں سے کئی سے زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ذریعہ ابلاغ کی صحیح طاقت کو پہچاننے اور استعمال کرنے میں قدرے دیر ہوئی اور شروع کے اٹھارہ بیس سالوں میں اس کی ترقی کی رفتار بہت دھیمی تھی، اس کی بنیادی وجہ (جو آج بھی کسی حد تک بنیادی وجہ ہے) یہ تھی کہ ٹیلی ویژن سیٹس (T.V. SATES) بہت مہنگے اور عام آدمی کی رسائی سے پرے تھے (یہ صورت حال ہمارے ہاں ٹیلی ویژن کی عمر ۲۰ سال کے لگ بھگ ہو جانے پر بھی پورے طور پر ختم نہیں ہوئی) بہر حال ایک لمبے عرصہ کے بعد منظر نامہ بدلا اور ٹیلی ویژن کے فروغ کے لیے دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی ایک طرح

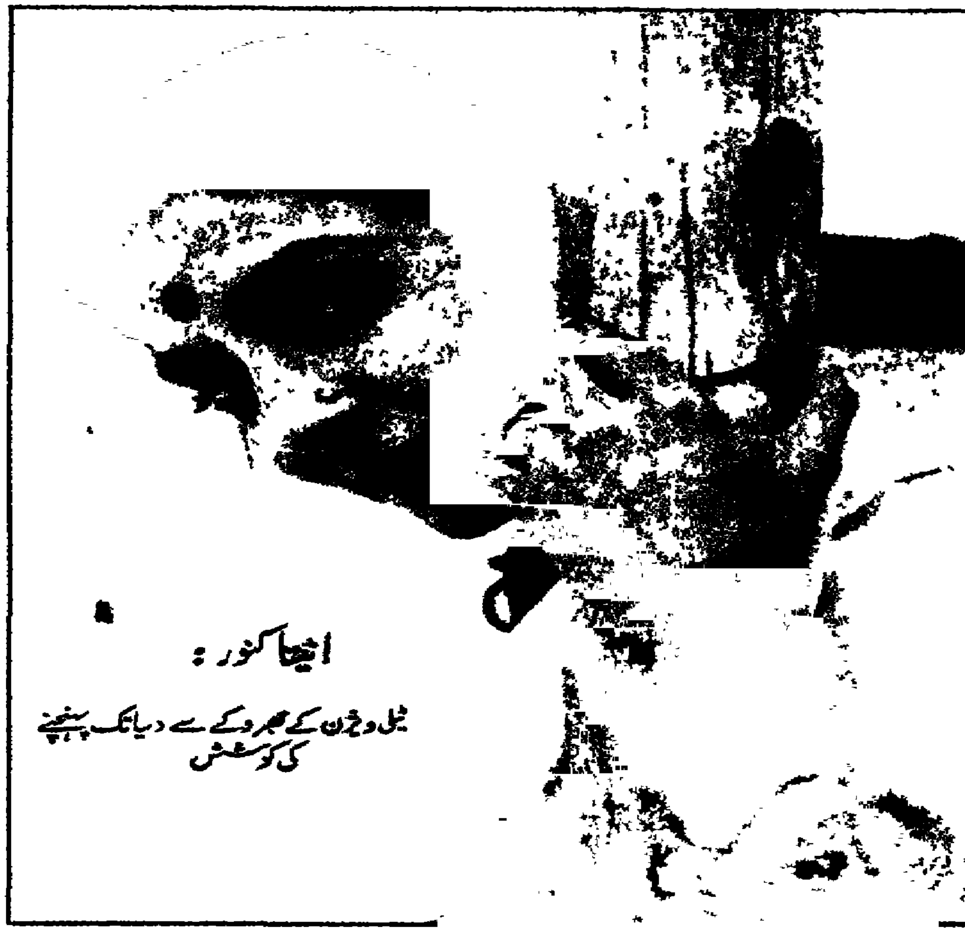


کوئنز کا ستارہ ۔ سدھارتھ باسو

کا شعور بیدار کرنے کی سعی اور اس کو مقبول عام بنانے کی منظم کوشش کی گئی (یہ کوشش مختلف سطحوں پر ہنوز جاری ہے) اس منظم کوشش کے نتائج کی ایک جھلک آپ آئندہ سطروں میں دیکھیں گے اور چند ایسے اہم سنگ میل آپ کو نظر آئیں گے جو ٹیلی ویژن کی ہندوستان میں مقبولیت اور فروغ کی موجودہ صورت حال کی بنیاد ہیں

۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کو یونیسکو (UNESCO) کی مدد سے تجرباتی طور پر دہلی میں ٹیلی ویژن کی نشریات کا آغاز ہوا۔ اس وقت اس کی حد صرف دلی شہر تک تھی اور ہفتہ میں ایک بار صرف ایک گھنٹے کے لیے پروگرام ہوتا تھا۔ اس ایک گھنٹہ میں تعلیمی معلوماتی اور تفریحی پروگرام پیش کیے جاتے تھے۔ اور یہ پروگرام دلی میں صرف چند جگہوں پر کمیونٹی ویوئنگ سیٹز (COMMUNITY VIEWING SETS) کے ذریعہ جو چند ٹیلی ویژن کلبوں میں مہیا تھے دیکھے جا سکتے تھے ظاہر ہے کہ یہ تجرباتی نشریات بہت محدود تھیں اور جن لوگوں کی رسائی ان ٹیلی ویژن کلبوں تک نہ تھی وہ لوگ ٹیلی ویژن سے واقف بھی نہ تھے۔ یہ صورت حال ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۵ء تک رہی لیکن ۱۵ اگست ۱۹۶۵ء سے نشریات ہفتہ میں ایک بار ایک گھنٹہ کی جگہ روزانہ ایک گھنٹہ کر دی گئیں لیکن ٹیلی ویژن سیٹس کا معاملہ جوں کا توں رہا یعنی یہ معاملہ اب بھی کمیونٹی ویوئنگ سیٹس تک ہی محدود تھا پھر بھی اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مقابلتاً زیادہ افراد کو نشریات سے محظوظ ہونے کا موقع ملنے لگا اس سے قبل اکتوبر ۱۹۶۱ء سے تجرباتی طور پر اسکول ٹیلی ویژن متعارف کرایا جا چکا تھا اور اس کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے تھے اسکول ٹیلی ویژن اس وقت بھی مقامی اسکولوں کے نصاب کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر چلایا جاتا تھا اور امید کی جاتی تھی کہ اس کے ذریعہ تربیت یافتہ اساتذہ اور خاص طور پر تجربہ گاہوں کی کمی کو کسی حد تک پورا کیا جا سکے گا یہ بات اور ہے کہ تجرباتی دور سے نکلنے کے بعد بھی اسکول ٹیلی ویژن کی عمارت آج بھی ان ہی بنیادوں پر کھڑی ہے اور اس میں اضافہ ہوا ہے تو بس یونیورسٹیوں کے (U H C PRODAREM) پروگراموں کا تاہم اس کامیاب تجربہ سے ہمت بڑھی اور چند سال بعد ۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو دہلی کے بعد بمبئی میں ٹیلی ویژن کا دوسرا اسٹیشن قائم کیا گیا۔ بمبئی میں ٹیلی ویژن اسٹیشن کا قیام ہندوستان میں ٹیلی ویژن کے فروغ کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے بمبئی کا ٹیلی ویژن اسٹیشن ہندوستان کا پہلا اسٹیشن ہے جو پورے طور پر پیشہ ورانہ مہارت کی حامل نشریات کے لیے بنایا گیا۔ اس کا سارا ساز و سامان مغربی جرمنی نے





# ایشا کنور :

## ٹیلی ویژن کے جھروکے سے دنیا تک پہنچنے کی کوشش

ہندوستان کو تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ شروع میں اس اسٹیشن کی نشریات بھی روزانہ ۱۰ گھنٹے کے لیے تھیں۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اوقات میں اضافہ کیا گیا اور ایک سال بعد ہی پونہ میں ایک ریلے سینٹر قائم ہو گیا اور اس ریلے سینٹر سے بمبئی کی نشریات مہاراشٹر کے دیہی علاقوں میں بھی دیکھی جانے لگیں۔ پونہ میں ریلے سینٹر کے قیام سے قبل ٹیلی ویژن کی نشریات صرف شہر بمبئی تک محدود تھیں اور اس کے بیشتر پروگرام شہری مسائل اور ضروریات سے متعلق تھیں لیکن جب اس سینٹر کے قیام سے دیہی علاقوں تک ٹیلی ویژن کی رسائی کسی حد تک ممکن ہو گئی تو دیہی باشندوں کے لیے بھی ان کی پسند اور ضرورت کے پروگرام نشریات میں شامل کیے جانے لگے۔

ترقی کے اس چھوٹے سے قدم کے بعد ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی تاریخ میں وہ اہم اور بڑا قدم آتا ہے جس نے ٹیلی ویژن کی مقبولیت کی حدوں کو وسیع تر کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور وہ تھا سٹی لائٹ کے استعمال کا آغاز۔ ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں یہ ایک انقلابی موڑ تھا۔ امریکہ کے سٹی لائٹ ٹی وی پروگرام کی مدد سے ہندوستان میں چھ ریاستوں کے تقریباً دو ہزار دیہات یک بیک ٹی وی کی حدود میں آ گئے۔ حکومت کی طرف سے ان مقامات پر مشترکہ طور پر دیکھے جانے والے ٹی وی سیٹس (COMMUNITY VEWING SETS) مہیا کرائے گئے اور گاؤں کی چوپال داستانوں، کہاوتوں اور سوانگوں کی دنیا سے نکل کر اچانک ٹیلی ویژن کی تیز اور خیرہ کن تصویری دنیا میں داخل ہو گئی (سماجی طور پر اس تبدیلی کے اثرات کے تذکرہ کا یہ موقع نہیں ہے) اس ترقی کا بنیادی مقصد گاؤں کے باشندوں تک تعلیم اور صحت مند تفریح کے ساتھ ان کے کام میں پروگرام کے ذریعہ مدد کرنا تھا اور نشریات کو عام طور پر دیہات کی ضروریات مسائل اور مزاج کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا جاتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس وقت اس سے پہلے ایسی کوئی مثال ہمارے یہاں موجود نہیں تھی اور اگرچہ یہ سب تجرباتی طور پر شروع کیا گیا تھا مگر یہی کامیاب تجربہ آگے چل کر ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا اور یہیں سے اس منزل کی راہ نکلی جس کا ایک روپ ہمارے سامنے آج ٹیلی ویژن کی بے پناہ مقبولیت اور فروغ کی صورت میں موجود ہے۔ یہ بات ۱۹۷۵ء کی ہے۔ جلد ہی ۱۹۷۶ء میں ہندوستانی ٹیلی ویژن کا انتظامی تاریخ میں ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا اور وہ یہ کہ ٹیلی ویژن آل انڈیا ریڈیو سے الگ ایک ادارہ بن گیا۔ اب تک ٹیلی ویژن اور ریڈیو کا شعبہ ایک ہی تھا اور ایک ہی ڈائریکٹوریٹ کے تحت کام کر رہا تھا مگر ۱۹۷۶ء میں ٹیلی ویژن کا اپنا الگ ڈائریکٹوریٹ بن گیا۔ اور اسے انتظامی امور میں آل انڈیا سے الگ حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا بظاہر شعبہ جات کی یہ تقسیم اور علیحدگی بہت اہم نظر نہیں آتی لیکن اگر ٹیلی ویژن کی ضروریات استعمال مقاصد اور مدعا سامنے ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں یہ کتنا اہم واقعہ تھا۔ لیکن اس حیثیت کے تسلیم کیے جانے کے باوجود عام طور پر اس کے انتظامی امور کی ساخت بھی ریڈیو جیسی ہی رہی اور آج بھی کافی حد تک یہی صورت حال ہے۔ اشتراک کی صورت حال اس وقت تک تو زیادہ نقصان دہ نہ تھی جب تک ٹی وی کچھ خاص علاقوں تک محدود تھا اور ریڈیو کے بالمقابل اس کی پہنچ عوام تک اس درجہ نہ تھی لیکن کم قوت کے ٹرانسمیٹر نصب ہونے کے بعد صورت حال یکسر مختلف ہو گئی اور اب ٹی وی کی رسائی محدود علاقوں تک نہیں بلکہ ملک کی بیشتر آبادی تک ہے۔ اگرچہ یہ اب بھی ریڈیو کے مقابلے میں بہت کم ہے اس لیے کہ ریڈیو پر (اگر آپ کے ریڈیو سیٹ میں شارٹ ویوز بینڈ صحیح ہیں تو) غیر ملکی نشریات بھی سنی جاتی ہیں جبکہ ٹی وی پر (ان علاقوں کو چھوڑ کر جو ہمارے پڑوسی ملکوں کی سرحد پر ہیں) فی الحال یہ ممکن نہیں۔ تاہم کم قوت کے ٹرانسمیٹرز کے نصب ہونے کے بعد ٹیلی ویژن کے

انتظامی ضروریات ریڈیو سے الگ الگ مختلف ہیں اور ان انتظامی ضروریات کے تحت ہی ٹیلی ویژن کو انتظامی طور پر ریڈیو سے ایک الگ شعبہ تسلیم کیا گیا اور ان ضروریات کے لیے ایک الگ ڈائرکٹوریٹ قائم کیا گیا جس سے ہندوستانی ٹی وی کے فروغ کی تار [illegible] اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

۷۶ [illegible] ء سے ۱۹۸۲ء تک الگ الگ صورت حال یکساں رہی لیکن ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء کو ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں ایک ناقابل فراموش دن قرار پایا اس لیے کہ ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء کو انسیٹ ۱- اے کے ذریعہ پورے ملک کی نشریات کو ایک جگہ جوڑ دیا گیا اور دہلی سے قومی نشریات کا آغاز ہوا اور پورے ملک میں بیک وقت ایک پروگرام دیکھا جانے لگا جس سے ملک کی مشترکہ تہذیب اور قومی اتحاد کے فروغ میں مدد مل رہی ہے۔

اسی دن ملک میں رنگین نشریات کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے تمام تر ترقی کے باوجود ٹیلی ویژن کی نشریات صرف بلیک اینڈ وہائٹ میں ہی دیکھی جاسکتی ہیں لیکن قومی نشریات کے آغاز کے ساتھ



کرن جوشی: ٹیلی ویژن نے گھر گھر پہنچایا

رنگین نشریات کی شروعات بھی ہوئی رنگین نشریات کا مقصد پوری دنیا میں ہو رہی ٹی وی کی تکنیکی ترقیات سے فائدہ اٹھانا اور نشریات کو مزید جاذب نظر بنانا تھا۔

حالانکہ انسیٹ کے ذریعہ پورے ملک کی نشریات کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا گیا تھا تاہم کچھ بڑے شہروں کو اس دن سے مائکرو ویو کے ذریعہ بھی ایک دوسرے سے منسلک کیا گیا اور اس سے ایک سینٹر کے پروگرام کا دوسرے سینٹر سے تبادلہ ممکن ہو سکا۔ مائکرو ویو کا یہ انتظام پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف ڈپارٹمنٹ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ مائکرو



ستیش کوشک: ٹی وی نے مقبولیت بخشی

ویو کی کچھ اہم لائنیں یہ ہیں۔

(i) دہلی، بمبئی، بنگلور، مدراس
(ii) بمبئی، پونہ
(iii) دہلی، دہرہ دون
(iv) دہلی، لکھنؤ، کلکتہ

نومبر ۱۹۸۲ء میں ٹیلی ویژن کی تاریخ میں ایک اور انقلاب آیا جب ۱۹ نومبر ۱۹۸۲ء کو نویں ایشیائی کھیلوں کو سیدھا نشر کیا گیا۔ اس سے قبل ساری نشریات پہلے سے ریکارڈ کر کے دکھائی جاتی تھیں اور یہ ریکارڈنگ ٹیلی ویژن کے اسٹوڈیوز میں ہوتی تھی مگر ۱۹ نومبر ۱۹۸۲ء کو پروگرام کو سیدھا نشر کرنے کی سہولت شروع ہوئی اور یہ کھیل نہ صرف ملک میں بلکہ غیر ممالک میں بھی سیدھے نشر کیے جاسکے۔ اس زبردست کام کے لیے چار چلتے پھرتے رنگین اسٹوڈیو اور بہت سے ایسے رنگین ویڈیو کیمرے منگائے گئے جن سے اسٹوڈیو کے باہر بھی کام ہو سکے (ایسے کیمرہ اور ریکارڈ بیٹوں کو ENG کہا جاتا ہے) بعد میں یہی کیمرے مختلف سینٹروں کو دے دیئے گئے جن کے ذریعہ براہ راست اور آؤٹ ڈور فلمنگ کر کے رنگین پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

اسی موقع پر ۱۰۰ واٹ کے ۲۰ کم قوت کے ٹرانسمیٹر بھی نصب کیے گئے تاکہ ایشیائی کھیلوں کی اختتامی تقریبات سارے ملک میں ایک ساتھ نشر کی جاسکیں۔

انسیٹ ۱- اے کے بعد (جس کا آغاز اگست ۱۹۸۲ء میں ہوا تھا) ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۳ء سے انسیٹ ۱- بی کو نصب کیا گیا تاکہ اس کے ذریعہ بھی سٹی لائٹ کا استعمال کر کے سارے رنگین نشریات بیک وقت دکھائی جاسکیں لیکن انسیٹ ۱- بی کی عمر کم ہو جس کی وجہ سے کل بند نشریاتی طریقہ کار کو دھکا مگر اس کو کسی طرح استعمال کیا گیا اور اس عارضی پریشانی کے بعد روسی سٹی لائٹ کی مدد سے کام رکھا گیا کچھ دن بعد انسیٹ ۱- بی نے بھی ٹھیک کرنا شروع کر دیا اور روسی سٹی لائٹ کی جگہ کام کرنے لگا اس طرح قومی نشریات کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ چند ماہ بعد ہی ہندوستانی ٹیلی ویژن نے ترقی کی راہ پر ایک قدم اور بڑھایا۔ اور ۱۵ ستمبر ۱۹۸۴ء کو دہلی میں دوسرا چینل شروع کیا گیا دو چینل جس کا دائرہ ۴۰ کلومیٹر ہے اس کا مقصد مقامی زبانوں، مقامی تہذیب اور مقامی مسائل سامنے لانے اور مقامی باصلاحیت افراد کو موقع دینے کے علاوہ دو پروگراموں کے درمیان اپنی پسند کے پروگرام کے انتخاب کا موقع مہیا کرنا بھی ہے۔ کچھ دن بعد یکم مئی ۱۹۸۵ء کو اس مقصد کے پیش نظر بمبئی میں بھی دوسرا چینل شروع کر دیا گیا اور امید ہے کہ جلد ہی ملک کے دوسرے شہروں میں بھی یہ سہولت ہو جائے گی۔

نینا گپتا: ٹی وی کی ذہن

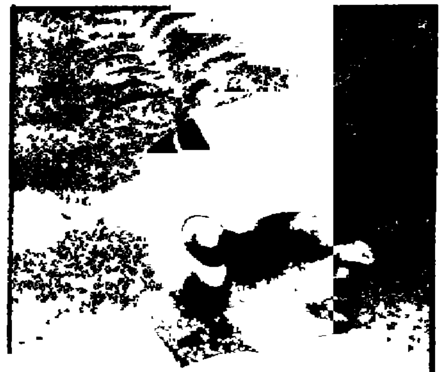
مذکورہ بالا مختصر اشاروں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے ملک میں ٹیلی ویژن کی ترقی کی رفتار کیا رہی اور کون کون سے اہم واقعات اس ترقی کی راہ میں پیش آئے اور آج ٹیلی ویژن کی مقبولیت جس منزل پر ہے ہم وہاں تک کس طرح پہنچ سکے لیکن ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں اور امید ہے کہ ہماری نشریات کے لیے بھی بہت جلد ترقی یافتہ ممالک میں استعمال ہونے والی تکنیکی سہولتیں مہیا ہو سکیں گی نیز ہماری نشریات تکنیکی فروغ کے ساتھ ساتھ سماجی، تہذیبی و ثقافتی تقاضوں پر بھی پوری اتریں گی۔

منیر الدین قریشی

# فلم اپنی اپنی

کامیاب اداکاروں کا فلم کاری اور ہدایت کاری کے میدان میں اترنا کوئی نئی بات نہیں۔ یہ سلسلہ کافی پیچھے تک جاتا ہے۔ مگر پچھلی دو دہائیوں میں ایک نئے رجحان نے جنم لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب فلم کاری کاروبار میں بنے رہنے کا ایک سہارا بن گئی ہے۔ کم سے کم کچھ اداکاروں کے بہت زیادہ کامیاب نہ ہونے یا بالکل ناکام ہونے کے بعد ہدایت کار بننے اور اس طرح اپنے آپ کو دوڑ میں بنائے رکھنے کی ان کی کوششوں سے یہی بات سامنے آتی ہے۔

آنجہانی گرو دت شاید پہلے اداکار ہیں جنہوں نے اداکاری کے بعد ہدایت کاری کو باقاعدہ اپنایا۔ بلکہ اس سچائی کو قبول کر لینا چاہیئے کہ گرو دت اداکار تو عام درجے ہی کے تھے اور ان کی اصلی صلاحیت ہدایت کار کے روپ ہی میں ظاہر ہوئی تھی۔ ان کی اعلیٰ درجے



کی ہدایت کاری آج تک ایک مثال ہے۔ دوسری مثال ہے راج کپور کی۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ راج کپور بہت اچھے اداکار بھی ہیں۔ مگر یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ راج کپور کی شخصیت کی تکمیل ان کی ہدایت کاری کا فن ہی ہے اور فلمی تاریخ میں انہیں بطور ایک ہدایت کار کے ہی یاد رکھا جائے گا۔

راج کپور کے علاوہ اس دور کے دوسرے بہت سے اداکاروں نے اپنی بات کہنے کے لیے ہدایت کاری کو اپنایا۔ دیو آنند سے لے کر سنیل دت تک، جانی واکر سے لے کر محمود تک، امول پالیکر سے لے کر گریش کرناڈ تک، اسرانی سے لے کر جگدیپ تک کئی ایک اداکاروں نے اداکاری کے ساتھ ہدایت کاری کے تجربے کیے۔ کافی سنجیدگی کے ساتھ ہدایت کاری کے میدان میں قدم رکھنے والوں میں ایک نام امجد خان کا بھی ہے۔ اس نے بڑی محنت سے دو فلمیں بنائیں مگر اسے کامیابی نہیں مل سکی۔ شبانہ اعظمی بھی (ٹی وی کے ذریعہ) اس میدان میں قدم رکھ رہی ہیں۔ ششی کپور کئی اچھی فلمیں بنانے کے بعد اب اپنی نئی فلم کے ساتھ ہدایت کار بھی بن رہے ہیں۔ دھرمیندر بھی اکثر ہدایت کار بننے کی بات کرتے سنائی دیتے ہیں۔

ایک اور مثال سنیل دت کی ہے۔ مرحوم گرو دت کی طرح سنیل دت نے بطور اداکار بہت اونچا مقام کبھی نہیں پایا۔ مگر اچھی فلموں کے فلمساز اور ہدایت کار کے طور پر انہوں نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ "یادیں" کے روپ میں ایک انوکھا تجربہ کیا تھا سنیل دت نے (اس فلم میں سنیل دت تنہا اداکار تھے) پھر "ریشما اور شیرا" جیسی اچھی فلم بنائی۔ انہوں نے سنیل دت کی ہدایت میں بنی دوسری فلمیں ہیں "راکی"، "ڈاکو اور جوان" اور "درد کا رشتہ"۔ اور اب سنیل دت نے دو نئی فلمیں بنانے کا اعلان کیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ظاہر ہے کہ ہماری فلمی صنعت کے باصلاحیت اداکار اپنی صلاحیتوں کو نیا رخ دینے کے لیے ہدایت کاری کے میدان میں اترے ہیں۔ آج کے دور میں خاص طور سے تین بڑے اداکار بطور فلم کار ممتاز ہیں۔ منوج کمار، فیروز خان اور سنجے خان۔ ان تینوں میں ایک بات مشترک ہے۔ ان تینوں کو بہ حیثیت اداکار بہت بڑا درجہ کبھی نہیں دیا گیا۔ تینوں میں سے کوئی کبھی دلیپ کمار یا امیتابھ بچن تو کیا، جتیندر کے درجہ تک بھی نہیں پہنچا۔ یہ اگر اسٹار بنے بھی تو بہت تھوڑے وقت کے لیے۔ ان تینوں کے فلم کار بننے کے اسباب تو الگ الگ ہو سکتے ہیں، اور جو پھل انہیں ملا وہ بھی ایک دوسرے سے کافی الگ ہو سکتا ہے۔ مگر ایک اور بات ان تینوں میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ آج یہ تینوں ہی صرف اپنی بنائی ہوئی فلموں کے بل پر زندہ ہیں۔ یہ سوچنا زیادہ مشکل ہے کہ اگر انہوں نے نئی فلمیں شروع کی ہوتیں تو آج کہاں ہوتے؟

منوج، فیروز یا سنجے کا معاملہ راج کپور، دیو آنند یا سنیل دت سے بالکل ہی الگ ہے۔ راج کپور نے بطور



اداکار اپنی پہچان بناتے ہی اپنی فلم کمپنی کی بنیاد ڈال دی تھی۔ ان کی فلم کاری اور اسٹارڈم دونوں ساتھ ساتھ پروان چڑھے۔ اسی طرح دیو آنند بہت بڑے اسٹار تھے۔ بہت مانگ تھی ان کی۔ اسی وقت انہوں نے اپنی پروڈکشن کمپنی "نوکیتن" کی بنیاد رکھ دی تھی وہ (بطور پروڈیوسر) فلمیں بناتے رہے اور ساتھ ہی باہر کی فلموں میں کام بھی کرتے رہے۔ ان کی مانگ برابر بنی رہی ان دونوں پر ہی یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ اپنے آپ کو منڈی میں جمائے رکھنے کے لیے انہوں نے اپنی فلم